ہماری ویب ای بُک

نغمہ حبیب

NAGHMA HABIB

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

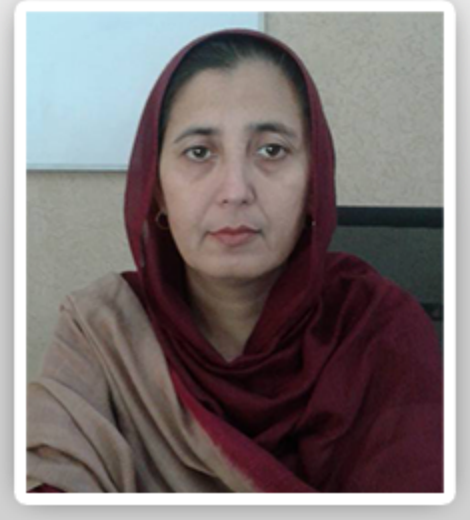

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Naghma Habib"
at Hamariweb.com

یہ قوم

آج کل اخبار اٹھا کر دیکھیں، کالم اور مضامین پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کہ مسائل کا ایک انبار ہے جس کے نیچے یہ قوم دبی ہوئی ہے۔ کہیں حکومت کے بے تحاشہ اخراجات ہوش اڑا دیتے ہیں کہیں بے شمار وزارتوں اور وزیروں کے مجلکے۔ کبھی فاٹا اور صوبہ سرحد کے جلتے ہوئے سبزہ زار دل دکھی کر دیتے ہیں کہیں بلوچستان کا مسئلہ فکرمندی کے آزار میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میرے سمیت ہر لکھنے والا اِن مسائل سے پریشان ہو کر بلبلا رہا ہے اِن کا دکھ بجا ہے لیکن کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو نہ صرف اِن حالات کو لکھتے ہیں بلکہ ایسا مایوس کن تجزیہ کرتے ہیں کہ ہر بیماری لاعلاج ہر درد لادوا محسوس ہونے لگتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے خدانخواستہ بس کچھ دم کی بات ہے کہ یہ ملک ہاتھوں سے گیا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ حالات اچھے ہیں کبوتر کی طرح حالات سے آنکھیں بند کر لینا مسائل کا حل نہیں لیکن مایوسی خود ایک لاعلاج بیماری ہے اور کبھی کبھی تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے قصداً یا ارادتاً ایسا کیا جا رہا ہو۔ شکر ہے ان خبروں کی پاپولیرٹی (Popularity) تو کچھ کم ہوئی کہ لوگ بچے برائے فروخت کے ٹیگ لگا کر انہیں سڑک کنارے لا بٹھاتے اور خوب شہرت پاتے۔ ایک دور آیا کہ غربت (بھوک نہیں) کے ہاتھوں خودکشیوں کو خوب اچھالا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ملک ملک نہیں بلکہ

کھچڑی ہے کہ جس نے جیسے چاہا چھچ ہلا دیا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہم اِن حالات سے خبردار نہ رہیں یا انہیں بہتر بنانے کی کوشش نہ کریں لیکن ان کا رونا رو رو کر مایوسی پھیلانے سے مجھے اختلاف ہے ٹھیک ہے حکومت مسائل کے حل میں ناکام ہے یہ بھی درست ہے کہ مسائل کا انبار ہے یہ بھی بجا کہ عوام بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں لیکن کچھ ایسا بھی تو ہوگا جو اچھا ہوگا اور میں سمجھتی ہوں کہ جو سب سے اچھی سب سے مثبت بات ہے وہ ہے اس قوم کی ہمت اسکا حوصلہ۔

1947 سے لیکر اب تک یعنی باسٹھ سالوں میں اس قوم پر بے شمار مشکل گھڑیاں آئیں لیکن ہر بار یہ سرخرو ہو کر نکلی اور اب تو جو حالات ہیں انشا اللہ پاکستانی قوم اس میں سے کندن بن کر نکلے گی۔ پاکستان بنا تو سال بھی نہ ہوا تھا کہ اس پر جنگ مسلط کر دی گئ جو اس نے بہادری اور فتح مندی سے لڑی۔ اور چھ ستمبر 1965 کی وہ رات کیسے بھولے گی جس کی تاریکی نے اس قوم کو ڈرایا نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اس کی کوکھ سے ایک شفق رنگ سویرا پھوٹا۔ 16 دسمبر 1971 کا وہ اعصاب شکن حادثہ بھی اس قوم نے برداشت کیا جب یہ ملک دولخت ہوا۔ لیکن جب آنسو خشک ہوئے تو اس قوم نے قسم کھالی کہ گھاس کھالے گی لیکن خود کو ناقابل تسخیر بنائے گی اور یہی ہوا کہ پاکستان نے ایٹم بم بنانے کو اپنی بقا کا مسئلہ بنا لیا اور خدا کا شکر ہے کہ یہ معرکہ بھی سر ہوا صرف

قوم کی ہمت سے ورنہ کیا کیا پابندیاں نہ لگائی گئیں پاکستان پر لیکن ظاہر ہے کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے اور خدا کا شکر ہے ہم نے کھویا کم اور پایا زیادہ۔

آج ہم پُر اعتماد ہیں کیونکہ دشمن جانتا ہے کہ ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں صرف ایٹم بم ہی نہیں آزمائش کے وقت تو اس قوم کا ہر فرد اور اس کی فوج کا ہر سپاہی نا قابل تسخیر ہو جاتا ہے اور اس زمین کے ایک ایک انچ پر اپنی سو سو زندگیاں قربان کرنا اپنا فخر سمجھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قوم نے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ جوانمردی سے کیا انسانوں سے مقابلہ تو خیر اس نے جان پر کھیل کر بھی کیا، قدرتی آفات میں بھی اس نے ہمت نہ ہاری، سیلاب، طوفان، زلزلے سب کچھ آئے لیکن اس نے ہر مشکل پر قابو پایا اور ہر مصیبت کا مقابلہ صبر واستقامت سے کیا۔ 1992 میں جب سیلاب آیا تو مجھے لاہور سے بذریعہ ٹرین حیدرآباد تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا کہیں کہیں تو ایسا تھا کہ پٹڑی کے نیچے ریت کی بوریاں رکھی ہوئی تھیں اور ٹرین چلتی رہی اسی عزم و حوصلے سے سیلاب زدہ علاقوں کے لوگ اس مشکل سے نبرد آزما نظر آئے۔ آٹھ اکتوبر 2005 تو خیر ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے زلزلہ کشمیر اور صوبہ سرحد میں آیا لیکن میں نے امدادی سامان کے ڈھیر اس بلوچستان میں دیکھے جسے آج بارود کا ڈھیر بنایا جارہا ہے بالکل اسی جذبے کے ساتھ جس طرح پنجاب کے لوگوں نے سن

کی قحط سالی میں پانی کے ٹینکر بھر بھر کر بلوچستان بھیجے تھے۔ یوں یہ قوم کبھی 2000 کسی محاذ پر پیچھے نہیں ہٹی۔بڑی سے۔بڑی مصیبت اور آفت سے بھی اللہ کے فضل سے کامیاب وکامران ہو کر نکلی.بڑی سے.بڑی دنیاوی طاقت کے مقابلے میں بھی ڈٹ گئی چاہے روس تھا اسے شکست سے دوچار کیا چاہے بھارت تھا اُس سے نہیں دبا اور چاہے امریکہ ہے یا اس کی پھیلائی ہوئی دہشت گردی کی آگ اُسے بھی انشااللہ یہ قوم اپنی ہمت سے بجھا ڈالے گی آج کل بھی اسے جن حالات سے گزارا جا رہا ہے میں انتہائی یقین سے کہتی ہوں کہ خود کو.بڑی سمجھنے والی یہ قومیں چند ایک بھی ایسے جھٹکے کھالے تو .برداشت نہ کرکے جبکہ پاکستان کے.بڑے سے لیکر چھوٹے شہروں تک کو ہلا دیا گیا ہے اور خود کش حملوں سے یہاں خون کی ندیاں بہا دی گئی ہیں اور اس کو ایک ایسے خوف میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پوری قوم گھروں سے نکلنا چھوڑ دے اور ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جائیں ساتھ ہی ساتھ اِن حملوں کے ذریعے دین اور مذہب کو بھی بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستانی مسلمان کو ہر جگہ مشکوک بنا دیا گیا۔ لیکن آفرین ہے اس قوم پر کہ ہر جھٹکا اپنے اندر جذب کرلیا اور پھر اُسی عزم وہمت سے ہر صبح کا آغاز کیا جو زندہ قوموں کا خاصہ ہے۔ لیکن جس انداز میں نفسیاتی وار کرکے اس قوم کو مفلوج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ قابل غور ہے۔ ہر چند مہینوں بعد مغرب اور خاص کر امریکہ کا کوئی تھنک ٹینک ناکام ریاستوں کی ایک فہرست جاری کردیتا ہے جس میں پاکستان کو.بڑے زور وشور سے

دس ناکام ترین ریاستوں میں شامل کر دیا جاتا ہے اور پھر اس فہرست کو خوب مشتہر کیا جاتا ہے تاکہ اس قوم کا ہر شخص باور کر لے اور خود کو مزید غیر محفوظ سمجھ لے کہ خدانخواستہ یہ ملک ختم ہو جائے گا۔ کبھی یہ شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے کہ پاکستان کے جوہری ہتھیار دہشت گردوں کے ہاتھ لگنے کے قوی امکانات ہیں یعنی اِنؐ جاہلوں کے خیال میں ہم نے ایٹم بم کو ایک شوکیس میں سجا کر رکھا ہوا ہے اور اُس پر ایک سادہ بندوق والا چوکیدار کھڑا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے لیکن ایسا اس قوم کا اپنی قوت پر یقین متزلزل کرنے کی ایک سازش ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تخصیص اس قوم کے لیے کیوں؟ کیوں اسی کو بہت اہتمام کے ساتھ سازشوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس کی کئی وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ پاکستان مدینہ کے بعد اسلام کے نام پر وجود میں آنے والا پہلا ملک ہے اور کچھ بھی کہہ دیا جائے حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور کفر دنیا میں دو ہی ملتیں ہیں اور دوسرا یہ کہ یہ پہلی مسلمان ایٹمی قوت ہے اور دنیا جانتی ہے کہ جب اس نے ایٹم بم نہیں بھی بنایا تھا تو بھی یہ قوم کسی طاقت کے سامنے نہ دبی تھی بلکہ اس کی فوج اپنے عام روایتی ہتھیاروں ہی کے بل بوتے پر اور اپنی قوم کی عظیم پشت پناہی پر ہر طاقت کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اور انہیں اپنے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ یہ قوم واقعی عظیم ہے کہ ابھی ہی کے واقعات دیکھ لیجئے کہ کیسے لاکھوں آئی ڈی پیز کے جھٹکے کو برداشت کیا اور بفضل خدا یہ لوگ پھر اپنی جنت نظیر وادی سوات

کی طرف پلٹنا شروع ہو گئے ہیں (خدا اس امن کو پائیدار کرے) اس مسئلے کے وقت بھی اس قوم نے اپنی بھرپور زندگی کا ثبوت دیا۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی سازش کا مقابلہ کیا جائے اور اس قوم کی کامیابیاں مشتہر کی جائیں میں یہ نہیں کہتی کہ مسائل اجاگر نہ کیے جائیں ضرور ہوں کیوں کہ اس کے بغیر ان کا علاج ممکن ہی نہیں لیکن مایوسی نہ پھیلائی جائے قوم کو یہ بتایا جائے کہ مشکل گھڑیاں اور سخت وقت قوموں پر آتے ہی رہتے ہیں۔ دنیا میں کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں مسائل نہ ہوں دنیا کی واحد سپرپاور اور ترقی یافتہ ترین ملک امریکہ میں چھ ملین لوگ دوپہر کا کھانا کھالیں تو نہیں جانتے کہ شام کو کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں اور شام کو کھالیں تو صبح کی خبر نہیں ہوتی۔ بھارت میں علیحدگی کی ایک درجن سے زیادہ تحریکیں چل رہی ہیں اور شاید اسی لیے اب بلوچستان میں یہ گھناؤنا کھیل شروع کیا جا رہا ہے۔ نسلی فسادات تو یورپ بلکہ برطانیہ جیسے ملک میں بھی ہوتے ہیں اور پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے درمیان فرقہ وارانہ اختلافات بھی۔

پس جو بات اس وقت انتہائی ضروری ہے کہ قوم کا اعتماد بحال ہو وہ یہ ہے کہ مسائل کو سامنے لاتے رہنا چاہیے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر قومی کامیابی کو نہ صرف سامنے لایا جائے بلکہ اسے منایا جائے جس طرح ٹونٹی ٹونٹی کرکٹ ورلڈ کپ میں کامیابی کو جوش و خروش سے منایا گیا تاکہ ہر موقع پر یہ ثبوت ملتا رہے

کہ یہ ملک ناکام ریاست نہیں بلکہ ایک زندہ قوم ہے۔

سوات ـــــ حقائق اور پراپیگنڈہ

سوات پھولوں، رنگوں، سرسبز و شاداب پہاڑوں اور بہتے آبشاروں کی خوبصورت وادی ہے جو ہزاروں سال سے ایک زرخیز ثقافت کی امین رہی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ریاست سوات پاکستان میں شامل ہوئی اور بعد میں اسے پاکستان میں ضم کردیا گیا۔ یہاں کے لوگ انتہائی محنت کش ہیں میں نے اپنے ایک اور مضمون میں بھی ذکر کیا تھا کہ کالام کے پہاڑوں پر چڑھتی ہوئی وہ بوڑھی عورت مجھے آج بھی یاد ہے جو اپنے سر پر لکڑیوں کا اتنا بڑا گٹھا اٹھائے ہوئے تھی جسے ہمارے میدانوں کا ایک جوان آدمی بھی بمشکل اٹھائے۔ یہ تو کل کا سوات تھا لیکن آج کا سوات جس عذاب سے گزرا ہے وہ آج بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اربوں روپے کا زرعی نقصان جسکا محتاط تخمینہ ۸۱ ارب روپے لگایا گیا سیاحت سوات کی سب سے بڑی صنعت ہے لیکن اس کو بھی ۶ ارب روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ آئی ڈی پیز کی صورت میں لاکھوں سواتی گھر بدر ہوئے اور جون، جولائی کی تپتی دوپہریں کھلے آسمان تلے گزارنے پر مجبور ہوئے۔ طالبان اور مولوی فضل اللہ انکے لیے دہشت اور ظلم کا نشان بن گئے تھے یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا جو اس وادی جنت نظیر نے دیکھا جبکہ اس تصویر کا دوسرا رخ عزم، ہمت اور شجاعت کی وہ داستان ہے جو پاک فوج نے یہاں رقم کی نہ صرف یہ کہ وادی کو طالبان کی دہشت سے صاف کیا بلکہ اس خوف

کا خاتمہ کیا جو چوکوں اور درختوں سے لٹکی لاشوں سے اس کے ہر گلی کوچے میں بکھرا ہوا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے پاک فوج کو اپنے ہیروں جیسے چمکتے گھبرو جوانوں اور افسروں کی جانوں کی قربانیاں دینا پڑی اور انہیں شہیدوں اور شہادتوں کا ثمر سوات کو امن کی صورت میں ملا۔ آئی ڈی پیز کی گھروں کو واپسی بھی اسی جری فوج کا کارنامہ تھا۔

سوات سے اب بھی جب اکا دکا واقعات کی خبر آتی ہے تو دل پریشان ہو جاتا ہے کہ خدانخواستہ بیرونی ایجنسیاں اور ملک دشمن عناصر پھر جڑ نہ پکڑ جائیں اور ساتھ ہی جب یہ بھی سننے میں آئے کہ پاکستان آرمی وہاں ماورائے عدالت قتل میں ملوث ہے تو فکر اور پریشانی فطری امر ہے۔ سوات سے میرا تعلق کچھ ایسا ہے کہ وہاں کے لوگوں کو تکلیف میں دیکھنا بلکہ سننا بھی بڑا مشکل ہے اور جذباتی لگاؤ کی وجہ یہ ہے کہ میں نے بچپن کے کچھ خوبصورت سال اس وادی میں گزارے۔ دوسری طرف افواج پاکستان کے بارے میں بھی کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کیونکہ یہ ہماری حفاظت کے امین ہیں پھر کیسے یہ توقع کی جائے کہ جنہوں نے اس وادی کو دہشتگردوں سے چھڑایا وہ ہی اس کے لیے وبال جان بن جائیں۔ خیر اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے جب سوات کے سکول کے زمانے کے کچھ ہم جماعتوں سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ سنا انہوں نے بھی یہی ہے لیکن وہ لوگ فوج کو سوات کا نجات دہندہ قرار دے رہے تھے اور انہوں نے ہی بتایا کہ افواج

پاکستان نے نہ صرف سوات کو یہ کہ مولوی فضل اللہ جیسے بھارتی کارندوں سے نجات دلائی بلکہ یہاں کے لوگوں کا اعتماد بحال کرنے کے لیے بھی اقدامات کیے۔ وہ لوگ جو تین سال تک شدید ذہنی دباؤ اور تناؤ میں رہے انکو ان حالات سے نکالنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہاں فلاحی کام کیے جائیں اور پاک فوج یہ فرائض بھی خوش اسلوبی سے ادا کر رہی ہے۔ متعدد سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر میں پاک فوج کا حصہ قابل قدر ہے اسکے علاوہ مینگورہ میں شہدا پارک بھی سوات کے لوگوں کو ہمیشہ ان جانبازوں کی قربانیاں یاد دلاتا رہے گا۔ مینگورہ میں ایک لائبریری کا قیام بھی فوج ہی کے مرہون منت ہے۔ ایک دلچسپ بات جو معلوم ہوئی وہ یہ کہ اوڈی گرام جہاں بدھ تہذیب کے آثار بھی موجود ہیں وہاں ایشیا کی سب سے پرانی مسجد بھی دریافت کی گئی اور اسکی تعمیر نو بھی پاک فوج نے ہی کی۔

مقصد ان اقدامات کو یہاں بیان کرنے کا یہ ہے کہ اگر واقعی سوات میں فوج نے یا فوج کی مدد سے یہ سب کچھ کیا گیا تو اس کے خلاف پراپیگنڈہ کون کر رہا ہے اور کیوں کیا جا رہا ہے میرے خیال میں اس کا جواب انتہائی سادہ ہے کہ وہ قوتیں یعنی را، رام، موساد، سی آئی اے اور ان کے چند پاکستانی کارندے جنھوں نے سوات کی وادی کی خوبصورتی اور وہاں کے امن کو پامال کیا اب بھی متحرک ہیں اور وہ جانتی ہیں کہ کون انہیں دبا سکتا ہے لہذا وہ انہیں کے خلاف

اپنا پراپیگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دشمن تو ظاہر ہے کہ اپنا وار کرے گا کیونکہ شکست قبول کرنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں لیکن فتح کو قائم رکھنا بھی انتہائی مشکل ہے۔ ہمارے ملک میں تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ہم اداروں کو مضبوط نہیں کر رہے اور ہر ادارہ اپنے دفاع کے لیے خود ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے ادارے اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارا میڈیا اس ذمہ داری کو کسی حد تک پورا کر رہا ہے لیکن وہ بھی اس پراپیگنڈے کا جواب اتنے زور و شور سے نہیں دے رہا۔ جبکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگیں فوجیں لڑتی ہیں لیکن جنگ کے بعد پورے ملک کے حالات کو معمول پر لانا ہوتا ہے جس کی ذمہ داری تمام ملکی اداروں اور پورے معاشرے کی ہوتی ہیں اور آجکل تو میڈیا وار نے بعد از جنگ حالات کو زیادہ مشکل یوں بنا دیا ہے کہ شکست کو زیادہ دلخراش اور فتح کو زیادہ دلآویز بنا دیتا ہے۔ اور فاتحین سے متعلق نفرت کو ہوا دینا بھی آسان ہے اور یہی کام پاک فوج کے خلاف کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ فوج سوات میں اپنا فرض پورا کر رہی ہے اگرچہ اپنے فرائض کا بڑا حصہ پورا کر چکی ہے تاہم اب بھی امن وامان کو برقرار رکھنے اور پائیدار بنانے کے لیے اسے وہاں رکنا پڑ رہا ہے۔ اب یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری بہر صورت نبھائے اور سوات میں امن وامان کی بحالی میں فوج کے کردار کو سراہتے

ہوئے اسکے خلاف منفی پراپیگنڈے کا مزید موثر جواب دے اور جو ایجنسیاں اور انسانی حقوق کے علمبردار یہ خبریں پھیلا رہے ہیں ان کو سوات میں بھارتی، امریکی، اسرائیلی اور افغانی کردار سے آگاہ کرے۔ وہ بھارتی ساختہ اسلحہ، کرنسی جو ان علاقوں سے برآمد ہوا اسے بین الاقوامی میڈیا کے سامنے پیش کرے بلکہ غیر مختون لاشوں سے بھی انہیں آگاہ کیا جائے اور پاک فوج کے انتہائی مثبت کردار کو مزید اجاگر کرے۔ میڈیا پر انکے فلاحی کاموں کو زیادہ سے زیادہ پیش کیا جائے تاکہ اصل صورت حال سب کے سامنے آسکے کیونکہ ملکی دفاع کی ذمہ داری کو ہمیں ہر سطح پر پورا کرنا ہوگا یہی مضبوط، مستحکم اور زندہ قوموں کا کردار ہوتا ہے۔

این جی اوز فلاحی یا۔۔۔ادارے

خیر اور فلاح اسلام کے ابدی اصول ہیں۔ نماز کو بھی خیر و فلاح قرار دیا یعنی اپنی ذات اور معاشرے کی خیر و فلاح۔ زکٰوۃ کو صاحب حیثیت مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا تاکہ وہ اپنے مال میں غریب کا حصہ اسکا حق سمجھے نہ کہ رعایت۔ صدقہ و خیرات کو بہترین درجہ دیا کیونکہ اسلام معاشرے کے ہر فرد کو دوسرے فرد سے جوڑتا ہے۔ اور ہر ایک کی مدد کا حکم دیتا ہے اور یہ مدد اس طرح کہ لینے والا شرمندہ نہ ہو کہ دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہو۔ معاشرتی بھلائی کے کاموں کو بھی نمود و نمائش نہیں بلکہ بھلائی اور خیر کے نکتہ نظر سے ہونا چاہیے لیکن آجکل خیر، خیرات، بھلائی اور معاشرتی تعمیر سب کچھ کمرشلائز کر دیا گیا ہے۔ فلاحی کام کسی ادارے یا تنظیم کے تحت کرنا فلاح کو زیادہ منظم بنا دیتا ہے لیکن آجکل دوسرے میدانوں کی طرح یہاں بھی نمود و نمائش نے جگہ لے لی ہے بلکہ اس کام کو دوسرے کی مدد کی بجائے اپنی مالی حالت مزید سے مزید نکھارنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ این جی اوز کے نام پر ایک طوفان بد تمیزی برپا ہے ترقی یافتہ ملکوں نے ترقی پذیر اور غریب ممالک پر کنٹرول کا ایک نیا طریقہ اس صورت میں نکالا ہے اور اپنے این جی اوز کی شاخیں ان ممالک میں کھول کر ان کے متعلق بلکہ ان کے خلاف رپورٹیں شائع کر کے ان کی پریشانیوں

میں مزید اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان بھی ان دنوں این جی اوز کی لپیٹ میں ہے اور حکومتی رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ سے زائد این جی اوز یہاں قائم ہیں۔ دراصل پاکستان میں اولین این جی اوز کی ابتدا اسوقت ہوئی جب اپنے قیام کے بعد اسے لاکھوں مہاجرین کو سنبھالنا پڑا بہت سے خیراتی ادارے وجود میں آئے زیادہ تر بیگمات نے یہ کام کیا۔ ۱۹۸۰ کی دہائی میں رفاہ عامہ کے لیے کچھ اور ادارے اور این جی اوز بنائے گئے جن میں کچھ ملکی اور کچھ غیر ملکی تھے اور ۱۹۸۰ کی دہائی کچھ اور غیر ملکی این جی اوز افغان مہاجرین کی آڑ لیکر آئے اور کچھ غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب نمائندوں نے فنڈز کے حصول کے لیے بنائے اسی طرح ۱۹۹۰ کی دہائی میں فنڈز کے لیے سندھ اور پنجاب میں بے تحاشا این جی اوز بنائے گئے۔

ملکی این جی اوز کی تو پھر کوئی منطق پیش کی جا سکتی ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ انکا خلوص بھی شک و شبہ سے بالاتر نہیں۔ دس، پندرہ یا بیس افراد پر مشتمل این جی او فلاح و بہبود کا کام کتنا کر سکتے ہیں اور فنڈ کتنا حاصل کرتے ہیں۔ کیا کبھی کسی حکومت نے ان کا آڈٹ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اور کیا کسی چیک اینڈ بیلنس کا نظام بھی موجود ہے یا بغیر کسی قانون یا قانون موجود ہوتے ہوئے بھی بلا ضرورت اور بلا تحقیق این جی اوز کو رجسٹر کیا جا رہا ہے۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ۴۵۰۰۰ این جی اوز رجسٹرڈ ہیں لیکن

اصل تعداد اب بھی معلوم نہیں حالانکہ یہ وہ زمانہ نہیں جب گنتی اور شمار بہت مشکل کام ہو ہمارے انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار این جی اوز بنانا ہی انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں اور پھر کسی فرد کے عمل کو پوری قوم پر منطبق کر کے اسے بدنام کرتے ہیں کشمیر سنگھ کی رہائی پر نام کماتے لیکن پورے کشمیر کے جل جانے پر خاموش رہتے ہیں۔ وہ اس خاموشی اور اس واویلے کی کتنی قیمت وصول کرتے ہیں عوام تو ظاہر ہے اس کا جواب نہیں جانتی کیا حکومت بھی بے خبر ہے؟

اب ذرا آیئے غیر ملکی این جی اوز کی بات کرتے ہیں جو خورو جھاڑیوں کی طرح ملک بھر میں اگی ہوئی ہیں کچھ قابل فہم اور کچھ نا قابل فہم ناموں سے گلی کوچوں میں موجود ہیں۔ کیا ایسا ہے کہ ان دور دراز کے ملکوں کے رہنے والے متعصب گوروں کو ہم سے انتہائی ہمدردی ہے اور وہ ہماری خدمت کرنے کے لیے ہمارے یہاں آئے ہیں۔ یقیناً ایسا ہرگز نہیں ہے ورنہ یہ این جی اوز ہمارے ملک کے خلاف لایعنی قسم کے الزامات نہ لگاتے اصل میں یہ آئے ہی اس کام کے لیے ہیں ورنہ وہ اپنے ملکوں میں بھی یہ خدمت کر سکتے ہیں کیونکہ مسائل وہاں بھی ہیں چاہے وہ ہم سے مختلف ہوں لیکن اپنے مسائل اجاگر کرنے میں ظاہر ہیں خامیاں بھی نظر آئیں گی اور فنڈز بھی اس طرح نہیں مل سکتے جس طرح ترقی پذیر ملکوں کی خدمت کے نام پر ہتھیائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان ملکوں کے

چھوٹے چھوٹے مسائل کو اچھال کر اپنی موجودگی کا جواز بھی پیدا کیا جاتا ہے اور پھر ان مسائل کے حل کے نام پر بڑے بڑے فنڈز حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ پوش علاقوں میں انتہائی زیادہ کرائے، اپنے کارندوں اور ملازمین کو بڑی بڑی تنخواہیں آخر یہ سب کیسے ممکن ہے ظاہر ہے اس سب کچھ سے زیادہ وہ اپنے لیے رکھ لیتے ہیں اور بنیادی انسانی حقوق کے حصول کے لیے کوشش کے نام پر ملک کی بدنامی اور بہت کچھ بھی۔

سوال یہ ہے کہ آخر ہماری حکومت یہ سب کچھ کرنے کی اجازت کیسے دے دیتی ہے۔ ایک یعنی یورپین آرگنائزیشن آف پاکستانی مائنارٹیز کے EOPM این جی او کی ہی مثال لیجیے نام سے کام کرنے والی این جی او نے پاکستان کو اقلیتوں کے لیے سب سے خطرناک ملک قرار دیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ پاکستان میں اقلیتوں کی تعداد ۵ فی صد ہے لیکن حکومت جان بوجھ کر انہیں کم بتاتی ہیں اس این جی او کی گمراہ کن رپورٹ میں بھی کہا گیا کہ عیسائی، ہندو، قادیانی اور دوسری اقلیتوں کی عورتوں کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے یعنی صرف پاکستان کی بدنامی کی کوشش ورنہ پاکستان کا آج کا آزاد میڈیا سب سے پہلے خبر پہنچانے کے شوق میں ہی ایسی خبریں نشر کر دے۔ پھر توہین رسالت کے قانون کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اور اس پر اعتراض کرتے ہوئے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کسی محمد یوسف کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے یعنی مذہبی معاملات میں

مداخلت۔ کیا ہماری حکومت اس اور اس جیسی دوسری این جی اوز سے جواب طلبی نہ کر کے مجرم نہیں بن رہی۔

ہمارے حساس ادارے بھی یوں لگتا ہے کہ اس فرض سے پہلوتہی کر رہے ہیں کیا پاکستان اور پاکستانیوں کے مسائل پہلے کم ہیں جو انہیں مزید بدنام کیا جارہا ہے دراصل مغرب نے اسلام کا بالعموم اور پاکستان کا بالخصوص محاصرہ کیا ہوا ہے لیکن قصور ہمارا بھی ہے جب گھر والے گھر میں مداخلت کی اجازت دیں تو دشمن تو ہر وقت تیار رہتا ہے ان کے جاسوس ادارے تو ہمہ وقت اپنے کام میں مصروف ہیں لیکن چوکنا تو ہمیں رہنا ہوگا جسطرح افواج پاکستان کی مدد سے گھوسٹ سکولوں کا پتہ چلایا گیا تھا کیا ایسے ہی اصل فلاحی اداروں، فنڈز کے حصول کے لیے قائم شدہ جعلی این جی اوز اور بدامنی اور بدنامی پھیلانے والے جاسوس این جی اوز جو کھلم کھلا اور درپردہ پاکستان دشمنی کر رہے ہیں کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا تاکہ مجبوراً نوکریوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے نوجوان ان کے جھانسے میں نہ آسکیں بلکہ ملک مخالف پروپیگنڈا کرنے والے این جی اوز کو نہ صرف بین کیا جائے بلکہ اندرونی معاملات میں مداخلت پر انکے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔ میڈیا سے میری گزارش ہے کہ جسطرح وہ سرکاری اداروں میں کرپشن کو عوام کے سامنے لاتا ہے اسی طرح این جی اوز کا کردار اور انکے فنڈز کا حساب کتاب بھی عوام کو بتائے اور یہ بھی کہ پچاس ساٹھ

لوگوں کی مدد کرنے کے لیے تقریب منعقد کرکے اسکا بل لاکھوں کے حساب سے کیسے لے لیا جاتا ہے حکومت اسطرف ضرور توجہ دے ورنہ ایسا نہ ہو کہ یہ ٹڈی دل پوری فصل کی تباہی کا باعث بن جائے۔

عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں

امریکہ کا پاکستان کے لیے امداد کا اعلان،.برطانیہ نے مشکل حالات سے نکالنے کے لیے پاکستان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے، یورپی یونین ۔۔۔ یوروکی امداد دے گا وغیرہ وغیرہ یہ وہ خوشخبریاں ہیں جو روز قوم کو سنائی جاتی ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو ہمیشہ کا معمول ہے نہ تو وہ مدد کہیں نظر آتی ہے نہ استعمال ہوتی ہے قوم اسی لوڈ شیڈنگ میں ڈوبی رہتی ہے، سڑکوں کی حالت بہتر ہوتی ہے نہ درختوں کے سائے میں لگنے والے سکول کی عمارت بنتی ہے اور نہ ہی دور دراز کا سفر کرکے ہسپتالوں تک پہنچنے کی ضرورت ختم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ گھر اپنے ہی چلاتے ہیں دوسرے آکر چلانا چاہیں بھی تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ جب تک ایک قوم اور اسکے حکمران خود اپنی ترقی کے بارے میں نہیں سوچتے تب تک ترقی ممکن ہی نہیں۔ ہمارے ہاں یہ ایک رویہ بن چکا ہے کہ ہم دوسروں پر تکیہ کرکے بیٹھے رہیں اور خود اپنی مہارتوں اور صلاحیتوں کو محفوظ رکھیں۔ جبکہ پوری دنیا میں پاکستانی ڈاکٹر، انجنیئر اور بزنس مین بڑی کامیابی سے اپنے پیشے میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں لیکن یہی لوگ اپنے ملک میں آنے سے کتراتے ہیں جبکہ ان کی مہارتوں کا بہترین استعمال اپنے ملک میں زیادہ بہتر ہو سکتا ہے۔

چونکہ پاکستان زیادہ آبادی والا عظیم افرادی قوت کا حامل ملک ہے اس لیے یہ ایک بہترین تجارت ہے کہ ہم اپنی افرادی قوت کو کم افرادی قوت والے ممالک کو مہیا کریں اور اس کے بدلے ان سے قیمتی زرمبادلہ کمائیں لیکن یہ کسی بھی طرح قومی تقاضوں کے مطابق نہیں کہ ہم ان ممالک کو مسلسل .برین ڈرین کی اجازت اور مواقع فراہم کرتے رہیں۔ اگر ہماری حکومت چاہے تو اپنے ہی ملک میں ایسے مواقع فراہم کر سکتی ہے کہ یہ دماغ ملکی اور قومی ترقی کے نشان بن جائیں جبکہ ہوتا یہ رہا ہے کہ ہم اپنے قومی معاملات کے لیے غیر ملکیوں کی خدمات .بڑے فخر اور یقین کے ساتھ خریدتے ہیں اور اربوں روپے انکی جیبوں میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک اور دعوت جو ہم مسلسل غیر ملکیوں کو دیتے رہتے ہیں کہ پاکستان میں سرمایہ کاری کریں یہ بھی درست ہے لیکن جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ غیر ملکی سرمایہ کار ہمارے غم میں دبلے ہو رہے ہیں اور ہماری ترقی کے لیے ہمارے ملک میں کارخانے لگائیں گے تو ہماری سوچ بالکل غیر حقیقی ہو جاتی ہے ہم دوسروں سے اپنی قومی ترقی کی توقع کیسے کر سکتے ہیں یعنی ایک عبث توقع۔

ہمارے حکمران، سیاستدان اور سرمایہ دار اگر بیرونی ممالک سے اپنا محفوظ سرمایہ لا کر اپنے ملک میں ہی سرمایہ کاری کریں تو سوچیے اس ملک کی ترقی اور زرمبادلہ کا گراف کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ قدرت نے بھی ہمارے ملک کو

بہترین اور قیمتی ذخائر سے نوازا ہوا ہے لیکن کمی خلوص کی ہے منصوبہ سازوں کی نہیں۔ بہترین منصوبے بنا کر بھی ہم اس پر مخلصانہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا پائے۔ تھر کول کو ہی لیجیئے ہمارے پاس یہ عظیم دولت موجود ہے لیکن اسکو استعمال کرنے کے طریقے پر اب بھی ہر طبقے کے اپنے تحفظات ہیں اور یہی حال ہمارے دوسرے معاملات کا ہے۔

مجھے اپنی قوم کی صلاحیتوں پر کوئی شک نہیں بلکہ اکثر اپنے مضامین میں ان صلاحیتوں کا ذکر کرتی رہتی ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس قوم کو جو کام بھی سونپا جائے تو تمام تر مشکلات کے باوجود اسے کر گزرتی ہے لیکن بات تب ہے جب ہماری حکومتیں دوسروں سے توقع کرنا چھوڑ دیں اور قوم کو بھی اس بات کی ترغیب دینا شروع کر دیں کہ خود کما کر کھانا ہے ورنہ بھوکے سو جانا ہے کیوں کہ مانگی ہوئی جنت سے بلاشبہ دوزخ کا عذاب ہی اچھا ہے کیونکہ سزا ہی سہی اپنے عمل کی تو ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ ہم نے تو منصوبہ سازی، سرمایہ کاری، تعلیم اور طریقہ ہائے کار تو چھوڑئے فکر بھی دوسروں کی اپنانی شروع کر دی ہے ورنہ ہم فکر اور نظریہ اپنا ہی رکھتے تو خود بخود ہمارا قومی احساس ذمہ داری ہمارے اعمال سے ہی ظاہر ہوتا۔ خودی اور خوداری ہمارے اسلاف کی عظیم فکر تھی لیکن ہم نے اسے اپنے قومی معاملات میں سے نکال دیا ہے اور اس بات پر فخر محسوس کرنے لگے ہیں کہ فکر غیر مستعار سہی، لیں اور پھر

عملاً اپنائیں۔

اکثر صاحب حیثیت لوگ یہ بات کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ پاکستان میں رکھا کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں سب کچھ ہے کیا یہ کم ہے کہ ہم بے نام ونشان نہیں لیکن ہم مسلسل تقدیر کو اپنی ناکامیوں کے لیے موردالزام ٹھرائے جاتے ہیں اور تدبر اور پھر تدبیر کی اہمیت سے انکار کیے جاتے ہیں۔ اگر ہم کبھی تدبیر کریں بھی تو تدبر سے خالی اور فہم سے بالا اور عاری۔ بجلی کے بحران کو ہی لیجیئے ہم نے طرح طرح کے تجربے کر ڈالے کہ بجلی بچائی جائے بچت کی اہمیت اپنی جگہ لیکن مزید بجلی کی پیداوار بہرحال وقت کا تقاضا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سی این جی سٹیشن بند کر دینے سے بچت ہوگی تو یہ کیوں نہیں سوچا جاتا کہ ضرورت منداسے بارہ بجنے سے پہلے بھر لیتے ہیں۔ قومیں اپنے ہی زور بازو پر ترقی کیا کرتی ہیں اور جب قدرت نے اسے سامان بھی مہیا کر رکھا ہو تو وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ اس سامان کا بہترین استعمال کیا جائے نہ کہ اس ضائع کیا جائے۔ اس معاملے میں میرے خیال میں ساری ذمہ داری حکمرانوں کی ہے کیونکہ قومی رویے متعین ہی تب ہوتے ہیں جب قوم کے سامنے ایک مثال موجود ہو۔ ہمیں اپنی قومی ترقی کے لیے ایسے واضح خطوط متعین کرنے کی ضرورت ہے جو ہمارے قدم ڈگمگانے نہ دے نہ کہ غیر ملکی امداد کی۔ اور نہ ہی

شکوہ شکایت کی بلکہ شکوہ شکایت کی تو ہمارے پاس گنجائش ہی نہیں کیونکہ قدرت نے اس ملک کو ایسے گراں بہا خزانے عطا کیے ہیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں۔ معدنیات ہمارے پاس ہیں، سمندر ہے، پہاڑ ہیں، میدان ہیں، زرخیز زمین ہے، افرادی قوت ہے اور عوامی جذبہ ہے پھر کس چیز کا گلہ خدا سے کیا جائے۔ بات صرف ان کے استعمال کی ہے جس کے لیے ہمیں مخلص حکمرانوں کی ضرورت ہے۔ ترقی کا عمل اگر متواتر اور منصوبہ بندی سے ہو تو چلتا رہتا ہے ہمیں اس عمل کو شروع کرنا ہوگا اور حکمرانوں سے شروع ہو کر ایک عام آدمی تک خودی اور خوداری کی سوچ کو عام کرنا ہوگا۔ شخص کی بجائے ادارے کی اہمیت اجاگر کرنی ہوگی اور ذات پر قوم کو ترجیح دینا ہوگی اور تدبیر سے تقدیر بدلنی ہوگی۔

مسلمانو! قوت کو بڑھاؤ اتنا

اسرائیل نے غزہ میں فلسطینیوں کے لیے امداد لے جانے والے بحری بیڑے فریڈم فلو ٹیلا پر حملہ کرکے بیں امدادی کارکنوں اور صحافیوں کو ہلاک کر دیا۔ جرم جن کا صرف یہ تھا کہ وہ ان فلسطینیوں کے لیے امداد لے کر جارہے تھے جنہیں اسرائیل نے انکے گھروں سے نکال کر بے گھر کر دیا ہے اور ان پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔
اسرائیل میں یقیناً کسی کیڑے کی زندگی بھی کسی فلسطینی کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہوگی۔
اسرائیل فلسطین کے خلاف جب ظلم و بربریت کی انتہا کر دیتا ہے تو بھی مغربی دنیا کو وہ تکلیف نہیں ہوتی جو کسی مسلمان ملک میں کسی غیر مسلم یا غیر ملکی کے زخمی یا اغوا ہونے سے ہوتی ہے وہ تہلکہ مچتا ہے وہ طوفان اٹھتا ہے کہ پوری مسلم ملت کو دہشتگرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ عراق اور افغانستان پر صرف اور صرف شک یا جھوٹے الزامات اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر پوری قوت سے حملہ کرکے اکی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ جبکہ نہ صرف اسرائیل بلکہ کوئی بھی غیر مسلم مسلمانوں کے خلاف کاروائی کرے تو اکی بے شمار توجیہات تلاش کرکے اسکو دبا دیا جاتا ہے یا جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہاں اس بار یہ ضرور ہوا کہ اس اسرائیلی کاروائی کی نسبتاً زیادہ مذمت کی گئی سلامتی کونسل کو بھی اپنی ذمہ داری کچھ یاد آئی لیکن ہوا اس اجلاس کے بعد بھی کچھ نہیں

اور دنیا کے اس بڑے دہشتگرد کو جسے دنیا کے سب سے بڑے دہشتگرد امریکہ کی مکمل حمایت حاصل ہے اور صرف اسی وجہ سے اس دہشتگرد کے ہر ظلم اور بربریت کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہی کچھ کسی مسلمان ملک کی طرف سے ہوتا تو پہلے جوابی کاروائی کی جاتی اور پھر اجلاس بلائے جاتے اور وہ بھی مسلم دنیا کو ہی مورد الزام ٹھرا کر ختم ہو جاتے۔

اسرائیل کی دشمنی صرف فلسطینیوں سے نہیں جن کی زمین پر اس نے غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے بلکہ یہ دشمنی دنیا کہ ہر مسلمان کے لیے عام ہے۔ پاکستان تو خیر پوری غیر مسلم دنیا کی آنکھ کا کانٹا ہے اور یہاں ہونے والے کسی انتہائی معمولی واقعے کو بھی کسی غیر ملکی فنڈ سے چلنے والی ملکی یا غیر ملکی این جی او کی مدد سے اچھال دیا جاتا ہے اور پوری قوم کو دہشتگرد قرار دے دیا جاتا ہے اور حکومتوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے لوگوں کے خلاف کاروائی کرے۔ دراصل یہ سب کچھ اسلام کی مخالفت میں کیا جاتا ہے۔ اب جیسا کہ میں اکثر لکھتی ہوں کہ دشمن تو اپنا کام کیے جا رہا ہے اور بڑی تندی و مہارت سے کیے جا رہا ہے لیکن ہم کیا کر رہے ہیں اور بحیثیت مسلمان ہمارا کردار کیا ہے۔ ایک چھوٹا سا اسرائیل اتنی بڑی اسلامی دنیا کو نہ صرف آنکھیں دکھاتا ہے بلکہ اسے اکثر مصیبت میں بتلا کر دیتا ہے۔ یہودی فطرتاً سازشی ذہن کا مالک ہے۔ لیکن کیا عالم اسلام سے اسکو کاؤنٹر کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی جاتی

ہے یا کبھی ہوئی ہے۔ دنیا میں ایک ارب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں، دنیا بھر کے تیل کا اٹھتر فیصد حصہ مسلم ممالک میں ہے اور آج کی دنیا یقیناً توانائی کے لیے مسلم دنیا پر ہی انحصار کرتی ہے اور تیل کے بغیر اسکا چلنا ممکن بھی نہیں لیکن دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ تیل لے جا کر غیر مسلم اس سے ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں اور مسلمان ممالک کے خلاف جہاز اڑاتے اور ٹینک لڑاتے ہیں اور یوں مسلمانوں کے وسائل مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ مصنوعات انکی ہم استعمال کرتے ہیں اور بڑے فخر سے کرتے ہیں.برانڈ ان کے پہننا پسند کرتے ہیں لیکن جنگی سائنس میں ہم ان سے پیچھے ہیں۔ یہ درست ہے کہ پاکستان ایٹم بم بنا کر غیر مسلم دنیا کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روایتی جنگی ٹیکنالوجی میں ہم نہ صرف ان سے پیچھے ہیں بلکہ ان پر انحصار کرتے ہیں خود کفالت کی منزل پر پہنچنے کے لیے ابھی بہت سارا سفر باقی ہے جسے طے کرنے کی خواہش عام مسلمانوں کی ضرور ہے لیکن حکمرانوں کی نہیں۔
ہمارے حکمران بینک بیلنس بنانے میں مصروف ہیں اور بہت سارے امریکہ سے اپنے تعلقات مضبوط سے مضبوط تر بنانے اور ظاہر کرنے میں مصروف ہیں۔
فریڈم فلوٹیلا پر حملہ تو ایک واقعہ ہے جبکہ اسرائیل اسطرح کے جرائم کا عادی مجرم ہے چلیں ان واقعات میں تو جنگی حالات رہے ہوں گے جبکہ اکثر وہاں

بھی ایسا نہیں ہوتا مثلاً فلسطینیوں کی بستیاں مسمار کرنا۔ وہاں تو مسلمان ممالک شاید کاروائی نہ کر سکتے ہوں لیکن کیا فریڈم فلوٹیلا کے معاملے میں ایسا ممکن نہ تھا ایک جہاز جسے ساری رات گھیر کے رکھا گیا کیا اس کو بچانے کے لیے کوئی مسلمان ملک حرکت میں نہ آسکتا تھا کیا اسرائیل کا فاصلہ مسلمان ممالک سے اتنا زیادہ تھا کہ کوئی اس محصور جہاز کی مدد کو نہ پہنچ سکتا تھا۔ دراصل یہ وقت صرف باتیں کرنے کا نہیں بلکہ عملی اقدامات کرنے کا ہے۔ اسرائیل دنیا کے نقشے پر آسانی سے نظر بھی نہیں آتا کیا مسلمان ممالک اس حقیر سے رقبے کے ملک کی ریشہ دوانیوں پر قابو نہیں پا سکتے۔ ہمارے اعلیٰ دماغ کہاں سوئے ہیں۔ کیا صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اسرائیل پروپیگنڈہ کرنے کا ماہر ہے امریکی اور عالمی میڈیا اسکے قبضے میں ہے امریکہ کے کلیدی فیصلوں پر یہودی اثرانداز ہوتے ہیں۔ اگر بیماری کا علم ہے تو اسکے علاج کی ضرورت ہے۔ میڈیا پر اسرائیل کا قبضہ ہے تو اسکا توڑ مسلمان میڈیا کو کرنا ہوگا اگر وہ امریکہ پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو ہمیں اپنی طاقت اتنی بڑھانی ہوگی کہ امریکہ ہم پر اثرانداز نہ ہو سکے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ زندہ رہنا ہے تو قوت کو بڑھاؤ اتنا کہ عدو آنکھ اٹھانے کی بھی جرات نہ کرے۔

مسلمان اگر اسرائیل اور اسکے مددگاروں کا معاشی اور تجارتی بائیکاٹ کرلیں اور اپنی منڈیوں کو ترقی دیں تو یقیناً ایک ارب سے زیادہ مسلمان جو کہ

زیادہ تر خریدار ہیں انکے معاشی نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ بات صرف حکمرانوں کی حکومتی سطح پر ہمت کی ہے۔ اور مسئلہ صرف فریڈم فلوٹیلا کے بدلے کا نہیں بلکہ مسئلہ اسرائیل جیسے دشمن کو قابو اور زیر کرنے کا ہے تاکہ آئندہ وہ ایسے حملوں کی جرات ہی نہ کرے بلکہ مقبوضہ فلسطینی علاقے خالی کر دے۔ لیکن اسکے لیے پہلی اور آخری شرط مسلمانوں بلکہ مسلمان حکمرانوں کی بیداری اور ہمت ہے۔

اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر

خدا اس ملک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے جانے کتنی بے شمار دعائیں اس ملک کی سلامتی کی ضمانت بنتی ہیں تبھی تو مشکل ترین حالات میں بھی یہ ملک قائم ہے اور رہے گا انشااللہ۔ دعائیں تو اپنی جگہ سلامتی کی ضمانت ہیں لیکن کچھ فرائض ہمارے بھی ہیں جن کو ہم بحیثیت قوم بہت کم ترین ذمہ داری کے طور پر بھی نہیں لے رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قوموں کا وجود باہمی خلوص، محبت اور اخوت کا مرہون منت ہے قومی یکجہتی کی ضرورت ہر معاشرے میں ہمیشہ اٹل ہے۔ اس وقت پاکستان بیرونی سازشوں کی وجہ سے جن مشکل صورتحال سے گزر رہا ہے ان حالات میں قومی یکجہتی ہمارے وجود کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے لیکن ہم اکثر اوقات انتہائی غیر ذمہ داری اور غیر حب الوطنی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں یقیناً اس سب کچھ میں غیر ملکی ہاتھ کارفرما ہو گا لیکن آلہ کار ہمارے اپنے لوگ ہوتے ہیں اگر ترکھان کے پاس ہتھوڑی اور آری نہ ہو تو وہ لکڑی کیا چیرے اور کیا ڈھالے۔ ہمارے اندر خرابی بہت اندر سے اور بہت چھوٹے درجے سے آتی ہے۔

میری چار سالہ بیٹی شام کو کھیل کود کر آئی تو پٹھان کے لمبے لمبے کانوں کا گانا ساتھ لائی جب اسے بتایا گیا کہ یہ بری بات ہے تو اچھا کہتے ہوئے بڑے

فخر سے کہا مجھے دوسرا بھی آتا ہے اور تب پنجابی کی شان میں ایک قصیدہ سنایا گیا۔ اب ظاہر ہے چار سالہ بچی نہ قافیہ ملا سکتی ہے نہ ردیف۔ وہ یہ سب کچھ باہر بچوں سے سیکھ کر آئی اور نہ ہی باہر کھیلتے ہوئے سات آٹھ نو سال کے بچے شاعر تھے انھوں نے یہ سب کہیں اور سے سیکھا اور جب اس عمر سے بچہ یہ سب ذہن نشین کر لیتا ہے تو پھر اس کی نظر میں نہ چاہتے ہوئے بھی دوسرے کی یہ خامیاں نظر آنے لگتی ہیں اور یوں ایک تعصب جنم لینے لگتا ہے جو مد مقابل کی طرف سے نفرت کا سبب بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ حالات جنم لیتے ہیں جس کا مظاہرہ اکثر اوقات ہمارے ملک میں دیکھنے میں آتا ہے۔ کراچی کے حالیہ حالات اسی ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک خود کو لسانی اور نسلی طور پر برتر بلکہ عظیم سمجھتا ہے اور دوسرے کی نسل بلکہ زبان میں بھی دل کھول کر نقص نکالے جاتے ہیں اور یہی اختلافات اور اعتراضات بڑھ کر فسادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی ذہنیتیں دشمن کا آلہ کار بننے فخر محسوس کرتی ہیں۔

بلوچستان کے حالات بھی ہمارے سامنے ہیں نسلی تعصب کو مسلسل ہوا دی جا رہی ہے دوسرے صوبوں کے لوگ جو نسل در نسل بلوچستان میں آباد ہیں نہ خود کو بلوچی کہلانے پر آمادہ ہیں اور نہ ہی بلوچی انہیں اپنانے پر آمادہ ہیں۔ یہی حال پنجاب، سندھ اور سرحد کا ہے انہی صوبوں کے ڈومیسائل رکھنے کے باوجود ہم

انہیں اپنانے پر تیار نہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اپنے علاقے کو چھوڑ دیا جائے اور وہاں سے تعلق ختم کر دیا جائے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کو اپنایا مکہ کو فتح بھی کیا تو وہاں واپس جا کر نہ بسے لیکن مکہ کی محبت آپ کے دل میں رہی۔ اپنے شہر اپنے گاؤں سے محبت فطری ہے اپنی نسل پر فخر بھی غیر فطری نہیں لیکن دوسرے کو کمتر سمجھنا اور اسکی تحقیر کرنا ہرگز فطری نہیں بلکہ ناجائز ہے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ باہر کی دنیا میں ہمارا تعارف صرف پاکستان ہے اگر ہم اس حقیقت کو اپنی نجی زندگیوں کا حصہ بنالیں کہ ہم سب حضرت آدم علیہ السلام کے قابل فخر بیٹے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار ہیں ہم مسلمان ہیں تو یقیناً ہم اس تعصب کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکیں گے. لیکن مسئلہ یہ ہے کہ علاقائی کے ساتھ ہم مذہبی تعصب میں بھی بری طرح مبتلا بلکہ جکڑے ہوئے ہیں یعنی نہ ہم قومی یکجہتی میں مثالی ہیں نہ مذہبی رواداری میں. ہم اگر پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور کشمیری ہیں تو ہم شیعہ، سنی، دیوبندی اور بریلوی بھی ہیں۔ یوں طرح طرح کے تعصبات نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا نہ ہم نے بحیثیت قوم خود کو مضبوط کیا اور نہ ہی ہم نے ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ ہمارے بہت سارے فیصلے علاقائیت کی نظر ہو جاتے ہیں این ایف سی ایوارڈ پر اتفاق رائے خوش آئند ہے لیکن عملی اقدامات کی ضرورت اس سے بڑھ کر ہے۔ حکومتی سطح پر بھی اور عوامی اور سیاسی سطح پر بھی۔ ہمارے آج کل کا سب

سے طاقتور ذریعہ میڈیا ہے اگر ہم اسے موثر طور پر استعمال کریں تو میرے خیال میں ہم کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اگرچہ ہمارا نیوز میڈیا ایک مثبت کردار ادا کر رہا ہے تاہم اسے اپنی انٹرٹینمنٹ میں اس چیز کو اشد طور پر شامل کرنا ہوگا۔

ہمارے دانشوروں کو عوامی سطح پر قومی یکجہتی پر زور دینا ہوگا۔ بحیثیت استاد میں طلبا کی سطح پر اس چیز کی شدید کمی محسوس کرتی ہوں کہ ہماری آج کی نسل اپنی تاریخ سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے ہمیں نہ صرف یہ سب کچھ نصاب میں شامل کرنا ہوگا بلکہ ایسی ہم نصابی سرگرمیوں کو بھی سکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک لازمی قرار دیا جائے کہ طلبا کسی علاقائیت کے تربیت لے ہی نہ سکیں اور نہ ہی ان ہاتھوں میں کھلونا بن سکیں جو ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ ہمیں اپنی نئی نسل میں یہ سوچ راسخ کرنا ہوگی کہ ہماری بقا صرف اور صرف قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری میں ہے۔ مجھے محسن احسان کا ایک شعر بہت پسند ہے اور دل چاہتا ہے کہ اسے اپنے ملک کی ہر دیوار پر لکھوا لوں شاید میری قوم کے غیر ضروری احساس تفاخر میں مبتلا گروہ اس سے کچھ سیکھ کر قوم اور ملت کا مطلب سمجھ جائیں اور اس بات کا ادراک کر لیں کہ طاقت، قوت اور عزت اتفاق اور قومی اتحاد میں ہے بصورت دیگر ان کا وجود کھوکھلا اور دیمک زدہ ہے۔ محسن نے متنبہ کیا

یہ تعصب تجھے گھن کی طرح کھا جائے گی
اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر

دو قومی نظریہ۔۔۔ قوم مذہب سے ہے

712 عیسوی کا سال تھا جب سترہ سالہ نوجوان محمد بن قاسم کی فوج نے تجربہ کار راجہ داہر کی فوج کو ان کے اپنے ہی ملک میں شکست دیکر یہاں اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ محمد بن قاسم کے حسن انتظام اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر سندھ کے بہت سارے خاندان مسلمان ہو گئے روایت یہ بھی ہے کہ راجہ داہر کا ایک بیٹا بھی مسلمان ہو گیا۔ یوں بقول قائداعظم برصغیر میں دو قومی نظریے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ ظاہر ہے جس شخص نے بتوں کی پرستش کو چھوڑ کر ایک اللہ کو اپنا معبود مان لیا تو اس نے ان تمام رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کو چھوڑ دیا جس پر وہ عمل پیرا تھا۔ اس نے اس نام تک کو ترک کر لیا جو اسے پیدائش پر دیا گیا تھا۔ یہی کچھ برصغیر میں ہوا اور ایک نئے نظریہ زندگی نے جنم لے لیا جو موجود طرز زندگی سے بالکل مختلف تھا۔

اسلام اور ہندومت دو مختلف سمتوں چلتی ہوئے دو قوموں کی صورت میں موجود رہے۔ مسلمانوں نے محمود غزنوی اور قطب الدین ایبک سے لیکر تا وقت اپنا تشخص برقرار رکھا کیونکہ ان کے پاس ایک دین، مذہب اور اصول تھے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب محض رسوم و رواج کا ایک مجموعہ ہی ہے وہ ہر اس چیز کو معبود بنا

دیتے ہیں جو انکے فائدے یا نقصان کا باعث بنے۔ اسلام مساوات کا داعی ہے جسمیں کالے کو گورے اور عربی کو عجمی پر برتری نہیں۔ یہاں ہر انسان اپنے اعمال کی بنا پر عزت یا ذلت کا حقدار ہے۔ جبکہ ہندو مت میں عزت و ذلت خاندان اور ذات پات کی بڑائی پر ہے۔ صدیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب اور رہن سہن پر مکمل طور پر قائم رہے۔ البیرونی اپنی مشہور کتاب، کتاب الہند میں 1001 میں لکھتے ہیں ہندوستان میں ہندو اور مسلمان صدیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود دو الگ الگ دھاروں کی طرح اپنی اپنی راہ چل رہے ہیں جو کبھی کبھی ایک دوسرے کو چھو تو لیتے ہیں لیکن مدغم نہیں ہوتے۔ البیرونی کے صدیوں بعد بھی یہی صورتحال قائم رہی۔ اور ہندو اور مسلمان اپنے اپنے طرز زندگی پر قائم رہے۔ دراصل یہ معاملہ دو مذاہب کا تھا۔ سر سید احمد خان جو ایک عرصہ تک ہندو اور مسلمان کو ایک ہندوستانی قوم کے افراد سمجھتے رہے لیکن اردو ہندی تنازعے کے بعد نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنے خیالات بدلے بلکہ بڑی شدت سے ہندو اور مسلمان کو پہلی بار دو قوموں کے طور پر پیش کیا اور اعتراف کیا کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے کیونکہ ان کے مذہب اور زندگی گزارنے کا طریقہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ سید امیر علی اور کئی دوسرے اکابرین نے اس نظریے کی بڑی مدلل اور منطقی انداز میں تشریح کی۔ اقبال کی آواز قوم مذہب سے ہے نے برصغیر کے مسلمانوں کے شعور کو مزید جلا بخشی۔ قائد اعظم نے اس نظریے کو سیاسی طور پر اتنے مضبوط انداز میں پیش

کیا کہ انگریز کو پاکستان کے مطالبے کے سامنے ہار ماننا ہی پڑی۔ قائد نے کہا مسلمان اقلیت نہیں وہ قوم کی ہر تعریف کے مطابق ایک قوم ہیں۔۱۹۴۷ میں قائد نے کہا کہ ہندوستان کبھی ایک ملک نہیں رہا اور نہ ہی اس کے رہنے والے ایک قوم۔ یہ برصغیر ہے جس میں بہت ساری قومیں بستی ہیں جن میں مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔

آج جب ہم ایک آزاد ملک میں آزاد شہری کی حیثیت سے رہ رہے ہیں تو کچھ ناشکرے اور احسان فراموش لوگوں کی دو قومی نظریے پر تنقید بھی سنائی دے دیتی ہے اور چند لوگوں سے منسوب اس بیان کی طرح کہ بنگلہ دیش کے قیام نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ وہ بدقسمت لوگ ہیں جو تاریخ سے بالکل بے بہرہ ہیں ورنہ وہ جانتے کہ چوہدری رحمت علی نے پاکستان کے ساتھ ساتھ بنگال میں بانگ اسلام کے نام سے مسلم مملکت کا منصوبہ پیش کیا تھا اور ابھی بھی ان کا ایک منصوبہ تشنہ تکمیل ہے یعنی حیدر آباد دکن میں عثمانستان کا قیام۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں پاکستان سے زیادہ مسلمان رہ گئے وہ بھی اپنا ریکارڈ اگر درست کر لیں تو بہتر ہوگا کہ اس وقت مغربی اور مشرقی پاکستان میں مسلمان ہندوستان سے دوگنا تھے۔ اور جو لوگ پاکستان نہ پہنچ سکے وہ بھی مجبوراً وہاں رہ گئے اور آج بھی کوئی اچھی زندگی نہیں گزار رہے۔ وہ لوگ اب بھی ہندوستان میں دو قومی نظریے کے ثبوت کے طور پر

اپنے مذہب اور طرز زندگی پر قائم ہیں وہ آج بھی عید میلاد النبی اور عاشورہ محرم مناتے ہیں دیوالی اور ہولی اب بھی ان کے مذہبی تہوار نہیں ان کے مہینے آج بھی محرم، صفر اور ربیع الاول ہیں، ماگھ اور جیٹ نہیں اگرچہ وہ ان ناموں کو استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا کیلنڈر ہجری ہے ہندی نہیں لباس کے معاملے میں بھی وہ ہندوں سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ اور تو چھوڑیے طرز تعمیر ہی کو لیجئے جہاں روایتی طور پر ہندو تنگ اور ہوا بند گھروں میں رہتے ہیں وہیں مسلمان کھلے اور ہوادار گھر بناتے ہیں ان کے روایتی برتن اور ان کے رسم و رواج آج بھی یکسر مختلف ہیں۔ پیدائش، شادی اور موت ہر ہر طریقہ آج بھی ایک دوسرے سے جدا ہے۔ ماڈرن ازم کے نام پر رسم ورواج کے ہندو ملغوبے کو اگرچہ میڈیا سے دیکھ دیکھ کر ہم میں سے بھی کچھ لوگ اپنانے پر تلے ہوئے ہیں لیکن سنجیدہ طبقوں میں یہ سب کچھ آج بھی ناپسندیدہ ہے۔ جو لوگ قوم کو مذہب سے الگ کرکے اس نظریے کو باطل ثابت کر رہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قومیں بنتی ہی مذہب کی بنیاد پر ہیں ورنہ آج امریکہ مسیحی صدر کی شرط نہ رکھتا اور اسرائیل میں بھی مسلمان صدر ہونا ممکن ہوتا۔ لہٰذا اس انتہائی نامعقول نظریے پر بجائے فخر کے ندامت ان کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ بھارت میں مسلمان صدر بن جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ اب وہاں دو قومیں نہیں بستی گجرات، بہار اور احمد آباد بھی بھارت ہی کے شہر ہیں جہاں مسلمان کے خون کی کوئی قیمت نہیں اور انہیں ان کی مسلمانی کی شدید سزا دی جاتی ہے۔

گائے کی تقدیس کے لیے اب بھی انہیں مجبور کیا جاتا ہے۔ لہذا یہ سوچ لینا کہ دو قومی نظریہ کوئی فرسودہ نظریہ ہے میرے خیال میں یہ خیال ہی فرسودہ ہے۔ دو قومی نظریہ آج بھی اتنا ہی جواز رکھتا ہے جتنا آج سے سوا تریسٹھ سال پہلے رکھتا تھا۔ دو قومی نظریے نے ہی برصغیر کے عوام کو وہ توانائی عطا کی جس نے پاکستان کی بنیاد رکھی اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی پاکستان کے دشمن جب پاکستان کے خلاف سازش کرتے ہیں تو سب سے پہلے جو بھارت سے محبت اور دوستی کا ثبوت دینے کی کوشش اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ ہمارا کلچر یعنی ثقافت ایک ہے اور اس کے لیے چھوٹی چھوٹی علاقائی مماثلتوں کا سہارا لیا جاتا ہے جیسے پتنگ بازی۔ اب اگر سوچا جائے تو پتنگ بازی تو چین میں بھی ہوتی ہے چائے پاکستان سمیت پوری دنیا میں پی جائے تو کیا ساری دنیا کو ایک ہی ملک تصور کر لیا جائے گا۔ بات آج بھی وہی ہے جو البیرونی نے ہزار سال پہلے کہی تھی کہ مسلمان اور ہندو دھارے ایک دوسرے کو چھوتے ضرور ہیں آپس میں مدغم نہیں ہوتے۔

ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کے معاہدے یا دوستی کی کوشش میں کوئی حرج نہیں لیکن ایک تو اپنی غیرت ملی کی قیمت پر نہیں یعنی اتنا نہ جھکا سر کو کہ دستار سر سے گر پڑے اور دوسرے اپنی قومی شناخت کی قیمت پر بھی نہیں۔ آخر میں میں اس اہم ترین تقسیم کا ذکر کرونگی جو رب کائنات نے کی ہے یعنی

مسلمان ایک ملت ہے اور غیر مسلم دوسری ملت۔ اور یہی حقیقت بر صغیر میں بھی ہے
کہ مسلمان ایک قوم اور ہندو دوسری قوم ہے۔

بھارت میں بنیادی انسانی حقوق اور عالمی برادری کی خاموشی

بھارت اپنی منجملہ دوسری خصوصیات اور اعزازات کے علاوہ ایک یہ اعزاز بھی رکھتا ہے کہ اس ملک میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی اس دھڑلے سے ہوتی ہے کہ اس سب کچھ کو مذہبی اور قانونی تحفظ حاصل ہے اور یوں یہ سب کچھ بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا جارہا ہے۔ سلسلہ تو یہ سالوں بلکہ صدیوں کا ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ عالمی رائے عامہ میں وہ شور و غوغا نہیں اٹھتا جو کسی مسلمان ملک میں کسی معمولی سے واقعہ کو اچھال کر اٹھتا ہے۔ اگرچہ یہ خلاف ورزیاں امریکہ اور برطانیہ میں بھی نسلی تعصب ہی کی صورت میں سہی ہوتی رہتی ہیں لیکن بھارت جیسے ملک میں یہ ان کے مذہب اور معاشرے کا حصہ ہے اور انہیں روکنے کی بے معنی سی عدالتی فیصلوں کے علاوہ کوئی کوشش نہیں ہوتی یعنی حکومتی یا عوامی سطح پر اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی اور نہ ہی طاقتور ہندو لابی ان معاملات کو بین الاقوامی طور پر آگے آنے دیتی ہے۔ تاہم پھر بھی حیرت انگیز طور پر ہی سہی ایمنسٹی انٹر نیشنل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر لیری کوکس نے 18 نومبر 2009 کو صدر اوبامہ کو ایک خط لکھا جسمیں اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ من موہن سنگھ سے ملاقات میں بھارت میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا نوٹس لیا جائے۔ لیری کوکس نے اپنے خط میں جن اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اس میں کچھ فوج کی

طرف سے معاملات میں خرابی پیدا کرنے سے متعلق ہیں جبکہ کچھ مذہبی طور پر محفوظ جرائم ہیں جو بڑے تسلسل سے بھارت میں جاری و ساری ہیں اور خود کو بڑا سیکولر سمجھنے والا بھارت ان حالات کو بدلنے پر آمادہ بھی نہیں اگرچہ اس کی عدالتیں ان سب کچھ کے خلاف فیصلے بھی دے رہی ہیں لیکن دراصل وہ فیصلے بھی تبدیلی کی خواہش کے بغیر ہوتے ہیں لہذا ان کا ہندو معاشرے پر کچھ اثر نہیں ہوتا ورنہ ہندو اچھوت تاریخ کا حصہ بن چکے ہوتے لیکن وہ اب بھی موجود ہیں اور پس رہے ہیں دلت یعنی زمین میں دبے ہوئے پسے ہوئے ٹوٹے ہوئے کے نام سے ہریجن یعنی نعوذ باللہ خدا کے بچوں کا نام پانے کے بعد بھی وہ پسے ہوئے ہی لوگ ہیں آج بھی وہ مندروں میں جانے کے حقدار نہیں اونچے درجے کے ہندو آج بھی ان کے خدا بنے بیٹھے ہیں دو سو ملین ہونے کے باوجود بھی یہ لوگ ذلیل و خوار ہیں اور کسی عزت کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ تنگ آکر اگر کوئی دلت اپنا مذہب تبدیل کر لے تو اس کا جینا مزید حرام کر دیا جاتا ہے۔ ادواسی بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں اور اب بھی یہ لوگ پہاڑوں میں رہنے پر مجبور ہیں کیونکہ نیچے آنے پر بھی انہیں انسانیت کے درجے تک آنے نہیں دیا جاتا۔ تعلیم کے دروازے آج بھی ان کے لئے بند ہیں اور پچاس ملین ادواسیوں کے صرف گیارہ فی صد افراد خواندہ ہیں یاد رکھیے یہ خواندگی کی شرح ہے پڑھے لکھے افراد کی نہیں حالانکہ یہ بھارت کی آبادی کا سات عشاریہ پانچ فی صد ہیں۔ اگر ایک ملک میں اکثریتی مذہب والوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے تو اندازا کیا جا

سکتا ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ کونسا رویہ رکھا جاتا ہوگا۔ تحریک پاکستان کے بارے میں واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بھی پڑھا کہ مسلمانوں کو پانی پلانے کے لئے ایسے ڈبے استعمال کئے جاتے تھے جسے ایک لمبے بانس سے باندھ دیا جاتا تھا تاکہ دور سے مسلمانوں کو پانی پلایا جائے بلکہ مسلم اور ہندو پانی کے گواہ آج بھی موجود ہیں۔ انداز شاید بدلے ہو حالات آج بھی وہی کے وہی ہیں۔ شبانہ اعظمی جیسی نام کی مسلمان فنکارہ کو بھی ممبئی میں گھر لینے کا حق نہیں دیا جاتا۔ وجہ صرف یہ کہ اسکا نام مسلمانوں کا ہے۔ گجرات، احمد آباد، بہار اور کئی دوسرے علاقے اکثر مسلمانوں کے خوں سے رنگے جاتے ہیں کیونکہ ہندو مذہب یا بھارتی ہندو، ہندو کے علاوہ ہر انسان کو ملیچھ قرار دیتا ہے لہذا اس غیر انسانی رویے کو مذہبی جواز دے کر اس کے خلاف بولنے والوں کے منہ بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اوبامہ کو لکھے گئے خط میں 1984 میں 3000 ہزار سکھوں کے قتل عام کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جبکہ 2002 میں 2000 مسلمانوں کو گجرات میں شہید کیا گیا اور وجہ یہ بتائی گئی کہ مسلمانوں نے ایک ٹرین پر حملہ کرکے 59 ہندو مار دیئے تھے جبکہ یہ بات ثابت شدہ بھی نہ تھی کہ گجرات کے ہمیشہ سے زیر عتاب صوبے کے مسلمان ایسی کوئی کاروائی کر سکتے تھے۔ بھارت اپنے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود اپنے عوام کو بنیادی انسانی حقوق تک نہیں دیتا۔ 1984 میں بھوپال میں یونین کاربائیڈ کے کیمیکل پلانٹ سے گیس کے اخراج کا جو خطرناک حادثہ ہوا تھا اسکے متاثرین آج تک اپنے اور اپنے بچوں کے

معذور جسموں کے ساتھ اپنا حق لینے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ تو بھارت میں انسانی حقوق کی روزمرہ کی خلاف ورزیاں ہیں جنھیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔

یوں تو بھارت خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اسکی حکومتیں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتیں ہیں لیکن ان منتخب شدہ حکومتوں کی حفاظت فوج ہی کے ذریعے کی جاتی ہے اور اسکے لئے فوج کو بھارت کے ظالمانہ قانون Armed Forces Special Power Act کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بھارت میں درجن بھر سے زیادہ چلنے والی آزادی کی تحریکوں کو رکوانے کے لئے ہی یہ ظالمانہ قانون بنایا گیا ہے جس کے تحت فوج کو ایسے خصوصی اختیارات دیئے گئے ہیں کہ شاید کسی مارشلائی ملک کی فوج کو بھی حاصل نہ ہو۔ اس قانون کو بھارتی پارلیمنٹ سے 11 ستمبر 1958 کو منظور کیا آج یہ قانون شمال مشرقی ریاستوں اروناچل پردیش، منی پور، آسام، مگھالیا، میزورام، تری پورہ اور ناگالینڈ میں رائج ہے۔ جولائی 1990 سے جموں کشمیر بھی اس بے رحم قانون کی زد میں ہے جس کے تحت فوج کو جو اختیارات حاصل ہیں متاثرہ علاقے کے لوگوں کو ان مظالم کے خلاف اپیل کا حق بھی حاصل نہیں۔ اس قانون کی رو سے فوج کو جو ماورائے قانون اختیارات حاصل ہیں ان کی رو سے فوج پانچ یا پانچ سے زیادہ افراد کے اجتماع پر گولی چلا سکتی ہے اور بغیر وارنٹ کسی کو بھی کہیں سے بھی گرفتار کر سکتی ہے۔

کے خلاف جہاں بھارت کے ان علاقوں Armed Forces Special Power Act کے لوگ غم و غصہ میں رہتے ہیں وہیں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمشنر نے اس غیر انسانی قانون کو نوآبادی دور کا قانون کہا اور Novnethem Rillay ہیومن رائٹس واچ نے بھی اسے ختم کرنے کی سفارش کی۔

UCIRF-US Commission on International Religious Freedom کے مطابق بھی بھارت ان ممالک میں شامل ہے جو اپنی مذہبی اقلیتوں کی حقوق کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ہیری کوکس کا خط یا مختلف اداروں کی طرف سے بھارت کو بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت میں ناکامی کا ذمہ دار قرار دیئے جانے کے باوجود عالمی میڈیا بلکہ ہمارا اپنا میڈیا بھی اس سب کچھ کو اجاگر کرنے میں ناکام کیوں رہتا ہے۔ دراصل اس میں مغرب کا تعصب اور ہماری اپنی کمزوری دونوں شامل ہیں۔ مسلمانوں کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دینے کی مہم میں جتے ہوئے مغرب کے سامنے بھارت کے حالات بھی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قوم کا ایک بڑا حصہ رات کھلے آسمان تلے سڑکوں پر سوتا ہے لیکن وہ صرف کمیشن اور خطوں پر اکتفا کیے رکھتا ہے۔ جبکہ بھارت قراردادوں، کمیشنوں اور یاداشتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے وہ سب ہی جانتے ہیں۔ وہ جو کشمیر کے بارے میں قراردادوں کے ساتھ پچھلے باسٹھ سالوں سے کر رہا ہے وہی اس کے کردار کو عیاں کر دیتا ہے۔ عالمی برادری اور اقوام متحدہ کو اس کا پچھلا

ریکارڈ سامنے رکھتے ہوئے کچھ عملی اقدامات بھی کرنا ہونگے تب ہی شاید بھارت میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی رک سکے اور حالات کچھ بہتر ہو سکیں ورنہ بھارت سرکار سے کسی بہتری کی امید نہیں۔

دفاعی بجٹ اور ملکی دفاع

بجٹ 2010-2011 پیش کر دیا گیا اور اسکی تمام تفصیلات بھی عوام کے سامنے آچکی ہیں ہمیشہ کی طرح نئے ٹیکس اور کچھ ریلیف بہر حال مہنگائی میں دبے ہوئے عوام مزید مہنگائی کے خوف میں مبتلا سوچتے ہیں کہ یہ سال کیسے گزرے گا اور مزید کتنے منی بجٹ آئیں گے۔ لیکن بجٹ کا ایک حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جو ہر سال موضوع بحث ضرور بنتا ہے اور بجا بنتا ہے اور وہ ہے دفاعی بجٹ۔ بجا موضوع بحث بننے کی وجہ یہ ہے کہ عوام بجا طور پر توقع کرتے ہیں کہ بجٹ میں ترقیاتی کاموں اور ریلیف پر زیادہ توجہ دی جائے لیکن اسے پاکستان کی بدقسمتی کہیے کہ اسکے پڑوس میں ایک ایسا شر پسند پڑوسی موجود ہے جس کے شر سے یوں تو اسکا کوئی پڑوسی بلکہ اس کے اپنے باشندے بھی محفوظ نہیں لیکن پاکستان تو خاص کر اس کے نشانے پر رہتا ہے کیونکہ پاکستان کو تو اس نے روز اول سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ بھارت کو ایک اور خبط یہ بھی ہے کہ اسے علاقے کا چوہدری مان لیا جائے اور باقی ممالک اسکی من مانیوں کے آگے چپ رہیں اور سر تسلیم خم کرتے رہیں اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنی دفاعی طاقت کو مستقل بڑھائے چلا جا رہا ہے جس کے لیے اسے اسلام اور مسلمان مخالف دنیا کا مسلسل تعاون بھی حاصل ہے۔ اب تو علاقائی طاقت سے آگے بڑھ کر وہ عالمی طاقتوں میں جا کھڑا ہونے کی کوشش میں

مصروف ہے اور بظاہر عالم اسلام سے بہتر تعلقات کی منہ زبانی باتیں کرنے والا امریکی صدر اسلام کے ایک اور دشمن کو ابھرتی ہوئی عالمی طاقت قرار دیتا ہے اور ہیلری تو صاف صاف اسے سلامتی کونسل کا ممبر بنانے کی حمایت کر رہی ہے۔ اب جبکہ پاکستان کے تمام تجزیہ کاران ساری تفصیلات سے بخوبی آگاہ ہیں پھر بھی وہ دفاعی بجٹ میں اضافہ کرنے پر خفا اور ناراض ہیں۔ مجھے بھی اس بات سے اتفاق ہے کہ صحت اور تعلیم، خوراک اور رہائش ہر شہری کا بنیادی حق ہے لیکن حفاظت کا انتظام بھی یقیناً انتہائی ضروری ہے پاکستان کے وفاقی بجٹ میں دفاع کا حصہ 442.173 ارب روپے رکھا گیا جو اعداد و شمار کے لحاظ سے پچھلے سال سے 5 فیصد زیادہ ہے۔ اور افراط زر کی شرح جو پچھلے سال 12 فیصد رہی اس سال بھی رہی تو اضافے کی یہ اوسط بھی نہیں رہے گی۔ پاکستانی دفاعی بجٹ کے مقابلے میں اگر بھارتی دفاعی بجٹ کو دیکھا جائے تو فروری میں پیش ہونے والے بجٹ میں دفاع کی مد میں 1.47 ٹریلین روپے یعنی 32 ارب ڈالر رکھے گئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس سب تیاری کا بڑا حصہ پاکستان کے خلاف ہوتا ہے ایک سال پر کیا موقوف بھارت کے عزائم تو ہمیشہ غاصبانہ رہے ہیں اگر پچھلے 5 سال کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو بھی پاکستان کا دفاعی بجٹ بھارت کے دفاعی بجٹ کے مقابلے میں انتہائی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے یہ اعدا و شمار کچھ اسطرح سے ہیں سال 2003-04 میں بھارت کا بجٹ 14 ارب ڈالر جبکہ پاکستان کا 2.75 ارب ڈالر رہا۔ سال 2004-05 میں بھارت کا بجٹ 16.73 جبکہ

پاکستان کا 3.3، سال 2005-06 میں یہ تناسب بھارت اور پاکستان کے لیے بالترتیب 18.04 اور 4.1 ، 2006-07 میں 19.77 اور 4.2، سال 2007-08 میں 21.33 اور 4.6 ، سال 2008-09 میں 26.4 اور 4.35 ارب ڈالر رہا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بھارت بڑا ملک ہے تو اس کے لیے عرض یہ ہے کہ بھارت بڑا ملک ضرور ہے لیکن اسکے جنگی تیاری کا نوے پچانوے فیصد حصہ پاکستان کے خلاف ہوتا ہے۔ اب اگر پاکستان اپنے دفاع سے غافل ہو جائے یا سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق دفاعی بجٹ کو کم سے کم رکھے تو کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بھارت بھی ایسا کرلے گا اور پاکستان کے خلاف اپنے مکروہ عزائم ترک کر دیگا۔ جبکہ پاکستان کو نہ صرف مشرقی سرحد پر بھارت سے مقابلہ کرنا ہے بلکہ ملک کے اندر بھی بھارت کی لگائی ہوئی آگ کو بجھانا ہے جسکی دہشت گردی اور مداخلت کے یقینی ثبوت سوات، بلوچستان اور افغانستان سے ملحقہ علاقوں میں مل چکے ہیں دہشتگردی کے خلاف پرائی جنگ جو ہمارے ملک میں بھڑک چکی ہے جس کی وجہ سے پاکستان پر دہشت گرد ہونے کا لیبل چسپاں کیا جا رہا ہے دراصل بھارت کی مدد کے بغیر ممکن ہی نہیں بھارت کے دفاعی بجٹ سے متوقع بلکہ یقینی طور پر اس مد میں بھی بہت کچھ خرچ کیا جا رہا ہے۔ اب اگر مد مقابل کی طاقت کا یہ عالم ہو اور ہم اعداد و شمار کے گورکھ دھندے میں پڑے رہیں تو کیا خود ہم اپنی شکست کا بندوبست نہیں کرینگے۔

جنوبی ایشیا دنیا کے انتہائی آبادی والے علاقے میں سے ہے یہاں کی زیادہ تر آبادی غریب ہے یقیناً اسلحے سے زیادہ انکی ضروریات دوسری ہیں لیکن ان سب حالات کو نظر انداز کرکے بھارت نے اسلحے کی دوڑ لگا رکھی ہے اور دنیا میں اسلحے کا دوسرا بڑا درآمد کنندہ ہے اور مسلسل اپنے دفاعی بجٹ میں اضافہ کرتا جارہا ہے۔ جیسے GNPاورGDP

پیچیدہ مسائل میں پڑے بغیر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا دشمن ہمیں نقصان پہنچانے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور ہم اپنا کتنا دفاع کر سکتے ہیں جسطرح گھر کو محفوظ بنانے کے لیے ہم گھر کی چاردیواری کو مضبوط بناتے ہیں کمروں کی دیواروں کی بنیادیں خرچے کا خیال کیے بغیر گہری کھودتے ہیں چاہے گھر کے اندر سامان ضرورت ہو یا نہ ہو اسکی تزئین وآرائش تو بہت بعد کی بات ہے۔ بالکل اسی طرح ملک کی حفاظت بھی اپنے قومی وجود اور بقاکے لیے ضروری ہے ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ دفاعی سازوسامان مہنگا بھی ہے اور ہم اس میں خود کفیل بھی نہیں بلکہ تقریباً مکمل طور پر دوسروں پر انحصار کرتے ہیں تو زیادہ دفاعی بجٹ کی گولی کڑوی سہی زندگی بچانے کے لیے نگلنا پڑے گی اور دنیا سے یہ بات منوانا پڑے گی کہ وہ بھارت کو مجبور کرے کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات کم کرے تاکہ اس کے پڑوسیوں کو بھی اپنے عوام کا پیٹ نہ کاٹنا پڑے جب تک بھارت اپنے مقاصد بدل کر درست نہیں کرتا تب تک خطے کے حالات میں تبدیلی ممکن نہیں۔

رہی بات پاکستان میں صحت، تعلیم، خوراک جیسی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی تو حکومت کو غیر اہم غیر ترقیاتی اخراجات انتہائی کم کرنا ہونگے۔ تعیش پسندی کی جگہ سادگی کو دینی ہوگی اور اسکی ابتدا حکومتی سطح پر کرنا ہوگی تو ہمارے بہت سے مسائل کم اور وسائل زیادہ ہو سکتے ہیں تب دفاعی اخراجات میں کمی کے غیر دانشمدانہ مطالبات بھی نہ کرنا پڑیں گے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غریب ملک ہو کر دفاع پر اتنا کیوں خرچ کرتے ہیں تو انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غریب بھی گھر کے گرد دیواریں بناتا ہے تاکہ حفاظت کا بندوبست مکمل رہے لہذا ہمیں تنقید کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ جب بھی دشمن کو ہمارے دفاعی نظام میں کوئی رخنہ نظر آیا وہ ہم پر حملہ کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگائے گا اور جب تک ہم مضبوط رہیں گے وہ ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات نہیں کرے گا۔

آئی ایس آئی اور اہل مغرب کا واویلا

دشمن جب کسی قوم اور ملک پر فتح حاصل کرنا چاہے تو اس کے قلب پر وار کرتا ہے اور یہی حال پاکستان کے دشمنوں کا ہے جب بھی اسے اپنی شکست نظر آنے لگتی ہے وہ مسلح افواج اور آئی ایس آئی کو نشانہ بناتے ہیں اور مختلف اطراف سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس بار بھی وہ انتہائی احمقانہ انداز سے ایک تعلیمی ادارے کی رپورٹ کی صورت میں حملہ آور ہوئے ہیں ایسا نہیں ہے کہ لندن سکول آف اکنامکس کے ہاورڈ یونیورسٹی کے فیلو Waldman Matt کی کوئی سٹر ٹیجک یا دفاعی اہمیت ہے تاہم اسے دشمن کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے اور تمام پاکستانیوں کو یقین ہے کہ یہ رپورٹ مغربی ممالک کی نیت کی غماز ہے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ آئی ایس آئی طالبان کے مالی اور تیکنیکی مدد کے ساتھ ساتھ اسلحہ بھی فراہم کر رہا ہے۔ نامعلوم طالبان رہنماؤں کے انٹرویوز کا ڈھونگ رچا کر رپورٹ کو جاندار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے نو طالبان لیڈرز کون تھے افغانستان کے انتہائی مغرب دشمن علاقوں میں ان خاص لوگوں تک مصنف کی پہنچ کیسے ممکن ہوئی یہ باتیں ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں۔ صدر پاکستان کی طالبان سے ملاقات کا بھی بے بنیاد ذکر کیا گیا ہے۔ آئی ایس آئی کی طالبان کی سپریم کونسل کے اجلاسوں میں شرکت بھی رپورٹ میں مذکور ہے۔ رپورٹ کے مندرجات تو اب تک سب کو معلوم ہو چکے ہیں لیکن اس

کے محرکات ضرور قابل غور ہیں اور ہاں یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ اگر طالبان کو واقعی پاکستان سے مدد مل رہی ہے تو کیا اب اس مدد کی ضرورت ختم ہو گئی ہے جو وہ خفیہ مدد دینے والے مددگار کا راز فاش کر رہے ہیں طالبان بھی جانتے ہیں کہ انہیں اپنی بقا کے لیے ابھی یہ جنگ لڑنی ہے اور اگر پاکستان حقیقت میں مدد کر رہا ہے تو کیا اس کے بعد بھی وہ ان کی مدد جاری رکھے گا یا رکھنے کی پوزیشن میں ہوگا کہیں ایسا تو نہیں کہ وسط ایشیائی توانائی کے ذخائر تک پہنچنے کے لیے علاقے میں اپنے قیام کا جواز بنانے کے لیے مغربی خفیہ ایجنسیاں ان کی مدد کر رہی ہوں اگر یہ بات اہل مغرب کو دور کی کوڑی محسوس ہو رہی ہو تو بھی اس کے امکانات آئی ایس آئی کے طالبان کی مدد کرنے سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے الزامات اب مغرب کا معمول بن چکا ہے اس سے پہلے ایڈمرل مائیک ملن یہ الزام لگا چکے ہیں کہ پاکستان ڈبل گیم کھیل رہا ہے جنرل ڈیوڈ پیٹریاس بھی آئی ایس آئی پر طالبان کی مدد کا الزام لگا چکے ہیں۔ تاہم یہ رپورٹ ایک ایسے وقت میں سامنے آئی جب امریکہ افغانستان میں بدترین حالات سے دو چار ہے جب صرف چند ہفتوں میں افغانستان میں تیس اتحادی فوجی مارے گئے۔

امریکہ اسوقت افغانستان میں ستر بلین ڈالر سالانہ خرچ کر رہا ہے اب تک ہزار سے زیادہ امریکی لاشیں لے جا چکا ہے جبکہ اسکے اتحادی لاشوں کی تعداد بھی ہزار کے قریب ہے۔ ایسے میں دوسروں پر الزام دھر دینا بہت آسان راہ فرار ہے اور محسوس یہی ہو رہا ہے کہ

امریکہ اور اسکے مغربی اتحادی نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔ پاکستان، آئی ایس آئی اور پاک فوج سے خوف زدہ یہ ملک اور آئی ایس آئی سے کئی گنا زیادہ بجٹ اور وسائل رکھنے والی ان کی خفیہ ایجنسیاں اپنے تمام تر مصائب اور ناکامیوں کا ذمہ دار اس ادارے کو قرار دیتی ہیں جس کے وسائل ان کے مقابلے میں بہت کم اور مسائل بہت زیادہ ہیں جس کو بیک وقت سی آئی اے، ایم آئی 5-، را، رام اور موساد بلکہ کے جی بی کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے اگر ان مقابلوں کے بعد وہ ان کی آنکھوں میں دھول بھی جھونک دے تو ان ملکوں کو باعزت طریقے سے اپنی ہار مان لینی چاہئے۔ لیکن بات یہ ہے کہ آئی ایس آئی کسی بھی مقصد کے لیے اپنے لوگوں کی جان لینے کی سوچ گا بھی نہیں اور وہ دہشت گردی کی اس نام نہاد اور مسلط کردہ جنگ میں اپنے کئی اہلکاروں کی قربانی دے چکا ہے اس کے دفاتر کو حتیٰ کہ اسکی بسوں تک کو نشانہ بنایا گیا اور طالبان ان حملوں کی ذمہ داری بھی قبول کرتے رہے۔ اس سب کچھ کے بعد بھی اس قسم کی لایعنی رپورٹس شائع کرنے کا سبب کچھ اور ہے یہ جس کو خود سمجھتے ہیں۔ اصل میں افغانستان پر حملے کے وقت امریکہ اور اس کے حواریوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انہوں نے سوویت یونین کو تڑوانے کے بعد جس افغانستان کو بے یار و مددگار چھوڑا تھا وہاں انہیں اس قدر شدید مزاحمت اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا اب جب وہاں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو موردالزام پاکستان کو ٹھہرادیا جاتا ہے نیٹو کے بے تحاشہ ٹینکرز جسکی حفاظت کی ذمہ

داری امریکہ لے چکے تھے ظاہر ہے کہ طالبان نے تباہ کیے کیا اس میں بھی پاک فوج ملوث تھی اور کیا جی ایچ کیو، پریڈ لین کی مسجد اور آئے روز پاک فوج کے قافلوں پر حملے بھی یہی پاکستانی حمایت یافتہ طالبان کر رہے ہیں اور کیا پاکستان ان کو اسی سب کچھ کرنے کے لیے مدد فراہم کر رہا ہے۔ اور کیا صدر پاکستان پچاس زیر حراست ان طالبان کو آزادی کی نوید سنانے گئے تھے جن کو وہ مسلسل اپنی شریک حیات کے قتل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور ان سے کسی نرمی کے راوادار نہیں۔ اصل حقیقت وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ یہ لوگ اب بوکھلائے ہوئے ہیں اور کھسیانی بلی کھمبا ہی نوچتی ہے یہ مغربی طاقتیں تو یہ تک کہہ چکی ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو اسکی فوج میں موجود طالبان کے حمایتیوں سے خطرہ ہے جبکہ پاکستانیوں اور پاک فوج کو یقین ہے کہ یہ ایٹمی قوت ان کے قوت ایمانی کے بعد ان کی بقا کی ضامن ہے اس لیے وہ مغربی اور مشرقی ہر بدنیت سے اس کی حفاظت کرینگے اور ان کے سامنے ہار نہ مانیں گے۔ دراصل مغربی دنیا اسلام اور خاص کر اسلامی جمہوریہ پاکستان سے خوفزدہ ہے وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس ملک کا مذہب اسلام ہے لہٰذا یہاں داڑھی بکثرت ہی نظر آئے گی اور یہ بھی کہ اس ملک کا قومی لباس شلوار قمیض ہے لہٰذا اکثریت اسی لباس میں ملبوس ہو گی وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ مسلمان ہونے کے ناطے یہاں تمام لوگ نمازی ہیں لہٰذا ٹوپی کا استعمال بھی عام ہوگا اب اگر ان سب خوبیوں اور خاصیتوں کے باعث امریکہ اور اہل مغرب پورے پاکستان کو طالبان

سمجھے تو ان کی جہالت ہے۔ اور ان کو اپنی سوچ پر غور اور نظر ثانی کر لینی چاہیے اور اگر وہ پاکستانی قوم اور فوج کے بارے میں اپنے معاندانہ رویے میں تبدیلی کر لے تو اس کے حق میں بہتر ہوگا کیونکہ اس وقت پاکستان کو امریکہ کی ضرورت نہیں بلکہ امریکہ کو پاکستان کی ضرورت ہے ورنہ بصورت دیگر افغان جنگ اس کو مزید مہنگی پڑے گی پاک فوج نے اپنے جتنے افسروں اور جوانوں کو اس جنگ میں کھویا اگر اس کے باوجود بھی مغرب اس کو قصور وار قرار دے رہا ہے تو حکومت پاکستان کو بھی اپنی حکمت عملی پر غور کر لینا چاہیے۔ زیر تبصرہ رپورٹ کی وجوہات میں سے ایک پاکستان کا شمالی وزیرستان میں آپریشن نہ کرنا بھی ہے جس کے لیے امریکہ پورا زور لگا رہا ہے اور مختلف حربے آزما رہا ہے۔

ایران پر مغربی پابندیاں لگنے کے باوجود پاکستان کا اس کے ساتھ گیس پائپ لائن کا منصوبہ بھی مغرب کے سیخ پا ہونے کی ایک وجہ ہو سکتی ہے بہرحال وجوہات جو بھی ہوں سب سے بڑی وجہ بدنیتی اور مغرب کا وہ دکھ ہے کہ ایک اسلامی ملک ایٹمی طاقت بن کر اس کے صلیبی ارادوں کی راہ میں روکاوٹ کیونکر بن گیا۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکی ہوں کہ حکومت پاکستان کو اپنی حکمت عملی پر نظر

شائی ضرور کر لینی چاہیے اور اس معاملے پر سخت مؤقف اختیار کرتے ہوئے صرف میڈیا وار پر اکتفا کرنے کی بجائے سفارتی سطح پر اسے اٹھانا چاہیے اور برطانیہ سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ملک سے ایسی رپورٹ شائع ہونے پر پاکستان سے سرکاری طور پر معافی مانگے اور یہ گارنٹی بھی لینی چاہیے کہ آئندہ ایسی بے بنیاد خبروں اور رپورٹس کو شائع نہیں کیا جائے گا جمہوریت اور آزادی صحافت اپنی جگہ لیکن ذمہ داری کا ثبوت دینا ان کے حق میں بھی بہتر ہے۔

پاکستانی۔۔۔ مضبوط اور مستحکم قوم

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں نے ایک نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا تھا یعنی کہ برصغیر میں دو قومیں بستی ہیں۔ مسلمان اور ہندو لہٰذا دونوں کے الگ الگ ملک ہوں جہاں وہ اپنے اپنے نظریے کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ قائداعظم نے پاکستان کے حصول کی توجیہہ پیش کی کہ پاکستان کا مطالبہ محض ایک خطہ زمین کے حصول کے لیے نہیں بلکہ ایک ایسی تجربہ گاہ کا حصول تھا جہاں ہم اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں اور یہی ہر پاکستانی کا عقیدہ بھی ہے اور یقین بھی کہ وہ ایک قوم ہیں کیونکہ وہ ایک مذہب کو ماننے والے ہیں اور یقیناً مذہب ہی قوموں کو یکجا رکھنے کی سب سے مضبوط ڈور ہوتی ہے۔ جغرافیائی اکائی کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن ہر جغرافیائی اکائی کا مذہب سے رشتہ بھی مسلّم ہے اور پاکستان کو تو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ اسلام کے نام پر بننے والے مدینہ کے بعد دوسری ریاست تھی اب جو لوگ پاکستان کی بنیاد کو سیکولر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ تاریخ مسخ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

پرویز ہود بھائی پاکستان کا ایک جانا پہچانا نام ہے نیوکلیئر فزکس کے استاد ہیں اور ان کی ذہانت میں کوئی شک نہیں ملکی حالات اور سیاست پر بھی نظر

رکھتے ہیں۔ لیکن ۔۔۔۔پاکستان کے بنیادی نظریے کے خلاف بات کرنا یقیناً ہر پاکستانی کے لیے تکلیف دہ اور قابل اعتراض ہے پرویز ہود بھائی کا ایک مضمون why a nation? Pakistan is not میں شائع HIMAL نیپال سے شائع ہونے والے ایک رسالے ہوا۔ مضمون کے مندرجات پر بات کرنے سے پہلے موصوف کی خدمت میں ایک گزارش ہے کہ جناب اس ملک کے لوگ ویسے ہی کافی مشکل اور بے یقینی کی فضا میں رہ رہے ہیں لہٰذا یہاں اور ایشوز اٹھانے سے ملک کی کوئی خدمت نہیں کی جا سکتی اس وقت جو ملک و قوم کا خیر خواہ ہے وہ اس ملک کی مثبت رویوں کو اندرون ملک اور بیرون ملک اجاگر کرے۔ بیماری کی نشاندہی ضروری ہے لیکن یاد رکھیے غلط تشخیص جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

اس مضمون میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ وہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ پاکستان کی بنیاد مذہب ہرگز نہیں تھی اور نہ اب مذہب اس ملک کے لوگوں کو یکجا کرکے قوم کی شکل دے سکتا ہے جبکہ خود اسلام کا کہنا ہے کہ دنیا میں دو قومیں ہیں ایک مسلمان اور دوسری غیر مسلمان اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دور دراز کے اسلامی ممالک ایک اکائی بن جائیں ظاہر ہے ایسا جغرافیائی لحاظ سے ایک خطہ زمین پر ہی ممکن ہے۔ مضمون نگار کا نقطہ نظر ہے کہ پاکستان میں مختلف زبانوں اور مختلف قومیتوں کے لوگ آباد ہیں تو کیا ایسا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے قبیلوں کو تحلیل

کر کے ایک قبیلہ نہیں بنایا؟ اوس اوس، خزرج خزرج اور اشہل اشہل ہی رہے۔ بحیثیت مسلمان میں انہی حوالوں پر یقین رکھتی ہوں مضمون نگار نے جن مغربی مفکرین کے نظریات کے حوالے دیئے ہیں ان میں سے بھی کوئی بھی حوالہ لے لیجئے پاکستان قوم کی باتوں پر اس قوم کے theoratical تعریف کے مطابق ایک قوم ہے۔ اگر میں ان بحیثیت قوم عمل کو زیادہ اہمیت کے قابل سمجھتی ہوں۔ وہی قبائل جن کو ہم طالبان کہہ کر دہشت گرد قرار دے رہے ہیں اور مضمون نگار ان سے صلح کی ہر کوشش کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور طاقت کے استعمال کو ان کا واحد علاج قرار دیتے ہیں۔ جب ممبئ حملوں کے بعد بھارت نے اشتعال انگیز زبان اور عمل اختیار کیا تو ان تمام قبائل بشمول طالبان نے یہی کہا کہہ اگر بھارت نے کسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرکے پاکستان پر حملے کی حماقت کی تو ہم حکومت کے ساتھ تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر پاکستان کی حفاظت کریں گے۔ کیا یہ ایک قوم کی نشانی نہیں کہ جب کوئی غیر قوم اسکے مقابلے میں آکھڑی ہو تو ہزار اختلافات کے باوجود وہ ایک ہو جائے؟ مجھے یقین ہے مضمون نگار اس سب کچھ سے باخبر ہونگے اور ان حالات سے بھی جو پاکستان کو اپنی سرحدوں خصوصاً مشرقی سرحد پر درپیش رہتے ہیں پھر بھی وہ ان سے صرف نظر کرکے معترض ہیں کہ بھارت کے ساتھ ساٹھ سالہ تنازعے نے سوائے اس کے کچھ نہ کیا کہ پاکستان کو ایک مسلح ریاست بنادیا جس نے پاکستان کو غیر ملکی قرضوں پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیا یہ اعتراض ہمیں بھی ہے کہ بھارت کو اپنی نیت درست کرلینی

چاہیئے تاکہ جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کی دوڑ ختم ہو اور عوام کی فلاح و بہبود پر توجہ دی جاسکے۔ مضمون صاف طور پر یہ تاثر دے رہا ہے کہ مضمون نگار کافی حد تک بھارت سے متاثر ہیں وہ بلوچستان میں بھارت کو موردالزام ٹھرانے سے گریزاں ہیں ان کے حکومتی نظام سے بھی متاثر ہیں تو عرض یہ ہے اگر انکا نظام حکومت ملک کو قوم بنانے میں کامیاب ہے تو پھر بھارت میں دو درجن سے زیادہ علیحدگی کی تحریکیں کیوں چل رہی ہیں کشمیر کے مسلمان کیوں آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں نکسلائیٹ کو بھارت سرکار سے تو چھوڑیے اس ملک کے ساتھ جڑ کر رہنے سے ہی اختلاف ہے۔ اگر پاکستان کے چار صوبوں کو وہ چار الگ قومیتیں قرار دے رہے ہیں جن کا مذہب ایک ہے جہاں زبانیں مختلف ہونے کے باوجود ان کا رسم الخط ایک ہے ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں بکثرت بولے اور سمجھے جاتے ہیں قومی زبان اردو تو خیر ہر ایک کی دسترس میں ہے۔ جہاں علاقائی لباس صرف ڈیزائن میں معمولی ردوبدل کے ساتھ ایک ہیں جہاں طرز تعمیر میں کوئی ایک بھی نمایاں تبدیلی نہیں۔ جہاں نام ایک ہیں یہاں تک کہ اخلاقی قدریں مشترک ہیں وہ کیسے ایک قوم نہیں۔ قوم کی کونسی خاصیت جس پر پاکستانی قوم پورا نہیں اترتی۔ فرقوں کو جس طرح مضمون میں اچھالا گیا ہے تو پھر تو بھارت کبھی ایک قوم نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہاں جو چھوت چھات کا نظام ہے وہ اسی آئیڈیل ملک کی خاصیت ہے اور ہاں پھر امریکی کیسے ایک قوم ہیں دوسری یورپی اور مغربی قومیں کیسے ایک قوم ہیں کیا وہاں ایک ہی مسیحی فرقہ رہتا

ہے اور کیا یہ ضروری نہیں کہ امریکی صدر پروٹیسٹنٹ ہو تو کیا دوسرے فرقوں کے پیروکاروں کو بطور احتجاج امریکہ چھوڑ دینا چاہیے۔ پاکستان میں روشن خیالی کی آڑ لے کر اس معاملے کو ہوا نہ دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اور پاکستانی جس طرح اپنے آپکو بحیثیت قوم ثابت کر رہے ہیں اس کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ طوفانوں، زلزلوں اور امریکہ، بھارت اور اسرائیل کی مسلط کردہ آفات میں جس طرح یہ قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے وہ اسے ایک قوم نہیں بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم قوم ثابت کرتا ہے۔ میرے خیال میں اگر کسی قوم میں اختلافی مسائل نہ ہو وہ انتہائی غیر قدرتی ہے اور مسلط کردہ ہم خیالی ہے اور ریاستی جبر بھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ پولیٹیکل سائنس کی رو میں اسے کیا کہا جائے گا لیکن زندہ دنیا میں یہی زندہ حقیقت ہے۔

ہاں آخر میں ایک گزارش ہے کہ اگر کسی کو پاکستان کے مسائل سے واقعی دلچسپی ہے تو اس کے لیے اپنے پرنٹ میڈیا کو استعمال کرے ایک بیرونی میگزین کو جسے پاکستان میں چند گنے چنے لوگ پڑھتے ہیں استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی اور کیا ملک کے کافی سارے مثبت پہلوؤں پر بھی روشن خیال طبقہ بین الاقوامی پلیٹ فارم سے کبھی بات کرتا ہے؟

پاک چین نیوکلیئر ڈیل

پاکستان اور چین دو ہمسایہ ممالک تو ہیں ہی قابل اعتماد دوست بھی ہیں یہ دوستی آج کل کی نہیں۔ 1949 میں چین آزاد ہوا تو پاکستان تیسرا غیر کمیونسٹ اور پہلا اسلامی ملک تھا جس نے اسے 1950 میں تسلیم کیا یوں ہمیشہ ہی پاکستان اور چین کے تعلقات انتہائی دوستانہ رہے ہیں اور دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے کام آتے رے ہیں چین چونکہ بڑا ملک ہے اسکے وسائل اور ذرائع زیادہ ہیں اس کی مہارت بھی مختلف شعبوں بہت زیادہ ہے لہذا وہ ہماری زیادہ مدد کر سکتا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور نہ صرف ہر موقع پر ہماری مدد کی بلکہ تکنیکی مدد بھی فراہم کرتا رہا ہے تاکہ پائیدار ترقی ممکن ہو سکے۔ شاہراہ ریشم سے لیکر گوادر تک ہر جگہ چین نے اپنی بے لوث دوستی کا ثبوت دیا اس لیے اب یہ کوئی اچھنبے کی بات تو نہیں اور نہ ہی کسی کو اس بات پر اعتراض ہونا چاہیے کہ چین پاکستان کو ایٹمی ری ایکٹر دے گا جس سے پاکستان اپنی توانائی کی ضروریات کا کچھ حصہ پورا کرے گا۔ پاکستان اس وقت توانائی کے بحران سے شدید ترین طور پر متاثرہ ممالک میں سے ہے سالہا سال سے دہشت گردی کی جنگ لڑتے لڑتے یہاں ترقیاتی کاموں پر وہ توجہ نہیں دی جا سکی جو دی جانی چاہیے تھی دفاعی اخراجات اس مسلط شدہ جنگ کی وجہ سے دفاعی بجٹ سے بڑھ جاتے ہیں۔ اب

ظاہر ہے وہ پیسہ جو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونا چاہیے تھا وہ اس جنگ پر صرف ہو رہا ہے۔ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے توانائی کی ضروریات بھی اتنی ہی تیزی سے بڑھتی ہیں لہٰذا یہ پاکستان کا حق ہے کہ وہ اپنے عوام کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن راستہ اختیار کرے۔ وہ جن کی جنگ ہم لڑ رہے ہیں وہ تو ہماری ضروریات کا احساس نہیں کر رہے لیکن جو کر رہے ہیں انہیں ان پر بھی اعتراض ہے۔

ایران، پاکستان گیس پائپ لائن کے بارے میں رچرڈ ہالبروک نے کہا کہ یہ پاکستان اور ایران کا باہمی معاملہ ہے لیکن اگلے ہی روز موصوف کی طرف سے بیان آیا کہ اس معاہدے کی صورت میں ایران پر پابندیوں کا اثر پاکستان پر بھی پڑ سکتا ہے یعنی دھمکی) اور ساتھ ہی حسب معمول یہ نمائشی بیان بھی دیا کہ امریکہ پاکستان کی توانائی (کی ضروریات اور مسائل سے آگاہ ہے۔ لیکن بات صرف آگاہی سے نہیں بنتی بلکہ بات ضروریات پورا کرنے کی ہے۔ جیسا چین جیسے دوست نے پورا کرنے کی بات اور وعدہ کیا ہے اور جس پر امریکہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکا ہے۔ بھارت بھی اس معاہدے سے پریشان ہے کیونکہ اسے تو یہ کسی بھی طرح گوارا نہیں کہ پاکستان کسی بھی مسئلے سے نکل سکے اور اپنے عوام کی فلاح و بہبود کا کام کر سکے۔ اس معاہدے پر جو بڑا اعتراض کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ چین NSG یعنی Nuclear Supplier Group کا رکن ہوتے

ہوئے کیسے یہ سودا کر رہا ہے تو بات یہ ہے کہ پاکستان اور چین کے درمیان یہ معاہدہ نیا
کا رکن بنا جبکہ پاکستان کے ساتھ اس کے معاہدے بہت NSG نہیں چین 2004 میں
کا قیام بھی بھارت ہی کے مرہونِ منت تھا جب اس نے 1974 میں NSG پرانے ہیں۔
ایٹمی دھماکے کیے تو جوہری صلاحیت اور سامان سپلائی کرنے والے ملکوں کو احساس ہوا
کہ ایٹمی صلاحیت اور ہتھیاروں کو انتہائی سخت قوانین کے تحت صرف ان ملکوں کو مہیا
پر دستخط کر چکے ہوں اگرچہ پاکستان اور بھارت دونوں نے یہ دستخط NPT کیا جائے گا جو
نہیں کیے لیکن دوہرے عالمی معیار اور خاص کر دوہرے امریکی معیار کے مطابق چین کے
ساتھ اس معاہدے کو ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے جبکہ اس سے پہلے امریکہ اور بھارت کے
کے پانچ ممبر NSG درمیان ستمبر 2008 میں ایسا ایک معاہدہ کیا گیا جس پر اس وقت
ممالک جن میں آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، ناروے، آئرلینڈ اور نیوزی لینڈ شامل تھے نے
Clean اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا لیکن بھارت کی صرف زبانی یقین دہانی پر اسے
دیا گیا۔اسوقت پاکستان نے بھی امریکہ سے ایسی ہی سول نیوکلیئر ڈیل کا Wavier
مطالبہ کیا جسے امریکہ نے درخور اعتنا نہ سمجھا جبکہ بھارت کے لیے امریکہ نے اپنے
قوانین میں ترامیم کیں اور اسے یہ تعاون فراہم کیا۔ امریکہ اپنا فرنٹ لائن اتحادی
پاکستان کو کہتا ہے لیکن فطری دوست اور اتحادی بھارت کو قرار دیتا ہے اور اس دوستی کا
حق بھی ادا کرتا ہے۔ اب اگر اس تناظر میں حالیہ پاک چین دفاعی اور ایٹمی معاہدے کو
دیکھا جائے تو یہ پاکستان کی اشد

ضرورت تھا اور ساتھ ہی چین کی بھی کیونکہ جب علاقے میں دو دوست ممالک بھارت کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھیں گے تو بھارت کوئی احمقانہ اقدام اٹھاتے ہوئے سوچے گا ضرور اور آئندہ کوئی بھارتی چیف جنرل دیپک کپور کی طرح پاکستان اور چین کو چھیانوے گھنٹوں میں فتح کرنے کی بات نہیں کرے گا اور اسی لیے بھارت کو اس معاہدے پر تشویش ہے۔ جبکہ امریکہ کی تشویش یہ ہے کہ پاکستان کا جھکاؤ چین کی طرف ہو گیا جو کہ ہونا چاہیے تو یوں افغانستان کی جنگ جیتنے کی موہوم سی امید سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا اور اسکی طویل المدت منصوبہ بندی کھٹائی میں پڑ جائے گی اور وہ توانائی کے ان بیش بہا ذخائر تک نہ پہنچ سکے گا جو وسط ایشیائی ریاستوں میں وہ تاک کر بیٹھا ہوا ہے اور ساتھ ہی اس کا اکیلے ہی سپر پاور بنے رہنے کا خواب بھی بکھر جائے گا۔

بھارت کی تشویش تو کھلا دشمن ہونے کی وجہ سے فطری ہے اگرچہ غیر متوقع امریکی تشویش بھی نہیں تاہم اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ امریکہ نہیں چاہتا کہ پاکستان خود کفالت کی منزل پر پہنچے یا اس راستے پر چلے بلکہ وہ ہر صورت اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی اپنی قومی خارجہ پالیسی پر ضرور نظرثانی کرنا ہو گی اور دوست اور دشمن کا واضح تعین کرنا ہوگا کہ کون ہمارا خیر خواہ اور کون بد خواہ ہے اور اس معاہدے کے معاملے میں دو ٹوک مؤقف اپنانا ہوگا کہ یہ معاہدہ پاکستان اور چین کے

کا ممبر NSG درمیان کوئی نیا معاہدہ نہیں اس لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ چین ہے یا نہیں۔ اگر چین ہے بھی تو وہ کوئی نیا معاہدہ نہیں کر رہا بلکہ یہ تعاون اور دوستی بہت پرانی اور یقیناً ہمالیہ سے بلند اور سمندر سے گہری ہے ہمیں دنیا کو یہ تاثر دینا ہوگا کہ چین اور پاکستان ایک دوسرے کے قابل اعتماد دوست اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

دہشتگردوں کی رہائی اور عوام کی فکر مندی

عوام کو کچھ شکایات ہیں جو بالکل بجا ہیں عوام کو حکومت سے شکایت ہے کہ انہیں بنیادی ضروریات زندگی مہیا نہیں کی جارہی روٹی، کپڑا اور مکان کا حصول نا ممکن ہوتا جا رہا ہے ان کے جان و مال کے حفاظت کا فریضہ بھی حکومت ادا کرنے میں ناکام ہو رہی ہے۔ امن و امان کی صورت حال سے ہر پاکستانی بجا طور پر پریشان ہے کہ باوجود جابے جا سیکیورٹی چیک کے خودکش شہروں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اگر نہ ہو سکیں اور روک لیے جائیں تو چیک پوسٹ پر موجود اہلکار تو شہید ہو ہی جاتے ہیں۔ انسانی جانیں ضائع ہونے پر ہر پاکستانی دکھی اور غمزدہ ہوتا ہے۔

مجرم پکڑ لیے جائیں تو بھی عوم اسے محض ضابطے کی کاروائی سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بعد یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ملزم یا مجرم کو سزا بھی ہوئی یا نہیں اگر ہوئی تو نہ تو یہ سرعام ہوتی ہے نہ اسے مشتہر کیا جاتا ہے تاکہ عوام کو اپنی حفاظت کا احساس اور مجرموں کو اپنے انجام کا خوف پیدا ہو بلکہ اکثر مجرم تو صاف.بری کر دیئے جاتے ہیں لہذا عوام کو ایک گلہ اپنے قانون اور عدالتی نظام سے بھی ہے۔ چلیں کچھ ملزمان تو ایسے ہونگے جنہیں شک کی بنیاد پر پکڑا گیا ہو اور انہیں شک کا فائدہ دے دیا جاتا ہو

لیکن کیا پھر بھی ضروری نہیں کہ ان کی خفیہ طور پر مسلسل نگرانی کی جائے تاکہ پھر کسی سانحے، حادثے اور تباہ کن جرم سے بچا جاسکے لیکن کچھ ملزم تو یقینی طور پر مجرم ہوتے ہیں پھر آخر انہیں کیسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سوات جس عذاب سے گزرا ہے اس کے ذمہ دار افراد کو ابھی تک سزا کیوں نہ ہوئی بلکہ بعض پر تو ابھی تک مقدمہ تک شروع نہیں کیا گیا۔ مسلم خان جیسا علی الاعلان مجرم اس کی ایک مثال ہے جو میڈیا پر آکر بے شمار جرائم کا اقرار کر چکا ہے۔ صوفی محمد نے جس طمطراق سے آئین پاکستان کی توہین کی اپنے خود وضع کردہ اسلامی اصولوں پر عمل نہ کرنے والے ہر مسلمان پر کفر کا فتویٰ جاری کر دینا جس کے لیے بہت ہی آسان تھا بلکہ واجب القتل قرار دینا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی تاحال اس کی سزا کا کسی کو علم نہیں۔

ایک نجی ٹی وی چینل پر ایک پروگرام میں ایک گرفتار شدہ خودکش بمبار نے بڑے فخر سے اقرار جرم کیا اور بڑی تسلی سے کہا کہ وہ پہلے بھی گرفتار ہو کر رہا ہو چکا ہے اور اب کی بار بھی ایسا ہی ہوگا ساتھ ہی اس نے پختہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ آزاد ہو کر پھر خود کش حملہ کر کے تباہی پھیلائے گا کیا اس شخص کو اس کے اس اقرار جرم کے بعد سزا دی گئی جو سرعام دی جانی چاہیے تھی تاکہ دوسروں کو عبرت ہوتی۔ محمد عقیل عرف ڈاکٹر عثمان کی مثال سب کے سامنے ہے جسے میریٹ ہوٹل کے دھماکے اور لیفٹیننٹ جنرل مشتاق بیگ کی شہادت کے جرم میں

پکڑا گیا لیکن حیرت انگیز طور چھوڑ دیا گیا جس نے اسے جی ایچ کیو پر حملے کی ہمت اور
پلاننگ کا موقع دیا۔ ایک اور یقینی مجرم جسکا نام اسوقت میرے ذہن میں نہیں جسے
مناواں پولیس ٹریننگ سنٹر پر حملے کے دوران فوجی ہیلی کاپٹر پر ہینڈ گرنیڈ پھینکتے ہوئے
رنگے ہاتھوں پکڑا گیا کیا اسے فوری اور سخت سزا نہیں ملنی چاہیے تھی اس مئی اور جون
کے مہینے میں دہشتگردی کے کئی ملزموں کو ناکافی ثبوتوں کے بنا پر بری کر دیا گیا اب
ثبوت تو ناکافی ہونگے ہی کیونکہ اصل مجرم یعنی خود کش تو مر جاتا ہے اور یوں بڑا
ثبوت خود بخود ضائع ہو جاتا ہے لیکن ظاہر ہے جسطرح ان حملوں کے لیے چودہ، پندرہ یا
اٹھارہ سال کے لڑکوں کو استعمال کیا جاتا ہے وہ اتنی بڑی پلاننگ خود تو نہیں کر سکتے۔ ان
حملوں کا منصوبہ ساز کوئی اور ہوتا ہے جو پوری معلومات حاصل کرتا ہے ان بچوں کی
ٹریننگ اور برین واشنگ کرتا ہے اور پھر انہیں استعمال کرتا ہے۔

کچھ خود کش اگر گرفتار ہو جاتے ہیں اور تمام ثبوتوں یعنی خود کش جیکٹ پہنے ہوئے
پکڑے جاتے ہیں تو پھر کیوں نہ انہیں فوری اور سرعام سخت سزا دے دی جاتی ہے۔ کم
عمر کے بچوں کو آپ الگ رکھ کر ان کی ذہنی تربیت کر کے زیر نگرانی مفید شہری بننے میں
مدد دے سکتے ہیں لیکن ماسٹر مائنڈ کے ساتھ رعایت قوم کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔
اسلام کسی انسان کا خون بہانے والے کے

ساتھ کسی قسم کی نرمی کا روادار نہیں جب تک کہ خود لواحقین یہ خون معاف نہ کر دیں۔ مون مارکیٹ میں مرنے والے معصوم شہریوں اور دلہنوں کا خون معاف کرنے پر انکے لواحقین تیار نہیں ہیں۔ پشاور کے تو نہ معلوم کتنے بے گناہ شہریوں کا خون ان کے سر پر ہے اور اس ملک کے رونقیں برباد کرنے والے کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ میں عدالتی نظام کی زیادہ پیچیدگیوں سے واقف تو نہیں ہوں لیکن میرے علم میں تو جو نام ایسے تھے جو سخت ترین سزا کے مستحق ہیں مجھے ان کی بری ہونے پر تعجب اور دکھ ہے۔ جبکہ اطلاعات کے مطابق سوات میں تقریباً دو ہزار دہشتگرد ایسے ہیں جن پر ابھی تک مقدمات شروع بھی نہیں ہوئے۔

انصاف کی فوری اور سستی فراہمی کسی بھی معاشرے کی خوش قسمتی ہوتی ہے اور دہشت گردی تو ایک قومی جرم ہے جس نے ہمارے پورے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے فوجی آپریشن سے اس مسئلے پر قابو تو پایا جاسکتا ہے لیکن یہ اس کا حتمی حل نہیں ہے۔ حتمی حل بہرحال حکومت اور سول اداروں کی ذمہ داری اور کام ہے جس کے لیے انتہائی خلوص نیت سے کام کرنا ہوگا متاثرہ علاقوں میں خاص کر اور پورے ملک میں عام طور پر عام آدمی کی حالت بہتر بنانے پر بھرپور توجہ دینی ہوگی تاکہ دہشت گردوں کو کارندے میسر ہی نہ آسکیں اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ جرم کی سزا جرم کے مطابق اتنی سخت ضرور ہو کہ دوسرے عبرت پکڑ سکیں۔ آج خوش قسمتی سے ملک میں آزاد اور ایماندار عدلیہ کی موجودگی ایک خوش

آئند امر ہے لیکن اس کے ثمرات عوام تک ضرور پہنچنے چاہئیں اور خاص کر دہشت گردی کے قلع قمع کرنے کے لیے انتہائی جرات اور زیرکی کی ضرورت ہے۔ قانونی پیچیدگیوں کو اصل مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ہرگز حائل نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یقیناً عدالت میں بیٹھا ہوا منصف بھی قانون کے سامنے ہر دوسرے شہری کی طرح بے بس ہے اسے بھی قانون کے مطابق ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اس معاملے میں ثبوت کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتے کیونکہ مجرم اپنے انجام تک پہنچ چکا ہوتا ہے لیکن ماسٹر مائنڈ کے خلاف اور گرفتار شدہ مجرم جو اقرار جرم کر چکے ہوتے ہیں ان کو فوری سزا دینا نہ صرف قانونی الجھنوں سے بچا سکے گی بلکہ عوام کو کم از کم اس تحفظ کا احساس رہے گا کہ کوئی ہے جو خود کو ان کی حفاظت کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور ان کے خون کا بدلہ لے سکتا ہے۔ جب کچھ ایسے لوگوں سے بات ہوئی جن کے عزیز و اقارب اس دہشت و بربریت کا شکار ہوئے تو ان کا کہنا یہی تھا ان کا تو جو نقصان ہونا تھا ہو چکا اس کا ازالہ تو ممکن نہیں لیکن مجرموں کو سخت اور سرعام سزائیں دوسرے لوگوں کی زندگیوں کو بہت حد تک محفوظ بنا سکتی ہیں۔

میک کرسٹل برطرف لیکن۔۔۔

امریکہ اس وقت افغانستان میں بری طرح پھنس چکا ہے وہ ہر حربہ آزما چکا ہے لیکن اس ملک کو فتح کرنے کا اس کا خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور اب تو لگتا ہے خود امریکی بھی اس سے ناامید ہو چکے ہیں۔ اگرچہ جنرل میک کرسٹل ایک بے باک افسر کے طور پر مشہور تھا لیکن کسی جنرل سے یہ توقع کرنا کہ وہ کوئی بات بغیر سوچ سمجھے کرے گا کسی بھی طرح قرین قیاس نہیں اس نے جو کچھ کہا وہ تو سب ہی جانتے ہیں اس لیے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تاہم اس نے ایسا کیوں کہا یہ ضرور سوچنے کی بات ہے کیا اسے اپنے حکمرانوں سے کوئی مخاصمت تھی یا ان سے کوئی اختلاف تھا۔ ایسا نظر تو نہیں آتا ورنہ اسے اتنے اہم فرائض سونپے نہ جاتے۔ اگر اس کا رویہ شروع ہی سے اتنا غیر ذمہ دارانہ تھا تو وہ اتنے بڑے عہدے پر پہنچنے سے پہلے کب کا فوج سے فارغ کر دیا گیا ہوتا اور عراق کے بعد اسے افغانستان نہ بھیجا جاتا اور نہ ہی ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز کی ذمہ داری سونپی جاتی پھر اس نے اس رویہ اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیوں کیا۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ وہ افغانستان میں اپنی فتح سے مکمل ناامید ہو چکا تھا یا وہ جان چکا تھا کہ یہ ایک لاحاصل اور غیر ضروری جنگ ہے یا وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ امریکہ بے بنیاد مفروضوں پر لڑ رہا ہے اور یا یہ

کہ جتنے ڈالر وہ تقسیم کر سکتا تھا وہ بھی کر چکا لیکن پھر بھی اس کے ہاتھ کسی سچے افغانی کی وفاداری نہیں آئی۔ خدا بہتر جانتا ہے جو ہوا کیوں ہوا لیکن ایک اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اندرونِ خانہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ امریکی فوج جان چکی ہے کہ امریکی حکومت اسے اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھا رہی ہے اور اپنے ظلم وزیادتی کی بھٹی کو ان کے جسم جھونک کر دہکا رہی ہے۔ بڑے لیول کا تو یہ پہلا جھٹکا تھا جو امریکہ کو لگا اور پوری دنیا میں آئیں گے وہ بھی اپنی جگہ اہم ہونگے۔ لیکن ایسا After Shocks محسوس کیا گیا اور جو ہرگز نہیں ہے کہ یہ امریکی فوج کے ذہنی تناؤ کا پہلا اظہار تھا یہ تو ایک جنرل تھا جو دباؤ بھی زیادہ برداشت کر سکتا تھا کیونکہ زیادہ بہتر حالات میں رہ رہا تھا۔ لیکن وہ سپاہی جو ہر وقت گوریلا افغان جنگجوؤں کی گولیوں کی زد میں ہوتے ہیں اپنے گھر سے ہی نہیں بلکہ اپنے ملک سے گھنٹوں نہیں بلکہ دنوں اور ہفتوں کے فاصلے پر ہیں جہاں راہ چلتا ہوا کوئی شخص ان کے لیے کسی محبت کا اظہار کرتا ہے نہ ان کی زبان سمجھتا ہے وہ جس ذہنی عذاب سے گزرتے ہیں وہ تب سامنے آتا ہے جب وہ خود زندگی کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ امریکی فوج میں خاص کر جو عراق میں اور اب افغانستان میں ڈیوٹی پر تعینات ہے میں خودکشی کا تناسب ان کے نفسیاتی تناؤ کا غماز ہے۔ صرف مئی 2010 میں دس خودکشی کے واقعات سامنے آئے اس سے پہلے مارچ میں ایسے تیرہ واقعات ہوئے جب کہ نو واقعات امریکی ریزرو فوج میں ہوئے اپریل میں ریزرو فوج میں پانچ ایسے

واقعات ہوئے اور خود ایک امریکی تجزیے کے مطابق یہ ریزرو فوج دوہرے عذاب سے گزرتی ہے ایک تو یہ کہ کب انہیں اس محاذ پر بھیج دیا جائے جہاں سے زندہ واپس آنا آسان نہیں اور دوسرے انہیں معاشی دباؤ سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

افغانستان کی جنگ جدید امریکہ کی طویل ترین جنگ کا اعزاز حاصل کر چکی ہے سات اکتوبر 2001 کو شروع ہونے والی یہ جنگ 105 ماہ کی عمر کو پہنچنے والی ہے جبکہ ویتنام کی جنگ 103 ماہ پر محیط تھی افغان جنگ میں اب تک 1053 امریکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں خواتین فوجی اپنے آپ کو انتہائی غیر محفوظ تصور کر رہی ہیں 2009 میں اکتالیس خواتین فوجیوں کی غیر طبعی اموات ہوئیں۔ کیسے؟ اسکی وجوہات مختلف تھیں جس میں جنسی زیادتی سے لے کر خودکشی تک شامل تھیں۔

افغانستان کی جنگ پر امریکہ ستر ارب ڈالر سے زیادہ سالانہ خرچ کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ امریکی معاشرے میں ان جنگوں کے لیے موافقت کم ہو رہی ہے کیوں کہ یہ معاشرہ اپنے دیگر مسائل سے ہی پریشان ہے جن میں معاشی مسائل سرفہرست ہیں بظاہر اس خوشحال معاشرے میں بھی نچلے متوسط طبقے کو یہ شکایت ہے کہ فلاحی ادارے بھی انہیں نظرانداز کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنی ضروریات بڑی مشکل سے پوری کرتے ہیں اس سے اس طبقے میں خاصی بے چینی پائی جاتی ہے۔ یہ تو

خیر ایک نکتہ معترضہ تھا۔ بات ہو رہی تھی افغان جنگ کی کہ امریکہ اس میں کس حد تک کامیاب رہا یا اس کی کامیابی کی کتنی امید ہے جب کہ وہ اس کے لیے لڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے فتح کی کوشش میں اس نے افغانوں پر ڈالروں کی بارش کی ہوئی ہے لیکن یہاں بھی قسمت اور کامیابی اس کا ساتھ نہیں دے رہی کیونکہ یا تو ڈالر لینے والے طالبان کے عتاب کا نشانہ بن جاتے ہیں اور دوسروں کے لیے عبرت یا وہ پیسہ بھی طالبان کے حوالے کر دیتے ہیں جبکہ اکثر پختون اسے لینے سے ہی انکار کر دیتے ہیں کیونکہ وہ ایک غاصب فوج کے ہاتھ سے زندگی کی اشد ضروریات کے لیے بھی پیسہ لینا بے غیرتی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اس افغانستان کے باشندے ہیں جو دنیا کا پانچواں غریب ترین ملک ہے یوں یہ امریکی چال بھی ناکام ہو رہی ہے۔ افغانوں کی اس سرزمین پر سکندر اعظم جیسا فاتح نہ جم سکا بلکہ ماضی بعید میں جانے کی کیا ضرورت ہے ابھی ماضی قریب کی بات ہے جب سویت یونین اپنا وجود ان ہی کے آگے کھو بیٹھا تھا۔ امریکی بھی اس ملک کو فتح کرنے کی نو سالہ کوشش کے بعد بھی ناکام ہیں جسکے لیے وہ تمام جتن کر چکے ہیں۔ وہی امریکہ جو دنیا کو انسانی حقوق اور قانون کی بالادستی کا سبق پڑھاتا ہے خود اس کے اپنے فوجی افغان جنگی قیدیوں کو جیلوں میں قتل کرکے بین الاقوامی قانون کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں Asian Tribune کی سات اپریل کی رپورٹ کے مطابق پھر جعلی مقابلوں میں ہلاکت کی خبر لگا دی جاتی ہے۔ بگرام کے عقوبت خانوں سے لیکر گوانتاموبے کے مظالم بھی امریکہ کو یہ جنگ تا

حال نہ جتوا سکے اب دیکھیں نئے جنرل ڈیوڈ پیٹریاس ان تمام مظالم کو کہاں تک پہنچا کر اپنے من پسند نتائج حاصل کرتے ہیں۔

دراصل امریکہ کے لیے اب بہتر یہی ہے کہ وہ اس جنگ سے جان چھڑا لے یہ اور بات ہے کہ اب یہ کمبل بھی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں کیا اب بے شمار عراقی اور افغانی اپنی قومی تاریخ کے اس سب سے بڑے مجرم کو معاف کرنے پر تیار ہو جائیں گے کیونکہ جس طرح ٹوئن ٹاورز کے پانچ ہزار امریکیوں کی جانیں قیمتی تھیں اسی طرح ان عراقی اور افغانی لوگوں کی جانیں بھی قیمتی ہیں۔

اب اگر امریکی واقعی اپنی باعزت واپسی چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اس عمل کو جتنا جلدی ہو سکے شروع کر دیں۔ دہشتگردی کے خلاف جنگ کے نام پر جتنی دہشتگردی وہ کر چکے تاریخ میں بدنامی کے لیے یہی کافی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ امریکہ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتا وہ اپنی غلطیاں دوہرائے جا رہا ہے ورنہ ویتنام کے بعد وہ کوئی مہم جوئی نہ کرتا اور افغانستان کو تو وہ خود سویت یونین کو توڑنے کے لیے استعمال کر چکا تھا اسے تاریخ کی خبر ضرور ہونی چاہیے تھی اکی ہزار سیکیورٹی اور حکومت پاکستان کی تمام تر مدد کے باوجود اس کے ٹینکرز اور ٹرک کیسے جلا دیئے جاتے ہیں کیا طالبان اور افغان اس سے زیادہ اچھے منصوبہ ساز نہیں؟

جنرل میک کرسٹل کی برطرفی کے بارے میں بہت سی باتیں کی گئی ہمارے ملک میں بھی اس پر اوبامہ پر داد تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے کہ ایک جنرل کو برطرف کر دیا گیا اپنی سیاسی حکومت میں بھی ویسی ہی ہمت پیدا کرنے کی بات کی گئی بجائے اس کے کہ اس واقعے کو قومی مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا اسے اپنے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی اس طرح کی عاقبت نااندیشی اور ذاتی مفاد کو قومی مفاد سے بالا تر سمجھنا دراصل ہمارا المیہ ہے۔ حالانکہ بات دراصل یہ تھی کہ امریکی حکومت دوسرے براعظم پر بیٹھ کر وہ کچھ محسوس نہیں کر سکتی تھی جو جنرل میک کرسٹل دیکھ اور سمجھ رہا تھا ہتھیار ڈالنے سے بہتر اس نے یہی سمجھا کہ وہ اس فوج کو چھوڑ دے جس کی خدمت اس نے اور اس سے پہلے اس کے والد میجر جنرل ہربرٹ جے میک کرسٹل نے کی تھی۔

خودکشی۔ خدا کے اختیارات میں مداخلت

اللہ تعالیٰ نے جب تخلیق کائنات کی اور زمین کو منتخب فرمایا اپنی سب سے حسین تخلیق یعنی زندگی کے لیے تو اس نے اس سیارے پر بے انتہا توجہ کی اللہ کہتا ہے کہ اُس نے چھ دن میں اس زمیں و آسمان کی تخلیق کی۔ پھر اللہ نے اس زمین پر کروڑوں سال کبھی برف کی تہہ جمائی اور کبھی سورج کی گرم شعاعیں مرکوز رکھیں اور کبھی گردوباد کے طوفان اٹھے جب یہ زمین ہر قسم کے موسم اور نرمی و سختی کی عادی ہوئی تو بڑی محبت سے زندگی کو تخلیق کیا اور جب زندگی نے پھل پھول کر سیارہ زمین کو خوشگوار بنایا تو اللہ نے اپنی معتبر ترین تخلیق اشرف المخلوقات انسان کو بنایا اور اس زمین پر اتارا۔ یوں سوچیے اللہ نے انسان کی زندگی کی حفاظت کو انسان کے اہم ترین فرائض میں داخل کیا۔ چاہے اپنی زندگی ہو یا دوسرے کی۔ اسی حقیقت کو سورہ المائدہ کی آیت نمبر 32 میں بڑی خوبصورتی سے بیان فرمایا " جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا یعنی بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اُس نے گویا تمام لوگوں کا قتل کیا اور جو اُس کی زندگانی کا مؤجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا مؤجب ہوا اور ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر روشن دلیلیں لا چکے ہیں". یعنی انسانی زندگی کو کس قدر اہم اور قابل قدر سمجھا گیا۔

اب ذرا آج کے حالات کی طرف آتے ہیں جس میں انسان کی زندگی کو دنیا کی ارزاں ترین شے سمجھ لیا گیا ہے. ہر روز دھماکے، دہشت گردی کی خبریں تو اتر سے آنا ایک معمول بن گیا ہے۔ 2002ء سے ہمارا ملک جس قسم کی دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے اُس میں سب سے خوفناک خودکش دھماکے ہیں۔ جس نے بے شمار انسانوں کو خاک وخون میں نہلا دیا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ حملے مسلمان مسلمانوں کی خلاف کرتے ہیں اگرچہ اس بات پر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا کیونکہ جن لوگوں سے اِن دھماکوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہ خود کو بہترین مسلمان کہتے ہیں اور دھماکہ کرنے والا خود کو شہادت کے درجے پر فائز سمجھتا ہے۔ حالانکہ دنیا کے کسی بھی معاشرے یا مذہب میں اگر خودکشی ناپسندیدہ ہے تو اسلام میں حرام ہے اور اس کی سختی سے ممانعت ہے۔ چاہے اسے جو بھی کرے اور جس نیت سے بھی کرے اللہ تعالیٰ سورۃالنسائ آیت 29 میں صاف صاف فرماتا ہے. ۔۔۔۔۔۔ "اور اپنے آپ کو ہلاک مت کرو کچھ شک نہیں کہ خدا تم پر مہربان ہے". یعنی خودکشی عین خدا کا عذاب ہے۔ دراصل زندگی اور موت کے اختیار کو اللہ نے خالصتاً اپنے لیے محدود رکھا ہے اور وہ اس میں انسان کی مداخلت کو کسی قیمت پر پسند نہیں کرتا۔ قضاوقدر کا مالک وہ ہے اللہ نے انسان کو محدود اختیارات کے ساتھ زمین پر بھیجا ہے۔ جب ایک انسان کسی دوسرے انسان کو قتل کرے تو اُس نے گویا خدا کے اختیار میں مداخلت کی اور اُس نے خود کو مار دیا تو اُس نے نہ صرف خدا کی

ناشکری کی بلکہ اُس کے اختیار کو چیلنج کیا۔" کہ اے خدا اگر تو نے مجھے زندگی دی ہے تو مجھے نہیں چاہیئے اور تو دیکھ کہ میں نے اسے ختم کر دیا ہے ". بہت دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان حالات کے ہاتھوں تنگ آ کر خود کشی کر لیتے ہیں اور مظلوم سمجھ لئے جاتے ہیں۔ خود کشی کی وجوہات میں ذہنی تناؤ، دباؤ، تنہائی، بے وفائی،.برے مالی حالات، بیماری اور معذوری وغیرہ کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ اور آج کل خود کش حملوں میں استعمال ہونے والے نوجوانوں کے بارے میں یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ حالات کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے ہیں جن کو مذہب کے نام پر بلیک میل کر لیا جاتا ہے ان کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف ان حالات سے دنیا میں نجات پالیں گے بلکہ جنت بھی کمالیں گے کیونکہ وہ ایک گمراہ حکومت کے خلاف جہاد میں اپنی جان دیں گے جو بھی اِن نوجوانوں کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں اور جو بھی طریقہ کار استعمال کرتے ہیں اللہ کی حدود کو توڑتے ہیں جہاں تک حکومت کی گمراہی کا تعلق ہے اس پر باز پرس اور تنقید ضروری ہے لیکن بغاوت یا نقص امن کی اجازت تب تک نہیں دی گئی جب تک حکومت صاف کفر نہ کرنے لگے۔

صحیح بخاری میں حضرت جنادہ بن ابی امیہ نے حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے حدیث روایت کی ہے کہ " ایک مرتبہ نبی کریم (ص) نے ہمیں بلایا اور ہم نے آپ سے بیعت (عہد) کی آپ (رض) نے بیان کیا کہ جن باتوں کا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے ہم سے عہد لیا تھا اُن میں یہ بھی تھا کہ ہم خوشی وناگواری، تنگی اور کشادگی اور اپنے اوپر ترجیح دیئے جانے میں اطاعت وفرمانبرداری کریں اور یہ کہ حکمرانوں کے ساتھ حکومت کے بارے میں اس وقت تک جھگڑا نہ کریں جب تک صاف کفر نہ دیکھ لیں جس کے لیے ہمارے پاس دلیل وبرہان ہو". اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکمرانوں کی رائے یا طرز حکمرانی سے اختلاف نہ کیا جائے ضرور کیا جائے لیکن اس کے لیے ان سے بھی بڑے گناہ یعنی خودکشی کا ارتکاب کہاں کا طریقہ ہے وہ بھی خدا، رسول اسلام اور جنت کے نام پر۔

اسلام میں خودکشی قطعاً حرام ہے اس کے لیے کسی بھی توجیہہ کو قبول نہیں کیا جا سکتا. یہاں تک کہ شدید بیماری کی حالت میں بھی۔ حضرت ایوب (ع) نے برسہابرس بیماری کی شدت میں گزارے لیکن صبر اور اس یقین کے ساتھ کہ جس خدا نے انہیں بیمار کیا وہی شفا دے گا اور اسی صبر کے بدلے میں شفا پائی۔

ایک شخص ایک غزوے میں بہت بہادری سے لڑا لیکن جب زخمی ہوا تو اُس نے تنگ آ کر خودکشی کرلی "حضرت جندب (رض) سے روایت ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ میرے بندے نے اپنے اوپر موت میں جلدی کی سو میں نے اُس کے لیے جنت کے دروازے بند کردیئے". یعنی نہ تو اُس کی بہادری کام آئی اور نہ اس کی شجاعت۔ بلکہ خودکشی نے اس کے سارے اعمال ضائع کردیئے یہاں تک کہ اُس کا جہاد بھی۔

جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن اس میں بھی اللہ نے حدود کی پابندی کرنے کا حکم دیا ہے. جہاد کی فرضیت کے حکم کو اس حکم اور تاکید کے ساتھ نازل کیا کہ "جو لوگ تم سے لڑتے ہیں اُن سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" (سورۃ البقرہ آیت 190)۔ حکم جہاد کے تسلسل میں ہی اسی سورۃ کی آیت 193 میں پھر تاکید کی۔۔۔۔ " ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں (کرنی چاہیے)". پھر جس مذہب نے حکم جہاد کو اتنی احتیاط کے ساتھ نازل کیا وہ اس میں یعنی جہاد میں) خودکشی کے حرام فعل کو حلال قرار دے سکتا ہے. ہر گز نہیں۔ (خودکشی ایک ایسا فعل ہے جس کی اسلام نے بہر صورت ممانعت فرمائی ہے اور ایسا کرنے والے کو سخت سزا کی وعید سنائی ہے اور حدیث نبوی کی رُو سے جس نے خود کو جس طرح ہلاک کیا دوزخ میں اُسی طریقے سے مارا جائے گا. چنانچہ ارشاد نبوی ہے جس نے خود کو لوہے کے ٹکڑے سے مارا اُسے دوزخ میں اسی لوہے کے ٹکڑے سے مارا جائے گا۔

اب خدا جانے ہمارے ملک کے ان نوجوانوں اور معصوم بچوں کو کون دین، مذہب، خدا اور جہاد کے نام پر خودکشی پر آمادہ کررہا ہے۔ اپنے آپ کو بہت بڑے علما

اور دین اور مذہب کے ٹھیکیدار سمجھنے والے کیا اسلام کی ان تمام تعلیمات سے بے خبر ہیں اگر ایسا ہے تو انہیں دیندار بننے سے پہلے اسلام کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہیئے اور اگر وہ یہ سب جانتے ہیں تو وہ تہرا گناہ کما رہے ہیں ایک، اپنے لوگوں کو دین سے گمراہ کرنے کا اور دوسرا دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے کا اور تیسرا خودکشی اور قتل کا. اور یوں وہ اسلام کو وہ ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں جو شاید غیر مسلم بھی نہ پہنچا سکیں. اگرچہ اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں کہ یہ سب کچھ کروانے میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ ان کے آلہ کار بننے والے خود کو مسلمان بلکہ مردان مومن کہتے ہیں اور اپنے ہر فعل کو عین اسلام سمجھتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں. اکثر یہ سننے میں آتا ہے جو کہ ظاہراً درست بھی ہے کہ ان حملہ آوروں کو روکنا ممکن نہیں کیونکہ یہ جان سے گزر جانے والے لوگ ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ واقعی جان سے گزر جانے والے لوگ ہیں لیکن یہ وہ کم علم یا بے علم لوگ ہیں جو اسلام کی اصل روح اور تعلیمات سے قطعاً واقف نہیں اور اسی لیے ان کو دین کے نام پر استعمال کر لیا جاتا ہے۔

اب یہ ہمارے علمائے کرام، خطیب حضرات اور مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ ہر کسی پر کفر کا فتویٰ لگا دینا اور جہاد کا اعلان کر دینا تو آسان ہے لیکن تمام عوامل کو سامنے رکھ کر اگر دیکھا

جائے تو یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے اور اگر اللہ کے سامنے جوابدہی ذہن میں ہو تو اور مشکل تر۔ اگر اسلام کو صحیح معنوں میں پیش کیا جائے تو کیا اس سے بہتر اور سچا مذہب بھی دنیا میں کوئی ہوگا۔ اسلام تو مسلمان ملک کے غیر مسلم شہریوں کی جان ومال کا محافظ بھی حکومت اور مسلمانوں کو قرار دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے "جس نے کسی اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہری کی جان لی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آنے لگتی ہے" اور یہاں ہم ہیں کہ مسلمان بھی مسلمان کے ہاتھ سے محفوظ نہیں۔

خودکش حملوں کو روکنا ممکن ہے اگر اس کام کو مشن سمجھ کر کیا جائے اور جتنی محنت خودکشی پر آمادہ کرنے والے کرتے ہیں ان ہی یا اُس سے کچھ کم محنت معاشرے کے پڑھے لکھے اور دین کو سمجھنے والے افراد اور خاص کر ہمارا میڈیا کر لے اور اس عزم کے ساتھ کریں کہ لوگوں میں اللہ پر یقین پیدا کیا جائے اس بات کا یقین کہ ہمارے مسائل کا حل خدا کے لیے مشکل نہیں اور وہ اسے پرامن طریقے سے حل کرے گا اگر ہم اس کی لیے پرامن کوشش کریں۔ جب اللہ چلنے کو کہے تو چلو دوڑو مت اگر دوڑوگے تو بھی اللہ کے نافرمان بنوگے. نہ اپنی جان کی ہلاکت کا گناہ اپنے سر لو اور نہ ان بے شمار معصوم لوگوں کے خون سے اپنی گردن بھاری کرو جو تلاش رزق میں اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور جب ان کے گھر

والے کھانے پر اُن کے انتظار میں بیٹھتے ہیں تو لاش ان کے پاس پہنچائی جاتی ہے اور کبھی وہ اپنے گھر کے کسی چشم وچراغ سے محروم ہو جاتے ہیں اور کبھی خاندان کے واحد کفیل سے اور ان سب کی مصیبت اور تکلیف کا گناہ بھی اسی مرنے والے خود کش اور اسکو اس ہلاکت پر آمادہ کرنے والے کے سر چلا جاتا ہے. حضرت عبداللہ (رض) سے روایت ہے کہ "مسلمان کو گالی دینا فسق اور اُس کو قتل کرنا کفر ہے". میں ایک بار پھر اس بات پر زور دوں گی کہ ہمارے علما اور میڈیا اس کام کو جس خوبی سے کر سکتے ہیں کوئی اور نہیں. اسلام کی صحیح تعلیمات کو لوگوں تک پہنچائیں پھر کوئی کسی کو خود کشی پر آمادہ نہیں کر سکے گا. امید اور خدا پر یقین یہ ایسے پر امن ہتھیار ہیں کہ جو انسان کو ایک اچھی زندگی جینے کی امنگ دیتے ہیں اور اللہ کی ذات پر یقین اور امید ہی عین اسلام ہیں۔

مجھے ہے حکمِ اذاں

کشمیر برصغیر تو کیا شاید کرہ ارض پر اپنے حسن بے پناہ کی نظیر نہیں رکھتا۔ لیکن ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے سے بار بار اس فردوس بر روئے زمین کے حسنِ جہان تاب کو داغدار کیا گیا اور اب بھی کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہوا ہمیشہ یہ کہ ایک کی شہادت نے دوسرے کے شوق شہادت کو مہمیز لگائی اور یہ شہادتیں آزادی کی لو کو شعلہ بناتی گئیں۔

ایسا ہی ایک ایمان افروز واقعہ اس وقت پیش آیا جب ڈوگرہ راج میں مسلمانوں کے خلاف مظالم اپنے عروج پر تھے اِن مظالم کے خلاف ایک جلسے میں عبدالقدیر نامی نوجوان کو مہاراجہ کے خلاف بولنے پر گرفتار کیا گیا اور اِس کے مقدمے کی سماعت سنٹرل جیل سرینگر میں ہونی قرار پائی جسے سننے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہوئے نماز کا وقت آیا تو ایک نوجوان نے اذان دینی شروع کی ہی تھی کہ ڈوگرہ سپاہیوں نے اسے گولی مار دی اُس کی جگہ لینے کو ایک اور نوجوان آگے آیا لیکن اسے بھی شہید کر دیا گیا اور پھر ایک ایک کرکے بائیس نوجوان شہید کر دیئے گئے شوق شہادت میں فرق نہ آیا کہ یہ مسلمان بندے جانتے تھے کہ چاہے کچھ ہو جائے انہیں ہے حکم اذاں لاالہ الا اللہ۔ یہ واقعہ 13 جولائی 1931 کا ہے لیکن اس کی ایمان افروزی میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی اور ہر سال 13

جولائی کو ان اسلام اور آزادی کے پروانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

کشمیر ایک مسلم اکثریتی ریاست تھی جسے قیام پاکستان کے وقت یقیناً پاکستان کا حصہ بننا چاہیے تھا لیکن متعصب راجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا اس سے پہلے انگریز بھی اپنی بدنیتی دکھا چکا تھا اور گورداسپور کو بھارت کو دے کر ایک ایسے فتنے کی بنیاد رکھ دی تھی جس کی شرانگیزی ابھی تک برصغیر کے امن کی درپے ہے۔ کشمیریوں پر بھارت کی طرف سے ابھی بھی وہی انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ کشمیر کی 97 فیصد آبادی مسلمان ہے جبکہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد ہجرت کر کے پاکستان اور آزاد کشمیر آچکی ہے لیکن بھارت کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ اکثریت کم نہیں ہوئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بھارت انتہائی وسیع پیمانے پر کشمیریوں کی نسل کشی میں مصروف ہے صرف 2008 میں اٹھارہ دیہات میں سے ایک ہزار سے زیادہ کشمیریوں کی نا معلوم قبریں دریافت ہوئی یہ تو ایک واقعہ ہے ورنہ کشمیری آئے دن اِن ہی حالات سے گزرتے ہیں اور بھارت سرکار طرح طرح کے ظالمانہ قوانین اس وادی میں نافذ کرتی رہتی ہے اور 1989 کے بعد جب سے کشمیر کی جدوجہد آزادی کا نیا دور شروع ہوا ہے تو بھارت کا خونی پن مزید عود کر آیا اور اس نے اپنے فوج کو مزید ظالمانہ اختیارات دیے اور اِنڈین آرمی چیف کے بقول یہ قوانین اِن کی فوج کی حفاظت کے لیے انتہائی ضروری ہیں یعنی خود اُن کا چیف بھی اِس بات کا اعتراف

کر رہا ہے کہ وہ صرف اپنی فوج کی حفاظت کا ذمہ دار ہے چاہے اِس کے لیے اسے کشمیریوں کا قتل عام کرنا پڑے جو وہ بڑی ایمانداری کے ساتھ کر رہے ہیں۔ کشمیر ایک عام سا مسئلہ نہیں کہ بھارت عالمی برادری کے سامنے اسے دہشت گردوں کی کاروائی بنا کر پیش کرے جو کہ وہ کر رہا ہے۔ دہشت گردی کی اصطلاح تو پچھلے کچھ سالوں میں عام ہوئی لیکن کشمیری تو یہ جنگ اس وقت سے لڑ رہے ہیں جب ہندو خود بھی انگریز سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے لیکن اس سب کچھ کو وہ آزادی کی تحریک کا نام دیتے تھے جبکہ انہیں انگریزوں سے اتنی زیادہ تکلیف بھی نہ تھی جتنی کشمیری بھارت کے ہاتھوں اٹھا رہے ہیں۔ روزانہ کی بنیاد پر کشمیریوں کو مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اشد ضرورتیں بھی کرفیو کی نظر ہو جاتیں ہیں لیکن بھارت سرکار کو نہ تو سلگتے بلکتے کشمیری بچوں کی پرواہ ہے نہ ہسپتال کے ضرورت مند بیماروں کی۔ اس کو صرف ایک خبط ہے کہ کشمیر کو اپنے غاصبانہ قبضہ کے میں رکھے بلکہ مرتے ہوئے کشمیری تو اِس کا کام آسان بنا دیتے ہیں کہ کشمیری مسلمانوں کی تعداد میں کمی واقعہ ہو۔ سات جولائی کا ہی واقعہ لیجئیے جب اس نے سولہ سالہ طالبعلم اور اس کے جنازے میں شریک نوجوان کو شہید کر دیا۔ سولہ سال وہ عمر ہے جسے بچوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اقوم متحدہ اپنی امن فوج کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ متاثرہ ملکوں میں سولہ سال تک کے بچوں پر ہتھیار اٹھانے سے گریز کریں۔ لیکن مغرب اور خاص کر امریکہ کے چہیتے بھارت پر یہ قانون کیوں نہیں لاگو ہوتا اور

عالمی انسانی حقوق کی تنظیمیں صرف شرط پوری کرنے کے لیے کبھی کبھار ہی کیوں کوئی بیان دیتی ہیں؟ عالمی طاقتوں سے بھارت کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتیں۔ مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے والی قومیں اگر بھارت کی سیر کو کبھی نکلیں تو وہ بھی جان جائیں گے کہ دہشت گردی کی ہر کاروائی کا ذمہ دار پاکستان کو گردانئے والا بھارت خود کیا کر رہا ہے۔ اور کشمیر تو دو ایٹمی قوتوں کے درمیان ایک سنگین مسئلہ ہے جس کی وجہ سے پورے علاقہ کا امن اور ترقی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اگر بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرے تو اس مسئلے کا حل مشکل بھی نہیں۔

کشمیری بھی آزادی کا اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا کہ دنیا کا کوئی بھی دوسرا انسان اور ان کا مطالبہ انتہائی منطقی بھی ہے کہ وہ مسلمان اکثریتی ریاست ہے اس لیے اسے ہندو کا غلام کیا جوار ہے۔ جس طرح دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو آزادی کا حق ہے جو مغرب نے ایسٹ تیمور میں میں بڑی آسانی سے تسلیم کیا وہیں سارے اصول مسلمانوں کے لیے کیوں الٹ جاتے ہیں۔ بھارت کو اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ کشمیر اس کا حصہ نہ کل تھا نہ آج۔ اگر 1931 میں کشمیری دیوانہ وار شہادت کو گلے لگا رہے تھے تو آج بھی معاملہ مختلف نہیں جس کا ثبوت 1989 سے لیکر 31 دسمبر 2009 تک کی تقریباً ترانوے ہزار شہادتیں ہیں۔ اور کشمیر بجا طور پر شہیدوں کی سرزمین کہلانے کا حقدار

ہے۔ آزادی کے یہ متوالے نہ تو کل غلامی پر رضامند تھے نہ ہی آج۔ اور یقیناً انہی شہادتوں کا ثمر جلد ہی کشمیر کی سرزمین پر آزادی کا سورج بن کر طلوع ہوگا۔

پانی اور پاکستان

پاکستان اس وقت جہاں دوسرے بہت سے مسائل اور دہشت گردیوں کا شکار ہے وہیں اس کو پانی کی کمی بلکہ یوں کہیئے کہ پڑوسی آبی دہشت گردی کا سامنا بھی ہے۔ کچھ موسمی حالات بھی ہونگے کچھ زیر زمین پانی میں کمی بھی ہوگی اور بھارت تو یقیناً اس کوشش میں مصروف ہے کہ پاکستان کو خدانخواستہ صحرا میں بدل دے جس کے لیے اس نے کشمیر میں دریاؤں اور نالوں کا رخ سرنگوں کے ذریعے بدل کر بھی ڈیم بنائے۔ اس محاذ پر جنگ یقیناً اہم اور ضروری ہے اور ہمیں ہر صورت ایک بدنیت پڑوسی کا مقابلہ کرنا ہے لیکن پانی کی کمی کے مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمیں کچھ اور اقدامات بھی کرنے ہونگے۔ زیر زمین پانی تو جو ہے سو ہے لیکن بالائے زمین بھی کچھ پانی اللہ نے اس ملک کو عطا کیا ہوا ہے جسے ہم اپنی نااہلی کے باعث کھو رہے ہیں دریاؤں پر بند باندھنا اور بڑے ڈیم تو خیر بڑے منصوبے ہیں جو بدقسمتی سے قومی اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے کھٹائی میں پڑے ہوئے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا اتفاق رائے پیدا ہونے تک ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں کہ فرشتے ہماری مدد کو آئیں گے یقیناً خدا فرشتے مدد کرنے کو بھیجتا ہے لیکن ان کے لیے جو اپنی مدد آپ بھی کرتے ہیں اور اپنی تقدیر بدلنے کے لیے اپنا خون پسینہ بہاتے ہیں۔

پاکستان میں بجلی کی لوڈشیڈنگ اور پینے کی پانی سے لے کر غذائی اجناس کی پیداوار تک ہمارے مسائل پانی کی کمی سے وابستہ ہیں۔ اصول تو یہ ہے کہ جہاں ایک چیز کم ہو اسے انتہائی کفایت اور بچت سے استعمال کیا جائے اس کے لیے انتہائی سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کی جائے۔ جو ہم نہیں کر رہے ہمارے ملک میں اگر معمول کے مطابق ہو تو بارش کا موسم دو بار آتا ہے اور اگر یہ بارشیں معمول کے مطابق ہوں تو ان کا پانی ذخیرہ کر کے اسے باقی کے خشک دنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن ہم ایسا کرتے نہیں ہیں چھوٹے ڈیم ہماری اس ضرورت کو کافی حد تک پورا کر سکتے ہیں۔

بڑے ڈیم اور بڑے منصوبے اپنی جگہ اہم ہیں لیکن چھوٹے ڈیموں کی اہمیت اور افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں بلکہ یہ چھوٹے منصوبے کم پیسہ، کم لاگت، کم جگہ، کم وقت، کم کرپشن اور کم ماحولیاتی آلودگی کے باوجود ہماری ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔ پاکستان اپنے زمینی خد و خال کے باعث وہ خوش قسمت ملک ہے جہاں بے شمار ایسی جگہیں موجود ہیں جہاں چھوٹے ڈیم بنا کر ہم نہ صرف اپنی بجلی کی ضروریات پوری کر سکتے ہیں بلکہ زراعت اور پینے کے پانی کے مسائل بھی حل کر سکتے ہیں۔ حکومت کئی بار ایسے منصوبوں کا اعلان تو کرتی ہے مگر اس پر عمل کم ہی نظر آتا ہے۔

ہمارے ہاں عموماً بھارت کو اس میں ہونے والی ترقی اور خاص کر اس کے جمہوری اداروں اور معلوم نہیں کہاں اور کیسے کیسے حوالوں کے لیے پیش کیا جاتا ہے جبکہ پانی کے معاملے میں ہم ایسا کرنے سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بھارت سندھ طاس معاہدے کی رو سے ہمیں ملنے والے دریاؤں پر بھی دھڑا دھڑ بڑے اور چھوٹے بلکہ بہت ہی چھوٹے ڈیم بھی بنا رہا ہے جس سے بہت معمولی مقدار میں بجلی کی پیداوار ممکن ہو سکے گی۔ میں بھارت کے چند ایسے ہی منصوبوں کا ذکر مناسب سمجھتی ہوں تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ کس طرح اپنی ضروریات پوری کرنے کی تگ و دو کر رہا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ ہماری ضروریات نظر انداز کر رہا ہے۔ بھارت راجوڑی میں درہالی نالہ پر 3.00 میگاواٹ، استھان میں استھان نالہ پر 0.75 میگاواٹ، بانڈی پورہ میں ماڈ مٹی نالہ پر 0.03 میگاواٹ اور بیلینگٹ میں بیلینگٹ نالہ پر 0.1 میگاواٹ کے منصوبے مکمل کر چکا ہے۔

یہ مکمل شدہ چند منصوبے ہیں جبکہ ایسے ہی کئی اور چھوٹے منصوبوں کے لیے منصوبہ بندی کی گئی ہے جن میں ہانسر کی پیداواری صلاحیت 1.3 جبکہ بارہ مولا میں ایرن کی صلاحیت 6 میگاواٹ ہو گی بھارت نے ان منصوبوں کی طرح درجنوں منصوبے مکمل کر لیے ہیں یا کر رہا ہے جبکہ ابھی ہم سوچ ہی رہے ہیں کہ انہیں

کیسے روکا جائے اور اسی اثنا میں ملک میں پانی کی قلت شدت اختیار کرتی جارہی ہے۔پاکستان میں مون سون کے موسم میں اچھی خاصی بارش ہو جاتی ہے لیکن اس پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ذخیرے نہیں ہیں تاکہ بوقت ضرورت استعمال کیا جاسکے۔ دریاؤں کے لیے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا پانی روکا جارہا ہے لیکن ہم آبشاروں اور پہاڑی ندی نالوں کے پانی کو بھی روکنے کا بندوبست نہیں کر رہے ہیں حالانکہ اگر اسی پانی کو روکا نہ بھی جائے اور ان کے بہاؤ پر ٹربائن نصب کیے جائیں اور اس سے پیدا ہونے والی بجلی کو مقامی سطح پر تقسیم کیا جائے تو بھی ہم توانائی کے اس سستے ذریعے سے بجلی پیدا کرکے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور پھر اس بہتے ہوئے پانی سے ذریعہ توانائی ہونے کی وجہ Renewable آبپاشی کا کام بھی لے سکتے ہیں۔ یوں ایک سے نہ تو پانی ضائع ہوتا ہے اور نہ ہی ماحول خراب ہوتا ہے۔ ماحولیاتی سائنس کے مطابق ایسے منصوبے ماحول کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتے۔ جبکہ اس کے برعکس جس دونوں کو Founa اور Flora طرح بھارت دریاؤں کا رخ موڑ رہا ہے وہ علاقے کے تباہ کر رہا ہے یعنی جنگلی حیات اور نباتات کو نقصان پہنچا رہا ہے۔

اب ذرا بات ہو جائے پاکستان کے چھوٹے بڑے مکمل شدہ اور چالو ڈیموں اور کچھ منصوبوں کی۔ چالو ڈیموں میں تو تین بڑے ڈیم یعنی تربیلا، منگلا اور ورسک ہیں ان کے علاوہ کچھ چھوٹے اور درمیانے ڈیم بھی ہیں۔ لیکن بڑھتی ہوئی

ضروریات پوری کرنے کے لیے یہ تعداد بہت کم ہے۔ ہمارے چاروں صوبوں میں ایسے کئی مقامات کی Feasibiliyy Study ہو چکی ہے اور اس پر لاکھوں روپیہ لگ چکا ہے لیکن ان منصوبوں پر کام شروع نہیں ہوا۔ مجھے کوئٹہ میں ولی تنگی ڈیم کو دیکھنے کا موقع ملا جو کہ انتہائی دشوار گزار اور آبادی سے میلوں دور ایک شاہکار ہے اگر اس مقام پر پانی ذخیرہ کرنے کا منصوبہ ستر کی دھائی میں تکمیل تک پہنچ سکتا ہے تو اس سے بہت سہل پوٹھوہار کے علاقے میں کیوں نہیں جہاں کم از کم 32 ایسے مقامات کی نشاندہی ہو چکی ہے۔ حکومت پنجاب نے 350 ڈیم بنانے کا اعلان تو کیا ہے لیکن عوام ان منصوبوں کی تکمیل کے منتظر ہیں۔ ہمارے ہاں بڑا مسئلہ حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ منصوبوں پر کام کا رک جانا بھی ہے۔ اور یوں خرچ شدہ رقم ضائع چلی جاتی ہے جبکہ پاکستان وہ ملک ہے جس کے پاس خرچ کرنے کو بھی پیسے نہیں ہیں کجا کہ ضائع کرنے کو۔ ایسے ہی کچھ اور Feasibality Study منصوبے بھی ہیں جن کے اوپر کافی پیسہ خرچ ہو چکا ہے ہو چکی ہے لیکن کام شروع نہیں کیا گیا۔ 2005 میں اورسکرئی ایجنسی میں چھ ایسے مقامات کی نشاندہی کی گئی جو چھوٹے ڈیم بنانے کے لیے موزوں تھے۔ سہون شریف سندھ میں 1.3 ملین ایکڑ فٹ کے ذخیرہ آب کے لیے سروے پر 113000 ملین روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ بلوچستان میں بیس چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کا حکومت نے اعلان کیا ہے۔ شمالی علاقہ جات تو خیر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے ایسے مقامات سے مالامال ہے۔

ہمارے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم منصوبے بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور پاکستانیوں کے بنائے ہوئے منصوبے جب دوسرے ممالک اپنے ہاں بروئے کار کاتے ہیں تو شاندار نتائج دکھاتے ہیں لیکن ہم اپنے بنائے ہوئے منصوبوں پر خلوص دل سے عمل نہیں کرتے۔ منصوبے بنانا اپنی جگہ اہم لیکن اس کی تکمیل ہی ملک کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتی ہے۔ اس وقت ہم پانی کے جس مسئلے سے دوچار ہیں اس کے حل کی ہر سطح پر کوشش کرنا ضروری ہے۔ بین الاقوامی طور پر بھارت کے مجرمانہ رویے کو اجاگر کرنا اور اسے مجبور کرنا تو مسئلے کے حل کی ایک کوشش ہے لیکن قومی سطح پر بھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔بڑے ڈیموں کی تعمیر بھی اپنی جگہ ضروری ہے لیکن چھوٹے ڈیموں کیطرف توجہ دینا بھی ازحد ضروری ہے اور اگر ان سے حاصل ہونے والی بجلی کو نیشنل گرڈ سے منسلک کرنے کی بجائے مقامی طور پر ہی تقسیم کر دیا جائے تو یوں ہم قومی نظام پر بوجھ کو بھی کم کر سکتے ہیں اور ہماری بند ہوتی صنعتوں کے لیے بجلی مہیا ہونا بھی ممکن رہے گا یہ منصوبے ہماری زراعت پر بھی انتہائی خوش گوار اثرات مرتب کرینگے اور زرعی ملک کے عوام غذائی اجناس اور خوراک کی جس کمی کا شکار ہیں اس پر بھی قابو پایا جا سکے گا۔

سٹریٹیجک ڈائیلاگ۔۔۔ اعتماد سازی امریکہ کی ذمہ داری

ایک بار پھر ہیلری کلنٹن پاکستان کے دورے پر آئی اور الزامات اور مطالبات کی پھر ایک طویل فہرست ہے جو آکر سنا گئی۔ یہ سب کچھ اب ایک معمول بن گیا ہے۔ ایک انوکھی بات جس کا ہیلری نے اس بار اضافہ کیا یا یوں کہیے ایک پینترا بدلا وہ یہ تھی کہ پاکستان اپنی جنگ لڑ رہا ہے اور امریکہ اس کی مدد کر رہا ہے۔ اس سے پہلے امریکہ پاکستان کو اپنا فرنٹ لائن اتحادی کہتا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم ہیلری سے کہتے کہ آپ افغانستان سے اپنی افواج نکال لیجیئے علاقہ خالی کر دیجیئے اپنے آپ کو سنبھال لیجیئے ہم خود کو دیکھ لیں گے کیونکہ جب آپ چلے جائیں گے تو ہمارا امن خود بخود بحال ہو جائے گا۔ پھر ہمیں کسی جنگ کی ضرورت نہیں رہے گی لیکن افسوس کہ حکومتی سطح پر ہم اس کی جرات نہیں کر پاتے۔ اس میں امریکہ کا قصور نہیں ہے بلکہ قصور ہماری کمزوریوں کا ہے اگر آج بھی ہم یہ یقین پیدا کر لیں کہ ہم اپنے بَل بوتے پر زندہ رہ سکتے ہیں کیونکہ قومیں دوسروں کی امداد پر ترقی نہیں کر سکتیں تو خود بخود ہمارے بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

امریکہ بڑے دھڑلے سے اپنی الزام تراشی اور مطالبات میں مصروف ہے مطالبہ یہی

کہ پاکستان مزید اقدامات کرے اور ضد یہ کہ امریکہ کو پاکستان سے شدید خطرہ ہے۔ اسامہ بن لادن کی پاکستان میں موجودگی ثابت کرنے پر ہی امریکہ کا سارا زور ہے یہ لایعنی خوف بھی امریکہ کو دامن گیر ہے کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں یہ مفروضہ کہ اگر امریکہ پر حملہ ہوا تو پاکستان ہی کی طرف سے ہوگا یعنی چاہے وہ اصل میں امریکہ کی کسی ریاست سے ہی ہوا ہو ذمہ داری پہلے سے ہی پاکستان کے سر تھوپ دی گئی ہے اور ساتھ ہی سنگین نتائج کی دھمکی بھی دے دی گئی ہے۔

امریکہ پاکستان کی اہمیت سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ افغان جنگ وہ پاکستان کی مدد بغیر نہیں جیت سکتا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی شرائط اور مطالبات منوانے پر مصر ہے جبکہ پاکستان کے مسائل سے مسلسل نہ صرف چشم پوشی کرتا ہے بلکہ ان کے حل سے انکاری رہتا ہے۔ امریکہ نے بذریعہ ہیلری واضح طور پر پانی اور کشمیر کے مسائل پر بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی کسی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے بھارت اس کے لیے ہمیشہ پاکستان سے زیادہ اہم رہا ہے وہ بھارت کو سول نیوکلئیر ٹیکنالوجی دینے پر راضی ہے لیکن پاکستان کے ساتھ نہ صرف خود کسی بھی ایسے معاہدے سے انکاری ہے بلکہ دوسروں پر بھی تنقید کر رہا ہے اور پاک چین معاہدے پر کھل کر اعتراض کر رہا ہے۔ پھر امریکہ کہتا ہے کہ پاکستان پر اعتماد کا فقدان ہے اگر ایسا ہے تو امریکہ کو پاکستان سے لاتعلق

ہو جانا چاہیے، اسے پاک فوج، آئی ایس آئی اور پاکستانی عوام کسی پر بھی اعتماد نہیں ہے تو پاکستان کے اتنے دورے کیا معنی رکھتے ہیں۔ پاکستانی عوام بھی امریکہ سے تعلقات پر کسی قسم کی خوشی محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ اسے اپنے بہت سارے مسائل خاص کر امن امان کی خرابی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ امریکی دورخی کے بہت سارے دور اس ملک کے عوام نے دیکھے ہیں۔ خود امریکہ طالبان سے بات چیت کر رہا ہے جبکہ ہم سے مطالبہ ہے کہ ان کے خلاف مسلسل لڑتے رہو۔ جنوبی وزیرستان کے بعد شمالی وزیرستان میں آپریشن پر اسکا اسرار ہے بات دراصل یہ ہے کہ اس کے لیے ہمارے عوام کی جانیں اور نہ ہماری افواج کی زندگی اہم ہے۔ اس کا طویل المیعاد منصوبہ یہ ہے کہ اس مسلمان ایٹمی ملک کی قوت کو آپس میں لڑا کر ختم کر دیا جائے اور جنوبی ایشیا میں امریکہ اور اس کے مسلم دشمن دوست بھارت اور اسرائیل کھل کھیلیں۔ افغانستان میں امریکی دلچسپی کا راز اب راز نہیں رہا کہ وہ علاقے میں اپنی موجودگی قائم رکھنے کے لیے اسامہ کے بہانے گھس آیا تھا کہ چین کے نزدیک ترین رہے اور اپنی ترقی قائم رکھنے کے لیے وسطی ایشیا سے معدنی تیل کی دولت پر ہاتھ ڈالنے کی آسانی ہو اور یوں چین کو سپر پاور نہ بننے دے۔ اسرئیل کے ذریعے بھارت کی مضبوطی بھی امریکی مقاصد میں شامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ کو بھارت سے اس قدر ہمدردی کیوں ہے صرف اور صرف اس لیے کہ بھارت پاکستان کا دشمن ہے اور پاکستان ایک اسلامی ملک ہے بات دوسروں پر تنقید کرنے سے نہیں بنے گی ان حالات میں خود ہمارا

قصور اُن سے زیادہ ہے ملک ہمارا ہے حکومت ہماری ہے لوگ ہمارے اور قوم ہماری ہے پھر ہم اُن کو اتنا اختیار کیسے اور کیونکر دے رہے ہیں کہ وہ ہمارے فیصلے کریں۔

افغانستان کو تجارتی راہداری دینے کی تقریب میں ہیلری کی خوشی دیدنی تھی جبکہ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے چہرے کا تناؤ بھی صاف نظر آرہا تھا۔ لیکن بات تو یہ ہے کہ پاکستانی مفادات کے خلاف یہ معاہدہ کیا صرف ہیلری کی خوشی کے لیے کیا گیا اور کیوں۔

کیا اب ہم دو طرفہ فیصلے بھی امریکہ کی مرضی سے کریں گے بغیر یہ دیکھے کہ اُس کے ہماری معیشت اور معاشرت پر کیا اثرات مرتب ہونگے۔ اب اسی معاہدے کو لیجیئے افغان ٹرک کیا لائینگے اور کتنے ٹرک راستے میں سے غائب ہونگے یا اُس میں موجود مال، اسلحہ اور ہیروئن پاکستان میں اتار کر تبدیل کر لیا جایا کرے گا اور پھر اس کے ہمارے معاشرے پر جو اثرات مرتب ہونگے وہ سبھی جانتے ہیں بقول حکومت کے پاک فوج اور آئی ایس آئی سے بھی اس معاہدے کے بارے میں مشورہ لیا گیا حیرت ہے اگر ان دونوں اداروں نے بھی اس نا معقول معاہدے کی حمایت کی ہو۔

امریکہ تو وہ بدنام طاقت ہے جسے نہ دوستی وقار کے ساتھ کرنی آتی ہے نہ دشمنی۔ وہ دوستی میں بھی ہمیشہ دشمنی ہی کرتا ہے۔ پاکستان کے معاملے میں اُس کا کم از کم یہی ریکاڈ ہے اس لیے ہمارے لیے اب بہتر یہی ہے کہ امریکہ کی دوستی کا نعرہ لگانا چھوڑ دیں اور خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش

شروع کر دیں۔ چند کروڑ ڈالر کی امداد نہ تو پاکستانی معیشت کو سہارا دے سکتی ہے اور نہ اٹھا سکتی ہے اور نہ ہمیں اس پر انحصار کرنا چاہئیے۔ قومیں اپنے زور بازو پر ہی ترقی کر سکتیں ہیں۔ آج بھی اگر دہشت گردی کے خلاف جنگ روک دی جائے اور جو کچھ اس پر خرچ ہو رہا ہے وہ ملکی ترقی پر خرچ ہو تو کیا ہمارے بہت سارے مسائل حل نہ ہو جائیں۔ حکومت پاکستان کو اپنے فیصلے خود کرنے کی عادت ہو جانی چاہیئے اور امریکہ کے دباؤ سے باہر آجانا چاہیے۔

جہاں تک ہیلری کا یہ کہنا کہ امریکہ اور پاکستان میں اعتماد کا فقدان ہے تو مجھے اس سے اتفاق ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ امریکہ کبھی بھی ضرورت کے وقت پاکستان کے کام نہیں آیا۔ اعتماد سازی کے لیے پاکستان سے مطالبات کرنے کی بجائے اب اسے خود بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اب صرف چند کروڑ ڈالر اور بھاری بھر کم اصطلاحات مثلاً Non NATO Allie, Front Line State Strategic Dialogue وغیرہ سے بات نہیں بنے گی۔ باہمی گفت و شنید کو اگر Strategic Dialogue کہہ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی کوشش کی جائے تو اس کا حاصل کچھ نہیں کیونکہ موقع پر ملنے والی امداد اگر Level سے بھی کم ہو تو امریکہ اپنی برپا کردہ جنگ میں فتح کی امید کیسے رکھتا ہے Tactical ہاں اس سے پاکستان کی معیشت تباہ کرنے اور پاکستان کا مستقبل تاریک کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لہذا اعتماد سازی کے لیے امریکہ کو خود کچھ اقدامات کرنا ہونگے سب سے پہلے تو اُسے

پاکستان اور بھارت کے لیے الگ الگ نکتہ نظر نہیں رکھنا ہوگا اور پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑے مسائل یعنی پانی اور کشمیر کے تنازعے میں بھارت پر دباؤ ڈالنا ہوگا۔ اور مزید اُسے افغانستان کے راستے پاکستان کا امن وامان خراب کرنے سے گریز کرنا ہوگا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسے ہوسِ ملک گیری ختم کرکے یہ علاقہ خالی کرنا ہوگا یوں نہ امریکہ رہے گا اور نہ دہشت گردی۔

جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری

بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے بالکل بجا کیونکہ اس آبادی ایک ارب سے زیادہ ہے بھارت میں ہر روز کچھ نہ کچھ نیا ضرور ہوتا ہے کیونکہ اتنی بڑی آبادی میں کوئی تو کوئی نہ کوئی صلاحیت ضرور رکھے گا۔ 3,287,263 مربع کلومیٹر کے رقبے میں پیداوار بھی ہوگی۔ یہ بھی درست ہے کہ بھارت کا جی ڈی پی بھی بڑھ رہا ہے لیکن اس چمکتی دمکتی ابھرتی اقتصادی قوت بھارت میں ہر رات لاکھوں بے خانماں لوگ سڑکوں پر بھی سوتے ہیں کیونکہ ان کی حکومت ان کو گھر نہیں دے سکتی یوں بھارت کو اپنی جی ڈی پی بڑھانے کے لیے سستے مزدور میسر آتے رہتے ہیں۔ بھارتی حکومت اپنے ملک کے حقیقی مسائل کی طرف توجہ دینے کی بجائے پروپیگنڈا کرنے اور پاکستان دشمنی پر اپنی توجہ زیادہ مبذول رکھتی ہے۔ اگر اسے اپنے عوام کی فکر ہوتی تو 1984 سے روتے بلکتے سسکتے ہوئے بھوپال کے لوگوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش ہی سہی کر چکا ہوتا۔ 1984 میں یونین کاربائیڈ سے خارج ہونے والی خطرناک تابکاری سے جس طرح 25 ہزار افراد لمحوں میں لقمہ اجل بنے اور ایک نسل معذور اور اپاہج پیدا ہوئی ان کی کوئی شنوائی آج تک نہ ہوئی اور آج بھی بھوپال کے لوگ سراپا احتجاج ہیں کہ نہ تو بھارت سرکار نے یونین کاربائیڈ سے کوئی ہرجانہ یا جرمانہ وصول کیا اور نہ ہی خود اِن متاثرین کی وہ مدد کی جس

کے وہ مستحق تھے۔ عالمی تنظیمیں کئی بار اس صورت حال پر تشویش کا اظہار کر چکی ہیں کچھ بھارتی بچوں نے امریکہ میں یونین کاربائیڈ کے دفتر کے سامنے مظاہرہ بھی کیا لیکن بھارتی حکومت کو تاحال اس مسئلے کو حل کرنے کی فرصت نہ مل سکی ہے یعنی وہ اس کو ضروری کام سمجھ ہی نہیں رہی۔

بھارت کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور نعمت سے نوازا ہوا ہے اور وہ ہے اس کی سرحد پر موجود ایک مسلمان ملک جو اس کے رعب میں آنے سے انکاری ہے لہٰذا بھارت اپنے ہاں ہونے والی ہر خرابی کی ذمہ داری اُس کے سر ڈال کر دنیا کے سامنے سرخرو ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے ممبئ حملوں کے بارے میں اُس نے کیا اور چمکتے بھارت کی چمکتی اِنٹیلیجنس ایجنسیاں اپنی ہر ڈیوٹی سے بری الذمہ ہو گئیں۔

بھارت جو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہتا ہے وہاں نہ تو اقلیتوں کو تحفظ حاصل ہے اور نہ نچلی ذات کے ہندوؤں کو۔ مسلمانوں پر حملے تو ہندوؤں کے مقدس مذہبی فرائض میں شامل ہے اور کشمیر اس کام کے لیے بھارت کا بہترین انتخاب ہے۔

اسی ماہ جولائی میں ہی کشمیر میں ایک طویل کرفیو لگا رہا، زندگی معطل رہی، احتجاج کرنے والوں پر گولیاں اور لاٹھیاں برسائی گئیں، اخبارات چار دن بعد شائع ہوئے، عالمی میڈیا کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دی گئی، جو

کچھ بھارتی میڈیا نے دکھا دیا بس دکھا دیا۔ یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک چمکتے دمکتے اور ناقابل یقین بھارت کی جو خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہتا ہے۔

مسلمانوں کے حقوق بھارت کے دیگر حصوں میں بھی محفوظ نہیں اِن کی مساجد ہندوؤں کے نشانے پر رہتی ہیں بابری مسجد اس کی سب سے بڑی مثال ہے جہاں رام مندر تعمیر کرنے کے لیے پھر سے منصوبہ بندی کی جارہی ہے اور شیو سینا پھر سے اپنے مذموم عزائم طے کرنے کے لیے اکٹھی ہو رہی ہے۔ 2007 میں اجمیر شریف، مالیگاؤں اور مکہ مسجد میں دھماکوں کا واحد گرفتار مجرم اسیم آنند ابھی بھی سزا سے محفوظ ہے اور باقی مفرور کیونکہ یہ سب ہندوں تھے جبکہ مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ میں اس قدر جلدی کی جاتی ہے کہ نام نہاد منصوبوں سے پہلے ہی انہیں پکڑ لیا جاتا ہے۔

پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ اِکا دُکا کوئی واقعہ ہو جائے تو اُسے پوری دُنیا میں اچھال دیا جاتا ہے جبکہ اُس کے لیے بھی بھارتی حکومت اور را کی امداد خارج از امکان نہیں ہوتی۔ لیکن اُسے مذہبی شدت پسندی قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ اُس میں کسی مذہبی جماعت اور مذہبی راہنما کا قطعاً کوئی ہاتھ یا کردار نہیں ہوتا۔ جب صرف مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے اور ایک انتہائی

مکروہ تعصب کی بنا پر جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاکے بنانے کی جسارت کی گئی اور مسلمان اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو انہیں بنیاد پرست کہہ دیا گیا جبکہ اور اہل مغرب صرف Shining India ای بھارت کو جسے آج کل خود بھارتی مسلمانوں اور پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے ایشین ٹائیگر ثابت کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے ان کے سترھویں صدی کے ایک راجہ شیواجی جسکے کردار کو ہندو خواہ مخواہ افسانوی بنا کر پیش کرنے کے چکر میں رہتے ہیں پر ان کے عقائد کے خلاف کتاب لکھی گئی تو بھارت سرکار نے اس پر پابندی لگا دی۔ امریکی مصنف جیمس لین کی کتاب Shiva Jee Hindu King in Islamic India پر بھارتی سپریم کورٹ نے پابندی ختم کی لیکن شیو سینا اس کی فروخت کی اجازت نہیں دے رہی اور اسی دھمکی کی وجہ سے کوئی دکاندار اسے فروخت کرنے پر آمادہ نہیں لیکن حیرت ہے اس سب کچھ کو بنیاد پرستی قرار نہیں دیا جاتا جسے بھارت میں سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔

نکسل باڑی تنظیم بھارت کے ماتھے پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہے جہاں حیرت انگیز جی ڈی پی نہ تو نظر آتی ہے اور نہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خود بقول سونیا گاندھی کے ان دور دراز کے قبائلی علاقوں میں ناقص حکومتی منصوبہ بندی کی وجہ سے ترقی کا نہ ہونا ہی نکسل ازم کی وجہ ہے۔ لیکن نکسل اب طفل تسلیوں کی حد سے آگے جا چکے ہیں وہ اس Shinning India کا حصہ بنے رہنے پر تیار

نہیں جس کی ترقی میں ان کے ذرائع اور ان کا خون شامل ہے لیکن اس ترقی میں ان کا حصہ کوئی نہیں۔ نکسل باڑی تو دور دراز کے علاقوں میں بستے ہیں بھارت کے تو بڑے شہر غربت سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں کولکتہ دنیا کے گندے ترین شہروں میں سے ہے جبکہ میڈیا پر نظر آنے والے بھارت میں نہ تو غریب نظر آتا ہے نہ غربت حالانکہ 2011 تک غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد 405 ملین ہو جائیگی اور ممبئی اور کولکتہ جیسے شہروں میں ایک بہت بڑی تعداد کھلے آسمان تلے رات بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اب بھی سائیکل رکشہ وہاں نظر آتا ہے۔ یہ اکیسویں صدی کی ابھرتی ہوئی اقتصادی قوت بھارت کے اصل چہرے کی چند جھلکیاں ہیں جن کا دنیا کو نظر آنا ضروری ہے اور بھارت جیسے متعصب ملک کو جو اپنی اقلیتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا جو اپنے لوگوں کو چھت مہیا نہیں کر سکتا جو اپنے دور دراز علاقوں میں ترقی نہیں پہنچا سکتا کو کوئی حق حاصل نہیں کہ اسے دنیا میں اتنی اہمیت دی جائے کہ اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی رکنیت کا اہل سمجھا جائے یا اُسے عظیم جمہوریت قرار دیا جائے۔بڑی جمہوریت ہونا تو خیر صرف تعداد کی بات ہے۔ صرف پاکستان پر فوقیت دینے کی خاطر بین الاقوامی ایجنسیاں بھارت کا اصل چہرہ نہ چھپائے بلکہ اسے دنیا کو ضرور دکھائے تاکہ دنیا اصل حقیقت سے آگاہ رہے اور بھارت کے پڑوسی اس کے شر سے محفوظ رہے۔

قوم کی جنرل کیانی سے مستقبل میں توقعات

چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی کی مدت ملازمت میں توسیع پر تبصروں اور تجزیوں کا ایک سلسلہ ہے کہ چل رہا ہے کوئی تائید کر رہا ہے اور کوئی اعتراض۔ اگرچہ موافقت مخالفت سے بہرحال زیادہ ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مؤثر دلائل دے رہے ہیں۔ معترضین کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ کوئی شخص ناگزیر نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ اداروں کو شخصیات سے زیادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ یہ دونوں باتیں بالکل صحیح لیکن اگر اس وقت ملکی حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس میں جنرل کیانی کے کردار کو پرکھا جائے تو حکومت کے اس فیصلے کو بہتر فیصلہ سمجھا جاسکتا ہے۔ ہاں اس کام کو جس طریقے سے کیا گیا اس نے ہی شاید اس معاملے کو کسی حد تک متنازعہ بنا دیا۔ جنرل کیانی ایک سرکاری ملازم ہیں حکومت کئی بار سرکاری ملازمین کی مدت ملازمت میں توسیع کرتی رہتی ہے۔ اگر اس توسیع کو بھی اسی طرح خاموشی سے کیا جاتا تو جو تھوڑا بہت اعتراض ہو رہا ہے نہ ہوتا۔ اسکے لیے خاص کر وزیراعظم کی تقریر اور 2013 تک تمام اعلی ترین عہدیداروں یعنی صدر، وزیراعظم، چیف جسٹس اور آرمی چیف کا اپنے اپنے عہدوں پر رہنے کی بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر حکومت نے جو کیا وہ تو کر لیا اور جو طریقہ کار اپنایا وہ ایک الگ بحث ہے لیکن کیا پاکستان کے موجودہ حالات میں اس

توسیع کو غلط قرار دینا درست ہوگا جب کہ افواج پاکستان اس وقت کئی محاذوں پر برسرپیکار ہے۔ سرحدوں کی حفاظت تو خیر اس کی اولین ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری میں عوام کی پشت پناہی کے علاوہ اس کا کوئی مددگار نہیں لیکن اُسے سرحدوں کے اندر جس خطرناک ترین جنگ کا سامنا ہے بسا اوقات اس میں اُسے عوام کی پشت پناہی بھی میسر نہیں ہوتی۔ ایسے میں جنرل کیانی نے پیشہ ورانہ انداز سے حالات کو قابو کیے رکھا۔ انہوں نے جس وقت فوج کی قیادت سنبھالی اس وقت جنرل مشرف کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے فوج اور فوج کے کردار پر ہر طرف سے انگلیاں اٹھ رہی تھیں اگرچہ کیا دھرا ایک شخص کا تھا لیکن نامقبولیت پورے ادارے کے حصے میں آرہی تھی وہی فوج جسے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے اب اسکے بارے میں منفی رائے دی جانے لگی تھی جنرل کیانی کے لیے یہ ایک اور محاذ تھا جسے انہیں سر کرنا تھا اور انہوں نے بڑی مہارت سے اس محاذ کو سنبھالا جس کے لیے انہوں نے فوج کو نہ صرف 2008 کے انتخابات سے دور رکھا بلکہ سول اداروں سے فوجی افسران کو واپس بلا کر انتظامی امور سے بھی الگ کر دیا قومی معاملات میں انہوں نے ایک اہم کردار ادا کیا ججوں کی بحالی کے معاملے میں انکا کردار سب ہی جانتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے پس پردہ رہ کر اس معاملے کو سنبھالا۔ یہ درست ہے کہ یہ سب ان کے کام نہ تھے لیکن ایک عام محب وطن شہری بھی اگر کسی قومی معاملے کو سلجھا سکے تو ضرور اس کی کوشش کرتا ہے تو ایک اعلیٰ عہدے دار کا تو یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ضرور یہ قدم

اٹھائے۔ کیری لوگر بل پر جب حکومت نے قومی وقار کو ایک طرف رکھنے کی کوشش کی تو ایک بار پھر جنرل کیانی نے ایک اچھے رہنما کا کردار ادا کیا یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب بھی نا پختہ کار سیاسی حکومت کے قدم لڑکھڑائے یا ڈگمگائے تو جنرل کیانی نے جمہوریت کو چھیڑے بغیر اس کی مدد کی۔

دوسری طرف انہوں نے سوات، جنوبی وزیرستان اور خیبر ایجنسی وغیرہ میں آپریشن کامیابی سے مکمل کیے۔ شمالی وزیرستان میں آپریشن نہ کرنے کا فیصلہ بھی انہوں نے ہی کیا اور ظاہر ہے یہ سب کچھ انہوں نے قومی مفاد میں ہی کیا لہٰذا ان پر کسی کو اعتراض کرنے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ نہیں مل پا رہی۔ ملکی اور قومی مفاد بہرحال اولین ترجیح ہونی چاہیے اور اسی اصول کو انہوں نے اپنائے رکھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دوسرا چیف آئے تو کیا وہ یہ سب کچھ نہ کرے گا تو یقیناً کرے گا کیونکہ فوج ایک منظم ادارہ ہے یہاں کا ہر افسر اتنی ہی قائدانہ صلاحیتوں کا مالک ہے جتنے جنرل کیانی اس لیے جہاں تک بات رہی ترقی کے منتظر جرنیلوں کی تو میرے خیال میں جہاں ملکی مفاد ذاتی مفاد سے ٹکرائے تو اپنی تربیت کے عین مطابق ہر فوجی افسر اپنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر قومی مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور یقیناً اس معاملے میں بھی انہیں ایسا کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا ہوگا۔

درحقیقت توسیع کے بعد کا یہ دور جنرل کیانی کے لیے ایک مشکل ترین دور کا آغاز ہے۔ قوم اب تک انکو جتنا آزما چکی ہے اس کے نتائج کی بنیاد پر ان سے توقعات میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ فوج کو انتظامیہ اور حکومت کے کاموں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے اور ایک بہترین فوج کو اپنی تمام تر توجہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور سرگرمیوں پر مرکوز رکھنی چاہیے لیکن اس وقت پاکستان جن گوں ناگوں مسائل سے دوچار ہے اور انتظامی اور سیاسی امور میں جس طرح کی عادات اپنائی جاچکی ہیں ان کی درستگی کے لیے جو شخص یا ادارہ بھی آگے بڑھے عوام اسے خوش آمدید کہیں گے اور فوج اپنی بہترین صلاحیتوں کی وجہ سے حالات کو سدھارنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ جنرل کیانی کو سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسائل ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے بلکہ جس طرح انہوں نے کیری لوگر بل یا ججوں کے معاملے میں پس پردہ رہ کر ملک کے بہترین مفاد کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اب انہیں دوسرے مسائل کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ عالمی سطح پر جس طرح پاکستان کو کرپٹ ترین ممالک میں شامل کیا جارہا ہے یہ داغ دھونے میں انہیں ایک مثبت کردار ادا کرنا ہوگا اور اگر کرپشن ملک سے ختم ہوگئی تو سمجھئے کہ ملک خود بخود ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا اور عوام کے بہت سے مسائل بھی خود ہی ختم ہو جائیں گے جمہوریت کو derail کرنے کا جو الزام فوج پر لگایا جاتا ہے اگر اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اس میں بھی زیادہ

قصور سیاست دانوں کا ہی نظر آتا ہے جو اپنے اقتدار اور وزارتوں کے حصول کے لیے ہر ایسے جرنیل کی دل کھول کر حمایت اور تائید کرتے ہیں اور جب ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے تو ایک جنرل کے پیچھے پوری فوج کو موردِ الزام ٹھرانے لگتے ہیں۔ جنرل کیانی نے اب تک تو اس تاثر کو بہت حد تک زائل کیا ہے اور قوم ان سے آئندہ بھی ایسی ہی توقع رکھتی ہے۔

بہرحال ایک عام پاکستانی کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ آرمی چیف کون ہے وہ ملک کی بھلائی چاہنے والے ہر چیف کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور جنرل کیانی کے بارے میں ایک عام پاکستانی ایسی ہی سوچ رکھتا ہے۔

سیلاب ۔۔۔ آبادیاں بَن ہو گئیں

29 جولائی 2010 کو آنے والا سیلاب ابھی رکا نہیں آگے بڑھتا جا رہا ہے اور پیچھے بستیوں کی بستیاں اُجاڑ رہا ہے۔
صوبہ خیبر پختونخواہ میں مون سون کی بارشوں کا تناسب پنجاب یا سندھ سے کم ہوتا ہے لیکن اس بار غیر معمولی بارشوں نے اس صوبے کو ہلا بلکہ بہا کر رکھ دیا ہے۔
سیلاب کا بڑا ریلا گزرنے کے تین چار روز بعد جب راستے کھلے تو ہم نوشہرہ میں اپنے گاؤں گئے۔ راستے میں حکومت کی طرف سے ناکافی بلکہ نہ ہونے کے برابر امداد کے خلاف مظاہرے کی وجہ سے کنڈر کے مقام پر ٹریفک رکی ہوئی تھی کوئی گھنٹہ بھر بعد بھی جب راستہ نہ کھلا تو مجبوراً ہم مڑ کر پشاور موٹر وے کے راستے نوشہرہ کے لیے چل پڑے۔ چارسدہ کا علاقہ شروع ہوتے ہی موٹر وے کی گرین بیلٹ پر سینکڑوں خاندان کھلے آسمان تلے پڑے نظر آئے۔ کچھ عرصہ پہلے اسی صوبے کے شہر سوات کے لوگ اسی طرح کسمپرسی کے عالم میں دربدر خاک بسر ہوئے تھے اب ایک بار پھر وہی عالم تھا ننھے بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سب

ہی موجود تھے۔ پختونوں کے ہاں عورتوں کے پردے کا انتہائی اہتمام کیا جاتا ہے لیکن آج کے حالات میں ایسا ممکن نہ تھا۔ جب کچھ بچوں کو ہم نے ٹافیاں دیں تو انکے چہروں سے پھوٹنے والی خوشی انکی معصومیت کی گواہ تھی۔ ہم نے کئی گاڑیاں دیکھیں جو لوگوں میں اشیائے خوردنی تقسیم کر رہی تھیں کچھ لوگ پانی کی بوتلیں بانٹ رہے تھے یہ سب اس عام تاثر کی نفی کر رہا تھا کہ اس بار امداد کا پرانا جذبہ نظر نہیں آ رہا لیکن یہ سب کچھ انفرادی یا چھوٹے چھوٹے گروپوں کی صورت میں کیا جا رہا تھا جو کیمپ مختلف فلاحی اداروں یا سیاسی جماعتوں کی طرف سے لگائے گئے تھے بظاہر تو ویران اور خالی پڑے ہوئے تھے جبکہ 2005 کے زلزلہ متاثرین کے لیے یہی کیمپ ہم نے بھرے ہوئے دیکھے تھے اب بھی ایسا نہ تھا کہ لوگ امداد نہ دے رہے تھے لیکن لگتا یہ تھا کہ اب ان کا حکومت پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ اور وہ یہ کام خود کرکے تسلی کر رہے ہیں کہ حق بحقدار رسید۔ اور ایسا محسوس کرنے کی بڑی ٹھوس وجوہات موجود ہیں۔ اس وقت جب سیلاب زوروں پر تھا تو ملک کے انتظامی سربراہ یعنی وزیراعظم گوجرانوالہ میں سیاسی جلسے سے خطاب کر رہے تھے اور وفاق کی علامت صدرِان مناظر کی تاب نہ لاسکے اور یورپ کے دورے پر نکل گئے۔

قارئین! الیکٹرانک میڈیا پر نظر آنے والے تو کچھ مناظر ہیں اگرچہ کیمرے کی آنکھ نے حتیٰ المقدور کوشش کی ہے اور مناظر کو فلم بند کرکے عوام اور

حکمرانوں کو دکھایا لیکن ان خانماں برباد وں کے بارے وہ کچھ سوچا نہیں جاسکتا جو دیکھا جاسکتا ہے۔ گاؤں کے ایک سرے پر موجود تقریباً تین سو گھروں کی آبادی مکمل طور پر پگھل کر پانی میں بہہ چکی ہے بے شمار مویشی اور پولٹری فارمز کی مردہ مرغیاں سطح آب پر تیرتی ہوئی نظر آئیں فصلیں گری ہوئی پڑی تھیں۔ جو مکین گاؤں سے بر وقت نکل چکے تھے وہ تو نکل گئے لیکن جو گاڑیاں نہ ہونے یا ٹرکوں اور ٹرالیوں پر جگہ نہ ملنے کے باعث پیچھے رہ گئے وہ یا تو دریائے کابل کی بپھری ہوئی موجوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ورنہ تو ان نامہربان لہروں کے ساتھ بہہ گئے۔ ابھی یہ سیلِ آب رکا نہیں ہے لیکن نہ گھر چھوڑنا آسان ہے نہ بنانا اور دوبارہ بنانا تو تکلیف دہ بھی ہے جب پانی کچھ اترا اور یہ مکین واپس اپنے گاؤں پہنچے تو کچھ تو ہر ایک اجنبی سے پوچھتے رہے جو پتہ تھا ان کے گھر کا اور جن کو اپنے گھر کی عمارت سلامت ملی تو نہ تو گھر کی چار دیواری تھی نہ سامان۔ جو کچھ ملا اس پر اللہ کا شکر ادا کیا اور اسی کو سمیٹنا شروع کیا۔ وہ گھر جو دوسروں کو کھلاتے تھے خود امدادی دیگوں سے کھانے پر مجبور تھے جن گھروں میں سب جانیں بچ گئی وہ اسی پر صابر وشاکر تھے ورنہ نہ بستر تھا نہ چارپائی، نہ آٹا نہ روٹی یہ حال تو دریائے کابل کے کنارے کے چند دیہات یعنی محب بانڈہ، پشتون گڑھی، امان کوٹ، چوکی درب، اضاخیل، لالہ کلے اور امان گڑھ اور ان کے آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا تھا اس وقت تو پورا ملک اس پانی کی لپیٹ میں ہے اور

مزید کئی دن رہے گا سیلابی ریلا خیبر پختونخواہ میں تو بے خبری میں آیا پنجاب اور سندھ کی حکومتوں کو تو معلوم تھا کہ پانی ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے لیکن کیا انہوں نے اس سے بچاؤ کے لیے کچھ کیا سوال یہ ہے کہ ہماری حکومتوں اور NDMA کی منصوبہ بندی کیا ہے یا یہ حادثوں کے منتظر رہتے ہیں لیکن اب کی بار تو ان حالات میں بھی یہ لوگ نظر نہیں آ رہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ قدرتی آفات کو روکا نہیں جا سکتا اور نہ ان کا مکمل مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن بہتر اور ذمہ دارانہ منصوبہ بندی سے اِن سے جان و مال اور املاک کے نقصان کو کسی حد تک تو کم کیا جا سکتا ہے۔

افواج پاکستان ہر ایسے موقعہ پر قوم کے شانہ بشانہ ہوتی تھی اور اب بھی ہے لیکن کیا ہماری فوج کی تعداد اتنی ہے کہ انہیں پورے پاکستان کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔ وزیر اعلیٰ خیبر پختونخواہ امیر حیدر خان ہوتی نے اپنے ایک بیان میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش میرے پاس سینکڑوں ہیلی کاپٹر اور ہزاروں کشتیاں ہوتی اور میں لوگوں کو اس مصیبت سے نکال سکتا۔ یہ بیان اُن سیاستدانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے جو کہتے ہیں کہ ایٹم بم کی موجودگی میں روایتی فوج اور سازوسامان کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت ہماری فوج کا ایک بڑا حصہ شمال میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مصروف ہے اور مشرقی سرحد کو تو کسی صورت خالی نہیں چھوڑا جا سکتا اس مشینی دور میں بھی انسانی

ہاتھوں کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں لیکن ہم مشین کو ان کا نعم البدل سمجھ کر اداروں کی ڈاؤن سائزنگ کیے جا رہے ہیں اور اس پالیسی کی زد سے ہماری فوج بھی محفوظ نہ رہی جس کا آج ہم خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے ہاں کوئی رضاکار تنظیمیں بھی نہیں ملک میں ایک بڑی تعداد نجی سکولوں اور کالجوں کی ہے جن میں گرلز گائیڈ، بوائے سکاوٹس یا این سی سی جیسی تنظیموں کا کوئی تصور۔ فارن فنڈڈ این جی اوز اپنے فائدے کا زیادہ اور دوسروں کی فلاح کا کم سوچتی ہیں۔ سول ڈیفنس کی تربیت ویسے ہی غیر ضروری خیال کی جاتی ہے۔ ایک نجی سکول میں سول ڈیفنس کی تربیت دیکھنے کا اتفاق ہوا ایک ہفتے کی اس تربیت میں بچوں کو آگ بجھانے کے جو طریقے سکھائے گئے وہ حقیقی حالات میں کسی طرح استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ ہائی سکول طلبا کو ہم ایسی تمام سر گرمیوں سے خارج کر دیتے ہیں اور صرف پڑھائی پر تمام تر توجہ مرکوز کر دی جاتی ہے یہاں تک کہ کھیلوں کے مقابلے بھی ختم کر دیئے جاتے ہیں تاکہ سکول کا رزلٹ اچھا آئے اور بہترین سکول اور ہیڈ ماسٹر کا انعام جیتا جا سکے۔ جبکہ سکول کو تعلیم اور تربیت دونوں کا ذمہ دار ہونا چاہیے اور بہترین سکول کا انتخاب کرتے ہوئے ان تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھنا چاہیے تاکہ ہم اپنی نوجوان نسل کو آج جیسے حالات کے لیے تیار کر سکیں یہ تو آفات سے بچاؤ کے ممکنہ اقدامات ہو سکتے ہیں اب ذرا ان حالات کا تصور کیجئے جب یہ پانی اتر جائے گا تو بان کی سہی چارپائی پر سونے والے، کچی چھت ہی سہی کے نیچے رہنے والے کو یہ سب

کچھ میسر ہوگا؟ اب تو ان متاثرین کو خیموں اور کھانے کی ضرورت ہے لیکن کیا کل کو تین چار مرلے پر کچے مکان کا مالک اسے دوبارہ تعمیر کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اور کیا جس نے عمر بھر کی کمائی سے پختہ مکان تعمیر کیا اب جس کے فرش بیٹھ چکے اور بنیادیں پانی کی لہروں سے کمزور ہو چکی ہیں کیا وہ اسے دوبارہ تعمیر کر سکے گا۔ یہ درست ہے کہ حکومت ہر ایک کا نقصان مکمل طور پر پورا نہیں کر سکتی لیکن پُر تعیش بیرونی دورے اور پر آسائش طرز زندگی میں کمی کر کے کچھ تو کیا جا سکتا ہے۔ ہماری حکومت فنڈز تو قائم کر رہی ہے لیکن خود ہمارے حاکموں نے ان فنڈز میں ذاتی طور پر کتنا جمع کیا یہ نہیں بتایا جاتا لاکھ دو لاکھ کی رقم جمع کرانا اگر کرائی بھی گئی ہو قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ ہمارے صدر اور اپوزیشن لیڈر بیرون ملک معلوم اکاؤنٹس کے ساتھ پاکستان کے دس امیر ترین افراد میں سے ہیں انہوں نے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے کیا دیا قوم نہیں جانتی۔ ہمارے مختلف نجی چینلز ٹیلی تھون چلا رہے ہیں یہ چینلز اربوں کے اور ان کے بعض اینکرز کروڑوں کے مالک ہیں انہوں نے حکومت کے پول بھی خوب کھولے اور اسے لوگوں کی مدد کرنے کے طریقے بھی سکھائے انہوں نے خود بھی کچھ عطیہ دیا؟ یہ بھی قوم نہیں جانتی یہ سب قوم کے سامنے ایک مثال قائم کریں تاکہ اس کے سامنے ایک واضح راستہ ہو۔

ایک درخواست ہر مخیّر شخص سے ہے کہ جتنی آپ کی توفیق ہے اس کے مطابق دل کھول

کر اپنے ان مصیبت زدہ ہم وطنوں کی مدد کریں جب پانی اترے گا تو انہیں اپنے ٹھکانے بنانے کے لیے روپے پیسے کی ضرورت ہو گی تاکہ یہ اس سے اپنے گھر دوبارہ بنا کر عزت کے ساتھ اپنی چھتوں کے نیچے آباد ہو سکیں۔

چودہ اگست یوم آزادی بھی اور خود احتسابی بھی

قربانیاں بے پناہ تھیں راستہ طویل بھی تھا اور کٹھن بھی لیکن قافلہ چلتا رہا اور ایک مبارک دن منزل پر پہنچ بھی گیا۔ ہزار ہا لاشیں گریں عصمتیں لٹیں بستیاں خاک و خون میں نہلا دیں گئیں تب کہیں تاریک راتوں کا سفر اختتام پذیر ہوا اور ایک صبح نو طلوع ہوئی۔ چودہ اگست 1947 کو ہم نے ایک آزاد ملک حاصل کر لیا۔ یہ سب کچھ آسان نہ تھا نہ معلوم کتنے مسافر آبلہ پا ہوئے اور کتنے آبلوں کا پانی خون کے ساتھ شامل ہو کر ان راستوں میں جذب ہوتا رہا۔ داستان بہت طویل ہے لیکن اتنی ہی شاندار بھی۔
جس پر آج بھی بر صغیر کا ہر مسلمان فاخر ہے۔ لیکن۔۔۔ اسے ہماری بد قسمتی کہیے کہ وہ راہبر جو یہ قافلہ منزل تک لائے تھے بہت جلد ہم سے جدا ہوئے۔ پر خلوص قیادت کسی قوم کے لیے تحفہ خداوندی ہے۔ اور اسی پر خلوص قیادت ہی کی بدولت مسلمانان ہند نے یہ اعزاز حاصل کیا کہ وہ سلطنت جس کا سورج غروب نہ ہوتا تھا اس سے نہ صرف ٹکر لی بلکہ فتح مند بھی ہوئے۔
آج۔۔ جب پاکستان گوں ناگوں مسائل سے دوچار ہے قوم اب بھی یہ عظیم ہے حوصلے بھی بلند ہیں۔ عوام میں ترقی کی خواہش بھی ہے اور جذبہ تعمیر بھی۔ قیادت بھی خلوص کی دعویدار ہے تو پھر غلط کہاں ہے، جھول کہاں پڑا، کسی ایک

ستون میں دراڑ پڑی یا ہم سب کسی نہ کسی طرح کے مجرم ہیں۔ چودہ اگست بلاشبہ خوشی منانے کا دن ہے، پرچم کے بن جانے کا دن، آزادی کی نعمت عظیم ملنے کا دن، فتح مندی کا دن ایک تابناک تاریخ۔ لیکن۔۔۔ چودہ اگست یہ سوچنے کا دن بھی ہے کہ جو مملکت جو بڑی شان سے معرض وجود میں آئی تھی جس سے مسلمانوں نے سب سے بڑی اسلامی مملکت ہونے کے ناطے بہت ساری امیدیں وابستہ کیں تھیں اور اب بھی اس کو اسلام کا قلعہ تصور کیا جاتا ہے جہاں کے لوگ ذہین ترین ہیں اور اس کا ثبوت دنیا بھر میں موجود وہ پاکستانی ہیں جو اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہتے ہیں۔ اقوام عالم میں اپنی اہمیت منوانے کے باوجود کیوں آج ہم اس مقام پر کیوں نہیں جسکے ہم مستحق ہیں۔
سوچیئے کہیں ایسا تو نہیں؟ کہ ہم سب ہی کسی نہ کسی طرح ان سارے حالات کے ذمہ دار ہیں۔ اس دن کو اور اسکی عظمت کو غنیمت جان کر کیوں نہ ہم اپنا محاسبہ کریں۔ اور اس نکتہ نظر سے جائزہ لیں کہ ہمیں اپنی کن خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پانا ہے تاکہ ہم اس ملک کی خاطر شہید ہونے والوں کا قرض اتار سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کسی نہ کسی طرح اس دھرتی کے مجرم ہیں۔ بحیثیت ایک عام آدمی کے ہم نے خود کو کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ ہم بھی قوم کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ میں ایک بہت عام سی مثال دونگی۔ اگر ہم کسی سے یہ کہہ دیں کہ صفائی کا خیال رکھتے ہوئے سڑک پر گندگی نہ پھینکیں تو جواب

یہی ملتا ہے کہ ایک میرے نہ پھینکنے سے کیا یہ گندی سڑک صاف ہو جائے گی؟ جب کہ حقیقت یہی ہے کہ اگر ہر یہی ایک میں خود کو سنوار دے تو پورے معاشرے کے سنوار اور سدھار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل ہمارے ہاں ہر ایک اپنا مستقبل اجالنے کے جنون میں مبتلا ہے چاہے اس کے لیے اسے بستی کا ہر چراغ بجھانا پڑے۔ سرکاری دفاتر میں جائیں تو بڑے افسر تک پہنچنے کے لیے بے شمار پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کئی جیبیں گرم کرنا پڑتی ہیں شاید اوپر کا افسر آپ کا کام آسانی سے کر دے لیکن اس تک پہنچ جان جوکھوں کا کام ہے جب کہ اکثر یہ سب کچھ اپنے جائز کام کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ تعلیمی اداروں کا رخ کریں تو اُستاد اپنے ٹیوشن سینٹر کی فکر میں میں زیادہ مبتلا نظر آتا ہے حالانکہ یہ وہ ادارہ ہے جہاں شخصیت اور مستقبل دونوں کی تعمیر ہوتی ہے اور یہاں بیٹھنے والا ایک مثالی کردار ہونا چاہیئے۔ اسی طرح سرکاری ہسپتال کا ڈاکٹر اپنے کلینک کی فکر میں زیادہ غلطاں نظر آئے گا۔

اور تو اور۔۔۔۔۔ معاشرے کا ایک طبقہ جو نہ صرف تعمیر ملت کے لیے ذمہ دار ہے بلکہ اسے معاشرے میں محبت اور اخوت کا ضامن ہونا چاہیے وہ علما کا طبقہ ہے لیکن یہاں ایک اور منظر نظر آتا ہے جو عالم جس فرقے اور مکتبہ فکر سے تعلق رکھا ہے اسی کے ماننے والوں کو ہی مسلمان سمجھتا ہے اور دوسرے نہ صرف گمراہ بلکہ کئی دفعہ ان کی نظر میں دائرہ اسلام سے خارج ہوتے ہیں یوں مذہبی

عفریت منہ پھاڑے معاشرے کو تباہ کرتا نظر آتا ہے۔ اب ذرا تجارت کی دنیا پر نظر ڈالیں ۔۔۔۔

ذخیرہ اندوزی کی اسلام میں سخت ممانعت ہے لیکن ہمارے تاجر کو جب قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی بھنک بھی پڑ جائے تو جو مال مارکیٹ میں ہونا چاہیے وہ گوداموں میں بند ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہوں جو ملک اور قوم سے مایوس ہوتے ہیں اور معاشرے میں انہیں نیکی کا کوئی وجود ہی نظر نہیں آتا میں اس وطن اور اس قوم کی عظمت پر یقین رکھتی ہوں لیکن۔۔۔۔ مرض کی تشخیص برائے علاج بہت اہم ہے اور معاشرے میں جہاں کہیں بھی اور جتنی بھی برائی موجود ہے اس کو دور کرنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کی نشاندہی کی جائے اور چودہ اگست کا دن ہم سے یہ سوال کرتا ہے کہ ہم اپنا فرض کس حد تک ادا کر رہے ہیں جتنا اہم مقام اتنی اہم ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے مضمون کے شروع میں اس بدنصیبی کا ذکر کیا کہ آزادی کے بعد بہت جلد ہم مخلص رہنماؤں سے محروم ہوگئے ابھی ہماری جڑیں پنپی بھی نہ تھیں ابھی کونپلیں بھی نہ پھوٹی تھیں کہ مخلص قیادت ہمارا ساتھ چھوڑ گئی اور پھر کوئی لیڈر اس پائے کا پیدا نہ ہوا یقیناً کچھ لوگ نیک بھی رہے ہونگے لیکن قائدانہ صلاحیتوں سے محرومی شائد آڑے آئی اور کبھی صلاحیت تو موجود تھی لیکن نیک نیتی کے فقدان نے صحیح سمت پہ چلنے سے روکے رکھا۔ یوں انہی رویوں کی وجہ سے

ہم نے آدھا ملک کھویا اور قومی وقار کو بھی داؤ پر لگا دیا اور آج تو حال یہ ہے کہ کوئی حکومت پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔

اب سوال یہ ہے۔۔۔۔ کہ یہ سب روتے ہمارے معاشرے کا حصہ بنے کیوں؟ تو میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ مذہب سے ہماری دوری ہے۔ ہم نے اسلام کے زریں اصول چھوڑے اور ہر چمکتی چیز سونا سمجھ کر اسے اپناتے گئے، رشوت اور ناجائز منافع خوری کی ضرورت ہی تب پڑی جب ہم نے سادگی چھوڑی اور مقابلے کی ایسی دوڑ شروع ہوئی کہ حرام اور حلال کی تمیز ختم ہو گئی۔ ہم نے اپنی تاریخ بھلا دی اُس پر فخر کرنا چھوڑ دیا ورنہ پیوند لگے کپڑے پہنے حضرت عمر فارق (رض) کے جاہ وجلال سے بڑی بڑی سلطنتیں کانپ جاتیں تھیں تو آج ہمارے لاکھوں کے سوٹ پہنے حکمران دوسروں کے آگے کیوں جھکے جاتے ہیں۔

محنت کی عادت تو ہم نے حکمرانوں سے لیکر ایک دہاڑی دار مزدور تک نے چھوڑ دی ورنہ اوقات کار میں آپ کو لوگ گپ شپ کرتے نظر نہ آتے لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ میں مایوس نہیں کیونکہ۔۔۔۔ مایوسی گناہ ہے اور اس قوم اور ملک کے بارے میں تو چاہے حسن ظن سہی میرا یقین ہے کہ جس دن اس نے تہیہ کر لیا کہ اس نے کچھ کرنا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ اس کی زندہ مثال ہمارا ایٹم بم کا بنانا ہے۔ اپنے کم وسائل اور بے شمار قومی اور بین

الاقوامی مسائل میں گھرے ہونے اور ناروا بین الاقوامی پابندیوں کے باوجود اگر ہم یہ کارنامہ کر سکتے ہیں تو ہم کیا نہیں کر سکتے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اگر۔۔۔۔

اگر ہم تہیہ کرلیں کہ ہم نے اس وطن کو عظیم سے عظیم تر بنانا ہے اگر ہم سوچ لیں کہ آج سے میں نے سڑک پر گند نہیں پھینکنا، ہم نے رشوت نہیں لینی، ہم نے اپنا کام ایمانداری سے کرنا ہے، ہم نے چور بازاری نہیں کرنی، ہم نے عدالتوں میں فیصلے مبنی بر انصاف کرنے ہیں، ہم نے حکومت برائے خدمت کرنی ہے برائے حصول زر نہیں اور ہم نے سیاست برائے عوام کرنی ہے برائے حرام نہیں۔اور سب سے بڑھ کر۔۔۔ ہم نے اپنے مذہب کی تعلیمات پر سچے دل سے عمل کرنا ہے، ہم نے سادگی اپنانی ہے، ہم نے اپنی تاریخ فراموش نہیں کرنی، ہم نے اپنی ثقافت کو ماڈرن ازم اور روشن خیالی کے نام پر داغدار نہیں کرنا۔ ہم نے مذہبی منافرت پھیلانے سے نہ صرف گریز کرنا ہے بلکہ ایسا کرنے والوں کو مسترد کردینا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی عظمت رفتہ بحیثیت ایک ملک، ایک قوم بحال نہ کرسکیں۔

قارئین کرام! چودہ اگست کا تو تقاضا ہی یہی ہے۔ ورنہ جھنڈیاں اور بیجز لگانے سے یوم آزادی نہیں منایا جاسکتا یوم آزادی ان شہیدوں کے لہو کو سلام

پیش کرنے کا دن ہے جنہوں نے اپنے خون سے اس چمن کی آبیاری کی۔ یہ اقبال کو سلام پیش کرنے کا دن ہے جنہوں نے مسلمانان ہند کو یہ دولت یقین دی کہ۔ جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یہ اس قائدِ اعظم کو سلام پیش کرنے کا دن ہے جس نے ہمیں ایک ایسی تجربہ گاہ لے کر دی جہاں ہم اسلامی اصولوں کو آزما سکیں۔ اور جہاں کسی غیر کی حکمرانی کا سایہ تک ہم پر نہ پڑے۔

اللہ اس ملک کو قائم اور آباد رکھے اور ان روحوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے جنہوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لیے قربان کر دیا تھا۔

سیلاب آزمائش ہے اپنی قومی طاقت ثابت کرنے کا

2005 میں کشمیر اور صوبہ خیبر پختونخواہ میں زلزلہ آیا تو گویا پورا ملک مدد کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا عوام نے مثالی جوش وجذبے کا مظاہرہ کیا۔ امدادی سامان کے ٹرکوں کے ٹرک راتوں رات متاثرہ علاقوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس زلزلے میں جو جانی نقصان ہوا وہ ملک کی تاریخ کا ایک غمگین باب ہے لیکن لوگوں کا امدادی جذبہ ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ سوات میں دہشت گردی کے خلاف آپریشن کے نتیجے میں سوات کی ایک بہت بڑی آبادی کو گھروں سے نکلنا پڑا تو لوگوں نے اپنے گھر ان آئی ڈی پیز کے لیے خالی کر دیے اور ان کی ہر طرح سے مدد کی گئی۔

آج ایک بار پھر پاکستان پر مشکل وقت ہے اور تاریخ کے بدترین سیلاب نے پورے ملک کو زیر آب کر رکھا ہے، آبادیاں مٹ گئی ہیں، فصلیں تباہ ہو گئیں ہیں بے تحاشا مال مویشی ہلاک ہو گئے ہیں انسانی جانوں کے ضیاع کا مداوا تو کسی صورت ممکن نہیں اور پانی کی نظر ہونے والی جان کا زخم تو کبھی مندمل نہیں ہوتا کہ نہ کوئی جنازہ اٹھتا نہ کوئی مزار ہوتا۔

یہ ہیں وہ انتہائی حالات جس سے اس وقت یہ قوم گزری ہے اور گزر رہی ہے۔ لیکن

ایک سوال جو بار بار اور بالکل درست کیا جا رہا ہے کہ مدد کا وہ جذبہ کیوں نظر نہیں آ رہا جو اس سے پیشتر مصائب و آفات میں نظر آتا ہے۔ میں اس خیال کو بالکل درست تسلیم نہیں کرتی کیونکہ لوگ مدد کر رہے ہیں لیکن زیادہ تر انفرادی طور پر اور اس کی وجہ حکومت پر عدم اعتماد ہے اور اس عدم اعتماد نے یقیناً حکومت پر کرپشن کے بے تحاشا اور بجا الزامات کی وجہ سے جنم لیا ہے اور نہ صرف حکومت بلکہ لوگ اپنی امداد سیاسی جماعتوں کے حوالے کرنے سے بھی کترا رہے ہیں لیکن وہ ذاتی طور پر جتنا بھی کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔ یاد رکھیئے میں عوام کی بات کر رہی ہوں خواص کی نہیں کیونکہ ابھی تک کسی بھی سرمایہ دار یا بڑے آدمی کی طرف سے کسی مدد کی خبر سننے میں نہیں آئی ہاں یہ لوگ عوام سے مسلسل مدد کی اپیل ضرور کر رہے ہیں۔ ملکی سطح پر امدادی کاروائیوں میں کمی کی دوسری اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے آنے والے قیامت خیز لمحے ملک کے کچھ حصوں پر آئے جبکہ باقی ملک محفوظ ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں رہا کہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کر سکے لیکن اب کے تباہ کن سیلاب نے پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لیا ہوا ہے شمال سے شروع ہو کر بے شمار دیہات، قصبوں اور شہروں کو روندتا ہوا یہ سیلاب چلا جا رہا ہے ہر علاقے کے لوگ اپنے علاقے کے لوگوں کی مدد تک محدود رہنے پر مجبور ہیں۔

اب ذرا بین الاقوامی امداد کا جائزہ لیتے ہیں تا حال کسی قابل ذکر مدد کا

کسی ملک نے اعلان نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ملک نقد امداد دینے پر آمادہ نظر آرہا ہے اور وجہ وہی نظر آرہی ہے جس کی وجہ سے خود اپنے لوگ اپنی مدد حکومت کے حوالے کرنے سے کترا رہے ہیں۔ 2005 کے زلزلہ زدگان کے لیے ملنے والی امداد کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ اتنی ضرور تھی کہ تیس بتیس لاکھ متاثرین کو کافی حد تک بحال کر سکتی تھی لیکن اس رقم کا ایک بڑا حصہ متاثرین تک نہ پہنچ سکا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس بار بین الاقوامی برادری اُس طرح فعال نظر نہیں آرہی۔ 2005 کے زلزلے میں ان ملکوں نے بھی ہماری مدد کی تھی جن کے ساتھ بظاہر ہمارے بہت زیادہ یا خوشگوار تعلقات نہ تھے۔ کیوبا ہی کی مثال لیجیے جس نے باوجود اس کے کہ ہم امریکی اتحادی سمجھے جاتے ہیں اپنے ڈاکٹرز بمعہ دواؤں اور تمام ضروری اشیا کے پاکستان بھیجے۔ فن لینڈ نے ایک 2260 ہزار خیمے اور سویڈن نے 242 ملین ڈالر کی امداد بھیجی دوست ممالک کی مدد اس کے علاوہ تھی۔ سعودی عرب کی طرف سے حسب معمول ایک بہت بڑی مدد آئی جو کہ امداد دینے والے ممالک میں سب سے زیادہ تھی چین نے بھی اپنی دوستی کا حق پوری طرح سے ادا کیا جبکہ یورپ اور امریکہ کی طرف سے بھی کافی مدد کی گئی۔

حکومت پاکستان پر شکوک و شبہات اپنی جگہ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الاقوامی کمیونٹی کو بالعموم اور تقریباً خاموش بیٹھے اسلامی ممالک کے

سامنے بالخصوص اس قدرتی آفت کی شدت کو موثر انداز میں پیش کیا جائے اور انہیں اس سے ہونے والے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون نے اس بات کو تسلیم کیا کہ اس سیلاب سے سونامی سے زیادہ افراد اور آبادی متاثر ہوئی ہے نہ صرف سونامی بلکہ ہیٹی اور پاکستان کے 2005 کے زلزلے کے کل متاثرین سے اس سیلاب کے متاثرین کی تعداد زیادہ ہے اس وقت پاکستان میں اس قدرتی آفت سے ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً دو ڈھائی کروڑ افراد متاثر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انفراسٹرکچر کو جو شدید نقصان پہنچا ہے اس کا صحیح اندازہ پانی کے اترنے کے بعد ہی لگایا جاسکے گا، تاہم یہ بات واضح ہے کہ نقصان ہماری بساط سے بڑھ کر ہے اور اکیلے ہماری حکومت کے لیے اس آفت سے نمٹنا ممکن نہیں۔ اگر یہاں امریکہ کی مثال دی جائے تو بے جا نہ ہوگی بے تحاشا وسائل کے ساتھ وہ اس وقت دنیا کا امیر ترین ملک ہے لیکن جب وہاں بھی سمندری طوفان کترینا آیا تو نقصان پورا کرنے کے لیے بین الاقوامی برادری نے اسے 854 ملین ڈالر کی امداد دی اور اس وقت ہمیں جس نقصان کا سامنا ہے وہ کترینا کے نقصان سے کہیں بڑا ہے اس لیے یہ کہنا کہ ہم اس سے اپنے زور بازو سے نمٹ لیں گے کچھ زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ نہیں لیکن اس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ ملنے والی امداد کو انتہائی شفاف طریقے سے خرچ کیا جائے چاہے یہ باہر سے آئے یا اندر سے اس کی تقسیم کو ایک منظم طریقے سے یقینی بنایا جائے اور ہو سکے تو مستقل بنیادوں پر کچھ ذمہ داران

تعینات کیے جائیں جو ہر ایسی آفت میں کام کرے اور جو براہ راست حکومت کو جوابدہ ہوں۔ اور اس کام کو قصبے یا تحصیل کی سطح سے شروع کیا جائے۔ جبکہ حاصل ہونے والی اور خرچ ہونے والی ہر رقم اور امداد کی تفصیل روزانہ کی بنیاد پر ویب سائٹ پر دی جائے تاکہ ہر آدمی اس کو دیکھ کے جبکہ یہی تفصیل میڈیا کو بھی مسلسل دی جاتی رہے یعنی ذمہ دار اہلکار کے نام سے لے کر حاصل اور خرچ کی تفصیل تک تاکہ جن لوگوں کی پہنچ انٹرنیٹ تک نہیں ہے وہ بھی تمام تر تفصیل سے آگاہ رہے اور مطمئین رہیں کہ ان کی دی ہوئی امداد حقدار تک پہنچ رہی ہے۔ یہ تو صرف ایک تجویز ہے یقیناً اس سے بہتر تجاویز بھی سامنے آتی ہونگی کیونکہ ہر محب وطن پاکستانی اپنے ملک میں کرپشن پر شرمندگی اور پریشانی کا شکار ہے اور ہر صورت اس بدنامی سے چھٹکارا چاہتا ہے۔

ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے نقصان کے برابر بیرونی امداد حاصل کر سکیں یقیناً یہ مشکل نہیں نا ممکن ہے لیکن ایک کہنے والے نے بڑی اچھی بات کہی کہ متاثر دو کروڑ پاکستانی ہوئے ہیں پھر بھی پندرہ کروڑ پاکستانی محفوظ ہیں اور ان محفوظ پاکستانیوں میں تمام بڑے بڑے نام شامل ہیں اور اگر یہ بڑے پہل کر لیں اور آگے بڑھ کر اپنی حیثیت کے مطابق سیلاب زدگان کی امداد کا اعلان کر لیں تو یقیناً عام آدمی بھی ان کی تقلید کرے گا۔ ہمارے یہ صنعتکار، بڑے بڑے زمیندار، سرمایہ دار، بڑے بڑے

ہوٹلوں کے مالکان، سیاستدان، حکمران یہاں تک کہ کھلاڑی جن کی دولت کا شمار بھی ایک عام پاکستانی کے لیے مشکل ہے اور وہی غریب عوام سے امداد کی اپیل کر رہے ہیں اگر یہ سب خود پہلے اپنے عطیے کا اعلان کر دیں تو یہی چیز عوام کے جذبے کو دو چند کر دے گی اور پھر یہ قوم واقعی جنونی ہے صرف اس جنون کو درست سمت دینے کی ضرورت ہے۔

اس وقت ملک، قوم اور سیلاب زدگان کو اشیائے خوردو نوش کے ساتھ ساتھ ہماری نقد مدد کی ضرورت ہے جو انفراسٹرکچر کے ساتھ ساتھ گھروں کی دوبارہ تعمیر کے لیے درکار ہے۔ ہمیں بین الاقوامی مدد کی امید میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنا کام اپنے ذرائع سے شروع کر دہنا چاہیئے اور اس تیزی، ایمانداری اور ہمت سے ان کاموں کی ابتدا کر دینی چاہیئے کہ ہم اپنے اوپر سے بہت سارے الزامات دھو سکیں۔ یہ بھی کہ پاکستان (خدا نخواستہ) ایک ناکام ریاست ہے یا ہم ایک قوم نہیں بلکہ ایک ہجوم ہیں اور یہ بھی کہ ہم دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں شامل ہیں۔ شاید ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں اس لیے ڈالا ہو کہ ہم ثابت کر سکیں کہ ہم چیلنجز کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اپنے زورِ بازو سے اپنی قسمت بدل سکتے ہیں۔ بحران اور آزمائش اگر واقعی قوم کی طاقت ثابت کرنے کا ایک بہانہ ہے تو آیئے مصیبت کی اس گھڑی کو اپنی طاقت ثابت کرنے کا ایک بہانہ بنا دیں۔ ہمارے حکمران پہل کریں اپنی دولت سے اپنے

عطیے سے ابتدا کریں وہ پوری قوم کو اپنے پیچھے پائیں گے۔

امریکہ کے جنگی جرائم

امریکہ خود کو دنیا کے امن کا ٹھیکدار سمجھ رہا ہے جبکہ دنیا میں فساد کی بہت بڑی وجہ خود امریکہ ہے دنیا کے کسی قانون یا اقوام متحدہ کے کسی چارٹر میں اُسے دنیا میں امن قائم کرنے کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی ہے۔ امریکی مفادات امریکہ کے لیے بہت بڑا بہانہ ہیں جبکہ وہ ہر اُس بات کو جو اس کے مخالف ملک کے مفاد میں ہو چاہے اس کا امریکی مفاد اور نقصان سے کوئی تعلق نہ ہو کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتا ہے اور اسی کو بہانہ بنا کر ہوس ملک گیری کی تسکین کرتا ہے۔ بقول امریکہ وہ دہشتگردی کے خلاف جنگ کر رہا ہے لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ وہ خود دنیا کا سب سے بڑا دہشتگرد ہے اس کا جرم صرف یہ نہیں کہ وہ کسی بھی ملک پر مفروضوں کی بنا پر حملہ کرتا ہے جو بعد میں باطل ثابت ہو جاتے ہیں جیسے عراق میں کیمیائی ہتھیاروں کا کوئی ثبوت نہ ملا اور اب تک اسامہ نامی جس سایے کے پیچھے افغانستان کو تاراج کر رہا ہے اس کو بھی تلاش نہیں کر سکا اور نہ ہی مستقبل میں اس کے کوئی امکانات نظر آرہے ہیں اس کا جرم یہ بھی ہے کہ وہ جنگ صرف فوجوں سے نہیں لڑتا نہ ہی حملہ آوروں اور زبردستوں سے لڑتا ہے بلکہ سول آبادیاں اور غیر مسلح شہری اس کے لیے آسان ٹارگٹ ثابت ہوتے ہیں اور ان معصوموں کی ہلاکت کو وہ اپنے سنہری کارناموں میں شمار کرتا ہے۔

امریکہ نے عراق، افغانستان اور ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ویت نام میں جس بربریت کا مظاہرہ کیا یہ ممالک تو کیا پوری دنیا ان مظالم کو نہیں بھول سکتی اور نہ امریکہ اپنے ان سیاہ کارناموں کو تاریخ سے مٹا سکتا ہے۔ عراق میں امریکی بمباری نے جس طرح عراق کو دہلا کر رکھ دیا تھا آج بھی وہ ان اثرات سے آزاد نہیں ہو سکا ہے عراق پر برسائے گئے بارود کی مقدار اور شدت ہیروشیما پر گرائے گئے امریکی ایٹم بم سے سات گنا زیادہ تھی جو صرف مفروضوں کی بنیاد پر برسایا گیا اور اس میں سے 93% بارود انتہائی سفاکی سے آزادانہ طور پر گرایا گیا باقی 7% گائیڈڈ میزائل میں سے بھی امریکی مہارت کی بنا پر 25 % خطا ہوئے اس بارود نے لاکھوں سول عراقی زندہ جلا دیئے اور اس سے بھی بڑا نقصان اور جرم اس وقت ہوا جب عراقی بچے اور بڑے مختلف موذی اور متعدی بیماریوں میں مبتلا ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیضہ، ٹائیفائڈ اور ہیپٹائٹس جیسی وباؤں نے عراقیوں کو مزید عذاب میں مبتلا کیا ان کے روزگار کے مواقع ختم کرکے بھوک اور ننگ میں مرنے کا پورا پورا بندوبست کیا گیا معاشی طور پر بھی اس ملک کو جان بوجھ کر تباہ کیا گیا اور وحشت اور بربریت کا یہ سارا کھیل عراقی تیل کی خاطر کھیلا گیا اور عراق پر کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا الزام لگانے والے امریکہ نے خود وہاں ہر طرح کا غیر قانونی اسلحہ استعمال کیا جن میں کیمیائی ہتھیار بھی کھلے عام استعمال کیے گئے

یعنی جلا کر مار دینے والا اسلحہ اور نیپام بم بھی Fuel Air Explosive مزید اس نے بے دریغ استعمال کیے اور کلسٹر بموں سے بھی عام عراقیوں کے ٹکڑے اڑا دیے گئے۔ جب عراق میں اُس کی وحشت و بربریت کو سکون نہ ملا تو اُس نے افغانستان میں بھی انسانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا اور خود کو انسانیت کا علمبردار کہنے والے اس دہشتگرد نے یہاں کی معصوم اور نہتی آبادی کو جس طرح بھون اور کاٹ کر رکھ دیا وہ بھی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے امریکہ ہٹلر کے گیس چیمبرز کا ذکر تو کرتا ہے لیکن خود اُس سے بڑھ کر جنگی جرائم کا مرتکب ہوا۔ اس کی ایک مثال اس وقت سامنے آئی جب اُس نے 8000 افغانی ایک کنٹینر میں بھرے اور ان قیدیوں پر احسان کرتے ہوئے اُس میں ہوا کے لیے سوراخ بنانے کے لیے اُس بھرے ہوئے کنٹینر پر فائر کیے یوں کچھ قیدی تو ہوا کے حصول کے نظر ہو گئے اور باقی ہوا اور خوراک کی کمی سے شہید ہو کر تین ہزار روحیں امریکی شغل میلہ کی نظر ہو کر جسموں سے آزاد ہو گئیں اور اجتماعی قبر میں بغیر کسی پوسٹ مارٹم یا طبّی معائنے کے دفن کر دی گئیں۔ یہ ہوتی ہے دہشتگردی جو امریکہ مسلسل کئے جا رہا ہے اور معلوم نہیں کب تک اس سلسلے کو جاری رکھے گا۔ افغانستان میں امریکی جنگی جرائم کی داستانیں تو خود امریکہ میں بھی عام ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی دی ٹائمز نے شائع کی جس کے مطابق امریکی فوجی تین

ہیلی کاپٹروں کے ذریعے کنڑ کے گاؤں غازی خان گئے اور وہاں نو طلبا کو شہید کر دیا ان معصوم بچوں میں سے آٹھ چھٹی جماعت کے طلبا تھے جن کی عمریں یقیناً گیارہ بارہ سال سے زیادہ تو نہ ہونگی اور گیارہ بارہ سال کا بچہ کتنا بڑا دہشتگرد ہو سکتا ہے یہ امریکہ خوب جانتا ہے لیکن سافٹ ٹارگٹ کے ذریعے اپنی دہشت بٹھانا ظاہر ہے کہ زیادہ آسان تھا اور امریکہ بدنامی سے یا نیک نامی سے ہر صورت سُپر پاور کہلانا چاہتا ہے۔ اور اسی جذبے کی تسکین وہ وقتاً فوقتاً اپنے (مفتوحہ ممالک) میں کرتا رہتا ہے اور ایسا ہی ایک اور کارنامہ اُس نے افغانستان میں سر انجام دیا جب 12 فروری 2010 کو گردیز میں خطابہ کے مقام پر اُس نے ٹارگٹ کرکے دو حاملہ خواتین دو بچوں اور ایک نوجوان لڑکی کو مار ڈالا اور بقول ڈیلی ٹائمز پہلی بار نیٹو افواج نے کسی ایسی حرکت کی ذمہ داری قبول بھی کر لی۔ بات یہ ہے کہ مریکہ تسلیم کرے یا نہ کرے اس کے جنگی جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ وہ اُس پر پردہ نہیں ڈال سکتا اور یہی وجہ ہے کہ نیویارک ٹائمز جیسے متعصب اور مسلم مخالف اخبار نے اعتراف کیا کہ 21 مارچ سے 21 اپریل 2010 تک 173 معصوم شہری افغانستان میں امریکی درندگی کا نشانہ بنے۔

ظلم و ستم امریکہ کی کوئی آج کی پالیسی نہیں بلکہ اپنے عروج کے ابتدا سے ہی وہ اس کام میں مصروف ہے دوسری جنگ عظیم میں ایک کے بعد دوسرے ایٹم بم کا

استعمال کیا حالانکہ وہ پہلے بم کی ہلاکت خیزی اور تباہی دیکھ چکا تھا لیکن جذبہ ترحم کسی امریکی حاکم کی خو میں نہیں لکھا گیا یہ اور بات ہے کہ وہ خود کو انسانی حقوق کا عظیم علمبردار سمجھتا ہے۔

ویت نام کی سرزمین اور وہاں کے باشندے اب بھی امریکی افواج کے مظالم کو نہیں بھولے سالہا سال تک انہوں نے اس جابر اور قابض فوج کا مقابلہ کیا اور لاتعداد ویت نامی ان کی توپوں کے گولوں اور بندوق کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ جو مسلح نہ تھے ان کو مار دینا تو ویسے ہی امریکی فوجیوں کے لیے آسان تھا اور انہوں نے یہ کام پورے دل وجان سے کیا اور 6.5 ملین ٹن بموں سے ویت نامیوں کو بھون کر رکھ دیا چار لاکھ ٹن نیپام بم برساتے ہوئے امریکہ کو کبھی انسانی حقوق کا خیال نہ آیا اور نہ ہی خود کو فطرت سے محبت کرنے والی قوم کا خطاب دینے والے امریکہ کو یہ خیال آیا جب وہ 11.2 ملین گیلن اورنج ایجنٹ چھڑکے گا تو فصلوں اور زمین کو کتنا نقصان پہنچے گا۔ امریکہ نے ویت نام میں تربیت یافتہ قاتلوں کی ایک فوج بھیجی اور اُسے ٹائیگر فورس کا نام دیا ان تربیت یافتہ قاتلوں نے اپنا حق نمک خوب ادا کیا وہ امریکہ سے یہ حلف لے کر گئے تھے کہ وہ ہر صورت جنگ جیت کر آئیں گے اور اس کے لیے انہوں نے ہر ظالمانہ حربہ آزمایا۔

ویت نام کے وسطی پہاڑی علاقوں میں امریکہ فوج کو سخت مزاحمت کا سامنا تھا اور وہاں کے لوگوں کو ان کو اس جذبہ حب الوطنی کی

سزا اس فوج نے یہ دی کہ اس کے کسانوں، عورتوں اور بچوں کو اپنے مورچوں میں لے جا کر مارا اور ان کے کان اور کھوپڑیاں زیادہ بہادروں یعنی زیادہ شقی القلب فوجیوں کو بطور یادگاری نشانات کے عطا کیے گئے۔ ان کے ظلم اور لالچ کی انتہا دیکھئے کہ ایک سپاہی نے ایک کسان کے دانت اس لیے توڑے تاکہ وہ اس کے دانتوں پر چڑھے ہوئے سونے کے خول لے سکے یعنی ایک امیر قوم ایک غریب قوم سے اس کی ہر دولت چھین لے۔

قارئین ! یہ تو امریکی بربریت کی چند مثالیں تھی ورنہ اس کی جنگی تاریخ ایسی ہی ظالمانہ کاروائیوں سے بھری پڑی ہے۔ اور خود کو مہذب ترین سمجھنے والی یہ قوم ہر تہذیب سے عاری ہے ظاہر ہے کہ جنگ کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں لیکن امریکی جنگ کا ایک اصول یہی ہے کہ ہر ذی روح کو مسل دو اور ہر اُس چیز کو مٹا دو جو انسان کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ امریکہ خود کو کیونکر پوری دنیا کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور ہر ملک کے معاملات میں مداخلت اپنا حق۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں کے دل و دماغ کو فتح کر رہا ہے تو امریکی تھنک ٹینکس کو چاہیے کہ جس طرح وہ دوسرے ملکوں کے ہر معاملے کے بارے میں سروے کرواتا ہے امریکی حکومتوں اور ان کی جنگی پالیسیوں کے بارے میں بھی ایک سروے کر لیں لیکن ایمانداری کے ساتھ اور دیکھ لیں کہ ایک دنیا امریکہ سے نفرت کرتی ہے چاہے کسی ملک کی حکومت امریکہ کے زیر اثر

ہی کیوں نہ ہو وہاں کے عوام امریکہ کے بارے میں جو منفی بلکہ منتقمانہ جذبات رکھتے ہیں وہی اُسے آئینہ دکھانے کے لیے کافی ہونگے۔ دل و دماغ جیتنے کے لیے دنیا کو محبت کی ضرورت ہے اور امریکہ کے پاس دنیا کے لیے محبت ناپید ہے اسے صرف اپنے مفادات سے محبت ہے اور اس کے لیے وہ پوری دنیا کی قربانی دینے کو تیار ہے دراصل یہ ایک حقیقت ہے اور پوری دنیا کو یقین ہے کہ اس وقت دنیا کے لیے اصل خطرہ اور سب سے بڑا دہشتگرد امریکہ ہے۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا سال تھا یمن کا عیسائی حاکم ابرہہ خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے فوج لے کر چلا اس کی فوج میں ہاتھی بھی تھے اور اس کا خیال تھا کہ وہ خانہ کعبہ کو نعوذباللہ نیست و نابود کر دے گا۔ لیکن ہُوا یہ کہ ننھے ابابیلوں نے اللہ کے حکم سے حقیر کنکریوں سے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا گویا وہ کنکریاں ہی ایٹم بم کا کام کر گئیں اور اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنے گھر کی خود حفاظت کی۔

دو یہودی سرنگ بنا کر نبی پاک کی لحد مبارک تک پہنچ کر آپکے جسم مبارک کو وہاں سے نکالنا چاہتے تھے کہ اللہ نے نور الدین زنگی جیسے مجاہد حاکم کو خواب میں خبر دی دونوں یہودی سرنگ سے پکڑے گئے اور کیفر کردار تک پہنچے۔

چشم فلک نے بارہا دیکھا کہ تباہی میں بچ جانے والی واحد شے قرآن پاک ہوتی ہے میرے بچپن کی بات ہے ہم گلگت میں رہتے تھے کہ ہمارے ایک کمرے کی چھت گری تو حیرت انگیز طور پر وہ حصہ بچا رہا جس کے نیچے قرآن شریف پڑے تھے۔

آج جبکہ پوری غیر مسلم دنیا کی طرف سے اسلام کی توہین اور مسلمانوں کی دل آزاری ہو رہی ہے۔ بش کا یہ اعلان ہے کہ وہ صلیبی جنگ لڑنے جارہا ہے اس بات کا اعلان تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہر حربہ آزمائے گا اور اس نعرے تلے پوری عیسائی دنیا اس کے ساتھ ہوگی اور یہی ہوا ڈنمارک نے اس کا ساتھ دینے کے لیے توہین آمیز خاکے شائع کیے اور اسے اظہار رائے کی آزادی کہا۔ فیس بک پر Draw Muhmmad یعنی حضرت محمد کے خاکے بنانے کا مقابلہ ایک اور حربہ تھا اس سے بھی شانِ محمدی میں کمی نہ آئی بلکہ جان نثاروں کی جان نثاری نے مغربی دنیا کو حیران و ششدر کر دیا تو اب دنیا کے سب سے بڑے دھوکے یعنی 11/9 کے انتقام کے طور پر اور اسکی نویں سالگرہ کے موقع پر Burn Quran Day (نعوذُ باللہ) منانے کا اعلان کرکے ایک امریکی چرچ Dove World Outreach Florida کے انچارج پوسٹر ٹیری جونز نے اسلام کو بدی کا مذہب قرار دے کر قرآن پاک کو نہ صرف خود نعوذُ باللہ جلانے کا اعلان کیا ہے بلکہ عیسائی مذہب کے تمام ماننے والوں سے بھی ایسا کرنے کو کہا ہے اس ملعون نے ایک کتاب Islam Is Of The Devil کے نام سے لکھی ہے جبکہ اس عبارت کے ساتھ T-Shirts مگ اور بھی بنائے اور بیچے۔ اس نے گراؤنڈ زیرو پر مسجد کی مخالفت بھی کی ہے۔ یہ سب کچھ اس نے گیارہ ستمبر 2001 کو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں پر خودکش حملوں میں ہلاک ہونے والوں کا بدلہ لینے کی آڑ میں کیا

جبکہ دراصل یہ اُس کا خبث باطن ہے جسے وہ ظاہر کر رہا ہے اور اُن بنیاد پرست اور متعصب عیسائیوں کی نمائندگی کر رہا ہے جو روز ازل سے اسلام کے خلاف ہیں اور یقیناً اس مردود کو اس سارے کام میں یہودیوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اور اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو یقیناً امریکی حکومت کی بھی۔ صدر اوبامہ بظاہر تو مسلمانوں سے اچھے تعلقات کی باتیں کرتے ہیں لیکن اب تک افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں مصروف ہیں۔ وکی لیکس جس پر مغربی دنیا کو پاکستان کے بارے منفی باتیں کرنے کی وجہ سے انتہائی اعتماد ہے کے مطابق سی آئی اے القاعدہ کو دہشتگردی کے لیے نفری فراہم کرتا ہے۔ یہ سارے کام اوبامہ کی حکومت کے زیر نگرانی ہو رہے ہیں اور اب انتہائی درجے کا یہ کام بھی اُسی کے ملک میں ہونے کا اعلان ہوا ہے اور اسے بھی اظہارے رائے کی آزادی کہہ دیا جائے گا۔ جبکہ اگر اسے اظہارے رائے کی آزادی کہا جائے تو بالفرض محال اگر 11/9 کے ذمہ دار مسلمان ہیں تو اُسے کیوں نہ اظہار آزادی کہا جائے امریکہ اور اس کے باشندوں پر طالبان اور دیگر مسلمانوں کے حملے بھی اسی زمرے میں ڈال دینے چاہیئے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے معیارات اپنے اور دوسروں کے لیے مختلف ہیں اور خاص کر اسلام سے جو پرخاش وہ رکھتے ہیں وقتاً فوقتاً وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ نے مسجد کے میناروں پر پابندی لگائی فرانس اور بیلجیئم کو مسلمان عورتوں کے نقاب سے خوف آرہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ انہیں اسلام سے خوف آرہا ہے انہیں

اس تناسب سے خوف آ رہا ہے جس سے غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں اللہ کا فرمان بالکل سچ ہے کہ یہ عیسائی اور یہودی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے ڈیوڈ کیمرون کے پاکستان کے بارے میں تاثرات ہی کو لیجیئے بھارت میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف زہر اُگلنے کا اور مطلب کیا ہے بھارت عیسائی ملک نہیں غیر مسلم تو ہے اور پاکستان مسلمان ہے۔

مغرب کی حکومتوں سے لے کر چرچ تک اور ظاہر ہے کہ عام آدمی تک ہر ایک اسلام کے خلاف صف آرا ہے۔ جبکہ بنیاد پرستی کا طعنہ مسلمان کو دیا جاتا ہے دہشتگرد اسلام اور مسلمان کو کہا جاتا ہے جبکہ خود مغرب اور سب سے بڑھ کر امریکہ اسلام کے خلاف برسرپیکار ہیں نہ تو مسلمانوں کے مذہب کا لحاظ رکھتا ہے نہ پیغمبر کا نہ مقدس مقامات کا اور نہ ہی قرآن پاک کا جبکہ کسی اسلامی ملک میں غیر مسلموں کے خلاف کوئی معمولی واقعہ ہو جائے چاہے اس کی وجوہات بالکل ذاتی ہوں اس کو اتنا اچھال دیا جاتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ اب اس جرم کی سزا میں اس ملک پر حملہ کر دیا جائے گا۔

اور تو اور خود ہماری نام نہاد حقوقِ انسانی کی تنظیمیں وہ واویلا کھڑا کر دیتی ہیں کہ الامان۔ گوجرہ کا ہی واقعہ لیجئے قادیانیوں کی عبادت گاہوں پر حملے ہی کو دیکھیے وہ شور اٹھایا گیا میڈیا اس طرح چیخا کہ اسلام دشمن این جی اوز کو بھی موقع مل گیا اور اپنے آقاؤں اور حکومتوں کی ایما پر پاکستان کو اقلیتوں کے لیے خطرناک ملک قرار دیا جانے لگا جبکہ ایسا واقعہ کہیں

پاکستان کی پوری تاریخ میں شاذ ہی ہوا ہو گا۔ میں ان واقعات کی حمایت نہیں کر رہی بلکہ اس کی سخت مذمت کرتی ہوں کیونکہ ہمارا مذہب اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا اور یہی فرق ہے اسلام اور کفر میں اسلام رواداری اور محبت کا سبق دیتا ہے جبکہ اس کے بر عکس یہودیت تو صرف خود ہی کو جینے کا حق دیتا ہے اور عیسائی نے یہ حق صرف عیسائی کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہم اُن سے کوئی حق مانگ کیوں رہے ہیں حق مانگا نہیں چھینا جاتا ہے لیکن جب مسلمان حکومتیں انتہائی مروت یا باالفاظ دیگر خوف کا اظہار کرتی ہیں تو عام مسلمانوں کو آگے آنا پڑتا ہے کیونکہ ان کو کسی حکومت کے جانے کا خوف نہیں ہوتا کسی سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے کا ڈر نہیں ہوتا مسلمان حکمران آج بھی اگر غیرت ایمانی کا مظاہرہ کریں تو مغرب ہمارے خلاف اپنے مکرہ عزائم کو سینے میں لیکر فنا ہو جائے لیکن یہ ہماری بے حسی ہے ورنہ

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

جہاں تک پوسٹر ٹیری جونز کی قبیح سوچ اور منصوبہ بندی کا تعلق ہے بحیثیت مسلمان میرا ایمان ہے کہ وہ قرآن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا جو سمجھتے ہیں کہ معجزے اب نہیں ہوتے تو وہ دیکھیں گے کہ اگر خدا نخواستہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو بھی گیا تو بھی اس کے بعد کے قبول اسلام کے تناسب سے ہی وہ زندہ

در گور ہو جائے گا اگر زندہ بچ گیا ہو گا تو۔ اللہ نے قرآن اور اسلام کی حفاظت کا خود وعدہ کیا ہے وہ اس کو پورا کر کے رہے گا اور دنیا دیکھے گی کہ

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

کہ عدو آنکھ اُٹھانے کی بھی جرات نہ کرے

کچھ دن اپنی اہمیت اور ولولہ انگیزی میں کچھ ایسے انوکھے اور یادگار ہوتے ہیں کہ جب بھی انہیں یاد کیا جائے نئے جذبوں کا باعث بن جاتے ہیں ایسا ہے ایک دن آج سے پینتالیس سال پہلے آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان شدید کشیدگی چل رہی تھی سرحدی جھڑپیں جاری تھیں لیکن باقاعدہ جنگ نہ چھڑی تھی اور نہ ہی اس کا اعلان ہوا تھا۔ لیکن ہندو اپنی روایتی بلکہ مذہبی مکاری کے ساتھ منصوبہ بندی میں مشغول تھا کہ کیسے اچانک بغیر اطلاع کے پاکستان پر دھاوا بولا جائے اور وہ پاکستان جس کے بارے میں اُسکی پیش گوئی تھی کہ بس چند ماہ میں ختم ہوجائے گا کو اگر سترہ سال بعد بھی نیست و نابود کردیا جائے تو بھی خسارے کا سودا نہیں۔ سو اُس نے ایسا کرنے کی ٹھان لی لیکن حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بلکہ نخوت نے اسے سرنگوں کر دیا۔

چھ ستمبر 1965 کو بھارت کی پندرھویں انفنٹری ڈویژن کے خوش فہم اور خواہ مخواہ کی احساس برتری میں مبتلا کمانڈر میجر جنرل پرساد نے اس خوش فہمی کے ساتھ لاہور پر برکی سیکٹر کی طرف سے حملہ کیا کہ وہ دوپہر کا کھانا لاہور جم خانہ میں کھائے گا۔ حملہ سے پہلے یقیناً اُس نے سوچا ہوگا کہ پاک آرمی

آرام کی نیند سو رہی ہو گی لیکن اگر چوکیدار کی آنکھ لگ بھی جائے تو ایک کھٹکا اسے تازہ دم کرنے کو کافی ہوتا ہے پھر یہ پہرہ دار تو سوتے میں بھی جاگنے والے لوگ تھے۔ میجر جنرل پرساد نے بی آر بی عبور کی لیکن ابھی وہ اپنی فتح کا جشن منانے کا سوچ بھی نہ سکا ہو گا کہ پاکستانی ابابیلوں کی زد میں آگیا اور جب وہ شیر اور عقاب بن کر اس پر جھپٹے تو پھر نہ تو جمخانہ یاد تھا نہ لنچ ہاں ہر بھارتی سپاہی کو اپنی جان کی پڑ گئی یوں بھارتی فوج کو ایک سخت مزاحمت کے بعد پسپا ہونا پڑا یہ غیر اعلانیہ حملہ تھا لیکن اس کا جواب اعلانیہ حملے سے بڑھ کر دیا گیا۔

اگرچہ پاکستان اور بھارت کی سرحدی جھڑپیں جاری تو تھیں اسی دوران بھارت نے 15 اگست کو سیز فائر لائن بھی عبور کی تاہم باقاعدہ جنگ شروع نہ ہوئی تھی لیکن چانکیہ کی ذہنیت ہمیشہ سازش اور خون کی خواہش رکھتی ہے اور بزدل ہمیشہ بے خبری میں حملہ کرتا ہے چور اور ڈاکو اپنی کاروائی اور اپنے پیشے کے لیے رات کی تاریکی کا ہی انتخاب کرتا ہے بس یہی سب کچھ بھارت نے کیا لیکن اس کے بعد کے واقعات کا انحصار مدمقابل یا صاحب خانہ کی ہمت پر منحصر ہے اسی چیز کا بھارت نے بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس حملے کا مقابلہ جس طرح پاک فوج نے کیا وہ تو تاریخ کا حصہ ہے ہی لیکن جس حوصلے اور ہمت کا ثبوت پاکستانی عوام نے دیا ویسی داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔ لاہور کے باسیوں نے

نہ صرف یہ کہ اپنا حوصلہ نہ ہارا بلکہ اپنی افواج کے لیے حوصلہ کا باعث بنے۔ کیمپس لگا لگا کر خون کے عطیے دیئے اتنی خوراک جمع ہوئی کہ جو ضرورت سے بہت زیادہ تھی۔ قوم نے جس جذبے اور حوصلے کا ثبوت دیا بھارتیوں کا حوصلہ پست کرنے کو وہی کافی تھا۔ یہ سب کچھ لاہور پر ہی موقوف نہیں تھا بلکہ شہریوں نے ہر موقع اور محاذ پر اسی جذبے کا مظاہرہ کیا اور یہی پشت پناہی تھی جس نے کسی موقع پر پاکستانی فوج کا جذبہ ماند نہ پڑنے دیا۔

اگرچہ یہ بات درست ہے کہ بھارتی فوج کچھ محاذوں پر پاکستان کے اندر بھی گھس آئی لیکن ہر محاذ سے اس کو پسپا کر دیا گیا جیسے بھارت کی ایک انفنٹری یونٹ باٹاپور تک آ گئی تھی لیکن پاکستانی جیالوں نے نہ صرف اُنہیں پسپا کیا بلکہ بھاگتے ہوئے وہ اپنا اسلحہ اور گاڑیاں تک چھوڑ گئے اور پسپائی اور شکست کی شرمندگی ساتھ لے گئے۔ اسی یونٹ نے ڈوگری پر قبضہ کیا لیکن 21 ستمبر کو انہیں وہاں سے بھی بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا انہی وقتی کامیابیوں کا بھارت نے انتہائی پرچار کیا لیکن یہ وہ بھی جانتے ہیں کہ وقتی کامیابی کامیابی نہیں کہلائی جا سکتی۔

اسی جنگ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹینکوں کی دوسری بڑی لڑائی لڑی گئی خود کو فخر ہند کہلانے والی فرسٹ آرمڈ ڈویژن نے سیالکوٹ کو تر نوالہ سمجھتے ہوئے

اس پر چڑھائی کی لیکن وہ بھی پاکستانی ٹینکوں ہی نہیں بلکہ پاکستانی ہمت کے سامنے نہ ٹک سکی۔

موجودہ دور کی جنگیں صرف زمین پر نہیں فضاؤں میں بھی لڑی جاتی ہے اور پاک فضائیہ نے جنگ ستمبر میں عزم و ہمت کی جو لازوال داستان رقم کی وہ دیو مالائی داستانوں سے کم نہ تھی اُس نے بھارتی فضائیہ کو ناکوں چنے چبوائے جام نگر اور پٹھان کوٹ آج بھی اُن حملوں کی یاد سے لرز جاتے ہونگے پٹھاں کوٹ پر حملے کے اگلے دن ایک پیغام ہمارے سیٹ نے پکڑا جو خود ہی اس حملے کی کامیابی کی پوری کہانی سنا دیتا ہے اور وہ تھا پٹھان کوٹ جل رہا ہمیں فوری مدد کی ضرورت ہے''۔

میجر عزیز بھٹی تھا یا وطن کا کوئی اور سپوت یا کوئی گمنام سرفروش ہر ایک نے اپنا حق ادا کیا اور زندہ قوم ہونے کا بھرپور ثبوت دیا۔اور یہ سب کچھ اپنے سے تین گنا بڑے اور کئی گنا طاقتور دشمن کے مقابلے پر کیا گیا اگرچہ ہندوستان نے اپنی کامیابی کا بھرپور پروپیگنڈہ کیا لیکن جو خفت اُسے اعلان جنگ کے بغیر حملے پر اور پھر شرمناک پسپائی پر اُٹھانی پڑی وہ بذات خود بہت بڑی ناکامی تھی۔

جنگ ستمبر میدان میں تو غیر فیصلہ کن رہی لیکن تاریخ نے ایک فیصلہ ضرور دیا کہ قوم متحد اور منظم ہو تو اُسے شکست نہیں دی جا سکتی اور اسی لیے پاکستانی قوم فتح مند رہی کسی لمحے اس کا مورال گرا نہیں بلکہ ہر لمحہ جذبوں سے بھرپور رہا شہادت یوں تو ویسے بھی مسلمان کا فخر ہے لیکن قوم نے اس سترہ دنوں کی جنگ میں ہر شہادت کو اعزاز سمجھ کر اپنے سینے پر تمغے کی طرح سجایا۔

یوں تو یہ آج سے پینتالیس سال پہلے کی کہانی ہے لیکن قوم کو سربلند کرنے کے لیے آج بھی کافی ہے۔ لیکن آج جس بات کی ضرورت سب سے زیادہ ہے وہ قومی یکجہتی اور قومی اتحاد ہے قوم آج بھی مشکل حالات سے دوچار ہے اور اسے کئی چیلنجز کا سامنا ہے ۔چیلنج چاہے جنگ کا ہو، امن کے زمانے کا ہو، سیاسی عدم استحکام کا ہو، معیشت کا ہو یا قدرتی آفت کا سب کا مقابلہ کرنے کے لیے قومی یکجہتی اور اتحاد اور تنظیم کے اصول ہی کام آتے ہیں آج بھی ہمیں مقابلہ کرنے کی ہمت ہر وقت رکھنی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسے حادثوں کا منتظر نہیں رہنا چاہیے بلکہ خدانخواستہ کسی بھی حادثے کی پیش بندی کرکے رکھنی چاہیے اور اُس جذبے کو ہمیشہ زندہ رکھنا ہے جس نے ہمیں ایک بڑی آزمائش میں سرخرو کیا تھا اور آئندہ بھی یہ جذبہ ہمیں زندگی کے ہر میدان میں کامیاب وکامران کر سکتا ہے۔

مسئلہ کشمیر اور برصغیر کا امن

برصغیر دنیا کا حساس ترین علاقہ ہے کیونکہ یہاں دو ایسے پڑوسی آباد ہیں جن کے رقبے، آبادی اور ذرائع میں بہت بڑا فرق موجود ہے۔ روائتی ہتھیار بھی بھارت کے پاس پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں اور آئے دن وہ میزائیلوں کے تجربات بھی کررہا ہے اور امریکہ، روس اور اسرائیل سے دھڑا دھڑ اسلحہ خرید بھی رہا ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان پر امریکہ کا احسان عظیم ہے کہ مدت پہلے کے خریدے ہوئے ایف سولہ طیارے جن کا ماڈل اب خاصا پرانا ہو چکا ہے احسان کرکے دے رہا ہے۔ چین اگر پاکستان کی دفاعی مدد کرے تو اس پر بھی اسلحے کے ڈیلروں یعنی امریکہ اور برطانیہ کو اعتراض ہوتا ہے۔ جو واحد بھارت کے برابر کی طاقت پاکستان کے پاس موجود ہے وہ ایٹمی قوت ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھارت پاکستان پر حملہ نہیں کرپا رہا جس کا ارادہ بظاہر وہ کئی بار کرچکا ہے۔ طاقت کی اس دوڑ کی اصل وجہ مسئلہ کشمیر ہے جسے بھارت اپنی نیت کی بنیاد پر حل کرنے سے انکاری ہے جس کے لیے اس نے اقوام متحدہ، سلامتی کونسل اور عالمی رائے عامہ کی کبھی قطعاً پرواہ نہیں کی۔ بلکہ دھونس اور دھاندلی سے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے۔ ازل سے آزادی کو انسان کا بنیادی حق قرار دیا جاتا ہے کیونکہ خدا نے اسے آزاد پیدا کیا ہے لیکن بھارت تحریک آزادی کشمیر کو مسلسل دہشت گردی قرار دے

رہا ہے۔ آزادی کی تحریکیں وہاں تو ناجائز ہو سکتی ہیں جہاں عقیدے کا تضاد نہ ہو تہذیب ثقافت اور معاشرت میں ٹکراؤ نہ ہو جغرافیائی لحاظ سے کوئی مجبوری ہو جبکہ کشمیر کے معاملے میں ایسا نہیں لیکن بھارت اس بات پر مُصر ہے کہ کشمیری اسکے غلام رہیں۔ تحریک آزادی کشمیر میں تیزی کی تازہ لہر نے بھارتی حکومت کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ اس بار کوئی ایک طبقہ اپنا حق آزادی لینے نہیں نکلا بلکہ کشمیر کا ہر فرد بشر بول اٹھا ہے خواتین اپنے جوانوں کا ماتم کرنے نہیں بلکہ بھارتی حکومت کے مقابلے پر نکلی ہیں اسی طرح نوجوانوں کے ساتھ بچے بھی تحریک آزادی میں شامل ہو چکے ہیں۔ جون 2010 میں شہید ہونے والے تینتیس مجاہدین میں سے چار اور اگست کے پہلے پندرھواڑے کی انسٹھ شہادتوں میں سے ایک آٹھ سالہ بچے کی شہادت اس بات کا ثبوت ہے کہ اب کشمیر کے بوڑھے، جوان، مرد، عورت اور بچے سب بھارتی قبضے کی گھٹن سے آزادی چاہتے ہیں اور ان کو اب بھارت کا کوئی ظلم و ستم غلام نہیں رکھ سکتا اور بھارت یہ جانتا ہے کہ اسکی سات لاکھ غاصب فوج بھی تحریک آزادی کشمیر کو نہیں کچل سکتی۔ بھارت کشمیر پر اپنا قبضہ قائم رکھنے میں مسلسل جنگی جرائم کا بھی مرتکب ہو رہا ہے اور کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کر رہا آخر بے شمار اجتماعی قبریں کیوں دریافت ہو رہی ہیں لاپتہ کشمیری انہیں قبروں میں ہی تو دفن کر دیئے جاتے ہیں۔ بھارت نے کشمیر میں Lasar Dazzler جیسا ہتھیار بھی استعمال کیا جو مستقل اندھے پن کا باعث بنتا ہے۔

کی دہائی میں امریکہ میں بنایا گیا۔ جسکو شدید بین الاقوامی Lasar Dazzler ،1990
مزاحمت کے باعث بند کر دیا گیا۔ اقوام متحدہ اور ریڈ کراس سمیت تقریباً تمام دنیا نے
اس کی مخالفت کی۔ یہ ہتھیار دو سے تین میٹر چوڑی ایسی شعاع نکالتا ہے جو اگر ایک
خاص حد سے بال برابر بھی زیادہ ہو جائے تو مستقل اندھے پن کا باعث بنتی ہے۔ یہ تو
ایک جنگی جرم ہے جبکہ بھارت تو کسی بھی جرم اور حربے سے گریز نہیں کر رہا اور کشمیر
کے لوگوں کے جذبہ حریت کو مسلسل دہشت گردی سے تعبیر کر رہا ہے اور اپنا جرم مسلسل
پاکستان کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ بقول بھارت کے کشمیر میں
تمام خرابی کا ذمہ دار پاکستان ہے پاکستان کشمیریوں کے جذبہ حریت کو ابھار رہا ہے

بھارت اس بات کو جاننے کے باوجود کہ آزادی ہر انسان کی جبلی خواہش ہے اور وہ اسکو
حاصل کرنے کی اپنی جان کی قیمت پر بھی خواہش کرتا ہے اور ایک بار پھر میں یہی کہونگی
کہ جہاں عقیدے اور نظریات کا اختلاف موجود ہو وہاں اس جذبے کا ہونا نہیں بلکہ نا
ہونا انوکھا ہے۔

بھارت خود بین الاقوامی طور پر جس کردار کا مالک ہے دنیا کو اس کا احساس کر لینا چاہیئے
اور کشمیریوں کو ان کا حق دلانے کیلیئے بین الاقوامی برادری کو فعال کردار ادا کرنا چاہیے
اور بھارت کو اسکے منفی بلکہ تخریبی رویے بدلنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ خود بھارت کے
حق میں بھی یہی بہتر ہے ورنہ اسکے فوجی

ایک ظالمانہ جنگ لڑتے لڑتے اب جس ذہنی دباؤ کا شکار ہیں پورا بھارتی معاشرہ اسکے زیر اثر آ جائے گا۔ بھارتی فوج میں اس وقت خود کشی کا رجحان جس قدر عام ہو رہا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بھارتی نوجوان نوکری کی خاطر بھی فوج میں نہیں جانا چاہتے حالانکہ انہیں پر کشش تنخواہ کا لالچ بھی دیا جاتا ہے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی سطح پر بھارت پر اتنا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ کشمیریوں کے حق خود ارادی کو تسلیم کر لے کیونکہ اندرونی طور پر تو بھارت سرکار کشمیریوں کے ہاتھوں مجبور نظر آ رہی ہے اور کشمیری بھی اب اپنا حق کسی طور پر بھی چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہے چاہے بھارت میڈیا کو کوریج کی اجازت دے یا نہ دے بین الاقوامی میڈیا کو کشمیر بدر کر دے وہ اس سے دنیا کی آنکھوں میں تو دھول جھونک دے گا لیکن جذبوں کو دبا نہ سکے گا۔ چاہے وہ کشمیری رہنماؤں کو پابند کر دے جیلیں ان سے بھر دے وہ روح آزادی کو پابند سلاسل نہ کر سکے گا۔

اقوام متحدہ، امریکہ اور دوسری طاقتوں کو بھارتی طرف داری سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیئے اور کشمیریوں کے جائز حق کو حاصل کرنے میں انکی مدد کرنی چاہیے۔ اس وقت دنیا کے امن کو جس مسئلے سے شدید ترین خطرہ ہے وہ یقیناً مسئلہ کشمیر ہے جو دو ایٹمی قوتوں کے درمیان جنگ کا باعث بن سکتا ہے اور

اگر جنگ چھڑ جائے تو پھر اس کو روایتی جنگ رکھنا بہت مشکل اور ایٹمی جنگ بنا دینا بہت آسان ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے ہر دو طاقتیں اپنے بچاؤ کا آخری حربہ ضرور آزمائیں گی۔ اگر بھارت اپنی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ دے تو کشمیر کا سلگتا ہوا انگارہ نہ صرف علاقے کی تباہی کا باعث نہ بنے گا بلکہ دونوں ممالک اپنے وسائل اپنے عوام کی خوشحالی پر لگا سکیں گے لیکن خوشحالی کی شرط پوری کرنا صرف اور صرف بھارت کے ہاتھ میں ہے۔

بھارتی فوج میں کرپشن

یوں تو بھارت سرکار اپنی فوجی قوت میں اضافہ کیلئے دن رات کوشاں ہے اور دنیا کے ہر کونے سے جدید سے جدید جنگی ٹیکنالوجی اور اسلحہ خرید رہا ہے اور خود اس کے اسلحہ ساز بھی فارغ نہیں بیٹھے ہوئے۔ حالانکہ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے پڑوسیوں میں سے کوئی بھی مشتعل مزاج نہیں، نہ ہی کسی کے جارحانہ اور غاصبانہ عزائم ہیں۔ ہاں یہ ساری خصوصیات خود بھارت میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جن کی تسکین اور تکمیل کے لئے وہ ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے اور اپنی فوج کی وسعت بھی اس کے ایجنڈے میں شامل ہے تاکہ علاقے میں اپنی چودھراہٹ قائم رکھ سکے لیکن ایک مسئلہ جس پر بھارتی حکومت یا تو سوچ نہیں رہی یا حقیقت یہ ہے کہ وہ اس پر قابو پانے سے قاصر ہے اور وہ مسئلہ اس کی فوج میں کرپشن کا اٹھتا ہوا طوفان ہے جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے نہ صرف کرپشن بلکہ ذہنی امراض اور خودکشیوں کا بڑھتا ہوا رجحان یقیناً بھارت کے لئے ایک چیلنج کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ لیکن تا حال اس تناسب میں کسی کمی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ خودکشی تو ایک مسئلہ ہے بھارتی فوج اس وقت اپنے اعلیٰ ترین افسران سے لیکر سپاہیوں تک مختلف قسم کی کرپشن میں مبتلا ہے۔ روپے پیسے کے لئے غبن سے لے کر جنسی سیکنڈلز تک مختلف واقعات آئے روز کا معمول بنتے جا رہے ہیں اور حیرت کی بات

یہ ہے کہ ان واقعات میں فوج کے بڑے عہدیداروں کا نام بھی تسلسل سے آ رہا ہے۔
ایسا ہی ایک سکینڈل اگست 2010 میں سامنے آیا جب آرمی سپلائی کور کے لیفٹیننٹ جنرل سریندرا کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے سیاچین بھیجے جانے والے گوشت اور خشک راشن کے معاملے میں خرد برد کی۔ یہ ذہن میں رہے کہ سیاچین میں استعمال ہونے والا راشن عام راشن سے کئی گنا مہنگا ہوتا ہے۔
اسی طرح میجر جنرل ایس کے بھراد واج جو کہ انڈین نیشنل سیکیورٹی گارڈ میں آئی جی آپریشن کے اہم عہدے پر فائز تھے، نے کینٹین کے کچھ معاملات اور گاڑیوں کے بے تحاشا استعمال پر پیسہ بھی کمایا اور یقیناً نام بھی کمایا، لیکن اندازاً لگایئے کہ کیا ایک میجر جنرل کو اتنی معمولی قسم کی بے قاعدگیوں میں ملوث ہونا زیب دیتا ہے؟
اور ایک حیرت انگیز واقعہ تو اس وقت پیش آیا جب بھارت کے انجینئر انچیف اے کے نندا نے اسرائیل کے دورے کے دوران ایک جونیئر میجر کی بیوی کے ساتھ جنسی زیادتی کی اس واقعے سے ہی بھارتی فوج کے اخلاقی معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ایک فوج کے لیڈروں اور سالاروں کے اخلاق کا یہ عالم ہو تو وہ کس منہ سے اپنے جونیئر افسروں اور جوانوں کو برائی سے روک سکتے ہیں اور اگر ایک شخص اخلاقی طور پر اس قدر گرا ہوا ہو تو اس سے کسی بہادری کی توقع

کیسے کی جا سکتی ہے۔

اب ذرا نیچے آیئے کہ جرنیلوں سے کم درجے پر بھارتی فوج کے افسران کیسے کیسے پیسہ کمانے اور بنانے میں مصروف رہتے ہیں اور یوں نظر آتا ہے کہ ان کی نوکری بلکہ زندگی کا مقصد صرف اور صرف پیسہ کمانا ہے چاہے اس کے لیے انہیں کچھ بھی کرنا پڑے اور اسی لئے خرد.برد، ذرائع کے غلط استعمال، فوجی سازوسامان کی غیر قانونی خریدوفروخت اور اخلاقی کرپشن جیسے واقعات سے بھارتی فوج بھری پڑی ہے۔ میجر بھوشن کو 19 جون کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا اور اس وقت میجر بھوشن انڈین آرمی میں شمولیت 2010 کے خواہش مند ایک امیدوار سے صرف دس ہزار روپے کی رشوت لے رہے تھے۔ ایسے ہی ایک اور کیس میں پولیس نے لیفٹیننٹ کرنل مونیدرپال سنگھ کو گرفتار کیا کیونکہ یہ صاحب اغوا شدہ گاڑیوں کے کاروبار میں ملوث تھے اور تین سو گاڑیوں کی چوری میں ان کا نام شامل تھا۔ ایک اور ایسا شرمناک واقعہ تب پیش آیا جب لیفٹیننٹ کرنل دریندر مل ڈائریکٹر ملٹری فارم جموں خشک دودھ کی خریداری میں دس کروڑ کا غبن کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

یہ ماضی قریب اور حال ہی میں پیش آنے والے چند واقعات تھے جو منظر عام پر آئے ورنہ نامعلوم کتنے ایسے واقعات ہونگے جو بھارتی فوج چھپا لینے میں

کامیاب ہو جاتی ہوگی اور مجرم سزا سے بچ جاتے ہونگے۔

بھارتی فوج جو خود کو بہت اعلیٰ تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس سمجھتی ہے۔ اسلحہ تو خیر درست ہے کہ وہ اعلیٰ ترین جمع کر رہی ہے چاہے اس کے لئے اسے اپنے لوگوں کو ننگا اور بھوکا رکھنا پڑے انہیں اس چیز کا بالکل افسوس نہیں ہے اگر اس کے شہر دنیا کے سب سے بڑے گٹر بنے رہیں اگر اس کی ایک ارب آبادی کی اکثریت رات کو بھوکی سڑکوں پر سوئے تو بھی اس کو دکھ نہیں۔ اس پر صرف ایک خبط سوار ہے اور وہ ہے مسلسل اسلحہ جمع کرو اور اس کے ذریعے اپنے پڑوسیوں کو ہراساں کرتے رہو۔ برصغیر کے امن کو تہہ وبالا کرنے کا ذمہ دار یقیناً بھارت ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اسے بین الاقوامی برادری کا تعاون بھی حاصل رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جب چین کا پاکستان کو ایٹمی ری ایکٹر دینے کا وقت آیا تو مغرب چیخ اٹھا لیکن امریکہ خود بھارت کو یہ ری ایکٹر دینے پر راضی ہے۔ ایک ایسی فوج کو جو خود اپنے کردار پر قابو رکھنے کی اہل نہیں ہے۔ اس پر پیسے خرچ کرنا اور نہ صرف اپنے عوام کو ہر سہولت سے محروم رکھنا بلکہ دوسروں کو بھی اس بات پر مجبور کرنا۔ یہ بھارت کا ایک بہت بڑا جرم بلکہ دیکھا جائے تو گناہ ہے جسے وہ کیے جا رہا ہے اور برصغیر کے امن کا قتل بھی بھارت کے ہی سر ہے۔

فوج کسی بھی ملک کا سب سے منظم ترین ادارہ ہوتا ہے اور سوچیے اگر بھارتی فوج کا یہ حال ہے تو اس کے دوسرے ادارے کرپشن کی لعنت میں کتنے ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ لیکن بھارت کو صرف ایک وجہ سے بین الاقوامی طور پر فائدہ دیا جاتا ہے اور وہ وجہ ہے کہ اس کے مقابلے پر اس کا صرف ایک پڑوسی آتا ہے اور وہ مسلمان ہے اور ایٹمی قوت بھی ہے جسکی ایٹمی قوت کو اب تک غیر مسلم دنیا نے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا حالانکہ بھارت جیسے دشمن کے ہوتے ہوئے یہ قوت حاصل کرنا انتہائی ضروری تھا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ پاکستان میں کرپشن نہیں ہے یقیناً بہت زیادہ ہے اور اسے ہر صورت میں ختم ہو جانا چاہیے لیکن پاکستان کو دنیا کے کرپٹ ترین ملک کہنے سے پہلے دنیا کو بھارت میں موجود کرپشن کے بارے میں معلوم کر لینا چاہیے۔ پاکستان کی بدنامی کی مہم ترک کرکے اصل حقائق دنیا کے سامنے لا کر بھارت کو سپرپاور ثابت کرنے سے پہلے اس کے اندر موجود برائیوں، بھوک افلاس اور بے گھری کو بھی دیکھ لینا چاہیے۔

اسلام اور حیلہ افرنگ

اہل مغرب آجکل دہشت گردی کے خلاف واویلے میں مصروف ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ اس مسئلے کا ذمہ دار ہر صورت مسلمانوں اور مسلمان ملکوں کو قرار دیا جارہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ واویلا کنندہ ممالک اس مسئلے سے یا تو متاثر ہی نہیں ہیں یا بہت ہی کم متاثر ہیں جبکہ جن مسلمان ممالک کو بدنام کیا جارہا ہے وہی سب سے زیادہ اس مسئلے سے دوچار بھی ہیں اور متاثر بھی۔ پاکستان کو تو دہشت گردی نے ہلا کر رکھ دیا ہے جبکہ اہل مغرب کا پروپیگنڈا یہ ہے کہ پاکستان ہی ان دہشت گردوں کی پناہ گاہ ہے۔ اور غیر مسلم قوتیں بڑی شد و مد کے ساتھ مسلسل اسلام اور دہشت گردی کو مربوط ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ دراصل یہ سارا پروپیگنڈا اسلام سے خوف اور نفرت پر مبنی ہے۔ خود کو بہت لبرل اور روشن خیال سمجھنے والے اہل مغرب دراصل انتہائی تنگ نظر اور متعصب ہیں۔ رچرڈ شیر دل اور صلاح الدین ایوبی کی صلیبی جنگوں سے لے کر بش کی یک طرفہ صلیبی جنگوں تک اسلام کے خلاف نفرت ہی کا جذبہ کارفرما رہا اور چلتا چلا جارہا ہے۔ اسلام کی اصل روح اور اصل شکل کو مسخ کرنے کی ایک مسلسل کوشش ہے جسے وہ صدیوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور آج میڈیا کی ترقی کے دور میں اس مہم کو تیز کر دیا گیا ہے۔

مغرب کے اہل دانش اسلام کی اصل روح سے آگاہ ہیں اور یہی آگاہی انکے لیے سوہان روح بنی ہوئی ہے کہ اگر بات حلقہ دانش وراں سے آگے نکل کر عام کانوں تک پہنچ گئی تو پھر اس طوفان کو روکنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ وہ لوگ جو بے خبری میں اسلام سے نفرت کر رہے ہیں وہ اس پاک مذہب کی اصلیت جان جائیں گے جو محبت، امن اور بھائی چارے کا مذہب ہے یوں بھی یورپ اور امریکہ میں تیزی سے پھیلتا ہوا اسلام اہل مغرب کے لیے پریشان کن ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آئے روز مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں مسجد کے میناروں پر پابندی، فرانس میں عرصہ دراز سے چلنے والی سکارف اور حجاب پر بحث اور پابندی، بیلجیئم میں سکارف کو جرم قرار دینے کی قرارداد اور ناروے کے اخباروں میں توہین آمیز خاکے تو آخری حد ہے۔ یہ سب کچھ اسلام دشمنی کے ایسے ثبوت ہیں جس سے انکار کسی صورت ممکن نہیں۔ اب اگر اس سب کچھ پر مسلمان رد عمل ظاہر کرینگے تو کیا ان کو بنیاد پرست اور دہشت گرد کہنا بجا ہوگا؟

آزادی کشمیر کی تحریک کے کارکنوں کو دہشت گرد کہنا کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں یہی حال فلسطین اور چیچنیا کے مسلمانوں کا ہے۔ افغانستان اور عراق میں امریکہ جو کھیل کھیل رہا ہے اس کا ایک قدرتی رد عمل وہی ہے جو کہ وہاں کے

لوگ کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہاں امن کا قیام نا ممکن ہو رہا ہے۔

اہل مغرب جو خود کو انسانیت کے ٹھیکیدار سمجھتے ہیں اور تو اور جانوروں کے حقوق کے بھی علمبردار بنے رہتے ہیں اور خانہ جنگیوں کے فیصلے کرنے کے بہانے دور دراز کے ملکوں میں پہنچ جاتے ہیں جن میں اکثریت مسلمان ممالک کی ہوتی ہے اور وہاں کے مسلمانوں کا خون ان کے لیے ان جانوروں سے بھی کم بے وقعت ہوتا ہے جن کے لیے وہ ریلیاں نکالتے ہیں۔ پھر بھی وہ اسلام اور مسلمانوں کو شدت پسند کہتے ہیں

جبکہ دوسری طرف اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو زندگی میں ایک خاص توازن کا حامل اور حامی ہے نہ تو اس میں جبر ہے اور نہ ہی وہ بے اعتدال نرمی کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا پیش کر دو۔ اسلام معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے اگر اس میں جرم کی سزا ہے تو اس سے بھی اصلاح مقصود ہے اور اس سے پہلے اصلاح کی ہر کوشش ضروری قرار دی گئی ہے ورنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں ایک مضبوط حکومت بناتے ہی مکہ پر حملہ کر دیتے اور بیعت رضوان میں بظاہر کفار کے حق میں جاتی ہوئی شرائط پر صلح نہ کرتے یہاں بھی اہل مکہ کو اصلاح کا موقع دے دیا گیا اور اس کے بعد بھی جب وہ راہ راست پر نہ آئے تو ان پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کی

طرح فتح کے بعد مکہ کو تاخت وتاراج نہ کیا بلکہ تاریخ میں معافی کی عظیم اور انوکھی مثال قائم کی۔

اسلام کو اس وقت جس طرح دہشت گردی سے مربوط قرار دیا جارہا ہے وہ صرف اسکے آفاقی محبت کے اصولوں کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی ایک سازش ہے۔ اسلام تو ایک انسان کی جان لینے کو پوری انسانیت کی جان لینے اور ایک جان بچانے کو پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف قرار دیتا ہے۔ اسلام میں واضح طور پر خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے کجا کہ خود کش حملے کرکے دوسرے کی جان بھی لے لی جائے لہذا ایک مسلمان خود کش حملے کو نہ صرف معاشرتی برائی بلکہ مذہب سے بغاوت تصور کرتا ہے۔ مغرب کا ایک اور ہتھیار جسے وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ اسلام کے خلاف استعمال کرتا ہے وہ عورت اور مرد کی معاشرے میں حدود ہیں اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے دنیا کے تمام مذاہب کی معاشرتی ڈھانچوں کو اگر اکٹھا کرکے عورتوں کے حقوق دیکھے جائیں تو بھی اسکے برابر نہ ہوں گے یونہی اسلام معاشرے میں ہر فرد کو دوسرے کی ذمہ داری بناتے ہوئے پڑوسی تک کو دکھ سکھ میں شریک اور ایک دوسرے کا معاون قرار دیتا ہے۔اور صرف یہ بھی نہیں کہ اسلام مسلمان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے بلکہ وہ تو اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم کو بھی مکمل مذہبی آزادی دیتا ہے۔ اور اس کا مطالبہ ان سے صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی مملکت کے

خلاف سرگرمیوں میں ملوث نہ ہوں جبکہ یہی مطالبہ دوسرے مذاہب کا بھی رہتا ہے۔ میں نے یہاں اسلامی معاشرے کے چند پہلو لیے ورنہ تو اسلام کی آفاقیت پر تو جلدوں کی جلدیں بھی لکھ لی جائیں تو ناکافی ہیں۔ مغرب تو ظاہر ہے صدیوں سے جاری اپنے مخاصمانہ روش کو جاری رکھے گا لیکن کچھ کام ہمیں بھی کرنا ہے اور آج کے دور کے مطابق کرنا ہے جس طرح مغربی میڈیا اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کو جاری رکھے ہوئے ہے ہمارے میڈیا کو اس کا مناسب توڑ کرنا ہوگا اور اسلام کو اس کی اصل روح اور تعلیمات کے ساتھ پیش کرنا ہوگا مجھے اپنے میڈیا سے شدید شکایت یہ ہے کہ وہ اس کوشش کو کرتے ہوئے بھونڈے پن کا شکار ہو جاتا ہے ایک مثال دونگی کہ انتہائی نازیبا اور بیہودہ لباسوں کے فیشن شوز کو اس بیان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ ان شوز سے پاکستان کے امیج کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی اور یہ تاثر زائل ہوگا کہ پاکستانی معاشرہ شدت پسند ہے۔ ہمیں اپنے مذہب کو اس کی مکمل روح کے ساتھ اور ندامت کے طریقے کو چھوڑ کر انتہائی مثبت اور فخریہ انداز میں پیش کرنا ہوگا اور روشن خیالی کے نام پر مغرب کو خوش کرنے کی بجائے اسلام کی اصل روشن خیالی کو اجاگر کرنا ہوگا۔

انڈیا میں کامن ویلتھ گیمز

1930 میں کینیڈا کے شہر ہملٹن میں برٹش ایمپائر گیمز منعقد ہوئیں ان میں گیارہ ممالک نے حصہ لیا اور تب سے اب تک یہ مقابلے منعقد ہو رہے ہیں سوائے 1942 اور 1946 کے کہ جنگ عظیم دوم کی وجہ یہ کھیل نہ ہو سکے، تاہم اس کا نام بدلتا رہا۔ 1966 میں انہیں برٹش ایمپائر اور کامن ویلتھ گیمز 1970 اور 1974 میں برٹش کامن ویلتھ گیمز اور 1978 میں اس کو موجودہ یعنی کامن ویلتھ گیمز کا نام دیا گیا۔ مختلف اوقات میں مختلف ممالک میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ زیادہ تر آسٹریلیا، کینیڈا اور برطانیہ نے ان کھیلوں کی میزبانی کی اور کھلاڑی ہمیشہ بین الاقوامی معیار کے انتظامات سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس بار ان کھیلوں کی بد قسمتی کہیئے یا بھارت کی کہ 2010 کے کھیلوں کی میزبانی بھارت کو دی گئی اور جوں جوں کھیلوں کی تاریخ نزدیک آ رہی ہے توں توں "Rising India" اور "Incredible India" کی عظیم انتظامی صلاحیتوں کی قلعی کھل رہی ہے۔ وہ ممالک جو بھارتی پراپیگنڈے اور پھیلائے ہوئے فساد کی وجہ سے پاکستان آنے سے کتراتے تھے اور بھارت ان کو محفوظ لگتا تھا وہ بھی ان مقابلوں میں جانے سے خوفزدہ ہیں اور یہاں ان کے خوف کی ایک نہیں کئی وجوہات ہیں۔ دہشت گردی بھی

صحت بھی اور چھتوں کے نیچے آ کر دب جانے اور پلوں کے اوپر سے گر کر مرنے ورنہ کم از کم شدید زخمی ہونے کا خوف بھی اور سارے ممالک اور کھلاڑیوں نے برملا اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ آسٹریلیا جو کہ اب تک ہونے والی تمام سترہ کامن ویلتھ گیمز میں شرکت کرتا رہا ہے اور سب سے زیادہ مرتبہ سرفہرست بھی رہا ہے وہ بھی ان کھیلوں میں شرکت سے شدید خوفزدہ ہے اور اس کی حکومت اور خود کئی کھلاڑی بھی اپنی حفاظت کے بارے میں تشویش رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کی کرکٹ ٹیم کو دھمکیاں مل سکتی ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے ایتھلیٹ، تیراک اور کوئی بھی کھلاڑی، کوئی بھی منتظم اپنی جان کو کیسے محفوظ سمجھے۔ اسی طرح انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور کئی دوسرے ممالک حفاظتی انتظامات کے بارے میں بالکل بھی مطمئین نہیں ہیں اور آسٹریلیا کے وفد کی حفاظت کے لئے تو شاید انہیں اپنی فیڈرل پولیس کو ساتھ لے جانا پڑے کیونکہ بجرنگ دل، بال ٹھاکرے یہ سارے نام ہی، RSS تجویز تو ایسی سامنے آ چکی ہے۔ کھیلوں کو بھارت سے دیس نکالا دینے کو کافی ہیں۔ اسی لیے تو انگلینڈ کے دفاعی چیمپئن سائیکلسٹ نے بھی کھیلوں میں جانے سے انکار کر دیا ہے تمغہ اپنی جگہ اہم لیکن زندگی کی قیمت پر نہیں کیونکہ جان ہے تو جہان ہے۔ وہ تمغہ اگلی بار بھی جیت لیں گے زندگی گئی تو گئی۔

اس سارے معاملے میں جو دلچسپ بات پیش آئی وہ یہ الزام تھا کہ آئی ایس آئی

دولت مشترکہ کھیلوں میں دہشت گردی کروا سکتی ہے۔ وہی بات ہوئی نا کہ ممبئی کی کسی سڑک پر رات کو کھلے آسمان کے نیچے سوئے ہوئے بے گھر مزدور کی دل کے دورے سے موت واقع ہوئی تو ذمہ دار آئی ایس آئی ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر دہلی کی وزیر اعلیٰ مسز شیلا ڈکشٹ نے یہ بات کہی اور اپنے ہر جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے آئی ایس آئی کا نام لینے کے رہنما اصول کو اپنا کر ہی بھارت کی قومی سلامتی کے مشیر ایم کے نارائن نے بھی گڑبڑ کے لئے آئی ایس آئی کو ہی ذمہ دار ٹھہرا دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آئی ایس آئی اور پاکستان کے کہنے پر کامن ویلتھ گیمز ویلج کو اس قدر ناقص تعمیر کیا گیا کہ پہلے ہی اس کی حالت مخدوش ہو گئی۔ بی بی سی نے 21 ستمبر کو کھیلوں کے انتظامات کے بارے میں ایک رپورٹ نشر کی جس میں بتایا گیا کہ چونتیس رہائشی ٹاورز میں سے بہت سے ابھی تکمیل سے بہت دور ہیں جن کمروں کا بین الاقوامی ٹیموں نے معائنہ کیا بہت سے پانی سے بھرے ہوئے تھے اور بقول بی بی سی کے انسانی رہائش کے لئے ناموزوں تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دہلی میں منتظمین کی کمیٹی کے صدر سریش کالماری نے اسی ویلج کو بیجنگ اولمپک ویلج کے معیار کا قرار دیا تھا۔ دراصل منتظمین نے اس حقیقت کو سراسر نظر انداز کر دیا تھا کہ ویلج جمنا کے سیلابی علاقے میں واقعہ ہے اور ساتھ ہی اس علاقے میں بھی جو دارلحکومت کے کسی بھی حصے سے زیادہ زلزلے کی زد میں آ سکتا ہے یہ بھارت کی تکنیکی مہارت کا ایک عظیم ثبوت ہے اور اپنی تعمیراتی مہارت کا ثبوت بھارت نے تب فراہم کیا جب جواہر

لال نہرو سٹیڈیم کے نزدیک پیدل چلنے والوں کے لئے بنایا گیا پل زمین بوس ہو گیا اور ستائیس مزدور زخمی ہو گئے جن میں پانچ شدید زخمی بھی شامل تھے۔ یاد رہے کہ افتتاحی اور اختتامی تقریبات اسی سٹیڈیم میں ہونی ہیں۔

جگہ جگہ بلکہ ہر جگہ کھڑے پانی میں مچھروں کی افزائش سے ڈینگی وائرس کا خطرہ الگ موجود ہے جبکہ بھارت کے دوسرے حصوں کی طرح ملیریا اور پیٹ کے امراض سے بچاؤ تو یقیناً خارج از امکان ہی ہے۔ جغرافیائی حالات اپنی جگہ لیکن منصوبہ بندی کی اہمیت اپنی جگہ مستحکم ہے۔ بھارت ان کھیلوں کی میزبانی حاصل کرنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن اس کے بعد خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کے لئے اس نے کسی کوشش کی ضرورت نہ سمجھی کیونکہ وہ "Rising India" اور "Incredible India" کہتا ہے تو دنیا مان لیتی ہے خود کو اکنامک ٹائیگر کہتا ہے تو بھی دنیا تسلیم کر لیتی ہے اور وہ وہاں سرمایہ کاری شروع کر دیتی ہے۔ ہاں اس بار اس نے سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا اچھا ثبوت فراہم کیا ہے اور کام کرنے والے ٹھیکیداروں کو کھلی چھٹی دی کہ جو چاہے کریں، جیسا چاہے بنائے، گرے یا جمارہے بھارت کے خیال میں جتنا مالی فائدہ وہ اٹھا سکتا تھا اٹھا چکا۔ دراصل اس کے ذہن میں ایک ہی منصوبہ تھا جس کا اظہار اس کے عہدیدار کر بھی چکے ہیں کہ کھیلوں میں کسی بھی دہشت گردی کے لئے آئی ایس آئی ذمہ دار ہو گی شاید بھارت اب یہ بھی کہہ دے کہ خراب مٹیریل آئی ایس آئی

کے کہنے پر لگایا گیا ہے۔ چلیں مان لیا لیکن پھر یوں کیوں نہ کیا جائے کہ بھارت کی حکومت آئی ایس آئی کے حوالے کر دی جائے کیونکہ وہاں کے عوام اپنی حکومت سے زیادہ اس پاکستانی ادارے کے تابع فرمان ہیں۔

اگرچہ بہت سے ملکوں نے اپنے وفود کی بھارت آمد موخر کر دی ہے لیکن بھارت کا اصل چہرہ اب بھی شاید دنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور ہمارے کچھ بزعم خود غیر جانبدار لکھاری اور تجزیہ نگار جو بھارت کی مدح سرائی اور ترقی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں، کے لئے بالخصوص اور دنیا کے لئے بالعموم اپنی آنکھیں کھولنے کا ایک اچھا موقع ہے۔ بھارت کی سازش پر پاکستان سے 2011 کے کرکٹ ورلڈکپ کی میزبانی چھینی گئی جس کے لئے اس نے سری لنکا کی ٹیم پر حملہ کرایا۔ لیکن اب سر پر آئے ہوئے دولت مشترکہ کے کھیلوں کی میزبانی کے لئے وہ مشکلات کا شکار بھی ہے اور دنیا کے اعتراضات کی زد میں بھی اور کھیل شروع ہونے سے پہلے کے یہ اعتراضات جہاں انتظامی اور منصوبہ بندی کے امور سے تعلق رکھتے ہیں وہیں بھارت میں ہر شعبے میں پھیلی ہوئی کرپشن کا بھی منہ بولتا ثبوت ہے۔

پاکستان میں را کی دہشت گردی

ارتھ شاستر تقریباً تین سو سال قبل مسیح میں لکھی گئی کتاب ہے اسے موریہ خاندان کے وزیر سیاست کوٹلیہ عرف چانکیہ نے لکھا تھا جاسوسی کی یہ کتاب ہندو ذہنیت کا مکمل آئینہ ہے اس میں راجہ کو اپنی حکومت کو طول دینے کے لئے ہر ناجائز اور ظالمانہ فعل کو جائز قرار دیا گیا اور ہمسایہ ملکوں اور راجدھانیوں کو تباہ کرنے اور ان کے لئے امن وامان کے مسائل کھڑے کرکے انہیں کمزور کرنے اور اپنی حکومت اور ملک کے لئے فائدہ اٹھانے کے طریقے بتائے گئے تھے۔ ہندو ذہنیت ہمیشہ سے شاطر، چالباز اور تخریب کار رہی ہے صدیوں کے گزرنے نے اس پر کوئی اثر نہ ڈالا 1968 میں انہی اصولوں اور ضابطوں پر عمل کرنے کے لئے ارتھ شاستر کو چانکیہ سمیت پھر زندہ کرکے اسے ہندو ذہنیت نے را کا نام دیا۔ را کا بڑا مقصد بھی وہی ٹھہرا کہ ہمسایہ ممالک کو چین اور سکون سے نہ رہنے دیا جائے ان کے امن وامان کو تہہ و بالا کیا جاتا رہے ہوس ملک گیری میں انسانی جانوں سے کھیلا جاتا رہے اور انہیں امن اور سکون کو ترسا دیا جائے۔ را یہ کام چانکیہ جی کے متعدد چیلوں سے لیتی رہتی ہے وہ اپنے جاسوس بھی بھیجتی ہے اور ہمسایہ ممالک میں ضمیر فروشوں کو اچھے داموں خرید کر بھی یہ کام کرتی ہے۔ اپنے بے حساب بجٹ کی وجہ سے یہ کام اسکے لئے مشکل بھی نہیں ہوتا۔ را کے قیام کا سب سے

بڑا مقصد پاکستان کو نشانہ بنانا تھا لیکن اس نے اپنے مذہب اور تاریخ کی تعلیمات کے عین مطابق اپنے دیگر پڑوسیوں کو بھی مسلسل نقصان پہنچایا جس کی بڑی مثال سری لنکا ہے جہاں تامل ٹائیگرز کو بے تحاشا اسلحہ اور پیسہ بھی دیا گیا اور تربیت بھی اور تقریباً تیس سال تک اس مکروہ فعل کو جاری رکھا گیا۔ سب سے پہلے ادھر ہی خودکش حملوں کے ذریعے فساد پھیلایا گیا لیکن تاملوں کے دل میں بغاوت بنام ''آزادی'' کا جو بیج بویا گیا پربھاکرن کی موت کے بعد آزادی کی یہی خواہش تامل ناڈو میں بھارتی تاملوں کی خواہش بننے لگی ہے۔ سری لنکا میں تو جو کیا گیا وہ کیا گیا پاکستان کو اپنے قیام سے لیکر اب تک کسی موقع پر بھارت نے معاف نہ کیا اور را نے اپنی اس ''ڈیوٹی'' کو بڑی تندھی سے انجام دیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں اور مکتی باہنی جیسی تنظیموں کے ذریعے اس نے جو انسانیت سوز مظالم کئے وہ تو تاریخ کا حصہ ہیں لیکن بنگلہ دیش بننے کے بعد اس نے بنگلہ دیش کو بھی سکون سے نہ رہنے دیا اور آسام اور بنگال میں آزادی کی تحریکوں میں اسے ملوث قرار دے کر اپنی تخریبی کاروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔

پاکستان دہشت گردی کی جس حالیہ لہر سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے اس سے را کو کسی طرح بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنا مکروہ کھیل مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے سوات میں لوگوں کو دیکھ کر یہی خیال آتا رہا

ہے کہ رانے کسطرح سالوں تک انکی زندگی اجیرن بنائے رکھی۔ سوات میں طالبان کے نام پر غیر مسلم لاشوں کا ملنا ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ لوگ نہ تو مقامی ہیں نہ کسی دوسرے مسلمان ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھارتی ساختہ اسلحہ ان لوگوں کے عام استعمال میں رہا۔ رانے اپنے خزانوں کے منہ کھلے رکھے اور ایک رپورٹ کے مطابق سوات کے دہشت گردوں پر رانے تقریباً 650 ملین روپے خرچ کئے ورنہ اس قدر وافر اسلحہ، روپیہ اور دوسرے ذرائع یہ لوگ مقامی ذرائع میں کس طرح ممکن بنا سکتے تھے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ چندے سے ایسا کیا گیا تو کیا غریب عوام اتنا روپیہ جمع کر سکتے ہیں جس سے جدید اسلحہ خریدا جاسکے۔ جدید ترین انفارمیشن ٹیکنالوجی خریدی بھی جائے اور استعمال بھی کی جائے جبکہ سب ہی جانتے ہیں کہ ان تحریکوں کے لیڈران نہ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے نہ ہی اعلیٰ تربیت یافتہ پھر وہ کیسے ان ٹیکنکل معاملات کو سنبھالے ہوئے تھے۔
بلوچستان میں تو را کی مداخلت خیر اب ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت بن چکی ہے جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ براہمداغ سمیت بی ایل اے کی نام نہاد لیڈر شپ را کی مدد سے ہی لیڈر بنے ہیں۔ بالکل اسی طرح جسطرح طالبان میں عہدے تقسیم کئے گئے انہیں بڑے لیڈر بنا دیا گیا جبکہ وہ مکمل ان پڑھ اور دین سے بے خبر لوگ تھے۔ بیت اللہ محسود را کا ایک اور لاڈلا تھا جسے

طلسماتی اور کرشماتی شخصیت بنا کر پیش کیا جاتا رہا۔ بلوچستان ہی کی بات کو اگر آگے بڑھایا جائے تو جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ را اس وقت دنیا کی ناکام ترین خفیہ ایجنسی سی آئی اے کا دست راست بنا ہوا ہے تا کہ پاکستان کے عدم استحکام کی اپنی خواہش بھی پوری کر سکے اور سی آئی اے سے بلوچستان کی معدنی دولت میں اپنا حصہ بھی وصول کر سکے۔ سی آئی اے کو میں نے ناکام اسلئے کہا کہ اب تک کوئی قابل ذکر کامیابی اس کے حصے میں نہیں آ سکی۔ ویتنام سے لیکر عراق اور افغانستان تک ہر میدان میں اسے ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑا نہ تو اس کی اطلاعات درست نکلی اور نہ اندازے۔

را خود تو پاکستان کے خلاف ہے ہی سرگرم عمل اب تو اس نے افغانستان کی خفیہ ایجنسی رام (ریاست امانت ملیہ) کو تربیت دینا شروع کی ہے تا کہ وہ پاکستان میں تخریبی کاروائیاں زیادہ مہارت سے کر سکے۔ افغانستان میں رام، سی آئی اے اور را مل کر منشیات سے اپنے فنڈز بناتے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ تینوں ایجنسیاں جانتی ہیں کہ احمد ولی کرزئی منشیات کا کتنا بڑا اسمگلر ہے لیکن اسے حامد کرزئی کا بھائی ہونے کا فائدہ دیا جا رہا ہے یہ ان کی پیشہ ورانہ مہارت اور دیانت ہے۔

اگر اس بات کا تجزیہ کیا جائے کہ را کے پاکستان کے خلاف عزائم کیا ہیں تو

ہمیں معلوم ہوتا ہے اس کا پہلا مقصد تو پاکستان میں عدم استحکام پیدا کرنا ہے تاکہ پاکستان ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہے۔ دوسرا مقصد جسے را کبھی پورا نہ کرسکے گا(انشا اللہ) وہ ہے پاکستان کے خدانخواستہ ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور اسی مقصد کے لئے اس نے بلوچستان میں سی آئی اے کی مدد کا فیصلہ کیا جسکی نظر وہاں کے ان قیمتی معدنی ذخائر اور توانائی کے پوشیدہ ذرائع پر ہے جسے وہ برس ہا برس تک استعمال کرسکتا ہے۔ ایک اور بڑا مقصد را کی کاروائیوں کا یہ ہے کہ کسی طرح پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کرلیا جائے جو بھارت کا علاقے کی سپرپاور بننے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔1998 میں بھارت نے جب ایٹمی دھماکے کئے تو بزعم خود اس کا خیال تھا کہ اب وہ پاکستان اور ارد گرد کے دوسرے ممالک کو ہضم کر جائے گا یا طفیلی ممالک بنا دے گا۔ لیکن جب جواب میں پاکستان نے دھماکے کئے تو اس کا یہ خواب چکنا چور ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ پاکستان ہندو جنونیت سے محفوظ ہوگیا بلکہ دوسرے ملک بھی اس کی دست برد سے بچ گئے۔

آجکل بھارت اور را ایک اور کام بڑی جانفشانی سے کر رہے ہیں اور وہ ہے ہمارے عسکری اداروں اور آئی ایس آئی کے خلاف زبردست پروپیگنڈا مہم یعنی دنیا میں ہونے والے ہر ناخوشگوار واقعے میں آئی ایس آئی کا ہاتھ ثابت کرنا اور یوں افواج پاکستان کو دہشت گرد ثابت کرنا اور ملک کے اندر اور باہر فوج کو

بدنام کرنا۔ را نہ صرف یہ کہ مختلف علاقوں میں عدم استحکام پیدا کرتا ہے بلکہ دیگر مختلف واقعات میں بھی ملوث رہتا ہے۔ کبھی اپنے ملک میں کبھی دوسرے ملک میں جیسے ممبئی بھی را کا ہی رچایا ہوا ڈرامہ تھا اور اسی طرز پر ایک ڈرامہ اس نے لاہور میں سری لنکن ٹیم پر حملے کی صورت میں رچایا۔ مناواں پولیس ٹریننگ سنٹر، میریٹ، پی سی پشاور اور ایسے دیگر واقعات میں را ملوث رہا۔ ڈیرہ بگٹی سے پکڑے جانے والے ایک دہشت گرد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انہیں بھارتی سپورٹ حاصل ہے۔

خفیہ ایجنسیاں جب اپنے ملکی مفادات کا تحفظ کریں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن جب دوسرے ملکوں کے معاملات میں مداخلت کریں تو یقیناً دہشت گرد بن جاتی ہیں اور بجا طور پر تخریبی ایجنسیاں کہلانے کی مستحق ہو جاتی ہیں۔ را ایسی ہی ایک تخریبی ایجنسی ہے جو اپنے لیڈروں کی خواہشات اور تصورات کے عین مطابق کام کرتی ہے۔ جواہر لال نہرو کوٹلیہ چانکیہ کا بہت بڑا مداح تھا اور اسکے جانشینوں نے انہی ظالمانہ اصولوں کو بنیاد بنا کر را کی بنیاد رکھی اور اسے دوسروں کے لئے وبال جان بنا دیا۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس کی مکاریوں اور عیاریوں سے باخبر رہے تو ان کی کامیابی کے امکانات خود بخود ختم ہوتے جائیں گے۔

سوات ۔۔۔ماضی، حال اور مستقبل

پاکستان گزشتہ چند سالوں سے دہشت گردی کی جس آگ میں جل رہا ہے اس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کوئی بڑا تو بڑا چھوٹا شہر بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن جن شہروں اور علاقوں نے اس آفت سے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے وہ صوبہ خیبر پختونخواہ ہے۔ حالانکہ اس علاقے کو خدا نے جس قدرتی حسن سے نوازا ہے وہ خزانہ بہت کم جگہوں کو عطا کیا گیا۔

عرصہ پہلے جب میں نے اپنے بچپن کے کچھ سال سوات میں گزارے تو اُس وقت کوئی ان حالات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جن سے سوات ماضی قریب میں گزرا ہے۔

سوات پڑھے لکھے لوگوں کا ایک پرامن شہر تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا کہ آپ سوات میں ہوں اور سیاح نہ دیکھیں۔ لیکن کچھ سال پہلے بالکل اچانک ہی سوات دہشت گردوں کی زد میں آگیا۔ نفاذ شریعت یہاں کے لوگوں کا دیرینہ مطالبہ تھا لیکن اس کیلئے انہوں نے کبھی تشدد کا راستہ نہیں اپنایا۔ وہ بذات خود اسلام کے اصولوں پر عمل کرتے تھے لیکن دنیاوی تعلیم کو بھی پوری اہمیت دیتے تھے۔ میں نے کالام کے راستے میں ایک ایسا ہائی سکول بھی دیکھا تھا جہاں دسویں جماعت میں صرف ایک طالبعلم تھا لیکن سکول اس کیلئے بھی

موجود تھا۔ لڑکیوں کے پڑھنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ دور دراز سے لڑکیاں نہ صرف سیدو شریف اور مینگورہ کے ہائی سکولوں میں پڑھنے آتی تھیں بلکہ پشاور اور ملک کے دیگر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سوات کی متعدد طالبات کی موجودگی وہاں کے لوگوں کی علم دوستی کا ثبوت تھا۔ اسے ہماری حکومتوں کی کمزوری ہی کہیے کہ ایک ترقی یافتہ شہر ان کی موجودگی میں تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ ہم میں ایک برائی یہ ہے کہ ہم برائی کو پنپنے دیتے ہیں اور جب وہ اپنی جڑیں پھیلا دیتی ہے تو تب ہم اسکی بیخ کنی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہر حال سوات نے ایک بہت شدید اور بڑے فوجی آپریشن کا سامنا کیا۔ اس وادی نے تو یقیناً اپنے در و دیوار پر اس سختی کو سہا، پاک فوج نے بھی اپنے بے شمار بہادر سپاہی اور آفیسر اس جنگ میں کھو دیئے۔

ایک لمبے عرصے بعد ایک لیکچر کے سلسلے میں سوات جانا ہوا تو ایک انجانا خوف دل میں تھا کہ معلوم نہیں اب بھی سوات اپنے اصل کی طرف واپس لوٹ چکا ہوگا یا نہیں اور کیا خوف اب بھی اس وادی کے در و دیوار پر چھایا ہوا ہوگا یا نہیں، کیا پر رونق بازار کھلے ہونگے یا نہیں۔ وقت تو شام کا تھا لیکن ہم جونہی سوات کی حدود میں داخل ہوئے شہر کی رونق کا احساس ہونے لگا۔ ایک جیتا جاگتا سوات ہمارے سامنے تھا۔ ہاں ایک چیز جو غیر معمولی لگی وہ ہر تھوڑے فاصلے پر فوجی سپاہیوں کی موجودگی، کہیں کہیں چوکیوں میں اور زیادہ تر ویسے ہی ڈیوٹی

پر موجود تھے۔ اگلی صبح لیکچر کیلئے جانا ہوا تو سوات کے بھرے پرے پر ہجوم بازار اور خرید وفروخت میں مصروف لوگ اس شہر کے امن کا ثبوت تھے لیکن پھر کئی فوجی جوان نظر آئے۔ مرغزار جاتے ہوئے ایک فوجی گاڑی نظر آئی جسے بچوں، بڑوں اور بوڑھوں نے انتہائی گرمجوشی اور پاک فوج زندہ باد کے نعرے لگا کر خوش آمدید کہا۔ تصویریں اتاریں اور ہاتھ ہلائے۔ یہ سب دیکھ کر یہی محسوس ہوا کہ طالبان کی دہشت سے نکلنے پر یہ لوگ مطمئین بھی ہیں اور خوش بھی۔ سوات کے درودیوار پر گولوں اور گولیوں کے نشانات اور کچھ جلے ہوئے سکول بھی نظر آتے رہے۔ ایک ایسا خالی گرلز سکول بھی نظر آیا جس کا نہ دروازہ تھا نہ کھڑکی اور عمارت پر آگ کے اثرات نمایاں تھے۔

سیدو شریف میں موجود بتکدہ کے کھنڈرات تک بڑی مشکل سے رسائی ہوئی کیونکہ اس کا اصل راستہ جو سوات میوزیم اور سرکٹ ہاؤس کے سامنے سے ہو کر جاتا ہے بند کیا گیا ہے۔ وہاں موجود آٹھویں جماعت کے ایک طالبعلم سے ملاقات ہوئی جب اس سے پوچھا کہ آخر طالبان ایک دم سے سوات میں اس قدر طاقتور کیسے ہو گئے؟ آپ لوگوں نے کیسے انہیں اتنا سپورٹ کیا؟ تو اس نے بتایا وہ شروع میں تو یہی کہتے تھے کہ اسلام پر عمل کرو اس کے اصول اپناؤ۔ یہ سب تو اچھا تھا لوگ ان کے ساتھ ہو گئے انہوں نے چندہ مانگا تو عورتوں نے اپنے زیور بھی دے دیئے کچھ نے خوشی سے کچھ نے مجبوراً اور اس کے بعد وہ اپنی اصلیت پر اتر آئے۔

اسلام کے مطابق چلنے کی بجائے اسے اپنے طریقے پر چلانے لگے اس بچے کے مطابق اس نے خود ذبح شدہ لوگ دیکھے۔ لیکن اب وہ خوش تھا کہ اس کی جان ان لوگوں سے چھوٹ چکی ہے۔

یہ تو وہ حالات ہیں جن سے سوات گزرا ہے، فوجی آپریشن کے اثرات بھی موجود ہیں اور سیلاب کی تباہ کاریاں بھی جا بجا نظر آرہی تھیں۔ لیکن کہیں پر سول ادارے کام کرتے نظر نہ آئے۔ جبکہ حکومت کو سوات کو ان تمام اثرات سے نکالنے کیلئے ہنگامی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا۔ لیکن اب بھی فوج ہر جگہ پر مصروف عمل ہے۔ امن و امان سے لے کر تعمیر نو تک ہر کام میں فوج ہی مصروف ہے۔ سیلاب کے دوران ٹوٹنے والے پلوں اور سڑکوں کی بحالی بھی فوج کے حوالے ہے۔ ایسا ہی ایک پل راستے میں شموزئی کے مقام پر نظر آیا۔ جس کی تعمیر میں فوجی جوان مصروف تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ فوج کے فرائض میں ہی شامل ہے یا حکومت اور اس کے سول اداروں کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ کیونکہ کم از کم ہمیں یہ لوگ کہیں بھی کام کرتے نظر نہ آئے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب حکومتی اداروں کو اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھال لینی چاہیئے۔ اندرونی امن و امان پولیس کی ذمہ داری ہے اور تعمیر نو تمام متعلقہ اداروں کی، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب یہ ادارے اپنی اپنی ذمہ داری اپنے سر لے لیں اور سوات کے اہم ممبران قومی و صوبائی اسمبلی کو اپنے ووٹ بنانے کے

ساتھ ساتھ پورے سوات کی تعمیر نو کیلئے کوشش کرنی چاہیئے۔ جس کیلئے ضروری نہیں کہ وہ حکومت کے فنڈز استعمال کریں بلکہ یقینا یہ تمام حضرات اگر بے شمار اثاثوں میں سے کچھ حصہ کسی بھی نیک کام میں لگا دیں تو یوں قطرہ قطرہ دریا بن جائے گا اور اینٹ اینٹ لگ کر شہر تعمیر ہو جائے گا۔

سوات پاکستان کے خوبصورت ترین مقامات میں سے ہے۔ سیاحت یہاں کی بہت.بڑی صنعت ہے جس سے نہ صرف خود سوات کے لوگ فائدہ اٹھاتے رہے ہیں بلکہ ملک میں بھی ایک کثیر زر مبادلہ آتا رہا ہے۔ اس صنعت کی طرف پھر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ سوچا جائے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ درست ہو جائے گا تو وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وقت کو قابو کرنے کیلئے انسان کو کوشش کرنا پڑتی ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت پاکستان اور خاص کر حکومت خیبر پختونخواہ سوات کی تعمیر نو کی ذمہ داری پوری ذمہ داری کے ساتھ قبول کر لے۔ وہاں کے ٹوٹے ہوئے پل، سڑکیں، سکول اور ہسپتال اپنی تعمیر کیلئے حکومت کے منتظر ہیں۔

غافل نہ ہو خودی سے۔۔۔

پاکستان علاقے کے نہیں دنیا کے اہم ترین ممالک میں شامل ہوتا ہے اب اسے ہماری خوش قسمتی کہئے یا خدانخواستہ بدقسمتی ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم اس اہمیت کا فائدہ اٹھاتے، دنیا کو اس کا احساس دلاتے اور مزید آگے بڑھ کر اس کی قیمت بھی وصول کی جا سکتی تھی لیکن ہوا یہ کہ ہم نے ہمیشہ اس اہمیت کی بھاری قیمت چکائی ہے۔ عالمی طاقتوں نے علاقے کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھا ہم کبھی ایک کے حلیف اور کبھی دوسرے کے حریف بنتے رہے۔ معلوم نہیں اس میں مفاد کس کا تھا لیکن یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جو نقصان قوم کا ہوا وہ ناقابل تلافی ہے۔ امریکہ کے حلیف بننے کے لئے آخری بار جو بھونڈی توجیہہ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ہمیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دیا جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ ہم نے مدد بھی کی اور پتھر کے زمانے میں بھی دھکیلا گیا۔ دہشت گردی کے طوفان نے جس طرح ہمیں اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور جتنا جانی و مالی نقصان اس معاملے میں پاکستان کا ہوا ہے کسی اور ملک کا نہیں ۔ہمارے ادارے تباہ حالی تک پہنچ چکے ہیں کیونکہ حکومت کی تو ساری توجہ اس جنگ پر مرکوز ہے وہ اداروں کے معاملات کو کیسے دیکھے۔ تعلیمی ادارے آئے روز بند ہوتے ہیں دفاتر میں خوف و ہراس کے باعث کارکردگی ناقص اور حاضری کم ہے۔ کاروبار کی

کئی دن ٹھپ ہوتا ہے غریب کو جب دو وقت کھانے کو نہیں ملے گا تو وہ طالبان کی
نوکری کرنے پر ہی مجبور ہوگا۔ حکومت ہے کہ کبھی right اور کبھی down sizing
کے نام پر مزید بے روزگاری پیدا کر رہی ہے غرض بے چینی اور بدامنی نے sizing
ہمیں واقعی پتھر کے زمانے کے قریب کر دیا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ یہ جنگ لڑے جا رہے
ہیں اور اسے اپنی جنگ بھی قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ میں جب کسی مصلحت سے
بالاتر ہو کر سوچوں تو یہ مجھے اپنی جنگ نہیں لگ رہی۔ لیکن ہم اس کا ایندھن بھی بنے
ہوئے ہیں اور اس کو جھونکنے والے بھی۔

دراصل پاکستانی قوم کے اعصاب کو مفلوج کر دیا گیا ہے ان کے امن و امان کو اس طرح
تہس نہس کر دیا گیا کہ وہ سکون سے نہ سوچ سکیں نہ عمل کر سکیں۔ اس سارے کام میں
دشمنوں کو کوئی دشواری بھی پیش نہ آئی کیونکہ ان کو ان کے مطلب کے کارکن اور لیڈر
یہیں سے میسر آ گئے۔ اور

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس جنگ کی آگ تو اب پورے ملک میں پھیل چکی ہے لیکن اس کو جس منصوبہ بندی
سے پھیلا گیا ہے کاش ہم اس کا توڑ کرنے کی کوشش کرتے۔ جن لوگوں کو طالبان دس
ہزار تنخواہ دے رہے ہیں حکومت ان کو چار چھ ہزار پر بھی ملازمت نہیں دے رہی۔

امریکہ ہم سے مطالبہ تو do more کا کر رہا ہے دہشت گردی کے خاتمے کے

لئے اصرار بھی مسلسل ہے لیکن وہ خود کتنا کر رہا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہی کافی
ہے امریکہ کے اعلان کے مطابق وہ اس سال عراق اور افغانستان میں 83 ارب ڈالر
خرچ کرے گا لیکن اس میں پاکستان کا حصہ 1.5 یعنی ڈیڑھ ارب ڈالر ہوگا۔اور وہ بھی
زیادہ تر القاعدہ کے خاتمے کے لئے خرچ کئے جائیں گے۔یعنی پاکستان کے لوگ غربت
ییں پستے رہیں گے اور امریکی مقاصد کے لئے دہشت گردی کی نظر ہوتے رہیں گے۔ ہاں
طالبان کی امداد مسلسل جاری رہے گی کیونکہ ظاہر ہے جہاں عام لوگ دو لقموں کو ترستے
ہیں وہی طالبان اپنے جنگجوؤں پر کھلا خرچ کر رہے ہیں۔اور وہ کبھی تنگی معاش کا رونا
روتے نظر نہ آئے۔آخر ان کم ترقی یافتہ بلکہ غیر ترقی یافتہ علاقوں میں دولت کی یہ
ریل پیل کہاں سے آئی باقی کا سارا ملک بھوک، افلاس اور بے روزگاری کی آگ میں
جل رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے غیر ملکی پیسہ یہاں پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے اور الزام
بڑے آرام سے آئی ایس آئی اور افواج پاکستان کے سر تھوپہ جا رہا ہے۔ امریکہ بہادر
مسلسل اپنی فرمائشیں جاری رکھے ہوئے ہے اوباما نے بھی بش ہی کی باتیں دوسرے
الفاظ میں دہرائیں۔ جبکہ خود اس کی توقعات حد سے بڑھ کر ہیں۔امریکہ کا بار بار یہ
اصرار کہ القائدہ کے تمام لیڈر پاکستان میں ہیں اسامہ کو تو پورا پاکستان گھمایا
گیا۔القائدہ! یہ تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ امریکہ دراصل جس القائدہ کی تلاش میں ہے
اس کا نام پاکستان کے " ایٹمی اثاثہ جات " ہیں جس کا دہشت گردوں کے ہاتھوں لگنے کا
ایک لایعنی سا پروپیگنڈا اس قدر

زور و شور سے کیا گیا کہ دہشت گردوں کا کوئی بھی ساتھی فی الحال اس سوچ تک نہ پہنچا ہو تو وہ بھی اس کے لئے منصوبہ بندی شروع کر سکے۔اب امریکہ مسلسل اس کوشش میں ہے کہ اُسے پاکستان میں داخل ہونے کا کوئی بہانہ مل سکے وہ جانتا ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں کیونکہ یہی ایٹمی ہتھیار اسی کے آڑے آرہے ہیں جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ کہنے کو تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ملک دنیا کے اہم ترین خطے میں اہم ترین مقام پر واقع ہے تو پھر ہم اس کا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ نے بیش قیمت قدرتی وسائل اور بے تحاشہ افرادی قوت سے نوازا ہے لیکن بات وہی کہ خدا بھی اُن ہی قوموں کی حالت بدلتا ہے جو خود اپنی حالت بدلتے ہیں۔ ہمیں اپنے وسائل سے کام لینا ہوگا اس کے لئے جنگی اور ہنگامی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا بجائے دوسروں کے دست نگر ہونے کے اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنا ہوگا اور یہ ایمان رکھنا ہوگا کہ اگر آج کدال چلانا شروع کریں گے تو آخر ایک نہ ایک دن پہاڑ کٹ جائے گا اور سورج کی کرنیں ہم تک پہنچ جائیں گی لیکن اس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے عوام سے لیکر حکمران تک ہر ایک کی ہمت کی ضرورت۔

ہم ایک خودار قوم ہیں لیکن اس کا ثبوت دینے کے لئے زندہ رہنے کا ثبوت بھی دینا ہوگا۔ امریکہ نہ خدا ہے نہ رازق نہ نگہبان پھر اُس سے اس قدر خوف کیوں مگر ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو حالات کا ذمہ دار

سمجھتا ہے ذمہ داری ہم سب کی ہے اور سب کو اس کی ذمہ داری لینی ہے۔ ہاں حکومت کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے کہ وہ حالات کا کس طرح مقابلہ کرتی ہے میڈیا کو اس کے لئے لوگوں کو تیار کرنا ہوگا اور اپنے کردار میں ایک مثبت تبدیلی لانی ہوگی صرف سیاستدانوں کو لڑوا کر اپنے پروگرامز کو مقبول بنانا ہی مقصد نہ ہونا چاہیئے۔ روزگار کے مواقع بڑھانا ہونگے تاکہ بے روزگار نوجوان طالبان کی "فوج" میں بھرتی نہ ہوں بلکہ پاکستان کی سلامتی کے لئے کام کریں اور سب سے بڑھ کر اسلام کو اپنی زندگیوں میں شامل کرنا ہوگا۔ اسلام کو صرف عبادات کی حد تک محدود نہیں کرنا ہوگا بلکہ عبادات کے ساتھ ساتھ اعمال پر بھی زور دینا ہوگا۔

اپنے ذہن سے احساس کمتری نکالنی ہوگی، توانائیاں مثبت انداز میں بروئے کار لانا ہونگی اور ملک کے اندر اعتماد کی فضا قائم کرنا ہوگی۔ ہمارے قبائلی ہمیشہ وطن کی حفاظت کی خاطر سروں پر کفن باندھ کر لڑے ہے ہیں اور ہمیں طالبان، دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد میں تفریق کرنا ہوگی اور اداروں کی عزت کو بحال کرنا ہوگا خاص کر افواج پاکستان اور آئی ایس آئی کے بارے غیر ملکی منفی پروپیگنڈے کا توڑ حکومتی سطح پر ڈٹ کر اور بھرپور انداز میں کرنا ہوگا۔ یہ انتہائی دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ ہر ایرا غیرا امریکی عہدہ دار اور اخبار پاکستان کے ان قابل فخر اداروں پر کیچڑ اچھالے اگر

دیکھا جائے تو اس طرح سے پاکستان کی کمر ہمت کو توڑنے کی کوشش کی جارہی ہے اور عوام میں بھی منفی سوچ پیدا کی جارہی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر قومی ادارے کو توقیر دی جائے اور میرے خیال میں فوج کو اس میں سرفہرست ہونا چاہیئے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ افواج پاکستان ہی ملکی سلامتی اور بقا کی ضامن ہیں اگر یہ کمزور ہوجائیں تو ہماری سرحدوں پر اور سرحدوں سے دور تمام دشمن اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہوجائیں گے ان کے بُرے ارادوں کے سامنے یہی فوج اور اس کا خوف ہی ہماری حفاظت ہے۔

پاکستان بلاشبہ عطیہ خداوندی ہے جو اس کے نام پر حاصل کیا گیا لیکن اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے اور ہمیں اس ذمہ داری کو ہر صورت اور بہر قیمت پورا کرنا ہے۔

امریکی صدر کا دورۂ بھارت اور پاکستانی تحفظات

امریکی صدر اوبامہ نے اپنے الیکشن کو جس نعرے کی بنیاد پر لڑا اور جیتا وہ تھا ''تبدیلی''۔ یقیناً امریکیوں کیلئے ایک سیاہ فام امریکی شہری جس کی صرف ماں امریکی تھی کا صدر منتخب ہو جانا ایک ''تبدیلی'' ہی تھا اور یہ بھی کہ اس کا نام بھی مسلمان تھا کیونکہ وہ ایک برائے نام ہی سہی مسلمان باپ کا بیٹا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کم از کم وہ دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکا نہ ہی امریکہ کے بارے میں دنیا کی رائے تبدیل کر سکا ہے۔ اگرچہ اسے ایک قابل اور زیرک سیاستدان سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ابھی تک وہ سیاست سے زیادہ طاقت کے ہی استعمال پر بھروسہ کر رہا ہے۔

یہی صدر اوبامہ تھے جنھوں نے کشمیر کے مسئلے کے حل کیلئے کوشش کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک کسی ہل جل کے آثار تک دکھائی نہیں دے رہے۔ اب جبکہ وہ نومبر میں بھارت کے دورے پر جا رہے ہیں ظاہر ہے کہ انہیں حق ہے کہ وہ جس ملک کے دورے پر چاہیں جائیں لیکن بھارت کا معاملہ مختلف کچھ یوں ہے کہ امریکہ پاکستان کو اپنا سٹرٹیجک پارٹنر کہتا ہے لیکن تعلقات وہ بھارت سے بڑھا رہا ہے ظاہر ہے کہ وہ ایسا اسے پاکستان کے مقابلے میں اہمیت دینے

کیلئے کر رہا ہے کیونکہ بقول اس کے اسے پاکستان بلکہ در حقیقت پاکستانیوں سے نام نہاد دہشت گردی کا خطرہ ہے اور بھارت بھی اسی راگ کو الاپ کر مغربی دنیا کی حمایت اور ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے جبکہ خود وہ یہ کام پاکستان میں بڑی تندہی سے کر رہا ہے اور فاٹا اور بلوچستان میں اس کے واضح ثبوت موجود ہیں۔ دوسری طرف وہ بھارت کو چین کے مقابلے پر علاقے میں بڑی طاقت کے طور پر ابھارنا چاہتا ہے جبکہ انہیں دونوں ملکوں سے بھارت خائف ہے جسکی وجہ سے بھارت اسلحے کے انبار لگا رہا ہے اور جنوبی ایشیا کے ممالک کو ہتھیاروں کی دوڑ پر مجبور کر رہا ہے ۔ بھارت امریکی ہتھیاروں کی بڑی منڈی ہے اور بارک اوبامہ اسی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے وہاں کا دورہ کر رہے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے بارے میں امریکہ کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہا حالانکہ اس وقت کشمیری بھارتی ظلم و ستم سے تنگ آ کر اپنی جانوں سے گزر رہے ہیں۔ اور اگر اوبامہ واقعی خود کو امن کا پیامبر ثابت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھارت پر زور دینا ہوگا کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق حل کر کے خون خرابہ روک دے۔ ایک طرف تو بھارت دہشت گردی کی شکایت کرتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف وہ خود اس کیلئے میدان ہموار کرتا ہے۔ ظاہر ہے جب وہ کشمیریوں کا حق خود ارادیت ضبط کرتا ہے تو وہ بھی بھارت سرکار کے خلاف کسی بھی بدلہ لینے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس جدوجہد کیلئے انہیں دہشت گرد قرار دینا کسی طرح بھی قرین انصاف

نہیں یہی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے پاک بھارت تعلقات کبھی بھی معمول پر نہ رہے اور دونوں ممالک ہر وقت توپ کے دھانے پر بندھے رہتے ہیں۔ بھارت کو اپنے بڑے ملک ہونے کا زعم ہے اور وہ اپنے پڑوسیوں کو اپنا مطیع بنانے پر تلا رہتا ہے اور پھر پاکستان تو دفاعی طور پر اسکے مقابلے پر ہے۔ لہذا وہ ہمہ وقت اسکی جڑیں کھوکھلی کرنے پر تلا رہتا ہے وہ مسلسل اپنی دفاعی صلاحیت بڑھا رہا ہے۔ اس کا جو بھی شخص سڑک پر رات گزارتا ہے گزارتا رہے لیکن ایٹمی ہتھیار مسلسل بنتے رہنے چاہئیں۔ اوبامہ کو بھارت پر ان مسائل کے حل کیلئے زور ڈالنا ہوگا۔ وہ جوش خطابت و خوشامد میں ڈیوڈ کیمرون کی طرح پاکستان پر کوئی الزام دھرنے کی بجائے بھارت کو یہ بات سمجھائے کہ کشمیر کے مسئلے کا حل بہت سارے تنازعات خود ہی حل کر دے گا۔ جس میں ایک بڑا مسئلہ پانی کا بھی ہے اور جو کہ کسی ممکنہ جنگ کا باعث بن سکتا ہے لہذا اس کا حل ہونا انتہائی ضروری ہے کیونکہ پاکستان کے بڑے دریا اسی وادی سے ہو کر آتے ہیں۔ اگرچہ امریکہ اس مسئلے کو پاکستان اور بھارت کا باہمی مسئلہ کہہ چکا ہے لیکن جیسے وہ پوری دنیا کا ٹھیکیدار بنا ہوا ہے اور خود کو انسانیت کا علمبردار سمجھتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ زندگی پانی کی مرہون منت ہے اور پاکستان کو اپنی بقا کے لیے ہر صورت میں پانی درکار ہے اور یہ بھی کہ وہ جس آزادی کی تحریک کو دہشت گرد تحریک قرار دے رہا ہے اور جسکی بنا پر اسے پاکستان سے شکایت ہے اور وہ بھارت میں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری بلا سوچے سمجھے پاکستان

پر ڈال دیتا ہے وہ شکایت بھی خود بخود ختم ہو جائے گی بھارتی حکومت جس نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے اوبامہ اس کو ختم کرانے میں بھارت کی مدد کرے تو شاید مسئلہ حل ہو جائے۔ اگرچہ کشمیر میں بھارت نے بین الاقوامی میڈیا پر پابندی لگا کر بہت سارے مناظر کو دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھا تاہم اگر اوبامہ ان مناظر کے دیکھنے پر اصرار کریں اور دیکھ لیں تو یقینا اصل صورت حال سے آگاہ ہو سکیں گے۔

منہ زبانی کسی کو اپنا اتحادی کہہ دینا یا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کردار کی تعریف کر دینا کوئی معنی اور فائدہ نہیں رکھتا پاکستان اس جنگ میں جتنا کھو رہا ہے اس سے کہیں کم پا رہا ہے۔ مالی نقصان کا کوئی اندازہ نہیں اور جانی نقصان تو نا قابل تلافی ہے۔ امریکہ کے ڈرون حملے اس پر مستزاد ہیں مجھے اس بات پر کوئی خوشی نہیں بلکہ شدید دکھ ہے کہ ہماری حکومتیں امریکی خواہشات پوری کئے جارہی ہیں وہ لوگ تو اپنے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں لیکن ہم کیا کر رہے ہیں اور جبکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بھی نہیں کیا جارہا اور نہ ہی انسانی جانوں کا کوئی بدل compensate عملی طور پر ہمیں ہے۔

ہماری حکومتوں کو یہ احساس کر لینا چاہیئے کہ امریکی صدر جس کام سے بھارت

جارہے ہیں وہ بھارت سے تجارتی اور دفاعی تعلقات مضبوط کرنا، وہاں منڈی تلاش کرنا اور بدلے میں اپنی منڈیوں کی پیشکش ہے۔ ایک بڑی آبادی اور بڑا ملک ہونا اپنی جگہ لیکن امریکہ کیلئے پاکستان اور بھارت کی اہمیت میں فرق ہونا چاہیئے۔ اسے سوچ لینا چاہیئے کہ اگر پاکستان نے اس کی مدد بند کر دی تو افغان جنگ اسے کئی گنا مہنگی پڑے گی ۔پاکستانی قوم اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب انکی حکومتیں اپنی خودی پہچان لیں گی۔ امریکہ کہنے کو تو کہتا ہے کہ وہ پاکستانیوں کے دل جیتنے کی کوشش کرے گا لیکن عملاً ہو یہ رہا ہے کہ پاکستانی اسکے اعمال کی وجہ سے ہر آنے والے دن میں اس سے زیادہ متنفر ہو رہے ہیں وہ اپنے ملک کے امن و امان کی خرابی کا ذمہ دار بھارت اور امریکہ کو سمجھتے ہیں۔ بھارت خفیہ سازشیں کرتا ہے اور امریکہ طاقت کے نشے میں مست خفیہ اور بظاہر دونوں طرح سے لگا ہوا ہے اور ان ساری کاروائیوں کے بعد امریکی صدر کا بھارت کے دورے پر نکل جانا ایک اور پیغام ہے کہ اگر ہم پاکستان سے مدد لیں گے تو بھی ہماری عنایات بھارت پر رہیں گی۔ کچھ امداد سیلاب زدگان کیلئے بھیج کر اور کبھی فاٹا میں آٹا گھی تقسیم کرکے امریکہ اگر یہ سمجھے کہ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے تو ایسا نہیں ہے وہ لوگ بھوک کے ہاتھوں مجبوراً یہ سب تو لیتے ہوں گے کیونکہ ان کے روزگار کے سب مواقع امریکہ ہی کی جنگ کی وجہ سے ضائع ہو چکے ہیں لیکن دل سے وہ امریکہ کے کبھی بھی حامی نہیں ہو سکتے۔ امریکہ کو اگر واقعی پاکستان سے دوستی کرنی ہے تو

پہلے تو وہ اس علاقے سے اپنی بساط لپیٹ لے اور پاکستان میں بغیر بے شمار شرائط کے ترقیاتی کاموں میں مدد کرے ورنہ وہ نقصان تو پورا کرے جو پاکستان نے ان کی وجہ سے اٹھایا ہے اور پاکستان کے دشمنوں کی امداد بند کر دے پھر چاہے وہ بھارت کا دورہ کرے یا اسرائیل کا یا کسی اور ملک کا پاکستانیوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

میرے اقدار کی دنیا تو سرِعام لٹی

پاکستان اس وقت یوں تو کئی مسائل سے دو چار ہے، ڈرون حملوں کی مصیبت بھی ہے، دہشت گردی کا عذاب بھی ہے، بیرون ملک قرضوں کے بوجھ سے بھی قوم کے کندھے زیر بار ہیں۔ لیکن ایک اور انتہائی خاموش طریقے سے بھی ہماری جڑوں کو کھوکھلا کیا جا رہا ہے اور اس جنگ کو بڑی کامیابی سے ہم خود اپنے خلاف لڑ رہے ہیں اور یہ جنگ ثقافتی جنگ ہے۔ ہماری اقدار، ثقافت اور روایات کو ہم خود اس طرح پامال کر رہے ہیں کہ ہمارے لیے کسی دشمن کی ضرورت ہی نہیں اور سچ پوچھیئے تو یہی اپنی اقدار سے دوری ہمارے بہت سارے مصائب کا باعث بن رہی ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اس سب کچھ کو جانتے بوجھتے بھی نہ ہم نے اس کی پیش بندی کی اور نہ اب کسی قسم کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت اس ثقافتی یلغار کیلئے سب سے بڑا ذمہ دار ہمارا الیکٹرانک میڈیا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ میڈیا نے لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کیا، بہت سارے ملکی مسائل کو اجاگر کیا، حکومتوں کی کرپشن منظرِعام پر لایا، سیاستدانوں، جرنیلوں اور علما سب کا اصل چہرہ عوام کو دکھایا۔ اب یہ عوام پر ہے کہ کس کو کس درجے پر رکھتے ہیں۔ لیکن ایک احتساب اب بھی میڈیا کو کرنا ہے جو سب سے مشکل ہے اور وہ ہے خود احتسابی۔ میڈیا نے عوام کو اس تنقید کے علاوہ کیا دیا، قومی تشخص کو اجاگر کرنے میں کیا کردار ادا کیا

یہ احتساب بھی اسے کرنا چاہیئے۔

اس بات کا سہارا لینا اور اس کا پرچار کرنا کہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے اس لیے تہذیبوں کو ایک دوسرے میں مدغم ہونے سے نہیں روکا جاسکتا ایک بے معنی حجت ہے اور اس کی بنا پر خود کو بری الذمہ قرار دینا کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں۔ ایک بہت سادہ سا سوال یہ ہے کہ کیا اہلِ مغرب نے اہلِ مشرق کا لباس اپنا لیا ہے؟ تو یقیناً اس کا جواب نہیں ہے کہ وہاں ایسا کسی بھی سطح پر نہیں ہوا بلکہ وہاں تو مسلمانوں کو سکارف تک پہننے کی اجازت نہیں دی جارہی بلکہ اس پر سزائیں اور جرمانے عائد کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ پاکستان میں فرانس کے سفیر نے اپنے ایک مضمون میں سکارف پر پابندی کی یہ توجیہہ پیش کی کہ وہ معاشرے میں کوئی تفریق و تمیز نہیں پیدا کرنا چاہتے۔ اس سے مغرب کی جمہوریت پسندی کا اندازہ بھی لگا لیجیئے کہ مذہب کی بنیاد پر بھی اختلافِ رائے اسے گوارہ نہیں لیکن ہم نے مغربی جمہوریت کو اتنا مقدس بنا دیا ہے کہ اس کیلئے ہم دین مذہب سے دوری بھی برداشت کرنے کو تیار ہیں۔

لباس کسی معاشرے کی پہلی پہچان ہوتی ہے آپ کسی بھی انجانے معاشرے میں جائیں وہاں کے معاشرتی عادات واطوار کا سب سے پہلا اندازہ وہاں کے لباس سے لگاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد زبان اور دیگر عادات و روایات تک بات پہنچتی ہے۔ لیکن

ہماری بد قسمتی کہ ہم نے اپنی اس پہچان پر بہت آسانی سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اگرچہ میں نہیں سمجھتی کہ قومی سطح پر ایسا ممکن ہے یا ہوا ہے لیکن کم از کم ہمارا میڈیا اسی کوشش میں مبتلا نظر آتا ہے کہ اس کے ڈراموں سے لیکر کوکنگ کے پروگراموں بلکہ ٹاک شوز تک میں انگریزی لباس کو بڑے فخر سے پہنا جاتا ہے۔ ہمارے کچھ پروگراموں کی اینکرز حکومتی بے اعتدالیوں اور کوتاہیوں کا رونا بڑے زور شور سے یوں ہی اپنی اقدار کا مذاق اڑاتے ہوئے روتی نظر آتی ہیں۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے ٹیلیویژن میزبانوں کے دوپٹوں پر نظر رکھی جاتی تھی کہ آیا درست ہے یا نہیں۔ اب تو اگر وہ ڈھنگ کے لباس میں ہی نظر آ جائے تو شکر ہے ورنہ اگر آپ ان کی شکل سے نا مانوس ہوں تو یقیناً انہیں کسی یورپی ملک کی خاتون سمجھنے میں حق بجانب ہوتے ہیں۔ غیر ملکی ڈرامہ، میوزک چینل یا مووی چینلز بند بھی کر دیجئے تو اپنے چینلز یہ کمی پوری کرتے نظر آتے ہیں اور اگر وہ بھی بند کر دیں تو ہمارے نیوز چینلز ایسے تمام مناظر بڑے دھڑلے سے دکھاتے ہیں۔ برائے نام لباس میں ملبوس پڑوسی ملک کی اداکاراؤں کے سین دکھانے میں ہر چینل دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مبتلا نظر آتا ہے اور فیشن شوز جس کے نام پر اپنی ثقافت و روایات حتیٰ کہ مذہب تک سے بغاوت کی جاتی ہے کو بڑے فخر کے ساتھ دکھایا جاتا ہے اور ہر لباس کی تعریف یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ لباس مشرق و مغرب کا حسین امتزاج تھے۔ اب اگر مشرق سے مراد بھارت یا دوسرے غیر مسلم معاشرے ہیں تو پھر تو

کسی طرح بات ھضم ہو لیکن چونکہ ہم ایک اسلامی ملک کے باشندے ہیں اس لیے ہم نے لباس کو زیب وزینت سے پہلے پردے کیلئے پہننا ہے جبکہ اکثر یہ شوز خواتین کے لباس کی نمائش کیلئے منعقد کیے جاتے ہیں اور یاد رکھیئے یہ برہنگی اسلام کے سراسر خلاف بلکہ سختی سے منع ہے۔ مرد گلوکاروں، اداکاروں اور ماڈلز کو دیکھیں تو وہ چمکیلے بھڑکیلے لباسوں اور مضحکہ خیز بالوں میں کسی اور سیارے کی مخلوق نظر آتے ہیں۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ یہ سب شوبز کی دنیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ باہر کی دنیا اس دنیا سے بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ آج معاشرے میں دیکھیئے تو عام گھروں میں شلوار قمیض کی جگہ پینٹ شرٹ نے کچھ اس طرح سے لے لی ہے کہ شلوار قمیض پہننے والوں کو کئی بار تضحیک کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے اور باقاعدہ طور پر انہیں شرمندہ کیا جاتا ہے۔

سادگی معاشرے سے ختم ہوتی جا رہی ہے اور ایسا لباس اور رہن سہن دونوں میں ہے۔ ہم میں سے مہنگائی کا رونا ہر ایک روتا ہے لیکن گھر سے باہر کھانا بھی فیشن ہے اور بے ہنگم طرز کے کپڑے پہننا بھی۔ موبائل نے ایک الگ مصیبت برپا کی ہوئی ہے ٹی وی پر اسّی فیصد اشتہارات موبائل فون اور نیٹ ورکس کے ہوتے ہیں۔ جس جس طریقے سے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنے سِم کی خریداری پر مائل کیا جاتا ہے وہ کسی طرح بھی ایک اسلامی معاشرے کے شایانِ شان نہیں اور پھر ہوتا یہ ہے کہ ہمارے نوجوان موبائل فون

کو اسی مقصد کیلئے استعمال کرنے میں لگ جاتے ہیں جسکی تربیت انہیں میڈیا دیتا ہے اور وہ ایسا نہ کریں تو انہیں اپنے ہم عمروں کی طرف سے بیک ورڈ، پینڈو اور نجانے کیا کچھ سننا پڑتا ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ میڈیا کو خود احتسابی کے عمل سے گزرنا پڑے گا اگرچہ یہ کڑوا گھونٹ ہے لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر میڈیا کو واقعی اپنے معاشرے کی فکر ہے اور اس کا بناؤ بھی مقصود ہے تو اسے اپنی مذہبی اور معاشرتی اقدار و روایات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا تاثر ایک مسلمان ملک کے طور پر اُبھارنا ہوگا اور اس پر فخر بھی کرنا ہوگا۔ کیونکہ آج کے دور میں معاشرے کے بگاڑ اور سنوار کی ذمہ داری گھر اور سکول سے بڑھ کر میڈیا پر ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے گھروں میں داخل ہو چکا ہے اور ہمارے ماحول پر مکمل طور پر اثر انداز بھی۔ مہنگائی سے روتے عوام کے سامنے اگر شاندار گاڑیوں، عالی شان گھروں، بے ڈھنگے قیمتی لباسوں اور مہنگے ترین غیر ملکی کھانے، جن کے اجزائے ترکیبی صرف امپورٹڈ ڈبوں میں ہی دستیاب ہیں، کی بجائے سادہ زندگی خوبصورت انداز میں پیش کی جائے اور اس کے فوائد اجاگر کیے جائیں، اپنے خوبصورت اور پر وقار لباس کو فخر اور نفاست کے ساتھ پیش کیا جائے تو ہم یقیناً بہت ساری مصیبتوں سے بچ جائیں گے اور پھر جب میڈیا اپنی حکومتوں اور جہازی سائز کابینہ، انکی شاہ خرچیوں اور

کرپشن پر اعتراض کرے گا تو چونکہ اس کا اپنا دامن صاف ہو گا تو اس کی بات دلپذیر بھی ہو گی اور پُر اثر بھی۔

ڈیوڈ ہیڈلے کے انکشافات

اوبامہ نے اپنے جنوبی ایشیا کا دورہ شروع کیا تو ممبئی اس کا پہلا پڑاؤ تھا اور وہاں پہنچتے ہی اس کا بھارت کے ساتھ اپنائیت کا پہلا اظہار ہی یہ تھا کہ بھارت اور امریکہ دہشت گردی کے خلاف ایک ہیں اور اپنے شہریوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں لیکن غالباً انہیں یاد نہ رہا کہ دنیا کا ہر ملک اپنے شہریوں کی حفاظت کا ذمہ دار ہے جس میں پاکستان بھی شامل ہے جس کے شہریوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے۔ اوبامہ کا دورہ شروع ہونے سے صرف ایک دن پہلے درہ آدم خیل کی مسجد میں خدا کے حضور نمازِ جمعہ میں سربسجدہ پچانوے سے زیادہ مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا اور ذمہ داری طالبان سے قبول کروالی گئی۔ کوئی مسلمان یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی مسلمان کو حالتِ نماز میں خدا کے گھر میں قتل کیا جائے ۔ لیکن پاکستان میں ایسا کیا جا رہا ہے۔ طالبان اگر مسلمان ہیں یا اُن کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ جتنے بھی بُرے ہو جائیں، شقی القلب ہو جائیں ایسا نہیں کریں گے۔ پھر وہ طالبان کون ہیں جو ہر واقعے کی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔ طالبان کو تو اختلاف لادینیت سے ہے۔ مساجد تو دین کا مرکز ہیں پھر کیوں یہ جائے امن اُن کا پسندیدہ نشانہ بنے ہوئے ہیں؟ کیا وہ مسلمان ہیں؟ کیا امریکہ نے کبھی ان لوگوں کے بارے میں اتنی تفتیش اور تشویش کا

اظہار کیا جتنا اوبامہ نے ممبئی حملوں کی دہشت و وحشت کا ابھی تک ذہن میں ثبت ہونے کا اظہار کیا؟ اسی محبت کا اظہار امریکہ بھارت کے ساتھ کرتا رہتا ہے جسے وہ اپنا اتحادی کہتا ہے۔ پاکستان سے وہ صرف اسٹریٹیجک فائدہ اٹھاتا ہے اور خود اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہی سازش اس نے اپنے ہی ایک شہری ڈیوڈ ہیڈلے کو پکڑ کر کی اس سے ایسی ایسی سازشوں کو پاکستان کے نام کروایا جو ہر زاویے سے خود سی آئی اے اور را کا ایجنٹ معلوم ہوتا ہے جو پیدائشی امریکی باشندہ ہے۔ اگرچہ اس کے والد پاکستانی تھے اور اس کی ماں سے علیحدگی کے بعد اسے پاکستان لے آئے تھے جہاں اس نے سکول کی تعلیم مکمل کی لیکن پھر اسے اس کی ماں امریکہ لے گئی اور شعور کی زندگی اس نے امریکہ میں ہی گزاری۔ اس کی سرگرمیاں شروع ہی سے کچھ صحت مندانہ نہ تھیں۔ ایک بار وہ امریکہ میں دو کلو ہیروئین کی سمگلنگ کے الزام میں پکڑا گیا اور صرف پندرہ ماہ کے بعد رہا کر دیا گیا اور پانچ سال تک زیرِ نگرانی رہا۔ کیا امریکہ کے قانون کے مطابق اس جرم کی سزا اس سے کہیں زیادہ نہیں بلکہ یہ سزا پچاس سالہ قید بھی ہو سکتی ہے تو ڈیوڈ ہیڈلے کے ساتھ آخر یہ نرمی کیوں برتی گئی؟ اس کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی۔

ڈیوڈ ہیڈلے اگست 2005 میں اپنی بیوی سے لڑائی کے الزام میں گرفتار ہوا۔ رپورٹس کے مطابق اس کی بیویوں نے 2005 اور 2007 میں یو ایس ڈائریکٹر آف

انٹیلی جنس کو اس کی مشکوک سرگرمیوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ جو شخص پہلے بھی مشکوک سرگرمیوں میں ملوث رہا کیوں نہ پہلے ہی دن اس پر نظر رکھی گئی۔ اب اس کے بارے میں جو کچھ کہا جارہا ہے۔ تو جب اس نے اپنا مسلمان نام بدل کر عیسائی نام رکھا جبکہ بظاہر مذہب نہ بدلا تو کیوں نہ اس کی وجہ معلوم کی گئی یا کم از کم اس پر نظر رکھی گئی ۔اب اس کے بھارت کے دوروں کو بنیاد بنا کر اس کے ممبئی حملوں میں ملوّث ہونے کا ثبوت پیش کیا جارہا ہے تو 2006، 2007اور 2008 میں اس کے دوروں کی وجہ کیوں نہ معلوم کی گئی۔ اگر اس کے دورے آئی ایس آئی نے کرائے تو وہ سی آئی اے کے ملک میں رہ رہا تھا۔ سی آئی اے نے ایک سزایافتہ مجرم پر نظر کیوں نہ رکھی۔ ڈیوڈ ہیڈلے کی زبان سے جو انکشافات کروائے گئے وہ سی آئی اے کے افسروں کی موجودگی میں ان کی جیل میں کروائے گئے، جس کی صحت کیلئے سی آئی اے ہی کی گواہی ہرگز کافی نہیں۔ اس سے منسوب بیانات کے مطابق آئی ایس آئی کے اوپر لشکرِ طیبہ کو فعال کرنے کیلئے دباؤ تھا اور پاکستان کا دہشت گردی کو بھارت منتقل کرنے کا منصوبہ بھی تھا۔ ڈیوڈ ہیڈلے کے مطابق دہلی میں نیشنل ڈیفنس کالج پر حملے کا منصوبہ بھی تھا جو خودکش نہ ہونا تھا۔ اب اگر اتنے سارے منصوبوں میں وہ شامل رہا تو آخر ایک عام ایجنٹ کی مہارت پورے سی آئی اے سے زیادہ کیسے ہو گئی کہ وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ممبئی حملوں پر افسوس زدہ اوبامہ کے ملک کی ایجنسی خود ہی ڈیوڈ ہیڈلے کو استعمال کرتی رہی؟

ویبسٹر ٹارپلے جو ایک صحافی ،اور مصنف ہیں اور مختلف جگھوں پر لیکچر دیتے ہیں کہ مطابق ڈیوڈ ہیڈلے سی آئی اے کیلیئے ہی کام کر رہا تھا یعنی منصوبہ بندی میں وہ شامل رہا لیکن آئی ایس آئی کی طرف سے نہیں بلکہ سی آئی اے کی طرف سے۔ اس کے را سے تعلق کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جارہا۔ کیونکہ اس کے بھارت میں اچھے خاصے تعلقات تھے اس کے تعلق داروں میں مہیش بھٹ کے بیٹے راہول بھٹ سمیت کئی دیگر با اثر لوگ بھی شامل تھے۔ لیکن ان سارے حقائق کے باوجود استعمال اس کو پاکستان کے خلاف کیا جارہا ہے اور اس کا یہ کہنا ہے کہ اسے آئی ایس آئی نے استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں اس نے آئی ایس آئی کے چند افسران کے نام بھی لئے ہیں۔ جبکہ دراصل اس طرح کی تمام سازشیں سی آئی اے اور را خود تیار کرتے ہیں کیونکہ بھارت کے خلاف پاکستان کا نام لینا انتہائی آسان ہے۔ اس کیس میں تو بھارت کی طرف سے بھی کچھ اعتراضات سامنے آئے کہ امریکہ ڈیوڈ ہیڈلے کو اس کے حوالے کیوں نہیں کرتا۔ معاملہ یہاں یوں ہے کہ امریکہ کو اپنا بھانڈا پھوٹنے کا ڈر ہے اور بھارت کو بھی معلوم ہے کہ اس شخص کے بھارت میں کافی مراسم تھے اس لئے وہ بھی پورا زور نہیں لگا رہا صرف اعتراض تک محدود ہے۔ جبکہ ابھی تک صرف الزامات کے علاوہ پاکستان کے اُوپر کچھ بھی ثابت نہیں کیا جا سکا۔ بقول ہیڈلے وہ بھارت جا کر مختلف مقامات کا جائزہ لیتا رہا۔ اگر اس نے بھا بھا

اٹامک ریسرچ سینٹر تک رسائی حاصل کر لی تھی تو اس کے بھارت میں مراسم کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں باوجود سزا یافتہ ہونے کے کھلے عام نقل و حرکت کرتا رہا اور یہ سب کچھ یہی ثابت کرتا رہا ہے کہ ڈیوڈ ہیڈلے سی آئی اے کا باقاعدہ ایجنٹ تھا اور پاکستان سے اس کا تعلق زبردستی جوڑا جا رہا ہے۔ جبکہ پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کے بارے میں اگر دنیا سوچے تو اس کو ان دہشت گردوں اور ان کے لیڈروں میں سی آئی اے اور را کے بے شمار کارندے ملیں گے جنہوں نے ایک پُر امن ملک کے امن کو تباہ و برباد کیا اور اس کے باشندوں کے جان و مال کو انتہائی ارزاں سمجھ لیا گیا ہے۔

لیکن ایک بار پھر میں یہی کہوں گی کہ یہ ممالک تو اپنے مفاد میں لگے ہوئے ہیں ان کیلئے ایک ایٹمی پاکستان کسی بھی طرح موزوں نہیں لیکن ہم کیا کر رہے ہیں ؟ ہماری حکومت کو اپنے رویے میں کچھ سختی پیدا کر ہی لینی چاہیئے اور امریکہ کو احساس دلانا چاہیئے کہ پاکستان بھی ایک مضبوط ایٹمی ملک ہے۔ اس کے لوگوں کے اعصاب سے مزید کھیلنا خطرناک ہوگا اور حکومت وہ تمام ثبوت بھی پیش کرے جو را سی آئی اے اور افغانستان کے بارے میں اس کے پاس موجود ہیں اور جس کیلئے اکثر حکومت کہتی ہے کہ مناسب وقت پر پیش کرے گی۔ وقت یہی مناسب ہے ۔ اوبامہ ایشیائی کے دورے پر ہے بھارت سے مکمل ہم آہنگی کا اظہار

ہو رہا ہے اور اوبامہ بمعہ اپنی بیگم کے بھارت کی دلجوئی کیلئے ممبئی کے سکول کے بچوں کے ساتھ رقص کے جوہر دکھا رہا ہے اور بھارت ممبئی حملوں کا کارڈ مسلسل استعمال کر رہا ہے۔ ڈیوڈ ہیڈلے کو خواہ مخواہ کی اہمیت دے رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسے سی آئی اے اور را نے استعمال کیا ہے لیکن پھر بھی اسے پاکستان کے سر تھوپ رہا ہے تو کیوں نہ وہ ثبوت اب پیش کر دیئے جائیں جو بلوچستان اور فاٹا سے اکٹھے کیئے گئے ہیں اور مضبوط لہجے میں اپنے خلاف تمام الزامات کی تردید کر دی جائے۔ امریکہ سے یہ کہا جائے کہ وہ علاقے سے اپنی بساط لپیٹ دے بلکہ اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ کیونکہ پاکستان ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔

سیکورٹی کونسل کی رکنیت اور بھارت کی نااہلی

دوسری جنگ عظیم نے سالہا سال تک دنیا کو آتش و آہن کی آماجگاہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اس جنگ کے دوران اور بعد میں جو کچھ ہوا وہ انسانیت کی تلخ یادیں ہیں لیکن اس جنگ کے اختتام پر دنیا کو جو ایک امید کی کرن نظر آئی وہ لیگ آف نیشن اور پھر اقوام متحدہ کا قیام تھا۔24 اکتوبر 1945 کو باضابطہ طور پر اس کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اپنا جو مقصد بیان کیا وہ دنیا کو جنگ سے بچانا تھا اگرچہ اب بھی اس معاملے میں اس کا کردار متنازعہ ہی ہے اور اس کی وجہ وہ بڑی طاقتیں ہیں جو سیکورٹی کونسل کے نام پر اس ادارے پر اپنی اجارہ داری قائم رکھے ہوئے ہیں اور حقیقتاً ویٹو پاور کے نام پر یہ ممالک اپنی من مانی کرتے رہتے ہیں۔ یوں تو ان ویٹو پاورز کے ساتھ ساتھ دس غیر مستقل ممالک بھی اس کونسل کے ممبر ہیں تاہم حقیقتاً کسی معاملے پر صرف ووٹ دینے ہی کی حد تک محدود ہیں۔اور اس ووٹ کی اہمیت بھی صرف تب تک ہے جب تک کوئی بڑی طاقت اس فیصلے کو ویٹو نہ کر دے۔ جنرل اسمبلی میں اگرچہ دنیا کے 180 سے زائد ممالک کو رکنیت حاصل ہے تاہم آخری فیصلہ سیکورٹی کونسل کے پانچ مستقل ارکان کی مرضی سے ہی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر بڑے ممالک کی یہ خواہش رہتی ہے کہ انہیں سیکورٹی کونسل کی مستقل رکنیت حاصل ہو جائے۔ سیکورٹی کونسل کے غیر مستقل

ارکان میں سے پانچ ایشیائی، دو لاطینی امریکی، دو مغربی یورپی اور ایک مشرقی یورپی ممالک میں سے چنا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے ممالک پانچ مستقل ارکان کے سامنے بے بس ہوتے ہیں اسی لئے وقتاً فوقتاً سیکورٹی کونسل میں توسیع کی آواز اٹھتی رہتی ہے جسمیں بھارت کی آواز بھی کافی بلند ہوتی ہے۔ اگرچہ جرمنی اور جاپان بھی اسکے لئے کوشاں رہتے ہیں لیکن پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا کے ممالک کے لئے جو بات باعث تشویش ہے وہ بھارت کی اس اہم ادارے میں شمولیت کی کوشش ہے کیونکہ بھارت جیسا ملک جو علاقے میں اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لئے کسی بھی حربے سے اجتناب نہیں کرتا اور خاص کر پاکستان کو دبا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اسکے ایٹمی اثاثوں تک رسائی یا انکی تباہی اسکا خواب ہے۔ بھارت جو اس مقصد کے لئے کوشاں ہے اگر سیکورٹی کونسل کی مستقل رکنیت تک رسائی حاصل کرلیتا ہے تو یقیناً پاکستان کے حق میں آنے والی کوئی بھی قرار داد روکتا رہے گا اور یوں پاکستان اس ادارے کا ایک معطل سا رکن بن کر رہ جائے گا یوں تو بھارت اب بھی اقوام متحدہ کی کسی قرار داد کو خاطر میں نہیں لاتا ورنہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ ایک اور بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ سیکورٹی کونسل کے مستقل ارکان میں ایک بھی مسلمان نہیں اور چین کے علاوہ اس پر مغرب ہی کی اجارہ داری ہے۔ ایک امریکہ اور تین یورپی ممالک یعنی برطانیہ، فرانس اور روس اس کے لئے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ اسکے بانی ارکان ہیں تو چین نے بھی تو اپنے زور بازو پر اپنا حق حاصل

کیا ہے تو پھر کوئی مسلمان ملک کیوں نہیں۔ اسکی وجہ مسلمانوں کی اپنی نااتفاقی بھی ہے اور کم مائیگی اور کم ہمتی بھی لیکن شائد سب سے بڑی رکاوٹ مغرب کا مسلمانوں کے خلاف تعصب ہے۔ ورنہ صرف آبادی کی بنیاد پر تو بھارت کو کچھ ملکوں کی آشیر باد حاصل نہیں ہے کبھی اسکو اکنامک ٹائیگر ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کبھی اسکے عوام کے معیار زندگی بلند ہونے کے دعوے کئے جاتے ہیں حالانکہ ایک ارب آبادی میں اگر دو چار یا چلیں دس کروڑ لوگ بہتر زندگی گزار رہے ہیں تو کوئی بڑی بات نہیں باقی نوے کروڑ کا بھی کوئی حساب ہونا چاہیے اور ان میں فٹ پاتھ پر سونے والوں کا بھی جو رات کو کھلے آسمان تلے اس پریشانی میں گزارتے ہیں کہ آیا صبح کھانے کو کچھ ملے گا بھی یا نہیں۔ پھر بھارت اب تو اپنے اندر خود رو جھاڑیوں کی طرح اگی ہوئی آزادی کی درجن بھر تحریکوں کے آگے بے بس ہے۔ نیکسلائیٹس نے اس کا ناک میں دم کیا ہوا ہے آسام والے اپنے وسائل و ذرائع دہلی منتقل ہونے کے خلاف ہیں کیونکہ خود اسکے لوگ تنگ اور بھوک کا شکار ہیں۔ کشمیر کی ظلم کہانی ہر ایک زبان پر ہے ارونا چل ڈریگن فورس، ڈیمو کریٹک فرنٹ آف بوڈو لینڈ، دیماسا لینڈ، گارو پیپلز لبریشن فرنٹ کمٹ پور، ناگا لینڈ، منی پور غرض اسی طرح کی تقریباً پندرہ تا اٹھارہ علیحدگی پسند تحریکیں بھارت میں چل رہی ہیں تو پھر وہ دوسروں کے بارے میں فیصلے کرنے کا کسطرح اہل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ وہ ایک ایٹمی طاقت ہے تو پاکستان بھی یہ اعزاز رکھتا ہے بلکہ بقول بھارت تو

اسکے ایٹمی دھماکے کامیاب ہی نہیں ہوئے تھے۔ (شائد یہ مزید دھماکے کرنے کا ایک بہانہ ہو)۔

سچ تو یہ ہے کہ سیکورٹی کونسل کے پانچ ارکان بھی اپنے اپنے دوست اور پسندیدہ ممالک کے حق میں ہی فیصلہ کرتے ہیں اور ناپسندیدہ ممالک کے بارے میں قراردادوں کو ویٹو کر دیتے ہیں اور امریکہ تو اس کا ناخدا بنا رہتا ہے یوں عملاً یہ ادارہ کوئی فیصلہ بڑی مشکل سے کرتا ہے بلکہ بسا اوقات کر ہی نہیں پاتا جس کی بڑی بڑی مثالیں کشمیر فلسطین وغیرہ ہیں۔ لہٰذا اس غیر ضروری توسیع کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں اور بھارت کو تو اس ممبر شپ سے دور ہی رکھنا چاہیے ورنہ یہ پاکستان بلکہ اسکے سارے پڑوسیوں کے لئے برا ہوگا کیونکہ بھارت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسکے اپنے پڑوسیوں سے تعلقات ہمیشہ معاندانہ رہے ہیں اور بجائے اچھے ہمسایوں کے رہنے کے اس نے ہمیشہ اپنے علاقے میں بالا دستی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور بالا دست کبھی اچھا فیصلہ ساز نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف اپنی انا اور اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے دوسرا اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور بھارت میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کو بھارت کو اس فہرست سے نکال دینا چاہیے تاکہ دنیا اور خاصکر برصغیر کا امن خطرے میں نہ پڑے۔

امریکی صدر کا دورۂ بھارت۔۔۔ اصل مقاصد

اوبامہ ایشیا کے دس روزہ دورے پر آئے اور چلے گئے اس دورے کا مقصد امریکہ کیلئے منڈیوں کی تلاش تھی۔ جبکہ اس کا درپردہ مقصد جو کہ اصل مقصد تھا وہ چین کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کرنا تھا۔ یہ دونوں مقاصد صرف اور صرف امریکہ کے مفاد میں ہیں اور اس کیلئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہے چاہے پورے ایشیا کا امن داؤ پر لگ جائے یا پوری دنیا کا۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے اوبامہ نے اپنے دورے کا آغاز بھارت سے کیا اور اسی سے امریکہ کی امن پسندی کا راز کھل جاتا ہے کہ اس نے ایک ایسے ملک کا انتخاب کیا جو انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزی کا مرتکب ہے اور اسی ملک میں کھڑے ہو کر اوبامہ نے اعلان کیا کہ وہ بھارت کے ساتھ مل کر دہشت گردی کے خلاف کام کرتے رہیں گے یعنی اس نے بھارت کی ریاستی دہشت گردی سے دانستہ طور پر آنکھیں چرالیں جو وہ کشمیر میں کر رہا ہے۔ بلکہ اس نے تو بھارت کو خوش کرنے کا ہر حربہ آزمایا کیونکہ اس کے خفیہ مقاصد کے حصول میں وہ انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ منڈیوں کی تلاش بھی اپنی جگہ اہم ہے کیونکہ یہ تلاش اسلحے کیلئے تھی۔ امریکہ کو اپنا اسلحہ فروخت کرنے کیلئے کسی بھی قیمت پر خریداروں کی ضرورت ہے بلکہ وہ اس کیلئے دنیا کے امن کو تہہ و بالا کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے بھارت کو

خوش کرنے کیلئے سلامتی کونسل میں اس کی مستقل رکنیت کی حمایت کا اعلان کیا حالانکہ وہ اس کے کردار سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھارت ایک بدنام ملک ہے اور اس کے کسی سے بھی مثالی تو چھوڑیے دوستانہ تعلقات بھی نہیں۔ پاکستان کو تو اس نے روز اول سے ہی قبول نہ کیا اگر اسے ویٹو پاور دی جائے تو کیا امریکہ نہیں جانتا کہ اس کے مابعد کے اثرات کیا ہونگے؟ بنگلہ دیش پر بھارت کا الزام ہے کہ نکسلائٹ کو ان کا تعاون حاصل ہے چین سے تو اس کے تعلقات ساری دنیا کے سامنے ہیں کہ کبھی ان میں خوشگواری نہ آ سکی بلکہ اس کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی کوشش میں ہی اس نے سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کا ڈول ڈالا۔ جبکہ دوسری طرف وہ پاکستان کے خلاف بھی ایک ایسی پوزیشن میں آنا چاہتا ہے کہ وہ اسے مزید نقصان پہنچا سکے اور پاکستان کے حق میں اٹھنے والی ہر آواز کو دبا سکے۔ پاکستان اور چین کے بارے میں تو بھارت بانگ دہل اپنی نیت اور عزائم کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ لیکن سری لنکا میں تامل ناڈو کے راستے اور تاملوں کے ذریعے اس نے کئی دہائیوں تک خون کی جو ہولی کھیلی وہ بھارت ہی کا مخصوص کردار ہے۔ اس لئے صدرِ امریکہ کو بھارت کی رکنیت کی حمایت کا اعلان کرنے سے پہلے خوب سوچ لینا چاہیئے تھا اور پوری دنیا کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرنے والا امریکہ اگر جنوبی ایشیا کو بھارت کے حوالے کرنے کے جرم میں شریک ہونے سے صاف انکار کرتا تو شاید اس کی ساکھ میں کچھ بہتری آجاتی لیکن چونکہ اسے منڈیوں کی تلاش ہے اور بھارت ایک ارب بھوکی

ننگی اور بے گھر آبادی کا ملک ہے یوں اس مصنوعات کی کھپت کافی ہو سکتی ہے اور انسانیت کے خلاف اس کا کردار بھی سب کے سامنے ہے جو کچھ وہ کشمیر میں کر رہا ہے اگر کسی مسلمان ملک میں وہ سلوک کسی اقلیت کے ساتھ کیا جائے تو امریکہ بشمول مغربی ممالک کی اکثریت چیخ اٹھے بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ اس ملک پر حملہ کر دیا جائے امریکہ کے ریکارڈ پر ایسے کئی حملے موجود ہیں لیکن باوجود اس کے کہ بارک اوبامہ نے کشمیر کے مسئلے پر مدد کا وعدہ کیا تھا۔ بھارتی دورے کے موقع پر اس نے صرف اتنا کہا کہ اگر پاکستان اور بھارت چاہے تو امریکہ کشمیر کے مسئلے کے حل میں مدد کر سکتا ہے کیا امریکہ کے صدر کی معلومات اتنی ناقص ہیں کہ وہ نہیں جانتا کہ بھارت کشمیریوں کی کسی صورت حق خود ارادیت دینے پر تیار ہیں اور اکیسویں صدی میں بھی وہ غلامی پر یقین رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے کشمیر کی لاکھوں کی آبادی کو غلام بنا رکھا ہے۔ اوبامہ نے دہشت گردی سے صرف تین دن تک متاثر ہونے والے شہر ممبئی کا تو خصوصی دورہ کیا وہاں کے بچوں کے ساتھ رقص کیا لیکن کشمیر میں جاری موت کے رقص کے سامنے بے بس انسانوں کی بے بسی کا عالم تک بھی دیکھنا گوارہ نہ کیا حالانکہ بھارت سرکار اگر ممبئی میں اس کی سیکیورٹی پر اربوں روپے لگا سکتی تھی تو کشمیر میں بھی اس کی حفاظت کا بندوبست کر سکتی تھی۔ لیکن ایسا جان بوجھ کر نہ کیا گیا تاکہ کشمیر کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے بسی کو پوشیدہ ہی رکھا جا سکے اور امریکہ کو بھی کشمیر کے مسلمانوں سے

ظاہر

ہے کوئی دلچسپی نہیں تھی اسے تو اسلحہ بیچنا تھا جو آزادی کیلئے لڑتے ہوئے لوگوں کے خلاف استعمال کیا جاسکے ۔ظاہر ہے اسے ہر حال میں بھارت کو خوش کرنا تھا کیونکہ اسے منڈیوں کی تلاش ہے اور بھارت کے ساتھ حالیہ معاہدوں سے اسے امید ہے کہ پچاس ہزار امریکیوں کو روزگار مل سکے گا اور ان پچاس ہزار افراد کیلئے امریکی صدر پورے جنوبی ایشیا کے امن کی قربانی دے سکتا ہے ۔ اسی لئے تو سلامتی کونسل کی رکنیت کیلئے وہ بھارت کی حمایت پر آمادہ ہے جبکہ دنیا پانچ ویٹو پاورز کے اختیار سے پہلے ہی نالاں ہے اور ان ارکان میں بھی امریکہ جس طرح سے اس اختیار کا استعمال کرتا ہے وہی دنیا کی تباہی کیلئے کافی ہے اور اگر بھارت کو بھی ان ٹھیکیداروں میں شامل کر دیا کر دیا گیا تو دنیا ایک اور عذاب میں مبتلا ہو جائے گی۔

امریکی صدر نے اگرچہ برطانوی وزیراعظم کی طرح پاکستان کے خلاف کوئی بیان تو نہیں دیا تاہم بھارت کی شان میں قصیدے پڑھے گئے اس سے جو معاہدے کیے گئے اس کی ترقی کو جس طرح سراہا گیا اس کو ہائی ٹیک اور ایٹمی ٹیکنالوجی دینے کی پابندی میں جس طرح نرمی کی ضرورت پر زور دیا پاکستان سے ممبئی حملوں کے ذمہ داروں کو جس طرح کٹھہرے میں لانے کا مطالبہ کیا گیا اور پاکستان کے موقف کی کوئی حمایت یا تائید نہ کی گئی کشمیر کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا اور یہاں تک کہ بھارت کی سلامتی کونسل کی رکنیت کی حمایت کا اعلان کیا گیا ان

سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھارت کو پاکستان کے مقابلے میں کتنی اہمیت دیتا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر دہشت گردی میں اس نے پاکستان کو مبتلا کر رکھا ہے جبکہ اس کی اصل ہمدردیاں بھارت کے ساتھ ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کیلئے اس کی امداد اس قدر مشروط ہوتی ہے کہ پاکستانی قوم کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اسمبلی میں قرارداد منظور کرنے اور امریکی سفیر سے احتجاج کرنے سے بڑھ کر ہماری حکومت کو سخت رویہ اپنا کر امریکی امداد اور دوستی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیئے اور اپنے قومی وقار اور عزتِ نفس پر مزید سودے بازی ختم کر دینی چاہیئے۔

سیلاب اب امداد نہیں۔۔۔خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زلزلے، طوفان، سیلاب قحط وہ قدرتی آفات ہیں جن کی روک انسان کے بس سے باہر ہے اور انسان دستِ قدرت کے آگے بالکل مجبور ان آفات کی زد پر ہوتا ہے۔ طوفانِ نوح سے لے کر 29 جولائی 2010 تک سیلاب کی موجوں کے آگے انسان کی بے بسی ایک ہی جیسی رہی۔ 29 جولائی 2010 سے شروع ہونے والا پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سیلاب خیبر پختونخواہ سے ہو کر پنجاب سندھ بلوچستان سب سے تباہی مچاتا ہوا گزرا۔ بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں شہر کے شہر تباہ ہو گئے۔ میں نے اپنے گاؤں میں تقریباً گیارہ فٹ چڑھے ہوئے پانی کے نشانات دیکھے۔ اللہ نہ کرے کہ پاکستان پر ایسی مصیبت دوبارہ کبھی آئے۔ یہ سیلاب یقیناً اس نسل کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سیلاب آیا تو ایک عام تاثر تھا کہ اس بار قوم نے وہ جذبہ نہ دکھایا جو کہ اس کا خاصہ ہے اور جو یہ کسی بھی آفت و تکلیف کے وقت دکھاتی ہے۔ لیکن بات یہ تھی کہ یہ سیلاب ایک مخصوص علاقے میں نہیں تھا بلکہ ملک کا ہر صوبہ اس سے متاثر تھا۔ اگرچہ انفرادی طور پر یہ امداد پہلے بھی کی جا رہی تھی لیکن آہستہ آہستہ اداروں نے اور خاص کر این جی اوز نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی غیر ملکی امداد آنے لگی اقوامِ متحدہ نے بار بار درخواست کی اور اس کی

ضرورت پر زور دیا۔ زیادہ تر یہ مدد ضروریاتِ زندگی اور اشیائے خوردونوش کی صورت میں تھی۔ کچھ نقد رقوم بھی تقسیم کی گئیں۔ اب جبکہ حالات کافی حد تک معمول پر آچکے ہیں اگرچہ پورے گھر یعنی تعمیر سے لے کر سامان تک پورا ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ لیکن ابھی بھی وہی امداد بار بار دی جارہی ہے جس کی ضرورت شروع میں تھی یعنی وہی کھانے پینے کی اشیا اور وہی کپڑے، باورچی خانے کی ضروریات، یہ بہت ہی اچھا جذبہ ہے اللہ ایسا کرنے والوں کو اس کا اجر دے لیکن میرے خیال میں اب ان سب چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ایک خاندان کئی کئی بار یہ سب کچھ وصول کرچکا ہے اور بات یہ نہیں ہے کہ نادار لوگ یہ سب لے رہے ہیں بلکہ اپنے آپ کو کھاتا پیتا کہنے والے بھی دھڑا دھڑ یہ سامان لے رہے ہیں اور عزت دار لوگ بھی ٹرکوں کے آگے اسی طرح دھکم پیل کر رہے ہیں جیسے کہ ضرورت مند۔ اگرچہ اس بات پر بہت سے لوگ میری مخالفت کریں گے اور سخت ردِ عمل کا بھی اظہار ہو سکتا ہے۔ لیکن اب آنے والی مدد کو میں بالکل غیر ضروری سمجھتی ہوں۔ میں دور دراز کے علاقوں کی بات نہیں کر رہی چونکہ وہاں تک امداد کی ترسیل مشکل ہے اس لئے ہمارے نام نہاد فلاحی ادارے اور این جی اوز آسان ٹارگٹ کی طرف بڑھتے ہیں کہ امداد کی تقسیم کے اعداد و شمار سے نام بھی کما سکیں اور خرچ سے زیادہ فنڈز بھی حاصل کر سکیں۔ دور دراز کے علاقوں میں جہاں یہ امداد اس طرح سے نہ پہنچ سکی جیسا کہ پہنچنی چاہیئے تھی کی طرف توجہ کی زیادہ ضرورت ہے اور ایک اور عنصر جو اس

ساری گہما گہمی میں نمایاں نظر آتا ہے وہ ہے مقابلے کا رجحان کہ فلاں با اثر شخص اتنے ٹرک اپنے گاؤں لایا تو مجھے کم از کم اس سے زیادہ لے جانے چاہئیں۔ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے پر برتری لے جانے کی کوشش یقیناً قابل تحسین ہے لیکن نمود و نمائش ایک منفی رویہ ہے جس کی کم از کم اسلام میں کوئی گنجائش نہیں وہ تو کہتا ہے کہ جب ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے کو خبر نہ ہو لیکن یہاں تو ٹرک لانے والے کو صرف اپنی تشہیر مقصود ہے۔

اسلام صدقہ و خیرات کی جتنی تاکید کرتا ہے کوئی اور مذہب اس کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ محنت کی ہدایت اس سے بڑھ کر کرتا ہے۔ یہاں میں حیاتِ طیبہ سے اس واقعے کا مفہوم نقل کرونگی جو میں نے اپنی کسی ابتدائی جماعت کی کتاب میں پڑھا تھا اور یقیناً بہت سے لوگ اس کی تفصیلات سے مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے کہ ایک شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں میری مدد کیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے پاس موجود چیزوں کی تفصیل پوچھی جو کہ ایک پیالہ اور ایک کمبل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ چیزیں منگوائیں اور ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فروخت کر دیں اس سے ملنے والے دو درہم میں سے ایک سے کھانے پینے کا سامان اور دوسرے سے کلہاڑی خریدنے کو کہا تاکہ لکڑیاں کاٹ کر بیچ سکے۔ کچھ عرصے بعد وہ شخص خوش خوش دربارِ نبی صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اب اسے مانگ کر کھانے کی ضرورت نہیں۔

لیکن اب دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ وہ لوگ جو کل تک مزدوری کیلئے مارے مارے پھرتے تھے اب امدادی ٹرکوں کے انتظار میں رہنے لگے ہیں۔ مصیبت کا وقت ٹل چکا ہے اب امداد کی نہیں ان اثرات سے نکلنے کی ضرورت ہے اور یہ اثرات تب ہی زائل ہونا شروع ہوں گے جب لوگ اپنی معمول کی زندگی کی طرف لوٹیں گے اور محنت مزدوری دوبارہ شروع کریں گے۔ ایک مشورہ سمجھیے یا درخواست تمام مخیر حضرات سے یہ ہے کہ اب وہ جتنی مدد کرنا چاہتے ہیں وہ نقد رقوم کی صورت میں کیجیے۔ اگرچہ ہمارے عوام کیلئے اپنی ضروریات پوری کرنا مشکل ہے تاہم جو جتنی مدد کرنا چاہے اس کو جمع کیجیے ۔ قطرہ قطرہ سمندر اور پیسہ پیسہ سرمایا بنتا ہے اور کسی این جی او کی مدد سے نہیں بلکہ کسی امین اور نیک شخص کی سرکردگی میں آگے بڑھ کر اگر حکومت کو نہ دینا چاہیں خود انفراسٹرکچر کی تعمیر میں لگایئے۔

حکومت کو بھی اس معاملے میں احتیاط کی ضرورت ہے کہ وطن کارڈ کے ذریعے وہ کن لوگوں کو پیسہ دے رہی ہے ۔ کئی ایسے خاندان ہیں جو دو کمروں کے کچے مکان میں رہتے تھے اور ان میں باپ بیٹے سب شامل تھے لیکن اب باپ اور اس کے چار

چار پانچ پانچ بیٹوں کے نام پر الگ الگ کلیم کرکے کئی کئی حصے لئے گئے ہیں اور یہ کہنے والوں کے بارے میں کہ انہیں کوئی امداد نہیں ملی ، پوری تفشیش کی جائے۔ مجھے ہر گز اس بات پر اعترض نہیں کہ جن کا نقصان ہوا ہے ان کی مدد کی جائے لیکن اس وقت ریلیف کی ضرورت ختم ہو کر بحالی تک بات آچکی ہے اب بحالی کی ضرورت ہے اور اس کیلیئے جو واقعہ میں نے اوپر بیان کیا اس سے رہنمائی لی جائے۔ قوم پہلے ہی کشکول سے تنگ آ چکی ہے ۔ حکومت کے کشکول پر سب کو اعتراض ہے تو اب اسے افراد کے ہاتھ میں مت پکڑا یئے ورنہ یہ حکومتی سطح سے اتر کر قومی رویہ بن جائے گا سیلاب ایک بہت بڑی آزمائش تھی جو آ کر گزر چکی ہے اب نفسیاتی بحالی کی ضرورت ہے۔ خودی، خودداری اور عزتِ نفس کی بحالی کی ضرورت ہے ۔صرف قدرتی آفات کے وقت ہی نہیں عام دنوں میں بھی حکومت سستی چینی اور سستے آٹے کے ٹرک کھڑے کرکے ، عوام کو قطاروں میں کھڑا نہ کرے بلکہ اشیائے ضروریہ کو دکانوں اور بازاروں میں ان کی پہنچ میں لائے ۔ ان قطاروں میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی بات ہوتی ہے۔ سستے آٹے کے ٹرک پاس کھڑی ایک سولہ سترہ سالہ لڑکی نے پوچھنے پر بتایا کہ اب تک وہ کم از کم دس بوری آٹا جمع کر چکی ہے۔ اب بھی یہی حال ہے شہروں سے نزدیک سیلاب زدہ علاقوں میں کئی کئی بار کا لیا ہوا سامان جمع کیا جا رہا ہے یا بیچا جا رہا ہے۔ الہذا اس بارے میں خاصی احتیاط کی ضرورت ہے اور اب جمع شدہ امداد کا رخ دور دراز کے علاقوں کی طرف کیجیے۔ چاہے یہ پنجاب میں ہوں خیبر پختونخواہ

میں یا سندھ اور بلوچستان میں اور اب انفرادی امداد سے آگے بڑھ کر پل، سکول اور سڑکیں بنانے کی ضرورت ہے۔ اس تعمیر میں متاثرہ افراد کو معمول سے اچھے معاوضوں پر شامل کیجیے امید ہے یہی دو درہم انہیں امداد کی ضرورت سے آزاد کر دیں گے۔

جذبہ حب الوطنی

ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ کم ہوتا جارہا ہے اور ایک مخصوص طبقے میں یہ تاثر دیکھنے میں آ بھی رہا ہے وہ یوں کہ ملکی اور قومی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دے دی جاتی ہے۔ کرپشن کو سو طریقوں سے کیا جارہا ہے اور اسے کسی نہ کسی طرح قانونی شکل دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ حالات ہر سطح پر ہیں۔ امرا اپنی دولت بڑھانے کیلئے کرتے ہیں اور غریب اسے اپنی گزر اوقات ممکن بنانے کیلئے اپناتے ہیں۔

ملکی حالات، مہنگائی، بنیادی سہولتوں کا فقدان یہ ساری وہ فکریں اور پریشانیاں ہیں جس نے عوام کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا ہے فکرِ جاناں کی جگہ فکرِ دوراں نے لے لی ہے۔ اگر بجلی ہے تو پانی نہیں اور پانی ہے تو گیس نہیں۔ روٹی کپڑا اور مکان نعروں کی حد تک ٹھیک ہیں لیکن حقیقت میں لوگ ان ضروریات سے محروم ہیں اور جب ضروریات ہی نہیں ہیں تو سہولیات کہاں سے آئیں۔ غیر ملکی قرضے ایک طرف تو عالمی مالیاتی اداروں کے شکنجے دوسری طرف، آمدن سے زیادہ ٹیکس کا بوجھ، مہنگائی کے مارے عوام اور سہولت اور آسائش کا عادی ایک محدود طبقہ امرا۔ غیروں کی مسلط کردہ دہشت گردی تو وہ عذاب ہے جس نے ہر ایک

کا جینا مشکل کر دیا ہے۔ عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں مسلسل ہمارے خلاف جاری ہیں جس نے ہماری معیشت اور تجارت ہر میدان کو متاثر کیا ہے۔ تعلیم، صحت، ترقیاتی کام کسی چیز پر وہ توجہ دینا ممکن ہی نہیں رہا جو عوام کا حق ہے۔ اب اتنی ساری مشکلات سے نبرد آزما ایک غریب ملک اور امیر حکمرانوں کے عوام کس طرح اپنے جذبات کے اظہار کیلئے وقت نکالیں۔ بہتر زندگی کی جدوجہد میں سرگرداں لوگ دن رات محنت مشقت میں مصروف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس چوک میں کسی بھی وقت دھماکہ ہو سکتا ہے جس میں وہ تلاش رزق میں چھابڑی لگا کر بیٹھا ہے۔

یہ ہیں ان حالات کی ہلکی سی جھلک جس سے اس ملک کے عوام ہر روز گزرتے ہیں۔ لیکن آفرین ہے اس بہادر قوم پر جو یہ سب کچھ انتہائی خندہ پیشانی سے.برداشت کر رہی ہے اور بظاہر یہ نظر آنا کہ جذبہ حب الوطنی ماند پڑتا جارہا ہے ایک بے جا خیال ہے۔ اپنی محبت کا اظہار یہ قوم اس وقت کرتی ہے جب انہیں کوئی معمولی سی قومی خوشی ملتی ہے۔ اس کا احساس مجھے اس وقت شدت سے ہوا جب دس سالہ عبداللہ نے مجھے بتایا کہ آج اس نے اپنی سالگرہ پر ملنے والے سو روپے میں سے پچاس روپے کا صدقہ اور "پندرہ رکعت نفل "مانے ہیں کہ پاکستان ایشین گیمز کے سیمی فائنل میں کوریا کے خلاف جیت جائے۔ جو اس نے اسی دن ادا کر دیئے۔ پاکستان فائنل جیت گیا اور بیس سال بعد ملنے والے اس گولڈ میڈل کا

جشن جس طرح قوم نے منایا اس نے ثابت کر دیا کہ اس کے دل پاکستان کیلئے دھڑکتے ہیں۔ خواتین کی کرکٹ ٹیم، سکواش ٹیم کی کامیابیوں اور خاص کر ہاکی ٹیم کی فتح نے تو قومی جذبات کو جس طرح اجاگر کیا اس نے ثابت کیا کہ یہ قوم قومی کامیابی پر کس طرح شادماں ہوتی ہے۔ اور خوشی خیبر سے لے کر کراچی تک ایک ہی جذبے اور رنگ میں منائی جاتی ہے۔

مصیبت کے وقت تو یہ قوم جس طرح یکجہتی کا مظاہرہ کرتی ہے وہ تو پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہے ہی۔ یہی وہ جذبہ ہے جس نے اس ملک کو قائم رکھا ہوا ہے۔ بزرگوں کی دعائیں، بچوں کے نوافل، نوجوانوں کا جذبہ و شوق وہ قیمتی اثاثہ ہیں جس سے یہ ملک مالا مال ہے۔ ایک چیز جس کی ہمیں اشد ضرورت ہے وہ ہے عمل پیہم اور قومی تربیت جو اگر ہم حاصل کریں اور دیں تو پھر ایشین گیمز تو کیا ہم ترقی کی کوئی بھی منزل طے کر سکتے ہیں اور ایک یہ کہ ہم تقدیر کا گلہ کرنا چھوڑ دیں اور خود تقدیر یزداں بن جائیں ورنہ حب الوطنی کی اس ملک میں کوئی کمی نہیں اور یہی جذبہ ہماری اصل قوت ہے لیکن اس جذبے کو درست راستے پر لگانے کیلئے ہمیں حکمران سے لے کر ایک عام آدمی تک سب کو کام کرنا ہوگا اور بجائے دوسروں کو الزام دینے کے خود اپنی ذمہ داری پوری ذمہ داری سے پورا کرنا ہوگی۔

افواج پاکستان اور آئی ایس آئی

پاکستان واحد اسلامی ایٹمی قوت جس کا ہر ایکشن مغرب اور اہل مغرب کے لئے باعث تشویش ہے۔ مغرب اور خاص کر امریکہ کسی کے لئے تشویش کا اظہار کرے تو سمجھیں کہ حالات کے بگڑنے میں اب کوئی کسر باقی نہیں رہی اور یہی کھیل عرصے سے پاکستان کے ساتھ کھیلا جارہا ہے۔ کبھی پاکستان کے حالات پر تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے عسکری اداروں کو بلاوجہ کی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یوں افواج پاکستان اور آئی ایس آئی پر ایک خاص نظر کرم رکھی جاتی ہے دراصل پاکستان دشمن قوتیں جانتی ہیں کہ ان کے ارادوں کے لئے سد راہ یہی ادارے ہیں۔ افواج پاکستان ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کی اہلیت اور ہمت رکھتی ہے اور آئی ایس آئی ان کے مذموم عزائم اور منصوبوں کی خبر رکھتے ہوئے انہیں ناکارہ بنانے کے لئے ہر دم تیار اور بفضل خدا مکمل طور پر کامیاب ہے اور یہی کامیابی امریکہ، بھارت، اسرائیل اور امریکہ نواز افغانستان کو شدت سے ناگوار ہے۔ پاکستان میں حالات کو جس نہج پر پہنچا دیا گیا ہے اور ہر روز قوم کو جس ذہنی کرب سے گزرنا پڑتا ہے وہ اسی قوم کی ہمت ہے۔ سوات میں طالبان سے ملنے والا امریکہ، روس اور بھارت ساختہ اسلحہ، اسرائیلی فوجی حکام کے بھارت کے دورے، افغانستان میں بھارت کے غیر ضروری طور پر قائم قونصل خانے یہ سب اس بین

الاقوامی سازش کے ثبوت ہیں جو پاکستان کے خلاف تیار کی گئی ہے اور اسے تاحال بڑی کامیابی سے کھیلا جارہا ہے۔ کسی مسلمان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ انسانوں کے گلے کاٹے اور پھران سرکٹی لاشوں کی بے حرمتی کرے انہیں چوکوں میں لٹکائے اور ان کی جنازہ نہ پڑھانے دیا جائے جبکہ وہ کلمہ گو مسلمان ہو اور خود کشی جسے اسلام نے کسی بھی صورت میں حرام قرار دیا ہے کو جائز قرار دے کر دوسروں کے بچوں کو اس قبیح فعل کے لئے استعمال کیا جائے جس کی اسلام کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دیتا۔ سوال تو یہ ہے کہ ان شر پسندوں کو اتنی بڑی مقدار میں اور اتنا جدید اسلحہ کہاں سے یئسر آگیا ان سب کو جنگی تربیت کیسے دی گئی تباہی پھیلانے کے جدید طریقے کیسے سکھائے گئے ظاہر ہے یہ مہارت سکھانے کے لئے ماہر ذہن اور ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ماہر ہاتھ پورا پاکستان بلکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ کس کے ہیں۔ سی آئی اے کو تو لگتا ہے قائم ہی اسی لئے کیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں امریکی اجارہ داری قائم ہو اور امریکہ کے ناپسندیدہ ممالک امن کو ترسیں اور یہ بھی کہ جہاں کسی ملک نے کوئی ایسی کامیابی حاصل کی کہ وہ امریکہ کے برابر نہ سہی اسکے دائرہ اثر سے نکلنے کی کوشش کرنے کے قابل ہو اسے کبھی خانہ جنگی کا اور کبھی کھلی جنگ کے لئے میدان جنگ بنا دے۔ اب ذرا ''را'' کی طرف آئیں تو اس میں تو کسی ابہام کی گنجائش ہی نہیں کہ را کے قیام کا مقصد ہی پاکستان مخالف سرگرمیاں ہیں۔ پاکستان کے خلاف نہ تو اسکے عزائم ڈھکے چھپے ہیں اور

نہ ہی اسکی کاروائیاں بلوچستان کو آجکل اس نے کھلم کھلا اپنا ٹارگٹ بنا رکھا ہے اور قبائلی علاقہ جات میں بھی اس کی دخل اندازی کسی سے پوشیدہ نہیں بلکہ کئی مواقع پر تو غیر مختون طالبان'' کی لاشیں بھی ملیں اور بلوچستان میں تو بھارتی اسلحہ ملتا ہی رہتا ہے'' اور ظاہر ہے یہ سب کچھ بے تحاشا بجٹ رکھنے والے ''را'' کا ہی کارنامہ ہے۔ رہا خادیا رام تو وہ تو کبھی کے جی بی اور کبھی سی آئی اے کے اشاروں پر ناچتا ہے اور موساد کی اسلام دشمنی تو ویسے ہی مسّلم ہے۔ اسرائیل تو ہر اس ملک کا دشمن ہے جو مسلمان ہے اور پاکستان تو اسلام کا قلعہ ہے چاہے یہ جتنے بھی لبرل حکمرانوں کے ہتھے چڑھے یہاں کے عوام بشمول افواج پاکستان کی اسلام سے محبت کبھی کم نہیں کی جاسکتی اور یہی چیز ان اسلام دشمنوں کے لئے سخت باعث تشویش ہے۔ اسرائیل جانتا ہے کہ یہ واحد اسلامی ملک ہے جو کہ جنگی ٹیکنالوجی میں اسکے مقابلے پر آنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسکی نخوت کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ اب اگر دیکھا جائے تو آئی ایس آئی ان تمام اداروں کے خلاف تن تنہا نبرد آزما ہے اور اسکی صلاحیت سے کچھ بعید نہیں کہ جس طرح اس نے کے جی بی کا مقابلہ کیا اور اسے شکست سے دوچار کیا جبکہ دونوں کے وسائل میں زمین اور آسمان کا فرق تھا اب بھی اگر 28 ٹریلین ڈالر ظاہری بجٹ کے ساتھ سی آئی اے چھوٹے سے آئی ایس آئی سے خوفزدہ ہے تو کچھ حیرت کی بات نہیں کیونکہ بقول رب تعالیٰ اکثر کم لوگ زیادہ لوگوں پر غالب رہیں گے 150 بلین ڈالر کے ظاہری بجٹ کے ساتھ را اور

موساد کے بے تحاشا وسائل کا مقابلہ آئی ایس آئی اپنے محدود وسائل کے ساتھ کر رہا ہے تو اسے ٹارگٹ بنائے رکھنا کہاں کا انصاف ہے آئی ایس آئی تو وہ کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہیے یعنی اپنے ملک کا دفاع اور ایسا کرتے ہوئے وہ اور کسی کا نقصان نہیں کرتا اور شائد اس کے پاس اس کے لئے وقت ہی نہیں کیونکہ جتنے محاذوں پر وہ لڑ رہا ہے یہی ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور ویسے بھی آئی ایس آئی کا کام اپنے ملک کے خلاف سازشوں کا توڑ کرنا ہے دوسرے ملکوں میں شر اور فساد پھیلانا نہیں۔ جس دن سی آئی اے، را اور موساد نے اپنی فتنہ انگیز کاروائیوں کو لگام دی اسی دن پاکستان جیسے امن پسند ملکوں میں امن قائم ہو جائے گا اور دنیا کے لوگ سکون سے رہنے کی آرزو پوری کر سکیں گے کاش ایسا ہو جائے۔ جہاں تک ہمارے ملک کا سوال ہے تو یہ بات ثابت شدہ ہے کہ امن پسند لوگوں کے اس ملک کا امن بیرونی قوتوں نے تباہ کیا ہوا ہے۔ دہشت گردی کی جنگ نے پاکستانیوں کو ایک عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے لیکن پھر بھی یہ قوم پر امید ہے کہ مشکل وقت کٹ جائے گا اور صرف اور صرف اس ملک کا بھلا سوچنے والے ذہن ہی فتح مند ہونگے اور یہ سب کچھ کسی بیرونی مدد نہیں بلکہ اپنی ہمت قوم کی دعاؤں اور میڈیا کے بھرپور سپورٹ سے ہوگا میڈیا کو قوم کے سامنے حقائق رکھنے ہوں گے تاکہ وہ بیرونی پروپیگنڈے کے زیر اثر نہ آئے بلکہ اپنے ملک کے زمینی حقائق کو دیکھتے ہوئے آئی ایس آئی اور افواج پاکستان کی کاروائیوں کی مکمل حمائت کرے ہمارے سیاسی لیڈر بھی فوج کی مخالفت چھوڑ کر عوام کو ان

قربانیوں سے آگاہ کریں جو بحالی امن کے لئے ہماری افواج دے رہی ہے اگر ہم خود کو سنبھالیں گے تو کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

وکی لیکس۔۔۔انکشافات یا سازش

بڑے اور طاقتور ملک چھوٹے، کمزور اور غریب ملکوں کو سو طرح کے پھندوں میں گرفتار رکھتے ہیں۔ کبھی آئی ایم ایف کبھی خود اپنے قرضے کبھی ان کو خود پر اس قدر منحصر کرنا کہ انہیں اپنا وجود قائم رکھنے کیلئے ان کا ہر مطالبہ ماننا پڑتا ہے اور اس انٹر نیشنل بلیک میلنگ کا سب سے بڑا بلیک میلر اور مجرم امریکہ ہے جہاں وہ بذریعہ جنگ تمام دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے وہیں وہ دوسرے ممالک کو آپس میں لڑا کر بھی اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے جس کیلئے وہ ہر روز نئی چالیں چلتا ہے۔ اس کی تازہ ترین چال وکی لیکس ہے جس کو وہ خود ہی معلومات فراہم کرتا ہے سچی اور جھوٹی ہر طرح کی اور پھر اسے نشر کر دیتا ہے جس میں سے چند ایک امریکہ کے متعلق ہوتی ہیں جبکہ باقی دوسرے ممالک خصوصاً پاکستان، ایران اور افغانستان سے متعلق ہوتی ہیں یا مسلمان عرب ممالک کے متعلق۔ پچھلے چند مہینوں میں وکی لیکس افشائے راز کا کارنامہ سر انجام دے چکا ہے اور نشانہ زیادہ تر مسلمان اور مسلمان ممالک ہی رہے۔ پاکستان کو امریکہ کی دوستی کے جہاں اور بہت سے نقصانات ہیں وہیں اس کو یہاں بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ بہت سے انکشافات تو انکشافات کے زمرے میں آ ہی نہیں سکتے کیونکہ امریکی حکومت اور سفیر کی طرف سے مہیا کیے گئے یہ راز پاکستان کا بچہ بچہ

پہلے ہی جانتا ہے مثلاً اسی خبر کو لیجیئے کہ امریکی سفیر نے کہا کہ امریکہ کو پاکستان پر اعتماد نہیں یہ بھی کوئی خبر بلکہ انکشاف ہے لیکن انکشافات کو ہزاروں تک پہنچانے کے شوق میں ہر بات کو راز کا درجہ دے دیا جاتا ہے ایسا ہی ایک راز حامد کرزئی کے بارے میں افشا کیا گیا جو افغانستان میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے یعنی کہ وہ منشیات کا سمگلر ہے معلوم نہیں اس کے بھائی کے بارے میں اس راز کو کیوں چھپایا گیا۔

رازوں کی تعداد بڑھانے کے علاوہ وکی لیکس کا مقصد دوست ممالک کے درمیان پھوٹ ڈالنا بھی ہوتا ہے۔ مثلاً چین، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے حکمرانوں کی طرف سے پاکستان اور پاکستانی حکمرانوں کے بارے میں کمنٹس۔ شاہ عبداللہ پاکستان کے ایک خیر خواہ دوست ہیں کسی بھی شخصیت کے بارے میں خیالات رکھنا کوئی جرم نہیں لیکن وکی لیکس جس طرح سے اسے نشر کر رہا ہے وہ یقیناً پاکستان اور سعودی حکومتوں کے درمیان ایک رخنہ ڈالنے کی کوشش ہے۔ یہی حال متحدہ عرب امارات کا ہے جن کی ترقی میں پاکستانیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے لیکن وہاں کے حکمرانوں کے واسطے سے بھی وکی لیکس نے شر انگیز قسم کے راز اچھالے۔

امریکہ کو دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت کرنے کی عادتِ بد ہمیشہ ہی

سے لاحق ہے بلکہ اکیسویں صدی میں ہوس ملک گیری کا شوق بھی اسے ہی لاحق ہے اور اسی شوق کو پورا کرنے کیلئے وہ غریب ممالک میں فساد برپا کرتا ہے اور بغیر کسی دعوت کے حالات کی درستگی کے نام اس ملک کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ وکی لیکس بھی ایک سائبر کرائم ہی ہے جو امریکہ پوری دنیا کے خلاف کر رہا ہے۔ پاکستان کہنے کو تو اس کا اتحادی ہے، کام بھی اس سے پورا لیتا ہے بلکہ مطالبہ ڈو مور کا رہتا ہے اور پروپیگنڈا مسلسل اس کے خلاف جاری رہتا ہے۔ وکی لیکس نے ایک انکشاف یہ کیا کہ جنرل کیانی نے مشرف سے سبق سیکھا اور بجائے سامنے آنے کے پس پردہ رہ کر سیاست اور حکومتی امور پر اثر انداز ہوتے ہیں کسی اور کی غلطی سے خود سبق سیکھنا ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ فوج اس ملک کا ایک قابلِ احترام حصہ ہے جس کا اول و آخر مقصد اس ملک کی خدمت ہے ہمارے ملکی حالات اور ''حکمرانی عادات'' کا تقاضا رہتا ہے کہ انہیں ملکی مفاد میں مشورہ دیا جائے یا کسی نہ کسی طرح غلط کام سے روکا جائے۔ ویسے تو پوری قوم اس وقت بھی جنرل کیانی کی مشکور تھی جب انہوں نے کیری لوگر بل کو بغیر تبدیلی کے منظور ہونے پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا بلکہ حکومت کو بھی پُر زور مشورہ دیا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ یہ یقیناً کوئی انکشاف نہیں تھا جسے وکی لیکس نے افشا کیا۔ فاٹا کے معاملات پر بھی جہاں تک اثر انداز ہونے کا تعلق ہے تو ظاہر ہے فوج وہی کرے گی جو ملکی مفاد میں بہتر ہوگا۔ جس طرح امریکی ادارے امریکہ کے مفادات کو اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں بالکل اُسی

طرح کسی بھی دوسرے ملک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امریکہ کی بجائے اپنے ملکی مفاد کو ترجیح دے اور یہ وکی لیکس کے کرتا دھرتا بھی جانتے ہیں اور پاکستانی عوام بھی۔ لیکن ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی ان باتوں کو اچھالا جاتا ہے تاکہ حکومت اور اداروں میں اختلاف پیدا کیا جاسکے اور پاک فوج اور آئی ایس آئی تو خاص کر امریکہ کی مہربانی'' کے زیرِ اثر رہتی ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس بار حکومت پاکستان بھی'' وکی لیکس کے نشانے پر ہے جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بہت سارے معاملات اس وقت خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے جب امریکہ اپنا دستِ شفقت حکومت کے سر سے اٹھالے گا اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری حکومتیں اپنا فیصلہ خود کریں صرف اور صرف ملک اور قوم کے مفاد میں وہ جب بھی اور جب تک دوسروں سے ہدایات لیں گے تب تک ملکی معاملات سدھر نہیں سکتے اور سبکی اور بے عزتی الگ برداشت کرنا پڑتی ہے۔ وکی لیکس جس مقصد کیلئے کام کر رہی ہے اس سے خود کو باخبر رکھنا بہت ضروری ہے اور دوست ممالک کے بارے میں بھی انتہائی ذمہ دارانہ رویے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی دوسری سازشوں سے حکومت، فوج اور عوام کے درمیان جس طرح خلیج حائل کرنے کی سازش کی جارہی ہے اس کا مؤثر اور پُرزور جواب دینا بھی ضروری ہے تاکہ حالات پھر کسی ایسے رخ نہ چلے جائیں کہ فوج اور قوم دونوں کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے۔

افغانستان پر تجزیاتی رپورٹ ۔۔۔ حقیقت یہ ہے

عراق میں امریکہ نے مفروضوں کی بنیاد پر جنگ شروع کی تھی اور بعد میں اس کے با صلاحیت اور عظیم خفیہ ادارے سی آئی اے کی اطلاعات غلط ثابت ہوئیں۔ پوری دنیا کے سامنے شرمندگی اس کے حصے میں آئی اور وہ وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ ہاں اس نے یہ کارنامہ ضرور سرانجام دیا کہ عراق کی صنعت و حرفت، تجارت اور ہر قسم کی ترقی اور خوشحالی کو بدحالی میں بدل دیا۔ عراق کی حکومت کو تو اس نے فتح کر لیا وہاں کے عوام کے دلوں میں اپنے لیے نفرت کے سوا کوئی جذبہ نہ پیدا کر سکا۔ لہٰذا اس محاذ پر اسے زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ عراق میں اپنے غلبے اور بربریت کے زعم میں اس نے 11/9 کے ڈرامے کی آڑ لے کر افغانستان پر حملہ کر دیا اس نے اس ملک کو بھی اپنی دنیاوی طاقت سے تاخت وتاراج کیا۔ سویت یونین کی حیوانیت سے بچے ہوئے اور اپنی سانسوں کی بحالی کی کوشش میں مصروف افغانستان کو بارود اور آگ کے ساتھ دوبارہ خاک اور خون میں نہلا دیا۔ حالانکہ امریکہ جانتا تھا کہ یہ ملک ہی پتھریلا نہیں اس کے لوگوں کا حوصلہ بھی ان پتھروں سے زیادہ سخت ہے۔ امریکہ پچھلے دس سالوں سے مصروفِ جنگ ہے لیکن کابل اور اس کے مضافات سے اپنے زیرِ سایہ کابل حکومت کی عملداری آگے نہ بڑھا سکا۔ اس نے بے شمار افغانوں کا خون تو اپنے سر لیا ہی ہے اپنے بے

شمار فوجی بھی اس جنگ کی بھینٹ چڑھا چکا ہے لیکن وہ افغانوں کو زیر نہ کر سکا ہے۔ جس کا اقرار وہ خود بھی کرتا رہتا ہے نہ ہی وہ ان سایوں کو تلاش کر سکا ہے جن کو ڈھونڈتا ہوا وہ یہاں آیا تھا۔ ہاں اس نے ایک اسامہ بن لادن کے بدلے میں ہر افغان کو اسامہ سمجھ کر اس کا خون بہانا روا سمجھ لیا اور اس کا دل اپنے لیے نفرت سے بھر لیا۔

افغانستان میں امریکہ کی موجودگی سے افغانستان کو جو نقصانات اٹھانا پڑے وہ تو اپنی جگہ، پاکستان اس جنگ سے شدید ترین طور پر متاثر ہوا۔ سویت افغان جنگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ نقصان ہمیں اٹھانا پڑا۔ دہشت گردی کے خلاف ان نام نہاد اور ڈھکوسلا جنگ نے ہمارے انفراسٹرکچر کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ہماری فوج کو تو افغان اور امریکی افواج سے بھی زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے باوجود امریکہ کا ''ڈو مور'' کا مطالبہ جاری ہے۔ اگرچہ وہ جانتا ہے کہ نہ تو ابھی تک اس نے طالبان کے خلاف کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل کی ہے اور نہ آئندہ اس کی کوئی امید ہے۔ افغان جنگ کے بارے میں حالیہ تجزیاتی رپورٹ میں بھی امریکہ نے اعتراف کیا کہ طالبان کے خلاف اس کی کامیابیاں دیرپا نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے سر سوائے خون خرابے کے کسی کامیابی کا سہرا ہی نہیں وہ افغان جنگ مجبوراً جاری رکھے ہوئے ہے اور ایک ہاری ہوئی جنگ سے واپسی کا باعزت راستہ تلاش کرنے میں یقیناً اسے وقت درکار ہے لیکن

بوکھلاہٹ میں اسے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ انخلائ کی منصوبہ بندی کیسے کرے۔ایک طرف تو وہ کہتا ہے کہ وہ جولائی 2011 میں اپنی افواج میں کمی کرے گا دوسری طرف وہ القاعدہ سے آخری وقت تک لڑنے کا اعلان کر رہا ہے۔کیا وہ ان سات ماہ میں پچھلے دس سال سے زیادہ کامیابی حاصل کرے گا؟

صدر اوبامہ حسبِ معمول پاکستان کے اوپر تمام ذمہ داری ڈال کر یقیناً اپنے ” انتہائی کامیاب“ خفیہ ادارے سی آئی اے کی رپورٹ کے مطابق القاعدہ کے ٹھکانے پاکستان میں قرار دیئے اور تجویز پیش کہ کہ القاعدہ کو ختم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان میں ان کو محفوظ ٹھکانے نہ دیئے جائیں۔پاکستان اور افغانستان دو ملکوں میں دس سال سے امریکہ القاعدہ کے ٹھکانے تلاش کرتے کرتے تھک چکا ہے۔یہاں کے لوگوں کی زندگی عذاب بنا دی گئ لیکن یہ ٹھکانے اور یہ لیڈر ان کے ہاتھ نہ لگ سکے تو کیوں نہ امریکہ اپنی تلاش کا رخ اپنے جاسوس ادارے اور اپنے ملک کی طرف پھیر دے اگر امریکی حکومت سی آئی اے کے اس جرم میں شریک نہیں تو شاید اسے اس تلاش میں کچھ کامیابی حاصل ہو جائے لیکن اس کیلئے اسے اپنی دوست ایجنسیوں یعنی ”را“ اور موساد“ سے مدد ضرور لے لینی چاہیئے اور انہیں بھی ان کاروائیوں سے باز رکھنے کا“ حکم دے جو وہ اس کی محبت اور اطاعت میں پاکستان اور افغانستان میں جاری رکھے ہوئے ہے۔خاص کر پاکستان میں ”را“ کی مدد کرنا یا لینا چھوڑ دے۔اس نے جس طرح بھارت کو

افغانستان میں مکمل طور داخل کر لیا ہے وہ اپنے بعد افغانستان کی حکومت کو بھارت کے حوالے کرنا چاہتا ہے تاکہ ''را'' اور بھارت پاکستان پر دو طرف سے حملہ آور ہو سکے اور بھارت اپنی ایک ارب ننگی بھوکی اور بے گھر آبادی کیلئے توانائی کے بیش بہا ذخائر پر قبضہ کر سکے چاہے اس کیلئے اسے آخری افغان کی آخری سانس بھی لینا پڑ جائے کیونکہ یہی اس کی فطرت ہے۔

امریکہ کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کہا کہ کابل اور اسلام آباد کو فاصلے ختم کرنا ہونگے۔ جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ کابل اور اسلام آباد میں فاصلے حائل کیے گئے ہیں۔ ورنہ یہاں نہ مذہبی نہ معاشرتی نہ ثقافتی اور نہ زمینی کسی طرح کا بھی فاصلہ نہیں۔ یہاں تو چبھے کانٹا جو کابل میں تو پاکستان کا ہر پیر وجواں بے تاب ہو جائے۔ کرنا صرف یہ ہے کہ ہیلری افغانستان سے اپنی فوجیں، سی آئی اے، را اور موساد سب کو واپس بلا لے اور افغانستان اور پاکستان کو اپنے باہمی معاملات خود حل کرنے دے۔ پاکستان او ر افغانستان میں جو سب سے مضبوط رشتہ ہے وہ مذہب کا ہے۔ جو انہیں ایک دوسرے سے دور نہیں ہونے دیتا۔ یہاں حکمران تو بِک کر ایک دوسرے کے خلاف ہو سکتے ہیں عوام نہیں۔ جس کا ثبوت آج بھی وہ لاکھوں افغان باشندے ہیں جو اَسّی کی دہائی میں پاکستان آئے تھے اور آج تک پاکستانیوں نے ان کو رہنے کی جگہ دی ہوئی ہے۔

اس تجزیاتی رپورٹ میں پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف اہم جزو ہونے کا تمغہ تو دیا گیا جو اس قوم کو ہر گز منظور نہیں لیکن پاکستان کے اوپر اعتماد کی کمی کا رونا امریکہ مسلسل رو رہا ہے۔ جبکہ امریکہ جانتا ہے کہ پاکستان کے بغیر اسے یہ جنگ کئی گنا مہنگی بھی لڑنا پڑی تو ممکن نہیں۔ اس وقت امریکہ پاکستان کی نہیں پاکستان امریکہ کی مجبوری ہے لیکن اس نکتے کو تسلیم کرنے کی ہمیں بھی ضرورت ہے کہ ہماری حکومتوں نے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگرچہ ہمیں امریکہ سے اس جنگ کے مکمل معاوضے کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔ لیکن امریکہ ہمیں امداد بھی ترسا ترسا کر بوند بوند کرکے دے رہا ہے۔ اعتماد سازی میں پاکستان سے مذید اقدامات کا مطالبہ صرف ناجائز ہی نہیں انتہائی بودا ہے اور کسی بھی ہوش مند شخص اور حکومت کو اس طرح کا مطالبہ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا چاہیئے اور پھر کوئی بھی بات کہنی چاہیئے۔ کیونکہ حکومتوں کی باتیں پوری قوم کی ترجمانی بن جایا کرتی ہیں اور اسی لیے امریکی حکومت کو انتہائی احتیاط کرنی چاہیئے اور تجزیاتی رپورٹس پیش کرتے ہوئے حقیقی تجزیہ کرنا چاہیئے۔ یہ رپورٹ بھی پچھلی رپورٹس کا تسلسل تھا چند الفاظ تبدیل کرکے اسے نئی رپورٹ کا نام دیا گیا ہے۔ جبکہ امریکہ کو چاہیئے کہ ایسے تجزیے پیش کرنے کی بجائے کچھ ایسے اقدامات کرے جو اس کے حق میں بھی بہتر ہو اور دنیا کے حق میں بھی۔

چند بوری آٹا، چینی یا کچھ ڈالر تقسیم کرنے سے امریکہ اپنے خلاف دنیا کے خیالات نہیں بدل سکتا ورنہ وہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ایسا کر چکا ہوتا جہاں وہ آٹا بھی تقسیم کر چکا ہے اور گھی چینی بھی۔ لیکن بارہ کے بچے اب بھی امریکہ کا نام اتنی ہی نفرت سے لیتے ہیں جتنا پہلے۔ امریکہ اپنا تاثر تب ہی بہتر کر سکتا ہے جب وہ قومی سطح پر پاکستان کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کرے۔ اسے اپنا اتحادی کہتا ہے تو کبھی اپنا غلام نہ سمجھے۔ بھارت کیلئے الگ اور پاکستان کیلئے الگ معیار نہ رکھے۔ وہ معاہدے بھارت سے کرے اور مطالبات پاکستان سے۔ یہ کسی بھی طرح پاکستانیوں کے دلوں سے امریکہ کی نفرت نہ نکال سکے گا۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی تو وہ کھل کر مخالفت کرتا ہے کبھی اسے طالبان کبھی القاعدہ کے خطرے میں قرار دیتا ہے۔ جبکہ بھارت کے ساتھ سول نیوکلیئر معاہدے بھی کرتا ہے اور اس کے غیر معیاری اور غیر محفوظ ایٹمی اثاثوں پر اسے کوئی اعتراض نہیں۔ بھارت کا ایٹمی سائنس دان لاپتہ ہو جائے اور اس کی لاش ملے تو کچھ نہ ہو اور خدانخواستہ اگر پاکستان میں ایسا واقعہ پیش آ جائے تو امریکہ کا پہلا الزام یہ ہو گا کہ اس سائنس دان سے طالبان نے معلومات حاصل کرکے مار ڈالا۔ جی ہاں امریکہ سے کوئی بعید نہیں۔

امریکہ اگر درست تجزیاتی رپورٹ پیش کرے تو یقیناً دنیا کے امن کی تباہی کا

واحد ذمہ دار امریکہ اور اس کے معاونین بھارت، اسرائیل اور ان کی خفیہ ایجنسیاں ہی ہونگی۔ اسے یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے ورنہ اس کو مشکلات اور شکست سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

پاک چین دوستی..... زندہ باد

چین پاکستان کا سب سے قابلِ اعتماد دوست ہے یہ صرف ایک جملہ نہیں بلکہ دونوں ملکوں کے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں سب سے زیادہ قابلِ بھروسہ رائے ہے۔ چین آنے والے وقت میں یقیناً ایک سپرپاور ہے اور اس وقت بھی دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط اقتصادی قوت ہے جو کسی معاشی بحران کا شکار نہیں ہے جیسا کہ اس وقت سپرپاور امریکہ معاشی بحران سے گزر رہا ہے۔ دنیا کی تجارت پر چین مسلسل چھاتا جا رہا ہے اور اپنی اہمیت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ چین جیسے اہم ملک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات نصف صدی سے زیادہ کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ دونوں ملکوں نے ہمیشہ اس کا حق ادا کیا ہے اور مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ چین نے اپنی مضبوط عالمی پوزیشن کی بنیاد پر جب بھی بین الاقوامی معاملات میں پاکستان کی مدد کی اس نے پاکستان کی ساکھ کو دنیا میں بہتر بنانے میں مدد دی اور چین نے کبھی پاکستان کے بارے میں نہ کسی ٹھنڈے رویے اور نہ کسی کنجوسی یا بخل کا ثبوت دیا۔ اس وقت جب پاکستان پر مغرب اور خاص کر امریکہ کی طرف سے دہشت گردی کی مکمل ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے چین کے وزیرِاعظم نے پاکستان کے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کھل کر کہا کہ دنیا کو دہشت گردی کے اصل اسباب

جاننے کی ضرورت ہے اسے کسی مذہب اور قوم سے منسلک نہ کیا جائے۔ یعنی انہوں نے پاکستان کے مؤقف کی ترجمانی کی کہ دنیا اس بارے میں ضرور جاننے کی کوشش کرے کہ پاکستان جو خود دنیا میں سب سے زیادہ دہشت گردی سے متاثر ہوا ہے اگر اس کے کچھ علاقوں میں کچھ مخصوص گروہ ایسا کر رہے ہیں تو کیوں؟ اس کے اسباب یقیناً کچھ اور ہیں اور ان اسباب کے بارے میں تو میرے سمیت ہر پاکستانی جانتا ہے اب تو اس میں کسی کو ابہام بھی نہیں کہ یہ ''اسباب'' ہماری دشمن خفیہ ایجنسیاں پیدا کر رہی
ہیں۔ ''موساد'' اور ''را'' کی مداخلت اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں بلوچستان میں تو اس کے کافی ثبوت بھی موجود ہیں اور افغانستان میں بھارت کی موجودگی بھی ہمارے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ جہاں سے بڑی آسانی سے ''را'' کے یہ دہشت گرد فاٹا میں داخل ہوتے ہیں اور پاکستان میں موجود اپنے کارندوں کی مدد سے پورے ملک میں دہشت گرد کاروائیاں کرتے ہیں۔ اس کام میں ''سی آئی اے'' اور ''را'' ان کو ہر قسم کی مدد فراہم کر رہی ہے اور پھر امریکہ جیسے دور پار کے دوست نما دشمن پاکستانیوں کو دہشت گرد قرار دے دیتے ہیں۔ انہیں دہشت گرد بھی صرف وہی لگتے ہے جو ان کے خلاف ہو۔ پاکستان میں مسلسل ہونے والے خود کش دھماکوں پر مغرب کی آنکھ بھر بھی نہیں آتی جبکہ اپنے ملک میں کسی سازش کے عملی جامہ پہننے سے پہلے پکڑے جانے والے منصوبے پر بھی وہ پاکستان پر حملہ آور ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اگر ہمارے پاس ایٹمی قوت نہ ہوتی تو یقیناً وہ ایسا کر بھی چکے ہوتے۔ یہی وہ

دوہرا معیار ہے جس کا چینی وزیرِاعظم وین جیا باؤ نے ذکر کرکے پاکستان کا مغربی اور بھارتی الزامات سے دفاع کیا اور جس طرح وہ ہمیشہ دفاعِ پاکستان میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اس نے وہی اب بھی کیا۔ پاکستان اس وقت بین الا قوامی اور قومی دونوں سطح پر شدید مشکلات سے دوچار ہے اور چین جیسے دوست کی سپورٹ اس کیلئے یقیناً انتہائی اہم ہے۔ جس طرح چین کا ہر باشندہ اور حکمران پاکستان کیلئے خیر سگالی اور محبت کے جذبات رکھتا ہے وین جیا باؤ نے اس کو مذید تقویت دی اور پاکستان سے دوستی کو اپنا عقیدہ قرار دیا اور کہا کہ یہ دوستی ہمارے خون میں شامل ہے اور ظاہر ہے عقیدہ اور خون بدلتا نہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی تقریر میں ہمیں یہ بھی یاد دلایا کہ چینی کہاوت کے مطابق (جو پاکستانی کہاوت بھی ہے) ''دور کے دوست سے نزدیک کا پڑوسی بہتر ہے'' اور حقیقت یہ ہے کہ پڑوسی اگر چین جیسا ہو تو دور کے امریکہ جیسے خود غرض اور مطلب کے دوست کے پاس جانے کی یقیناً کوئی ضرورت نہیں۔ اب تک کے پاک چین اور پاک امریکہ تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو دونوں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ امریکہ اگر ہمیں ہتھیار دیتا ہے تو صرف ہتھیار بیچتا ہے اور ٹیکنالوجی کی بات پر وہ ہمیں غبی سمجھ کر اسے ہماری سمجھ اور عقل سے بالاتر قرار دے دیتا ہے لیکن چین نے کبھی ٹیکنالوجی دینے سے انکار نہیں کیا۔ اس نے کسی میدان میں پاکستانیوں کو کند ذہن اور غبی نہ سمجھا وہ جانتا ہے کہ اس ملک کے لوگ ذہین بھی ہیں اور محنتی بھی۔ یہی وجہ ہے چینی صدر کے اس دورے کے

دوران پاکستان اور چین کے درمیان دس ارب کے تجارتی معاہدوں کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ پانچ سال میں 500 طلبا کو وظائف دیئے جائیں گے تاکہ وہ چین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ ساتھ ہی چینی وزیرِ اعظم نے کرنسی کے تبادلہ کا سلسلہ شروع کرنے کا عندیہ بھی دیا ہے اور یہ معاہدے کسی ''کیری لوگر بل'' کے تحت نہیں ہوں گے بلکہ یہ دو دوست ممالک کے درمیاں معاملات ہیں جو انشائ اللہ خوش اسلوبی سے مکمل ہو جائیں گے۔ وین جیا باؤ نے خود کہا کہ چین پاکستان سے کیے گئے تمام معاہدے پورے کرے گا اور ماضی میں بھی چین کا یہی ریکارڈ ہے کہ اس نے پاکستان سے کیے گئے معاہدے پورے کیے اور کئی انجینئرز کو جان سے ہاتھ دھونے پر بھی انہوں نے شاہراہِ ریشم مکمل کی اور بلوچستان میں ریکوڈک، سینڈک اور گوادر میں مکمل تندہی سے کام کر رہا ہے۔ اگرچہ پاکستان کے چین سے تعلقات ہمیشہ مثالی رہے چاہے حکومت کسی جماعت کی ہو اس نے چین سے تعلقات کو اولیت اور اہمیت دی۔ اب بھی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے چین کے وزیرِ اعظم کا انتہائی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن چین کے وزیرِ اعظم کی اس نصیحت پر حکومتِ پاکستان بلکہ اپوزیشن لیڈرز کو ضرور غور کرنا چاہیئے کہ دور کے دوست سے قریب کا پڑوسی بہتر ہے۔ اپنے ملک کے ماتھے سے دہشت گردی کا داغ دھونے کیلیۓ انہیں سخت رویہ اپنا کر دلیرانہ فیصلے کرنے ہونگے۔ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ نے ہمیں ساری دنیا سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے ہماری تجارت اور معیشت تباہ حالی کا شکار ہے اب اس جنگ سے

خود کو نکالیں۔ چین جیسے دوستوں سے تجارت، تعلیم اور سائنس جیسے میدانوں میں معاہدے کر لینے چاہیئے اور امریکہ جیسے دور کے دوستوں کو اپنے ساتھ برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے اور انہیں اپنی مجبوری نہیں بنا لینا چاہیئے۔

مہنگائی عوام اور حکمران

ایک میڈیا ورکشاپ میں کچھ پہنچی ہوئی شخصیات فرمارہی تھیں کہ ہم کہتے ہیں پاکستان کو اللہ نے ہر چیز سے نوازا ہے کیا ہے اِس مُلک میں نہ کھانا وافر، نہ پانی موجود۔ معدنیات کے قدرتی ذخائر ہیں تو زیرِ زمیں دفن۔ مُجھے اُن سے شدید اختلاف تھا کیونکہ واقعی پاکستان خُدا کی طرف سے ایک نوازا ہوا مُلک ہے جسے قُدرت نے ہر نعمت دی ہوئی ہے اور وافر مقدار میں دی ہوئی ہے۔اِسے استعمال میں لانا اور اِس کی منصوبہ بندی کرنا ہمارا کام ہے. قُدرت نے معدنیات دے دیں لیکن لوہا بنا کر اُسے خُدا نے نہیں داؤد (ع) نے ڈھالا، پانی کے لیے کشتی نوح (ع) نے بنائی، بیج خُدا نے بنایا تو فصل اِنسان نے بوئی اور کاٹی بھی۔ ہم بنی اسرائیل نہیں بنی اسماعیل ہیں، ہمارے لیے من و سلویٰ نہیں اُترے گا بلکہ ہم نے وادی، غیر ذی زرعہ (مکہ) کو خود آباد کیا. قُدرت کا جو کام تھا اُس نے کر دیا اَب اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے ہماری بھی کُچھ ذمہ داریاں ہیں جو ہم نے نبھانی ہیں.اِس وطن اِس مٹی کا ہم سَب پر حق ہے اور اُس کو ہم نے ادا کرنا ہے، لیکن لگتا ایسا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک حتی المقدور صرف لینے کی کوشش میں مُبتلا ہے. ہمارے منصوبہ ساز کسی خلائی مخلوق کی آمد کے مُنتظر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا انحصار آئی ایم ایف جیسے اداروں پر بڑھتا جارہا

ہے۔ زرعی مُلک ہونے کے باوجود ہم نہ صرف خوراک کی کمی کا شکار ہیں بلکہ زرعی زمین کو اَب بھی مُسلسل ٹاؤن شپس میں تبدیل کیا جا رہا ہے جسکی یقیناً حکومت سے اجازت لی جاتی ہے لیکن حکومتی منصوبہ ساز کسی فکر اور تشویش میں مُبتلا نہیں ہیں کیونکہ زرعی اجناس مہنگی ہوں یا سستی صنعتی اشیائے ضرورت کوڑیوں کے دام ملیں یا اونٹ ہاتھی کے نرخ، اقتدار کے ایوانوں میں کوئی ہلچل نہیں مچتی۔ ایسی قراردادوں کی ابتدائی طور پر اسمبلی کے فلور پر مخالفت کر کے نام کما لیا جاتا ہے لیکن پھر اپوزیشن کے امرا بھی حکومتی تجاویز کی توثیق کر کے اسکو قانون بنا دیتے ہیں اور عوام کے کندھے مہنگائی کے بوجھ سے مزید دَب جاتے ہیں۔ جو ٹیکس امرا کو دینا چاہیے ایک مزدور بھی دینے پر مجبور ہے، بجلی کا ایک بلب جلانے والا بھی ٹیکس دینے پر مجبور ہے اور گیس کو صرف کھانا بنانے کے لیے استعمال کرنے والا بھی چاہے وُہ اُسے کتنی ہی احتیاط سے استعمال کرے پھر بھی ٹیکس دیتا ہے، اگر یہ ٹیکس مُلک کی بہتری اور ترقی کے لیے استعمال ہوتا تو پھر بھی شاید عوام کو تسلی ہوتی کہ اُن کا پیسہ اُنہیں کے کام آ رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ نہ تعلیم نہ صحت کُچھ بھی سستا نہیں ہے۔ کوئی عام آدمی بیمار ہو تو گھر والوں کو سَب سے پہلے مہنگی دواؤں اور ڈاکٹر کی فکر لاحق ہو جاتی ہے لیکن اِس سے ہمارے حکمرانوں کو اِس لیے فرق نہیں پڑتا کیونکہ وُہ بخار اور کھانسی کے علاج کے لیے بھی بیرونِ مُلک جا سکتے ہیں تعلیم مہنگی ہے تو بھی اُنھیں اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ

اُن کے بچے پاکستان کی عام تعلیم حاصل کرنے کی بجائے باہر کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں. مُجھے اِس پر ہرگز اعتراض نہیں کیونکہ علم چاہے جہاں سے ملے حاصل کرنا چاہے لیکن اگر یہ سَب قابلیت کی بنُیاد پر ہوتا، کس نے کہا کہ یہ بچے سَب سے لائق سَب سے قابِل ہیں پھر بھی یہ سَب قابلِ قبول ہوتا اگر یہ حکمران قوم کے اِن بچوں کی فکر کرتے جنھوں نے اِسی مُلک میں رہنا ہے اور اِس کی خدمَت کرنی ہے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ جو کاپیاں سال دو سال پہلے دَس روپے کی تھیں آج تیس چالیس روپے تک پہنچ چکی ہیں دو روپے کی پنسل پانچ روپے کی مِل رہی ہے اور یوں وُہ بچے جِن کے والدین دو وقت کی روٹی مشکل سے پوری کرتے ہیں وُہ تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں. اُن میں سے کوئی آوارہ گردی کرتے ہیں تو کوئی چور اُچکے اور ڈاکو بَن جاتے ہیں اور جو والدین اَپنے بچوں کو ہر حال میں پڑھانا چاہتے ہیں وُہ نہ صرف اپنا پیٹ کاٹتے ہیں بلکہ بچوں کی دیگر خواہشات بھی مار دیتے ہیں کیونکہ اُنھیں اُن کی فیس جو ہر سال پچھلے سال سے بڑھ جاتی ہے ادا کرنا ہوتی ہے۔

اَب ذرا آیئے آشیائے خوردنی کی طرف جو اَب سالوں یا مہینوں میں مہنگی نہیں ہوتی بلکہ اَب ایک بار کے بعد دوسری بار بھی لینے جائیں تو قیمتیں بڑھ چکی ہوتی ہیں ابھی آپ خود کو اِن بڑھی ہوئی قیمتوں کا عادی بنانے کی کوشش میں ہوتے ہیں کہ اس اضافے پر ایک اور اضافہ کر دیا جاتا ہے.

پاکستان ایک زرعی مُلک ہے لیکن آٹا، چاول، چینی تو اپنی جگہ پیاز، ٹماٹر، لہسن اور بینگن ہی لیجیے انہیں بھی کھانا مُشکل ہوتا جارہا ہے ایسے میں غریب آدمی جائے تو کہاں جائے اور کرے تو کیا کرے۔ اَیسے میں مجرموں اور خود کش بمباروں کا پیدا ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے وُہ دال جو غریب کی خوراک سمجھی جاتی تھی آج ڈیڑھ دوسو روپے کلو ہو چکی ہے۔

ہَم پاکستان کے حالات کو دُنیا کے حالات سے علیحدہ نہیں کر سکتے، مہنگائی آج تمام دُنیا کا مسئلہ ہے اور وُہ مجموعی طور پر مہنگائی کی لپیٹ میں ہے لیکن ایک غریب مُلک ہونے کی وَجہ سے پاکستان کے عوام اِس بوجھ کو بدقت تمام اُٹھا رہے ہیں اور صُورتِ حال بگڑتَب جاتی ہے جَب آئی ایم ایف جیسے اداروں سے مدد لینے کا خمیازہ اِس مُلک کے غریب عوام کو عجیب و غریب قسم کے ٹیکسوں کی صُورت میں ادا کرنا پڑتا ہے اور حالات کو اِس نہج پر لانے میں عوام سے زیادہ حکمران طبقہ ذمہ دار ہوتا ہے جو اَپنے آرام اور آسائش پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا۔ اُن کے آگے پیچھے گاڑیوں کی فوج، شاہانہ عشائیے، قیمتی ملبوسات اور شاندار طرزِ زندگی سَب کُچھ جاری و ساری رہتا ہے۔ بیرونی دوروں پر کروڑں خرچ کر دیے جاتے ہیں اور پھر سارے اخراجات پُورے کرنے کے لیے عوام پر کوئی نیا ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔

صُورتِ حال مُشکل ضرور ہے مرض لاعلاج نہیں صرف پُر خلوص منصوبہ بندی اور اِس پرپُر خلوص عمل ہماری مُشکلات میں کمی کر سکتے ہیں اور عوام سے لیکر حکومتی سطح تک سادگی اپنانے سے ہم اَپنے بہت سارے اخراجات کو کم کر سکتے ہیں. اِس کے لیے حکومت کو پہل کرنا ہوگی نہ صرف سادگی اپنانے میں اور اخراجات کم کرنے میں بلکہ اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر مُلکی مفاد میں جُرات مندانہ نہیں بلکہ عقلمندانہ اور بہترین فیصلے کرنے ہونگے.آئی ایم ایف اور بیرونی قرضوں کو ختم کرنا ہوگا, حکمرانوں کو بھی اَپنی سرمایہ کاری پاکستان میں کرنا ہوگی, تعلیم ,صحت اور خوراک جیسے شعبوں کو خصوصی توجہ دینا ہوگی. تبھی تاریخ سے مُعافی اور ناموری کی اُمید کرنا چاہیے۔

ممبئی حملے اور امریکی عدالت

کچھ لوگ کچھ ادارے ملکوں اور قوموں کی پہچان بن جاتے ہیں اور یہ خوش قسمت ادارے اور لوگ ان قوموں کے لیے سلامتی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ پاکستان میں بھی ایسا ایک ادارہ فوج ہے جو کسی بھی صورت قومی بقا کے منافی کام نہیں کر سکتا۔ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ پامردی کے ساتھ کرتے ہوئے ہمیشہ ملک کا اور قومی مفادات کا دفاع کیا۔ ایسا ہی ایک ادارہ ''آئی ایس آئی'' بھی ہے جس نے کبھی قومی مفادات کا سودا نہیں کیا۔ دنیا کی تمام خفیہ ایجنسیوں کا اکیلے اور ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کر رہا ہے۔ جب سے دہشت گردی کے خلاف جنگ ہم پر مسلط کی گئی ہے تب سے تو اسے مزید مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے مجھے '' آئی ایس آئی'' کی صلاحیتوں پر کوئی شک نہیں بلاشبہ یہ دنیا کے جس ملک میں چاہے گڑبڑ بھی پھیلا سکتا ہے اور وہاں کے حالات سدھارنے میں بھی معاون ہو سکتا ہے۔ لیکن اس وقت ملک کو جن حالات کا سامنا ہے اس میں ''آئی ایس آئی'' کے لیے وقت نکالنا یقیناً مشکل ہے کہ وہ بھارت جیسے مکار دشمن ملک میں ممبئی حملوں جیسی لمبی کاروائی کر سکے۔ ہاں اگر وہ ایسی کوئی کاروائی کرے یا کرنا چاہے تو یقیناً ''را'' کیلئے اس کو روکنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ''آئی ایس آئی'' کا کام اپنے دشمن کی خفیہ چالوں کے خلاف اپنے ملک کا دفاع ہے۔ ''را''

یا'' سی آئی اے'' کی طرح دوسرے ملکوں کی تباہی اور ان کو فتح کرنا نہیں ممبئ حملے خود بھارت کے حکمرانوں کی بہت بڑی ناکامی تھی جسے بڑے آرام سے پاکستان کے سر منڈھ دیا گیا اور اسے '' آئی ایس آئی '' کا کارنامہ قرار دیا گیا، اگر یہ سب '' آئی ایس آئی '' نے کرنا ہوتا تو بھارت حکومت ایک ملزم یا مجرم کو بھی نہ پکڑ پاتی اور منصوبہ بھی مکمل کر دیا جاتا۔

ممبئ حملوں کے بارے میں تازہ اور بیہودہ قسم کا نیا شوشہ یہ چھوڑا گیا ہے کہ امریکہ کی ایک عدالت نے ''آئی ایس آئی'' کے افسران کے نام ایک سمن جاری کیا ہے۔ جس میں انھیں عدالت میں طلب کیا گیا ہے۔ ان افسران میں میجر سمیر علی، میجر عظیم اور '' آئی ایس آئی'' کے سابق سربراہ جنرل ندیم تاج سمیت اس کے موجودہ سربراہ لیفٹیننٹ جنرل احمد شجاع پاشا کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ممبئ حملوں کی خفت نجانے کب تک بھارت مٹاتا رہے گا اور اس کو مٹانے کے لیے کتنی نامعقول حرکتیں کرتا رہے گا اگرچہ یہ حرکت اب کی بار امریکی عدالت نے کی ہے لیکن امریکہ میں ہندو لابی نے یقیناً اسکے لیے دن رات ایک کر دیئے ہونگے۔ امریکہ کو بھی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ناکامی کے لیے بہت سارے جواز ڈھونڈنے پڑ رہے ہیں اور آج کل ہمارے حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے پاکستان ان کے لیے ایک آسان نشانہ ہے اور دنیا میں ہونے والی کوئی بھی دہشت گردی اس ملک کے سر دھر دی جاتی ہے جو خود سب سے زیادہ دہشت گردی کا شکار

ہے۔ اب تک امریکی حکومت یہ کام کر رہی تھی لیکن اب شاید امریکی عدالتوں نے بھی اپنی حکومت کی مدد کرنا شروع کر دی ہے تبھی تو اس واقعے میں ہلاک ہونے والے ایک یہودی خاندان کے لواحقین کی طرف سے .بروکلن کی ایک عدالت نے یہ احمقانہ سمن جاری کر دیا۔ ربی گیوریل، ہالٹسنبرگ اور اس کی حاملہ بیوی ریوکا کی ہلاکت اس واقعے میں ہوئی جبکہ ان کے بیٹے موشے کو اس کی بھارتی آیا نے بچا لیا تھا۔ اب اگر ایک ایک خاندان کا حساب لینا اور دینا پڑے تو پاکستانیوں کے خون کا حساب دیتے دیتے تو امریکہ بھارت اور یہودی اسرائیل کو ہزاروں حساب دینے پڑیں گے اور ''آئی ایس آئی'' کے، قابلِ فخر افسران سے پہلے ،جارج بش ،اوبامہ ، منموہن سنگھ ، سونیا گاندھی ،آنجہانی ہالبروک، مک ملن، ''سی آئی اے'' کے کئی افسران اور سربراہان اور '' را'' کے کئی سربراہوں اور کرنل سرکانت جیسے کئی بھارتی افسروں کو پاکستانی عدالتوں میں پیش ہونا پڑے گا بلکہ اس فہرست میں مغربی پاکستان میں پاکستانیوں کے قتل کی سزا میں مدتوں کی آنجہانی اندرا گاندھی اور کئی دوسروں کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔

جنرل پاشا اور ان کے ساتھیوں کا جرم تو ثابت بھی نہیں بلکہ صرف ایک الزام ہے جو ان کے ادارے پر دشمنی میں لگایا جا رہا ہے جبکہ ان شخصیات کے جرائم تو بے شمار اور ثابت شدہ ہیں۔ ڈرون حملوں کا جرم ہی دیکھیئے جو مسلسل جاری ہے۔ ہمارے تو'' آئی ایس آئی'' کے سربراہ کو بلایا گیا ہے لیکن وہاں سے تو

صدر امریکہ یہ تمام احکامات جاری کرتے ہیں لہذا انھیں تو انتہائی مطلوب قرار دے دینا چاہیئے چاہے یہ موجودہ صدر ہو یا سابقہ اور یہ دلیل انتہائی بودی ہوگی کہ یہ سب کچھ جنگ کے دوران ہو رہا ہے۔ پاکستان پر ایک انتہائی ان چاہی جنگ کا تسلط مزید بڑا جرم ہے۔ اس لیے اس جرم کی سزا زیادہ سخت ہونی چاہیے کہ ایک پر امن قوم کو جنگ کی آگ میں جھونکا گیا ہے اس کے ترقی کے عمل کو روک دیا گیا ہے بلکہ ترقی معکوس کا عمل جاری ہے۔ موجودہ املاک کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا گیا ہے۔ حکومت کے پاس ایک اچھا موقع ہے کہ وہ نقصانات کے الزالے کا مطالبہ امریکہ اور نیٹو سے کر دے۔ انسانی جانوں سے لے کر سڑکوں، پلوں اور عمارات تک کے نقصانات کا۔

اس وقت حکومت کو نہ صرف معذرت خواہانہ یا کمزور موقف نہیں اپنانا چاہیئے بلکہ اس حرکت کا مضبوط بلکہ جارحانہ جواب دینا چاہیے کہ واقعہ بھارت کا، عدالت امریکہ کی تو مدعا علیہ پاکستان کیسے اور پھر ''آئی ایس آئی'' کے چیف کو طلب کرنا خاصا توہین آمیز ہے جس پر ابھی تک تمام سیاسی لیڈروں نے قومی اتفاقِ رائے کا اظہار کیا ہے لیکن حکومت کو اس پر انتہائی سخت موقف اپنانا چاہیے۔ ''آئی ایس آئی'' کے سربراہ یا دوسرے افسران امریکی شہری نہیں لہذا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ انھیں طلب کرے اس پر اس عدالت کے جج پر ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کیا جانا چاہیئے اور وزیرِاعظم گیلانی کا

یہ کہنا کہ ہم ”آئی ایس آئی“ کے کسی افسر کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ کسی امریکی عدالت میں پیش ہوں، کافی اور مناسب نہیں، انہیں زیادہ مضبوط لہجہ اور مؤقف اپناتے ہوئے کہنا چاہیئے تھا کہ حکومت پاکستان ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ اپنے قابلِ فخر ادارے ”آئی ایس آئی“ کے سربراہ تو کیا ایک عام سے اہلکار کو بھی کسی امریکی یا غیر ملکی عدالت میں پیش ہونے دے ان کا لہجہ اتنا مظبوط ہونا چاہیے کہ آئندہ کوئی ملک یہ حرکت نہ کرے اور ایسی حرکت کرنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرے کہ جس طرح ”آئی ایس آئی“ ہر وقت اپنے ملک کی خاطر کسی بھی آگ میں کودنے کے لیے تیار رہتی ہے اس ملک کی حکومت، سیاستدان اور عوام اس ادارے کی عزت برقرار رکھنے کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں۔

بجلی کا بحران

آج کل پاکستان جن مسائل سے شدت سے دوچار ہے اور جن سے عوام شدید طور پر متاثر ہیں ان میں بجلی کا بحران انتہائی اہم ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے بلا تمیز ہر شخص پریشان ہے۔انسان نے ترقی کا بہت سارا سفر بجلی ہی کے دم سے طے کیا، زندگی کی بہت ساری سہولتوں کا عادی ہوا، ہاتھ سے ہونے والے بہت سارے کام بجلی سے ہونے لگے اب جب زیادہ تر گھروں سے ہتھ پنکھیاں اور گھڑے اٹھ چکے تو بجلی دغا دینے پر آ گئی ہے لوڈشیڈنگ نے واقعی زندگی مشکل بنادی ہے اور آسانی سے مشکل کی طرف کا یہ سفر خاصہ مشکل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی مرض لاعلاج ہو چکا یا چارہ گروں کے کچھ ہنروں کی آزمائش ابھی باقی ہے۔ جب بھی لوڈشیڈنگ بڑھتی ہے تو بیشمار حکومتی اعلانات آسرے اور سہارے بن کر قوم کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں کہ ”جلد ہی بجلی کی کمی پر قابو پا لیا جائے گا۔ یہ ڈیم بنا دیں گے وہ ڈیم بنا دیں گے بجلی کی کمی عارضی ہے ختم ہو جائے گی“۔اور یہی سنتے سنتے ایک زیادہ شدید بحران آ جاتا ہے، اور عوام پھر چیخ اٹھتی ہے۔

کیا واقعی بجلی کا یہ بحران لاعلاج ہے اور کیا واقعی ہم اپنی ملکی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں یا ایسا ہے کہ ہم وسائل اور ذرائع رکھتے ہیں لیکن

منصوبہ بندی نہیں کرتے اور یا عمل کا فقدان ہے۔اعداد وشمار تو جو ہیں سو ہیں یہ درست ہے کہ ہماری بجلی کی زیادہ کھپت گھریلو سطح پر ہے لیکن بہتری کی کسی کوشش کے بغیر اگر گھریلو صارفین سے کہا جائے کہ ''ایک بلب بجھا دیجئے'' تو کیا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ بھی اچھا ہے لیکن چاہے ہم دو بلب بھی بجھا دیں تو جب تک نئی بجلی نہیں بنے گی ضروریات پوری نہیں ہو سکیں گی۔اور نئی بجلی بنانے کے لیے حکومت کو ایک سے زیادہ ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنا ہوگا۔ کالاباغ ڈیم کو اگر اس مسئلے کا واحد حل قرار دیا جائے تو قومی اتفاق رائے پیدا ہونے میں نجانے کتنے سال لگیں اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے اگر یہ ڈیم نہ بنایا تو ہم اگلا قدم نہ اٹھا سکیں گے بجائے رک جانے کے چلتے رہنا ہمارے لیے زیادہ سود مند ہے۔ہمیں مزید ایسے مقامات تلاش کرنا ہونگے جہاں ڈیم بنائے جا سکیں بجائے بہت بڑے منصوبے بنائے جائیں اگر بجلی علاقائی سطح پر فراہم کی جائے تو یوں دور دراز تک لائن بچھانے کے اخراجات اور نقصانات میں خاطر خواہ کمی کی جاسکے گی اور بڑے منصوبے میں خرابی کی صورت میں ملکی سطح پر مکمل بریک ڈاؤن سے محفوظ رکھا جاسکے گا۔یہی وجہ ہے کہ کئی ممالک میں بجلی چھوٹے ڈیمز اور منصوبوں کے ذریعے پیدا کی جارہی ہے ہم اپنے شمالی علاقوں میں بلند آبشاروں اور تندو تیز دریاؤں کو اس مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ چھوٹے منصوبوں سے گھریلو ضروریات مقامی سطح پر پوری ہونے سے مرکزی نظام میں بجلی کی بچت ہوگی جسے صنعتی منصوبوں یا

نزدیکی بڑے شہروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکے گا۔

کوئلہ بھی بجلی پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور پاکستان میں کوئلے کے بہت بڑے ذخائر موجود ہیں جس کو توانائی کے حصول کے لیے بھی استعمال کیا جارہا ہے اور بجلی کی پیداوار کے لیے بھی لیکن بجلی کی شدید کمی پر قابو پانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تھرمل پاور سٹیشنز کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ کوئلے سے بجلی کی پیداوار مزید بڑھ سکے اور خاص کر ان علاقوں میں ایسا کیا جائے جہاں کوئلہ موجود ہے تاکہ نزدیکی علاقوں کو بجلی پہنچائی جاسکے۔ سندھ اور بلوچستان کے وہ علاقے جہاں کوئلہ وافر مقدار میں موجود ہے میں تھرمل پاور سٹیشن لگائے جائیں۔ ہمیں بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے ہر طریقہ استعمال کرنا ہوگا تاکہ بجلی کی کمی کے باعث ملکی صنعت جس نقصان سے دوچار ہے اس سے بچا جاسکے۔

عالمی سطح پر ایک ذریعہ جسے بجلی کی پیداوار میں اہمیت حاصل ہو رہی ہے، وہ ہے ہوا۔ پاکستان کے ساحلی علاقوں میں مسلسل ہوا چلتی رہتی ہے یہ پٹی ایک ہزار کلومیٹر سے زیادہ لمبی ہے اس میں سندھ اور بلوچستان کے علاقے شامل ہیں۔ سندھ کے ڈھائی سو کلومیٹر علاقے میں فی کلومیٹر 100-150 اور بلوچستان کے تقریباً آٹھ سو کلومیٹر کے علاقے میں فی کلومیٹر آبادی 10-50 افراد پر

مشتمل ہے۔ان علاقوں میں آبادی کچھ اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ یہاں تک بجلی کے مرکزی نظام سے بجلی پہنچانا نہ صرف مہنگا بلکہ انتہائی مشکل کام بھی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کے عوام اب بھی آج کی دنیا سے صدیوں پیچھے ہیں۔ان علاقوں کی گھریلو بجلی کی ضروریات کا تخمینہ تقریباً 250 KW ہے جو کہ یہاں مسلسل چلنے والی ہوا سے بخوبی پوری کی جاسکتی ہے۔اس علاقے کے اپنے ذرائع سے ہی انہیں بجلی فراہم کرکے انکی قسمت بدلی جاسکتی ہے۔

شمسی توانائی اگرچہ مہنگا طریقہ ہے تاہم اسے بھی بجلی کی پیداوار کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک بار خرچے کے بعد یہ توانائی آپ مفت اور بے اندازہ حاصل کر سکتے ہیں۔راولپنڈی کا رومی پارک شمسی توانائی کی ایک مثال ہے دوسری مثال حال ہی میں پاک فوج کا سوات میں تقریباً ایک ہزار گھروں سے زیادہ کو شمسی توانائی سے روشن کرنا اور والی بال اور فٹ بال گراؤنڈ میں بجلی مہیا کرنا ہے اسی طرح سیاچین میں کمبائنڈ ملٹری ہسپتال بھی شمسی توانائی سے کام کر رہا ہے لیکن ضرورت اس کے دائرہ کار کو وسیع کرنے کی ہے۔

یہ تو وہ ذرائع تھے جن کے ذریعے ہم بجلی کی پیداوار بڑھا سکتے ہیں لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ ہمیں بجلی کے استعمال میں کفایت کی عادت بھی ڈالنی

ہو گی۔ گھڑی کو آگے پیچھے کرنے کا تجربہ بھی ہم کر چکے ہیں اور یہ کچھ زیادہ کامیاب نہ تھا بازار سرشام بند کرنے کے حکم نامے بھی کئی بار جاری ہوئے لیکن عمل کہیں نظر نہ آیا۔ بات یہ ہے کہ کاروبار جلد بند کرنے سے کاروباری سرگرمیوں کو نقصان زیادہ پہنچتا ہے بجلی کی بچت کم ہوتی ہے کیونکہ شدید گرمیوں میں لوگ شام کو ہی بازار جا سکتے ہیں ریسٹورنٹ وغیرہ شام کو ہی چلتے ہیں یعنی زیادہ تر کاروباری سرگرمیاں سورج ڈھلنے کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ دکانوں، مارکیٹوں اور ریسٹورنٹس میں ایک ہی رو میں لگے ہوئے بے شمار بلب بند کروا دیئے جائیں اور دکان کے سائز کے مطابق کم سے کم بلب لگانے کی اجازت ہو۔ اگرچہ بجلی کا کمرشل استعمال کل استعمال کا 7.2 فیصد ہے لیکن اس وقت ہمیں کم سے کم بجلی کی بھی ضرورت ہے تاکہ صنعتی اور ترقیاتی سرگرمیاں متاثر نہ ہوں۔ سٹریٹ لائٹس ترقی کی نشانی ہے لیکن اگر اِنہیں بھی ضرورت کے مطابق کر دیا جائے تو اِن پر خرچ ہونے والی 0.5 فیصد بجلی میں مزید بچت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح رات کی تقریبات، عشائیوں وغیرہ میں روشنیوں کا جو سیلاب نظر آتا ہے اسے کنٹرول کیا جائے۔ ایئر کنڈیشن نہ چلانے کا فیصلہ قابل تحسین ہے کہ ایک تو بجلی کی بچت ہو گی دوسرا ماحول میں FC C گیسوں کا اخراج کم ہو گا تاہم اس فیصلے پر سختی سے عملدرآمد کروانے کی ضرورت ہے کیونکہ صرف احکامات اور اعلانات سے بات نہیں بنتی اس کے لیے اعلیٰ ترین سطح پر حکام کو مثال بننا پڑے گا۔

بجلی چوری ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے جس پر قابو پا کر شاید ہم بجلی کی بچت کے ساتھ ساتھ بجلی کی قیمتوں میں کمی بھی لا سکیں۔ شہروں کے ساتھ ساتھ دیہات میں وسیع پیمانے پر بجلی چوری کی جاتی ہے اور بہت معمولی رقم کے عوض میٹر ریڈرز اس چوری کو نظر انداز" کر دیتے ہیں اور بہت ہی معمولی بل سے ایک ہی گھر میں تین چار" ایئر کنڈیشنر چلتے رہتے ہیں جس کا خمیازہ "ایماندار" صارفین کو بہت بڑے بل کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔

بجلی کے لئے منصوبے لگانے کے لیے اگر پرائیوٹ سیکٹر کی مدد ضروری ہی ہے تو پاکستانی سرمایہ کاروں کو ترجیح دی جائے اور خاص کر ان لوگوں کو جن کی شہرت اچھی ہے اگر ہم نے اپنی تمام صنعت غیر ملکیوں کے حوالے کر دی تو کیا ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنی دولت اور سرمایے میں اضافے کی بجائے ہماری ترقی کے لیے کام کریں گے۔ کراچی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ غیر ملکی کمپنی نے (KESC) الیکٹرسٹی سپلائی کارپوریشن اس کے ساتھ کیا کیا اور کراچی کو اپنی تاریخ کے بجلی کے بدترین بحران سے گزرنا پڑا اور پڑ رہا ہے۔ ہمیں اپنی تجارت بھی خود کرنی ہوگی اور وسائل اور مسائل کے مطابق تحقیق بھی خود کرنی ہوگی کہ ہم اپنے ذرائع میں کیسے اضافہ کر سکتے ہیں اور ہر شخص کو اپنا حصہ اس طرح اور اس سوچ کے ساتھ ڈالنا ہے کہ اِس یا کسی بھی قومی مشن میں صرف اس نے

حصہ نہ ڈالا تو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہنے کا گناہ اس کے سر ہو گا پھر نہ تو کوئی قوم اور نہ ہی کوئی شخص ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکے گا۔

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں

ملکِ عزیز اس وقت کئی مسائل کا شکار ہے کچھ تو غیروں کے مسلط کردہ کچھ اپنوں کی بے اعتنائی اور خود غرضی۔ غیر تو غیر ہیں انہیں ہم سے کیا دلچسپی اور دشمن تو دشمن ہیں ان کے حق میں تو یہی بہتر ہے کہ ہمارے ملک میں افراتفری ہو، بے چینی اور بدامنی ہو، آپس میں ناچاقیاں ہوں اور سب باہم دست و گریباں ہوں اور اسی میں ملک معاشی بدحالی اور بین الاقوامی بدنامی کا شکار ہوتا رہے اور دنیا میں اپنا وقار کھوتا رہے۔ لیکن دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سارے کام ہم خود کر رہے ہیں کبھی ادارے آپس میں الجھ کر جگ ہنسائی کر رہے ہیں اور کبھی شخصیات اور بڑی معذرت کے ساتھ کہ ہمارے سیاستدان بجائے اس کہ سیاست ملک کی بہتری کیلئے کریں ان کا مرکز و محور ان کی اپنی ذات ہوتی ہے جہاں ان کی ذات یا مقام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی ظاہر ہو وہ فوراً سے پیشتر ایسے اقدامات کرنے شروع کر دیتے ہیں جو صرف ان کی ذات کیلئے بہتر ہوتے ہیں۔ تب نہ انہیں جمہوریت کی فکر اور پروا ہوتی ہے اور نہ عوام اور قوم کی۔ وہ عوام جن سے ووٹ لینے کی خاطر یہ سیاستدان ان کے دروازے پر جا کر فلاحی اور ترقیاتی کاموں کے وعدے کرتے ہیں۔

آج جبکہ پھر ہمارے ملک کو ٹھوس اقدامات، مثبت خیالات، اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے ہمارے سیاستدان پھر سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف ہیں اور یہ اب کی ہی بات نہیں بلکہ ہمیشہ ہی یہ اتحاد بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ان سیاسی اتحادوں میں کھیل خیالات کا نہیں بلکہ مفادات کا ہے اور اگر یہ مفادات ملکی اور قومی ہوتے تو اس سے بہتر بات نہ ہوتی لیکن دکھ یہ ہے کہ یہ سب کچھ ذاتی دلچسپی، بہتری اور مفاد کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس سب کچھ کو یہ ایک جملہ کہہ کر جائز قرار دے دیا جاتا ہے کہ سیاست میں کل کے مخالفین آج کے دوست اور آج کے دوست کل کے مخالفین ہوتے ہیں۔ ایسے ہی چند اور جملے یہ سیاستدان اپنی مدح سرائی کیلئے بولتے رہتے ہیں مثلاً جمہوریت بہترین انتقام ہے یا جمہوریت عوام کی حکومت عوام کیلئے ہے۔ بلا شبہ یہ سارے خوبصورت جذبات و احساسات ہیں لیکن اگر ان میں صدق و خلوص شامل ہو۔ لیکن خلوص ہی وہ جنس ہے جس کی کارزارِ سیاست میں شدید کمی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آئے روز اہلِ سیاست کی وفاداریاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے پر نازیبا الفاظ اور جملے کسے جاتے ہیں۔ گالم گلوچ کو ایک دوسرے کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے اور یہ لیڈر تو ایک دوسرے کے خلاف بول لیتے ہیں سوچے بغیر یا ہو سکتا ہے مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ اور پھر دو گروہوں میں چپقلش کا آغاز ہو جاتا ہے جو ہوتے ہوتے ایک فساد کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر وہ کچھ ہوتا ہے جو اکثر کراچی میں ہو جاتا ہے۔

ذوق نے درست کہا تھا کہ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے۔ یہی حال سیاست کا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک میں بے شمار طبقہ ہائے فکر و خیال موجود ہیں اور نہ صرف ان کی تسلی کیلئے بلکہ ان کی فکر کو کارآمد بنانے کیلئے مختلف سیاسی جماعتوں کا وجود ناگزیر ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں کی سیاسی تربیت ضروری ہے۔ قوم کو اس وقت عملی اور مفید اقدامات کی ضرورت ہے۔ صرف نعروں کی سیاست نہ ان کا پیٹ بھر سکتی ہے اور نہ ہی جمہوریت ان کو ضروریاتِ زندگی دے سکتی ہے۔ اب تک جبکہ جمہوریت کے دعویدار مسلسل جمہوریت کو عوام کی ضرورت قرار دے رہے ہیں مجھے بھی اس رائے سے سو فیصد اتفاق ہے لیکن عملاً ایسا ہو نہیں رہا کیونکہ نظر ایسا آتا ہے کہ جمہوریت عوام سے زیادہ ہمارے محترم سیاستدانوں کی ضرورت ہے۔ ان کے لمبے لمبے حفاظتی قافلے ان کی پرآسائش زندگی اور رہن سہن صرف تبھی ممکن ہے جب سیاست اور جمہوریت کے نام پر ان کی حکومت چلتی رہے اور وہ پروٹوکول کے نام پر عوام کے وسائل کو استعمال میں لاتے رہیں۔

نہ تو میں جمہوریت کے خلاف ہوں نہ سیاست کے لیکن اگر یہ سب کچھ موجودہ طور طریقے پر چلتا رہا تو ملک جو پہلے ہی مشکلات کا شکار ہے اس کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوگا کسی بہتری کی کوئی امید نہیں ہو سکتی بلکہ عوام کے مسائل جو

پہلے ہی بے شمار ہیں میں مزید اضافہ ہی ہوگا کیونکہ جتنا سیاسی عدم استحکام ہوگا اتنی ہی معیشت ابتری کا شکار ہوگی اور یوں وہ عوام جو ان سیاستدانوں کو اس امید پر ووٹ دیتے ہیں کہ وہ ان کے مسائل حل کریں گے نا امیدی کا شکار ہو رہے ہیں سیاسی اور فوجی حکومتوں کو مسلسل اور باری باری آزمانے کے بعد عوام کو کسی ایسی تبدیلی کا انتظار ہے جہاں چہروں کی تبدیلی نہ ہو بلکہ نظام بدلا جائے اور وہ بھی وہ تبدیلی نظام نہ ہو جس کا نعرہ ہر انتخابات کے موقع پر ہر سیاسی جماعت لگاتی ہے اور جب وہ حکومت میں آتی ہے تو صرف اپنے ذاتی حالات کی تبدیلی پر زور دیتی ہے اور وزارتیں اور مشاورتیں حاصل کر لینا ہی سیاست کی معراج سمجھ لیا جاتا ہے اور عوامی مسائل جوں کے توں رہتے ہیں اور طرہ یہ کہ سیاسی جماعتیں ملک بچانے سے زیادہ جمہوریت بچانے کی باتیں کرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ بلا شبہ جمہوریت کو بچانا بھی ضروری ہے تاکہ عالمی برادری میں ساکھ برقرار رہے لیکن ہر روز کی جوڑ توڑ اب عوام کیلئے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اب کی بار واقعی نظام بدلا جائے ورنہ پھر یہی سیاستدان یہ گلہ کرتے ہیں کہ فوجی جرنیل اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ موقع خود سیاستدان فراہم کرتے ہیں۔

سیاستدانوں کو سوچ لینا چاہیے کہ وہ حالات کو کس طرح اس نہج پر لے جانے سے

بچا سکتے ہیں جہاں بات کسی مارشل لا تک نہ پہنچ سکے اور یہ تبھی ممکن ہے کہ جمہوریت اور آمریت میں عوام کے حالات مختلف رہیں لیکن جمہوری ادوار حکومت میں نہ تو بے روزگاری میں کمی ہوتی ہے نہ ہی عوام کو ضروریاتِ زندگی وافر مہیا ہیں نہ ہی تعلیم اور صحت کے مسائل حل ہوتے ہیں۔ مہنگائی آمریت کے دور سے کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ افراطِ زر میں کسی کمی کا کوئی امکان نہیں۔ دہشت گرد حملوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا بلکہ موجودہ جمہوری دور میں تو کبھی کبھار ہونے والے ڈرون حملے روزمرّہ کا معمول بن گئے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ حکومت ان پر رسمی احتجاج بھی نہیں کر رہی۔

جمہوریت اور آمریت میں سب سے بڑا فرق فردِ واحد کے فیصلوں اور مشاورت کے فیصلوں کا ہے لیکن ہمارے ملک میں جمہوری ادوار میں بھی فیصلہ ایک ہی شخص کا ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں میں خود جمہوریت نہیں لیڈری نسل در نسل چل رہی ہے اس کا صلاحیت سے دور دور کا واسطہ نہیں اگر ایسا ہو تو یہ سوائے خوش قسمتی کے کچھ نہیں۔ جمہوریت یقیناً ایک بہترین طرزِ حکومت ہے لیکن اگر اس میں عوام کے مسائل حل ہوں انہیں نوکریاں ملیں تاکہ وہ دہشت گردوں کی فوج میں شامل ہو کر روزگار نہ حاصل کریں۔ مہنگائی نہ ہو بلکہ ضروریاتِ زندگی کا حصول آسان ہو اور عدلیہ کے فیصلوں کا احترام کیا جائے۔ کیونکہ سیاستدان اس سب کچھ کیلئے فارغ نہیں اتحاد بنانے اور بگاڑنے میں اپنی توانائی صرف کرنے

کے بعد وہ اتنا تھک چکتے ہیں کہ وہ ان سارے مسائل پر توجہ نہیں دے پاتے لیکن اب انہیں سوچ لینا چاہیے کہ ملکی تاریخ میں انہیں اپنا نام کس طرح لکھوانا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تاریخ واقعی بڑی بے رحم ہے سیاسی ناقدین کا قلم تو شاید ان جرائم پر پردہ ڈال دے لیکن کسی بے باک مؤرخ کا قلم ان تمام جرائم کو ریکارڈ کرکے منظرِ عام پر ضرور لائے گا اور آنے والی نسلیں ان کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

میڈیا ہماری نظریاتی سرحدوں کا محافظ

آج کی دنیا ایک چھوٹا سا گاؤں بن چکی ہے جہاں ہر ایک ہر وقت دوسرے سے باخبر ہے۔ اسی باخبری کی وجہ سے ہی ہر ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔ اقوام، اقوام کے سامنے فوری جوابدہ ہیں تو حکومتیں عوام کے سامنے یوں کسی کو پہلے کی طرح کھل کھیلنے کا موقع کم ملتا ہے۔ ہر ایک پر میڈیا کے کیمرے کی آنکھ مرکوز ہے اور اچھی بات تو یہ ہے کہ یہ زد سب کے لیے برابر ہے۔ اب کسی ملک کی خبر نا ممکن نہیں اور کسی معاشرے کا کلچر اجنبی نہیں رہا کہ ظاہر ہے الیکٹرانک میڈیا پلک جھپکنے سے پہلے جہاں خبر آپ تک پہنچا دیتا ہے وہیں معاشروں کے اندر کے حالات اور رہن سہن سے بھی آپ کو خبردار کر دیتا ہے۔ لیکن اس ہماہمی میں جو ایک کام بہت مشکل ہے وہ ہے کسی ملک کے لیے اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت۔ یہ سرحدیں آپس میں کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئیں ہیں کہ نظریوں اور ثقافتوں کی تمیز مشکل ہو گئی ہے۔ میڈیا ایک ایسا طاقتور ذریعہ ہے کہ جس نظریے کو ابھارنا چاہے ابھار دے اور جس کو دبانا چاہے دبا دے اسے میڈیا کی خوش قسمتی سے زیادہ اس کی ذمہ داری گردانا جائے تو زیادہ موزوں ہو گا کیونکہ آج ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں وہاں اس ملک کے ہر فرد کو بطور فرد لیکن سب سے بڑھ کر ہر ادارے کو بطور ادارہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا ہے اور اس عزم سے نبھانا ہے کہ تاریخ کا

دھارا موڑا جا سکے۔ اور میڈیا کی یہ ذمہ داری اس لیے زیادہ ہے کہ اُس نے تاریخ بنانی بھی ہے اور تاریخ کا ریکارڈ بھی رکھنا ہے۔ اُسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے افواج پاکستان کو ذمہ داری سونپی گئی ہے تو نظریاتی سرحدوں اور نظریہ پاکستان کی حفاظت میڈیا اور افواج پاکستان کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ جس طرح فوج ان ذمہ داریوں کا حلف اٹھاتی ہے میڈیا کو بھی حلفیہ اس کو قبول کرنا چاہیئے۔ لیکن دکھ اُس وقت ہوتا ہے جب ہم ایسا کوئی منظر اپنے ٹیلی وژن سکرین پر نہیں دیکھ پاتے۔ ہمارے نیوز چینلز آج کل کے پسندیدہ ترین چینلز ہیں۔ لیکن اِن چینلز سے کبھی کبھی انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا جاتا ہے اور ''صحافتی جرات'' کی آڑ لے کر قومی اداروں کو خوامخواہ کی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کافی عرصہ تک یہ کھیل افواج پاکستان کے ساتھ کھیلا گیا اور صرف ایک شخص جس کو سیاستدانوں نے صدر منتخب کیا تھا کسی فوجی سپاہی یا افسر نے نہیں اُس کے تمام اعمال اور تمام فیصلوں کا ذمہ دار فوج کو ٹھہرایا گیا اور اس بات کو عوام کے ذہنوں میں اس طرح راسخ کیا گیا کہ ابھی تک اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ دو چار دن پہلے ایک انتہائی پڑھے لکھے صاحب سے ملاقات ہوئی تو موصوف نے فوج پر کچھ اس طرح تنقید کی اور اس لہجے میں کی جیسے وہ کسی دشمن ملک کی فوج کا ذکر کر رہے ہوں۔ اور ساتھ ہی انہوں نے میڈیا کا حوالہ دیا۔ اگر میڈیا ایک پڑھے لکھے شخص کے ذہن کو اس طرح ڈھال سکتا ہے تو ایک اَن پڑھ آدمی کے

معاملے میں تو اُسے کسی مشکل کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑے گا۔ اگر تفریحی چینلز کو لیا جائے تو انہیں تو دل کسی طرح بھی اپنا ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا ایسے ایسے مناظر نظر آتے ہیں الامان الحفیظ۔ غیر ملکی چینلوں سے مقابلے کے نام پر ہم نے اپنی ثقافت اور کلچر کو مار دیا ہے اب صرف دفن کرنا باقی ہے یعنی نہ کہانی ہماری نہ معاشرت نہ لباس نہ خیالات اور اگر ذرا اشتہارات پر نظر پڑے تو پھر تو کوئی اور ہی دنیا نظر آتی ہے۔ایک موبائل فونز کے اشتہارات کو لیجیے اور سوچیئے کہ وہ کیا بتانا چاہتے ہیں موبائل فون یا کوئی اور تعلیم۔ اور میوزک چینل پر تو نظر نہ ہی پڑے تو اچھا ہے۔

میرا یہ سب کچھ کہنے کا مقصد میڈیا کو برا بھلا کہنا ہرگز نہیں لیکن مجھے ہی کیا اس قوم کو میڈیا سے بہت سی امیدیں ہیں بلکہ ہر طرف پھیلی ہوئی مفاد پرستی اور خود غرضی میں یہی میڈیا ہی امید بن کر سامنے آتا ہے کہ یہی وہ محاذ ہے جہاں سے ہم اپنی نظریاتی جنگ لڑ سکتے ہیں اور یہاں سے وہ کچھ آنا چاہیے جو کہ اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کی ضرورت ہے جدیدیت بری نہیں ہے لیکن نظریہ حیات کی قیمت پر نہیں۔ قوم کو شعور وآگہی دیں انہیں اپنی قوم دکھائیں۔۔بڑے بڑے شاہانہ گھر، طرز زندگی، لباس کی ضرورت پوری نہ کرنے والے لباس یہ سب کچھ معاشرے میں فرسٹریشن کو فروغ دے رہے ہیں اور مقابلے کی دوڑ

کا باعث بن رہا ہے۔ قناعت پسندی کی بجائے ہل من مزید کی ایک وجہ یہ سب بھی ہے۔آج کی نسل گود مادر اور درسگاہوں سے زیادہ اس میڈیا سے متاثر ہوتی ہے اسلیئے احتیاط انتہائی ضروری ہوجاتی ہے۔

حقائق صرف سیاسی نہیں سماجی بھی ہوتے ہیں انہیں بھی سامنے لانا انتہائی ضروری ہے۔ معاشرتی حقائق کو سامنے لانا زیادہ مشکل ہے انہیں سامنے لایا جائے اور پھر اس ذریعے کو محاذ اور درس گاہ بنا کر قوم کی تقدیر بدلنے کا کام لیا جائے۔

آزادی صحافت کو آزادی صحافت کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر کیا جائے اور میڈیا ایک مشینری جذبے کے تحت سپاہیانہ اور مجاہدانہ جذبے سے ملکی مسائل کے خلاف سینہ سپر ہوجائے۔اگر ہم نے اپنی نظریاتی سرحدیں خالی چھوڑ دیں تو اگر جغرافیائی اکائی کے طور پر ملک محفوظ بھی رہے تو ہم اپنا ملی تشخص کھودینگے۔اس ملک کی حفاظت ہمیں ہر محاذ پر کرنی ہے اور نظریہ پاکستان کو بحیرہ عرب یا بحر ہند میں غرق ہونے سے بچانا ہے اور اس تحفظ کی ذمہ داری میڈیا کو قبول کرنا ہوگی۔ محاذ کوئی بھی آسان نہیں ہوتا اور نظریاتی محاذ تو اہم ترین ہے۔ میڈیا کو یہ محاذ سنبھالنا پڑے گا اور اسے جتنی بھی مخالفت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے بین الاقوامی معیار سے بڑھ کر قومی معیار اور

مفاد کو مد نظر رکھنا ہوگا قومی تشخص کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی ہوگی قومی اداروں کی مضبوطی کے لیے انتہائی ایمانداری اور غیر جانبداری سے کام کرنا ہوگا اور قوم کو detrack ہونے سے بچانا ہوگا۔

یقین پیدا کر۔۔۔ مغلوبِ گماں تو ہے

کیا پاکستان ایک کمزور ملک ہے اگر کہا جائے ہاں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایٹمی قوت کمزور ہو اور اگر کہا جائے نہیں تو پھر کیوں ہم حملہ آور قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔کیا یہ ہماری کم ہمتی ہے یا مجبوری۔ایک طرف تو ہم خود کو بڑے فخر سے ایٹمی قوت کے طور پر متعارف کراتے ہیں اور امریکہ کی غلامی سے آزاد قرار دیتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ بس کبھی کبھار میزائیل حملوں پر احتجاجی بیان جاری کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے دفاع کا عظیم فریضہ ادا کر دیا ہے۔مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ آج کے دور میں صرف جذبہ ہی نہیں جدید ٹیکنالوجی بھی انتہائی ضروری ہے لیکن اگر ٹیکنالوجی ہو اور اسے چلانے والے ہاتھ کانپتے ہوں تو کیا نشانہ درست لگے گا۔ہم نے ہر حال میں حالات اور حملوں کا مقابلہ کرنا ہے اور اپنی آزادی برقرار رکھنی ہے۔ ہمارے عوام اس کے لیے تیار ہیں اور ہماری فوج اور دوسرے حساس ادارے تو ہر وقت مستعد اور قوم کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے ہمہ وقت سینہ تان کر کھڑے ہیں اور عسکری قیادت بھی پر عزم ہے لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ ہماری سیاسی قیادت کو بھی معاملہ فہمی کا ثبوت دینا ہوگا اور ہر صورت میں قوم کا مورال بلند رکھنا ہوگا اور ایسے بیانات دینے سے گریز کرنا ہوگا جو قوم کی حوصلہ شکنی کا باعث بنتے ہوں۔یہ

بالکل درست ہے کہ ہمارے پاس امریکہ جیسے جدید ہتھیار نہیں ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کہ امریکی فوجیوں اور عوام کے پاس وہ حوصلہ نہیں جو ہمارے پاس ہے۔اس بات کا یقین رکھنا چاہئیے کہ بندوق سے اہم وہ مضبوط ہاتھ ہیں جو اسے چلاتے ہیں یہ بھی بات ذہن میں رہے کہ قومیں اپنی تقدیر خود بناتی ہیں اور ان کی رہنمائی ان کے لیڈر کرتے ہیں۔اگر لیڈر اہم نہ ہوتے تو کیا برصغیر پاک وہند کے بکھرے ہوئے مسلمان خود ہی آزادی حاصل کر لیتے اور انہیں قائدا عظم کی رہنمائی کی ضرورت ہی نہ تھی مگر یہ اُس لیڈر کی عظمت تھی اور اُس کی رہنمائی کی برکت تھی کہ بکھرے ہوئے دانے ایک لڑی میں پروئے گئے اور ایک تسبیح وجود میں آئی لیکن آج نہ ہی وہ عزم ہے نہ ہی وہ رویے کہ قوم کو بحیثیت قوم خود پر فخر کروایا جائے جبکہ اس قوم کو یہ احساس دلانا مشکل بھی نہیں کیونکہ یہ پر عزم لوگوں کا ملک ہے جو اپنی تاریخ اور روایات کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ یہ بے حوصلہ بھی نہیں۔اس ملک کے پاس حوصلہ اور ہمت بھی ہے اور اپنی حفاظت کا کچھ ہی سہی سامان بھی ہے اور خدا کا شکر ہے ایک بہترین تربیت یافتہ اور پر عزم فوج بھی اس کو بے وقار کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔آرمی چیف نے اپنے رویے اور اپنے فیصلوں سے خود کو ایک بہترین محب وطن اور بہادر سپاہی کے طور پر منوایا ہے۔اگر وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ قوم کو پاک فوج پر مکمل اعتماد اور بھروسہ ہے تو حقیقت یہی ہے اور اب تو خدا کا شکر ہے قوم کا فوج پر اعتماد

بحال ہو رہا ہے اور ماضی کی تلخ خلیج اب ختم ہوتی نظر آ رہی ہے جو صرف ایک شخص کے فیصلوں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اگر آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو قوم کے حوصلے پست کرنے کی بجائے انہیں بلند کرنے کی ضرورت ہے جس میں سب سے بڑا کردار ہمارے قائدین اور پھر میڈیا کا ہے کیونکہ یہ عام لوگوں پر اپنا سب سے زیادہ تاثر چھوڑتے ہیں۔ اور اگر یہ قائدین حکومت کا حصہ ہوں تب تو اُن کی بات کو سند کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ اس قوم کو آزمائش میں ڈالا جائے لیکن اگر ایسا ہوا تو باوجود اس کے کہ ہمارے پاس تیس ہزار کی بلندی پر اڑنے والے ڈرون نہیں ہیں لیکن حوصلہ اور ہمت بے تحاشہ ہے۔ ہمارے جذبہ ایمانی کا کوئی اندازہ نہیں جسے کئی بار آزمایا بھی گیا اور ہمیشہ اس کے نتائج نے پاکستان کے خوددار عوام کی عزت کو ساری دنیا میں بلند ہی کیا ہے۔ اور اب بھی خدانخواستہ وقت پڑنے پر ہم اپنے دفاع کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں لیکن حکومتی سطح پر بھی اسی حوصلے کی ضرورت ہے اور احساس کمتری سے نکل کر اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے سے ہم دنیا کی بڑی طاقتوں کا مقابلہ بھی بخوبی کر سکتے ہیں اس لیے عوام کو بے حوصلہ کرنے کی بجائے ہمارے حکمران اپنا حوصلہ بھی قائم رکھیں اور عوام کا یقین بھی متزلزل نہ کریں۔

سانحہ سمجھوتہ ایکسپریس اور بھارت سرکار

امن یقیناً اس وقت دنیا کی سب سے بڑی خواہش ہے کیونکہ یہی جنس اس وقت دنیا میں سب سے کمیاب ہے۔ دنیا دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے اور غیر مسلم دنیا بڑی دیدہ دلیری سے اسلام اور دہشت گردی کو آپس میں جوڑنے پر مصر ہے۔ ہر دھماکہ، ہر ظلم اور جبر مسلمانوں کے سر منڈھ دیا جاتا ہے اور پھر بطور سزا مسلمانوں کے خلاف سخت ترین اقدامات کیے جاتے ہیں۔ لیکن جب یہی واقعات مسلمانوں کے خلاف ہوتے ہیں تو ان سے آنکھیں چرا لی جاتی ہیں بلکہ کسی سزا کا مطالبہ بھی یا تو ہوتا نہیں ہے یا اگر ہو تو بھی انتہائی کمزور۔

فروری 2007 میں ایک ہولناک واقعہ جسے دنیا کو ہلا دینا چاہیے تھا ہوا اور بس کچھ ہی دن بعد دنیا کے حافظے سے محو ہو گیا۔ سمجھوتہ ٹرین جسے پاکستان اور بھارت کے درمیان چلایا گیا کہ دونوں ممالک میں مقیم خاندانوں کے افراد آپس میں سہولت کے ساتھ مل سکیں۔ ان ٹرینوں کی حفاظت کیلئے دونوں ممالک اپنے اپنے ملک میں ذمہ دار ہیں۔ لیکن 19 فروری 2007 کو بھارت سے پاکستان آنے والی سمجھوتہ ایکسپریس کی حفاظت جس طرح بھارت حکومت نے کی وہ اس کیلئے انتہائی شرم کا مقام ہے۔ جب اس ٹرین کو پانی پت کے نزدیک دیوانہ گاؤں میں دہشت

گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن بھارت نے اس پر کسی خاص شرمندگی کا اظہار نہیں کیا۔

سمجھوتہ ٹرین کے مسافروں کو جس طرح درندگی کا نشانہ بنایا گیا اور جس طرح زندہ جلایا گیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اڑسٹھ انسانوں کو دو بوگیوں کے دروازے بند کر کے زندہ جلایا گیا اس سے بھارت کی درندگی اور دہشت گردی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ کوئی الزام نہیں بلکہ اس واقعے کے مجرم اس جرم کو قبول کر چکے ہیں۔ آر ایس ایس کے لیڈر اور سرگرم کارکن آسیم آنند نے اس جرم کو تسلیم کیا کہ اس نے نہ صرف اس ٹرین کو آگ لگائی بلکہ اس نے مسلم اکثریتی شہر مالیگاؤں اور حیدر آباد کی مکی مسجد کے دھماکوں کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ سمجھوتہ ٹرین کے سانحے کا انتہائی تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ اس میں بھارتی فوج کے حاضر سروس افسر کرنل سری کانت پروہت اور ریٹائرڈ میجر آپادھیا بھی شامل تھے۔ اس واقعے میں مسافروں کو زندہ جلانے کیلئے ایک سفید پاوڈر استعمال کیا گیا اور اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس سے پہلے اسرائیل اس پاوڈر کو فلسطینیوں کے خلاف استعمال کرتا رہا ہے۔ یہ پاوڈر انتہا درجے کی حرارت پیدا کر کے اپنے شکار کو جلا دیتا ہے۔ اسرائیل فلسطین کے مسلمانوں کے خلاف اس پاوڈر کو کئی بار استعمال کر چکا ہے۔

سمجھوتہ ٹرین کے مسافروں کو بھی اسی بیدردی سے شہید کیا گیا۔ کیا اس منصوبہ بندی میں اسرائیلی مدد بھی شامل تھی؟ بہر حال جو بھی تھا بھارت کی سرزمین

پر تشدد کا انتہائی بہیمانہ کھیل کھیلا گیا لیکن نہ بھارتی میڈیا اور نہ عالمی رائے عامہ نے اس سانحے پر کوئی شور مچایا، اس ظلم پر جو آواز اٹھنا چاہیئے تھی نہ اٹھی۔ اس کے بعد کے سال یعنی نومبر 2008 میں ممبئی کے تاج ہوٹل پر دہشت گرد حملہ ہوتے ہی بھارت نے بغیر کسی تاخیر اور ثبوت کے الزام پاکستان پر لگا دیا اور اس کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان ہر معاملے کو اس سے منسلک کر دیا ہر سطح پر ہونے والی ہر بات چیت کو اسی بہانے ناکام بنایا گیا۔ پورے عالمی میڈیا میں چیخ و پکار کی گئی یہاں تک کہ اسے مسئلہ کشمیر سے زیادہ اہم بنا دیا گیا۔ یہاں تک بونگے پن کا مظاہرہ کیا گیا کہ آئی ایس آئی چیف کو نئی دہلی طلب کرنے کی جرات کی گئی جبکہ نہ تو اس وقت نہ اب کسی پاکستانی ادارے یا شخص نے اعترافِ جرم کیا۔ اگر اس حملے میں کوئی پاکستانی ملوث تھا بھی تو یقیناً اسے بھارتی دہشت گردوں کا تعاون حاصل تھا۔ لیکن اس سارے معاملے کے برعکس سمجھوتہ ٹرین میں جتنی ہلاکتیں ہوئیں پاکستانی مسلمان شہری شہید کئے گئے لیکن حکومتِ پاکستان نے اپنے مؤقف پر وہ زور نہ دیا جو دینا چاہیے تھا نہ اسے عالمی میڈیا نے اس طرح کوریج دی جیسے ممبئی حملوں کو اچھالا گیا۔ اس بدقسمت ٹرین میں جس طرح زندہ انسانوں کو جلایا گیا اس پر انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کو بھارت حکومت کے خلاف جو کہنا اور کرنا چاہیے تھا وہ نہ کیا گیا یہ بات حادثے کے وقت بھی یقینی تھی کہ بھارت کی حدود میں ہونے والے اس حادثے میں بھارتی حکومت ، فوج اور خفیہ ایجنسیاں

ملوّث تھیں ورنہ انتہائی سیکیورٹی میں اس طرح کا حادثہ ممکن نہ تھا۔ کرنل سری کانت پر تو یہ جرم نومبر 2008 میں ثابت ہو چکا تھا لیکن بھارت سرکار نے اسے کوئی بڑی بات نہ سمجھتے ہوئے کرنل سری کانت کو تاحال کوئی سزا دی اور نہ ہی حکومتِ پاکستان نے ان کے آرمی چیف کو پاکستان طلب کیا جس کی فوج کا ایک کرنل اس دھماکے میں ملوّث تھا۔ اب جبکہ آسیم آنند کا اعترافی بیان سامنے آ چکا ہے اور اس کے تمام ساتھی بھی بے نقاب ہو چکے ہیں حکومتِ پاکستان کو ایک سخت مَوقف اپنا لینا چاہیے اور اگر بھارت اس مقدمے اور سزاؤں میں دقت محسوس کرے تو مجرموں کو پاکستان کے حوالے کر دے کیونکہ انہوں نے پاکستانیوں کو شہید کیا ہے۔ پاکستانی میڈیا اور حکومت کو مل کر انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کو جگا دینا چاہیے کہ کس طرح مسافروں کو زندہ جلایا گیا۔ پاکستانی تنظیموں پر تو پابندی لگوانا اب بہت آسان ہو گیا ہے اس لیے فوراً کسی بھی تنظیم کو دہشت گرد قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی جاتی ہے لیکن بھارت کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے لانے کا یہ ایک اچھا موقع ہے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینا تو اب بہت آسان ہے اور اس سازش میں بھارت اسرائیل اور مغربی دنیا پیش پیش ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھارت اکثر یہ جرم بڑے دھڑلے اور تسلی سے کرتا ہے اس کے ہاں کوئی اقلیت محفوظ نہیں بھارتی مسلمان دنیا کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور ان کی آبادی دنیا کے بڑے بڑے ملکوں سے کہیں زیادہ ہے لیکن جس وقت انتہا پسند ہندو چاہیں انہیں بندوق کی نوک پر

رکھ لیتے ہیں۔آسیم آنند نے اپنے اعترافِ جرم میں صرف سمجھوتہ ایکسپریس ہی نہیں مالیگاؤں، مکی مسجد اور اجمیر شریف تمام دھماکوں کی ذمہ داری قبول کی اور یہ تمام دھماکے مسلمانوں کے خلاف کیے گئے۔اس میں بھارتی اور پاکستانیوں کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تخصیص کی گئی۔انتہا پسندی اس کو کہتے ہیں جو بابری مسجد اور گجرات میں مسلمانوں کے قتلِ عام سے لے کر سمجھوتہ ایکسپریس ٹرین کے سانحے تک میں برتی گئی۔ جس طرح سوامی آسیم آنند نے کہا کہ بم کے بدلے بم ہونا چاہیے تو اس کے اس اصول کے مطابق زندہ انسانوں کے جلانے کے بدلے میں زندہ انسانوں کو جلانا ہونا چاہیئے۔ یہ کسی مسلمان کا خود ساختہ انتقامی خیال نہیں بلکہ راشٹریہ سیوک سنگھ، بجرنگ دل اور دوسری ہندو انتہا پسند تنظیموں کا اصول ہے خود سونیا گاندھی اور راجیو گاندھی کے بیٹے، اندرا گاندھی کے پوتے اور جواہر لال نہرو کے پڑپوتے راہول گاندھی نے اس بات کو تسلیم کیا کہ آر ایس ایس بھی القاعدہ جیسی دہشت گرد تنظیم ہے اگرچہ راہول گاندھی سے بھی اپنے خاندان کے بڑوں کی طرح کسی بھلائی کی امید نہیں رکھنی چاہیے اور وہ بھی آئندہ انتخابات میں وزیرِ اعظم بننے کا خواب دیکھتے ہوئے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے جس کیلئے اسے بھارت کے مسلمانوں کے ووٹ بھی درکار ہونگے۔

سمجھوتہ ایکسپریس ٹرین پر حملہ اگرچہ پہلے بھی کوئی معمہ نہ تھا تاہم اب تو

اس کی آخری گتھی بھی سلجھ چکی ہے اور اس کے بعد بھارت سرکار اور فوج کو جس شرمندگی سے دوچار ہونا چاہیے تھا اس کا سایہ کہیں نظر نہیں آ رہا اور اسی لیے اس نے اس کی تحقیقات سے پاکستان کو آگاہ کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ تاہم حکومتِ پاکستان کو اس معاملے کو انتہائی سنجیدگی سے لیتے ہوئے عالمی طاقتوں اور رائے عامہ کے سامنے حقائق کو پورے زور و شور سے اجاگر کرنا چاہیے بھارتی فوج کشمیر میں جس طرح انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں مصروف ہے، جس طرح سرکاری سطح پر ہندو دہشت گرد تنظیموں کی پشت پناہی کی جاتی ہے ان سب معاملات کو دنیا کے سامنے لانا چاہیے۔ حافظ سعید بغیر کسی ثابت شدہ جرم کے مطلوب شخص ہیں تو آسیم آنند اور اس کے لیڈرز ثابت شدہ جرائم پر نہ صرف پابندی بلکہ سزا کے مستحق ہیں خاص کر سمجھوتہ ٹرین کے معاملے میں سخت رویہ اپنانا چاہیے اور جس طرح ممبئی حملوں کے بارے پاکستان کو شدید تنقید اور بدنامی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی اسی طرح کا معاملہ بھارت سے کیا جائے اور اس بات پر زور دیا جائے کہ انتہا پسند ہندو تنظیموں پر پابندی لگائی جائے اور را اور بھارتی فوج سے اس قسم کی ظالمانہ کارروائیوں پر سخت پوچھ گچھ کی جائے اور عالمی سطح پر بھارت سے پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف دہشت گرد کارروائیاں روکنے کا مطالبہ کیا جائے۔

ریکوڈک آنے والی نسلوں کی امانت

معدنیات قدرت کے وہ خزانے ہیں جو خدا نے اپنی مخلوق کیلئے زمین کی تہوں میں چھپا رکھے ہیں اور جو جتنا محنت کش اور منصوبہ ساز ہے اس میں اس کا اتنا ہی حصہ ہے۔
قدرت نے یہ دولت یوں تو ساری زمین کے نیچے پھیلا رکھی ہے لیکن کچھ علاقوں کو انتہائی قیمتی معدنیات انتہائی فراخ دلی سے عطا کی ہیں۔
بلوچستان انہی خوش قسمت زمینوں میں سے ایک زمین ہے کہ جن کو خدا نے قیمتی معدنیات سے فراوانی سے نوازا ہوا ہے۔ یہاں کوئلے سے لے کر گیس اور کرومائیٹ سے لے کر تانبے اور سونے تک کے بیش بہا خزانے موجود ہیں ۔ لیکن اس زمین کی بد قسمتی یہ ہے کہ اسے دریافت کرنے والے ، نکالنے والے اور استعمال کرنے والے مخلص نہیں اور یہی وجہ ہے کہ معدنی لحاظ سے دنیا کا امیر ترین خطہ ہونے کے باوجود یہ غربت، افلاس ، بد حالی، تعلیم کی کمی اور انتہائی پسماندگی کا شکار ہے۔
سوئی میں گیس ، چملانگ اور مچھ میں کوئلہ ، مسلم باغ میں کرومائیٹ اور بے شمار مقامات پر بے شمار دیگر معدنیات موجود ہیں۔ چاغی کو ایک اعزاز تو یہ

حاصل ہے کہ پاکستان نے یہاں اپنے ایٹمی دھماکے کیے لیکن دوسرا فخر اس کو یہ بھی حاصل ہے کہ اسی علاقے میں ریکوڈک میں سونے اور کاپر کے بیش بہا خزانے بھی دفن ہیں۔ ریکوڈک کی زمین دنیا کی امیر ترین زمینوں میں سے ایک ہے کہ یہاں 12.3 ملین ٹن تانبایا کاپر اور 20.3 ملین اونس سونا موجود ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان ذخائر کی قیمت 500 بلین ڈالر ہے۔ جو کہ اس سے زائد ہو سکتی ہے لیکن ابھی تک سنجیدگی سے اس دولت کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہماری دیگر خرابیوں کے ساتھ ساتھ ایک برائی یہ بھی ہے کہ ہم جو کام خود کر سکتے ہیں اس کو بھی تن آسانی اور اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ ہم ریکوڈک کے عظیم خزانے کے ساتھ کر رہے ہیں ہم نے اس بیش بہا خزانے کو غیر ملکی کمپنیوں کے حوالے کر دیا ہے اور بیرک گولڈ جیسی بدنام زمانہ کمپنی کو بھی اس میں حصہ دار بنا دیا ہے بیرک گولڈ ایک انتہائی بد نام کمپنی ہے اور دیگر جن ملکوں میں جہاں یہ کام کر رہی ہے اس سے قتل و غارت، عورتوں سے زیادتی، مقامی لوگوں کو تنگ کرنے اور ان کو خوفزدہ کرنے جیسے جرائم منسوب ہیں تو ہم کیسے اس سے کسی نیکی یا بھلائی کی توقع کر سکتے ہیں دوسری کمپنی اینٹا فوگیسٹا ہے اور انہیں دونوں کمپنیوں کے اشتراک کا نام ٹیتھیان کاپر کمپنی TCC ہے۔ ان کمپنیوں میں سے ہر ایک کا حصہ 37.5 فیصد ہے جبکہ اس عظیم منصوبے میں حکومتِ بلوچستان کا حصہ 25 فیصد ہے۔ یوں ہم مہارت کے بدلے اپنی دولت کا 75 فیصد حصہ بیچ کر اپنی قومی دولت ضائع کر رہے

ہیں کیونکہ یہ مہارت بھی ہمارے پاس موجود ہے اور صلاحیت بھی اور بقول ڈاکٹر ثمر مبارک مند نہ ہمیں کسی ماہر نہ مہارت اور نہ کسی بیرونی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ ریکوڈک ہمارے لیے قدرت کا ایک عطیہ ہے جسے ہم اپنے ملک کی ترقی کیلئے استعمال کر سکتے ہیں اور بقول ایک امریکی جیالوجسٹ اگر ریکوڈک کے خزانے سے پاکستان کو اس کا صحیح اور درست حصہ بھی ملے تو یہ کسی بھی تیل پیدا کرنے والے ملک سے زیادہ امیر ہو سکتا ہے۔

آج جب کہ ملک معاشی طور پر مسلسل تنزلی کی طرف جا رہا ہے غربت کی لکیر سے نیچے کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہی غربت بہت سارے معاشرتی مسائل بلکہ دہشت گردی کا باعث بھی بن رہی ہے۔ ریکوڈک جیسے خزانے ہمارے لئے قدرت کا ایک تحفہ ہیں اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قدرت کئی بار ضرور لیکن بار بار موقع نہیں دیتی۔ لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مفاد پرست حکمران ان قدرتی خزانوں کو غیروں کے ہاتھ فرخت کر دیتے ہیں۔ ریکوڈک کے قابلِ استعمال ذخائر اس وقت 260 بلین ڈالر کی مالیت کے ہیں جبکہ کل ذخائر کا محتاط ترین اندازہ 500 بلین ڈالر ہے۔ جس میں اضافے کا امکان ایک ٹریلین ڈالر تک کا ہے اور ایک اندازے کے مطابق اس کی فرخت سے ایک بلین ڈالر کے مالیت کے 260 سٹیل ملز جتنا نقصان ملک کو پہنچے گا۔ اگر ثمر مبارک مند جیسی شخصیت کے مطابق اس سونے ، کاپر اور دیگر معدنیات کی کشید

کیلئے ہمیں کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں تو پھر کیوں اس کے حصص یا مکمل طور پر فروخت کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ بات یہ نہیں کہ کیوں کسی منصوبے کا ٹھیکہ کسی غیر ملکی کمپنی کو دیا جائے یہ سب کچھ آج کی دنیا میں عام ہے اور کاروباری دنیا اسی طرح چل رہی ہے لیکن اس کے بدلے میں میزبان ممالک بہت زیادہ فوائد اور سرمایہ حاصل کرتے ہیں اور اگر وہ بھی اس ملک میں خود ماہرین اور افرادی قوت موجود نہ ہو تو تب۔ اور ریکوڈک جیسے خزانے تو خدا کی نعمت ہوتے ہیں جب کہ افرادی قوت، مہارت اور صلاحیت سب کچھ موجود ہے تو اس انمول خزانے کو کیوں غیروں کے ہاتھوں بیچا جائے۔ اگر آج ہم خود اس قابل نہ بھی ہوں تو بھی اس کو آنے والی نسلوں کی امانت سمجھ کر غیروں کی دست برد سے بچایا جائے۔ کیونکہ ہم نے ان کیلئے کوئی دوسرا قابلِ فخر اثاثہ نہیں چھوڑا۔

دہشت گردی، بدامنی، مہنگائی، افراطِ زر اور ناخواندگی جیسے مصائب دینے کے بعد کم از کم اگر ہم اتنا ہی کرلیں کہ جو معدنیات قدرت نے ہمیں دی ہیں انہیں اگر نکال کر اس ملک کی ترقی میں استعمال نہیں کر رہے تو اس امید پر انہیں امانتاً زمین میں رہنے دیں کہ جب بھی یہ نکلیں اس ملک اس زمین کے کام آسکیں اور بلوچستان جہاں ویسے ہی احساسِ محرومی کی وجہ سے بہت سے مسائل جنم لے رہے ہیں جن میں بلوچستان کی کئی شکایات بالکل بجا ہیں اور انہیں دور

کرنے کیلئے حکومت کو بہت تندہی سے کام کرنا ہوگا۔ ریکوڈک نہ صرف ملکی ترقی بلکہ بلوچستان کی شکایات دور کرنے کا بھی ایک اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

کاپر اور سونے کے ساتھ ساتھ دیگر قیمتی معدنیات سے بھرپور یہ خزانہ پاکستان کی قسمت بدل سکتا ہے۔ پاکستان کو قدرت نے غریب نہیں بنایا لیکن اسے وہ حکمران نہ مل سکے جن کا خلوص شک وشبے سے بالاتر ہو ورنہ تو ہم کم از کم اس دولت کو جو قدرت نے ہمیں بنی بنائی دی ہے اس کی قدر کر لیتے اور ان خزانوں سے مکمل استفادہ کرتے اور ان میں کسی خیانت کا سوچتے بھی نہ۔ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تھر کول کے اور دوسری طرف ریکوڈک کے عظیم ذخائر ہمارے خلوص کے منتظر ہیں۔

جن پر ہمارے حکمرانوں کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تھر کول سے ہم اپنی توانائی کی تمام ضروریات پوری کرکے فاضل توانائی کو دوسرے شعبوں میں بھی استعمال کر سکتے ہیں جبکہ ریکوڈک تو پاکستان کو دنیا کے خوشحال ترین ملکوں کی صف میں کھڑا کر نے کو کافی ہے۔

کرپشن اور انقلاب

ایک طرف عوام کی پریشانی اور مہنگائی اور دوسری طرف حکومت کے شاہانہ طور طریقے اور کرپشن۔ اس وقت دو ایسے متضاد رخوں میں چلتے ہوئے مسائل ہیں جس کے آپس میں ملنے اور فاصلہ کم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ بلکہ فی الحال تو یہ خلیج بڑھتی ہی نظر آ رہی ہے۔ حکمران اور سیاستدان مسلسل ایک دوسرے پر الزام تراشی میں مصروف ہیں دوسری پارٹی پہلی پارٹی اور پہلی پارٹی دوسری پر الزام عائد کر رہی ہے کہ حالات کی ذمہ دار وہ ہے۔ حالات کا ذمہ دار جو بھی ہے لیکن اس کے متاثرین عوام ہیں جو مہنگائی کی عفریت کا مقابلہ مکمل طور پر غیر مسلح ہونے کے باوجود کر رہے ہیں۔ جبکہ حکمران اس سب کچھ سے بے نیاز کرپشن کے چھوٹے بڑے ہر قسم کے سکینڈل میں ملوث ہو رہے ہیں۔

اس وقت مہنگائی پوری دنیا کا مسئلہ ہے لیکن جن ملکوں میں کرپشن زیادہ زوروں پر ہے اور حکمران زیادہ کرپشن میں مبتلا ہیں وہاں حالات زیادہ خراب ہیں اور بدقسمتی سے پاکستان انہی ممالک میں شامل ہے۔ یہاں حکومتی اخراجات کسی شتر بے مہار کی طرح آزاد ہیں اور بڑھتے بڑھتے ملکی بجٹ کا سب سے بڑا حصہ بننے والے ہیں۔ جبکہ اس حرص و ہوس نے اداروں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا

ہے کوئی ادارہ کرپشن سے محفوظ نہیں ہے۔ اداروں کا معاملہ تو یوں بھی گھمبیر ہے کہ یہاں کرپشن صرف بالائی سطح پر نہیں بلکہ نچلی سطح پر بھی اتنے ہی زور و شور سے موجود ہے بس فرق صرف یہ ہے کہ یہ کرپشن ایک شخص سے شروع ہو کر معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے اور حکومتی کرپشن پورے معاشرے پر براہِ راست اثر ڈال رہی ہے اور دوسرا فرق یہ ہے کہ نچلی سطح پر یہ لوگ اپنے روز مرّہ اخراجات پورے کرنے کیلئے رشوت لیتے ہیں اور بالائی افسران اپنے معیارِ زندگی کو شاندار بنانے کیلئے ۔ لیکن انہی اداروں میں جب حکومت اور وزارت ملوّث ہوتی ہے تو معاملہ بڑھتے بڑھتے بینکوں اور سوئس بینکوں تک پہنچ جاتا ہے اور در اصل ملک پر اثر انداز بھی تب ہوتا ہے جب ہمارے یہ بڑے کرپشن اور رشوت ستانی پر اتر آتے ہیں ادارے تباہ ہو جاتے ہیں اور عوام کو وہ سہولت مل نہیں پاتی جو ان کا حق ہوتا ہے جس کیلئے وہ ٹیکس پر ٹیکس دیتے جاتے ہیں۔

موجودہ حالات میں پی آئی اے کو ہی لیجئے ، ریلویز کی خبر لیجئے، سٹیل ملز کا واقعہ یاد کیجئے ہر جگہ آپ کو کرپشن نظر آئے گی۔ رینٹل پاور پلانٹس ہی لیجئے بجلی کی قیمت آسمان پر پہنچ چکی ہے اور تو اور حج کرپشن پر کیس کو ہی لیجئے یعنی صرف اپنے دیے کو چاند بنانے کے واسطے بستی کے چراغ بجھائے جا رہے ہیں اور اسی پریشان عوام کو مزید پریشان کرنے کیلئے معاشیات کی موٹی موٹی

میں الجھا کر Budget Deficit اور GDP ، GNP،Growth Rate اصطلاحات مہنگائی کی توجیہات پیش کی جاتی ہیں جو ایک عام آدمی کی سمجھ سے تو یقیناً بالاتر ہیں ایک درمیانے درجے کے پڑھے لکھے شخص کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ ریڑھی لگا کر کمانے والا تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ بھی مختلف شکلوں میں کافی ٹیکس حکومت کو ادا کر رہا ہے۔ تو اس کا دودھ پیتا بچہ بھی ادا کر رہا ہے۔ ٹیکس تو ایک عام سرکاری تنخواہ دار ملازم GST بھی ادا کر رہا ہے جس کو اتنی ہی تنخواہ دی جاتی ہے کہ وہ مہینہ بھر کے اخراجات پورے کر سکے لیکن بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طریقوں سے ٹیکس دیتا ہے اور ٹھیک ٹھاک دیتا ہے۔ یوں مہنگائی اور نقد ادائیگی دونوں صورتوں میں متاثر ہوتا ہے اور حکومتی اصطلاحات و توجیہات دراصل عوام کیلئے کسی طرح بھی اہم نہیں ان کیلئے اہم یہ ہے کہ آٹے، دال کے بھاؤ میں کتنی کمی ہوئی، پٹرول کتنا مہنگا ہوا، گھی کی قیمت میں کیا اتار چڑھاؤ آیا۔ بیماری کی صورت میں وہ دوا کس قیمت پر لے گا اور ڈاکٹر کی فیس کتنی دے گا۔

عام آدمی جانتا ہے کہ اس کے اوپر سے یہ سارا بوجھ کم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کیلئے کرپشن پر قابو پانا پہلی شرط ہے جو چیز ہم باہر سے منگوا رہے ہیں اس کی قیمت پر تو حکومت بین الاقوامی قیمتوں کی توجیہہ پیش کرتی ہے جو چیز ہماری ملکی پیداوار ہے اس پر سو طریقوں سے ٹیکس عائد کر کے عوام کی پہنچ سے

دور کر دی جاتی ہے۔ چینی کو ہی لیجئے یہاں مسئلہ بڑی کرپشن کا ہے شوگر ملز بڑے بڑے سیاستدانوں، اسمبلی ممبران اور حکومتی ارکان کے ہیں ۔ لہذا یہاں کرپشن بھی بڑی ہے اور تو اور ہم نے تو وہ معدنیات بھی نہیں چھوڑیں جس کی بناوٹ میں کوئی انسانی محنت نہیں لگی لیکن چونکہ اس کو نکالنے میں انسان کا ہاتھ ہے لہذا ہم نے تھر کول کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے کیونکہ ہم اسے استعمال کریں گے تو رینٹل پاور میں سے کیسے اپنا ذاتی خزانہ بھر سکیں گے۔ ریکوڈک کا خزانہ ہم نکالیں گے تو عوام کے اوپر خرچ کرنا پڑے گا یوں عوام خوشحال ہو کر حکومتی بڑوں کے مقابلے پر اتر آئیں گے لیکن ہمارے کرتا دھرتا یہ بھول رہے ہیں کہ قطرہ قطرہ پانی بھی گرے تو پتھر میں سوراخ بن ہی جاتا ہے اور پھر پانی رکتا نہیں عوام کا بھی دل ہے اگر سنگ وخشتِ درد سے بھر آیا تو پھر انقلاب فرانس تو پرانی بات ہے انقلاب ایران بھی کل کا معاملہ تھا آج ہی کی مثال لیجئے کہ تیونس کے عوام نے مہنگائی کے ہاتھوں تنگ آ کر سڑکوں کا رخ کیا اور صدر بن علی کو کرسی صدارت ہی نہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں نہ پھر معاشیات کی اصطلاحات اس واقع کو روک سکیں اور نہ طاقت کیونکہ وہ طاقت عوام کی خاموشی تک تھی۔ نپولین کے بقول کسی ملک میں کرائسز برے لوگوں کی جارحیت سے نہیں بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی سے پیدا ہوتے ہیں اور جب حکومتیں اچھے لوگوں کو بولنے پر مجبور کر دیں تو پھر تیونس جیسے حالات پیدا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی

حالات کرپشن ہی سے بگڑتے ہیں۔ ہم ان کو تو ٹھیک نہیں کر سکتے لیکن ایک عام آدمی خود کو درست کرے اور جب اس کا عمل خود اتنا مضبوط ہوگا تو وہ دوسرے پر مؤثر اور برحق اعتراض کرسکے گا لیکن کرپشن کی دیمک نے ہمارے معاشرے کو کچھ اس طرح کھوکھلا اور مفلوج کرکے رکھ دیا ہے کہ ہر شخص اس میں ملوّث ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ہم واقعی اس لعنت کو اپنے معاشرے سے ختم کرنا چاہتے ہیں اور ہم اپنے ملک کیلئے واقعی مخلص ہیں تو کرپشن کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا اور اس کیلئے انقلابی اور ہنگامی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا۔ عام آدمی خود سے شروع کرے اور حکومت خود سے لیکن پہلی مثال حکومت کو قائم کرنا ہوگی۔ کرپشن کی وجوہات میں ایک بہت بڑی اور اہم وجہ سادگی اور صبر سے دوری ہے ہم اپنی خواہشات پر صبر کرنا بھول چکے ہیں جس نے حرص و ہوس کو عام کر دیا ہے وہ سادگی جو اسلام کا ایک سنہرا اصول ہے لیکن سادگی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم ضروریاتِ زندگی سے ہی دست کش ہو جائیں لیکن تصنع اور مقابلے کی دوڑ کی جو لعنت ہمارے معاشرے میں پچھلی دو دہائیوں میں بڑھی ہے اسے روک دینا انتہائی ضروری ہے۔ اس دوڑ کو میڈیا نے جس طرح مہمیز لگائی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے ہر ڈرامہ ایک شاہانہ گھر کی کہانی ضرور سناتا ہے، قیمتی ملبوسات، تزئین و آرائش اور فیشن سب نے مل کر عوام کو سادگی سے دور کر دیا ہے۔ میڈیا جہاں کرپشن کے کیسسز سامنے لارہا ہے وہیں سادگی کا بھی پرچار کرے، اسے فروغ دے اور خود اپنے اینکرز اور ڈرامے کو سادہ اور نفیس بنائے۔

کرپشن نے ہمارے معاشرے کو مہنگائی، تصنع اور بناوٹ جن جن طریقوں سے متاثر کیا ہے ان سب کے کردار ہم خود ہیں بس جس کی پہنچ جہاں تک والا معاملہ ہے۔ لیکن چونکہ ہم خود ہی مریض اور خود ہی بیمار کرنے والے ہیں اس لیے مرض کی نوعیت سے بخوبی واقف ہیں اور اسی لیے علاج نا ممکن نہیں۔ لیکن بہتر حل یہی ہوگا کہ حکومت سادگی اپنائے کرپشن کو روکے کرپٹ افراد کو سزا دے اور اس سزا کی تشہیر کرے ورنہ اگر عوام نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو خونریزی بھی یقینی ہے اور انقلاب بھی۔

کشمیر پاکستان کی شہ رگ

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے یہ جملہ قائد کا ہے لیکن حقیقت، وقت کی ہے کہ اسکے بغیر نہ تو پاکستان کا نام نہ اس نقشہ مکمل ہے۔ یوں تو بھارت میں بہت سے مسلم اکثریتی علاقے ہیں لیکن کشمیر کا مسئلہ مختلف یوں ہے کہ یہ قدرتی طور پر پاکستان کا حصہ ہے اور پاکستان کے ساتھ متصل ہے۔ پاکستان کے بیشتر دریا کشمیر سے نکلتے ہیں یعنی ان کے منبے کشمیر میں ہیں یوں پاکستان کی رگوں میں دوڑتا لہو کشمیر سے آتا ہے دوسری طرف پاکستان کشمیر کیلئے اتنا ہی اہم ہے ایک تو مذہبی رشتہ اور دوسرے ہندوستان جیسے پڑوسی کی موجودگی میں اس کے تحفظ کی ضمانت اسی میں ہے کہ وہ پاکستان کا حصہ بنے۔
پاکستانی اور کشمیری عوام کبھی ایک دوسرے کو الگ سوچ بھی نہیں سکتے اور یہی وجہ ہے کہ بھارت گزشتہ تریسٹھ سال سے جو مظالم ڈھا رہا ہے اس پر پاکستانی عوام ہمیشہ دکھ کا شکار بھی ہوتے ہیں اور غم وغصے کا بھی۔ کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ کہنے والوں نے کبھی کشمیریوں کے دکھ پر دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کشمیریوں کی جدوجہدِ آزادی کو دہشت گردی قرار دینے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی دنیا کے ہر انسان کی طرح کشمیریوں کا بھی حق ہے۔ جس کیلئے وہ لوگ اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ جبکہ بھارت سرکار اس جذبہ آزادی کو کچلنے کیلئے ایک سے بڑھ کر ایک

کالا قانون آزما چکی ہے فوج کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں جس کی رو سے وہ کسی بھی کشمیری پر صرف شبے کی بنیاد پر بھی گولی چلا دیتی ہے اور کسی کشمیری کا خون بہہ جانا بھارتی فوج کیلئے کسی پریشانی یا پشیمانی کا باعث نہیں ہوتا۔ نہ ان کیلئے یہ اہم یا سوچنے کی بات ہے کہ ان کی گولی کا نشانہ بننے والا نوجوان ہے بوڑھا ہے یا بچہ ، اگر عورت بھی اس گولی کا نشانہ بن جائے تو بھی کوئی خاص بات نہیں۔ کشمیر میں بھارتی فوج نے ہر طرح سے انسانیت کی دھجیاں بکھیر دی ہیں جس طرح کسی کشمیری کی جان محفوظ نہیں ہے اسی طرح کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ صرف 2010 کے اعداد وشمار لیں تو بھارت کی عظیم جمہوریت کا پول کھل جاتا ہے۔ صرف اس ایک سال میں 447 کشمیری مسلمان بھارتی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے جبکہ 6076 عام شہری زخمی ہوئے۔ گھروں کی تلاشی بھی بھارتی فوج کا ایک پسندیدہ مشغلہ ہے اور اسی شغل کو جاری رکھتے ہوئے گھروں کی تلاشی لی گئی اور ان ساری کاروائیوں کے دوران 2188 کشمیری گرفتار132 ہوئے۔ ان گرفتار شدگان میں سے گیارہ زیرِ حراست افراد غائب کر دیئے گئے۔ عورتوں اور بچوں کا اس صورت حال میں متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے الہذا عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر وہ ہوتا ہے جب عورتوں کی آبروریزی کی جاتی ہے اور کشمیر میں بھارتی فوج مسلسل اس مکروہ فعل میں ملوث ہے صرف سال 2010 میں 87 خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ صرف دسمبر کے مہینے میں دس لوگوں کی شہادت کے ساتھ تین خواتین کی بے

حرمتی کی گئی ہے۔ 78 کو تشدد کا نشانہ بنا کر شدید زخمی کیا گیا ہے۔ اگر یہ ایک سال کے اعداد و شمار ہیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر کیا صورتِ حال ہو گی۔ 2010 میں کشمیر میں بدترین کرفیو نافذ رہا۔ بین الاقوامی میڈیا کے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگائی گئی تاکہ کشمیر کے حالات کو دنیا کی نظر سے اوجھل رکھا جا سکے اگرچہ یہ کرفیو اور پابندی ہی دنیا کو جگانے کو کافی تھے تاہم انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں اس طرح سے کبھی بھی نہ چیخیں جیسے وہ کسی ایک انسان کے ساتھ زیادتی پر بھی چیخ اٹھتی ہیں درست ہے کہ ایک انسان پر بھی ظلم نہ ہو لیکن یہاں تو پورے خطے پر ظلم ہو رہا ہے۔ فوج کو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے وہ جب چاہے جہاں چاہے کسی کشمیری مسلمان کو مشکوک قرار دے کر بھون ڈالے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں خاموش اس لیے ہیں کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے قرار دادیں تو منظور کر لیں لیکن ان پر عمل درآمد کیلئے کسی قسم کا عملی کام نہ کیا اور یوں لگتا ہے کہ جب کشمیریوں کی نسل کشی مکمل ہو جائے گی تو اقوامِ متحدہ مسلمانوں سے خالی خطہ کشمیر کے حق کیلئے بولے گا۔ دوسری جانب امریکہ کسی مسلمان ملک میں ہنگاموں اور ہڑتالوں پر بھی بولتا ہے اور حکومت کو عوامی رائے کے احترام کا درس دیتا ہے۔ مصر ہی کی مثال لیجیے کہ حکومت مخالف مظاہروں پر جان کیری نے فوراً حکومت کو عوامی رائے کے احترام کا حکم دیا۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ ایسا ضروری ہے لیکن یہی

فارمولا کشمیر پر کیوں لاگو نہیں کیا جاتا جہاں کے عوام اپنی نسلوں کی نسلیں قربان کر چکے ہیں جو روز سڑکوں پر ایک ہی مطالبہ لے کر نکلتے ہیں اور آزادی ، آزادی کے نعرے لگاتے لگاتے ایک غیر مذہب ، غاصب حکومت اور بے رحم فوج کی گولیوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اگلے دن ان شہدا کی جگہ کئی اور غازی آزادی کا مطالبہ لے کر سڑکوں پر آ جاتے ہیں یہ سلسلہ گزشتہ چھ دہائیوں سے جاری ہے لیکن نہ عالمی طاقتوں کے کان پر جوں رینگ رہی ہے نہ بھارت کوئی ارادہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ کشمیریوں کو آزادی دے گا۔ بلکہ کشمیر پر تو پاکستان کو جو مضبوط، مؤثر اور ٹھوس مؤقف اختیار کرنا چاہیئے اس میں بھی اکثر لچک پیدا کر دی جاتی ہے لچک پیدا کرنا غلط نہیں لیکن قومی مفاد پر زد تو بڑی بات ہے اس میں بال بھی آ جائے تو یہ غلط ترین ہے۔ اس وقت کشمیریوں کو ہماری اخلاقی مدد کی ضرورت ہے اور ہمیں بین الاقوامی سطح پر مسئلۂ کشمیر کو زیادہ مؤثر انداز میں اور زیادہ زور و شور سے اجاگر کرنا ہوگا۔ بھارت سے ہر قسم کے تعلقات کو اسی مسئلے سے منسلک کر دینا چاہیئے اور اس سے ہر بات چیت کیلئے پہلی شرط مسئلہ کشمیر کو بنا دینا چاہیئے۔ پڑوسیوں کے ساتھ امن سے رہنا ہر ملک تو ملک انسان کی بھی خواہش ہوتی ہے ملکوں کے تعلقات تو پوری قوم کے حال اور مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے ان تعلقات کا خوشگوار ہونا بہت اہم اور ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری قومی وقار اور ملکی مفاد ہے۔ کشمیر جس پر پاکستان اور بھارت کے درمیان تین

کھلی جنگیں ہو چکی ہیں اور سرحدی جھڑپیں تو ایک معمول ہے۔ اس مسئلے کا حل ہونا نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت اور پوری دنیا کے حق میں ہے۔ دو ایٹمی قوتوں کے درمیان تنازعات کے نتائج سے دنیا کا محفوظ ہونا ضروری ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی تنازعہ کشمیر ہی ہے باقی تمام مسائل اسی مسئلے سے جڑے ہوئے ہیں کیونکہ پاکستان اور پاکستانیوں کا مطالبہ انتہائی منطقی اور جائز ہے کہ وہ اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے حقِ خود ارادی کیلئے ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں جن کے دل مسلمان ہونے کے ناطے ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ بین الاقوامی برادری کو اس سلسلے میں پاکستان اور کشمیریوں کے مطالبات ماننے کیلئے بھارت کو مجبور کرنا ہوگا۔

موجود اور مہیا آبی وسائل کا استعمال

دنیا میں جہاں بہت سی دوسری سیاسی و معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہیں موسمی تغیر و تبدل اور ماحولیاتی تبدیلیاں بھی معاشروں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ قدرتی وسائل کی موجودگی اور مقدار معاشروں کی ضروریات اور فرائض میں بھی اتار چڑھاؤ کا باعث بن جاتی ہیں۔

پانی خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سے وہ نعمت ہے جس پر زندگی کی بنیاد ہے۔ ابتدائی انسانی تہذیبوں کی بنیاد ہر اس جگہ پڑی جہاں پانی موجود تھا۔ دریاؤں کے کنارے یا چشموں اور نخلستانوں کے ارد گرد آبادیاں بڑی بڑی تہذیبوں کا پیش خیمہ بنیں اور آج بھی پانی کی فراوانی اور درست استعمال قوموں کی ترقی میں انتہائی اہم ہیں۔ اگر پانی وافر ہے تو ہی زرعی خود کفالت کی منزل طے ہو سکتی ہے۔

ایک زرعی ملک ہونے کے ناطے پاکستان کیلئے پانی کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ موجود ذخائرِ آب کو انتہائی سوچ سمجھ کر اور سمجھداری سے استعمال کیا جائے۔ لیکن دیگر قومی معاملات کی طرح ہم اس معاملے میں بھی

غفلت برت رہے ہیں۔ 1992 میں پاکستان کو پانی کی کمی کا شکار ملک قرار دیا گیا اور ممالک میں شامل کیا گیا Water Stress میں اسے عالمی بینک کی طرف سے 2003 لیکن اس ساری صورتِ حال کے باوجود بھی نہ تو ملک میں پانی کا ضیاع روکنے کی کوشش کی گئی نہ آبی ذخائر بنا کر پانی محفوظ کرنے کی۔

ڈیمز بنانے کو سیاست کی نذر کیا جا رہا ہے اور لگتا یوں ہے کہ پورے ملک میں ڈیموں کی تعمیر کو کالا باغ کی تعمیر سے مشروط کر دیا گیا ہے یعنی جب تک کالا باغ نہ بنے تب تک دوسرے ڈیموں کی تعمیر پر بھی کام شروع نہیں کیا جائے گا۔ کالا باغ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن جن دوسرے مقامات پر ہم پانی کے ذخیرے بنا سکتے ہیں ان پر تو کام شروع کر دیا جائے اور اس سے پہلے کہ ہم خدانخواستہ پانی کی بوند بوند کو ترسیں ہماری ضرورت کے مطابق پانی کا بندوبست اور انتظام ضروری ہے۔

اس وقت پاکستان میں فی کس موجود پانی 1000 مکعب میٹر سے کچھ زیادہ ہے جبکہ یہی مقدار سال 2000 میں 2961 مکعب میٹر تھی اگر دس سال میں پانی کی مقدار تین گنا کم ہو گئی ہے تو آنے والے سالوں کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے اور جبکہ اس وقت بھی پاکستان پانی کی کمی کے شدید ترین دباؤ کے شکار ممالک میں شامل ہے۔

اس صورت حال میں اگرچہ بھارت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے جس نے ہمارے حصے کے دریاؤں پر ڈیم بنا کر ہمارا پانی روکا اور ان دریاؤں کو یا تو پاکستان پہنچنے سے خشک کر دیا یا اسے ندیوں میں بدل دیا جس نے ان پر انحصار کرنے والے علاقوں کو بنجر کر دیا۔ بھارت کے ساتھ تو ہمیں اپنا مقدمہ لڑتے ہی رہنا ہے اور بین الاقوامی سطح پر بھارت کی اس چوری اور جرم کو اجاگر بھی کرنا ہے اور اپنا حق بھی لینا ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں موجود اور مہیا آبی وسائل کو بہتر انداز میں اور احتیاط سے استعمال میں لانا ہوگا۔

اس وقت ہمارے آبی وسائل میں گلیشئرز اور مون سون کی بارشیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کا سالانہ بہاؤ 141.67 ملین ایکڑ فٹ ہے جس میں سے 106 ملین ایکڑ یعنی 97% زرعی اور بقیہ 3% گھریلو اور صنعتی مقاصد کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ زراعت میں استعمال ہونے والے پانی میں سے تقریباً 50% پانی کھیتوں تک پہنچنے سے پہلے یا تو زمین میں جذب ہو کر یا زمین پر پھیل کر ضائع ہو جاتا ہے۔ کچھ ہمارے یہاں آبپاشی اس بیدردی سے کی جاتی ہے کہ چاہے ضرورت سے زیادہ پانی کھیتوں کو دیا جائے اپنے حصے کے وقت تک پانی دیا ہی جاتا ہے جو نہ صرف فصل کو متاثر کرتا ہے بلکہ وہ پانی جو پاکستان کی آنے والی نسلوں کیلئے بھی بہت ہی اہم اور قیمتی ہے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس

وقت بھی پاکستان کا نہری نظام دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام ہے اور ہمارے قابلِ کاشت 34 ملین ہیکٹر اراضی میں سے 16 ملین ہیکٹر کو سیراب کرتا ہے اور یہی زراعت ہماری سالانہ آمدنی کا 25% حصہ بناتی ہے لیکن اس نہری نظام کو جدید بنانا اب وقت کا تقاضا اور ہماری ضرورت ہے اگرچہ کئی نہروں کو پختہ تو کر دیا جاتا ہے لیکن بعد میں اس کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی جاتی اور سالہا سال تک اسے ایک ہی حالت میں رہنے دیا جاتا ہے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار یہ نہریں پھر بے تحاشا پانی جذب کر کے ضائع کر دیتی ہیں جبکہ ان نہروں سے نکلنے والی ندیاں اور نالے اکثر کچے ہوتے ہیں اور اگر یہ ندی نالے آبادیوں سے گزریں تو ان میں گند پھینک کر انہیں اس قدر بھر دیا جاتا ہے کہ بہت سارا پانی کھیتوں تک پہنچنے کی بجائے راستے میں ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ یوں ہم پانی ضائع بھی کر رہے ہیں اور پانی کے ذخائر بنا بھی نہیں رہے۔ جبکہ ہماری آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے ہماری ضروریات بھی بڑھ رہی ہے اور ماضی کے مقابلے یہ استعمال تین گنا بڑھ چکا ہے۔

بین الاقوامی معیار کے مطابق اگر کسی ملک میں سالانہ فی کس 1700 مکعب میٹر پانی موجود نہ ہو تو اسے پانی کی کمی کے دباؤ کا شکار ملک سمجھا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں یہ مقدار 1000 مکعب میٹر ہے اسی سے مسئلہ کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ہم زرعی سے لے کر گھریلو اور صنعتی ہر سطح پر

پانی ضائع کر رہے ہیں۔ گھریلو استعمال کیلئے پانی کی انتہائی کمی کے باوجود اسے صفائی بلکہ بے جا صفائی کے نام پر ضائع کیا جاتا ہے۔ آبپاشی کے جدید طریقے نہیں اپنائے جا رہے جبکہ اس سلسلے میں کسانوں کو آگاہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ حکومت کو ہر قیمت پر اور ہر مناسب مقام پر ڈیم بنا دینا چاہیئے۔ چھوٹے چھوٹے یہ آبی ذخائر نہ صرف ہماری آبی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد کریں گے بلکہ ہماری توانائی کی ضروریات بھی پوری کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمیں میڈیا اور ہر دوسرے ذریعے قوم کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہوگا کہ ہم نے پانی کی کمی پر قابو پانے کی کوشش نہ کی تو ہمارا ملک صحرا میں تبدیل ہو سکتا ہے اور ہمیں اس ناخوشگوار عمل کو ہمیں ہر صورت اور ہر قیمت پر روکنا ہوگا۔

پانی حاصل کرنے کا حق

سورۃ الانبیا میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا'' پانی زندگی کی بنیاد ہے اور دنیا کی تمام بڑی تہذیبیں پانی کے کنارے ہی پروان چڑھی ۔ بڑے شہر دریاؤں کے کنارے ہی آباد ہوئے اور اب بھی وہی علاقے آباد ہیں جہاں پانی ہے اور بے آب علاقے آج بھی ویران اور لق ودق پڑے ہیں۔ پانی کی یہی اہمیت ہے جس کی وجہ سے یہ آبادی کی طرح وجہ نزاع بھی بنتا رہا اور قوموں کے درمیان جنگوں کا باعث بھی ۔ دریاؤں کا پانی آج بھی ملکوں کے درمیان با قاعدہ معاہدوں کے تحت تقسیم ہوتا ہے اور اکثر اوقات خوب ہوتا ہے ۔ اس تقسیم میں کبھی کبھار تنازعات بھی جنم لیتے ہیں لیکن جس طرح سے برِصغیر میں یہ مسئلہ الجھتا جا رہا ہے وہ انتہائی خوفناک ہے یہ خطہ دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے خطوں میں سے ہے ۔ یوں تو ان تمام ممالک میں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے لیکن بھارت کو اپنی ایک ارب سے زیادہ کی آبادی کیلئے بے تحاشا وسائل کی ضرورت ہے جسے وہ اپنے پڑوسی ممالک سے چھین کر اپنی آبادی کی بھوک اور پیاس بجھانے کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان ہی برِصغیر میں وہ ملک ہے جو بھارت کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور سکت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کے نشانے پر رہتا ہے اور ہر محاذ پر وہ پاکستان کے خلاف نبرد آزما رہتا ہے۔

پاکستان کی

بدقسمتی کہ کشمیر کے ایک حصے پر جو پاکستان کا قدرتی حصہ ہے بھارت قابض ہے اور پاکستان کے زیادہ تر دریا اسی کشمیر سے نکلتے ہیں جن کا پانی روکنے کی ہر ممکن کوشش میں بھارت مصروف ہے حالانکہ ایسا بھی نہیں کہ بھارت کو ایسا کرنے کی آزادی حاصل ہے کیونکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان پانی کی تقسیم کا ایک معاہدہ موجود ہے اور سندھ طاس معاہدے کی رو سے سندھ، جہلم اور چناب کے پانی پر پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا ہے لیکن بھارت مسلسل ان دریاؤں پر ڈیم بنا رہا ہے اور پاکستان کے اعتراض کے باوجود نہ تو اس نے یہ تعمیر بند کی اور نہ ہی ان کی تعداد میں کسی کمی کا روادار ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ بھارت معاہدوں کی خاک اڑانے کا ماہر ہے ورنہ وہ اب تک کشمیر میں استصوابِ رائے کرا چکا ہوتا اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عمل کر چکا ہوتا۔
دوسری طرف اس کو چین کے تبت میں دریائے Yalong Tsangpo کے پانی کو موڑنے پر اعتراض ہے اور دریا کے بہاؤ یعنی Run of River پر ژانگ مو پراجیکٹ پر بھی اعتراض ہے جبکہ مزے کی بات یہ ہے کہ بھارت اور چین میں ایسا کوئی معاہدہ موجود ہی نہیں جس کی رو سے چین پر کوئی پابندی عائد ہوتی ہو لیکن پاکستان کے ساتھ معاہدے کی موجودگی کے باوجود وہ دیدہ دلیری سے پاکستان کا پانی چوری کر رہا ہے۔
جبکہ دوسری طرف بنگلہ دیش بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں اور وہ گنگا کا پانی بنگلہ دیش پہنچنے سے پہلے ہی روک لیتا ہے کیونکہ اسے کلکتہ کے انتہائی بڑے اور گندے شہر کی ضروریات پوری کرنی ہوتی ہیں اور گنگا کا

پانی صنعتی اور گھریلو ضروریات کیلئے بے دردی سے استعمال کر لیا جاتا ہے اور اس میں فضلہ اور گند پھینک کر ناقابلِ استعمال بنا دیا جاتا ہے جبکہ اسی دریا پر اس نے 270 ڈیمز بنانے کا منصوبہ بھی بنایا ہوا ہے۔

اس وقت دنیا کے کئی ممالک پانی کی کمی کا شکار ہیں اور بھارت خود بھی اس کمی کا شکار ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسرے ملکوں کا پانی روکا جائے اور پاکستان تو موسمی تغیر و تبدل کا بھی شکار ہے ویسے بھی جغرافیائی طور پر پاکستان کا زیادہ تر علاقہ صحرائی اور نیم صحرائی ہے ہمارا پانی کا زیادہ تر انحصار گلیشئرز کی برف پگھلنے سے دریاؤں میں آنے والے پانی پر ہے ایسے میں جبکہ ملکی زراعت، صنعتی اور گھریلو استعمال کیلئے سارا دارومدار انہی دریاؤں کے پانی پر ہے تو یہ کسی طرح بین الاقوامی اخلاقیات کے مطابق نہیں کہ کسی ملک کا پانی روکا جائے اور وہ بھی جب معاہدہ موجود ہو۔ لیکن بھارت پورے دھڑلے سے ایسا کر رہا ہے اور سندھ، جہلم اور چناب پر نہ صرف ڈیم بنا رہا ہے بلکہ پانی کا رخ موڑ کر اسے اپنے ملک کی زراعت میں استعمال کر رہا ہے جبکہ سندھ طاس معاہدے کی رو سے وہ ایسا کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

موجودہ موسمی اور ماحولیاتی تناظر میں پانی کی اہمیت کو ضرور مدِ نظر رکھنا چاہیئے اور یہ ذہن میں رکھنا چاہئیے کہ اگر تاریخ میں پانی کے مسئلے پر

جنگیں ہو سکتی ہیں تو آج کی دنیا میں بھی ایسا ممکن ہے اور پاکستان اور بھارت تو ویسے ہی مدِمقابل ممالک ہیں اور دوایتی قوتیں ہیں اور یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اگر ایک دفعہ محاذ آرائی شروع ہو جائے اور بات میدانِ جنگ تک پہنچ جائے تو پھر معاملے کو قابو میں لانا مشکل ہو جاتا ہے اس لئے عالمی.برادری کو اس معاملے کو انتہائی سنجیدگی سے لینا چاہیئے اور بھارت پر دباؤ ڈالنا چاہیئے کہ کیسے وہ ایک آباد اور زرخیز ملک کو صحرا میں بدلنے کی کوشش میں مبتلا ہے اور معاہدے کے باوجود اگر وہ پانی روک رہا ہے تو یقیناً وہ چوری کا مرتکب ہو رہا ہے اور یقیناً اس پانی چوری پر اسے سزا ملنی چاہیئے۔

پاکستان پچھلے کئی سالوں سے اس مسئلے پر احتجاج کر رہا ہے لیکن عالمی.برادری معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں کر رہی جبکہ پاکستان میں پانی کی کمی خطرناک حد تک.بڑھتی جا رہی ہے ہمارے ہرے بھرے کھیت بنجر ہوتے جا رہے ہیں وہ علاقے جہاں کبھی سرسبز کھیت تھے وہاں پانی کی کمیابی سے کھیت ویرانے میں تبدیل ہو رہے ہیں اور اس ساری صورتحال میں بھارت کا بہت.بڑا ہاتھ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر اقوامِ متحدہ، عالمی.برادری اور عالمی تنظیموں نے بھارت کو اس جرم سے نہ روکا اور حالات مزید خراب ہونے پر پاکستان کو کوئی سخت قدم اٹھانا پڑا تو بھی ذمہ داری بھارت اور بین الاقوامی.برادری پر ہوگی کیونکہ

پاکستان کو اپنا حق حاصل کرنے کا حق بہرحال حاصل ہے۔

ریمنڈ ڈیوس امریکی جاسوس یا سفارتکار

ایک امریکی ریمنڈ ڈیوس نے 27 جنوری کو مزنگ لاہور کے قرطبہ چوک میں دو پاکستانیوں پر فائرنگ کرکے انہیں ہلاک کردیا اور ایک شخص کو اسکی مددگار گاڑی نے کچل ڈالا امریکہ کیلئے یہ کوئی نئی بات نہیں وہ عرصے سے پاکستان میں یہ کر رہا ہے۔ خود کش حملوں میں بھی امریکہ زور و شور سے ملوث ہے اور ڈرون حملے تو جیسے امریکہ کے فرائض میں شامل ہیں کہ کیے جاؤ اور پاکستانیوں کو مارے جاؤ یقیناً کچھ دہشت گرد بھی مرے ہونگے لیکن کیا ننھے بچے بھی دہشت گرد ہیں جو ان حملوں میں مر جاتے ہیں۔ یہ سب تو اب معمول ہے لیکن جو کچھ ابھی تک خلاف توقع ہوا جس کو کم از کم امریکہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ ریمنڈ ڈیوس کی گرفتاری اور تاحال اسکا جیل میں رہنا ہے یہ اور بات ہے کہ اطلاعات کے مطابق جیل میں بھی اس کے ساتھ خاصا وی آئی پی.برتاؤ کیا جارہا ہے اور اسے ہر قسم کی سہولت دی جارہی ہے اور وہ جیل میں بھی سپر پاور ملک کا باشندہ ہونے کی نخوت میں مبتلا ہے تبھی تو اپنا پسندیدہ کھانا نہ ملنے کی شکایت کر رہا ہے جو مہمان خاص بھی نہیں کرتے اور امریکہ بھی اس کے لئے استثنٰی مانگ رہا ہے بلکہ دھونس جما کر اسکی رہائی کا مطالبہ کر رہا ہے اور ویانا کنونشن کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ جبکہ واردات کے پہلے ہی دن سے یہ بات کہی جارہی تھی کہ

ریمنڈ ڈیوس کوئی سفارتکار نہیں ہے بلکہ امریکہ کا جاسوس ہے جو خفیہ قسم کی سرگرمیوں میں ملوث تھا اور یہ بھی کہ وہ لاہور میں ریکروٹنگ کی ڈیوٹی بھی کر رہا تھا۔ اس سے مختلف قسم کی مشکوک اشیا بھی برآمد ہوئیں اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ ریمنڈ ڈیوس اسلحہ لے کر لاہور کے مصروف ترین علاقے میں کیوں گھوم رہا تھا جبکہ متعلقہ تھانے کو اس کی خبر نہ تھی جو کہ سفارتکار ہونے کی صورت میں ہونی چاہئے تھی۔ اب جبکہ امریکی میڈیا نے بھی اس راز کو طشت از بام کر دیا ہے کہ ریمنڈ ڈیوس سفارتکار نہیں بلکہ سی آئی اے کا با قاعدہ ایجنٹ تھا اور لاہور کو اپنا مرکز بنا کر پاکستان مخالف سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ جس کا ثبوت اس سے برآمد ہونے والی دینی درسگاہوں اور مدرسوں وغیرہ کی تصاویر تھیں لیکن امریکہ ڈھٹائی سے اسے سفارتکار ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا اور اب امریکی میڈیا نے جس طرح بھانڈا پھوڑا ہے تو اس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس شخص کیلئے امریکی وزارت خارجہ سے لے کر صدر امریکہ تک ہر ایک کیوں بلبلا اٹھا کیا ڈیوس سے کچھ اور بھی خفیہ راز وابستہ ہیں جنہوں نے امریکہ کو خوفزدہ کر رکھا ہے؟ یہ کہنا کہ امریکہ ریمنڈ ڈیوس کو بچانے کیلئے کوئی بھی اقدام بے خوف کر سکتا ہے درست نہیں کیونکہ امریکہ کے جتنے مفادات پاکستان سے وابستہ ہیں وہ ان کو داؤ پر نہیں لگا سکتا اس کو پاکستان کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جتنی کہ پاکستان کو اس کی ہے۔ امریکہ افغانستان میں جس بری طرح پھنسا ہوا ہے اور کسی قدر با عزت واپسی کے راستے کی تلاش میں ہے

وہ جانتا ہے کہ پاکستان کی مدد کے بغیر وہ افغانستان میں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ جیتنا تو درکنار جاری بھی نہیں رکھ سکتا اور یہی وقت ہے کہ حکومت پاکستان ایک مضبوط مؤقف اختیار کرتے ہوئے ریمنڈ ڈیوس کے معاملے کو غیرت قومی کے مطابق برتے اور امریکہ کے دباؤ کو کسی صورت قبول نہ کرے۔ یہ حقیقت دنیا کی تاریخ کا المناک باب ہے کہ امریکہ کسی کا دوست نہیں ہے پوری دنیا کو اپنی جاگیر سمجھتے ہوئے اسکے باشندے اور کارندے جہاں اور جس وقت چاہیں اپنی کاروائیاں کرنے سے نہیں کتراتے اور پاکستان کی بری قسمت تو یہ بھی ہے کہ اسکے حکمران امریکہ کے سامنے جھک جاتے ہیں اور عوام کی توقعات اور خواہشات کے بالکل برعکس امریکی کاروائیوں پر احتجاج تو درکنار ناگواری تک کا اظہار نہیں کیا جاتا اور مسلسل اپنے عوام اور سیکیورٹی فورسز کی قربانی دی جا رہی ہے۔ ایک ایسے دوست کیلئے جو ایک بہت بڑا دشمن ہے اور جس نے ہمارے معاشرے کو امن سے محروم کر رکھا ہے۔ کیونکہ اسے پوری دنیا کے امن کی کوئی فکر نہیں لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ خود کو امن کا بہت بڑا داعی کہتا ہے۔ اسکی دورخی کا یہ عالم ہے کہ جہاں جمہوریت ہے وہاں اسکو عام آدمی خطرے میں نظر آتا ہے اور جہاں آمریت ہے وہاں جمہوریت خطرے میں محسوس ہوتی ہے یوں وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں مداخلت کا بھونڈا سہی جواز ڈھونڈتا ہے اور وہ خود کو اس کا حقدار سمجھتا ہے اس نے اپنے کارندے پوری دنیا کے امن کو تہہ و بالا کرنے کو چھوڑ رکھے ہیں جو جس وقت چاہیں وہاں کے امن پر دھاوا بول دیتے

ہیں اور امن کی بحالی کے بہانے اس ملک میں گھس جاتے ہیں لیکن امن کی بحالی تو ایک طرف خون کی ندیاں بہا دی جاتی ہیں پاکستان میں امریکہ نے جس طرح دہشت گردی پھیلا رکھی ہے وہ اس کا ثبوت ہے اور اس وقت اس نے اپنے ایک قاتل شہری کو ہر صورت چھڑانے کے لئے جس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے اور جس استثنٰی کا مطالبہ کر رہا ہے وہ دراصل ایک ریمنڈ ڈیوس کے لئے نہیں بلکہ وہ اسے اپنے ہر شہری کا حق سمجھتا ہے۔ ڈیوس نے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا اور اسے صرف اس لئے معافی یا استثنٰی نہیں ملنا چاہیے کہ وہ امریکی باشندہ ہے اور پاکستانی عدالتوں کو آزادی سے کسی خوف کے بغیر فیصلہ کرتے ہوئے امریکہ کو یہ احساس دلا دینا چاہیے کہ پاکستان ایک آزاد ملک ہے اور کسی امریکی کو مزید یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ پاکستانیوں کے خون سے ہولی کھیلے اور ساتھ ہی امریکہ کو ریمنڈ ڈیوس کی طرح دیگر جاسوسوں اور قاتلوں کو واپس امریکہ بلا لینا چاہیے۔ اس نے اپنے ہی رچائے ہوئے ڈرامے یعنی ٹوئن ٹاور میں مارے جانے والے چند ہزار امریکیوں اور یہودیوں کے بدلے بے شمار مسلمانوں کا خون بہا دیا ہے بلکہ اس کی طرف واجب الادا خون کا اگر حساب لیا جائے تو مزید کئی ٹوئن ٹاورز گرانے ہونگے پھر بھی مشکل ہے کہ خون کے بدلے خون پورا ہو سکے۔ اس موقعے پر ہماری حکومت کو شدت سے امریکہ کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ اب پاکستان مزید امریکی مفادات کے تحفظ کا متحمل نہیں ہو سکتا اس عمل کیلئے عوام تو تیار ہیں لیکن حکومت کو انتہائی ثابت قدمی کا

ثبوت دینا ہوگا۔

سی آئی اے، را اور موساد کی پاکستان میں سرگرمیاں

گاہے بگاہے امریکہ کے ایوانوں سے کچھ آوازیں پاکستان کے متعلق اٹھتی رہتی ہیں کبھی انہیں پاکستان کے ایٹمی اثاثے طالبان کے ہاتھ لگتے نظر آتے ہیں کبھی القاعدہ کے۔ کبھی ان پر پاکستان میں اسامہ کی موجودگی کا انکشاف ہوتا ہے اور کبھی تمام دہشت گرد تنظیمیں اور انکے ہیڈ کواٹرز پاکستان میں نظر آتے ہیں اور لگتا ایسا ہے کہ وہ پاکستان کے غم میں دبلا ہو رہا ہے جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش میں سب سے زیادہ مبتلا ہے بلکہ پاکستان کے لئے بے شمار مسائل کا سب سے بڑا ذمہ دار ہی امریکہ ہے اور پاکستان پر سب سے زیادہ الزام تراشی کا مجرم بھی۔ پہلے الزام تراشی کرکے اپنے لئے حالات سازگار بنانا اس کا پرانا وطیرہ ہے یہی اس نے عراق میں کیا چاہے اسے بعد کیمیائی ہتھیاروں کا کوئی نام ونشان ملا یا نہ ملا یہی اس نے افغانستان میں کیا اور اسامہ بن لادن کی موجودگی کا بہانہ بنا کر وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور پورے خطے کو ایک ایسے غیر متوازن وغیر یقینی حالات سے دو چار کر دیا ہے جس نے پورے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور انہی حالات کی آڑ لے کر اس نے اپنے کارندے یہاں پھیلا دیئے۔ سی آئی اے امریکہ کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی ہے اور پوری دنیا میں صرف عدم توازن اور تنازعات کو ہوا

دینے کی ڈیوٹی پر مامور ہے اور اسے جہاں ضرورت ہو وہ دوسری خفیہ ایجنسیوں سے مدد لیتی رہتی ہے اور اپنا مطلب نکالنے کے بعد ان سے نہ صرف قطع تعلق کر لیتی ہے بلکہ اسی ملک کے خلاف بھی سرگرم عمل ہو جاتی ہے اور مزید ایجنسیوں کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے اس طرح اس کا یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ آئی ایس آئی کے ساتھ بھی سی آئی اے مل کر کام کرتی رہی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سی آئی اے، آئی ایس آئی کی مدد کے بغیر کے جی بی سے ٹکر نہ لے سکتی تھی اور نہ اسے افغانستان سے نکلنے پر مجبور کر سکتی تھی اور نہ ہی اب امریکہ پاکستان کی مدد کے بغیر افغان جنگ جاری رکھ سکتا ہے لیکن یہ سوچنا کہ امریکہ مدد کرنے والے ملک سے بھی مخلص ہوگا سراسر حماقت ہے اور یہی کھیل امریکہ پاکستان میں کھیل رہا ہے اگرچہ ایک عام آدمی مسلسل اس بات پر مصر تھا کہ پاکستان کے امن کو تہہ و بالا کرنے میں سی آئی اے کا بہت بڑا ہاتھ ہے تاہم وہ ایک عام آدمی تھا اس لئے اس کی آواز پر کان نہیں دھرا گیا اور اب جبکہ ریمنڈ ڈیوس جیسا جاسوس پکڑا گیا ہے تو عام آدمی کے اس خدشے کو کسی اہمیت کے قابل سمجھا جانے لگا ہے اور یہ بات سامنے آنے لگی ہے کہ نہ صرف سی آئی اے خود پاکستان کی سلامتی کے خلاف سرگرم عمل ہے بلکہ را اور موساد جیسی بدنام زمانہ ایجنسیوں کو بھی پاکستان کے خلاف مکمل امداد فراہم کر رہی ہے جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا کہ سی آئی اے کسی کی مدد کے بغیر کام نہیں کر سکتی یہی کام وہ اب پاکستان میں پاکستان کے خلاف کر رہی ہے اور اس کام میں اسے بھارتی

ایجنسی را اور اسرائیلی موساد کا مکمل تعاون حاصل ہے یا یوں کہیے کہ سی آئی اے کو را کا بھی تعاون حاصل ہے۔ MIاور موساد بلکہ کچھ رپورٹس کے مطابق برطانیہ کے 6۔

بلوچستان اور سوات میں را اور موساد کی مداخلت تو اب ایک مصدقہ اور ثابت شدہ امر ہے۔براہمداغ بگٹی کا کیس سب ہی کے ذہنوں میں ابھی تازہ ہے اس معاملے میں یہ تمام ایجنسیاں بشمول افغانستان کی خفیہ ایجنسی رام ملوث تھیں۔

اسی طرح بلوچستان میں دیگر کئی مقامات و واقعات میں را کے دہشت گرد گرفتار بھی ہوئے اور انہوں نے اس بات کا اقرار بھی کیا اور یہ بات بھی صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیا جانتی ہے کہ بلوچستان میں امریکہ کو انتہائی دلچسپی اس زمین میں موجود قیمتی معدنی ذخائر کی وجہ سے ہے اور اس کو اس کی بندرگاہوں کی اہمیت کے بارے میں بھی علم ہے کہ یہاں سے آبنائے ہرمز کی تیل کی گزرگاہ تک پہنچ بھی کتنی آسان ہے اور خود بلوچستان میں بھی اپنی زمینی ساخت کے لحاظ سے تیل اور گیس کے کتنے چھپے ہوئے ذخائر موجود ہیں ریکوڈک کے سونے اور تانبے کے ذخائر اسکے علاوہ ہیں دوسری طرف اسے پاکستان کے شمال مغربی علاقے سے وسطی ایشیا میں بحیرہ کیسپیئین کے ارد گرد توانائی کے عظیم ترین ذخائر تک پہنچنے میں بھی کافی آسانی ہو سکتی ہے اور اسے توانائی کی بے انتہا ضرورت ہے نہ صرف پوری دنیا پر مسلط کی ہوئی جنگ کو جاری رکھنے کے لئے بھی اور

اپنے عوام کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی اور بھارت اور اسرائیل اپنی دیگر دلچسپیوں کے ساتھ سی آئی اے کے اس ٹاسک میں صرف اسلئے شامل ہیں کہ اس سارے معاملے میں پاکستان سب سے زیادہ متاثرہ ملک ہے اگرچہ بھارت کو بھی اپنی بھوک، ننگی اور بے سائباں آبادی کے لئے بھی تواہائی کے لئے بے تحاشا ذرائع کی ضرورت ہے لیکن ان سب کا سب سے بڑا مقصد دنیاکے واحد ایٹمی مسلمان ملک پاکستان کو نہ صرف عدم توازن کا شکار کرنا ہے بلکہ خدانخواستہ اسے ختم کرنا ہے۔ کیونکہ نہ صرف ان ممالک بلکہ کسی بھی غیر مسلم ملک کے حق میں ایک ایٹمی مسلمان ملک کسی طرح بھی نہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ انکے ارادوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان ہے اگر یہ ممالک کسی بھی مسلمان ملک کی طرف بڑھتے ہیں تو پاکستان دنیائے اسلام کی قیادت اور حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر یہ اسلام کے خلاف کسی کھلی جنگ کا اعلان کرتے ہیں تو پاکستان انکے مقابلے پر تن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ یوں ان ایجنسیوں اور ان کے ممالک کے مفادات بالکل ایک ہو جاتے ہیں سالوں سے یہ پاکستانیوں کے حوصلے آزما رہے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اسطرح پاکستانی کندن بنتے جا رہے ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ پاکستانی حکمران اپنے عوام سے حوصلہ سیکھ ہی لیں گے اور 'ناں' کرنے کی جرات پیدا کر ہی لیں گے اور اب تک بھی پاکستان انہی حوصلوں کی وجہ سے بحکم خدا قائم ہے اور تن تنہا ان تمام سازشوں کا مقابلہ کر رہا ہے آئی ایس آئی جو ان ایجنسیوں کے مقابلے میں

انتہائی کم وسائل رکھتی ہے ان سے ٹکر لئے ہوئے ہے پاکستانی عوام اپنے حوصلے کا بے پناہ مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن اب وقت ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کی طرز کے سفارتی اہلکار ملک سے فوراً بے دخل کر دیئے جائیں اور بلیک واٹر یا زی سروس کے کسی بھی کارندے کو نکال دیا جائے بلکہ ہر مشکوک غیر ملکی چاہے وہ امریکی ہو یا کوئی اور اسکی سخت نگرانی کی جائے کیونکہ حالات و واقعات بتا رہے ہیں کہ امریکہ اور ان دوسرے غیر ملکیوں کے خود القاعدہ اور دہشت گردوں سے رابطے ہیں جس کا ثبوت ریمنڈ ڈیوس سے ملنے والی دستاویزات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ڈرون حملوں میں بے شمار پاکستانی مارے گئے لیکن نام گرامی دہشت گرد لیڈر بچ جاتے ہیں کیونکہ ان سے خود امریکہ اور اسکے حواریوں کے مفادات وابستہ ہیں افغانستان میں امریکی فوج موجود ہے وہاں کی نام نہاد سہی سرکاری حکومت امریکہ چلا رہا ہے اور امریکہ کا اتحادی پاکستان ہے لیکن پاکستان کی سرحدوں پر افغانستان میں ایک درجن سے زائد بھارتی قونصلیٹس ہیں جبکہ بھارت اور افغانستان کی کوئی سرحد بھی آپس میں نہیں مل رہی افغانستان میں بھارت کی دلچسپی صرف اس لئے ہے کہ وہ ایک دوسری طرف سے بھی پاکستان کی سرحدوں پر موجود رہنا چاہتا ہے اسی طرح اسرائیل بھی اس خوف میں مبتلا ہے کہ اسرائیل کی عالم اسلام کے خلاف کسی بھی کھلی جنگ کی صورت میں پاکستان اسکے خلاف مضبوط ترین حریف ہوگا اور وہ کسی مسلمان ملک کو اس قدر مضبوط تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اسکے صیہونی ارادوں کے آڑے آسکے۔ یہی وقت ہے کہ

پاکستان خود کو ایک ایٹمی طاقت اور طاقتور ملک ثابت کرے اور دنیا کو دکھا دے کہ اگر وہ ماضی میں دنیا کی سپر طاقتوں کو تہس نہس کر سکتا ہے، گزشتہ دس گیارہ سال سے اگر آئی ایس آئی اور پاکستانی دنیا کی بڑی بڑی خفیہ ایجنسیوں اور دشمنوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور انہوں نے ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تو ان کو مان لینا چاہیئے کہ اس قوم کو شکست نہیں دی جا سکتی اور ہماری حکومت کو بھی یہ یقین ہونا چاہئے کہ اگر اس نے ان طاقتوں کے سامنے جرا،ت انکار کی تو یقیناً فتح انکی ہو گی کیونکہ انکی پشت پر ان طاقتوں کے ستائے ہوئے اٹھارہ کروڑ عوام کسی بہادر فوج کی طرح کھڑی ہو گی اور ان دشمن ایجنسیوں کو بھی اب اپنا بوریا بستر پاکستان سے سمیٹ لینا چاہئے کیونکہ لگتا یہی ہے کہ اب انکے پاس وقت بہت کم ہے۔

پاکستان کا مطلب کیا

غلامی سے آزادی تک سفر طے کرتے کرتے قومیں بہت سے مشکل حالات کا سامنا کرتی ہیں اور یہی کچھ برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوا آزادی کی راہ میں بے تحاشا مصائب و آلام کا سامنا کیا اور قربانیوں کا ایک طویل سلسلہ چلتا رہا لیکن یہاں قائداعظم جیسے لیڈر اور اقبال جیسے شعلہ نوا رہنما موجود تھے۔ محمد علی جوہر، شوکت علی، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، ہیرے موتی جیسے لیڈروں کی موجودگی میں یہ قافلہ چلتا رہا 23 مارچ 1940 کو نصب العین کا تعین کرنے کے بعد کسی رہرو نے پلٹ کر نہ دیکھا اور منزل پر پہنچ کر دم لیا یہ کہانی اس قدر سادہ اور مختصر نہ تھی وقت بھی لگا اور خون بھی بہا تب جاکے کہیں یہ گھر ملا جس کا نام پاکستان ہے۔

پاکستان کا حصول زمین کے ایک ٹکڑے کا حصول نہیں تھا بلکہ بقول قائداعظم یہ تجربہ گاہ اس لئے قائم کرنا چاہتے تھے کہ جہاں مسلمان اسلامی اصولوں کو آزما سکیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ان اصولوں کو خلوص دل سے کاروبار زندگی اور کاروبار حکومت میں آزمایا جائے تو ایک بہترین معاشرہ اور بہترین حکومت تشکیل پا سکتی ہے لیکن افسوس کہ قائد کی عمر نے وفا نہ کی اور پاکستان صرف

ایک سال کی عمر میں اپنے رہنما سے محروم ہوگیا اور آج جب کہ ملک کو قومی یکجہتی اور اسلامی اصولوں کی ضرورت ہے ہم موجود مسائل کے ساتھ ساتھ مزید کئی دوسرے مسائل کو بھی ابھار رہے ہیں یوں لگتا ہے جیسے پچھلے تمام مسائل حل ہو گئے ہیں اور فارغ رہنا ہمیں پسند نہیں لہذا ہم نے یہ ذکر چھیڑ دیا ہے کہ آیا قائداعظم کا تصوّر سیکولر پاکستان کا تھا یا اسلامی مملکت کا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قائداعظم اور برصغیر کے مسلمانوں نے ایک سیکولر ملک کے لئے ہی اپنی جانوں کی قربانی دی تو پھر تو حکومت برطانیہ سے آزادی ہی کافی تھی اُس کے لئے الگ ملک حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر اُن تریسٹھ لاکھ مسلمانوں کو پاکستان آنے کی کیا ضرورت تھی جو ہجرت کرکے پاکستان آئے نہ صرف اپنا گھر چھوڑا بلکہ کئی بار تو ایسا ہوا کہ پورے پورے خاندان راستے ہی میں شہید کر دیئے گئے۔ اور کبھی اس قربانی اور شہادتوں کی کہانی سنانے کو کوئی ایک فرد اپنے خوابوں کی سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ پاکستان کا حصول اسلام اور پاکستان کا مطلب لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہی قرار دیا گیا تھا اس میں کوئی دوسرا تیسرا نکتہ نظر تھا ہی نہیں اور یہی نکتہ نظر حصول پاکستان کے بعد بھی رہا اور اب بھی ایک عام پاکستانی کی سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہاں کچھ نام نہاد روشن خیال لیکن حقیقتاً بے مہار لوگ اور بزعم خود انسانی حقوق کے علمبردار اس تاثر کو عام کرنے کی کوشش میں مبتلا ہیں بلکہ محسوس کیا جائے تو یہ ایک سازش ہے ورنہ پوپ بینڈ یکٹ

پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے ناموس رسالت کے قانون پر رائے زنی کیوں کرتا جبکہ یہی پوپ تاریخ کی اٹل حقیقت کو یہ کہہ کر جھٹلا رہا ہے کہ حضرت عیسٰی (ع) کو بقول انکے مصلوب کرنے میں یہودیوں کا کوئی قصور نہیں اور یہ فرمان اخوت بین المذاہب کے لئے جاری کیا گیا اسکی جگہ اگر وہ یہودیوں کے لیے اپنے نبی (ع) کو مصلوب کرنے پر معافی کا اعلان فرماتے تو زیادہ مناسب تھا۔ دوسری طرف یہ سب قوتیں اسلام کو بدنام کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور دکھ اس بات کا ہے کہ ہمارے دین سے بے خبر نماز روزہ سے آزاد۔ برائے نام مسلمان روشن خیالی کے نام پر ان لوگوں کی خوشامد کرتے ہوئے۔ بڑی آسانی سے ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں اور یہ بحث چھیڑ دیتے ہیں کہ پاکستان کا مطالبہ سیکولر یا پھر اسلامی ریاست کے لئے تھا چاہیئے تو یہ کہ یہ خود کو پڑھے لکھے باشعور کہنے والے پاکستانی ان امپورٹڈ این جی اوز کو بھی چپ کرواتے اور انہیں اسلام کے زرین اصولوں سے آگاہ کرتے مگر یہ خود اُن سے زیادہ بلند بانگ اور لایعنی نعرہ بازی شروع کر دیتے ہیں آج کل قائداعظم کو سیکولر اور مطالبہ پاکستان کو ایک سیکولر ملک کا مطالبہ ثابت کرنے پر اقلیتوں کے حقوق کی آڑ میں زور دیا جا رہا ہے اور یہ سب ایک سازش کے تحت پاکستان کی اسلامی حیثیت ختم کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے جبکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو مذہبی رواداری کا سب سے زیادہ حامی ہے بلکہ دوسرے کے دین کو نہ چھیڑنے کی تلقین کرتا ہے قرآن پاک میں کئی جگہ اللہ تعالٰی کو ö نے رسول

تسلی دی کہ تمہارا کام صرف پیغام پہنچانا ہے انکے اعمال کی ذمہ داری سے آپکو آزاد قرار دیا اور یہ بھی کہ تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین اگر تبلیغ پر بھی کوئی اسلام قبول نہ کرے تو اسلام نے اس کو مارنے کا اختیار نبی ö کو بھی نہیں دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ دنیا کا ہر شخص ایک مذہب پر نہیں ہو سکتا چاہے وہ سچا ترین مذہب اسلام ہو۔ اسلام، اسلامی ملک میں رہنے والے غیر مسلم عوام کی حفاظت کی ذمہ داری بھی مکمل طور پر اسلامی حکومت پر ڈالتا ہے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) جیسے ثقہ راویؑ سے مروی ہے کہ " جس نے کسی اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہری کی جان لی وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آنے لگتی ہے" اب جو مذہب غیر مسلم کی جان لینے کے بدلے میں اتنی سخت وعید سناتا ہے کیا وہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری نہ لے گا آج کل پاکستان میں جو حالات پیدا کئے گئے ہیں اس میں نہ تو کسی مسلمان کی جان محفوظ ہے نہ کسی غیر مسلم کی۔ یہ کہنا کہ صرف غیر مسلموں کو خطرہ ہے انتہائی زیادتی ہے اور یہ بھی کہ یہ سب کچھ مسلمان کر رہے ہیں ایک اور بڑی زیادتی ہے اگر کوئی غیر مسلم خاندانی دشمنی کا بھی شکار ہو جائے تو انکے حقوق کا واویلا کرکے شور مچا دیا جاتا ہے تاکہ پاکستان کی اسلامی حیثیت کو چیلنج کیا جاسکے جبکہ یہاں ہر روز مسلمان کبھی مسجد میں کبھی نماز جنازہ میں اور کبھی بازاروں میں مارا جارہا ہے اور کم از کم نوے فیصد پاکستانیوں کا خیال ہے کہ یہ سب

فارن فنڈڈ ہے اور اب تو یہ ثابت بھی ہو رہا ہے اس لئے پاکستان کے وجود کو سیکولر اور اسلامی کے درمیان پیسنے سے بہتر ہے کہ بیرونی دشمن طاقتیں اپنے ہاتھ روک لیں اور ہمارے روشن خیال پڑھے لکھے اور صرف زبانی کلامی مسلمان دنیا کی نظروں میں اچھا بننے سے پہلے اپنے ملک کی بہتری کا سوچیں اور وہ پروپیگنڈا چھوڑ دیں جو وہ کر رہے ہیں بلکہ وہ یورپ کے اسلام مخالف اقدامات کا نوٹس لینا شروع کر دیں کہ خود کو فرد کی آزادی کا علمبردار کہنے والے یورپ میں مسلمان عورتوں کے سکارف، مساجد کے مینار امریکہ میں گراؤنڈ زیرو پر مسجد کی اجازت نہ دینے والے امریکہ کے اعمال کو قابل توجہ اور قابل اعتراض سمجھنا شروع کر دیں۔

قائداعظم یقیناً کوئی مذہبی شخصیت نہ تھے لیکن ان کی کئی تقاریر اس بات کی گواہ ہیں کہ پاکستان کے لئے ان کی جدوجہد صرف ملک نہیں بلکہ اسلامی ملک کے حصول کے لئے تھی اور اسلامی ملک لینے کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ یہاں سے دوسرے مذاہب کے ماننے والے نکال دیئے جائیں یہ سب تو sons of the soil ہیں اس زمین پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ایک مسلمان کا اور اس ملک کے لئے تکلیف اٹھانا اُتنا ہی ان کا بھی فرض ہے جتنا ایک مسلمان کا۔ یہ بحث ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چھیڑی گئی ہے اور اس کو ختم کرنے کے لئے ہم سب کو اہم کردار ادا کرنا ہوگا اور دنیا کے سامنے آج کے پاکستان اور اُس پاکستان

کے درمیان فرق ختم کرنا ہوگا جس کا مطالبہ برصغیر کے مسلمانوں نے 23 مارچ 1940 کو کیا اور اسے 14 اگست 1947 کو حاصل کر لیا۔

میڈیا کے پیران کامل

پاکستان اس وقت تاریخ کے مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا جملہ ہے جسے ہر دور میں سیاستدانوں، حکمرانوں، حاکم جرنیلوں غرض ہر طالع آزمانے ادا کیا اور یہ ادائیگی ہمیشہ ایک دھمکی آمیز انداز میں ہوئی لیکن میرے سمیت اکثریت نے نہ صرف یہ کہ کبھی اس پر کان نہیں دھرا بلکہ اس جملے سے چڑتے ہی رہے اور پاکستان بفضلِ تعالیٰ قائم رہا۔ آج بھی یہی تاثر پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے کوئی ٹاک شو سنیں کسی سیاستدان سے بات کریں کسی اینکر کے خیالات زریں سنیں ہر ایک یہی تاثر دینے کی کوشش میں مبتلا ہے کہ پاکستان اپنی بقا کی جنگ میں شکست کے قریب ہے اور یہ سب کچھ ہمدردی اور محبت کی آڑ میں کیا جارہا ہے۔ ان سب لوگوں کی نیت پر شک کرنا درست نہیں ان میں سے بہت سے دلی ہمدردی، غم خواری اور فکرمندی میں بھی یہ سب کہتے، کرتے ہونگے لیکن بات وہی ہے کہ بیوقوف دوست عقلمند دشمن سے بدتر ہے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر یہ سب کیسے ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ پاکستان آج جس قدر بدامنی، دہشت گردی اور سازشوں سے دوچار ہے یقیناً پاکستانی عوام کا حوصلہ ہے کہ مقابلے پر تنے کھڑے ہیں اور یوں

محسوس ہوتا ہے کہ وہ لیڈروں کی پشت پناہی کے بغیر اکیلے ہی اس محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں ۔ بظاہر شعلہ نوا میڈیا اور اس کے آتش نوا بڑے بڑے اینکرز قوم کی خبرداری میں مصروف نظر آتے ہیں ۔ لیکن کیا درحقیقت یہ واقعی صرف قومی خدمت کے جذبے سے معمور ہیں ۔ حصول رزق حلال ایک عبادت ہے اور بطور ذریعہ آمدن اس پیشے کو اپنانے والے لوگوں کا حق ہے کہ وہ ملک کی خیر خواہی کرتے ہوئے اور جائز ذرائع اپناتے ہوئے ایک اچھی ذاتی زندگی کے لیے جدوجہد کریں لیکن کیا یہ سب ایسا ہی کر رہے ہیں ۔ کیا ایمانداری سے کوئی بھی ملازمت پیشہ شخص چاہے وہ حکومتی ملازم ہو یا غیر حکومتی چند سالوں میں اتنی دولت کما سکتا ہے جتنا ہمارے میڈیا اینکرز نے کمائی ۔ آج سے کوئی تین سال پہلے جب میں نے اس میدان کے چند سرکردہ کھلاڑیوں سے درخواست کی کہ کسی پروگرام میں وہ بھی اپنے اثاثے ڈیکلیئر کریں تو کچھ نے میری اس ای میل کو سرے سے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا اور کچھ نے اسے کسی مناسب وقت پر ٹال دیا اور ابھی تک انہیں وہ مناسب وقت میسر نہ آ سکا۔ جبکہ اس عرصے میں وہ بے شمار ٹیکس نا دہندگان ، رشوت خوروں اور بیرونی ممالک سے پیسہ لینے والے ملک دشمن عناصر کو بے نقاب کر چکے ہیں ۔ پاکستان اس وقت بیک وقت کئی دشمن ایجنسیوں کی زد پر ہے ۔ اگرچہ کچھ عاقبت نا اندیش لوگ اسے محض محب وطن پاکستانیوں کی ایک بدگمانی سمجھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ ہم کیوں اپنی ہر مصیبت کے لیے دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں حالانکہ نا اہلی ہماری اپنی ہے بلاشبہ کہ نا اہلی

ہماری ہی ہے کیونکہ ہمارے ہی درمیان سے وہ ایسے لوگ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی تجوریاں بھرنے کی خاطر ملک و قوم کے ہر مفاد کو روندتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں یہی لوگ کبھی دہشت گردوں کی صورت میں سامنے آکر بم دھماکوں سے ارضِ وطن کو لرزا دیتے ہیں اور کبھی ٹارگٹ کلنگ کی صورت میں وطن کے گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں اور کبھی یہی لوگ حب وطن کا جامہ پہن کر لوگوں میں مایوسی کا بیج بو دیتے ہیں یہ اندر کے وہ دشمن ہیں جو اپنا کام بڑی تسلی سے کر رہے ہیں اور اس کے بدلے میں دولت اور پیسہ اپنے خزانوں میں بھر رہے ہیں مجھے ان لوگوں سے زیادہ خوف آتا ہے کیونکہ یہ آستین کے سانپ ہیں شاید کچھ لوگ میرے اس نکتہ نظر کو محض بدگمانی سمجھیں لیکن میرا نکتہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس قدر باقاعدگی سے بیرونی ممالک کے دورے کیسے کر لیتے ہیں کیا صرف ایک نوکری سے یہ ان اخراجاتِ سفر کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ صرف دو تین سال کی محنت سے کیسے یہ بین الاقوامی شہرت کے حامل بن جاتے ہیں کہ ہر کانفرنس میں شرکت کرنے یہ امریکہ، یورپ اور بھارت پہنچ جاتے ہیں۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں ان کو کونسے سٹریٹیجک نوعیت کے معاملات طے کرنے ہوتے ہیں اور وہاں انہیں وی آئی پی پروٹوکول کیونکر دیا جاتا ہے۔ اور جو حرکات وہاں کی جاتی ہیں اسکی جھلک بھی عوام کبھی کبھار یوٹیوب ہی پر سہی دیکھ لیتے ہیں۔ ہمارے کچھ لکھاریوں اور مصنفین کے بھارت سے باقاعدہ مصدقہ تعلقات ہیں اور آزادی اظہار کے نام پر وہ

ملک اور اسکے معتزز اداروں کے خلاف زہر افشائی کرتے رہتے ہیں ۔ ایسا ہر گز نہیں ہے کہ ملک میں سب اچھا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ بھی اچھا نہیں ہے اور اس کچھ اچھا کو عوام الناس کے سامنے اس نظریے سے بھی نہیں لایا جاتا کہ دہشت گردی ، بد امنی ، دشمنوں کی سازشوں کے شکار عوام امید کی کوئی کرن ہی سمجھ لیں اور مستقبل کے بارے میں کسی خوش فہمی کا ہی شکار ہو جائیں ۔ اور سونے پر سہاگہ ہمارے سیاستدانوں کے آئے دن کی تبدیل ہوتی وفاداریاں ، تنازعات اور مخالفتیں ہیں جو ان کو ملک اور قوم کے لیے سوچنے کا موقع فراہم ہی نہیں ہونے دیتی اور سچی بات تو یہ ہے کہ سیاستدان بھی ہمارے اینکرز خواتین و حضرات کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ٹاک شوز میں ایک دوسرے پر یوں گرجتے برستے ہیں یوں الزامات لگاتے نظر آتے ہیں گویا دو دشمن ملکوں کی فوجیں محاذ پر صف آرا ہیں ۔

میں بطور ایک لکھاری میڈیا کی آزادی کے خلاف ہو ہی نہیں سکتی لیکن قومی سلامتی اور ذمہ داری اس آزادی سے کہیں اہم ہے ۔ آزادی کا مطلب مادر پدر آزادی نہیں ہونا چاہے اس کے لیے امریکہ ہی کی مثال کافی ہے کہ لاکھ آزادی کے باوجود وہاں کا میڈیا اس بات کا پابند ہے کہ ملکی سلامتی کے خلاف یا کسی معمولی خطرے کے پیش نظر بھی وہ ہر خبر نشر نہیں کرتے اور کسی نہ کسی ضابطہ اخلاق کے پابند ہیں اگر یہ دلیل دی جائے کہ ہمارا میڈیا نو آموز ہے اور

تجرباتی دور سے گزر رہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس آموختگی میں خدانخواستہ ہم کسی بڑے قومی نقصان سے دوچار نہ ہو جائیں اس وقت چونکہ موضوع بحث تفریحی پروگرام نہیں ورنہ یہ ہماری قومی سلامتی پر ایک اور وار اور حملہ ہے جس کے بارے میں پہلے بھی بات ہو چکی ہے اور پھر بھی کبھی ہو گی۔ لیکن اس وقت نکتہ زیر غور یہ ہے کہ ہمارے نام نہاد محب وطن اینکرز اور چینلز اس بات کا احساس کیوں نہیں کر رہے کہ وہ دشمن کے ایجنڈے میں کس قدر مدد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ بے خبری میں نہیں ہے اگر یہ سارے دیگر ملک دشمن عناصر اور سرگرمیوں سے آگاہ ہیں تو یہ اس قدر معصوم نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی دشمن کا ایک طرف سے حملہ ہے۔ جس کے بارے میں ہمیں بحیثیت قوم انتہائی سنجیدگی سے سوچنا ہو گا اور ان " پیران کامل "کا محاسبہ بھی کرنا ہو گا اگر ہم تاریخ کے نازک موڑ سے گزر رہے ہیں تو اس کا علاج کرنے سے پہلے بیماری کی تشخیص انتہائی ضروری ہے یہ بھی سوچنا اہم ہے کہ طالبان میں عہدے بھی اسی میڈیا نے تقسیم کئے تھے ان کے انٹرویوز بھی کئے تھے آخر جہاں تک ہماری ایجنسیاں بھی نہ پہنچتی تھیں یہ اینکر اور رپورٹر کیسے پہنچ جاتے تھے بات سوچنے کی بھی ہے اور احتیاط کی متقاضی بھی اور اگر یہ اتنے بارسوخ ہیں تو یہ اثر و رسوخ سب سے پہلے ملک کے مفاد میں استعمال ہونا چاہیے ابھی تک اگر میڈیا کے "انکشافات " کا کوئی ثمرہ دیکھنے کو نہیں مل رہا تو وجہ حکومت کی عدم دلچسپی اور نااہلی کے ساتھ ساتھ ان میں خلوص

کی کمی بھی ہے۔

خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

فلوریڈا کے ملعون پادری ٹیری جونز نے آخر کار اپنے ناپاک منصوبے پر عمل کر لیا اور ہم مسلمان حسبِ معمول دیکھتے رہ گئے اور جب شیطانی کھیل کھیلا جا چکا تو رسمی احتجاج کے لئے چند مذمتی قرار دادیں پیش کر دی گئیں عوام کا خون ابل ابل کر انکی نیس پھاڑنے کی کوشش میں اندر ہی اندر سوکھتا رہا بے بسی سے انکے چہرے سرخ ہو کر پیلے پڑتے رہے اور وہ شیطان اپنی کامیابی پر شاداں جشن مناتا رہا اسکے چیلے چانٹے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں بیٹھ کر مزید شیطانی منصوبے بناتے رہے۔اور پھر یوں ہو گا کہ کچھ دنوں میں یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور بس۔ اس وقت بھی عالم اسلام کو جن مسائل میں الجھایا گیا ہے وہ انہی سے نبٹ رہا ہے حکمران اپنے تختوں کی حفاظت میں مصروف ہیں اور ٹیری ملعون مسلمان عوام کی پہنچ سے بہت دور ایک ایسے ملک میں محفوظ و مامون بیٹھا ہوا ہے جو نہ صرف عالم اسلام بلکہ تمام دنیا میں ہونے والے فسادات اور دہشت گردی کی منصوبہ سازی کا گڑھ ہے جو تیسری دنیا کے ممالک کے لیے ایک آفت اور مصیبت سے کم نہیں اور تمام منصوبوں میں یہ سب سے زیادہ گھناؤنی سازش تھی جو ٹیری جونز نے انجام دی۔ نعوذ باللہ قرآن پاک پر مقدمہ اور پھر پھانسی کی سزا اور نذر آتش کرنا ایک فعل دوسرے سے بڑھ کر قبیح۔ یہ بالکل درست ہے کہ خدا نے قرآن کی حفاظت کا

ذمہ اپنے سر لیا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک اسکے الفاظ تو الفاظ اسکے زیر زبر پیش' اسکے رموز واو قاف تک محفوظ ہیں ٹیری تو ٹیری پورا امریکہ، پوری ملت کفر مل کر بھی اس کی حفاظت میں مخل نہیں ہو سکتی جیسے ابرہہ خانہ کعبہ کا کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن ہم اگر ابابیلوں کے انتظار میں بیٹھ جائیں جو ٹیری جونز اور اسکے شیطانی چیلوں کو کھائے ہوئے بھُس کی طرح کر دیں تو اس رب العالمین و رب قرآن کے لیے ایسا مشکل نہیں وہ چاہے تو پلک جھپکتے ان ملعونین کو نشان عبرت بنا دے لیکن کچھ فرائض خدا نے ہم مسلمانوں پر بھی رکھے ہیں۔ ہم اپنی تو حفاظت نہیں کر پا رہے لیکن کیا ہم اپنے دین کی حفاظت کر رہے ہیں؟ ہم نے تو بڑی آسانی سے خود پر انتہا پسندی اور دہشت گردی کے چپاں کئے گئے لیبل قبول کر لئے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل دہشت گرد اور انتہا پسند خود اہل مغرب ہیں جو طرح طرح سے اسلام کے خلاف مصروف سازش رہتے ہیں کبھی براہ راست حملے اور دہشت گردی کرکے اور کبھی مسلمانوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر۔ جس کے لیے یہ انسانیت سے گری ہوئی حرکات کرکے اپنی حیوانی خصلت اور جبلت کا ثبوت دیتے رہتے ہیں کیونکہ انکے یہ افعال انتہا پسندی سے بھی آگے بڑھ کر حیوانیت کا ثبوت ہیں خود کو امن کے پیامبر اور داعی کہنے والے یہ انتہا پسند دہشت گرد ہی دراصل دنیا کے امن کے دشمن ہیں ورنہ کسی بھی مذہب کا مذہبی رہنما اس قدر گھناؤنی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اس پادری کو کم از کم پاکستان کے مسیحیوں نے تو پادری ہی ماننے سے انکار کر

دیا ہے کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے دین کو کبھی نہیں چھیڑا گیا جبکہ وہ دوسرے کے دین میں دخل دینے والے شیطان ہیں اسلام تو وہ دین ہے جو کہتا ہے کہ کافروں سے کہہ دو کہ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتا ہے کہ تمہارا کام اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے تم انکے اعمال کے ذمہ دار نہیں ہو۔ جو جنگ میں بھی بے بس پر ہاتھ اٹھانے سے منع کرتا ہے جو تاکید کرتا ہے کہ

فقط اُن سے لڑو جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں

فقط اُن سے لڑو جو تم پہ جینا تنگ کرتے ہیں

کے جس واقعے کی ایک بیہودہ آڑ لے کر یہ بیہودہ حرکت کی گئی اس واقعے کی 9/11 صحت پر کسی کو بھی یقین نہیں بلکہ خود حقیقت پسند امریکی اُسے ایک سازش قرار دیتے ہیں جس کو بہانہ بنا کر پہلے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی پھر پاکستان کے امن کو تباہ کیا گیا اور پھر پورے عالم اسلام کو دہشت گرد قرار دیا جانے لگا۔ 11/9 کا ذمہ دار قرآن پاک کو قرار دینا صرف ملعون ٹیری جونز کا نکتہ نظر نہیں بلکہ امریکی حکومت کا بھی یہی خیال ہے جبکہ وہ خود اس ڈرامے کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہیں۔ ایسے شیطانی منصوبے بنانے کے لیے یہودی ذہن انتہائی زرخیز اور باکمال ہے لہذا مجرموں کو ڈھونڈ نے کے

لیے اسرائیل کا رخ کرنا زیادہ بہتر ہوگا لیکن معاملہ وہی ہے کہ مسلمانوں کے جذبات سے ہی کھیلنا ہے کیونکہ یہ عیسائی اور یہودی سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دوسرے مذاہب کا احترام کرتا ہے اُن کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ان کی عبادت گاہوں کا احترام کرتا ہے اقلیتوں کو حقوق دیتا ہے انکی حفاظت کا ذمہ دار مسلمان حکومت کو گردانتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا اور اگر مسلمان انتہا پسند اور دہشت گرد ہوتے تو نہ جانے اب تک (نعوذباللہ) کتنے بائبل نذر آتش ہو چکے ہوتے کتنے گرجے اپنے عبادت گزاروں سمیت ڈھائے گئے ہوتے بائبل کے بارے میں تو کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا کہ اُکی بے حرمتی کرے کیونکہ اسلام انہیں نہ صرف ایسا کرنے سے روکتا ہے بلکہ انہیں پہلی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے پھر اِن لعنتی کرداروں سے کوئی پوچھے کہ کیسے وہ اسلام، قرآن اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں دہشت گرد اور انتہا پسند تو خود مغرب ہے جس نے دنیا کے امن کو تہہ و بالا کیا ہوا ہے تنگ نظر تو یہ خود ہیں کہ اسلامی عقائد و نظریات پر پابندی عائد کرتے ہیں اور وہ اس سے خائف ہیں کیونکہ وہ بھی مدینہ کے یہودی سرداروں کی طرح جانتے ہیں کہ اسلام ہی وہ دین ہے کہ جس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کی بشارت اُن کے نبیوں نے دی تھی۔ لیکن وہ اپنی ضد میں اس پر ایمان نہ لاتے تھے اور یہی حال عیسائیوں کا تھا آج ملعون ٹیری جونز کی حرکت پر وہ عیسائی یاد آرہا ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ مائدہ کی آیت نمبر 58 میں

کیا گیا جو اذان سن کر کہتا تھا کہ جل جائے جھوٹ کہنے والا ایک دن اسکا غلام گھر ایک آگ لایا جس سے رات کو گھر میں آگ لگ گئی اور وہ اور اسکے تمام اہل خانہ جل مرے تو اگر صرف کہنے والا جل سکتا ہے تو جلانے والا بھی یقیناً اس سزا سے گزر سکتا ہے تا ہم اللہ پر اس مکمل یقین کے ساتھ ہم نے بھی کچھ کرنا ہے اور مسلمان ممالک کو بحیثیت ملت اس معالے پر اپنا رد عمل دکھانا چاہیئے بطور احتجاج اپنی ہی اسمبلیوں کے اجلاس ملتوی کرنے سے کچھ نہ ہوگا بلکہ بائیکاٹ ہم نے مجرموں اور انکی حکومتوں کا کرنا ہوگا اور ان کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ مسلمانوں کی طرف سے کسی بھی انتہائی اقدام کے لیے انہیں تیار رہنا چاہیے۔ مسلمان ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں، شیطانی بے حیائی پھیلانے والی انکی فلمیں فخر سے اپنے ملک میں چلانا بند کر دیں اور جو سب سے بڑا ہتھیار قدرت نے انکے ہاتھ میں دیا ہے یعنی 'تیل' اس قرآن کے لیے دینا بند کر دیں پھر اُن کی بلبلا ہٹ بھی دیکھیں اور پوری اسلامی دنیا میں ان کی ظالم افواج کی شکست کا منظر بھی کیونکہ پہلے ڈرا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (قربان ہوں ہم سب اس نام پر) اب قرآن پاک کی علی اعلان بے حرمتی شاید کسی اور انتہا پسندی بلکہ بیہودہ انتہا پسندی کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی مسلمان عوام اس کا موقع دیں گے۔ او آئی سی کا اجلاس تو جب ہو تو ہو۔ ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی کسی مسلمان کی غیرت وحمیت اور پہنچ نہ صرف اس ابلیس کو اس کے تیں مشیروں سمیت نشان عبرت بنا دے بلکہ امریکہ کی شیطان کی مدد

گار حکومت کو اس کے مددگاروں سمیت کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کر دے جو یقیناً 9/

11 سے بڑی ہو۔

امن ! مگر دستار نہ گر پڑے

امن دنیاکے ہر انسان کی خواہش ہے اور دیکھا جائے تو اخلاقیات کے تمام سبق چاہے وہ
جس مذہب کے ہوں اسی امن کی ترویج کے لیے ہی ہیں۔ کوئی بھی ملک ہو اس کے
عوام کی پہلی خواہش ایک اچھی اور آسان زندگی گزارنا ہوتا ہے۔ یہی حال پاکستانی
عوام کا بھی ہے اور گزشتہ برسوں سے تو وہ جس طرح سے بدامنی ، دہشت گردی اور
قتل و غارت گری کا شکار ہیں اسکے بعد تو یہ خواہش مزید شدت اختیار کر گئی ہے بلکہ یہ
پاکستانیوں کا خواب بن گیا ہے کہ ایسا بھی کوئی وقت ہوگا کہ وہ بے دھڑک اپنے ہی
ملک میں گھوم سکیں گے مائیں اپنے بچوں کو بے فکری سے سکول اور مسجد بھیج سکیں گی۔
کھیل کے میدان آباد ہو سکیں گے تجارت باعث رزق و برکت ہو گی لیکن اس خواب
کی تعبیر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بیرونی قوتیں ہیں پاکستان کے عوام انہی
قوتوں کو جارحانہ ارادوں کے سبب ہی اپنی فلاح و بہبود پر صرف ہونے والی بہت بڑی
رقم کو فلاحی کاموں کی بجائے دفاعی ضرورت پر خرچ کرنے پر مجبور ہیں جس کا احساس
ہر شخص کو بھی ہے اور ہر ذمہ دار کو بھی لیکن مسئلہ جب زندگی اور موت کا ہو تو ظاہر
ہے زندگی کی سانسیں بحال رکھنے کے لیے ہر قیمت پر جدوجہد کی جاتی ہے یہی حال
پاکستان کا ہے جسے بد قسمتی سے اپنی سرحد پر ہی ایک ایسے دشمن کا سامنا ہے جس کی نیت
کبھی پاکستان کے

لیے اچھی نہیں ہوئی قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہر موقع پر بھارت ہماری جڑوں کو کاٹنے میں مصروف ہے اور مستقبل قریب میں اس کا اپنا رویہ تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نظر بھی نہیں آتا اور مسئلہ یہ ہے کہ یہ رویہ عوام کی سطح سے لے کر اعلیٰ حکومتی سطح تک موجود ہے اگر چہ یہی حال پاکستان اور پاکستانیوں کا بھی ہے لیکن پاکستانیوں کا یہ رویہ زیادہ تر بھارتی رویوں کا ردعمل ہوتا ہے اور اس رویے کی جڑیں بھی بھارت کی پیدا کردہ ہیں کشمیر کا مسئلہ ہو یا پانی کا اس کا ذمہ دار بھارت ہی ہے اور دنیا کی کوئی عدالت اِن مسائل کے لیے پاکستان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتی۔پاکستان لاکھ خواہش کے باوجود ان مسائل کو پر امن طور پر حل نہیں کروا سکتا جب تک بھارت نہ چاہے۔ہم اپنی طرف سے جتنی بھی امن کی فاختائیں اڑائیں جب تک بھارت کا رویہ مثبت نہ ہو جائے کچھ نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہو جائے تو ظاہر ہے.برصغیر کے تقریباً ڈیڑھ ارب انسان سکھ کا سانس لے لیں گے پھٹے پرانے کپڑے پہنے اس خطے کے باسی بقا کی جنگ کی فکر سے آزاد ہو جائیں مگر شرط وہی بھارت کی رضا۔لیکن آج کل جو ایک ہوا پاکستان میں چلی ہے وہ ہے ہر صورت، ہر قیمت پر امن کی ہوا چلانے کی خواہش چاہے ایسا کوئی جھونکا ادھر سے نہ آئے اور اس ساری تگ و دو کے بعد بھی بھارت کی طرف سے کسی ایسی خواہش کا اظہار نہیں ہو رہا بلکہ وہ مسلسل اپنی فطرت پر اڑا ہوا ہے اور پاکستان سے متعلق منفی پروپیگنڈے میں نہ صرف حکومتی سطح پر مصروف ہے بلکہ میڈیا اور عوام دونوں

جگھوں پر بھی پاکستان کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے اور امن کی آشا کے نام پر دو چار لو گوں کو پاکستان کے دورے پر بھیج کر جنھیں ہمارے کچھ بھارت نواز لوگ اور چینلز وی آئی پی حیثیت دے کر انہیں اس طرح اہم بنا دیتے ہیں جیسے بھارت کا صدر یا وزیر اعظم پاکستان آیا ہو اور پاکستان کے لیے انتہائی خیر سگالی کے جذبات لایا ہوں جبکہ دوسری طرف پاکستانیوں کے ساتھ اسکے الٹ سلوک کیا جاتا ہے جس کا ثبوت راحت فتح علی خان کے ساتھ کیا گیا سلوک ہے جو وہی سُر لے کر بھارت گئے جس کی بعض لوگوں کے مطابق کوئی سرحد نہیں ہوتی اور وہ کہتے ہیں کہ ''یہ سر بلائے ہیں جب تم ادھر نہیں آتے''۔ ابھی کرکٹ ٹیم ہی کو لیجئے کہ انڈین میڈیا نے کس طرح اسے بدنام کرنے کی کوشش کی اور انتہائی گرے ہوئے الفاظ سے اس کا ذکر کرتے رہے یہاں تک کہ پاکستان کرکٹ ٹیم کی پریکٹس کے انداز کو ان کی گراؤنڈ میں با جماعت نماز کو غرض ہر چیز کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور ایک جارحانہ انداز اختیار کیے رکھا گیا آئی پی ایل کے دوران پاکستانی کھلاڑیوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا تھا وہ بھی ابھی سب کو یاد ہے۔

اب اگر امن کی خواہش اور آشا لیے ہم ہی امن کی پتنگیں اڑاتے رہیں کہ آسمان تو سب کا سا جھا ہے اور وہاں سے مسلسل تذلیل ہوتی رہے تو ظاہر اسے ہماری کمزوری ہی سمجھا جائے گا امن کی خواہش بجا مگر۔

سر کو جھکا کے ملنے میں کیا حرج ہے مگر
اتنا نہ جھکا سر کو کہ دستار گر پڑے
دشمن بڑھائے ہاتھ تو تم بھی بڑھاؤ ہاتھ
ہاں مگر یہ نہ ہو کہ ہاتھ سے تلوار گر پڑے

کیونکہ امن کے لیے طاقت کا توازن پہلی شرط ہے اس وقت بھارت اپنا دفاعی بجٹ 34 ارب ڈالر تک پہنچا چکا ہے اور ہتھیاروں کے کئی سودے زیر تکمیل ہیں مسلسل جارحانہ جنگی حکمت عملیاں ترتیب دی جا رہی ہیں جو صرف اور صرف پاکستان کے خلاف ہوتی ہیں اگرچہ اپنا دفاع ہر ایک کا حق ہے لیکن دوسروں کا امن تباہ کرنے کا حق کسی کو نہیں جس کا ارتکاب بھارت مسلسل کر رہا ہے۔ فاٹا اور بلوچستان میں بھارت کی مداخلت سب ہی جانتے ہیں اور اپنی طویل سرحد کے علاوہ وہ افغانستان کے راستے بھی پاکستان میں مسلسل دراندازی کر رہا ہے اور اپنی دشمنی اور بغض کو ہر راستے سے نکالنے میں مصروف ہے را کو تو بنایا ہی پاکستان کے خلاف گیا ہے اور وہ اب یہ کام محاورۃً نہیں حقیقتاً خیبر سے کراچی تک بڑی تندہی سے کر رہا ہے پھر امن کیسے قائم ہو سکتا ہے امن کبھی بھی ایک کی خواہش کے مطابق نہیں ہو سکتا اسکے لیے دو طرفہ خواہش ضروری ہے اور جب تک بھارت یہ خواہش نہ کرے پاک بھارت تعلقات بہتر نہیں ہو سکتے

کیونکہ جارح بھی وہ ہے اور قابض بھی وہ کشمیر کا قبضہ چھوڑ دے ،آبی جارحیت ختم کر دے ،واہگہ کے ادھر لاشیں نہیں زندہ انسان واپس کرے، پاکستان میں دہشت گردی بند کر دے، خیبر سے لے کر کراچی تک خون خرابے کا منصوبہ ختم کر دے، پاکستان کو ختم کرنے کی خواہش ختم کر دے تو امن خود بخود قائم ہو جائے گا وہ لوگ اور چینلز اگر بھارت سے یہ ساری ضمانتیں حاصل کر لے تو امن خود بخود ہر پاکستانی کی خواہش بن جائے گا۔

جو حد سے گزر گئے

اخلاق، اقدار، روایات، معاشرہ، ثقافت یہ سارے خوشنما الفاظ اب بھی ہماری روزمرہ زندگی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن عملاً لگتا ایسا ہے کہ یہ سب ہمارے معاشرے سے رخصت ہوتے جارہے ہیں ہم میں سے ان کی حفاظت کے دعویدار تو بہت ہیں لیکن لگتا ایسا ہے کہ بات دعوؤں سے آگے نہیں بڑھ رہی بلکہ ہر ایک حتی الوسیع ان الفاظ تک کو مٹانے کے درپے ہے ہمارے معاشرے کا ہر فرد اس میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے اور پچھلے دس پندرہ سالوں میں ہم نے اپنے معاشرے کی ہیتِ ترکیبی کو جس طرح بدل کر رکھ دیا ہے ہم نے اپنی شناخت کو داؤ پر لگا دیا ہے ماڈرن ازم کے نام پر ہم نے مغرب کی ہر بیہودگی کو اپنانا شروع کر دیا ہے یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ اس کا ہماری اپنی معاشرتی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے اور کیا کیا مسائل معاشرے میں جنم لے رہے ہیں ہم خود کو ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ ظاہر کرنے کے لیے انکی روایات اپنا رہے ہیں ویلنٹائن ڈے پر تو اتنا لکھا اور بولا جا چکا ہے کہ میں مزید کیا کہوں مجھے تو خوف ہے کہ کچھ ہی عرصے میں تکیوں کی نامعقول جنگ بھی ہماری تفریحات وترجیحات میں شامل نہ ہو جائے۔ ماں باپ کی محبت کو تو ہم مدر، فادر ڈے تک لے آئے ہیں کہ اسی دن تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں بلکہ اس دن کے لیے روک کر رکھے جاتے ہیں۔ ہمارے نیوز چینلز جن فیشن شوز

کو مشرق و مغرب کا حسین امتزاج کہتے ہیں وہ ہمارے معاشرے کا اعشاریہ ایک فیصد لوگ بھی نہیں پہنتے لیکن کچے ذہنوں کو بے راہرو کرنے کے لیے انہیں ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے بلکہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے اشتہارات اب ڈانس شوز بن چکے ہیں۔ سادگی کی جگہ تضع اور بناوٹ لیتی جا رہی ہے جس نے کئی نفسیاتی امراض کو بھی بڑھا دیا ہے ڈیپریشن اور ذہنی دباؤ میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے مقابلے کے رجحان میں خطرناک حد تک اضافے نے رشوت، بدعنوانی اور خیانت جیسی برائیوں کو معاشرے کی جڑوں تک پہنچا دیا ہے، اور تصویر کا دوسرا رخ اس سے بھی بڑھ کر خطرناک ہے اور وہ ہے مذہبی انتہا پسندی جس کو اپنا کر بہت سے لوگوں نے اسلامی میانہ روی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے ہم اکثر یہ تجزیے کرتے ہیں کہ کس طرح اسلام کے نام پر اسلام کو بدنام کرنے والے دشمن اتنی کامیابی کے ساتھ اپنے لیے کارندے ڈھونڈ لیتے ہیں اگرچہ یہ سب کچھ کروانے والوں کو کم از کم میرا دل مسلمان ماننے کو تیار نہیں اور بہت سارے ایسے ثبوت اور مشاہدات ہیں کہ یہ لوگ دین کی بنیادی تعلیمات سے بھی پوری طرح واقف نہیں کجا کہ عالم دین ہونا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دہشت گردی کے مختلف واقعات میں استعمال ہونے والے کارندے خود ہمارے ہی لوگ ہیں اور اسلام ہی کے نام پر انہیں ورغلایا گیا ہوتا ہے اور یہ کام بہت آسانی سے کر لیا جاتا ہے جب مدارس کے یہ بچے اسلامی تعلیم حاصل کرتے کرتے ماڈرن ازم کے نام پر عریانیت اور بے راہروی کو دیکھتے ہیں تو خود

بخود ان کے اندر مزاحمتی جذبات پیدا ہوتے ہیں جنھیں بڑی آسانی سے استعمال کر لیا جاتا ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ایک انتہا کے رد عمل میں دوسری انتہا جنم لیتی ہے اور یہی کچھ ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے۔

بلکہ ہم خود غیروں کے آلہ کار بن کر ایسا کر رہے ہیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ دونوں انتہاؤں پر ڈور تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے لیکن آلہ کار ہم خود ہیں ہم مذہبی انتہا پسندی کی شکایت بھی کرتے ہیں اور اس سے شاکی بھی ہیں خاص کر ہمارا میڈیا بھی اس صورت حال پر پریشانی کا اظہار بھی کر رہا ہے لیکن خود وہ دانستگی میں زیادہ اور شاید کچھ نادانستگی میں بھی اس انتہا پسندی کو فروغ دے رہا ہے جسطرح کے ملبوسات اور پھر حرکات و سکنات ہمارا میڈیا فن اور فیشن کے نام پر دکھا رہا ہے وہ ہماری تہذیب و ثقافت تو کسی طور پر بھی نہیں۔ ہمیں اس پر غور ضرور کرنا ہو گا اعتدال پسندی اور روشن خیالی کے نام پر جو طوفان بد تمیزی برپا کیا جا رہا ہے اسے روکنا بہر صورت ضروری ہے یہ اعتدال پسندی ہر گز نہیں بلکہ ماڈرن ازم کی انتہا پسندی ہے اور ایک انتہا کو دوسری انتہا سے کاٹا جا رہا ہے انتہا پسندی کے ایک سرے پر اپنے دین اور ثقافت سے بے خبر میڈیا اور فیشن شوز کے منتظمین اور دوسری طرف ہر علم سے بے زار طالبان اور وہ بے علم لوگ اور بچے جنھیں یہ سب کچھ دکھا کر بڑی آسانی سے باور کرا دیا جاتا ہے کہ ایک عام آدمی اور عام مسلمان

اسلام سے کتنی دور اور کتنا بے راہرو ہے اور یوں وہ پاکستان کے خلاف نبرد آزما دشمن قوتوں کے کام بڑی آسانی سے آجاتے ہیں۔

ہمیں بطور ذمہ دار شہری، بطور منظم معاشرے، حکومت کو بحیثیت ذمہ دار معقول اور مسلمان نمائندہ حکومت کے اور میڈیا کو ایک ایسے موثر ذریعہ کے جو لوگوں کے خیالات بڑی کامیابی اور آسانی سے موڑ سکتا ہے کو کہ اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہوں گی ورنہ ہمارا معاشرہ اور ثقافت دونوں انتہاؤں پر دین اور اعتدال پسندی سے جس طرح دور ہوتا جارہا ہے وہ اسے جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہا ہے ہماری واپسی کے تمام راستے بند ہوتے جائیں گے خاص کر بھارتی چینلز زبان کی سمجھ کی وجہ سے جس طرح ہمیں نقصان پہنچا رہے ہیں وہ انتہائی خطرناک ہے نیوز اور ڈراما چینلز بند کرنے کے بعد ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہم محفوظ ہو چکے ہیں جبکہ وہ ننھے منے ذہن جو کسی کورے کاغذ کی طرح ہر تحریر کو اپنے اوپر جگہ دینے کو ہر وقت تیار پڑے ہیں اب بھی وہ سب کچھ دیکھ رہے بچوں کے چینلز کی اکثریت کارٹونز کے نام پر نہ صرف غیر اسلامی الفاظ بلکہ نظریات بھی ان بچوں کو سکھا رہے ہیں پیغمبر سے پہلے وہ اوتار کا تصور سیکھ رہے ہیں کرنے والے تو یہ سب کرتے رہیں گے لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہم یہ سب کچھ دکھائیں کیوں اور پھر اس کے رد عمل پر شکوہ کناں رہیں شدت کا رد عمل تو شدت ہی سے آئے گا اور جب یہ رد عمل آئے تو معاشروں میں شدت پسندی

قدرتی امر ہے اور یہی شدت پسندی پھر دہشت گردی کا روپ اختیار کر لیتی ہے فطری رد عمل کے طور پر اور دوسرے یہ کہ دشمن کے لیے ایسے لوگوں کو خریدنا اور ان کے جذبات استعمال کرنا انتہائی آسان ہو جاتا ہے اور یہی وہ عوامل ہیں جس نے ہمیں موجودہ مصائب میں مبتلا کر رکھا ہے مسائل کے حل کے لیے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا انتہائی ضروری ہے اور اپنی نااہلیوں اور کوتاہیوں کا ادراک اور پھر ان کی درستگی مزید ضروری، اس لیے دوسروں کو الزام دینے کے ساتھ اپنے گریبان میں بھی جھانکنا ضروری ہے۔

امریکی ناکامی۔۔۔ واحد قابل عمل منصوبہ

امریکی کانگریس نے اپنی ایک رپورٹ میں بڑی دیدہ دلیری سے کہا ہے کہ پاک فوج کے پاس دہشت گردی سے مقابلہ کرنے کے لیے کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ یعنی ایک بار پھر اپنی ناکامی کا الزام پاکستان کے سر رکھ دیا گیا اس لایعنی امریکہ کی خود ساختہ اور پاکستان پر مسلط کردہ جنگ میں پاکستان کے عوام اور فوج نے جس قدر قربانیاں دیں وہ خود امریکہ اور اسکے اتحادیوں کی مجموعی ہلاکتوں سے کہیں زیادہ ہے جس پر کسی پاکستانی کو فخر نہیں لیکن دکھ ضرور ہے ہاں اپنے ملک میں امن بحال کرنے کے لیے ہماری فوج اور دوسرے سیکیورٹی اداروں کے اہلکاروں نے اپنے عوام کی جانیں بچانے کے لیے جس طرح اپنی جانیں قربان کیں وہ قابل فخر ہیں اور اس سارے جانی نقصان کا ذمہ دار امریکہ ہے اس نے علاقے میں اپنی موجودگی کے لیے دہشت گردی کا شوشا چھوڑا اور پھر یہاں اسے پروان چڑھایا میں ایسا اس لیے کہہ رہی ہوں کہ خود امریکہ کی یہاں موجودگی ہی دہشت گردی کی بڑی وجہ ہے آج امریکہ یہاں سے کوچ کر جائے دہشت گردی کا مسئلہ خود بخود ختم ہو جائے گا کیونکہ یہ جنگ دراصل امریکہ کے خلاف ہے جسے وہ اپنے دیگر مددگاروں کے ذریعے پاکستان اور افغانستان میں لڑ رہا ہے اور وہ مددگار بھارت، اسرائیل اور نیٹو ممالک کی افواج ہیں جبکہ بھارت اور اسرائیل کی خفیہ

ایجنسیاں مسلسل پاکستان میں گڑبڑ پھیلانے میں مصروف ہیں بلکہ تمام تر دہشت گردی کی منصوبہ بندی انہی لوگوں کی مرہون منت ہے پیسہ ادھر ہی سے آرہا ہے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وزیرستان، سوات، خیبر یا بلوچستان کے وہ غریب لوگ جو دو وقت کے کھانے کو ترستے تھے، وہ لوگ جو انتہائی معمولی کاروبار یا مزدوری کرتے تھے اچانک لیڈر بن گئے۔بڑی بڑی گاڑیوں کے مالک بن گئے ظاہر ہے یہ سب کچھ بیرونی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا اور نہ ہے یہ مدد اب بھی جاری ہے اور یہ سب کچھ کرنے والے اب ہر الزام پاکستان پر دھر رہے ہیں کہ اُس کے پاس دہشت گردی روکنے کا کوئی منصوبہ نہیں جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ پاکستان اس محاذ پر کئی دشمنوں سے برسرپیکار ہے اگرچہ پاکستان کے عوام کو اس بات پر اعتراض ہے کہ ہم امریکی جنگ سرزمین پاکستان پر کیوں لڑ رہے ہیں۔ لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ یہی طاقتیں پاکستان کے کسی منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دیتی کیونکہ اگر اس جنگ کو ختم کرنے میں پاکستان کامیاب ہو جائے تو آخر امریکہ کو یہاں رکنے کے لیے کیا جواز پیش کرنا ہوگا پاکستان اپنی تمام تر قوت اور اپنے وسائل سے بڑھ کر اس جنگ پر خرچ کر رہا ہے ہم نے اپنی معاشی، معاشرتی، تعلیمی، طبی ہر قسم کی ترقی داؤ پر لگا دی ہے امریکہ اس جنگ کو ختم کرنے میں سنجیدہ نہیں اسی لیے بات بات پر پاکستان کی امداد روکنے کی دھمکیاں دینے لگتا ہے اس بات کا احساس کئے بغیر کہ پاکستان اپنے وسائل سے بڑھ خرچ کر رہا ہے۔ حکومت پاکستان کو امریکہ کے اس اعتراض پر ایک

مضبوط موقف اپنانا چاہیئے اگر چہ ابھی تک ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے اور اگر آیا بھی ہے تو بہت جلد ہتھیار ڈال دیئے گئے ریمنڈ ڈیوس کا معاملہ ہی لیجئے جس کے لیے ایک بھونڈا جواز یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ مقتولین کے رشتہ داروں نے دیت قبول کر لی معاملہ مقتولین اور اسکے رشتہ داروں تک محدود ہوتا تو بات قبول ہوتی لیکن معاملہ تو جاسوس ریمنڈ ڈیوس کا تھا اپنے مقاصد کے لیے کارندے بھرتی کرنے کا تھا۔ فیضان اور فہیم جو بھی تھے ان کے ورثا نے دیت جیسے بھی قبول کی حکومت پاکستان کوئی مضبوط موقف نہ اپنا سکی ڈرون حملوں کو ہی لیجئے شروع شروع میں تو احتجاج ہو ہی جاتا تھا اب تو وہ بھی نہیں ہو رہا۔ شمالی وزیرستان میں جرگے پر ڈرون حملے پر فوج نے جو شدید احتجاج کیا اُس کے بعد حکومت کو بھی یہ احساس ہوا کہ شمالی وزیرستان کے لوگ بھی پاکستانی ہی تھے اور مرنے والوں میں کوئی نام نہاد دہشت گرد بھی نہیں تھا اور درحقیقت یہی احتجاج تھا جو امریکہ کو کھٹک گیا اور اُس نے پاکستان پر اعتراضات بڑھا دیئے کہ پاکستان کے پاس کوئی منصوبہ بندی نہیں ہے کہ وہ دہشت گردی روک سکے۔ حکومت اور سیاست کی تو جو بھی مصلحتیں ہوں لیکن ایک عام پاکستانی اس کا بڑا آسان حل پیش کرتا ہے افغانستان سے امریکی فوجوں کی واپسی اور وہاں کے لوگوں کو اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنے کا حق دینا اور پاکستان میں خفیہ سرگرمیاں چاہے خود یا کسی اور ملک کے توسط سے ہوں ختم کرنا ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی غربت اور معصومیت کا فائدہ اٹھانا بند کرنا ہوگا

ان پر بمباریاں بند کرنی ہونگی اور یہ توقع رکھنا کہ امریکہ خود ایسا کرلے گا یا میرے جیسے عام پاکستانیوں کے لکھنے کہنے سے بند کردے گا سراسر حماقت ہے ایسا کروانے کے لیے ہماری حکومت کو کچھ کرنا ہوگا اور اپنی اہمیت منوانی ہوگی امریکہ بھی جانتا ہے کہ اس وقت اُسے پاکستان کی کتنی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ آجاکے اپنی ناکامی کا الزام پاکستان کے سر رکھ دیتا ہے جو اُس نے ابھی بھی کیا وہ جانتا ہے کہ پاک فوج ہی کی منصوبہ بندی تھی کہ سوات میں طالبان کے خلاف فتح ممکن ہوسکی لہٰذا امریکہ کو یہ بیان سوچ سمجھ کر دینا چاہیے تھا بلکہ اگر وہ اسے اپنی فوج پر منطبق کرکے کہہ دے تو زیادہ بہتر ہوگا جس نے اگر کہیں کوئی کامیابی حاصل کی بھی تو منصوبہ بندی کی وجہ سے نہیں بلکہ طاقت کے بل بوتے پر اور عام شہری آبادی کے قتل عام سے ہی ، کہ حکومتیں اپنے شہریوں کے مزید قتل عام کے خوف سے جنگ بندی پر مجبور ہو جاتی ہیں لیکن پاکستان جنگی طاقت کے لحاظ سے نہ تو عراق ہے نہ افغنستان ، ویت نام یا لیبیا۔اور یہ امریکہ کو بہر حال ایک سخت مقابلہ دے سکتا ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ سی آئی اے کی طرح امریکہ فوج کے سر بھی کسی عظیم منصوبہ بندی کا سہرا نہیں ہے۔ یہی حال اُس کا افغنستان میں بھی ہے کہ آٹھ سال سے لڑتی ہوئی جنگ کو وہ کسی انجام تک پہنچانے سے قاصر ہے۔ لہٰذا ان کے الزام کے جواب میں حکومت پاکستان کو ان تک اپنا اور پاکستانی عوام کا مخلصانہ مشورہ اور منصوبہ پہنچادینا چاہیئے کہ افغان مسئلے اور دہشت گردی کی جنگ

کے خاتمے کا ایک ہی حل ہے کہ امریکہ خطے سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لے تا کہ یہاں کے لوگ امن اور چین سے رہ سکیں اور وہ اپنی جنگ اپنے ملک میں لڑے تو پوری دنیا جو امریکہ کو محفوظ رکھنے کے لیے اس آگ میں جھونکی گئی ہے محفوظ ہو جائے گی۔

افغانستان میں مہذب امریکہ کی وحشت

انسانی حقوق اور تہذیب ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں لیکن آج کل جتنا چرچا اس چیز کا کیا جا رہا ہے وہ پہلے شاید کبھی نہ تھا اور ساتھ ہی جتنا آج کل انسانی حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے شاید پہلے کبھی اس قدر نہ کیا گیا تھا۔ فاتح اقوام نے ہمیشہ ہی مفتوح اقوام کے افراد کے ساتھ ظلم و زیادتی کے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں اُن سے تاریخ بھری پڑی ہے چاہے وہ سکندر اعظم تھا یا چنگیز خان یا ہلاکو خان سب نے ایک ہی خصلت پائی تھی اس میں مشرق و مغرب کی تخصیص نہیں تھی اور نہ زمانے کی ہاں اگر عظیم فتوحات میں سے کوئی فتح تھی اور پر امن بھی تھی بلکہ سکون و اطمینان بھی تھی وہ تھی فتح مکہ اور یہاں فاتح وہی مذہب اور اُس کا پیغمبر تھا جس مذہب کو آج یہ بدبخت دنیا کے امن کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف تمام مغرب اور کفر صف آرا ہے جبکہ خود یہ جن جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں اسکی نظیر دورِ وحشت سے بھی بمشکل ملے گی اسکی تازہ ترین مثال بلکہ انکشاف جرمنی کے ایک رسالے Der Spiegel اور رولنگ سٹون میگزین نے کیا ہے اِن رسالوں میں امریکہ کے کچھ سپاہیوں کی وہ بربریت دکھائی گئی کہ جسے دیکھ کر انسانیت شرما جاتی ہے مثلہ بنانے کی وہی جاہلانہ روایت بزعم خود ایک مہذب ترین قوم دہرا رہی ہے پہلے عام سویلین افغانی مارے گئے اور

پھر اُن کی لاشوں کی جس طرح بے حرمتی کی گئی وہ امریکہ ہی کا وصف ہو سکتا ہے اِن تصاویر کے بارے میں خبر ہونے پر پینٹاگون اور امریکی حکومت نے ہر ممکن کوشش کی کہ انہیں منظر عام پر نہ آنے دیا جائے اسکے لیے ایک درجن سے زائد کمپیوٹر قبضے میں لیے گئے۔اِن کاروائیوں میں ملوث فوجیوں کے رشتہ داروں تک سے رابطے کیے گئے کہ اگر اُن کے پاس ایسی کوئی تصویر ہو تو غائب کر دی جائے تاہم پھر بھی یہ تصاویر منظر عام پر آ ہی گئیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ افغانستان میں امریکی فوجیوں نے کلر ٹیم (Killer Team) کے نام سے ایک گروپ بنا رکھا ہے جو وحشت و بربریت کے تمام پچھلے ریکارڈ توڑ رہا ہے۔اِن تصاویر میں ایک افغانی کا سر کاٹ کر اسے رکھا گیا ہے اور یہ فوجی اسے تختہ مشق بنا رہے ہیں اسی طرح 15 جنوری 2010 کو ایک پندرہ سالہ نہتے لڑکے گل مدین جو قندھار کے نزدیک ایک گاؤں کلے لا محمد کا رہنے والا تھا کو بغیر کسی وجہ کے گرینیڈ مار کر شہید کر دیا گیا اور پھر بہادری کے سند کے طور پر اسکی تصویر اتاری گئی پھر اسکے کپڑے اتار کر اسکی لاش کے ساتھ چاقو اور قینچیوں سے کھیلا جاتا رہا اور اس کے ہاتھ کی انگلیاں کاٹ لی گئیں۔

اسی طرح نومبر 2009 میں جب امریکی فوجیوں کو ایک گن شپ ہیلی کاپٹر کے حملے میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں لانے کو کہا گیا تو وہاں بھی اِن لاشوں کی بے حرمتی کی گئی اور سارجنٹ گبز نے بطور ''یادگار ٹرافی'' لاشوں کی

انگلیاں کاٹ لیں اسی طرح کچھ کٹی ٹانگیں اور سر ہیں جن کو تختہ مشق بنایا جارہا ہے ایک اور تصویر میں ایک لاش کے گلے میں ایک گتے کا بورڈ لٹکایا گیا ہے جس پر یہ لکھا ہوا ہے ''مرا ہوا طالب'' جبکہ رپورٹ کے مطابق یہ شخص ان بے گناہ کسانوں میں سے تھا جنھیں امریکیوں نے مار دیا تھا۔ یہ وارداتیں یقیناً صرف تیسری پلاٹون کے کلر گروپ تک محدود نہیں بلکہ پوری امریکی فوج اسی نوعیت کے جنگی جرائم میں ملوث ہے اور جس طرح امریکی محکمہ دفاع نے اِن تصاویر کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی کتنی ہی کوششوں میں وہ کامیاب ہو چکا ہو گا اور کتنی ہی وارداتوں کی تصاویر بھی نہ اتری ہو نگی لیکن آسمان وزمین کانپے ہونگے کہ بہادر افغان بزدل دشمن کے چھپے ہوئے وار کی زد میں آ گئے۔ گارجین میں ملالئی جویا کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اُس نے 2009 میں کنڑ صوبے میں پنسٹھ دیہاتیوں کے مارے جانے کا ذکر کیا ہے جن میں سے نو وہ بچے شامل تھے جو گھر کا چولہا جلانے کے لیے خشک لکڑیاں اکٹھی کر رہے تھے۔ مضمون نگار جو خود افغان ہے اور ظاہر ہے غیر ملکیوں کے مقابلے میں افغانستان کے حالات بہتر جانتی ہے اسکے مطابق مقتولین کے خاندانوں کو دو ہزار ڈالر فی کس دینے کی پیشکش کی جاتی ہے یعنی ایک افغان کی زندگی کی قیمت دو ہزار ڈالر اور ایک امریکی کی جان کے بدلے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمانوں کی جانیں۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ امریکی جرائم نئے ہیں ماضی قریب ہی کی تاریخ میں امریکہ ویت نام اور پھر عراق میں یہی کچھ کرتا رہا اور جب سے افغان جنگ

شروع ہوئی ہے بلکہ خود امریکہ نے کی ہے تو اب وہ اپنی وحشت و بربریت کا جنون افغانیوں پر پورا کر رہے ہیں کبھی جرگوں پر اور کبھی سکولوں پر بمباری کی صورت میں اپنا جنگلی پن نکال رہے ہیں۔2009 میں رات کو مارے جانے والے چھاپوں میں سو عام شہری مارے گئے جن میں حاملہ خواتین بھی شامل تھیں جن کے بچوں کو اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔

The American Muslims کی ایک رپورٹ کے مطابق حاجیوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

عام افغانیوں کے لیے امریکی فوجیوں کے مکے، تھپڑ، گالم گلوچ اور لاتیں اب عام سی بات رہ گئی ہے۔

یہ تو صرف وہ جرائم ہیں جو منظر عام پر آسکے ورنہ امریکہ خود جن ملکوں میں حالات خراب کرتا ہے اور اُنہیں درست کرنے کے بہانے وہاں اپنی فوجیں بھیجتا ہے تو پھر اسکی فوج ہر قدم پر جنگی جرائم کی مرتکب ہوتی ہے افغانستان امریکہ کے لیے ایک ایسا ہی میدان جنگ ہے جہاں پر ہر ظلم اور ہر جرم جائز ہے بلکہ افغانستان پر ہی کیا موقوف خود ہمارے سرحدی علاقے بھی مسلسل امریکی وحشت کی زد میں ہیں ڈرون کو کسی بھی گھر کسی بھی گاؤں، بلکہ کسی بھی گاڑی،

پر حملہ کرنے بھیج دیا جاتا ہے اور اُس پر کسی ندامت کا اظہار تو درکنار اس پر فخر کیا جاتا ہے ابھی حال ہی میں امریکہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اب وہ ہر ڈرون حملے پر کوئی وضاحت پاکستان کو نہیں دے گا یعنی چاہے حملہ کسی جرگے پر ہو کسی جنازے پر ہو یا ننھے بچوں کے کسی مدرسے یا سکول پر وہ خود کو اس کا مجاذ سمجھے گا۔

دنیا کو اب امریکہ کے اس کردار پر سوچنا بھی ہوگا اور کوئی لائحہ عمل بھی مرتب کرنا ہوگا وہ ممالک جو آج امریکہ کی ہاں میں ہاں ملا کر مسلمانوں کا خون بہانے پر خوش ہیں اگر امریکہ کو روکا نہ گیا تو اس کی پیش قدمی رکنے والی نہیں وہ ان تک بھی پہنچ سکتا ہے جب تک اسے بزور بازو نہ روکا جائے۔ گل مدین ایک بچے کا نام نہیں ہے یہ افغان قوم کا نام ہے یہ پوری افغان قوم کی تذلیل ہے اور پوری مسلم امہ کی بھی لیکن اس احساس زیاں کو محسوس کرنے کے لیے مسلمانوں کا اتفاق اور اتحاد اولین شرط ہے تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ امریکہ کو مزید مظالم سے روک سکیں۔

امریکی ڈرونز اور پاکستانی عوام

امریکہ دہشت گردی کے خلاف گزشتہ دس سال سے ایک جنگ لڑ رہا ہے کیونکہ اس کے ملک میں ایک شہر میں ایک عمارت پر کچھ جہازوں نے حملہ کیا جسے امریکیوں نے 9/11 کے نام سے یاد رکھا ہوا ہے اور اس کے بعد گویا امریکہ کو افغانستان اور پھر پاکستان میں کھل کھیلنے کا موقع مل گیا وہ جہاز امریکہ سے ہی اڑے تھے پاکستان یا افغانستان سے نہیں یعنی ناکامی تھی بھی تو امریکی خفیہ اداروں کی تھی لیکن بدلہ افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لیا گیا اور اب امریکہ مسلسل اپنے جہاز بھیج کر پاکستان کے قبائلی علاقوں میں کچھ دہشت گردوں کے ساتھ ساتھ زیادہ تر معصوم پاکستانیوں کو نشانہ بنا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پاکستان کی خود مختاری کو چیلنج کر رہا ہے 2004 میں پہلی دفعہ ڈرون حملہ ہوا تو پاکستانیوں کے لیے ایک اچھنبے کی بات تھی کچھ شور بھی اٹھا خود مختاری کی خلاف ورزی کی باتیں بھی ہوئیں غم وغصے کا اظہار بھی ہوا امریکہ سے احتجاج کی باتیں بھی ہوئیں لیکن اب تو ایسا لگتا ہے کہ امریکہ نے ان علاقوں کو مال غنیمت سمجھ لیا ہے اور قبائلیوں کو مال مویشی۔ امریکہ جیسے ملک میں جہاں جانوروں کے حقوق کا بھی شور اٹھتا ہے پاکستانیوں کا خون اُن کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم کیوں چپ ہیں ہماری حکومت کوئی بامعنی احتجاج

کیوں نہیں کرتی ہماری فوج سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہے تو پھر فضائی سرحدوں کی یہ مسلسل خلاف ورزی کیسے برداشت کی جارہی ہے اگر اس کی کوئی خاص وجہ ہے تو وجہ قوم کو بتادی جائے تاکہ قوم کو کچھ تو معلوم ہو۔ حملے بڑھتے جارہے ہیں اور احتجاج کم ہوتا جارہا ہے 2004 میں پہلا اور اگلے دو سالوں میں دو دو، 2007 میں چار اور بڑھتے بڑھتے یہ حملے 2010 میں 118 تک پہنچ گئے اور 2010 میں 993 افراد اِن حملوں کی نذر ہو گئے رواں سال اب تک 22 ڈرون حملے ہو چکے ہیں جن میں اموات ہوئیں یوں 2004 سے 2011 تک 234 حملے ہوئے اور تقریباً تین 148 ہزار ہلاکتیں ہوئیں اور ان میں بہت سے بے گناہ بھی مارے گئے اور وہ بھی جنہیں دہشت گرد قرار دیا گیا تو کیا یہ پیدائشی دہشت گرد تھے یا یہ وہ لوگ تھے جو کبھی امریکہ کے کام آتے رہے تھے؟ جو بھی تھا آخر اتنی آسانی اور سہولت سے پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی کیسے کر لی جاتی ہے اور اس پر کسی ردعمل کا اظہار نہ آنا ایک اور بڑا قومی جرم ہے جس سے نہ صرف جانوں کا نقصان ہو رہا ہے بلکہ قومی وقار کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے اور قومی سالمیت متاثر ہونے کا بھی خدشہ موجود ہے یہ ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے جسے انتہائی غیر سنجیدگی سے لیا جارہا ہے سترہ مارچ کو شمالی وزیرستان میں ایک جرگے پر ہونے والے حملے پر جب فوج نے شدید احتجاج کیا تو حکومت کو بھی ناراضگی کا اظہار کرنا پڑا لیکن اس پر امریکہ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا سوائے اسکے کہ اُس وقت بے گناہوں پر جان بوجھ کر کئے گئے

حملے پر افسوس کا اظہار کر دیا گیا اور صرف ستائیس دن بعد جنوبی وزیرستان میں ایک ڈرون سے سات میزائل داغے گئے اور اس حملے میں چھ افراد شہید کر دیئے گئے جو کہ پھر عام قبائلی تھے اور کچھ نے انہیں حقانی گروپ کا قرار دیا کسی افسوس دکھ یا ہلچل کا اظہار نہیں کیا گیا اور صرف آٹھ دن بعد یعنی اکیس اپریل کو پھر شمالی وزیرستان میں میر علی کے مقام پر حملہ ہوا اور پچیس افراد ہلاک ہوگئے جن میں چار عورتیں اور پانچ بچے بھی شامل تھے اس حملے سے کچھ ہی دن پہلے امریکی جوائنٹ چیفس آف سٹاف مائک ملن نے ایک دفعہ پھر شمالی وزیرستان میں دہشت گردوں کی موجودگی کا رونا رویا اور ایک دفعہ پھر پاکستان فوج کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف سنجیدہ کوشش نہیں کر رہی جس کو پاک آرمی نے مسترد کیا۔

اب یہ سب کچھ چل رہا ہے اور برسوں سے چل رہا ہے اور لگتا ہے حکومت اس کی عادی ہو چکی ہے بس کبھی کبھار ازراہ تفنن کوئی ہلکا سا بے ضرر سا Ammune ہو کر احتجاج کر لیا جاتا ہے ورنہ اکثر اس کی بھی زحمت نہیں کی جاتی میڈیا پر ایک معمول کی خبر آتی ہے اور چلی جاتی ہے اور کارپردازان حکومت حکومتی جوڑ توڑ میں مصروف رہتے ہیں کبھی اتحاد بناتے ہیں اور کبھی اس کو قائم رکھنے کے لیے جتن کرتے ہیں یوں مرتے ہوئے کسی معصوم قبائلی کی آخری چیخ ان تک نہیں پہنچ پاتی شائد پہاڑ راہ میں حائل ہو جاتے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ

حکومتی کان پر نہ تو وہ ٹارگٹ کلنگ اثر انداز ہو رہی ہے جو آس پاس کے شہروں میں ہو رہی اور نہ ہی وہ جو امریکی ڈرون قبائلیوں کو سافٹ ٹارگٹ سمجھ کر رہے ہیں بس ایک فخر اور زعم ہے کہ ہم جمہوری حکومت ہیں جمہوریت تو عوام کی حکومت عوام کے لیے ہوتی ہے لیکن اپنے ملک میں تو ایسا لگ رہا ہے کہ حکومت کا ہر ذمہ دار صرف اپنی ذات کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت میں ہے اسے عوام اور عوامی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پاکستان کی خود مختاری اور وقار سے اسے کوئی سروکار نہیں فوج حکومت کا ماتحت ادارہ ہے جب وزیراعظم نے سوات میں آپریشن کا حکم دیا تو فوج نے اسے بہر صورت ممکن کر دکھایا، تو ڈرون حملوں کو روکنے کے لیے ایسا کوئی حکم کیوں نہیں دیا جا رہا جبکہ پاک فضائیہ کے سربراہ بہت پہلے کہہ چکے ہیں کہ انکے پاس ان جہازوں کو مار گرانے کی صلاحیت موجود ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی غیر ذمہ دارانہ بیان نہیں دے سکتے اور اگر اس صلاحیت میں کوئی کمی تھی بھی تو چھ سات سالوں میں وہ دور ہو جانی چاہیے تھی ڈرون حملوں میں یقیناً کچھ دہشت گرد بھی مارے گئے ہونگے کچھ غیر ملکی بھی ہوں گے جو اُن ہی لوگوں کی اولاد ہے جو کبھی امریکہ نے ہی یہاں لاکر بسائے تھے اپنے مفادات کے لئے، لیکن کیا وہ عورتیں، بچے، جرگوں اور حجروں میں بیٹھ کر برادری کے فیصلے کرنے والے بوڑھے مشران بھی دہشت گرد تھے جو اِن حملوں کی نذر ہو گئے عوام مسلسل اس سوال کا جواب مانگ رہے ہیں۔ حکومت کو اس معاملے کو سنجیدگی سے لے ہی لینا چاہیے عوام کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ

داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے اور ملک کی خود مختاری کی بھی اور ابھی تک ایک جگہ پر بھی کسی کامیابی کے آثار نظر نہیں آرہے۔ حکومتی جوڑ توڑ سے زیادہ اہم یہ ملک ہے اگر یہ ہے تو حکومت ہے اگر نہیں تو کچھ بھی نہیں لہذا اس طرف توجہ دینا زیادہ ضروری ہے اور عوامی مرضی کا کوئی جرات مندانہ فیصلہ خود بخود آپ کو حکومت کا حقدار ثابت کر دیتا ہے صرف اسمبلی کی قراردادیں معاملات حل نہیں کرتیں بلکہ اصل حل ان قراردادوں پر جرات مندانہ عمل ہے اگر حکومت ان اختیارات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کرلے تو ڈرونز کا راستہ روکا جا سکتا ہے اور یوں عوام کے جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ملکی خود مختاری اور قومی وقار کی حفاظت قوم کا مورال بلند کر دے گی اور عالمی برادری میں ملک کا وقار بھی۔

یومِ شہدا اصل تقاضا

تیس اپریل کو یوم شہدا منایا گیا۔ زندہ قومیں اپنے ہیروز کو یاد رکھتی ہیں ،انھیں خراج عقیدت پیش کرتی ہیں ان کے کارنامے آنے والی نسلوں سے بیان کرتی ہیں اور شہید تو ایک ایسا ہیرو ہے جس پر کئی کئی نسلیں نازاں رہتی ہیں۔ بہادری سے سینے پر گولی کھائے یہ شیر افسانوی کردار بن جاتے ہیں کہ ان جیسا بننے کی خواہش کئی کئی سینوں میں مچلتی رہتی ہے۔ پاک فوج کی تاریخ ایسے شہیدوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے ایک طرف کیپٹن سرور سے لے کر حوالدار لالک جان تک یہ درخشندہ ستارے قوم کے ماتھے کا جھومر ہیں تو دوسری طرف ستاروں کا ایک جھرمٹ وہ بھی ہے جو دہشت گردوں کے وار سے اس ملک کو بچاتے بچاتے شہید ہوتے گئے اور اس کہکشاں کا ستارہ بنتے رہے اور وہ معصوم شہری بھی جو سڑکوں پر، جرگوں میں، جنازوں میں اور یہاں تک خدا کے گھروں یعنی مسجدوں میں دوران قیام، بحالت رکوع یا سربسجود جام شہادت نوش کر گئے۔ خدا کے ہاں شہید کے لیے بڑا اجر ہے اور یقیناً یہ شہدا اُس سے مستفید ہو رہے ہو نگے۔ معاشرہ بھی ان کو مکمل عزت اور احترام دیتا ہے اور ہماری افواج بھی اِن شہدا کو ہر موقعے پر یاد رکھے ہوئے ہیں۔ تیس اپریل کو تمام چھاؤنیوں میں یوم شہدا پورے احترام کے ساتھ منایا گیا جو کہ اِن کا حق تھا اور قوم ہمیشہ اپنے اِن جیالوں کو یاد رکھے گی

جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کی حفاظت کی خاطر قربان کر دیں اگرچہ اِن کے خاندانوں کی ذمہ داری متعلقہ ادارے قبول کرتے ہیں لیکن پھر بھی جس کرب اور مشکلات سے یہ خاندان گزر رہے ہیں اس کا اندازہ وہی لوگ خود کر سکتے ہیں یا ان سے مل کر ان مشکلات کی صرف ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے ،کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ سلسلہ آخر تا بکے۔ غیروں کی یہ ایک جنگ جو ہم پر مسلط کی گئی جسے ہم سالہاسال سے لڑ رہے ہیں جس نے ہمارے ملک کو اگر صدیوں نہیں تو کئی دہائیوں تک پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ترقی کا سفر رک کر ترقی معکوس کا سفر بنتا جا رہا ہے، پتھر کے زمانے سے بچاؤ کے لیے جو اقدامات کیے گئے تھے اسی کا نتیجہ ہے کہ عوام بجلی، گیس ،پانی اور علاج جیسی ضروریات سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں بلکہ بہت حد تک ہو چکے ہیں ۔ کچھ کاروبار دہشت گردی کی نظر ہو گئے اور کچھ اس کے ما بعد کے اثرات کی۔ وہ پیسہ جو ان ضروریات پر خرچ ہونا چاہیے تھا اس جنگ کی نظر ہو رہا ہے پورا معاشرہ مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طبقہ جو یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ہمیں غیر ملکی امداد مل رہی ہے وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اس امداد سے اس نقصان کا عشر عشیر بھی پورا نہیں ہوتا جو ہمارا ہو رہا ہے اور اُن خاندانوں کے دکھوں کا تو کوئی مداوا نہیں جہاں بچے یتیم، عورتیں بیوہ ہو چکیں اور جہاں بوڑھے والدین بڑھاپے کا سہارا کھو چکے ہیں اگر ان کی خوشیوں اور مستقبل کے بدلے ہم امریکہ کا ساتھ دے رہے ہیں اور ان کے شکر گزار بھی ہو رہے ہیں کہ وہ ہمیں امداد دے رہے ہیں تو ہم

تاریخی جرم کر رہے ہیں یعنی ہم اپنا خون بیچ رہے ہیں ۔ایک ٹی وی چینل پر ہمارے کچھ دانشور اس خوف کا اظہار کر رہے تھے کہ اگر امریکہ نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تو ہمارے وہ تاجر خاص کر کاٹن مصنوعات کے ،کیا کریں گے ،وہ خاندان جن کا روزگار اس شعبے سے وابستہ ہے کیا کھائیں گے ،ہمیں یہ احسان مان لینا چاہیے کہ ان خاندانوں کا روزگار امریکہ سے وابستہ ہے سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ ان مصنوعات کو ترس کھا کر خرید رہا ہے یا ان کی اس کے ہاں کھپت ہے ۔ایک اور دانشور نے تو حد کر دی کہ اگر امریکہ ہمیں امداد نہ دے تو ہمیں اس ہال سے پیدل گھر جانا پڑے گا ۔کیا اس ملک میں کوئی پیدل نہیں چلتا ؟کیا تمام لوگ ٹی وی دانشور ہیں اور خوشحال ہیں؟ کوئی بھی ذی شعور شخص جنگ کے حق میں نہیں لیکن قومی وقار بھی کوئی چیز ہے ہم دوسری اقوام کی خود داری کی مثالیں دیتے ہیں کہ جو میسر نہ ہونے پر پیاز نہیں کھاتے، چینی استعمال نہیں کرتے لیکن ہم خود اس کے لیے تیار نہیں۔ آرمی چیف نے راولپنڈی میں یوم شہدا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بالکل بجا کہا کہ ہم ملک کی خوشحالی کے لیے اپنی عزت اور وقار کا سودا نہیں کریں گے لیکن قوم منتظر ہے کہ کب ان خیالات کو عملی جامہ پہنایا جائے اور خود داری کا ثبوت دیا جائے ۔ چلیئے ایران تو تیل کی دولت پر امریکہ کے سامنے اٹھتا ہو گا تو شمالی کوریا کے پاس کیا ہے، کیوبا کیسے امریکہ سے ٹکر لیتا ہے یقیناً صرف خودداری کی بنا پر اور ہمیں تو ٹکر لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صرف خود کو اس کی جنگ سے الگ کرنا ہے

اور اپنے عوام کی خواہشات اور ضروریات پوری کرنے کا خود کو ذمہ دار سمجھتا ہے اور یہ سوچ بھی ختم کرنی ہے کہ امریکہ مدد نہ کرے تو ہم کھا بھی نہ سکیں۔ رازق خدا ہے اور جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو اُس سے تو موت اچھی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا تو یہی وطیرہ تھا۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ہاتھ کھینچ لیں تو امریکہ کو افغانستان میں بے دست وپا کر سکتے ہیں یہ حقیقت وہ بھی جانتا ہے لیکن نا اہل رہبری کے سبب ہم اُسے دبانے کی بجائے خود دب رہے ہیں۔ اب مزید جوانیاں اس جنگ میں جھلسانے کے لیے ہمارے پاس نہیں ہیں۔ یہ جوانیاں ہمارے اپنے ملک کی امانت ہیں اگر یہ وطن کی حفاظت کے لیے سربکف ہیں تو حکومت کو بھی ان کی حفاظت کا خیال رہنا چاہیے انہیں سنبھال رکھنا چاہیے یہ ہمارا آج بھی ہیں اور کل بھی۔ ان کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ دوسروں کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے۔ شہدا کے یہ خاندان چاہے وہ فوجی ہیں، پولیس سے ہیں یا اُن بے گناہوں کے ہیں جو راستوں میں مارے گئے ہمارے لیے قابل احترام ہیں ان کے دکھ کو ہر پاکستانی دل سے محسوس کرتا ہے اور اسی لیے وہ کسی بھی سخت فیصلے کو بھی قبول کرنے کو تیار ہے چاہے اُس کو پیدل چلنا پڑے۔ اگر چہ اگر یہ جنگ بند کر دی جائے تو ہمارے بہت سے وسائل جو ہم اس آگ میں جھونک رہے ہیں ہمارے کام آنا شروع ہو جائیں گے اور ارباب اختیار کو یہ بھی سوچ لینا چاہئے کہ اب تو شائد ہمارے پاس سڑکیں بھی نہ بچیں جو شہدا کے نام سے موسوم کی جا سکیں۔ اگر چہ بہت سا پانی پلوں کے

نیچے سے بہہ چکا ہے تاہم اب بھی اگر ہمارے حکمران سوچ لیں تو شاید ان کا سجدہ سہو
قبول ہو جائے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے

اسامہ بن لادن ایک ہوّا، ایک نام جسے امریکہ نے سالہا سال تک پوری طرح کیش کیا اسی نام کی آڑ لے کر پوری مسلم دنیا کو خاک و خون میں نہلاتا رہا۔ اسی کا پیچھا کرتے کرتے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، پاکستان کے امن کو تباہ کر دیا گیا۔ اب بقول امریکہ اسامہ سچ مچ مارا گیا ہے، اگرچہ یہ دعوے پہلے بھی کئے گئے لیکن اب کی بار تو فی الحال القاعدہ نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا ہے۔ عام لوگ اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ اسامہ اس ایکشن میں مارا گیا ہے کچھ کہتے ہیں اسامہ تورا بورا میں مارا گیا تھا کچھ کہتے ہیں وہ زندہ ہے اور مارا جانے والا کوئی اور تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ اُسے کہیں اور سے لا کر اس گھر میں مارا گیا چاہے جو بھی ہوا، اسامہ زندہ ہے یا نہیں، کب مارا گیا میرا آج کا موضوع یہ بالکل نہیں میں تو یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ پاکستان ایک آزاد، خود مختار اور ایک ایٹمی ملک ہے اسکی ایک انتہائی پیشہ ور اور بہادر فوج اور خفیہ ادارے ہیں تو ان سب کی موجودگی میں یہ سب کیسے ہوا کہ غیر ملکی فوج بھی آئی، ہیلی کاپٹر بھی آئے اور چالیس منٹ کاروائی کرتے رہے۔ بقول انکے وہ افغانستان سے آئے تو ظاہر ہے گھنٹہ ڈیڑھ آنے جانے میں لگا تو ہم اُس وقت کہاں تھے اگر راڈار جیم بھی کر دیئے گئے تو جب شہری

اِن ہیلی کاپٹرز کا شور سن رہے تھے ایک گر کر تباہ بھی ہوا گولیوں کی بوچھاڑ کی آواز بھی آئی تو آخر کسی کی آنکھ کیوں نہ کھلی اگر کھلی تو کیوں ایکشن نہیں کیا گیا یا کرنے نہیں دیا گیا۔ حکومت نے آخر کسی ایکشن کا حکم کیوں نہیں دیا۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ہمارے حکمران امریکی مفادات کا بہت اچھا اور بڑی ایمانداری سے تحفظ کرتے ہیں کیونکہ اسی میں اُن کی بقا ہوتی ہے لیکن قوم اس قدر کھلم کھلا طریقے سے اپنے ملک کی زمین پر انکے اس آپریشن پر جس نفسیاتی الجھن کا شکار ہے حسب معمول اُس پر ہمارے کرتا دھرتاؤں کو کوئی پریشانی نہیں۔ ابھی تک قوم کو انکے سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا قصور ہمارے عوام کا بھی ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے تو شروع شروع میں احتجاج کرتے ہیں، شور مچاتے ہیں، سوالات اٹھاتے ہیں اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور حکمران پھر ریلیکس ہو کر کسی اور الجھن کی تلاش اور بندوبست میں مصروف ہو جاتے ہیں یہی حال اس معاملے کا ہوگا لیکن یہاں سوچنے، پوچھنے اور جواب لینے کو بہت کچھ ہے اگرچہ ہر بحث کی تان ادھر ہی آکر ٹوٹتی ہے کہ آخر امریکہ ہمارے ملک کے اندر آکر پاکستان ملٹری اکیڈمی کے پڑوس میں ایک بڑی فوجی چھاؤنی میں جہاں فرنٹیئر فورس اور بلوچ رجمنٹل سنٹرز بھی ہیں میں مسلح کاروائی کیسے کر لی خود بقول سی آئی اے کے ایبٹ آباد میں ان کا ایک سٹیشن کام کر رہا تھا جو اب بند کر دیا گیا ہے آخر کسی کو پتہ کیسے نہ چلا، مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہم امریکہ کے ہاتھوں میں کھیل

رہے ہیں عوام ہمیشہ سے چیخ رہے ہیں کہ امریکہ ہمارا دوست نہیں ہے اُس نے کبھی مصیبت میں ہمارا ساتھ نہیں دیا بلکہ سچ یہ ہے کہ اُس نے ہمیں ہمیشہ مصیبت میں ڈالا ہے موجودہ جنگ کو پاکستان پر جس طریقے سے مسلط کیا ہے اُس نے ہماری معیشت، تجارت، صنعت حتیٰ کہ تعلیم تک کو بُری طرح متاثر کیا ہے، جہاں امریکی بچے بے خوف وخطر سکولوں میں جاتے ہیں وہیں ہمارے بچے اور والدین اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں ان کا سکول دہشت گردوں کا اگلا نشانہ نہ ہو، اور تو اور ہماری مساجد دہشت گردوں کا پسندیدہ نشانہ ہیں غرض یہ کہ ملک کا کوئی گوشہ کوئی شعبہ محفوظ نہیں۔ ہزاروں جانیں جن کا کوئی بدل نہیں اور نہ جن کے واپس آنے کا کوئی امکان ہے اس جنگ پر قربان ہوچکیں ۔ ہر نیا واقعہ اس قوم کو ہلا کر رکھ دیتا ہے (حکمرانوں کو نہیں) لیکن اس آپریشن جسے Geronimo کا نام دیا گیا ہے نے پوری قوم کو دہلا کر رکھ دیا ہے یعنی اب ہمارے گھر بھی محفوظ نہیں کہ ہم ان میں پناہ لے سکیں کیونکہ چاہے، امریکی میڈیا اور انکے دیکھا دیکھی ہمارے کچھ اپنے چینلز بھی اس گھر کو جتنا بھی خاص طرز تعمیر اور پر اسراریت کا حامل قرار دیں وہ ایک عام گھر تھا اور اس طرح کے گھر آپ کو پورے خیبر پختون خواہ میں کہیں بھی نظر آجائیں گے آخر اس کو مشکوک کیوں سمجھا گیا؟ کیا یہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت تھا؟ تھا تو ایسا ہی ورنہ صرف چالیس منٹ میں بغیر کسی مزاحمت کے آپریشن مکمل بھی ہو گیا لیکن کیا ہماری اس کوتاہی نے پوری دنیا کو شہ نہیں دے دی کہ پاکستان

ایک کھلا بغیر حکمران بغیر نگران میدان ہے جس کا جو جی چاہے کر لے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ قوم ایسا سوچنے میں اس لیے حق بجانب ہے کہ وہ جس سخت رد عمل کی توقع کر رہی تھی وہ کسی ذمہ دار کی طرف سے نہیں آیا بلکہ اس بات کا اقرار کیا گیا کہ کسی کو بھی اس کاروائی یا منصوبے کا علم نہیں تھا کچھ نے تو یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ ہم جان سکتے۔ تو کیا ہم خود کو ایٹمی اور عسکری قوت سمجھنا ترک کر دیں؟ ماضی میں یہی فوج اور آئی ایس آئی اگر عالمی قوتوں کی سازشوں کا کامیاب جواب دیتی رہی ہے تو اب کیوں ایسا ممکن نہ ہوا۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی ۔ قوم کو اگر اب بھی وہ وجہ بتا دی جائے تو بہتر ہوگا اور یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ ہم امریکہ کو کئی بار آزما چکے بلکہ پچھلے ساٹھ باسٹھ سال سے مسلسل آزما رہے ہیں اور مایوس ہو رہے ہیں بلکہ نقصان اٹھا رہے ہیں جبکہ خود ہم مسلسل اُسکی خدمت پر معمور ہیں تو اب ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ اگر مومن ایک سوراخ سے دو بار بھی نہیں ڈسا جاتا تو ہم کیوں مسلسل ڈسے جا رہے ہیں۔ اب ہمیں اپنی خارجہ پالیسی میں ذرا تبدیلی بھی کر کے دیکھ لینا چاہیے امریکہ جو ہم سب کے حواسوں پر مسلط ہے اسے ذرا چھوڑ کر دیکھ لینا چاہیے وہ جو کہتے ہیں کہ اسکی مدد کے بغیر ہم کچھ دن بھی نہ چل سکیں گے تو وہ تسلی رکھیں کہ جو قوم امریکی دوستی کے برے ترین دن برداشت کر سکتی ہے تو وہ کوئی بھی مشکل برداشت کر لے گی۔

ہماری فوج اور آئی ایس آئی اگرچہ ہماری جمہوری حکومت کے تابع ہے لیکن کسی بھی طرح امریکی تعاون سے ذرا ہاتھ کھینچ لے تو بہتر ہوگا تاکہ امریکہ کو اور خاص کر سی آئی اے کو اپنی اوقات معلوم ہو جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس آپریشن کو اُس نے بغیر آئی ایس آئی کی مدد کے کیسے مکمل کر لیا۔ تاہم یہ بات سب ہی کہتے ہیں آئی ایس آئی کو اپنی مہارت اور صلاحیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سی آئی اے کی مدد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیئے تاکہ اُسے معلوم ہو سکے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ غرض اس آپریشن کے بعد قوم جس نفسیاتی دباؤ اور تناؤ کا شکار ہے اور عدم تحفظ کی جو کیفیت ہے حکمرانوں اور فوج کو بھی سنجیدگی سے اس کا ازالہ کرنا چاہیئے امریکہ ایک اسامہ کو مارنے کے لیے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہا چکا ہے اور اب پاکستان میں اس کو تلاش کر لینے کے بعد یا اُسے مارنے کا ڈرامہ یا حقیقت جو بھی ہے دنیا کو دکھا رہا ہے اسکے سینیٹرز جس طرح کے بیانات دے رہے ہیں اور پاکستان پر جو الزامات دھر رہے ہیں جو الفاظ اور زبان استعمال کر رہے ہیں پاکستان کو بھی جواب اسی ''ٹون'' میں دینا ہوگا ورنہ ہم مزید حادثوں سے دوچار ہوتے رہیں گے اور یہ سوچ بھی ذہن سے نکالنی ہوگی کہ ہم صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم صلاحیت رکھتے ہیں آج بھی فضائیہ کے سربراہ نے اپنی اِن صلا حیتوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی غیر ملکی جنگی طیارے اور ہیلی کاپٹر کو ملکی سرحدوں کی خلاف ورزی کرنے پر مار گرایا جائے گا اور انہوں نے قوم کو ایک بار پھر یہ یقین دلایا کہ اگر

انہیں حکم دیا جائے تو وہ ڈرون گرا سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی تینوں مسلح افواج کی صلاحیتوں پر بھروسا بھی ہے اور فخر بھی ۔ان کی حب الوطنی اور جانثاری بھی کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن ہمیں دوسری مخصوص وجوہات دور کرنے کے لیے سنجیدگی اپنانی ہوگی اور امریکی مفادات اور حکمرانی کی خواہش سے زیادہ پاکستان کے بارے میں سوچنا ہوگا اور مان لینا ہوگا کہ

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں

حکم ہو تو ! کفن باندھ کے تیار کھڑے ہیں

قوم شدید ذہنی اور نفسیاتی دباؤ میں ہے۔ اگرچہ آج اس دباؤ کا نکتۂ عروج ہے۔ تاہم یہ دباؤ یہ قوم سالہا سال سے برداشت کر رہی ہے اور وجہ امریکہ کی اس سے ''دوستی'' ہے۔ پچھلے چونسٹھ سال میں ہم نے امریکہ کو جب بھی آزمایا، مایوسی کے علاوہ کچھ بھی نہ پایا۔ لیکن ہماری حکومتوں نے انتہائی ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس دوستی میں رخنہ نہ ڈلنے دیا چاہے عوام چیختے رہے، چلاتے رہے۔

اسامہ کے بہانے امریکہ نے اسلامی دنیا کے امن کو روند ڈالا اور پھر 2 مئی 2011 کو ایبٹ آباد میں اسامہ کو ہلاک کر دیا گیا۔ کیسے؟ میرے خیال میں اس کہانی کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اب تو اس کی اتنی جزئیات و تفصیلات سامنے آچکی ہیں کہ بچہ بچہ آپ کو یہ کہانی فرفر سنا دے گا اور ہر کہانی کے آخر میں ایک بے یقینی ہو گی کہ اب معلوم نہیں اسامہ مارا بھی گیا ہے یا نہیں، یا وہ اسامہ ہی تھا یا کوئی اور؟ لیکن ہماری خود مختاری کو للکارا ضرور گیا۔

اب اسامہ کے بعد جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ ذمہ دار

کون تھا؟آئی ایس آئی کے سربراہ نے ذمہ داری قبول کر لی ،پارلیمنٹ کے بند کمرے میں اجلاس ہوا جس کی خبریں باہر پہنچتی رہیں ۔اس اجلاس کے دوران بھی اور اس سے پہلے بھی ایئر چیف کا بیان آ چکا ہے کہ وہ ذمہ داری قبول کرتے ہیں، ڈرون گرانے کی صلاحیت کا اعلان بھی کر چکے ہیں تاہم وزیر دفاع اس سارے معاملے میں کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ عسکری قیادت نے تو غلطی کا اعتراف بھی کیا، خود کو احتساب کیلئے پیش بھی کیا، لیکن کیا وہ واحد ذمہ دار ہیں؟اگر پارلیمنٹ میں قرار داد پاس ہو گئی ہے تو اس پر عمل بھی کیا جائے اگر ہم امریکہ سے کھلی جنگ چھیڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو یہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اس سے تعاون ختم کر دیں۔ ہم نے کیوں اس کے مفادات کے تحفظ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ دہشت گردی کی جنگ میں ہم اس کے اتحادی ہیں اور ایسی فرنٹ لائن پر ہیں جہاں ہمارے علاوہ خود امریکہ بھی نہیں ہے وہ دہشت گردوں کی پہنچ سے بہت دور اور محفوظ ہے جبکہ ہم ایسی توپ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ ہمارے عام شہری کی زندگی محفوظ ہے نہ سیکیورٹی اداروں کی ۔آج 13 مئی کو مہمند ایجنسی شب قدر میں جس طرح 80 اہلکار شہید کیے گئے اس کے بعد کسی کا دل امریکہ کی طرف سے کیسے صاف ہو سکتا ہے۔کیونکہ اس نے ہی تو یہ جنگ ہمارے سر تھوپی ہے یہ بچے تو ابھی اپنی ڈیوٹی پر بھی نہیں پہنچے تھے ابھی تو پاس آوٹ ہوئے تھے۔ حکومت اگر یہ مہربانی کرے کہ صرف قراردادیں پاس نہ کرے بلکہ ان پر عمل بھی کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن اداروں کے

ریکارڈ پر بے شمار کارنامے موجود ہیں یعنی آئی ایس آئی اور فوج کو تو فوراً ذمہ قرار دے دیا گیا لیکن سیاستدان دامن بچا کر نکلنے کی کوشش میں رہے بلکہ پہلے وزیرِ اعظم قوم کو کچھ بتائے بغیر فرانس اور پھر صدر غیر ملکی دوروں پر نکل گئے اور وزیرِ اعظم نے دورے سے واپسی پر اپنا بیان جاری کیا لیکن پھر بہت سارے اعترافات کیے۔

ہم اپنے آپ کو جمہوری ملک کہتے ہیں تو پھر ذمہ داری بھی جمہوری حکومت کو لینی چاہیئے افواج پاکستان اور آئی ایس آئی حکومت کے ماتحت ادارے ہیں انہیں احکامات حکومت سے موصول ہوتے ہیں اور وہ ان پر عمل کرنے کے پابند ہیں تو پھر ساری ذمہ داری ہم افواج پاکستان پر کیسے ڈال رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے میڈیا نے اس معاملے میں ایک ذمہ دارانہ رول ادا کیا لیکن بار بار فوج کی نااہلی کی بات بھی کی جاتی رہی۔ بیرونی میڈیا نے تو ہماری فوج اور آئی ایس آئی کی تضحیک میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ فوج اور یہ ادارہ ایک ایسے مسلمان ملک یعنی پاکستان کے تھے جس کے لوگ امریکہ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تمام مسائل کا ذمہ دار بھی اس کو سمجھتے ہیں۔ کچھ ہمارے اپنے صرف ''خود کو بہترین مسلمان'' سمجھنے والے مضمون نگاروں اور مذہبی جماعتوں کے ذمہ داروں نے بھی اپنا حصہ بڑھ چڑھ کر ڈالا بغیر یہ سوچے کہ اگر ہماری فوج نا اہل ہے تو کیا اقوامِ متحدہ کی افواج کو پاکستان

آ کر ہماری حفاظت کا ذمہ لے لینا چاہیئے اور ایٹمی ہتھیاروں کے غیر محفوظ ہونے کا جتنا ڈھول یہ پیٹ سکتے تھے پیٹ لیا تو ان کی حفاظت کا ٹھیکہ بھی کیا کسی اور ملک کو دے دینا چاہیئے ۔یہ کیوں نہیں سوچا جا رہا کہ اسامہ مفرور تھا اور مفرور کے ٹھکانے بدلتے بھی رہتے ہیں اور کوئی حکومت اور کوئی ایجنسی اس کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ اسامہ کوئی عام شخص نہیں تھا القائدہ نے دس سال بلکہ زیادہ امریکہ جیسی سپرپاور کو تگنی کا ناچ نچا کر اس کو اس کی اوقات یاد دلائے رکھی اب بھی اس کو کن حالات میں اور کہاں مارا گیا کوئی نہیں جانتا اس کی موت پر بھی یقین نہیں کیا جا رہا لیکن القاعدہ کے اقرار سے ہی کچھ لوگ مجبوراً مان رہے ہیں۔ امریکی حملے سے عدم تحفظ کا احساس ضرور پیدا ہوا ہے لیکن یہ کہنا کہ بھارت بھی ایسا قدام کر سکتا ہے یا ایٹمی اثاثے غیر محفوظ ہیں دشمن کا پروپیگنڈا ہے اور مغربی اور بھارتی میڈیا کا دشمنانہ واویلا ہے ۔جو وہ اب سے نہیں سالہاسال سے کر رہا ہے۔ افواج پاکستان چاہے بری ہوں یا فضائی کو ایک جھٹکا ضرور لگا ہے۔ قوم کو اس پر شکایت بھی ہے اور ناراض بھی ہے لیکن اس کا مطلب بے اعتمادی ہرگز نہیں ہے۔ قوم ایک بہت بڑے حادثے سے دوچار ہوئی ہے ۔ 11/9 کا واقعہ بھی کچھ کم بڑا نہیں تھا کہ امریکہ میں ہی جہاز اڑے اور اپنے بے تحاشا وسائل اور جاسوسی آلات کے باوجود سی آئی اے کو خبر تب ہوئی جب ٹوئن ٹاورز اڑ چکے، ممبئی میں کھیل اگر ''را'' کا تیار کردہ نہیں تھا تو اسے کیوں خبر نہ ہوئی۔

اگرچہ دہشت گرد چھپا دشمن ہے لیکن امریکہ کی مثال بھی اسی چھپے دہشت گرد جیسی ہی ہے جو بظاہر دوست ہے اور بہ باطن ایک برا دشمن۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ ہم اب بھی امریکہ کو پہچاننے کی سعی و کوشش نہیں کر رہے اور یا پہچان کر بھی آنکھیں بند کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت اور پارلیمنٹ اب بھی دو ٹوک انداز نہیں اپنا رہی کہ اگر دوبارہ ایسا کوئی حملہ ہوا تو اس کا جواب دیا جائے گا۔ کسی بھی انداز میں ۔بلکہ اب بھی پالیسی پر از سرِ نو غور کی بات کر رہی ہے اور قوم جانتی ہے کہ بے انتہا غور کے بعد بھی نتیجہ کیا آتا ہے یہی کہ ہم امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے لہٰذا ہمیں صبر کرنا چاہیئے اب حکومت تو صبر کر سکتی ہے لیکن وہ جن کے پیارے مرتے ہیں وہ کیسے صبر کریں۔ امداد کی فکر مت کیجیئے قوم اب بھی بہت اچھے حالات میں نہیں رہ رہی بے تحاشا مسائل سے دوچار ہے ملنے والی امداد اب بھی قوم تک نہیں پہنچ رہی۔ جنگ چاہے بڑے دشمن سے ہو یا چھوٹے سے طرفین کا نقصان ہوتا ہی ہے اس لیے جنگ کے حق میں شاید ہی کوئی ہو لیکن ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ خود کو امریکی اتحاد سے الگ کر دیں اور اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں ۔ مشکلات تو شاید آئیں گی لیکن ملک تو سلامت رہے گا تو کیا بہتر نہ ہو گا کہ اپنی بقا کیلئے ہم امریکہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ کر بھی دیکھ لیں۔

آئی ایس آئی۔ مردِ میداں

آج کی دنیا تیز ہے اور اس کو سمجھنے کیلئے آپ کی حیات بھی بہت تیز ہونی چاہئیں۔ انفرادی سطح پر تو کسی بھول چُوک کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن قومی سطح پر ایسی کوئی بھی غلطی بہت خوفناک نتائج کی حامل ہوتی ہے اور انہی نتائج سے بچنے کیلئے قومی سطح پر ہر وقت انتہائی مستعدی کی ضرورت رہتی ہے۔
2 مئی کو ایسی ہی ایک چُوک نے ہماری قومی زندگی ہلا کر رکھ دی ہے۔ غلطی بہت بڑی تھی اور ذمہ داران کئی تھے لیکن سب سے زیادہ جن اداروں کو نشانہ بنایا گیا وہ بڑی و فضائی افواج اور پاکستان کی مایہ ناز اور خود مغربی رینکنگ کے مطابق نمبر ون خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی تھی۔ یہ درست ہے کہ آئی ایس آئی نے اسامہ بن لادن کے معاملے میں غفلت برتی ہے اگر وہ واقعی ایبٹ آباد میں تھا یا نہیں دونوں صورتوں میں کوتاہی ہوئی ہے جسے بہادری سے تسلیم بھی کیا گیا لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ اس کی اہلیت مشکوک ہے انتہائی نامناسب ہوگا۔ آئی ایس آئی کی کارکردگی اور کارناموں کی فہرست اگر دیکھی جائے تو سی آئی اے سے بہت طویل ہے اور اکثر مواقع پر اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور یہ سب کچھ اپنے نسبتاً بہت کم وسائل میں رہ کر کیا جیسا کہ جنرل پاشا

نے اسمبلی میں بھی بتایا کہ جہاں سی آئی اے اپنے سورس کو کسی مخبری کیلئے دس ہزار ڈالر دیتی ہے آئی ایس آئی دس ہزار روپے بھی بمشکل ادا کرپاتی ہے۔ خفیہ ایجنسیوں کے وسائل کے بارے میں بہت ساری حکومتیں چیک نہیں رکھتی۔ سی آئی اے کو اجازت ہے کہ وہ جس بھی طریقے سے چاہے اپنے فنڈز بنا سکتی ہے اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا اور بغیر کسی آڈٹ کے اس کا موجودہ بجٹ تقریباً تین ٹریلیئن ڈالر ہے۔ یقیناً آئی ایس آئی بھی ایک بڑا بجٹ رکھتی ہے لیکن اس کے وسائل و ذرائع اور آلات سی آئی اے کی ٹکر کے نہ ہونے کے باوجود اس کی کارکردگی کا گراف نہ صرف اس سے بلکہ را، موساد اور ایم آئی سکس کی طرح دیگر بڑی ایجنسیوں سے زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ اس بات پر آج کل بہت تبصرہ ہوا کہ اگر ایک واقعے کو لیا جائے تو پھر 11/9 کے بعد سی آئی اے کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا اگرچہ اس کے بعد امریکہ میں دہشت گردی کا کوئی واقعہ نہ ہوا لیکن اس میں امریکہ کی ذہانت سے زیادہ اس کی طاقت کو دخل ہے جسے وہ بے دریغ دنیا کے انسانوں اور خاص کر مسلمانوں پر آزما رہا ہے۔

حالیہ واقعے کے علاوہ دیکھیں تو پاک آرمی اقوامِ متحدہ کی افواج میں بہترین کارکردگی دکھاتی رہی ہیں اور ملک کیلئے نیک نامی کا باعث بنتی رہی ہیں اور یہی حال آئی ایس آئی کا ہے جس نے ہر مشکل وقت میں انتہائی مستعدی سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ اگرچہ مجھے اس بات پر فخر بالکل نہیں کہ آئی ایس آئی

نے ہی سی آئی اے کی ہر موقع پر مدد کی۔ انتہائی مطلوب دہشت گردوں کو گرفتار کروایا تاہم یہ حقیقت تھی اور اب بھی ہے کہ سی آئی اے اور امریکہ ہمارے خطے میں آئی ایس آئی کے بغیر چار قدم بھی نہیں چل پائیں گے اور آئی ایس آئی کو بھی اپنی اہمیت کو محسوس کر لینا اور کروا لینا چاہیئے۔ سی آئی اے کے ساتھ تعاون سے کوئی بھی پاکستانی خوش نہیں اور نہ امریکہ کو اس کا اعتراف ہے بلکہ اس نے ہمیشہ پاکستان، اس کی افواج اور ایجنسیوں پر ڈبل گیم کا الزام لگایا ہے اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں سوچ لینا چاہیئے کہ ہمیں اس سے تعاون جاری رکھنا چاہیئے یا نہیں اور آئی ایس آئی کو خاص کر اس پر غور کرنا چاہیئے۔ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا لیکن ہم تو بار بار ڈسے جا رہے ہیں اور سانپ ایک ہی ہے یعنی امریکہ۔ اگرچہ ہمارے عوام کو اس سے غرض نہیں کہ امریکہ جیسا مکار اور دھوکے باز ملک ہمارے بارے میں کیا کہہ رہا ہے لیکن بین الاقوامی طور پر یہ چیز پاکستان کی ساکھ کو نقصان ضرور پہنچا رہی ہے۔ دوسری طرف ملک کے اندر بھی بہت سارے الزامات آئی ایس آئی اور فوج کے نام لگا دیئے جاتے ہیں شمسی ایئر بیس کے معاملے کو لیجیئے جسے خود سیاسی حکومت نے ہی بیچا اگرچہ زمین بیچی گئی لیکن اتنی زیادہ زمین بھی کسی غرض سے ہی خریدی جاتی ہے اور پھر اس کے موجودہ استعمال کی اجازت کیوں دی گئی۔ ایک اور اہم معاملہ جس میں آئی ایس آئی کو گھسیٹا گیا ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کا تھا اس میں بھی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق حکومت کا ہاتھ ثابت ہوا۔

ان تمام حقائق کو مدّنظر رکھتے ہوئے اگر آئی ایس آئی اپنے فرائض کا از سرِ نو تعین کر ے اور امریکہ سے معلومات کے تبادلے کا جو بار بار ڈھول پیٹا جا رہا ہے اس تعاون کو امریکی مفاد کی بجائے صرف ملکی مفاد تک محدود کر دیا جائے اور ان لوگوں، تنظیموں اور ملکوں کی خبر لینا شروع کر دے جو پاکستان مخالف ہیں تو بہتر ہوگا۔ جس طرح سے آئی ایس آئی دنیا کی بڑی بڑی ایجنسیوں کو کامیابی سے کاؤنٹر کر رہی ہے اور اسے بیک وقت کئی دشمنوں سے اکیلے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور آن دی ریکارڈ یہ بات موجود ہے کہ بڑی کامیابی سے کر رہی ہے تو اس کی صلاحیتوں پر کسی شک کی گنجائش ہی نہیں آئی ایس آئی آج بھی اتنی ہی با صلاحیت اور مؤثر ہے جتنی روس افغان جنگ کے دوران تھی اور ویسا ہی کوئی کارنامہ اب بھی بعید از قیاس نہیں۔ لہٰذا نہ تو ملک کے اندر اور نہ ہی ملک کے باہر اس کی صلاحیتوں پر کسی شک کی کوئی وجہ ہے اور آئی ایس آئی کو بھی اپنی صلاحیتوں کو منوانے کیلئے نئے سرے سے تیاری کر کے میدان میں اترنا چاہیئے۔

یعنی ملک ہمارا اور اختیار ان کا

اسامہ بن لادن کی ایبٹ آباد میں مبینہ ہلاکت کے بعد سے مسلسل یہ واقعہ موضوع بحث ہے بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ سب سے بڑا رد عمل عوام کے شدید رد عمل اور ایک طرح سے پر زور مطالبے کے نتیجے میں پارلیمنٹ کا اجلاس تھا جس میں عسکری قیادت نے ارکان پارلیمنٹ کے سوالات کے جوابات دیئے اور اجلاس کے اختتام پر ایک مشترکہ قرارداد پیش اور منظور کی گئی۔ جس میں بہت سارے نکات عوامی خواہشات کے عین مطابق تھے۔ عسکری قیادت نے جب ایوان کی بالادستی قبول کر لی اور اسے کوئی بھی اقدام اٹھانے کی اجازت دے دی تو اب عوام کی یہ امید کہ جمہوری حکومت کوئی ٹھوس حکمت عملی اپناتے ہوئے کوئی قدم اٹھائے بالکل بجا ہے۔ اب جبکہ جمہوری حکومت ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ عوام کی اکثریت کی نمائندہ ہے اور عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئے ہوئے نمائندوں نے ایک قرارداد میں خود کو امریکہ سے معاملات طے کرنے کا ذمہ دار قرار دے دیا ہے تو پھر قوم بجا طور پر یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ قومی خود مختاری کی حفاظت کریں اور یہ خوف دل سے نکال دیں کہ اگر انہوں نے امریکہ کو کوئی سخت جواب دیا تو نتائج کیا ہونگے یقیناً مشکلات پیش آئیں گی لیکن معاملات کو اگر ہوشمندی سے سنبھالا جائے تو انہیں کم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سارے معاملے

کو دیکھنے سے پہلے ذرا اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے کہ آخر ملک کے حالات اس نہج تک پہنچے کیسے کہ ہمارے حکمرانوں کو یہ سوچتے ہوئے بھی جھر جھری آنے لگتی ہے کہ اگر امریکی امداد بند ہو گئی تو کیا ہوگا؟ پاکستان اس وقت بیرونی قرضوں پر چل رہا ہے اور ہم 44% امداد امریکہ سے لے رہے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ہم نے خود کو گروی رکھ لیا ہے بلکہ اپنی زندگی کے حقوق بھی امریکہ کو دے دیئے ہیں۔ یہ بھی بالکل درست ہے کہ آج کی دنیا میں خود کو الگ تھلگ رکھنا ممکن نہیں ۔ یہاں ہر ملک کسی نہ کسی ضرورت اور معاملے میں دوسرے ملک پر انحصار کرتا ہے لیکن اس انحصار میں وقار اور خود مختاری سے ہاتھ نہیں دھویا جاتا۔ پھر ہم نے ان حالات کو کیسے قبول کر لیا۔ یہاں بات ہمارے حکمرانوں کی شاہ خرچیوں اور خود غرضیوں پر آتی ہے۔ جو وزارتوں پر وزارتوں بنائے جاتے ہیں تاکہ ان کیلئے وزیر بنا سکیں کیونکہ حکومت میں رہنے کیلئے اتحاد اور اتحادوں کو قائم رکھنے کیلئے وزارتوں کی رشوت اور وزیروں کیلئے بے تحاشا مراعات یہ سب کچھ اس سلسلے کی کڑیاں ہیں اور آپ ایسی ہی بہت سی کڑیاں جوڑیں تو امداد کی ضرورت تو پڑے گی۔ اب ذرا دوسری طرف آیئے اور دیکھئے کہ ہمارے سیاستدانوں اور ان کے خاندانوں کے کتنے مفادات اس ملک سے وابستہ ہیں سوائے اس کے کہ اس کے عوام کی خون پسینے اور محنت مشقت سے حاصل کی ہوئی کمائی سے اپنے بینک بھر سکیں۔ کیا پاکستان جیسے امیر لوگوں کے ملک کو بیرونی قرضوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہ سیاستدان کاروبار جہاں چاہے

کریں لیکن کچھ ذرائع اپنے ملک میں بھی پیدا کریں تاکہ ملک غیر ملکی غلامی سے بچا رہے۔ اس وقت یہی امداد کی مجبوری ہے جس نے پورے ملک کی سانسیں اکھاڑ رکھی ہیں اور اس وقت کسی آمر کی حکومت بھی نہیں کہ ہمیشہ کی طرح الزام آمر کو دے دیا جائے۔ اب عوام کی خواہشات کے مطابق امریکی امداد کی مجبوری سے خود کو آزاد کر لینا چاہیئے۔ عوام اب تک بھی اس امداد کا ثمر اور اثر نہیں دیکھ سکے اور آئندہ بھی ایسا کوئی امکان نہیں ہے اور ایک پہلو یہ بھی مد نظر رکھیئے کہ آخر ہر قیمت پر امریکہ ہی کیوں؟ کوئی اور طاقت چھوڑ یئے چین بھی کیوں نہیں، کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ چین ہمیں مہارت دیتا ہے اور منصوبے بنا کر دیتا ہے روزگار ملک میں آتا ہے اور جب روزگار ہوتا ہے تو ظاہر ہے لوگوں کو کھانے کو ملتا ہے اور جب وہ غم روزگار سے آزاد ہوتے ہیں تو حکومت کی پالیسیوں اور بدعنوانیوں پر تنقید کر سکتے ہیں جو کہ بدعنوان حکومتوں کیلئے بہت خطرناک ہوتا ہے کیونکہ شعور کے ذریعے انہیں چیک کیا جاسکتا ہے جبکہ حکومت یہی نہیں چاہتی کہ قوم جان سکے کہ اب تک اراکین حکومت نے بیرونی بینکوں میں ڈھائی سو ارب ڈالرز اپنی آنے والی بے شمار نسلوں کیلئے سنبھال کر رکھے ہیں تاکہ دو سو سال بعد آنے والا پوتا بھی اپنے دادا کی دولت پر فخر کر سکے چاہے اس سارے فخر میں ملک کا نام کہیں نہ آئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک عام آدمی کا جمہوریت سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن اب حکمرانوں نے اپنی ذمہ داری قبول کرلی ہے اور ایسے حالات میں کی ہے جب ملک میں امریکہ کے خلاف جذبات اپنے عروج پر ہیں۔ ایک اور حوصلہ افزا اقدام جو اٹھایا گیا ہے وہ صدر اور وزیر اعظم کے دورہ چین اور روس ہیں۔ خاص کر دورہ چین سے قوم کی کچھ آس بندھی ہے اور وہ توقع کر رہی ہے کہ شاید امریکہ سے کسی طرح ان کی گلوخلاصی ہو لیکن فی الحقیقت ہو یہ رہا ہے کہ جب سے امریکی حملے کے خلاف پارلیمنٹ نے قرارداد منظور کی ہے ڈرون حملوں میں زیادہ تیزی آ گئی ہے لیکن ہونا یہ چاہیے کہ پاکستان کو ہر صورت امریکی بالادستی اور غلامی سے نجات حاصل کرنا ہوگی کیونکہ سچ یہ ہے کہ امریکہ ہمیں دے کم رہا ہے اور ہم سے لے زیادہ رہا ہے اور نہ ہی وہ ہمارے اوپر اعتماد کرنے کو تیار ہے جس کا برملا اظہار اس نے ایبٹ آباد آپریشن میں پاکستان کو بے خبر رکھ کر کیا اور اب بھی مشترکہ آپریشن کی شرط تک ماننے کو تیار نہیں یعنی ملک ہمارا اور اختیار ان کا۔ اب تک تو اس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کیلئے منظور کی جانے والی رقم بھی ہمیں نہیں دی ہے اور جو دی ہے وہ بھی ترسا ترسا کر۔ جبکہ اس سے کہیں زیادہ دولت ہم دہشت گردی کی جنگ میں جھونک چکے ہیں۔ اب امریکہ کے ساتھ معاملات جو پہلے ایک عام آدمی کی نظر میں فوج طے کرتی تھی سیاسی حکومت کے حوالے کیے جا چکے ہیں تو اب تک جتنی دولت ہمارے حکمران بنا چکے ہیں اسی کو کافی سمجھ لیں اور قوم اور عوام سے کئے گئے وعدے پورے کرتے ہوئے اپنی ہی قرارداد پر عمل کرلیں اور امریکی

امداد پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنے زور بازو پر اعتماد کرلیں اور ایک دفعہ وقار سے جینے کا حوصلہ کرلیں تو پھر دنیا میں کچھ بھی ناممکن نظر نہیں آئے گا۔

پاکستان میں دہشت گردی۔۔۔ طالبان یا کوئی اور

یوں تو جب سے امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع کی ہے جو کہ بذات خود سب سے بڑی دہشت گردی ہے تب سے ہی پاکستان مسلسل دہشت گردی کی زد میں ہے لیکن کبھی اس کا گراف اوپر اور کبھی نیچے آتا ہے۔ 2 مئی کو ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے مبینہ قتل کے بعد سے اب تک پاکستان دو اطراف سے شدید دہشت گردی کی زد میں ہے۔ دو اطراف سے اس لیے کہ ایک طرف سے امریکہ خود بڑی شدومد سے ڈرون حملے کر رہا ہے اسکی سینٹ اور حکومتی اہلکاروں کے اشتعال انگیز بیانات بھی جاری ہیں جبکہ دوسری طرف القائدہ اسامہ کے اُس قتل جس کا دعویدار امریکہ ہے کا بدلہ پاکستان سے لے رہا ہے ہر طرف ایک بے چینی نظر آرہی ہے 2 مئی کے سکتے سے ابھی قوم نکلی نہ تھی کہ 22 مئی کو پی این ایس مہران پر حملہ ہو گیا اس حملے میں جو نقصان ہوا جو طیارے جل کر تباہ ہو گئے ان کی مالیت کیا تھی وہ ایک الگ موضوع ہے لیکن بات یہ ہے کہ آخر دہشت گردان حساس مقامات تک پہنچ کیسے گئے۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ مسلح افواج کو نشانہ بنایا گیا ہو ایک رپورٹ کے مطابق ہماری افواج کے اوپر تقریباً اڑتیس ایسے حملے ہو چکے ہیں جن میں جی ایچ کیو پر حملہ بھی شامل ہے۔ اس بار بھی اس حملے کے لیے القائدہ اور طالبان کا سہارا لیا گیا ہے اور ہر واقعے کی طرح تحریک طالبان پاکستان نے

اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور ہمارے عزت ماب وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے کسی بھی بیرونی ہاتھ کے ملوث ہونے کے امکان کو رد کر دیا ہے اس حملے میں نقصان تو جو ہوا سو ہوا اس نے بہت سارے سوالات عام آدمی کے ذہن میں اٹھا دیئے ہیں جن میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ کیا پاکستان کے خلاف کوئی سازش تیار کی گئی ہے جس کی رو سے پاکستان کے سیکیورٹی اداروں کی نا اہلی ثابت کر دی جائے اور ہمارے حساس اثاثہ جات کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی افواج کی تعیناتی کا شوشا چھوڑا جائے جیسا کہ نیٹو کے سیکٹریری جنرل نے افغانستان کے دورے کے دوران دل کی بات کہہ ہی دی کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے محفوظ ہیں لیکن انہیں اس کے بارے میں تشویش ہے یعنی پہلے حالات کو اس نہج تک لایا گیا اور اب تو پہلا جملہ بول کر پہلی قسط ادا کی گئی ہے اگرچہ درحقیقت یہ پہلا جملہ بھی نہیں ہے ایسی باتیں اکثر سننے میں آتی رہتی ہیں لیکن اس بار موقع تاک کر کی گئی ہے۔ پاکستانیوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ہمارے ایٹمی اثاثے یوں سر راہ نہیں پڑے اور اس کی حفاظت کا ایک مضبوط اور مربوط نظام ہے لیکن پھر بھی اگر کسی سے خطرہ محسوس کیا جا سکتا ہے تو وہ سب سے پہلے امریکہ اور پھر بھارت اور اسرائیل ہیں اور ہمیں اس شیطانی تکون سے ہر وقت خبردار رہنا ہوگا اگرچہ ہمارے وزیر داخلہ نے تمام بیرونی دشمنوں کو بری الذمہ قرار دے دیا ہے تاہم قوم یہ بات ماننے کو تیار نہیں کیونکہ جس طرح بھارت کی تمام تر جنگی تیاری پاکستان کے خلاف ہوتی ہے اسی طرح ہماری تیاری بھارت کے خلاف ہوتی ہے

اور پی سی تھری اورین طیارے جو کہ جدید ترین نگران
طیارے ہیں اور میزائل لے جانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں بحیرہ عرب میں بھارتی سرگرمیوں پر نظر رکھتے تھے۔ اربوں روپے کے نقصان کے ساتھ ساتھ پاکستان نیوی کو دفاعی اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بھی بہت بڑا نقصان ہوا ہے جس کا سب سے زیادہ فائدہ بھارت کو ہوا ہے امریکہ کو بھی اس شک سے مبّرا اقرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ مفاد اس کا بھی اس میں ہے کہ پاکستان دفاعی طور پر اس کا محتاج رہے تاکہ وہ علاقے میں اپنی مفادات کا تحفظ کرتا رہے یوں یہ کہہ دینا کہ غیر ملکی ہاتھ خارج از امکان ہے حقائق سے آنکھیں بند کرنے والی بات ہے اور اب تک ہم نے اپنی آنکھیں بند ہی رکھی ہیں اسی لیے ہم خسارے میں رہے تربیت کے بہانے جتنے امریکی ہمارے ملک میں موجود ہیں اُن سب پر کڑی نظر رکھی جانی چاہیے بلکہ جدید ٹیکنالوجی کی ضروری تربیت کے بعد انکی موجودگی کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ اب آیئے ذرا دوسری طرف کہ دہشت گرد ہوتے کیوں سارے پاکستانی یا ایشیائی ہیں بلکہ پاکستانی ہیں تو تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کس طرح اپنی فوج میں مقامی لوگوں کو زیادہ پیسے کا لالچ دے کر بھرتی کیا۔ حالات اب بھی وہی ہیں فرق صرف یہ ہے کہ تب سب کچھ کھلم کھلا ہوا اب امریکہ رازداری سے یہ سب کچھ کر رہا ہے تاکہ مہذب دنیا میں الزام سے بچ سکے۔ ظاہر ہے یہ مقامی لوگ جب کوئی معمولی روزگار بھی حاصل نہیں کرپاتے تو مجبورًا بھوکے خاندانوں کا پیٹ

بھرنے کے لیے سی آئی اے اور بلیک واٹر کے کارندے بن جاتے ہیں۔

ایک اور پہلو جس پر کسی کی توجہ نہیں جا رہی یا اسے در خور اعتنا ہی نہیں سمجھا جا رہا بس صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں اہم تنصیبات کی سیکیورٹی بڑھا دی گئی ہے کیا اسکے لیے نئی بھرتی کر لی جاتی ہے یا یہی ہوتا ہے کہ کسی دوسری جگہ سے سیکیورٹی ہٹا کر لگا دی جاتی ہے اور یوں دہشت گردوں کو کوئی نہ کوئی خالی ٹارگٹ مل جاتا ہے سی سی ٹی وی کیمرہ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن حفاظت پھر بھی انسان نے ہی کرنی ہے ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری افواج اس وقت مختلف محاذوں پر برسرپیکار ہیں کچھ مشرقی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہر وقت مستعد و تیار ہیں تو کیا پھر ہمارے پاس اتنی فورس بچ جاتی ہے جو اہم تنصیبات کی حفاظت کرکے اس پر حقیقت پسندی سے سوچنا پڑے گا کہ کیا کم از کم دہشت گردی کے خاتمے تک ہمیں زیادہ فوج اور پولیس کی ضرورت نہیں ہے جبکہ ہمارا ایک پولیس سپاہی کئی سو لوگوں کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور دسیوں پولیس والے کسی ایک وی وی آئی پی کی حفاظت کے لیے ذمہ دار۔

یہ کہہ دینا کہ سیکیورٹی بڑھا دی گئی ہے صرف ایک تسلی ہے اور سیکیورٹی بڑھانے سے بھی زیادہ ضروری دہشت گردی کے وجوہات کو ختم کر دینا ہے اور سب سے بڑی وجہ پر حکومت کو ضرور سوچنا چاہئے کہ کب تک ہم امریکہ کی حفاظت کی

خاطر اپنے لوگوں اور اثاثوں کی قربانی دیتے رہیں گے۔ ایبٹ آباد آپریشن، پی این ایس مہران اس سے پہلے جی ایچ کیو، آئی ایس آئی کے دفاتر بحریہ اور فضائیہ کے اہلکار و تنصیبات اور عام شہری املاک۔ ہمارا مالی نقصان تو ہے ہی ہماری خود مختاری پر بھی حملے ہیں اور ایک عام پاکستانی اس کا ذمہ دار دہشت گردوں سے زیادہ امریکہ کو سمجھتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر ہم نے خود کو اس جنگ سے الگ کر لیا تو ہمارے بہت سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے جبکہ دوسری طرف ہمیں ایسی قانون سازی بھی کرنی ہوگی کہ کم از کم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے دہشت گردوں کو سختی کے ساتھ قرار واقعی سزائیں دے کر نمٹ لیا جائے اور ناکافی ثبوت ہونے کی بنا پر ان کی خلاصی ممکن نہ ہو۔ ملک اس وقت سنجیدہ ترین حالات سے دوچار ہے اور ہمیں ہر پہلو پر انتہائی سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ کام کرنا ہوگا اپنی ذات اور مفاد سے بالاتر ہو کر۔

ہمارے ایٹمی اثاثے۔۔۔غیروں کی تشویش نہیں خوف

پاکستان اس وقت مختلف قسم کے حملوں کی زد میں ہے، دہشت گردوں کے حملے اور امریکی حملے تو عملاً ہو رہے ہیں جبکہ الزامات اور خدشات کے اظہار میں بھی کسی کنجوسی بلکہ احتیاط تک کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جا رہا ہے۔ بھارت کو بھی موقع ملا ہوا ہے کہ پاکستان کے حالات پر اپنا من چاہا تبصرہ کرے اور نیٹو کو بھی ،اور تو اور کرزئی بھی پاکستان کو اُس دہشت گردی کا الزام دے رہا ہے جس نے اُس کے اپنے ملک سے جنم لیا بلکہ وہ اور امریکہ مل کر اُسے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ان دنوں جس سوال کو خواہ مخواہ اچھالا جا رہا ہے بلکہ خود ہمارے میڈیا میں بھی اس کو زیر بحث لایا جا رہا ہے وہ ہے ایٹمی اثاثوں کی حفاظت۔ ایسا ایک لحاظ سے بہتر ہے کیونکہ یہ ہمیں مزید چوکنا کرے گا لیکن آخر اس معاملے کو مشکوک کیوں بنایا جا رہا ہے۔ نیٹو کے جنرل سیکریٹری نے کہا کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے محفوظ ہیں لیکن ہمیں اُس کے بارے میں تشویش ہے اگر محفوظ ہیں تو تشویش کی وجہ کیا ہے۔ بھارت کے ایک مضمون نگار سبھاش کپیلا نے لکھا کہ پاکستان کے اثاثے چونکہ اُسکی مغربی سرحد کے قریب رکھے گئے ہیں بھارت سے بچانے کے لیے اور یوں وہ بہت آسانی سے دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔

ادھر امریکہ اسی فکر میں مبتلا ہے۔ بات دراصل یہ نہیں کہ انہیں واقعی فکر ہے کہ خدانخواستہ ایسا ہو جائے گا بلکہ بات ساری یہ ہے کہ ایک مسلمان ملک کے پاس ایٹمی قوت ہونا ان کو گوارا نہیں یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ بھارت نے ایٹمی دھماکے ہم سے پہلے کیے اور دھماکے کرتے ہی اُسکی زبان دھمکی آمیز ہو گئی تھی اور پاکستان کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا پھر بھی پاکستان کو دھماکوں سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی اور اُس پر سخت پابندیاں بھی عائد کی گئی اب جبکہ اس واقعے کو تیرہ سال ہو گئے ہیں آج بھی غیر مسلم دنیا ہماری اس حیثیت کو قبول کرنے کو تیار نہیں اور اسامہ بن لادن کی ہلاکت اور خاص کر پی این ایس مہران کے واقعے کے بعد اس معاملے کو بلاوجہ ہوا دی جا رہی ہے حالانکہ ان ممالک کو معلوم ہے کہ ایٹمی اثاثے ہینگرز میں کھڑے ہوئے بڑے بڑے جہاز نہیں بلکہ انہیں انتہائی حفاظت سے اور سخت سیکیورٹی میں رکھا جاتا ہے اور ہمارا یہ نظام کسی بھی طرح امریکہ اور بھارت سے کم نہیں بلکہ بھارت کے اثاثے خود کبھی بہت محفوظ متصور نہیں کیے گئے اور امریکہ کے ابتدائی ایٹمی زمانے میں بھی کئی ناخوشگوار واقعات ہو چکے ہیں جبکہ اللہ کا شکر ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود پاکستان میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا کیونکہ پاکستان میں ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کے لیے ایک نہایت موثر اور منظم نظام موجود ہے۔

کسی بھی نظام کو پہلا خطرہ اندرونی طور پر ہو سکتا ہے اس کے بعد بیرونی یا ان دونوں کے ملاپ سے اور یا ایٹمی اسلحہ کے ذخیرہ کرنے کی مقامات سے۔ پاکستان کے اثاثوں کے کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم میں ان تمام باتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے اور ہر وہ شخص جو کسی بھی طرح ایٹمی اثاثوں کی حفاظت سے متعلق ہو اُسکے بارے میں انتہائی درجے کی چھان بین کی جاتی ہے اور نہ صرف اسکی موجودہ پوزیشن بلکہ اُسکے تعلیمی ریکارڈ، سیاسی وابستگی یہاں تک کہ اسکے خاندان کے تمام افراد کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے، اسکی نفسیاتی صحت چیک کی جاتی ہے اور وقفے وقفے سے مسلسل یہ سیکیورٹی کلیرنس ہوتی ہے اور ایک ادارہ نہیں بلکہ ایم آئی کے ساتھ ساتھ آئی ایس آئی بھی یہ کلیرنس کرتی ہے۔ جہاں تک ہتھیاروں کا تعلق ہے تو یہ بھی کوئی کھلونے نہیں ہیں کہ جسے ہر شخص استعمال کرکے اول توانہیں حصوں میں رکھا گیا ہے یہ ہتھیار جوڑ کر تیار حالت میں نہیں رکھے جاتے اور پھر اس پر خفیہ کوڈ لگے ہوتے ہیں اور وہ بھی پورا کوڈ ایک شخص نہیں جانتا بلکہ کئی کئی افراد اسے پورا کر سکتے ہیں اسکے علاوہ بھی ان کی حفاظت کے لیے کیمرے، سکینرز اور دوسرے بے شار جدید آلات نصب ہیں جبکہ اس کے محافظ ہر وقت انتہائی مستعد یعنی ہائی الرٹ رہتے ہیں اور اگر کسی محافظ یا اہلکار کے بارے میں شک بھی ہو تو اُسے فوری طور پر چیک کیا جاتا ہے اور کسی بھی ثبوت کی بنا پر حاضر سروس یا ریٹائرڈ فرد کو، چاہے وہ سول ہے یا فوجی پچیس سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔

یہ ہیں اُن انتظامات کے صرف معلوم حصے کا سرسری سا جائزہ ہے جو ان اثاثوں کی حفاظت کے لیے مستقل بنیادوں پر کیے جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ظاہر ہے کہ طریقہ کار میں بہتری اور تبدیلی بھی لائی جاتی ہے پھر اس شور کی توجیہہ کیا ہے جو ایک دم مچا دیا جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد شور تھمتا ہے اور پھر اٹھا دیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور ایمان کی طاقت کے ساتھ اگر ٹیکنالوجی کی طاقت بھی شامل ہو جائے تو بڑے سے بڑے دشمن کی قوت کو بکھیرا جا سکتا ہے بس یہی خوف ہے جو کبھی امریکہ، کبھی بھارت اور کبھی نیٹو کی زبان سے تشویش بن کر نکلتا ہے اور اس کا دوسرا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ پاکستان پر دباؤ ڈالا جاسکے کہ وہ نہ صرف اپنی صلاحیت میں اضافہ نہ کر سکے بلکہ موجودہ صلاحیت سے بھی یا تو دست بردار ہو جائے یا اسے زائل کر دے جیسا کہ انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ انٹرنیشنل سیکیورٹی واشنگٹن نے اپنی 16 مئی 2011 کی رپورٹ میں بھی کہا کہ پاکستان اپنے ایٹمی اثاثوں میں ہر سال سات سے چودہ وار ہیڈز کا اضافہ کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے اس شور کی جو آجکل امریکہ نے مچایا ہوا ہے اور بھارت اس میں اپنی ہمت کے مطابق حصہ ڈال رہا ہے اور پاکستانی جو پہلے ہی حالات کی وجہ سے پریشان ہیں ان کا اپنے اداروں اور طاقت پر سے اعتماد ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو کہ اُس بڑے سازشی منصوبے کا حصہ ہے جو اسکے خلاف بنایا گیا ہے سچ تو یہ ہے

کہ ہمارے ایٹمی اثاثوں کو سب سے بڑا خطرہ اُن طاقتوں کی طرف سے ہے جو انکے غیر محفوظ ہونے کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ دہشت گردوں سے تو ہم انہیں محفوظ رکھ لیں گے لیکن بھارت، امریکہ اور اسرائیل سے ان کی حفاظت کے لیے ہمیں مزید اقدامات کرنے ہونگے کیونکہ ہمارے ایٹمی اثاثوں کو دراصل خطرہ ان ملکوں سے ہے کسی اور سے نہیں لیکن ایک اور یاددہانی بھی ضروری ہے کہ پاکستانی اپنے ایٹمی اثاثوں کے بارے میں انتہائی حساس ہیں اور اسکی حفاظت کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔ لہذا دشمن قوتوں کو اِن کے بارے میں کچھ بھی کہنے یا کرنے سے انتہائی محتاط رہنا چاہیے۔

امن و امان اور افغان مہاجرین کی واپسی

1979 میں سابق سوویت یونین نے افغانستان میں فوجیں داخل کیں تو اس یلغار سے بچنے کی خاطر لاکھوں افغانیوں نے پاکستان کا رخ کیا اور نہ صرف بڑے بڑے مہاجر کیمپ آباد ہو گئے بلکہ یہ مہاجر شہروں میں کرایوں پر گھر لے کر رہنے لگے اور کچھ نے تو، جو خوشحال لوگ تھے پشاور میں رہنے والے رشتہ داروں کے نام پر اپنے گھر بنا لیے اور یوں ان کی جائیدادیں بن گئیں ۔ایک بہت بڑی تعداد نے تجارت شروع کی جو آج بھی بڑی کامیابی سے چل رہی ہے اور کچھ نے دہاڑی مزدوری شروع کی یوں ہر شعبہ زندگی میں افغان مہاجرین نظر آنے لگے۔ اُس زمانے کے پرائیویٹ سکولوں میں افغان طلبہ کی ایک کافی بڑی تعداد نے داخلے لئے اور پاکستانی تعلیم حاصل کرتے ہوئے وہ پاکستانی طلبہ کے ساتھ ساتھ پڑھتے رہے اب ایک اور نسل ان کی جگہ لے چکی ہے اور وہ نسل اپنے سے پہلی نسل جو ہجرت کرکے آئی تھی کے کاروبار اور تجارت کو چلا رہی ہے یوں یہ افغان مہاجرین کی تیسری نسل ہے جو پاکستان میں رہ رہی ہے اور باوجود اسکے کہ ان میں سے اکثر کی زبان بھی پشتو ہے اور کچھ رسوم و رواج بھی مشترک ہیں لیکن ان کی پہچان آج بھی بڑی آسان ہے کیونکہ انہوں نے اپنا تشخص بڑی وضاحت سے برقرار رکھا ہوا ہے یہاں تک کہ اُن کے عروسی ملبوسات کی علیحدہ دکانیں ہیں اور الگ ریسٹورنٹ ہیں۔ یہاں تک تو

کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنے رسوم و رواج اور تشخص کو آج بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔
لیکن مسلہ یہ ہے کہ پاکستان جو اپنے لوگوں کی کفالت میں مشکلات محسوس کرتا ہے اسکی معیشت لاکھوں مہاجرین کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہیں جو کامیاب تجارت کے باوجود دتا حال کوئی ٹیکس نہیں دے رہے۔ معیشت کے اوپر تو جو بوجھ پڑا ہوا ہے وہ تو ہے ہی انہیں کی موجودگی کی وجہ سے بہت سے دوسرے مسائل بھی جنم لے رہے ہیں،جن میں سے آلودگی اور مہنگائی جیسے مسائل بھی شامل ہیں کیونکہ ایک شہر اپنی ہی آبادی جتنی ایک اور آبادی کو بھی اٹھائے ہوئے ہے اور اِن سب سے بڑھ کر جو مسلہ ہے اور جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھا ہوا ہے وہ ہے امن و امان ۔ ایسا ہر گز نہیں ہے کہ یہ تمام مہاجرین دہشت گرد یا شدت پسند ہیں ان کی ایک بڑی تعداد پڑھی لکھی اور شریف لوگوں پر مشتمل ہے لیکن ان کی موجودگی کی وجہ سے سرحد پار (ڈیورنڈلائن) سے نقل و حرکت مسلسل اور بڑے پیانے پر جاری رہتی ہے یہ لوگ بڑی با قاعدگی سے افغانستان جاتے رہتے ہیں۔ اب وہاں سے واپسی پر یہ اپنے ساتھ کیا کچھ لے کر آتے ہیں انتہائی چیکنگ اور احتیاط کی جائے تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ان کے ساتھ آنے والی ممنوعہ اور خطرناک اشیا کی آمد کو روکا جاسکے ۔ پھر پاکستان اور افغنستان کی ایک طویل مشترکہ سرحد ہے جو دشوار گزار راستوں اور پہاڑوں پر مشتمل ہے اور یہی دشوار گزاری دہشت گردی کے لیے جائے اماں بنی ہوئی ہے۔ ان راستوں اور علاقوں کے کونوں کھدروں سے یہ لوگ واقف ہیں۔ پھر ہے بھی یہ آزاد قبائلی علاقہ ،

جہاں پاکستانی قوانین بہت کم لاگو ہوتے ہیں۔دراصل یہ معاملہ دونوں ملکوں کی باہمی کوشش اور تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ ایک اور پہلو اس مسئلے کا یہ بھی ہے کہ افغانستان ہی کے راستے وسطی ایشیائی یعنی ازبک اور تاجک اور کچھ دیگر ریاستوں کے باشندے بھی پاکستان آکر اپنا ''شوق جہاد'' پورا کرتے ہیں اب بات یہ ہے کہ غیر مسلم فوج افغانستان میں موجود ہے ان سے جنگ تو جہاد ہے پاکستان میں کیوں؟ صرف اس لیے کہ پاکستان کو غیر مستحکم کیا جائے اور یوں پاکستان کئی سالوں سے دہشت گردی کی زد میں ہے اب جبکہ امریکہ اور کرزئی دونوں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ افغانستان پر ان کا مکمل کنٹرول ہے اور طالبان کمزور ہو چکے ہیں تو پھر انہیں چاہیئے کہ ان افغان مہاجرین کو اپنے وطن واپس لے جانے کے لئے اقدامات کریں یہ سمجھ لینا کہ کیمپ خالی کروانے سے مہاجرین واپس چلے جائیں گے تو ایسا نہیں ہے کیونکہ ان مہاجرین کی آمد کے بعد پشاور اور اسکے مضافات میں بے تحاشا چھوٹے گھر بن چکے ہیں جو انہیں ارزاں نرخوں پر کرایے پر دستیاب ہیں الہذا یہ کیمپوں سے اٹھ کر ان گھروں میں چلے جاتے ہیں ۔ گزشتہ سال جولائی میں آنے والے سیلاب میں دنیا کا سب سے بڑا اضاخیل مہاجر کیمپ تباہ ہوگیا تو یہ پھر سے جی ٹی روڈ کے کنارے خیمہ بستیوں میں آباد ہو گئے ہیں یوں پھر ان تک امداد بڑی آسانی سے پہنچنے لگی ہے چونکہ پشاور افغان مہاجرین سے سب سے زیادہ متاثرہ شہر ہے اس لئے اس کا زیادہ ذکر کیا گیا لیکن یہ لوگ دوسرے شہروں میں بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں

اور مختلف پیشوں اور کاروبار سے منسلک ہونے کی وجہ سے ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں لیکن بہر حال پاکستان کی شہریت نہیں رکھتے۔

جب افغانستان مصیبت میں تھا تو پاکستان اور پاکستانیوں نے دل کھول کر ان کی مدد کی تھی اور اب بھی کر رہے ہیں لیکن بتیس سال سے یہاں رہنے والے ان لوگوں کی وجہ سے پاکستانی معیشت اور معاشرت نے بہت نقصان اٹھایا ہے معاشرت کے لیے میں صرف ایک مثال دوں گی۔ یکٹری بورڈ پشاور ایک صاف ستھرا اور رہنے کے لیے اچھاعلاقہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب وہاں افغانیوں کے اتنے پر ہجوم بازار اور کاروبار ہیں کہ وہاں رہنا تو درکنار گزرنا بھی محال ہو جاتا ہے اور امن و امان کی تو جو صورت حال ہے اُس نے پاکستان کو قومی اور بین لاقوامی سطح پر جو نقصان پہنچایا ہے اگر ہم آج سے ہی بہتری کی طرف سفر شروع کردیں تو بھی ہمیں بیس تیس سال لگ جائیں گے کہ ہم اپنی صنعت، معیشت اور رسل و رسائل کو دوبارہ بین الاقوامی سطح پر لا سکیں۔ نفسیاتی مسائل الگ ہیں خوف کی فضا ہر وقت طاری رہتی ہے۔ کہیں پتا بھی کھڑک جائے تو دھماکے کا شک ہونے لگتا ہے ٹریفک سگنل پر رک جائیں تو گاڑیوں کے ہجوم کو دیکھ کر خوف آنے لگتا ہے کہ رش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تخریب کاری نہ کر دی جائے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ہر مہاجر اس کا ذمہ دار نہیں ہے لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ دہشت گرد اِن کی موجودگی کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور بڑی آسانی سے اپنی

کاروائیاں کر لیتے ہیں ۔ افغانستان پر جب بھی مشکل وقت آیا پاکستان اور پاکستانیوں نے مکمل طور پر اسلامی اخوت کا مظاہرہ کیا، انکی مدد کی اور پناہ دی لیکن اب خود ہمارے گھر میں جو آگ لگی ہوئی ہے یا لگائی گئی ہے ہمیں اسے بجھانا ہے اور قومی سطح پر امن و امان اور بین الاقوامی سطح پر اپنی ساکھ بہتر کرنی ہوگی۔ ہم اپنی پینتیس ہزار جانیں اس دہشت گردی کی نذر کر چکے ہیں یہ اعداد و شمار پچھلے دس سال کے ہیں اس سے پہلے کے بائیس سالوں کی تعداد اور تھی ۔ منشیات کا طوفان تب سے آکر ابھی تھما نہیں ۔ اس سب کچھ کے باوجود جناب کرزئی بھی فرمائش اور مطالبہ کر دیتے ہیں کہ پاکستان دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہیں ختم کردیں جناب آپ ہماری طرف دہشت گرد.برآمد کرنا بند کردیں تو خالی پناہ گاہیں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ اپنے ملک میں امن و امان قائم کریں جو کہ آپ کے بقول ہے ۔ہم افغانوں کو کافی تربیت یافتہ کر چکے ہیں انہیں اپنے ملک لے جا کر افغانستان کی تعمیر نو میں اِن سے کام لیجئے اور امریکہ کو واپس بھیج دیجئے کیونکہ یہ جتنے بھی آپ کے مخالف ہوں افغان ہیں اور جتنی محبت یہ افغانستان سے کر سکتے ہیں امریکہ یا کوئی اور نہیں کر سکتا۔

افغان مہاجرین کی واپسی یقیناً پاکستان کو امن کی طرف پلٹانے میں بہت.بڑا کردار ادا کر سکتی ہے لیکن یہ واپسی صرف کیمپوں کے انخلاتک محدود نہ ہو

بلکہ شہروں سے بھی ہو۔اِن مہاجرین کے نام پر آئے ہوئے این جی اوز کی سرگرمیوں کو بھی محدود کر دیا جائے اوراِن پر کڑی نظر رکھی جائے کہ ان میں کتنے منصوبہ ساز اور سرمایہ دار مددگاراِن دہشت گردوں کو امداد فراہم کر رہے ہیں کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جس پیمانے پر ہو رہا ہے، گاڑیاں اور اسلحہ جس طرح استعمال کیا جارہا ہے یہ اُن غریب قبائل کے بس کی بات نہیں جو چند سال پہلے دو وقت کی روٹی بھی بمشکل کھاتے تھے اور عام قبائلی اب بھی وہی زندگی گزارنے پر مجبور ہے جو وہ پہلے گزارتا تھا۔

بہرحال افغان مہاجرین کی واپسی کے مسئلے کو سنجیدگی سے لینا ہوگا اور افغان حکومت، امریکہ اور باقی دنیا کو بھی احساس دلانا ہوگا کہ پاکستان اب بھی ایک بہت بڑا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور مہاجرین کو بھی اپنے ملک جلدازجلد واپس جانے پر راضی کرنا ہو گا اور وہاں اسے حالات پیدا کرنے ہونگے کہ یہ اپنا رزق روزی اسی طرح کما سکیں جیسے یہ پاکستان میں کما رہے ہیں اور انکی واپسی تک ان کی کاروائیوں پر کڑی اور مسلسل نظر بھی رکھنی ہوگی۔

تہذیب ۔۔۔ گلہ تو اپنے بکھرتے ہوئے سفر سے ہے

پاکستان اِن دنوں مشکل حالات کا شکار ہے عوام کی جان اور خون اتنے ارزاں ہیں کہ ایک طرف سے امریکہ دوسری طرف سے دہشت گرد اس پر حملہ آور ہیں نہ سڑک محفوظ نہ مارکیٹ نہ حجرہ نہ مسجد۔ میڈیا بڑی تندہی سے یہ خبریں عوام تک پہنچا رہا ہے بلکہ ہر چینل دوسرے سے پہلے نیوز بریک کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ انتہائی سرعت کے ساتھ ہر خبر ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ حکومت کی بد انتظامی کے پول بھی عوام کے سامنے کھل رہے ہیں اور ہمارے ماورائی خوبیوں کے ساتھ مشہور ہونے والے رہنما اپنی اصل حقیقت اور کردار کے ساتھ عوام کی عدالت میں کھڑے ہیں یہ اور بات کہ اس عدالت میں ملزم ہی طاقتور ہے۔ عوام کے مالیاتی سے لے کر معاشرتی مسائل تک سامنے آ رہے ہیں ۔ یہ ہمارے میڈیا کا وہ رخ ہے جو قابل ستائش ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارا میڈیا معاشرے کی شکست وریخت کا بھی ذمہ دار بن رہا ہے ۔ کسی بھی ملک و قوم کی مضبوطی کے لیے سب سے پہلے اس کی معاشرتی

روایات کو مضبوط ہونا چاہیے اور اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کو مذہب کے ساتھ ساتھ معاشرت کے بھی اصول دیئے ہیں اور در حقیقت یہی اصول اسلامی معاشروں کی بنیاد بنتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حیا کو نصف ایمان قرار دیا ہے اور اللہ، رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان اور عبادات کے بعد یہ اہم ترین احکامات میں سے ہے بلکہ اسے ایمان و عبادت میں ضروری قرار دیا گیا نماز شروع کرنے سے پہلے سر اور جسم کو ڈھانپنا ضروری ہے یوں اسے عبادت کا جز بنا دیا گیا ہے۔ مخلوط محافل اور غیر ضروری رابطوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسلام عورت کو گھر میں بند نہیں کرتا لیکن اُسے نمائش کی چیز نہیں سمجھتا کیونکہ اسلام اُسے عزت دیتا ہے اور اُسے ایک نیک اور سلجھے ہوئے معاشرے کا ذمہ دار سمجھتا ہے لیکن بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بزعم خود پختہ ذہن، روشن خیال اور ترقی پسند کہلانے والے میڈیا نے ٹاک شوز کے ذریعے سیاسی اصلاح کا تو بیڑا اٹھایا ہوا ہے لیکن معاشرتی سدھار اور سنوار کو نہ صرف اپنی ذمہ داریوں سے خارج کر دیا ہے بلکہ خود اس بگاڑ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ بیرونی چینلز کے اوپر کوئی چیک نہیں ہر قسم کے مناظر آپ کے گھر کا حصہ بن چکے ہیں پیمرا کو اس معاملے کا فوری نوٹس لینا ہوگا ورنہ ہمارے معاشرے میں بچ جانے والی چند ایک معاشرتی قدروں کا خاتمہ بھی عنقریب ہو جائے گا۔ ہم جو بڑے فخر سے اپنے اخلاقیات کا ذکر کرتے تھے وہ تو ویسے ہی معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ اِن غیر ملکی چینلز کے بعد ذرا اپنے ڈرامہ چینلز پر آیئے تو بھی آپ کو بسا اوقات پاکستانیت ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ بیرونی چینلز کو تو آپ لاک کر دیجئے، انڈین ڈرامہ چلانے اور دیکھنے پر پابندی لگا دیجئے لیکن نیوز چینلز کے ساتھ ساتھ کیا کیا جائے کہ خبریں چلتے چلتے کسی انڈین فلم کا کوئی ایسا

منظر سکرین پر نظر آئے گا کہ شریف گھرانے کا ہر فرد چینل کی تبدیلی تک ایک دوسرے سے نظریں چرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بھارتی اداکارائیں شائد اتنا اپنے چینلز پر نظر نہ آتی ہوں گی جتنا ہمارے میڈیا پر۔ ہمارے ہاں چلنے والے اکثر اشتہارات برائے نام تو کو پروڈکشن کے ہیں لیکن درحقیقت بھارتی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار۔ کیونکہ جو لباس اور طور طریقے اِن میں دکھائے جاتے ہیں وہ کسی بھی طرح ہمارے نہیں۔ اب ذرا آیئے ان اشتہارات کی طرف جن میں ہماری ماڈلز ماڈلنگ کرتی نظر آتی ہیں لیکن انتہائی مختصر اور بیہودہ لباس میں۔ یہ تو پی ٹی وی کے زمانے سے ہی چلا آ رہا ہے کہ بلیڈ کا اشتہار ہو تو بھی اُس میں عورت کی موجودگی ضروری ہے اور موٹر سائیکل بلکہ ٹریکٹر کا تب بھی۔ کیا ہر چیز کی فروخت کے لیے اُس میں عورت کی موجودگی ضروری امر ہے یا ہم نے اُسے توجہ کا نوٹس سمجھ لیا ہے۔ چلیں مان لیا کہ تصویر کائنات میں رنگ اسی سے ہے لیکن رنگ بھرنے کا بھی ایک ہنر ایک طریقہ ہوتا ہے اور اس ہنر کا کمال آج یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عورت کو نیم عریاں لباس میں کسی بھی پراڈکٹ کی مشہوری کے لیے استعمال کر لیا جائے بلکہ خبروں اور میڈیا چینلز کی شہرت کے لیے بھی، اور اگر یہ ماڈلز بھارتی ہوں تو پھر تو کیا ہی بات ہے اگرچہ ہماری اپنی اداکارائیں بھی کچھ کم نہیں تاہم یہ تو کسی تر در کسی تکلیف کی قائل نہیں۔ اُن کا معاشرہ، ان کا مذہب اور انکی فلمی صنعت جانے اور وہ جانے لیکن ہم نے کیوں اپنے الیکٹرانک میڈیا، اشتہارات، اخبارات میگزینز ہر چیز،

کے لیے انہیں ضروری سمجھ لیا ہے بلکہ اسی پر کیا موقوف بڑے فخر سے انہیں ہر چوک میں بورڈ آویزاں کرکے اپنے ملک اور معاشرے کے لیے ناگزیر بنا دیا ہے۔ یہ تو لباس کا معاملہ تھا جو خرابی کی جڑ ہے اسکے بعد ذرا غور کیجئے اُن حرکات و سکنات پر جو اِن اشتہارات میں کی ہیں۔ چائے کا اشتہار ہے تو پورا ملک ناچتا ہوا دکھایا جاتا ہے، گھی یا تیل میں تو حد کر دی جاتی ہے کہ خاتون خانہ ناچ ناچ کر کھانا پکا رہی ہیں ہماری خواتین کام کرتے ہوئے گنگناتی تو ضرور ہیں لیکن باورچی خانہ جس کے آداب اور احتیاط ہی یہ ہیں کہ کسی بھی قسم کی تیزی نہ ہو تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو کجا کہ ناچ کر کھانا پکایا جائے۔ صابن اور شیمپو کے اشتہارات تو نظر بھر کر دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ جوس کی مشہوری مقصود ہو تو الگ تماشا اور سوفٹ ڈرنکس پینے والے کو تو ایسی ہیجانی حرکتیں کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے کہ شراب نوشی کا گماں ہوتا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر آج کل جس چیز نے طوفان بلکہ طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے وہ موبائل فون اور موبائل فون کمپنیز ہیں۔ یہاں کسی ضابطہ اخلاق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی یوں تو ضابطہ اخلاق کہیں موجود نہیں لیکن موبائل کو تو بالکل مبرا قرار دے دیا گیا ہے نہ لباس، نہ تہذیب، نہ معاشرت، نہ تمیز کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ہمارے مشہور گلوکار اِن اشتہارات میں جو حرکتیں کرتے ہیں اور جو حدیں پھلانگتے نظر آتے ہیں کم از کم ہمارے معاشرے میں انہیں انتہائی معیوب بلکہ قبل سزا سمجھا جاتا ہے۔

یہ تو چند ایک جھلکیاں تھیں جو احتیاط کرتے ہوئے پیش کی جا سکتی تھیں۔ باقی قارئین خود جانتے ہیں کہ کس کس مصنوعہ کو کس کس انداز سے پیش کیا جاتا ہے اور سوال یہ بھی ہے کہ کیا خود کو اسلامی معاشرہ کہنے کے بعد ان مصنوعات کو یوں سرعام مشتہر کرنا مناسب بھی ہے۔ اعتراض کی صورت میں جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دور جدید میں یہ سارے ذرائع استعمال کرنا پڑتے ہیں تو ذرائع سے اختلاف نہیں ہے بلکہ طریقے سے اختلاف ہے۔ ایک معاشرہ جو مذہب اور تہذیب دونوں کی بنا پر اس قسم کی حرکات کو معیوب سمجھتا ہے وہاں اِن مناظر کے بعد جو خرابی جنم لیتی ہے اس کا علاج نا ممکن ہو جاتا ہے۔ موبائل ہی کو لیجئے کہ ہر شخص اسے کان سے لگائے ہوئے نظر آتا ہے اور جو لوگ بھوک کے مارے خودکشی پر آمادہ ہیں وہ بھی موبائل پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں اور نوجوان اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کرنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسا وہ ٹی وی پر دیکھتے ہیں اور اس میں ماڈرن اور بیک ورڈ اور پڑھے لکھے یا ان پڑھ کی کوئی تخصیص نہیں۔

ہم اپنی روایات بڑی حد تک کھو چکے ہیں لیکن حالات سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے ہمیں ان کی بازیافت کرنا ہوگی۔ جو باقی ہیں ان کو بچانے کے لیے ہمیں سنجیدہ کوشش کرنا ہوگی دراصل ہمارے بہت سے مسائل کی جڑیں انہیں اقدار و روایات سے

رو گرانی سے جڑی ہوئی ہیں۔ جس کے لیے حکومت اور عوام دونوں ذمہ دار ہیں پیمرا کو چینلز اور کیبل آپریٹرز دونوں کے لیے ایک معتدل اور اخلاقی حدوں کا حامل ضابطہ اخلاق بنانا ہوگا۔ ورنہ ہم اپنی آخری پونجی سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

ہوشیار۔۔۔ تو عرصہ محشر میں ہے

پاکستان کا حصول مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا ایک نا قابل یقین نتیجہ تھا۔برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے یہ سوچے بغیر کہ ان کا شہر پاکستان کا حصہ بن سکتا ہے یا نہیں ہر نعرے کا ایک جواب دیا پاکستان کا مطلب کیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ، لے کے رہیں گے ۔۔پاکستان بن کے رہے گا ۔۔ پاکستان۔ اُس وقت اکثریت کا ایک ہی مطالبہ تھا اور وہ تھا پاکستان۔ پاکستان بنا تو کچھ ہی عرصے بعد سیاسی جوڑ توڑ شروع ہو گئی لیکن وہ سب کچھ سیاسی تھا ملک کے لیے ہر ایک مخلص تھا۔ کرپشن اگر تھی بھی تو اس میں حکومت اور سربراہان حکومت کا نام نہ آتا تھا۔ ساٹھ کی دہائی میں پاکستان ترقی کی راہ پر چل نہیں دوڑ رہا تھا کم از کم تاریخ اور کتابوں میں یہی درج ہے اور چشم دید گواہ ابھی بفضل تعالیٰ حیات ہیں ، پھر اسی دہائی کے اواخر تک قومی اتحاد میں جو دراڑیں پڑیں اُس نے ملک کو دو ٹکڑے کرکے چھوڑا۔ اس مرحلے کے بعد اب ایک بار پھر ملک تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہا ہے اگرچہ یہ جملہ ہر دور میں بولا جاتا رہا ہے تاہم آج حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ سوائے بلوچستان میں چند ایک عاقبت نا اندیش اور خود غرض لوگوں کے ملک میں نااتفاقی نہیں ہے۔ بلوچوں کی بھی اکثریت جن میں وہاں کے پختون بھی شامل ہیں پاکستان کی سالمیت کی ضرورت سے

انکار نہیں کرتے۔ فاٹا اور وزیرستان جو سب سے زیادہ مشکل اور مصیبت میں ہے سمیت ہر ایک ملکی حالات کی درستگی کے لیے دعا گو ہے۔ دشمن کی چالیں اور سازشیں ابھی جاری ہیں اور وہ کسی بھی زاویے سے کوئی کوتاہی نہیں کر رہا۔ کبھی وہ بریلوی دیوبندی کا تنازعہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے کبھی شیعہ سنی اور کبھی اقلیتوں کو ملک کے خلاف ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم خود کو دشمن کے ہر حربے سے بچا سکیں۔ فی الوقت دشمن نے قومی سلامتی کے حامل اور ذمہ دار اداروں کو نشانہ بنانے کا عزم کیا ہوا ہے۔ 2 مئی کو ایبٹ آباد میں اسامہ کی مبینہ ہلاکت کے بعد فوج سے جو شکایتیں قومی سطح پر کی گئیں بالکل بجا تھیں لیکن بین الاقوامی سطح پر ہماری فوج کو جس طرح نشانہ بنایا گیا وہ یقیناً بدنیتی پر مبنی تھا۔ اُس کے بعد پے در پے کچھ ایسے واقعات ہوئے جس نے دشمن کے ارادوں کو مزید خوراک بہم پہنچائی۔ اِن واقعات میں خروٹ آباد، مہران بیس اور کراچی رینجرز کے واقعات شامل ہیں۔ اب دیکھا جائے تو مہران بیس کے علاوہ یہ سارے واقعات انفرادی سطح کے ہیں اور نہ صرف قابل مذمت بلکہ انتہائی قابل مذمت ہیں اور ان واقعات میں ملوث افراد کو یقیناً قرار واقعی سزا ملنی چاہیے اور انہیں صرف اس لیے نہیں چھوڑ دینا چاہیے کہ ان کا تعلق فوج سے ہے بلکہ اِن کی سزا اس لیے سخت ہونی چاہیے کہ اِن کے انفرادی فعل سے اِن کے ادارے کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ باوجود اس کے کہ فوج نے حکومت کو پیشکش کی کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے فوج اُس پر عمل

درآمد کرے گی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اُس کے خلاف تنقید کا طوفان اٹھادیا گیا ہے یہ سوچے بغیر کہ چاہے اچھا ہے یا بُرا اسی ادارے نے ملک کی حفاظت کی ذمہ داری نبھانی ہے اور یہ بھی مد نظر رہے کہ دہشت گردی کے خلاف یہی فوج مسلسل برسر پیکار ہے ہر روز یہ اپنے کئی شہیدوں کو اس وطن کی مٹی کے سپرد کرتی ہے۔ کیا ان کے نفسیاتی دباؤ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فوج انہی سپاہیوں سے مل کر بنی ہے ۔ افراد کی کوتاہیوں کو تنقید کا نشانہ بنانے کی بجائے اداروں کی شکست وریخت ہماری قومی صحت کے لیے انتہائی خطرناک ہوگی لیکن مصیبت یہ ہے کہ جرات اور انصاف سے کام لینے کی بجائے کہ انکی خامیوں کی اصلاح کے لیے کوشش کی جائے ہم اِن اداروں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے درپے ہوجاتے ہیں اور اس میں ہمارا بچپن کی سرحدوں کو بالکل ابھی ابھی عبور کرتا ہوا اور لڑکپن کی سرحدوں سے ہنوز دور الیکٹرانک میڈیا ایک خطرناک رول ادا کررہاہے۔ غلطیوں کی نشاندہی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف مختلف چینلز اپنے مالکان اور سیاسی ہمنواؤں کو خوش کرنے کے شوق میں مصروف قومی سلامتی اور سالمیت سے بے خبر اپنی دوڑ یں لدوڑے جارہے ہیں۔ ایک فوج پر ہی کیا موقوف ہر ادارے کی معمولی غلطی کو مسلسل تنقید کا نشانہ بناکر اُسکو دنیا کے سامنے اس قدر ذلیل کردیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی طور پر بھی یہ تذلیل فرض سمجھ لی جاتی ہے۔ ایک مثال پی آئی اے کی دوں گی ۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کی کارکردگی روبہ زوال ہے لیکن

خدا جانے کب ایک بار اکی کسی فلائٹ میں چوہا نکلا اور پھر ہر نیوز چینلز کے مزاحیہ شو میں اس کو اس قدر اچھالا گیا کہ کوئی اس سے سفر کرنا بھی چاہے تو نہ کرے اور جو تھوڑی بہت آمدن تھی وہ بھی ختم ہو کر ادارہ تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا۔ اسی طرح ریلوے بھی اگر سیاستدانوں سے کچھ بچ گیا تھا تو اُسے تو بالکل ہی ناکارہ سمجھ لیا گیا ہے۔کہنے کا مقصد ہر گز یہ نہیں ہے کہ غلطیوں اور خامیوں کی نشاندہی نہ ہو۔ ضرور ہو لیکن تنقید برائے تنقید اور تنقید برائے اصلاح میں فرق محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ اب کی بار ہم واقعی تاریخ کے نازک موڑ سے گزر رہے ہیں بجائے اداروں کو نشانہ بنانے کے حکومت اور سیاستدانوں پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے کہ وہ قوت فیصلہ پیدا کرے اور قوت فیصلہ تب ہی آتی ہے جب خلوص اور نیک نیتی ہو ، قومی مفاد ذاتی مفاد سے بالاتر ہو۔ ہر لفظ یہ سوچ کر بولا جائے کہ اس کا ملک و قوم پر کیا اثر ہوگا۔ فوج اور آئی ایس آئی بھی حکومت کے ماتحت ادارے ہیں۔ حکومت اور سیاست دان اپنا کردار اتنا مضبوط بنالیں کہ وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے پر انہیں مجبور کر سکیں۔ یہ درست ہے کہ طالع آزما جرنیلوں نے قومی مفاد کو نقصان پہنچایا لیکن جس طرح وہ ” تخت نشین ‘ ‘ کئے گئے اُن حالات اور اُس سیاسی کردار کا ایک ایک لفظ اب بھی ہر پاکستانی کو یاد ہے اور جس طرح ہمارے سیاستدان اور چغادری قانون دان خود کو ہر جرم سے پاک قرار دے رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ جب جو اختیار کی منزل تک پہنچا بہت کم ایسے ہوں گے کہ انہوں نے

قومی مفاد کو اپنی ذات پر ترجیح دی ہوگی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے۔ یہ وقت ایک دوسرے کو گالیاں دینے کا نہیں ہے محاسبے اور خود احتسابی کا ہے۔ ملک کو صرف اپنی ذمہ داری سمجھنے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا ہے۔ دوسروں کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کا ہے دشمنی کا نہیں بلکہ ان غلطیوں اور کوتاہوں کی درستگی کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا ہے نہ کہ اپنے دل کا بغض نکالنے کے لیے دوسروں کی غلطیوں کا بوجھ بھی "دشمن" کے سر ڈال دیا جائے جیسا کہ فوج کے معاملے میں کیا جا رہا ہے کہ وزارت داخلہ کے ماتحت رینجرز کے ظلم کو بھی فوج کے نامہ اعمال میں لکھ دیا گیا ہے۔یقینا وہ ایک گھناؤنا جرم تھا جو وقوع پزیر ہو چکا لیکن اُسے دن میں کم از کم پچاس دفعہ ہر چینل سے دکھانے کا مقصد کیا ہے؟ تاکہ مزید سبکی ہو؟ اور یہ پہلو بھی مد نظر نہیں رکھا جا رہا ہے کہ ہر بار مرتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اُسکے گھر والوں کو از سر نو اذیت دی جا رہی ہے یہ نوجوان پاکستانی تھا اور یہ دکھ ہر پاکستانی محسوس کرتا ہے اب یہ منظر ہر ایک دیکھ چکا سب کو معلوم ہو چکا۔ لیکن خدارا اس انفرادی فعل کو اپنے ملک کے انتہائی قابل احترام اور اہم اداروں کی تباہی کا باعث مت بنایئے خود اپنے ملک کو عالمی طاقتوں کے لیے پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنے سے گریز کرنا چاہیے اگر ایسا ہی ہے کہ اس ملک کی فوج اس کی حفاظت نہیں کر سکتی تو ہمارے سیاستدانوں کو جن میں بہرحال کچھ پڑھے لکھے لوگ بھی موجود ہیں اور ہمارے

الیکٹرانک میڈیاکے ''پیران کامل'' کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہمارے اس اقرار کا مطلب کیا ہوگا خود دوسروں کو دعوت دینا۔ مجھے کیا کسی بھی محب وطن پاکستانی کو کسی ایسے شخص سے جس نے جرم کیا ہویا جس نے حفاظت میں کوتاہی برتی ہو کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی لیکن یوں ہر انفرادی فعل پر فوج کو بدنام کرنا بھی کوئی حب الوطنی نہیں بلکہ سمجھی یا ناسمجھی میں جو بھی ہے ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ صرف اپنا فرض ادا کریں فریق مت بن جایئے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ووٹ اور نام کماتے کماتے دنیا میں اپنی شناخت کھو دیں۔

ہر گھڑی چوکس و چوبند و خبردار رہو

ملکوں کے درمیان باہمی تعلقات اگر برابری کی بنیاد پر ہوں تو نعمت ہے لیکن اگر یہی تعلقات حاکم اور محکوم یا حکم اور بجا آوری کی بنیاد پر ہوں تو عذاب بن جاتے ہیں اور کمزور ملک مزید خستہ حال اور مفلوک الحال ہوتا جاتا ہے۔ یہی حال پاک امریکہ تعلقات کا ہے۔ اس وقت امریکہ نے پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے اور ہتک پر ہتک اور مطالبوں پر مطالبوں میں مصروف ہے بلکہ پاکستان پر ہی کیا موقوف وہ پوری دنیا میں دندناتا پھر رہا ہے لیکن اسلامی دنیا اور خاص کر پاکستان اس کا ہدف ہیں۔ بش نے جب دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو اُسی وقت اُس نے اسے صلیبی جنگ کہا۔ بعد کی تصحیح ان الفاظ کا مداوا نہیں کر سکتی تھی اور نہ عمل سے ایسا کرنے کی کوشش کی گئی ۔انتہا پسندی اگر ہے تو سب سے زیادہ اسرئیل میں ہے بھارت میں بے شمار تنظیمیں مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہیں یورپ میں مسلمانوں کے مذہبی فرائض مثلاً پردہ ہی کو لیجیے پر پابندیاں لگائی گئیں جبکہ اسکے برعکس مغربی میڈیا جتنا چیخے چلائے اور مسلمان ممالک خاص کر پاکستان کو اقلیتوں کے لیے خطرناک قرار دے لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عدالتی حکم، کوئی حکومتی اقدام ایسا نہیں ہے جس کی رو سے وہ اپنا کوئی مذہبی فریضہ پورا نہ کر سکتے ہوں یہی مغربی میڈیا جو خود کو انتہائی غیر

متعصب کہتا ہے انتہائی متعصب کردار ادا کرتا ہے، خود ہی سروے منعقد کرتا ہے اور خود ہی نتائج مرتب کرتا ہے اور پوری دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور پھر ہم اسے اپنے ہر چینل سے دکھا دکھا کر اپنے عوام کے ذہن میں راسخ کر دیتے ہیں دراصل مغربی میڈیا کا 95 % حصہ یہودی اور خاص کر صیہونیوں کے قبضے میں ہے یوں مغرب مسلمانوں سے کئی گناہ زیادہ بنیاد پرست ہے جبکہ یہی وہ الزام ہے جسے لے کر وہ افغانستان کے راستے دراصل پاکستان پر حملہ آور ہے۔کہنے کو تو امریکی فوج افغانستان میں ہے لیکن اس کے اعلیٰ فوجی حکام اتنے ہی پاکستان میں بھی پائے جاتے ہیں جتنے وہاں اور یہاں وہ صرف مطالبات لے کر آتے ہیں لہذا حکومت سے درخواست ہے کہ کم از کم اس آمدورفت اور میل ملاقات کو محدود کر دیا جائے۔ اس کے جتنے جاسوس حکومت اور آئی ایس آئی کے علم میں ہیں ان کو واپس بھیج دیا جائے اور جو حکومت کے علم میں نہیں ہیں ان کا سراغ لگایا جائے۔ اس وقت پاکستان کو کچھ کڑوے گھونٹ پینے ہونگے کیونکہ پاکستان کی سالمیت اور اس کا وجود امریکی خواہشات سے زیادہ اہم ہے۔ یہ سوچنا کہ امریکہ ہمارے ساتھ ہماری خدمات کے صلے میں رعایت کر رہا ہے نری حماقت ہے امریکہ صرف ایک وجہ سے پیچھے ہے اور وہ ہے پاکستان کی ایٹمی قوت ابھی تک صرف ایٹمی جنگ کے خدشے نے اسے محدود رکھا ہے رکا ہوا امریکہ اب بھی نہیں ہے۔ روزانہ ڈرون حملے امریکی جارحیت ہی ہے جو ائیر چیف کے بیان کہ ہم ڈرون گرا سکتے ہیں حکومت حکم دے کے باوجود جاری ہیں۔ اس وقت یہ سمجھنا کہ ہم حالت جنگ

میں نہیں ہیں یا صرف طالبان ہمارے خلاف برسرپیکار ہیں بالکل غلط ہے سچ یہ ہے کہ ہم کئی محاذوں پر برسرپیکار ہیں اور ہر محاذ کا سرا امریکہ سے ملتا ہے بھارت اسرائیل اور نیٹو تو امریکی کارندے ہیں ہی اور پاکستان کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کے ہی دست راست ہیں لیکن دوسری طرف اُس کے جاسوس اور دہشت گرد بھی ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں یہ سوچنا کہ غیر ملکی این جی اوز کی نیندیں ہماری وجہ سے اڑی ہوئی ہیں اور وہ ہماری خدمت کے لیے ہی اس دنیا میں جی رہے ہیں ایک اور دھوکہ ہے انہی این جی اوز میں خدمتگاروں کے روپ میں ہمارے یہ دشمن ہمارے گھر میں بیٹھے اپنی حکومت کے لئے خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ہم اُن کے ممنون ہو رہے ہیں یہی لوگ بڑی آسانی سے ہمارے لوگوں کو خریدتے ہیں اور انہیں ہمارے خلاف ہی استعمال کر لیتے ہیں اور اِن لوگوں کی غربت امریکہ کے لیے ایسا کرنے میں آسانی مہیا کر دیتی ہے امریکہ کسی ایک محاذ پر ہم سے برسرپیکار نہیں آج کل کی تازہ جنگ جو چھیڑی گئی ہے وہ پاک فوج کے خلاف ہے اب جب آئی ایس آئی نے اپنے ہی پانچ شہریوں کو اسامہ کے بارے میں امریکہ کے لیے مخبری کرنے کے الزام میں گرفتار کیا ہے تو امریکہ کو اعتراض ہے امریکہ سے یہ پوچھا جائے کہ اپنا شہری جاسوس تو وہ چھڑا لے گئے اب ہمارے معاملے میں مداخلت کا حق اُسے کس نے دیا ہے ابھی تو صرف اس کے کچھ جاسوس گرفتار ہوئے ہیں کچھ اس کے اور کچھ ہمارے اپنے شہری، ابھی تو دیکھنا یہ ہے کہ اسکے مزید کتنے جاسوس پکڑے جاتے ہیں امریکہ حالات کو مسلسل خراب

کر رہا ہے اور اس نہج پر لانے کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ وہ پاکستان پر حملہ کرنے کا جواز ڈھونڈ سکے۔ ظاہر ہے کہ طاقت میں ہم امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ اُس نے ہر زہر اپنے پاس جمع کر رکھا ہے تاکہ وہ اسے دنیا کے کسی بھی ملک میں بسنے والے انسانوں کو دے کر اُن کی زمین پر قبضہ کر سکے۔ ایسے میں پاکستان کے پاس صرف ایک چارہ رہ جاتا ہے کہ وہ امریکہ پر واضح کر دے کہ اگر اس کے اوپر جنگ مسلط کی گئی تو پھر ایٹمی جنگ کو روکنا اس کے لیے ناممکن ہو جائے گا کیونکہ صرف یہی ایک قوت ہے جس نے ابھی تک ہمیں دشمن کی کاری ضرب سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے میزائل امریکہ تک مار نہیں کر سکتے لیکن یہ جنگ شاید پھر دو ملکوں تک محدود نہ رہے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت پاکستان کو سیاسی جوڑ توڑ سے فرصت پا کر اپنی سفارتی جنگ پر بھی توجہ دینی چاہیے خاص کر اسلامی ملکوں کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ پاکستان کی سلامتی مسلم امہ کی طاقت کی سلامتی ہے جتنا مضبوط کردار پاکستان نے عرب اسرائیل تنازعے میں ہمیشہ ادا کیا ہے ہم بھی اُتنی ہی توقع رکھتے ہیں۔ چین کے ساتھ اپنے رابطوں کو مزید مضبوط کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بیرونی اقدامات کے ساتھ ساتھ اپنے اہم لوگوں کے رابطوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے اور آئی ایس آئی اور فوج کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنانے والوں سے یہ ضرور پوچھنا چاہیے کہ اپنے اداروں کے خلاف یہ جنگ لڑتے ہوئے بھارتی سفارت خانے میں حاضری چہ معنی دارد کیا وہاں فیڈ ہونے کے

لیے جایا جاتا ہے یا فیڈ بیک دینے کے لیے۔
ہمیں ایک چو مکھی لڑائی لڑنی ہے اور زور و شور سے لڑنی ہے کیونکہ یہ ہماری بقا کی جنگ ہے اور بقا اور فنا کی اس جنگ میں اپنے ذاتی مفاد کو نہ صرف پیچھے رکھ کر بلکہ دور پھینک کر ہمیں پھر سے ایک قوم بننا ہے کیونکہ یہی آخری چارہ کار ہے جو ہمیں کامیابی اور بقا کی طرف لے جا سکتی ہے ہم نے عراق ، افغانستان اور پاکستان کا فرق خود بھی سمجھنا ہے اور امریکہ کو بھی سمجھانا ہے۔غزوہ تبوک کی طرح بغیر لڑے یا بدر کی طرح لڑ کر اپنے قوت ایمانی اور غرور ملی کو ثابت کرنے کا اس سے بڑا موقع دوسرا نہیں ہوگا۔

یہ لوگ تو اوراک چمن بھی نہیں رکھتے

سیاست اور اہل سیاست کسی بھی ملک و قوم کی قسمت کے مالک ہوتے ہیں ملک کی ترقی اگر اہل ہنر کے ہاتھ میں ہے تو یہ ہنر مند، ان کا ہنر اور اس کے استعمال کی تمام تر منصوبہ بندی یہی اہل سیاست کرتے ہیں اور بڑی خوش قسمت ہوتی ہیں وہ قومیں جس میں ذمہ دار، با وقار اور فرض شناس سیاستدان موجود ہوں جو سیاست کو ذریعہ خدمت سمجھتے ہوں نہ کہ حصول حکومت کا ذریعہ۔ پاکستان بنا تو انہی سیاستدانوں کی محنت تھی، جنہوں نے بڑے سلیقے سے یہ جنگ لڑی اور جیتی اور وجہ اس کامیابی کی یہ تھی کہ ایک بے غرض اور ایماندار قائد ان کی رہنمائی کر رہا تھا جسے حکومت کا لالچ تھا نہ اختیارات اور شہرت کی ہوس۔ لیکن افسوس ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور انکی وفات کے بعد بہت جلد ملک سیاسی بھیڑ چال کا شکار ہوگیا۔ حکومت پر حکومتیں بدلتی رہیں اور انہی حالات نے ملک میں پہلے مارشل لا کا جواز فراہم کیا اور یوں سیاسی حکومت کا عمل خود اہل سیاست کی نااہلی کے سبب رک گیا اور پھر مارشل لا کی حمایت میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا۔ ملک ٹوٹا لیکن اقتدار پر کوئی سمجھوتہ نہ ہوا اس بہت بڑے قومی نقصان کے بعد آئین بنایا گیا، جمہوریت کچھ ہی سال چلی ، الیکشن ہوئے ، ایک بار پھر اقتدار کی ہوس ، حکومت جانا نہ چاہیے حزب اختلاف خود حکومت کرنے کی آرزو

مند، روز روز ہنگامے ، توڑ پھوڑ، گولیاں اور ایک بار پھر جمہوریت کا باب بند کر دیا گیا تھا۔ مارشل لا لگا اور اب جو سیاستدان ایک دوسرے کو مارشل لا کا ساتھ دینے کا طعنہ دیتے نظر آتے ہیں سب نے اس مارشل لا کی حمایت کی اور کئی ایک نے تو اپنی سیاست شروع ہی ادھر سے کی اور آج یہی لوگ کچھ تلخ قسم کے ذاتی تجربات کے بعد اٹھتے بیٹھتے فوج کو مطعون کرتے رہتے ہیں۔ایسا ہر گز نہیں ہے کہ فوج میں ناپسندیدہ عناصر نہیں ہونگے، یقیناً ہونگے کیونکہ کسی بھی انسان کی طرح یہاں بھی انسان ہیں اگر چہ یہ سخت ترین ٹریننگ سے گزر کر اپنی ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کرنا کافی حد تک سیکھ جاتے ہیں تاہم وقت ان میں سے بھی کچھ پر اپنا اثر چھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنی تربیت کا حق اس طرح ادا نہیں کرپاتے۔ لیکن یہ لوگ اتنی کم تعداد میں ہوتے ہیں کہ بہر حال یہ اپنے ادارے اور اس کے بارے میں عام تاثر پر اثر انداز نہیں ہوتے اور کسی ایک جاہ و حکومت پسند جنرل کے فعل کی وجہ سے پورے ادارے کو بدنام کرنا کسی طرح بھی قر ین انصاف نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں بہتری اور خوبی کی کوئی گنجائش نہیں ضرور ہے لیکن جگہ ہنسائی کروا کر نہیں۔ ہم اپنے اداروں کو مضبوط کرنے کی بجائے ان کو کمزور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے سیاست دانوں نے نہ وقت سے سبق سیکھا اور نہ تاریخ سے۔ وہ صرف اپنی سیاست کو چمکانے میں لگے ہوئے ہیں ایک دوسرے پر حملے ایک دوسرے کے ادوار حکومت پر تنقید،جب جس کا مفاد عدالت سے وابستہ ہو

عدالت ، عدالتی نظام اور منصف عظیم ہو جاتے ہیں اور جب فوج کے تحفظ کی ضرورت ہو تو اس کی حمایت کر دیتے ہیں، جب کہ دوسرا فریق ان کی شدید مخالفت میں مصروف ہو جاتا ہے بغیر کسی دور اندیشی کے اور بغیر کسی معاملہ فہمی کے ۔ یہی کچھ آج کل کیا جا رہا ہے۔ ایک عجیب رسہ کشی ہے جو سیاستدانوں میں چل رہی ہے اور اُس میں با عزت اداروں اور لوگوں کی پگڑیاں اچھالی جا رہی ہیں ۔ وہ توانائی، وہ سوچ ، اور فہم جو ملکی ترقی میں استعمال ہونی چاہئے الزام تراشی اور تباہی کے اسباب پیدا کرنے میں صرف ہو رہی ہے، جو مہارت دشمن کے خلاف استعمال ہونی چاہیے وہ تمام چالیں ایک دوسرے پر آزمائی جا رہی ہیں۔ اسی سیاسی لڑائی کا خمیازہ ہم ایک بار مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں بھگت چکے ہیں ،نہ اکثرت کے فیصلے کو حکومت پر قربان کیا جاتا اور نہ ملک ٹوٹتا۔ ملک آج بھی کچھ اچھے حالات میں نہیں ہے دہشت گردی نے ہمارے معاشرے کو جہاں ایک طرف مادی نقصان پہنچایا ہے دوسری طرف اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ ترقی کا عمل عملاًرکھا ہوا ہے اس پہیے کو چلانے کی فکر کسی کو نہیں۔ ہاں اپنے اپنے بیرونی ملک کاروبار کو زیادہ اور اندرون ملک کو کچھ کچھ ترقی دینے کی فکر ضرور ہے اور پھر اندرونی و بیرونی کاروباروں سے حاصل شدہ آمدنی کو سوئس بینکوں کا کاروبار چمکانے کے لیے وہاں رکھ دیا جاتا ہے جو پاکستانیوں کے یہ اٹھارہ ہزار ارب روپے یعنی 450 ارب ڈالر کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں اور اس سرمائے کے زیادہ تر مالکان پاکستانی سیاستدان ہیں۔ اگر وہ

ملک پر یہی احسان کرلیں کہ اپنا یہ سرمایہ ہی یہاں لے آئیں تو ہمارے بینک اور زرمبادلہ کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ وہ خود ہی اس رقم سے کاروبار کریں لیکن سرمایہ پاکستان میں رکھیں بس یہی انکی مہربانی ہوگی لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ کیا ان کو خود بھی اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں اگر ایسا ہی ہے تو عوام کیسے ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔

یہی کھیل کھیلتے کھیلتے ہمیں چونسٹھ سال گزر گئے ہیں۔ اس کھیل میں ہم نے بہت کچھ کھویا ہے اور جو کچھ پا لیتے ہیں اُسے بھی بڑی آسانی سے کھو دیتے ہیں۔ چاہے قومی وقار ہو، تجارت ہو، ترقی ہو، سائنس اور ٹیکنالوجی ہو حالانکہ دنیا بھر میں کام کرنے والے پاکستانی ہنرمند، سائنسدان، ڈاکٹر اور انجنیئر بہترین مانے جاتے ہیں مگر پاکستان میں یہ سارا ٹیلنٹ بھی سیاسی جھگڑوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ ہر سیاسی پارٹی برسراقتدار آکر اپنے ووٹرز اور حامیوں کو نوکریوں اور بڑے بڑے عہدوں سے نواز دیتی ہے اور اگلی پارٹی حکومت میں آکر انہیں فارغ کر دیتی ہے ان میں ان عہدوں اور نوکریوں کے اصل حقدار دونوں بار بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اعلیٰ عہدے تو ایک طرف چپڑاسی، نائب قاصد اور ایل ڈی سی جیسی نوکریوں کے لیے بھی پارٹی رہنماؤں کے رقعے ساتھ ہوتے ہیں اور صاحبان حکومت سے ٹھکرلے کر تبادلہ کروالینا کسی کسی کے ہی بس کی بات ہوتی ہے لہٰذا نوکریاں ادھر ہی تقسیم ہو جاتی ہیں۔

ان ساری باتوں اور کوتاہیوں کو یہاں بیان کرنے کا مقصد محض تنقید نہیں بلکہ ارباب اختیار اور ارباب سیاست کو یہ یاد دلانا ہے کہ اپنی غلطیوں سے سیکھ کر اگلا قدم اٹھانا آپ کی پچھلی غلطی کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اس وقت آپ کے پاس غلطی کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ حالات کی نزاکت کا احساس کیجئے ایک دوسرے پر الزامات کو ہی سیاست مت سمجھ لیجئے غلطیوں کی نشاندہی کریں اور ترقی میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے اپنی پارٹی بلکہ اپنے ذاتی دور حکومت کا انتظار مت کیجئے اور مخالفت میں اس حد تک مت جائیے کہ آپ کی تنقید ذاتی دشمنی بن جائے۔ اس مٹی کا حق ہماری طرح آپ پر بھی ہے اس کی ترقی میں آپ کا حصہ عوام سے کہیں زیادہ ہونا چاہیے۔ عوام تو حکومتی اور دیگر ارکان اسمبلی کے خرچ کے لیے اپنے حصے کے دو وقت کے کھانے میں سے ٹیکس پر ٹیکس دے کر نڈھال ہے۔ ہر محنت کش ہر روز اپنی کمائی اس امید پر گنتا ہے کہ شاید آج وہ کھانے پینے سے کچھ پس انداز کر کے کل اپنے بچوں کے لیے نئے جوتے اور کپڑے لے آئے گا لیکن وہ نہیں جانتا کہ وہ ہر چیز کی اصل قیمت کے ساتھ ساتھ ایک ٹھیک ٹھاک رقم بطور ٹیکس دے دیتا ہے اور وہ جنہیں کروڑوں میں ٹیکس دینا چاہیے وہ اپنے جائیداد صرف لاکھوں میں ظاہر کرتے ہیں کسی غریب کروڑ پتی ممبر اسمبلی کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہے تو کوئی پانچ لاکھ کا قرض دار ہے جبکہ ان کی ایک ایک لباس اور ایک ایک پرس اور بیگ کی قیمت لاکھوں میں ہے انہی لاکھوں کو اس

نیت سے ایک چھوٹے سے کاروبار میں لگا دیجئے کہ آپ کی اپنی ہی جائیداد میں اضافہ ہو یوں کچھ لوگوں کی ملازمت تو لگ جائے گی۔ لیکن اتنا سوچنے کا وقت کس کے پاس ہے۔ جب ملک ہاتھوں سے جائے اور ملت کی آنکھیں کھل جائیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہمارے عزت ،دولت، شہرت بلکہ حکومت بھی اس ملک سے ہے تو کچھ تو اس کی بھی فکر کیجئے۔ تنقید بلکہ خود ملک مخالف پروپیگنڈے سے باز آیئے۔ فکر آشیاں بجا لیکن فکر چمن بھی کیجئے اور ماضی قریب کے وہ سارے کردار ذہن میں رکھیئے کہ جب وطن سے نکالے گئے تو زندگی رہی نہ عزت اور نہ جاہ و حشمت۔ شاہ ایران اور مارکوس ایران اور فلپائن سے نکلے تو پھر کچھ بھی نہ تھے۔ لوگ منتظر ہے کہ کوئی جناح نہ سہی کہ قائداعظم بن سکے اب ملک ویسے بھی بن چکا ہے بس اب کوئی سنبھال کر رکھنے والا مخلص رہنما ہی میسر آجائے تو مٹی کا حق ادا ہو جائے گا۔ عوام کی زندگی آسان ہو جائے گی اور اقوام عالم میں پاکستان اور پاکستانی پھر سے باعزت مقام پر فائز ہو سکیں گے۔ اللہ ہماری حفاظت اور حمایت کرے۔

رکوڈک ۔۔۔ چہ ارزاں فروختند

بلوچستان اس وقت بہت ساری سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے بظاہر پاکستان کے بلحاظ رقبہ اس سب سے بڑے صوبے کا ایک بڑا حصہ بہت بڑے بڑے دشتوں اور صحراؤں پر مشتمل ہے۔ زیر زمین اور بالائے زمین پانی کی کمی بڑے شہروں اور بڑی بستیاں آباد نہ ہونے کی سب سے بڑے وجہ ہے ۔جہاں تھوڑا بہت پانی میسر آیا وہاں چھوٹی سی آبادی آباد ہو گئی ۔ ہاں جہاں پانی موجود ہے وہاں سر سبز باغات بھی نظر آتے ہیں یوں قدرت اپنے پودے تنوع کے ساتھ یہاں نظر آتی ہے۔ بلوچستان کے لق و دق اور بے آب وگیاہ صحرا اپنے سینے میں جو دولت سمیٹے ہوئے ہیں اُسی نے اس کو سازشوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے ۔بڑی طاقتیں دنیا کی تمام دولت پر نظریں گاڑھے پنجے گاڑھنے کی منتظر ہیں۔ ایک طرف تیل اور توانائی کے ذخائر کو اپنے مذموم عزائم پورے کرنے کے لیے ہتھیانے کی فکر اور کوشش ہے تو دوسری طرف سونے اور دیگر قیمتی معدنیات کو قبضے میں لے کر باقی دنیا کو کنگلا کرنے کی خواہش ،تاکہ ساری دنیا اُن کی محتاج ہو کر غلام بن جائے ۔ اس کوشش میں تمام بڑی طاقتیں بشمول بھارت اور اسرائیل مصروف ہے اور یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں ان کی دلچسپی مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ سینڈک کے بعد رکوڈک میں قیمتی معدنی ذخائر نے ان کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہیں ۔ رکوڈک ضلع چاغی میں ایران

افغان سرحد کے قریب سونے اور کاپر کے عظیم الشان ذخائر ہیں اور باور کیا جاتا ہے کہ یہ ذخائر ایران کے سرچشمہ اور چلی کے ایسکنڈیڈا (Escondida) کے ذخائر سے بڑے ہیں۔ یہاں ایک محتاط اندازے کے مطابق 12.3 ملین ٹن کاپر یا تانبا اور 20.9 ملین اونس سونے کے ذخائر موجود ہیں۔

قیمتی معدنیات کے یہ ذخائر نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے پاکستان کی قسمت بدل سکتے ہیں لیکن پاکستان کی واحد بد قسمتی یہاں کے خود غرض حکمران ہیں اور اس بار بھی یہی ہوا کہ رکوڈک کو بیچ دیا گیا اور بہت سستا بیچا گیا اور بدنام زمانہ بیرک گولڈ کو بھی اس میں حصہ دار بنایا گیا،اور حیرت ہے کہ اس سودے پر حکومت نے تو جو کیا وہ کیا ہماری سیکیورٹی ایجنسیوں ،آئی ایس آئی اور فوج بھی خاموش رہی حالانکہ کم از کم یہودی کمپنی کے ملک میں داخلے پر ان اداروں کو نوٹس تو لینا چاہیے تھا لیکن ایسا کیوں نہیں کیا گیا یہ سوال بھی جواب طلب ہے۔ یہ کمپنی دنیا میں مائننگ کے میدان میں سب سے ناکام ترین کمپنیوں میں سمجھی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ہی ہے کیونکہ یہ صیہونی کمپنی اپنے دیگر بہت سارے مقاصد لے کر کسی ملک میں داخل ہوتی ہے صرف مائننگ پر اس کی توجہ نہیں ہوتی پاکستان کے بارے میں یہودیوں اور صیہونیوں کے جو خیالات ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن پرویز مشرف اور شوکت عزیز نے اس یہودی کمپنی کے چیف ایگزیکٹو آفیسر گریگ والکنز کے بقول اس کا 2007 میں

اسلام آباد میں پر جوش استقبال کیا۔ جس کے مطابق اُس کی کمپنی القائدہ کے خطرے کے باوجود پاکستان میں مزید پراجیکٹس لینے کی خواہش مند ہے۔ ظاہر ہے اُنہیں اپنے کارندے پاکستان میں داخل کرنے ہیں اور اس زمین کی رگوں میں موجود قیمتی خون بھی چوسنا ہے اور کمپنی کے سنئیر نائب صدر وائنس بورگ نے تسلی ظاہر کی کہ ان کا عملہ اسلام آباد میں محفوظ ہے یعنی انہیں مکمل سیکیورٹی اور گارنٹی دی گئی جو نہ اُس وقت کسی پاکستانی کو تھی اور نہ اب ہے۔ یوں صرف ذاتی مفاد اور خواہش میں اس کمپنی کو ملک میں آنے دیا گیا جس کی آڑ میں موساد جیسی ایجنسی کے جاسوس ملک میں آ سکتے ہیں۔ جس کی ہٹ لسٹ میں پاکستان اہم ترین نشانوں میں سے ایک ہے لیکن ملکی مفاد کو بیچنا پاکستانی حکمرانوں کے لیے کبھی مشکل نہ رہا۔

دوسرا حملہ جو ملکی مفاد پر کیا گیا وہ یہ کہ بلوچستان حکومت کو صرف 25% حصہ دیا گیا جو اسے 25% رقم خرچ کرنے کے بعد ہی ملے گا یعنی اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ اُسکی زمین خزانے کی مالک ہے۔ ٹیتھیان کاپر کمپنی اس معاملے میں کسی شراکت کی قائل نظر نہیں آتی ۔یہی وجہ ہے کہ اُس نے یہ منصوبہ بنا رکھا ہے کہ بجائے پاکستان میں یہ معدنیات نکالنے کے خام حالت میں اس مواد کو باہر لے جایا جائے گا اور وہاں اس سے تانبا اور سونا نکالا جائے گا اور اس کے لیے گوادر کی بندرگاہ استعمال کرنے کی بجائے ایک چھوٹی بندرگاہ تعمیر

کی جائے گی جو گوادر سے تیس کلومیٹر کراچی کی طرف ہو گی۔ اس کے لیے کمپنی نے بلوچستان لبریشن آرمی سے ایک اچھی خاصی رقم کے بدلے یہ تحفظ مانگا ہے کہ وہ کمپنی کی ٹرانسپورٹ اور سپلائی لائن پر حملہ نہیں کرے گی۔ ان تمام اقدامات سے منصوبے کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے جو بندرگاہ تعمیر کی جائے گی وہ حکومت پاکستان کی مدد کے بغیر ہو گی لہذا اُس میں حکومت کی مداخلت نہ ہونے کے برابر ہو گی اور برصغیر ایسی اجازت کا خمیازہ ایک بار بھگت چکا ہے اور وہ ہماری ہی تاریخ کا حصہ ہے لہذا انتہائی احتیاط انتہائی ضروری ہے اس منصوبے کی جو قیمت لگائی گئی ہے وہ پچیس بلین امریکی ڈالر ہے جبکہ اس کی اصل قیمت جو اس سے حاصل کئے جانے والے مواد کی ہو گی اس کا اندازہ 125 بلین امریکی ڈالرز کا ہے حکومت کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے اور دونوں بیرونی کمپنیوں یعنی کینڈا کی بیرک گولڈ اور چلی کی اینٹا فوگسٹا سے معاہدے کی شرائط پر انتہائی باریک بینی سے نظر ثانی کرنی چاہیے اور منصوبے کی اصل قدر و قیمت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی قیمت لگانی چاہئے اور ان کمپنیز کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ مقامی سطح پر خام مال سے معدنیات حاصل کریں تاکہ یہ مہارت مقامی لوگوں کو منتقل کی جاسکے اور مستقبل میں کم از کم چھوٹے منصوبوں پر ہی سہی مقامی ماہرین کام کر سکیں۔

رکوڈک، سینڈک، تھر کول، چمالانگ اور ایسی بے شمار دولت قدرت نے پاکستان کو عطا کی ہے جو اس ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے لیکن اس کے لیے حکمرانوں اور دیگر کرتا دھرتا لوگوں کا خلوص چاہیے۔ حکومتی فیصلے خود اہل حکومت کے لیے نہ ہوں بلکہ ملک اور عوام کے بہترین مفاد میں ہوں۔ بیرونی اداروں اور کمپنیز کے ساتھ معاہدوں پر کسی کو اعتراض نہیں کیونکہ کسی بھی ملک میں ہر مہارت کا موجود ہونا مشکل ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہر گز نہیں کہ ناکام اور بدنام کمپنیز کو ٹھیکے دیئے جائیں اور اس بات کا تو خاص خیال رکھنا چاہئے کہ کون آپ کے ملک کو نقصان پہنچانے کی نیت لے کر آپ کے ہاں آتا ہے۔ یہودی از روئے قرآن ، از روئے تاریخ،از روئے حال،اور از روئے عمل ہر طرح سے ہمارے دشمن ہیں ان کا مقصد دنیا میں اپنی حکومت اور دوسرے کی محکومی ہے۔ اگر گزشتہ حکومت نے انہیں پاکستان میں کام کرنے کی اجازت دی بھی تو کیا موجودہ حکومت اُس اجازت پر نظر ثانی نہیں کر سکتی۔ منصوبے کی اہمیت اور قیمت کا اندازہ لگانا بھی بہت ضروری ہے اور مقامی ماہرین سے بھی استفادہ ضروری ہے کیونکہ ان کا حق پہلا ہے۔ ہم جب بعد میں اپنے ہی ملک میں موجود خام مال کی مصنوعات انتہائی مہنگے داموں بے تحاشا ٹیکسوں کے ساتھ برآمد کرتے ہیں تو پہلے ہی کیوں اپنے خام مال سے فائدہ نہیں اٹھا لیا جاتا۔ معاملہ صرف ذات کے خول سے نکل کر ملکی مفاد کو عزیز تر سمجھنے کا ہے اور پاکستانی قوم کسی ایسے ہی رہنما اور مسیحا کے انتظار میں ہے جو اس کے قبلے

کو درست کرے اور اسکے درد لا دوا کا علاج کرے۔

امریکی سفارت خانے میں ایک مکروہ تقریب

پاکستان حالت جنگ میں ہے یہ جنگ خود ہمارے حکمرانوں کی منتخب کردہ ہے جو اسے بڑے زور و شور سے اپنی جنگ قرار دیتے رہے اور آخر کار اسے اپنا لیا۔ یہ جنگ ہم گزشتہ ایک دہائی سے لڑ رہے ہیں اور مسلسل جانوں کی قربانیاں دی جارہی ہیں شہری آبادی بھی اور فوجی بھی سب جنگ کی نذر ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ تو صرف ایک محاذ ہے۔ دشمن طاقتیں کئی محاذوں پر برسرپیکار ہیں اُس نے پاکستان میں مذہبی منافرت پھیلانے کی بھرپور کوشش کی اگرچہ وقتی طور پر کامیاب بھی ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ مذہبی خانہ جنگی نہ چھیڑ سکا۔ کرپشن کو اُس نے یوں پھیلایا کہ ہمارا ہر راشی جرم کرکے مغربی ممالک میں پناہ لے لیتا ہے۔اِن طاقتوں نے امریکی چھتری تلے دہشت گردوں کی ہر قسم کی مدد جاری رکھی ہوئی ہے۔اِن ساری جنگوں کے ساتھ ساتھ اقتصادی جنگ بھی زور وشور سے لڑی گئی اور اقتصادی پابندیوں کے ذریعے بھی پاکستان پر دباﺅ ڈالا گیا۔ آئی ایم ایف کے جال میں پاکستان کو جکڑا گیا اور یوں حکومت اس کی خواہشات کے عین مطابق ٹیکسز اور مہنگائی سے عوام کی کمر توڑنے میں مصروف اور مجبور ہے۔ ان تمام حملوں کے ساتھ ساتھ ثقافتی حملہ بھی ایک زور دار حملہ ہے جو سلسل جاری ہے اور ہم سب جانے انجانے میں خود ان کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔
لیکن اب جو ایک حملہ پاکستان

پر کیا گیا ہے وہ امریکی سفارت خانے میں منعقدہ ایک مکروہ تقریب تھی جس میں امردیا ہم جنس پسندوں کو مدعو کیا گیا اور اُن کو یقین دلایا گیا کہ واشنگٹن پاکستان میں ان کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔ عمل قوم لوط جس پر حضرت لوط (ع) کی قوم کو شدید عذاب کے ذریعے تباہ کیا گیا کی نہ صرف اسلام اور آسمانی مذاہب بلکہ دیگر مذاہب بھی اسکی شدید مذمت کرتے ہیں اور مہذب معاشروں میں یہ ہمیشہ ایک قابل نفرت فعل اور قابل سزا جرم رہا ہے اور اسلام تو ہر بے حیائی کو سختی سے ممنوع قرار دیتا ہے۔ وہ جنسِ مخالف سے بھی نکاح کے رشتے کے بغیر کسی بھی ایسے تعلق کو ناجائز اور قابل سزا سمجھتا ہے اور بعینیہ یہی حکم تورات نے دیا جس کو اسلام نے منسوخ نہیں کیا، بلکہ رجم کا ذکر قرآن میں نہیں ہے لیکن چونکہ تورات کے اس حکم کی تنسیخ بھی نہیں ہے لہذا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قائم رکھا اور عمل لواطت تو قابل سزا سے بھی آگے بڑھ کر قابل عذاب ہے۔ مغرب کو تو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا ہی ہے لیکن امریکہ نے اب اس خطرناک ہتھیار کو استعمال کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے اور اس مکروہ فعل کو پاکستان میں کھلے عام کیا ہے اور اس گناہ میں مبتلا لوگوں کو مدد کی یقین دہانی کر وائی ہے۔ اس پر اگرچہ دفتر خارجہ نے امریکی سفارت خانے کو تنبیہہ اور احتجاج ریکارڈ کروایا ہے لیکن اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ امریکہ یا کوئی دوسرا بے راہرو ملک چاہے اپنے سفارت خانے یا اپنے عملے کے کسی فرد کے گھر میں بھی ہو ایسی

جسارت نہیں کرے گا اور اس تقریب کے کسی مقامی شریک کو اگر ہو؟ سزا ضرور دینی چاہیے۔ ایسا نہیں ہے کہ پاکستان میں اس مکروہ فعل کے مرتکب افراد نہیں ہونگے لیکن یوں سرعام انہیں ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا ہماری زمین پر ہمارے مذہب اور ہماری روایات دونوں کی توہین ہے۔ 26 جون کو امریکی سفارت خانے نے (GLIFAA) جوان قبیح لوگوں کی تنظیم ہے اور امور خارجہ میں موجود ان لوگوں کے لیے کام کرتی ہے نے اس تقریب کا اہتمام بلا وجہ نہیں کیا بلکہ اِس کا مقصد ہمارے معاشرے پر ایک ایسا وار ہے جو ہماری تباہی پر مہر ہو۔

امریکہ نے اپنے مذموم عزائم اور دجالی شکنجے میں ہر طرح سے ہمارے معاشرے کو جکڑنے کی کوشش جاری رکھی ہوئی۔ جیسا کہ مضمون کے شروع میں ذکر کیا گیا اُس نے ہم پر ہر حربہ آزمایا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب تک ہم اپنی بقا کی جنگ میں کامیاب رہے ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ حق کو غالب کرکے رہے گا لیکن اس غلبے کے لیے وہ یقیناً انسان کی ہمت کو آزماتا ہے۔ اُس نے حق کی فتح کے لیے ہی گھوڑے تیار اور صفیں درست رکھنے کا حکم دیا ہے اور اس فتح کے وعدے کے باوجود احتیاط اور تدبیر کو ضروری قرار دیا ہے۔ ورنہ احد کے میدان میں حاصل شدہ فتح کو دڑے پر متعین تیر اندازوں کی بے تدبیری سے آزمائش میں نہ بدلتا اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑے پر باوجود کثرت تعداد کے حنین کے میدان میں مسلمانوں کو عارضی سہی ہزیمت سے نہ آزماتا۔ اس لیے یہ سوچنا کہ یہ ایک

محدود فعل تھا جو کیا گیا اور پاکستانی احتجاج کے بعد دوبارہ ایسا نہیں ہوگا ایک غلط فہمی ہے امریکہ ہر طریقہ ،ہر چال ہم پر آزمارہا ہے اس کا مقصد ہمیں ہر طرح سے تباہ کرنا ہے اپنا رہا ہے، جہاں ہر دوسرا حربہ پہلے سے زیادہ Strategies اور اسی لیے وہ مختلف خطرناک ہے اور اس حالیہ حربے کو کم از کم میں ذاتی طور پر گزشتہ تمام حملوں سے زیادہ خطرناک قرار دیتی ہوں کہ اس فعل نے تاریخ میں بہت سی عظیم الشان سلطنتوں کے حلیئے بگاڑے ہیں۔ حضرت لوط (ع) کی قوم تو صرف ایک مثال ہے۔ حکومت پاکستان اگرچہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر چکی ہے لیکن اب امریکی سفارت خانے پر مزید کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے پر جس زور و شور سے ثقافتی حملہ جاری ہے اُس نے اسکے خدوخال کو پہلے بھی کچھ زیادہ محفوظ نہیں چھوڑا ہے۔

ہمارے کیبل آپریٹرز پیمرا کی اجازت سے ہر فحش انگریزی اور بھارتی چینل دکھارہا ہے اور ہمارا ناخواندہ ، کم تعلیمیافتہ اور ماڈرن کہلانے والا، غرض ہر طبقہ بڑی حد تک اسکے اثرات قبول کر رہا ہے۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کریں اور صرف ملکی اور قومی مفاد میں کریں۔ اگر ہم دیدہ دل واکر لیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہم مسلسل قدرتی (سیلاب ،زلزلے، طوفان وغیرہ) اور انسانی (دہشت گردی، مذہبی منافرت، اقتصادی بدحالی) عذابوں سے گزر رہے ہیں۔ اب ہمارے پاس نہ تو کسی کوتاہی کی گنجائش ہے اور نہ کوئی اور عذاب سہنے کی ہمت ،اس لیے سخت سے سخت ترین رد عمل پابندی اور حکمت

عملی کی ضرورت ہے اور اس رجحان اور اس کے پھیلانے کی کوشش کرنے والے ہر دو کے ساتھ سختی سے نمٹنا ہوگا یہی ہمارے رب کا حکم بھی ہے اور ہماری بقا کی ضمانت بھی۔

کراچی کا امن مستحکم پاکستان کی ضمانت

کراچی پاکستان کی تجارت کا مرکز ہے اور تجارت و کاروبار ملک اور قوم کی زندگی کے لیے اہم ترین ہے کیونکہ کاروبار زندگی کے لیے بھی پیسہ چاہیے اور ضروریات و سہولیات کے لیے بھی۔ کراچی پاکستان کی واحد بندرگاہ اور بیرونی دُنیا سے بھاری تجارت کا واحد ذریعہ اور راستہ ہے غرض کراچی ہماری بقا اور ترقی کا ضامن ہے پھر کیوں اور کون اُسے موت کا شہر بنا رہا ہے۔ آج کراچی جل رہا ہے مسلسل لاشیں گر رہی ہیں گھر سے انتہائی ضرورت سے نکلا ہوا اِنسان بھی گھر واپسی کا یقین نہیں رکھتا۔ مقتولین کی کوئی خاص اور ایک قسم نہیں بس میں بیٹھا ہوا بھی مر رہا ہے اور بڑی بڑی گاڑیوں کے سوار بھی۔ نہ پٹھان کی جان محفوظ ہے نہ اُردو بولنے والوں کی نہ بلوچی، سندھی یا پنجابی کی لیکن ہر ایک دوسرے سے شاکی ہے اور ٹارگٹ کلنگ کا الزام لگا رہا ہے۔ مطالبہ سب کا ایک ہے اور وہ ہے اَمن۔ نعرہ بھی سب کا ایک ہے کہ کراچی کا اَمن پورے پاکستان کا اَمن ہے۔ اِس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ کراچی چھوٹا پاکستان ہے۔ پاکستان کی ہر زبان بولنے والا اور ہر نسل کا پاکستانی یہاں موجود ہے اور یہ تعداد چند سو یا ہزار نہیں ہوتی ہے بلکہ لاکھوں میں ہے اس لیے کراچی منی پاکستان کہلاتا ہے اور اسی لیے کسی ایک پاکستانی قومیت کا کراچی پر حق جتانا انتہائی

کم عقلی کی بات ہے اور کوئی پارٹی کوئی قومیت بظاہر اس کا دعویٰ کرتی نظر بھی نہیں آتی پھر کون ہے جو کراچی میں یہ سب کروا رہا ہے جسے کراچی کے ہر رہنے والے سے دُشمنی ہے اگر چہ ہمارے وزیر داخلہ کے مطابق ہمارے ہاں ہونے والی بہت ساری دہشت گردیوں میں بیرونی ہاتھ ملوث نہیں ہوتا لیکن حیرت تب ہوئی ہے جب بات بندوق اور پستول سے نکل کر راکٹ لانچرز، گرینیڈز اور مارٹروں تک پہنچ جاتی ہے کیا ہمارا ہر شہری اَسلحہ ساز ہے اگر یہ سارا اَسلحہ شہروں کے اندر ہی بن رہا ہے تو وہ کن فیکٹریوں میں بن رہا ہے اور وہ کہاں ہیں اور اگر نہیں تو پھر کہاں سے آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہیں سے تو آ رہا ہے بلکہ جس طرح وزیرستان، سوات اور بلوچستان میں بیرونی ہاتھ کار فرما ہے وہی ہاتھ یہاں بھی تو حرکت میں نہیں ہے۔ سوال یہ بھی ہے اَب تک کتنے ٹارگٹ کلرِ پکڑے جا چکے ہیں اور کیا یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ مارنے والے سیاسی پارٹیوں کے کارکن ہیں اگر ایسا بھی ہے تو بھی معافی کی کوئی گنجائش نہیں رکھنی چاہیے بلکہ معاملے کی جڑ تک پہنچنا چاہیے کہ کون اور کیوں ایسا کر رہا ہے۔ یہاں نہ حکومتی اتحاد بچانے کی فکر کرنی چاہیے اور نہ مزید دو سال حکومت کرنے کی سوچ رکھنی چاہیے۔

کراچی جیسے شہر میں جہاں نہ صرف ملک کے ہر حصے کے لوگ موجود ہیں بلکہ بڑی تعداد میں غیر ملکی بھی بستے ہیں کسی بھی ملک، رنگ اور نسل کے دہشت گرد

داخل کرنا کوئی مشکل کام نہیں جبکہ ان کا کھوج لگانا بہت مشکل ہے لیکن مشکل کام ظاہر ہے حکومت کو ہی کرنے ہیں۔اسے کھوج بھی لگانا ہے اور سزا کا اہتمام بھی سر عام کرنا ہے۔ دہشت گرد چاہے ملکی ہو یا غیر ملکی ان کے ساتھ کوئی رعایت برتنا قومی جرُم ہے اور یہ جرُم کرنے والے سخت ترین سزا کے مستحق۔ کراچی کے معاملات کو حل کرتے ہوئے یہ نکتہ ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ کسی بھی ملک کی انتظامیہ کو مفلوج کرنے کے لیے اُسکی معاشی حالت کو بدحال کرنا ہوتا ہے اور یہی سب کچھ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ کراچی کے حالات ایک دن خراب رہیں تو کروڑوں روپے کا نقصان ہوتا ہے سٹاک ایکسچینج میں بھی اور بندرگاہ کی سرگرمیاں بھی بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کوئی کمپنی نہ تو اپنے سامان اور مصنوعات کی تباہی اور ضیاع چاہتی ہے اور نہ ہی اپنے ملازمین کی لہذا وہ ہر نقل و حرکت منسوخ کر دیتی ہے اور یوں دشمن کے منصوبے بہت آسانی سے پایہ تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ دشمن کوئی ایک نہیں بلکہ کئی ہیں اور کراچی جیسے بین الاقوامی شہر میں یہ کاروائیاں مشکل بھی نہیں ہر رنگ و نسل کا شخص پہلے ہی سے یہاں موجود ہے۔ اپنے لوگوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ بیرونی ہاتھ کو ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہیے آخر یہی شہر جو عروس البلاد کہلاتا تھا کیوں دہائیوں سے بدامنی کا شہر بن بنتا رہتا ہے۔بڑے شہروں میں اکا دکا واقعات کو تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن قتل عام کو نہیں۔ کراچی میں اس وقت قتل عام کی سی کیفیت ہے ہر روز بیسیوں لوگ مر رہے ہیں۔ ہر

گروپ کے پاس اسلحہ موجود ہے حکومت کی رٹ نظر نہیں آرہی وقتی طور پر تو حالات کو رینجرز کے ذریعے کنٹرول کرنے کی ضرورت کو سمجھا جاسکتا ہے لیکن بار بار حالات بگڑنے کی وجوہات کی تلاش ضروری ہے پھر بغیر کسی مصلحت کے اِن عناصر سے نمٹنا بھی ضروری ہے۔اِس وقت دہشت گردی کی جنگ نے ہماری ترقی کے عمل کو ویسے ہی روک رکھا ہے۔ صنعتیں توانائی کے بحران کے باعث بند پڑی ہیں۔ایسے میں اگر ہماری تجارت بھی بند ہو جائے ہماری بندرگاہوں کا استعمال بھی ختم ہو جائے تو معاملات آج سے بھی زیادہ گھمبیر ہو سکتے ہیں اور دُشمن اپنے مقاصد میں بڑے آرام سے کامیاب ہو سکتاہے اور اس کی کامیابی خدا نخواستہ ہماری ابدی شکست ہے۔ کراچی میں مختلف پارٹیوں میں عدم برداشت اور کراچی کی ملکیت کے احساس کو بھی ختم کرنا ہے۔ کراچی سب کا شہر ہے اور یہ احساس ذہنوں میں ڈالنے والی طاقتوں کو تلاش بھی کرنا ہے تاکہ مسائل کو مستقل بنیادوں پر حل کیا جائے۔کچھ مخصوص ملکوں کے لوگوں پر کڑی نظر بھی رکھنی ہے۔ ہمیں کراچی کو ہر صورت اُن حالات سے نکالنا ہے جس کا سامنا اکثر اہل کراچی کو کرنا پڑتاہے اور اُس کے اثرات پورے پاکستان پر، ہماری معیشت پر، ہماری تجارت پر اور اقتصادی حالت پر پڑتے ہیں۔ ہمیں خود غرضی کے طور طریقے اور سیاست ختم کرکے صرف ملک کے مفاد کے بارے میں سوچنا ہے کیونکہ ملک میں اَمن اور امان ہوگا تو خوشحالی خود بخود ہمارا مقدر بن جائے گی۔

تھینک یو امریکہ ۔۔۔ لیکن

امریکہ نے پاکستان کی آٹھ سو ملین ڈالر کی امداد روک دی بقول امریکہ اُس نے فوجی امداد روکی ہے اُس جنگ کے لیے فوجی امداد جو امریکہ نے پاکستان پر مسلط کی ۔ امریکہ یہ جنگ دہشتگردی کے خلاف نہیں "اور" مقاصد کے لیے لڑ رہا ہے اور ان مقاصد میں توانائی کے ذخائر پر قبضے سے لے کر پوری دنیا پر اپنی حکمرانی قائم کرنا شامل ہیں۔ اسلام کے خلاف قوت کا استعمال تو اس کا روحانی مقصد ہے اس لیے کسی بھی اسلامی ملک کا قوت پکڑنا اُس کے لیے نا قابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اُس نے عراق پر حملہ کیا، اسی لیے وہ ایران کے خلاف ہے، اسی لیے اُس نے طالبان کی حکومت تہس نہس کی اور اسی لیے وہ ایٹمی پاکستان کے خلاف ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ پاکستانی قوم نے ایبٹ آباد آپریشن پر آنکھیں بند نہ کیں بلکہ اس کے ذمہ داروں اور امریکہ پر برس پڑی تو اسکی پاکستان دوستی پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ جب فوج نے اُس کی ہر مرضی ماننے سے انکار کر دیا تو اُس نے ہماری امداد بند کر دی ایک رپورٹ کے مطابق ہماری فوج ڈیڑھ سال سے کوئی امداد وصول بھی نہیں کر رہی لیکن قوم خوش ہے کہ اس طرح سے شاید ہم خود کفالت کی طرف کوئی قدم ہی اٹھا لیں، لیکن اُسے یہ گلہ بھی ہے کہ خود پاکستان نے یہ امداد لینے سے انکار کیوں نہ کیا۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری

کلنٹن اپنے گزشتہ دورے پر جب پاکستان آئی تو اُس نے کہا تھا کہ اگر آپ کو ہماری امداد منظور نہیں تو اسے لینے سے انکار کر دیں۔ کاش کہ ایسا کر لیا گیا ہوتا۔ قوم کو اس بات کا احساس ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں انکار و اقرار آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بہت سوچنا پڑتا ہے لیکن جب آپ دس سال تک مسلسل اقرار کے باوجود مسلسل خسارے میں رہیں تو آزمائش کے طور پر ہی اپنا لائحہ عمل تبدیل کر کے دیکھ لیں اور اب جب کہ خود امریکہ نے ہماری امداد سے ہاتھ کھینچ لینے کا اعلان کیا ہے تو ہمیں بھی اُس کی ہر قسم کی مدد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ طالبان اور دہشت گرد دونوں امریکہ کی مدد کی پاداش میں ہی ہم سے نبرد آزما ہیں جبکہ امریکہ کے شہری امن و امان کی فضا میں رہ کر زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں اور امریکی حکومت دنیا پر اپنی گرفت مسلسل بڑھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اگرچہ اب افغانستان میں خود اُس کی حرکات اُس کی ناکامی کی چغلی کھا رہی ہیں لیکن اُس نے عالم اسلام کو بالعموم اور پاکستان کو بالخصوص مصیبت میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ یوں تو ہمارے پینتیس ہزار فوجیوں اور شہریوں کا خون بہا بھی امریکہ کے سر واجب الادا ہے اور ہماری تباہ حال معیشت کی بحالی بھی اور ہمارے فوجی وسائل کا ضیاع بھی اور اب تک جتنے اخراجات پاکستان کر چکا ہے ہمارے جتنے وسائل کو وہ استعمال کر چکا ہے ان کی وصولی بھی ہمارا حق ہے کیونکہ بدقسمتی سے ہی سہی ہمارے وسائل جو اُس نے استعمال کئے اس کا معاوضہ کسی بھی قانون کے تحت وہ روکنے کا مجاز نہیں

ہے اور نہ ہی پاکستان کو اپنے اس حق سے دست بردار ہونا چاہیے۔ لیکن اب اگر امریکہ نے ہمیں اپنی بدنیتی میں ہی سہی یہ موقع فراہم کیا ہی ہے تو ہمیں اس موقعے کا فائدہ اٹھا لینا چاہیے اور اس جنگ کو روک لینا چاہیے ہاں اگر پھر بھی یہ دہشت گردی جاری رہے تو پھر ہمیں بھی ان دہشتگردوں کے خلاف پوری قوت سے آپریشن کر لینا چاہیے۔ جہاں تک امریکی امداد کا تعلق ہے اور اس بات کا کہ ہمیں زندہ رہنے کے لیے اس امداد کی ضرورت ہے تو یہ حربہ ہم پر پہلے بھی کئی بار آزمایا جا چکا ہے۔ پر تعیش زندگی کو ترجیح دینے والا حکمران طبقہ اگر یہ فیصلہ کر لے کہ قوم کے ساتھ انہی کی طرح زندہ رہنا ہے تو مسئلہ ہی حل ہو جائے گا۔ عوام تو اب بھی کچھ آسان حالات میں نہیں رہ رہے اگر وہ اب بھی بجلی اور جدید دور کی کئی سہولیات کے بغیر زندہ ہیں تو امداد بند ہونے سے کوئی بہت بڑا فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے اپنے مفادات کے لیے عوام کا سہارا لینے کی بجائے جرات انکار پیدا کرنے سے حکمران خود پر لگنے والے تمام الزامات کو دھو سکتے ہیں۔ اسوقت اگر امریکہ نے فوجی امداد روکی ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم بہت شکریے کے ساتھ دوسری امداد لینے سے بھی انکار کر دیں اور چین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے اپنی عظیم الشان افرادی قوت کے ہاتھ سے موبائل فون لے کر انہیں تیشہ پکڑا دیں تو جس طرح ایک زندہ قوم اپنی حمیت اور غیرت کی بھوکا رہ کر بھی حفاظت کرتی اسی طرح یہ قوم بھی کر لے گی۔ زمین کے ایک ایک انچ کو حتی المقدور خوراک اگانے کے لیے استعمال کریں،

معدنیات کے قیمتی خزانوں کو ذاتی دولت نہیں بلکہ ملکی تعمیر و ترقی میں استعمال کریں،
حکمران سادہ زندگی اپنائیں اور سامان تعیش کا استعمال ختم کردیں تو پھر دیکھیں کہ کیسے ہم
امریکہ بلکہ کسی کی بھی بھیک بہ نام امداد رد کرکے بھی ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہیں
اور یہ سوچ بھی ذہن سے نکال دیں کہ ایسا ممکن نہیں جب ایک قوم بطور قوم کچھ کر
گزرنے کا فیصلہ کرلے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ ہمارے حکمران امریکہ کا شکریہ ادا کرتے
ہوئے اس ''گُر'' کو صرف ایک دفعہ آزما کر دیکھ لیں۔

افواج پاکستان اور میڈیا

فوج کسی بھی ملک و قوم کی حفاظت کی ضامن ہوتی ہے اور پاکستانی فوج نے یہ فرض ہمیشہ بحسن و خوبی ادا کیا۔ میں جنگوں میں ان کی خدمات کا کوئی تذکرہ نہیں کرنے جا رہی کیونکہ ان کا اعتراف قومی و بین الاقوامی ہر سطح پر کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے پاک فوج کے کردار پر جو تنقید کی جا رہی ہے اُس میں کسی قومی مفاد کو پیش نظر نہیں رکھا جا رہا۔ انفرادی واقعات کو میڈیا پر اس طرح تسلسل سے پیش کیا گیا کہ جیسے کسی دشمن فوج کے خلاف کوئی پروپیگنڈا مہم چلائی جا رہی ہو۔ ان واقعات پر ہر پاکستانی کو دکھ ہوا ہر ماں کو سرفراز شاہ کے بے گناہ قتل کا دکھ تھا لیکن اُس کو میڈیا پر جس طرح عوام کے جذبات کو فوج کے خلاف بھڑکانے کے لیے استعمال کیا گیا اُس میں تعصب کی بُو ہر ایک نے محسوس کی یہی کچھ خروٹ آباد کے واقعے میں کیا گیا۔ وہاں بھی بے بسی کی موت مرتے انسانوں کو دیکھنا کچھ آسان نہ تھا لیکن میڈیا کے ہر گروپ نے دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں اُسے بے شمار بار دکھایا اور بلکہ کچھ چینلز حسب معمول اس خبر کو بریک کرنے کا اعزاز اپنے سر لیتے رہے لیکن جب عدالت میں اُن کا دہشت گرد تنظیم سے تعلق ثابت ہو گیا تو اُس کو صرف بطور خبر دیا گیا۔

اب اسی میڈیا نے اُس خبر کو بریک کرنے میں کوئی سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کی جو بیرونی چینلز نے دکھائی جس میں افغان دہشت گردوں نے جو خود کو طالبان ظاہر کر رہے تھے نے ایک درجن پاکستانی سیکیورٹی اہلکاروں کو اغوا کرکے انہیں ایک نا معلوم مقام پر ایک قطار میں کھڑا کرکے گولیاں مار کر شہید کیا اور ان تڑپتی ہوئی لاشوں پر گولیاں برساتے رہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ پہلا واقعہ ہے ایسے کئی واقعات سامنے آتے رہے لیکن میڈیا میں کبھی کبھار ہی ان کی کوئی جھلک نظر آئی ۔ میں اسے بالکل بھی مناسب نہیں سمجھتی کہ فوج کے متعلق ایسے واقعات کو زیادہ دکھایا جائے لیکن دوسری طرف فوج کے خلاف تعصب پیدا کرنے کے غیر ملکی یا چلئے تجارتی ہی سہی ایجنڈے پر کام کرنا بھی قرین انصاف نہیں بلکہ حب الوطنی کے تقاضوں کے شدید منافی ہے۔ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہوں اور مجھے کبھی یہ کہنے میں تامل نہیں ہوا کہ میں اسلام کے بارے میں کافی سخت ہوں لیکن سختی کا مطلب یہ نہیں کہ ہر دوسرے شخص کے ایمان پر شک کیا جائے۔ ہمارے اکثر تو نہیں مگر کچھ دانشور، اینکرز اور کچھ کالم نویس صرف اپنی تشہیر کے لیے جذباتیت سے بھرے کالم لکھنے اور پورے ملک کے اسلام پر شک کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے اور مسلسل خود کو طالبان کہلانے والے ان دہشت گردوں کے دفاع میں مصروف رہتے ہیں اور نہ صرف دفاع بلکہ ان کی حمایت کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام میں کلیتہ حرام فعل خودکشی کے لیے بھی جواز تلاش کر

لیتے ہیں وہ خود بھی جانتے ہیں کہ اللہ نے انسانی جان کو کس قدر مقدس بنایا ہے اور ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ فساد فی الارض کو کتنا بُرا سمجھا ہے لیکن وہ سڑکوں، مسجدوں، ہسپتالوں اور جنازوں میں خود کش حملوں میں مرنے والوں کا قتل جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ اُس حکومت میں رہ رہے ہیں جس کے یہ دانشور اور یہ میڈیا خلاف ہے۔ اختلاف رائے کو اختلاف رائے رہنے دیں دشمنی مت بنا دیں اور فوج جیسے ادارے تو پاکستان کی بقا کے ضامن ہیں لیکن دکھ تو اسی بات کا ہے کہ ملکی بقا کو پس پُشت ڈال کر صرف اپنی شہرت اور زیادہ معاوضے کے لیے ہر مہینے میڈیا گروپ بدلنے والے اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ ملک ہے تو ان کی دانشوری ہے ورنہ اُن کی دانش اُس پایے کی ہرگز نہیں ہے کہ ملک کے بغیر پہچانے جائیں فی الحال تو یہ خوش ہیں کہ وہ عوام الناس میں فوج کے خلاف زہر پھیلا رہے ہیں لیکن مستقبل کی سختی ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ٹسٹ میں انجینئرنگ کے انٹری ٹِسٹ کے لیے بیٹے کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا جہاں ایک خاتون مسلسل فوج کے خلاف ہرزہ سرائی میں مصروف تھیں وہ دوسرے تمام اداروں کو جو حقوق بخوشی دینے پر راضی تھیں اور تمام سہولیات کے لیے انہیں مجاز سمجھ رہی تھیں مثلاً پی آئی اے اور ریلوے کے فری ٹکٹ، یونیورسٹی اہلکاروں کے بچوں کے لیے مخصوص کوٹہ لیکن ایک فوجی ادارے میں داخلے کے لیے اپنے بچے کو ٹِسٹ دلانے کے باوجود یہ فوج اُسے دنیا کا بُرا ترین ادارہ نظر آ رہا

تھا۔ جبکہ دوسری خواتین کسی کسی معاملے میں ان کا ساتھ دینے کے باوجود انہیں ٹوکتی رہیں۔ بات ایک خاتون کی رائے کا نہیں بلکہ اُس رویئے کا ہے جو پروان چڑھایا جارہا ہے اور بجائے اس کے کہ ہمارا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں ان رویوں کو ختم کرنے کے لیے فوج کی قربانیاں دکھائیں وہ مسلسل اُسے ظالم بناکر پیش کررہے ہیں بجائے اس کے کہ سوات، وزیرستان بلکہ پورے ملک میں اسکی قربانیوں اور دہشت گردوں کے مظالم کی داستان بیان کرے وہ طالبان اور دہشت گردوں کے پاک فوج کے خلاف بلکہ بسا اوقات ہر پاکستانی کے خلاف ان کے اقدامات کے لیے توجیہات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ میڈیا سے میری یہی درخواست ہے کہ خدارا ہوش کے ناخن لیجئے اسلام کی روح کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اور اس بات کا ادراک کیجئے کہ اسی فوج کی ہمت ہے کہ آپ ابھی تک دشمن سے محفوظ ہیں اور ایک درجن بیٹوں کی ماؤں کو بھی اپنے جوان بیٹوں کی موت کا اتنا ہی دکھ ہوگا جتنا کسی بھی دوسری ماں کو اس نے بھی اُس کو اس لیے جوان نہیں کیا تھا کہ وہ کسی ایسے نامعلوم مقام پر مارا جائے کہ نہ اُس کا جنازہ اٹھے نہ مزار بنے اور اُسے مرتے ہوئے دیکھ کر بھی ہمارے کیمرے اپنی آنکھیں بند کرلیں کہ مبادا کوئی ان کی قربانی کو خراج تحسین نہ پیش کرسکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت اور تاریخ یقینا اِن مجاہدوں کی قربانیوں سے اپنے صفحات کی تابناکی میں اضافہ کریں گے اور ظالم، مظلوم، حرام اور حلال موت کا فرق بھی واضح کردیں گے۔

امریکہ کا ٹارگٹ ایشیا کا امن

بقول امریکہ عالمی امن کو دہشت گردوں سے خطرہ ہے اور دہشت گرد کے معنی امریکہ مسلمان لیتا ہے اگر اس کا بس چلتا تو آسمانی بجلی کی کڑک کو بھی مسلمانوں سے منسوب کر دیتا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ بذات خود دنیا کی بدامنی کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ 1980 کی دہائی میں دنیا کو کولڈ وار کے عذاب میں مبتلا کیے رکھنے والا امریکہ اب ایک اور سرد جنگ کا آغاز کرنے جا رہا ہے اور اب کے اُس نے اس کے لیے ایشیا کا انتخاب کیا ہے۔ اس کوشش کا آغاز امریکی وزیر خارجہ ہیلری نے اپنے دورہ بھارت کے دوران بھارت کو ایشیا کی قیادت سنبھالنے کی نصیحت اور پیشکش کرتے ہوئے کیا۔ ایسا کرتے ہوئے یقیناً امریکہ کے ذہن میں چین کو نیچا دکھانا تھا کیونکہ امریکہ اپنی گرتی ہوئی اور چین کی بڑھتی ہوئی معیشت کی حقیقت سے آگاہ بھی ہے اور خوفزدہ بھی۔ وہ جانتا ہے کہ عالمی منڈی میں سوئی سے لے کر الیکٹرانک اور اب تو آلات حرب تک پر چین چھاتا جا رہا ہے بلکہ چھا چکا ہے۔ بھارت Incredible India کا پُرفریب نعرہ لگانے کے باوجود ابھی اس کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچا تو پھر اُسکو چین کے مقابلے پر لانے کی کوئی تُک نہیں ہے لیکن امریکہ کو صاف نظر آ رہا ہے کہ چین اسکے مقابلے پر ایک مضبوط طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے اور نہ صرف خطے بلکہ بین الاقوامی سطح پر ایک اہم مقام حاصل کر رہا ہے۔ امریکہ ساری دنیا پر راج کرنے کے

منصوبے میں نہ تو انسان کو اہمیت دے رہا ہے اور نہ انسانی اقدار کو،اور یہی وجہ ہے کہ وہ بھارت کو اپنا قدرتی اتحادی قرار دیتا ہے اور وہ دونوں بڑی کامیابی سے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ بھارت بھی علاقے میں اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے ہر حربہ آزمارہاہے وہ افغانستان میں اپنی موجودگی میں مسلسل اضافہ کر رہاہے اور اسی راستے وہ پاکستان میں اپنی دخل اندازی بڑھاتا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر یہ دہشت گرد ممالک ہی عالمی امن کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں یہی امریکہ کبھی لیبیا میں حالات بگاڑتا ہے کبھی بحرین اور کبھی یمن میں ،دوسری طرف بھارت ،پاکستان اور چین کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دے کر انکے خلاف جنگ آزماہے۔پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں بھارت کامسلسل ملوث ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے۔

بلوچستان پاکستان کا معدنی خزانہ بھی ہے اور گوادر کی بہترین بندرگاہ کی دولت سے بھی مالامال ہے یہاں چین نے جس طرح کئی منصوبوں میں پاکستان کی مدد کی ہے وہ پاک چین دوستی کی عظیم مثال ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ صوبہ بھارت اور امریکہ کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اب ان تمام حالات کو مد نظر رکھیں اور پھر امریکی خواہش کو کہ بھارت ایشیا کی قیادت کرے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیوں بھارت اپنے ملک کے حالات بھلا کر ایشیا میں جگہ جگہ موجود ہے افغانستان میں بھارتی کردار ایک انتہائی بے تکی بات ہے لیکن وہ ایسا کر رہا ہے جبکہ خود وہ اپنے ملک میں علیحدگی کی درجن بھر

تحریکوں کا سامنا کر رہا ہے۔ کشمیر میں وہ سات آٹھ لاکھ فوج کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ مائو نواز نکسل باڑیوں سے بھی اُسے شدید مسائل درپیش ہیں نسلی امتیاز کو اگرچہ بھارت کا برہمن تو مسئلہ نہیں سمجھتا لیکن دلت اور شودر بھی انسان ہونے کے ناطے کبھی نہ کبھی تو آنکھ کھولیں اور ہاتھ اٹھائیں گے ہی۔ شدت پسندی کا اگر جائزہ لیا جائے تو بھارت میں یہ لوگ باقاعدہ سرگرم عمل ہیں اور انہیں اگرچہ حکومتی آشیرباد حاصل ہے لیکن کئی مذاہب پر مشتمل معاشرہ ہونے کی وجہ سے اسے عوامی مقبولیت کی سند کبھی بھی نہیں دی جاسکتی۔ بجرنگ دل، شیو سینا، بی جے پی یا آر ایس ایس ہندوئوں کے ایک طبقے میں تو قابل قبول ہو سکتے ہیں لیکن بھارت کے کروڑوں مسلمان انکے نشانے پر رہتے ہیں عیسائیوں کے گرجے جلانے سے یہ لوگ دلی راحت محسوس کرتے ہیں گوردوارے بھی انہیں گوارہ نہیں تو ظاہر ہے ان مذاہب کے ماننے والے کروڑوں بھارتی کیسے انہیں قبول کر سکتے ہیں۔ بھارتی معیشت کے گن گانے والے چھوٹے تو چھوٹے کولکتہ جیسے بڑے شہر میں بے گھر بلکہ بے سائباں کھلے آسمان تلے زندگی گزارنے والے بھارتیوں کی گنتی کر لیں تو اس عظیم الشان معیشت کا راز کھل جائے گا۔ شائد امریکہ فلموں میں نظر آنے والے بھارت کو دیکھتا ہے اور اُسے قیادت کا اہل سمجھتا ہے اور ہاں ایسا سمجھ لینا کہ امریکہ ایسا بھارت کی ہمدردی اور محبت میں کر رہا ہے ایک اور حماقت ہے اُسے دراصل ایک مہرہ چاہیے جسے وہ چین کے خلاف چل سکے اور ایٹمی پاکستان کے خلاف بھی نبرد آزما رکھ سکے یوں اس علاقے میں جنگ کی صورت حال پیدا کرکے یہاں کے عوام کو

بھوک اور ننگ کے خلاف لڑنے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف لڑاسکے اور یہاں کی غربت میں اتنا اضافہ کرے کہ یہ خطہ ہمیشہ امریکہ کا محتاج رہے دوسری طرف چین کو بھی مسائل میں الجھا کر اُسکی ترقی کی رفتار کو روک سکے اور اگر کھلی جنگ نہ بھی ہو تو بھی نفرت کی دیواریں اتنی اونچی رہیں کہ جن کے سائے میں اسلحے کے ڈھیر ضرور رکھے جاسکیں اور اسلحے کا سب سے بڑا تاجر امریکہ دنیا کو اسلحہ بیچ بیچ کر اپنے عوام کی خوشحالی کا بندوبست کرتا رہے اور کبھی امن قائم کرنے کے بہانے ان ممالک کو تباہ و برباد کرتا رہے۔

اس وقت ایشیا امریکہ کا ٹارگٹ ہے اور چین اور پاکستان تو اسکی ہٹ لسٹ پر سرفہرست ہیں کیونکہ اسکے عزائم کی راہ میں یہی سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ اس لیے اب امریکہ کے اس کھیل اور امریکہ بھارت گٹھ جوڑ سے نمٹنے کے لیے ایشائی کی دیگر اقوام کو مل جل کر اپنی بقا کی جنگ لڑنی ہوگی اور ان کے اتحاد کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرنی ہوگی ۔پاکستان اور چین کو اپنے بلاک میں مزید ممالک شامل کرنے کی تگ و دو بڑھانا ہوگی۔ حکومت پاکستان اور سیاستدانان پاکستان کو اس بات کا ادراک کرنا ہوگا کہ ہمیں اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہے امریکی خواہشات کا نہیں کیونکہ امریکہ اپنی خواہش کا اظہار کرچکا کہ وہ ایشیا کی قیادت بھارت کو دینا چاہتا ہے ہمیں نہیں پھر ہم کیوں اسکے اتحادی بن کر خود کو جنگ میں جھونکیں ۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنے قومی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے خود کو امریکہ سے الگ

کرلیں نہ دوستی نہ دشمنی۔

یہ بیرنگ بریوک نہیں پورا مغرب ہے

مغربی دنیا میں طویل عرصے کے بعد دہشت گردی کی واردات ہوئی ہے۔ناروے میں ایک بتیس سالہ شخص جس کا نام اینڈرسن بہرنگ بری وک ہے نے صدر کی رہائش گاہ کے قریب ہونے والے ایک اجتماع میں بے دریغ فائرنگ کرکے ترانوے (93) افراد کی جان لے لی۔یاد رہے کہ یہ شخص مسلمان نہیں کٹر عیسائی ہے اور یہی بات ہے جس کا اسے فائدہ دیا گیا۔ مختلف نیوز چینلز نے اُس کے اس فعل کے لیے مختلف توجہات تراشیں کسی نے اُسے گن مین، کسی نے حملہ آور کہا۔امریکہ نے اس کے فعل کو بدامنی کا ایک واقعہ قرار دیا۔یہ تو بھلا ہو اندرے بریوک کا جس نے خود ہی قبل از واقعہ اور بعد از واقعہ اقرار جرم کیا شاید وہ بھی جانتا تھا کہ اُسے کوئی بھی دہشت گرد قرار نہیں دے گا بلکہ اُس کے فعل کو دہشت گردی کے علاوہ کوئی بھی نام دے دیا جائے گا۔اُس نے واقعے سے قبل 1516 صفحات پر مشتمل جو اپنا منشور لکھا اُس نے صاف طور پر خود کو مسلمانوں کا شدید ترین مخالف اور کٹر عیسائی کہا۔اُسے یورپ میں اسلام پھیلنے کا غم اور دکھ ہے اور اگر سوچا اور دیکھا جائے تو درحقیقت یہ غم اور دکھ پورے مغرب کو ہے اور یہ خوف بھی کہ ایک دن اسلام کم از کم یورپ کا اکثریتی مذہب بن جائے گا اور یہی خوف امریکہ کو بھی لاحق ہے اور اسی خوف نے اہل مغرب کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ بظاہر خود

کو لبرل اور غیر متعصب کہنے والے یہ لوگ اندر سے انتہائی تنگ نظر اور متعصب ہیں اور عالم اسلام کے خلاف ہر وقت نبرد آزما ہیں۔ ناروے میں ہونے والے اس واقعے پر ان کا ردعمل انکے تعصب کی انتہا ہے۔ اگر یہی قتل کسی مسلمان کے ہاتھ سے سرزد ہوتا تو اسے ایکٹ اور 11/9 بنا کر مسلمانوں پر ہلہ بول دیا جاتا۔ حتیٰ کہ اگر دو چار لوگ بھی مارے جاتے تو اسے دہشت گردی کا بہت بڑا واقعہ قرار دیا جاتا اور اگر یہ کسی مسلمان ملک میں کسی اقلیت کے خلاف ہوتا تو پاکستان یا دوسرے مسلمان ملک کو اقلیتوں کے لیے خطرناک ترین ملک قرار دے دیا جاتا۔ یہ ہے اہل مغرب کا اصل چہرہ جسے دنیا کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ہر راسخ العقیدہ مسلمان انہیں دہشت گرد نظر آتا ہے جبکہ دراصل یہ دہشت گرد خود بناتے ہیں انہیں ہر قسم کی امداد مہیا کرتے ہیں ،ان سے ہر طرح کا کام لیتے ہیں مسلمان ملکوں کی غربت کو کیش کرتے ہیں، خود معیشت کی تباہی کے کنارے پر پہنچ کر بھی انتہائی غریب مسلمانوں کو دہشت گردی کرنے کے لیے رقم فراہم کرتے ہیں۔ انہیں خود اپنے ہی ممالک کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور یوں ان ممالک میں اپنی دخل اندازی کا انتہائی بے تکا جواز ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ یہی کچھ امریکہ اور یورپ پاکستان کے ساتھ کر رہا ہے۔ بات دراصل ایک شخص کی نہیں بلکہ صدر بش سے لیکر آندرے بریوک تک سب کے سب اہل مغرب نے اس جنگ کو مقدس مذہبی جنگ ہی سمجھ لیا اور پھر اس کا نشانہ ہر مسلمان کو بنا لیا۔ خود کو انتہائی مہذب ، روشن خیال اور فراخ دل کہنے

اور سمجھنے والے اِن لوگوں نے نہ صرف ہر مسلمان کو دہشت گرد سمجھ لیا بلکہ ان کے مقدس مقامات یہاں تک قرآن پاک تک کی (نعوذ باللہ) بے حرمتی کی اور ایسی وحشیانہ حرکتیں کیں کہ جس کی تاریخ میں مثال تک نہیں ملتی۔ امریکہ کے پادری ٹیری جونز کے بدترین گناہ کو ابھی تک مسلمان نہیں بھولے اور نہ ہی اس سیاہ ترین صفحے کو یہ لوگ تاریخ سے پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں لیکن اس کے مذموم فعل کے بعد کیا ہوا نہ تو وہ حکومت امریکہ کو انتہائی مطلوب شخص بنا اور نہ ہی مسلمانوں کے اس فتوے کو جائز قرار دیا گیا کہ یہ ملعون شخص قابل گردن زدنی ہے اگر ہوا تو یہ کہ اُسے انتہائی تحفظ فراہم کر دیا گیا۔ چونکہ اینڈرسن بیرنگ.بری وک نے ناروے کے عیسائی باشندوں کا قتل عام کیا ہے اس لیے اس کو سزا ملنے کے امکانات تو ہیں لیکن ڈیڑھ ہزار صفحات کا شیطانی منشور اور منصوبہ شائع کرنے پر بھی اُسے دہشت گرد نہیں کہا جا رہا کیونکہ یہ سارا زہر مسلمانوں کے خلاف اگلا گیا ہے اور شاید اسی منصوبے کا فائدہ اُسے دے کر ذہنی مریض یا کوئی اور بہانہ تراش کر سزا سے بچا لیا جائے۔ بالکل اُس طرح جس طرح ہر مسلم دشمن کو بچا لیا جاتا ہے اور اس کے فعل کو آزادی اظہار رائے کہہ دیا جاتا ہے جبکہ یہی اظہار رائے جب کوئی مسلمان کرتا ہے تو اُسے بنیاد پرست، دہشت گرد اور شدت پسند گردان کر اُس کے خلاف طوفان اٹھا دیا جاتا ہے اس کو علی الاعلان انتہائی مطلوب قرار دے دیا جاتا ہے۔ دراصل مغرب کے یہی دوہرے معیار ہیں جو اُس کے ذی شعور شہریوں کو اسلام کے متعلق

سوچنے، پڑھنے، جاننے اور پھر مان لینے اور قبول کر لینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اسلام یورپ ہی نہیں امریکہ کا بھی سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ تیزی 11/9 کے ڈرامے کے بعد آئی ہے جس نے پورے مغرب کو ہلا کر دکھ دیا ہے اور یہ صرف اس وجہ سے نہیں کہ مسلمان ممالک سے جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ خود یورپ اور امریکہ کے غیر مسلم باشندے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اب چاہے جتنے بھی ٹیری جونز، مولی نورس یا بیرنگٹ.ریوک اٹھ کھڑے ہیں وہ اس تبدیلی کو نہیں روک سکتے اِن میں سے ہر ایک کا طریقہ واردات دوسرے سے مختلف ہے لیکن ہر بار ہر مکروہ فعل کے بعد نقصان مجرم کو ہی ہو رہا ہے اور اسلام کے پھیلاؤ سے خائف یہ لوگ اس کو روکیں گے تو کیا ان کا ہر فعل اس میں تیزی پیدا کر رہا ہے اور خود ان کے غیر مسلم شہری اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس لیے مغربی ممالک کو اپنے نامہ اعمال پر نظر ڈالنی چاہیے جس نے نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان سے بد دل کر دیا ہے بلکہ ان کے شہری بھی ان سے بد دل ہو کر اُن کی مخالف سمت میں چلے جا رہے ہیں اور یہ سفر اب رکتا ہوا نظر نہیں آ رہا بلکہ مستقبل میں اس میں مزید تیزی آئے گی۔ لہٰذا اہل مغرب کو اپنے رویے پر غور کرنا ہوگا اور یہ بھی کہ اب اپنے جرائم کو چھپانے کے لیے مسلمان ممالک کی تباہی ان کے لیے مزید خطرناک ثابت ہوگی اور ہمیں بھی مغربی میڈیا کی آزادی اور اظہار رائے کی شخصی آزادی کے طلسم سے نکل کر ان کی برتری کے احساس کو

ختم کرنا ہوگا اور یہ یقین پیدا کرنا ہوگا کہ مسلمان ہونے کے ناطے ہم ہی حق پر ہیں تبھی وہ لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارا مذہب اختیار کر رہے ہیں ہمارے مدرسوں، ہمارے قرآن اور ہمارے مذہب کو دہشت گرد سمجھنے والے خود ان کی حقانیت کی دلیل بن رہے ہیں۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے کہ حق غالب ہو کر رہے گا۔

ہیومن رائٹس واچ اور بلوچستان

بلوچستان بلحاظ رقبہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ تو ہے ہی اسکی زمین سب سے زیادہ معدنی خزانے سموئے ہوئے ہے اور بلحاظ حساسیت بھی اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے۔ اس صوبے کے جغرافیائی حالات کچھ ایسے ہیں کہ کچھ مخصوص علاقوں کے علاوہ آبادی خال خال نظر آتی ہے اور لق و دق صحرا دور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ان علاقوں کو قدرت نے معدنیات سے تو بے تحاشا نوازا ہوا ہے لیکن زندگی کی بنیادی ضرورت پانی دور دور تک موجود نہیں ہاں جہاں پانی موجود ہے وہاں باغات زندگی کا بھرپور ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے شہر بھی ملک کے دیگر شہروں سے چھوٹے اور کم ترقی یافتہ ہیں، آبادی بکھری ہوئی ہے، سرداری نظام انتہائی مضبوط ہے، خواندگی کی شرح بوجوہ کم ہے اور زراعت انتہائی مشکل ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جو قدرت کی طرف سے اس صوبے میں پائے جاتے ہیں لیکن دوسری طرف اسی صوبے کو قدرت نے معدنیات کی دولت سے بھی بڑی فیاضی سے نوازا ہوا ہے۔ یہاں معدنی ذخائر کی اتنی بہتات ہے کہ بلا مبالغہ ان کی آمدنی سے نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے ملک کے دن پھر سکتے ہیں۔ کوئلے سے لیکر سونے، تانبے ، سنگ مرمر، اونیکس، کرومائیٹ اور بے شمار دوسری دولت اس زمین میں مدفون ہے۔ سینڈک، رکوڈک اور سوئی ،ان سب دشتوں میں خدا تعالیٰ نے بیش بہا خزانے ہمارے لیے سنبھال رکھے

ہیں لیکن ہو کیا رہا ہے؟ ہو یہ رہا ہے کہ بلوچستان بے شمار مسائل سے دوچار ہے اور یہ مسائل کسی ایک کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ اس جرم میں سب برابر کے شریک ہیں حکومت بلوچستان کے حالات سے کسی بھی عام شہری سے زیادہ باخبر ہے لیکن اسکے رویے میں سنجیدگی نظر نہیں آرہی۔ وہاں ٹارگٹ کلنگ جاری ہے اور اس کی ایک ہی آسان وجہ بیان کردی جاتی ہے "یہ سب ایجنسیاں کروارہی ہے" آخر کیوں کیا اس ملک کی ایجنسیاں اس ملک کی دشمن ہیں کہ حالات کو خراب سے خراب تر کردیں گی۔ صاف طور پر فرقہ واریت نظر آنے کے باوجود بھی اس حقیقت سے نظریں چرالی جاتی ہیں۔ اپنے عاقبت نااندیشوں کی انہی باتوں سے غیروں کو بھی ایسا کرنے کی شہہ مل جاتی ہے۔ ہیومن رائٹس واچ نے ایسی ہی ایک گمراہ کن رپورٹ شائع کی جس میں بلوچستان میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور لاپتہ ہونے والے ہر شخص کی گمشدگی میں انٹیلیجنس ایجنسیوں کو ملوث قرار دیا ہے۔کچھ اشخاص کے انٹرویوز ان کے فرضی ناموں سے شائع کئے گئے ہیں اور ان سب کو بلوچ قوم پرست اور علیحدگی پسند قرار دیا گیا ہے اور اسی وجہ کی بنیاد پر ان کی گمشدگی کو پاک فوج اور اس کے اداروں سے منسوب کردیا گیا ہے جبکہ عینی شاہدین کے تمام تر بیانات اندازوں پر مبنی ہیں اور اگر ان واقعات کو چیک کیا بھی جانا چاہے تو کیسے کہ نام سارے فرضی ہیں ۔اس رپورٹ کو بریڈ ایڈم نے مرتب کیا ہے جو یقیناً بلوچستان کے لوگوں کا کسی بھی طرح کسی عام سے

پاکستانی سے زیادہ خیر خواہ نہیں ہے۔ اسکو اپنی نوکری کرنی ہے اور ذریعہ آمدن و معاش کو جاری رکھنا ہے۔ لیکن ہم اِن غیر متعلقہ غیر ہمدرد لوگوں کی رائے کو اپنے اداروں پر ترجیح دینے کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔ بلوچستان ہر دوسرے صوبے کی طرح پاکستان کا قیمتی اثاثہ ہے صرف اس لئے نہیں کہ یہ اُس معدنی دولت سے مالا مال ہے جو ہمیں مال و دولت کے انبار دے سکتا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہمارے خدا نے ہمارے دل ایک دوسرے کے لیے نرم کر دیئے ہیں۔ اس لیے بھی کہ ہم نے مل کر اس ملک کو بنایا۔ اس میں کسی بریڈ ایڈم کی کوئی جدوجہد شامل نہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی لالچ نہیں بلکہ ہم ایک ہیں ہر طرح سے، جبکہ دوسری طرف ہم جانتے ہیں بلکہ خود ایسی رپورٹیں مرتب کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ بلوچستان کی دولت پر اُنکی نظر ہے انہیں اپنے بھوکے پیٹوں، تباہ ہوتی معیشتوں اور ظلم و جبر کی جنگیں جاری رکھنے کے لیے توانائی سے لے کر ہر قسم کی دولت چاہیے اور وہ بلوچستان میں حالات خراب کرکے یہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ گوادر کی بندرگاہ ان کے مقاصد کے حصول میں کتنی مددگار ثابت ہو سکتی ہے یہ بھی سب جانتے ہیں اس بندرگاہ کے ذریعے وہ نزدیک ترین راستے سے تیل کی سب سے بڑی گزرگاہ آبنائے ہرمز تک پہنچ سکتے ہیں، مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کا خواب پورا کر سکتے ہیں، وسطی ایشیا تک اور بحیرہ کیسپیئن کے توانائی کے ذخائر ان کی دسترس میں آ سکتے ہیں۔ انہی ذخائر پر بھارت کی بھی نظر ہے جس کو اپنی بے ہنگم بڑھتی

ہوئی آبادی کے لیے بے تحاشا توانائی کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اِن ملکوں کو اپنا شوق ملک گیری پورا کرنے کے لیے بھی، جنگوں کی آگ میں جھونکے کے لیے بھی توانائی کی ضرورت ہے۔ بھارت تو اپنی پاکستان دشمنی میں بھی بلوچستان میں ہر ایسی تحریک اور شرارت میں شامل ہے جو پاکستان مخالف ہو، وہ اپنے اس کردار سے انکار کرنا بھی چاہے تو قابل قبول نہیں کیونکہ مشرقی پاکستان میں اس کا کردار اور مداخلت سب کو یاد ہے اگر وہاں وہ مکتی باہنی کو پال سکتا تھا تو کیا یہاں بی ایل اے طرز کی تنظیموں کی پذیرائی نہ کرے گا اور کیا وہ کاروائیاں کرنے سے چوکے گا جسے اب ہیومن رائٹس واچ والے پاکستانی ایجنسیوں کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔ یہی ہومن رائٹس اُن ساری کاروائیوں سے کیوں آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو پاکستان دشمن ایجنسیاں پاکستان میں کرتی اور کرواتی ہیں اور جب کہ اُس کے ثبوت بھی موجود ہوتے ہیں۔ معاملہ دراصل یہ ہے کہ یہ امریکن فنڈڈ ادارے کسی بھی طرح پاک فوج کو اور خاص کر آئی ایس آئی کو ٹارگٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور یہی کچھ وہ اب کر رہے ہیں اور کیا ہیومن رائٹس والے مداخلت کار ملکوں کے خلاف بھی کوئی رپورٹ شائع کرتا ہے جو دوسرے ملک کی خلاف بلاوجہ اور یا انتہائی بے بنیاد وجوہات کی بنا پر کاروائیاں کرتے ہیں۔ کیا عراق میں کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کے بارے میں غلط رپورٹ پر عراق پر حملے پر امریکی حکومت کو مجرم گردانا گیا اور کیا بھارت سے پوچھا گیا کہ اُس نے علیحدگی پسندوں کو پھولوں کے ہار

کیوں نہ پہنائے۔ بہرحال یہ سب ایک سازش کے تحت کیا جارہا ہے اور وہ ہے پاکستان، آئی ایس آئی، پاک فوج اور پاک فوج سے متعلق اداروں کے خلاف منافرت پھیلانے کی کوشش کرنا کیونکہ یہی وہ طاقت ہے جس نے اب تک اس ملک کے خلاف ہونے والی کوششوں کو ناکام کیا ہے چاہے اسکے لیے انہیں کتنی ہی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ غیر تو ظاہر ہے اپنے مقاصد کے لیے اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور رہیں گے لیکن خود ہمیں اس بارے میں بہت محتاط ہونا ہوگا اور بغیر کسی ثبوت اور وجہ کے صرف اور صرف ایک آسان توجیہہ تلاش کرنے کی خاطر اپنے ملک کے نگہبانوں اور اس کی سالمیت کے ذمہ داروں کے خلاف اس قسم کے الزامات سے احتراز برتنا ہوگا اور ملک دشمن عناصر کی ہر صورت میں حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ بلوچستان واقعی ایک حساس معاملہ ہے لیکن ابھی خدانخواستہ حالات اُس نہج پر نہیں پہنچے کہ جہاں سے واپسی ناممکن ہو۔ بلوچ عوام اب بھی پاکستان سے پیار کرتے ہیں اور علیحدگی پسندوں کو اب بھی عوامی پذیرائی حاصل نہیں ہے اور عوام ہی بلاشبہ سب سے بڑی قوت ہوتے ہیں لیکن تعلیم کی کمی، وسائل تک مشکل رسائی، سہولیات کا فقدان اور سب سے بڑھ کر عوام تک درست نظریات کا نہ پہنچنا اور غلط نظریات کو زور و شور سے ان تک پہنچانا خدانخواستہ کسی بھی سانحے کا باعث بن سکتے ہیں۔ حکومت کو بلوچستان کے مسئلے کو انتہائی سنجیدگی سے لینا چاہیے اور مسائل کے حل پر بھرپور توجہ دینی چاہیے اور وہاں کے عوام کو اس حقیقت کا احساس بھی دلانا ہوگا کہ اس وقت ہم

بطور قوم مسائل سے دوچار ہیں مہنگائی، بیروزگاری اور غربت دوسرے صوبوں کا بھی مسئلہ ہے، وہاں کے عوام بھی مشکل حالات میں زندگی گزار رہے ہیں، وہ بھی دہشت گردی کا شکار ہیں اورِان سب مسائل سے ہمیں مل کر نمٹنا ہے اور منفی رجحانات پر بھی قابو پانا ہے اور منفی پروپیگنڈے کا بھی جواب دینا ہے۔ اس ملک میں موجود وسائل و مسائل ہم سب کے سانجھے ہیں۔

ٹارگٹ کلرز کون ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں ان کو تلاش کرنے اور ان کے مقاصد کو عوام کے سامنے لانے کے لیے حکومت کو ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی اور جب حقائق سے پردہ اٹھے گا تو پھر کسی کو ہمارے خلاف زہر اگلنے کا موقع نہیں ملے گا۔

چودہ اگست۔۔۔۔روشن چراغِ آرزو کردے

چودہ اگست 1947 قافلہ جانثاراں کو جب اپنی منزل ملی.بر صغیر کے مسلمان سرخرو ہوئے کیونکہ وہ باوجود کم مائیگی کے کم حوصلہ نہ تھے، باوجود قلّت تعداد کے کثرت تعداد کے آگے جھکے نہیں بلکہ انہیں اپنے سامنے جھکادیا۔تاریخ کے تابع نہ ہوئے بلکہ اسکا دھارا موڑ دیا۔ عزم و ہمت کی یہ کہانی تاریخ عالم کا ایک ایسا روشن باب ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی جب دنیا کا نقشہ حقیقی معنوں میں بدلا گیا اور ایک نظریے کے تعلق نے بر عظیم کے کونے کونے کے مسلمانوں کو یک جان کر دیا صرف ایک کلمے نے انہیں وہ طاقت دی کہ جس نے خود کو دنیا کے سامنے ایک نئی قوم کے طور پر متعارف کروایا لیکن کیا ایک قابل لیڈر شپ اور ایک باہمت رہنما کے بغیر ایسا ممکن تھا کہ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے مسلمان اس طرح ایک جھنڈے تلے جمع ہو جاتے اور بغیر یہ سوچ سمجھے کہ ان کا علاقہ ان کا گھر پاکستان کا حصہ بنے گا یا نہیں وہ ایک آواز ہو کر ایک نعرہ لگاتے ۔لے کے رہیں گے پاکستان ، بن کے رہے گا پاکستان ۔اور پھر انہوں نے کر دکھایا اور ایک نہیں دو طاقتوں کو اپنے سامنے جھکا دیا۔ پاکستان بن گیا اور منزل مل گئی اگرچہ ہزاروں دکھ بھری داستانوں نے جنم لیا خاک میں لتھڑی ہوئی خون میں نہلائی ہوئی ، لیکن وہ دکھ سہہ لئے گئے اس نوزائیدہ

مملکت کے ہر فرد نے آنے والے مہاجرین کی آباد کاری کو اپنی ذمہ داری سمجھ لیا اور دیگر چیلنجز کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا اور ہندو کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا کہ یہ ملک پنپ نہ سکے گا لیکن جب وہ کمزور ناتواں شخص اپنی توانا آواز میں ایک بار پکارتا تھا تو پوری قوم اپنے قائدِ اعظم کی آواز پر جان سے گزر جانے کو تیار ہو جاتی تھی کیونکہ اس پکار میں خلوص اور نیک نیتی تھی پھر رفتہ رفتہ ہم نے حکمرانی اور رہنمائی کا یہ خلوص کھو دیا۔ بجائے اس کے کہ قوم کی تربیت کی جاتی خود رہنما خلوص سے عاری ہوتے گئے۔ میں گئے زمانوں کا تجزیہ نہیں کروں گی کہ اُس سے ہم سب واقف ہیں اور ہر کوئی چاہے خود شامل گناہ ہے بظاہر بڑی دردمندی سے حالات کا تجزیہ کر رہا ہے۔ حکمرانوں کے پول کھول رہا ہے ان کی رشوت ستانیوں کا دکھڑا رو رہا ہے۔ میں اُن سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں اور مجھے بھی خوف ہے کہ اگر نااہل رہبری کے سبب رواں دواں نہ رہا کارواں تو کیا ہوگا۔ لیکن ایک ہی طبقے کو تمام خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہرانا بھی کیا قرین انصاف ہے؟ چودہ اگست کو یوم آزادی منانا ہمارا حق ہے لیکن زندہ قومیں خالی خولی تقریبات پر اکتفا نہیں کرتیں۔ عمل ان پہلا اصول ہوتا ہے۔ رہنما کے بغیر یقیناً کوئی بھی قوم قوم نہیں رہتی صرف ایک بھیڑ بن جاتی ہے ایک دوسرے کو دھکیلتا، مارتا دھاڑتا آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ایک ہجوم۔ جہاں ہر ایک کو اپنی ذات کا غم ہوتا ہے چاہے دوسرا جان سے جائے اور یہ عمل زیادہ تکلیف دہ تب ہوتا ہے جب ہر ایک

ان حالات کو بُرا بھلا کہہ رہا ہوتا ہے اور نظم و ضبط کی تلقین کر رہا ہوتا ہے لیکن خود اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس وقت پاکستان انہی حالات کا شکار ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم اس یوم آزادی پر یہی طے کرلیں کہ ہم نے خود سے ابتدا کرنی ہے اور جب ہر ''خود'' یہ کام کرلے گا تو مسائل خود بخود حل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ حکومتی کرپشن تو بہت بڑی ہے اس لیے سب کی نظروں میں آجاتی ہے لیکن پٹواری، کلرک، کانسٹیبل کی کرپشن پر کون تنقید کرے گا یہ تو مالی کرپشن ہے ہم تو فعلی کرپشنز کو بے ایمانی کے زمرے میں ہی نہیں لاتے لیکن ہمیں اب بطور قوم اپنا احتساب کرنا ہوگا۔ ہم نے استاد سے پوچھنا ہوگا کہ وہ سکول میں اُس طرح کیوں نہیں پڑھا دیتا جیسا کہ ٹیوشن اکیڈمی میں، ڈاکٹر ہسپتال میں مریض کو وہ توجہ کیوں نہیں دیتا جو کلینک میں۔ جج ایک مقدمے کو طول پر طول دے کر اور دوسرے کا فیصلہ ایک پیشی میں کرکے کیوں فیصلے کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ ایک انجنیئر کا بنایا ہوا پل کراچی جیسے پر ہجوم شہر میں کیوں ایک سال میں گر جاتا ہے۔ ایک صحافی اپنے کام سے غرض رکھنے کی بجائے دوسرے کو گھیرنے میں کیوں مصروف ہو جاتا ہے اور تو اور وہ دیہاڑی دار مزدور جسکی مظلومیت کی کہانی سنا کر ہر ایک خود کو انسان دوست ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے وہ کام کرنے کی بجائے وقت گزاری کیوں کرتا ہے۔ ایک دن مزدوری کرکے دو دن کی گزر اوقات کے پیسے کما کر اگلے دو دن مزدوری سے چھٹی کیوں کرتا ہے بہتر زندگی کے لیے کیا مسلسل محنت اسکا فرض

نہیں ۔ بندہ مزدور کے تلخ اوقات کا دکھ اپنی جگہ لیکن اصلاح کی کوشش اس سے زیادہ ضروری ہے ۔ اب ذرا کاروبار کی دنیا میں آیئے جہاں اصول تجارت صرف اور صرف منافع ہے چاہے یہ منافع جائز ہے یا نا جائز اس سے کسی کو سروکار نہیں ۔ یہاں بھی چھوٹے یا بڑے تاجر کی تخصیص نہیں ۔ چاہے صنعت کار ٹیکس یا بجلی چوری کرے یا ریڑھی بان دگنی قیمت پر اشیا فروخت کرے اور گلے سڑے پھل کو دھوکے سے آپ کے سودے میں ڈال دے۔ غرض ہر سطح پر ہر شخص ہر قسم کی کرپشن میں ملوث ہے اور موردِالزام دوسرے کو ٹھہرا رہا ہے ۔ مجھے کسی کی حب الوطنی پر شک نہیں لیکن ہم خود غرض ضرور ہیں اور ہم میں دردِ دل نہیں ۔ اگر یہ دو خصوصیات اس قوم میں پیدا ہو جائیں تو پھر اس کی بقا اور ترقی یقینی ہے اگر ہم میں ہر ایک اپنے دائرہ کار کو ہی اپنا پاکستان سمجھنے لگ جائے اور اس کی اصلاح کی کوشش شروع کر دے تو معاملات خود بخود بہتری کی طرف چل پڑیں گے۔ اہل سیاست و حکومت سے لیکر اہل ہنر و محنت تک بس اپنا اپنا محاذ اپنا اپنا پاکستان سمجھ کر سنبھال لیں تو اس قوم کی عظمت میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں اور اگر حکمران اپنا فرض پہچان لیں اور حکومت صرف برائے حکمرانی نہیں بلکہ برائے خدمت کریں جو ان کا اصل مقام ہے تو ہمارے مسائل خود بخود حل ہونا شروع ہو جائیں گے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ یہاں الزامات کی بوچھاڑ ہے جو ایک دوسرے پر کی جا رہی ہے ۔ آج بھی اگر یہ وطیرہ بدل دیا جائے تو کراچی میں خون خرابہ رک جائے گا ، بلوچستان میں ٹارگٹ کلنگ کا کچھ مداوا ہو سکے گا اور سرحد

اور پنجاب خود کش دھماکوں سے نہیں لرزیں گے۔ قوم اس مسیحا کے انتظار میں ہے جو اس بے اتفاقی کو اتفاق میں بدل دے جو خود اتنا با کردار ہو کہ جب وہ دوسروں کی غلطیوں کی نشاندہی کرے تو کوئی اُس کے کردار پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ ایسا نا ممکن بھی نہیں۔ دراصل اس وقت ضرورت خلوص کی ہے عوامی سطح پر بھی اور حکومتی سطح پر بھی اُسی خلوص اور عمل کی جو یہ قوم سیلاب، زلزلوں، طوفان اور جنگوں کے وقت دکھاتی ہے اور ان آفات سے ایسے نمٹ لیتی ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے یہی قوم ہے جس نے پوری دنیا کی مخالفت اور پابندیوں کے باوجود ایٹم بم بنایا اور اب پوری دنیا کے سامنے تن کر کھڑی ہے اور اس کی حفاظت کر رہی ہے بس اس کی انہیں خوبیوں کو آزمانے کے لیے ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو اپنے ہم عصروں کی پگڑی اچھالنے کی بجائے ہر پاکستانی کا شملہ اونچا اور اس ملک کا پرچم سربلند کرے۔

جوان سیرت فولاد -The Mighty Souls

کسی بھی ملک و قوم کے نوجوان اس کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں جب ان کی ہمت بلند اور عزم آہنی ہو تو کوئی انہیں شکست نہیں دے سکتا۔ پاکستان کے قیام میں انہی نوجوانوں نے ہر اول دستے کا کردار ادا کیا اور تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوا دیا۔ آج بھی ہم اپنے نوجوانوں سے وہی توقع رکھتے ہیں اور باوجود بہت ساری کوتاہیوں کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان نوجوانوں میں آج بھی عزم و حوصلے کی کمی نہیں یہ کسی بھی میدان میں اپنا آپ منوانے کی ہمت رکھتے ہیں اور ملک کی سربلندی اور حفاظت کیلئے کوشاں ہیں۔

ظاہر ہے یوں تو ہم بے شمار کتابیں پڑھتے ہیں لیکن کچھ کتابیں اپنے لکھنے والے کی وجہ سے خاص محسوس ہوتی ہیں کبھی بلحاظ شہرت ، کبھی بلحاظ رتبہ لیکن بہت کبھی کبھی بلحاظ عمر بھی ۔ اوپر کی تمہید باندھنے کی وجہ ہی یہی تھی کہ میں ایک ایسی کتاب کا ذکر کرنے جا رہی ہوں جس کو لکھنے والا سولہ سترہ سال کا ایک بچہ یا نوجوان ہے جسے فیروز سنز نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کو اے لیول کے ایک طالبعلم شہیر اللہ خان نے لکھا ہے۔ سترہ سالہ مصنف بیکن ہاؤس ایجوکیشنل کمپلیکس راولپنڈی کا طالبعلم ہے اور جیسا

کہ ایک عام تاثر ہے کہ آج کے بچے تختی سے بہت دور ہوتے ہیں اس بچے نے اس تاثر
جو کہ پندرہ مختصر کہانیوں پر مشتمل The Mighty Souls کو غلط ثابت کیا ہے۔ کتاب
ہے اور یہ تمام کہانیاں افواج پاکستان، انٹیلیجنس اداروں اور اینٹی نارکوٹکس کے
بارے میں لکھی گئی ہیں۔ چونکہ یہ تمام کہانیاں تصوراتی ہیں اور اسی لیے اسے اس
نوجوان ذہن کی اپنے وطن سے محبت اور اس کیلئے قربانی کے جذبے سے تعبیر کیا جا سکتا
ہے اور یہ کتاب دوسرے نوجوانوں کو بھی انہی جذبات کی ترغیب دلانے میں بھی مدد
گار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ جنرل ریٹائرڈ حمید گل نے لکھا ہے جس کو
شہیر اللہ خان اپنے لیے ایک اعزاز گردانتا ہے۔ کتاب میں موجود کہانیاں تو اپنی جگہ
لیکن زیادہ اہم وہ جذبہ ہے جو ان میں کارفرما ہے اور جس کو دیکھ کر اور پڑھ کر اس
بات پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے کہ یہ قوم ناقابلِ تسخیر ہے اور باوجود ہزار مشکلات
کے اس کے عزم و ہمت میں کوئی کمی نہیں آئی اور نہ ہی نوجوان نسل کی اپنے محافظوں پر
اعتماد میں کمی آئی ہے۔ اس کتاب کو ادب کے معیار سے زیادہ جذبے کے معیار پر پرکھا
جائے تو ایک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان جانتے ہیں کہ یہ ملک ہے تو
وہ ہیں اور اسی لیے وہ اس کی بقا کیلئے کوئی بھی قربانی دینے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس کتاب
میں کچھ کہانیاں دہشت گردی کے مسئلے کے گرد بھی گھومتی نظر آتی ہیں جس سے اندازہ
ہوتا ہے کہ اس طویل جنگ نے کس طرح آج کے بچوں کے ذہنوں پر اپنے اثرات
مرتب کیے ہیں لیکن دہشت گردوں کا

مقابلہ کرکے انہیں شکست فاش دینے کی سوچ سے عزم وہمت کا اظہار بھی ضرور کیا گیا ہے اور اس سوچ کا بھی کہ دشمن چاہے اندر کے ہوں یا باہر کے وہ دشمن ہی ہیں اور جو بھی شخص اس ملک کو نقصان پہنچانا چاہے اس سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنا ضروی ہے ۔چونکہ خود شہیر اللہ خان کا تعلق ایک فوجی گھرانے سے ہے اس لیے ان کہانیوں کو پڑھ کر لگتا ہے اس نے فوجی زبان اور ہتھیاروں کے استعمال کا اظہار بڑی مہارت سے کیا ہے لیکن وہ خود کتاب میں موجود جذبے کو پاکستان کی نوجوان نسل کی اکثریت کی ترجمانی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ جذبہ مختلف لوگوں میں مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے مگر یہ جہاں بھی ہو اور جس صورت میں بھی ہو قابلِ قدر اور انتہائی اہم ہے۔ اسی جذبے کے تحت ہمارے نوجوان مختلف شعبوں میں سرگرم عمل ہیں۔ ہاں فوجی جس طرح اپنی جان پر کھیل کر وطنِ عزیز کے دفاع کیلئے ہر مشکل سے ٹکرا جاتے ہیں وہ اس سے بہت متاثر دکھائی دیتا ہے خود وہ فوج کو پیشہ یا نوکری نہیں عبادت اور مشن سمجھتا ہے اور اس دن کا منتظر ہے جب وہ بھی یہ اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ بہر حال یہ بات خوش آئندہ ہے کہ ہمارے Teenagers صرف ون ویلنگ، شور شرابے، کمپیوٹر گیمز، شیشہ اور موبائل میسجنگ میں ہی مصروف نہیں ہیں وہ انتہائی تعمیری سوچ بھی رکھتے ہیں، وہ ملک کیلئے قربانی دینے والوں کو بھی یاد رکھے ہوئے ہیں اور سوات، وزیرستان، سیاچین، کشمیر غرض محاذ پر برسرپیکار اپنے

سے عمر میں کچھ ہی بڑے مجاہدوں کے کارناموں پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ
صورتِ فولاد جوان ہی اس مٹی اور وطن کی بقا اور عظمت کے ضامن ہیں۔
اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ اس قوم کا ہر بچہ اور نوجوان بلکہ اس کا ہر باشندہ اس مٹی کی
حفاظت کیلیے اتنا ہی پر عزم اور پر جوش ہو جتنا The Mighty Souls کا مصنف شہیر
اللہ خان ہے۔اللہ اس وطن کی اور اس قوم کی حفاظت کرے (آمین)

اہل سیاست ۔۔۔ اپنا آپ پہچانو

23 مارچ 1940 کو لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ مسلمان اور ہندو برصغیر میں بسنے والی دو الگ الگ قومیں ہیں۔ انہوں نے کہا دونوں کے مذاہب ، فلسفہ ، معاشرتی رسوم ، ادب سب ایک دوسرے سے جدا ہیں یہ دونوں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نظریات ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔۔۔۔ دونوں کی تاریخ جدا ہے اور بسا اوقات ایک کی فتح دوسرے کی شکست اور ایک کے اکابرین دوسرے کے دشمن ہیں۔۔۔ مسلمان قوم کسی بھی تعریف کے مطابق ایک الگ قوم ہیں اس لیے ان کا ایک الگ ملک ہونا چاہئیے انہوں نے واضح کہا کہ " ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن سے رہنا چاہتے ہیں " اور دراصل یہی وہ اساس تھی جس کی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا اور یہ بھی حقیقیت ہے کہ اس سارے اختلاف کی وجہ صرف ایک تھی اور وہ تھی مذہب۔ جب مذہب ہی الگ تھا تو ظاہر ہے وہ مرکز و محور ہی الگ تھا جس کے گرد ہر انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی گھومتی ہے اور دراصل یہی دو قومی نظریہ ہی تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو جدا گانہ حیثیت اور تشخص دیا۔ اس نظریے کو ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچانے والی سیاسی جماعت مسلم لیگ تھی۔ پاکستان تو بن گیا کیونکہ اس قافلے کو میر کارواں ایسا میسر آیا کہ جس کے ضبط و اخلاص اور ثابت قدمی کی مثال

ملنا مشکل بلکہ بہت حدتک نا ممکن ہے اور یہی خلوصِ نیت تھا جس نے ایک انہونی کو ہونی بنا دیا۔

قائدا عظم کی رہنمائی برصغیر کے مسلمانوں کی سب سے بڑی خوش قسمتی تھی لیکن ان کی بے وقت رحلت اس نئے ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی کہ ان کے بعد کوئی سیاستدان قوم کو اس طرح لے کر نہ چل سکا جیسا کہ ان کا فرض تھا ہر ایک اپنے مفاد اور اپنی حکومت کی خاطر سیاست کرتا رہا اور آج کل تو حال یہ ہے کہ ہر ایک قائدا عظم کے وژن کی بات کرتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ وہ قائدا عظم کے وژن سے اتنا بھی باخبر نہیں جتنا کہ ایک عام پاکستانی محنت کش جو کم از کم خود میں اور ہندو میں فرق سے تو واقف ہے لیکن ہمارے سیاستدان صرف اپنے مفاد کو ہی جانتے ہیں ورنہ خود کو پاکستان کی بانی جماعت کا سربراہ اور رہنما اور قائد اعظم کے جانشین کہلانے والے جناب نواز شریف وہ تقریر نہ کرتے اور اُن خیالات کا اظہار نہ فرماتے جو انہوں سیفما کی تقریب میں فرمایا۔ امن کی خواہش اپنی جگہ قابل تعریف ہے اور یہ خواہش قائد نے قرار داد لاہور یعنی قرار داد پاکستان کے وقت بھی کی تھی کہ ہم پڑوسیوں کے ساتھ امن اور دوستی سے رہنا چاہتے ہیں لیکن دوستی کی یہ خواہش تاریخ بھلا کر نہیں تھی۔ امن اور دوستی ہر ذی ہوش انسان کی خواہش ہوتی ہے اور امن ہوتا بھی تب ہے جب محلے میں رہنے والے تمام لوگ اس کے خواہش مند ہوں۔ میں متنازعہ معاملات کی بات

ہی نہیں کرونگی کہ کارگل کا معاملہ کیا تھا، قصور وار کون تھا اور مجرم کون لیکن وہ معاملات جو غیر متنازعہ ہیں جس میں کسی کو نہ شک ہے اور نہ شک کی گنجائش ان سے رو گردانی میاں صاحب کیلئے کیسے ممکن ہوئی، یہ کہہ دینا کہ ہمارا اور ہندوئوں کا رب ایک ہے بلاشبہ ہم سب کا پیدا کرنے والا ایک ہے لیکن یہ کہنا کہ ہم بھی اسی رب کو پوجتے ہیں جس کو آپ (ہندو) تو یاد کیجیئے گا ''لااعبدو ما تعبدون'' اور یہ بھی کہ ''لکم دینکم ولی یدین'' تمہارے لیے تمہار دین اور ہمارے لیے ہمارا دین اور یہ دین ہی ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے متضاد بنا دیا۔ سکھوں سے مخاطب ہونے کی بھی اور بات ہے موحد وہ بھی ہیں لیکن تاریخ ہماری اور ان کی بھی ایک نہیں۔ کتاب ان کی اور ہماری جدا، نبی ان کا اور ہمارا جدا، ہیرو ان کے اور ہمارے جدا۔ امرتسر سے تعلق پر فخر سے بہتر ہے کہ پاکستان پر فخر کیا جائے۔ آپ کو عزت، شہرت، دولت اور حکومت پاکستان نے دی۔ زبان تو دنیا کے کئی ملکوں کی ایک ہوتی ہے۔ آلو اور گھیا ہم اور ہندو ہی نہیں امریکی، روسی، فرانسیسی، جاپانی، اطالوی سب ہی کھاتے ہیں تو کیا ساری لکیریں مٹا دینی چاہیئے۔ یہ سرحد لکیر نہیں ایک بہت بڑی حقیقیت ہے پہچان ہے جو ہمیں ملی ہے اور اس حقیقت سے انکار آپ اپنی تباہی کا سامان کرنا ہے۔ تجارت سے بھی کسی کو اختلاف نہیں لیکن عزت کے ساتھ موٹروے بھی تاشقند اور کولکتہ تک لے جایئے لیکن سرحدوں کی حفاظت اس تجارت، دوستی اور رابطے سے زیادہ اہم ہے۔ یہ گارنٹی بھی لینا ضروری ہے کہ موٹروے

سے 'را' کے ایجنٹوں کی ترسیل نہ ہوگی۔ بھارت سے کہہ دیجئے اسلحہ جمع کرنا بند کر دے یہ معاہدہ کر لے کہ پاکستان پر ہرگز حملہ نہ کرے گا ہم بھی اپنی تیاری موقوف کر دیں گے یہ خواہش تو ہر پاکستانی کی ہے کہ پیسہ اسلحے پر نہیں ترقیاتی اور معاشرتی وسائل پیدا کرنے پر لگے لیکن پہلے بھارت اپنے مکروہ عزائم کے سامنے بند باندھے لیکن وہ یہ بند پاکستانی دریاؤں پر باندھ رہا ہے تاکہ اس کی زراعت تباہ کی جاسکے اور پھر کیا ہوگا ظاہر ہے کہ ہم غلہ، اناج اور سبزیاں بھی درآمد کرنا شروع کر دیں گے اور بھارت سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ہم یہ سب ان سے منگوانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اب ایسے پڑوسی کے حقوق ہم ہی پورے کرتے رہیں یا ان کا بھی کچھ فرض ہے۔ امن کی آشا اور امن کی خواہش ہر ایک کو ہے لیکن خودداری اور عزت کے ساتھ۔

ہمارے سیاستدانوں کو بات کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیئے یہ کوئی امن پسندی نہیں کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال آگے کر دو بلکہ یہ بزدلی ہے اور دوستی بھی درست لیکن تاریخ مسخ کرکے نہیں۔ جہاں تک مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے بھارتی خواہش کا تعلق ہے تو صرف واجپائی پر کیا موقوف بھارت کی ہی حکومت نے اقوام متحدہ کی اس قرارداد کو منظور کیا تھا جس میں کشمیریوں کو استصواب رائے کا حق دیا گیا تھا۔ کیا یہ حق واقعی ان کو ملا یا دیا گیا۔ بین الاقوامی تعلقات میں آپ دوستوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے کجا کہ دشمن کی

باتوں پر امنا و صدقنا کہہ دیں اگر واجپائی جی اتنے مخلص تھے تو کچھ کیا کیوں نہیں۔
خدارا ہمارے سیاستدان سمجھ داری کا ثبوت دیں دوست دشمن کو پہچانیں۔آپ سب جانتے ہیں مشرقی پاکستان میں کس نے کیا کیا اور پورے پاکستان میں اور خصوصاً بلوچستان میں کیا کر رہا ہے۔ افغانستان میں اپنی موجودگی کو کیوں بڑھایا جا رہا ہے۔ پاکستان میں خود دہشت گردی کروانے کے بعد پاکستان کو دہشت گرد ملک قرر دینے کیلئے کون کوشاں ہے ظاہر ہے بھارت نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر دو قومی نظریے کو بحیرۂ عرب میں غرق کرنے کا نعرہ اگر تب لگایا تھا تو کیا اب ہم خود وہی نعرہ لگانے لگے ہیں۔ لیکن دو قومی نظریہ نہ تب غرق ہوا تھا نہ اب ہوگا۔ یہ نظریہ تو قیامت تک قائم رہے گا جب مومن اور کافر الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ وہ سرحد ہمارے بزرگوں نے کھینچی ہے اور انہوں نے بخوشی اپنے گھر بار، گاؤں اور شہر چھوڑے ناموں کے ساتھ شہروں کے نام لگانے کا اس زمانے میں رواج تھا سو وہ لگاتے رہے لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کی بقا پاکستان میں ہی ہے اور اسی لئے وہ پاکستان چلے آئے اور پھر انہوں نے دل و جان سے اس ملک کو اپنایا بلکہ اس پودے کو سینچتے رہے اور اس سرحد کو سرحد ہی سمجھا کہ اُدھر ہندوستان اِدھر پاکستان اور یہ پاکستان ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیئے۔ دو قومی نظریہ کسی دشمنی کا نظریہ نہیں ہے یہ صرف

ہماری پہچان ہے اور اس پہچان کو قائم رکھنا ہماری بقا کی ضمانت اور یہ ضمانت تبھی ہی کار آمد ہو گی جب طاقت کا توازن برقرار رہے۔

ہمارے خدایانِ سیاست کو جان لینا چاہیئے کہ پاکستان کا عام شہری ان سے زیادہ امن کا خواہش مند ہے کیونکہ آپ تو اب بھی اس ملک سے اپنے حصے سے زیادہ وصول کر رہے ہیں۔ دفاع پر تو اس عام پاکستانی کے حصے کی دولت خرچ ہو رہی ہے اور وہ آج کی جدید دنیا میں بھی سہولیات سے محروم بیٹھا ہے اور اس کی اس محرومی کا مجرم بھی بھارت ہے کہ جس دن اس نے پاکستان کو حقیقت تسلیم کر لیا، اپنے خطرناک عزائم سے باز آگیا اس دن خود بخود ہم بھی ترقی کے راستے پر چل پڑیں گے۔

میری اہل سیاست سے مئودبانہ درخواست ہے کہ خدارا اپنی پہچان کھونے کی کوشش مت کریں آپ سولہ کروڑ ہیں لیکن دنیا میں پہچان رکھتے ہیں بھارت میں مسلمان آپ سے بہت زیادہ ہیں لیکن وہ بھارت میں بھی نمایاں نہیں کتنے کلیدی عہدوں پر مسلمان آپ کو ملیں گے اور بس اتنا یاد رکھیئے کہ

وطن کی قدر کرو اس کی خاک کو چومو
نجانے کتنے گھروں کے عوض یہ گھر ٹھہرا

اور یہ بھی ذہن میں رکھیئے کہ ہماری تاریخ جدا، ہماری ثقافت جدا، ہمارے نام جدا، ہمارے کلینڈر الگ، ہمارے مخصوص کھانے الگ، برتن مختلف، گھروں کی طرز تعمیر جدا، تہوار اپنے اپنے، زبان ہیں مماثلت ضرور لیکن رسم الخط جدا، ہمارے لباس الگ، ہمارے رہنما اور ہیرو جدا۔ غرض ہمارا کچھ بھی ایک نہیں ہے کیونکہ ہم دو قومیں ہیں مسلمان الگ اور ہندو الگ۔

امریکیوں کا پاکستان سے بے جا شکوہ

کچھ دن پہلے لاہور سے ایک امریکی باشندہ اپنے شاندار گھر سے اغوا کر لیا گیا۔ ویرن وینسٹن جو بظاہر پاکستان میں رفاہی کاموں میں مصروف تھا، کیا اس کی کچھ دوسری سرگرمیاں بھی تھیں، کیا وہ واقعی ایک سی آئی اے ایجنٹ تھا یا پاکستانی اسے امریکہ سے بدگمانی کی بنیاد پر ایجنٹ قرار دے رہے ہیں۔

پندرہ اگست کے ایکسپریس ٹربیون میں مائیکل کیگلین کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار کو یہ گلہ ہے کہ ہم پاکستانی ہر امریکی کو سی آئی اے کا ایجنٹ کیوں قرار دے دیتے ہیں اور اس کا کہنا ہے کہ ہر امریکی جاسوس نہیں اور ان میں اکثر پاکستان اور پاکستانیوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ پھر بھی ہم امریکیوں کے متعلق اپنی رائے کیوں نہیں بدلتے اور ان سے بدگمان کیوں ہیں اور ساتھ ہی اس نے خود ہی چند وجوہات بھی بتائی ہیں۔ تو بات دراصل یہ ہے کہ پاکستانی عام امریکیوں سے بدظن نہیں ہیں لیکن امریکی حکومت کے بارے میں واقعی ہماری رائے کچھ اچھی نہیں ہے چونکہ ہمیں پاکستان میں موجود امریکیوں کے بارے میں کچھ ایسے تلخ تجربات ہو چکے ہیں کہ ان کے بعد کسی بھی امریکی پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنا سراسر حماقت ہے۔

ریمنڈ ڈیوس تو ابھی کل ہی

کی بات ہے جس کی جاسوسی سرگرمیاں بمعہ شواہد سب کے سامنے آئیں اور جس کو حکومت امریکہ خود اپنا اہلکار تسلیم کرتی رہی اور اسے سفارتی استثنائی دینے کا مطالبہ کرتی رہی۔پاکستان میں بے شمار غیر ملکی این جی اوز کام کر رہی ہیں جن میں سے بیشتر امریکی ہیں اور ان اداروں کے کرتا دھرتا بھی ظاہر ہے کہ امریکی ہیں۔ اقوام متحدہ کے اداروں میں بھی بہت سے ایسے ہی غیر ملکی موجود ہیں جو سالہا سال سے پاکستان میں مقیم ہیں اور جن کی سرگرمیاں صاف طور پر مشکوک ہیں اور اسی لیے انہیں ملازمت میں توسیع پر توسیع دی جاتی ہے۔

پشاور میں یونیورسٹی ٹاؤن کے علاقے میں ایسے بہت سارے امریکی موجود ہیں جنھوں نے بظاہر فلاحی ادارے قائم کر رکھے ہیں جبکہ ان کی حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ یہ درپردہ جاسوسی اور پاکستان مخالف سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ اکثر امریکی باشندے پولیس کے اشارے پر بھی گاڑی نہیں روکتے اور ایسا سفارت کار بھی کرتے ہیں یعنی ہر امریکی یا چاہیئے ہر ایک نہ سہی امریکیوں کی اکثریت خود کو پاکستان میں رہ کر اس کے قانون سے بالاتر سمجھتی ہے اور جونہی ان کی نقل و حرکت زیادہ ہوتی ہے امن و امان کی صورت حال مخدوش ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس تمام صورت حال کو مد نظر رکھا جائے تو کیا ''ایسے'' امریکیوں کو مشکوک قرار دے دینا قرین انصاف نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی ''ایسے'' امریکیوں کو ہی مشکوک سمجھتے ہیں سب کو نہیں ، اور اگر دوسری طرف نظر ڈالی

جائے تو امریکی ہر پاکستانی کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے مسلمان ہونے کے ناطے پاکستانی داڑھی بھی رکھیں گے ۔ قومی لباس بھی پہنیں گے، وہ روزہ بھی رکھیں گے، نماز بھی ادا کریں گے اور قرآن پاک بھی پڑھیں گے اور جو پاکستانی اپنے یہ دینی فرائض ادا کرتا ہے اور سر پر ٹوپی رکھ لیتا ہے وہ امریکہ کے خیال میں دہشت گرد قرار پاتا ہے ۔ اس نے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ پاکستانی مسلمان مردوں کی اکثریت سر پر ٹوپی رکھتی ہے اور پینٹ کوٹ پر شلوار قمیض کو ترجیح دیتی ہے ۔ ہم تو صرف ان امریکیوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں جو واقعی ہمارے ملک کے خلاف مصرف عمل ہیں اور اسی مقصد کیلئے انہوں نے فلاحی کاموں کی آڑ لے رکھی ہے ورنہ وہ خود امریکہ میں کیوں خدمات سر انجام نہیں دیتے ؟ کیا وہاں کوئی غریب نہیں ؟ وہاں کے غریب اپنے ملک کے حساب سے غریب ہیں ان کی بھی خدمت کی جا سکتی ہے لیکن وہ بڑے شوق سے پاکستان آ کر چند تھیلے آٹے، چاول، چینی اور گھی کے تقسیم کرکے پاکستانیوں کو خریدنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ امریکی یہ سب تقسیم نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں ہم خود پیدا کر سکتے ہیں نہیں تو آدھے پیٹ کھا لیں گے لیکن ہمارے ملک میں دہشت گردوں کی پشت پناہی چھوڑ دی جائے، چاہے یہ پشت پناہی فاٹا میں ہو یا بلوچستان میں اور اس چھوٹی موٹی امداد کی بجائے پاکستان کی ترقی ہیں مدلچسپی لی جائے نہ کہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں۔

ہم امریکہ سے اس لیے نالاں ہیں کہ وہ ہمارے دشمن کا دوست ہے اور بھارت کی خیر خواہی میں مسلسل کوشاں ہے۔ سول نیوکلئیر ٹیکنالوجی کا معاہدہ وہ وہاں کرتا ہے ہم سے نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اسی نے دنیا میں پاکستان کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اسی کے تھنک ٹینک مسلسل پاکستان کو ناکام ریاست ثابت کرنے پر مصر ہیں۔ ہماری حکومتوں پر مسلسل ان کا دباؤ رہتا ہے۔ خیر اس معاملے میں تو ہمارے حکمران بھی قصوروار ہیں جو یہ دباؤ برداشت نہیں کرپاتے اور ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ہماری فوج جو دس سال سے امریکہ کی مسلط کردہ جنگ لڑ رہی ہے مسلسل اس کی تنقید کی زد میں ہے جس کے راسخ العقیدہ مسلمان افسر اور سپاہی انہیں طالبان نظر آتے ہیں اور ہمارے ایٹمی اثاثے انہیں غیر محفوظ نظر آتے ہیں جبکہ وہ اس بات کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ انہیں تو دنیا میں ہر جگہ آمادہ شر اپنی فوج کی فکر کرنی چاہیئے۔

اب ہماری طرف سے اتنی ساری بدگمانیوں میں مبتلائی امریکیوں کے بارے میں ہم کس طرح حسن ظن رکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی قوم مکمل طور پر بدطینیت نہیں ہوتی لیکن اس کی اکثریت کی رائے اور اس کی پالیسیاں اس کے بارے میں تاثر قائم کرتی ہے۔ اس کے عمال حکومت کی نیک نیتی یا بدنیتی متاثرہ قوم کی رائے کو ڈھالتی ہے۔ آج کے دور میں تو اس کے میڈیا کا طرز عمل بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ صرف چند روپوں یا ڈالروں کی امداد کے عوض کسی

دوسری قوم کو اپنی جاگیر سمجھ لینا کسی بھی طرح بین الاقوامی مُسلمہ اصولوں کے مطابق نہیں اور وہ بھی جب کہ امداد نقصان کے معاوضے سے بھی بہت کم ہو۔

اب اگر ان ساری باتوں کو سامنے رکھا جائے تو پاکستانیوں کی امریکیوں سے بد گمانی کچھ حیران کن اور غیر مناسب نہیں۔ بجائے یہ شکایت کرنے کے کہ پاکستانی ہر امریکی کو سی آئی اے کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ امریکہ بہادر اپنی اداؤں پہ ذرا غور کرے تو شاید وہ وجوہات و شکایات کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔

دو قومی نظریہ ۔۔۔ قوم ہوشیار باش

پاکستان بنے ہوئے ساڑھے چھ دہائیاں گزر گئیں یعنی نصف صدی سے زیادہ عرصہ ، لیکن اسکے دشمنوں نے اسے قبول نہ کیا اور ہر ہر زاویے سے اسکے وجود کے درپے ہیں کبھی خود وار کرتے ہیں اور کبھی ہمارے اندر سے ایسے کردار ڈھونڈ نکالے جاتے ہیں۔ آج کل بھی ایسا ہی ایک وار پاکستان کی اساس یعنی دو قومی نظریے کو موضوع بحث بنا کر بلکہ اس کی مخالفت کرکے کیا جارہا ہے اور اس نظریے کی تشریح اس طرح کی جارہی ہے جیسے یہ دو قوموں کی جداگانہ حیثیت کا تعین نہ ہو بلکہ دو قوموں کی دشمنی کی بنیاد ہو یعنی وہ جس بات کا سارے فسانے میں ذکر ہی نہیں وہی ان کو ناگوار گزر رہی ہے۔ آپ تاریخ کی کتابیں اُٹھا کر دیکھیں کہاں لکھا ہے کہ ہندوستان میں دو دشمن قومیں بستی ہیں مسلمان اور ہندو۔ وہاں تو یہ لکھا ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں مسلمان اور ہندو اور اِسی لیے دو قوموں کے دو ملک ہوں۔ ابھی حال ہی میں سیفما کی ماروی سرمد اپنی تنظیم کے پلیٹ فارم سے دو قومی نظریے کے خلاف بُری طرح اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں اور معلوم یا نامعلوم ایجنڈے پر زور و شور سے عمل پیرا ہیں۔ چاہے وہ خود کو جتنا بھی آزاد ظاہر کریں لیکن ان کا کام اور اُن کا لہجہ بول رہا ہے کہ وہ کسی خاص مقصد سے یہ سب کچھ کر رہی ہیں۔ ماروی کے مطابق وہ دائیں بازو کے لوگوں سے اس

Head)

یعنی براہ راست ٹکراؤ پر انتہائی خوش ہیں بات دائیں اور بائیں کی (on Collision نہیں وہ اِس شُہرت سے ضرور خوش نظر آ رہی ہیں جس میں اچانک ملک گیر اضافہ ہوا اور اگر پہلے انہیں دس فیصد لوگ جانتے تھے تو اب پچاس، ساٹھ فیصد لوگ جاننے لگے ہیں اور شُہرت کی تو موت بھی زندہ باد بالکل اس مصری کہانی کی طرح جس میں شُہرت کا خواہشمند ایک شخص ایک اداکارہ کا قتل اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ مجھے معلوم ہے میرا لہجہ اور الفاظ سخت ہو گئے ہیں لیکن اس لہجے اور الفاظ سے زیادہ نہیں جو ماروی سرمد استعمال کرتی ہیں۔ جو خود بامعاوضہ یا بلامعاوضہ تلک یا بندیا لگا کر سمجھتی ہیں کہ پاکستان اور بھارت کی ثقافت ایک ہے۔ کیا بھارت کی ہندو عورت کبھی آپکی بلوچ قمیض اِتنے فخر سے زیب تن کرکے بھارت کے خلاف بات کرتی ہے۔ اِن کو اعتراض ہے کہ ہم ایک نظریے یا تھیوری جیسی بے حیثیت چیز کو اتنا اہم کیوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے اسے اپنے ملک کی بنیاد قرار دے دیا جبکہ خود کو سائنسی تعلیم کی ماہر بھی کہتی ہیں حالانکہ سائنس کی طالبہ و معلّمہ دونوں حیثیتوں میں، میں نے یہی پڑھا اور پڑھایا کہ بغیر تھیوری کے سائنسدان کوئی سائنسی قانون بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور یہی نظریہ ہے جس کی بنیاد پر قومیں بنتی ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے ممدوح ہندو نہ کوئی خاص نظریہ حیات رکھتے ہیں اور نہ خاص نظریۂ معبود یعنی جس کو چاہا پوج لیا اور خدا بنالیا اور یہ پہلا فرق ہے جس کو ہندوستان کی دو قوموں کے درمیان تقسیم کی بنیاد بنایا گیا لیکن یہ صرف واحد

فرق نہ تھابلکہ یہاں ثقافت سے لیکر رہن سہن تک بالکل مختلف تھا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ماروی اور ہمنوا خود پاکستان کے اندر تو سندھی بلوچی ، پنجابی اور پٹھان کو قوم قرار دیتے ہیں اور ان کے " قومی" حقوق کے لیے شور مچاتے ہیں جن کے آباواجداد ، جن کے رسوم ورواج ، جن کی زبانیں، جنکے لباس معمولی فرق سے ایک ہیں،اور مذہب تو ہے ہی ایک ، لیکن ان میں تفریق کی دانستہ کوشش مسلسل جاری ہے۔ یہاں اگر مذہب میں فرقے ہیں بھی تو اللہ ، رسول اور قران میں کوئی تمیزو تفریق نہیں۔ پھر آخر مسئلہ کیا ہے۔ جہاں تک پرچم میں اقلیتوں کے لیے الگ رنگ مخصوص کرنے کا تعلق ہے جسے ماروی نے جھنڈے کی تقسیم قرار دیا یہ تقسیم نہیں ان کا حق ہے اور یہی حق انکا زمین پر ہے اس جھنڈے کو سلامی دینے والے صرف سبز رنگ کو سلام نہیں کرتے بلکہ ان کا ہاتھ پورے جھنڈے کے سامنے اٹھتا ہے۔ دراصل یہ اقلیتوں کے د ل میں نفرت پیدا کرنے کی ایک مذموم اور مخصوص کوشش ہے ورنہ کم از کم کوئی ذی شعور پاکستانی ایسا نہیں جو ان کے بارے میں منفی خیالات تک رکھتا ہو۔ نہ تو بحیثیت مسلمان وہ ایسا کرنے کا مجاز ہے اور نہ یہ بھارت ہے جہاں کے ہندو تو پوتر ہیں اور مسلمان اچھوت بلکہ مسلمان ہی کیا خود ہندو دلت توشاید انسان کے زمرے میں بھی نہیں آتے۔ بھارت کے مسلمانوں کی تو مجبوری ہے کہ وہ اب بھی گجرات اور احمد آباد میں رہتے ہیں ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے ایک بھارتی اخبار کی رپورٹ کے مطابق جب مالیگائوں میں سڑک پر مردہ گائے پائی گئی تو وہاں کے ہندو

مسلمانوں کی جان کے دشمن ہو گئے جبکہ تحقیقات سے پتہ چلا کہ اگر گائے کو مارا بھی گیا تھا تو اس میں کوئی مسلمان ملوث نہیں تھا یہ آپکے عظیم سیکولر بھارت کا حال ہے۔ ایک مسلمان کو بھارت کا صدر بنا دینے سے یہ مت سمجھئے کہ سب اچھا ہے۔ بیس پچیس کروڑ میں کسی کو تو موقع ملے گا ہی اور یہی موقع دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے استعمال کرلیا جاتا ہے۔ بات باقی کے مسلمانوں کی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں سمجھتی کہ خدانخواستہ ہم یہ بدلہ پاکستان کے اقلیتوں سے لیں یہ سارے بھی اس زمین کے اتنے ہی حقدار ہیں جتنا کہ ایک مسلمان۔ خود میں ایک سکھ اور ہندو دوکاندار کی مستقل گاہک رہی ہوں، میری عیسائی ہم جماعت ہمارے ساتھ کھاتی پیتی رہی۔ یہ سارے مفروضے مخصوص مقاصد کے لیے قائم کیے اور پھیلائے جاتے ہیں۔ محترمہ اسلام کا مطالعہ کیجئے اور پھر بتایئے کہ اسلام کا اقلیتوں کو برابر کے حقوق دینے کا نعرہ بقول آپ کے کھوکھلا ہے یا درحقیقت ٹھوس۔ کیا کبھی آپ نے اسلام کو سمجھنے کے نظریے سے پڑھا بھی ہے؟ میرے خیال میں تو اسطرح کے مسائل کو اُٹھانا اور "براہ راست ٹکراؤ" کا مقصد سستی شُہرت کے علاوہ کچھ نہیں جو کہ سیفما کو خاصی حاصل ہوچکی۔ یہ یاد رکھیئے جن قوموں کے پاس نظریہ نہیں ہوتا، نظریہ حیات نہیں ہوتا وہ معاشرے کھوکھلے ہوتے ہیں اور وہاں اتحاد نہیں ہوتا آخر وہ متحد ہوں تو کس بات پر

کیونکہ دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں علاقائی رواج اور زبانیں نہ ہوں جہاں پورا ملک ایک قبیلے اور نسل سے تعلق رکھتا ہو ایسا تو ایک گاؤں میں بھی ممکن نہیں تو کیا پھر پورا گاؤں آپس میں دشمن ہوگا۔

قصہ مختصر دو قومی نظریہ ہی اس ملک کی اساس بنا تھا اور اب بھی یہ برِصغیر کے معاملے میں اتنا ہی سچ ہے جتنا کل تھا۔ اور یہی نظریہ ہی دراصل ہماری طاقت اور مرکزِ ثقل ہے جس نے قوم کو متحد کر کے رکھا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دو قومی نظریے پر وار کر کے اسکو متنازعہ بنانے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے کیونکہ دشمن جانتا ہے کہ یہی اس کی پہچان اور طاقت ہے جس نے اسے دشمن کے سامنے ناقابلِ تسخیر بنایا ہوا ہے اور اپنی اس پہچان کو قائم رکھنے کے لیے یہ قوم کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ لٰہذا ہمیں اِن ہتھکنڈوں اور پروپیگنڈوں سے آگاہ رہنا ہوگا اور اِن لوگوں کے عزائم کو ناکام بنانا ہوگا۔

برصغیر کی ترقی کی کنجی بھارت کے ہاتھ

پاکستان کو اللہ تعالٰی نے جہاں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہوا ہے وہاں اس کی بہت بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ اس کی سرحد پر ایک ایسا ملک موجود ہے جس نے کبھی اس کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور ہر موقع پر پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہے ۔اس کے اسی رویے نے برصغیر کی فضا میں تناؤ کی کیفیت طاری رکھی ہوئی ہے ، کئی جنگیں ہو گئیں اور مزید جنگوں کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ دوایٹمی ممالک کے درمیان کوئی لڑائی کسی عظیم الشان تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ بھارت کی بدنیتی اور پاکستان میں مداخلت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں بنگلہ دیش بنانے کے بعد اور اپنی ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لے کر بھی مطمئن نہ ہوا اور پاکستان کے وجود کے درپے رہا اور ہے۔ یوں تو وکی لیکس کے انکشافات بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص اب کسی حیرت کا باعث نہیں بنتے لیکن پاک بھارت تعلقات کی نوعیت چونکہ اتنی نازک ہے کہ اس بارے میں کسی بات کو نظر انداز کرنا شاید ممکن نہیں رہتا۔ وکی لیکس کے حالیہ انکشافات میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ بھارت پاکستان میں دہشتگردکاروائیوں میں ملوث ہے اور یہ خبر دبئی سٹیٹ سیکیورٹی ڈیپارٹمنٹ کے حوالے سے دی گئی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو یہ کوئی انکشاف نہیں کہ بھارت پاکستان مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہے لیکن شاید ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے جویکطرفہ امن اور محبت کی فاختائیں اور پتنگیں اڑاتے ہیں یہ اہم ہو۔ کیونکہ یہ لوگ محب وطن پاکستانیوں کے بارے میں علی الاعلان تعصب کا الزام لگاتے نظر آتے ہیں اور دوستی کی خواہش میں سرحدیں تک مٹانے کے آرزومند ہو جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ یہی کہتی اور لکھتی ہوں کہ دوستی میں کوئی حرج نہیں بلکہ پڑوسیوں کے ساتھ دوستی آپ کو بہت سارے مسائل سے بچالیتی ہے آپ کی فوج سرحد پر عمومی انداز اور تعداد میں موجود ہوتی ہے ہر وقت حالتِ جنگ میں نہیں ہوتی، دور کا دشمن جب تک آپ تک پہنچتا ہے تو آپ خبردار اور تیار ہو سکتے ہیں یہاں تو آپ فوراً وار کی زد میں آجاتے ہیں نہ خبرداری نہ تیاری۔ لہٰذا دوستی آپ ہی کے فائدے میں ہے وہ سارا پیسہ جو جنگ اور جنگ کیلئے تیار رہنے پر صرف ہوتا ہے ملکی ترقی اور خوشحالی کا حصہ بن جاتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بھارت اس بات کو سمجھنے پر بالکل تیار نہیں۔ اس کی بدنیتی ہمیشہ ننگی تلوار کی طرح بے نیام رہتی ہے۔ بلوچستان، پنجاب، کراچی بالخصوص اور سندھ بالعموم اس کی زد میں رہتے ہیں جہاں کسی شخص میں بغاوت کا ایک جراثیم بھی نظر آیا اس کو اپنا پیرو بنا دیا اور حیاتیاتی اصولوں کے مطابق اس جراثیم کی انتہائی تیز رفتاری سے تقسیم در تقسیم کرکے آس پاس پھیلا دیا۔ یہی کام اس نے بلوچستان میں کیا ہوا ہے اور وہاں کے ماحولیاتی حالات اور غربت نے اس کیلئے اس کام کو قدرے

آسان کر دیا۔ خود بھارت میں کروڑوں لوگ بھوکے ننگے بے سائباں اور بے سروسامان ہیں لیکن وہ راکے ذریعے وہ پیسہ جو ان کا حق ہے بے دریغ پاکستان کے خلاف لٹا رہا ہے۔ اس کی موجودگی اور مداخلت اب کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں۔ سوات ہیں پاکستانی طالبان اور دہشت گرد جو اسلحہ استعمال کرتے رہے اس میں بہت سا بھارتی ساختہ تھا اور صرف اسلحہ ہی نہیں بلکہ آئی ایس پی آر کے مطابق دوائیں، طبّی آلات اور مصنوعات بھی ملیں اور مقامی لوگوں کے مطابق بھارتی روپیہ بھی دیکھا گیا۔ غیر مختون لاشوں کا ملنا بھی سب کے علم میں ہے۔ پاکستان کے ساتھ مسلسل دشمنی میں ہندو کی وہی ذہنیت کارفرما ہے جو تحریک پاکستان کے وقت بھی تھی۔ وقت کی تبدیلی نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہی اپنے رویے میں لچک پیدا کر دینی چاہیئے انہیں بھارت کا بنگلہ دیش میں کردار اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے بلکہ بھارت تو اپنے ملک میں مسلمانوں کا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتا ابھی حال ہی میں گنیش وسرجن کے تہوار کے موقع پر مہاراشٹر میں نندوربار کی مسجد کے سامنے سے گزرتے ہوئے جلوس نے مسجد پر گلال پھینکا اور فرقہ وارانہ فساد کے نتیجے میں دو افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے اور ایسا ہی فساد اسی ریاست میں عید کے موقع پر نیواسہ میں بھی ہوا۔ مسلمانوں کی طرف سے بلائی گئی پولیس خود فریق بن کر مسلمانوں سے بر سرپیکار ہو گئی۔ یہ تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے اور خدانخواستہ پاکستان میں عید کے موقع پر بھی کبھی ایسا واقعہ نہیں

ہوا جسے پاکستان دشمن و مخالف اور خود اپنی ہی نام نہاد انسانی حقوق کی تنظیمیں "نا معلوم وجوہات" کی بنا پر اقلیتوں کیلئے خطرناک ترین ملک قرار دیتے ہیں۔ اب جو ملک اپنے مسلمان شہریوں کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ کسی مسلمان ملک کا خیر خواہ کیسے ہو سکتا ہے جہاں نندوربار تو ایک مثال ہے ورنہ فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم و اسلام دشمنی ان کی گھٹی میں پلا دی جاتی ہے اور یہی حال پاکستان دشمنی کے بارے میں ہے اور یوں را کو پاکستان کے خلاف ایجنٹ ڈھونڈنے میں زیادہ تگ و دو بھی نہیں کرنی پڑتی۔ ان حالات میں ہمیں دنیا کو زیادہ طاقتور آواز میں یہ حقیقت بتانی اور سمجھانی ہو گی کہ مداخلت کار پاکستان نہیں بھارت ہے۔ اس نے پاکستان کی شہ رگ یعنی کشمیر کو دبایا ہوا ہے وہ پاکستان کی رگوں میں دوڑتے دریاؤں کا پانی روک کر اس کے کھیتوں سے زندگی چھیننا چاہتا ہے اور جب سیلاب آئے تو بپھرے دریا ہماری آبادیوں کو نگلنے کیلئے چھوڑ دیتا ہے۔ افغانستان میں بالکل ہی بے مقصد اور لایعنی قونصلیٹوں کی فوج بنا کر اور اس کی تعمیر نو کا بہانہ بنا کر اپنے جاسوس وہاں بھیج کر پاکستان کے خلاف مصروف کار ہے۔ جو ملک مسلسل حالت جنگ میں ہے پہلے وہاں جنگ ختم کرو انسان بچیں گے تو تعمیر بھی ہو جائے گی لیکن مقصد دوسری طرف سے بھی پاکستان پر یلغار اور بلوچستان اور فاٹا میں داخلہ ہے۔

قارئین اگر ہم یہ سمجھیں کہ دنیا کو یہ سب کچھ خود نظر آجائے گا تو ایسا ممکن نہیں کیونکہ شاید دنیا کا اتنا خلوص نہیں جتنا کہ اس کی ضرورت بھارت سے وابستہ ہے ایک ارب سے زیادہ آبادی والا یہ ملک ان کی مصنوعات، ان کے اسلحے اور ان کی تکنیکی صلاحیتوں کی ایک بہت بڑی منڈی ہے تبھی تو شائننگ انڈیا کی تنگ و تاریک اور بدبو دار گلیاں انہیں نظر نہیں آتیں اور اسی چیز کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں دنیا کو ان تلخ حقائق سے آگاہ کرتے رہنا ہوگا جن کا سامنا ہم بھارت کی وجہ سے کرتے ہیں اور یا بھارت کو اپنا رویہ اور اپنے ارادے بدلنے ہونگے۔ پاکستان میں مداخلت بند کر دینی ہوگی۔ برصغیر پاک و ہند کی ترقی کی کنجی بھارت کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے جارحانہ عزائم سے باز آجائے گا، جب وہ اکھنڈ بھارت کے نظریے سے دستبردار ہو جائے اور پاکستان کو اپنی گم شدہ جاگیر اور چھنی ہوئی میراث سمجھنا چھوڑ دے گا تو پاکستان اور خود بھارت کے عوام بھی سکھ کا سانس لے لیں گے۔

نہ ہم یقین کی جانب نہ ہم گماں کی طرف

وطن عزیز میں ایک عجیب ہوا چلی ہوئی ہے بلکہ آندھی اُڑی ہوئی ہے، طوفان اٹھا ہوا ہے۔ الزامات کی بوچھاڑ ہے ہر ایک دوسرے کو مجرم، غدار اور خدا جانے کیا کیا کہہ رہا ہے کس کی بات میں کتنی صداقت ہے اور کتنا جھوٹ، عوام اس کا بڑا درست تجزیہ اور فیصلہ کر رہے ہیں۔ لیکن ملک و قوم اس وقت جن حالات سے گزر رہے ہیں اس میں عوام الزامات نہیں اقدامات کی توقع کر رہے ہیں مگر ہو یہ رہا ہے کہ یہاں ہر ایک دوسرے کو غدار کہنے سے ہی فارغ نہیں ہے۔ بات دراصل وہ نہیں ہوتی جو ہمارے لیڈر کہہ رہے ہوتے ہیں بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے اقتدار کی فکر ہے یعنی یا حصول اقتدار یا دوام اقتدار کی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس ساری دوڑ دھوپ میں نہ عوام کی فکر ہے نہ ملکی و قومی ترقی کی۔ قومی سطح پر تو ہم نے اپنے قومی تشخص، پہچان اور نظریے کو ہی مشکوک بنا دیا ہے۔ حیرت ہے کہ جو شخص خود کو عظیم مدبر ظاہر کرنا چاہے وہ نظریہ پاکستان، دو قومی نظریہ اور قائداعظم کے نظریات پر تبصرہ شروع کر دیتا ہے اور بانی پاکستان کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے، پاکستان کا مطلب کیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے نعرے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ یہ بھی فرما دیتا ہے کہ قائد نے یہ نعرہ کبھی نہیں لگایا، تو عرض ہے کہ نعرے لیڈر

نہیں عوام لگاتے ہیں اور لیڈر کے نظریات کے مطابق لگاتے ہیں ویسے بھی کب قائداعظم نے روسٹرم توڑ کر، آستین پھاڑ کے، چیختے چنگھاڑتے تقریر کی اور کب نعرے لگائے۔ کاش ہمارے سیاستدانوں نے ان جیسی پر سکون اور موثر تقریر کرنا سیکھی ہوتی اور کیا قائداعظم نے کسی جلسے میں کبھی کسی کو یہ نعرہ لگانے سے منع کیا تھا۔ برصغیر کے مسلمان قائداعظم کے پیچھے اس لیے چلے تھے اور نتائج کی پرواہ کیے بغیر چلے تھے کہ وہ اپنا ایک الگ تشخص چاہتے تھے اس لیے کہ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلامی ملک اور حکومت کے طلب گار تھے جہاں بقول قائد کے وہ اسلامی اصولوں کو آزما سکیں اور یہ صرف قائد کی ہی نہیں بلکہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی خواہش تھی۔ آج ہمارے عوام نہیں لیکن ہمارے نام نہاد لیڈر اس چیز کو متنازع بنا رہے ہیں اور خود کو محب وطن بھی کہہ رہے ہیں۔ حب الوطنی اپنے نظریے سے انحراف نہیں بلکہ اس کا اعتراف ہے روایات اور تہذیب کی پاسداری ہے لیکن ہمارے لیڈر سے لے کر ایک عام آدمی تک سب اس انحراف کا ارتکاب کر رہے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو کراچی آج بھی روشنیوں کا شہر ہوتا جہاں آج موت کا ننگا رقص جاری ہے ہر سیاسی پارٹی دوسری پارٹی کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہے اور ہر ایک امن کا نعرہ لگانے کے باوجود امن کی خواہش سے عاری ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو کئی مہینوں سے جاری یہ قتل و غارت بند ہو چکا ہوتا، دراصل یہاں عام آدمی ہی استعمال ہوتا ہے اور عام آدمی ہی مرتا ہے اور یہی عام آدمی کا قصور ہے کہ وہ خاص آدمی کے اشارے پر سب کچھ کر

گزرتا ہے۔ ہر ایک کو اپنے گناہ کا علم ہے لیکن پھر بھی دوسرے کو بیوقوف سمجھتے ہوئے اپنی بے گناہی کے ثبوت پیش کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔ حکومت جانتی ہے کہ گناہ گار کون ہے اور مجرم کون لیکن اسکے باوجود آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔ ایک کراچی پر ہی کیا موقوف ملک میں ہر جگہ امن و امان کی صورت حال مخدوش ہے بلوچستان کو ہی لیجیے اس مسئلے کو حل کرنے کی کتنی مخلصانہ کوشش ہوئی ہے کیا کسی نے اس مسئلے کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت بھی محسوس کی ہے۔ یہ تو سیاسی صورت حال ہے جہاں حکومت کی جوڑ توڑ آڑے آتی ہے اور اسی جوڑ توڑ سے نافرصتی نے حکومت کی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ لوڈ شیڈنگ کو ہی لیجیے،.بڑھتی ہی جارہی ہے لیکن تدارک کا کوئی امکان اور کوئی کوشش ہوتی نظر نہیں آرہی ابھی ہم ڈیموں کے لیے انتخابِ مقام پر الجھے ہوئے ہیں جبکہ دوسری طرف میلہ لوٹا جارہا ہے۔ کرپشن ہے کہ اپنے عروج پر ہے اور بانگ دُہل ہے، یہاں بھی ہر ایک کرپشن سے نالاں ہے اور کرپٹ سے بھی۔ راشی، مرتشی کے دوزخ میں جانے کا یقین بھی ہے اور رشوت کی.برائی کا اعتراف بھی ہے لیکن دوسرے کے لیے اور شاید اسی مصرفیت کی وجہ سے اپنے گریبان میں جھانکنے کی فرصت نہیں ورنہ اس لعنت پر قابو پانا اگر مشکل ہے بھی تو ناممکن تو نہیں لیکن مسئلہ وہی یعنی خلوص کی کمی۔

اب ذرا معاشرے میں معاشرتی اقدار کی طرف دیکھئے تو وہ بھی معلوم نہیں کتنی

تہذیبوں اور ثقافتوں کے ساتھ خلط ملط کر دی گئی ہیں شادی بیاہ ہی کو لیجئے شادی پاکستان میں ہوتی ہے لیکن رسوم ہندوانہ حالانکہ پنجاب کی رسمیں خیبر پختونخوا اور سندھ کی بلوچستان میں نہیں اپنائی جاتیں ایسا کرتے ہوئے اُن کی اقدار آڑے آتی ہیں لیکن مکمل غیر رسمیں باوجود اس کے کہ وہ دولت کے ضیاع کا باعث ہیں اپنا لی جاتی ہیں ۔ لباس میں جدیدیت میں کوئی حرج نہیں لیکن پورا لباس ہی غیروں کا اپنا لینا کہاں کا انصاف ہے لیکن ہم نے لباس جسے اللہ نے ستر پوشی اور زیب وزینت دونوں کے لیے اتارا صرف زیب وزینت کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے، حالانکہ یہاں بھی ہر ایک لباس کے اصل مقصد سے واقف ہے اور دوسرے پر اعتراض بھی کر رہا ہے اگرچہ اپنے بس کی حدتک وہ خود بھی مجرم ہے یہ تو صرف چند ایک پہلو تھے جن کا تجزیہ کیا گیا ورنہ ہم میں سے ہر ایک اپنی حدتک مجرم ہے کیونکہ ہم نے ایک نیا ملک بنایا تھا، یہاں ہم ایک بہترین معاشرہ تشکیل دے سکتے تھے بالکل اُس نئے گھر کی طرح جسے ہم بہترین طور پر سجانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے وسائل کے مطابق ایسا کرتے بھی ہیں لیکن نیا ملک بنانے کے لیے جس طرح ہم نے آگ اور خون کے سمندر پار کیے ہم نے اُس کو بھلا کر صرف اپنی ذات کو ملک پر ترجیح دی اور آج تک ہم یہی کر رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی بساط کے مطابق برابر کا مجرم ہے اور جب تک ہم اپنے جرم کا اعتراف نہیں کر لیں گے بناؤ اور سدھار کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔ سیاست اور نظریے سے لے کر ایک عام آدمی کے معمولات

تک ہر پہلو کو نظر میں رکھ کر اُسے سدھارنے کی جب تک کوشش نہیں کی جائے گی اور ہر شخص نہ کرے گا تو اسی طرح ہم دوسروں کے دست نگر اور محتاج رہیں گے اور معاشرے میں تضادات اور پھر فسادات جنم لیتے رہیں گے۔ دوسروں کو موردالزام ٹھہرا کر خود کی پارسائی کا پرچار معاملے کا حل نہیں کیونکہ خود ہم دل میں جانتے ہیں کہ ہم سچے نہیں ہیں اور اسی لیے ہم اپنی زبان میں وہ اثر نہیں پاتے جو ہمارے الفاظ کی تاثیر ہونی چاہیے۔ ہم نے اگر اپنے معاشرے کی ازسرِ نو تعمیر نہ کی یا مرمت کا کام ہنگامی اور بنیادی طور پر نہ کیا تو ہم آگے بھی عرصہ دراز تک مسائل سے دوچار رہیں گے۔ ہاں اپنی ذات اور اپنے ادارے کو اپنا پاکستان سمجھ کر ٹھیک کرنے کی ذمہ داری لے لیں تو پورا پاکستان نکھر اور سدھر کر سامنے آئے گا کیونکہ یہاں نہ صلاحیت کی کمی ہے نہ زورِ بازو کی، کمی ہے تو صرف یقین اور خلوص کی اور اسی کمی پر قابو پانا ہی ہماری فتح کا باعث ہوگا۔ دوسروں کی خامیوں کی نشاندہی ضرور کریں لیکن اپنی خامی کی نشاندہی سے بھی آگے بڑھ کر اسے ختم کرنا ہی ہمارے مسائل کا واحد حل ہے۔

امریکا کو احساس دلانا ہوگا

امریکہ نے ایک دفعہ پھر اپنی خصلت دکھائی ہے اور اپنی ناکامیوں کا الزام پاکستان کے سر دھرتے ہوئے بے شمار مطالبات بھی کر دیئے اور اپنی تمام تر کوتاہیوں کا ملبہ پاکستان پر ڈال دیا۔ اس کا سب سے بڑا مطالبہ حقانی نیٹ ورک کے خلاف کاروائی ہے اور یہ مطالبہ بیک آواز کیا گیا ہے اگرچہ زیادہ اہم امریکی جائنٹ چیفس آف سٹاف مائیک مولن کا بیان ہے جس نے کابل میں امریکی سفارت خانے اور انٹر کانٹیننٹل ہوٹل میں ہونے والے دھماکوں کا ذمہ دار آئی ایس آئی اور پاکستان کو قرار دیا ہے۔ کابل ایک جنگ زدہ ملک کا جنگ زدہ دارالحکومت ہے اور امریکہ جانتا بھی ہے کہ وہ ایک قابض ملک ہے اور افغان اپنے ملک پر قبضہ کرنے والے کو نہ کبھی معاف کرتا ہے اور نہ ہی قبضہ طویل ہونے دیتا ہے، وہ اپنی غیرت کی خاطر جان سے گزر جاتا ہے اور اس کی اس فطرت سے امریکہ واقف ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر افغان کرزئی نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود وہ اس جدوجہد کا سہرا پاکستان کے سر باندھ رہا ہے، جبکہ بات دراصل یہ ہے کہ وہ اپنی ''مفتوح وسیع و عریض سلطنتِ کابل'' میں بھی امن قائم رکھنے میں ناکام رہا ہے کیونکہ وہ امریکہ کے علاوہ پوری دنیا کی بدامنی کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔

پاکستان پر حقانی نیٹ ورک کے خلاف کاروائی کا امریکہ کا لایعنی مطالبہ نیا نہیں اور وہ خود بھی مسلسل ڈرون حملوں میں مصروف ہے۔ کچھ عرصے سے اس مطالبے میں اضافہ کیا گیا اور اضافے کے ساتھ ہی پاکستان میں دہشت گرد کاروائیوں میں اضافہ ہوا۔ پہلے کوئٹہ میں ڈی آئی جی ایف سی پھر کراچی میں ایس ایس پی سی آئی ڈی اور پھر نشتر آباد پشاور یں سی ڈینز کی ایک دکان پر خود کش حملہ کیا گیا۔ اس کے بعد پاکستان کے حالات کو مزید خراب ظاہر کرنے کے لیے کوئٹہ میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر ایک اور تنازعہ شروع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اسی کی آڑ لے کر ایران کو بھی بد ظن کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ امریکہ کے لوگ شاید انسانیت پسند ہوں لیکن ان کی حکومت کا ایک ہی اصول ہے لڑاؤ اور مارو اور عرصہ دراز سے وہ اسی اصول پر عمل پیرا ہے۔ وہ پہلے الزام لگاتے ہیں اور خود ساختہ ثبوتوں کی بنا پر حملہ کرتے ہیں پھر انکا میڈیا انتہائی آزادی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی حکومت کے کارنامے کے بارے میں رپورٹ مرتب کرتا ہے کہ ثبوت نہ مل سکے اور الزامات غلط تھے جبکہ یہی میڈیا پہلے اپنی حکومت کو شدومد سے تعاون فراہم کرتا ہے۔ یہی کچھ عراق میں کیا گیا افغانستان میں بھی یہی جنگ لڑی جا رہی ہے اب ایسے ہی الزامات پاکستان کے اوپر لگائے جارہے ہیں اور دباؤ بڑھانے کے لیے امن کی صورت حال کو خراب سے خراب تر کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مائیک مولن کو کابل دھماکوں کی تکلیف اس

لیے ہوئی ہے کہ وہ امریکی سفارت خانے اور انٹر کانٹینینٹل ہوٹل میں تھے ورنہ اُسے کسی افغان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے لیکن اسکو یا اسکی حکومت کو سی آئی اے کی کاروائیاں نظر نہیں آرہیں جس نے ہمارے عوام اور ہماری فوج کو گاجر مولی کی کھیت سمجھا ہوا ہے کہ کاٹو اور کاٹو اور بس۔ چترال سکاوٹس پر حملہ ابھی تقریباً ایک ماہ پہلے کی بات ہے اور یہ حملہ افغان حدود سے کیا گیا لیکن یہ اوبامہ، مائیک مولن، ڈیوڈ پیٹریاس اور حتیٰ کہ جے کارنی کسی کے خیال میں تخریب کاری نہیں تھی اس لیے جواب بیک آواز چیخ اٹھے ہیں اُس وقت چپ رہے۔ مہمند ایجنسی میں فوجی اہلکاروں کو قطار میں کھڑا کرکے گولی مار کر شہید کرنے کے واقعے کو بھی امریکہ دہشت گردی کے زمرے میں نہیں لارہا۔ پاکستان پچھلے گیارہ سال سے امریکہ کی جنگ لڑتے لڑتے اور بقول ہماری وزیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان دنیا کو محفوظ بناتے بناتے خود انتہائی غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ اس جنگ میں ہم نے نہ صرف اپنا امن کھویا، ہزاروں پاکستانیوں کی جانیں کھوئیں بلکہ اپنے وسائل اور اپنی معیشت کی بربادی سے اپنی آنے والی نسلوں کو ابھی سے سالہاسال پیچھے کردیا ہے۔ ترقی معکوس کے اس عمل میں ہماری تجارت ہماری معیشت سب بہہ گئی لیکن جناب اوبامہ نے اس سب کچھ کے باوجود پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان سنجیدگی دکھائے تو مل کر کام کرتے رہیں گے جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس ''کام'' میں امریکہ پاکستان کا محتاج ہے، وہ ہمیں جتنی امداد دے رہا ہے ہم اُس کی بہت بڑی قیمت ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کا اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ اس وقت بھی.برادرانہ نہ سہی قدرتی ضرور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پر امن افغانستان پر امن پاکستان کے لیے بہت ضروری ہے لیکن اُس افغان عوام کو پاکستان کے خلاف بھڑکانے کے لیے امریکہ اور افغان حکومت بشمول بھارت تندہی سے کوشاں ہیں جس کی ایک نسل پاکستان میں پیدا ہوئی، اسکے وسائل استعمال کرکے پلی.بڑھی اور پڑھی لکھی اُسکو وہ سارا وقت بھلا کر پاکستان کے خلاف کر دیا جائے۔ امریکہ نے پاکستان پر ''پراکسی وار'' کا الزام لگایا ہے جبکہ وہ خود پاکستان کو اپنا اتحادی قرار دینے کے باوجود اپنے مقابلے میں اس چھوٹے اور کمزور ملک کے خلاف کئی محاذوں پر سرگرم عمل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خود امریکہ اس ساری دہشت گردی کا ذمہ دار ہے جو پاکستان اور افغانستان میں ہو رہی ہے بلکہ اس کا وجود ہی ان سارے حالات کا باعث ہے آج اگر وہ اس علاقے سے نکل جائے تو حالات خود بخود معمول پر آجائیں گے۔ امریکہ تو اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے اور عراق کے کیمیائی ہتھیاروں اور افغانستان میں اسامہ کی موجودگی کے بہانے کی طرح اگر حقانی گروپ کو بطور بہانہ یا بطور چارہ استعمال کرکے پاکستان کے خلاف کاروائی کی گئی تو ہمیں بھی اس کے لیے خود کو تیار کر لینا چاہیے اگرچہ امریکی بیانات کے خلاف پاکستان نے رد عمل ظاہر تو کیا لیکن قوم جس توانائی سے یہ رد عمل چاہتی تھی وہ نظر نہ آئی۔ جس طرح حکومت دوسرے ممالک کے سفیروں کو کسی ایسے بیان پر دفتر خارجہ طلب کر سکتی

ہے امریکی سفیر کو اسی طرح احتجاج کے لیے کیوں طلب نہ کیا گیا۔ کیا حقیقتاً ہم اپنی آزادی اور خود مختاری گروی رکھ چکے ہیں ۔ ہماری وزیر خارجہ نے کہا کہ الزام تراشی سے امریکہ پاکستان جیسے اتحادی کو کھودے گا لیکن کسی عملی احتجاج اور اقدام کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ۔ اقدام سے میری مراد ہر گز امریکہ کے ساتھ جنگ نہیں لیکن کیا ہم امریکہ کو جو تعاون فراہم کر رہے ہیں اُس پر نظر ثانی نہیں کی جا سکتی، اگر بقول امریکہ ہم پرائی وار ہی لڑ رہے ہیں تو جنگ سے ہاتھ کھینچ کر کیا اُسے اپنی اہمیت کا احساس نہیں دلایا جا سکتا اور یوں ہم جو پیسہ اور وسائل امریکہ کی جنگ میں جھونکے جا رہے ہیں وہ ترقی کے لیے استعمال کر کے واقعتاً ملک کو باعزت ملکوں کی صف میں لا کھڑا کیا جا سکے گا اور امریکہ نے جس امداد کو حقانی نیٹ ورک کے خلاف کاروائی سے مشروط کر لیا ہے اس امداد کا احسان ہی نہ لیا جائے ویسے بھی ہم امداد سے زیادہ اپنے وسائل کی تباہی اور جانوں کا ضیاع کر رہے ہیں ۔ ہمیں اپنی عزت کو خود بحال کرنا ہے جو بقول انکی فوج کے سربراہ کے ہم خطے میں کھو رہے ہیں اگر امریکہ اپنے مفادات کے تحفظ میں مصروف ہے تو پھر ہمیں بھی عزت سے جینے اور اپنے مفادات کے تحفظ کا مکمل حق ہے اور ہمیں کسی بھی طریقے سے سہی امریکہ کو یہ احساس دلانا ہی ہوگا۔

تاریخ کا دھارا موڑ دیجیے

آخر اوبامہ نے کہہ ہی دیا کہ حقانی نیٹ ورک کے ساتھ پاکستانی رابطوں کے بارے میں انٹیلیجنس اطلاعات زیادہ مضبوط نہیں تاہم پھر بھی پاکستان سے ڈو مور کا مطالبہ جاری رہے گا۔

اگرچہ امریکی لہجے میں تبدیلی محسوس کی جارہی ہے اور مائیک مولن کے بیان کے بعد جو تیزی اور نخوت دکھائی جارہی تھی اُس میں کچھ کمی آئی ہے لیکن اب بھی وہ پاکستان کے اوپر دباﺅ ڈالنا اپنا فرض سمجھ رہے ہیں جس کا اظہار اوبامہ کے بیان سے ہو رہا ہے مائیک مولن تو رخصت ہوئے اب دیکھئے جنرل مارٹن ڈیمپسی ان کے مکروہ عزائم کو کس انداز میں آگے لے کر چلتے ہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ امریکی صدر جو بھی ہو، ان کی فوج کا سربراہ جو کوئی بھی ہو فی الحال وہ طاقت کے نشے میں مست مسلمانوں کے خلاف اسی طرح نبرد آزما رہیں گے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ خود مسلمان اُن کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں ۔کابل میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے کرزئی اس کے اشارے پر ہی پاکستان کو موردِالزام ٹھہرارہا ہے۔برہان الدین ربانی کی خود کش دھماکے میں ہلاکت سے لے کر ہر دھماکے کی ذمہ داری وہ پاکستان پر ڈال رہا ہے اور آئی ایس آئی کو ذمہ دار

قرار دے رہا ہے۔ افغانستان میں امریکہ کو اپنی شکست کے لیے کوئی جواز چاہیے کیونکہ وہ جس نشے میں مست ہو کر افغانستان آیا تھا کہ روسی جنگ کے بعد تباہ حال اس ملک کو بڑی آسانی سے فتح کرلے گا لیکن ایسا ہوا نہیں اور وہ لوگ جو جدید دنیا کی تعلیم سے کم آشنا تھے جن کا ایک بہت بڑا تناسب خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش لوگوں پر مشتمل ہے ان ہی لوگوں نے اس سُپر پاور کو ناکوں چنے چبوا دیئے اور فی الوقت گیارہ سال تک جنگ لڑنے کے بعد بھی وہ انہیں زیر نہ کرسکے اور مستقبل قریب میں بھی اس کے آثار نظر نہیں آرہے تو اس کو اس عظیم الشان شکست کی کوئی توجیہہ تو چاہیے ہی تھی اور آئی ایس آئی کی صلاحیتوں کا اُسے بھی اندازہ بھی ہے اور دنیا کو بھی لہٰذا اُس نے کیا یہ کہ ہر واقعے کا ذمہ دار آئی ایس آئی کو گردانا شروع کردیا چونکہ اُس کو اس بات کا بھی مسلسل دکھ ہے کہ پاکستان نے ایٹمی قوت کیوں حاصل کی اور اس نے اس بم کو پہلے ہی دن اسلامی بم کا نام دیا۔ امریکہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ آئی ایس آئی اور پاکستان کی مدد کے بغیر افغانستان میں کامیابی حاصل کرنا تو درکنار اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا لہٰذا بہر صورت دباؤ بڑھایا جائے اور پاکستان کے خلاف بہانے تراشے جائیں۔ حقانی نیٹ ورک بھی ایسا ہی ایک بہانہ ہے جسکے ساتھ روابط کو بہانہ بنا کر امریکہ آگے بڑھنا چاہ رہا ہے۔ پاکستان کے ساتھ یہ روابط تو خود صدر امریکہ کے مطابق بھی ثابت شدہ نہیں ہیں جبکہ دوسری طرف یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہی حقانی نیٹ ورک بمعہ دوسرے مجاہد

لیڈروں اور گروپوں کے امریکہ کی پیداوار ہیں اور اس کے منظور رہے ہیں لیکن آج جب وہ اس کے مفادات سے متصادم ہو رہے ہیں تو وہی جلال الدین حقانی جو وائٹ ہاؤس تک پہنچ رکھتے تھے آج ان کی نظروں میں متعوب ٹھہرے ہوئے ہیں اور انہی سے روابط کے غیر ثابت شدہ الزام میں پاکستان کے خلاف گرمی بھی پیدا کی جارہی ہے اور پاکستان پر ایکٹ اور فوجی آپریشن کے لیے دباؤ بھی بڑھایا جارہا ہے جبکہ اس سے پہلے بھی پاکستان پچھلے گیارہ سال سے امریکی مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے اور اپنے شہریوں فوجیوں ،پولیس اور دیگر اہلکاروں کی جانوں کی قربانی دے رہا ہے لیکن اس کے باوجود. امریکہ جب چاہے پاکستان پر برس پڑتا ہے۔ یہ برسنا صرف زبانی نہیں ہوتا بلکہ عملاً بھی ہمارے شہری اسکے ڈرون حملوں کی زد میں رہتے ہیں اور اب تک وہ 258 ڈرون حملے کر چکا ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں عام لوگ مارے گئے۔ دراصل امریکہ ہماری ہی مدد سے ہمارے ہی خلاف جنگ لڑ رہا ہے بظاہر تو اس کا تیل ٹینکروں میں جاتا ہے لیکن اس کے ٹریلر اور ٹینکرز افغانستان پہنچتے پہنچتے راستے میں اور بالخصوص سرحدی علاقوں میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں اس کا اندازہ لگانا اس لیے مشکل نہیں کہ اتنی مقدار میں اسلحہ، گولہ بارود ،گاڑیاں اور تنخواہیں کیسے دہشت گردوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ امریکہ اپنی اس جنگ کے لیے ہمارا مکمل محتاج ہے پھر ہم کیوں اُس کی دھمکیوں میں آجاتے ہیں کیا ہمارے اندر بھی وہ کمزوری ہے جو قوموں کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ پچھلے تجربات کی

روشنی میں اے پی سی کے نتائج سے اگرچہ بہت ساری امیدیں لگا لینا بھی عقل مندی نہیں ہے لیکن اتحاد کے اس ایک مظاہرے نے کم از کم امریکہ کو اپنا لہجہ بدلنے پر مجبور کر دیا اور وہ روابط جن کا الزام لگا کر بظاہر وہ ہم پر حملہ کرنے کو تیار تھا اُن الزامات کی صحت پر اب وہ شک کا اظہار کر رہا ہے۔ اس کی وزیر خارجہ جو دہشت گردی کے خلاف جنگ اور کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے بھارت کو یاد رکھ کر پاکستان کو بھول رہی تھیں اب پاکستان کے کردار کا کچھ ہی سہی اظہار کر رہی ہیں۔ لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس اتفاق کو برقرار رکھ سکیں اور کم از کم دنیا کو اور امریکہ کو یہ پیغام دے سکیں کہ پاکستان پر حملہ اتنا آسان نہیں۔ اسکی فوج تو فوج اسکے عوام بھی یہ ٹکر لینے کی ہمت رکھتے ہیں اور ہماری امن پسندی کو ہماری مجبوری نہ سمجھا جائے اور امریکہ اگر افغانستان، جو ایک ''بے فوج'' ملک ہے میں گیارہ سال سے لڑتی ہوئی جنگ نہ جیت سکا بلکہ بدترین شکست سے دوچار ہے تو پاکستان کی پیشہ ور فوج کو کیسے زیر کر سکتا ہے۔ اب حکومت پاکستان کو مزید ہمت کرنے کی ضرورت ہے اور امداد کی لعنت سے بھی خود کو آزاد کرنا ہے۔ بلکہ ہمیں تو امداد کی ضرورت ہی نہیں اگر ہمارے اہل سیاست اپنے اثاثے اپنے ہی نام سے پاکستان میں منتقل کر دیں اور یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ ہم نے تاریخ میں اپنا نام بہادر رہنمائوں اور عظیم قوم کی حیثیت سے رقم کرنا ہے اور نہ صرف اوبامہ اور امریکہ کا لہجہ بدلنا ہے بلکہ تاریخ کے الفاظ بھی بدلنے ہیں

کیونکہ خداتعالیٰ ان قوموں کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت نہیں بدلتے۔

پاکستان دشمنوں کی پناہ گاہ افغانستان

افغانستان اور پاکستان دوپڑوسی ہی نہیں اسلامی ممالک بھی ہیں دونوں ملکوں کے تعلقات قدرتی اور فطری ہیں۔ افغان خانہ بدوش خاندان عرصہ دراز سے شدید سرد موسم سے بچنے کیلئے خیبر پختونخواہ کے گرم علاقوں مثلاً پشاور، چارسدہ، مردان وغیرہ میں آتے تھے یہ بالکل معمول کا عمل تھا اور کوچی کہلانے والے یہ لوگ موسم بہتر ہوتے ہی واپس چلے جاتے تھے نہ ہی کسی بدامنی کا باعث بنتے تھے اور نہ فساد کا۔ افغانستان کے کچھ حکمران پاکستان کے متعلق مختلف خیالات رکھ سکتے تھے لیکن اس کے خلاف کوئی منصوبہ نہ بناتے تھے نہ رکھتے تھے۔ روس کے خلاف جنگ بظاہر تو افغانوں نے جیتی لیکن اس لیے کہ ان کی پشت پر پاکستان تھا۔ پاکستان نے لاکھوں افغان مہاجرین کو پناہ دی انہی میں سے ایک آج کا افغان صدر حامد کرزئی بھی تھا۔ افغان عوام آج بھی پاکستان کے اس احسان کو یاد کرتے ہوں گے مگر اس کے حکمران آج غیروں کے اشاروں پر اس محسن کے خلاف نبرد آزما ہیں جس نے کئی دہائیوں تک اپنی معیشت، معاشرت، ثقافت، تعلیم غرض ہر شعبے پر تیس لاکھ رجسٹرڈ اور کئی لاکھ ان رجسٹرڈ مہاجرین کا بوجھ برداشت کیا بلکہ ابھی بھی کر رہا ہے۔ پشاور کے بازار اور گلیاں اب بھی ان مہاجرین سے بھری ہوئی

ہیں نہ شہر میں ترتیب نظر آتی ہے نہ منصوبہ بندی اور نہ تنظیم۔ پاکستان میں ہونے والے دھماکوں اور دہشت گردی میں وہ لوگ بہت حد تک ملوث ہیں جو افغان مہاجرین کے روپ میں یہاں آئے چاہے وہ ازبک تھے، تاجک تھے، یا قازق یا عرب تھے اوراب بھی یہ آنا جانا لگا ہوا ہے اور اسی کی آڑ لے کر عالمی طاقتیں اپنے مقاصد کے حصول کیلئے نہ صرف اپنے ایجنٹ پاکستان میں داخل کر رہی ہیں بلکہ پاکستان کے مخالفین کو بھی افغانستان میں نہ صرف پناہ دی جارہی ہے بلکہ ان کی باقاعدہ تربیت بھی کی جارہی ہے انہیں تمام سہولیات مہیا کی جارہی ہیں اور ان کی باقاعدہ پشت پناہی کی جارہی ہے۔ بلوچستان میں چلنے والی تمام بد امنی افغانستان سے کنٹرول ہو رہی ہے اور یہ سب کچھ بھارت اور امریکہ کے اشاروں پر ہو رہا ہے۔ بلوچستان میں علیحدگی پسند تحریکوں کو تمام تر مالی معاونت افغانستان کے راستے مہیا کی جارہی ہے اور اسلحہ بھی ادھر ہی سے آرہا ہے۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ براہمداغ بگٹی افغانستان میں ہی بیٹھ کر پاکستان کی سا لمیت کے خلاف سرگرم عمل ہے اور بلوچستان افغانستان طویل سرحد سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ بھارت اس معاملے میں نہ صرف اس کا مددگار ہے بلکہ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اسے استعمال کر رہا ہے۔ اسے براہمداغ سے بھی کوئی ہمدردی نہیں لیکن اس کی خواہش پاکستان توڑ کر اپنی پاکستان دشمنی نکالنی ہے۔ حربیار اگر بھارتی وزیر اعظم کو پاکستان کے اوپر سے اڑتے ہوئے بلوچستان کے حالات دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور افغانستان سے

زیادہ بلوچستان کی فکر کرنے کو کہتا ہے تو کسی رشتے ناطے اور امید سے ہی کہتا ہے اور بھارت اس سارے کھیل میں انتہائی آسانی سے اپنے دوست اور نمک خوار حامد کرزئی کی مدد سے مصروف ہے۔ حامد کرزئی اُسے پاکستانی سرحد پر قونصلیٹس کی قطار کھڑی کرنے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ ہر قسم کی سہولت مہیا کرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ ایمان نہ لانے والے کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے اور ہندو اپنی فطرت اور خصلت کے عین مطابق اسے بھی ڈسے گا۔ دوسری طرف یہی افغانستان جو بھارت اور امریکہ کی پیروی میں اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعہ کا ذمہ دار پاکستان کو سمجھتا ہے خود وہ پاکستان میں دہشت گردی کرنے والوں کو پناہ دیئے ہوئے ہے۔ براہمداغ بگٹی نے سوئٹزرلینڈ میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کیلئے بھارتی پاسپورٹ پر افغانستان سے سفر کیا۔

افغانستان میں حامد کرزئی کی حکومت خود افغانستان پر تو حکومت کر نہیں سکتی تاہم کرزئی صاحب اپنی صدارت قائم رکھنے کیلئے ہر قسم کی امریکی خدمات سرانجام دینے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ پاکستان میں امن وامان کے مسائل پیدا کرنا امریکی منصوبہ بندی کا حصہ ہے کیونکہ جونہی امن وامان کی صورت حال بہتر ہوگی پاکستانی عوام کی توجہ اپنے بین الاقوامی مسائل پر مرکوز ہوگی، خارجہ پالیسی بھی زیر نظر آئے گی تو امریکہ کے ساتھ تعلقات پر غور کیا جائے گا، معاشی حالت بہتر ہوگی تو امریکی امداد سے گلوخلاصی ہوگی اور پھر

یقیناً امریکی حکم اور محکومی سے بھی جان چھوٹے گی اور وہ امریکی مفادات کے تحفظ کیلئے مجبور نہ ہوں گے اور اس طرح یہ سلسلہ چل نکلے گا جو قومی خود مختاری کی بحالی پر منتج ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں امریکہ اور امریکہ نواز حامد کرزئی پاکستان دشمنوں کو ہر قسم کی تربیت اور سہولت بہم پہنچارہے ہیں۔۔براہماغ ہو یا منگل باغ سب ان کے منظور نظر ہیں۔ منگل باغ جب گھیرے میں آتا ہے تو افغانستان کی طرف بھاگتا ہے۔ رپورٹس کے مطابق اس نے ننگرہار صوبے میں نازیان شنواری میں امین شاہ شنواری کے پاس پناہ لی۔ مولوی فضل اللہ سوات سے بھاگتا ہے تو افغانستان میں ہی اسے پناہ ملتی ہے اور ادھر ہی سے اس نے چترال سکاؤٹس پر حملہ کیا۔

افغانستان بغیر کسی ثبوت کے صرف امریکہ اور بھارت کی شہ پر ہر الزام پاکستان کے سر تھوپتا ہے اگر وہ خود اپنے اعمال پر بھی غور کرلے تو بہتر ہوگا۔ بھارت اور امریکہ کا جوڑ افغانستان سے ہرگز فطری نہیں بلکہ یہ صرف اپنے مفادات کیلئے ہے اور مفادات کے حصول کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا لیکن رہنا پاکستان اور افغانستان نے مل کر ہے کیونکہ سرحدیں ہماری مشترک ہیں،دین اور مذہب ہمارا ایک ہے،خدا اور رسول ہمارا ایک ہے، ثقافتی اور مذہبی رشتے ہمارے ہیں پھر آخر کیوں افغان حکومت ہم سے ہی نبرد آزما ہے وہ جانتے ہیں کہ بھارت کا ریکارڈ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کتنا گھناؤنا ہے اور جہاں تک

طالبان کی محفوظ پناہ گاہوں کا تعلق ہے جو بقول حامد کرزئی کے پاکستان میں ہیں اور وہ نیٹو افواج سے درخواست کر رہے ہیں کہ اس کی طرف توجہ دیں تو کیوں نہ وہ خود افغانستان میں حالات بہتر کرلیں اور طالبان سے جو درحقیقت افغانی ہیں بات کریں بجائے امریکہ اور بھارت سے مدد لینے کے ان سے ترقیاتی کاموں میں مدد لیں، امن و امان پر توجہ دیں اور تمام افغان مہاجرین کو واپس لے جائیں تو پاکستان میں بھی امن و امان قائم ہو جائے گا۔ اگر افغانی پاکستان میں دہشت گردی کے ذمہ دار نہیں ہیں اور ان کے ساتھ آئے ہوئے عرب، تاجک، ازبک سب بھی چلے جائیں تو یوں ہمارے لیے بھی ان بے شمار قومیتوں میں سے دوست دشمن کی پہچان آسان ہو جائے گی۔ ہمارے مجرموں کو پناہ دینا بھی چھوڑ دیں اور یہ بھی یاد رکھیئے طالبان بنیادی طور پر افغان ہیں لہذا مزید طالبان بنانا چھوڑ دیں حالات خود بخود بہتر ہو جائیں گے۔

ون پوائنٹ ایجنڈا

یوں تو ہم بہت سارے مسائل سے دوچار ہیں اور فی الحال مسائل کے حل کی بجائے ان میں اضافہ ہی ہوتا نظر آرہا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسائل کے حل کی کوئی سنجیدہ کوشش ہو ہی نہیں رہی اور اگر غور کریں تو ان مسائل کی جڑ وہ بد دیانتی ہے جو ہمارے معاشرے میں نیچے سے لے کر اوپر تک ہر ایک کے کردار کا حصہ بن چکی ہے اگر سچ پوچھا جائے تو ہم میں سے کوئی پارسائی کا دعویٰ کرنے کے قابل نہیں رہا ہے لیکن جب یہی کرپشن اور رشوت خوری اعلیٰ حکومتی درجے پر ہوتی ہے تو ادارے تباہ کر دیتی ہے اور ملک کو صدیوں پیچھے دھکیل دیتی ہے اور یہی کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ ہر ایک کو اپنے بینک بیلنس کا خیال ملک سے بڑھ کر ہے اس دوڑ میں ملک کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملک کے انتہائی اہم اداروں کو بیچ کر کھایا گیا یا ایسا کیا جا رہا ہے بغیر یہ سوچے کہ ان اداروں کے بغیر ملک اپاہج ہو رہا ہے۔ آج کل ریلوے کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے کیا وہ ایسا ہی نہیں ہے جیسے ایک دشمن ملک کے اس طرح کے اداروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ریلوے زمانہ امن سے لے کر حالت جنگ تک جو اہم کردار ادا کرتا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں امن میں یہ ایک سستی سواری ہے اور جنگ میں بھاری سامان جنگ کی ترسیل کا اہم ذریعہ لیکن بقول لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس عظمت

حیات کے ڈیڑھ سو سالہ پرانا ریلوے کا نظام کرپٹ افسروں نے تباہ کر دیا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں وہ ریلوے جس نے عرصہ دراز تک غریب اور متوسط طبقے کو سستی سواری فراہم کی وہ آج بند ہونے کے قریب ہے۔ روزانہ بند ہونے والی گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، تین سو انجن خراب ہو چکے ہیں، سینکڑوں ملازمین بے روزگار بیٹھے ہوئے ہیں اور اِن حالات میں بھی ریلوے افسران ایک ہی شہر میں ایک سٹیشن سے دوسرے پر تبادلے کے لیے کوشاں ہیں اور وجہ صرف یہ ہے کہ اس دوسرے سٹیشن پر آمدنی زیادہ ہے۔ ظاہر ہے اسی کرپشن کا پیٹ بھرنے کے لیے ہی ریلوے کے سارے وسائل وقف ہو چکے ہیں۔ ریلوے ایک ایسا ادارہ ہے جو حکومت کے لیے بھی آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہے لیکن اس وقت خود یہ ادارہ حکومت کا سو ارب روپے کا مقروض ہے اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے تو اِس قرض کا مستقبل قریب تو کیا مستقبل بعید میں بھی ادا ہونا ناممکن ہے۔ قومی نوعیت کے اس انتہائی اہم ادارے کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ شدید قسم کا قومی جرم ہے لیکن اس سے بھی بڑا جرم تو یہ ہے کہ ان مجرموں کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں اور ایک منافع بخش ادارہ نا صرف ناکارہ ہو گیا ہے بلکہ ملکی معیشت پر بوجھ بن چکا ہے۔ یہ تو صرف ریلوے کی تباہی کا ایک انتہائی مختصر اور سرسری سا جائزہ ہے لیکن دوسرے قومی اداروں کا حال بھی کچھ مختلف نہیں پی آئی اے جسے کبھی واقعی باکمال لوگوں کے لیے لاجواب سروس سمجھا جاتا تھا آج انتہائی خسارے

میں جارہی ہے بلکہ اکثر اوقات بین الاقوامی سطح پر قوم کے لیے شرمندگی کا باعث بن جاتی ہے لیکن انتہائی مخدوش حالات میں بھی اس اہم قومی ادارے کے افسران انتہائی ڈھٹائی سے اعلیٰ ترین تنخواہیں وصول کر رہے ہیں اور مسلسل اپنے بینک بیلنس میں اضافہ کر رہے ہیں اس کے لیے وہ ملک و قوم کو خاطر میں توکیا وہم و گمان میں بھی نہیں لاتے اور ہر ایک اپنی ذات کے لیے کوشاں ہے۔ حکومت اداروں سے زیادہ اپنے من چاہے لوگوں کی ترقی کے بارے میں فکر مند ہے قومی ترقی کے کام نہ صرف رکے ہوئے ہیں بلکہ موجود منصوبوں اور اداروں کو بھی کرپشن کی عفریت کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ منافع بخش قومی اداروں کو ملکی معیشت پر بوجھ بنا دیا گیا ہے کرپشن کی ایک نہ بھولنے والی مثال تو سٹیل ملز کی بلا مبالغہ اونے پونے فروخت کی کوشش تھی ظاہر ہے اتنے بڑے سودے اور منصوبے حکومتی نظروں سے اوجھل تو نہیں رہ سکتے اور اگر رہ جائیں تو یہ کرپشن سے بھی بڑا جرم ہے۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرات کے کنارے پیاسے کتے کی مرنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں تو ہماری حکومتیں ہزاروں لاکھوں افراد کے بھوکے سونے اور بھوکے بلکنے مرنے کی ذمہ داری کیوں نہیں لیتے۔ بات اُس کردار اور قوت ایمانی کی ہے جسے ہم نے اپنے بزرگوں کے ساتھ ہی دفن کر دیا ہے۔ اگر آدھی دنیا پر محیط سلطنتوں پر حکومت کرکے بھی سادہ ترین زندگی گزارنے کے باوجود ایک دنیا اُن سے کانپتی تھی تو اس کی وجہ وہ بے مثال کردار تھا جس کا اعتراف ہر زمانے میں دنیا نے کیا۔ دولت سے زیادہ ان کو

عزت عزیز تھی اور اسی لیے مال وزر نے ان کو کبھی متوجہ تک نہ کیا لیکن آج ایک عام عہدے پر فائز افسر بھی کروڑوں کا مالک بننے کے چکر میں حرام اور حلال کا فرق بھلا بیٹھا ہے۔

بات ریلوے میں کرپشن سے شروع ہوئی تھی لیکن یہ واحد ادارہ نہیں جسے ہم نے تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کر دیا ہے اگر ہم آج بھی سوچ لیں کہ پاکستان ہے تو ہماری عزت بھی ہے اور آسائش بھی تو میرے خیال میں اس ادارے کو بشمول دوسرے اداروں کے بچانے کے لیے لمبے چوڑے اور پیچیدہ منصوبے بنانے سے زیادہ اس سوچ کو پروان چڑھانا ہوگا اور پھر اسے نافذ کرنا ہوگا کہ ہم نے ملک کو خود پر فوقیت دینی ہے، ہم نے ہر حال میں کرپٹ اور راشی اہلکاروں کو سزا دینی ہے چاہے یہ اہلکار افسر ہوں یا ماتحت یا پھر وزیر اور مشیر۔ جب تک ملک کے لیے سوچنے اور حرام اور حلال کی تمیز کی سوچ کو پروان نہیں چڑھایا جائے گا تب تک ہمیں کسی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ کرپشن ختم کرنے کے لیے صرف ون پوائنٹ یعنی یک نکاتی ایجنڈا یہی ہونا چاہیے کہ ہر راشی کو انتہائی سخت سزا دی جائے گی اور چونکہ حکومت خود اس کرپشن میں حصہ دار ہی نہیں بلکہ کلیدی کردار ہے لہٰذا اس کے لیے ہماری عدالتوں کو ہی وہ کردار ادا کرنا ہوگا جو اسلامی نظامِ عدل کا خاصہ ہے اور یہ سزائیں دیتے ہوئے کسی تفریق کو روا نہ رکھا جائے۔ بڑا اور چھوٹا، پسندیدہ اور ناپسندیدہ سب کو ایک ہی

ترازو میں تولا جائے تو تب ہی ہم اپنے اداروں کو بچا سکیں گے۔

امریکہ ! ہر مسلمان دہشت گرد نہیں

جمہوریت ،انسانی حقوق ، شخصی آزادی ، قانونی بالادستی نجانے فریبِ مغرب نے تہذیب کے نام پر دنیا کو کیسے کیسے لوٹا ہے۔ اسے جنگ میں جھونکا ہے، خون خرابہ اور قتل وغارت گری کی ہے اور ان تمام اصولوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ امریکہ خود کو دنیا میں انسانی حقوق کا ٹھیکہ دار سمجھتا ہے مگر دور دیسوں میں بحالی امن کے نام پر خون کی ندیاں بہائی گئیں اور خود یہی امریکہ اپنے شہریوں کے ساتھ جس تعصب کا برتائو کرتا ہے وہ مثالی ہے۔ ستمبر 2001 میں نیویارک میں ہونے والی دہشتگردی کے ڈرامے کے بعد جس طرح امریکی مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا وہ بذات خود ایک بڑا جرم ہے وہ بھی اس ملک میں جس کی ترقی میں وہ برابر شامل رہے، جہاں وہ نسل ہا نسل سے آباد ہیں اور خود کو مکمل امریکی کہتے ہیں لیکن امریکی ان کو اس حق کا اہل ہی نہیں سمجھ رہے۔ 11/9 کا واقعہ جدید دنیا کی تاریخ کا وہ تاریک ترین باب ہے جس میں خود تو تین سے پانچ ہزار جانیں گئیں اگرچہ یہ بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی لیکن ان جانوں کا بدلہ لینے کیلئے اس تعداد سے کئی گنا زیادہ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا اور جارہا ہے۔ خود امریکی مسلمان مشکوک بنا دیئے گئے اور وہ مسلسل پولیس ، ایف بی آئی اور سی آئی اے کی نظروں میں ہیں ان کی نجی زندگی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔
شخصی

آزادی کے علمبردار ملک میں ان سے یہ حق چھین لیا گیا ہے، یہ آزادی نہ گھر میں ہے نہ راستے میں نہ دفتر اور نہ سکول کالج میں، اب کچھ امریکیوں کو بھی شاید احساس ہونے لگا ہے کہ وہ اپنے مسلمان شہریوں کا اعتماد کھوتے جارہے ہیں اور اسی لیے اب ان کا پریس کبھی کبھی اس موضوع پر بولتا ہوا دکھائی دے رہا ہے لیکن یہودیوں کے زیر اثر میڈیا اور پریس کا بھی ایک بڑا حصہ ابھی حیلے بہانے سے اور کھلم کھلا دونوں طرح سے اس تعصب کو ابھارنے میں مصروف ہیں۔ خود حکومتی حلقوں اور سینٹ میں بھی یہ لابی سرگرم عمل ہے۔ The Christian Science Monitorکے سروے کے مطابق اڑتیس فیصد امریکیوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ دوسرے کسی بھی مذہب کی نسبت اسلام بدامنی کا زیادہ حامی ہے جبکہ پنتالیس فیصد لوگوں نے اس خیال کی مخالفت کی۔ اس زیادہ تناسب کے باوجود نیویارک پولیس مسلسل مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھ کر نظر میں رکھے ہوئے ہے۔ ایک ریپبلکن سینیٹر لنڈسے گراہم کے مطابق مسلمانوں کو تعصب اور الزامات کا سامنا ہے کیونکہ یہ حقیقی امریکی نہیں اور اس نے صاف اور واضح وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ کیونکہ یہ مسلمان ہیں اور اسی مسلمان ہونے ہی کی وجہ سے ان کو ہر مقدمے میں بآسانی ملوث کر دیا جاتا ہے۔ 11/9کے بعد تو ان مسلمانوں کو قربانی کا بکرا سمجھ لیا گیا ہے۔ تھامس پیریز شہری حقوق کیلئے اسسٹنٹ اٹارنی جنرل ہے اس نے کہا کہ 11/9کے بعد ان کے محکمے کے پاس ایسے کیسز آئے کہ مساجد کو بند کرنے کی کوشش کی گئی، دفاتر اور جائے کار پر مسلمانوں کو

اپنا لباس پہننے پر اور عبادت کے نظام الاوقات پر توہین اور تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہا ں تک کہ بچوں کو سکول گرائونڈ میں غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے یہ اعداد و شمار میں شائع ہوئے اور امریکی مسلمانReligion اور اعترافات اکیس اکتوبر کے ای پیپر وکیل فرحانہ خیرا کے مطابق اس تعصب میں پچھلے ماہ سے اضافہ ہوا ہے۔ اضافے کی وجہ پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ امریکی حکومت اور عوام تیزی سے پھیلتے ہوئے اسلام سے خوفزدہ ہیں اور اسی لیے ہر طریقہ آزمارہے ہیں لیکن وہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں کرپا رہے۔ دراصل وہی تعصب جو امریکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے اس میں امریکی اور غیر امریکی کی تخصیص نہیں وہ اسلام کے پھیلائو سے خائف ہے اور یہی خوف اس کی تشویش میں مسلسل اضافے کا باعث ہے۔ سلام المرایتی نے لاس اینجلس ٹائمز میں مسلمانوں کے خلاف تعصب اور ان کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا رویہ ان فاصلوں کو بڑھا رہا ہے۔ اس نے ایف بی آئی کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیا جس کے مطابق امریکی مسلمان ساتویں صدی کا اسلام اور طرز بودوباش امریکہ میں لانا چاہتے ہیں، رپورٹ میں اسے تہذیبی جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ سلام المرایتی جو کہ خود بیس سال تک قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ منسلک رہا ہے اور مسلم پبلک افیئرز کا صدر بھی ہے کے مطابق اس طرح کی رپورٹیں امریکی مسلمانوں اور دیگر امریکیوں کے درمیان خلیج کو بڑھا رہی ہیں جبکہ اصل کام

رپورٹ مرتب کرنا نہیں بلکہ اس خلیج کو پاٹنا ہے۔ مسلمان اس معاملے میں مکمل طور پر تعاون کر رہے ہیں اور انہی کی مدد سے القاعدہ کے دہشت گردی کے چالیس منصوبے نا کام بنائے گئے۔ اوپر دیئے گئے تمام حوالے خود امریکی میڈیا سے لیے گئے ہیں اور بغیر کسی مبالغہ آمیزی کے من و عن بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بظاہر صرف چند ایک جھلکیاں ہیں ورنہ چھوٹے موٹے واقعات اس سے کہیں زیادہ ہی ہیں۔ نماز و روزے کی پابندی سے لے کر لباس تک کو شدت پسندی کا نام دیا جارہا ہے۔.بروکلین یونیورسٹی میں طلبا ئ کو صرف اس لیے نگرانی میں رکھا جارہا ہے اور انہیں دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے کہ انھوں نے یونیورسٹی میں دو کمرے، ایک لڑکوں اور ایک لڑکیوں کی نماز کیلئے مختص کیے ہیں جہاں بقول ان طلبائ کے یہ نماز پڑھتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔ جبکہ نیویارک پولیس کے مطابق یہ طلبائ خاموش کھڑے یا بیٹھے رہتے ہیں اور پھر سرزمین پر ٹیکنے کی پر اسرار حرکات کرتے ہیں۔ دراصل یہ بھی توہین کا ایک انداز ہے ورنہ کیا نیویارک پولیس کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ نماز کے بارے میں نہیں جانتے۔

یہ تو کچھ حقائق ہیں جو امریکہ میں وقوع پزیر ہو رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان حکومتیں کتنی سنجیدگی سے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں امریکہ سے کس حد تک مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے مسلمان شہریوں کے حقوق کا خیال کرے یا اسے امریکہ کا اندرونی معاملہ سمجھ کر چھوڑ دیا جا رہا ہے۔

جبکہ یہ وہی امریکہ ہے جو مسلمان حکومتوں کے خلاف کاروائیاں کرنے کیلئے صرف اس بات کو جواز بناتا ہے کہ یہ مسلمان حکومت اپنے مسلمان شہریوں کے حقوق پورے نہیں کر رہی۔ کسی بھی مسلمان ملک میں کسی غیر مسلم کے ساتھ بالکل ذاتی وجوہات کی بنا پر ہونے والے کسی جھگڑے کو بین الاقوامی طور پر اچھالتا ہے اور اس طرح کے واقعات کو خود بڑے زور و شور سے ہوا دیتا ہے تاکہ حالات کو اس حد تک خراب کیا جائے کہ ملکی حالات کا بہانہ بنا کر کسی اور ملک کے عوام کی مدد کرنے کیلئے خود میدان میں کود پڑے اور اپنی ہوس ملک گیری کی تسکین کرتا رہے۔

دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان حکومتیں اور کہیں کہیں مسلمان عوام ڈالروں کے عوض بڑی آسانی سے امریکہ کو یہ سہولت فراہم کرتے رہتے ہیں یہ اور بات ہے کہ امریکہ اپنا کام نکال کر ان حکمرانوں کو گولی یا سولی کی خوراک بنا دیتے ہیں لیکن امریکی تابعداری کے بدلے میں چند سال اور دولت اکٹھی کرنے کیلئے مل جاتے ہیں اور پھر وہ یہ دولت اپنے آنے والی سات نسلوں کے حوالے کر جاتے ہیں۔ درحقیقت مسلمان امریکی ہوں یا غیر امریکی ،امریکہ کے نزدیک وہ دہشت گرد ہیں اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کے سامنے اکڑ کر کھڑا ہونے والا کوئی مسلمان ملک نہیں ہے اور اسی لیے وہ آسانی سے اپنا کام کیے جا رہا ہے۔ اسی امریکہ کا لباس ہم انتہائی فخر سے پہنتے ہیں جو مسلمانوں کو ان کے

لباس کی وجہ سے دہشت گرد قرار دیتا ہے اور انہی کے دیکھا دیکھی ہم خود بھی اپنے لباس کو تضحیک کا نشانہ بنا کر اسے جہالت کی نشانی سمجھتے ہیں۔ وہ ہماری عبادت کو شدت پسندی کہتے ہیں اور ہمارے صاحبانِ علم خاموشی سے سنتے ہیں علمی بنیاد پر کوئی ٹھوس اور مستند جواب سننے میں نہیں آتا۔ وہ جہاد کو جرم بتاتے ہیں اور کوئی انہیں یہ بتانے والا نہیں کہ جہاد ظالم سے جنگ اور امن کی بحالی کو کہتے ہیں بلکہ ہمارے حکمرانوں نے کیا یہ کہ بجائے اس کے کہ جہاد کے اصل معنی سمجھائے جائیں اپنی کتابوں سے لفظ جہاد مٹانا شروع کر دیا۔ جب امریکہ سے باہر کے مسلمانوں کے خوف کا یہ عالم ہوگا تو امریکی مسلمان تو مصیبت میں پڑے ہی رہیں گے۔ وہ تو بھلا ہو خود ان امریکیوں اور یورپیوں کا جو اسلام کو تجسُس کے مارے پڑھتے ہیں اور متاثر ہو کر اسلام قبول کر رہے ہیں اور اسلام کی اسی افاقیت نے غیر مسلموں کے اوسان خطا کیے ہوئے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے نہ تو مسلمان حکمران اور نہ بزعم خود مسلمان علمائ امریکہ کو جواب دے رہے ہیں۔ ہمیں اپنے رویوں میں مکمل تبدیلی لانی ہوگی، اپنے دین کی حفاظت کرنی ہوگی اور امریکہ سمیت سب کو بتانا ہوگا کہ اسلام صرف ساتویں صدی کیلئے نہیں تھا بلکہ قیامت تک کیلئے ہے اور یہ بھی کہ یہ کسی بھی مذہب سے زیادہ پر امن مذہب ہے اس کے پیروکار اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح نرم خو اور باعث رحمت ہیں لیکن اپنے خلاف معاندانہ رویوں کا جواب دینا جانتے بھی ہیں اور اس کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔

موجودہ حالات ۔۔۔ ذمہ دار کون

بد قسمتی سے ہم اس وقت آزمائش کے ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں کوئی پورا اترنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ ہر ایک الزام تراشی میں مصروف ہے یا ذاتی مستقبل کی تعمیر میں۔ دوسری طرف کچھ دوسری قوتیں ہیں جو اپنے خود ساختہ مذہبی نظریات کی ترویج بزور شمشیر کو جہاد قرار دے رہی ہیں۔ ایک اور طبقہ فکر بھی نمودار ہو رہا جو نظریہ پاکستان کو ہی غلط ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے بلکہ اسے تو دانشمندی کی نشانی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے یہ وہ سارے اندرونی عناصر ہیں جو جانتے بوجھتے اس ملک کو نقصان پہنچانے میں مصروف ہیں، جانتے بوجھتے ہوئے اس لیے کہ یہ سب کچھ منصوبہ بندی کے تحت کیا جارہا ہے۔ کچھ کو بیرونی مدد اور تعاون حاصل ہے لیکن آلہ کار خود اپنے ہی لوگ ہیں اور کچھ تو خود ہی منصوبہ ساز اور خود ہی آلہ کار، اور ایک گروہ وہ بھی ہے جو عملاً اس ملک کی ثقافت کے خلاف محاذ آرا ہے۔ ان کے لباس اور ان کے انداز اپنی ہی ثقافت سے شدید طور پر متصادم ہیں۔ یہ تو ایک اجمالی سا، انتہائی مختصر سا جائزہ تھا اُن حالات کا جن کا ہم سامنا کر رہے ہیں مجرم الگ ہیں، طریقہ واردات مختلف، لیکن نشانہ ایک ہی ہے اور وہ ہے پاکستان۔ اگرچہ اِن میں سے ہر ایک دوسرے کو تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے لیکن یہ سب برابر کے شریک جرم ہیں۔ خود کش حملوں نے اس

ملک کے امن کو جس طرح تہس نہس کیا ہے انسانی جان کو کیڑے مکوڑے سے بھی ارزاں کر دیا ہے وہ اگر چہ ان چند ہزار طالبان کے بس کی بات نہیں لیکن اُنہیں بیرونی امداد جس حساب سے مل رہی ہے اُسی حساب سے وہ انسانی قتل عام میں ملوث ہو رہے ہیں۔ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جس جنگ میں ہاتھ ڈالا ہے اُس نے خود ہمارے امن کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے لیکن عوام کے بار بار کے مطالبے کے باوجود کوئی بھی صاحب اختیار اس سے ہاتھ کھینچنے کو تیار نہیں اور نہ ہی عوام الناس کو وہ منطق سمجھائی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ہر تنقید بھی برداشت کی جا رہی ہے اور ہر نقصان بھی سہا جا رہا ہے لیکن حکمت عملی میں تبدیلی نہ۔ برداشت کی جا رہی ہے نہ پیدا کی جا رہی ہے نقصان ہوتا ہے تو ہوتا رہے ہم اپنی پالیسی سے چمٹے رہیں گے۔ ہاں وہ منصوبے جو ملک کی ترقی میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں بڑی آسانی سے آتی جاتی حکومتوں کی نظر ہو جاتے ہیں اور ہمارے یہی رویے ہیں جس نے ہمیں بین الاقوامی سطح پر ایک سافٹ ٹارگٹ بنا دیا ہے۔ طالبان، حکومت اور عوام ایک ہی کردار ادا کر رہے ہیں بس طریقہ واردات مختلف ہے۔ عوام کا کردار بھی کچھ زیادہ قابل قدر نہیں، یہی عوام سرکاری اہل کار ہیں، اساتذہ ہیں ڈاکٹر اور انجنیئر ہیں دکاندار اور پھل فروش اور سبزی فروش ہیں اور فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کے مصداق ہر کوئی اپنا اپنا دیا جلا رہا ہے، مالی اور اخلاقی ہر لحاظ سے ،اور حیرت اس بات پر ہے کہ مالی کرپشن تو پھر بھی کسی کو نظر آ جاتی ہے لیکن

ہمارے رویے جو نقصان ملک کو پہنچا رہے ہیں اسکی کسی کو پرواہ نہیں حالانکہ اگر یہی اخلاقی برائیاں ختم ہو جائیں تو باقی سب بُرائیاں اور بدعتیں خود بخود ختم ہو جائیں گی اِنہی برائیوں کی وجہ سے معاشرے میں کوئی محفوظ نہیں اور یہ سب نتیجہ ہے مذہب سے دوری کا۔ اسی مذہب سے شدھ بدھ نہ رکھنے والے لوگوں کے سامنے جب طالبان جیسے طبقے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں تو وہ اُسی کو عین اسلام سمجھ کر ان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جبکہ دوسری جانب یہی مذہب سے دور لوگ شدت پسندی کو ہوا دینے کا باعث بنتے ہیں معاف کیجئے گا لیکن ننگے ملبوسات کی نمائش کو جس طرح ہر چینل پر دکھایا جا رہا ہے اور تعریفوں کے جو ڈونگرے برسا دیئے جاتے ہیں وہ کچھ کو تو اسی رویئے کی طرف راغب کر دیتے ہیں اور کچھ کو اتنا خلاف کہ وہ شدت پسندی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یوں سب کا جرم شدید ہے چاہے اس کا احساس کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

یہ سب کچھ تو ایک طرف، جب ملک کے نظریے کو ہی متنازعہ بنانے کی کوشش کی جائے اور اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اس خیال کو سرعام پیش کیا جائے تو ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ خود ہم سب سے بڑے مجرم ہیں۔ اگر اِن لوگوں کو کوئی دشمن مدد دے بھی رہا ہے تو ہمارا میڈیا ان کے خیالات عام کرنے میں کیوں کردار ادا کر رہا ہے۔ اور حیرت ہے ہم اسلامی تنظیموں پر شدت پسندی کی چھاپ لگا کر انہیں تو بڑی سہولت سے بین کر دیتے ہیں لیکن اس طرح کے گروہوں کو

خوب کُھل کھیلنے دے رہے ہیں بلکہ دو قومی نظریے کو متنازعہ بنانے کی عملاً کوشش کی جا رہی ہے۔ امن کے لیے اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ قبائل اپنی پہچان ختم کردیں، قومیں اپنے نظریئے بھلا دیں اور ملتیں اپنے مذاہب سے روگردانی اختیار کریں اسلام کا یہی اصول ہی یاد رکھ لینا کافی ہے کہ لَکُم دِینُکُم وَلِیَ دِین اور بس خود بخود امن قائم ہو جائے گا۔

قومی ذمہ داری اور قومی یکجہتی کا احساس اجاگر کرنے کی جتنی ضرورت ہے ہم اس سے آنکھیں چرا کر اپنا تمام تر زورِ خطابت اور زورِ بازو ایک دوسرے کے خلاف بیانات دے کر صرف کر رہے ہیں ملک میں مسائل کا ایک انبار لگا ہوا ہے لیکن نئی نئی بحثیں چھیڑ کر ''نئے اور اچھوتے'' موضوعات کی تلاش میں قومی یکجہتی کا بیڑا غرق کیا جا رہا ہے۔ جب تک ہم میں سے ہر ایک اپنی غلطی تسلیم کرکے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ ہم مسائل سے نکل کر ترقی کی دوڑ میں شامل ہو جائیں گے۔

ہماری ثقافت اور فیشن شوز

فیشن ہر انسان کا حق ہے خدا خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ اس نے لباس ستر کے لیے بنایا لیکن اس کو زیب و زینت کا ذریعہ بھی کہا پہلی سزا جو انسان کو دی گئی وہ بے لباسی تھی جب حضرت آدم و حوّا نے شجر ممنوعہ کو ہاتھ لگایا تو انہیں بے لباس کر دیا گیا اور بقول قرآن ، انھوں نے پتے توڑ توڑ کر اپنا ستر چھپانے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگی تو انہیں معاف تو کر دیا گیا لیکن بطور سزا انہیں زمین پر بھیج دیا گیا سو یہ تھی لباس اور انسان کے تعلق کی کہانی جسے تمام آسمانی مذاہب نے تسلیم کیا ہے۔ دوسری طرف تاریخ دان کہتے ہیں کہ انسان نے ہزاروں سال تک وحشت میں زندگی گزارنے کے بعد جب تہذیب سیکھی تو اس کا بہت بڑا جزو لباس تھا۔ لیکن شاید انسان اپنے دور وحشت کی طرف پھر لوٹنے لگا ہے کہ وہ لباس کو مختصر سے مختصر کرتا جا رہا ہے اور اُس نے اسے ستر پوشی کا ذریعہ سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ زیب و زینت سے بھی اُس نے لباس کا اختصار ہی مراد لینا شروع کر دیا ہے۔ مغرب کی دنیا تو عرصہ دراز سے اس بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی اور لباس کی اہمیت کھو چکی تھی لیکن اب مشرق نے بھی اندھا دھند اور بلا سوچے سمجھے اس دلدل میں پاؤں رکھ دیا ہے ابھی تو یہ ایک خوبصورت فریب ہے لیکن اسکی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا

رہا ہے کہ ہم اپنی معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اس وقت ہمارا ملک بہت سارے مسائل میں گھرا ہوا ہے اور ہمارا میڈیا ان مسائل کی نشاندہی بھی کر رہا ہے لیکن دوسری طرف ایک طبقہ وہ بھی ہے جو فیشن شوز کے نام پر مسلسل عریانیت کو فروغ دے رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہی میڈیا جو ملکی حالات پر تشویش سے آگے بڑھ کر واویلا مچا رہا ہوتا ہے کسی بھی ایسے فیشن شو کی خبر بڑے زور و شور کے ساتھ دیتا ہے اور اِن ملبوسات اور ماڈلز کے وہ، وہ زاویے دکھائے جاتے ہیں جنہیں کم از کم شریف خاندان کے افراد مل بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے اور ہمارے نیوز چینلز جن تعریفی کلمات کے ساتھ یہ خبر چلاتے ہیں وہ مزید قابل شرم ہیں۔ ہم اس وقت نہ صرف مسلح دہشت گردی کی زد میں ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہم اس ثقافتی یلغار کی زد میں بھی ہیں جو ہماری جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے لیکن ہمارا میڈیا خوش ہے کہ اِن بیہودہ قسم کے فیشن شوز سے ہمارے ملک کا سوفٹ امیج اجاگر ہو رہا ہے یعنی وہ ملبوسات جو ہماری ان ماڈلز کے علاوہ کوئی اور پہننے پر آمادہ نہیں کم از کم عوامی مقامات پر تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وہ ہمارے ملک اور ہماری ثقافت کو کیسے بین الاقوامی طور پر پیش کر سکتے ہیں اور اگر اِن شوز کو تجارتی مقاصد کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو پھر اسے پاکستانی میڈیا پر کیوں فخر سے دکھایا جاتا ہے اور کیوں ملک میں اُس ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے جس کی نہ ہمارے مذہب میں اجازت ہے اور نہ ہی ہمارے معاشرے میں یہ

پسندیدہ ہے۔ لیکن چونکہ شاید ہم اسی چیز میں دنیا کے ساتھ مقابلے کے قابل ہیں اس لیے ہم زور و شور سے اس میں مصروف ہیں۔ ترقی کی دوڑ دوڑنے کے لیے تو ہمت بھی چاہیے اور قوت بھی اور اس کے لیے منصوبہ بندی بھی ضروری ہے جبکہ کیٹ واک کے لیے اِن میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ سب تجارتی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے تو ہم اپنے ملبوسات اور لباس کو فروغ کیوں نہیں دیتے کیا ضروری ہے کہ ہم تبھی تجارت کر سکیں اور ترقی یافتہ کہلا سکیں جب ہم اپنے مذہب، ثقافت اور تہذیب کو چھوڑ دیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے اور ہمارے الیکٹرانک میڈیا کو بالخصوص اور پرنٹ میڈیا کو بالعموم یہ سوچ لینا چاہیے کہ بہت ساری خرابیاں اسی طرح جنم لیتی ہیں اور بہت ساری قومیں اسی بے حیائی کے ہاتھوں تباہ ہوئیں کیونکہ اخلاقی گراوٹ تباہی کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ ہمارا معاشرہ آج جس مقام پر پہنچ چکا ہے اُس کی ایک بہت بڑی وجہ اپنے مذہب، ثقافت اور معاشرت سے دوری ہے اور یہ فیشن شوز کچے ذہنوں کو مزید خلجان میں مبتلائ کرتے ہیں اگر یہی کر لیا جائے کہ بے حیائی کے ان کھلے مظاہروں کو میڈیا پر ہی نہ دکھایا جائے تو بھی کم از کم کچھ تو بچت ہو فیشن اور بے حیائی اور عریانیت میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو پھر اس سرگرمی کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن فکر مندی اور دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارا کوئی نیوز بلیٹن

اِن خبروں کے بغیر نہیں جاتا اور اگر کوئی فیشن شو منعقد نہ ہوا ہو تو بھارتی فلموں کے انتہائی نا معقول بلکہ نہ دیکھنے کے قابل مناظر اور خبریں اِن بلیٹنز کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

معاشرے کا بناؤ اور بگاڑ ملک کے ہر شہری اور ہر طبقے کا فرض ہے لیکن آج کی دنیا میں اس میں میڈیا کا ایک بہت اہم کردار ہے جسے اسے بہت محتاط ہو کر ادا کرنا چاہیے۔

ہمارے میڈیا کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ پیسے سے زیادہ اہم ملک ہے اور کاروبار سے اہم ہماری معاشرتی اقدار ہیں یہی ملک اور اقدار ہماری پہچان ہیں ان کے بغیر نہ ہماری پہچان ممکن ہے اور نہ ہماری عزت اسی لیے یہ ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہیے نہ کہ اپنی ذاتی خواہشات اور نفع و نقصان۔

فکرِ اقبال ۔۔۔ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

ہر قوم میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں، ایسے رہنما ہوتے ہیں جن پر بجا طور پر قومیں فخر کرتی ہیں اور اگر یہ رہنما اقبال جیسے شعلہ نوا ہوں تو کرۂ ارض پر نئی مملکت کا ناقابل یقین معجزہ بھی رونما ہو ہی جاتا ہے۔پاکستان کا بن جانا اقبال اور قائدِاعظم جیسے مخلص اور پاکیزہ کردار رہنماؤں کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسکی مثال کم از کم ماضی قریب میں موجود ہی نہیں۔

برصغیر کے مسلمان ہزار سال تک کی حکمرانی کے بعد جس کسمپرسی اور تاریکی میں زندگی گزار رہے تھے اس میں روشنی کی یہی کرنیں تھیں جو ان کی زندگی کا باعث اور ثبوت بنیں خود بقول اقبال۔

ولولہ اک تازہ دیا میں نے دلوں کو

لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

1930 کا سال تھا،برصغیر کے مسلمان سالہاسال سے انگریز اور ہندو کے سامنے بے بس تھے ان کا استحصال جاری تھا مسلمان اِن سارے حالات کے عادی ہو چکے تھے لیکن ایسے میں اقبال نے پاکستان کا تصور دیا جو گویا برصغیر کے

مسلمانوں کو ایسے راستے پر لگانا تھا جس کا انجام یقینی منزل تھی ۔برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی تعین کردہ منزل کے علاوہ کسی دوسرے تیسرے حل کی گنجائش ہی نہ رکھی انہوں نے اپنی قومی غیرت اور خودی کو ہر شے پر مقدم رکھا اور منزل پالی۔ اقبال کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا قائد کی محنت رنگ لائی اور ایک نئے ملک نے جنم لیا ۔پاکستان آزاد نہیں ہوا تھا بلکہ بنا تھا کیونکہ اس سے پہلے اس نام کا کوئی ملک کرئہ ارض پر موجود نہ تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس ملک کو بنانے والے، اسکو سنوارنے تک زندہ نہ رہ سکے اور ہم اس ملک کو اُس طرح نہ سنبھال سکے جیسا کہ اس کا حق تھا۔ آج بھی ہم فکر اقبال کا حوالہ دیتے نہیں تھکتے لیکن ہم نے اُسے اپنی قومی زندگی میں وہ جگہ نہ دی جو دی جانی چاہیے تھی۔ ہم نے یہ ضرور کیا کہ اشعارِ اقبال کو اپنی تقریروں کی خوبصورتی کے لیے استعمال کیا اس سے لوگوں میں جوش و خروش پیدا کیا اور پھر محفل اور جلسہ برخواست کر دیا گیا۔ اقبال کو بس ہم نے اتنا ہی یاد کیا حالانکہ آج بھی فکرِ اقبال کو قومی غیرت اور خودی کو زندہ کرنے کے لیے استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے۔ آج کے پاکستان کو ماضی کے ہندوستان سے زیادہ اسکی ضرورت ہے۔ آج ہم دنیا میں جس مقام پر کھڑے ہیں وہ ہر گز وہ نہیں جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا۔ آج تو ہم اپنی خودی و خود داری کھو چکے ہیں ۔ ہر غیر قوت کے دستِ نگر ہیں امریکہ ہو یا کوئی اور غیر ملکی قوت وہ ہمیں اپنی جا گیر سمجھے ہوئے ہیں بین الاقوامی سطح پر ہمیں اگر کوئی اہمیت دی

جارہی ہے تو صرف اِن قوتوں کے مفادات کی حد تک ، چاہے اِن مفادات کی خاطر ہمارے لوگوں کے خون کی ندیاں بہادی جائیں ۔ معاشی سطح پر ہم اِن قوتوں کے محتاج ہیں، تکنیکی مقابلے میں ہم بہت پیچھے ہیں، تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام کا ہم اب تک تعین نہیں کرسکے ہیں ایسا اس لیے نہیں ہے کہ ہمارے پاس ٹیلنٹ نہیں ہے، ہے بلکہ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو وہ خودی و خوداری نہیں ہے جس نے ایک بے نام قوم کو قوم بنادیا تھا یا وہ خلوص نہیں ہے جس نے ایک آواز کو وہ طاقت بخشی تھی کہ جس سے زمین ہنداور تاج برطانیہ کانپ اٹھے تھے اور جس کو پکارنے والا زمین پر تھا لیکن اُس کی صدا تھی آسمانوں میں۔ وہ آواز جس نے قوم کے ہر فرد بشر کو جگا کر رکھ دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ مخلص تھا وہ اپنی عزت اور غیرت کا سودا نہیں کرتا تھا اور قوم کو بھی یہی بتاتا تھا۔ لیکن افسوس کہ اقبال کو اپنا قومی شاعر ماننے والے آج عمل سے مکمل طور پر عاری ہو چکے ہیں وہی عمل جسے اُس نے جنت اور جہنم کا تعین قرار دیا تھا۔ آج قوم قوم سے زیادہ ایک ہجوم بنتی جارہی ہے ہر ایک اپنی زندگی بنانے کے چکر میں مبتلائ ہے اور اسی دوڑ میں ملک وملت کہیں بہت پیچھے رہ گئے ہیں آج یوم اقبال پر اقبال کے شعروں سے محافل گرمانے سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم فکر اقبال کو اپنی قومی زندگی میں یوں شامل کریں کہ یہ اب کے، مسلمانان پاکستان کو جگادیں اور عوام سے لے کر حکومت اور حکومت سے لے کر عوام تک ہر ایک خود کو قومی ترقی کا ذمہ دار سمجھے اور اپنی کوتاہوں کا

خود ادراک کرتے ہوئے اپنا جرم تسلیم کرے اور اسے دوبارہ نہ دہرائے تو پھر ہی اقبال کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکے گا ایک مضبوط اسلامی مملکت کا خواب اور یہ کچھ ناممکن بھی نہیں کیونکہ بقول اقبال۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

امن ۔۔۔ مگر دستار نہ گر پڑے

امن یقیناً ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے چاہے یہ دو انسانوں کے درمیان ہو دو گھروں کے درمیان یا دو ملکوں کے بیچ کیونکہ امن ہی دنیا میں انسانی بقا کی ضمانت ہے اسی سے دنیا حسین ہے اور اسی کے نہ ہونے سے بد نما۔ امن مظالم پر چپ رہنے کا نام نہیں بلکہ ظلم، زیادتی اور ظالم کے خلاف ڈٹ جانے سے جو امن قائم کیا جائے وہ زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔

پاکستان کی ترقی کی راہ میں جو اندرونی رکاوٹیں ہیں وہ تو ہیں لیکن اس راہ کا سب سے بڑا روڑا ہماری سرحد پر موجود ایک ایسا ملک ہے جس کی بدنیتی اور دشمنی نے ہمیں مجبور کر رکھا ہے کہ باوجود ایک غریب ملک ہونے کے ہم اپنے وسائل دفاع پر خرچ کرتے رہیں اور ایٹمی اسلحہ بنائیں لیکن ہمیں یہ سب کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ دوسری طرف ایک بہت بڑا ملک ہے جس کے عوام بھوکے مر رہے ہیں۔ ممبئی اور دہلی کی چکا چوند کے پیچھے کھلے آسمان تلے بسنے والے بے شمار انسان ہیں لیکن بھارت سرکار خوش ہے کہ وہ ایک بہت بڑی فوجی طاقت ہے اور وہ اپنے اسلحے کا ڈھیر اونچا ہی اونچا کرتا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ اس کی یہ ساری جنگی تیاری اپنے سے کئی گنا چھوٹے ملک پاکستان کے خلاف ہے اور یہ بھی

سب جانتے ہیں کہ یہ واحد محاذ نہیں جس پر وہ ہمارے خلاف سرگرم عمل ہے۔ دہشت گردی کے جس طوفان نے پاکستان کا احاطہ کیا ہوا ہے اُس میں بھی بھارت کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ بلوچستان میں اُسکی دلچسپی اور باغی بلوچ لیڈروں سے اُسکے تعلقات بلوچوں سے ہمدردی نہیں بلکہ پاکستان سے دشمنی کی بنا پر ہیں۔ افغانستان کی ترقی کی بھی اُسے خواہش نہیں لیکن ایک اور سمت سے پاکستان پر یلغار اُسکی اولین ترجیح ہے۔ ان سارے عناصر کے ذکر کی وجہ آج کل کے وہ ''امن پسند'' گروہ اور ان کی انکی وہ سرگرمیاں ہیں جسے امن کی آشا کے نام پر پروان چڑھایا جارہا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا کہ امن کی خواہش ہر معقول انسان کو ہوتی ہے اور یہی حال بین الاقوامی امن کا بھی ہے لیکن نہ تو شخصی اور نہ ہی قومی خودی اور خودداری کا سودا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے داؤ پر لگایا جاسکتا ہے۔ اگر بھارت آج اپنے اعمال پر نظرثانی کرتے ہو اپنی پاکستان دشمن سرگرمیوں سے ہاتھ کھینچ لے تو پھر توپڑوسی ہی سب سے اچھے دوست ہو سکتے ہیں لیکن ایسے کسی اقدام کی فی الحال کوئی توقع تک نہیں کی جاسکتی۔ بھارت کشمیر کو آج بھی اپنا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے اور اُس پر پاکستان کا حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ وہ تو اس مسئلے پر بات چیت سے ہی گریزاں رہتا ہے۔ اسے اپنے ان وعدوں کا بھی کوئی پاس اور لحاظ نہیں جو اُس نے کشمیر میں استصوابِ رائے کے بارے میں اقوام متحدہ میں کئے ہوئے ہیں اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس مسئلے کے ہوتے ہوئے امن کی

آشارے مضحکہ خیز ہے تو بے جانہ ہوگا۔
بھارت نے کسی بھی زاویے سے پاکستان دشمنی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ پانی ہی کے مسئلے کو لیجیے ،پانی جو زندگی کا ضامن ہے اور اسکا ہونا نہ ہونا زندگی اور موت کا مسئلہ ہے ۔بھارت نے ہزار ہا سال سے بہنے والے دریائوں کا رخ موڑ کر ان کے پانیوں پر ڈاکہ ڈالا اور مسلسل ایسا کر رہا ہے۔ اُس نے نہ صرف ان دریائوں کا پانی روکا بلکہ ان کا رخ تک موڑنے کی کوشش کی اور پانی کے بہائو کو سرنگوں کے ذریعے اپنی جانب کیا۔ پھر اس ملک سے دوستی اور امن کی خواہش کس بنیاد پر کی جائے کیا اپنے ہرے بھرے کھیتوں کو صحرائوں میں بدلنے کی خاطر یا مستقبل کی نسلوں کی خوراک کی قیمت پر۔
امن کی آشا کوئی قابل اعتراض عمل نہیں لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ خواہش کس سے کی جارہی ہے اور آیا دوسری طرف بھی صرف ایک اشتہاری مہم سے ہٹ کر بھی یہ خواہش موجود ہے یا نہیں تو اسکے ثبوت کے لیے سارک سربراہ کانفرنس کے اختتام پر بھارتی وزیراعظم کا وہ بیان ہی کافی ہے جس میں انہوں نے کہا ممبئی جیسا حملہ پاک بھارت تعلقات کے لیے تباہ کن ہوگا یعنی تعلقات کی خواہش کا اظہار بھی دھمکی آمیز انداز میں کیا گیا اور گویا کہ پاکستان کو بھارت کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی کہ وہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں

ہونا چاہیئے اور اس عمل کے لیے راستہ کھلا چھوڑا گیا کہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی بھارت میں ہونے والی کسی بھی بدامنی بلکہ واردات کے لیے بھی پاکستان ہی ذمہ دار ہوگا۔ اب ایسے بیانات کے بعد کسی خیر کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

ہمارے ہاں اگر ایک مخصوص گروہ کی یہ خواہش ہے کہ بھارت سے کسی بھی قیمت پر دوستی کی جائے تو وہ تو اپنی جگہ لیکن جمہوری حکومت نے بھی ماضی سے کوئی سبق سیکھنے اور حال کے حالات میں محتاط رہنے کی بجائے جس طرح بھارت کے نمائندے کملیش شرما کی دولت مشترکہ کے جنرل سیکریٹری کے عہدے میں توسیع کے لیے نہ صرف حمایت کی گئی بلکہ قرارداد کی تائید کی گئی اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اُن تمام شہیدوں کا خون رائیگاں گیا جو اس دشمن سے، اس ماں دھرتی کی حفاظت کے لیے کی خاطر لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کشمیر پر قابض قوت سے اب ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ ہم نے اسی کو تجارت کے لیے پسندیدہ ملک قرار دیا۔ اس کے فوائد و نقصانات پر تو کوئی ماہر معاشیات ہی بہتر تبصرہ کر سکتا ہے تاہم ایک عام پاکستانی کو اس اچانک انکشاف سے ضرور تکلیف پہنچی ہے اور وہ یقینا یہ سمجھتا ہے کہ اگر حکومت کے پاس اسکے بارے میں فوائد کی تسلی بخش فہرست ہوتی تو اِس فیصلے کو عوام کے سامنے ضرور رکھا جاتا بہر حال ماہرین معاشیات کے غیر جانبدارانہ تبصروں کا عوام کو انتظار رہے گا۔

بھارت سے دوستی اور امن کی خواہش بذات خود کوئی قابل اعتراض عمل نہیں لیکن اس امن کی آشا کا اظہار ادھر سے بھی برابری کی بنیاد پر ہونا چاہیے ۔ اور حکومت پاکستان کو اپنی سالمیت اور میڈیا کو اپنی غیرت ملی کو ضرور مدِ نظر رکھنا چاہیے ۔ غیرت ملی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اُن کے ڈرامے ان کی فلمیں (جن کو دیکھ کر شریفوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں) اپنے چینلز پر دکھاتے ہوئے ضرور سوچ لیا کریں کہ ہم ان کی ثقافت کو کیوں اپنے ملک میں متعارف بھی کروا رہے ہیں اور مقبول بنانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بھارت یا کسی بھی پڑوسی ملک سے دوستی ظاہر ہے پاکستان کے لیے بھی بہتر ہے لیکن اپنی غیرت ملی، سالمیت اور خوداری کی بنیاد پر ہرگز نہیں بلکہ قومی وقار اور عزت و حمیت کے ساتھ اور ان عناصر کو ہماری حکومتی اور عوامی ہر دو سطح پر ہر صورت ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔

پاکستان میں اقلیتی برادری

پاکستان اس وقت دنیا والوں کیلئے ایک آسان ہدف ہے یہاں ان کی مرضی کے خلاف ہونے والا کوئی معمولی سا واقعہ بھی اتنا اچھال دیا جاتا ہے جیسے آج دنیا کا سب سے اہم واقعہ یہی ہو۔ اس رویے میں دشمنوں کا ہاتھ تو ہے ہی لیکن خود ہم بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ آج کل اگر بین الاقوامی میڈیا پاکستان کو اقلیتوں کیلئے خطرناک ترین قرار دے رہا ہے تو ہمارا اپنا میڈیا بھی آزادیٔ اظہار کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کرتے ہوئے ان سے آگے بڑھ کر ایسا کر رہا ہے۔ سیاسی طور پر بھی ہمارا رویہ کچھ کم غیر ذمہ دارانہ نہیں ہے۔ حکومت کی مخالفت میں حکومت سے باہر بیٹھی سیاسی جماعتیں بھی ان خیالات کو اس قدر اچھال دیتی ہیں جیسے کسی دشمن ملک کی بات کر رہے ہوں۔

آج کل یہی اقلیتوں کے معاملے میں بھی کیا جا رہا ہے جو کہ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ پاکستان کے مخالفین کوئی ایسا موقع ضائع نہیں کر رہے جس پر اس ملک کی تذلیل کر سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں اور نہ ہی کسی سچے پاکستانی کو اس پر کوئی شرمندگی اور ہچکچاہٹ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کا بنیادی نظریہ اسلام ہے۔ ہم نے اسے اسلام ہی کے نام پر حاصل کیا تھا اور

فیصد مسلمان آبادی کے ساتھ یہ ہمارا حق بھی ہے کہ اس ملک میں اسلامی قوانین کا 97 نفاذ ہو۔ چونکہ اسلام صرف عقائد ہی نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں زندگی کے ہر معاملے کیلئے ہدایات موجود ہیں اور اجتہاد کا راستہ بھی کھلا رکھا گیا ہے اور ویسے بھی یہ ہمارا داخلی معاملہ ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے لیکن کبھی انسانی حقوق کے نام پر اور کبھی اقلیتوں کے نام پر پاکستان کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں نہ تو کوئی تعصب پایا جاتا ہے نہ ہی ان پر کسی قسم کی پابندیاں ہیں۔ پاکستان میں اقلیتوں کا تنا سب تقریباً 3 فیصد ہے اور آئین کے آرٹیکل 27 کی رو سے یہ کسی بھی قسم کی ملازمت کے حقدار ہیں، کسی بھی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور یہ کہنا کہ ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی ہو رہی ہے بذات خود سراسر زیادتی ہے۔

افواج پاکستان جو ملکی دفاع کی ذمہ دار ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کے لحاظ سے حساس ترین ادارہ ہے اگر اس میں غیر مسلم افسران کسی بھی عہدے تک جا سکتے ہیں تو یقینا کسی بھی دوسرے شعبہ زندگی میں بھی انہیں مواقع حاصل ہیں۔ پاک فوج میں ایک نہیں بلکہ کئی غیر مسلم میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے اسی طرح بریگیڈیر اور دوسرے عہدوں پر افسران موجود ہیں۔ پاک فضائیہ میں سیسل چوہدری

کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ پاک فضائیہ میں شاید یہ تناسب پاک آرمی سے بھی زیادہ ہے۔ یہی حال نیوی کا ہے۔ اب اگر دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرف آئیں تو رانا بھگوان داس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اور قومی سطح پر ان کی شخصیت کے قابل احترام ہونے میں بھی کوئی دورائے نہیں اور نہ ہی یہ کوئی پہلا واقعہ تھا کہ وہ قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان بنے اس سے پہلے جسٹس کارنیلس آٹھ سال تک مسلسل اس عہدے پر فائز رہے۔

اس مضمون کا مقصد یہ نہیں کہ اقلیت سے تعلق رکھنے والی ان شخصیات کا ذکر کیا جائے جو کلیدی عہدوں پر فائز رہے کیونکہ یہ فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کیلئے بے شمار صفحات درکار ہیں تاہم ان کا ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ یاددہانی کرانا تھی کہ پاکستان میں اقلیت اتنے ہی اہم اور اتنے ہی پاکستانی ہیں جتنے کہ مسلمان اور نہ ہی کبھی اقلیتی عوام کی طرف سے پاکستان کیلئے برے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، ہاں شوقِ لیڈری میں ہر پاکستانی کی طرح وہاں سے بھی کوئی ایسی بات ہو تو یہ ہمارا قومی رویہ ہے مذہبی نہیں۔ 6 ستمبر 2011 کو راولپنڈی میں ہندو اور سکھوں نے ہندو سکھ سوشل ویلفیئر کونسل کے زیراہتمام جوش و خروش سے یوم دفاع مناتے ہوئے شہدا کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اس لیے کہ وہ ان کے بھی ہیرو تھے اور اس لیے بھی کہ وہ پاکستان میں پر سکون اور پر امن زندگی گزار رہے ہیں۔

انسانی حقوق کے نام پر بڑے بڑے فنڈز حاصل کرنے والی تنظیمیں جن واقعات پر شور مچاتی ہیں وہ اکثر ذاتی اور خاندانی دشمنیوں کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک موجودہ حالات میں نشانہ بننے والے غیر مسلم شہریوں کا حال ہے تو کیا پورا ملک ان حالات کا شکار نہیں ہے؟ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے تو پورے ملک کو دہشت گردوں کا نشانہ بنا رکھا ہے اور اس میں مسلم، غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ پاکستان مخالف بین الاقوامی پروپیگنڈہ مشینری کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ پاکستان میں اس طرح کی سرگرمیوں کی پشت پناہی دراصل خود ان کے مربی کرتے ہیں اور انہوں نے ہی پاکستان کو دہشت گردوں کی آماجگاہ بنا رکھا ہوا ہے۔ اگر آج یہ لوگ ان کی مدد اور پشت پناہی چھوڑ دیں، انہیں اسلحے کی فراہمی بند کر دیں تو ان کا وجود ختم ہو جائے گا اور یوں اس ملک میں سب کی جان و مال محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن مسئلہ وہی ہے کہ یہ طاقتیں ایسا چاہتی ہی نہیں خود ان ممالک میں مسلمانوں کے بارے میں جتنا تعصب پایا جاتا ہے وہ ان کے ہر ہر اقدام سے عیاں ہے۔ امریکہ جو خود کو وسیع النظر سمجھتا ہے وہاں خود کو بار بار عیسائی کہنے والے بارک حسین اوبامہ کا نام ہی باعث اعتراض ہے۔ نائن زیرو میں مسجد کا ایک کمرہ ان کی برداشت سے باہر ہے۔ وہاں قرآن پاک کے ساتھ جو سلوک کیا گیا سب جانتے ہیں لیکن کسی ذمہ دار کو کوئی سزا نہ دی گئی۔ یہی حال یورپ کا ہے جہاں حجاب کو قابل سزا سمجھا جاتا ہے اور

بھارت جہاں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی ہے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ سب ہی جانتے ہیں لیکن چونکہ وہ برا سلوک مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے قابل سزا نہیں۔ سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود ان میں سب سے کم شرح خواندگی ہی بتا دیتی ہے کہ بھارت کے مسلمان کس حال میں رہ رہے ہیں۔ صنعتوں میں، معیشت میں، کسی بھی جگہ آبادی اور نمائندگی کے تناسب میں انتہائی زیادہ فرق ہے۔ چند ایک نام ہرگز کروڑوں مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کر سکتے جبکہ نہ ہی نیم مسلم فلمی ہیرو بھارتی مسلمانوں کی حالت زار کے نمائندہ ہیں۔

پاکستانی اقلیتیں پاکستان کے معزز شہری اور قابل فخر سرمایہ ہیں اور ان کی حفاظت کسی بھی دوسرے پاکستانی کی طرح حکومت کا فرض ہے لیکن یہ سمجھنا کہ ان کے ساتھ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ ان کے خلاف سازش ہے قرین انصاف بالکل بھی نہیں۔

اگر پاکستان میں اقلیتوں کے حالات کا درست تجزیہ کیا جائے بلکہ اگر بھارت، امریکہ اور انسانی حقوق کے بڑے دعویدار ممالک کے ساتھ ان کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو پاکستان اقلیتوں کیلئے ان ممالک سے کہیں زیادہ محفوظ اور مامون ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ پاکستان دشمن پروپیگنڈے کا منہ توڑ اور

موثر جواب دیا جائے اور صرف حکومت مخالف خبروں اور خود کو بہادر اور بے لاگ ثابت کرنے کیلئے یہ ملک دشمنی نہ کی جائے کہ صرف منفی خبریں دی جائیں بلکہ کچھ وہ اقدامات بھی دکھائے اور بتائے جائیں جو اندر اور باہر ملک کے تاثر کو بہتر کر سکیں۔

چاند تارے کے پرچم میں لپٹے ہوئے

دہشت گردی کی جنگ پاکستان کے لیے دو دھاری تلوار بن چکی ہے طالبان اور دہشت گرد تو اس لیے پاکستان کے خلاف ہیں کہ ہم ان کے خلاف امریکی جنگ میں اتحادی ہیں اور امریکہ اس لیے خلاف ہے کہ ہم امریکہ کے اتحادی ہیں کیونکہ دوسری کوئی وجہ نظر تو نہیں آتی ۔پاکستان اس جنگ میں ستر ارب ڈالر کا نقصان اٹھا چکا ہے جس میں سے صرف دس ارب ڈالر کے اخراجات امریکہ نے ادا کیے ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنی امداد کا پرچار ہماری" خدمات "سے زیادہ کرتا ہے قوم کو بھی ان خدمات پر کوئی فخر نہیں لیکن حکومت ہے کہ ان خدمات کو انجام دینے پر مصر ہے ۔ہم اس جنگ میں نہ صرف طالبان بلکہ امریکی دہشت گردی کا بھی شکار ہیں پچیس اور چھبیس نومبر کی درمیانی رات کو چوبیس گھبرو جوان، ہمارے محافظ امریکی دہشت گردی کا شکار ہو گئے وہ جوان جنہیں ان کی ماؤں نے وطن کی حفاظت کے لیے بھیجا تھا بے خبری میں شہید کر دیئے گئے۔ مہمند ایجنسی میں ہونے والے واقعے نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے ۔پاکستانی سرحد کے تین سو میٹر اندر تک آنے کی ہمت دہشت گردی ہی ہے ۔یہ اندر آنا نہ تو کسی تعاقب میں تھا اور نہ ہی کسی اشتعال کا نتیجہ ہاں یہ اس خونی فطرت کی تسکین ضرور تھی جس نے امریکہ کو پوری دنیا کو اپنی جاگیر سمجھنے پر مجبور کر رکھا ہے۔پوری قوم نے اس پر غم وغصے کا اظہار

کیا۔ یہ بلاشبہ یہ ہماری قومی خود مختاری پر ایک شدید ضرب ہے۔ اگرچہ حکومت نے بھی واقعہ پر احتجاج کیا سیاسی اور دینی جماعتوں نے بھی اس کی مذمت کی ہے تاہم اس کا یقین کسی کو بھی نہیں ہے کہ اس احتجاج کے نتیجے میں اس طرح کی دہشت گردی نہیں دہرائی جائے گی۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے واقعات پر ایسا ہی احتجاج کیا جاتا رہا ہے۔ اس وقت چند ایک اقدامات کرکے عوام کو مطمئن کر دیا جاتا ہے اب کی بار بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔ امریکی سفیر کو دفتر خارجہ طلب کرکے اسے احتجاج ریکارڈ کروایا گیا کابینہ کی دفاعی کمیٹی کا اجلاس بھی ہوا حملہ کی شدید مذمت کی گئی اور نیٹو سپلائی بند کرنے کا اعلان کیا گیا یہ سب کچھ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور بڑی آسانی سے اور بہت جلدی تصفیہ ہونے پر دوبارہ تمام احکامات واعلانات معطل کر دیئے جاتے ہیں ہر بار ان اقدامات کو حکومت کے جرات مندانہ اقدامات کے لقب سے ملقب کر دیا جاتا ہے ہاں اس بار ایک فیصلہ مزید کیا گیا کہ امریکہ پندرہ دن میں شمسی ایئر بیس خالی کر دے۔ اول تو سوال یہ ہے کہ یہ ائیر بیس دیا کیوں گیا اور پھر اب تک خالی کیوں نہ کروایا گیا۔ کہنے کو تو ہم کہتے ہیں کہ ہم اپنی سرزمین کسی دوسرے کو استعمال نہیں کرنے دیں گے لیکن ایسا واقعتاً ہو رہا ہے۔ اللہ کرے حکومت اپنے اس فیصلے پر قائم رہے فوج کو بھی اس معاملے میں سخت موقف اپنانا چاہیئے۔ یہ حملہ پاک فوج پر براہ راست حملہ تھا وہ فوج جس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہزاروں جانیں گنوائیں ایک بار پھر سب سے بڑے دہشت گرد یعنی امریکہ کا نشانہ بنی

اور فوج پر حملہ یقیناً کسی ملک پر ہی حملہ تصور کیا جاتا ہے بقول ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل اطہر عباس کے یہ امریکہ کا پہلا حملہ نہیں تھا بلکہ اس سے پہلے بھی ایسے ہی حملوں میں بہتّر فوجی شہید اور دو سو پچاس سے زیادہ زخمی ہو چکے ہیں یعنی ان شہادتوں کے بعد یہ تعداد سو کے قریب پہنچ چکی ہے جنرل اطہر عباس کے بقول امریکہ کا صرف معافی مانگنا ہی کافی نہیں۔یقیناً یہی پوری قوم کے جذبات ہیں اور حکومت کو اس معاملے میں ٹھوس اقدام اٹھانا ہی ہوگا۔پاکستان کو اپنی خود مختاری اور سلامتی کی حفاظت کا پورا حق ہے اور اس کی خاطر کسی بھی حکومتی اقدام پر پوری قوم ہمیشہ کی طرح سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے گی۔ دراصل یہ ایک چیک پوسٹ پر حملہ نہیں تھا بلکہ پاکستان کی سلامتی پر حملہ تھا اور میجر مجاہداور کیپٹن عثمان یا شہید ہونے والے سپاہی صرف چوبیں افراد نہیں تھے بلکہ یہ پاک فوج تھی اور یہ کروڑوں پاکستانیوں کے نمائندے تھے اگر امریکہ اپنے ایک قاتل ریمنڈ ڈیوس کے لیے ہر قسم کے اقدامات اٹھانے پر تیار ہو سکتا ہے، اگر ٹوئن ٹاور میں ہلاک ہونے والے چند ہزار امریکیوں کے بدلے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کر سکتا ہے تو اپنی حفاظت کرنا ہمارا بھی حق اور فرض ہے۔اب تک ہم اپنے پینیتس ہزار سے زیادہ شہریوں اور فوجیوں کی قربانی دے چکے ہیں اوراب جب کہ وزیراعظم نے بھی کہہ دیا ہے کہ ہمیں کوئی بڑا قدم اٹھانا پڑے گاتو یہ قدم اٹھا لینا چاہیے اس سے پہلے کہ ہمارے مزید چاند تاروں کے لاشے چاند تارے کے پرچم میں لپیٹے جائیں ہمیں

غیرت مندی اور زندگی کا ثبوت دینا ہو گا۔

نیٹو حملہ۔۔۔ حکومتی اقدامات اور عوامی توقعات

پچیس اور چھبیس نومبر کی رات کو ہونے والا واقعہ نہ تو پہلا تھااور نہ ہی غیر متوقع اس سے پہلے بھی امریکہ کئی بار یہ حرکت کر چکا ہے۔ دس جون 2008 کو گوراپرئی پر فضائی حملہ کیاگیا، تین ستمبر 2008 کوانگوراڈا، اسی سال اکیس ستمبر کو لوڑہ منڈی، پچیس ستمبر کوتمئی میں فضائی اور زمینی حدود کی خلاف ورزیاں کی گئی اور ایک دفعہ پھر اسی سال پندرہ ستمبر کوامریکی فوجیوں نے پاکستان میں داخل ہونے کوشش کی جس پر ایف سی کے جوانوں کی امریکی فوجیوں سے جھڑپ بھی ہوئی۔2011 میں سلالہ چیک پوسٹ حملے سے پہلے سترہ مئی کو دتہ خیل میں بھی ایک جھڑپ ہوئی۔ موجودہ حملے سے پہلے ان حملوں میں 72 شہادتیں ہو چکی ہیں اور چوبیں مزید شہادتیں اس تازہ واقعہ میں ہوئیں اور یہ اب تک ہونے والا سب سے سنگین واقعہ تھا۔اگرچہ ڈرون حملے اور ان حملوں میں شہادتیں اور ہلاکتیں ایک معمول ہے مگر ان حملوں کے لیے توامریکہ کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ دہشت گردوں کے خلاف ہیں لیکن سلالہ چیک پوسٹ پر حملے کے لیے وہ کہتا ہے کہ یہ حملہ غلط فہمی کی بنیاد پر ہواجب کہ سچ یہ ہے کہ سلالہ چیک پوسٹ پرپاکستانی پرچم لہرالہرا کرامریکہ کو بتا رہا تھا کہ یہاں پاکستانی فوجی موجود ہیں دہشت گرد نہیں،اور حقیقت یہ بھی ہے کہ امریکہ پہلے سے یہ سب جانتا تھا اور اس نے

جان بوجھ کر یہ حملہ کیا تھااور اس کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح پاکستان اس واقعہ پر بھی صبر کے ساتھ خاموشی اختیار کر لے گا کہ جہاں اس کے پانچ ہزار دیگر فوجی شہید ہوئے وہاں یہ چوبیس اور بھی سہی۔ دہشت گردی کی جنگ کی نذر ہو کر شہید ہونے والے بھی توامریکہ کے لیے ہی مارے گئے سو اب کے فوجی اگر براہ راست امریکیوں کے ہاتھوں شہید ہو جائیں تو بھی کوئی بات نہیں لیکن امریکہ کی توقعات کے خلاف پاکستانی اس بار برداشت نہ کر سکے اور چیخ اٹھے عوام بھی اور حکومت بھی۔ حکومت کو یا تو خود احساس ہوا یا عوامی احتجاج کے سامنے مجبور ہو کر بہرحال جو بھی ہے اس نے امریکی اقدام کے خلاف معقول رویہ اختیار کیا۔ یوں تو پاک امریکہ تعلقات ریمنڈ ڈیوس کی دہشت گردی کے بعد کئی بار بھنور میں آئے اور ان میں کافی سرد مہری رہی، پھر دو مئی کے واقعے نے اسے مزید جھٹکا لگایا لیکن اب کی بار تو براہ راست پاکستان کی سرحدوں کے اندر پاک فوج کے خلاف کاروائی کی گئی جو ایک کھلی جنگ میں ہی ممکن ہوتی ہے اگرچہ اس سے پہلے بھی امریکہ کے لیے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا ہے کہ وہ پاکستانی سرحدوں کے اندر کاروائی کرے۔ وزیرستان پاکستان کا ہی حصہ ہے جہاں اس کے ڈرون دندناتے پھرتے ہیں اور حتیٰ کہ اڑتے بھی پاکستان کے اندر سے ہیں کم از کم حالات وواقعات یہی بتاتے ہیں اور امریکہ کا بھی شروع سے یہی کہنا تھا۔ چاہے ہماری حکومت نے اس کی ہر بار تردید کی لیکن آخر اب کی بار اس نے ان ایئر بیسوں کا اعتراف کر ہی لیا۔ جو اقدامات حکومت پاکستان اب اٹھا رہی

ہے پہلے ہی اس کی ہمت کر لیتی تو نوبت یہاں تک پہنچتی ہی نا۔اب خرابیٔ بسیار کے بعد بھی اگر کچھ کرنے کی ابتدا کر ہی لی گئی ہے تو بھی شاید باقی کی بچت ہو جائے۔اگرچہ امریکہ اپنی دھونس کی عادت کے مطابق اب بھی کسی قسم کی معذرت سے انکار کر رہا ہے لیکن اب اگر معذرت کی بھی جائے تو بات معذرت سے آگے جا چکی ہے جبکہ وہ اب بھی حالات کی ذمہ داری پاکستان پر ڈالنے پر مصر ہے۔سینٹر جان کیری نے بون کانفرنس میں پاکستان کے شرکت سے انکار پر کہا کہ پاکستان کے بائیکاٹ کا مطلب یہ ہے کہ وہ علاقے میں حالات کی بہتری کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہے خود امریکہ کی طرف سے کبھی اس حملے کو نیٹو کی جانب سے قرار دیا جا رہا ہے اور کبھی بھول۔ چاہے جو بھی تھا یہ ایک کھلی جارحیت تھی امریکی فوجیوں کو اگر یہ نہیں معلوم کہ کہاں افغانستان کی حدود ختم ہوتی ہیں اور کہاں پاکستانی حدود شروع تو دنیا کا جدید ترین نظام رکھنے والی اس فوج کو اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کو بھی ترقی دینی چاہیئے جس کا پول کئی بار کھل چکا ہے کم از کم افغانستان کے بارے میں امریکی دعویٰ محض ایک دعوے سے بڑھ کر کچھ نہیں

۔امریکہ کو افغانستان سے جانا ہے اور وہ اپنی ناکامیوں کے لیے بہت سی توجیہات تلاش کر رہا ہے اور مزید کرے گا۔پاکستان بد قسمتی سے امریکہ کا مددگار رہا ہے لیکن مزید کسی بھی قسم کی مدد جرم سے بڑھ کر گناہ کے زمرے میں شامل ہو جائے گی۔ حکومت نے اس حملے کے بعد بہتر قومی رویہ دکھایا ہے لیکن عوام اب بھی خوف زدہ ہیں کہ وہ کہیں پھر پہلے کی طرح بہت

جلد یا کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے اقدامات سے نہ پھر جائے اگر ایسا ہوا تو شاید عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے ۔ایک طبقے کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان تعلقات کے لیے فوج ذمہ دار ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ فوج حکومت کے تابع ہے بون کانفرنس اور شمسی ایئر بیس کا فیصلہ اگر حکومت نے کر لیا ہے تو فوج اس سے رو گردانی نہیں کر سکتی ۔دیگر اقدامات کے ساتھ ساتھ وزیر اعظم کو بھی اس بار اعتراف کرنا پڑا کہ پاک امریکہ تعلقات کی نوعیت پر انہیں کوئی عزت نہیں مل رہی اور یہ سچ بھی ہے کہ ملک میں امن وامان کی صورت حال کی ذمہ داری تمام تر دہشت گردی کی جنگ پر ہے جو ساری دنیا جانتی ہے کہ خالصتاامریکی جنگ ہے جس نے ہماری صنعت ،معیشت، مواصلات ، تعلیم غرض ہر شعبے کو متاثر کیا ہے جو پیسہ یہاں لگنا چاہیئے تھا وہ امن وامان قائم رکھنے پر صرف ہو رہاہے، نہ بیرونی سرمایہ دار یہاں آنے پر تیار ہیں اور نہ ہی اپنے سرمایہ کاری کرنے پر ۔ہم جانتے ہیں کہ ایک پر زور اور مستقل موقف اپنانے پر ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لیکن اگر عوام اس کا مطالبہ کر رہے ہیں تو یقینا وہ حالات.برداشت کرنے کے لیے بھی تیار ہیں،بس حکومت اپنے موقف پر قائم رہے اور بجائے صرف چند وقتی اقدامات پر اکتفا کرنے کے اصل جڑ پکڑنے کی کوشش کرے ۔کسی بھی امریکی عہدے دار کی آمد پر صدر اور وزیر اعظم سے لے کر بے شمار استقبالی اہلکاروں کی قطار کو عہدے دار کی حیثیت کے مطابق چھوٹا کیا جائے بلکہ ختم ہی کیا جائے ۔ صرف شمسی نہیں تمام ایئر بیس خالی کروائے

جائیں اوران کے کنٹینرز کو بحری جہازوں سے اتارا نے ہی نہ دیا جائے پھر امریکہ افغان جنگ کی شدت کو خود دیکھے گا۔اگر پاک افغان سرحد پر بسنے والے قبائیلیوں کو ہی اس سرحد کی حفاظت کی ذمہ داریاں دے دی جائیں کیونکہ بقول قائداعظم یہ قبائلی ہماری تھرڈ لائن فورس ہیں پھر دیکھئے کہ امریکہ کیسے اور کس حد تک اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب ہو سکتا ہے۔اس وقت جس طرح فوج نے امریکہ اور نیٹو سے اپنے تعلقات مکمل منقطع کیے ہوئے ہیں یہاں تک کہ دونوں فوجوں کے درمیان کھیلوں کے مقابلے تک موقوف ہو چکے ہیں،ان اقدامات کو جاری رہنا چاہیے حکومت کے اب تک کے اقدامات بھی کافی حد تک عوامی توقعات کے مطابق ہیں۔ عوام اس وقت یہی توقع کر رہے ہیں کہ حکومت اور فوج اپنے فیصلوں پر قائم رہیں گے اور پاکستان کی تقدیر کو پاکستان کے عوام کے ساتھ منسلک کریں گے نہ کہ امریکہ جیسے خود غرض اور خود پسند ملک کے ساتھ۔

یادگار پاکستان ۔۔۔ تحریک پاکستان کی کہانی

زندہ قومیں اپنی تاریخ اور ثقافت کو زندہ رکھتی ہیں اور باوجود بہت سی برائیوں کے پاکستانیوں کی اکثریت اپنے تاریخی ورثے سے محبت کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر یہ گلہ بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ ہم تاریخی عمارات اور اپنے ورثے کی وہ حفاظت نہیں کر رہے جو کرنی چاہیے۔ لیکن اسلام آباد، جہاں اپنے اندر بہت سے راز سموئے ہوئے ہے جہاں ہمارے حال اور مستقبل کے فیصلے ہوتے ہیں وہاں ایک جگہ ایسی بھی ہے جس نے ہماری آزادی کی تحریک کو اپنے اندر بہت خوبصورتی سے سمویا ہوا ہے۔ جہاں جاکر آپ کو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ اور اس کے خم و پیچ کو بھلایا نہیں ہے۔ پچھلے دنوں مجھے یادگار پاکستان اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا جو کہ لوک ورثہ کا ایک ادارہ ہے یہاں میں نے اپنی تاریخ بلکہ حال کو ایک چھت کے نیچے انتہائی احتیاط سے جمع دیکھا اور اپنے بچوں کو بھی دکھایا جنھوں نے اپنی عمروں کے مطابق اس میوزیم میں موجود تمام نوادرات اور تاریخ کے تمام حقائق کو انتہائی دلچسپی اور حیرت کے ساتھ دیکھا اور میری خواہش ہے کہ ہر پاکستانی جس کی اس یادگار تک پہنچ ہے ضرور اسے اپنے بچوں کو دکھائے تاکہ آنے والی نسلوں کا ہم پر کوئی قرض نہ رہے اور یہ قرض ہمیں ہر صورت میں چکانا ہے ورنہ تاریخ کسی کوتاہی کو کسی صورت معاف نہیں کرتی۔ یادگار

پاکستان کی عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہاں ہمارا اتنا خوبصورت اثاثہ اور خزانہ محفوظ ہے۔

برصغیر دنیا کے زرخیز ترین خطوں میں سے ہے اور اسی لیے تاریخ کے ہر دور میں مختلف تہذیبوں کا مسکن رہا ہے یہ تہذیبیں یہاں خوب پھلی پھولیں اور اپنے عروج پر پہنچیں تاہم اسی زرخیزی، آب وہوا کی موافقت اور وسائل کی فراوانی نے اسے ہر طالع آزما کے لیے انتہائی پرکشش بنا کر رکھا اور یہی وجہ ہے کہ ایک کے بعد دوسری قوم آتی رہی اور نئی تہذیبیں پنپتی رہیں ۔ مسلمان یہاں پہلی بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مکران میں داخل ہوئے تاہم تاریخ میں مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ آمد 712 ئ میں سترہ سالہ نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم کی سرگردگی میں ہوئی اور ان تمام ادوار کو بڑی خوبصورتی سے اس میوزیم میں محفوظ کیا گیا ہے ہندومت ، بدھ مت اور مسلمانوں کی آمد کو مجسموں کے ذریعے اسی زمانے کے ماحول کے مطابق جس طرح دکھایا گیا ہے ایک بار تو آپ خود کو اسی زمانے میں محسوس کرتے ہیں مختلف مسلمان ادوار کو بھی بڑی خوبصورتی سے مجسم کیا گیا ہے اور آپ کو یہاں غزنوی ، غوری، لودھی اور بابر سبھی اپنی کہانی خود سنا رہے ہیں۔ انگریز کی آمد اور حکومت کے ہر منظر کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اقبال اور قائدا عظم کی ذاتی یادگاروں کے لیے الگ گوشے مخصوص ہیں۔ مسجدِ قرطبہ جس نے کئی سو سال تک اللہ اکبر کی صدا اور ایک

سجدۂ مومن کے لیے انتظار کیا تھا اور یہ اعزاز مسلمانان عالم میں اقبال کے نصیب میں لکھا گیا تھا کہ سپین کی وادیوں میں گونجی اذان انکی، اور اس عظیم مسجد میں اسی بندۂ مومن کی پیشانی نے وہ سجدہ کیا کہ جس سے زمین ہل جاتی ہے یہ خوبصورت منظر، اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مخطوطے، انکی شاعری اور میزانیے سب کچھ عاشقانِ اقبال کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں۔ اسی طرح قائدِاعظم کی ذاتی اشیائی اور جسمانی طور پر اس فردِ ناتواں کے عزم و ہمت سے بھرپور فیصلوں کے لمحے اور جدوجہد کی داستان یوں مجسم کی گئی ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ گول میز کانفرنس، مذاکرے اور مشنز کو تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے۔

پاکستان آزادی کے بعد بھی مشکل ترین حالات اور کٹھن ترین مسائل سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے لیکن اس کے باوجود ترقی کے کئی مراحل بھی طے ہوئے جسے کہیں تصویروں کی زبانی اور کہیں مجسم کرکے دکھایا گیا ہے۔ یہاں ایک آڈیٹوریم بھی موجود ہے جو پاکستان کی کہانی کا کوئی نہ کوئی پہلو دکھاتا رہتا ہے۔ پاکستان کے شعرائ و اُدبائ بھی دنیائے ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور بقول اقبال شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم، اس یادگار میں انکو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ حفیظ جالندھری کے ہاتھ کا لکھا ہوا قومی ترانہ دیکھنے والے کے لیے کسی تبرک سے کم نہیں، تقریباً تمام قابل ذکر

شعرائ وادیب اپنے فن پاروں کی صورت میں یہاں نظر آتے ہیں، سائنس، کھیل، طب، صنعت، فوج اور فوجی معرکے غرض ہر شعبے کو یہاں محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ یادگار ایک خوبصورت کاوش اور عظیم قومی خدمت ہے۔ لیکن دکھ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بہت سے باخبر لوگ بھی اس سے بے خبر ہیں کہ شکرپڑیاں کے دامن میں فن اور تاریخ کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے اور نہ ہی ہمارا ہر دم باخبر میڈیا اس کو وہ اہمیت دے رہا ہے جو وہ مادام تسائو کے عجائب گھر میں رکھے جانے والے ایک ایک مومی مجسمے کو دیتا ہے چاہے وہ کرینہ کپور کا ہی کیوں نہ ہو۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی نوجوان نسل کو اپنی تاریخ بتائی اور دکھائی جائے تاکہ وہ اس ملک کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو سکیں اپنے رہنمائوں کی جانفشانی اور سیاسی بصیرت پر فخر کر سکیں۔ میں نے یہاں کئی نوجوانوں کو یادگار کی عمارت کے ساتھ تصویریں کھینچتے ہوئے دیکھا لیکن پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ اس عظیم عمارت کے الگ الگ پنکھڑی نما ستون کس چیز کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ نوجوان نسل کی تعمیر و تخریب ہماری کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ یادگار پاکستان جیسے منصوبے یقینا انہیں اپنی تاریخ سے بیگانہ نہ ہونے دیں گے۔

مشرقی پاکستان میں بھارت کا مکارانہ کردار

23 مارچ 1940 کو لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جسے تاریخ نے قرار داد پاکستان کے حوالے سے اپنے اندر محفوظ کر لیا اور اس قرارداد کو جس شخصیت نے پیش کیا وہ تھے شیر بنگال مولوی فضل الحق۔ اس سے پہلے 1906 میں بنگالی شہر ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اسی بنگال کے لوگوں نے اپنی گردنیں کٹا کر، اپنا خون بہا کر قیام پاکستان کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ پھر کیسے کچھ ہی سالوں میں وہ لوگ پاکستان کے خلاف ہو گئے سیاسی اور انتظامی اختلاف کوئی انہونی یا انوکھی بات نہیں تھی لیکن اِن اختلاف کو پہلے پیدا کیا گیا اور پھر ہوا دی گئی یہاں تک کہ اس کے شعلے اس طرح بھڑکا دیئے گئے کہ جس نے آشیاں ہی جلا دیا۔

اور 1970-71 کے وہ خون آشام سال بھی آئے جب دونوں پاکستانوں کے لوگ ایک دوسرے کی جانوں کے دشمن بن گئے۔ دراصل بیچ میں ایک ایسا دشمن آ دھمکا تھا کہ جس کی مکاری کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ بھارت نے مشرقی پاکستان میں جو مکروہ کردار ادا کیا اس کی کوئی مثال تک نہیں ملتی۔ سالوں اس نے وہاں کے عوام میں احساس محرومی کا بیج بویا اور اس احساس کو پختہ کیا کہ آپ

کے ساتھ زیاتی ہو رہی ہے جب وہاں کامیابی امکانات سے کم ملی تو وہ کچھ ہوا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کا المیہ ہے یعنی چند لیڈر نما لوگوں کو خرید کر انہیں لیڈر بنادیا گیا اور دوسری طرف مغربی پاکستان میں بھی ہماری قیادت نے بھی کچھ دانشمندانہ کردار ادا نہیں کیا اور وہ المیہ سٹیج کیا گیا کہ جو ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ دونوں طرف مسلمان، دونوں طرف پاکستانی فرق صرف لفظ مشرقی اور مغربی کا، اس میں بے شمار پاکستانی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی بچوں کا قتل عام کیا گیا یعنی یہ صرف سیاسی نہیں انسانی المیہ بھی تھا اور اس قتل عام کا ذمہ دار بلکہ واحد ذمہ دار بھارت تھا جس نے اس سارے فساد کو پیدا کیا اور ہوا دی۔ مکتی باہنی نے جس طرح مغربی پاکستانیوں کو، بہاریوں کو اور پاکستان کے ہمدرد بنگالیوں کو قتل کیا اس درندگی میں اُسے را جیسے شقی القلب استاد اور مددگار کی مدد حاصل تھی اور پھر اپنی تاریخی اور روایتی مکاری سے اُسے پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیا اور افواج پاکستان کو بدنام کرنے کی باقاعدہ ایک مہم چلائی جسے ابھی تک ہوا دے دی جاتی ہے اور بنگلہ دیشی عوام کے جذبات کو پاکستان کے خلاف ابھارنے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس طرح کی سول نافرمانی اور پاکستان مخالف جنگ کا مشرقی پاکستان میں سامنا کیا گیا یہ کہنا کہ وہاں کوئی بنگالی، فوج کی گولی سے نہیں مارا گیا ہوگا غیر حقیقت پسندی ہے کیونکہ پاکستانی فوج اور مغربی پاکستانی جس طرح وہاں محصور حالت میں مارے گئے تو یقینا انہوں نے

اور

فوج نے اپنے دفاع میں گولیاں بھی چلائیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہندو ہاسٹلز سازشوں کی آماجگاہ اور سازشیوں کی پناہ گاہ بنے ہوئے تھے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ انہیں چیک نہ کیا جاتا اور وہاں گولی نہ چلتی۔ یہاں ہونے والی 167 ہلاکتوں کو پاک فوج نے تسلیم کیا۔ لیکن دیناج پور کے ہزاروں شہدائ جو بنگالی باغیوں اور مکتی باہنی کا نشانہ بنے، اس کا واویلا نہ تو انسانی حقوق کی تنظیموں نے کیا نہ بھارت کو اُن سے کوئی ہمدردی تھی کیونکہ یہاں ضمام کار اُسکے ہاتھ میں تھی اور بندوق اور بندوق چلانے والے دونوں ہی اُس کے ساختہ وپرداختہ تھے۔ اسی طرح چٹاگانگ بھی پاکستان مخالفوں کی زد میں آگیا تھا یہاں دس ہزار کی سول آبادی مکتی باہنی کے ظلم وستم کا نشانہ بنی اور کاٹ کر رکھ دی گئی اِن شہیدوں کا سوگ بھی سوائے پاکستان کے کسی نے نہ منایا، نہ انسانی حقوق کی تنظیموں نے اور نہ ہی بھارت نے۔ بھارت نے اس کا جشن ضرور منایا ہوگا کیونکہ اُن کی پروردہ مکتی باہنی قتل عام میں خاصی کامیاب رہی تھی۔ اسی طرح میمن سنگھ میں دو ہزار پاکستانی خاندانوں پر مشتمل ایک بستی کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا تھا۔ یہ سارے واقعات بہر حال تاریخ میں محفوظ ہیں اور کچھ تو کیمروں کی آنکھوں نے بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ جہاں تک پاک فوج پر یہ قابل شرم اور گھناؤنا الزام لگایا گیا کہ اُس نے لاکھوں عورتوں کی عصمت دری کی، تو اکادکا واقعات تو خارج از امکان قرار نہیں دیئے جا سکتے جسے حمود الرحمان کمیشن نے بھی تسلیم کیا) کیونکہ جب اِن (

فوجیوں کی آنکھوں کے سامنے اِن کی زندہ ماؤں بہنوں اور بیٹیوں اور یہاں تک کہ اُن کی لاشوں تک کی بے حرمتی کی گئی تو دکھ اور کرب میں کچھ نے حوصلہ ہار بھی دیا ہوگا لیکن بحیثیت مسلمان مسلمان کوئی ایسی حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور کسی مسلمان فوج کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی کا کوئی مقام ہو ہی نہیں سکتا اور یہی وجہ ہے کہ بھارتی فوج اور میڈیا نے پاکستان کے خلاف جو سب سے گھناونا الزام لگایا وہ یہی تھا لیکن تاریخ یہ نہیں کہتی بلکہ یہ سب بنگلہ دیش کے جواز کے طور پر بنگلہ دیش اور بھارت کی طرف سے اچھالا گیا اور ایسے ہونے والے واقعات کو بھی جو معمول کے مطابق ہو رہے تھے پاک فوج کے کھاتے میں ڈال دیا گیا اور اس تعداد کو غیر معقول حد تک بتایا گیا یعنی دو لاکھ۔ لیکن سرمیلا باس کی کتاب Dead Reckoning کے مطابق یہ تعداد ہرگز ہرگز اتنی نہیں تھی، یاد رہے کہ سرمیلا باس خود ایک بنگالی محققہ ہیں جس نے اپنی کتاب میں عینی شاہدین کے بیانات شامل ہیں اور ان واقعات کی مکمل تحقیق کے بعد اسے شائع کیا گیا ہے۔ اگر ایک بنگالی ہندو محققہ نے اس راز سے پردہ اٹھایا ہی لیا ہے تو ہمارے اپنے میڈیا اور محققین کو بھی اس الزام کو پاک فوج کے دامن سے دھونے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ بنگلہ دیش میں مکتی باہنی اور بھارت کا کردار خود اتنا مکروہ اور وحشیانہ تھا کہ اُسے چھپانے کے لیے انہیں بہت سارے حربے آزمانے پڑے۔

بنگلہ دیش مغربی پاکستان سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا اور تین طرف سے بھارت سے گھرا ہوا۔ جس نے اُس کا کام آسان کر دیا تھا پھر اُسے مشرقی پاکستان کی ہندو آبادی کا بھی مکمل تعاون حاصل تھا اور یہ متعصب ہندو مسلسل بھارت نواز بنگلہ دیش قوم پرستوں کی مدد کرتے رہے۔

بھارت جو بھی بیہودہ الزامات لگائے وہ اپنے ماتھے پر لگے درندگی اور دوسرے ملکوں کے معاملات میں بے جامداخلت کے بدنما داغ کو نہیں دھو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ گزشتہ چالیس سال سے پاکستان کے خلاف اس جنگ کے بارے میں بے سروپا پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ امن کی آشا اور امن کی فاختائیں اڑاتا اور اپنے ایک گھنٹے کے دوران دس بار نشر ہونے والے ہر بلٹن میں بھارتی فلموں اور اداکاروں اور اداکاراؤں کی خبر دیتا ہمارا میڈیا آج بھارت کے اِن گھناونے الزامات کی تحقیقات کرکے ان کی حقیقت منظر عام پر لائے اور بھارت کی مدد سے عوامی لیگ اور مکتی باہنی کے مکروہ کردار کو بھی دنیا کے سامنے لائے تاکہ اس ملک اور مٹی کا بھی کچھ حق ادا ہو اور آئندہ کے لیے خدانخواستہ کسی بھی ایسی سازش کا مقابلہ آسانی، مہارت اور کامیابی سے کیا جاسکے۔

جعلی کرنسی بھارت کا اندرونی مسئلہ

بھارت رقبے کے لحاظ سے پاکستان سے کئی گنا اور آبادی کے لحاظ سے بھی چھ گنا سے زیادہ بڑا ملک ہے یعنی ایک بہت بڑا ملک جو بزعم خود برصغیر تو کیا خود کو ایشیا کا لیڈر اور چوہدری سمجھتا ہے اور پاکستان کو ایک چھوٹے اور کم ترقی یافتہ ملک کا درجہ دیتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان سے خوف محسوس کرتا ہے اور یہی خوف ہے کہ اُسے اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے میں پاکستان ملوث نظر آتا ہے ممبئی حملوں سے لے کر کسی فرقہ وارانہ فساد تک کا ذکر پاکستان سے خالی نہیں ہوتا۔ بھارت کا بس چلے تو اپنے سٹریٹ کرائمز اور ذاتی دشمنیوں کا بوجھ بھی پاکستان پر ڈال دے۔ یہ صرف جذباتی باتیں نہیں بلکہ اس کا ثبوت وہ سارے الزامات ہیں جو بھارت ہر واقعے کے بعد پاکستان پر لگاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں جب متعدد ریاستوں میں جعلی کرنسی نوٹ پکڑے گئے تو بھارت سرکار نے اُسے بھی پاکستان کی انٹیلجنس ایجنسی آئی ایس آئی سے منسوب کر دیا اور اس کا میڈیا حسب معمول چیخنے چنگھاڑنے لگا کہ یہ نوٹ ممبئی کے تاجر داؤد ابراہیم نے پھیلائے ہیں داؤد ابراہیم جو بھارت کا سب سے بڑا جرائم پیشہ شخص سمجھا جاتا ہے یہی داؤد ابراہیم ہے جس کا نام ممبئی بم دھماکوں میں بھی لیا جاتا رہا ہے اب اگر یہ نوٹ یہ شخص اور اس کا نیٹ ورک پھیلا رہا ہے تو وہ بھارت کا شہری ہے بھارت

کی حکومت، پولیس اور جاسوسی کے تمام ادارے بشمول راأسے کیوں اب تک گرفتار نہیں کرسکے یا اس کے نیٹ ورک کو کیوں نہیں توڑ سکے۔ وہ کوئی سیاسی شخصیت نہیں جس کو بہت سارے لوگوں کی حمایت حاصل ہو نہ ہی کوئی مذہبی شخصیت ہے جو کسی مذہبی تحریک کی وجہ سے مسلمانوں میں مقبول ہے اور نہ ہی کوئی قوم پرست لیڈر ہے کہ جو بھارت میں چلنے والی درجن بھر سے زیادہ آزادی کی تحریکوں کی طرح کوئی تحریک چلا رہا ہو اور اُسے دشمن قوتوں کی حمایت حاصل ہو پھر اگر بھارت سرکار اُسے گرفتار نہ کر سکے تو اُسے اپنی کمزوری کا اعتراف کرنا چاہیے نہ کہ اُسے آئی ایس آئی کا کارندہ قرار دے۔ بھارت میں کئی دیگر داؤد ابراہیم بھی کام کر رہے ہونگے لیکن داؤد ابراہیم کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یا اس کا نام مسلمان ہونے کی وجہ سے اُسے آئی ایس آئی سے نتھی کر دیا جاتا ہے تو کیا یہی معاملہ بیس پچیس کروڑ مسلمانوں کے بارے میں کیا جا سکتا ہے اگر داؤد ابراہیم جرائم پیشہ ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے اور بھارت میں جب تک یہ تعصب اور دشمن رویہ رہے گا کہ ہر برے کام کے لیے پاکستان کو الزام دیا جائے تو وہ اپنے جرائم پر قابو نہیں پا سکے گا۔ دراصل بھارت اپنے ہاں ہونے والے جرائم اور دہشت گردی سے ایک فائدہ بھی اٹھانا چاہتا ہے کہ اپنے عوام کو پاکستان سے بدظن کیا جائے اور اسی دشمنی کے نام پر ووٹ لے کر حکومتیں بنتی رہیں۔ پاکستان مخالف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے بھارتی حکومت بے دریغ پیسہ بہاتی ہے۔ اس کے میڈیا چینلز اپنے مخصوص لب و لہجے اور انداز

میں پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی اور الزام تراشی میں مصروف رہتے ہیں، اور اپنے ہاں موجود پاکستان مخالف سوچ اور رویے کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ اپنے پروگراموں میں بھاری معاوضوں کے عوض ایسے تجزیہ نگاروں کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس کا پرنٹ میڈیا جس میں انگریزی، ہندی حتیٰ کہ کئی اردو اخبارات بھی پاکستان مخالف مضامین لکھوانے اور چھاپنے میں پیش پیش رہتے ہیں بلکہ یہ کام غیر ملکی لکھنے والوں سے بھی کروایا جاتا ہے۔ یوں وہ کسی بھی زاویے سے پاکستان کی مخالفت کرنے میں پورا زور بازو صرف کرتا ہے اور کسی بھی جرم کے الزام سے خود کو بری کرنے کے لیے اُس کے پاس ایک آسان نسخہ ہے کہ اس کا ذمہ دار آئی ایس آئی کو قرار دے اور اپنے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کے جو بیچارے اپنے مسائل اور روزی روٹی سے اتنی فرصت نہیں پا سکتے کہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ ایک ارب بیس کروڑ آبادی کا یہ ملک سرکاری کاغذوں میں 75% خواندگی ہونے کے باوجود کرہ ارض کی سب سے بڑی ناخواندہ آبادی کا مالک ہے ہر شہر میں لاکھوں بے گھر لوگ دن بھر کی محنت کے بعد رات کھلے آسمان تلے گزارتے ہیں۔ خود دار لحکومت دہلی میں ایک محتاط اندازے کے مطابق دو لاکھ افراد بے گھر ہیں جو سخت سردی، گرمی، بارش اور اولے، ہر موسم یا تو بڑے بڑے پائپوں میں یا کسی ٹین کی چھت یا درخت کے نیچے گزار دیتے ہیں لیکن یہ سارے مسائل بھارتی حکومت کے لیے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن پر وہ تب توجہ دیتے ہیں جب انہیں آئی ایس آئی سے فرصت مل

جائے۔ بھارت نے جعلی کرنسی کیس میں بھارت نیپال اور بھارت بنگلہ دیش سرحدوں کو بھی مشکوک قرار دیا ہے۔ یہ جعلی کرنسی جو مغربی بنگال ،آندھر پردیش، اترپردیش، تامل ناڈو اور گجرات کی ریاستوں میں بکثرت استعمال ہوتے ہوئے پکڑی گئی اب اس سارے معاملے میں پاکستان کا کردار یا آئی ایس آئی کا ہاتھ ایک انتہائی انہونی اور انوکھی بات لگتی ہے۔ تاہم بھارت ہر صورت یہ تعلق جوڑنے پر مصر ہے چاہے یہ جوڑ منطقی لگے یا غیر منطقی اور اس کے لیے اُس نے اپنے میڈیا کو ہر طرح کی سہولیات فراہم کر دی ہیں۔ آئی ایس آئی اگرچہ کوئی بھی کام کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے لیکن اُسے بیک وقت کئی دشمنوں کی مکاریوں کا سامنا ہے اسے سی آئی اے کی سازشوں کا بھی جواب دینا ہے۔ موساد کا بھی توڑ کرنا ہے، بھارت نوازرام کی ریشہ دوانیوں کا جال بھی توڑنا ہے اور راکی مکاریوں کا علاج بھی کرنا ہے ،دشمن کئی بھی ہیں اور طاقتور بھی شاید اس لیے آئی ایس آئی کے پاس اتنا وقت نہ ہو کہ وہ بھارت میں اِن چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث ہوسکے۔ ہاں جب بات پاکستان کی سالمیت کی آئے تویقیناً اس ادارے کی ذمہ داری ہی یہی ہے کہ وہ جان سے گزر کر بھی اپنا فرض ادا کرے نہ صرف آئی ایس آئی بلکہ پاکستان کی حفاظت اور سالمیت پاکستان کے ہر شہری کا فرض ہے۔ لیکن اس وقت داؤد ابراہیم اور جعلی کرنسی جیسے مسائل بھارت کے اپنے پیدا کردہ ہیں اس لیے بھارت اُن سے خود ہی نبٹ لے اور اپنے وسائل اپنے لوگوں کو زندگی کی سہولیات دینے پر صرف کرے پاکستان مخالف پروپیگنڈے پر

نہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں۔۔۔

میمو گیٹ نے پاکستانی سیاست وحکومت کو ہلا کر رکھ دیا ہے اس نے حکومت اور فوج کے درمیان ایک ناخوشگوار ماحول کو جنم دیا اور فوج کے بارے میں غیر محتاط اور سیاسی مقاصد سے بھرپور بیانات آئے۔ اس سارے معاملے کا مرکزی کردار امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی کو حکومت نے ان کے عہدے سے برطرف کر دیا اور ان سے استعفٰی لے لیا گیا۔ سابق وزیراعظم محترم نواز شریف نے میمو کی تحقیقات کے لیے عدالت سے رجوع کیا اور عدالت نے ملوث کرداروں سے جواب طلب کیا جن میں صدر پاکستان، آرمی چیف، آئی ایس آئی چیف، حسین حقانی اور منصور اعجاز میں سے آخرالذکر چار نے اپنے بیانات عدالت عظمٰی میں جمع کروا دیئے۔ منجملہ دوسری باتوں کے اس میمو میں امریکہ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ افواج پاکستان کی قیادت تبدیل کروانے اور ایٹمی اثاثوں تک رسائی دینے کی بھی بات کی گئی جس پر نہ صرف افواج پاکستان بلکہ پوری قوم کو شدید اعتراض ہے۔ منصور اعجاز جس نے اپنے مضامین کے ذریعے یہ طوفان اٹھایا بھی کوئی قابل اعتماد شخص نہیں اور نہ ہی اس کے پاکستان کے لیے کوئی دردمندانہ اور نیک خواہشات ہیں۔ بلکہ وہ ماضی میں بھی پاک فوج کے خلاف مضامین لکھتا رہا ہے اور شاید اسی لیے اس بار بھی اس سازش کے لیے اس کا انتخاب کیا گیا۔ اس میمو سے دو مقاصد حاصل کرنے

کی کوشش کی گئی نمبر ایک فوج کے خلاف سازش اور پھر اس کا بھانڈا پھوڑ کر فوج اور حکومت میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش ۔ بلکہ اس دو دھاری داری تلوار کو ہر رخ سے پاکستان کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اور اس میں مختلف اور نئے نئے زاویے شامل کیے جا رہے ہیں ۔ مثلاََ یہ کہ ڈی جی آئی ایس آئی نے صدر پاکستان کے خلاف سازش کی اور عرب حکومتوں سے مدد طلب کی کہ صدر صاحب کو عہدے سے ہٹایا جا سکے اور اس کے ساتھ ہی وہ قوتیں جواب تک بظاہر خاموش تھیں وہ بھی بول پڑیں ،بلکہ انسانی حقوق کی تنظیم ہیومن رائٹس ایشیا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمادیا کہ آئی ایس آئی کے سربراہ کو جمہوریت کے خلاف سازش پر سزا ملنی چاہیے۔ یوں وطن عزیز ہر ایرے غیرے کی دشنام طرازی کا نشانہ بن گیا اور اسکے ادارے چاہے وفاق ہو، پارلیمنٹ ہو، فوج ہو یا عدلیہ سب ہدف تنقید بن رہے ہیں اور دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ خود ہم پاکستانی اس سازش کی کامیابی میں پیش پیش ہیں حتیٰ کہ وزیر اعظم نے کھُل کر فوج کے خلاف سخت باتیں کہیں جو کہ ان کے عہدے کے ہر گز شایانِ شان نہ تھیں کیونکہ ایک ملک کے سربراہ کو یہ ہر گز زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح کی باتیں کرے مثلاََ وزیر اعظم نے ایک انتہائی نا مناسب بات یہ کی کہ ہم نے فوج کی تنخواہوں میں اضافہ بھی کیا پھر بھی یہ لوگ مطمئن نہ ہوئے تو کیا ہماری فوج صرف تنخواہ میں اضافے پر ملک کے لیے جذبات میں تبدیلی لائے گی، کیا یہ کرایے کے فوجی ہیں۔ بہر حال ہمارے کرتا دھرتاؤں کو ،چاہے ان کا تعلق فوج سے ہو یا حکومت

اور عدلیہ سے وہ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے اپنے عہدے کے وقار کو ملحوظ خاطر رکھیں اور سب سے پہلے ملکی سلامتی کو مد نظر رکھے اور ساتھ ہی اس بات کو بھی ذہن میں رکھے کہ کہیں ہمارے دشمن جو ہمہ وقت ہمارے خلاف سرگرم عمل ہیں ہمیں ہی تو ہمارے خلاف استعمال نہیں کر رہے جیسے میمو کے تمام کردار پاکستانی ہی ہیں لیکن اِن کو استعمال کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے غیر۔ امریکہ عرصہ دراز سے اس کوشش میں مصروف ہے کہ کسی طرح پاک فوج اور حکومت میں اختلافات پیدا کئے جا سکیں جس کے لیے پہلے کیری لوگر بل کا سہارا لینے کی کوشش کی گئی پھر ریمنڈ ڈیوس کے معاملے میں فوج حکومت اور عدلیہ تینوں کو گھسیٹا گیا اور متنازعہ فیصلے پر تنازع کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی اگرچہ اِن معاملات کو وقتی طور پر حل تو کر لیا گیا لیکن اِن کے ذریعے اداروں میں نفرت کا بیج ضرور بو دیا گیا اور اسی سال دو مئی کے واقعے نے اس بد ظنی کو نا قابل علاج حد تک زیادہ کر دیا۔ دوسری طرف یہ طاقتیں جو حکومت اور فوج کو لڑا کر ملک کو کمزور کرنے کے درپے ہیں خود بھی الزام تراشی میں کسی سستی کا اظہار نہیں کر رہیں اور آئی ایس آئی پر براہ راست دہشت گردی میں ملوث ہونے کا الزام لگا رہی ہیں اور افغانستان اور بھارت اپنے ہاں ہونے والے دہشت گردی کے ہر چھوٹے بڑے واقعے کی ذمہ داری آئی ایس آئی پر ڈال رہے ہیں۔ ان اقدامات کو براہ راست آئی ایس آئی سے منسوب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئی ایس آئی اپنے مشنز کے لیے حکومت سے اجازت طلب نہیں کرتی۔

دشمن تو اپنا کام کر رہے ہیں کیونکہ اسی میں ان کا مفاد ہے اور ایک کمزور پاکستان ان کے بقا کی ضمانت ہے کیونکہ یہی ایٹمی پاکستان انکے جارحانہ عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس دن پاکستان پورے دم خم سے اِن کی راہ میں کھڑا ہوگیا وہ اپنے ارادوں کو کم از کم آسانی سے عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ نیٹو سپلائی کی پابندی اسکی تازہ ترین مثال ہے، بے نتیجہ بون کانفرنس بھی پاکستانی قوت کا اظہار ہے اور چاہے اِن دشمن قوتوں کو یہ سب کچھ بُرا لگا ہوتا ہم ملک کے اندر اس فیصلے کو بے حد پذیرائی ملی اگرچہ یہ فیصلہ فوج اور حکومت کا متفقہ تھا لیکن اسے بھی فوج کے کھاتے میں ڈال کر بین الاقوامی سطح پر اِسکے خلاف نفرت کی وجہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ بہر حال یہ فیصلہ حکومت نے کیا یا فوج نے قابل تحسین ہے لیکن قابل تشویش بات یہ ہے کہ دشمن بڑی کامیابی سے دو دورائے پیدا کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اختلاف رائے انسان کا بنیادی حق ہے لیکن ملکی سالمیت اور قومی وقار میں دو رائیں ہونا یقیناً خطرناک ہے۔ اس معاملے میں ہمارے کچھ اینکر پرسن جو الیکٹرانک میڈیا پر کافی حد تک قابو رکھتے ہیں مسلسل اس مسئلے کو ہوا دیئے جا رہے ہیں تنقید برائے تعمیر میں کوئی حرج نہیں لیکن تنقید برائے تنقید تباہ کن ہوتی ہے میڈیا سے میری یہی درخواست ہے کہ آپکے چینل کی ریٹنگ ایک بہت چھوٹا ایشو ہے اس دوڑ میں ملک کو تباہی کے کنارے مت پہنچایئے آپ کی ریٹنگ اگلی ششماہی میں بڑھ جائے گی لیکن ملک جو نقصان

اٹھائے گا اس کا مداوا بہت مشکل ہو گا۔ یہ وقت اداروں اور شخصیات کو لڑانے کا نہیں بلکہ ملک و قوم میں اتحاد قائم کرنے کا ہے اور خود اپنی فوج اور آئی ایس آئی کو شکست دینے کا نہیں بلکہ دشمن قوتوں کو ناکام کرنے کا ہے، نہ ہی یہ وقت فوج اور حکومت کا ایک دوسرے پر حملے کرنے کا ہے بلکہ سلالہ جیسے حملے روکنے کا ہے، ڈرونز سے نجات حاصل کرنے کا ہے۔ امریکہ، بھارت، اسرائیل کی سازشوں اور افغانستان کے بدنیت حکمرانوں کے حیلوں کے توڑ کرنے کا ہے اور اگر ہم اپنے اداروں کے خلاف برسرپیکار ہو گئے تو ہم کسی غیر کا جواب دینے کے قابل نہیں رہیں گے۔

محمد علی جناح

ہندوستان پر ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد جب مسلمان عیش پرست ہو گئے تو نہ ہندوستان ان کا رہا اور نہ ہی حکومت۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً مسلمان رہنما اٹھتے رہے جن میں سید احمد شہید، شاہ ولی اللہ اور سرسید جیسے جید اور مخلص رہنما بھی شامل تھے نہ تو جن کی صلاحیتوں میں شک تھا، نہ خلوص میں اور نہ کوششوں میں اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس قوم میں زندگی کی رمق باقی رہی۔ لیکن اس تمام جدوجہد کے باوجود اس بہت بڑے ملک میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو یکجا نہیں کیا جا سکا اور وہ دو سو سال تک انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارتے رہے۔ ان کے مسائل و مصائب دور کرنے کے لیے جس توانائی اور فہم وفراست کی ضرورت تھی اس کے لیے ان لوگوں نے دو صدیوں تک انتظار کیا اور اس عرصے میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ رہا نہ تو وہ تعلیم میں آگے تھے نہ ملازمتوں میں کہیں نظر آتے تھے اور نہ ہی سیاست میں ان کی اتنی نمائندگی تھی جتنی ہندوؤں کی۔ اور یہی اجارہ داری تھی جو مسلمانوں کو مزید سے مزید دبائے جا رہی تھی اور انہیں دوسرے درجے کے شہری سمجھا جا رہا تھا شاذونادر ہی کوئی مسلمان کسی اچھے عہدے تک پہنچتا تھا جبکہ ہندو اپنی ریشہ دوانیوں کی بدولت خود کو قابض حکومت کے قریب رکھ کر ہندوستان کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا ایسے میں مسلمانوں

کو حقیقتاً ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو انہیں ان اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا۔ اور مسلمانوں کی خوش قسمتی کہ ان کا ایک ہی لیڈر نہ صرف ہندوؤں بلکہ انگریزوں سب کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا۔ قائدِاعظم محمد علی جناح درحقیقت مسلمانانِ ہند کے لیے ایک رحمت اور نجات دہندہ ہی کی حیثیت رکھتے تھے جنہوں نے نہ صرف مخالفین کا مقابلہ کیا بلکہ بغیر کسی تشدد کے کیا۔ ان کی بارعب اور متوازن شخصیت کے آگے نہ تو کبھی سیاسی مخالفین جم سکے اور نہ ہی حکومت ۔ بلکہ قائدِاعظم کی شخصیت کے آگے کبھی کسی کو غیر محتاط رویہ تک اپنانے کی ہمت نہ ہوئی اور یہ صرف اور صرف ان کے خلوص نیت اور پاکیزگی کردار کی بدولت تھا۔ یہ بے داغ سیاسی کردار ہی تھا جس نے دنیا کا نقشہ بدل دیا اور کرہ ارض پر ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا۔ بظاہر یہ ناممکن تھا کیونکہ انگریز اور ہندو مد مقابل تھا ایک کے پاس طاقت اور حکومت تھی اور دوسرے کے پاس اکثریت اور مکاری ۔ مسلمان دس کروڑ ہونے کے باوجود ہندوستان میں اقلیت میں تھے لیکن اتنی بڑی اقلیت کہ یہ کسی بھی آزاد مسلمان ملک سے بڑی مسلم آبادی تھی۔ اور آزادی ان کا حق تھا جسے اس باہمت لیڈر نے اپنے تدبر اور ذہانت سے حاصل کرکے دکھایا حالانکہ اُس کے سدِ راہ صرف غیر نہیں اپنے بھی تھے کچھ مسلمان لیڈروں نے بھی پاکستان کی مخالف کی لیکن اِن ساری مخالفتوں پر قابو پانا قائدِاعظم ہی جیسے لیڈر کے لیے ممکن تھا۔ سٹینلے والپرٹ جو یونیورسٹی آف کیلے فورنیا میں تاریخ کے پروفیسر رہے نے جناح آف

few پاکستان نامی اپنی کتاب میں قائدِاعظم کواِن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ individuals significantly alter the course of history, fewer still modify the map of the world, hardly any one can be credited with creating a Nation State, Muhammad Ali Jinnah did all three. قائدِاعظم نے واقعتاً تاریخ بدلی دنیاکا نقشہ بدلا اور ایک نئی قوم اور نیا ملک بنایا۔ ملک تو بن گیا لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ قائدؒ کو وقت نہ مل سکا کہ وہ اس ملک کو مستحکم کرتے اوراپنے بعد آنے والوں کی سیاسی تربیت کرتے۔ خود قائدؒ کہا کرتے تھے کہ میری جیب میں زیادہ تر سکے کھوٹے ہیں اور یہی سیاسی بدقسمتی تھی جس نے روزاول سے ہی پاکستان کو گھیرے میں لیے رکھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ ملک قائم ہے اوراس کا وجود شاید اسکے بنانے والے کی ایمانداری کا ثمرہ ہے۔ ورنہ دل اس وقت شدید دکھ اور درد محسوس کرتا ہے جب اس ملک کے سیاستدانوں سے لے کرایک عام شخص تک کرپشن میں ملوث نظر آتا ہے اور یہ کرپشن صرف مالی نہیں بلکہ حکومت اور اقتدار کا چور دروازوں سے حصول، اداروں کی تباہی اور فرائض سے غفلت یہ سب ہی کرپشن کے زُمرے میں آتا ہے اور ہم میں سے ہرایک اس سب کچھ کا مجرم ہے لیکن دوسرے کو اس کاالزام دیتا ہے۔ آج جب ہم قائدِاعظم محمد علی جناح کاایک سوپینتیسواں یوم پیدائش منارہے ہیں توکیا ہی بہتر ہو کہ اُن کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہوئے ہم اپنی خامیوں پر نظر کریں،ان کے

نام پر سیمینار اور اجلاس منعقد کر کے چائے پانی کا بندوبست کرنے کی بجائے ہمیں مستقبل کے لیے کچھ ایسے منصوبے بنانے ہونگے ۔کچھ ایسی راہیں اپنانی ہونگی جو منزلوں کا تعین کر سکے۔ اس وقت اس قوم کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ ایمانداری کے ساتھ کام ہے اور ہمیں یہ محنت اور کام ہر سطح پر کرنا ہوگا کیونکہ کام کام اور بس کام ہی اس قائد کا پیغام تھا۔ 24 نومبر 1945 کو مردان میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ہمیں ہر قیمت پر پاکستان حاصل کرنا ہے اسی کے لیے ہمارا جینا اور مرنا ہے آپ کام کریں اور سخت کام اسی طرح آپ دس کروڑ مسلمانوں کی عزت.بڑھانے میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔

یکم جولائی 1948 کو انہوں نے سٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی معیشت کو خود اپنی طرز پر مستحکم کرنے اور ساتھ ہی محنت کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنی قسمت خود بنانی ہے۔

آج ہم اگر قائداعظم کے انہی اصولوں کو اپنی سیاسی اور قومی زندگی میں بطور رہنما شامل کر لیں تو ہم اپنے بہت سے مسائل سے نجات حاصل کر لیں گے لیکن ہمیں اپنے ہر عمل میں وہی خلوص شامل کرنا ہوگا جو بانی پاکستان کا طرہ امتیاز رہا ہے ہم اس وقت واقعی مشکل ترین حالات سے گزر رہے ہیں ایسے حالات جن میں ہمارے ادارے تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں ہمیں اپنی محنت کو کئی گنا

بڑھانا ہوگا اور جتنا ہم معاشی اور معاشرتی طور پر مستحکم ہونگے اتنا ہی ہم دنیا میں بہتر مقام حاصل کر سکیں گے ہمیں استحکام پاکستان کو اپنی پہلی ترجیح بنانا ہوگا، پاکستان کے ہر ادارے کو پورا پاکستان سمجھ کر سنبھالنا ہوگا صرف اور صرف خلوص نیت اور محنت ہمارے مسائل کا آخری حل ہے۔ بلاشبہ یہی بہترین طریقہ ہے اپنے قائد کو خراج تحسین پیش کرنے کا تب پھر یہ نہ کہیں گے ارض و سمائ ہم دن ہی منایا کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے ملک کی حفاظت کرے۔

ہماری زراعت پر امریکی حملہ

امریکہ اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ انتہائی غیر معمولی اور غیر یقینی رہے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد بین الاقوامی جنگ نے ان تعلقات کو مزید متنازعہ بنادیا ہے۔ عوام کی مرضی کے خلاف حکومتی سطح پر یہ تعلقات قائم رکھے گئے اور عوام کے بار بار اصرار پر بھی اُن پر نظر ثانی تک نہیں کی گئی فضائی اور زمینی حدود کی خلاف ورزی کو بڑی خاموشی اور غیر ضروری تحمل کے ساتھ .برداشت کیا جاتا رہا۔ ملکی سڑکیں.بڑے .بڑے کنٹینرز کے پہیوں تلے روندی جاتی رہیں سڑکیں تباہ ہوتی رہیں اور نیٹو اور امریکہ اپنی جنگ بغیر کسی رکاوٹ کے.بڑے تسلسل سے لڑتی رہے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی ایک الگ مسئلہ ہے تاہم ہماری حکومتوں نے اپنے تعاون میں کسی طرح کی کمی نہیں چھوڑی ۔ دو مئی کو اسامہ بن لادن کی ہلاکت کا ڈرامہ یا چلئے حقیقت لیکن یہ کاروائی پاکستان کے اندر آ کر کی گئی ،حکومت کو اس کی خبر تھی یا نہیں لیکن اس کے بعد بھی حالات سنبھالنے کی کوشش کی گئی یہ اتار چڑھاؤ آتے اور جاتے رہے اور پھر پچیس چھبیس نومبر کی درمیانی رات کو مہمند ایجنسی میں سلالہ چیک پوسٹ پر حملے نے پوری قوم اور پوری فوج کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایسے میں حکومت کو دباؤ کے تحت یا کسی بھی وجوہ کی بنا پر امریکہ کے ساتھ اتحاد کے معاملے میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنا پڑی ۔ وہ

ملک جو افغانستان میں اپنی جنگ کے لیے پاکستان کو استعمال کرنے کے باوجود اس کا اعتراف کرنے کا تکلف بھی نہیں کرتا تھا بلکہ ہر بار ڈو مور کا مطالبہ آجاتا تھا اور ساتھ ہی پاکستان کے خلاف ایک لمبی چارج شیٹ بھی رکھ دی جاتی تھی یعنی ہر بار الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی مثال ہو جاتی تھی۔ بہر حال اب جبکہ امریکہ کو پہلی بار پاکستانی تعاون سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں اور اُس کو ایک گیلن پٹرول ایک ہزار ڈالر میں پڑ رہا ہے اور اس کو ایک لمبے راستے سے افغانستان میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے آنا پڑ رہا ہے تو اُسکی پاکستان کے لوگوں سے محبت اور انکی فلاح کے تمام جذبات ختم ہو چکے ہیں اور اُس نے اِس ملک کی امداد بند کرنے کے بے شمار بہانے ڈھونڈنے شروع کر دیئے ہیں ۔نہ اب اُسے اس ملک کی زراعت سے دلچسپی ہے نہ صنعت سے، اور امریکہ نے پاکستان کی سات سو ملین ڈالرز کی وہ امداد بند کر دی جو مصنوعی کھاد کیلشیم امونیم نائٹریٹ کی تیاری پر خرچ ہو رہی تھی۔ یہ کھاد صحرائی، ریتلی اور خشک زرعی زمینوں پر لگائی جانے والی فصلوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔پاکستان میں یہ کھاد پچھلے چالیس سال سے بن رہی ہے۔ دنیا میں اس کھاد کی سالانہ پیداوار 3.7 ملین ٹن ہے جس میں سے 2.89 ملین ٹن یورپ میں بنتی ہے جبکہ پاکستان میں یہ پیداوار 0.6 ملین ٹن یعنی بہت کم ہے۔ دہشت گردی کی جنگ نے پاکستان کو بہت سارے کردہ و ناکردہ جرائم کا مجرم بنا دیا ہے،امونیم نائٹریٹ دراصل وہ کھاد ہے جسے دہشت گردوں نے دیسی ساختہ بموں میں سب سے زیادہ استعمال

Improvised یعنی IED کیااس کھاد میں 68% نائٹرک ایسڈ استعمال ہوتی ہے اور
Explosive Devise تیار کرنے کے لیے 60% نائٹرک ایسڈ استعمال ہوتی ہے۔
یہی کھاد 1995 امریکہ میں اوکلو ہامہ بم دھماکے میں استعمال کی گئی جس میں 168
جانیں ضائع ہوئی تھیں۔اس کھاد پر امریکہ کی طرف سے نومبر 2009 میں پابندی
لگائی گئی اور واقعے کے پندرہ سال بعداس کھادکے خلاف قانون سازی کی گئی اور اس
کے ساتھ ہی پاکستان میں اس کی پیداوار کی مد میں دی جانے والی امداد بند کردی گئی۔
پاکستان میں یہ کھادپاک عرب تعاون سے چلنے والی فاطمہ فرٹیلائزر میں تیار کی جاتی
ہے جس کی فیکٹری ملتان کے قریب ہے۔امریکہ کی الزام تراشی یہ تھی کہ افغانستان
میں ہونے والی دہشت گردکاروائیوں میں استعمال ہونے والی یہ کھادپاکستان سے
افغانستان پہنچتی ہے۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے ہمسایہ ممالک میں سے
بھارت اور وسط ایشیائی ممالک بھی یہ کھاد تیار کرتے ہیں اور یہ کھاد ان ممالک میں سے
کسی بھی ملک سے افغانستان پہنچ سکتی ہے کیونکہ امریکہ مخالف افغان کسی بھی طرح
اسے حاصل کر سکتے ہیں لہذاپاکستان پر یہ پابندی صرف اور صرف پاکستان دشمنی کی
مثال ہے اور دباؤبڑھانے کاایک حیلہ۔کیونکہ یہ ملک دنیاکے اُن ملکوں کی فہرست
میں شامل ہے جس میں پانی کی شدید کمی ہے اور یہ کمی 2035 میں ایک ہزار مکعب
میٹر تک پہنچ سکتی ہے جبکہ یہی مقدار 1950 میں پانچ ہزار مکعب میٹر تھی۔ایک ایسے
ملک کے خلاف امریکی پابندیاں اس کی دھونس پر مبنی ہے

کیونکہ وہ ہر صورت پاکستان کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ امریکہ کی خدمات سرانجام دیتا رہے اور اپنے لوگوں اور اپنی فوجوں اور پولیس کی قربانی دیتا رہے۔ یہ کھاد جس کے لیے پاکستان کو موردالزام ٹھہرایا جا رہا ہے وہ پاکستان میں ہونے والے دھماکوں اور دہشت گردی کے واقعات میں سب سے زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ 2002-2011 تک ہونے والے 67% دھماکوں میں یہی مرکب استعمال ہوا ان دھماکوں میں خیبر پختونخواہ میں 2053 اور بلوچستان میں 2073 سیکیورٹی اہلکار اور سویلین شہید کیے گئے یوں سب سے زیادہ نقصان اس نے پاکستان میں ہی کیا لیکن دوسری طرف یہی کھاد ہمارے چھوٹے کسانوں کے لیے پیام زندگی لاتی ہے اور ان کی خشک اور بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنا کر اُن کی گزر اوقات کا بھی بندوبست کرتی ہے اور اس پر پابندی کا مطلب اِن سارے لہلہاتے کھیتوں کو بنجر بنانا ہے اور ایک ملک جو پہلے ہی پانی کی عدم دستیابی کی بنا پر خوراک کی کمی کے خطرے سے دوچار ہے اُسے مزید مسائل سے دوچار کرنا ہے وہ بھی اس صورت میں جب پاکستان نے دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی مکمل تعاون کیا اور کھاد اور تھیلوں کے رنگ میں بھی تبدیلی کی تاکہ اُس کی پہچان نہ ہو سکے لیکن یہ سمجھنا کہ ہر دھماکے میں استعمال شدہ دھماکہ خیز مواد پاکستانی کھاد سے حاصل شدہ مرکبات سے ہی بنایا گیا ہے خود دوسرے اطراف سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے کیونکہ یہی کھاد ظاہر ہے انہی کیمیائی عناصر اور تناسب سے ایران اور ازبکستان یا بھارت میں بھی بنتی ہے اور وہاں سے بھی بڑی آسانی

سے افغانستان میں پہنچائی جا سکتی ہے اور اگر یہ پاکستان سے افغانستان سمگل ہوتی ہی ہے تو کیوں نہ جدید امریکی امداد سے لیس افغان حکام اسے پکڑ لیتے ہیں۔ پاک افغان سرحد آسان نوعیت کی نہیں بلکہ اس کی جغرافیائی ساخت اور بناوٹ اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی بھی جگہ سے سیکیورٹی فورسز کی نظروں میں آئے بغیر بھی اسے عبور کیا جا سکتا ہے اس لیے دونوں طرف کی چوکیوں کو مستعد رہنے کی ضرورت ہے صرف پاکستان کو اس کی ذمہ داری اور الزام دینا کسی بھی طرح درست نہیں۔ لہٰذا جناب کرزئی اپنے حصے کی کوتاہیاں بھی ہمارے پلڑے میں نہ ڈالیں اور پاکستان جہاں ان ہی کے کئی کرتوں اور جرائم کی سزا بھگت رہا ہے اُسے مزید مصیبت میں نہ ڈالیں اور امریکہ بھی اپنی سپلائی لائن کٹنے کی دیگر وجوہات پر غور کرے اور اُسے بجائے امداد سے منسلک کرنے کے پاکستان میں اپنی مداخلت سے منسلک کرے کیونکہ جب تک وہ پاکستان کے ساتھ اپنے غلام اور آقا والے رویے میں تبدیلی نہیں لائے گا تب تک وہ پاکستانیوں کے دل نہیں جیت سکے گا یہ تو صرف ایک امداد ہے ہماری معیشت ، مواصلات اور امن کی تباہی کا ایک بہت بڑا قرض تو امریکہ کے ذمے ابھی بھی واجب الادا ہے۔

میمو گیٹ ! تنقید بجا لیکن۔۔۔

میمو گیٹ نے تقریباً تین ماہ سے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس سازش کا انکشاف ہونے پر قوم واقعی ششدر رہ گئی کیونکہ اس میں بڑے بڑے نام شامل تھے اور پھر یہ معاملہ عدالت میں پہنچا تو بھی اس کے فیصلے کا انتظار کرنے کی بجائے ہر طرف سے تبصروں اور تجزیوں کی زد میں رہا۔ اظہار رائے کی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے اس لیے اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا لیکن اگر اس اظہار رائے کی آزادی کی آڑ میں ملک اور اس کے اداروں کو نقصان پہنچایا جائے تو پھر اسے رک جانا چاہیئے۔ لیکن معاف کیجئے گا ہمارا الیکٹرانک میڈیا اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اس وقت کچھ زیادہ مثبت کردار ادا نہیں کر رہا۔ ایشوز کو اپنی ریٹنگ بڑھانے کیلئے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور پھر اداروں کے اوپر باقاعدہ حملہ آور ہونا کسی بھی طرح درست نہیں۔ ہمارے ٹاک شوز تو باقاعدہ کسی دنگل کا منظر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اینکرز خواتین و حضرات پروگراموں کے دوران اپنی رائے مہمانوں پر ٹھونسنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور باقاعدہ فریق بن جاتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی اختلاف رائے برداشت کرنے کا روادار نہیں ہے۔ ہمارے کچھ اینکر پرسنز تو ملکی حالات کو اپنے قابو میں رکھنے کیلئے ہر حربہ آزماتے ہیں اور سچ بات یہ ہے کہ ان کی پہنچ ہے بھی بہت دور تک۔ یہ

طالبان کے ان ان لیڈروں تک سے ملاقات کر آتے تھے جہاں تک انٹیلیجنس ایجینسیاں بھی نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ یہ مشکوک بات بھی ہوتی تھی اور حیران کن بھی کہ آخر یہ لوگ وہاں تک پہنچ کیسے جاتے ہیں کہ جلتے ہیں جبرائیل کے پر جس مقام پر اور پھر اپنے اداروں کو ہدف تنقید بنا دیتے ہیں اور یہ اعزاز الیکٹرانک میڈیا کے چند چنیدہ اینکرز پرسنز کو ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ ایک عام اور سچا صحافی اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں سے اتنا وقت ہی نہیں نکال پاتا کہ وہ ایک سراغرساں بن سکے وہ تو غم روزگار میں غلطاں و پیچاں اپنے شعبے کے ان لوگوں کے ٹھاٹ باٹ ہی دیکھتا رہتا ہے جن کی چڑیائیں انہیں خبریں لا لا کر دیتی ہیں اور وہ ان کی طرح در در کی ٹھوکریں کھائے بغیر تخت طاؤس پر بیٹھے رہتے ہیں اور کچھ زیادہ سال پہلے کی بات بھی نہیں جب یہ لوگ انہی کی طرح موٹر سائیکل پر گھوم گھوم کر خبریں اکٹھی کرتے تھے لیکن اب ان کے کارندے اور چڑیائیں ان کیلئے ''چراغ کے جن'' کی طرح ہر خدمت سرانجام دیتے ہیں اور یہ بڑی بڑی ٹپس اور عظیم الشان انعامات اور معاوضے پاتے ہیں حیرت کی بات ہے کہ آخر کیسے صرف یہ چند ہی لوگ اتنے باصلاحیت ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی صلاحیتوں کو بڑے سوچے سمجھے طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہو کبھی حکومت کے خلاف اور کبھی دوسرے اداروں کے خلاف۔ آج کل انہی ''میزبانانِ گرامی'' میں سے کچھ اسی طرح چڑیوں اور ذرائع سے خبریں حاصل کرتے ہیں اور فوج کے خلاف حیرت انگیز حد تک قابل اعتراض بیانات دے رہے ہیں۔ اگرچہ

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا پورا میڈیا ایسا نہیں کر رہا لیکن ایک گروہ فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف بیانات کو ہی میڈیا کی معراج سمجھے ہوئے ہے مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ اس سب کچھ کے قومی اور بین الاقوامی منفی اثرات قوم اور ملک پر پڑیں گے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک مضبوط اور مستحکم فوج ہی ایک مستحکم پاکستان کی ضمانت ہے۔ سپریم کورٹ نے ابھی میمو کیس کو صرف قابل سماعت گردانا ہے لیکن یہ سارے انتہائی با خبر لوگ فوج پر برس پڑے ہیں جبکہ عدالت اور ججوں کو بھی نا قابل اعتبار قرار دے دیا گیا جن کو جب تک مرضی کے فیصلے آتے رہے تو فقید المثال قرار دیا جاتا تھا۔ حقانی کی وکیل عاصمہ جہانگیر نے دوران سماعت افواج پاکستان کی عقل کو جس طرح ٹخنوں میں قرار دیا وہ آپ یا تو بچوں سے کہہ سکتے ہیں یا ذاتی بغض و عناد نکالنے کیلئے یہ الفاظ ادا کر سکتے ہیں اور یہ رویہ بھی درست نہیں کہ خود کو ہی عقل کل سمجھ کر دوسروں کی تضحیک کی جائے۔ لیکن ان خاتون کا رویہ بھی فوج کے بارے میں منصور اعجاز سے کچھ کم نہیں اور جس طرح وہ کمرہ عدالت سے نکلنے کے بعد عدالتی کاروائی پر بیانات دیتی ہیں وہ سراسر عدالت پر اثرانداز ہونے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ خاتون جو کہ ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ کہلاتی ہیں ہر معاملے میں ان کے معیار مختلف اور اپنی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں جہاں وہ توہین رسالت کے قانون کو قابل اعتراض سمجھتی ہیں وہاں وہ ایک ارب مسلمانوں کی دل آزاری کو انسانی حقوق کی کوئی

خلاف ورزی نہیں سمجھتی نہ اس نے ''ڈرا محمد'' کے قبیح ڈرامے پر ایک لفظ کہا نہ ٹیری جونز کی حرکت پر۔ بال ٹھاکرے سے وہ اسی کے مقدس رنگ یعنی نارنجی کپڑوں میں بڑی مریدیت سے ملاقات کرتی ہیں لیکن اپنے جرنیل اس کی نظر میں قابل سزا ہیں جو اس ملک کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اگر بات اصولوں پر اختلاف کی ہوتی تو اور بات تھی کیونکہ ہماری فوج اور جرنیل کوئی شجر ممنوعہ نہیں جن کے بارے میں کچھ نہ کہا جا سکے لیکن یہ صاحبہ اور ہمارے چند ایک اینکرز صرف اور صرف مخالفت کو ہی اپنی مقبولیت کا زینہ سمجھتے ہوئے بڑے خضوع و خشوع سے اختلاف میں مصروف رہتے ہیں اور اسے اپنی بہادری گردانتے ہیں جبکہ بڑی بہادری یہ بھی ہے کہ اپنے مخالف کی اچھی بات کی بھی تعریف کر دی جائے لیکن یہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔ دراصل شہرت اور دولت وہ جنس گراں مایہ ہیں جنہیں یہ ہر صورت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ اسے ہر صورت اسے لپیٹنے میں مصروف رہتے ہیں، چلیئے اس پر بھی اعتراض نہیں لیکن اس کیلئے جو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں وہ ضرور قابل اعتراض اور قابل غور ہیں۔ ہمارے کچھ '' عقل کل '' قسم کے اینکرز جو اپنے پروگرام بھی پاکستان سے کرنا پسند نہیں کرتے ہیں باہر بیٹھ کر ملکی حالات پر تبصرے کرتے ہیں اور بمعہ اہل و عیال قومی اداروں کی مٹی پلید کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ایسے ہی ایک بیٹی ماریہ سیٹھی نے وال سٹریٹ جرنل میں پاک فوج کے خلاف ایک مضمون لکھا جس

اور اسی پر Pakistan Army is the Real Obsticle to Peace کا عنوان تھا انہیں شہرت اور دولت دونوں سے نوازا گیا۔ کمال اس عام سے مضمون کا نہیں بلکہ اس کے موضوع کا تھا جو مغرب میں پسندیدہ ترین ہے اور اس پسندیدگی کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ یہ واحد اسلامی ایٹمی قوت کے خلاف ہے کیونکہ مغرب طاقت کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے اور مغرب کی چاکری کو ہمارا فرض۔

ہمارے اینکرز اور محترمہ عاصمہ جہانگیر صاحبہ سے بصد ادب یہ درخواست ہے کہ میں آپ جیسی کوئی "عقل کل" نہیں ہوں اور نہ ہی بااثر لیکن ایک دردمند پاکستانی کی حیثیت سے آپ سے یہ درخواست ضرور ہے کہ اگر آپ کی عقل آپ کو اسامہ بن لادن تک پہنچا سکتی ہے ،بقول آپ کے اقتدار کے ایوانوں کے تمام فیصلے آپ کے پاس پہنچائے جاتے ہیں ،آپ اسی عقل سے سالہاسال پہلے پیشن گوئیاں کر سکتے ہیں ،آپ ہی بادشاہ گر ہیں اور انہیں سارے ہنروں کے ذریعے آپ آج دولت میں کھیل رہے ہیں تو یہ ذہن میں رکھیئے کہ یہ ملک ہے تو آپ کے یہ سارے ہنر ہیں ،نام ہے، شہرت ہے اگر یہ نہ رہا تو کچھ نہ رہے گا۔ فوج پر تنقید کریں اور عدالت کو یہ احسان بھی یاد دلائیں کہ اس کی بحالی کیلئے آپ نے ہی تو سب کچھ کیا تھا عام وکیل اور عام صحافی کی تو آپ حفاظت پر مامور تھے کہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ ادارے جن کی شکست و ریخت کیلئے آپ کوشاں ہیں یہی آپ کی بقا کی بھی ضمانت ہیں۔

یہ

رہیں گے تو آپ آزاد ہیں، خدانخواستہ یہ نہ رہے تو غلام اور غلام غلام ہی ہوتا ہے مالک نہیں بنتا آپ نے امن کی بڑی آشائیں باندھیں.بڑی پتنگیں اڑائیں لیکن بھارت میں آج بھی مسلمان ذلیل و خوار ہے اور سب سے کم شرح خواندگی ان کی حالت زار کا منہ بولتا ثبوت ہے ایسا صرف اس لیے ہے کیونکہ وہ آزاد نہیں، اپنے ملک پر فخر کریں اداروں پر تنقید گناہ نہیں بلکہ اگر مثبت ہو تو فائدہ ہی فائدہ ہے لیکن تنقید ملکی مفاد کی خاطر کریں، انہیں سیدھے راستے پر لگانے کیلئے کریں اپنی ذاتی شہرت اور بے اندازہ دولت میں اضافے کیلئے نہیں۔

اداروں کا احترام ۔۔۔ زبانی کلامی

وطن عزیز میں ایک عجیب سی رسم چلی ہے کہ جہاں آپ کے خلاف کوئی عمل کوئی فیصلہ ہوا ہم بحیثیت قوم بھی اور حکومت بھی اس پورے ادارے کے خلاف ہو جاتے ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ہم اداروں کی تباہی کے لیے سرگرم ہیں تو بھی غلط نہ ہوگا اور زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ایسا کرنے میں ہماری حکومتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتی بلکہ حکومتی سطح پر یہ کام زیادہ اختیارات کے ساتھ زیادہ انہماک کے ساتھ کیا جارہا ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان اور ہمارا میڈیا بھی اس کام میں حصہ بقدر جثہ ڈال رہے ہیں اگرچہ عوامی سطح پر بھی یہ رویہ موجود ہے تاہم یہاں اس کی اہمیت اس لیے کم ہو جاتی ہے کہ ان کی آواز اپنے ہی حلقے میں دب کر ختم ہو جاتی ہے اور مزید دکھ کی بات یہ بھی ہے کہ غلط پالیسیوں پر بھی عوامی آواز نہیں اٹھتی کیونکہ عوام کو غم روزگار سے ہی فرصت نہیں وہ کبھی بجلی کی لوڈشیڈنگ کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں اور کبھی گیس کی۔ ایسے میں وہ حکومتی پالیسیوں پر سوائے گھر کی بیٹھک میں بیٹھ کر تنقید کرنے کے اور کیا کر سکتے ہیں اور ایسے میں اختیارات کے حامل لوگ بڑے سکون سے قوم اور ملک کی قسمت کو اپنے مطابق موڑنے میں مصروف رہتے ہیں اور یہی سب کچھ اب بھی کیا جارہا ہے۔ میموگیٹ سکینڈل نے پوری قوم کو اپنے حصار میں لیا ہوا

ہے اور حکومت اور اداروں میں ٹکراؤ کی سی صورتحال ہے جو یقینا ریاست کے لیے خطرناک ہے۔ ہمارے سیاستدان جو جمہوریت کا نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن اس کے اصل حسن یعنی اختلاف سے انہیں شدید اختلاف ہے اور جو نہی انہیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑے اس سے انحراف ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔ یہی کچھ اس وقت ہو رہا ہے عدالت سے اختلاف ، فوج سے اختلاف بلکہ عوام سے بھی اختلاف اور اس وقت حکومت فوج، عوام اور عدالت تینوں سے برسرپیکار ہے۔ عدالت نے میموگیٹ کا از خود نوٹس نہیں لیا تھا اور نہ ہی فوج نے یہ پٹیشن داخل کروائی تھی بلکہ اسے مسلم لیگ ن کے جناب نواز شریف کی طرف سے داخل کروایا گیا تھا جس پر ظاہر ہے کہ عدالت کو کاروائی کرنی تھی ۔اس لیے یہ کہنا کہ عدالت اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہی ہے بالکل غلط ہے کیونکہ جب ایک کیس عدالت میں پہنچا دیا گیا تو پھر اُس کا نوٹس نہ لینا دراصل اختیارات سے تجاوز ہے۔ لہذا اگر کوئی ادارہ کام کر رہا ہے تو اُسے کام کرنے دیں اسی میں ملک کی بہتری ہے اگر میموگیٹ کی غلطی ہو چکی ہے تو اُسے درست کرنے کی کوشش کی جائے نہ کہ مخالفت برائے مخالفت اور صرف حکومت بچانے کے لیے ملک کو داؤ پر نہ لگایا جائے۔ ملک رہے گا تو حکومت رہے گی ورنہ یہ شان و شوکت رہے گی نہ کرّوفر نہ ہی گاڑیوں کے لمبے لمبے محافظ قافلے۔ حکومت کو سب سے پہلے اس رویے کو اپنانا ہو گا کہ اداروں کے آئین پاکستان کے مطابق تفویض کردہ اختیارات میں مداخلت نہ کرے اور اگر کوئی ادارہ اپنے فرائض کو بخوبی سر

انجام دے رہا ہے تو اُس کے ساتھ تعاون کرے ہاں جہاں کوئی بھی ادارہ یا شخص ملک کو نقصان پہنچائے تو یقینا کوئی ماورائے قانون و آئین نہیں اور ایک شخص کو بچانے کے لیے حکومت یا کسی شخص یا ادارے کو ملک کی سالمیت اور وجود سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ جمہوریت کے سلسلے کو یقینا ملک میں چلتے رہنا چاہیے اور پارلیمنٹ کو بالادست ہونا چاہیے لیکن اس بالادستی کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اداروں کی تضحیک کی جائے یا انہیں مسلسل تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ میموگیٹ کے معاملے میں انتہائی ہوشمندی کی ضرورت ہے اگر یہ میمو حقیقت ہے تو اس کے مجرموں کو ضرور سزا ملنی چاہیے۔ تاکہ ہم مستقبل میں کسی بھی ایسی صورتحال سے دوچار نہ ہوں اور اس کے لیے عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے نہ کہ پہلے سے ہی اُسے تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ اگر ہم اپنے اداروں کو آزادی کار نہیں دیں گے تو یہ شاید ایک محدود مدت تک تو حکومت کے فائدے کا باعث ہو سکے لیکن اس سے ملک میں تنازعات کی روایات میں اضافہ ہی ہوگا اور ہم اب بحیثیت قوم مزید کسی تنازعے کے متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔

جمہوریت کے نام پر غیر جمہوری رویے

میدان سیاست ہی وہ میدان ہے جہاں سے ملک کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں اور ملک کا مستقبل اسی سے وابستہ رہتا ہے اگر اسی میں فیصلے درست ہیں تو ساری راہیں سیدھی رہتی ہیں لیکن بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ وطن عزیز میں یہ میدان دشمن فوجوں کے میدان کارزار کا منظر پیش کرتا ہے۔ اختلاف رائے اس کا حسن ہے لیکن اس اختلاف میں ملک اور قوم کو ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہیے ہر پارٹی کے منشور کا محور و مرکز صرف پاکستان ہونا چاہیے جو کہ اگرچہ لکھے ہوئے کی حد تک تو ہے تاہم عملی طور پر یہ منشور صرف اور صرف حصول اقتدار ہے روز روز نئے اتحاد بنتے اور ٹوٹتے ہیں اور یہ بناؤ و بگاڑ صرف اور صرف نمبر گیم کے لیے ہوتا ہے تاکہ اسمبلی میں اکثریت برقرار رہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہر سیاسی لیڈر اس جوڑ توڑ کی ایک ہی توجیہہ پیش کرتا ہے کہ "سیاست میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی" اگر ایسا ہی ہے تو سیاسی پارٹیوں کی منشور کیا ہیں، انہیں کیوں لکھا جاتا ہے نہ لکھا جائے۔ نہایت دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ ہر سیاسی پارٹی اپنی انتخابی مہم کو مسلسل جاری رکھے ہوئے ہوتی ہے لیکن ملکی معاملات میں سنجیدگی کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف ہی محاذ آرا رہتی ہیں۔ جمہوریت کا راگ الاپنے سے جمہوریت نہیں پنپ سکتی اس کے لیے جمہوری رویے اپنانا ضروری ہوتے

ہیں لیکن ہمارے سیاسی لیڈران عجزوانکساری سے خود کو سیاست کا طالبعلم کہنے کے باوجود اس کے اصولوں کو سمجھنے کی چنداں کوشش نہیں کرتے جمہوریت صرف حکومت حاصل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دراصل لوگوں کی خدمت کا نام ہے جو عوامی نمائندوں کا فرض ہے اور عوام اپنے نمائندے اسی کام کے لیے منتخب کرتے ہیں لیکن ہمارے نمائندے اپنی تجوریاں بھرنے کے علاوہ کسی دوسرے کام میں سنجیدگی کے قائل ہی نہیں وہ صرف اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ انہیں اٹھارہ کروڑ عوام کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے جانتے وہ بھی ہیں کہ اس ملک میں اٹھارہ کروڑ عوام ووٹ نہیں ڈالتے بلکہ یہ تعداد اس سے کہیں کم ہے تقریباً چار کروڑ تو جعلی ووٹ ہیں اور انتخابات میں ٹرن آوٹ کو مد نظر رکھا جائے تو شاید یہ تین کروڑ کے بھی نمائندہ نہیں ہیں اور اس پر اگر یہ خود کو ملک کے سیاہ و سفید کا مالک سمجھنا شروع کردیں تو یہ کونسا جمہوری رویہ ہے اگر انہیں فیصلے کا حق دیا بھی گیا ہے تو اس کا مطلب ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے نہ کہ عوام کے ٹیکس سے جمع شدہ رقم سے عیش و عشرت ، عدالتی فیصلوں کا مذاق اڑانا ، عوام کو مہنگائی کی چکی میں پیسنا ، ٹی وی ٹاک شوز میں آکر قومی سلامتی کے اداروں کی تذلیل عوام کو اداروں سے بدظن کرنا اور اسی عوام سے حقائق چھپانا جس نے ان کو منتخب کیا ، ہے۔ لیکن خود کو عوام کا نمائندہ کہنے والے یہ حکمران اور سیاسی رہنما ملکی ترقی سے بے خبر صرف اور صرف سوئس بینکوں کے اکاونٹ نمبر زیاد رکھنے میں ہی مصروف ہیں

۔ دولت کا کمانا اور

کاروبار کا بڑھانا قابل اعتراض بات نہیں لیکن اس کے لئے استعمال ہونے والے ذرائع ضرور قابل غور ہوتے ہیں۔ مجھے نہ تو جمہوریت سے اختلاف ہے نہ سیاست سے بلکہ میں جمہوریت کو بہتر طریقہ حکومت سمجھتی ہوں لیکن مجھے اپنے سیاستدانوں کے رویے پر شدید اعتراض ہے جو اپنے جرائم کو، اپنی غلطیوں کو اور اپنی خود غرضیوں کو جمہوریت کے پردے میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے خوشنما الفاظ کا سہارا لیتے ہیں کبھی جمہوریت کو بہترین انتقام قرار دیتے ہیں، کبھی سیاست کو بغیر حرف آخر کے ایک عمل اور کبھی خود کو سیاست کا حقیر طالب علم قرار دے کر خود کو چغادری سیاست دان سمجھتے ہیں۔ سیاست اور جمہوریت اگر عوام کی بہتری کے لیے ہو تو ہی قابل احترام ہیں ورنہ عوام کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ملک میں کونسا طرز حکومت ہے۔ انہیں انکی بنیادی ضروریات مہیا رہیں، انہیں کھانے کو کھانا ملے، پہننے کو کپڑے ملیں اور سر چھپانے کو چھت جس میں زندگی کی بنیادی سہولیات موجود ہوں اب وہ زمانہ نہیں رہا جب عوام کو کھوکھلے نعروں سے بہلایا جا سکے یا یہ تاثر دیا جا سکے کہ آپ ان کی خیر خواہی میں مصروف کار ہیں۔ اب نعروں سے آگے بڑھ کر عمل کا وقت ہے۔ بین الاقوامی برادری میں ملک کی جتنی بدنامی ہو چکی اس داغ کو دھونے کا وقت ہے اگر وقت مزید آگے نکل گیا تو یہ اپنے وقت کے سارے بڑے بڑے نام مٹا دے گا کیونکہ تاریخ ناموں سے نہیں کاموں سے بنتی ہے۔

ثناخوانِ تقدیس مغرب کہاں ہیں

سوات میں طالبان کے خلاف پاک فوج نے آپریشن کیا اور کچھ طالبان کی لاشیں ملیں تو انسانی حقوق کی قومی تنظیمیں اور بین الاقوامی ادارے سب بول اٹھے اور پاک فوج پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام دھر دیا اور یہ تحقیق بھی نہ کی گئی کہ کیا واقعی یہ سب پاک فوج کا کیا دھرا تھا بھی یا نہیں۔ ملک میں اقلیتی برادری کے ذاتی اختلافات کے نتیجے میں ہونے والے کسی حادثے پر بھی انسانی حقوق کا مسئلہ اٹھا دیا جاتا ہے آئین کی شقوں کو انسانی حقوق کے خلاف قرار دے کر اسے تبدیل کرنے کا بھی مطالبہ کر دیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی تو ایک طرف ہمارے اپنے انسانی حقوق کے داعی بھی چیخ چیخ کر ان معاملات کو اچھالتے ہیں اپنی خامیوں پر نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ان کے درست ہونے کا کم از کم امکان ہی موجود رہے لیکن ملک کی ساکھ کو مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے جس کا دھیان کسی کو نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بین الاقوامی میڈیا اور اداروں کی ایسی رپورٹس کو مزید اچھال دیا جاتا ہے اور اگر انہوں نے کوئی کسر چھوڑی بھی ہو تو اسے ہمارے اپنے پورا کر دیتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ سارے انسان دوست اس وقت خاموش رہتے ہیں جب اہل مغرب کسی بہت ہی گھناؤنے جرم میں ملوث ہوتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جب امریکی فوجیوں کی ایک ویڈیو منظر عام پر آئی

جس میں چار امریکی فوجی تین طالبان کی لاشوں پر پیشاب کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں یعنی انسان کی جتنی توہین کی جاسکتی ہے وہ کی گئی ہے لیکن حیرت ہے کہ نہ وہ شور اٹھا نہ وہ واویلا ہوا جو ہمارے ہاں ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات پر بھی اٹھا دیا جاتا ہے
۔

امریکی فوج کے ذمے یہ پہلا جرم نہیں ہے بلکہ ایک لمبی فہرست ہے جو اس فوج سے منسوب ہے ویت نام سے لیکر عراق اور عراق سے لیکر افغانستان تک ہزاروں ایسی کہانیاں ہیں جو انسانیت سوز ہیں ۔ وہی امریکہ جو نہ صرف دنیا کو انسانی حقوق کے تحفظ کا درس دیتا ہے بلکہ ان حقوق کی آڑ لے کر ملکوں کے ملک تاخت وتاراج کر دیتا ہے دراصل یہ ایک طریقہ ہے ایک راستہ ہے کہ کیسے دوسرے ممالک میں اپنی فوج داخل کی جاسکے اور وہاں کے وسائل پر قبضہ کیا جاسکے ۔ اسے پاکستان ، افغانستان اور عرب ممالک میں دلچسپی اپنی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں۔ اس لیے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہماری بھلائی کا کوئی منصوبہ لے کر آئیں گے سراسر حماقت ہے ،ہاں زمانہ قدیم میں فاتح افواج جو بربریت کرتی تھیں امریکی فوج نے وہ وطیرہ اور دور ابھی تک نہیں چھوڑا لیکن صرف بڑا ملک ہونے کی وجہ سے اُسے چھوٹ دی جارہی ہے۔ طالبان سے نظریاتی اختلاف اپنی جگہ ، لیکن دنیا کا کوئی قانون لاش کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیتا اور جہاں ہمارے ملک میں معمولی معمولی باتوں پر واویلا کیا جاتا ہے ،

اُنہیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا جاتا ہے اور ہماری فوج، آئی ایس آئی اور دیگر قومی اداروں کو بہت بڑا مجرم بنا دیا جاتا ہے وہیں ان لوگوں کے جرائم سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ اگرچہ مسلمان فوج ہونے کی حیثیت سے کوئی پاکستانی فوجی ایسا کام کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس واقعے پر ایمنسٹی انٹر نیشنل چیخا نہ ہیومن رائٹس واچ، نہ ایشیا واچ اور نہ ہی پاکستانی ادارہ حقوق انسانی کو اعتراض ہوا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہمارے ادارے یہ سب کچھ روک سکتے ہیں لیکن کم از کم وہ اس امر کو دنیا کے سامنے تو لا سکتے ہیں کہ وہ امریکہ جو پاکستان کو شدت پسند سمجھتا ہے خود سب سے بڑا شدت پسند اور دہشت گرد ہے لیکن ہوا ایسا کہ نہ صرف عالمی تنظیمیں بلکہ خود کو پاکستان میں انسانیت کے بڑے علمبردار اور ٹھیکیدار کہنے والی شخصیات عاصمہ جہانگیر، علی دایان اور ماروی سرمد جو اپنے اداروں کے خلاف بولتے تھکتے نہیں یہ سب کچھ دیکھ کر بھی چپ رہے بلکہ نامی گرامی اینکرز اور سیاسی شخصیات بھی خاموش رہیں۔ امریکی فوجیوں کی یہ حرکت نہ صرف انسانی اقدار کے خلاف ہے بلکہ فوجی اصولوں کی بھی سراسر خلاف ورزی ہے جو دنیا کے کسی قانون میں بھی جائز نہیں۔ یہ بہت اچھا موقع تھا کہ انسان اور انسانیت کے یہ ہمدرد بولتے اور امریکہ اور اہل مغرب کو ان کا اصلی چہرہ دکھاتے اُنہیں بتاتے کہ اسلام اپنے کسی ماننے والے کی ایسی حرکت پر اُسے سخت سزا کی وعید سناتا ہے پھر وہ اسلام اور مسلمانوں کو تنگ نظر اور شدت پسند کیسے سمجھتے ہیں اور

کیسے اپنی انسانیت دوستی کا چرچا کرتے ہیں لیکن حسب معمول اس واقعے پر چپ سادھ لی گئی۔ میری اِن انسانیت کے علمبرداروں سے گزارش ہے کہ اپنے گریبان میں جھانکنا بہت اچھی بات ہے اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھنا بھی بہت احسن ہے لیکن دوسروں کی کوتاہیوں سے صرف اپنے مفاد کے لیے صرفِ نظر کرنا اور مظالم پر چپ رہنا ظالم کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔ ہمیشہ مغرب کی انسانیت دوستی پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے والے اِن لوگوں کو اِس واقعے پر کم از کم اظہار خیال ہی کر لینا چاہیے تھا ۔امریکہ سے اِن فوجیوں کو سزا دینے کا مطالبہ کر لینا چاہیے تھا اور ان پر یہ بھی واضح کر دینا چاہیے تھا کہ اسلام کو بدنام کرنے کی بجائے خود اپنے آپ کو درست کریں، وہ دنیا کے ٹھیکدار نہیں، دنیا کے کونے کونے میں امن کے نام پر فساد برپا کرنے کی بجائے خود کو ظلم کرنے سے روکیں تو امن خود بخود قائم ہو جائے گا۔

یوم یکجہتی کشمیر۔۔۔۔اصل تقاضے

پاکستان تو بن گیا لیکن انگریز کی بدنیتی اور ہندو کی مکاری نے کشمیر کے تنازعے کی صورت میں ایک ایسے مسئلے کی بنیاد رکھ دی جو نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے باوجود حل کے قریب بھی نہیں ۔اس مسئلے پر پاکستان اور بھارت کی تین جنگیں ہو چکیں1948 سے لے کر 1999 تک ہونے والی ان جنگوں میں دونوں ملکوں کا بے تحاشا نقصان ہو چکا ہے اور مستقبل قریب میں بھی اس کے رکنے کا کوئی امکان نہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے جیسے اسی مسئلے سے پانی کے مسئلے نے جنم لیا اور اگلی کسی بھی جنگ کے امکانات اور وجوہات میں پانی سر فہرست ہوگا کیونکہ ہمارے تمام دریا اسی وادی سے ہو کر ہم تک پہنچتے ہیں۔ کشمیر بھارت کے لیے اہم ہو یا نہیں ہمارے لیے ہے اور وہ اِس پر قابض ہو کر بیٹھا ہوا ہے تو بھی اس لیے کہ پاکستان کو نقصان پہنچائے اور اسے زیادہ سے زیادہ مصیبت میں ڈالے رکھے ۔ وہ اسی مسئلے کی آڑ لے کر ہر جرم کا الزام پاکستان پر رکھ دیتا ہے چاہے وہ بھارت کے دوسرے سرے پر وقوع پذیر ہوا ہو یوں بھارت اس تنازعے کا مکمل فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔پاکستان کو نہ صرف زمینی طور کشمیر کے مسئلے سے نقصان دینا چاہتا ہے بلکہ نفسیاتی طور پر بھی مفلوج کرنا چاہتا ہے۔ 1951 میں اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل نے کشمیر میں

استصواب رائے کے لیے قرار داد منظور کی اور اس کے بعد بھی ایسی ہی قرار دادیں منظور کی گئی لیکن بات قرار دادوں تک ہی رہی اس پر عمل درآمد کے لیے بھارت پر وہ زور نہ ڈالا گیا جو مسئلے کو حل کی طرف لے جاسکے اور کشمیریوں کو ان کا حق خود ارادیت دلاسکے۔ کشمیر کا مسئلہ اِس وقت صرف آزادی تک نہیں ہے بلکہ یہ انسانی حقوق کا بھی مسئلہ ہے جس طرح آئے روز کشمیری بھارتی فوج اور پولیس کے ہاتھوں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں وہ بذات خود ایک المیہ ہے Shining India کی ترقی کے دروازے کشمیر تک آتے آتے بند ہو جاتے ہیں اور کالے قوانین کے ذریعے فوج اور پولیس کو ایسے اختیارات مل جاتے ہیں کہ وہ کسی کشمیری سے بازپُرس کیے بغیر اُس کی زندگی کے مالک بن جاتے ہیں۔ بے شمار اجتماعی قبریں اپنے مدفونوں سمیت ان مظالم کی گواہ ہیں خواتین کی عصمت دری بچوں کا قتل، جوانوں کا غائب ہو جانا اور پھر کچھ دنوں بعد ان کی لاشیں ملنا اب کشمیریوں کے لیے انہونی بالکل نہیں لیکن انہوں نے حالات سے سمجھوتا نہیں کیا اور وہ مسلسل اپنی آزادی کے لیے کوشاں ہیں جو کہ ان کا حق ہے کسی بھی دوسرے انسان کی طرح اور مسلم اکثریتی علاقہ ہونے کے ناطے یہ کشمیریوں کا حق ہے کہ وہ غیر مسلم حکومت کے ساتھ نہ رہنا چاہیں تو وہ آزادی کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور انہیں آزادی ملنی چاہیے بالکل اُس طرح جس طرح آزادی ہندوستان کے ہر ہندو کا حق ہے۔ لیکن اس حق سے کشمیری کو محروم رکھا جا رہا ہے جبکہ کشمیر نہ تو مذہبی طور پر اور نہ جغرافیائی لحاظ سے

بھارت کا حصہ ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ وہ اس راستے سے پاکستان کو مسلسل دباؤ میں رکھ سکے۔

اگر کشمیر کا مسئلہ آج بھی حل کر لیا جائے تو اس خطے کی قسمت سنور جائے لیکن اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ بھارت اپنی ہٹ دھرمی ختم کر دے اور اس بات کو تسلیم کر لے کہ وہ دس نہیں بیس لاکھ فوج کے ذریعے بھی کشمیریوں کے دل نہیں جیت سکتا۔ اور Prevention of Terrorist Activities Act ، Armd Forces Special Power Act اور Terrorist and Disruptive Activities Act جیسے ظالمانہ قوانین بھی اُسے کشمیریوں پر قابو پانے میں مدد نہیں دے سکتے اِن قوانین کو اگر چہ بنایا تو پورے بھارت کے لیے جاتا ہے لیکن ان کا سب سے زیادہ اور آزادانہ استعمال کشمیر میں ہی کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر بھارت کے ہاتھ میں پاکستان کے خلاف موثر ترین ہتھیار ہے اس لیے وہ کسی صورت اسے ہاتھ سے نکلنے نہیں دے گا لیکن پاکستان کو بھی اپنی کشمیر پالیسی میں تسلسل رکھنے کی ضرورت ہے کہنے کو تو ہر حکومت اسے اپنے ایجنڈا پر رکھتی ہے لیکن در حقیقت اس کو وہ اہمیت نہیں دی گئی اور بین الاقوامی سطح پر اس کو اجاگر کرنے کے لیے وہ کوشش اور محنت نہیں کی گئی جس کی ضرورت تھی اور ہے۔ صرف یوم یکجہتی کشمیر منا لینے سے کشمیر کی آزادی کا کوئی امکان نہیں ہے بلکہ اس کے لیے سر توڑ اور انتھک کوشش کی ضرورت ہے اور ٹھوس عملی اقدامات سے

ہی اس کا حل ممکن ہے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہر سال پانچ فروری کو پورا ملک چھٹی کرکے یوم یکجہتی کشمیر مناتا ہے پورے ایک دن کی اقتصادی صنعتی، تعلیمی ، معاشی ہر قسم کی سرگرمی ختم کردی جاتی ہے کروڑوں کا کاروبار بند کرکے یکجہتی کا اظہار کرنے کی بجائے اگر ہم بحیثیت قوم اور حکومت اس مسئلے کو دنیاکے ہر فورم پر اٹھائیں، آٹھ کی بجائے بارہ گھنٹے کام کریں تو ہم دنیا کو زیادہ مستحکم پیغام دے سکتے ہیں۔ بقول قائداعظم کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور ہمیں خود اس کا احساس کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی اس امر کا احساس دلانا چاہیے۔ اقوام متحدہ کو بھی یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ جس طرح وہ طاقتور ممالک کے مفادات کے لیے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اُسی طرح مظلوم کشمیریوں کو بھی غاصب بھارت کے قبضے سے نجات دلائے۔ یہ سوچنا کہ بھارت خود کشمیر کا قبضہ چھوڑ دے گا سراسر حماقت ہے کشمیر کی آزادی کے لیے پاکستانیوں کا اُن کے ساتھ یکجہتی کا اظہار یقیناً اُنہیں قوت دیتا ہے لیکن اُنہیں ہماری مزید اخلاقی مدد کی ضرورت ہے تاکہ وہ یہ محسوس کرسکیں کہ آزادی کی جدوجہد میں وہ تنہا نہیں ایک ایٹمی قوت ان کی پشت پر جم کر کھڑی ہے۔

بلیم گیم یا حقیقت

میرے ایک کرم فرما بھائی جو ایک انتہائی محب وطن پاکستانی ہیں اکثر میری ویب سائیٹ پر میرے مضامین پر تبصرہ کرتے ہیں اور بسا اوقات قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے ہیں ، نے اپنے ایک تبصرے میں منجملہ دوسرے کئی موضوعات کے لاپتہ افراد کے موضوع پر بھی بات کی ۔اُن جیسے قاری کی بات کو نظر انداز کرنا بھی مشکل تھا اور میڈیا میں بھی آج کل لاپتہ افراد کے معاملے کو خاصی اہمیت دی جا رہی ہے جو کہ حقیقتاً اہمیت کا متقاضی بھی ہے کیونکہ بہت سارے خاندان اسی کے باعث ایک تکلیف دہ زندگی گزار رہے ہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر میں نے اس مسئلے کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کی کوشش کی اور یہ بھی کہ کیا ہر گمشدہ شخص ایک ہی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے اور لواحقین کا شک آخر ہر بار ایجنسیوں کی طرف کیوں جاتا ہے؟ کیا ان کے پیارے مشکوک سرگرمیوں میں ملوث تھے جس کی بنا پر ان کے قانون لاگو کرنے والے اداروں کے ہاتھوں اٹھائے جانے کا امکان موجود تھا۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ اگر کوئی مجرم ہے تو اُنہیں عدالتوں میں پیش کرکے ان پر مقدمہ چلایا جائے اور انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔تاہم ایسا ہو نہیں رہا ہے ملک میں سالہا سال سے جاری دہشت گرد کاروائیوں میں پینتیس ہزار افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ ان دہشت

گردوں کے خلاف لڑتے ہوئے پانچ ہزار سیکیورٹی اہلکار بشمول فوج اور پولیس جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور کئی اُن دہشت گرد حملوں کی نذر ہو چکے ہیں جو کہ ان کو ٹارگٹ کرکے کیے گئے تھے۔ ملک میں نہ راہ چلتا ہوا راہ گیر محفوظ ہے نہ پارک میں کھیلتا ہوا بچہ، میں ایک ایسے بچے کے بارے میں جانتی ہوں جس نے بم کو کھلونا سمجھ کر اٹھالیا تھا جو اُس کے ہاتھوں میں پھٹ گیا اور ہمارے مستقبل کا ایک روشن ستارہ اپنی آنکھوں اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں سے محروم ہو کر ٹمٹما گیا وہ زندہ ہے لیکن کیسے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ لیکن حیرت ہے جب ایسے دہشت گرد پکڑے جاتے ہیں تو بھی سزا سے چھوٹ جاتے ہیں کبھی چالان نامکمل ہونے کی وجہ سے اور کبھی ناکافی ثبوتوں کی بناپر اور تب کوئی واویلا نہیں مچتا کوئی شور نہیں اٹھتا۔ عدالتوں کے لیے بے حد احترام کے ساتھ میرا اُن سے یہ سوال ہے کہ ڈاکٹر عثمان جیسے ثابت شدہ دہشت گردوں کو چھوڑ دینا کہاں کا انصاف ہے۔ اسی طرح جی ایچ کیو، حمزہ کیمپ اور کامرہ ایر بیس پر حملہ کرنے والے گیارہ ملزمان کو لاپتہ افراد کی فہرست میں رکھ کر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے جبکہ تحقیق پر پتہ چلا کہ انہیں لاپتہ افراد کی فہرست میں شامل کرنا بھی سراسر زیادتی ہے۔اِن تمام ملزمان کو اسلحے اور دھماکہ خیز مواد سمیت گرفتار کیا گیا لیکن انسداد دہشت گردی کی عدالت سے ناکافی ثبوتوں کی بناپر بری ہوئے اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکاروں کے روپ میں آئے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے

میں کامیاب ہوگئے۔ ان کے رشتہ داروں کی طرف سے داخل کردہ رٹ پٹیشن کے جواب میں سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق انہیں نو دیگر مشکوک افراد کے ساتھ پکڑ کر اعلیٰ عدالت میں پیش کیا گیا اور سپریم کورٹ نے اُن کے فیلڈ جنرل کورٹ مارشل اور انہیں ان کے خاندانوں سے ملوانے کے احکامات بھی جاری کیئے۔ فاٹا میں اپنے قیام کے دوران ہی یہ افراد مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوئے اور ان میں سے چار لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں جان بحق ہوگئے اِن میں سے چار اسی ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور تین کو پارا چنار میں رکھا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بہتر ہوگا کہ ان کو سول اداروں کے حوالے کیا جائے کیونکہ مجرموں کو پکڑ لینے کے بعد اِنہیں سزا دینا عدالتوں کا کام ہے لیکن اس کے لیے سول اداروں کو ذمہ داری قبول کرتے ہوئے انہیں اپنے زیر حراست لے کر ان کی حفاظت کا بندوبست کر لینا چاہیئے۔ اب اس طرح کے افراد کو لاپتہ افراد کی فہرست میں ڈال دیا جانا کہاں تک درست ہے اور کیا اِن کے ساتھ ہمدردی کرنا جائز ہے،ہاں اس طرح اس فہرست کو طویل سے طویل تر کر کے معصوم اور گناہ گار کا فرق ختم کیا جا رہا ہے ۔

پاکستان ان دنوں ویسے بھی انتہائی نا مساعد حالات سے گزر رہا ہے ایسے میں اگر ہم غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنائیں اور صرف خود کو انتہائی باخبر اور غیر جانبدار ظاہر کرنے کے لیے ہر معاملے میں ملکی سلامتی کے اداروں کو ہدف

تنقید بنائیں جو کہ آج کل ایک فیشن بنتا جا رہا ہے، تو ہم ملک کی کوئی خدمت نہیں کر رہے، بجائے ان معاملات کو اچھال اچھال کر ملک کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے، مسائل کی جڑ پکڑنے کی کوشش کی جائے۔ دہشت گردوں کو تو ہم انسان قرار دے کر ان کے انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں لیکن راستوں اور گلی کوچوں میں مرنے والے اُن پاکستانیوں کو ہم اس وقت بھول جاتے ہیں جو تلاش رزق میں نکلتے ہیں اور گھروں کو واپس نہیں آتے۔ بظاہر ہم ملک سے محبت کے دعوے بھی کرتے ہیں لیکن اُن عناصر کو تلاش کرنے کی بجائے جو ملک کی سالمیت کے درپے ہیں اور انہیں اُن کے ارادوں سے باز رکھنے کے ان سے منسلکہ دوسرے مسائل کا واویلا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم ملکی مفاد کو ذاتی مفاد سے بالا رکھنے کی بات بھی کرتے ہیں لیکن عملاً ہم ایسا نہیں کرتے۔ بلوچستان یا فاٹا میں گڑ بڑ پھیلانے والے عناصر کو نہیں بلکہ یہاں کے پر امن شہریوں کو ہماری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان ان دہشت گردوں کی جانوں سے کئی گنا بڑھ کر قیمتی ہے اور اس ملک کی سالمیت بھی کسی شخص کے مفاد سے بڑھ کر اہم ہے لہذا ہر بات کی تہہ سے ملکی سلامتی کے اداروں کے خلاف قابل قبول یا نا قابل قبول ثبوت نکالنے سے ملک کی کوئی خدمت نہیں ہوتی۔ ہماری حکومتیں سیاسی جوڑ توڑ اور عدالتیں سیاسی مقدمات کے علاوہ ایسے مقدمات و معاملات پر اپنی توجہ مرکوز کریں اور ایسے قوانین بنائیں جو واقعی انصاف کے تقاضے پورے کرے، جو بے گناہ ہیں انہیں ایجنسیوں کی قید یا پولیس کی حراست سے چھڑا سکیں اور

جو قصور وار ہیں انہیں سزا سے بچنے کی کوئی توقع نہ ہو، نہ کوئی ملک کو نقصان پہنچا کے نہ ایسا کرنے کی سوچ کے تو یقینا ہم بلیم گیم سے فرصت پا کر ملکی ترقی کی طرف متوجہ ہو سکیں گے۔

"باخبر ذرائع"

امریکہ اس وقت پوری دنیا کی باگ ڈور کو اپنا حق سمجھ کر اسے اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے اور اس کے لیے وہ ہر قسم کا حربہ آزمانے پر تلا بیٹھا ہے۔ کبھی وہ حکومتوں کو خریدتا ہے کبھی جنگی حملہ کرتا ہے اور کبھی معاشی پابندیاں لگاتا ہے یہاں تک کہ اقوام متحدہ بھی اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس نے یہی حربے ایران ، عراق ، افغانستان اور پاکستان میں آزمائے۔ سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی حملے کے بعد جب عوام کے شدید احتجاج پر امریکہ کے خلاف کچھ اقدامات کئے گئے اور کسی حد تک امریکہ کے اثر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا تو اس نے متبادل راستے اختیار کرنا شروع کیے انہی میں سے ایک میڈیا کے ذریعے مسائل پیدا کرنے کی کوشش ہے اور یہی وجہ ہے کہ لاہور میں نئی امریکی قونصل جنرل نین ماریہ نے تشریف لاتے ہی اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں اور ایک معروف پاکستانی اینکر سے ملاقات فرمائی۔ اعتراض اس بات پر ہرگز نہیں کہ یہ ملاقات کیوں کی گئی لیکن قابل اعتراض بات یہ ہے کہ ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا گیا جن پر ویسے ہی پاکستان سے زیادہ امریکی مفاد کی وکالت کا شبہ رہتا ہے اور یہ اکثر اوقات قومی سلامتی کے اداروں پر شدید تنقید کرتے نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی دشمن ملک کی فوج پر حملہ آور رہو۔ چلیے بات یہاں تک بھی قابل

قبول ہے، مخالفت بھی ہر ایک کا حق ہے، اگرچہ یہاں بات تنقید اور مخالفت سے آگے بڑھ کر ہے لیکن یہی لنگر صاحب اکثر اوقات پیش آمدہ واقعات کی پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اسے اپنی چھٹی حس، مضبوط تجزیاتی قابلیت اور اپنے انتہائی باخبر ذرائع سے منسوب کرتے رہتے ہیں اگر وہ اپنے ان ذرائع کی تفصیلات سے عوام کو آگاہ کرتے رہیں تو تصویر کا وہ رخ جو وہ عوام سے پوشیدہ رکھتے ہیں ان کے سامنے آسکے گا۔صرف اپنی باخبری کا اعلان بلکہ اس کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ملک کی سلامتی اور استحکام کو نظر انداز کرنا کہاں کا انصاف ہے۔آزادی اظہار کی آڑ لے کر اپنی ذاتی تشہیر کو مقصد بنا لینا بھی قرین انصاف نہیں۔

یہ ذہن میں رہنا چاہیئے کہ ملک ہے تو ہماری پہچان ہے۔درخت جتنا بھی تن آور اور برگ وبار سے بھرپور ہو اس کے لیے زمین کا ہونا ضروری ہے لیکن دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو اپنی ذات کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ اہم اور قیمتی سمجھتے ہیں۔ایسا بھی ضروری نہیں کہ اس ملاقات میں پاکستان کے خلاف کوئی منصوبہ بنا ہو لیکن دوسروں کو ہدف تنقید بنانے والے اپنے گریبان میں جھانک لیا کریں تو بہتر ہوگا اگر یہ صاحب کم از کم اپنے ہی پروگرام میں اس ملاقات کی تفصیلات سے لوگوں کو آگاہ کرتے تو عوام کے دلوں میں شکوک وشبہات جنم نہ لیتے۔چونکہ

ہمارا الیکٹرانک میڈیا اس وقت ایک انتہائی مضبوط ذریعہ معلومات ہے اس لیے اگر یہاں اپنی ذات پر ملکی مفاد کو ترجیح دینے کا رواج عام ہو جائے تو شاید ملک میں بہت سارے فساد نہ پھیلیں اور اداروں کے خلاف غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔ یہاں عوام کے سامنے وہ حقائق رکھے جائیں جو واقعی حقیقی ہوں اور میڈیا وہ کردار ادا کرے جو اسے کرنا چاہیے۔میڈیا در حقیقت وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے ملک کی وہ خدمت کی جا سکتی ہے جو کسی بھی دوسرے طریقہ سے ممکن نہیں۔ یہاں سے حکمرانوں اور اداروں پر نظر اس لیے رکھی جائے کہ وہ بے راہ نہ ہوں صرف مخالفت برائے مخالفت کے لیے نہیں۔بلکہ یہ سب کچھ ملک کی بہتری کے لیے ہونا چاہیے۔

بلوچستان سلگتا ہوا انگارہ کیوں

بلوچستان پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ایک سلگتا ہوا انگارہ کیوں بنتا جا رہا ہے، اس مسئلے کو کیوں الجھایا جا رہا ہے، یہ صوبہ ترقی کی دوڑ میں کیوں پیچھے رہ گیا ہے اور بیرونی طاقتوں کو بلوچستان میں دلچسپی آخر کیوں ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جنہوں نے محب وطن پاکستانیوں کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ ان سب پر مستزاد امریکہ کا انتہائی مخاصمانہ رویہ جس نے بلوچستان کے حالات کو مسئلہ بنا کر اپنے ایوانوں میں موضوع بحث بنا دیا۔ امریکہ کا رویہ بذات خود بہت سارے سوالات کا جواب ہے کہ جو کھیل بیرونی طاقتیں اس کی سرکردگی میں پوشیدہ طور پر کھیل رہی تھیں آخر کھل کر سامنے آ گئی ہیں اور وہ لوگ جو اس معاملے میں بیرونی ہاتھ کے ملوث ہونے کو ایک لا یعنی خیال تصور کرتے تھے اب انہیں سمجھ جانا چاہیئے کہ حالات کو اس نہج تک لانے میں کون کون ملوث ہیں؟ لیکن بیرونی ہاتھ کے ملوث ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حکومت یا دوسرے عناصر بری الذمہ قرار دے دیئے جائیں۔ بلوچستان میں وفاقی حکومتوں اور خود بلوچستان کی صوبائی حکومتوں اور وہاں کے قبائلی نظام اور سرداروں سب کا کردار انتہائی افسوس ناک ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے انتہائی مشکل اور مختلف حالات کا حامل صوبہ بلوچستان بلحاظ رقبہ پاکستان کا تینتالیس فیصد ہے جبکہ اس وقت اس کی آبادی تقریباً اسی لاکھ کے قریب ہے جو کہ چند ایک شہروں کے علاوہ چھوٹے دیہات اور انتہائی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر مشتمل ہے یوں یہ ایک حقیقت بن جاتی ہے کہ ان بستیوں تک سہولتوں کا پہنچانا مشکل ہو جاتا ہے لیکن حکومت کا کام صرف بڑے شہروں کی ترقی نہیں ہوتا بلکہ اصل کام ان دور افتادہ لوگوں اور علاقوں تک ثمرات کا پہنچانا ہوتا ہے۔ بلوچستان میں ایسی کوششیں کم ہی نظر آتی ہیں اور اگر ہیں تو بڑے شہروں تک محدود ہیں۔ سکول کی عمارت کھڑی کرنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کو ایک ادارہ بنانا زیادہ اہم ہے لیکن بلوچستان میں سکولوں کی بڑی تعداد اساتذہ اور طلبائ سے بے نیاز مخدوش حالت میں گرنے کے قریب ہیں اور انتہائی مستند ذرائع کے مطابق یہ سالہا سال سے غیر حاضر اساتذہ بڑی باقاعدگی سے تنخواہ ضرور وصول کرتے ہیں۔ دوسری طرف جہاں ملک میں نجی تعلیمی ادارے شرح خواندگی بڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں وہاں بلوچستان میں چھوٹے بڑے صرف 1750 نجی تعلیمی ادارے ہیں۔ اب یہاں بلوچ سرداروں کو آگے بڑھ کر اپنے صوبے کیلئے کچھ کرنا چاہیئے تھا لیکن یوں ان کی سرداری خطرے میں پڑتی ہے۔ یوں تو صرف یہ ایک میدان ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو بنیاد یہیں سے کمزور پڑ جاتی ہے اور لگتا ایسا ہے کہ بلوچستان کو لاعلم رکھنے میں ہی یہاں کے سرداروں کا بھلا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈیرہ بگٹی میں

پانچ سے نو سال کی عمر کے صرف 3 فیصد بچے سکول جاتے ہیں جبکہ خود یہ سردار ایچی سن، آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بلوچستان سے ان کی محبت صرف اقتدار کے حصول تک ہے۔ چونکہ بگٹی، مینگل اور مری سرداروں میں سے کوئی بھی اس وقت حکومت میں نہیں اسی لیے انہیں ہر چیز میں خرابی نظر آ رہی ہے۔
بلوچستان حکومت بھی اس سلسلے میں انتہائی افسوسناک طور پر لاتعلقی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس اسمبلی کا ہر رکن وزیر ہے لیکن وہ رقم جو انہیں ترقیاتی کاموں کیلئے مل رہی ہے اور وہ رقم جو بلوچستان میں ترقیاتی کاموں کیلئے مختص ہے جو کہ 160 بلین روپے ہیں ان کا استعمال کہیں نظر نہیں آ رہا۔ یوں بلوچستان میں ایک عام استاد یا دوسرے سرکاری ملازم سے لے کر سیاستدانوں، سرداروں اور حکمرانوں تک تمام حالات کے ذمہ دار ہیں۔ جہاں تک نامعلوم لاشوں کا ملنا اور لاپتہ افراد کی فہرست میں اضافے کا تعلق ہے اس کے لیے ہر بار کی طرح بغیر سوچے سمجھے ایجنسیوں کو دوش دینا بھی کچھ زیادہ مناسب نہیں ان حالات کی آڑ لے کر ذاتی دشمنیوں کی بنا پر ہونے والے قتل بھی ایجنسیوں کے کھاتے میں ڈال دیئے جاتے ہیں اور مجرمانہ افعال کیلئے ہونے والے بھی۔ اس سلسلے میں ہمارا میڈیا اور ہمارے سیاستدان بھی کچھ تعمیری کردار نہیں ادا کر رہے۔ ان معاملات کو جس طرح اچھالا گیا اسی نے غیر ملکی طاقتوں کو حوصلہ دیا کہ وہ ہمارے معاملات میں مداخلت کر سکیں ایسا بھی نہیں کہ خبر کو منظر عام پر نہ لایا جائے لیکن اس میں تعصب چاہے وہ آئی ایس آئی

کے خلاف ہو، فوج کے خلاف ہو یا حکومت کے خلاف نہ آنے دیا جائے اور یہ بھی بتانا چاہیئے کہ پورا بلوچستان اس وقت حرب یار مری ،براہمداغ بگٹی یا اختر مینگل کے ساتھ نہیں جو تشدد کو ہی مسئلے کا حل سمجھتے ہیں جو کسی بات کے سننے کو تیار ہی نہیں جن کی تان صرف بلوچستان کی آزادی پر ٹوٹتی ہے اور جن کے بیرونی ممالک ہوٹلوں کے RAW کراۓ تک ادا کرتی ہے۔ میڈیا کو انہیں بلوچوں کے لیڈر بنانے سے گریز کرنا چاہیئے اور اس بلوچ قیادت کو بھی سامنے لانا چاہیئے جو پاکستان کی سالمیت کی بات کرتی ہے اور ان ملکوں پر بھی سفارتی دباؤ ڈالا جائے جو کسی بھی طریقے سے بھی ان شر انگیزوں کو تعاون فراہم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ بلا سوچ سمجھے یہ کہنا کہ ایف سی اور فوج برے حالات کی ذمہ دار ہیں درست نہیں بقول آئی جی ایف سی وہاں پر شر پسندوں کے 60 کیمپ کام کر رہے ہیں کیا ان کیمپوں کی ذمہ داری صوبائی حکومت لینے کو تیا رہے اگر ایسا ہے تو پھر یہ کہنا درست ہوگا کہ ایف سی پیچھے ہٹ جائے اور ان کانوں، ڈیموں اور ترقیاتی منصوبوں کو بھی جو بلوچستان کے لوگوں کی زندگی کی امید ہے صوبائی حکومت کے حوالے کر دے جن کی حفاظت وہ صوبائی حکومت ہی کے کہنے پر کر رہی ہے۔ بلوچستان کے مسئلے کو اس وقت سیاسی مفاد کیلئے استعمال کرنے کا موقع نہیں اور نہ ہی اس پر کسی غیر سنجیدگی کی گنجائش ہے اس مسئلے کو قومی سطح پر مل

بیٹھ کر حل کرنا ضروری ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ سنجیدہ اور ذمہ دار قسم کے بلوچ لیڈروں سے بات کی جائے اور نہ صرف طرفین اپنی غلطیاں تسلیم کرے بلکہ ان کا مداوا بھی کیا جائے۔ بیرونی طاقتوں کی مداخلت کے خلاف شدید رد عمل ظاہر کیا جائے۔ آئی ایس آئی لوگوں کی شکایات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ بیرونی ایجنسیوں کی سازشوں کا توڑ کرے کیونکہ صرف یہ کہہ دینا نہ اس کیلئے کافی ہے اور نہ اس کا کام ہے کہ بیرنی ہاتھ ملوث ہے بلکہ اس کی ڈیوٹی اس بیرونی ہاتھ کو توڑ دینا ہے جو ہمارے خلاف مصروف عمل ہے اور حکومت کو ترقیاتی کاموں کو ترجیحی بنیادوں پر کروا کر بلوچوں کا اعتماد بحال کرنا ہے اور ترقی کے فوائد کو عام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ ایک دوسرے کو الزام دینے کی بجائے ہر ایک کو اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دشمنوں کی پہچان اور خبرداری بھی انتہائی ضروری ہے لیکن ان سے نبٹنا بھی ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے۔

براہمداغ اور حربیار پورا بلوچستان نہیں ہیں

بلوچستان پچھلے دنوں خبروں کا مرکزی نکتہ بنا رہا اگر خبریں خوش کن ہوں تو تب تو اور بات ہوتی ہے لیکن یہ خبریں پاکستان کے ہر محب وطن شہری کیلیے انتہائی تشویش ناک اور افسوس ناک ہیں۔ کبھی ادھر سے لاپتہ شہریوں کی مسخ شدہ لاشوں کی خبریں ملتی ہیں اور کبھی علیحدگی کی تحریک کی اطلاعات۔ آخر حالات یہاں تک پہنچے کیسے ؟آج سب اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ حالات پر پہلے ہی نظر کیوں نظر نہ رکھی گئی۔اس وقت جب حالات بہتر تھے ان شکایات کا ازالہ کرنے کی کوشش کیوں نہ کی گئی جو بلوچستان کے بارے میں تھیں۔ دراصل یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہم پلوں کے نیچے سے پانی گزرنے کے بعد اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ہم ابھی بھی کر رہے ہیں لیکن ہنوز غیر سنجیدگی کا شکار ہیں اور صرف باتیں ہو رہی ہیں عمل فی الحال نظر نہیں آرہا۔ مسائل میں کمی نہیں آرہی اور نہ ہی لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔.براہمداغ اور حربیار کو ہر ٹی وی چینل پر سنوا سنوا کر بلوچ نوجوانوں کو مزید.برافروختہ کیا جارہا ہے اور دوسری طرف کا نکتہ نظر سنوانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی جارہی یوں نادانستہ یا نادانستہ مسئلے کو مزید الجھایا جارہا ہے۔ اگرچہ ان کی شکایات سننا ضروری ہے لیکن مسائل کا جو حل وہ بتاتے ہیں اس کے علاوہ

محب وطن بلوچوں کے ذہنوں میں بھی کچھ حل ہوں گے جن کا سننا بھی انتہائی ضروری ہے۔

بلوچستان کے حالات کو اس نہج تک لانے میں کئی عناصر بہت اہم رہے ہیں۔ اس کیلئے صرف حکومت کو بھی موردِ الزام نہیں سمجھا جا سکتا اور فوج کو بھی اور نہ ہی سردار بری الذمہ قرار دیئے جا سکتے ہیں اور یہ تاثر لینا بھی درست نہیں کہ مسائل صرف بلوچستان میں ہیں بلکہ یہ مسائل پورے پاکستان کے ہیں جس میں کچھ تو ہماری معاشی حالت سے وابستہ ہیں اور کچھ حکومت کی نااہلیوں سے۔ جہاں تک لاپتہ افراد کا تعلق ہے تو یہ باقی تین صوبوں میں بھی ہیں اور یہ امر قابل افسوس ہے، اسی طرح مسخ شدہ لاشوں کا ملنا بھی قابل افسوس بھی ہے اور قابل مذمت بھی لیکن بغیر سوچے سمجھے ان کا الزام فوج کے سر دھر دینا اور اسٹیبلشمنٹ اسٹیبلشمنٹ کے نعرے لگانا باقی ہر مجرم کی مدد کرنے کے مترادف ہے نہ کہ ملک کی خدمت کے۔

بلوچستان میں اس وقت ستّر سردار ہیں جن میں سے صرف مری، بگٹی اور مینگل سردار علیحدگی کی باتیں کر رہے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بھی خاندان کا ہر فرد اس نکتہ نظر کا حامی نہیں۔ اس کی مثال براہمداغ، شاہ زین اور عالی بگٹی ہیں جن میں پہلے تو بگٹی قبیلے کی سرداری کیلئے کشمکش چلی اور ابھی

بھی انتہا پسندانہ نظریہ صرف براہمداغ کا ہے جو کہ نواب اکبر بگٹی کا نواسہ ہے پوتا نہیں۔

معاملہ جو بھی ہے اور جس کے بھی درمیان ہے نقصان پاکستان کا ہے اور اسے ہم نے ہر صورت خراب ہونے سے روکنا ہے اور جو خرابی ہو چکی ہے اس کا سدِ باب بھی کرنا ہے۔ بار بار بلوچستان کو مشرقی پاکستان سے تشبیہہ دینا معاملے کو خوامخواہ ہوا دینے والی بات ہے جبکہ درحقیقت ان معاملات میں بڑا فرق ہے مشرقی پاکستان کا زمینی فاصلہ وہاں تک پہنچنے میں ایک بڑی رکاوٹ تھا جبکہ آج کا پاکستان نظریاتی کے ساتھ ساتھ ایک جغرافیائی اکائی بھی ہے۔ یہاں ہر صوبہ دوسرے پر انحصار کرنے پر مجبور ہے اور یہ سمجھنا کہ کوئی بھی صوبہ ہر معاملے میں خود کفیل ہو سکتا ہے کسی طرح درست نہیں۔ کسی کے پاس بجلی ہے تو کسی کے پاس گندم اور کہیں بندرگاہ موجود ہے تو کہیں معدنی دولت۔ اس لیے یہ سوچنا کہ کوئی بھی صوبہ دوسرے کے بغیر اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے بالکل غلط ہے اور اگر اسی خیال کی ترویج کی جائے تو ہی ہم ایک ایسا پاکستان تشکیل دے سکتے ہیں جس میں ہر صوبہ اور ہر حصہ ایک فعال کردار ادا کر سکے۔
بلوچستان میں اس وقت ایک بے چینی ضرور پائی جاتی ہے لیکن ایسا سوچنا کہ براہمداغ اور حربیار پورا بلوچستان ہے، بھی انتہائی غلط ہے۔ بلوچستان کی

ایک بہت بڑی آبادی پختون بھی ہیں اور وہ بلوچ بھی جو پاکستان سے محبت کرتے ہیں خاص کر بلوچ نوجوان اور یہ نوجوان بذات خود پاکستان کا ایک بہت بڑا ہتھیار ہیں لہذا ان پر کام کرنا بہت ضروری ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ محب وطن نوجوانوں کو ہتھیار بند کریں بلکہ انہیں ایک مثبت تبدیلی لانے کیلیۓ استعمال کیا جائے۔ حکومت انہیں وہ وسائل مہیا کرے جو انہیں ذہنی طور پر مطمئن کر دے تو یہی قومی یکجہتی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ بلوچستان کے مسائل پر میڈیا پر کئی پروگرام کیے جا رہے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بلوچستان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور خاص کر سیاسی زیادتیوں اور ترقیاتی کمی کا احساس پوری قوم کو ہے اور سب اس کا مداوا چاہتے ہیں اور اگر سب ہی ایسا چاہتے ہیں تو حکومت خلوصِ دل سے اس کی منصوبہ بندی کرے وقت اب بھی ہمارے ہاتھ میں ہے، بلوچوں کی اکثریت اب بھی پاکستان کی حامی ہے وہ خود بھی بدامنی سے تنگ ہیں وہ بھی آزادی سے ایک خوشحال پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں وہی پاکستان جس کیلیۓ ان کے آباؤاجداد نے ووٹ دیا تھا اور اس میں رہنا پسند کیا تھا خالصتاً اپنی مرضی سے۔

شدت پسند امریکہ ہے مسلمان نہیں

مغرب اور اہل مغرب جو ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں کوئی معمولی سا واقعہ ہو اور مسلمانوں کو شدت پسند، انتہا پسند اور دہشتگرد قرار دے دیں اور پھر ان کے خلاف نہ ختم ہونے والا پروپیگنڈا بلکہ جنگ شروع ہو جائے۔ تمام عالمی ادارے چیخ اٹھتے ہیں اور مسلمانوں سے آگے بڑھ کر اسلام، اسکی تعلیمات اور پیغمبر اسلام تک پہنچ جاتے ہیں۔ ملعون ٹیری جونز کی علی الاعلان قرآن کی بے حرمتی کے واقعے پر امریکی خاموشی اُس کی نیت کی غماز ہے اسی طرح فیس بک پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ اسلم کی شان میں گستاخانہ خاکوں کے واقعات ماضی بعید کے قصے نہیں بلکہ یہ سب کچھ پچھلے دو چار سالوں کے واقعات ہیں۔ انہی مکروہ واقعات میں تازہ اضافہ افغانستان میں امریکی ائیر بیس بگرام پر قرآن پاک کو جلا کر شہید کرنے کا ہے۔

22 فروری 2012 کو بگرام ائیر بیس پر کوڑا کرکٹ جمع کرنے والے چند لوگوں کو جلے ہوئے قرآن پاک اور کچھ مذہبی کتابوں کے صفحات ملے جنھوں نے اس کی رپورٹ کی ،یہ خبر پھیلتے ہی افغانستان بھر میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ امریکی صدر نے اگرچہ رسمی معافی ضرور مانگی لیکن ایساف کے کمانڈر جان آر ایلن نے

واقعے کو غلطی قرار دے کر اس سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کی اور اُن فوجیوں کو جو اس میں ملوث تھے کو نہ صرف کسی سزا کا حقدار قرار دینے سے احتراز کیا گیا بلکہ ان کے کورٹ مارشل کو بھی بعید از مکان قرار دے دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا کہ کوئی ممکنہ سزا زیادہ سے زیادہ عہدے کی تنزلی ہو سکتی ہے۔ یہ ہے وہ مغربی رویہ جسے وہ ہمیشہ انتہائی برحق سمجھتا ہے جبکہ دراصل یہ وہ رویہ ہے جو انتہا پسندانہ بھی ہے اور شدت پسندانہ بھی۔ امریکہ جس انداز سے دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے وہ بذات خود دہشت گردی ہے بلکہ وہ خود شدت پسند ہے اور شدت پسندی کو ہوا دے رہا ہے۔ اس واقعے میں بھی جس طرح اسے غلطی قرار دیا گیا ہے وہ مضحکہ خیز بھی ہے اور توہین آمیز بھی۔ کسی پوری لائبریری یا دو چار سو کتابوں میں ایک دو نسخے تو نظروں سے اوجھل ہونے کا امکان ہو سکتا ہے لیکن ایک بیس پر پڑی ہوئی چند کتابوں میں یہ کئی ایک نسخے کیسے نظروں سے اوجھل ہوئے۔ کیا امریکی نہیں جانتے تھے کہ قرآن پاک مسلمانوں کی مقدس کتاب ہے اس کی تو جلد اور ظاہری انداز ہی بتا دیتا ہے کہ یہ کتاب قرآن پاک ہے پھر غلطی کا سوال کیسے پیدا ہوتا ہے اور جب مسلمان اس طرح کے واقعات پر غم وغصے کا اظہار کرتے ہیں تو انہیں انتہا پسند قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ انہیں اس رویے پر مجبور کیا جاتا ہے اور جب اہل مغرب جانتے ہی ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب کے بارے میں انتہائی حساس ہیں تو کیوں انکے مذہب کو چھیڑا جاتا ہے اگر عوامی سطح پر ایسا ہو بھی جائے تو حکومتیں کیوں انہیں

نذر انداز کر دیتی ہیں۔ اگر مسلمان ممالک میں کسی دوسرے مذہب کے خلاف کوئی چھوٹا سا ایسا واقعہ ہو جائے اور حکومتیں اُس کے خلاف ایکشن لے بھی لیں تو بھی مغرب اپنے ظالمانہ رد عمل کو اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن اس حالیہ واقعے پر تو خود مسلمان حکومتوں بلکہ پاکستانی حکومت اور میڈیا کا رویہ بھی خاصا قابل اعتراض تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اب اس طرح کے واقعات کے عادی ہوگئے ہیں اور ہم نے مغرب کے اس حق کو بھی تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہمارے دین، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ اسلم اور کتاب کے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کرتے رہیں تو بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اس مسئلے کا حل پُر تشدد ہنگامے نہیں بلکہ حکومتی سطح پر ایک مضبوط موقف اپنانے کی ضرورت ہے اور مغربی حکومتوں بشمولِ امریکہ سے پُرزور طور پر یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اس طرح کے واقعات کی روک تھام کرے اور ان میں ملوث مجرموں کو شدید ترین سزائیں دیں، جب دو چار لوگوں کو یہ سزا ملے گی تو آئندہ ایسے واقعات غلطی سے بھی نہیں ہونگے۔ امریکہ افغانستان میں دہشت گردی کا مجرم بھی ہے اور پاکستان اور افغان امن کی تباہی کا بھی، اب وہ افغانستان میں اپنے قیام کی طوالت کے لیے اس طرح کے حربے آزماتا رہے گا کیونکہ اس کا مقصد دنیا میں شر اور فساد پھیلانا ہے تاکہ دنیا اسکا اسلحہ بھی خرید ے اور اس کے تابع بھی رہے اور چاہے اسکی اپنی معیشت تباہ ہوتی رہے لیکن وہ اقوام مسلم پر جنگ مسلط رکھے ۔ ان رویوں کے خلاف صرف گلہ کرنا درست نہیں بلکہ ایک مضبوط حکومتی

موقف ہی ان کو ختم کرنے کا باعث بن سکتا ہے یہ ہماری غیرت کا تقاضا بھی ہے اور
مذہبی فریضہ بھی۔

پاکستانی سیاست یا گورکھ دھندا

سیاست کہیں بھی خم و پیچ سے عاری تو نہیں ہوتی لیکن پاکستان کی سیاست تو ایک عجیب گورکھ دھندا ہے۔ کبھی اس میں حکومت کا عمل دخل اور کبھی فوج کی دراندازیاں۔

میڈیا پر ایک شور ہے کہ آئی ایس آئی نے آئی جے آئی بنائی اور سیاست دانوں میں پیسے تقسیم کیے یعنی باالفاظ دیگر انہیں خریدا گیا اور یہی وہ المیہ ہے جس نے ہمارے ملک کو ہمیشہ اپنے حصار میں لیے رکھا۔ ہمیں مارشل لا کا گلہ بھی ہے اور شکایت بھی اور یہ سچ بھی ہے کہ بار بار کے مارشل لانے قومی اور بین الاقوامی طور پر ہمیں بے اعتبار بھی کر دیا ہے لیکن اگر ایک ایماندارانہ تجزیہ کیا جائے تو ہمارے سیاستدانوں نے کبھی اپنے منصب کے شایانِ شان کردار ادا نہیں کیا ان کی وفاداریاں چڑھتے سورج کے ساتھ ساتھ رہیں اور وہ اس کے لیے بڑے دھڑلے سے یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ سیاست میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ پیسوں کی تقسیم اور قبولیت دونوں افسوسناک عوامل ہیں لیکن دکھ اور افسوس اسی بات کا ہے کہ ہمارے ملک میں بات ضمیر کی نہیں مانی جاتی یا اسے بڑی آسانی سے گروی رکھ لیا جاتا ہے۔ سینٹ کے حالیہ انتخابات میں ایک خوف تھا کہ پھر فوج اور آئی ایس آئی کی مداخلت ممکن ہو سکتی ہے لیکن اس بار سیاستدانوں اور حکومت نے خود وہ کارنامہ سرانجام دے دیا جس کے لیے ہمیشہ وہ فوج سے شاکی نظر آتے

ہیں اور سینٹ کی نشستوں کے لیے پیسے کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ ووٹ ضمیر کی آواز کے مطابق نہیں بلکہ رقم کے مطابق دیئے گئے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کون جیتا اور کون ہارا، کس کو کتنی نشستیں ملیں لیکن پریشانی یہ ہے کہ قوم اپنے اس ایوانِ بالا سے کیا توقع رکھے جہاں پہنچنے والوں نے خود خرید وفروخت کرکے اپنی سیٹ خریدی اور جب وہ اس ملک کی قسمت کے فیصلے کریں گے تو کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ واقعی ملکی ضروریات اور مفادات کے مطابق فیصلے کریں گے نہ کہ اپنی ذات کے لیے اور اپنے فوائد کے لیے۔ سیاست میں اختلاف رائے اپنی جگہ لیکن اسے دور کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے پارٹی کی تبدیلی کوئی قابل فخر بات نہیں اور اگر ایسا کیا جائے تو پھر بیانگ دہل کیا جائے نہ کہ بظاہر تعلق ایک کے ساتھ اور بباطن ووٹ کسی اور کے لیے ۔ایک عام آدمی کی مجبوری کو تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنا ووٹ اپنی مرضی کے خلاف کسی ایسے امیدوار کو دے دیا جو اُس کے لیے قابل بھروسہ نہیں یا اُس نے یہ حق اپنے دل کی آواز کے مطابق استعمال نہیں کیا تو یقینا اس کی کوئی مجبوری ہو گی لیکن کروڑوں کے یہ مالک ممبران صرف ہل من مزید کی خواہش میں ایسا کرتے ہیں اور حیرت انگیز طور پر ہمارے سیاستدان دو لاکھ اور پانچ لاکھ کے لیے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اس میں لینے اور دینے والا دونوں مجرم ہیں لیکن لینے والا نہ لے تو دینے والا کس کو دے۔

ہم میں سے ہر ایک چونسٹھ سال کا رونا تو روتا ہے لیکن حالات کو بدلنے کی مخلصانہ کوشش کہیں سے ہوتی نظر نہیں آتی بلکہ قومی جرائم میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ جی ہاں یہ ایک قومی جرم ہے کہ آپ اپنا نظریہ بیچ دیں، کسی پارٹی سے وابستگی کسی نظریے سے وابستگی ہوتی ہے اور اُس کو یوں برائے فروخت نہیں ہونا چاہیے اور اگر یہ سب ایوانوں کے اندر ہو تو پھر تو مزید دکھ دینے کی بات ہے کیوں یہ عوام کی امانت کو فروخت کر دیتے ہیں اور جس مینڈیٹ کے ساتھ اُنہوں نے اپنے نمائندوں کو یہاں بھیجا ہوتا ہے وہ آپ فنا ہو جاتا ہے۔ دیگر اداروں مثلاً آئی ایس آئی اور فوج سے سیاستدانوں کی شکایت کو بھی عوام تب ہی اہمیت دیں گے جب ان کا دامن صاف ہو لیکن جب خود وہ اس طرح کے جرائم میں ملوث ہونگے تو دوسروں سے شکایت کی کوئی تو جیہہ عوام کو مطمئن نہیں کر سکے گی۔

امریکہ کا نشہ قوت

ایک دفعہ پھر دہشت گردی بھی اور زبردستی بھی اور ہزار توجیہات بھی کہ گناہ گار کو بے گناہ ثابت کیا جائے افغانستان میں 22 فروری کو قرآن مجید کی شہادت کے واقعے پر غم وغصے کی لہر اپنی پوری شدت سے چل ہی رہی تھی کہ ایک امریکی فوجی نے سولہ افغان شہریوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا اور اس کا وحشی پن یہاں پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس نے اِن معصوموں کی لاشوں کو آگ لگا دی۔ ان شہید کیے جانے والوں میں نو بچے اور عورتیں بھی شامل تھے۔ امریکہ کے مطابق یہ ایک فوجی کا انفرادی فعل تھا تاہم کچھ گواہوں کے مطابق یہ ایک سے زیادہ امریکی فوجی تھے تعداد جو بھی تھی۔ لیکن فعل اتنا قبیح ہے کہ انسانیت شرما جائے یہ صرف قندھار کے ضلع پنجوائی کے سولہ بے گناہ سوئے ہوئے شہری نہیں تھے کہ جن کے خلاف امریکی فوجی یا فوجیوں نے اپنی وحشت وبربریت کا اظہار کیا بلکہ یہ وہ خبثِ باطن ہے جو امریکہ انسانوں اور خاص کر مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے اس کی نظر میں نہ افغان نہ پاکستانی اور نہ ہی عراقی انسان کی تعریف پر پورا اترتے ہیں بلکہ یہ اعزاز صرف امریکیوں یا اُس کے مغربی حواریوں کو حاصل ہے۔

امریکہ جو کہ پوری دنیا کا ٹھیکیدار بنا بیٹھا ہے وہ نہ صرف خود کو ملکوں

کی جمہوریت کا ذمہ دار سمجھتا ہے بلکہ وہ اکیلا خود کو ہی انسانی حقوق کا علمبردار بھی گر دانتا ہے اور اس طرح کے واقعات میں ملوث اپنے شہریوں کو ہر ملک کے قانون سے بالاتر سمجھتا ہے دراصل یہ رویہ وہ خون ہے جو اُس کے منہ کو لگا ہوا ہے۔ امریکہ اس خطے سے نکلنا کیوں نہیں چاہتا کیونکہ ابھی اسکے مقاصد حاصل نہیں ہوئے ہیں اور اس نے اس خطے کے لوگوں کو اپنا غلام سمجھنا شروع کر رکھا ہے۔ پاکستان اور افغنستان میں وہ مسلسل انسانی حقوق اور ملکی قوانین کی خلاف ورزیاں بڑے دھڑلے سے کر رہا ہے۔2011 میں پہلے جس طرح اُس کے جاسوس ریمنڈ ڈیوس نے لاہور کی ایک مصروف سڑک پر خون کی ہولی کھیلی اور پھر جس طرح امریکہ اُس کو چھڑا کر لے گیا وہ واقعہ ابھی سب کو یاد ہے، ابھی اس واقعے کی گرد نہ بیٹھی تھی کہ ایبٹ آباد میں امریکی ہیلی کاپٹروں کی آمد یعنی پاکستانی سرحدوں کے سینکڑوں میل اندر تک آ جانا اور کاروائی کرنا ایک اور دھونس تھی اس میں ہماری اپنی جو کمزوری تھی وہ اپنی جگہ لیکن امریکہ نے ہمارے ساتھ ایک مفتوح والا سلوک کیا کہ جس کے گھر پر جب چاہے حملہ کیا جائے۔
سلالہ چیک پوسٹ پر حملہ کرکے بھی امریکہ نے اسی نخوت کا ثبوت دیا اور پاکستانی مطالبے کے باوجود معافی مانگنے پر تیار نہ ہوا۔ اس وقت امریکہ خود کو جس قدر پوری دنیا کا مالک سمجھ رہا ہے اتنا ہی اس کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے اُس نے جس طرح خود کو ہر دہشت گردی کا لائسنس جاری کر رکھا ہے اور اپنے لیے ہر خون روا اور معاف سمجھ رکھا ہے وہی سب سے بڑی دہشت گردی ہے۔

اپنے اس فوجی کو بھی جس نے اِن سولہ افغان شہریوں کی جان لی اُس نے دماغی مریض قرار دے دیا ہے اور اِسی مرض کو بہانہ بنا کر وہ یقیناً اُسے بچانے کی کوشش کرے گا اور بچالے گا لیکن کیا وہ امریکی فوجی جنھوں نے افغانوں کی لاشوں کے اوپر پیشاب کرکے اپنی وحشت کا ثبوت دیا تھا وہ بھی ذہنی مریض تھے اور اگر ایسا تھا تو کیا اُس کی پوری فوج ذہنی مریض ہے یا اُس کے ہوس ملک گیری نے اُسے ایسا بنا دیا ہے دونوں صورتوں میں ذمہ دار امریکی حکومت ہے اور کسی بھی صورت میں یہ کھلی دہشت گردی ہے۔ اور اب جبکہ امریکہ افغانستان سے نکلنے کی اور اس سال تئیس ہزار فوجیوں کو نکالنے کی بات کر رہا ہے تو ساتھ ہی ایران کے بارے میں شدت پسندانہ بیانات دے رہا ہے ایک سروے میں باسٹھ فیصد امریکیوں نے یہ رائے دی کہ اگر ایران کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں تو اس پر حملہ کر دینا چاہیے یعنی وہ امریکی عوام بھی قوت و طاقت کو صرف اپنا حق سمجھتے ہیں تاکہ دنیا بھر میں ان کی بدمعاشی قائم رہے۔ پاک ایران گیس پائپ لائن پر اُسے اعتراض ہے تاکہ پاکستان اُس کا دست نگر رہے۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان بہتر تعلقات اس کو گوارا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہاں ہونے والی امن کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور تصفیہ نہیں ہو پاتا۔ نیٹو سپلائی بند ہونے کے بعد خیبر پختونخواہ میں دہشت گرد حملوں کی شدت بھی معنی خیز ہے ورنہ امریکی امداد سے ہاتھ کھینچ لینے کے بعد طالبان کے پاس پاکستان مخالف حملوں کا کوئی جواز نہیں۔ دراصل یہ خود امریکہ کے حق

میں بہتر ہے کہ اس خطے میں حالات بد سے بد تر رہیں اور وہ اپنی موجودگی کا کوئی بھونڈا جواز مہیا کرتا رہے اور اسی لیے وہ حالات کے بگاڑ کے لیے حتی الامکان کوشش میں مصروف ہے۔

امریکہ کی اِن تمام سازشوں کی کامیابی میں خود مسلمانوں کا قابلِ افسوس حد تک بزدلانہ اور مفاد پرستانہ رویہ بھی شامل ہے اگر مسلمان حکمران امریکی خوشنودی کی بجائے اپنے قومی اور ملی مفاد کو اہم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس کا مقابلہ کر سکیں۔ تیل فراہم کرنے والے ممالک یہی فراہمی روک دیں تو اُس کی جنگیں خود بخود دم توڑ جائیں گی۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلافات اسکی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ جب تک مسلمان حکمران اپنی خودی نہ پہچان لیں اور ملکی مفادات کو ذاتی مفادات سے بالاتر نہ سمجھنے لگ جائیں امریکی حکمران تو حکمران اس کے دہشت پسند فوجی اسی طرح مسلمان شہریوں کا قتل عام کرتے رہیں گے چاہے وہ قندھار یں پنجوائی کے گھروں میں ہو یا لاہور کی سڑکوں پر۔

مسخ شدہ لاشیں

بلوچستان میں مسخ شدہ لاشیں ایک قابل افسوس امر ہے جس نے پورے ملک میں بے چینی کی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ کراچی میں بوری بند لاشوں نے خوف وہراس پھیلا رکھا ہے اس شہر میں تو گلیوں اور سڑکوں پر سر عام لاشیں گرادی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی پاکستانی معیشت بھی دم آخر کی مریض لگنے لگتی ہے۔ خیبر پختون خواہ میں تو لاشوں کا شمار نہیں بم دھماکے ، ڈرون حملے ، جنازوں پر حملے، جرگوں میں دھماکے، جلی ہوئی لاشیں, اڑے ہوئے اعضا قیامت کا ہی منظر ہوتا ہے۔ محفوظ پنجاب بھی نہیں مون مارکیٹ میں جلے ہوئے انسانی بدن اب بھی نظروں کے سامنے آتے ہیں ۔لالکڑتی راولپنڈی میں بسوں سے انسانی جسم اس حالت میں نکلے کہ قابل شناخت نہ تھے۔ ملک عزیز پچھلے دس سالوں سے انہی حالات سے گزر رہا ہے اور ہسپتال تک محفوظ نہیں۔ کچھ دن دھماکہ نہ ہو تو خوش ہونے کی بجائے دل لرزنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ خاموشی کس طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ بم دھماکے کے بعد جسموں اور لاشوں کا حال نا قابل بیان ہوتا ہے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے والے بھی قابل رحم بنادیئے جاتے ہیں اور ایک ثابت شدہ دہشت گرد کے حق میں بھی کئی آوازیں اٹھنے لگتی ہیں اور انہیں ایجنسیوں کے مظالم کا شکار قرار دیا جانے لگتا ہے یہ عدالتوں میں ناکافی ثبوتوں کی بناپر بری کر دیئے جاتے ہیں

اور ہلاک شدگان کے لواحقین صرف سرد آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے لیے نہ انسانی حقوق کی تنظیمیں بولتی ہیں نہ میڈیا پروگرام کرتا ہے، نہ بھوک ہڑتالیں ہوتی ہیں نہ دھرنے دیئے جاتے ہیں کیونکہ اِن تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کی جانوں کی وہ قیمت وصول نہیں کی جا سکتی،انسانی حقوق کے نام پر شہرت کا بھی کوئی چانس نہیں ہوتا جو دوسری صورت میں ہوتا ہے لہٰذا وہ بے نام ونشان رہ جاتے ہیں۔

بلوچستان میں مسخ شدہ لاشوں کا الزام بڑے وثوق کے ساتھ ایجنسیوں پر ڈال دیا جاتا ہے اور دیگر سارے مجرموں اور گناہ گاروں کی پردہ پوشی ہو جاتی ہے۔ ہر لاپتہ فرد کا اغوا کنندہ بھی یہی ایجنسیاں قرار دے دی جاتی ہے اور وہی فوج اور وہی آئی ایس آئی جن پر قوم کو فخر ہوتا تھا،بڑے منظم انداز میں قابل نفرت بنائی جا رہی ہیں بیرونی یا اندرونی ہر قسم کے دشمن کا ایجنڈا،بڑے آرام سے پورا ہو رہا ہے۔ میری ملاقات چند ایسی خواتین سے ہوئی جن کے شوہر یا بیٹے دہشت گردی کی نذر ہو کر شہید ہو چکے ہیں اور ان کا یہ گلہ بالکل بجا ہے کہ وہ کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کریں کیا اتنا کہہ دینا اُنکے دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے کہ پورا ملک دہشت گردی کی زد میں ہے اور کسی ایک حملے کے ہلاک شدگان میں انکے پیارے بھی شامل تھے اور بس۔ جب کہ دوسری طرف مشکوک افراد کی پشت پناہی کے لیے ہر ایک کمربستہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ملک بھر میں اِن مسخ شدہ لاشوں کا مسئلہ درپیش نہیں اور کیا اسے حل کرنے کی ضرورت نہیں اور اِن ''لاپتہ افراد'' کے لواحقین کو کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں جن کے پیارے کسی دھماکے میں ایسے لاپتہ ہو جاتے ہیں کہ دوبارہ ملنے کی کوئی اُمید نہیں رہتی اور ان کے حوالے ایک ایسی جلی ہوئی لاش کردی جاتی ہے جس کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا یا چند اعضا کسی نام سے موسوم کرکے انہیں دے دیئے جاتے ہیں۔

دہشت گرد اگر پکڑے جاتے ہیں تو عدالت میں کوئی ایسا نظام کیوں موجود نہیں کہ انہیں ایسی سزائیں دی جائیں کہ کوئی اور ایسا کرنے کا سوچے بھی نہ۔ خود کش تو اپنی سزا کا خود انتخاب کرلیتا ہے لیکن منصوبہ سازوں کو کیوں تاحال کوئی سزا نہیں ملی۔ جہاں تک شرپسندوں مجرموں اور علیحدگی پسندوں کی بات ہے تو کیا دوسرے ممالک اپنے مجرموں کو انسانی حقوق کی بنیاد پر چھوڑ دیتے ہیں، کیا آزادی اور علیحدگی کی تحریکیں چلانے والے چند شرپسندوں کو پھولوں کے ہار پہناتے ہیں۔ جہاں تک لاپتہ افراد کا تعلق ہے ان کی بازیابی ضروری ہے اور اگر وہ مجرم ہیں تو ان کو قانون کے مطابق انتہائی سخت سزا دینا بھی ضروری ہے لیکن آسان حل یعنی ایجنسیوں کو ذمہ دار قرار دینے کی بجائے تحقیقات ہونا زیادہ ضروری ہیں۔ کیونکہ اگر یہ سارے گناہ گار نہیں تو سارے

بے گناہ بھی نہیں اور جس کا جتنا گناہ اُس کی اتنی سزا کو قبول کر لینا چاہیے۔ ہاں انہیں دیگر ممالک میں بھی تلاش کر لینا چاہیے اور دہشت گرد تنظیموں میں بھی۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ بہت سارے خود کش بھی اسی فہرست میں شامل ہوں۔ اس مسئلے کا حل الزامات نہیں تحقیقات اور عدل و انصاف کا بہتر نظام اور پھر استعمال ہے۔ مسخ شدہ لاشوں کا مسئلہ بھی اگر حل کرنا ہے تو پھر یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ پولیس اور فوج بھی اس ملک کے شہریوں اور انسانوں پر مشتمل ہیں اور چوکوں، سڑکوں اور جنازوں میں مرنے والے بھی انسان بھی ہیں مسلمان بھی اور پاکستانی بھی۔ ہر پہلو سے سوچیے اور پھر بتائیے کہ کیا یہ لوگ ہمدردی کے زیادہ حقدار نہیں اور کیا انہیں مارنے والے لائق سزا نہیں۔

امریکی سفارت خانہ یا مشاہداتی چوکی

ہمیں امریکہ سے کئی شکایات ہیں جو کہ بالکل بجا بھی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اسے مسلسل اپنے ملک میں دخل اندازی کے مواقع فراہم کرتے رہتے ہیں کبھی بغیر روک ٹوک اور تحقیق کے بے شمار ویزے جاری کر کے ، کبھی بلیک واٹر جیسی بدنام زمانہ تنظیموں بلکہ دہشت گردوں کو ملک میں رہنے کی اجازت دے کر اور یہاں تک کہ دہشت گردوں کو مارنے کے نام پر ڈرون حملوں کی بھی۔ اس کے اعلیٰ حکام کے بے اندازہ دورے ایک اور طریقہ ہے اور اِن کے برائے نام اعلیٰ حکام سے بھی ہمارے اعلیٰ ترین حکام کی ملاقات بھی انتہائی ضروری گردانی جاتی ہے۔ فلاحی اداروں اور این جی اوز نے ایک اور طوفان مچا رکھا ہے یعنی امریکہ ہزار حیلوں بہانوں سے ہمارے ملک، معاشرے بلکہ ہماری حکومت میں داخل ہو چکا ہے۔ رہی سہی کسر اسکے شاہانہ سفارت خانے کے ذریعے پوری کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس سفارت خانے کی سات منزلہ عمارت ایک اچھی خاصی مشاہداتی چوکی (Observation Post) بننے کی پوری اہلیت و صلاحیت رکھے گی اور سیکیورٹی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اعتراض کے مطابق یہاں سے ایوان ہائے صدر و وزیراعظم دونوں میں نقل و حرکت بخوبی دیکھی جاسکے گی۔ سوال یہ ہے کہ سی ڈی اے نے اس تعمیر کی اجازت کیونکر دی کیا اسلام آباد جیسے حساس شہر میں ہر ادارے کو حد سے زیادہ محتاط نہیں ہونا

چاہیے اور موجودہ حالات میں جہاں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات خاصے کشیدہ ہیں اسی سال جنوری میں یہ اجازت کیسے دی گئی اور اسکے اس نقشے کو کیسے منظور کر لیا گیا یہ وسیع و عریض سفارت خانہ 208418 مربع گز کے پلاٹ پر بن رہا ہے اور اس کی عمارت 1734212 مربع فٹ پر محیط ہوگی۔ اسے جدید سہولیات سے آراستہ کیا جائے گا۔ایک رپورٹ کے مطابق اس میں ایٹمی مورچہ بھی تعمیر کیا جائے گا۔ اس پر خرچے کا تخمینہ ایک ارب ڈالر ہے۔ اس کی تفصیلات جاننے کے بعد ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا ہیڈ کوارٹر تعمیر کیا جا رہا ہے جس میں جنگی تعمیرات بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نقشے اور ان سہولیات کی وجہ سے باقی ممالک کے سفارت خانوں میں ہونے والی سرگرمیاں بھی مانیٹر کی جا سکیں گی بلکہ چین تو اپنی تشویش کا اظہار بھی کر چکا ہے۔ سفارتی عملے کو آرام دہ اور پر سکون ماحول مہیا کرنا ہر ملک کا سفارتی حق ہے لہذا اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے لیکن جب تعلقات نازک نوعیت کے ہوں اور ہوں بھی پاکستان جیسے ایک چھوٹے، غریب اور ساتھ ہی تزویراتی لحاظ سے اہم ملک کے دارلخلافے میں ایک طاقتور اور خود کو دیگر ممالک کی قسمت کا تو بالعموم لیکن پاکستان کی قسمت کا بالخصوص مالک سمجھنے والے ملک امریکہ کا تو ظاہر ہے کہ پاکستان کے عوام کو یقینا یہ پوچھنے کا حق ہے کہ انہیں یہ آسانیاں کیوں فراہم کی جا رہی ہیں۔ کیا امریکہ کا پچھلا ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ جس نے اپنی ضرورت کے وقت تو پاکستان کو مکمل طور پر استعمال کیا لیکن جب

بھی پاکستان کو اس کی ضرورت پڑی اس نے صرف اور صرف تاریخیں دیں اور وقت آنے پر کسی بھی امداد سے معذوری ظاہر کی جسکی ایک مثال 1971 کا امریکی امدادی بحری بیڑہ ہے جو تا حال پاکستان نہیں پہنچ سکا ہے۔ ہاں اسکے جاسوس جہاز مسلسل پاکستانی فضاؤں کو روندتے ہوئے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اپنے ٹارگٹ کو مارتے ہیں اور بحفاظت واپس چلے جاتے ہیں۔

یہ بات تو قابل اعتراض ہے ہی کہ امریکہ ہمارے ملک میں ہر قسم کی مداخلت پر آمادہ رہتا ہے یہاں تک کہ حکومتی پالیسیوں پر بھی اپنی رائے کا اظہار کرتا رہتا ہے چاہے وہ یہ کہے کہ ''یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے'' لیکن اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ بلوچستان کے مسئلے پر اُس نے جس ناروا اور شرمناک رویے کا مظاہرہ کیا پاکستان کے ہر شہری کو اس پر شدید اعتراض ہوا لیکن ان سارے حقائق کے باوجود یہ بات قابل غور ہے کہ اُسے یہ شہہ ہماری کمزوری کی وجہ سے ملتی ہے اور یہ کمزوری عوام کی سطح پر نہیں بلکہ حکومتی سطح پر ہے۔ عوام تو باوجود اپنے بے شمار مسائل کے حکومتی پالیسیوں پر اعتراض بھی کر لیتے ہیں اور اس پر نظرثانی کا مطالبہ بھی لیکن ڈھاک کے وہی تین پات رہتے ہیں اور پالیسی میں کسی تبدیلی کے آثار تک نمایاں نہیں ہوتے جب تک خود حکومت کے کرتا دھرتا متاثر نہ ہوں۔ پاکستان کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہر حکومت سب سے پہلے تو حکومت بچاؤ مہم پر رہتی ہے اور اس سے جو وقت

بچتا ہے اس میں ذاتی تشہیر و ترویج کر لی جاتی ہے، ملک کی باری آتے آتے بہت کچھ بگڑ چکا ہوتا ہے۔ سفارت خانے کی اس تعمیر جس پر بہت سے اندیشے اور سوالات اٹھتے ہیں کو ابھی سے زیر غور رکھ کر اس پر کوئی ایکشن لے لینا چاہیے تعمیر شروع ہوئی تو مکمل ہونے میں کچھ دیر نہیں لگے گی اور اگر یہ عمارت تعمیر ہو گئی تو معاملات مزید پیچیدہ ہو سکتے ہیں جو کہ پہلے ہی کافی گھمبیر ہیں۔ معاملہ ایک عمارت کی تعمیر کا بھی نہیں بلکہ اُس نیت اور عمل کا ہے جو امریکہ ہر معاملے میں دکھا رہا ہے۔ سلالہ چیک پوسٹ کے معاملے پر آج ہی یعنی 26 مارچ کو اس کا یہ بیان آیا ہے کہ غلطی امریکہ کی نہیں پاکستان کی تھی اس لیے معافی نہیں مانگی جائے گی۔ مستقبل میں ایسی کسی دھونس سے بچنے کے لیے آج ہی پیش بندی کر لینی عقلمندی ہے۔ سی ڈی اے اس معاملے کا سنجیدگی سے نوٹس لے اور اگر وہ خود سے ایسا نہ کرے تو وفاقی حکومت اسے ایسا کرنے کا حکم دے کیونکہ معاملہ قومی دلچسپی بلکہ امریکہ کے کیس میں تو قومی سلامتی کا ہے اور قومی سلامتی بہر حال ہر چیز پر مقدم ہے۔

میڈیا کے لیے پچاس کروڑ ڈالر

میڈیا اپنا اثر و رسوخ پہلے بھی رکھتا تھا جب اخبارات زیادہ سے زیادہ، چند ایک ریڈیو اسٹیشنوں اور تین چار ٹیلیویژن چینلز پر مشتمل تھا۔ تب بھی یہ بناؤ اور بگاڑ کا کئی کئی زاویوں سے ذمہ دار ہوتا تھا فیشن، ڈرامہ معاشرتی و سماجی جنگ سب اس کا موضوع بنتے تھے لیکن آج کے آزاد میڈیا نے تو دنیا بھر میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جو ملکوں کے فیصلوں پر براہِ راست اثر انداز ہونے کی قوت رکھتا ہے۔ عوامی شعور کی بیداری آج کے میڈیا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ دوسری طرف اسی میڈیا نے معاشرے میں کئی ایک سماجی برائیوں کو بھی پھیلایا ہے۔ اگرچہ یہ موجود پہلے سے تھیں لیکن انہیں فروغ ملتے ملتے اب یہ برائی نہیں سمجھی جارہی اور انہیں معاشرتی اور سماجی رواجوں کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس میں لباس اور معاشرتی رویے سب شامل ہیں۔ آزادی اظہار کے نام پر کچھ ایسے اقدامات بھی کیے جاتے ہیں اور کچھ ایسے پروگرامز بھی پیش کیے جاتے ہیں جو ہرگز ہرگز ملک کے حق میں نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات ملک کی تذلیل کا باعث بنتے ہیں ۔ یہاں تک کہ نظریۂ پاکستان پر بھی تنقید کر دی جاتی ہے اور ان لوگوں کا نکتہ نظر بڑے ذوق و شوق سے پیش کیا جاتا ہے جو کھلم کھلا دو قومی نظریہ اور نظریہ پاکستان کے مخالف ہیں۔ اسی میڈیا پر کرپشن کے کینسر بھی

سامنے آتے ہیں اور حکومتی فیصلوں پر نظرثانی کرنے کیلئے حکومت کو مجبور بھی کیا جاتا ہے تاہم اس کے باوجود مندرجہ بالا منفی پہلو قابلِ معافی نہیں ہو سکتے۔

پچھلے دنوں ایک نجی ٹی وی چینل پر ایک پروگرام نظر سے گزرا جس میں الیکٹرانک میڈیا کے چند اینکرز نے ایک نہایت اہم موضوع پر گفتگو کی اور وہ تھی کہ امریکہ نے پاکستانی میڈیا کیلئے 50 کروڑ ڈالرز کی امداد مختص کی ہے لیکن آخر کیوں؟ اور میڈیا جیسے حساس اور اہم شعبے پر آخر وہ کیوں خرچ کرنا چاہتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس ملک کے میڈیا کو اپنے حق میں استعمال کرکے اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے۔ اسی پروگرام میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ ایک صحافی امریکہ سے اپنا ٹی وی چینل شروع کرنے کیلئے امداد کا طلب گار ہے۔ اگرچہ اس صحافی یا اینکر کا نام نہیں لیا گیا لیکن ظاہر ہے وہ جو بھی ہے وہ ملک سے کتنا وفادار ہو سکتا ہے؟ ہمارے کئی اینکرز ببانگِ دہل نظریہ پاکستان کے خلاف بولتے نظر آتے ہیں بلکہ کئی تو بھارت، امریکہ اور اسرائیل کے خلاف بات کرنے والے کو باقاعدہ تنقید کا نشانہ بنا کر انہیں شر پسند ثابت کرتے ہیں تو کیا یہ امداد ایسے ہی پروگرامز کرنے پر راضی ہونے والوں پر خرچ کی جائے گی۔ کسی بھی قوم کی یہ دراندازی دوسری قوم کو بغیر تیر و تلوار کے تباہ کرنے کا سب سے خطرناک ہتھیار ہے اور پاکستان کے آج کل کے حالات

دراصل خود ہی وہ اجازت نامہ ہے جو دوسری قوموں کو اپنے معاملات میں دخل اندازی کرنے کیلئے مرحمت فرما دیا جاتا ہے اور وہ حالات ہیں اندرونی کمزوریاں، ناچاقیاں، فرقہ واریت اور تعصب۔ یہاں کبھی سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان اور مہاجر کے نام پر قوم کو تقسیم کر دیا گیا ہے اور کہیں شیعہ اور سنی کے نام پر اور باہم دست و گریباں ان لوگوں کے جذبات کو جب مزید بھڑکا دیا جاتا ہے تو وہ بغیر سوچے سمجھے بھڑک اٹھتے ہیں اور ملک دشمن نہ ہوتے ہوئے بھی ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں جو ملک کے حق میں نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایک غریب ملک ہونے کے ناطے ہمیں امداد کی ضرورت پڑتی ہے یہ اور بات ہے کہ یہ ضروریات زیادہ تر ہماری خود ساختہ ہوتی ہیں جن کیلئے ہم اپنی آزادی گروی رکھ لیتے ہیں۔

ہمارے نیوز میڈیا کی اکثریت جس طرح عوامی مسائل، حکومتی خامیوں اور ملک دشمن عناصر پر نظر رکھے ہوئے ہے اس کا ایک بہت اچھا تاثر ابھر سکتا ہے اور بہت اچھے نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں اگر یہ خود ان چند لوگوں پر کڑی نظر رکھے جو صرف اپنے مفادات اور اپنی رینکنگ بڑھانے کی خاطر ملک کی ساکھ کو داؤ پر لگا دیتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ غیر جانبدارانہ تبصرہ کرتے ہیں جبکہ درحقیقت وہ اپنے آقاؤں کیلئے انتہائی جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کی خوشنودی اور اپنی خوشحالی کی خاطر سب کچھ کرنے پر آمادہ

رہتے ہیں۔

میڈیا نے اگر بہت کچھ کو اپنی ذمہ داریوں میں شامل کر لیا ہے تو خود احتسابی کو بھی انہی میں سے ایک سمجھ لے کیونکہ جب وہ خود کالی بھیڑوں کو اپنی صفوں سے نکال باہر کرلے گا اور غیر ملکی امداد لے کر اپنے ہی ملک اپنے ہی نظریے کے خلاف کام کرنے والوں کا محاسبہ کرے گا تو کسی اور کو ملک کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کی جرات نہ ہو گی اور ملک میں مزید اختلاف کو ہوا نہ ملے گی کیونکہ قومی اتحاد اور اپنے نظریے کی حفاظت وہ واحد ہتھیار ہے جو ہمیں تمام مصائب سے بحفاظت نکال باہر کرسکے۔

ہم اپنے خوں سے ہر ایک کیاری کی آبرو کو نکھار دیں گے

گیاری سیکٹر میں این ایل آئی کی چھٹی بٹالین کے سو سے زیادہ آئی ایس پی آر کے مطابق ایک سو اننتالیس سویلین، سپاہی اور آفیسر بشمول کمانڈنگ آفیسر ایک دیو ہیکل برفانی تودے کے نیچے آ کر دب گئے تودے کا حجم ہی وہ اندوہناک داستان سنا دیتا ہے جو رقم ہو چکی ہے۔ایک مربع کلومیٹر کی لمبائی، چوڑائی اور اسی فٹ اونچائی کی یہ سفید بلا کسی بلائے ناگہانی کی طرح صبح کے چھ بجے اس یونٹ کے ہیڈ کوارٹرز پر آ کر نازل ہوئی لیکن در حقیقت یہ بلائے ناگہانی نہیں تھی کیوں کہ یہاں پہنچنے والا ہر فوجی یہ سوچ سمجھ کر وہاں جاتا ہے کہ یہاں اسے کئی دشمنوں کا سامنا ہے لیکن سلام ہے اِن حوصلہ مند، جرات مند بھائیوں اور بیٹوں کو کہ وہ پھر بھی وہاں جاتے ہیں اور یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ رزق روزی کا معاملہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ وہ جذبہ اور ولولہ ہے جو انکی فطرت کا حصہ بن چکا ہوتا ہے کہ اس پاک سرزمین کی حفاظت ہمارا فرض ہے چاہے وہ سیاچین کے برف زار ہوں یا تھر کے ریگزار۔ سیاچین جو ہمیشہ سے پاکستان کا ہی حصہ تھا کبھی اس شدید اور مشکل ترین علاقے میں فوج تعینات کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی اور 1984 تک اس مسئلے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا لیکن بھارت کی بدنیتی اور بد فطرتی کے باعث یہ مسئلہ بن گیا جب اُس نے اپنی فوجیں پاکستانی علاقے میں داخل کر دیں اور دنیا

کا یہ مشکل ترین اور مہنگا ترین محاذ کھل گیا جس میں شاید آپس کی جھڑپوں کے باعث اتنی اموات اور شہادتیں نہ ہوئی ہوں جتنا موسم کے ہاتھوں ہو چکی ہیں۔ معاشی لحاظ سے نہ ہی تو بھارت کے عوام خوشحال ہیں نہ پاکستان کے لیکن اس جنگ پر کروڑوں اربوں روپے خرچ ہو چکے ہیں وہی پیسہ جو اِن ملکوں کے عوام کی بھلائی پر خرچ ہونا چاہیئے تھا وہ اس محاذ پر موسم سے لڑتے ہوئے خرچ ہو رہا ہے۔ بھارت نے تو از خود اس مسئلے کو پیدا کیا ہے لیکن پاکستان کے اوپر تو یہ سب کچھ مسلط کردہ ہے اور یہی اس مسئلے کا افسوسناک پہلو ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر دکھ اس بات کا ہے کہ نہ تو بین الاقوامی سطح پر بھارت پر کوئی دباؤ ڈالا گیا نہ ہی اُسے لعنت ملامت کی گئی کہ اس نے اس غیر انسانی جنگ کو شروع کیوں کیا اور نہ ہی قومی سطح پر اس چیز کا احساس اس انداز میں کیا گیا جس کی ضرورت تھی بلکہ اکثر اوقات تو فوج کے اخراجات اور بجٹ کو کچھ اس انداز میں تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے جیسے کسی دشمن ملک کی فوج کا ذکر کیا جا رہا ہو۔ جب کہ آج اس دیو ہیکل برفانی تودے سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس مناسب مشینری بھی موجود نہیں ہے کیونکہ یہ سب کچھ یقیناً بہت مہنگا ہے اور ہماری دسترس سے بہت دور۔ اور وہی فوجی جو ملک میں آنے والے سیلاب، طوفان اور زلزلوں میں متاثرین کی ڈھارس بندھاتے ہیں نہ پانی دیکھتے ہیں نہ ہلتی ہوئی زمین اور بے خطر ہر اُس خطرے میں کود پڑتے ہیں جہاں عقل محوِ تماشائے لب بام رہتی ہے آج ہزاروں ٹن برف کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ یہ صرف 139 افراد

نہیں اس قوم کے محافظ ہیں جن کے لیے لڑتے ہو جان دینا کچھ انوکھا نہیں اور نہ ہی
افسوسناک لیکن یوں بغیر لڑے اور دشمن کو ٹھکانے لگائے بغیر ایک ایسے دشمن کے نرغے
میں آجانا جس کا مقابلہ ممکن نہیں یقینا کسی فوجی کے لیے انتہائی حسرت آمیز ہوتا ہے۔
اس وقت قوم کی دعائیں یقینا اِن کے ساتھ ہیں۔ لوگوں کی طرف سے اُن کے لیے
ایس ایم ایسز کی گردش اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنے شیروں اور مجاہدوں کے لیے
فکرمند بھی ہے اور دعاگو بھی۔ قوم کی یہ محبت اس ملک کی سلامتی سے اور اس کی
حفاظت کرنے والوں سے ہے اور اُن لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ بھی جو ملکی مسائل کا ذمہ
دار فوج کو سمجھتے ہیں۔ دیس کے اِن سپوتوں کے لیے بے شمار دعاؤں کے ساتھ اُن
لوگوں سے بھی درخواست ہے جو بات بے بات فوج کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں کہ
فوج کی قربانیوں کا اندازہ بھی لگایئے اور اُس تنقید کا بھی جو اکثر اوقات سیاستدانوں کی
طرف سے آتی ہے ورنہ قوم نے ہمیشہ اپنے اِن جیالوں پر فخر ہی کیا ہے اور آج بھی وہ
اِن کے لیے دعاگو ہے۔ تین دن گزر جانے کے بعد بھی ان قابل فخر بیٹوں تک رسائی
ممکن نہیں ہو سکی ہے لیکن اِس حادثے نے شاید بہت سے لوگوں کو اپنے رویوں پر
سوچنے پر مجبور کردیا ہوگا کہ فوج جن مشکل حالات میں سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے وہ
یقینا اس بات کی متقاضی ہے کہ قوم کی دعائیں اور محبتیں ہر وقت ان کے ساتھ رہیں۔

میمو گیٹ کا فیصلہ۔۔۔ قوم منتظر

میمو گیٹ کا ایک شور اٹھا اور دب گیا۔ پاکستان میں ویسے بھی کمیشن صرف بنتے ہی ہیں اگر یہ اپنی سفارشات مرتب کرے بھی تو وہ ہمیشہ مخفی ہی رہتے ہیں کوئی نہیں جان پاتا کہ مجرم کون تھا سزا تو بہت بعد کی بات ہے سیاسی قتل، قومی سانحے ،بین الاقوامی سازشیں سب کچھ وقت اور مصلحت کی گرد میں دب جاتا ہے۔ تو کیا اب بھی ایسا ہی ہوا ،کیا میمو گیٹ بھی مصلحت کی نظر ہوگیا۔ مجرم جو بھی ہے کیا قوم کو یہ حق نہیں کہ اُس کے بارے میں جان سکے۔ چیف جسٹس اور عدلیہ کی بحالی کے لیے عوام نے جس طرح تحریک چلائی اُس کے بعد عوام بجا طور پر دلیرانہ فیصلوں کی توقع کر رہے تھے اگرچہ کچھ فیصلوں نے عوام کی ہمت بھی بندھائی لیکن کچھ اہم ترین نوعیت کے معاملات پر قوم میں مایوسی ہی پھیل رہی ہے اگر ایسا اب بھی نظریہ ضرورت کے اصول پر کیا جا رہا ہے تو پھر پیسہ اور وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ۔

اس کیس میں فریقین کے بیانات کافی اہم ہیں۔ منصور اعجاز اپنا موقف کافی زور و شور سے بیان کر چکا ہے۔ مجھے اس شخص کے قابل اعتبار ہونے پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں ہے اس کا ماضی اور حال میرے خیال کی تائید کرتا ہے تاہم اگر

کوئی الزام لگا ہے اور اگر لگانے والا غیر ملکی بھی ہے تو بھی تفشیش ضروری ہے اور اب تک اُس نے عدالت سے تعاون بھی کیا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے عدالت کو خاصی تگ و دو کرنی پڑی اور کیمرہ سیشن کے ذریعے یہ بیان ریکارڈ ہوا۔ مجھے منصور اعجاز کے بارے میں کوئی خوش گمانی اور خوش فہمی نہیں ہے نہ ہی اس سے پاکستان کے لیے کسی نیک نیتی کی توقع ہے کیونکہ خود بقول اسکے وہ مختلف خفیہ اداروں کے لیے کام کرتا ہے اور اُن سے اُس کے تعلقات ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے اس دعوے کو نظر انداز کر دیا جائے جو اُس نے حسین حقانی کے متعلق کیا ہے۔ وہ اپنے کردار اور ''پیشے'' کے لحاظ سے ایسے موقعوں کی تاک میں رہتا ہے جہاں وہ اپنی چال چل سکے اور اس کے لیے وہ ثبوت بھی برابر رکھتا ہوگا۔ اب حسین حقانی اور منصور اعجاذ میں کون سچا اور کون جھوٹا ہے یہ معلوم کرنا میرا یا کسی دوسرے عام پاکستانی کا کام نہیں ہے لیکن ہم اس کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ اس معاملے کے حقائق جان سکیں اور اسی لیے پوری قوم کی نظریں عدالت پر لگی ہوئی ہیں کہ آخر کوئی تو ایسا قومی جرم بھی ہو جس کے حقائق اور جس کے مجرم قوم کے سامنے لائے جائیں۔ اب جب کہ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ احمد شجاع پاشا بھی عدالت میں پیش ہو چکے ہیں منصور اعجاز نے بھی اپنے پاس موجود ثبوت پیش کر دیئے ہیں لیکن جناب حسین حقانی جو کہ اس کیس میں سب سے زیادہ مطلوب شخص ہیں ملک سے باہر ہیں اور عدالت سے کسی تعاون کے روادار نظر نہیں آتے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ بجا لیکن بصد معذرت اگر

عدالت کو ثبوت بھی مہیا ہیں اور پھر بھی فیصلہ ہونے میں دیر کی جا رہی ہے تو کیوں، اور اس کیوں کے پیچھے وہ خوف چھپا ہوا ہے کہ کہیں اس انتہائی اہم معاملے کو بھی دبا نہ دیا جائے۔ ایک ایسا معاملہ جس میں مبینہ طور پر کسی دوسرے ملک کی فوج یا حکومت کو یہ دعوت دی جائے کہ ہمارے ملک کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ان میں مداخلت کی جائے اور اپنی ہی فوج کے خلاف شکایت کی گئی ہے ایک ایسی فوج کے پاس جو پہلے ہی پاکستان کی تاک میں بیٹھی ہوئی ہے۔ عدالت کو اس وقت اس معاملے پر تیزی سے کام کرنے کی ضرورت ہے، چونکہ معاملہ امریکہ کے ساتھ ہے اس لیے انتہائی احتیاط کی ضرورت بھی ہے کیونکہ امریکہ کو ہمیشہ پاکستان سے اپنا کام لینے کی عادت ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بات اب بھی کچھ ایسی ہی ہو۔ بہر حال قوم بہت سے قومی سانحات کی طرح اس جرم کو سرد خانے میں ڈال کر دبا دینے کے خوف میں مبتلا ہے۔ خدا کرے کہ یہ خوف صرف ایک خوف ہی ہو اور حقیقت صرف یہ ہو کہ عدالت واقعی عدالت ہے وہ جگہ جہاں حق دار کو اس کا حق ملتا رہے اور مجرم کو سزا چاہے مجرم کوئی بھی ہو، با اثر ہو یا بے اثر حکومت ہو یا رعایا، حاکم ہو یا محکوم۔ میموگیٹ کا فیصلہ اب آجانا چاہیے اور مجرم کو اپنے انجام تک ضرور پہنچ جانا چاہیے تاکہ آئندہ کوئی اس قسم کی سازش کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم

ایک بار پھر یومِ شہدا آگیا پاک فوج تیس اپریل کو اپنے شہیدوں کو یاد کرتے ہوئے چار سال سے مسلسل یوم شہدا منا رہی ہے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے کہ ان شہیدوں کی قربانیوں کو یاد کیا جائے جو اِس ملک کی خاطر اپنے سر ہتھیلی پر لیے جنگلوں، میں آگ شبیں گزارتے ہیں اور پھر اپنی جانیں اس مٹی پر قربان کر دیتے ہیں اور اس کے لیے دعا کرتے ہیں کہ میں رہوں نہ رہوں اس کو بار ور کر دے اور اب کی بار تو اِن شہیدوں میں گیاری کے ایک سو انتالیس شہدا کی قربانی اور خون بھی شامل ہو گیا ہے یہاں شہیدوں کا وہ مزار بن گیا ہے جس کی حرمت ہر پاکستانی پر لازم قرار پائی ہے۔ سیا چین کا محاذ لیا جائے یا وزیر ستان اور سوات کا کبھی یہ مجاہد ملکی سرحدوں کی اور کبھی ملکی مفاد کی حفاظت کرتے ہوئے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں اور نہ کوئی شکوہ نہ شکایت نہ مقدمہ نہ سمن بس صرف قربانی۔ لیکن کیا قوم کو صرف اِن جوانوں کے خون کی ضرورت ہے اِن کی صلاحیتوں کی نہیں؟ جہاں تک دشمن کے خلاف جنگ کی بات ہے تو اس سے اِن ماتھوں پر شکن بھی نہیں آتی اور یہ سوئے دار چل پڑتے ہیں لیکن آخر کسی اور کی مسلط کردہ جنگ یہ قوم کب تک لڑتی رہے گی۔ جس ملک کے لیے ہم یہ جنگ لڑے جا رہے ہیں یعنی امریکی مفاد کی خاطر آخر ہماری حکومتیں کب اپنے رویوں اور پالیسیوں پر نظر

ثانی کریں گی اور اپنی پہلی ترجیح پاکستان اور اس کے عوام کو قرار دیں گی۔ شہادت اگرچہ مطلوب و مقصودِ مومن ہے لیکن جس طرح اس ملک کی فوج اور اس کے عوام کا قتلِ عام کیا گیا اور وہ دہشت گردوں کی نظر ہو ہو کر شہید ہوتے جارہے ہیں اسے اب بند ہو جانا چاہیے۔ دھماکوں اور دہشت گردی کی لہر اگر کچھ دنوں کیلئے رُک بھی جائے تو دوبارہ شروع ہوجاتی ہے اور شہیدوں کی فہرست لمبی ہوتی جاتی ہے۔ ابھی عوام مطمئن ہو بھی نہیں پاتے کہ ان کا سکون اور زندگی چھین لی جاتی ہے آخر اس سب کچھ کے پیچھے کون سے ہاتھ ملوث ہیں ،کیا القاعدہ اور طالبان اتنے طاقتور ہیں کہ ایک نہیں بلکہ دنیا کے پینتیس ممالک بشمول امریکہ اُن کی کمر نہ توڑسکے ہیں اور وہ جدید ترین اسلحے کے استعمال کے بعد بھی ان کے سامنے بے بس ہیں اور اگر پاکستان نے نیٹو سپلائی بند بھی رکھی ہوئی ہے تو پھر کون سے عناصر ہیں جواب بھی پاکستان کے خلاف سرگرم عمل ہیں یا انہیں ایسا کرنے کیلئے مدد فراہم کی جارہی ہے تاکہ پاکستان اور افغانستان میں موجودگی کا جواز مہیار ہے اور امریکیوں اور امریکہ کی حفاظت کی خاطر ان ملکوں کے عوام کی قربانی دی جاتی رہے۔

یہاں چند سال میں بے شمار تنظیموں کا بن جانا ان کے عہداروں اور اہلکاروں کی تنخواہوں اور ان کے اخراجات آخر کہاں سے پورے ہو رہے ہیں کیا ان پتھریلے پہاڑوں میں رہنے والے ان لوگوں کے ایسے ذرائع آمدن ہیں جو ان کا پیٹ بھرنے

کے علاوہ انہیں تنخواہ دار ملازم رکھنے کی اجازت دے سکیں۔ ان کو کمپیوٹر ماہرین کہاں سے مہیا ہو جاتے ہیں؟ بلوچستان میں، سوات میں، وزیرستان حتیٰ کہ بڑے چھوٹے تمام شہروں میں جس طرح ان دہشت گردوں نے امن وامان تباہ کرکے رکھ دیا ہے کوئی جان محفوظ ہے نہ مال۔ وہ جان جس کا کوئی نعم البدل نہیں اور وہ مال وہ سڑکیں وہ عمارتیں جس کو بناتے بناتے پاکستانی عوام اپنا خون پسینہ بہا دیتے ہیں سب ان کی نظر ہو رہا ہے، باپ بچوں کا رزق روزی گھر پہنچانے کی بجائے اپنے ارمانوں سمیت ان عمارتوں کے نیچے دفن ہو جاتے ہیں۔ ہماری پولیس اپنی ڈیوٹی پر کھڑے کھڑے جان دے رہی ہے اور ہماری خاک سے جڑی خاکی فوج اس زمین پر اپنی جان قربان کر دیتی ہے اور یہی ان کا فخر ہے اور مقصد بھی اور یوں یہ خود قوم کا فخر بن جاتے ہیں لیکن آخر کب تک ہم مسائل سے دوچار رہیں گے ہم دہشت گردوں کے خلاف لڑ تو رہے ہیں لیکن جو انہیں مدد فراہم کر رہے ہیں بلکہ دراصل ان کی ڈور جس کے ہاتھ میں ہے اس اصل دشمن سے نمٹنا ضروری ہے۔ اگر ہم صرف شاخ تراشی کرتے رہیں گے تو درخت تو نہ سوکھے گا بلکہ اور ہرا بھرا ہو گا۔ لہٰذا ان دہشت گردوں سے جنگ تو لڑنی ہے جب تک کہ یہ ختم نہ ہو جائیں، لیکن آج اگر اصل وجہ امریکہ یہ خطہ چھوڑ دے تو ہماری جانیں اور ہمارے مال محفوظ ہو جائیں۔ یہ صرف ایک خوش فہمی نہیں بلکہ حقیقت ہے کیونکہ 2001 میں امریکی آمد سے پہلے کیا یہاں یہ دہشت گردی، خودکش حملے یا تباہی و بربادی تھی اگر نہیں تھی تو پھر اصل مجرم کون ہوا؟ ظاہر ہے

امریکہ۔ اگر وہ اپنی حفاظت کی جنگ اپنی زمین پر لڑتا تو شاید اب تک محفوظ ہو چکا ہوتا۔ مجھے اپنی قوم کے ہر شہید پر فخر ہے لیکن ان کا خون بہت قیمتی ہے، بہت قیمتی اور یہ صرف اپنی جنگ اور اپنی زمین کیلئے محفوظ ہو جانا چاہیئے تاکہ میرا ملک دشمن کی بد نظر سے محفوظ رہے۔

دو مئی۔۔۔ پاکستان کی خود مختاری

دو مئی 2011 کی صبح جب پاکستان کے عوام بیدار ہوئے تو ایک عجیب و غریب خبر بلکہ ایک وقوع شدہ سانحہ ان کا منتظر تھا۔ قوم کے جذبات میں غم و غصہ بھی تھا اور شرمندگی بھی۔ شرمندگی تو اس بات کی تھی کہ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ رات کے اندھیرے میں ہم پر حملہ ہو بھی چکا اور حملہ آور جا بھی چکے جبکہ غم و غصہ اس بات پر کہ ہماری خود مختاری پر حملہ کیسے کر لیا گیا۔
اب یوں تو اس واقعے کو سال ہو چکا لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر یہ ابھی بھی بالکل تازہ تازہ معلوم ہوتا ہے اور بین الاقوامی سطح پر اسے بسا اوقات پاکستان کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے کہ پاکستان نے اُسامہ بن لادن کو پناہ دیئے رکھی تھی جبکہ دوسری طرف وہ بظاہر دہشت گردی کے خلاف ایک اہم امریکی اتحادی کا کردار ادا کر رہا ہے۔
بات دراصل دو مئی سے شروع نہیں ہوئی، بلکہ اس سے پہلے بھی باوجود اِس کے کہ پاکستان اس جنگ سے سب سے زیادہ متاثرہ ملک ہے امریکہ اور اسکے اتحادیوں کی یہ الزام تراشی مسلسل جاری رہی ہے۔ پاکستان نے اِس جنگ میں اپنے بے شمار شہریوں کی جانوں کی قربانی دی اور کسی باقاعدہ جنگ سے زیادہ فوجی شہادتیں ہوئیں لیکن امریکہ کی زبان اور رویے

میں نہ کوئی تبدیلی آئی نہ شکر گزاری کا کوئی عنصر بلکہ ہمیشہ ناراضگی اور مزید کچھ کرنے کا مطالبہ ہی ہوتا رہا اور دو مئی کو اُس نے پاکستان کی خود مختاری پر جس طرح حملہ کیا اور اس کے بعد جس طرح الزامات کی بوچھاڑ کی وہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ امریکہ یہ تعلقات کسی برابری کی بنیاد پر استوار نہیں رکھنا چاہتا بلکہ وہ اپنا ہاتھ بہر صورت اوپر ہی رکھنا چاہتا ہے۔ جس طرح وہ اور مغربی میڈیا اُس دن اس بات پر مُصر رہا کہ حکومتِ پاکستان، پاک فوج اور آئی ایس آئی بن لادن کی پاکستان میں موجودگی سے باخبر بھی تھے اور اس کے مددگار بھی، اور گزشتہ ایک سال میں اس رویے میں کوئی تبدیلی بھی نہیں آئی ہے اور اس کا اصرار اب بھی اسی بات پر ہے کہ اسامہ ایبٹ آباد میں آئی ایس آئی کی مرضی سے بیٹھا ہوا تھا تو کیا امریکہ باقی دنیا سے اس تنظیم کا قلع قمع کر چکا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، اگرچہ القاعدہ کمزور ضرور ہوئی ہے لیکن اب بھی اُس کے ہمدرد، رہنما اور کارندے اپنی کاروائیوں میں کسی نہ کسی صورت میں مصروف ہیں۔

اب امریکہ جس چیز کا الزام پاکستان پر لگا رہا ہے کیا دھرا خود اُس کا ہے اگر امریکہ نے خود اس شخص کو اپنی آنکھ کا تارا بنا کر نہ رکھا ہوتا تو وہ اتنی اہمیت حاصل نہ کر سکتا تھا بلکہ 9/11 سے پہلے تو شاید ہی کوئی اُسامہ بن لادن کو پاکستان میں جانتا تھا یوں امریکہ اپنے کیے جرم کا الزام پاکستان کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح وہ اب بھی اُسامہ کی ایبٹ آباد میں موجودگی پاکستان کے سر ڈال رہا ہے اور اِس

بارے میں بھی انتہائی غیر مناسب رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ جبکہ اسی پاکستان اور آئی ایس آئی کی مدد سے اُس نے القاعدہ کے کئی رہنمائوں کو گرفتار کیا بلکہ کئی تو پاکستان نے اُس کے حوالے کئے جن میں سے کچھ تو شاید بے گناہ بھی رہے ہوں اور صرف شبے کی زد میں آئے ہوں۔ لیکن امریکہ پھر بھی پاکستان کو مورد الزام ٹھہرانے سے باز نہیں آرہا اور مسلسل پاکستان کی خود مختاری کو سوالیہ نشان بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ دو مئی اور اس کے بعد 26 نومبر کو سلالہ چیک پوسٹ پر حملہ اس کے ثبوت ہیں۔ اگر وہ اُسامہ کی موجودگی سے کسی بھی طرح آگاہ ہو چکا تھا تو مناسب ترین بلکہ بین الاقوامی اصولوں کے مطابق تو ضروری یہی تھا کہ وہ پاکستان کو اس سے آگاہ کرتا ،آئی ایس آئی کو اعتماد میں لیتا اور حکومتِ پاکستان کی مدد سے اسامہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا لیکن اُس کا یہی جابرانہ رویہ اُس کو کسی بھی قسم کی بین الاقوامی حمایت یا کم از کم اِن ملکوں کی عوامی حمایت سے محروم کرچکا ہے۔ امریکہ کا یہ کہنا کہ وہ پاکستان کی مدد کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ وہ جب تک پاکستان کی خود مختاری کا احترام نہیں کرے گا تب تک پاکستانی اسے اس تعاون کا حقدار نہیں سمجھیں گے جس کا وہ مطالبہ کرتا ہے اور دو مئی اور سلالہ جیسے واقعات کا ہونا یا مستقبل میں ایسے واقعات کا دہرایا جانا پاکستان کی خود مختاری پر تو حملہ ہوگا ہی امریکہ کے حق میں بھی بہتر نہ ہوگا ۔شاید پاکستانی اس صبر اور ضبط کا مظاہرہ نہ کرسکیں جس

کا اب تک کیا گیا ہے۔ جس جنگ کو وہ شروع کر چکا ہے اور جو اپنی طوالت کے باعث اس کے لیے دردِ سر بن چکی ہے وہ اس سے جان نہ چھڑا سکے گا۔ اُس نے اپنے لیے جو مخالفین پیدا کئے ہیں جنہیں وہ دہشت گرد کہتا ہے اِس طرح وہ مزید مضبوط ہوتے جائیں گے۔ اُسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ پاکستانی حکومت، فوج یا آئی ایس آئی کی مدد کے بغیر ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگرچہ اُس نے اِن لوگوں کو پاکستان پر مسلط تو کر دیا ہے اور جس طرح اِن کو پنپنے میں مدد دی اور پاکستان کی مغربی سرحد پر روسی مخالفت میں ان کو لا کر آباد کیا گیا تھا اِس کا مداوا اب بہت مشکل ہو چکا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو یہ لوگ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ یہ امریکہ کی مدد اور تعاون کے خلاف ہیں لہٰذا ہم اگر امریکہ کی مدد بند کر دیں تو یہ ہمارے لیے خطرہ نہیں لیکن جب تک امریکہ اپنی حرکتیں بند نہ کر دے اور افغانستان سے واپس نہ چلا جائے یہ امریکہ کو معاف نہیں کریں گے۔

امریکہ کو اب یہ سوچ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ یہ جنگ نہیں جیت سکتا لہٰذا واپسی کا یک باعزت فیصلہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ اور ساتھ ہی پاکستان سے اپنے تعلقات پر نظر ثانی کر کے اسے برابری کی سطح پر لانا ہوگا۔ نیٹو سپلائی کی بندش اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستانی مزید اپنی خود مختاری کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ،اور ساتھ ہی ساتھ اُسے پاکستان مخالف

پروپیگنڈہ بھی بند کرنا ہوگا جس طرح اُس نے اسے خطرناک ترین ملک کا نام دے کر اس کی معیشت، تجارت حتیٰ کہ کھیل تک کے شعبے کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے، وہ دوستی کے پردے میں دشمنی کا واضح ثبوت ہیں۔

ذرائع کے مطابق پورا مغربی میڈیا دو مئی کو پاکستان کے خلاف چنگھاڑنے کے لیے تیار بیٹھا ہے اور امریکی میڈیا اُن کی سرکردگی کا پروگرام بنا چکا ہے یہ سب امریکہ کی اِس خود ساختہ جنگ کے لیے اور زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام تر پروگرام پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے بنایا گیا ہے لیکن بات آجا کر وہیں آتی ہے کہ امریکہ نے پاکستان کی خود مختاری کا احترام نہیں کیا اور ایک دوسرے اور آزاد ملک کی سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے ایک کاروائی کی جو یقیناً ایک جرم ہے لہٰذا پاکستان کو الزام دینے کی بجائے وہ اپنا جرم قبول کرے اور اِن واقعات پر پاکستان سے معافی مانگتے ہوئے مستقبل میں ایسا نہ ہونے کی ضمانت دے تاکہ یہ دونوں ملک اور دنیا دہشت گردی سے بچ سکیں۔ امریکہ یاد رکھے کہ اُس کی یہ ضمانت اس خطے کے امن کی بھی ضمانت ہوگی۔

موبائل ۔۔۔ جو بے وقار کرے

ہر معاشرہ اپنی ایک پہچان رکھتا ہے اور اس کی کچھ روایات و اقدار ہوتی ہیں۔ مسلمان ممالک میں اِن روایات و اقدار کی بنیاد اسلامی اصول و ضوابط ہوتے ہیں اور اِن کا منبع قران و سنت یا ان سے اخذ شدہ اُصول جو دراصل انسان کی بھلائی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے ضامن ہوتے ہیں لیکن آج کے اسلامی ممالک کے معاشرے بھی اپنی اصل راہ سے بے راہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے صرف ماڈرن ازم کو ترقی سمجھ لیا ہے جس میں لباس اور اطوار سب شامل ہیں۔ دنیا نے بلاشبہ بہت ترقی کر لی ہے ہر روز نئ ایجادات یا پرانی ایجادات میں نئ اختراعیں ہماری زندگی کا حصہ بن چکی ہیں اب ان کا استعمال کس طرح کیا جائے یہ ہماری صوابدید پر ہے۔ آج کی جدید ایجادات میں کمپیوٹر اور موبائل انسان پر شدت سے اثر انداز ہوئی ہیں اور درحقیقت انہوں نے معاشروں کا رخ بدل کر رکھ دیا ہے، کمپیوٹر گیمز نے بچوں کو پارکوں اور کھیل کے میدانوں سے اٹھا کر کمروں کا باسی بنا دیا لیکن موبائل نے معاشرے کو جس طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے بلاشبہ اسکے فائدے بھی ہیں لیکن اس نے مسائل کو بھی جنم دیا ہے کسی بھی جگہ سے ایک دوسرے سے رابطے نے زندگی آسان کر دی ہے تجارت، بینکنگ، تشہیری مہم ہر چیز میں موبائل کا استعمال ہو رہا ہے یہ سب بجا لیکن اِن سارے مقاصد

سے زیادہ یہ اُن کاموں کے لیے استعمال ہو رہا ہے جو کسی بھی طرح ہمارے معاشرتی اقدار کے مطابق نہیں۔ اس پر بھیجے جانے والے میسجز اکثر اخلاق سے مکمل طور پر گرے ہوئے ہوتے ہیں اور سونے پر سہاگہ میڈیا پر چلنے والے بے مہار اشتہارات ہیں جس میں موبائل کا اہم ترین استعمال یہ بتایا جاتا ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں میں بازاری قسم کی محبت اس کے ذریعے بڑی آسانی سے پروان چڑھ سکتی ہے اور صرف ایک موبائل سیٹ یا سم دیکھ کر لڑکی اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بھول کر لڑکے کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ یہ تو اشتہارات کی دنیا ہے لیکن حقیقت کی دنیا بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے وہاں بھی یہ سب کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے جس کے عملی مظاہرے اکثر نظر آتے رہتے ہیں جو کہ یقینا قابل اعتراض ہے۔

موبائل فون ہماری ضرورت سے بڑھ کر وقت کے ضیاع کا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے کوئی انتہائی ضروری کام کرتے کرتے میسجز آپ کی توجہ بٹا دیتے ہیں اور پھر پیغام در پیغام کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ موبائل کی یہ وبا ملک میں کچھ یوں پھیلی ہوئی ہے کہ بازار جائیں تو پھل فروش، سبزی فروش، ریڑھی بان سب اس سے چمٹے نظر آئیں گے۔ رنگارنگ پیکجز کا فائدہ اٹھاتے یہ لوگ گھنٹوں اس پر محو گفتگو رہتے ہیں اور گھنٹوں ضائع ہو جاتے ہیں ۔ وہ جو غم روزگار کا رونا روتے نظر آتے ہیں اور گزارا نہیں ہوتا کا نعرہ ان کی زبان پر رہتا ہے

وہ بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہتے ہیں اور توجیہہ یہ دیتے ہیں کہ پاکستان میں یہی تو ایک تفریح ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے بھاگتے دوڑتے صحتمندانہ کھیل کھیلتے نوجوانوں کو بیٹھا کر میسجز کی سحر میں گرفتار کر لیا ہے، مزدور مزدوری چھوڑ کر اس استعمال میں مصروف ہے اور گھر میں بچوں یا ماں باپ کے لیے کچھ لے جا سکے یا نہیں موبائل کا کارڈ خریدنا ضروری ہے۔ ایک سروے کے مطابق اٹھارہ کروڑ کے اس ملک میں تقریباً بارہ کروڑ موبائلز آخر کیا پیغام دیتے ہیں اور ہمارے کس قومی مزاج کی نشاندہی کرتے ہیں۔ خوشحال ممالک میں اگر موبائل فون کا استعمال کیا بھی جا رہا ہے تو وہ اپنے قومی وقار کو اس نہج تک پہنچا چکے ہیں کہ جہاں وہ اس قسم کی تھوڑی بہت عیاشی .برداشت کر سکتے ہیں۔ اس وقت جب قوم کو اس درجے کے کام کی ضرورت ہے کہ جس میں تھکان اتارنے کا بھی وقت نہ ہو ہم صرف اور صرف آرام کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ پاکستانی عوام کئی کئی مسائل میں گرفتار ہیں لیکن اس کے لیے یہ کہنا کہ ہم مشکل وقت کو کاٹنے کے لیے اس کا سہارا لے رہے ہیں سراسر جرم ہے اس وقت کو کاٹنے کے لیے کوہکن کے کدال کی ضرورت ہے تبھی شیرین تک پہنچ ممکن ہے۔ یہ ملک جہاں ہر چیز مہنگی ہے اور ضروریات زندگی تک پہنچ بھی مشکل ہے وہاں آخر موبائل کو اسقدر ارزاں نرخوں پر کیوں رکھا گیا ہے اور ایک ہی میسج کو پورے ملک میں آخر کون پھیلاتا ہے کبھی کوئی واہیات لطیفہ اور کبھی کوئی غیر تصدیق شدہ بلکہ اکثر اوقات خود سے گھڑا ہوا کوئی

اسلامی میسج جنگل کی آگ کی طرح پھیلا دیا جاتا ہے جسے آگے نہ بھیجنے پر کئی طرح کی وعیدیں سنادی جاتی ہیں آخر ان پیغامات پر بلکہ ایک پیغام پر کتنا پیسہ عوام کا برباد ہو جاتا ہے اور موبائل کمپنیوں کو کتنا منافع مل جاتا ہے جن میں سے اکثریت غیر ملکی ہیں۔
حکومت کو اگر گٹھ جوڑ سے فرصت ملے تو اِن معاملات پر بھی غور کرلے اور ہم عوام کو بھی مسلسل شکایت اور بیزاری کے اظہار کے ساتھ اپنے اعمال پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ ہم کتنے گنہگار ہیں اور اپنے حالات کے کتنے ذمہ دار۔ اور یہ بھی فیصلہ کرلیں کہ کیا ہم نے اپنے حالات بدلنے کی کوشش خود کرنی ہے یا مسلسل اپنے مسائل کے لیے دوسروں کو ذمہ دار گردانتے گردانتے خود کو دنیا میں مزید بے وقا کرنا ہے۔

نیٹو سپلائی لائن۔۔۔حکومت اور عوام

امریکہ نے ایک بار پھر پاکستان پر دباﺅ بڑھانا شروع کر دیا ہے کہ وہ نیٹو کی سپلائی لائن بحال کر دے جو کہ سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی بمباری اور چوبیس فوجی اہلکاروں کی شہادت کے بعد بند کر دی گئی تھی یہ صرف چوبیس شہادتیں نہیں تھیں بلکہ پاکستان کی خود مختاری پر ایک زبردست حملہ تھا اس سے پہلے دو مئی کو بھی امریکہ یہ حرکت کر چکا تھا۔اِن واقعات پر عوام کا غم و غصہ فطری تھا اور شاید یہی مجبوری تھی کہ حکومت کو نیٹو سپلائی لائن بند کرنے کا اقدام اٹھانا پڑا جو امریکہ کے لیے خلاف توقع تھا کیونکہ اب تک اُس کے ہر ڈو مور کے مطالبے پر ہمارے حکمران لبیک کہتے رہے تھے اور جب ایک بار پھر خلاف توقع یہ پابندی طول پکڑتی گئی تو امریکہ کو یہ جنگ مہنگی سے آگے بڑھ کر نا ممکن نظر آنے لگی اور تب اُس نے پاکستان کو مختلف دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور اب اس نے ایک بِل پر کام شروع کر دیا ہے جس میں پاکستان کی فوجی امداد روکنے اور تجارتی اور سول امداد پر شرائط سخت کرنے کی تجاویز شامل ہیں۔ جمعرات دس مئی کو یہ دونوں بِل سینٹ کی سب کمیٹیوں میں پاس ہو چکے ہیں اب اس پر زیریں ایوانِ نمائیدگان میں بحث کے بعد اِسے سینٹ میں پیش کیا جائے گا اور منظوری کی صورت میں صدر اوبامہ کے دستخط کے بعد یہ لاگو ہو جائیں گے۔ یہی وہ امداد ہے

جس نے پاکستانی قوم کو خدانخواستہ ایک غلام کی حیثیت کے قریب کر دیا ہوا ہے لیکن یہ امداد عوام کی سطح پر کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ درست ہے کہ اس سے کئی منصوبے چلتے ہوں گے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے ہمارے حکمران اپنی ضروریات، اپنے اللے تللے، اور اپنی خواہشات زیادہ پورا کرتے ہیں جو اُنہیں امریکہ کو آنکھیں دکھانے سے باز رکھتے ہیں۔ سیکیورٹی کے نام پر اُن کے آگے پیچھے چلتی ہوئی گاڑیوں کی فوج، ظہرانوں وعشائیوں کی ریل پیل، بچوں اور پھر ان کے بچوں کی بیرون ملک تعلیم اور بزنس سب کچھ آخر کہاں سے ہو۔ اس لیے یہ کہنا کہ امریکہ پاکستانی عوام کی مدد کر رہا ہے کچھ زیادہ قرین انصاف نہیں اور امریکہ کا یہ سوچنا کہ وہ پاکستان کی مدد کر رہا ہے بھی درست نہیں وہ تو وہ معاوضہ بھی ادا نہیں کر رہا جو خدمات وہ پاکستان سے لے رہا ہے سڑکوں اور عمارتوں کی تباہی سے لے کر سٹاک ایکسچینج میں نقصان تک کہاں کہاں ہم اس دہشت گردی کی جنگ سے متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ کوئی بیرونی ٹیم پاکستان آکر کھیلنے تک کو تیار نہیں اور اس سب کچھ کے بعد نیٹو کے سیکٹری جنرل کا یہ کہنا کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف مدد نہیں کر رہا ہمارے منہ پر طمانچے کے مترادف ہے۔ امریکی حکومت کا حقانی نیٹ ورک کی سزا پاکستان کو دینے کا کیا جواز ہے اگر وہ چاہتا ہے کہ طالبان اُس کی شرائط پر اُس کے ساتھ صلح کریں اور وہ ایسا کرنے کو تیار نہیں تو بھی مجرم پاکستان۔ جبکہ سچ یہ ہے کہ امریکہ پوری دنیا کو اپنا مطیع بنا کر اس پر راج کرنا چاہتا ہے۔ خاص کر

اسلامی دنیا کو تو وہ اس حالت میں رکھنا چاہتا ہے کہ وہ سر اٹھا کر چل نہ سکے اور زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ باوجود ایک اللہ، رسول صلی اللہ علیہ اآلہ اسلم سے ڈرنے کا دعویٰ کرنے کے ہم امریکہ کے تابعدار ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں۔ اگر یہ ممالک ایک ہو جائیں تو ممکن ہی نہ تھا کہ امریکہ کسی ایک مسلمان ملک کو بھی آنکھیں دکھاتا۔ خود وہ طالبان سے مذاکرات کرتا ہے لیکن پاکستان کا ایسا کہنا بھی اُس کو سیخ پا کر دیتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو پاکستان ٹیررازم اکاونٹیبلیٹی بِل نہ پیش کیا جاتا۔ ڈرون حملوں کو تو بند کرنے سے مکمل طور پر انکار کیا جارہاہے بلکہ اسے بین الاقوامی قوانین کے مطابق قرار دیا جارہاہے کیونکہ یہ ٹارگٹڈ ہیں تو کیاپاکستان اگر کسی امریکی کو نشانہ بنائے یعنی ٹارگٹڈ آپریشن کرے تو وہ سب جائز ہوگا۔

اب سوال امریکی امداد کی ممکنہ بندش کے بعد کی صورت حال کا ہے کہ پھر کیا ہوگا۔ کیا بجلی بند ہوجائے گی تووہ اب بھی بند ہے، مہنگائی ہو جائے گی، کارخانے بند ہو جائیں گے، دوائیاں مہنگی ہو جائیں گی تو یہ سب تو ہمارے حکمرانوں کی مہربانی سے اب بھی ہیں دریاامریکہ کے منظور نظر بھارت کی کرم نوازی سے قطرہ قطرہ خشک ہو رہے ہیں۔ اگر، پاکستانی قوم اب بھی اِن سارے مصائب کا مقابلہ کررہی ہے جو بلاوجہ ہیں تو بوجہ آنے والی مشکلات سے بھی نبٹ لے گی۔ لیکن اگراِن دھمکیوں میں آکر جو امریکہ دے رہا ہے سپلائی لائن

کھولی گئی تو قوم کا سر جس طرح شرم سے جھک جائے گا اور امریکہ اور نیٹو کی تعریف کے بدلے میں بین الاقوامی طور پر جو سُبکی ہو گی اُس داغ کا مٹانا بہت مشکل ہو جائے گا اور خود کو خود دار قوم کہنے والی یہ قوم اپنی خود داری کا بین ہی کر سکے گی۔ اگر حکومت نے عوامی دباؤ میں ہی آ کر ایک غیرت مندانہ اور عزت مندانہ فیصلہ کر لیا ہے تو اُس پر قائم رہے کیونکہ اِس قوم کی زندگی اتنی بھی ارزاں نہیں کہ امریکیوں کی حفاظت کے لیے مسلسل قربان ہوتی رہے۔ قوم کا اب بھی خیال ہے کہ کاش ہم اس جنگ میں نہ کو دے ہوتے تو آج ہماری جانیں محفوظ ہوتیں اور امریکیوں کی طرح ہم بھی زندگی کے مزے لوٹتے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ امریکہ سے تعلقات ختم کئے جائیں لیکن ہر پاکستانی کی طرح یہ مطالبہ ضرور ہے کہ انہیں برابری کی بنیاد پر قائم کیا جائے اور یہ کہنا کہ وہ ایک بڑا ملک ہے اور ہم چھوٹا ملک اس لیے ایسا ممکن نہیں یہ بھی درست نہیں کیونکہ آزاد ممالک اپنی آزادی، خود مختاری اور وقار کی خاطر ایک جیسے اور برابری کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں اس کے لیے صرف حکمرانوں کی جرات کی ضرورت ہوتی ہے قوم خود بخود اُن کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ اگر ہمارے حکمران بھی اپنے اخراجات میں کمی کریں جن کا میں پہلے ہی ذکر کر چکی ہوں، اگر بیرونی دوروں پر اور وہاں شاہانہ قیام و طعام پر سمجھوتہ کر لیں لاکھوں کے لباس اور بیگ استعمال نہ کریں ، کروڑوں روپے گاڑیوں پر خرچ کرنے کی، بجائے روزگار کے ذرائع پیدا کرنے پر استعمال کریں، پچاس ہزار کی کرسیوں کے جلسوں پ

اٹھنے والے اخراجات ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کریں تو اِن پچاس ہزار لوگوں کا بھلا ہوتا جائے۔ اپنے اکاونٹ اپنے اور اپنے بچوں ہی کے نام سے اپنے ملک میں منتقل کریں تو پاکستان کا خزانہ اور بینک یوں خالی نہ ہوں وہیں فیکٹریاں اور تجارتی فرم جو وہ وہاں بناتے ہیں یہاں لے آئیں تو زرِ مبادلہ کمانے کا باعث بنے گا اور غریب عوام کو روزگار فراہم ہوگا تو قوم اِن کو محسن مانے گی پھر نہ تو امریکی امداد کی ضرورت رہے گی نہ اس کی بندش کی فکر۔ قومیں وہیں زندہ رہتی ہیں جو اپنی خود داری کی حفاظت کرتی ہیں اور سہاروں پر جانے کی بجائے اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرتی ہیں۔ پاکستان کے ذمہ دار پاکستانی ہیں کوئی اور یا امریکہ نہیں اور پاکستانی صرف پاکستان کے ذمہ دار ہیں امریکہ یا کسی اور کے نہیں۔

آخری دستِ شفقت

انگلیاں بے بس، قلم شکستہ، الفاظ گنگ اور ذہن پریشان ہے کہ لکھوں تو کیا لکھوں لیکن دل بضد ہے کہ لکھنا ہے اس باپ کے لیے جس نے تمہیں لکھنا سکھایا، قلم پکڑنا سکھایا جس نے تمہیں لفظ اور اس کے معنی سکھائے اس کا حق ادا کرنا تو ممکن نہیں لیکن اُس کی محبت اور محنت کو سلام کو پیش کرنا ہے۔ کسی بیٹی کے لیے اپنے باپ کا نوحہ لکھنا کوئی آسان کام نہیں اور میرے لیے بھی یہ نا ممکن ہے اسی لیے میں ایسا کروں گی بھی نہیں، میں تو اُس بھرپور زندگی کو صرف ایک خراج عقیدت پیش کروں گی جو میرے والد محترم نے گزاری۔ میرے والد محترم ،نام الحاج محمد اورنگ زیب ولدِ حاجی عبدالغفور کوئی مشہور شخصیت نہ تھے لیکن ہمارے لیے وہ ایک دنیا تھے اور اٹھارہ مئی 2012 کو جب انکی بیماری کی خبر پر میں اُن کے پاس پہنچی تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آج یہ شفیق سایا میرے اور میرے بہن بھائیوں کے سر سے اٹھ جائے گا۔آکسیجن ماسک لگائے ہوئے انھوں نے آنکھوں سے میرے سلام کا جواب دیا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے مجھے سر نیچے کرنے کا اشارہ کیا اور اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا اور بس وہ آخری دست شفقت تھا جو میرے سر پر رکھا گیا لیکن اس میں وہ پوری کہانی سمٹ آئی تھی جو اس صابر انسان کی زندگی کے اسّی سالوں پر محیط تھی۔بڑھاپے کے علاوہ انہیں کوئی

بیماری نہ تھی ٹانگ ٹوٹنے کے آپریشن کی وجہ سے دو انچ چھوٹی ہو چکی تھی لیکن مخصوص بوٹوں اور جوتوں کی وجہ سے وہ چلتے پھرتے تھے لیکن پتے کے آپریشن کے بعد جانبر نہ ہو سکے اور صرف تین دن بیماری کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ایک ایسے معاشرے میں جہاں دوسری بیٹی کی پیدائش بھی ماتھے پر بل ڈال دیتی ہے مسلسل چھ بیٹیوں کی پرورش انتہائی محبت سے کی اور ان کی تعلیم و تربیت پر وہ توجہ دی جو ان کے بعد پیدا ہونے والے دو بیٹوں سے کسی طرح کم نہ تھی ۔ ہماری ایک ایک کامیابی ان کے لیے کسی جشن سے کم نہ ہوتی تھی۔ پڑھائی میں کامیابی سے لے کر تقریری مقابلے میں انعام حاصل کرنے تک ہر موقع پر فخر کیا۔ اللہ نے انھیں بیٹیاں دے کر ہر بیٹی کے لیے ان کے دل میں محبت ڈال دی تھی۔ آج جب کہ اُن کی بیٹیاں اپنے بھائیوں کی طرح اپنے اپنے میدان میں مصروف عمل ہیں تو انتہائی فخر محسوس کرتے تھے۔ ہمارے والد بلحاظ پیشہ اریگیشن انجنیئر تھے اور بڑی خوشی سے اپنی بنوائی ہوئی نہروں کا ذکر کرتے تھے کتاب سے انھیں عشق تھا اور اپنے علمی خزانے کی ہمیشہ حفاظت کرتے تھے یہاں تک کہ اپنے پسندیدہ رسالوں کے پرچے جلد کروا کے رکھتے تھے۔ اردو اور انگریزی کی انتہائی خوبصورت تحریر لکھنے والے میرے والد فارسی شاعری کا خوبصورت ذوق رکھتے تھے جو انھیں ان کے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ اقبال کے اشعار کا انتہائی خوبصورت استعمال کرتے تھے اپنی بڑی نواسی کو پی ایچ ڈی کے لیے انگلینڈ رخصت کرتے ہوئے اُسے نصیحت کی ۔

ہزار چشمہ تیرے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر

کم ہمتی تو شاید انہیں چھو کر بھی نہ گزری تھی میں آج بھی اُن کی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو نماز، روزے اور دین کی انتہائی پابندی کے ساتھ ساتھ ہر لمحہ مجھے وہ دوسروں کی دلجوئی ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ ماں ،باپ، بیوی، بہن ،بیٹی ،بیٹے، بھائی، عزیز رشتہ دار سب کے حقوق اس محبت سے ادا کئے کہ کسی کو کوئی گلہ نہ رہا۔ اپنے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کو پیار سے مختلف ناموں سے بلاتے۔

میں جہاں بھی کسی اسلامی مسئلے میں الجھ جاتی تو کسی اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی طرح فوراً اس کا مستند حل بتا دیتے۔ اور یہاں ان کا وسیع مطالعہ بولتا ہوا نظر آتا تھا۔ اخبار میں میرا مضمون دیکھتے تو مجھے فون کرکے اپنا مخصوص جملہ بولتے ’’بیٹی جان تمہارا مضمون آیا ہے دیکھا ہے تم نے‘‘ پھر اُس پر تبصرہ کرتے اور مجھے ایسے لگتا کہ جیسے میرے لکھے ہوئے الفاظ پوری دنیا نے پڑھ لیے ہوں۔ ایک دو سال پہلے مجھ سے شورش کاشمیری کی کتابیں لانے کو کہا لیکن انتہائی کوشش کے بعد مجھے صرف ایک کتاب مل سکی ۔ اپنی آخری بیماری میں بھی انکی فرمائش ہوتی تھی کہ کوئی انہیں کلامِ اِقبال سنائے۔

آج ہمارے والد ہم میں نہیں لیکن اللہ پر بھروسہ ، صبر ، راست گوئی اور نرم مزاجی انکے
یہ اصول اور عادات ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ میری تحریر کا یہ ٹکڑا ان کی
زندگی کا احاطہ نہیں کر سکتا لیکن بس یہ تو ایک بیٹی کا ایک معمولی سا خراج عقیدت ہے اور
مجھے یقین ہے کہ ہمارے والد گلگت، سوات ، صوابی، چترال ، کوہاٹ اور پشاور کی اُن
نہروں کی بوند بوند میں زندہ ہیں جن کے پانی میں وہ گرمیوں کی دوپہروں میں کام
کرتے ہوئے اپنا پسینہ شامل کرتے رہے اور ان کھیتوں کی فصلوں میں وہ ہمیشہ تروتازہ
رہیں گے جن تک ان نہروں کا پانی پہنچتا رہے گا۔ ان کی زندگی میں جب انہوں نے مجھے
اپنے بنائی ہوئی نہریں دکھائی اور میں نے انہیں ایک شعر پڑھ کر سنایا تو بہت خوش
ہوئے اتنا کہ شاید اپنے کام کی کسی بھی تعریف پر اتنا خوش نہ ہوئے ہوں اور میں آج
بھی اپنے عظیم اور پیار کرنے والے پاپا کے بارے میں یہی کہوں گی۔

مانا کہ اس زمین کو گلزار نہ کر سکے
کچھ خار تو کم کر گئے گزرے جدھر سے ہم

شکیل آفریدی میں امریکہ کی دلچسپی

امریکہ اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ ہی عجیب و غریب نوعیت کے رہے ہیں بظاہر دونوں طرف سے نعرہ برابری کی بنیاد کا لگایا جاتا ہے لیکن دراصل امریکہ ہمیشہ اپنی طاقت کے نشے میں مست نخوت کا مظاہرہ کرتا ہے اور پاکستان کو صرف اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف موجودہ نام نہاد جنگ میں امریکہ پاکستان کو اپنا نان نیٹو اتحادی کہتا رہا لیکن جب اسامہ بن لادن کی ہلاکت اور سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی حملے کے بعد پاکستان نے اپنے مفادات کی بات کی تو اُسے یہ بات شدید طور پر ناگوار گزری اور اس کا لہجہ غیر معمولی طور پر لیکن توقعات کے عین مطابق بدل گیا بلکہ دھمکی آمیز ہوگیا۔ نیٹو سپلائی کی بندش تو گویا بلی کی دم پر پاؤں رکھنے والی بات تھی اور اس کے بعد امریکہ کو اسامہ کی خبر دینے والے شکیل آفریدی کی سزا نے بھی امریکہ کو سیخ پا کر دیا اور پاکستان کے احسانات بھول کر وہ شکیل آفریدی کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لیے میدان میں آگیا۔ شکیل آفریدی جس نے اپنی قوم اور قبیلے کی سرفروشانہ روایات کے خلاف غداری کا مکروہ فعل سرانجام دیا اور پختون قوم کا سر جھکادیا ہے امریکہ کا منظور نظر ہے اور وہ اسے بچانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ دراصل یہ ایک شکیل آفریدی کا معاملہ اور مسئلہ نہیں ہے بلکہ امریکہ کے پھیلائے ہوئے

بے شمار ایجنٹوں کا ہے اگر وہ ایک شخص کو استعمال کر رہا تھا تو یقیناً اس نے اس طرح کے ضمیر فروش غداروں کا جال بچھایا ہوا ہوگا۔ بدنام زمانہ سی آئی اے جس کا کام امریکہ کا دفاع کم اور دوسرے ممالک میں عدم توازن اور بگاڑ پیدا کرنا زیادہ ہے فی الوقت پاکستان اُس کا پسندیدہ ترین شکار ہے اور یہاں وہ بڑی تندہی سے مصروف عمل ہے۔ امریکہ شکیل آفریدی کو کھلم کھلا بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی سزا پر اعتراض کر رہا ہے جبکہ خود وہ امریکہ کے کسی چوک میں پٹاخہ پھاڑنے والے کو بھی غدار اور ملک دشمن قرار دے کر کئی کئی دہائیوں کی قید کی سزا سناتا ہے۔ اس شخص کی موجودہ سزا اس کے دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات کے نتیجے میں دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ انصار الاسلام کے سربراہ منگل باغ کو مدد اور علاج فراہم کرتا رہا ہے اور اس کی دہشت گرد کاروائیوں میں اس کا معاون رہا ہے۔ جبکہ اسامہ کے کیس میں وہ اس سے بڑی سزا کا مستحق ہے غداری کی سزا تینتیس سال قید سے کہیں بڑھ کر ہونی چاہیے تھی۔ امریکہ کا یہ موقف بھی سراسر غلط ہے کہ ڈاکٹر شکیل نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہماری مدد کی ہے اور چونکہ پاکستان اس جنگ میں ہمارا اتحادی ہے اس لیے اُس نے کوئی غداری نہیں کی لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اُسے پاکستان میں اسامہ کی موجودگی کا علم تھا تو اس نے اس کی خبر حکومت پاکستان کو کیوں نہ دی اور امریکہ کو پاکستان کے اندر حملہ کرنے میں اور ہدف تک پہنچانے میں مدد کیسے فراہم کی۔ کیا امریکہ اپنے خلاف کسی ایسی مخبری کو

امریکہ کے حق میں گردانے گا۔ جبکہ اسی جرم کی پاداش میں اُس نے پاکستان کی تینتیس ملین ڈالر کی امداد بند کر دی ہے امریکہ کے انہی دوہرے معیاروں نے اُسے قابل نفرت بنایا ہوا ہے وہ جس قیمت پر ہمیں امداد دیتا ہے وہ تو اس نقصان کی تلافی بھی نہیں ہے جو ہم اُس کی وجہ سے اٹھا رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ ہمارے ٹی وی چینلز بھی یو ایس ایڈ کے اشتہار بڑی باقاعدگی سے دکھا رہے ہیں کہ شاید امریکہ کے بارے میں پاکستانیوں کے خیالات بدل جائیں جبکہ یہ تبھی ممکن ہے جب امریکہ اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کرے اور پاکستان کو اپنا غلام اور محکوم سمجھنے کی بجائے اسکے عوام کو برابری کی بنیاد پر اپنا دوست سمجھے۔ دہشت گردی کی جو مصنوعی اور نام نہاد جنگ امریکہ نے برپا کر رکھی ہے اس میں ہر ناکامی کا ذمہ دار پاکستان کو سمجھنا چھوڑ دے اور تعلقات پاکستان سے رکھے شکیل آفریدی جیسے غداروں سے نہیں اور یہ بھی نہ ہو کہ جب اسکی مرضی کے خلاف کوئی کام ہو تو فوراً پاکستان کو دھمکیاں دینا شروع کر دے، اس کی خود مختاری کو مذاق سمجھے اور ہر روز ڈرون آکر اسکے شہریوں کو ہلاک کرے۔ اگر وہ اپنا وطیرہ بدل دے تو پھر یو ایس ایڈ کے اشتہارات کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ بلکہ بات امریکہ کے سفارتی آداب کی تعلیم کی بھی ہے تاکہ اُسے معلوم ہو سکے کہ دوسرے ممالک سے تعلقات کس طرح رکھے جاتے ہیں اور اس کی سرحدوں کا احترام کس طرح کیا جاتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ امریکہ کی دیدہ دلیری میں ہمارے حکمرانوں کی شہہ اور خود غرضی بہت بڑا عنصر ہے اور شکیل

آفریدی جیسے ایجنٹوں کے بچنے میں ہماری خفیہ ایجنسیوں کی کمزوری بھی شامل ہے کہ ایک نام اور مقام رکھنے کے باوجود ان کی نظر ان لوگوں پر کیوں نہ پڑی اور کیا اب بھی وہ ایسے تمام لوگوں کی نشاندہی کرنے کے قابل ہیں اگر نہیں تو انہیں اپنی آنکھیں کھول لینی چاہیے اور ان ملک دشمنوں اور امریکہ بلکہ کسی بھی دشمن کے کارندوں پر ان کی کڑی نظر ہونی چاہیے۔ بہر حال پاکستان کو امریکہ کو سخت الفاظ میں بتا دینا چاہیے کہ شکیل آفریدی چونکہ پاکستانی شہری ہے لہذا اُسے سزا دینے یا نہ دینے کا حق صرف پاکستان کو ہے اور چونکہ وہ طے شدہ غدار ہے لہذا وہ اس سے بھی بڑی سزا کا مستحق ہے جو اُسے دی گئی ہے۔

آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

سوال یہ ہے کہ امریکہ پاکستان کے معاملات میں مداخلت کیوں کرتا ہے کیا اُسے طاقت کا نشہ ہے یا ہمیں اپنی ضعیفی کا بہت زیادہ احساس بھی ہے اور خوف بھی، یا وجوہات کچھ اور ہیں لیکن پاک امریکہ تعلقات کی اس ہماہمی سے بھرپور تاریخ میں اکثر اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے والی صورت حال پیدا ہوتی رہتی ہے۔ خود ہمارے اندر سے ہی اُسے ایسے کردار مل جاتے ہیں جو اُس کا کام کردیتے ہیں یا آسان کردیتے ہیں۔ معلوم نہیں اسامہ کو دو مئی 2011 کو مارا گیا یا وہ پہلے مرچکا تھا لیکن ایک ڈرامہ سٹیج کرنے میں اُسے جو کردار ہمارے ہی درمیان سے میسر آیا وہ ڈاکٹر شکیل آفریدی تھا۔ رپورٹس کے مطابق سی آئی اے کے لیے کام کرتے ہوئے امریکہ کے اس ایجنٹ نے پولیو مہم کا سہارا لے کر اسامہ کے گھر سے ڈی این اے ٹیسٹ حاصل کیے اور یوں اُس کی نشاندہی ممکن ہوئی اور ساتھ ہی دو مئی کا آپریشن ممکن ہوسکا۔ خیر ڈاکٹر شکیل آفریدی پکڑا گیا اور پاکستانی قوانین کے مطابق اُسے غدار قرار دیا گیا۔ وہ پاکستان کے خلاف کاروائیاں کرنے میں منگل باغ کا بھی مددومعاون رہا اور اسی مقدمے میں اُسے تینتیس سال قید کی سزا سنائی گئی، صرف تینتیس سال قید کی پچاسی سال کی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ امریکہ نے اس سزا کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا شاید اُسے یہ توقع نہ تھی

کہ پاکستان کی ''مجبور حکومت'' اُس کے وفادار کو سزا دے گی۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آئی کہ اُس نے ڈاکٹر آفریدی کے لیے شور مچایا اُس کی سزا پر اعتراض کیا بلکہ حد سے آگے بڑھ کر پاکستانی امداد روکی یعنی ایک شخص کی خاطر پورے ملک سے مزید بر سرپیکار ہوگیا لیکن حیرت ہے کہ کچھ آوازیں اپنے ملک سے بھی ایسی اٹھیں کہ جو ڈاکٹر آفریدی کا دفاع کر رہی تھیں اور اُس کی سزا پر اعتراض کہ اس طرح پاک امریکہ تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا اب امریکہ سے تعلقات پاکستان کو کوئی فائدہ دے رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں ممالک آپس کے تعلقات ختم نہیں کر سکتے لیکن امریکہ جیسے ملک سے اگر یہ معمول کی نوعیت کے ہوں تو زیادہ بہتر رہتے ہیں۔ یہاں ملت زیادہ ہو تو ہمیشہ نقصان اور نفرت انتہا سے بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ایک فاصلہ رہنا بہتر ہے لیکن ہمارے کچھ دانشور اس بات پر خوفزدہ رہتے ہیں کہ اگر امریکہ ہماری مدد کرنا بند کردے تو ہمارا ملک کیسے چلے گا بلکہ ایک نجی چینل پر تو ایک ''عظیم دانشور'' نے یہ تک فرما دیا کہ اگر امریکہ ہماری امداد بند کردے تو ہمیں سٹوڈیو سے گھر تک پیدل جانا پڑے گا۔ جبکہ زندہ قومیں گھاس کھا لیتی ہیں، پیدل چل لیتی ہیں لیکن اپنی خود مختاری کا سودا نہیں کرتیں۔ شکیل آفریدی کی سزا کے بعد پھر سے کئی دلوں میں یہ خدشات اُبھرے لیکن کیوں؟ اس سوال کا جواب ایک نجی چینل پر ڈاکٹر دانش کے پروگرام نشریہ ستائیس مئی سے مل جاتا ہے انھوں نے بتایا کہ امریکہ نے اس سزا کی مخالفت کروانے کے لیے

مختلف لکھاریوں، اینکرز اور بزعم خود دانشوروں کے لیے پانچ سو ملین روپے جاری کر دیئے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ کچھ بڑے نام اپنے نام کو تو کیش کرتے ہی ہیں اپنی خدمات'' کا معاوضہ یوں بھی وصول کرتے ہیں۔ سزا کے بعد مئی کے آخری ہفتے کے'' اخبارات جن میں زیادہ تر انگریزی اخبارات تھے نے اپنے کچھ کالم نویسوں کے کالم چھاپے اور اداریے لکھے جن میں دی نیوز اور ڈان بھی شامل تھے جنھوں نے اس سزا کی مخالفت کی۔ ہر ایک کا اپنا نکتہ نظر ہے لیکن کم از کم قومی حمیت اور غیرت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جنھیں بہر حال نبھانا ضروری ہے تبھی بین الاقوامی طور پر ہم قابل عزت گردانے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے وہ چند معتبر اور غیرت مند نام بھی موجود ہیں جنھوں نے اس شخص کو ہر صورت قابل سزا سمجھا ہے لیکن قومی معاملات پر کوئی ایک بھی مخالف آواز آپ کے لیے تکلیف اور سُبکی کا باعث بنتی ہے جبکہ اس معاملے میں تو ہماری قومی حیثیت کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے۔ امریکی حکومتی نمائندوں نے کھلم کھلا ہمارے عدالتی فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنا کر ایک اور طرح سے بھی ہمارے ملکی معاملات میں مداخلت کی ہے۔ ہیلری کلنٹن نے اِسے غیر منصفانہ، سینٹر کارل لیون نے اسے شاکنگ اور قابل شرم کہتے ہوئے اِسے پاکستان کے لیے امریکی امداد کی بندش کا باعث قرار دے سکنے کی دھمکی دی۔ امریکی وزیر دفاع لیون پینٹا جو اکثر پاکستان کے خلاف اپنا غصہ نکالتے نظر آتے ہیں نے بھی اس سزا کو پریشان کن قرار دیا اور اس ڈاکٹر کو پاکستان مخالف نہیں اسامہ مخالف

قرار دیا لیکن وہ یہ بھول گئے کہ امریکہ نے اُسی کی مدد سے ہماری سرحدی روندیں اور ہمارے ملک کے اندر آیا۔ اگر اُسے کچھ شواہد ملے تھے تو اُس نے اسے پاکستانی ذمہ داروں کو بتانا کیوں مناسب نہ سمجھا۔ یہ معاملات ملکوں کے درمیان ہوتے ہیں شخصیات کے نہیں۔ اور اسی طرح یہ بھی سوچا جائے کہ ہمارے عدالتی فیصلوں پر امریکی حکومت تبصرہ کس قانون کے تحت کرتی ہے کیا ہم بھی امریکہ کے خلاف اپنا یہ حق استعمال کر سکتے ہیں اور کیا امریکہ اس کو برداشت کرے گا۔ اگر نہیں تو اُسے ہمارے قوانین کا احترام کرنا ہوگا اور اس پر کسی قسم کے تبصرے سے گریز کرنا ہوگا۔ لیکن امریکہ سے بڑی ذمہ داری خود ہماری ہے کہ ہم اپنے اندرونی معاملات اور قومی سلامتی کے بارے میں کسی بھی مصالحت سے گریز کریں، چاہے اس کے لیے ہمیں کتنی ہی بڑی قیمت ادا کی جائے یا خود ہمیں ادا کرنی پڑے کیونکہ یقیناً سب سے قیمتی چیز ہمارا ملک ہے اسی سے ہماری پہچان اور ہماری عزت ہے۔

اختلاف بجا لیکن ملکی وقار اپنی جگہ

وطنِ عزیز میں ایک عجیب رسم چلی ہے کہ جس کو کسی سے شکایت ہے یا کسی پر بجا یا بے جا الزام لگانا ہو تو بجائے قانون کا سہارا لینے کے فوراً میڈیا کا رخ کیا جاتا ہے شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ قانون عام آدمی کی پہنچ سے بہت دور ہے اور اسکی پیچیدگیاں اُسکی سمجھ سے بالاتر ہیں اور ساتھ ہی اُس کے پاس غمِ روزگار کے بعد اتنا وقت بھی نہیں بچتا کہ وہ عدالتوں کے چکر کاٹے، وکیلوں کے اخراجات بھگتائے لہٰذا اُس کے پاس آسان ذریعہ یہی رہ جاتا ہے کہ وہ میڈیا کا رُخ کرے اور اپنے مسائل اور اپنا خوف اتنا مشتہر کرے کہ نقصان کی صورت میں ثبوت مہیا رہے۔

عام آدمی کی حد تک تو اگر یہ سب درست نہیں تو قابلِ قبول ضرور سمجھا جا سکتا ہے لیکن خود کو قانون کے ماہر سمجھنے والے بھی جب یہ راستہ اپنائیں تو حیرت ضرور ہوتی ہے کہ پسِ پردہ کچھ اور عوامل اور مقاصد تو کارفرما نہیں۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کی مشہور و معروف وکیل، سپریم کورٹ بار کی سابقہ صدر اور انسانی حقوق کی علمبردار محترمہ عاصمہ جہانگیر صاحبہ نے اپنی جان کے خوف کا اظہار کیا ہے اور یہ خوف انہیں سکیورٹی ایجنسیز سے ہے۔ وزارتِ دفاع نے اِس بات کا سنجیدگی سے نوٹس لیتے ہوئے انہیں سکیورٹی دینے کی پیشکش کی جسے ا

نھوں نے لینے سے انکار کردیا۔ یہ اقرار اور انکار ان کا حق ہے کہ وہ یہ سہولت حاصل کریں یا نہیں اور شک کا اظہار بھی اُن کا حق ہے لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بطور قانون دان وہ کسی ایسے فورم کا انتخاب کرتیں جہاں انکی یہ بات سنجیدگی سے لی جاتی اور صرف کسی کو بدنام کرنے کی کوشش نہ گردانی جاتی۔ سکیورٹی اداروں کے بارے میں ایسے شکوک اور شبہات کا اظہار اب اہمیت حاصل کرنے کا ایک حربہ نظر آتا ہے۔ ملک میں جہاں کچھ ہوا اُسے فوراً خفیہ اداروں کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ کراچی میں سیاسی جماعتوں کی گڑ بڑ ہے تو خفیہ اِدارے، شمالی علاقاجات میں فرقہ ورانہ چپقلش ہے تو خفیہ اِدارے، بلوچستان میں دو قبائل کی لڑائی ہے تو خفیہ ادارے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتی کہ خفیہ اِدارے کسی چیز میں ملوث نہیں ہونگے کچھ نہ کچھ انکے حصے میں ہوگا لیکن یوں ہر غلط کام کا الزام اِنہی پر دھرنے سے ہم دوسرے مجرموں کو کھلی چھٹی دے رہے ہوتے ہیں۔ اب خفیہ اِداروں کی آڑ میں کوئی کچھ کرتا پھرے اور آزاد رہے اپنے موجودہ جرائم پر بھی اور مستقبل کے جرائم پر بھی۔ لہٰذا اصل مجرم تک پہنچنے کی کوشش ضرور ہونی چاہیے اور یہ رویہ بھی ختم ہونا چاہیے کہ مسائل کی خواہ مخواہ کی تشہیر کی جائے اس طرح انہیں گلیمرائز تو کیا جاسکتا ہے حل نہیں اور محترمہ عاصمہ صاحبہ جیسے جو خود کو رہبری کے قابل اور حقدار سمجھتے ہیں انہیں اسطرح کے مسائل کو اُجاگر کرنے کے لیے نہ صرف خود ایک درست راستہ اختیار کرنا چاہیے بلکہ اُس عام آدمی کی بھی مدد کرنی چاہیے جو

بیچارہ قانونی پیچیدگیوں سے خوفزدہ اور پریشان ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ میڈیا نے بہت سارے مسائل کو سامنے لا کر کم از کم ان کی اہمیت سے آگاہی پیدا کر دی ہے لیکن عاصمہ جہانگیر کے الزام کے معاملے میں خدانخواستہ اس کے زیادہ مضر اثرات ہو سکتے ہیں آج معاشرے میں کسی کی جان محفوظ نہیں اور اگر ہم اس طرح کے الزامات کو یوں سرعام کسی کے سر تھوپ دیں گے تو دیگر عناصر ان حالات کا فائدہ اٹھا کر بھی بری الذمہ قرار پا سکتے ہیں تو کیا اس کے لیے بہتر نہ ہوتا کہ عاصمہ جہانگیر خود اپنے ادارے یعنی سپریم کورٹ پر ہی بھروسہ کرلیتی اور بجائے مذکورہ اعلان کرنے کے وہاں سے قانونی تحفظ حاصل کرلیتی ۔ کیونکہ اُن جیسی شخصیات جتنی ایک طبقے میں مقبول ہوتی ہیں اتنی ہی دوسرے طبقے میں غیر مقبول ہوتی ہیں۔ اگرچہ میں عاصمہ صاحبہ کے سامنے ہر لحاظ سے طفلِ مکتب ہوں لیکن پھر بھی ان سے التماس ہے کہ خود بھی ایسے مسائل میں اپنی سوجھ بوجھ کو بہتر طریقے سے استعمال کریں اور دوسروں کی بھی رہنمائی کریں اور ساتھ ہی اپنے اِداروں کی تذلیل کرنا چھوڑ دیں جیسا کہ وہ اکثر قومی سلامتی کے اِداروں سے شاکی رہتی ہیں کیونکہ اگر یہ ادارے نہ ہونگے تو آپ ہرگز اس ملک کی حفاظت نہ کرسکیں گی۔ قانون دان کا کام قانون کی حکمرانی ہے تو ملک کی حفاظت ایک بہت اہم فریضہ ہے جو یہ ادارے ادا کر رہے ہیں۔ شخصیات سے اختلاف کیجیے وہ آپکا حق ہے لیکن جس طرح آپکا ادارہ قابل تعظیم ہے اُسی طرح ملک کا ہر ادارہ قابلِ عزت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ سپریم کورٹ سے ناراض ہو کر بھی اس پر عدم

اعتماد ظاہر کر چکی ہے (میموگیٹ کے کیس میں) اختلاف اپنی جگہ لیکن ملکی وقار اپنی جگہ اس سے بڑھ کر اہم ہے۔

چاہتے ہیں سو آپ کریں۔۔۔

آج کا دور اگر الیکٹرانک میڈیا کا دور کہلائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ملکی معاملات میں یہ جو کردار ادا کر رہا ہے اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں اور معاشرتی رویوں کے اُتار چڑھاو میں بھی یہ اہم ترین کردار کا حامل ہے۔ایسے میں چاہتے نہ چاہتے ہوئے خود بخود معاشروں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا ہے۔ پاکستان میں آزاد نجی الیکٹرانک میڈیا کی آمد نے جہاں لوگوں کو پی ٹی وی کا سرکاری خبر نامہ سننے کے جبر سے آزاد کیا وہی پرنٹ میڈیا کو بھی پیچھے دھکیل دیااور وہ لوگ جو اخبارات میں شائستہ، سنجیدہ اور شستہ زبان میں مضامین پڑھتے تھے وہ بھی ٹیلی وژن کے آگے بیٹھ گئے اور ہر روز بر پا ہونے والا وہ زوردار'' معرکہ '' دیکھنے لگ گئے جو ہوتا تو سیاسی مخالفین کے درمیان ہے لیکن محسوس دو دشمنوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جس میں مہمان و میزبان دونوں کسی ضابطہ ئ اخلاق کے پابند نظر نہیں آتے۔ مہمان تو خیر بلائے ہی دھماکہ خیزی کے لیے جاتے ہیں میزبان بھی باقاعدہ فریق کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان اینکرز کے تندوتیز سوالات یہ تاثر دیتے ہیں کہ اِن سے بڑھ کر نہ تو ملک کا کوئی خیر خواہ ہے اور نہ بڑا دانشور، اگرچہ یہ رویہ کچھ چینلز کے کچھ اینکرز کا ہے لیکن کچھ اس طرح سے میڈیا پر حاوی نظر آتا ہے کہ کسی معتدل مزاج چینل اور اینکر کو اس میدان میں پنپنے

نہیں دیتا۔ اگران اینکرز کی شان و شوکت کا موازنہ ایک عام صحافی سے کیا جائے تو زمین وآسمان کا فرق صاف نظر آتا ہے جبکہ یہ بات آن دی ریکارڈ ہے کہ صرف دس پندرہ سال اور بعض اوقات تو صرف پانچ چھ سال پہلے بھی یہ عالی شان اینکرز موٹر سائیکل سوار تھے لیکن آج یہ شان دار گاڑیوں کے مالک ہیں مگر کیسے ؟ارسلان افتخار، ملک ریاض کیس نے ان کے پول کھول دیئے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ملک ریاض نے جو فہرست شائع کی ہے اور جو خطیر رقم ان نامور "محبان وطن "کے نام منسوب کی ہے وہ درست ہی ہو لیکن پردے کے پیچھے کچھ نہ کچھ تو ہے۔ ایک نجی چینل کے ملک ریاض کے ساتھ انٹرویو نے تواس سب کچھ کی صرف ایک جھلک دکھائی ہے۔ اس فہرست میں جو اینکرز خواتین وحضرات شامل ہیں ان سے جب اس بارے میں بات کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اثاثے ڈیکلیئر کریں توایک'' حیرت انگیز ''جواب ملتا ہے کہ ہم ایسا کرنے کو تیار ہیں لیکن اگر ہمارے مالکان اجازت دیں ۔ سوال یہ ہے کہ کیاآپ کے مالکان آپ کی ذاتی زندگی کے بھی مالک ہیں؟ اگر آپ کا دامن صاف ہے تو فوراًعوام کے سامنے خود کے پیش کیجئے اور اپنی پوری برادری کے اوپر لگا ہوا داغ دھو ڈالیے۔ عوام ملک ریاض کے ماضی کو دیکھتے ہوئے شایداس فہرست پر زیادہ اہمیت نہ دیتے لیکن خودچینلز جب ایک دوسرے کے آگے ٹھن گئے تو وہ پول بھی کھل گئے جو ملک ریاض نہیں کھول سکا تھا۔ ایک اینکر نے اس گاڑی کا نمبر تک بتایا جو تحفتاً لی گئ تھی لیکن ان صاحب کا نام لینے سے بوجوہ گریز کیا اب پیشہ ورانہ ایمانداری کا تقاضا تو یہ تھا

کہ یا آپ بات نہ کرتے یا پوری کرتے وسوسے ڈالنے والوں میں کیوں شامل ہوئے ہیں کہ یہ تو چاہے جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے ان سے پناہ مانگی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بحریہ ٹاؤن کی طرف سے جاری کی گئی فہرست جس کی اُن کی طرف سے تردید آچکی ہے اس کو لوگوں نے اس لیے درست مانا کہ ایک عرصہ سے وہ عین الیقین سے ان معاملات کا مشاہدہ کرتے آرہے تھے انہیں صرف ثبوت چاہیے تھے جو خود میڈیا نے مہیا کیے۔ ورنہ اس فہرست میں تو شاید کئی بے گناہ بھی شامل کئے گئے ہوں جن کے لباس اور شان و شوکت وہ نہیں جو لینے والوں کی ہوتی ہے واللہ العلم۔ لیکن ایک اور سوال یہ ہے کہ حکومت، اپوزیشن، جرنیلوں اور سرکاری افسران پر مسلسل یہ دباؤ ڈالنے والے کہ وہ اپنے اثاثہ جات ظاہر کریں خود ایسا کرنے پر کیوں تیار نہیں اپنے میڈیا مالکان سے جو رقم وہ لیتے ہیں حلال تو وہی ہے کیونکہ وہ طے شدہ ہے لیکن اس کو بھی اس حد تک نہ لے جائیں کہ اس کے بدلے چاہے وہ آپ سے کوئی بھی غلط کام کروانا چاہیں اس کے لیے آپ مجبور ہوں۔ شنید کے مطابق ان اینکرز کی تنخواہیں لاکھوں میں ہیں، اگر ان میں سے کچھ اُن رپوٹرز کی بروقت تنخواہوں کے لیے مختص کر دیے جائیں جنہوں نے ایک بار مجھ سے یہ درخواست کی تھی کہ میں ان کے مسائل کے بارے میں لکھوں کہ کس طرح ان کی چار اور چھ ہزار تنخواہ بھی اکثر مہینوں بعد ملتی ہے، تو شاید ان کا

بھی کچھ بھلا ہو اور وہ زیادہ دلچسپی کے ساتھ اپنا کام کر سکیں اور اپنے گھروں کے چولہے چلا سکیں۔آج سے تقریباً چار سال پہلے جب اس فہرست میں شامل ایک مرد اور خاتون لینکر سے میں نے بذریعہ ای میل ان کے اثاثے ظاہر کرنے کو کہا تو ایک نے تو جواب دینا ہی مناسب نہ سمجھا اور دوسرے نے کسی مناسب وقت کا وعدہ کیا جو ہنوز انہیں میسر نہیں ہو سکا ہے۔ میں ان تمام لینکرز سے یہی کہوں گی کہ یہ مت سمجھیں کہ اللہ نے صرف آپ کو صلاحیت دی ہے آپ سے زیادہ با صلاحیت لوگ.برس ہا برس کی محنت کے بعد بھی تہی دامن رہتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ اللہ نے آپ کو موقع دیا ہے اور اگر آپ میں کچھ صلاحیت بھی ہے تو اسے ملک میں انتشار نہیں محبت پھیلانے کے لیے استعمال کریں۔پیسہ آپ کے دنیاوی مسائل کو کم ضرور کر دیتا ہے لیکن اعمال کے عذاب کو نہیں ٹال سکتا۔دوسروں پر تنقید کرنے سے پہلے اپنے کردار کا بے داغ ہونا بے حد ضروری ہے اپنے مالک حقیقی پر یقین رکھیں وہی آپ کا رازق ہے آپ کے اصل اور مکمل اثاثہ جات آپ کا ایمان اور یہ وطن ہیں۔۔برائیاں ضرور اُجاگر کریں لیکن اپنے ایمان اور اس ملک کی قیمت پر نہیں۔

حقانی وکیل برائے امریکہ

اللہ ہمارے ملک پر رحم اور کرم کرے اب تو بس دعا کی جا سکتی ہے کہ ہر طرف خود غرضی کی ایک ایسی ہوا اڑی ہوئی ہے جس میں ملک اور قوم کا چہرہ کہیں نظر نہیں آتا اور آئے بھی تو دھند میں لپٹا ہوا۔ صاف نظر آتے اور ثابت شدہ مجرم نہ صرف آزاد ہیں بلکہ صاحبِ اختیار اور نوازے ہوئے ہیں۔ اگر یہ فہرست مرتب کی جائے تو بہت سے پردہ نشینوں کے بھی نام آئیں لیکن آج کل نہ معلوم امریکہ میں سفیر برائے پاکستان یا امریکہ کا سفیر برائے پاکستان حسین حقانی صاحب باوجود مجرم ثابت ہونے کے نہ صرف آزاد ہیں بلکہ اب تو کھل کر پاکستان اور اس کے اداروں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ 13 جون 2012 کو واشنگٹن پوسٹ میں اپنے مضمون میں وہ حسبِ معمول امریکی مفادات کا تحفظ کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک عام پاکستانی امریکہ کے خلاف جو جذبات رکھتا ہے رکھے، یہ اُس کا حق ہے لیکن ایک سفیر کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے ملک کی پالیسیوں اور عوام کا دفاع کرے جو حسین حقانی نے اپنے دورِ سفارت میں بھی نہیں کیا اور اب تو بالکل ہی نہیں کر رہے۔ اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ پاکستان میں امریکہ مخالف جذبات بڑھتے جا رہے ہیں جبکہ کسی ایک ملک کی کسی دوسرے ملک کی مخالفت اس کے لوگوں اور آب و ہوا سے نہیں ہوتی بلکہ اُن پالیسیوں سے ہوتی ہے جو اس کے لیے نقصان کا باعث

ہوں۔ حسین حقانی بجائے پاکستان کا مقدمہ لڑنے کے امریکہ میں پاکستان مخالف جذبات کو بھڑکا رہے ہیں جو کسی طرح درست نہیں اگر وہ بقول اُن کے پاک امریکہ تعلقات کی بہتری کے لیے کام کرنے کے جرم میں پکڑے گئے ہیں تو یہ یاد رہے کہ یہ تعلقات صرف اس صورت میں بہتر رہتے ہیں جب پاکستان تابعداری کا مظاہرہ کرتا رہے اور حسین حقانی کے دور میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ مسٹر حقانی نے نہ صرف عدالتی فیصلے کو جانبدارانہ قرار دیا بلکہ اس فیصلے کو ملک ریاض، ارسلان افتخار کیس سے عوام کی توجہ ہٹانے کا ایک حربہ بھی لکھا۔ واقعی ایسا ہے یا نہیں مجھے اس سے بحث نہیں لیکن یوں دوسرے ملک میں اپنے ملک اور اس کے اداروں کی تذلیل کرنا قرین انصاف نہیں، یہ فیصلہ یا وہ فیصلہ یا چاہے جو بھی فیصلہ ہو، اسے صرف ملکی مفاد میں ہونا چاہیے۔ بقول حقانی کے جہادی انہیں امریکہ نواز سمجھ کر ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں یہ امریکہ کی ہمدردی کے حصول کی چال تو ہو سکتی ہے حُب الوطنی کی کوئی مثال نہیں۔ حسین حقانی اس بات کے دعویدار ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ دونوں ملکوں کے بہتر تعلقات کے لیے کام کیا تو انہیں اس کام کے نتائج بھی بتانے چاہیں کہ اِن سے پاکستان کو کیا فائدہ ہوا، کیا یہاں دہشت گردی کو قابو کیا گیا یا انسانی جان اور مال کو محفوظ بنایا جا سکا؟ پاکستان کے عوام کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ ملک میں امن ہو، وہ غم روزگار سے کہاں اتنا وقت نکالیں کہ امریکہ کے خلاف منصوبے بنائیں اِن کا صرف ایک مطالبہ ہے کہ ان کے ملک کے خلاف

پالیسیاں نہ بنائی جائیں اور کاروائیاں روک دی جائیں تو اگر حسین حقانی اتنے بااثر تھے کہ وہ کہتے ہیں کہ میمو کی حوالگی کے لیے انہیں منصور اعجاز کی مدد کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ بلاواسطہ بھی یہ کام کر سکتے تھے تو انھوں نے وہی اثر و رسوخ ڈرون حملے، دو مئی اور دہشت گردی روکنے کے لیے کیوں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو بجائے یہ سب کرنے کے امریکہ کو مزید برانگیختہ کرنے کی کوشش میں بتلائ ہیں۔ مسٹر حقانی اگر واقعی امریکہ میں اتنے ہی ہر دلعزیز ہیں تو امریکیوں کو یہ احساس دلائیں کہ پاکستانیوں کے دل جیتنے کے لیے آٹے، دال اور گھی کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی پالیسیاں پاکستان دوست بنانے کی ضرورت ہے۔ یو ایس ایڈ نہ دی جائے لیکن دہشت گردی ختم کی جائے اور ڈرون حملے روکے جائیں۔ وہ امریکیوں کو یہ باور کرائیں کہ پاکستانی امریکی عوام سے نہیں امریکی حکومت کی ہٹ دھرمی سے نالاں ہیں۔ یہ امن کو ترسے ہوئے لوگ امن سے محبت کرتے ہیں امریکہ اگر اِن کے مسائل کی وجہ بننا چھوڑ دے تو انہیں اُس سے کوئی پرخاش نہیں۔ یعنی حسین حقانی اور امریکہ دونوں کو پاکستانیوں کے دل جیتنے کے لیے اپنے احسانات یاد دلانے کی نہیں اپنا کردار اور رویہ بدلنے کی ضرورت ہے۔

اور کتنے سُرجیت اور سَربجیت

بھارتی جاسوس سُرجیت سنگھ کو کوٹ لکھپت جیل لاہور سے رہا کردیا گیا۔ سُرجیت سنگھ 1982 میں جاسوسی کے الزام میں پکڑا گیا اور اُسے سزائے موت سنائی گئی جسے بعد میں عمر قید میں تبدیل کردیا گیا۔ اُس کی یہ سزا 2005 میں ختم ہوچکی تھی لیکن بقول اُس کے، اُس کی حکومت گرفتاری کے بعد اُسے بھول چکی تھی لہذا اُسے اب 2012 میں رہا کردیا گیا۔

اس سے پہلے کی اطلاع یقیناً پاکستانی عوام کے لیے زیادہ تشویش ناک تھی کہ دہشت گرد سربجیت سنگھ کو رہا کیا جارہا ہے جو کئی بم دھماکوں میں ملوث ہونے کا اعتراف کرچکا ہے اور اِن بم دھماکوں میں کئی ہلاکتیں ہوئیں۔ جبکہ اسے سزائے موت بھی سنائی جاچکی ہے۔ جان کے بدلے جان کے قانون کے مطابق اُسے یہ سزا کئی بار سنائی جانی چاہیے تھی۔ یہاں انسانی حقوق کی کسی بنیاد پر اُسکی سزا میں تخفیف یا تبدیلی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔ سُرجیت سنگھ کی رہائی سے زیادہ اہم معاملہ یہ ہے کہ پاکستان میں اور کتنے سُرجیت اور سربجیت سنگھ موجود ہیں اور ہمیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ بات تو ثابت شدہ ہے کہ ''را'' کا قیام صرف اور صرف پاکستان کے خلاف تھا اور اس کا پہلا کامیاب مشن مشرقی

پاکستان میں نفرت کا بیج بو کر بنگلہ دیش کا قیام تھا لیکن اُس کی سرگرمیوں میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے اور بلوچستان سمیت پورے پاکستان میں سرگرم عمل ہے۔ خود سُر جیت سنگھ نے اپنے ملک پہنچ کر میڈیا کو یہی بتایا کہ ''را'' سرحدی دیہات سے غریب لوگوں کو پاکستان میں جاسوسی کے لیے بھرتی کرتا ہے اور پھر ان کو اور ان کے خاندانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے جب تک وہ کامیاب رہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ گرفتاری کی صورت میں بھارت سرکار اور ایجنسیاں اُن سے کوئی سروکار نہیں رکھتیں۔ خود سرجیت سنگھ فیروزپور کے ایک گائوں کا رہنے والا ہے اور اپنے بیان کردہ حالات کا تجربہ کر چکا ہے۔

بھارت پاکستان مخالف سرگرمیاں جس انداز سے جاری رکھے ہوئے ہے اُسی نے پاکستان میں امن وامان کی صورت حال کو مخدوش کر رکھا ہے۔ بلوچستان کے حالات تو پوری طرح اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ بیرونی ہاتھ مکمل طور پر اور پوری تندہی سے اس صوبے میں کارفرما ہے چونکہ '' را'' کے پاس بنگلہ دیش کا کامیاب تجربہ ہے اس لیے فی الحال وہ مسائل کو گھمبیر بنانے میں کامیاب بھی ہے۔ صرف بلوچستان پر کیا موقوف پاکستان کا کوئی علاقہ ان کی کاروائیوں سے مستثنیٰ نہیں۔ ہمارے قبائلی علاقہ جات میں گڑبڑ بھی بیرونی مدد کے بغیر ممکن نہیں ۔ سمجھوتہ ایکسپریس جیسے واقعات بھی بھارت ہی کا طرئہ امتیاز ہیں کہ کسی دوسرے ملک کے شہریوں کو یوں بے دردی سے اپنے ملک میں زندہ جلادیا جائے اور اس کے مجرم

سزا سے بچے رہیں۔ خود بھارت میں ممبئی حملوں کو بنیاد بنا کر ابھی تک پاکستان کے خلاف زہر اُگلا جاتا ہے اور اجمل قصاب کو حکومت پاکستان کا نمائندہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ کئی بار اِن حملوں کے ماسٹر مائنڈ کو پکڑے جانے کے دعووں کے بعد ایک بار پھر ماسٹر مائنڈ ابو جندل کو گرفتار کرنے کا دعوی کیا گیا ہے اور اس کا تعلق پاکستان سے جوڑ کر کراچی میں حملے کی تیاری کا پلان بنانے کا دعوی بھی کر لیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ پاکستان کے خلاف غیر ثابت شدہ واقعات و الزامات کا اعلان کرے بھارت خود اپنی کاروائیوں کو لگام دے۔ صرف ''امن کی آشا'' کا نعرہ لگا لینا کافی نہیں بلکہ بھارتی حکومت کو امن کے لیے اقدامات بھی کرنا ہونگے اور پاکستان میں کشمیر سنگھ، سرجیت اور سربجیت سنگھوں کو نکیل بھی ڈالنی ہوگی۔ ساتھ ہی سکھوں کو بھی یہ سوچ لینا ہوگا کہ بھارت سرکار ان کے گولڈن ٹیمپل کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد انہیں ہی کیوں چارے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ سرجیت سنگھ نے بھارت پہنچ کر جہاں یہ بیان دیا کہ پاکستانی جیلوں میں اُس کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا گیا اور تمام بھارتی قیدیوں کے ساتھ اچھے سلوک کی گواہی دی وہیں اُس نے پاکستان میں ''را'' کے جاسوسوں کی موجودگی کے بارے میں بھی بتایا جن میں زیادہ تر اسی کی برادری اور مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید اسی لیے اُس کے مطابق اس کی حکومت اِن گرفتار جاسوسوں کے متعلق خبر رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی، جبکہ ہندو کرنل سری کانت جیسے مجرم مکمل طور پر حکومتی حفاظت میں رہتے ہیں۔

سرجیت سنگھ کے اس بیان کے بعد کہ کس طرح بھارتی سرحدی دیہاتیوں کو جاسوسی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، بھارت سرکار کو اپنے اس دعوے اور الزام پر غور کرلینا چاہیے کہ ان کے ہاں کشمیر میں سرحدپار سے دخل اندازی کی جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ پاکستان کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ خود بھارت کی پالیسیاں یہ کام سرانجام دے دیتی ہیں اور اس کے مسلمان شہریوں کو درجہ دوم کے شہری ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں کہ اُسی زمین کے بیٹے ہونے کے باوجود وہ سرکاری نوکریوں، تعلیم حتیٰ کہ ہر شعبے میں دوسروں سے پیچھے ہیں جبکہ وہ کسی ایک ملک میں دنیا کی سب سے بڑی مسلمان آبادی ہیں اور بزعم خود دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے باسی ہونے کے باوجود بے بس ہیں اور کسی بھی وقت ہندو اپنے خون کی پیاس بجھانے کے لیے مسلمانوں کو استعمال کرتے ہیں۔ گجرات کی شکیلہ بانو کا کیس اس کا ثبوت ہے جو دس سال بعد بھی نہیں جان سکی کہ 2002 میں اُس کے پڑوسی اس کے دشمن اور اس کے آٹھ اہلخانہ کے قاتل کیسے بن گئے۔ لہٰذا پاکستان پر الزام دھرنے کے بجائے بھارت اپنے اعمال پر غور کرے کہ مذہب کو بنیاد بنا کر اس ناقابل یقین اور چمکدار بھارت ”Shining and Incredible India“ میں کیا کچھ ہوتا ہے۔

ایک شکایت یہاں مجھے اپنی خفیہ ایجنسیوں سے بھی ہے۔ آئی ایس آئی دنیا کی بہترین خفیہ ایجنسی ہے مگر وہ اب تک اِن غیر ملکی ایجنسیوں کی کاروائیوں کا

سدِباب کیوں نہیں کر سکی، چاہے یہ سی آئی اے ہو"را" ہو یا موساد۔ ایک مشکل ضرور ہے کہ ایک کا مقابلہ تین سے ہے لیکن اس کی مہارت سے قوم کو یہ امید ضرور ہے کہ وہ اس مقابلے کی اہل ہے لہٰذا اُسے ان کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے اور ہماری حکومت، میڈیا اور ایجنسیوں کو سُرجیت اور سَربجیت جیسے جاسوسوں اور دہشتگردوں کو سامنے لا کر بھارت کی پاکستان میں بدامنی پیدا کرنے کی کوشش اور کاروائیوں کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنا ہوگا اور محکمہ خارجہ کو بھی اپنی یہ ذمہ داری سمجھنا ہوگی کہ اسے دنیا کو بھارت کی طرف سے پاکستان پر لگنے والے دہشت گردی کے الزامات کی حقیقت بتانا ہو گی۔

اسلام کے خلاف نیا امریکی منصوبہ

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پورا مغرب یکجا ہو کر میدان عمل میں اترا ہوا ہے اور مسلسل ایسے اقدامات کر رہا ہے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہو اور اسلام کو نقصان پہنچے۔ اسلام کو بدنام کرنے کی ہر سطح پر کوشش کی جارہی ہے اور اُسے دہشت گردی کے ہم معنی بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ ملت کفر کا تعصب اور بغض اس سارے منصوبے میں بڑے منظم طریقے سے روبہ عمل ہے اور یقینا اس سارے عمل میں امریکہ ان کا سرپرست اعلیٰ ہے۔ اس کی بدنیتی اور فسادی فطرت نے ہی اُسے پوری دنیا میں ناپسندیدہ ترین ملک بنا رکھا ہے۔ اُس کا یہ غرور اور طنطنہ کہ وہ سپر پاور ہے، نے اسے انسانوں سے زیادہ بھیڑیوں کا ملک بنا رکھا ہے اُس کے سیاستدان الیکشن جیتنے کے لیے کسی ملک بالخصوص کسی اسلامی ملک پر چڑھائی کر دیتے ہیں، وہاں قتل و غارت گری کرتے ہیں اور دورِ جدید کے یہ چنگیز خان مسلمانوں کے خون کے دریا اور سروں کے میناروں پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ خود یہ حال ہے کہ امریکہ کے اصل باشندوں کو کالا کہہ کر امور سلطنت سے صدیوں دور رکھا، اب بھی گورے اور کالے کا یہ فرق باوجود کالی حکومت ہونے کے برقرار ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ ہے اور مسلمانوں کو امریکہ سے شکایت بھی ہے لیکن عیسائیت سے نہیں۔ مگر دوسری طرف وہ خود دنیا میں اپنے پھیلائے ہوئے فساد کا الزام بلکہ

سزا بھی مسلمانوں کو دیتا ہے۔ اس کی خبثِ باطن کا ایک اور ثبوت اُس وقت ہاتھ آیا جب یہ انکشاف ہوا کہ امریکہ کے جائنٹ فورسز سٹاف کالج برائے آفیسرز میں ایک انتہائی مکروہ عمل جاری ہے اور وہ یہ کہ 2004 سے یہاں اسلام کے خلاف بڑے منظم طریقے سے نصاب میں نفرت انگیز مواد پڑھایا جارہا ہے اور اب تک 800افسران رضاکارانہ طور پر یہ نفرت انگیزی سیکھ چکے ہیں۔ اس نصاب میں اسلام کے خلاف جو شرانگیزی پھیلائی جارہی ہے اس کے لیے افسران خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کرتے ہیں ۔اس کورس کو مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ا۔ اسلامی بھائی چارے کی تباہی

ب۔ اسلام کو عیسائیت کا حقیقی دشمن بنا کر پیش کرنا

ج۔ اسلام کے مثبت تاثر کو زائل کرنا اور اسے بنیاد پرست اور جہادی بمعنی فسادی مذہب ظاہر کرنا

د۔ عوام کے ذہنوں کو اس طرح ڈھالنا کہ نعوذ باللہ مکہ،مدینہ پر حملے کو وہ کھلے دل سے قبول کرلیں

یہ مکروہ منصوبہ جو پینٹاگون میں تیار کیا گیا بلکہ اس پر باقاعدہ کام بھی ہورہا ہے مگر ان کا یہ رویہ سمجھ سے بالاتر نہیں ہے کیونکہ اسلام کے انتہائی پر امن رویے اور فطرت کے باوجود یہ قوتیں اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئیں

اور یہاں تک کی انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں تک کی تکذیب کی جن میں واضح طور آخری زمانے کے پیغمبر ﷺ کے زمانے اور علاقے کی نشان دہی کی گئی ہے اور یہ سب جاننے کے باوجود انہوں نے اس بات کا انکار کیا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ لیکن ایسا ایک گروہ کے لیے فرمایا گیا اور وہی گروہ آج کے زمانے میں سر گرم ہے اور یہ سب کچھ اس کے باوجود ہے کہ اسلام اِن مذاہب تو کیا پوری انسانیت کے لیے امن کا پیغام ہے۔ جس جہاد کا نام لیتے ہوئے آج مسلمان بھی ہچکچاتے ہیں وہ یہ ہرگز نہیں کہ ہر وقت تلوار بے نیام رہے ہاں اس وقت جب ہمارے مذہب کو نقصان پہنچایا جائے تو پھر حکم خدا ہے کہ "جب تم، کافروں سے بھڑ جائو تو اِن کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ تم اُن کو خوب قتل کر چکو تو جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر (چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لے کر۔ یہاں تک کہ فریق مقابل لڑائی کے ہتھیار ہاتھ سے رکھ دے (سورۃ محمد آیت نمبر 4) سوال یہ ہے کہ اسلام کو بدنام کرنے والے یہ لوگ کیا اپنے خلاف لڑنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں یہ تو اُس احسان کے بھی روادار نہیں جس کا اسلام مذکورہ بالا آیت میں اپنے ماننے والوں کو ہدایت کرتا ہے۔ جہاد کو جس غلط رنگ میں اِن طاقتوں نے پیش کیا ہمارے علمائ کو منطقی بنیادوں پر اس کا جواب دینا چاہیے تھا جو کہ افسوس ہے کہ نہیں دیا گیا اور اگر دیا بھی گیا تو جذباتیت نے اسے مؤثر نہ ہونے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ

خدا کا فرض کردہ جہاد ان طاقتوں کی طرح بے مہار نہیں۔ آج امریکہ مسلمان ممالک میں مداخلت چھوڑ دے اور ہتھیار رکھ دے تو مسلمان اپنی دینی تعلیمات کے مطابق لڑائی بند کر دیں۔ امریکہ گھر آیا دشمن ہے اگر وہ ہمارے گھروں میں آکر ہمیں مارے گا تو اپنے دفاع میں کچھ بھی کر لینا ہر انسان کا حق ہے۔ لیکن دراصل یہ وہ گروہ ہے جو اسلام کے خلاف نبرد آزمائی کو ہی مردانگی سمجھتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سمجھا دیا تھا اور فرمایا دیا تھا کہ "(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے (سورۃ المائدہ آیت نمبر 82) حضرت علی رضی اللہُ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہُ عنہ کی جنگوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جب قیصرِ روم نے مسلم سلطنت کی عیسائی رعایا کو حکومت کے خلاف بھڑکایا تو ان کا جواب یہ تھا کہ ہمارے یہ کافر (یعنی مسلمان) حکمران تم جیسے جابر حکمرانوں سے بہتر ہیں ان کا یہ جواب صرف اس لیے تھا کہ ایک جزیہ دے کر وہ محفوظ و مامون ہو جاتے تھے۔ اسلام کو دہشت گرد کہنے والے یہ بذات خود دہشت گرد اگر اس مذہب کا مطالعہ کریں تو اُن کی انکھیں کھلی رہ جائیں اور یہی خوف اور ڈر ہے کہ وہ اس کو سمجھنے سے کتراتے ہیں اور جو اس کو پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں اور یوں یورپ میں

قبول اسلام کی شرح روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے حکمران اسلام سے خوف زدہ ہیں اور اسے دہشت گردی کے مترادف قرار دے رہے ہیں حالانکہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام نے اپنے غیر مسلم شہریوں کو جو تحفظ دیا وہ یہ لوگ آج کی جدید دنیا میں بھی اپنی اقلیتوں کو نہیں دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہُ عنہ نے بیت المقدس کی فتح پر وہاں کے گرجے میں یہ کہہ کر نماز پڑھنے سے انکار کیا کہ ان کے ایسا کرنے سے مسلمان اسکو مسجد بنالیں گے۔انہیں کے دور کی ایک محفوظ دستاویز بھی ایسا ہی ثبوت فراہم کرتی ہے جس میں ایک عیسائی نے دوسرے شہر کے عیسائیوں کو یہ خوشخبری دی کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے جو ہم پر ظلم نہیں کرتی بلکہ ہمارے گرجوں اور راہب خانوں (Convents) کی حفاظت کرتی ہے (بحوالہ خطبات بہاولپور از ڈاکٹر حمید اللہ خان) یہ وہی حضرت عمر رضی اللہُ عنہ ہیں جو دین کے معاملے میں بہت سخت تھے اور حدیث کے مطابق ابو بکر دین میں ابراہیم (یعنی نرم) اور عمر موسیٰ (یعنی سخت) ہیں ۔ سلطان صلاح الدین ایوبی رچرڈ کو تو معاف کرکے رہا کر دیتا لیکن رچرڈ سے ایسی توقع عبث ہے۔ اسلام کو بدنام کرنے کی اس سازش کی بجائے اگر یہ ممالک خود اپنے رویوں پر غور کرلیں تو زیادہ بہتر ہوگا اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ اسلام کی تعلیمات کا اسی سے اندازہ لگائیں کہ مسلمان کو تو یہ حکم ہے کہ پچھلی کتابوں پر بھی ایمان لائیں،اور یہ اپنے پیروکاروں کو صاف طور پر حکم دیتا ہے کہ لااِکرَاہَ فی الدِّین یعنی دین

میں کوئی جبر نہیں، جبکہ دوسری طرف تاریخ گواہ ہے کہ مشنری سکولوں اور کانونٹ کی آڑ میں کس طرح غریب مسلمانوں اور ہندئوں کو برصغیر پر انگریز قبضے کے دوران عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اب یہی کام سائنسی بنیادوں پر اسلام کے خلاف بطور مذہب کیا جارہا ہے۔ اور راہب خانوں کی جگہ امریکہ کی جائنٹ سروسز سٹاف کالج میں یہ سب ہورہا ہے اور راہبوں کا کام لیفٹیننٹ کرنل میتھو ڈولی سرنجام دے رہا ہے۔
حیرت تو اس بات پر ہے کہ آٹھ سال سے جاری اس قبیح فعل کی شکایت ایک طالبعلم آفیسر نے کی تو اپریل 2012 میں اس کورس کو صرف معطل کیا گیا یعنی ختم اب بھی نہیں کیا گیااور جنرل ڈیمسی جو چیف آف جنرل سٹاف ہیں نے اس کی تحقیقات کا حکم دیا کہ یہ مواد کیسے کورس میں شامل ہوا جبکہ ایک ہفتے کا یہ کورس سال میں پانچ بار چلتا تھا تو کیا امریکی حکمرانوں اور خاص کر فوجی لیڈرشپ اس سے بے خبر ہو سکتی ہے۔
ہماری فوج پر تو امریکہ بڑی آسانی سے بنیاد پرستی اور شدت پسندی کا الزام لگا دیتا ہے دیکھیئے اپنی فوج کے لیے وہ کس الزام کا انتخاب کرے گا اور کیا اس سب کچھ کے ذمہ دار کسی سزا کے مستحق ٹھہریں گے ؟اس معاملے کی تفصیلات سے کم از کم یہ تو ثابت ہوا کہ امریکی فوج میں آٹھ سو شدت پسند افسر موجود ہیں اور باقی اس کے علاوہ ہیں اگرچہ یہ آٹھ سو افسر اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کہ اس کی حفاظت کا وعدہ خدا نے کیا ہے لیکن کیا ویٹی کن پر حملے کے کسی منصوبے کو یہ شرپسند خود معاف کریں گے یا کسی بھی حکومتی سرپرستی کے

بغیر بننے والے ایسے کسی منصوبے پر کسی بھی اسلامی ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔

امریکی حکومت عیسایت اور اسلام کے مابین دشمنی بڑھانے کی مجرم ہے۔ اگر یہ اسلامی ممالک میں خونریزی نہ کرتی، اسلام کے خلاف مکروہ منصوبے نہ بناتی اور اسلام کو بدنام نہ کرتی بلکہ اپنی خامیاں دور کرتی تو دنیا یقیناً زیادہ بہتر اور پرامن جگہ ہوتی ۔ اسلام کی حقانیت سے خوفزدہ یہ دشمنانِ اسلام اگر یہ جان لیں کہ اسلام دراصل خدا کا نُور ہے اور اسے نُور اس لیے کہا گیا کہ یہ انسان کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے، اسے گمراہ نہیں ہونے دیتا۔ اسلام نہ صرف اپنے ماننے والوں کو صاف طور پر تعلیم دیتا ہے کہ "لکم دینکم ولی الدین" تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین، بلکہ اللہ تعالیٰ بار بار اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہی بتاتا ہے کہ تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے ان کافروں کی ہدایت یابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں نہیں یعنی یہ زبردستی کا کام نہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اسلام کے خلاف یہ سب کچھ کرنے والے ذمہ داروں کو بین الاقوامی اور اگر امریکہ کا کوئی فوجی قانون ہے تو اس کے مطابق سخت سزا دی جائے کیونکہ سزا صرف مسلمانوں کا حق نہیں بلکہ امریکی شدت پسند اور شرپسند اسکے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے مذاہب کو ایک دوسرے کے سامنے

بطور دشمن لا کھڑا کردیا ہے۔

مارشل لائ۔۔۔ کیا ایک بار پھر دعوت

ایک عجیب ماحول اور بے چینی ہے جس نے پورے ملک کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے اور اب تو میرے جیسے غیر ضروری طور پر خوش گمان بھی پریشان ہیں ۔ایسا نہیں ہے کہ یہ بے چینی اور بد انتظامی کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی لیکن ہمارے ملک کو اس نے بہت.بری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔بد امنی اور دہشت گردی تو اپنی جگہ اور اس کے ذمہ داروں کا تو تعین کرتے ہوئے نظریں دشمنوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں لیکن بد انتظامی اور سیاسی بے چینی اور خیانتوں کا ذمہ دار کون ہے ؟اداروں کے ٹکرائو کا دوش کس کو دیا جائے عدلیہ ، مقننہ ، انتظامیہ سب لرزہ.براندام نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک میں کچھ دم خم ہو بھی تو دوسرا اسے نکالنے کے چکر میں نظر آتا ہے ۔صرف اپنی دُکان چمکانے کی فکر ہے ،ملک ہاتھوں سے جاتا ہے تو جائے بلکہ اب تو ملک کی بات کرنے والا بیوقوف گردانا جا رہا ہے ۔دفتر، سکول یا ہوٹل میں فالتو بتی بجھائیں تو داد جو ملتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ کون سا تم نے اپنی جیب سے بل دینا ہے۔یہ وہ رویہ ہے جو عوام اپنے حکمرانوں سے سیکھ رہے ہیں یا ان سے انتقام لینے کے لیے اپنا رہے ہیں۔ ایسے میں ہر درد دل رکھنے والے پاکستانی کا دل روپڑتا ہے اور وہ کچھ کر سکنے کی خواہش کرتا ہے لیکن حکومت ہے کہ ہر صورت اپنے حال میں گم رہنے پر مصر ہے ۔ ایسے میں

اسمبلی کے فلور پر ایک بار پھر ماشل لائ کی بازگشت سنائی دی کہ کیا حالات پھر مارشل لائ کی طرف جا رہے ہیں۔ ایک اخباری خبر کے مطابق نون لیگ کے ایاز امیر اور خواجہ سعد رفیق نے دس جولائی کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران اس خدشے کا اظہار کیا، جبکہ دوسری طرف شیخ رشید کو یہ گلہ ہے کہ فوج کیوں کچھ نہیں کر رہی اور عاصمہ جہانگیر کو یہ شکایت ہے کہ فوج پردے کے پیچھے سے سب کچھ کر رہی ہے۔جب کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے سیاستدان خود اپنی کوتاہیوں پر نظر کریں اپنی خامیاں تلاش کریں اور ان کو رفع کرنے کی تجویز کریں۔ لیکن وہ تجویز کرتے ہیں تو یہ کہ وہ عدالت سے ماورائ ہوں، شہریت کسی اور ملک کی رکھیں اور حکومت اس بیچارے ملک پاکستان پر کریں جبکہ وہ یہ قسم کھا چکے ہوں کہ بحالت جنگ مابین پاکستان وامریکہ یا پاکستان وبرطانیہ آخرالذکر کے وفادار رہیں گے۔ یہی لوگ جب حکومت میں ہوتے ہیں تو حالات کو اُس نہج پر لے آتے ہیں جس پر آج ہیں اور پھر خود ان اندیشوں کا اظہار شروع کردیتے ہیں جن کا اظہار اب کیا جارہا ہے یعنی مارشل لائ۔ مارشل لائ یقیناً ان مسائل کا حل نہیں بس ایک وقتی بچاؤ ہوتا ہے جو کر لیا جاتا ہے۔ اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں، فوج کو بھی نہیں کہ فوج کا کام حکومت نہیں حفاظت ہے یعنی ملکی سرحدوں کی حفاظت لیکن چونکہ یہ فوجی بھی پاکستان کے عام شہری پہلے اور فوجی بعد میں بنتے ہیں اور دونوں صورتوں میں ملک کے بارے میں سوچنا ان کا حق ہے۔ لہذا یہ سوچنا کہ یہ حالات سے آنکھیں بند کرکے رکھیں گے کسی طرح ممکن نہیں

اور پھر ایک غیر آیئنی اقدام کے طور پر فوجی حکومت آ جاتی ہے۔بلکہ اب تو جب حالات حکومت کے قابو میں نہ آ رہے ہوں تو عام لوگ یہی سنتے پائے جاتے ہیں کہ ایسی جمہوریت سے مارشل لائ بھلا۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر ہرگز اس کی قائل نہیں لیکن عوام کو اپنے روزمرہ مسائل کا حل چاہیے انہیں کھانے کو روٹی اور رہنے کو جگہ چاہیے آئین اور قانون تو ان کی سوچ سے بہت بالاتر چیزیں ہیں۔

پاکستان میں مارشل لائ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے اور اکثر اوقات ایسے حالات پیدا کرنے کے ذمہ دار ہمارے سیاستدان ہوتے ہیں۔تاہم اب کی بار باوجود ایک کرپٹ ترین حکومت ہونے کے فوج نے جس ضبط و تحمل کا ثبوت دیا ہے اور خود کو سیاست اور حکومت سے دور رکھا ہے وہ قابل تحسین ہے اور اگر جمہوریت اور یہ حکومت اتنا عرصہ چلی تو اس میں حکومت سے زیادہ فوج کا ہاتھ ہے جو کھلی آنکھوں سے حالات خراب ہوتے دیکھتی رہی لیکن اپنی ہی ذمہ داریوں سے عہدہ.برائ ہوتی رہی اور حکومت کا کام سیاستدانوں کے لیے چھوڑے رکھا۔ ملک میں جو انارکی پھیلائی جارہی ہے اس کا نام حکومت نہیں اور نہ ہی یہ جو کچھ کیا جارہا ہے کسی طرح کی ملک دوستی ہے۔ جمہوریت کو جمہوریت کی طرح.برتا جائے تو تب ہی یہ ایک بہتر طریق حکمرانی ہے اگر اسے آمریت بنادیا جائے تو عوام کی شخصیات میں دلچسپی.بڑی قلیل المدت ہوتی ہے اور یہ سمجھنا کہ کوئی بھی انسان ناگزیر ہے انتہائی حماقت ہے۔ موجودہ حکومت حالات کو خود سنبھالنے کی کوشش

کرے تو یہ ملک و قوم کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا اور موجودہ حالات کے لیے فوج یا کسی بھی دوسرے اِدارے کو موردِ الزام ٹھہرانا بھی خود کو بری الذمہ قرار دینے کی بس ناکام کوشش ہوگی۔ اب اسی بات کو لیجیے کہ بغیر ملکی حالات وضروریات کو مدِنظر رکھے اپنی من پسند قانون سازی کی جارہی ہے۔ اس بات کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کہ اِس سب کچھ کا ملک پر کیا اثر پڑے گا۔ بس دھن یہی ہے کہ انتخابات وقت سے دو ماہ بھی پہلے نہ ہوں اور جب بھی ہوں ایک بار پھر جیت لیے جائیں جائز یا ناجائز کسی بھی طریقے سے۔ حال اپوزیشن کا بھی کچھ مختلف نہیں ان کا مطمح نظر بھی اگلی حکومت حاصل کرنا ہے نہ کہ خدمت اور نہ ہی اس نے موجودہ دورِ حکومت میں ایمانداری سے اپوزیشن کا کردار ادا کیا۔

اگر آج کے حالات کا ایماندارنہ تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ منظر کچھ اچھا نہیں ہے لہٰذا یہ وقت انتہائی سمجھ داری کا مظاہرہ کرنے کا ہے۔ سوال مارشل لائ یا نہ مارشل لائ کا نہیں ہے بلکہ ملکی سالمیت اور بقا کا ہے۔ فوج نے اب تک جس سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے ورنہ کئی ایسے مواقع آئے کہ یہی محسوس ہوا کہ اب صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا کہ اب۔ اب اللہ کرے ایسا ہی ہو اور ملک میں جمہوریت چلتی رہے۔ فوج اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برائ ہوتی رہے اور سیاستدان اپنی ذمہ داریوں کو پہچان سکیں اور انہیں ادا کرنے لگ جائیں اور باقی اداروں کو اپنا کام کرنے دیں۔ حکومت بہر حال بالا

دست ہوتی ہے اور عدلیہ، فوج، انتظامیہ جو بھی ادارہ اچھا کام کرے اسے عوامی سطح کے ساتھ ساتھ حکومت کی طرف سے سراہا جانا چاہیئے۔ شخصیات سے اختلاف کرنا چاہیں تو کریں لیکن اداروں سے نہیں۔ آرمی چیف، چیف جسٹس یا کسی دوسرے ادارے کا سربراہ تنقید سے ماورائی نہیں ہونا چاہیئے لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہر بد انتظامی اور مسئلے کی وجہ ان اداروں کو قرار دیا جائے اور حکومت بری الذمہ ہو جائے۔ بجائے الزامات کے، مسائل کی جڑ تک پہنچ کر ملک کی حالت سنوارنے کی سنجیدہ کوشش اس کا اولین فرض ہونا چاہیئے کیونکہ عوام انہیں اسی لیے منتخب کرتے ہیں نہ کہ ان کی تجوریاں بھرنے اور نہ ہی خدانخواستہ ملک کی تباہی کے لیے۔ اللہ ہمارے حکمرانوں کو خود سے بڑھ کر اس ملک کی فکر کرنے کی توفیق دے اور ہمارے ملک کی حفاظت کرے۔

کچھ علاج بلوچستان کا بھی اے چارہ گراں

ملک امن و امان کے مسائل سے مسلسل دوچار ہے کراچی میں ہر روز آٹھ دس معصوم لوگوں کا قتل تو اب کوئی خاص خبر نہیں رہی بس ایک افسوس زدہ لفظ کے بعد لوگ اس سب کو بھول جاتے ہیں ۔ خیبر پختونخواہ میں کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو خبروں میں دو چار منٹ سے زیادہ وقت حاصل نہیں کرپاتا۔ گلگت بلتستان جیسے پرامن علاقوں سے بھی جب بدامنی کی خبریں ملیں تو دل دھل جاتا ہے۔ حالات بلوچستان کے بھی کچھ مختلف نہیں ہر روز کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ اہل وطن کو پریشانی میں مبتلائ کردیتا ہے اور یہ پریشانی اس لیے کچھ زیادہ ہوتی ہے کہ یہاں یہ بربریت ملک کی سالمیت کے وہ دشمن کرتے ہیں جو بلوچستان کو پاکستان کا حصہ تسلیم کرنے سے انکاری ہیں لیکن لگتا ایسا ہے کہ وہ انسانیت کے بھی انکاری ہیں انہیں پنجابی ، ہزارہ اور اب خیبر پختونخواہ کے پختونوں میں سے کوئی بھی انسان محسوس نہیں ہوتا اور وہ انہیں یوں کچل کر رکھ دیتے ہیں جیسے وہ کیڑے مکوڑے ہوں ،بسوں سے اتار اتار کر انہیں بھون دیا جاتا ہے لیکن حیرت ہے کہ اِس کے باوجود انسانی حقوق کی تنظیموں کو بلوچستان میں ہونے والی غیر انسانی سرگرمیاں نظر نہیں آتی اور ہر ایسی چیز ایجنسیوں کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔ سات جولائی کو ایسی ہی ایک ہولناک خبر آئی کہ سوات سے تعلق رکھنے والے

سات کان کنوں کی لاشیں کوئٹہ کے قریب سے ملی ہیں ان کان کنوں کو چھ جولائی کو اغوا کیا گیا تھا اور اگلے ہی دن ان کی لاشیں ڈگاری میں کوئلے کی کانوں کے پاس سے ملیں اور بلوچستان لبریشن آرمی یعنی بی ایل اے نے اس درندگی کی ذمہ داری قبول کرلی اور بیانگ دہل کی۔ اب کوئی بی ایل اے کے درندوں سے پوچھے کہ سوات سے سینکڑوں ہزاروں میل دور چل کر صرف روزی رزق کمانے کے لیے کوئٹہ کے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے پر آمادہ یہ غریب کشمیر خان، محمد نواز، عبدالاحد، احمداللہ، خان محمد اور محمد اکبر، اور ڈاکٹر اسحاق نے کتنے بلوچوں کو اغوا کیا یا خدانخواستہ قتل کیا جس کا بدلہ لینے کے لیے انہیں یوں بیداری سے قتل کیا گیا اور نہ ہی یہ کسی حکومتی ادارے سے وابستہ تھے اگر ہوتے بھی تو حکومت نے کونسا اِن کے لیے کوئی انتہائی اقدام اٹھا لینا تھا وہ حکومت جسے اپنے سیاسی مسائل سے فرصت نہیں اور جس کا مقصد حیات اس وقت صرف اپنا دور حکومت مکمل کرکے تاریخ میں اپنا نام لکھوانا ہو اُسے غریب مزدوروں کی کیا فکر ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ سوچنا کہ بی ایل اے اس طرح اپنے مشن کو آگے بڑھانا چاہ رہی تھی کسی طرح قابل قبول نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس دہشت گرد تنظیم کا مقصد صرف اور صرف دہشت گردی کرکے خوف کی فضا پیدا کرنا ہے اور یہ بلوچستان کے صرف کچھ سرداروں کی کچھ اولادوں کی اپنی سرداری قائم رکھنے کی کوشش ہے جو یہ سوچ بغیر درندگی کر رہے ہیں کہ بلوچستان کا ایک بڑا حصہ پشتون ہے اور بلوچوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان کے دوسرے صوبوں

میں محفوظ و مامون زندگی گزار رہی ہے کیونکہ پاکستان، بلوچستان اور بلوچی یہ ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔اس مسئلے کو پیدا کرنے والے اور پھر اس کو ہوا دینے والے پاکستان کے وہ دشمن ہیں جنہوں نے اس کے وجود کو روزاول سے تسلیم نہیں کیا اور اب بھی مسلسل اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہیں لیکن دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ ہم ہر جرم کو ایجنسیوں کے کھاتے میں ڈال کر ایسے مجرموں کو کھلی چھٹی دے دیتے ہیں۔ بلوچستان میں بھی ہم یہی کر رہے ہیں اگر کوئی بندہ ذاتی دشمنی کے باعث بھی مار ڈالا جائے تو اسے کسی سرکاری ایجنسی کے نام قتل کے طور پر درج کر دیا جاتا ہے اور یوں اصل قاتل دندناتے پھرتے ہیں۔اب جبکہ بی ایل اے نے اس غیر انسانی واقعے کی ذمہ داری قبول کرلی ہے توکیا بلوچستان کے لاپتہ افراد کے کچھ اور ذمہ داروں کا تعین بھی ضروری نہیں ہے۔ایک ای میل میں بلوچستان کے ایک صاحب نے نام لے کرکچھ ایسے لوگوں اور تنظیموں کی نشاندہی کی جو اس طرح کی کاروائیوں میں ملوث ہیں۔حکومت وقت ، فوج ایف سی اور فرنٹیر کانسٹیبلری سمیت تمام ذمہ دار اداروں کو بلوچستان کے حالات کا احساس کرنا ہوگا اور اس کا حل نکالنا ہوگا صرف ایک دوسرے کو الزام دینے سے معاملات حل نہیں ہونگے۔ سپریم کورٹ اور چیف جسٹس انتہائی درست طور پر لاپتہ افراد کے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں اور اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اِن افراد کو مل جانا چاہیے لیکن اِن میں جو مجرم ہیں انہیں سیاسی سمجھ کر چھوڑ دینا بالکل بھی قرین انصاف نہیں اور پھر جو

مجرم ہیں انہیں قرار واقعی سزا دی جانی چاہیئے کیونکہ ملکی سالمیت کے خلاف کام کرنے والے کبھی بے گناہ نہیں ہو سکتے چاہے وہ جس انداز میں بھی اس میں ملوث ہوں۔ لہذا بی ایل اے کے دہشت گردوں کو چھوڑ دینا ملک اور اس کے عوام کے ساتھ زیادتی ہے اور جس بے باکانہ انداز میں وہ بلوچستان میں ہونے والی دہشت گردی کو قبول کر رہے ہیں اس کے بعد کسی رعایت کی گنجائش ہو ہی نہیں ہو سکتی۔ آخر ان چھ مزدوروں اور ایک ڈاکٹر کو کس گناہ میں ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا جو اپنے بیوی بچوں کا یا اپنے ماں باپ کا پیٹ پالنے کے لیے اپنوں سے دور کوئلے کی کان کے اس آلودہ ترین ماحول میں مزدوری پر مجبور تھے جہاں سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے یا کیا یہ کسی ایجنسی کے لیے کام کر رہے تھے اور یا یہ لوگ اس کان پر قبضہ کرنے آئے تھے۔ اگر اِن الزامات میں سے بفرض محال کوئی ثابت ہو بھی جائے تو کیا بی ایل اے اس کی سزا دینے کی مجاز ہے یا اس کی سزا دینا عدالت کا کام تھا۔

بلوچستان کے حالات ہمیں جو عندیے دے رہے ہیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حیرت ہے کہ اِن دہشت گردوں کے خلاف اب تک محب وطن بلوچوں اور پختونوں کو متحد کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی یا ان کی وہ حوصلہ افزائی کیوں نہیں کی جارہی جو کہ کی جانی چاہیے صرف حالات کی خرابی کا رونا رویا جارہا ہے یا معافی مانگی جارہی ہے جبکہ ضرورت عملی اقدامات کی ہے اور ہر

قصور وار کی تلاش بھی ضروری ہے اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ آخر وہ کون سی قوتیں ہیں جو حالات کو خراب سے خراب تر کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے بلوچستان کی اہمیت کے پیش نظر بیرونی قوتیں بھی یہاں مکمل طور پر سرگرم عمل ہیں تو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اِن کے آپس میں تعلقات کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ بلوچستان اس وقت حساس ترین ایشو ہے اور اس کی حساسیت کے مطابق اس کو اہمیت دینا اور پھر اس کو حل کرنا ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہیے ورنہ وقت اور تاریخ قوم اور ملت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی۔ صاحبانِ اقتدار و عدالت ! اِن غریب مزدوروں کا خون بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کسی دوسرے پاکستانی کا لہذا کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ! کہ یہ قوم کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

مقبوضہ کشمیر۔۔۔ فوج آزاد، عدلیہ مجبور

جنوبی ایشیا دنیا کے خطرناک ترین خطوں میں سے ایک ہے کیونکہ یہاں دو ایٹمی قوتیں واقع ہیں اور دونوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ ناخوشگوار بلکہ خطرناک حد تک کشیدہ رہتے ہیں۔ جنگیں، تنازعات اور جھڑپیں یہ سب یہاں کا معمول ہیں۔ دونوں ممالک اپنے بجٹ کا بڑا حصہ دفاع پر خرچ کرتے ہیں جبکہ عوام سوائے غربت اور بے بسی کے کچھ نہیں کماتے ۔ یہ تو ہیں خطے کے حالات لیکن ان حالات کا اگر ایماندارانہ تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی سب سے بڑی وجہ کشمیر ہے۔ وہ کشمیر جو مسلمان اکثریتی ریاست تھی لیکن اسے کسی نہ کسی طرح سے بھارت نے ہڑپ کر لیا اور یوں مسلمان ریاست کو ہندو مملکت کا غلام بنا دیا گیا لیکن اس فیصلے کو ظاہر ہے کہ مسلمان کشمیریوں نے قبول نہیں کیا اور نہ ہی یہ پاکستان کے لیے قابل قبول تھا۔ یہ ریاست جو اس نوزائیدہ مملکت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی کاٹ دی گئی اور یوں ایک ایسی جنگ کا آغاز کر دیا گیا جو کبھی سرد اور کبھی گرم ہر وقت جاری رہتی ہے۔ باوجود اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے بھارت اس مسئلے کو حل کرنے پر تیار نہیں۔ کشمیری عوام پینسٹھ سال سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور مسلسل اپنی جانیں گنوا رہے ہیں ،چونکہ یہ ظلم و ستم بھارت میں ہو رہا ہے اس لئے عالمی طاقتوں کو یہ ریاستی دہشت

گردی نظر نہیں آرہی اور نہ ہی ایسٹ تیمور کی طرح ان مسلمانوں کی کوئی مدد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور نہ ہی سوڈان جیسے سقہ مسلمان ملک کی طرح یہاں کے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی انہیں بے چین کرتی ہے اور یوں جدید دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں ان کشمیریوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ان کی بیٹیوں بہنوں کی عزتیں پامال ہو رہی ہیں۔ صرف 2010-11 میں 210 خواتین کی بے حرمتی کی گئی جبکہ 746 اغواکے واقعات ہوئے لیکن لاپتہ افراد کی فہرست کی طوالت سے نہ بھارتی حکومت ہلی اور نہ عالمی طاقتوں میں جُنبش ہوئی۔ خواتین بیوہ اور بچے یتیم ہوں تو بھارتی حکومت کے لیے ان پر ہاتھ اٹھانا اور آسان ہو جاتا ہے اور زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ حکومتی اور فوجی سرپرستی میں ہوتا ہے بلکہ فوج کو تو ایسے لا محدود اختیارات حاصل ہیں کہ جن کے تحت وہ کشمیریوں کی جان و مال اور عزت و آبروکے بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔ انہیں آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ کے تحت ایسے اختیارات دیئے گئے ہیں کہ کشمیری ان کے سامنے انسان کے درجے سے اُتر کر جانور سے بدتر ہو گئے ہیں کہ ان کے مظالم پر فریاد کرنے کا حق بھی نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ عدالت سے رجوع کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک مقدمے میں بھارتی سپریم کورٹ نے اُن فوجیوں جن میں چار افسران شامل ہیں کو چھوڑ دیا جن کو مجسٹریٹ ملزم تسلیم کر چکے تھے اور سرینگر ہائی کورٹ نے بھی اس مقدمے کی اجازت دے دی تھی لیکن AFSPA کے کالے قانون نے ان فوجیوں کومزید کشمیریوں کے

قتل عام کے لیے آزاد چھوڑ دیا بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ جموں کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی JKCCS کی رپورٹ کے مطابق پولیس میں ترقیاں اور انعامات زیادہ سے زیادہ کشمیریوں کے قتل پر دیئے جا رہے ہیں یعنی قانون کے رکھوالے جو بظاہر انسانی زندگیوں اور جان و مال کی حفاظت پر معمور ہیں درحقیقت قتل عام کا لائسنس اپنے ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں۔ مذکورہ بالا مقدمہ جس میں فوجیوں کو قانون سے بالا قرار دے دیا گیا یہ ایک جعلی مقابلے کی بابت تھا جو پتری بل میں سال 2000 میں سٹیج کیا گیا 2006 تک تو اس پر کوئی کارروائی ہی نہ ہوئی اور ہوئی تو آخری فیصلہ دنیا کی سب سے بڑے جمہوری ملک میں یہ کیا گیا کہ فوج کسی بھی کشمیری کو کسی بھی وقت گولی کا نشانہ بنائے یا ہوس کا انہیں کھلی چھٹی ہے۔ بقول سید علی شاہ گیلانی اس مقدمے کے فیصلے نے فوج کے ہاتھوں معصوم لوگوں کے قتل عام کو قانونی تحفظ فراہم کر دیا ہے یعنی بے خوف ہو کر اپنا کام کیے جاؤ۔ اس فیصلے نے ان دعوؤں کی قلعی بھی کھول دی ہے کہ بھارت میں عدلیہ آزاد ہے اور فوج جمہوری اداروں اور عدلیہ کے سامنے مجبور ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہو لیکن کشمیر کے معاملے میں ایسا نہیں۔ حکومت اور فوج نے عدالت کو یوں پابند کر رکھا ہے کہ وہ کشمیر میں فوجیوں کے کسی اقدام کی سرزنش بھی نہیں کر سکتی۔ سید علی گیلانی نے عالمی برادری سے اپیل کی ہے کہ جنگی جرائم میں ملوث اہلکاروں کو سزا دلوانے میں مدد کرے جس طرح بوسنیا کے معاملے میں کیا گیا۔ لیکن لگتا یہی ہے کہ

اُن کی آواز صدا بصحراہی ثابت ہوگی کیونکہ عالمی برادری کے بہت سارے مفادات بھارت سے وابستہ ہیں۔ ایک ارب سے زائد آبادی کے اس اژدہام والے ملک میں ان کی مصنوعات کی عظیم الشان منڈی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ ان کے اسلحے کا ایک بڑا خریدار بھی ہے اگر کشمیر کا مسئلہ حل ہوگیا تو پاکستان کے ساتھ اس کے دوسرے چھوٹے موٹے مسائل بھی خود بخود ہی طے پا جائیں گے اور جب تنازعات نہ رہیں گے تو جنگ کہاں ہوگی اور ان کا اسلحہ کہاں بکے گا۔ اگر کشمیر کا مسئلہ حل ہوا تو بھارت اپنے ہاں ہونے والی ہر دہشت گردی کا الزام پاکستان کے سر کیسے دے سکے گا۔ خود اپنے شہریوں کے ثبوت شدہ جرائم بھی وہ بڑی دیدہ دلیری سے پاکستان کے کھاتے میں نہ ڈال سکے گا۔ بھارت میں خون مسلم کی ارزانی صرف کشمیر میں ہی نہیں پورے بھارت کے مسلمان اس کی زد میں ہیں لیکن اُس کو پوچھنے والا کوئی نہیں صرف اس لیے کہ عالمی طاقتوں نے قرآن کے عین مطابق دنیا کو کفر اور اسلام کے دو بلاکوں میں تقسیم کر رکھا ہے یہاں تک کہ باانڈی پورہ کشمیر میں قرآن پاک کی بے حرمتی بھی انہیں نظر نہ آئی لیکن کسی مسلمان ملک میں کسی غیر مسلم کے کسی دشمنی یا تنازعے کے نتیجے میں قتل کو بھی دہشت گردی کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ راجیش کھنہ کی موت پر صف ماتم بچھانے والا ہمارا میڈیا ایسے واقعات پر چپ سادھ لیتا ہے بلکہ کسی کو خبر بھی نہیں ہو پاتی کہ ایسے قبیح اور مکروہ اسلام مخالف منصوبے بنتے بھی ہیں اور رویہ عمل بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر

پاکستان کی شہ رگ ہے اس کی رگوں میں دوڑنے والا پانی کشمیر سے ہی آتا ہے وہاں کے کروڑوں مسلمان ہم سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم ان کی آواز میں آواز ملائیں اور اُن کے حقوق کے لیے آواز اُٹھائیں۔

ڈرون حملے اور ہماری خود مختاری

23 جولائی کو ایک بار پھر شمالی وزیرستان میں ایک گھر پر ڈرون حملہ کیا گیا جس میں 11 افراد جان بحق ہو گئے۔ ڈرون حملے اب اس تواتر سے ہوتے ہیں کہ نہ تو اب کسی کو تاریخیں یاد ہیں نہ ہلاکتوں کی تعداد۔ یہ حملے پاکستان کی سرحدوں کے اندر پاکستانی شہریوں پر ہوتے ہیں، اُن شہریوں پر جو کبھی پاکستان کے بازوئے شمشیرزن سمجھے جاتے تھے۔ قبائلی جو ہماری تھرڈلائن فورس تصور ہوتے تھے ہمارے بغیر تنخواہ کے محافظ۔ اگر بالفرض ان ہلاک شدگان میں کوئی دہشت گرد ہو بھی تو ایک دو ہونگے، دو چار ہونگے سارے کے سارے تو نہیں ہو سکتے تو پھر ہماری حکومت ان حملوں کے خلاف سخت رویہ کیوں نہیں اپناتی۔ کیوں نہیں امریکہ کو ایک یا دوسرے طریقے سے مجبور کرتی کہ وہ یہ درندگی چھوڑ دے، ہماری خود مختاری کا احترام کرے، ہماری سرحدوں کی تعظیم کرے، ہماری جانوں کو بھی امریکی جانوں کی طرح محترم جانے اور اپنی وہ روش ترک کرے جو اس نے ہمارے خلاف اپنائی ہوئی ہے۔ ایبٹ آباد، سلالہ، میران شاہ باجوڑ آخر اُس کی بد فطرتی سے ہماری کوئی جگہ محفوظ کیوں نہیں اور ہم بڑے ضبط سے اُسے کیوں برداشت کیے جا رہے ہیں کیا یہ جرم ضعیفی کی سزا ہے یا بے حمیتی کی انتہائی، چاہے جو بھی ہے ہم خود بھی غلط ہیں۔ ہم آخر ہر بار امریکہ سے دب کیوں جاتے ہیں۔

یہ مانا کہ ہم اُس جیسی طاقت نہیں رکھتے کیونکہ اُس کے کارخانے دن رات نئے سے نیا جنگی اسلحہ ڈھال رہے ہیں دعویٰ انسانیت دوستی کا اور عمل انسان کشی کا۔ ہم وہ ٹیکنالوجی اور وسائل و ذرائع نہیں رکھتے جو اُس کے پاس ہیں لیکن اس بات کو وہ بھی مانتا ہے کہ علاقے میں ہماری اہمیت کیا ہے اور وہ یہاں ہمارا کتنا محتاج ہے، اس کا اندازہ نیٹو سپلائی کی صرف سات ماہ کی بندش میں وہ لگا چکا ہے جس کے لیے اُس نے ہر حربہ آزمایا۔ وہ مانے یا نہ مانے اُس نے سرحد کے پار افغان علاقے سے پاک فوج کے دستوں اور پاکستانی علاقوں میں سول آبادی پر خود حملے کرائے ورنہ کیا وہ اتنی طاقت اور ٹیکنالوجی کی موجودگی میں مولوی فضل اللہ کو روک نہیں سکتا۔ وہ یہی ڈرون ٹیکنالوجی اس کے خلاف کیوں استعمال نہیں کرتا جو وہ بڑی باقاعدگی اور درندگی سے پاکستانی علاقوں میں استعمال کرتا ہے اگر وہ پاکستان کو اپنا اتحادی کہتا ہے اور اس سے کسی بھی امریکی سے زیادہ امریکہ کے لیے وفاداری کی توقع رکھتا ہے تو خود وہ کسی بھی فرض سے مبرائ کیوں ہے۔ وہ جب انتہائی بربریت سے ڈرون حملے کرتا ہے اور دس پندرہ قبائلیوں کو بھون کر رکھ دیتا ہے تب اُس کے انسان دوست شہری کیوں خاموش رہتے ہیں۔ اس کی انسانی حقوق کی تنظیموں کو چپ کی بیماری کیوں لگ جاتی ہے۔ یہ سارے اعتراضات ہونے کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اپنے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے تو ہماری حکومت کس مرض کی دوا ہے۔ کیا اُس کا ہر شہری اس کے لیے اتنا ہی معتبر نہیں جتنا صدر یا وزیراعظم یا

ان کے اہل خانہ ہیں بلکہ یہ لوگ تو اپنی حفاظت کے ساتھ ہر شہری کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں ان کے بھی جو وزیرستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں ایک مشکل ترین زندگی گزارتے ہیں جو اس ملک کے وسائل و ذرائع کو اتنا استعمال نہیں کرتے جتنا دوسرے کرتے ہیں تو کیا اُن کی زندگی بھی بے وقعت ہے۔ آج اگر یہ ڈرون ادھر تک آتے ہیں تو کل کو خدانخواستہ مزید پیش قدمی ہو سکتی ہے جس کی کئی مثالیں میں شروع میں بیان کر چکی ہوں اور جس پر انتہائی افسوس کے ساتھ لیکن تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہماری حکومت نے انتہائی کمزوری کا ثبوت دیا اور اپنے ملک سے زیادہ امریکہ کی حفاظت کو اپنا فرض جانا۔ یہ سوچنا کہ ابھی تک امریکہ اگر پاکستان کے خلاف کھلی اور وسیع جارحیت نہیں کر سکا تو اس میں کسی اعلیٰ حکومتی پالیسی کو دخل ہے تو سچ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس رکاوٹ کی وجہ وہ ایٹمی قوت ہے جس کو حاصل کرنے سے روکنے کے لیے امریکہ نے ہر حربہ آزمایا تھا اور اب بھی اس کی مکمل کوشش ہے کہ خدانخواستہ کسی نہ کسی طرح ان اثاثوں تک پہنچ جائے اور آئے روز ان کے غیر محفوظ ہونے کا پروپیگنڈا اس کا معمول ہے کہ یہ غیر محفوظ ہیں جبکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک مربوط اور محفوظ نظام کے تحت اللہ کے فضل سے انتہائی محفوظ ہیں۔ ہماری حکومت کو کم از کم اپنی اسی پوزیشن کا فائدہ اٹھا لینا چاہیئے اور امریکہ سے ڈرون حملوں پر دو ٹوک انداز میں بات کر لینی چاہیئے اور اسے یہ باور بھی کرا دینا چاہیے کہ ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ اگر ان

علاقوں میں کوئی دہشت گرد ہے بھی تو اُس کے خلاف کارروائی کا حق صرف حکومت پاکستان کو ہے امریکہ کو نہیں ۔ امریکہ کے لیے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ افغانستان خالی کردے اور واپس ہزاروں میل دور اپنے گھر کو لوٹ جائے تاکہ یہ خطہ ایک بار پھر پُرامن اور محفوظ ہو جائے کیونکہ ادھر فساد کی جڑ ہی امریکہ ہے اور جب تک یہ علاقے میں موجود ہے تب تک یہاں قیام امن کی کوئی کوشش سود مند ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ جس طرح کسی بھی ملک کی سرحدیں اور اس کے شہری قابل احترام ہیں ایسے ہی پاکستانی اور پاکستانی سرحدیں بھی قابل احترام ہیں۔ لہذا امریکہ کو بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی روک دینی چاہیئے اور ایسا کرے تو اُسے بھی کہیں تو جوابدہ ہونا چاہیئے ۔ کیا اقوام متحدہ صرف باقی دنیا کے لیے ہے۔

برما۔۔۔برق گرتی ہے توبچارے مسلمانوں پر

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے گذشتہ بارہ سال سے مسلمانوں اور عالم اسلام کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے جسے اُس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نام دے رکھا ہے اور کسی اسلامی ملک میں کسی غیر مسلم کے خلاف ہونے والا معمولی واقعہ بھی اس قدر اچھال دیا جاتا ہے کہ بات بہت آگے چلی جاتی ہے۔ دو تین سال پہلے یورپین آرگنائزیشن آف پاکستان مائنارٹیز نامی این جی او نے پاکستان کو اقلیتوں کے لیے خطرناک ترین ملک قرار دیا اور یہی شوشہ کسی بھی مسلمان ملک کے بارے میں کسی بھی وقت چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر برما یا میانمار کے بارے میں انسانی حقوق کے کچھ ادارے بولے بھی ہیں تو ہزاروں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد اور اس بولنے میں بھی وہ زور نہیں جو اتنا خون بہہ جانے کے بعد ہونا چاہیئے تھا۔

برما اور بنگلہ دیش کی سرحد پر واقع صوبہ رکھنی جو 36762 مربع کلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے اور تاریخی طور پر اراکان کے نام سے جانا جاتا ہے یہاں روہنگیا مسلمان ساتویں صدی سے آباد ہیں لیکن حیرت ہے کہ میانمار کی حکومت انہیں اپنا شہری تسلیم کرنے پر تیار نہیں جبکہ ان مسلمانوں کے آباواجداد بھی اسی زمین کی پیداوار ہیں ہاں ان کی ریاست کو انگریز نے دوسری جنگ عظیم

ہیں علاقے سے جاتے جاتے برما کے سپرد کر دیا اور یوں تب سے روئے زمین پر یہ انوکھی مثال قائم ہوئی کہ کچھ انسان کسی بھی ملک کے شہری تسلیم نہیں کیے جا رہے اپنی زمین کے بھی نہیں اگرچہ میانمار کسی بھی اقلیت کے لیے کوئی خوشگوار جگہ نہیں۔ یہ ملک سے فوجی آمریت کے زیر تسلط ہے اور 1988 سے حکومت بغیر کسی آئین اور 1962 قانون سازی کے حکومت میں ہے۔ یہاں کسی اقلیت کو مذہبی آزادی نہیں یہاں تک کہ انہیں اپنے مذہبی تہواروں کی چھٹی کے لیے بھی پہلے سے درخواست دینا اور اس کی منظوری کے لیے رشوت دینا پڑتی ہے جو کہ اکثر اوقات منظور نہیں ہوتی لیکن مسلمانوں کے لیے یہ سختی کچھ زیادہ ہی ہے اور روہنگیا مسلمانوں کے لیے تو یہ پابندیاں نہ صرف زیادہ بلکہ غیر انسانی ہیں۔ انہیں نہ تو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہے نہ طبّی سہولیات پر ان کا کوئی حق ہے نہ ایک سے دوسرے شہر جانے کی اجازت ہے یہاں تک کہ شادی کے لیے بھی ان مسلمانوں کو حکومت سے اجازت لینا پڑتی ہے اور وہی حکومت جو ان مسلمانوں کو اپنا شہری ہی تسلیم نہیں کرتی جب کبھی اجازت دے تب ہی شادی ہو سکتی ہے یوں کئی طریقوں سے ان کی نسل کشی جاری ہے۔ کبھی ان مسلمانوں کے قتل عام سے، کبھی ان کے بچوں کو مار کر اور کبھی شادی کی اجازت نہ دے کر۔ اس ملک کے بڑے شہروں مثلاً ینگوں کے رہنے والے مسلمانوں کو ساحل سمندر پر جانا ہو تو بھی انہیں حکومت سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ اور اسی حکومت کی ایمائی پر برمی بدھ برمی مسلمانوں کے قتل کو ثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔ اکثر اوقات ان

مسلمانوں کا قتل عام اس بات پر بھی ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کوئی جانور کیوں مارا کیونکہ بدھ مذہبی طور پر جانور یا جاندار کی جان لینا گناہ سمجھتے ہیں اور مسلمان ذبیحے کی سزا میں قتل کر دیے جاتے ہیں اور حکومت اس سارے کھیل میں نہ صرف شریک بلکہ اس کی پشت پر ہوتی ہے۔اس وقت ان مسلمانوں کو انسان تو کیا جاندار کے درجے سے بھی گرا دیا جاتا ہے جن کو مارنا بدھ گناہ سمجھتے ہیں۔ موجودہ فسادات میں جس طرح ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا ہے وہ سنگین نوعیت کا جرم ہے۔ اقوام متحدہ کی قرار داد نمبر 96 (I) کے تحت جو گیارہ دسمبر 1946 کو منظور ہوئی نسل کشی چاہے جنگ کے دوران ہو یا امن کے بین الاقوامی قوانین کے مطابق جرم ہے اور اس قرارداد کی رُو سے اقوام متحدہ کے اراکین اس کو روکنے اور نسل انسانی کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن برما میں نسل کشی پر پوری دنیا خاموش ہے جس میں انسانوں کو زندہ جلایا گیا ان کی عورتوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ان فسادات کے لیے جس واقعہ کو جواز بنایا گیا وہ ایک بدھ لڑکی کا قبول اسلام تھا جس کو بعد میں قتل کر دیا گیا اور اس کا الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا گیا حالانکہ سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ اگر اس کو اسلام قبول کرنے کے بعد قتل کیا گیا تو مسلمان ایسا کیوں کرتے انہیں تو اس کی حفاظت کرنی چاہیے تھی لیکن دراصل مسلمانوں کو اس بات کی سزا دی گئی کہ کیوں ایک بدھ لڑکی نے ان کا مذہب قبول کیا جبکہ خود یہ لوگ جبراً مسلمانوں بلکہ عیسائیوں کے مطابق انہیں بھی

بدھ مت قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں ۔برما میں مسلمانوں کے خلاف بدھوں کا مخاصمانہ رویہ کوئی نیا نہیں تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب یہاں کے بدھوں نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ رویہ اختیار کیا اور ان کے انہی مظالم سے تنگ آ کر یہ مظلوم مسلمان بنگلہ دیش کا رخ کرتے ہیں مگر وہاں سے بھی انہیں نکال دیا جاتا ہے یا انہیں انتہائی نا مساعد حالات میں مہاجر کیمپوں میں رکھا جاتا ہے یا یہ مظلوم روہنگیا مسلمان تھائی لینڈ کے مہاجر کیمپوں میں ایک تکلیف دہ زندگی گزارتے ہیں۔ ان میں سے کچھ برمیوں ہی کے نام سے بغیر شہریت کے کراچی اور سعودی عرب میں آباد ہیں لیکن کیا ان کا یوں بکھرے رہنا مسئلے کا حل ہے یقینا نہیں بلکہ اس کا مستقل حل نکلنا چاہیے اور اس کے لیے سب سے زیادہ ذمہ داری او آئی سی کی ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ان مسلمانوں کے حق میں مضبوط آواز اٹھائے۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد 1.56 بلین ہے جو کہ دنیا کی کل آبادی کا تقریبا 23 فیصد بنتا ہے تو کیا اتنی بڑی تعداد آٹھ لاکھ روہنگیا مسلمانوں کو ان کا حق نہیں دلا سکتی۔ اگر یہ سب اس چیز کا انتظار کر رہے کہ دوسرے ان کی مدد کریں گے تو ایسا ہر گز نہیں ہے غیر مسلم دنیا تو خود مسلمانوں کے در پے ہے۔ ہاں جب مسلمان حکمرانوں کو اپنے شوق حکمرانی سے فرصت ملے گی اور وہ اس مسئلے کو توجہ دیں گے تو یقینا اس کا حل نکل آئے گا۔ اس مسئلے کو اقوام متحدہ تک پہنچ جانا چاہیے اور اس پر اسی طرح کا کوئی فیصلہ آنا چاہیے جیسا کہ ایسٹ تیمور کے صرف

دس گیارہ لاکھ لوگوں کے لیے الگ ملک کی صورت میں آیا۔آخر برما کے ان مسلمانوں کے لیے ان کے حقوق کی بات کیوں نہیں کی جا رہی جو آزاد ذرائع کے مطابق اس کی آبادی کا دس فیصد ہیں۔انسانی حقوق کی تنظیموں نے اگرچہ معاملے کا نوٹس تو لے لیا ہے مگر سرسری سا۔ان غیر انسانی مظالم سے ان مسلمانوں کی نجات کا کوئی منصوبہ سامنے نہیں آ رہا یہاں تک پاکستان کی انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی خاموش ہیں کیا بہتر نہ ہوتا کہ وہ اس مسئلے کو عالمی سطح پر اجاگر کرتیں۔ہمارا الیکٹرانک میڈیا اس معاملے پر جس مجرمانہ انداز میں خاموش رہا وہ انتہائی قابل افسوس ہے۔حدیث شریف کے مطابق مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں کہ جس کے ایک حصے میں تکلیف ہو تو پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے تو ہمیں اس تکلیف کو محسوس کر لینا چاہیے اگر ہمارا میڈیا ان زندہ جلتے ہوئے مسلمانوں کے کلپس دکھاتا ان روتے بلکتے بچوں اور بے آبرو عورتوں کے کرب میں ڈوبے چہرے دکھاتا تو شاید عالمی ضمیر جاگ ہی اٹھتا اور میانمار کے مسلمانوں کو انسان سمجھتے ہوئے ان کی مدد کے لیے آگے بڑھتا تو ہزاروں مسلمان چند دنوں میں کاٹ نہ دیئے جاتے اور برمی وزیراعظم انہیں اپنی ہی زمین سے بے داخل ہونے کا حکم نہ دیتا ۔امن کی نوبل انعام یافتہ برمی آن سان سوچی اپنے نوبل انعام کی لاج رکھتے ہوئے ہی ان کے حق میں کچھ بول لیتی۔مسلمان عوام تو پوری دنیا میں بولے اور پورے کرب کے ساتھ بولے لیکن ان کی آواز ابھی تک تو صدا بصحرا ہی ثابت ہوئی ہے۔خدا کرے مسلمان حکمران بولیں اور پورے زور سے

بولیں، متحد ہو کر بولیں، خلوص سے بولیں تو یقیناً یہ سب جذبے ان کی طاقت بن جائیں گے ایک ایسی طاقت جو مخالف پر لرزہ طاری کر دے۔ نہ صرف روہنگیا بلکہ برما کے دوسرے مسلمان بھی اسی جذبے کے منتظر ہیں ہمیں برمی مسلمانوں کی اخلاقی، مذہبی اور سفارتی سطح پر مدد کرنا ہو گی کیونکہ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور باقی دنیا کو ایسا کرنے پر مجبور کرنا ہو گا اور یہ یاد دلانا ہو گا کہ ان کی مدد بھی ان انسانی حقوق کے علمبرداروں کا انسانی فریضہ ہے۔

! بھارت افغانستان میں کیوں

دسمبر 1979 میں روس نے افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں اور افغان مہاجرین جو وہاں سردار داؤد کے قتل کے بعد، ترکی اور حفیظ اللہ امین کی غیر مستحکم اور غیر منتخب حکومتوں کے دوران بھی پاکستان آ رہے تھے لاکھوں کی تعداد میں پاکستان پہنچے اور ساتھ ہی کلاشنکوف کلچر اور بم دھماکے بھی پاکستانی عوام کا مقدر ہوئے۔ معیشت نے جو بوجھ اٹھایا، پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے اسے برداشت کرنا ناممکن تھا لیکن پاکستانی عوام نے اپنے ان مجبور مسلمان بھائیوں کی مدد کو دینی فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ 1989 میں روس افغانستان چھوڑ گیا اور خود بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا لیکن 2001 میں امریکہ وہی شوق ملک گیری لے کر افغانستان آیا جس کا مظاہرہ روس کر چکا تھا۔ اس کا بہانہ اُسامہ تھا لیکن مقصد کچھ اور، اور اس بار پھر پاکستان کو پہلے سے بھی برے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے تو امریکہ اپنے مفاد لیے پاکستان کو استعمال کر رہا تھا لیکن اُسے امریکہ کی اپنے مطلب کے لیے ہی سہی مدد حاصل تھی لیکن اب تو پاکستان صرف برے حالات کا سامنا ہی کر رہا ہے بے یار و مددگار۔ امریکہ اسے استعمال کر رہا ہے لیکن اپنی شرائط پر، اس کے عوام پر ڈرون حملے کر کے، سرحد کے اُس پار افغان علاقوں سے اس کے فوجیوں پر حملے کروا کے، اس کے لوگوں کا قتل عام کر کے اور

دنیا میں ہونے والی تمام دہشت گردی کے لیے اُسے موردالزام ٹھہرا کر بلکہ سزا دے کر۔ یہ مختصر سا تذکرہ اور جائزہ تھا ان اثرات اور مشکلات جن کا سامنا پاکستان صرف افغانیوں کی مدد کی پاداش میں کرتا رہا ہے لیکن اب جبکہ امریکہ نے سمجھ لیا ہے کہ پاکستانی مزید اس کا دباؤ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تو اُس نے پاکستان کے بجائے بھارت کو افغانستان میں حد سے زیادہ اہمیت دینا شروع کر دی ہے جو کہ انتہائی غیر قدرتی ہے اس اہمیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ پاکستان کو یہ بتائے کہ وہ اس کے بغیر بھی افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہے اور دوسری طرف بھارت افغانستان کی طرف سے بھی پاکستان کو نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں آ جائے بلکہ وہ ایسا کرنے میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکا ہے کیونکہ پاک افغان سرحدی علاقوں اور قبائلی علاقہ جات میں جو دہشت گرد تنظیمیں پل رہی ہیں اور پاکستان کے ہر شہر اور ہر علاقے کو تہہ وبالا کر رہی ہیں وہ غیر ملکی امداد کے بغیر خود کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ ظاہر ہے بھارت کے درجن بھر قونصل خانے کسی خاص مقصد ہی کے لیے تو بنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھارت کے چار ہزار اہلکار افغانستان میں مختلف تعمیراتی، تعلیمی ترقیاتی اور طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ یقیناً افغانستان کی ہمدردی میں نہیں کر رہا بلکہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہی سرگرم عمل ہے اور مفادات کے حصول کے بعد وہ اپنی پالیسی تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ اس نے ایران کے ساتھ مل کر بھی افغانستان میں کچھ

ترقیاتی کام کیے جن میں سے ایک اہم منصوبہ دو سو ستر کلو میٹر طویل سوریج دل آرام سڑک ہے جو ایران سے افغانستان تک پہنچائی گئی اور جس کا مقصد بھارت افغان تجارت کے لیے آسان راستہ مہیا کرنا تھا لیکن جب امریکہ کا دباؤ پڑا تو آج اس کے ایران کے ساتھ تعلقات میں وہ گرم جوشی نہیں رہی۔ ہیلری کلنٹن کے مطابق بھارت اور امریکہ کے مفادات ایک ہیں لیکن ہیلری کلنٹن یاد رکھے جس وقت ان مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوگا تو بھارت اپنا اتحادی تبدیل کر دے گا۔ ہاں وہ اپنے واحد مستقل مقصد کے حصول سے کسی طرح دستبردار ہونے کو تیار نہیں اور وہ ہے پاکستان کو نقصان پہچانا۔اسی افغانستان کے راستے وہ بڑی آسانی سے بلوچستان میں دراندازی کر رہا ہے اور وہاں موجود پاکستان مخالف قوتوں کو اسلحہ اور مالی امداد فراہم کر رہا ہے جس کے مستند شواہد موجود ہیں پاکستان کو اس بات پر اعتراض نہیں کہ وہ افغانستان میں کیوں ترقیاتی کام کر رہا ہے لیکن اس بات پر تشویش ضرور ہے کہ آخر امریکہ نواز افغان حکومت بھارت کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے اور پھر بھارت اسی افغانستان کے غم میں کیوں مبتلائی ہو گیا ہے جس پر روسی قبضے کی وہ حمایت کرتا رہا ہے۔وہ یقینا صورت حال کا فائدہ اٹھا رہا ہے اور بھارت نواز کرزئی دور حکومت میں افغانستان میں اپنے پنجے اس مضبوطی سے گاڑہ رہا ہے کہ پاکستان کے خلاف اس کو اس کی مغربی سرحد پر ایک مضبوط بیس اسٹیشن میسر آجائے۔ موجودہ صورت حال میں بھارت کے اس کردار کے پیچھے جو بااثر ہاتھ محسوس ہوتا ہے وہ امریکہ ہے جو پاکستان

کو کمزور کرنے کے ساتھ بھارت کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ ایک بہت.بڑی غلطی کر رہا ہے اور اوبامہ حکومت کی اس پالیسی پر سینیٹر جان مکین نے بھی تنقید کرتے ہوئے اسے خبردار کیا کہ پاکستان کو نظر انداز کرنے اور کمزور کرنے کی پالیسی کا امریکہ کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہی ہوگا اور یہ کہ اوبامہ کی پاکستان پر تنقید بھی معاملے کو بگاڑ دے گی ۔افغانستان میں بھارت کی انتہا درجے کی دلچسپی خالی از مصلحت نہیں اور یہ مسئلہ صرف نشاندہی سے ہی حل نہیں ہوگا بلکہ پاکستان کو امریکہ اور باقی دنیا کو بھارت کی نیت سے آگاہ کرنا ہوگا اور سفارتی سطح پر ایک سخت جنگ لڑنا ہوگی اور انہیں یہ بتانا ہوگا کہ بھارت جس نیت سے افغانستان آیا ہے اُس کے نتائج انتہائی خطرناک ہو سکتے ہیں جس سے بچنے کے لیے یہاں اس کے غیر فطری کردار کو محدود کرنا ہوگا۔

تاریخ پھر سے بدلی جا سکتی ہے

انسان ہو یا جانور اللہ تعالیٰ نے اِن کی خصلت میں آزادی لکھ دی ہے۔ چڑیا، پرندے آزاد فضا میں اڑیں تو ہی خوش، جانور آزادی سے جنگل میں گھومیں تو ہی سکھی۔ پھر انسان تو اشرف المخلوقات ہے بھلا اسے آزادی کیسے عزیز نہ ہو۔ لیکن طاقتور اقوام طاقتور ہی تب ہی کہلاتی ہیں کہ وہ کمزور اقوام کی آزادی پر شب خون ماریں اور انہیں غلام بنالیں۔۔برصغیر میں مسلمان آئے تو اپنے ساتھ ایک ایسا مذہب لائے جو انسان کو شرف انسانیت سے سرفراز کرتا ہے اور یہ شرف انسانیت انسان کو انسان سے محبت سکھاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ یہاں تیزی سے پھیلا۔ مسلمان فاتحین یہاں آئے تو لوگوں کی جانوں سے بڑھ کر ان کے دلوں پر حکومت کرتے رہے ایک ہزار سال تک باوجود حکمرانی رنجشوں کے۔ یہاں کے عام باشندوں پر وہ قدغنیں نہیں تھیں جو انہیں حکمرانوں سے بدظن کرتیں۔ ملک خوشحال تھا اس لیے دنیا کی حریص نظریں اس پر رہیں۔دولت کی فراوانی زیادہ ہوئی تو کچھ اہل مغرب کی مکاری اور کچھ حکمرانوں کی عیاشی کہ ملک ہاتھوں سے گیا اور جب مکمل طور پر غلام بنا تو ملت کی آنکھیں کھل گئیں ۔دیر تو ہو چکی تھی لیکن کچھ عظیم رہنماؤں کی رہبری اور کچھ عوام کی غیرت نے اجنبی قابضین کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس راہ میں مشکلات بھی آئیں، خون بھی بہا، عصمتیں بھی لٹیں،

یتیمی کے دکھ بھی سہے گئے، جلوسوں پر بھی گولیاں چلیں، سڑکیں بھی رنگین ہوئیں اور پھانسی گھاٹ بھی آباد ہوئے لیکن مسلمانوں کو ایک دولت میسّر رہی اور وہ تھی مخلص رہنمائی کی دولت۔ مسلمان اگر جانیں لٹاتے رہے اور مالی نقصان برداشت کرتے رہے تو انہیں یہ تسلی تھی کہ ان کے رہنما انہیں اپنے وعدے کے مطابق اسی راستے پر لے کر چلیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور پھر تاریخ نے دیکھا کہ اسی مخلص رہنمائی اور عوامی قوت نے دنیا کا نقشہ محاورۃً نہیں حقیقتاً بدل کر رکھ دیا اور دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا جس کا اس سے پہلے کوئی وجود نہیں تھا دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی کا انتہائی اہم ملک۔ جس ملک پر دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کی نظریں جمی ہوئی رہتی ہیں۔ جو اگر اپنے محل وقوع اور اپنی آبادی کی طاقت کو ہی استعمال کرے تو بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ ایسا ہوا نہیں۔ اس زمین کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی اور انسانی وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہاں عرب دنیا کی طرح تیل نہیں ابلتا لیکن اللہ نے اس زمین کو کوئلے کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہوا ہے، اسے سونے اور کاپر جیسی قیمتی دھاتوں سے نوازا ہوا ہے، سمندر کے کھلے سینے اسے عطا کئے ہیں، چار موسموں کے پھل اور فصلیں اسے عطا کی ہیں اور سب سے بڑھ کر اٹھارہ کروڑ زرخیز دماغ اور ہاتھ عطا کیے ہیں جو اس ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ جب جب اس کے لوگوں نے کسی کام کی ٹھانی تو اسے کر کے چھوڑا۔ 1948 میں ایک

نوزائیدہ ملک پر جنگ مسلط کی گئی تو پوری قوم سپاہی بن گئی اور دشمن کو اپنی جرات اور ان حماقت کا احساس دلادیا۔ 1965 میں بزدل دشمن نے حملہ کیا تو نہ صرف فوج بلکہ نفسیاتی محاذ پر اس کے عوام نے بھی عظیم کارنامے سرانجام دیئے اور ایثار و قربانی کی وہ مثالیں قائم کیں کہ قوم آج بھی ان پر فخر کرتی ہے۔ دفاع وطن سے لیکر تعمیر وطن تک ہر مرحلے پر اس قوم نے خود کو منوایا۔ دنیا بھر کی مخالفت لے کر بھی اسے ایٹمی قوت بنا یا، پابندیاں برداشت کیں لیکن اپنی طاقت کا سودا نہیں کیا اور یوں آج ہم صرف اسی ایٹمی قوت ہونے کے ناطے ہی بہت سارے خطرات سے بچے ہوئے ہیں۔ آج جب کہ حالات زیادہ موافق نہیں ملک اور قوم مشکل حالات کا سامنا کر رہے ہیں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بہت ساری سازشوں اور مخالفتوں کا سامنا ہے۔ دہشت گردی، بھتہ خوری قتل اورڈکیتی ہمارے معاشرے کا نشان بنتے جا رہے ہیں۔ حکومتیں کچھ خود ملک سے، زیادہ اپنے مفاد کو ترجیح دے رہی ہیں اورکچھ سیاسی رنجشیں انہیں پنپنے نہیں دیتی ہیں۔ اور ان حالات کا ہی شاخسانہ ہے کہ تجارت و معیشت بھی زوال کا شکار ہیں۔ ان سارے حالات کا صرف ایک علاج ہے کہ انقلابی اور ہنگامی بنیادوں پر ملک کے لوگوں کو متحد کیا جائے۔ حکومت صرف برائے حکومت نہیں بلکہ برائے خدمت و رہنمائی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ ایسے حالات کسی دوسرے ملک میں پیش نہیں آتے وہاں بھی چوری، ڈکیتی، قتل معاشی دباؤ سب کچھ ہو جاتا ہے لیکن زندہ قومیں حالات قابو کر لیتی ہیں اور بجائے، حالات کے

مطابق ڈھلنے کے انہیں اپنے مطابق ڈھال لیتی ہیں۔ اس وقت پاکستان کے عوام اور حکومت کو مل کر ملک کو اِن حالات سے نکالنا ہوگا اگر ہم عوام اسے صرف حکومت کی ذمہ داری سمجھ کر خود کسی بھی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جائیں اور یہ سمجھیں کہ حالات درست ہو جائیں گے تو یہ احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہوگا بلکہ عوام کو دُہری ذمہ داری نبھانی ہے انہیں حکومت کو سیدھے راستے پر بھی رکھنا ہے اور کام بھی کرنا ہے۔ اگر یہ کروڑوں ہاتھ کام کرنے لگ جائیں تو پھر تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومتوں اور حاکموں کو اپنی تجوریاں بھرنے اور اپنی آنے والی نسلوں کی فکر کرنے کے بجائے اس ملک کی آنے والی نسلوں اور اسکے مستقبل کی فکر کرنی ہوگی۔ یوں تو ہم ہر سال چودہ اگست مناتے ہیں لیکن بے روح یوم آزادی منانے سے ہم ملک و قوم کی کوئی خدمت نہیں کرتے نہ ہی جھنڈیاں لگانے سے ترقی کی دوڑ میں آگے نکلا جا سکتا ہے۔ یہ سب وطن سے محبت کی نشانیاں سہی لیکن محبت کو بارآور اور ثمربار ہونا چاہیے۔ جشنِ آزادی ہمیں زندگی کا احساس دلاتا ہے لیکن تقاریر نعرے اور سجاوٹ جب جب زندگی کے ساتھ زندگی کی حرارت بھی پیدا کریں تو ہی فائدہ مند ہیں۔ اس چودہ اگست کو صرف منانے کے لیے نہیں بلکہ ملک بنانے کے عزم کا دن بنایئے اس عہد کے ساتھ کہ یہ ملک جس مقصد کے لیے بنا تھا اس کو اس کا طرۂ امتیاز بنائیں گے اور اسے حقیقی معنوں میں اسلام کا قلعہ بنائیں گے۔ ہم میں سے جو جس شعبے میں ہے اُسی شعبے کو بہترین بنا کر

ملک کی خدمت کریں تو یقین کریں ہر شعبہ زندگی چمک اٹھے گا صرف اُسی ہمت اور عزم کی ضرورت ہے جس نے یہ ملک حاصل کیا آج رہنماؤں میں وہی جذبہ اور عوام میں وہی قوت اور عزم زندہ ہو جائے تو تاریخ پھر سے بدلی جا سکتی ہے۔

ڈی جی آئی ایس آئی کا دورہ امریکہ

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کچھ عجیب نوعیت کے ہیں یہ حکومتوں کی سطح پر تو خوشگوار سمجھے جا سکتے ہیں لیکن عوامی سطح پر اسے کبھی پذیرائی نہیں مل سکی ہے اور یہی حال کچھ سیاسی حکومتوں کا بھی رہتا ہے کہ جو جماعت جب حکومت میں نہ ہو دوسری جماعت کو امریکہ کے ساتھ تعلقات کا طعنہ دیتی رہتی ہے۔ یہی حال ہمارے فوجی تعلقات کا بھی ہے کبھی یہ اتنے خوشگوار ہو جاتے ہیں کہ ہم مل کر دوسری سُپر پاور کا شیرازہ بکھیر دیتے ہیں اور کبھی ہمارے F-16 بھی روک لیے جاتے ہیں اور ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ سب پینترے امریکہ اپنے مفاد کے لیے بدلتا رہتا ہے اُسے پاکستان کے فائدے مفاد سے کوئی غرض نہیں۔ آج کل بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے اور اسی صورت حال میں جب ڈی جی آئی ایس آئی نے امریکہ کا دورہ کیا تو قوم کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات بالکل بجا تھے لیکن اِن سوالات کو خدشات کی شکل دینا قوم کو مزید ذہنی الجھن میں مبتلائ کرنے کے مترادف ہے، جبکہ پہلے ہی اس کی الجھنوں کا کوئی حساب نہیں پچھلے دنوں ایک اخبار میں آپریشن ''ٹائٹ سکریو'' کی تفصیلات کچھ اس تفصیل سے پڑھیں کہ جیسے وہ وقوع پذیر ہو چکا ہے جبکہ ابھی تک حکومت یا فوج کی طرف سے ایسا کوئی عندیہ بھی نہیں دیا گیا ہے۔ حکومت کے ساتھ لاکھ اختلافات سہی

لیکن ملکی وقار کا خیال رکھنا ضروری ہے اگر ایسا کوئی معاہدہ ہوا نہیں تو کیوں یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ ڈی جی آئی ایس آئی ایسی کوئی ڈیل کرکے واپس آئے ہیں کہ شمالی وزیرستان میں آپریشن کا فیصلہ کر لیا گیا ہے جس میں پاک فوج کے ساتھ ساتھ امریکی فوجی حصہ لیں گے یعنی "امریکہ کو پاکستان میں زمینی رسائی"۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنی خود مختاری کا مکمل سودا کر لیں۔ ڈی جی آئی ایس آئی کو بھی اس بات کا احساس یقینا ہوگا کہ اب تو ہم اپنے اتنے جوان اس پرائی جنگ میں جھونک چکے ہیں کہ اب مزید کی گنجائش ہی نہیں اور دوسری بات کیا وہ کسی حکومت کے تابع نہیں اگر ہیں تو کیا حکومت نے انہیں ایسا کرنے کا مینڈیٹ دے دیا تھا۔ ہم تو اُن سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ امریکہ تو کیا کسی بھی غیر ملکی طاقت کو وہ پاکستان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے پر آنکھ پھوڑنے کی دھمکی دے آئیں اور وقت آنے پر ایسا کرکے بھی دکھائیں۔ ظاہر ہے اندر کی بات، تو بات کرنے والے ہی جانتے ہونگے لیکن ان کی طرف سے تو قوم کو یہی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ ڈرون حملوں اور سرحدپار سے پاکستانی سرحدوں کے اندر اور پاک فوج پر تحریک طالبان کی طرف سے حملوں پر بھی سخت موقف اپنایا گیا کہ امریکہ اِن دونوں طرح کے حملوں کو روک دے اور ڈرون ٹیکنالوجی پاکستان کو منتقل کر دے تاکہ پاکستان دہشت گردوں کے خلاف خود کاروائی کر سکے اور یوں ہم وطن عزیز میں دہشت گرد کاروائیاں کرنے والوں کو خود روک سکیں کیونکہ ظاہر ہے امریکہ اپنے دشمن کے خلاف تو کاروائی کرتا ہے

ہمارے دشمن کے خلاف اُسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اُس کے اِنہی ڈرون حملوں کے بعد ہی تو پاکستان کے دوسرے علاقوں یں ان کاروائیوں میں تیزی آتی ہے۔ یوں اِن حملوں کا نقصان ہر طرف سے پاکستان کو ہی ہوتا ہے ایک طرف اُس کی خود مختاری پر حملہ کیا جاتا ہے، اُس کی سرحدیں روندی جاتی ہیں اوراُس کے شہری ہلاک ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس سب کچھ کا بدلا دوسرے معصوم شہریوں سے لے لیا جاتا ہے جو خود ڈرون حملوں میں مرنے والوں کے لیے روتے ہیں۔ ہاں حکومت اور آئی ایس آئی کو اس پر مزید سخت موقف اپناتے ہوئے امریکہ کو اِن حملوں کو روک دینے پر مجبور کر دینا چاہیے۔ بلکہ اُسے اس بات پر بھی آمادہ کر لینا چاہیے اور یہ یقین دہانی کروالینی چاہیے کہ افغان سرحد کے اُس پار سے پاکستانی سرحد کے اندر ہونے والی کاروائیاں روک دی جائیں۔ کیونکہ پاکستانی عوام اور پاک فوج کو بھی یقین ہے کہ یہ کاروائیاں امریکی مدد کے بغیر ناممکن ہیں۔ حکومت اور افواج پاکستان کی طرف سے اگرچہ ہمیشہ اس بات کی تردید کی جاتی رہی ہے کہ پاکستان کا حقانی نیٹ ورک سے کوئی تعلق نہیں اور اب بھی ایسا ہی کیا گیا تاہم اس الزام کو مزید سختی سے مسترد کیا جانا چاہیے کہ ہم حقانی نیٹ ورک کی کسی بھی قسم کی مدد کر رہے ہیں یا ہمارا ان سے کسی قسم کا تعلق ہے۔ یہ ساری تنظیمیں خود امریکہ کی پیداوار ہیں اسی نے انہیں بنایا اور پروان چڑھایا تو اب ان کا الزام پاکستان کے سرکیوں تھوپا جا رہا ہے اور اِن کاروائیوں کا ذمہ دار پاکستان کو کیوں سمجھا جا رہا ہے۔

ظاہر ہے وہ اپنے خلاف ہونے والی کاروائیوں کا جواب دیں گے یہ ایک فطری امر ہے۔
پاک فوج کے ہر ہر اہلکار نے ہمیشہ جس طرح اپنے فرائض ادکیے ہیں اُن پر پوری قوم کو فخر ہے اور بھروسہ بھی ہے لیکن موجودہ صورت حال میں جہاں ہر ادارہ دوسرے سے بدظن اور ہر شخص دوسرے کے بارے میں مشکوک ہے اسے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور اس طرح کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو قوم کو اعتماد میں لے لینا چاہیے تاکہ بدگمانیاں مزید نہ بڑھیں۔ قوم یہ جانتی ہے کہ ہر حکومتی اور خاص کر فوجی معاملہ مشتہر نہیں کیا جاسکتا لیکن عام اعتماد کی فضا بحال رکھنے کے لیے خاص کر اقدامات ہونے چاہیں تاکہ چہ میگوئیاں جنم ہی نہ لیں اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے حوالے سے خبروں کو اچھالا نہ جاسکے، اور یوں بداعتمادی کی فضا پیدا نہ ہو۔ پھر ہمارے اپنے میڈیا کو بھی عوام کو صرف اندازوں، تبصروں اور تجزیوں میں الجھانے کی بجائے درست حقائق سامنے رکھنے چاہیں۔ حکومت اور فوج نے اگر مضبوط موقف اپنایا ہو تو اس کی حوصلہ افزائی کریں اور تنقید کی بجائے ایک گائیڈ کا کردار ادا کرتے ہوئے لوگوں کی رائے کو اوپر تک پہنچانا چاہیے۔
اللہ پاکستان کی حفاظت کرے اور اس کے ہر ذمہ دار کو اس کے مفادات کا تحفظ

کرنے کی ہدایت دے۔ آمین۔

کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں نے صرف ایک عقیدے کی بنیاد پر حاصل کیا یعنی عقیدہ توحید و رسالت ۔ صرف ایک خدا ، ایک رسول ، ایک قرآن اور ایک مذہب اسلام ہی تھا جس نے برصغیر کے کونے کونے کے ہر مسلمان کو متحد کیا اور اس اتحاد اور اتفاق نے دنیا کی عظیم ترین اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی اس سارے عمل اور جدوجہد کے دوران یہاں کوئی شیعہ تھا نہ سنی نہ دیوبندی نہ بریلوی۔ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے وہ خود کو صرف مسلمان کہتے تھے دیگر مذاہب سے الگ ایک مذہب ۔ آج بھی مسلمان ، دوسروں کی نظر میں صرف مسلمان ہے شیعہ یا سنی نہیں اور اسی بنیاد پر اہل کفران کے خلاف متحد ہیں اگر ایران کی اکثریت شیعہ ہے تو وہ ان کی نظروں میں مجرم ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے ۔ اگر پاکستان کی اکثریت سُنی ہے تو وہ بھی مجرم اور قابلِ نفرت ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے ان کے لیے اہلِ حدیث ، شیعہ یا سنی کی کوئی تخصیص نہیں تو پھر مسلمانوں میں یہ تخصیص کیوں ۔ ایسا نہیں کہ کوئی بھی مسلک ہر ایک پر لاگو کر دیا جائے اور اس کی بنیاد پر دوسرے کو لادین قرار دے دینا بھی یکسر غلط ہے ۔ اسلام تو وہ مذہب ہے جو کسی کے دین اور مذہب پر پابندی نہیں لگاتا وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے لیکن زبردستی نہیں کرتا ۔ لَااِکراہَ فی الدِّین۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اگر جنگ ہوئی تو اس میں عقیدے اور مسلک کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ اس کی وجوہات کچھ اور تھی جس کو آپ انتظامی اور حکومتی کہہ سکتے ہیں ۔ناراضگی دینی معاملات پر نہیں ہوئی تھی بلکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو گورنری سے ہٹانے پر تھی۔ ہم ان کے غلط اور درست ہونے کا فیصلہ مذہبی بنیادوں پر نہیں کر سکتے ۔یہی حال حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے کا تھا یہاں بھی کسی کو مسلکی ناچاقی نہیں تھی نہ ہی کوئی فقہی اعتراض تھا ۔اگر حضرت امام جعفر صادق، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے اُستاد تھے تو اُن کی شاگردی امام جعفر کے لیے بھی باعث فخر تھی ۔انہی روایات کو لے کر مسلمان دنیا کے کونے کونے میں گئے اور دین پھیلاتے رہے ۔ اللہ نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر عمل اور ہر طریقے کی حفاظت کرنا تھی لہٰذا کوئی ان کے کسی فعل کا کوئی ایک طریقہ اور کوئی دوسرا طریقہ اپناتا اور پھیلاتا رہا اور یوں ہر عمل محفوظ ہوتا رہا۔مجھے اس بات سے ہرگز اختلاف نہیں کہ ہر ایک اپنا مسلک رکھے اور پختہ طور پر رکھے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کو کافر یا واجب القتل قرار دیا جائے۔بلکہ اسلام تو ہر انسانی جان کو قابل احترام قرار دیتا ہے یہی وہ تعلیمات تھیں جس نے اسلام کو دنیا کے ہر کونے میں پہنچایا اور اگر ملک اور حکومتیں بزور شمشیر بھی فتح ہوئے تو دل حسن سلوک سے ہی فتح ہوئے ۔ حضرت داتا گنج بخش، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت شاہ رکن عالم

حضرت پیر بابا بونیری، حضرت کاکا صاحب ، حضرت عبداللہ غازی اور سینکڑوں ایسے نام آج بھی قابلِ صد احترام ہیں یہی حال دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہے جہاں یہ بندگانِ خدا اُس کا پیغام لے کر پہنچے اور انسان کو بحیثیت انسان وہ عزت و تکریم دی کہ وہ خود اس دین کی پناہ میں آتے گئے۔ لیکن دکھ اور افسوس کا مقام ہے کہ اس سب کچھ کو تسلیم کرنے کے باوجود اسلامی معاشروں میں عدم برداشت اور مسلکی عدم رواداری کا رجحان خطرناک حد تک بڑھ رہا ہے جس پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے سب سے اہم اور بڑا کردار علمائے کرام کو ادا کرنا ہوگا کیونکہ ہمارے معاشرے اور مذہبی معاملات میں جو اہمیت اِن کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں۔ اس کام کے لیے آج بھی مسجد کو جس کامیابی سے استعمال کیا جا سکتا ہے کسی دوسرے پلیٹ فارم کو نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال دوسرے مذاہب کے بارے میں ہے کہ جب تک یہ علمائے عام لوگوں میں رواداری کو فروغ نہیں دیں گے تب تک کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن دُکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ یہاں سارا زور خود کو یا اپنے پیر و مُرشد کو بڑا عالم ثابت کرنے پر ہے۔ اس کی ایک حیرت انگیز مثال سے اس وقت سامنا ہوا جب ایک مشہور اور انتہائی قابلِ احترام مترجم قران کے ترجمہ شدہ نسخہ کے آخر میں مترجم اور ترجمہ کے بارے میں ایک نوٹ پڑھا جس میں آدھا درجن دوسرے مترجمین کو باقاعدہ نام لے کر اور غلط کہہ کر اور ان کے ترجمے کو غلط قرار دیا گیا ہے اور ان پر من و عن اِن الفاظ میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ

انہوں یہ ترجمہ کرکے ایمان کے تابوت میں کیلیں ٹونک دیں ہیں جب کہ یہ فرق صرف الفاظ کا ہے یا انداز کا ترجمہ میں کوئی فرق نہیں اور یہ سارے مترجمین انتہائی مستند سمجھے جاتے ہیں اور اِن کے تراجم ، حواشی یا تفاسیر کے بے شمار نسخے گھر گھر میں موجود ہیں اور ان تراجم کو پڑھنے سے کوئی ایسا تاثر نہیں ابھرتا کہ ایمان تابوت میں بند ہوجائے ۔ میں مفسر قران یا عالم قران ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتی اور نہ ہی ہوں لیکن اِن میں سے ایک دو تراجم کو میں بھی پڑھ چکی ہوں کسی بھی غلط تاثر کے بغیر۔ الفاظ کا چناؤ یقیناً احتیاط کا متقاضی ہے لیکن کسی کے ایمان پر حملہ کرنے کا یہاں کوئی جواز نہیں۔ اسی طرح کے تاثرات جب ہمارا کم پڑھا لکھا طبقہ پڑھتا ہے تو ان کے لیے طالبان کا روپ دھار لینا انتہائی آسان ہوجاتا ہے۔ اگرچہ طالبان کے زیر اثر علاقوں کے پڑھے لوگ بھی اس بارے میں مشکوک ہیں کہ یہ ساری کارستانی کم از کم مقامی لوگوں کی نہیں ۔ پاراچنار سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان نے بتایا کہ قطع نظر ان کے فرقے اور مسلک کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پختون ، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے لیکن کرم ایجنسی میں ایسا ہورہا ہے تو پھر یہ کون ہیں اگرچہ یہ ایک سوالیہ نشان ضرور ہے تاہم الزام دوسرے کے سر تھوپ کر ہم بری الذمہ نہیں ہوسکتے کیونکہ ان صنم خانوں کو کارندے اہل کعبہ کے اندر سے ہی مل رہے ہیں جو لمحہ فکریہ بھی ہے اور باعثِ افسوس بھی ۔ معاملہ صرف یہاں تک محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک ہی فرقے میں صرف مختلف مکاتبِ فکر

کے درمیان بھی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر مختلف زبانوں بلکہ علاقوں کے درمیان بھی ہے۔ مسئلہ تشخیص کا نہیں کہ وہ سب جانتے ہیں بلکہ مسئلہ ان تمام عدم رواداریوں سے نجات پانے کا ہے اور یہ ذمہ داری معاشرے کے ہر پڑھے لکھے فرد کی ہے ورنہ اس دنیا میں ہم اپنے دین کی جس سبکی کا باعث بن رہے ہیں روزِ قیامت ہمیں اس کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا کہ جس دین کو رب العالمین نے عالمِ انسانیت کے دل ملانے کے لیے بھیجا تھا ہم میں سے کچھ نے اس دین کا نام لیکر خود اپنے ہی اندر دیواریں کھڑی کیں، کچھ نے ان دیواروں کو اونچا کیا اور کچھ باوجود اس صلاحیت کے کہ وہ ان دیواروں کو گرا سکتے تھے اپنی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کرتے رہے۔ اگر دین پر عمل کرنے کی بات ہے تو اس کے لیے جان سے گزر جانا بھی باعث فخر ہے مگر، اگر دین کو مسخ کرکے اپنی طالبانی اور خوارج قسم کی شریعت بنانی ہے تو ہم دین مصطفوی کے مجرم ہیں کہ وہ دین جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے خود تفرقہ اُس دین میں اب آکے پڑا ہے۔ آج اگر لبنان میں سُنی اور علوی برسرپیکار ہیں تو کیا وہ اسرائیل کے خلاف سرخرو ہونے کی طاقت اور صلاحیت رکھ سکیں گے۔ اسی طرح پاکستان اگر انہی مسائل میں الجھا رہا تو یہ مان لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ ایٹمی قوت ہمیں دوسروں کے حملے سے تو بچالے گی تباہی سے نہیں کیونکہ ہم دین، فرقے، مسلک، مکتبہ فکر، زبان، علاقے اور نجانے کن کن بنیادوں پر تقسیم ہو کر ایک ایسے گڑھے کی طرف جارہے ہیں جس میں سے ہماری بازیابی مشکل ہی نہیں بلکہ

ناممکن ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایمان پیدا

پاکستان کا بننا ایک معجزہ تھا۔ حقیقتاً ایک معجزہ کہ آٹھ دس کروڑ مسلمانوں نے اپنے سے کئی گناہ زیادہ ہندوئوں اور اپنے وقت کی سپر پاور تاج برطانیہ جس کا سورج نصف النہار پر چمکتا ہی رہتا تھا کو شکست سے دو چار کیا اور بے ملک و بے وطن مسلمانوں کو ایک نام اور نشان ملا، پائوں رکھنے کو زمین اور سر چھپانے کو نیلگوں چھت میسر آئی اپنی زمین اور اپنا آسمان۔ اگرچہ یہ دنیا کے کسی بھی خطے کے رہنے والوں کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی حق تھا کہ وہ آزاد ملک میں اور اپنی زمین پر سانس لے سکیں لیکن بھارت نے اس نئی مملکت کو کسی طور قبول نہ کیا اور اس کے وجود میں آتے ہی اس کے خلاف کھلی جارحیت کا مرتکب ہوا۔ کشمیر پر بھارت کا قبضہ ،پاکستان پر پانی کی بندش، اس کے اثاثوں کی روک، اس پر لٹے پٹے مہاجرین کا بے اندازہ بوجھ ، غرض ہر طرح سے اس نوزائیدہ مملکت کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی گئی لیکن صرف اور صرف اس کے عوام کا جذبہ ایمانی تھا جو اس ملک کی حفاظت کرتا رہا۔ اور صرف ایک کلمے کی برکت تھی جس نے اس وطن کے ہر محافظ کو وہ زور بازو اور قوت عطا کی جس نے چھ ستمبر 1965 کے دن اُسے سرخرو کیا۔ دشمن تو اپنی فتح کے جشن کا پروگرام بھی مرتب کر چکا تھا لیکن اُسے دوپہر کا کھانا لاہور میں تو کیا خود بھارت کے اندر اپنے میس میں

بھی کھانا نصیب نہیں ہوا اور وہ جس بھگدڑ اور افرا تفری کا شکار ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے ۔ سترہ دنوں کی اس جنگ میں کبھی عزیز بھٹی کے ہاتھوں ، کبھی ایم ایم عالم ، کبھی رفیقی، کبھی شامی اور کبھی سیلسل چودھری کے ہاتھوں ہزیمت اٹھاتا رہا۔ ہماری لڑتی ہوئی فوج کا ہر سپاہی تو اپنی بندوق اور وردی کی لاج رکھتا ہی رہا اور آخری گولی اور آخری قطرے تک لڑنے کے عزم کو نبھاتا ہی رہا لیکن ساتھ ہی عوام نے جس ذمہ داری، ایثار اور جذبے کا ثبوت دیا وہ اپنی مثال آپ تھا اور ہے ،اور فوج کے پیچھے یہی عوامی طاقت تھی جس نے اُسے سرخرو کیا۔ کہنے والے کہتے ہیں عورتیں اپنا زیور، بچے اپنے غلے، جوان اپنا خون، تاجر اپنا سامانِ تجارت، گھردار اپنا راشن لے لے کر آتے رہے اور وطن اور اس کے جانثاروں پر نثار کرتے رہے اور یوں چراغ روشن رہا اور جلتا رہا اور کامیابی اور فتح مندی ان کا مقدر بنتی رہی ۔ لیکن آج بھی ہم سے یہ کہتے ہیں فضا کے تیور، ہر گھڑی چوکس و چوبند و خبردار رہو کیونکہ کفر کی طاقتیں آج بھی ہمیشہ کی طرح آمادہ کشر ہیں بلکہ حملہ آور بھی اور اب کا حملہ اس کھلے حملے سے زیادہ خطرناک ہے جو چھ ستمبر 1965 کو ہوا تھا۔اب کی بار دشمن نے دوسرا طریقہ کار اپنایا ہے اس نے ہماری بنیادوں میں پانی دیکر اُن کو کمزور کرنا شروع کیا ہے کہ دیوار خود بخود گر پڑے اور اپنے کارندے اُس نے خود ہمارے اندر سے نکالنے شروع کیے ہیں بس دکھ یہی ہے کہ آج وہ جذبہ مفقود ہے جو آج سے سنتالیس اڑتالیس سال پہلے تھا۔ آج جنگ چومکھی ہے حملہ

ثقافتی بھی ہے، اخلاقی بھی، اقتصادی بھی، نظریاتی بھی اور کھلی دہشت گردی بھی جس کے ذریعے پاکستان کا گھیراؤ کیا گیا ہے لہٰذا آج ہمارا دفاع بھی حملے کے مطابق کثیرالجہتی ہونا چاہیے ۔ لیکن ایمانداری سے سوچیے کیا ہم ایک بھی حملے کا جواب سنجیدگی سے دے رہے ہیں ۔ ثقافتی اور نظریاتی حملے کو ہم خود اپنی ثقافت کو دفن کرکے اور نظریے کی نفی کرکے کامیاب بنا رہے ہیں ۔ ہم نے اپنا لباس یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ آج کے گلوبل ویلج میں دوسرے کا اثر نہ لینا ناممکن ہے لیکن سوچیے ہم خود اثرانداز ہونے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔ ہم خود مسلکی جھگڑوں اور فرقہ واریت میں پڑ کر ''ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں ایک ہندو دوسرے مسلمان یعنی صرف مسلمان ''کی نفی کرکے اپنے نظریے کو کمزور کر رہے ہیں اور کچھ لوگ تو بہانگ دہل اس کی تضحیک کرکے اس کا انکار کر رہے ہیں۔ ہمیں اتنے محاذوں پر الجھا دیا گیا ہے کہ ہم آپس میں ہی برسرپیکار رہیں کہ نہ اقتصادیات کی طرف توجہ دے سکیں نہ معاشیات کی طرف اور نہ ہی ترقی کی دوڑ دوڑ سکیں، وقت ہمیں آگے لے جانے کی بجائے پیچھے دھکا دے رہا ہے ۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ نہ کوئی جوہر ہے نہ اقبال اور نہ جناح جو قوم کی نیّا پار لگا دے لیکن ایک امید اب بھی ہے جو قوم کی توانائی بحال کرنے کو کافی ہے اور وہ ہے کہ '' مایوسی گناہ ہے'' یہ نہ رب کو پسند ہے نہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو۔ اور یہ یقین کہ آج بھی ہماری یہ آگ گل و گلزار ہو سکتی ہے بات ایمانِ براہیمی کی ہے انداز گلستان خود

بدل جائیں گے۔ اگرچہ ستمبر 1965 کو ہم سترہ سال کی کچی عمر میں دشمن کو ناکوں چنے چبوا سکتے تھے تو آج ہم تجربات کی بھٹی میں اتنے کندن بن چکے ہیں کہ اب نا خالص مادے کی پہچان آسان ہونی چاہیے اور دفاع وطن کا تجربہ بھی پختہ ہونا چاہیے آج حملے کی نوعیت کے مطابق ہر فرد قوم کو سپاہی بننا پڑے گا۔ اپنا اپنا میدان جیتنے کے لیے سر دھڑ کی باری لگانی ہوگی۔ سرحدوں کی حفاظت تو فوج کی ذمہ داری ہے وہ خندقیں خون سے بھر کر بھی اسے ناقابل عبور بنا دے گی لیکن جنگ ملک کے اندر بھی ہے جس کے لیے حکومت کے انداز کو خدمت میں بدلنا ہوگا اور عوام کے انداز کو جہاد میں۔ اپنے اپنے میدان میں جہاد، اپنے اپنے معرکے میں فتح اور پھر یہ تمام فتوحات پاکستان کی جھولی میں ڈال دینا ہوں گی تو پھر تو شکست اور ہزیمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قومیں انہی قربانیوں کے سہارے عظیم بنتی ہیں انسانی جسموں سے نکلا ہوا پسینہ اس کے کھیتوں کو سینچتا ہے بالکل اُسی طرح جس طرح انسانی رگوں کا خون اُسے ناقابل تسخیر بناتا ہے۔ یوم دفاع پاکستان منانا اپنی جگہ اہم ہے لیکن دفاع پاکستان اُس سے بڑھ کر اہم ہے اور اگر یوم دفاع تجدید عزم اور تکمیل عزم کے ساتھ منایا جائے تو ہی کچھ حاصل ہے ورنہ یہ ساری مشق لاحاصل ہی رہے گی اور ہم آزادی کے پینسٹھ سال بعد ایسی لاحاصل مشقوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اظہارِ رائے کی آزادی یا دہشت گردی

میری جان بھی قربان ہو اُس ذات پر جس کی محبت ماں باپ، اولاد اور دنیا کی ہر محبت سے بڑھ کر عظیم ہے اور ہر مسلمان کے لیے باعث عزت اور باعثِ افتخار ہے جس کے نام پر ہر مسلمان کٹ مرنے کے لیے تیار ہے جس کے نام کی حرمت بعد از خدا کائنات میں سب سے زیادہ ہے اور جس کی محبت مومن کے ایمان کا حصہ ہے۔ یہی محبت اور جانثاری ہے جو غیر مسلم دنیا کو بے چین رکھتی ہے کہ آخر وہ کون سی قوت ہے جو مسلمان کو اس جذبے سے سرشار رکھتی ہے کہ وہ اپنے نبی Öکے نام پر جان سے گزر جاتا ہے۔ یہی تعصب اور اسلام دشمنی ہے جو کبھی ایک صورت میں اور کبھی دوسری شکل میں ابھر ابھر کر آتی ہے کبھی نعوذباللہ ڈرا محمد Ö اور کبھی قرآن کو نذر آتش کرنے اور کبھی آپ Ö پر تضحیک آمیز فلم کی صورت میں۔ لیکن صد شکر کہ یہ سب مسلمانوں کے ایمان کو مزید پختہ کر دیتا ہے۔

مغرب جو مسلمانوں کو متعصب ، تنگ نظر، بنیاد پرست اور دہشت گرد کہتا ہے خود اِن تمام خصوصیات کا مکمل مظہر ہے اگر اُسامہ بن لادن مغرب کو انتہائی مطلوب تھا کیونکہ وہ ان کے خلاف دہشت گردی کرتا تھا تو کیا ٹیری جونز اس سے کم درجے کا دہشت گرد ہے یہ تو مسلمانوں کی جان سے بھی کھیلتا ہے ان کے

جذبات سے بھی اور ان کے دین سے بھی اور مسلمان جان اور جذبات کی قربانی اگر خوشی خوشی دیتا ہے تو دین کی خاطر لیکن جب اُس سے دین کی قربانی مانگی جائے تو وہ مانگنے والے کی جان لینے اور اپنی جان دینے سے دریغ نہیں کرتا یہ بات اہل کفر بھی جانتے ہیں تو کیا یہ حرکات کرکے وہ خود دہشت گردی نہیں کر رہے ۔وہ اسلامی دنیا سے تو مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے مجرم ان کے حوالے کر دیئے جائیں تو اُن تک بھی مسلمانوں کا یہ مطالبہ پہنچ جانا چاہیے کہ نکولا بسلے اور اس کے ٹولے کے تمام دہشت گرد مسلمانوں کو انتہائی مطلوب ہیں کیونکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا خاتمہ ان دہشت گردوں کے خاتمے کے ساتھ ہی منسلک ہے۔ یہ کوئی جذباتی بات نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس مسئلے کا حل نکل آنا چاہیے اور اس بات کا جواب بھی آ جانا چاہیے کہ اہل مغرب اور حاکمانِ مغرب جو خود کو انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار کہتے ہیں وہ دوسرے مذاہب خاص کر اسلام کے ماننے والوں کو انسان ماننے کو تیار نہیں وہ کتے، بلی کے حقوق کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن مسلمان کے نہیں تو وہ دنیا میں امن کی توقع کیسے رکھتے ہیں۔
اس وقت مسلمان ممالک جن مسائل سے دوچار ہیں،اور جو اکھاڑ پچھاڑ یہاں پر جاری ہے اس تمام معاملے کے پیچھے امریکہ اور اس کے حواریوں کا ہاتھ ہے اور اس کے لیے سالہاسال تک اِن کی منصوبہ بندی جاری رہتی ہے ۔مسلمانوں کی نا اتفاقی اور آپس کے جھگڑے ان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔آج بھی اگر مسلمان باہمی رنجشیں بھلا دیں تو وہ دنیا

کی سب سے بڑی طاقت بن جائیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں متحد ہونے ہی نہیں دیا جاتا اور یوں دشمن کا ہر منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔اِس طرح کے مکروہ واقعات پر جس طرح مسلمان دنیا متحد ہو جاتی ہے اگر یہی جذبہ باہم موجود رہے تو نہ تو کوئی ٹیری جونز رہے نہ مولی نورس اور نہ نکولا بسیلے۔

جہاں تک مغرب کا یہ کہنا ہے کہ وہ اظہار رائے کی آزادی پر پابندی نہیں لگا سکتے اس لیے نہ تو وہ ڈنمارک کے اخبارات نہ ان بیہودہ فلموں اور نہ قرآن پاک کی بے حرمتی پر پابندی لگائیں گے لیکن یہی امریکہ اپنے ملک کے خلاف صحافتی مواد پر بھی پابندی لگا دیتا ہے، اپنے خلاف زبانی کلامی بات کرنے والوں کو بھی مجرم قرار دے دیتا ہے، اندازوں اور تصورات کی بنا پر عراق پر حملہ آور ہوتا ہے، ایک اسامہ کے پیچھے پورے افغانستان پر کارپٹ بمباری کر دیتا ہے لیکن مسلمانوں کے مجرموں کو مکمل تحفظ دیتا ہے۔ مسلمان ملکوں میں کسی غیر مسلم کے ساتھ ایک معمولی سا واقعہ بھی پیش آئے تو اسے انسانی حقوق یاد آ جاتے ہیں اور اس واقعے کو فوراً پورے ملک اور پوری قوم کو سزا دینے کا جواز بنا لیتے ہیں۔ یہ مسئلہ واقعی بہت بڑا ہے اور امریکہ کا یہ کہنا کوئی جواز نہیں رکھتا کہ ان واقعات میں ان کی حکومت ملوث نہیں بلکہ یہ انفرادی یا کسی گروہ کے افعال ہیں کیوں وہ چھوٹی سے چھوٹی حرکت پر بھی کسی اسلامی ملک کو ہلا کر رکھ دیتا ہے

۔

آج کل ان واقعات میں جو تیزی آئی ہے وہ انتہائی قابل تشویش ہے اور ان پر مسلمانوں کا رد عمل فطری ہے اور مغرب یہ جانتا بھی ہے لیکن اِن کے سدباب کے لیے کوئی اقدام نہیں اٹھا رہا۔ مسلمان ممالک میں بھی کچھ روز ہنگامے ہوتے ہیں احتجاج کیا جاتا ہے اپنے ہی ملکوں میں توڑ پھوڑ ہوتی ہے حکومتیں بے حس رہتی ہیں اور عوام دلبرداشتہ ہو کر قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ وہاں مغرب اس تباہی پر خوش ہوتا ہے اور یہاں مظاہرین اور پولیس ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں، اور ابھی ایک مسئلے کا حل نہیں نکلتا کہ دوسرا واقعہ ہو جاتا ہے ۔ ان واقعات کو روکنا صرف عوام کے بس کی بات نہیں بلکہ اسے پوری امت مسلمہ کو حل کرنا ہوگا۔ معدنی تیل کی جو دولت مسلمانوں کو میسر ہے اسے بطور ہتھیار استعمال کیا جانا چاہیے مسلمان ممالک جو امریکی، یورپی اور مغربی ممالک کی بہت بڑی منڈیاں ہیں اِن کی اشیائ کا بائیکاٹ انہیں جس تجارتی خسارے سے دوچار کرے گا جو معاشی جھٹکا لگائے گا وہ انہیں اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کر دے گا۔ بات صرف غیرت ، حمیت اور احتجاج کو درست سمت فراہم کرنے کی ہے اور یہ بھی کہ احتجاج حکومتی سطح پر بھی ہو اور مغربی حکومتوں کو بہر صورت مجبور کیا جائے کہ وہ ایسی حرکات کرنے والوں کو یا تو خود سخت سزا دے یا انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ اگر وہ اور ان کا پوپ تک ہمارے قوانین (توہین رسالت) کی تبدیلی کا مطالبہ کر سکتا ہے تو ہم ان کے آزادی اظہار

رائے کے قانون میں یہ شق شامل کرنے کی بات کیوں نہیں کرتے کہ دوسرے قرآن پاک اور اکابرین اسلام کے خلاف بات ،ö مذاہب اور خاص کر اسلام ،رسول کرنے والوں کو قابل سزا قرار دیا جائے اور انہیں سزا دی جائے ورنہ وہ یہ خاطر جمع رکھیں کہ جسے وہ دہشت گردی کہتے ہیں اور مسلمان جہاد یعنی کوشش، کفر اور ناحق کو مٹانے کی کوشش اور حق کو پھیلانے کی کوشش مزید پھیلے گیا اور کامیابی بالآخر حق کی ہوتی ہے۔

پاکستانی عوام بنام حکومتِ امریکہ

مغرب اور یہود وقتاً فوقتاً مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرتے رہتے ہیں ۔ پیغمبرِاسلام محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ان کا تعصب کبھی ایک اور کبھی دوسری صورت میں نکلتا رہتا ہے اور مغربی حکومتیں انہیں آزادی اظہار رائے کا نامعقول جواز فراہم کرکے نہ صرف چھوڑتی جاتی ہیں بلکہ ایسا کرنے والوں کو کسی بھی ممکنہ خطرے کے پیش نظر انتہائی سخت سیکیورٹی فراہم کرتی رہتی ہیں۔

گزشتہ کچھ سالوں سے اِن گستاخانہ واقعات میں جو تیزی آئی ہے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک عام سا احتجاج ہوتا ہے اور کچھ دنوں میں بات ختم ہو جاتی ہے ۔نہ ہی ہیومن رائٹس والے چیختے جنگھاڑتے ہیں اور نہ مسلمان حکومتیں اپنی مدہوشی سے عالم ہوش میں آتی ہیں اور مغرب جو خود کو دنیا کا اَن دَاتا سمجھتا ہے اور ہماری حکومتیں اور کچھ بزعم خود دانشور بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ ان کی مدد کے بغیر ہم کیسے زندہ رہیں گے اور یوں دنیا پر دین کو قربان کردیا جاتا ہے لیکن خوش قسمتی کہ اس بار حکومت پاکستان نے حکومتی سطح پر احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے یومِ عشقِ رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلممنانے کا اعلان کیا۔ اور ساتھ ہی احتجاج کو پرامن رکھنے کی اپیل بھی کی جاتی رہی کیونکہ جہاں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف بات کی جائے وہاں مسلمان کا مشتعل ہوجانا فطری امر ہے۔یوم عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے جہاں غیر مسلموں کو مسلمانوں کا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے لیے سر کٹانے کے جذبے سے آگاہ کیا وہاں کچھ ناخوشگوار واقعات بھی ہوئے ،کچھ قیمتی جانیں بھی تلف ہوئیں ،املاک کو نقصان بھی پہنچایا گیا، بینک بھی لوٹے گئے اور بہت کچھ ایسا بھی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ احتجاج نہیں ہونا چاہیے تھا جیسا کہ امریکہ بہادر کی سکریٹری آف سٹیٹ ہیلری کلنٹن کا بیان آیا کہ مظاہروں کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ بقول انکے اس فلم سے حکومت امریکہ کا کوئی تعلق نہیں، مان لیا نہیں ہوگا لیکن کیا ان تین مردود اشخاص کو امریکی تحفظ حاصل نہیں جنہوں نے یہ گھناؤنی دہشت گردی کی۔ اور ساتھ ہی محترمہ نے یہ دھمکی بھی دی کہ تشدد کو کسی صورت.برداشت نہیں کیا جائے گا۔ بالکل مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ دہشت گردی کو ہرگز.برداشت نہیں کیا جائے گا اور ایسے تمام دہشت گرد دنیا میں اُس نفرت کے ذمہ دار ہیں جو شدت پسندی کو پیدا کرتی ہے۔ اوبامہ ہیلری اور ان کے قبیلے کے اور دہشت گرد اگر کبھی خود دنیا کے امن کو تباہ کریں گے یا اس میں مددگار ہونگے تو ظاہر ہے وہ اپنے خلاف جذبات کو روک نہیں سکیں گے پھر چاہے لیبیا میں ان کا سفیر قتل ہو یا

پاکستان میں ان کے سفارت خانے اور قونصل خانوں پر حملوں کی کوشش ہو سب جائز قرار دیا جائے یہ بھی اظہار رائے ہی ہے کہ وہ آپ سے نفرت کا اظہار کریں۔ جب آپ کی طرف سے دہشت گردی رک جائے گی تو ادھر سے بھی امن ہو جائے گا۔

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اپنا احتجاج زیادہ سے زیادہ با اثر بنانے کی ضرورت ہے ہم ان کے خلاف نعرے لگائیں ،اپنے ہی املاک کو نقصان پہنچائیں تو ان کا کچھ نہ بگاڑ پائیں گے۔ میں سڑکوں پر نکلنے کی ہر گز خلاف نہیں بلکہ معذرت مگر اس کی حامی ہوں مگر توڑ پھوڑ اور وہ بھی غریب دکان داروں کی دکانیں ، بینک لوٹنا پٹرول پمپ لوٹنا یہ کسی طرح کا موثر احتجاج نہیں موثر احتجاج تو تب ہوگا جب ہم ایسے لوگوں کی سرپرستی کرنے والی حکومتوں کو نقصان پہنچائیں وہ اگر اتنی دیدہ دلیر ہیں تو صرف اپنی ترقی معیشت اور دولت کے بل پر تو کیوں نہ ہم انہیں یہیں پر مار دیں انکی مصنوعات کا، بائیکاٹ کر دیں ، کم از کم اُنہیں مصنوعات کا جو ایک ایس ایم ایس کے ذریعے گردش کر رہی ہیں لیکن وہ ہمیں پیپسی ، لیز اور اس فہرست میں شامل اشیائ کا نشئی بنا چکے ہیں یوں ان کی معیشت ترقی یا فتگی اور ہماری ترقی معکوس پر گامزن ہے۔

ہمارا الیکٹرانک میڈیا جو چاہے ثقافت کی دھجیاں بکھرے چاہے دین کی ، کو صرف

اپنی آمدن اور نفع سے سروکار ہے یوم عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب پورا ملک امریکہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا بلکہ اُسکے سفارتخانوں اور قونصل خانوں پر حملہ آور ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ اوبامہ اور ہیلری کے بیانات معاوضتاً Paid کے طور پر نشر کر رہا تھا اور یو ایس ایڈ کے اشتہارات بھی اور ساتھ ہی یہ بھی (Add) فرمارہا تھا ''ہمیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیار ہے'' یہ دوہرا معیار عوام کے مزید غصے کا باعث بن رہا تھا۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیار ہے تو اس طرح ان کے مخالفین کو نقصان پہنچاؤ کہ کم از کم ایک دن کے لیے ان اشتہارات مت دو۔ ان کے چینلز بند کر کے انہیں نقصان پہنچاؤ جب عوام دیکھیں گے کہ ان کا غیض و غضب وہاں پہنچ رہا ہے تو وہ پتھر نہیں اٹھائیں گے اور گولیاں نہیں کھائیں گے ۔ اگر اسی دن کی طے شدہ پاک امریکہ ملاقاتیں موخر کر دی جاتیں تو عوام حکومتی املاک کو توڑ پھوڑ کر اپنی ناراضگی نہیں دکھاتے۔ اس دن صرف احتجاجی مراسلہ کافی نہیں تھا نیٹو سپلائی کو دھمکی کے طور پر استعمال کیا جاتا تو کچھ ہاتھ آتا۔

اگر بی بی عاصمہ جہانگیر، محترمہ فرزانہ باری، قابل احترام ثنا بُچہ اور اقلیتوں کے حقوق پر اپنے مغربی دوستوں کی خاطر چیخ اٹھنے والے ہمارے اینکرز اس معاملے پر بھی کچھ بول ہی لیتے تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہنچتی کہ انیس

افراد مارے جائیں۔ یہاں یہ واضح کرتی چلوں کہ میں بھی تمام پاکستانیوں اور مسلمانوں کی اکثریت کی طرح اقلیتوں کے حقوق کی بڑی علمبردار ہوں اور میرے لیے اِن واقعات میں جانوں کے ضیاع کے ساتھ ایک چرچ کا نذر آتش ہونا سب سے زیادہ افسوس ناک تھا جس کی حفاظت ہمارا دینی فریضہ تھا لیکن ہم اسے ادا نہ کر سکے اور اس کے لیے ہم اللہ کے آگے جوابدہ ہونگے۔

ایک لنکر نے یہ فرمان بھی جاری کیا کہ ستاون مسلمان ممالک میں پاکستانی ہی سب سے زیادہ ناراض کیوں؟ اور یہاں پر ہی چھٹی کیوں اور دن منانے کا اعلان کیوں؟ تو کیا اگر چھپن ممالک نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت و حرمت پر سمجھوتہ کر لیا ہے تو ہم بھی کرلیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہے بھی نہیں لیبیا میں جو کچھ ہوا شاید اُس سے یہ ''باخبر لنکر'' بے خبر تھیں اور مصر اور تیونس کے حالات بھی اِن سے پوشیدہ تھے پاکستانی تو شاید زیادہ گراں خواب تھے کہ دیر سے بیدار ہوئے۔

ایک محترم سیاسی لیڈر نے زخموں پر یوں نمک پاشی کی کہ ہم نے آخر اس معاملے کو اتنی اہمیت کیوں دی اور ہم نے ان فلم سازوں کو کروڑ پتی بنا دیا، تو کیا ہم پہلے کی طرح دیکھتے جائیں اور وہ کرتے جائیں۔ ہمارے ماں باپ کو کوئی گالی دے تو ہم جان سے گزر جاتے ہیں تو پھر یہ دعویٰ کیسے کہ کہ حرمت رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں اپنے ماں باپ سے بڑھ کر عزیز ہے۔

کاش ہمارے یہ انسانی حقوق کی باتیں کرنے والے، ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے حقوق کی بات کرنے سے کچھ نام کما سکتے تو کما چکے ہوتے اور عوام ہاتھوں میں ڈنڈے اور پتھر نہ اٹھاتے اور پھر اگر عوام نکل ہی آئے تھے تو انہیں نکالنے والی جماعتیں اور ان کے لیڈر ان کے ساتھ ہوتے تو نقصان شاید کم ہوتا۔

حکومت کا اعلان کردہ یوم عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گزر گیا لیکن مغرب یاد رکھے کہ مسلمان کے لیے ہر دن یوم عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اگر ان کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو ان کو روکنے کی بات بیکار ہوگی۔اوبامہ اور ہیلری ہمیں منہ زبانی یہ نہ بتائے کہ وہ تمام مذاہب کا احترام کرتے ہیں ہمیں ثبوت چاہیے جس طرح شہزادہ ہیری اور کیٹ کی قابل اعتراض تصاویر یوٹیوب سے ہٹائی گئیں اسی طرح گوگل اور یوٹیوب سے یہ فلم ہٹا دی جائے اور جس طرح ہولوکاسٹ کی بات کرنے کو قابل سزا قرار دیا گیا اسی طرح ان ملعون اشخاص کو بھی سزا دی جائے نہیں تو انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دے بالکل اسی طرح جس طرح وہ القاعدہ والوں کی حوالگی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے منواتا ہے مسلمانوں کے مجرم مسلمانوں کو دے دیئے جائیں اور یہ فرمان بھی نہ جاری کیا جائے کہ شدت پسندی برداشت نہیں کی جائے گی اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ

کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا آگے کردو یہ آپ کی تعلیمات ہیں اور ان کی رو سے آپ کو خود پر حملہ کرنے والوں کی پذیرائی کرنی چاہیے اگر تم لوگ دہشت گردی کروگے تو اس کا جواب بھی پاوگے۔ ہم مسلمان تو علی الاعلان کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی شان میں گستاخی کرنے والا قابل قتل ہے اور ظاہر ہے جہاں یہ لوگ مسلمانوں کو دستیاب ہونگے تو ان کی حفاظت پورے مغرب کے لیے بھی ناممکن ہو جائے گی۔

بھارت میں آزادی کی تحریکیں

ہندوستان کہنے کو تو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہاں سب امن ہے اور نہ ہی قومی یکجہتی ۔ جتنا بڑا ملک اتنے بڑے مسائل لیکن ہمارے ہاں کچھ لوگ یہ تاثر دینے کی کوشش میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں کہ بھارت میں ایسا کچھ نہیں جبکہ آج بھی وہاں دو درجن سے زیادہ آزادی کی زندہ تحریکیں موجود ہیں جن سے بھارت کے 200 سے زیادہ اضلاع متاثر ہیں ۔ شدید ترین متاثرہ علاقوں میں سے آسام کی ریاست بھی شامل ہے اور یہاں اکثر اوقات حکومت اور باغیوں میں جھڑپیں جاری ہی رہتی ہیں لیکن ہمارے میڈیا کی چونکہ تمام تر توجہ اپنے ملک میں چلنے والی غیر حقیقی تحریکوں پر رہتی ہے الہذا یہ خبریں پاکستانیوں تک پہنچ پاتی ہے اور نہ ہی باقی دنیا تک۔ ابھی حال ہی میں ان تازہ جھڑپوں میں وہاں 78 افراد مارے گئے آسام میں تین لاکھ لوگ کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں جبکہ اس کے چار اضلاع میں کسی بھی مشکوک شخص کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہے۔ تین کروڑ کے اس علاقے میں لوگ انتہائی غریب ہیں جبکہ علاقہ معدنی ذخائر اور چائے کی دولت سے مالا مال ہے لیکن مقامی باشندوں کا کہنا ہے کہ اس دولت میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور یہ بھارت کے دیگر علاقوں کی ترقی پر خرچ ہو رہا ہے۔ سیکیورٹی فورسز کی تازہ جھڑپیں بوڈوز کے ساتھ ہوئیں جو کہ

سالہا سال سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور اسی لیے بدترین سیاسی تشدد اور ریاستی دہشت گردی کا شکار ہیں اور کیمپوں کو گھر سے بہتر سمجھ رہے ہیں۔ آسام کوئی اکیلا صوبہ نہیں جو علیحدگی کا مطالبہ کر رہا ہے یہی مطالبہ جھارکنڈ، ناگالینڈ، سکم، گجرات اور سب سے بڑھ کر کشمیر کے لوگوں کا ہے۔ یہاں تک کہ خالصتان کی تحریک جسے بظاہر تو 1984 میں کچل دیا گیا تھا اب تک کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہے اور انٹرنیٹ پر اس کا جھنڈا اور مواد اب بھی موجود ہے یعنی سوچا جائے تو یہ لوگ بھی وقت کے انتظار میں ہیں اور موقع پاتے ہی یہ تحریک پھر موثر ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھارت میں جو تحریکیں بڑے زور و شور سے چل رہی ہیں ان میں ایک جھارکنڈ بھی ہے اس صوبے میں پچھلے دنوں 560 بارودی سرنگیں پکڑی گئیں ہیں ظاہر ہے اُس کو بچھانے والے دہلی کے دوست تو نہیں تھے یقینا وہ اُن فوجیوں کے لیے تھیں جو ان صوبوں میں کسی بھی شخص کو گولی مار دیتے ہیں ۔ بھارتی حکومت نے 2006 میں نکسلائٹ تحریک کو بھارت کی یکجہتی کے لیے سب سے بڑا اندرونی خطرہ قرار دیا جو کم از کم نو صوبوں میں عملی طور پر برسرپیکار ہیں جن میں کرناٹک، اڑیسہ، چھتیس گڑھ، آندھراپردیش، مہاراشٹرا، جھارکنڈ، بہار، اترپردیش اور مغربی بنگال شامل ہیں بھارتی حکومت نے 2011 میں دعویٰ کیا کہ یہ تحریک 180 اضلاع سے گھٹ کر 80 اضلاع تک محدود ہو گئی اور ان کی کاروائیوں میں بھی پچاس فیصد کمی آئی ہے جبکہ سنٹرل ریزرو فورس کے چیف وجے کمار نے اپنی ریٹائرمنٹ سے صرف دو دن

پہلے کہا کہ اِن علاقوں میں ماؤنواز نکسل باڑی اس لیے طاقتور ہیں کہ یہاں حکومت کہیں نظر نہیں آتی یہاں کی ایک نسل نے اِنہی نکسلائٹ کو اپنے معاملات طے کرتے دیکھا ہے اور یہ کہ چھتیس گڑھ کو جیتنے کے لیے انہیں یہاں کے لوگوں کے دل جیتنا ہونگے۔ انتیس ستمبر 2012 کا یہ اخباری بیان بھارت سرکار کے ان دعوئوں کی قلعی کھول دیتا ہے کہ وہ اِن صوبوں میں مرکز گریز قوتوں کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جبکہ 1967 میں بے زمین کسانوں میں زمینوں کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ایک چھوٹے سے گائوں نکسل باڑی میں اٹھ کھڑے ہونے والے اس چھوٹے سے مائو نواز گروہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ پچھلے پچیس سال سے وہ عملاً اس علاقے میں حکمران اور منتظم ہیں۔

بھارت جو دوسرے ملکوں میں حالات بگاڑنے میں بھرپور دلچسپی لے رہا ہے اگر اپنے ملک کے حالات بہتر بنانے پر اپنی توانائیاں صرف کرتا تو شاید اس کے اپنے سمیت پورا علاقہ امن میں رہتا۔ ہاں اس کی خارجہ پالیسی کی داد دینا پڑتی ہے کہ ابھی تک اقوام متحدہ کا ویسا کوئی کمشن بھارت نہیں پہنچا جیسا کہ بلوچستان میں تشریف لایا حالانکہ بھارت کے نقشے پر نظر ڈالیں تو یہ لوگ ایک بہت.بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں اور باوجود حکومتی دعوئوں کے مکمل طور پر متحرک ہیں اور اپنے مسائل سے اپنے ہی وسائل کے ذریعے لڑرہے ہیں اگرچہ بھارت کی طرف سے اکثر اوقات یہ غیر منطقی دعویٰ بھی سنائی دے دیتا ہے کہ

انہیں پاکستان، بنگلہ دیش اور چین امداد فراہم کر رہے ہیں لیکن بھارت میں کچھ سچ بولنے والے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ اندرونی طور پر پیدا شدہ اندرونی مسئلہ ہے اور صرف اور صرف وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے ہے۔ صرف چھتیس گڑھ اور جھارکنڈ میں ایک ٹریلین ڈالر کے ثابت شدہ معدنی ذخائر موجود ہیں۔ آسام چاول اور چائے کی وسیع پیداوار کے باوجود بھارت کی مجموعی معاشی ترقی سے کہیں پیچھے ہے اور محض محدود صنعتیں اسکی مرکزی حکومت کی طرف سے نظر اندازی کی غماز ہیں۔ ایک مغربی تجزیہ نگار کے تجزیے کے مطابق غربت یہاں اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے اور یہی وہ ساری وجوہات ہیں جنھوں نے بھارت کے اِن صوبوں کے لوگوں کو ہتھیار پکڑا دیئے ہیں،اور یہی بندوق بردار بھارتی ترقی اور جمہوریت کی اصل حقیقت بھی بتا دیتے ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہاں یہ سب چلتا رہے گا جب تک بھارت خاص کر پاکستان کے خلاف ہتھیاروں اور جنگی تیاریوں پر لگایا جانے والا پیسہ ان بھوکے ننگے نکسل باڑیوں کے روٹی کپڑے پر نہیں لگائے گا اور دوسروں کے گھر میں آگ لگانے پر جو دولت خرچ کی جا رہی ہے وہ اپنے لوگوں پر خرچ نہیں کرے گا۔ 40.44 بلین امریکی ڈالرز کی خطیر رقم کا دفاعی بجٹ کسی نکسل باڑی کو نہ تو کھانے کو دے سکتا ہے نہ پہننے کو اور نہ ہی ممبئی، کلکتہ، آگرہ اور دہلی میں سڑک کنارے رات بسر کرنے والے مزدور کو۔ لہٰذا یہ طے شدہ امر ہے کہ یہ ہتھیار اٹھتے رہیں گے جب تک کہ اِن لوگوں کی انسانی ضروریات پوری نہ ہونگی۔ سہولیات پر تو شاید سمجھوتہ ممکن ہو

ضروریات پر نہیں ہوتا۔

خود اپنی آگ میں جلتے تو کیا ہوتے

دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ نے جو نقصان پاکستان کو پہنچایا ہے اتنا دنیا کے کسی ملک کو نہیں پہنچایا اور یہ نقصان کسی ایک پہلو سے نہیں بلکہ کثیر الجہتی ہے یعنی جانی، مالی، معاشی اور حتیٰ کہ معاشرتی بھی۔ معاشرہ جس ذہنی خلفشار سے گزر رہا ہے اس کے اثرات عدم.برداشت سے ہی محسوس ہو جاتے ہیں لیکن یہ جنگ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی اور نقصانات اندازے سے باہر ہوتے جارہے ہیں۔ایک غریب ملک کی معیشت اس بوجھ کو اُٹھانے سے قاصر ہونے کے باوجود اس کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ایسے میں بجائے اس کے کہ بین الاقوامی.برادری اور دہشت گردی کی جنگ کا سب سے.بڑا مجرم یعنی امریکہ اس کی معیشت کو سہارا دینے کی کوشش کرتا اس کو مزید دبایا جارہا ہے اور اس جنگ کو پھیلانے کے یے مجبور کیا جارہا ہے۔ ہمارے قبائلی علاقے اور اس کے عوام جس کرب سے گزر رہے ہیں اس کا حال ان سے ہی پوچھا جا سکتا ہے کہ چند لوگوں کے کئے کی سزا انہیں کس بیدردی سے دے دی جاتی ہے اور کس طرح گیہوں سے زیادہ گھن پیس دیا جاتا ہے اور اگر بفرضِ محال ڈرون حملوں کو جائز بھی قرار دیا جائے تو کیسے دو دہشت گردوں کے ساتھ نو بے گناہ مار دیے جاتے ہیں اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ ڈرون حملے میں گیارہ دہشت گرد مارے گئے اکثر اِن میں دو چار ماہ یا دو چار سال کے بچے بھی شامل

ہوتے ہیں اور وہ پردہ دار خواتین بھی جنہیں علاج کے لیے بھی گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ وزیرستان میں اس باقاعدگی سے ہو رہا ہے کہ اب تو ہم بحیثیت قوم بھی اس کے عادی ہو چکے ہیں اور پاک فوج کو بھی اِن علاقوں میں اس طرح الجھا دیا گیا ہے کہ معاملات طول ہی پکڑتے جا رہے ہیں اور اب معاملات قابو میں ہونے کے باوجود یہ فکر ضرور دامن گیر ہے کہ فوج کے بعد حالات کیا ہونگے اور امریکہ کی فرمائش پر اگر یہی آپریشن شمالی وزیرستان میں شروع کر دیا جائے تو پھر حالات کیا ہونگے۔ اگرچہ اب تک حکومت اور فوج اس دباؤ کو برداشت کر رہی ہے لیکن ساتھ ہی یہ جملہ کہ ''پاکستان اس آپریشن کے لیے ضرورت اور وقت کا تعین خود کرے گا'' پریشان کن ضرور ہے اور لوگ سوچتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ حکومت دباؤ برداشت نہ کر سکے اور کل ہی وقت آنے کا اعلان کر دیا جائے اور ملک ایک بار پھر دہشت گردی اور دھماکوں سے گونج اٹھے۔ اور یہ بھی کہ کیا امریکہ اس کے بعد کوئی دوسری فرمائش نہیں کرے گا، ایک کے بعد دوسرے علاقے کو ٹارگٹ نہیں کرے گا اور کیا حقانی گروپ کے بعد وہ کوئی دوسرا بہانہ نہیں تراشے گا۔ جبکہ اس ساری جنگ کا واحد اور آسان حل صرف اور صرف ایک ہے کہ چونکہ امریکہ حملہ آور ہے اور ادھر آیا ہے لہٰذا وہ واپس چلا جائے کیونکہ ان گروہوں کی جنگ صاف طور سے امریکہ کے خلاف ہے۔ پاکستان بھی ان کی زد میں اس لیے ہے کہ وہ اس جنگ میں امریکہ کا معاون ہے دوسری طرف امریکہ اس پر ہر طرف سے دباؤ ڈال رہا ہے کہ

وہ اس کا یہ مطالبہ پورا کردے۔ ابھی حال ہی میں یہ حربہ بھی آزمایا گیا ہے کہ بھارتی میڈیا نے بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ پاکستان یہ دباؤ برداشت نہ کر سکے گا اور شمالی وزیرستان میں آپریشن شروع کر دے گا یعنی بھارت امریکہ کا نفسیاتی آلۂ کار بن کار دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف وہ اقدامات نہیں کر رہا جو اُسے کرنا چاہیے اور اگر وہ ایسا کرے گا بھی تو یہ عالمی دباؤ کے تحت ہوگا جبکہ خود بھارت کم از کم پاکستان کے اندر اِن دہشت گردانہ کاروائیوں میں ثابت شدہ طور پر ملوث ہے اور افغانستان کے راستے اِن لوگوں تک امداد پہنچانے میں مصروف عمل بھی ہے وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ پاک فوج کو زیادہ سے زیادہ ملک کے اندر مصروف رکھا جائے۔ لہذا یہ اس کے بھی عین مفاد میں ہے کہ پاکستان یہ آپریشن شروع کر دے یوں ایک طرف مشرقی سرحد سے فوج ہٹ کر مغربی علاقوں میں مصروف ہو جائے گی دوسری طرف اسے افغانستان کے راستے مزید مداخلت کا موقع مل جائے گا اور جنگی حالات میں اس کے کارندے کسی مشکل سے دوچار نہ ہونگے۔ یوں امریکہ اور بھارت باہمی تعاون سے پاکستان میں حالات کو مزید خراب کر سکیں گے۔ یوں وہ قبائل جو پاکستان کی حفاظت کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں انہیں پاک فوج کے خلاف لڑا دیا جائے اور جبکہ ابھی پاکستانی حکومت یا فوج نے کسی ایسے آپریشن کا اعلان بھی نہیں کیا عوام کے ذہنوں میں شکوک و شبہات ڈالے جائیں۔ ایسا کسی حد تک ہوتا نظر بھی آ رہا ہے کہ اطلاعات کے مطابق کچھ لوگ اپنا

علاقہ چھوڑ رہے ہیں یا چھوڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان نے اگر ابھی تک ثابت قدمی دکھائی ہے تو مستقبل میں بھی انہیں ملکی مفاد میں ہی فیصلے کرنے چاہیں۔ اگر چہ اس جنگ کو کچھ لوگ اپنا کہہ رہے ہیں کہ اب تو یہ آگ ہمارے گھر میں لگ چکی ہے لیکن ہم اس گھر آئی یا لائی بلا کو جتنا جلدی ٹال سکیں اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ دس سال سے مسلسل اس پرائی جنگ کو لڑتے لڑتے اب تو قوم کے اعصاب شل ہو چکے ہیں ، دھماکے، قتل و غارت اور دہشت گردی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، ترقی کا عمل عملاً رکا ہوا ہے اگر کوئی نئی سڑک تک بنتی ہے تو نیٹو کے وزنی کنٹینرز اور ٹریلر اس کو وقت سے بہت پہلے نا قابل استعمال بنا دیتے ہیں۔ جنوبی وزیرستان ، سوات ، باجوڑ اب اتنے آپریشنز کے بعد ہم کسی اور ایسی کاروائی کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔ہمیں نہ صرف دہشت گردی کو اپنے ملک سے ختم کرنا ہے بلکہ اس کے ساتھ بین الاقوامی پروپیگنڈے کا بھی جواب دینا ہوگا اور اپنے ملک سے اس پرائی جنگ کا خاتمہ بھی کرنا ہوگا۔

پاکستان طالبان کے اسلام کے لیے نہیں

میں اسیّ کی دہائی میں سیدو شریف کے ایک سکول کی طالبہ تھی صبح اپنی بہنوں کے ساتھ مل کر سکول جاتی اور دوپہر میں بلا خوف وخطر واپس آتی پختونوں میں عورتوں کی عزت واحترام کا جو تصور ہے وہی ہمارا محافظ ہوتا تھا۔ اپنے سکول سے دوسرے سکولوں میں کھیل، تقاریر، نعت، قرآت اور ڈریس شوز کے مقابلوں میں جانا ایک معمول کی کاروائی تھی۔ سکول ہی کی طرف سے سیر وتفریح کے لیے جانے میں بھی سیکیورٹی کے کوئی مسائل آڑے نہیں آتے تھے اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے نہ شرعی حدود کو پار کیا گیا نہ پختون روایات کو۔ دو تین سال پہلے مجھے اپنے ہی سکول میں بطور مہمان مقرر جانے کا موقع ملا تو میں نے لڑکیوں میں تعلیم کے لیے وہی جوش وخروش دیکھا جو کسی بھی دوسری جگہ پر ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد سوات کا اصل چہرہ دکھانا تھا۔ سازشوں اور کم علم بلکہ ”بے علم عالموں“ نے سوات کے چہرے کو جس طرح بگاڑا اس نے نہ تو وادی سوات کو کوئی نیک نامی بخشی اور نہ اسلام کو۔ میرے اِن جملوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کسی نئے روشن خیال اسلام کی داعی ہوں۔ میں تو حضرت محمد Ö کے لائے ہوئے دین اور اصولوں کو روشن خیالی کی سب سے بڑی دلیل سمجھتی ہوں، جس دین نے ظلم اور جہالت کی بنیادیں ہلادی تھیں جس نے علم کو مردوں کے لیے مخصوص

اور عورتوں کے لیے ممنوع نہیں کیا بلکہ دونوں پر فرض قرار دیا اور جس نے متنبہ کیا کہ جب قیامت کے دن زندہ درگور کی جانے والی لڑکی سوال کرے گی کہ اُسے کس گناہ کی پاداش میں زندہ دفن کیا گیا۔ جہاں حضرت عائشہ (رض) مردوں کے لیے بھی علم کا سرچشمہ تھیں اور حضرت حفصہ (رض) ان گنے چنے چند لوگوں میں سے تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ پھر آج خود کو طالبان کہنے والوں نے کس طرح اللہ کی اِن حدود کو پار کیا۔ ملالہ یوسف زئی خود کو دوپٹے میں ڈھانپ کر رکھنے والی ایک چھوٹی سی لڑکی کیسے اور کس مذہب کی رو سے واجب القتل قرار دی گئی کیونکہ اسلام تو کسی ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے۔ علم کو تو ربِ کائنات نے ہی شرف انسانیت قرار دیا اور وجہ سجود ملائکہ بھی ، عبادت گزار معصوم عن الخطائ اور خواہش سے آزاد تو فرشتے تھے آدم نہیں لیکن مسجود آدم ہوا فرشتے نہیں۔ ملالہ ، شازیہ ، کائنات یا کوئی بھی عورت یا بچی کیا اسی آدم کی اولاد نہیں جسکے علم کی توقیر سجدہ ملک سے کروائی گئی اور اس واقعے پر بحیثیت مسلمان ہم سب کا ایمان ہے۔ جس واقعے کو طالبان نے اپنے اس ظالمانہ فعل کے لیے بطور توجیہہ پیش کیا یعنی حضرت موسیٰ (ع) و خضر (ع) کا واقعہ جس میں حضرت خضر (ع) نے بحکم خدا ایک بچے کی جان لی کہ نیک والدین کی اولاد ہونے کے باوجود اس نے مستقبل میں گمراہ اور بُرا بننا تھا، یہ علم تو موسیٰ (ع) کو بھی نہیں تھا تب ہی تو وہ باوجود وعدے کے اس فعل پر چپ نہ رہ سکے اور بول اٹھے کہ حضرت خضر (ع) نے ایسا کیوں کیا۔ تو کیا

طالبان پر بھی نعوذ باللہ حضرت خضر (ع) کی طرح کوئی وحی آئی تھی اور ہم عام لوگ حضرت موسیٰ (ع) کی طرح اس سے بے خبر تھے۔ قرآن کی خود ساختہ توضیح کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے تو پھر یہ کیسا علم ہے جو طالبان نے حاصل کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خود کو عالم کہتے ہیں۔ کیا اسلام نے عورت، بچے اور بوڑھے کے قتل اور کھیتیوں،اور باغوں کو جنگ میں بھی جلانے سے منع نہیں کیا تو پھر امن میں کیسے معصوم بچیوں کو گناہ گار سمجھا گیا اور کیا گناہ کی سزا دینا ہر خاص و عام کا کام ہے یا ریاست کا کہ جس کو چاہے یہ ذمہ داری تفویض کرے۔ کچھ لوگ ملالہ کے کچھ انٹرویوز کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اُس نے داڑھی اور برقعے سے خوف کا اظہار کیا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ دونوں چیزیں سوات کے معاشرے میں انتہائی قابل احترام سمجھی جاتی ہیں وہاں آپ کو کوئی لڑکی یا عورت بغیر چادر یا پردے کے نظر نہیں آئے گی مردوں کی اکثریت داڑھی اور ٹوپی کے ساتھ ہوتی ہے لیکن دکھ تو یہی ہے کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت شعائر اسلام کو لوگوں کی نظروں میں خوفناک بنایا گیا، تو ایک بچی کا خوفزدہ ہونا کوئی انہونی بات ہے کیونکہ وہ جن حالات سے گزری اسکو وہی جان سکتی ہے۔ ملالے کے ساتھ ہمدردی کو کچھ لوگ جو خاص رنگ اور وجہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی منطق سمجھ میں نہیں آرہی۔ اگر یہ واقعہ ملالے کے ساتھ نہیں کسی بھی بچی کے ساتھ پیش آتا اور اسکی پیشانی اور گلے پر پستول رکھ کر گولی ماری جاتی تو بھی یہ واقعہ اتنا ہی افسوسناک ہوتا جتنا اب ہے۔ اسلام اور پختون

روایات کے بالکل خلاف ملاریڈیو یعنی مولوی فضل اللہ جس نے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کی ہے، ضروری ہے کہ اُس کی دینی اسناد بھی چیک کی جائیں اور اسلام دشمن اور غیر ملکی قوتوں سے اس کے روابط بھی کیونکہ بحیثیت مسلمان اور پختون اُسے خود بھی اس طرح کے فعل پر خود کو قابل سزا سمجھنا چاہیے۔ نجانے کتنی ملالہ کتنی شازیہ اور کائنات اور کتنے محمد، احمد اور عبدالرّحمٰن بغیر کسی جرم کے اس کی دہشت گردی کی نظر ہو چکے ہیں جن معصوموں کا خون اسلام نے حرام قرار دیا تھا۔ وہ اسلام اور پختونیت کی کسی کتاب میں سے یہ شق نکال کر دکھائے کہ کسی نے قتل نہ کیا، فساد نہ کیا، ارتداد نہ کیا، زنا نہ کیا تو وہ کس جرم میں واجب القتل ہو گیا۔ اُس سے پوچھا جائے کہ اس کی غیرت نے عورت بلکہ بچی پر ہاتھ اٹھانا کیسے گوارا کیا۔ یہاں لوگوں کا یہ خیال ضرور قابل توجہ ہے کہ کارندے اگرچہ پاکستانی ہیں لیکن منصوبہ ساز کوئی اور ہے۔
اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ ملالہ اور اس کے ساتھ زخمی ہونے والی بچیوں کو صحت اور زندگی عطا کرے کہ زندگی اور موت کا مالک وہ ہے کوئی دہشت گرد نہیں اور اس زمین کے ہر بیٹے اور بیٹی کی حفاظت کرے۔ پاکستان اللہ کے نام پر بننے والی مدینہ کے بعد دوسری ریاست ہے یہاں اسلام کو اسلام رہنے دیا جائے طالبان برینڈ، مشرف برینڈ یا کسی اور برینڈ میں نہ ڈھالا جائے۔ قانون کی

حکمرانی، حکمرانوں کا خلوص اور عوام کی ایمانداری اب بھی اس ملک کو اٹھا کر سربلند کر سکتی ہے یہ وطن محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسلام برتنے کے لیے بنا تھا جس نے عورت کے لیے مرد کی طرح تعلیم کو فرض قرار دیا تھا اس کے حصول پر اُسے قابل قتل نہیں گردانا تھا۔ کسی صوفی محمد، فضل اللہ اور طالبان یا کسی غیر ملکی ایجنڈے کے پہنچنے کے لیے نہیں۔

27 اکتوبر۔۔۔ ابھی اور کتنے یوم سیاہ

مسئلہ کشمیر جس نے تقسیم ہند کے وقت ہی سے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے کر رکھا ہے اور طاقت کی کشمکش کا باعث بھی ہے کشمیر جو پاکستان اور بھارت کے شمال میں واقع انتہائی خوبصورت علاقہ ہے اور تزویراتی لحاظ سے بھی اہم ترین ہے۔ محل وقوع کے اعتبار سے مغرب اور شمالی مغرب سے پاکستان سے جڑا ہوا ہے اور ساتھ ہی ثقافت ،معاشرت اور سب سے بڑھ کر مذہب کے مضبوط رشتے میں بھی بندھا ہوا ہے۔ لیکن اسے برصغیر کی بدقسمتی کہیے کہ تقسیم ہند کے وقت ہندو راجہ ہری سنگھ یہاں کا حکمران تھا اور اس نے باوجود مسلمان اکثریتی ریاست ہونے کے پاکستان سے الحاق نہ کیا اور بھارت میں شامل ہو کر ایک ایسے تنازعے کی بنیاد رکھ دی جو پچھلے پینسٹھ سال سے خطے کے وسائل کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کا باعث بن رہا ہے۔ راجہ ہری سنگھ نے 25 اکتوبر کو بھارت سے الحاق کی دستاویز پر دستخط کرکے ایک بار پھر کشمیر اور کشمیریوں کو بیچ دیا جبکہ ابھی تو کوئی بھی کشمیری اپنی تاریخ کے اُس سیاہ باب کو بھی نہ بھولا تھا جب 1846 میں اُسے مبلغ پچھتر ہزار روپے میں انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچا تھا۔ ٹھیک ایک صدی بعد پھر یہ عمل دہرایا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے الحاق کی اس دستاویز پر 25 اکتوبر 1948 کو بطور گورنر جنرل بھارت دستخط کرکے اسے منظور کیا اور ساتھ ہی لکھا کہ

جونہی ریاست کے حالات بہتر ہوں، قانون کی بالادستی قائم ہو اور مداخلت کار یہاں سے نکل جائیں تو کشمیر کا الحاق یہاں کے لوگوں کی مرضی کے مطابق پاکستان یا بھارت سے کر دیا جائے گا اور اس دستخط کے ساتھ ہی 27 اکتوبر کو بھارتی فوجیں کشمیر میں داخل ہو گئیں اور نہ صرف کشمیریوں بلکہ پورے برصغیر کے لوگوں کی بدقسمتی کا آغاز ہو گیا۔ بھارت نے ہندوستان کی تقسیم کو مجبوراً تسلیم تو کر لیا تھا لیکن پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اس کے خلاف سازشوں کے کا آغاز بھی کر دیا تھا جس کے تحت 27 اکتوبر کو اس کے اپنی فوجیں کشمیر میں بھیج دیں۔ کشمیریوں کے حالات اس سے پہلے بھی کچھ اچھے نہ تھے وہ ہری سنگھ اور اس کے آبا و اجداد کے مظالم کے خلاف پہلے بھی سینہ سپر تھے اور مسلسل اپنے خون سے اپنی آزادی کی تاریخ رقم کر رہے تھے اب انہوں نے اس تاریخ کو اپنی تاریخ کا وہ یوم سیاہ قرار دیا جسے وہ اب تک مناتے آ رہے ہیں۔ کشمیری دنیا کے ہر کونے میں 27 اکتوبر کو بطور یوم سیاہ منا کر اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ بھارت کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔ اگرچہ باوجود اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے نہ یہاں استصواب رائے کرایا گیا اور نہ ہی کسی دوسرے طریقے سے کشمیریوں کے مسائل کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ نائیجیریا میں عیسائی اقلیت کے الگ ملک کے مطالبے کی تو توجیہات تلاش کی جا رہی ہیں لیکن کشمیر میں 80% مسلمان اکثریت کی آواز کو دبایا جا رہا ہے اور اس جرم میں اقوام متحدہ بھی شامل ہے جو لگتا ہے اپنا پچھلا ریکارڈ جو کشمیر کے

متعلق تھا تلف ہی کر چکا ہے لیکن پاکستان اور بھارت کے اخبارات بالخصوص اور دنیا بھر کے بالعموم اسے یاد دلادیں گے کہ اس نے 5 جنوری 1949 کو کشمیریوں کا یہ انسانی حق تسلیم کرلیا تھا کہ ہر انسان کی طرح وہ بھی اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں اور پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک مملکت کا انتخاب کر سکتے ہیں یا آزاد ریاست کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں لیکن وہ آج تک اپنے کہے پر عمل کرا نہ سکا اور آج کشمیر اقوام متحدہ کے کاغذات میں سب سے پرانا غیر حل شدہ مسئلہ ہے اور نہ ہی اس کے حل کی مستقبل قریب میں کوئی امید ہے بلکہ اقوام متحدہ اس کے بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے۔بڑی طاقتیں ایک ارب سے زیادہ آبادی والے ملک بھارت میں اپنی مصنوعات کی منڈی تو کھونا نہیں چاہتی اور ساتھ ہی وہ اپنے اسلحے کی عظیم الشان منڈی برصغیر کو کسی صورت اپنے ہاتھ سے چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس لیے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کشمیری کس کرب سے گزر رہے ہیں۔ ان کے بچے گولیوں کی بوچھاڑ میں پیدا ہوتے ہیں اور کبھی بچپن میں اور کبھی عین عالم جوانی میں انہی گولیوں کی نظر ہوجاتے ہیں۔ نہ عزتیں محفوظ ہیں نہ جانیں اور نہ ہی گھر بار۔ اور کسی بھی وقت یہ سب کچھ سپیشل آرمڈ فورسز ایکٹ کی نظر ہوجاتے ہیں، ایسے لا محدود اختیارات کی نظر جن پر کسی فوجی یا پولیس والے سے بھارتی قانون کے مطابق بازپُرس نہیں کی جا سکتی اور مسلمان کشمیریوں کا قتل عام اور آبروریزی قانوناً کرلی جاتی ہے۔ کشمیر کا مسئلہ نہ صرف کشمیریوں کی زندگی اور موت کا

مسئلہ ہے بلکہ پاک بھارت مسائل کی جڑ بھی ہے۔ یہی کشمیر ہے جہاں سے ہو کر پاکستان کے دریا یہاں پہنچتے ہیں اور یہیں پر بھارت ان کا پانی روک لیتا ہے۔ اپریل 1948 میں چوری کا یہ جرم پہلی بار کیا گیا۔ سندھ طاس کا معاہدہ ہوا تو بھی بھارت نے اس میں اپنی مرضی کی شقیں شامل کیں اور پھر بھی معاہدے کی خلاف ورزی جاری رہی اور ہے کہ جب چاہا جہاں چاہا پانی روک دیا کبھی ڈیم بنا کر روکا کبھی سرنگ بنا کر موڑ دیا۔ دراصل اس مسئلے کا حل بھی تبھی ممکن ہے جب کشمیر کا مسئلہ حل ہو یہی حال اسلحے کی دوڑ کا ہے اگر یہ مسئلہ حل ہو اور بھارت اپنی نیت بدل دے تو یہ دوڑ بھی ختم ہو اور عوام پر سکون اور خوشحال زندگی گزار سکیں اور ترقی ان کا مقدر بن سکے۔ کشمیریوں کی نسلیں دراصل اس خطے کی ترقی کی جنگ لڑ رہی ہیں اور بھارت ان کی نسل کشی میں مصروف ہے۔ شہید ہونے والے اور غائب ہونے والے کشمیریوں کی تعداد ہر سال پچھلے سال سے زیادہ ہوتی جاتی ہے اگر کبھی کبھار انسانی حقوق کی کسی تنظیم کو کسی کشمیری کی چیخ سنائی دے بھی دے تو چند دنوں تک اس کی بازگشت رہتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے۔ خود مسلمان ممالک بھی کان بند کئے پڑے رہتے ہیں۔ آج بھی اگر مسلمان متحد ہو جائیں اور مغربی دنیا بڑی طاقتوں اور اقوام متحدہ پر دباؤ ڈالیں تو نہ صرف کشمیر، افغانستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے مسائل حل ہو جائیں اور کوئی مسلمان یوم سیاہ منانے پر مجبور نہ ہو۔ کشمیری پچھلے پینسٹھ سال سے یہ دن منا رہے ہیں اور نجانے ابھی کتنے سال اس سیاہ

بختی کے باقی ہیں۔ اللہ تمام مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی قوت عطا کرے اور ان کی
مشکلات آسان کرے۔

انڈین واٹر بم

یوں تو کرہ ارض کا تین تہائی حصہ پانی اور صرف ایک تہائی خشکی پر مشتمل ہے لیکن قابل استعمال پانی کا تناسب صرف تین فیصد ہے اور یہی تین فیصد انسان اور خشکی کے جانداروں کی زندگی کا ضامن ہے۔ بالائے زمین اس قابل استعمال پانی کا سب سے بڑا ذریعہ دریا ہیں اور ابتدائی ہی سے انسان نے اپنی بستیاں انہی دریاؤں کے کنارے بسائیں ۔ دجلہ ، فرات ، نیل اور سندھ ابتدائی آبادیوں اور تہذیبوں کا منبع رہیں۔ سندھ کے پانیوں نے ہمیشہ اپنے کناروں پر عظیم تہذیبوں کو پھلتے پھولتے دیکھا اور اس کے معاون دریاؤں نے ہی پنجاب کے زرخیز میدانوں کو غلے کا گھر بنائے رکھا۔ تقسیم ہند کے وقت جب کشمیر کو حیلے بہانوں سے بھارت کے حوالے کیا گیا تو دیگر مسائل کے ساتھ بھارت نے پاکستان کے پانی کو روک کر اپنی بدنیتی کا ثبوت دیا۔ یکم اپریل 1948 کو جب اس نوزائیدہ مملکت کی عمر صرف سات آٹھ ماہ تھی بھارت نے اُن نہروں کا پانی بند کر دیا جن کے ہیڈ ورکس تقسیم کے وقت بھارت میں رہ گئے تھے جس کے بعد مختلف اوقات میں یہ عمل دہرایا جاتا رہا۔مذاکرات در مذاکرات کے نتیجے میں 1960 میں سندھ طاس کا معاہدہ طے پایا لیکن بھارت نے اسے بھی وہ اہمیت نہ دی جو ایک بین الاقوامی معاہدے کی ہوتی ہے جب اور جہاں اس کی مرضی ہوئی اس نے معاہدے کو توڑنے میں کسی

ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کشمیر میں اس نے مختلف دریاؤں اور نالوں پر پن بجلی کے بہتر (72) منصوبوں کی تکمیل کا منصوبہ بنایا ہے جن میں سے کئی ایک مکمل بھی کر لیے گئے ہیں ان میں سے بگلیہار اور کشن گنگا بڑے منصوبے ہیں اور ان پر پاکستان نے شدید اعتراض اور احتجاج بھی کیا ہے۔ بگلیہار پر عالمی عدالت انصاف نے بھی پاکستان کے چار میں سے تین اعتراضات قبول کیے اور بھارت سے یکم ستمبر 2012 کو انہیں دور کرنے کو کہا ہے جبکہ کشن گنگا پر بھی کام روک دینے کا کہا گیا ہے لیکن بھارت ہر طریقے سے اس آبی دہشت گردی پر آمادہ ہے۔ اب بھارت کی سپریم کورٹ نے یہ حکم دیا ہے کہ بھارت کے مغربی دریاؤں کو جنوبی جزیرہ نمائی دریاؤں سے ملا دیا جائے تاکہ پورے ملک میں پانی کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکے۔ بھارت کے جنوب میں صرف تین بڑے دریا ہیں جن میں مہاندی، نرمادا اور تپتی شامل ہیں۔ مہاندی اور کچھ چھوٹے دریا گوداوری، کرشنا اور کاویری خلیج بنگال میں گر جاتے ہیں جب کہ مغربی دریاؤں میں سے دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا بھارت سے ہو کر پاکستان میں داخل ہوتے ہیں جن پر بھارت پہلے ہی کئی منصوبے بنا رہا ہے اور یہ منصوبے پاکستان کے حصے کے دریاؤں پر بھی بنائے جا رہے ہیں۔ دریائے جہلم جو بھارت میں دریائے کشن گنگا کہلاتا ہے پر کشن گنگا ڈیم بن رہا ہے اور ساتھ ہی مغربی دریاؤں کا پانی خشک ریگستانی جنوبی حصے کے دریاؤں سے ملایا جا رہا ہے اس منصوبے پر چھپن (56 لاکھ ملین روپے خرچ ہونگے لیکن بھارت کے اس منصوبے سے)

ماحول پر جو اثرات مرتب ہونگے وہ پورے خطے کو متاثر کریں گے۔ چالیس ہزار کلو میٹر نہروں کی تعمیر سے پانی کی ایک بہت بڑی مقدار جب صحرائی، نیم صحرائی اور خشک علاقوں تک پہنچائی جائے گی تو پورے علاقے کے موسم پر اثر پڑے گا۔ قدرتی ماحول میں تبدیلی کئی مسائل کو جنم دے گی اور اگر یہ اثرات بھارت تک محدود ہوتے تو اُن کا اندرونی معاملہ ہوتا لیکن ماحولیاتی اثرات ایک علاقے تک محدود نہیں رہتے بلکہ پورے خطے کو متاثر کرتے ہیں۔ اس منصوبے پر نہ صرف پاکستان کو اعتراض ہے بلکہ نیپال اور بنگلہ دیش بھی اس کے مخالف ہیں اور خود بھارت کے اندر سے بھی اس کے خلاف کافی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ دوسری طرف اس منصوبے سے پاکستان کے دریاؤں میں بھی پانی کی مقدار پر منفی اثرات مرتب ہونگے اور پاکستان جو پہلے ہی پانی کی کمی کا شکار ہے اس کے حالات مزید نازک ہو سکتے ہیں۔ بھارت کی سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے مطابق ان دریاؤں کو 2016 تک جوڑا جائیگا جو کہ بظاہر ایک ناقابل عمل منصوبہ ہے یعنی چار سال میں چالیس ہزار کلو میٹر لمبی نہروں کی تعمیر۔ جبکہ اس منصوبے کے لیے نہ کی گئی ہے اور نہ ہی ماحولیاتی مطالعہ۔ مگر بھارت ہر Feasibility Study تو صورت اپنی من مانی پر تلا ہوا ہے چاہے اس سے دوسرے ممالک بنجر اور صحرا بن جائیں یا سیلابوں کی نظر ہو جائیں اس سے بھارت کو کوئی سروکار نہیں اور پاکستان کے خلاف تو وہ پانی کی بندش کو روز اول سے بطور ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ بین الاقوامی برادری کو اس مسئلے کی طرف توجہ دینی چاہیے ورنہ

پاکستان جو پہلے ہی پانی کی کمی کا شکار ہے اس کے لہلہاتے کھیت بنجر ہو جائیں گے اور اس وقت اگر انسانی حقوق کی تنظیمیں اور اقوام متحدہ بہت بھی شور مچائے تو کچھ بھی ممکن نہ رہے گا۔حکومت پاکستان بھی اس مسئلے پر بیرونی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ نہ صرف عالمی طاقتیں بھارت کو اس بدترین دہشت گردی سے روکیں بلکہ اُسے سرزنش بھی کریں اور سندھ طاس معاہدے کی پاسداری پر مجبور بھی کریں ورنہ یہ تنازعہ کسی بڑی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے اور دونوں ایٹمی ممالک کسی بھی ایسی صورتحال کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

میڈیا! کچھ فکرِ وطن بھی ہے

کاش اس ملک میں نیک نیتی کی کمی نہ ہوتی اگر ایسا ہوتا تو شاید بہت سے مسائل جنم ہی نہ لیتے۔ صرف اور صرف خود کو محب وطن اور دوسروں کو غدار کہنے کا رواج بھی انتہائی خطرناک ہے۔اس طرح کے الزامات کو کچھ لوگ اپنے مفادات کی خاطر اچھالتے ہیں اور قومی سالمیت اور یکجہتی کو نہ صرف پس پشت ڈال دیتے ہیں بلکہ اسے شدید نقصان پہنچانے کی دانستہ و نادانستہ کوشش بھی جاری رہتی ہے تاکہ گرما گرم خبر میسر رہے۔

حال ہی میں چیف آف آرمی اسٹاف نے معمول کا ایک بیان دیا جس میں انہوں نے ایک مکمل طور پر غیر متنازعہ بات کہی کہ کسی ایک ادارے کو یہ حق نہیں کہ وہ ملک کے مفاد کا تعین کرے بلکہ اس کے لیے قومی اتفاق رائے کا ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ فوجی قیادت اور سپاہ میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش برداشت نہیں کی جائے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اداروں کو کمزور کرنا یا آئین سے تجاوز ہمیں صحیح راستے سے ہٹا دے گا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ماضی میں سب سے غلطیاں ہوئیں اور کسی ملزم کو مجرم ٹھہرا کر پورے ادارے کو موردالزام ٹھہرانے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔

چیف آف آرمی اسٹاف کے بیان پر ہماری مستعد اور آزاد میڈیا نے کچھ اتنی تیزی سے پروگرام مرتب کیے اور اس سے پہلے کچھ یوں بریکینگ نیوز کا ہنگامہ مچایا گیا کہ محسوس ہوا بلکہ کرایا گیا کہ جیسے مارشل لائ لگنے میں محض چند منٹ باقی ہیں اور اسے بالکل واضح طور پر عدلیہ کے خلاف بیان قرار دیا گیا۔ اسکے بعد چیف جسٹس صاحب کے آنے والے بیان کو آرمی چیف کے بیان کا جواب قرار دیا گیا۔

میڈیا کی آزادی سے کسی کو اختلاف نہیں لیکن یوں دو بڑے اداروں کے سربراہوں کے بیانات کو اچھالنا کسی بھی طرح دانشمندی نہیں جبکہ ان بیانات میں ایسی کوئی بات بھی نہ ہو۔ آرمی چیف کے بیان کو جس طرح ہمارے چغادری اینکرز نے کئی کئی طرح معانی پہنائے ان کا بیان کے متن سے کہیں بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ فوج اپنے ڈسپلن کی نوعیت میں دوسرے تمام اداروں سے مختلف ادارہ ہے یہاں اس پر لگنے والے الزامات کی تردید یا تو آئی ایس پی آر کر سکتا ہے یا ادارے کا سربراہ۔ موجودہ حالات میں جس طرح فوج کو تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اس سے یقیناً ادارے کی ساکھ پر اثر پڑ رہا ہے۔ آرمی چیف نے تسلیم کیا ہے کہ ماضی میں سب سے غلطیاں ہوئیں ہیں۔ اگر کچھ جرنیلوں نے ملک کی سیاست میں مداخلت کی ہے اور قوانین کی خلاف ورزی کی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب

نہیں کہ پورے ادارے کو بدنام کیا جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اگر ایک جج غلط فیصلہ دے تو پوری عدلیہ مجرم نہیں گردانی جاسکتی۔ جسٹس منیر کے فیصلے سے آج کی عدلیہ کا کوئی تعلق نہیں اسی طرح ہر جرنیل کا فعل اس کا ذاتی فعل ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہر دوسرے شخص کی طرح فوجی بھی پہلے انسان اور پھر فوجی ہے اور ہر دوسرے انسان کی طرح یہ ہر خطا سے مبرائ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر جو جرم اس ادارے سے منسوب کیا جا رہا ہے اس میں سیاستدان بھی شامل ہیں بلکہ مارشل لائ اکو تحفظ دینے میں عدالتیں بھی برابر کی شریک ہیں، عوام نے بھی مارشل لائوں کی آمد پر مٹھائیاں بانٹی ہیں۔ سیاستدانوں نے جرنیلوں کو وردی میں دس دس بار منتخب کرنے کے دعوے کیے ہیں۔ آئی ایس آئی کا سیاسی ونگ بنانے کا کارنامہ بھی ایک سیاسی وزیراعظم نے سرانجام دیا۔ دو چار ماہ کی وزارت عظمیٰ کی تاریخ بھی سیاستدانوں نے مرتب کی اور انہی کارناموں نے پہلے مارشل لائ کی راہ ہموار کی اور ایک ایسی بری روایت کو ملک میں متعارف کروایا جس سے قوم جان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی۔ انہی غلطیوں کا دونوں اداروں کے سربراہوں نے مختلف انداز میں ذکر کیا اور ہم سب ایک بار پھر ایک بڑی قومی غلطی کرنے پر آمادہ ہوگئے کہ دونوں کے بیانات کو اس طرح پیش کیا جائے گویا دو دشمنوں کے بیانات ہوں۔ حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ ایسے میں ملکی مفادات کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والے اینکرز صرف اپنی ریٹنگ کی فکر میں مبتلا ہو گئے اور قومی مفاد اور یکجہتی کہیں پیچھے رہ گئے۔ اس

وقت فوج باوجود انتہائی حالات کے بھی حکومت کے معاملات میں مداخلت نہیں کر رہی تو ایسے میں اس کے کردار کو سراہا جانا چاہیے تھا۔ اگر جنرل کیانی یا کوئی دوسرا فوجی غلطیاں کرنے والے جرنیلوں کو تحفظ دینے کی بات کرے تو تب انہیں تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا مگر اب کیوں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عدلیہ نے بھی ماضی سے ہٹ کر فیصلے کیے ہیں جن کا ملکی سیاست پر یقیناً مثبت اثر پڑے گا کیونکہ جب چیک کا نظام رہے گا تو خوف کے تحت ہی سہی اپنے اعمال درست رکھے جائیں گے۔ اگر پینسٹھ سال کے بعد بھی ہمارے اداروں نے اپنے اپنے دائرہ ہائے کار کا تعین کر کے اس کے اندر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر کم از کم اس وقت انہیں نہ دہرانے کا عزم کیا بلکہ آئین کی پاسداری کا اعلان بھی کیا تو اس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے نہ کہ ان بیانات کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر اپنا اُلو سیدھا کیا جائے۔ کیا یہ بہتر رویہ نہیں کہ ادارے کے سربراہ کو ہی یہ اختیار ہو کہ وہ پورے ادارے کی ترجمانی کرے یا یہ بہتر ہو گا کہ آرمی چیف ہر لیفٹیننٹ، کیپٹن یا میجر کو یہ اجازت دے کہ وہ میڈیا پر آ کر اپنی ذاتی حیثیت میں بیانات دے اور اپنا دفاع کرے اور چیف جسٹس سیشن کورٹ، ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے ہر جج کو یہ اجازت نامہ مرحمت فرمائے کہ وہ سیاستدانوں کی طرح ہر شام میڈیا پر بیٹھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ آزادی اظہار رائے یقیناً قابل قدر ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے لیکن اگر تجھ کو تہذیب ہر بند سے

آزاد کرے تو پھر یہ آزادی نہیں بلکہ جنگل کا قانون بن جاتا ہے۔ اور ہمارے ملکی حالات میں جبکہ ہمیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت بڑے بڑے اور شدید چیلینجز کا سامنا ہے تو ہمیں ان چیلینجز کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے اپنے محاذ پر ڈٹ جانا چاہیے اور اگر کسی دوسرے محاذ پر کمزوری دیکھیں تو اپنا محاذ چھوڑے بغیر ان کی مدد کے لیے بھی کمر بستہ ہو جانا چاہیے تبھی ہم دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت بین الاقوامی سطح پر ہمیں جس طرح گھیرا گیا ہے اور ہمیں جس دہشتگردی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، ڈرون حملے بلکہ کھلم کھلا دو مئی اور سلالہ چیک پوسٹ جیسے حملے بھی انتہائی آسان سمجھ لیے گئے ہیں تو یہ کوئی نئی بات بھی نہیں منتشر قومیں ہمیشہ طاقتور اور متحد قوموں کے لیے سافٹ ٹارگٹ ہوتی ہیں اور کچی دیوار بھی ثابت ہوتی ہیں۔

موجودہ حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے بالخصوص اور قومی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے بالعموم ہمیں ہر نکتہ نگاہ سے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی ادارے کو اتنا ہدف تنقید نہیں بنانا چاہیے کہ نہ صرف اس کی کارکردگی متاثر ہو بلکہ وہ کوئی ایسا ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور ہو جائے جو قومی مفاد کو نقصان پہنچنے کا باعث بنے۔ اگرچہ فوج کے نظم و ضبط کے پیش نظر ایسے کسی ردعمل کا اندیشہ نہیں ہوتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے اداروں کی عزت و تکریم کو نقصان پہنچایا جائے جو قومی سلامتی اور وقار کے ضامن ہوتے ہیں۔

ایک درد مند پاکستانی کی حیثیت سے میری الیکٹرانک میڈیا سے یہ درخواست ہے کہ قومی مفاد کو مد نظر رکھیئے۔ اگر لوگ آپ کو دیکھتے اور سنتے ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ رائے عامہ کو بدل سکتے ہیں تو اس کو ملکی مفاد میں بدلیئے۔ اداروں کا خود بھی احترام کریں اور عوام کو بھی یہ احترام سکھایئے تاکہ ہم ان چیلینجز کا جو ہمیں درپیش ہیں نہ صرف مقابلہ کر سکیں بلکہ سرخرو بھی ہو سکیں۔

کراچی کے حالات اور حکومت کی غیر سنجیدگی

دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر دہشت گردی امریکہ نے شروع کی، فریقین امریکہ اور طالبان تھے لیکن سب سے زیادہ اس جنگ نے پاکستان کو نقصان پہنچایا جانی بھی مالی بھی اور معاشی بھی۔ عمارتیں تباہ، سڑکیں تباہ، فوج مسلسل مصروف جنگ ،پولیس ہمہ وقت ریڈ الرٹ، سیکیورٹی اہلکار ہر وقت نشانے پر ، شہریوں کی جان نہ جائے کار پر محفوظ نہ سڑکوں پر غرض ایک قیامت ہے جو ہر جگہ برپا ہے۔ اسی دہشت گردی کی جنگ کی آڑ میں فرقہ واریت ، نسلی اور صوبائی تعصب، بھتہ خوری، اُجرتی قتل سب ہی اپنا اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور تجارتی مرکز ہے اس لیے اس کا خاص کر نشانہ بن جانا کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں اگرچہ کراچی مختلف ادوار میں بدامنی کا شکار ہوتا رہا ہے لیکن موجودہ حالات جن سے کراچی گزر رہا ہے شاید اس کی تاریخ کا بدترین دور ہے انسانی جان کی کوئی حیثیت نہیں ہے ہر روز یوں قتل عام ہوتا ہے کہ چنگیزی دور کا گمان گزرتا ہے۔ بے گناہ مقتول تو شناخت ہو جاتا ہے لیکن قاتل کا کوئی علم نہیں جو ڈھونڈتا پھر رہا ہے ہر ایک دوسرے پر الزام لگا رہا ہے اور قاتل مصروف عمل ہیں۔ کبھی کبھار اگر اس لہر میں کمی آ بھی جائے تو صرف یہ ہوتا ہے کہ کچھ کم لاشیں گرتی ہیں۔ کراچی کے حالات کا ہماری معیشت پر جو اثر پڑتا ہے وہ ملک کی

معاشی حالت کو مزید دگرگوں کر رہا ہے حکومت چند سطحی سے اقدامات ضرور کرتی ہے لیکن مسئلے کی جڑ پکڑنے کی سنجیدہ کوشش ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہمارے ملک میں یہ رجحان عام ہوتا جا رہا ہے کہ مسائل کے حل کے لیے فوج کی طرف دیکھا جاتا ہے اور اس سے بھی خطرناک رویہ اُس وقت ہوتا ہے جب ایسے آپریشنز کے بعد فوج کو بری طرح ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ کراچی میں بھی فوجی آپریشن کی باتیں کافی عرصے سے ہو رہی تھیں جس کے بارے میں بالا آخر آرمی چیف نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بائیس نومبر کو کہہ ہی دیا کہ کراچی میں کسی فوجی آپریشن کی ضرورت نہیں تاہم فوج کو جب بھی آئین کے مطابق حکومت بلائے تو وہ امن و امان برقرار رکھنے میں حکومت کے ساتھ ہوگی۔ کراچی کا مسئلہ سیاسی بھی ہے لیکن اس پہلو کو نظر انداز کرنا بھی غلط ہوگا کہ آخر کراچی میں اتنا اسلحہ کہاں سے آجاتا ہے اور کیسے استعمال ہو جاتا ہے۔ ہر سیاسی پارٹی اس بات سے انکاری ہے کہ اس کے کارکن کسی ایسی کاروائی میں شریک ہیں تو پھر یہ سب کچھ کرنے والے آخر کون ہیں اور موقع ہاتھ سے جانے کیوں نہیں دیتے اگر یہ سب کچھ سیاسی مخالفت کا شاخسانہ ہے تو محرم میں یہ فرقہ وارانہ قتل میں کیسے تبدیل ہوگیا۔ اگر لسانی بنیادوں پر ہے تو شیعہ اور سنی کے لیے کسی زبان کی قید بھی نہیں تو پھر آخر کیوں تلاش نہیں کر لیا جاتا ان لوگوں کو جو یہ سب کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے سیاستدان عظیم جذبۂ خیر سگالی ''کے تحت بیرونی ہاتھ کو خارج از امکان قرار دے دیتے ہیں'' لیکن پھر یہ سب کچھ کون کر

رہا ہے اس ''کون'' کی تلاش بھی ضروری ہے اور سزا بھی ورنہ کرنے والا اپنی کامیابی کا جشن مناتا رہے گا اور اہلیان کراچی اپنے پیاروں کو روتے رہیں گے یہ تلاش کامیاب تبھی ہوگی جب کراچی پر دعویٰ جتانے والے اس پر پورے پاکستان کا حق تسلیم کریں گے تو مسئلے کا ایک پہلو تو حل ہوسکے گا۔ جہاں تک فوج کا تعلق ہے تو فوج اس مسئلے کو دبا تو دے گی اور مجرموں کو بھی شاید پکڑنے میں معاون ثابت ہو لیکن مسئلے کا حل یہ نہیں مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہر ادارہ اپنا کام ایمانداری سے کرے امن و امان کا قیام پولیس کی، ذمہ داری ہے اور رینجرز اُن کی مدد کے لیے موجود ہیں ۔ مزید یہ کہ اہلیان کراچی اپنے سیاسی لیڈرز کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ کراچی کا امن قائم کرنے اور رکھنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں ایک کارکن کا بدلہ لینے کے لیے صرف نسلی اور لسانی بنیاد پر شناخت کرکے بے شمار لوگوں کو مار دینا کوئی حل اور بہادری نہیں بلکہ اصل حل یہ ہے کہ قاتل کو تلاش کیجئے۔ کیونکہ وہ، جس کو بدلے میں کو مارا جاتا ہے وہ قاتل نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی محفوظ کر لیا گیا ہوتا۔ حکومت کو کراچی کا امن قائم کرنے کے لیے ہر حربہ آزمانا ہوگا اس کے لیے مختلف گرپوں کے دوسرے ممالک سے رابطے بھی چیک کیے جائیں کیونکہ پاکستان کو جس طرح سے دہشت گردی کی جنگ میں جھونکا گیا ہے اُس میں یہ قوتیں ضروری سمجھتی ہیں کہ پورے پاکستان کو مختلف طریقوں سے بدامنی میں مبتلا رکھا جائے تاکہ وہ علاقے ہیں اپنی اجارہ داری بھی قائم رکھ سکیں اور اپنی موجودگی کا

جواز بھی اور پاکستان کو اتنا مجبور رکھ سکے کہ وہ ان طاقتوں کے آگے جھکا ہی رہے۔اس سارے معاملے میں قصور اور ذمہ داری سب سے زیادہ خود ہماری ہے اگر دشمن کو وار کرنے کے لیے ہم لوگ کارندے مہیا نہ کریں تو وہ کسی طرح بھی ہم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے ہیں نہ ہی ہمارے ملک کے امن و امان سے کھیل سکتے ہیں بات صرف ملکی مفاد کو مقدم رکھنے کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حکومتوں کی سیاسی جوڑ توڑ میں دلچسپی ختم ہو تو وہ امن و امان کی طرف توجہ دے سکیں گی۔اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عوام میں دلچسپی صرف ووٹ تک ہے انتخابات کے دنوں میں جو دعوے کئے جاتے ہیں اگر ان میں آدھے بھی پورے کر دیئے جائیں تو ملک کا نقشہ بدل جائے۔ حکومت کو کراچی کے مسئلے کو سنجیدگی سے لینا ہوگا اور اس کی اندرونی و بیرونی تمام وجوہات پر غور کرنا ہوگا اور پھر بغیر کسی خوف اور ڈر کے اس قتل عام کے ہر ذمہ دار کو سخت ترین سزا دینا ہوگی اور بیرونی عناصر کو بھی یہاں سے بہر حال نکال باہر کرنا ہوگا ورنہ انتخابات میں تو شاید آپ پھر بھی کبھی حکومت حاصل کر سکیں لیکن تاریخ کا سلوک بہت بے رحمانہ ہے وہ اپنے الفاظ نہ واپس لیتی ہے نہ مٹاتی ہے اور نہ نورتنی حوالوں کو قبول کرتی ہے۔

16 دسمبر یومِ سیاہ بھی اور یومِ احتساب بھی

14 اگست 1947 جب پاکستان بنا اور 16 دسمبر 1971 جب پاکستان ٹوٹا، مغربی پاکستان پاکستان رہ گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا یعنی ایک آزاد ملک نے آزادی حاصل کی، بنگالیوں نے 1947 میں آزاد ہو کر 1971 میں دوبارہ آزادی حاصل کی۔ معاملات یہاں تک پہنچنے کی کئی وجوہات تھیں، حقوق و فرائض کی جنگ بھی اور اختیارات اور نظراندازی کا تنازعہ بھی۔ جس کی بنیاد دانستگی یا نادانستگی میں رکھ دی گئی تھی لیکن اس معاملے کو کچھ یوں ہوا دی گئی کہ اُس نے نفرت کی شکل اختیار کر لی اور نفرت کو اس حد تک ہوا دی گئی کہ ملک دولخت ہو گیا یا کر لیا گیا۔ ہمارے حکمرانوں کو جب ہوش آیا تو تب تک معاملات ہاتھ سے نکل چکے تھے بلکہ حکمرانی کی جنگ اس دوران بھی جاری رہی اور حسب معمول سانحے کے بعد تحقیقات بھی ہوئیں رپورٹ بھی مرتب ہوئی اور بس۔ گناہ گار کو کوئی سزا نہ ملی اور تلافی تو خیر ممکن ہی نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان میں دشمن اندرونی بھی تھے لیکن بیرونی عناصر نے ان اندرونی عناصر کو بیرونی کمک اور امداد فراہم کی بلکہ ان کو اپنا آلہ کار بنایا گیا اور اِن سے دوہرا کام لیا گیا اِن ہی کے ذریعے ملک توڑا گیا اور اِن ہی کے ذریعے پاکستان کو بدنام بھی کیا گیا۔ اُس وقت جو حالات تھے اُن میں یہ کہنا کہ صرف گناہ گار ہی مارے گئے ہو نگے بھی خلاف حقیقت ہے لیکن

بیرونی ذرائع سے جو تعداد اور چنگیزیت بتائی جا رہی ہے وہ تو حقیقت کے قریب بھی نہیں۔ تین لاکھ ہلاک شدگان کو غیر جانبدار محقق شرمیلا بوس نے پچاس ہزار بتایا ہے یہ تعداد بھی کم نہیں اسے بھی نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن جس بے دردی سے بنگالیوں نے مغربی پاکستانیوں کا قتل عام کیا اُس کے بہت سے چشم دید گواہ بلکہ متاثرین آج بھی زندہ ہیں اور بہاری تو آج بھی بنگلہ دیش میں رنج والم کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ بنگلہ دیش آج جب یہ بات کرتا ہے کہ پاکستان اُس سے معافی مانگے تو وہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان پاکستانیوں کے خون کا حساب بھی ضروری سمجھے جن کے قتل عام کو کسی میڈیا نے کوریج نہ دی لیکن مکتی باہنی اور را نے اُنکے خون کو بہانا کارِ ثواب جانا۔ را نے اپنے قیام کا مقصد بڑی تندہی سے پورا کیا اور وہ ملک جس کے وجود کو بھارت نے پہلے دن سے ہی تسلیم نہیں کیا تھا اُسے توڑ کر ہی چھوڑا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ ایوارڈ ہے جو اس جُرم کو کرنے والی بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو بنگلہ دیش نے دیا ۔ بنگلہ دیشی حکومت نے اپنے 150 بیرونی دوستوں کو بنگلہ دیش کے قیام کے سلسلے میں ان کی خدمات کے صلے میں ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے جس کے پہلے ہی مرحلے پر پہلا ایوارڈ اندرا گاندھی کو دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ دراصل وہ ہی بنگلہ دیش کی بانی ہے اور بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمٰن اس کا ایک کارندہ۔ وہ جس مدد کے بہانے وہ اپنی افواج کو مشرقی پاکستان میں لائی تھی اسی مدد کی آڑ میں را نے بنگالی، پنجابی،

پٹھان اور بلوچیوں کا قتل عام کیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو جس طرح شہہ دی گئی وہ بھی را جیسی مکار ایجنسی کے لیے ہی ممکن تھا اُس کے اِس کام کو ہماری حکومت اور سیاستدانوں نے بھی آسان کیا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ آج بھی حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ، ہم آج بھی قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دے رہے ہیں ۔ را، مکتی باہنی، بھارتی حکومت ، بنگلہ دیش کے فارن فرینڈز جن میں کچھ پاکستانیوں کا نام بھی لیا جا رہا ہے سب اس سانحے کے ذمہ دار ہونگے لیکن اس سے سبق سیکھنا ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ آج جب پاکستان کو ہر طرح سے کمزور کرنے کے لیے ہر طرح کی طاقتیں بر سرپیکار ہیں کبھی پاکستان کے بارے میں منفی اور شرانگیز رپورٹیں شائع کی جارہی ہیں اور کبھی خدانخواستہ اس کا شیرازہ بکھر جانے کی پیش گوئیاں کی جارہی ہیں، بلوچستان میں بھارت اور را آج بھی سرگرم عمل ہے اور قبائلی علاقوں میں سی آئی اے اور امریکہ محوِ فساد ہے اور یہ طاقتیں ایک دوسرے کی دست و بازو بنی ہوئی ہیں، طالبان کے نام سے بھی معلوم نہیں کون کونسی طاقتیں دہشت گردی میں مصروف ہیں، لیکن ہم پھر بھی علاقیت اور فرقہ واریت کے فتنوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ علاقے کے نام پر، مذہب کے نام پر، فرقے کے نام پر قتل عام روز کا معمول ہے۔ پنجابی، پٹھان سندھی اور بلوچی اب موجود ہیں اور بہ زور و شور مصروف عمل بھی ہیں تو آج بھی اچھی توقع کیسے رکھی جائے۔

16 دسمبر ہماری تاریخ کا یوم سیاہ تو ہے ہی لیکن اگر اس دن کو ہم بجائے یوم سیاہ کے بطور یوم احتساب منالیں سب اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ لیں، ایک زبان دوسری زبان کو اور ایک صوبہ دوسرے صوبے کو حقیر نہ جانے ،وسائل بھی سانجھے ہوں ،دکھ اور درد بھی مشترک تو پھر ہی ہم دشمن کے وار سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اس دن اگر ہم یہی کرلیں کہ اپنے اندر موجود دشمنوں کی پہچان بھی کرلیں اور بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کی تدبیر بھی تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے 16 دسمبر 1971 کی سیاہ تاریخ سے سبق حاصل کی لیا ہے اور آئندہ ایسے سانحات و حادثات سے قوم کو کبھی نہیں گزرنا پڑے گا۔ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے،آمین۔

امریکہ افغانوں کا دوست یا دشمن

اس وقت امریکہ دنیا کے لیے دہشت کا ایک نشان بنا ہوا ہے اور خاص کر اُس کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی تو اس کے ہر ہر فعل سے عیاں ہو رہی ہے جہاں کہیں کسی ملک میں اُسے معمولی سا بہانہ ملا اُس نے خلق خدا میں فساد برپا کرنا اپنا فرض جانا۔ کہنے کو تو اوبامہ مسلم دوستی کا نعرہ لگاتا ہے اور اتحاد بین المذاہب کی بات بھی کرتا ہے لیکن عملاً ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔ دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر امریکہ صرف مسلمان مما لک میں ہی متحرک نظر آتا ہے اور جتنا بظاہر اسے ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بباطن اتنا ہی اسے پھیلایا جاتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس جس ملک میں وہ جاتا ہے وہاں دہشت گردی کو اتنا ہی زیادہ فروغ ملتا ہے اور نہ صرف وہ ملک بلکہ پورا علاقہ دہشت گردی کی زد میں آجاتا ہے جسکی سب سے بڑی مثال افغانستان میں اُس کی موجودگی اور پورے خطے خاص کر پاکستان میں بدامنی اور دہشت گردی کا راج ہے اور جب تک وہ یہاں موجود ہے کسی بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آرہی۔ کہنے کو تو امریکہ 2014 میں افغانستان سے نکلنے کی بات کر رہا ہے لیکن فی الحال اس کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے۔ امریکہ خود کو دنیا کے امن کا ضامن سمجھتا ہے لیکن ابھی تک اُس کے کریڈٹ پر ایسا کوئی کارنامہ نہیں۔ افغانستان اور پاکستان کے مغربی

سرحدی علاقے اسکے خیال میں دنیا بھر کے دہشت گردوں کی جائے پناہ ہیں جن پر وہ دس سال سے اپنے ہر طرح کے وسائل اور دماغی صلاحیتیں خرچ کر چکا ہے لیکن دہشت گردی میں کمی کی بجائے ہر روز اضافہ ہی دیکھنے میں آ رہا ہے۔ افغانستان جو کبھی پوست کی کاشت کا گڑھ تھا لیکن طالبان کے زمانے میں پوست سے پاک ملک بن گیا تھا آج ایک بار پھر پوست اور افیون کا گھر بن چکا ہے اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق اس ملک میں جرائم میں 39% اور پوست کی کاشت میں 18% اضافہ اسکے دعوئوں کی قلعی کھولنے کو کافی ہے۔ جرائم پیشہ افراد نہ صرف افغانستان میں کھل کھیل رہے ہیں بلکہ پاکستان میں بھی سمگل ہو رہے ہیں افغان حکومت باوجود مکمل امریکی حمایت اور مدد کے ان سارے مصائب و مسائل کے سامنے بے بس نظر آ رہی ہے۔ اس کو اپنے عوام کی نفرت اور غصے کو بھی برداشت کرنا پڑ رہا ہے اور کسی بھی قسم کی کامیابی بھی اُسے نہیں مل رہی کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ امریکہ افغانستان میں افغانوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفادات کے لیے بیٹھا ہوا ہے۔ اُسے یہاں بیٹھ کر نہ صرف وسطی ایشیائ کے توانائی کے خزانوں پر نظر رکھنی ہے بلکہ اس طرح وہ روس اور چین کی عسکری طاقت و قوت کا بھی بہتر اندازہ رکھ سکے گا۔ 2014 میں امریکہ نے بظاہر تو افغانستان سے نکلنے کا اعلان کیا ہے لیکن اب اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ افغانستان کو اس طرح چھوڑ کر نہیں جائے گا جیسے روس چھوڑ کر گیا تھا اور اس کے دیکھا دیکھی برطانیہ اور باقی نیٹو ممالک بھی اپنی کچھ نہ کچھ افواج افغانستان میں رکھیں گے یعنی اُس

نے خطے میں رہنے کا کوئی نہ کوئی جواز تلاش کیے رکھنا ہے اسی فوجی انخلائی کے سلسلے میں مارچ میں امریکہ اور افغانستان میں ایک معاہدہ طے پایا جس میں اس یاداشت پر دستخط کئے گئے کہ امریکہ بگرام ایئر بیس پر موجود قیدیوں اور اس بدنام زمانہ قید خانے کو افغان حکومت کے حوالے کر دے گا۔یاد رہے کہ اس جیل میں بہت سے ایسے قیدی بھی موجود ہیں جن پر اب تک نہ تو امریکہ نہ افغان حکومت کوئی الزام ثابت کر سکی ہے۔ معاہدہ تو ہوگیا تھا کہ چھ ماہ میں یہ کام مکمل کر لیا جائے گا لیکن اب بقول افغان صدر حامد کرزئی امریکہ اس میں لیت و لعل سے کام لے رہاہے اور ابھی تک اُس نے اس پر عمل نہیں کیا ہے۔

اگرچہ حامد کرزئی کو وقتاً فوقتاً امریکہ سے شکایت ہوتی رہی ہے اور وہ کبھی دبی آواز میں اور کبھی اپنے اندر کے افغان کو جگا کر بول لیتے ہیں تاہم پھر کسی مغلوب قوم کے سربراہ کی طرح امریکی مفادات کا تحفظ کرنے لگتے ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اپنے ملک کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرنے کے لیے کوئی کردار ادا کرتے جب کہ انہوں نے کئی کئی موقعوں پر امریکیوں کو آزمالیاہے بلکہ ایک بار توانہوں نے یہ تک کہا کہ شروع میں وہ ان غیر ملکیوں کے انکے ملک میں ایک ایک لمحے کی موجودگی کے لیے مشکور تھے لیکن اب وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے یہاں آئے ہیں انہیں افغانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔.برہم تو وہ اُس وقت بھی ہوئے جب امریکی جہازوں نے افغان سول

آبادی پر بمباری کی، اور اُس وقت بھی جب ان کے ملک میں اور ان کی حکومت میں نعوذباللہ قرآن شریف جلایا گیا، اُس وقت بھی ناگواری کا اظہار کیا جب امریکی سپاہیوں نے "مسلمان" طالبان کی لاشوں پر پیشاب کرنے جیسا غیر انسانی فعل کیا لیکن پھر بھی امریکہ اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر کرزئی اپنے دوست اور دشمن کی پہچان کر لیتے ،اپنی توانائیاں اُسی پاکستان کے خلاف استعمال کرنے سے گریز کرتے جس نے سالہاسال اپنی معیشت کو زیر بار رکھ کر انہیں اور ان کے ہموطنوں کو دشمن کے مقابلے میں پناہ دی اگر وہ یہی توانائی اپنے حقیقی دشمنوں کے خلاف استعمال کرتے تو شاید اب تک افغانستان کو آزاد کر چکے ہوتے لیکن دکھ اسی بات کا تو ہے کہ مسلمان نے ہمیشہ مسلمان سے ہی شکست کھائی ہے کسی اور قوم سے نہیں اگر میر جعفر و صادق نہ ہوتے تو سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان انگریز کی پہنچ سے بہت دور ہوتے۔ حامد کرزئی اگر اب بھی تاریخ سے سبق حاصل کرلیں، اپنے اوپر قابض قوم کے اعمال پر غور کریں اور اپنے مربیوں کی نیتوں کا ادراک کریں اور یہ سمجھ لیں کہ یہ لوگ مسلمانوں کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے بلکہ یہ تو پوری دنیا میں مسلمانوں کے درپۓ آزار ہیں تو شاید کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دے سکیں کہ اُن کی قوم ان کے پچھلے گناہ معاف کردے ورنہ شاید اب تو لوگ بگرام ائیر بیس کی پروان جیل کے خوف سے خاموش رہیں لیکن آنے والی افغان نسلیں انہیں نجیب اللہ اور ببرک کارمل سے بھی زیادہ سخت الفاظ اور سلوک کا

مستحق سمجھیں گی۔

دہشت گردی آخر کب تک

اسلام کا مطلب سلامتی اور ایمان کا امن ہے لیکن پوری غیر مُسلم دنیا آج اس کوشش میں بتلا ہے کہ اسلام کو دہشت گرد قرار دیا جائے اور بد قسمتی سے انہیں خود ہمارے اندر سے کچھ ایسے نام بھی میسر آ گئے ہیں جو ان کے مقاصد کے حصول کو آسان بنا رہے ہیں ۔ یہی عناصر ہیں جنھوں نے پاکستان کے امن کو تہہ و بالا کر رکھا ہے کبھی یہی عناصر فرقہ واریت ، کبھی لسانیت ، کبھی علاقائیت ، کبھی صوبائیت کے نام پر دہشت گردی میں مصروف ہیں۔ خود کو بہترین مسلمان کہنے والے دوسروں کے دین و ایمان کو کمزور اور مشکوک سمجھتے ہیں اور ان کو قتل کرکے ثواب کمانے کا بلکہ جنت کمانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جاتا ہے لیکن ایسا کرنے والوں کے پاس اسلام سے کوئی مستند حوالہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ وہ مذہب نہیں جو خلق خدا میں فساد پیدا کرے بلکہ یہ تو زمین میں فساد پھیلانے والوں کو ناپسندیدہ ترین قرار دیتا ہے اور ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل سمجھتا ہے۔ اگر یہ سب کرنے والے مسلمان ہیں تو وہ پہلے اپنے اسلام اور مسلمانی کا ثبوت پیش کریں ۔ تحریک طالبان کی طرف سے ہر حملے کی ذمہ داری قبول کرنا بھی مشکوک ہے یہ سطریں لکھتے ہوئے ہی یہ افسوس ناک خبر آئی ہے کہ پشاور میں خود کش دھماکے

میں خیبر پختونخواہ کے سینئر صوبائی وزیر اور اے این پی کے رہنما جناب بشیر احمد بلور شہید ہو گئے ہیں اس دھماکے میں اب تک نو افراد جاں بحق ہو چکے ہیں اور حسب معمول اس واقعے کی ذمہ داری بھی تحریک طالبان نے قبول کر لی ہے۔ لیکن کیا یہ دھماکے کرنے والے واقعی پاکستانی اور مسلمان ہیں بظاہر بھی اور اِن تمام واقعات کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بعد بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اِن عناصر کے ساتھ بیرونی مدد شامل ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اسی ملک میں پہلے بھی شیعہ اور سنی رہتے تھے اور اب بھی رہتے ہیں کہیں ایک آدھ واقعہ تصادم کا ہو بھی جاتا تھا تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے پنجابی ،پٹھان ، بلوچ، سندھی اور مہاجر پہلے بھی تھے اور خاص کر کراچی میں پہلے بھی یہ رہتے تھے لیکن ایک دوسرے کا قتل عام نہیں کرتے تھے پھر آخر اب ایسا کیوں ہے وہ کون سے لوگ ہیں جو ہمارے درمیان آگھسے ہیں جو نہ تو عوام کو بخش رہے ہیں نہ خواص کو۔ بشیر احمد بلور سے سیاسی یا نظریاتی کوئی بھی اختلاف کیا جائے لیکن قابل قتل جرم انہوں نے نہیں کیا تھا۔ نہ ان کی مسلمانی میں کسی کو شک تھا یہ انہی بلور برداران میں سے تھے جنہوں نے قابلِ اعتراض فلم بنانے والے گستاخ رسول کا سر قلم کرنے والے کے لیے اپنی جیب سے ایک لاکھ ڈالر کی خطیر رقم بطور انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔ دہشت گردی کی اس تازہ لہر نے ایک بار پھر پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور خیبر پختونخواہ کے تو اب گاؤں اور رہائشی علاقے بھی اس سے محفوظ نہیں مثنی اور پشتخرہ شہری علاقے نہیں

لیکن دہشت گردوں کی زد میں ہیں۔ کل کے واقعے میں تو یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا جلسہ نہیں تھا جس کی پورے شہر کو خبر ہوتی بلکہ یہ گھر میں ہونے والا چھوٹا سا اجلاس تھا جس میں انھوں نے خطاب کیا۔ بشیر احمد بلور ایک بہادر انسان تھے اور ایسے ہونے والے دھماکوں کی جائے وقوعہ پر فوراً پہنچتے تھے۔ یہ افسوس ناک واقعہ تو ملک میں ہونے والے بے شمار واقعات کی طرح ہو چکا۔ لیکن کیا اِن دھماکوں اور دہشت گردی کی جڑ تک پہنچنے کی کوئی حکمت عملی بھی طے ہو گی یا نہیں۔ صرف چند دن پہلے ہی پشاور ائیر بیس اور اُس کے بعد متنی تھانہ کو دہشت گردوں نے نشانہ بنایا اگرچہ شاید پہلی بار کسی حملے کو اُس طرح روکا گیا جیسا پشاور ائیر بیس پر کیا گیا کئی دہشت گرد بھی مارے گئے اور اگلے دن بھی پانچ دہشت گردوں کو تلاش کر کے ہلاک کیا گیا لیکن ہر واقعے کے بعد یہ کہہ دینا کہ دہشت گردوں کی کمر توڑ دی گئی ہے صرف ایک طفل تسلی ہے لیکن اب اس دہشت گردی جس نے پورے ملک میں ایک طوفان اٹھا رکھا ہے کو ختم کرنے کے لیے کوئی ایسی حکمت عملی طے کرنی ہو گی کہ نہ صرف اس کا مقابلہ کیا جا سکے بلکہ اسے ختم کیا جا سکے۔ تحریک طالبان کی طرف سے مختلف ناموں سے آنے والے پیغامات کی بنا پر ہر واقعے کو ان کے کھاتے میں ڈال دینا اور پھر اِن سایوں کے پیچھے بھاگتے رہنا کوئی حکمت عملی نہیں۔ بلکہ اِن کی روک تھام کے لیے ایسی ہمہ جہت پالیسی کی ضرورت ہے جس کی مدد سے اِن دہشت گردوں کی جڑ تک پہنچا جا سکے اور اس پر خارجہ و داخلہ ہر ہر نہج

سے سوچنے کی ضرورت ہے یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ اِن واقعات کی ایک لہر کے بعد وقفے میں کس طرح اور کہاں سے دوبارہ افرادی قوت یعنی مزید خود کش بمبار تیار کر لیے جاتے ہیں اور کہاں سے اسلحہ اور بارود اور خود کش جیکیٹس مہیا ہو جاتی ہیں اگر یہ لوگ ہفتے میں آٹھ دس بمبار اڑاتے ہیں تو کیا بقول حکومت کے یہ تین پانچ ہزار طالبان ختم نہ ہو چکے ہوتے۔ سوچنے کو بہت کچھ ہے اور پھر حکمت عملی تربیت دیتے وقت اِن عوامل کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔ سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ پشاور ائیر بیس کے خود کشوں کے جسموں پر جو ٹیٹوز کندہ ہوئے ملے ہیں وہ کس اسلامی نظریے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خود کشی کی اسلام میں حرمت بھی مستند ہے، اسلام کی امن پسندی بھی ایک مستحکم حقیقت ہے اور اس مذہب میں انسانی جان کی قیمت بھی انمول ہے پھر آخر ایسا کرنے والے کون ہیں اور وہ خاص کر اسلام کا نام کیوں استعمال کر رہے ہیں وہ کون سی ٹیکنالوجی ہے جو اِن سنگلاخ پہاڑوں میں پیدا ہونے والے، پلنے والے اور رہنے والے لوگوں کو حاصل ہو گئی ہے کہ وہ انسانی ذہنوں کو یوں بدل دیتے ہیں کہ نہ اپنی جان کی اہمیت رہتی ہے نہ دوسرے کی۔

زندگی کسی لیڈر کی ہو یا عام انسان کی اُس کی قیمت ایک ہے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اتنی سیکیورٹی کے باوجود کوئی جان محفوظ نہیں تو ایک عام جان کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اس ملک کا ہر شہری آج یہ سوال کرتا ہے کہ یہ حالات

کب بدلیں گے کب وہ سکون اور اطمینان سے اپنی زندگی گزار سکیں گے، سیاسی عمل،
کاروبار، تعلیم غرض ہر شعبہ کب اپنی نارمل حالت پر لوٹ سکے گا ہم آخر کب تک
دھماکوں کی زد میں رہیں گے اسلام کے نام کو بدنام کرکے آخر ہم کس مسلمانی کا ثبوت
دے رہے ہیں۔

فیئر ٹرائل بِل اندیشے اور ضرورت

پاکستان پچھلے بارہ سال سے دہشت گردی کی آگ میں مسلسل جل رہا ہے۔ فوجی آپریشن بھی ہوئے ، مذاکرات بھی ہوئے وقتی کامیابیاں بھی ہوئیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں حالات گھوم پھر کر پھر وہیں آ جاتے ہیں اور وطن عزیز کے در و بام اور سڑکیں و بازار پھر بم دھماکوں سے گونج اٹھتے ہیں۔ ٹارگٹ کلنگ ہر روز بے گناہوں کی جان لے رہی ہے صرف اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے ختم نہیں ہوتی نہ کوئٹہ میں نہ کراچی میں نہ پشاور یا پنجاب کے کسی شہر میں۔ تھانوں پر بھی حملے ہوتے ہیں اور دفاعی تنصیبات پر بھی۔ مہران یا پشاور ائیر بیس ہو یا کامرہ اور واہ کی اسلحہ ساز فیکٹریاں یہاں تک کہ جی ایچ کیو بھی ان کی زد میں آیا۔ اس دہشت گردی نے ہزاروں افراد کی جان لی جن میں عوام اور خواص کی کوئی تخصیص نہیں اور نہ ہی بچوں اور بڑوں کی کوئی تمیز ہے۔ اگرچہ حکومت اکثر اوقات مختلف قسم کے اقدامات اٹھاتی رہی ہے کہ حالات کو قابو میں کیا جا سکے جس میں خصوصی دنوں پر موبائل فون سروس کا بند کرنا بھی شامل ہے جس پر تنقید بھی ہوتی ہے تاہم اکثر نتائج مثبت بھی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اس مسئلے کا مستقل حل نہیں اور دس سال تک اِن حالات کو برداشت کرنے کے بعد عوام بجا طور پر کسی ٹھوس اور مستقل حل کا مطالبہ کرتے ہیں۔

دہشت گرد اس وقت جس آزادی اور تسلی سے اپنا کام کر رہے ہیں ضروری ہے کہ انکے پکڑے جانے کے لیے ہر ممکن اقدام کیا جائے۔ اور تمام جدید اور سائنسی طریقہ ہائے کار بروئے کار لائے جائیں تاکہ شواہد نہ ملنے کا عذر بھی ختم کرکے انہیں سخت ترین سزائیں دی جاسکیں اور ان کو دوسروں کے لیے نشان عبرت بنایا جاسکے۔ حکومت نے اگرچہ دہشت گردی روکنے کی وقتی کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں تاہم کوئی ٹھوس قانون سازی نظر نہیں آرہی تھی۔ اب پارلیمنٹ نے 20 دسمبر 2012 کو ایک بل منظور کیا ہے اور اسے فئیر ٹرائل بل کا نام دیا ہے۔ جس کے تحت ملک کی چھ انٹیلجنس ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ کسی بھی شہری کے ٹیلیفون، ای میلز اور ایس ایم ایس کو پڑھ یا سن سکیں گے اور ان میں مداخلت کرکے اسے روک بھی سکیں۔ ان اداروں میں تینوں مسلح افواج کی خفیہ ایجنسیاں، آئی ایس آئی، آئی بی اور پولیس شامل ہیں۔ بظاہر دیکھا جائے تو یہ بل شہریوں کے نجی معاملات میں مداخلت ہے جو کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں ایک ناپسندیدہ فعل اور عمل ہے اور اس کی زد میں انتہائی ذاتی رابطے اور معاملات بھی آسکتے ہیں جو کہ کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ اور اِن ہی نکات کو بنیاد بنا کر اعتراض کرنے والے اس بل کی مخالفت کر رہے جو کہ عام حالات میں تو بالکل بجا اور مناسب سمجھی جاسکتی ہے لیکن اِن دنوں ملک جن حالات سے گزر رہا ہے اُن

میں کچھ سخت فیصلوں کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سب ہی مانتے ہیں کہ موبائل فون نے ایسی کاروائیوں کے دوران باہمی رابطے اور ربط کو کتنا آسان کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور ای میل نے بھی کسی راز کو راز نہیں چھوڑا۔ گوگل ارتھ سے اگر ایک عام شہری کسی بھی عمارت اور موقع کی انتہائی درست سمت اور مقام کا تعین کر سکتا ہے تو ایک دہشت گرد گروہ بھی اپنے خودکش کارندوں کو اس مقام تک پہنچا سکتا ہے اور وہ یہ ٹیکنالوجی بڑی کامیابی سے استعمال کر رہے ہیں، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں ہوتا نہ ہی کوئی اور ثبوت اور شواہد مجرم تک پہنچنے کے لیے موجود ہوتے ہیں اور ان ہی ناکافی ثبوتوں کی بنا پر ہماری عدالتیں کچھ ایسے مجرموں کو بھی چھوڑ دیتی ہیں جو کہ جائے وقوعہ سے پکڑے گئے ہوتے ہیں جس کی ایک بڑی مثال تو ڈاکٹر عثمان کی ہے۔ اسے پکڑے جانے کے بعد چھوڑا گیا اور تب ہی اُس نے جی ایچ کیو پر حملے کی منصوبہ بندی اور سرکردگی کی۔

مذکورہ بل کم از کم ان ثبوتوں کو تو مستحکم کرے گا جو اب تک گرفت میں نہیں آرہے تھے۔ پاکستان میں جس حساب سے دہشت گردی ہو رہی ہے اور جس طرح انسانی جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے جس طرح اہم تنصیبات کو نشانہ بنایا جارہا ہے اس کے لیے کوئی بھی ایسی قانون سازی کی جائے جو اِن واقعات کی روک تھام میں مددگار ہو تو وقتی طور پر اس کے منفی اثرات کو بھی قبول کیا جا سکتا ہے

جہاں تک اس قانون کو لاگو کرنے میں احتیاط کا سوال ہے اس کو ضرور برتنا ہوگا۔
مخالفت کرنے والے اس اندیشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اسے غلط استعمال کیا جا سکتا ہے
اگرچہ اسے استعمال کرنے کے لیے ہائی کورٹ کے کسی جج کی اجازت کی ضرورت ہوگی
تاہم پھر بھی اس پر سخت نگرانی اور احتیاط کی ضرورت ہوگی جہاں تک کچھ سیاسی
جماعتوں کے اس خدشے کا سوال ہے کہ سیاسی مخالفین اسے ایک دوسرے کے خلاف
استعمال کر سکتے ہیں تو اس کا علاج خود سیاستدانوں کے پاس ہے کہ وہ خود کو اتنا مہذب
اور شائستہ بنائیں کہ کسی ایسی غیر مہذب حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں
سیاست اور دہشت گردی میں فرق کو قائم رکھیں اور ایسا کرنے والے کسی سیاسی کارکن
کو خود اپنی ہی جماعت اتنی سخت سزا ضرور دے کہ دوسرا ایسی حرکت کرنے کا سوچے بھی
نہ۔ بجائے اندیشوں اور خدشوں کے ہمیں اپنے قومی اور سیاسی کردار کی تعمیر کرنا ہوگی۔
جہاں تک مختار اداروں کی طرف سے خوف ہے تو اگر ہم اِن کو قومی سلامتی کا ذمہ دار
سمجھتے ہیں تو اِن پر بھروسہ بھی کرنا ہوگا۔ مختصراً یہ کہ ''انوسٹیگیشن آف فیئر ٹرائیل
بل'' کے اگر کچھ منفی اثرات ہوں بھی تو ہمیں دہشت گردی کے '' جن'' سے لڑنے کے
لیے کچھ سخت فیصلے کرنا اور قبول کرنا ہونگے اگر قومی اسمبلی نے اس بل کو متفقہ طور پر
منظور کر لیا ہے تو اسے قانون و آئین کا حصہ بنا کر لاگو کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا
چاہیے اس وقت ملک جس انتہا درجے کے مسئلے سے دوچار ہے اُس کا مقابلہ ہر محاذ پر
ضروری ہے تاکہ

شہریوں کے جان و مال کو محفوظ بنایا جاسکے۔

گوادر پورٹ خدائی نعمت لیکن بے قدری کیوں

طویل ساحلی پٹی اللہ تعالی کی نعمت اور کسی ملک کی خوش قسمتی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور اللہ تعالی نے اس نعمت اور خوش قسمتی سے پاکستان کو نوازا ہوا ہے اس گیارہ سو کلومیٹر لمبی ساحلی پٹی کو پاکستان کی ترقی و خوشحالی میں ایک کلیدی کردار ادا کرنا چاہیے تھا کیونکہ دنیا کے اہم ترین تزویراتی اور تجارتی مقام پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ اپنی حیثیت و اہمیت کا فائدہ اٹھا سکتا تھا اور ہے لیکن اس کے لیے پہلی شرط خلوص نیت اور پھر درست منصوبہ بندی اور لگن ہے جس کا ہمارے ہاں درحقیقت فقدان ہے۔ اور ہماری بہت ساری خوش قسمتیوں کی طرح ہماری گوادر جیسی خوش قسمتی بھی اس کی نذر ہوتی جا رہی ہے۔ گوادر جسے ہم نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے پاکستان کی ترقی کا زینہ بنا سکتے تھے وہ ہماری بے توجہی بلکہ مجرمانہ غفلت کی نذر ہوتا جا رہا ہے۔ گوادر کی بندرگاہ قدرتی طور پر کٹی پھٹی ہے اور اسی وجہ سے جہازوں کی آمدورفت کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ یہ دنیا کے انتہائی حساس ترین علاقوں میں سے ایک ہے جس کے ایک طرف تیل سے بھرپور علاقے یعنی مشرقِ وسطیٰ کے ممالک، دوسری طرف دنیا کا سب سے زیادہ آباد خطہ یعنی جنوبی ایشیا اور تیسری طرف توانائی کے خزانوں سے مالامال وسطی ایشیائی واقع ہیں۔ آبنائے ہرمز یہاں سے 624 ناٹیکل میل یعنی تقریبا ساڑھے گیارہ سو

کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس اہم گزرگاہ سے سترہ بی بی ڈی تیل روزانہ گزرتا ہے۔ انہی سارے حقائق کو مد نظر رکھ کر 2002 میں گوادر کے ساحل کو گہرے پانیوں کی بندرگاہ کے طور پر ترقی دینے کا فیصلہ کیا گیا، یہ فیصلہ تجارتی اور دفاعی دونوں لحاظ سے کیا گیا اور یہ دونوں وجوہات بہت اہم تھیں۔ دفاعی لحاظ سے اس لیے کہ 1971 میں جس طرح بھارت نے پاکستان کی بحری ناکہ بندی کی تھی وہ صورت حال پھر پیدا نہ ہوسکے اور کراچی کی بندرگاہ کی بندش کی صورت میں بھی پاکستان اپاہج اور مجبور نہ ہو اور اپنا دفاع جاری رکھ سکے۔ اور تین اہم خطوں کے سنگھم پر واقع ہونے کی وجہ سے بھی حفاظتی اقدام ضروری تھا۔ خاص کر آبنائے ہرمز سے قریب ہونے کی وجہ سے بھی حساسیت کی نوعیت بڑھ جاتی ہے اور یہی گزرگاہ جو مشرق وسطی سے تیل لیکر چین، جاپان، جنوبی کوریا اور پوری دنیا کا 35 تا 40 فیصد تیل پہنچانے کا کام کرتی ہے گوادر کی تجارتی اہمیت کو بھی بڑھا دیتی ہے۔ گوادر وسطی ایشیا اور مغربی چین کو بین الاقوامی تجارتی گزرگاہوں سے ملانے کے لیے قریب ترین بندرگاہ ہے۔ وسطی ایشیا کے لینڈ لاکڈ خطے کی تجارت یہاں سے کم ترین وقت اور پیسے میں ممکن ہے۔ اب اس ازحد اہمیت کی وجہ سے جو ایک کام شروع ہو چکا ہے اُس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کیوں نہیں کی جارہی بلکہ عدم استعمال سے تو اب تک کیا گیا کام بھی خرابی کی جانب ہی رواں ہوگا اور ملکی ترقی میں ایک کارآمد منصوبہ صرف نااہلی کی وجہ سے ناکارہ ہوتا جارہا ہے۔ اس بندرگاہ کی ترقی کے لیے

میں گوادر پورٹ اتھارٹی بنائی گئی تھی اور اس نے سنگاپور کے پورٹ آف 2006 کے ساتھ Concession Holing Company سنگاپور اتھارٹی کے ذیلی ادارے معاہدہ کیا کہ وہ پانچ سال میں بندرگاہ کی ترقی و تعمیر میں 550 ملین ڈالر لگائے گا لیکن ایسا کیا نہیں گیا۔ابتدائ میں یہ ٹھیکہ چالیس سال کے لیے دیا گیا تھا جسے سپریم کورٹ کی مداخلت پر منسوخ کیا گیا اور اب پانچ سال کی مدت پوری ہونے کے بعد ستمبر 2012 ہیں چین کے ساتھ اس بندرگاہ کی ترقی کا معاہدہ کیا گیا ہے۔

گوادر پاکستان کی ترقی و خوشحالی کا زینہ بن سکتا ہے لیکن حکومتوں کی بے رخی اور بے اعتنائی نے ایسا ہونے نہیں دیا گوادر کے ساحل کا سروے 1954 میں یو ایس جنرل سروے نے کیا اور اسے بندرگاہ کے لیے موزوں قرار دیا لیکن صرف ایک چھوٹی بندرگاہ میں بن سکی اور پھر 1993 میں اس پر کچھ کام ہوا تاہم بڑی بندرگاہ پر کام 1988 میں شروع ہوا انہی وقفوں سے حکومتی دلچسپی ظاہر ہو جاتی ہے لیکن اب جبکہ 2002 خوش قسمتی سے یہ بندرگاہ بن چکی ہے تو ہمیں اسے ملکی ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہیے تھا لیکن ہمارے وزیر برائے جہاز رانی و بندرگاہ اپنی پارٹی کے تو بڑے سرگرم اور اہم رکن ہیں اور اس کی بہتر اور زبردست ترجمانی کرتے رہتے ہیں لیکن اس اہم ترین منصوبے کی طرف اُن کی وہ توجہ نہیں جو ہونی چاہیے۔کچھ لوگ تو یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ ان کا

تعلق کراچی سے ہونے کی وجہ وہ کراچی کی اہمیت کم نہیں کرنا چاہ رہے اگرچہ میں اس رائے کو زیادہ درست نہیں مانتی لیکن اگر ایسا ہے بھی تو گوادر کی اہمیت اپنی جگہ لیکن کراچی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے دفاعی بھی اور تجارتی بھی۔ پاکستان ایک ترقی یافتہ ملک ہوگا تو اس کی تمام بندرگاہیں ہر وقت یکساں مصروف اور اہم رہیں گی۔

ایران ہمارا برادر اسلامی ملک ہے لیکن اگر وہ گوادر سے ستر پچھتر کلومیٹر دور اپنی چاہ بہار کی بندرگاہ کو گوادر کے مقابلے پر تعمیر کر رہا ہے اور اس کے لیے اُس نے بھارت کی خدمات حاصل کی ہوئی ہیں تو ہمیں بھی اپنی حیثیت پر غور کر لینا چاہیے ہمارے وزیر باتد بیر کو پاکستان نیوی پر زمین پر قبضے کا الزام لگانے پر زیادہ زور دینے کی بجائے اس اہم قومی منصوبے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے ان کا یہ کہنا کہ ساحل سمندر پر 584 ایکڑ اراضی نیوی کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے بندرگاہ ترقی نہ کر سکی۔ تو کیا ریلوے لائن نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے اور بہتر سڑک نہ ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔ خدارا قومی اہمیت و ترقی کے منصوبوں کو یوں تباہ نہ کیجئے نیوی، وزارت جہاز رانی و بندرگاہیں حتیٰ کہ وزارتِ تجارت اور تاجر برادری سب اس خدائی نعمت سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ بندرگاہ قدرتی طور پر اپنی آس پاس کی بندرگاہوں سے زیادہ آئیڈیل ہے اور چین، افغانستان اور وسطی ایشیائی کے غیر ساحلی یعنی

لینڈ لاکڈ ملکوں کے زیادہ نزدیک ہے،ان کے لیے اس کے ذریعے تجارت کم خرچ اور کم وقت طلب ہے اور ظاہر ہے وہ اسے دوسروں ترجیح دیں گے لیکن ہماری طرف سے اگر کوتاہی ہوئی تو پھر وہ دوسری طرف دیکھنا شروع کردیں گے.برآمدات کے لیے بھی اور درآمدات کے لیے بھی۔ اگرچہ ہم نے بہت سارا وقت گنوادیا ہے لیکن اس کا ازالہ اب بھی ممکن ہے اگر ہمارا ہر ادارہ جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس منصوبے سے ہے اس کی ترقی کو اپنی ذمہ داری سمجھے اور ایک دوسرے پر الزام تراشی سے گریز کرکے اپنا کام کرے اور بے غرض ہو کر کرے تو گوادر اب بھی پاکستان کی خوش بختی اور ترقی ضامن سکتا ہے۔

قائداعظم ۔۔۔ اٹھارہ کروڑلوگوں کا بابا

شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک میں یہ طرزِ سیاست ہو جو پاکستان میں ہے کہ اپنے دیئے کو چاند بنانے کے لیے نہ تو کسی کی جان کو بخشتے ہیں نہ عزت کو لیکن ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے تو حد کرتے ہوئے اور خود کو بچانے کے لیے قائداعظم محمد علی جناح کو جس طرح ڈرون مارا ہے وہ انتہائی قابل افسوس ہی نہیں بلکہ قابل مذمت ہے۔ اپنی ذات اور سیاست بچانے کے لیے اگر چند اُن اشخاص کو بخش دیا جائے جن کو قوم غیر متنازعہ ہیرو مانتی ہے، انہیں یوں اپنی خاطر نہ گھسیٹا جائے تو قوم کے اوپر یہ ہمارے سیاستدانوں کا احسان ہوگا۔ اگر پینسٹھ سال تک قائد کو قوم نے غیر متنازعہ قائد مانا ہے بلکہ تحریکِ پاکستان کے سال بھی شمار میں ڈال دیجئے تو یہ پچھتر، اسّی سال ہو جاتے ہیں تو اب بھی انہیں متنازعہ بنانے کی کوشش نہ کی جائے ۔بعد میں ہرزہ سرائی کی جتنی تو جیہات پیش کی جائیں وہ پہلا تاثر زائل نہیں کرتیں۔ میں مانتی ہوں کہ قائداعظم معصوم عن الخطا نہیں تھے وہ نعوذباللہ کوئی پیغمبر یا صحابی بھی نہیں تھے کہ جن کے خلاف بات کرنے کو میں گناہ سمجھوں جیسا کہ ایم کیو ایم کے ایک لیڈر نے اپنے ’’قائدِ تحریک‘‘ کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ مثال تو نبی اور صحابہ کی بھی دی جاتی ہے تو قائداعظم کی کیوں نہیں دی جا سکتی یہ بات درست ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ

اپنے قومی ہیروز کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا جائے۔ لگتا تو ایسا ہے کہ ایک لاولد انسان سمجھ کر محمد علی جناح کو الطاف حسین نے ڈرون مارا ہے لیکن وہ بھول گئے وہ کہ محمد علی جناح ہی نہیں قائداعظم بھی ہیں سچ مچ کے قائد اور اٹھارہ کروڑ عوام کے روحانی باپ اور یہ قوم بحیثیت قوم اب بھی اتنی گئی گزری نہیں ہے یہ باقی ہر قسم کے قائدوں کو تو بھول جاتی ہے اور گزرتے وقت اور گزرتی حکومت کے ساتھ ان کی قیادت بھی وہ نہیں رہتی جو حاکمیت کے زمانے میں ہوتی ہے اگر الطاف صاحب اور ان کے عہدہ داران ان احساسات کو صرف میری جذباتیت سمجھ رہے ہیں تو ایسا نہیں بلکہ یہ اُن سب لوگوں کے جذبات ہیں جن سے اُن کے اس خطاب کے بعد میری بات ہوئی۔

قائداعظم کے پاسپورٹ پر اگر تاریخ ملاخطہ کی جائے تو وہ ہے 28 نومبر 1946 یعنی پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے تو ان کا پاسپورٹ پاکستانی کیسے ہو سکتا تھا جس کو پاسپورٹ آفس آف سندھ نے کراچی میں جاری کیا تھا۔ پھر ان کو دہری شہریت کا طعنہ کیوں دیا گیا یہ بات بعید از عقل ہے۔ اگر ہمارے سیاستدان پاکستان سے واقعی محبت کرتے ہیں صرف ووٹ اور حکومت کے لیے نہیں اور آئین اور قانون ان کو دہری شہریت کے ساتھ اسمبلی میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا تو دوسرے ملک کی شہریت چھوڑ دینے میں قباحت کیا ہے۔اور اگر حد ادب نہ ہو اور میں اپنے محترم اور شجر ممنوعہ قسم کے سیاستدانوں سے یہ پوچھ

سکوں کیا وہ قائدا عظم کی طرح اپنی جائیداد حکومت پاکستان اور عوام پاکستان کے لیے وقف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں لیکن اس سوال کا جواب خود میرے اپنے پاس بلکہ پاکستان کے ہر فرد کے پاس موجود ہے کہ وہ تو اربوں کے مالک ہو کر بھی حکومت سے قرضے کے نام پر پیسے لیتے ہیں اور پھر انہیں معاف کر والیتے ہیں ملک کے بڑے بڑے منصوبے اپنے ذاتی مفاد کے لیے بیچ دیتے ہیں۔ یہ بھی عرض ہے کہ قائدا عظم نے جب حلف اٹھایا تھا تو وہ گورنر جنرل تھے اور گورنر جنرل تاج برطانیہ کا نمائندہ ہوتا ہے لہٰذا یہ قانونی مجبوری تھی اور ابھی تو پاکستان وجود میں بھی نہیں آیا تو کیسے ایک ناموجود ملک کا آئین بنتا جس کی وفاداری کا وہ اعلان کرتے اور افسوس کہ قائد کی زندگی نے تو اتنی وفا بھی نہ کی کہ وہ پاکستان کا آئین بنتے ہوئے دیکھتے اور اس کا حلف اٹھاتے۔ لیکن وفادار وہ عوام پاکستان کے ہی رہے وہ مشکل ترین حالات میں بھی ملک چھوڑ کر نہیں گئے بہتّر کلو گرام وزن ،اُس وقت کے لاعلاج مرض ٹی بی میں مبتلائ، خود اپنی ذاتی حیثیت میں بیرونِ ملک علاج کی استطاعت رکھنے کے باوجود علاج کے لیے باہر نہ گئے اپنے ہی ملک کے کم وسائل ڈاکٹروں سے علاج کرواتے رہے۔ چھینک آنے پر بھی آج کے سیاستدانوں کی طرح بیرون ملک کا رخ نہیں کیا۔ ایک خراب ہو کر راستے میں رکی ہوئی ایمبولنس میں زندگی کی آخری سانسیں لیں لیکن اس زمین سے جدا نہ ہوئے۔

قائداعظم کا اور خود کا موازنہ کرنے والوں کو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُنھوں نے پاکستان بنایا توڑنے کی باتیں نہیں کیں بات بات پر یہ دھمکی نہیں دی کہ اِن ،اِن اور اِن اقدامات کی روشنی میں ملک ٹوٹ سکتا ہے یا ہماری بات مانی جائے ۔ نہ ہی پاکستان کے قیام کو غلطی قرار دیا بلکہ اپنی زندگی کا آخری سال جو اس آزاد ملک میں گزارا وہ اس کی سالمیت اور ترقی کی بھاگ دوڑ اور کوشش میں گزرا۔ ایک عام آدمی آج بھی یہ سوچتا ہے کہ کاش وہ مزید چند سال زندہ رہتے تو پاکستان ایک زیادہ مضبوط ملک اور مستحکم جمہوریت ہوتا۔

ایم کیو ایم اس بات کو اپنے سیاسی فائدے کے لیے تو استعمال کرتی ہے کہ وہ، وہ لوگ ہیں جنھوں نے پاکستان بنایا تو عرض ہے کہ پاکستان برصغیر پاک و ہند کے ہر مسلمان نے بنایا، ہاں اللہ نے آپ کو یہ عزت دی کہ آپ کے بزرگوں نے اس ملک کی خاطر ہجرت کی تو کم از کم اپنے بزرگوں کی ہجرت اور خون کی ہی لاج رکھ لیں اور بات بات پر ملکی سالمیت کے خطرے میں ہونے کی بات مت کریں اور وہ جس کی آواز پر آپ کے بزرگوں نے لبیک کہا تھا اپنا گھر بار چھوڑا تھا، اپنے گاؤں، اپنے شہر چھوڑے تھے بلکہ ادھورے جسم لائے تھے کہیں جسم چھوڑ آئے تھے کہیں سر۔ لیکن یہاں پہنچ کر ایک لفظ شکوے کا زبان پر نہیں لائے تھے نہ شکایت کی تھی کہ محمد علی جناح یہ تم نے کیا کیا بلکہ پاک سرزمین پر

سر رکھ کر سجدہ شکر بجا لائے تھے۔ خود احسان مانا تھا بار بار اس ملک پر احسان جتایا
نہیں تھا وہ واقعی عظیم لوگ تھے ان کی عظمت کو گھن مت لگایئے اپنے رب کا احسان
مانیے اس کا شکرادا کیجئے کہ اُس نے آپ کو شناخت دی اور اس شخصیت کا ممنون احسان
ہو جایئے جس کا نام محمد علی جناح تھا لیکن قوم نے اُس کی خدمات کے صلے میں اُسے اپنا
قائدا عظم مانا۔ قائدا عظم اور آپ کا کوئی مقابلہ نہیں ان کو اپنی سیاسی ضرورت کے لیے
استعمال مت کیجئے۔ آخر کو وہ اٹھارہ کروڑ لوگوں کا بابا ہے کوئی لاوارث شخص نہیں۔

دشمن وہی روپ کئی

اسے پاکستان کی بدقسمتی کہیے کہ اس کی سرحد پر ایک ایسا دشمن موجود ہے جس کی ہر پالیسی پاکستان دشمنی کے گرد گھومتی ہے۔ وہ دنیا میں اسلحے کا دوسرا بڑا خریدار ہے اور یہ اسلحہ وہ بلا تخصیص ہر فروخت کنندہ سے حاصل کر رہا ہے۔ چاہے وہ امریکہ ہے، اسرائیل ہے، روس،، برطانیہ یا فرانس ہے اور اس اسلحے کا شاید کسی حد تک نشانہ تو چین بھی ہوگا لیکن بنیادی طور پر اس ساری تیاری کا مرکزی نکتہ پاکستان ہے کہ کسی طرح اُسے صفحۂ ہستی سے خدانخواستہ مٹا دیا جائے۔ بات یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ اگر پاکستان کسی خیر سگالی کا مظاہرہ بھی کرے تو ادھر سے جواب میں معاندانہ رویے ہی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان آرمی نے اندرونی خطرات کو پاکستان کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ چھیاسٹھ سالہ پالیسی کو تبدیل کیا گیا اور بھارت کو دوسرے درجے پر خطرناک قرار دیا گیا کم از کم میڈیا پر اس تبدیلی کو ایسا ہی پیش کیا گیا۔ اگرچہ آرمی چیف نے کہا کہ اس بات کو سیاق و سباق کو شامل کئے بغیر پیش کیا جا رہا ہے۔ تاہم جو بھی تھا ایک ضروری یا غیر ضروری خیر سگالی کا مظاہرہ کیا گیا تھا جس کے بعد بھارت نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ سرحد پر اپنا اصلی چہرہ دکھائے اور بتا دے کہ وہ آج بھی پاکستان کے بارے میں اپنا زہریلا

رویہ قائم رکھے ہوئے ہے اور نہ صرف سرحد کی بار بار خلاف ورزی کی گئی ،ہمارے دو جوان شہید ہوئے بلکہ بھارتی میڈیا پاکستان اور پاک فوج پر چنگھاڑتا رہا۔ اور نہ صرف میڈیا بلکہ بھارتی آرمی چیف اور وزیراعظم نے بھی اپنا پیشہ ورانہ فرض سمجھا کہ پاکستان پر برس پڑے بلکہ ہر ایک نے حسب توفیق دھمکیاں بھی دیں۔ سرحد پر موجود صورت حال کے بارے میں جب پاکستان نے اقوام متحدہ سے تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا تو اُسے بھی رد کر دیا گیا۔ اور وزیراعظم من موہن سنگھ نے بتا دیا کہ اب پاکستان سے حالات خوشگوار نہیں رہ سکتے۔ تو بات یہ ہے کہ حالات ناخوشگوار ہونے کے لیے تو کسی کھیل میں ہی سہی پاکستانی ٹیم کی جیت ہی کافی ہوتی ہے۔ کرکٹ سیریز میں جیت یا ہاکی ایشین چیمپین شپ میں جیت ۔ ہاکی میچ میں تو بھارتی ٹیم میدان ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہاکی کے پاکستانی کھلاڑیوں کو معاہدے کے باوجود اور بھارت پہنچنے کے بعد شیوسینا کی فرمائش پر واپس کر دیا گیا یعنی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی باگ ڈور عملاً شدت پسند ہندئوں کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان بلائنڈ ٹیم کے نابینا کپتان کو تیزاب پلانے جیسا غیر انسانی فعل کیا گیا اور اس پر انسانی حقوق کی تنظیموں کو سانپ سونگھا ہی رہا اور ہوٹل انتظامیہ کے صرف سوری کہنے کو ہی کافی سمجھا گیا۔ یہ تو حال ہی میں صرف کھیل کے میدان میں اس کا رویہ ہے۔ ورنہ موقع جہاں بھی ملتا ہے اسکا حال یہی رہتا ہے۔

کسی بھی پُرامن مسلمان اور پاکستانی کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ دنیا میں بالعموم اور ہمارے اپنے خطے میں بالخصوص امن ہو لیکن کیا امن قائم رکھنے کی یہ ذمہ داری صرف پاکستان کی ہے کیا بھارت کا کام صرف چودھراہٹ دکھانا ہے۔ امن کی آشا امید اور خواہش سب کو ہے لیکن ایسے نہیں کہ ہم بھارت کی مرضی پر چلتے رہیں تو ہم اچھے، اپنے مفادات کی بات کی تو دہشت گرد۔ دہشت گرد یقینا ہمارے لیے اس وقت بہت بڑا خطرہ ہیں لیکن آخر اِن کو مدد کون فراہم کر رہا ہے۔ میرے اس سوال کا درست جواب آخر کس کے پاس ہو گا کہ ان سنگلاخ پہاڑوں میں اتنی دولت ،اتنا اسلحہ، اتنی گاڑیاں اور اتنا بارود آخر کہاں سے آتا ہے۔ بلوچوں کو اسلحے کے کون سے تاجر گولہ بارود پاکستان کی تمام ایجنسیوں کی نظروں سے بچا کر فراہم کرتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اندرونی وسائل سے ہو رہا ہے یا بھارت اور امریکہ بمعہ اسرائیل ایسا کر رہے ہیں۔ ان ملکوں کا نام سنتے ہی کچھ نام نہاد روشن خیال آپ کو قنوطی اور بے ثبوت بات کرنے کا طعنہ دیتے ہیں چلیئے مان لیتے ہیں لیکن اس سوال کا جواب اور ثبوت بھی ضروری ہے کہ ہمارے یہ پہاڑی اور پسماندہ، رزق روزی کی تلاش میں سرگرداں لوگ آخر یہ سب کچھ کہاں سے لے آتے ہیں ان کے ذرائع کیا ہیں۔ ان کے آقا کون ہیں جو اِن سے خیبر تا کراچی دہشت گردی کرواتے ہیں اور ان کے وسائل ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔ ان میں سے اکثر گروہ تو ایک دوسرے کے نظریاتی اور جذباتی مخالف ہیں لیکن سب بڑی تندہی سے ایک ہی مقصد کے لیے سرگرم ہیں اور وہ ہے ملک میں بد

امنی پھیلانا تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سارے کارندوں کی باگ ڈور کسی ایک طاقت کے یا ایک نظریہ رکھنے والے اکٹھ کیے ہوئی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔ آج ہماری مشرقی اور مغربی دونوں سرحدوں پر ایک ہی دشمن ہے مغرب میں اُس کا مددگار اور اہلکار کوئی اور ہے اور مشرق میں وہ۔ سرملا نائیک اسلم اور حوالدار محی الدین کی مقدس لاشیں بھیج کر ہماری امن کی خواہش کو ہماری کمزوری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ امن کی خواہش اور کوشش ضروری ہے لیکن دشمن کا تعین اس سے بھی زیادہ اہم ہے تاکہ حفاظت کا بندوبست کیا جاسکے اور ہاں قومی پالیسیوں کو بنانے، عوام تک پہنچانے اور مشتہر کرنے میں اور بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے تاکہ کسی ایسی کمزوری کا مظاہرہ نہ ہو جس سے دشمن فائدہ اٹھاسکے۔

عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۔۔ وہ تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے

اسلام دنیا کا وہ عظیم مذہب ہے جس پر رب کائنات نے اپنا سب سے بڑا فضل کیا کہ اسے وہ ہستی عطا کی جس کا نہ بدل نہ ثانی نہ دنیا میں نہ دین میں ، مبلغ تو کوئی مقابل نہیں، کمانڈر تو حکمت عملی وہ کہ آج بھی مشعل راہ بنائیں، معلم تو وہ ملک جس میں علم تھا نہ حکمت اس کے لوگوں کو معلم جہاں بنا دیا، باپ تو محبت کا دریا شوہر تو مہر و وفا کی تصویر۔ یہ صرف الفاظ نہیں بلکہ ان میں سے ہر ہر لفظ کا ثبوت مکمل طور پر موجود ہے۔ حقیقتاً پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ دنیا کے ہر فرد کے لیے ایک ایسا راستہ ہے جس میں ناکامی اور برائی کا شائبہ تک نہیں اور یہی وہ کردار تھا جس نے اُس معاشرے کو بدل کر رکھ دیا جو شقی القلبی کی اُس حد پر تھا جہاں باپ خود اپنے ہاتھ سے اپنے لختِ جگر کو زندہ درگور کرتا تھا اور بیٹی کی التجا اور باپ سے محبت کا اظہار بھی اُسے زمین کا رزق بننے سے نہ بچاتی تھی۔ جہاں بات بات پر سالہا سال پر محیط جنگیں لڑی جاتی تھیں اور یہ حال صرف مکہ کا نہیں ساری دنیا کا تھا۔ مدینہ میں اوس و خزرج آپس میں برسرپیکار تھے دیگر اقوامِ عالم باہم الجھی ہوئی تھیں ایسے میں امن اور سلامتی کی بات کرنا ایک ایسا مشکل کام تھا جس کو سرانجام دینے کے لیے وہ اخلاق و کردار اور ثابت قدمی اور محبت درکار تھی جس

پر انگلی اٹھانے تک کی گنجائش نہ ہو۔ مکہ میں رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو مشکلات سہیں ،جو تکالیف اٹھائیں وہ ہر ہر زاویے سے کسی بھی عام انسان کی قوت برداشت سے باہر تھیں۔ صرف شعب ابی طالب کو لیجئے کہ تین سال ایسا مقاطعہ رہا کہ پتے، گھاس اور چمڑا ابال کر کھانے پر مجبور ہوئے مگر پائے استقلال میں لغزش نہ آیا نہ فخر انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہ اُن کے ماننے والوں کے۔ تیرہ سال تبلیغ کے بعد مکہ میں کچھ ہی لوگ مسلمان ہوئے اور مکہ کے سرداروں میں اکثریت کا رویہ انتہائی سخت اور دشمنانہ رہا۔ مدینہ تشریف لے گئے تو اوس و خزرج کے جنگ بعاث کی دشمنی کے باعث ایک دوسرے کے بارے میں خیالات نیک نہ تھے یہی وجہ تھی کہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ خزرجی ،اوسیوں کے خوف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استقبال کو قبانہ آسکے اور چھپتے چھپاتے آئے کیوں کہ انہوں نے جنگ بعاث میں قبیلہ اوس کے کئی اشخاص کو قتل کیا تھا لیکن بعد یہی اوس اور خزرج صرف

اور صرف انصار بن گئے۔ یہودی مدینہ کی آبادی کا ایک اہم عنصر تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ میثاق مدینہ فرمایا تاکہ مدینہ میں امن قائم ہو اور رہے۔ کسی کافر یا مشرک کو اس کے دین کی وجہ سے نہ مارا نہ قتل کیا جب تک وہ خود آمادۂ شر اور فساد نہ ہوا۔ مکہ جس شہر کی فضا اُن مظالم کی گواہ تھی جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں پر کئے گئے تھے اُس نے وہ منظر بھی دیکھا جب بطور فاتح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم اسی شہر میں داخل ہو تو وہاں کے لوگوں کے تمام جرائم معاف کئے، تمام مظالم بھلا دیئے ، شعب ابی طالب بھی، وہ پتھر بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مارے گئے اور وہ کانٹے بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ میں بچھائے گئے ،یاد رہا تو صرف عفو و درگزر اور رحمت و محبت ۔ اور صرف مکہ ہی کیا جہاں جس نے ہتھیار رکھ دیئے اور رحم مانگا یہ سر چشمہ رحمت ، رحمت و محبت ہی رہا۔

آج جب ہم اس عظیم ہستی کا میلاد منا رہے ہیں تو اِن تقاضوں کی شناخت اور پہچان بھی ضروری ہے جو ہمارا مذہب ہم سے کرتا ہے۔ آج جب مسلمان ہی مسلمان کو مار رہا ہے کبھی سیاست کے نام پر، کبھی فرقے کے نام پر، کبھی قومیت کے نام پر اور کبھی نسلی تعصب کے نام پر تو ہم کونسی مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ اس دین کے پیرو ہو کر کہ

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے

لیکن افسوس کہ خود تفرقہ اس دین میں اب آکے پڑا ہے

بین الاقوامی معاملات میں تو ہم غیروں کو دوش دے سکتے ہیں لیکن خود مسلمانوں کے اندر سے رواداری کہاں گئی وہ دین جو زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی فراہم کرتا ہے اُس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیروکار ہونے کے

باوجود جو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے جس نے دشمن کو بھی معاف کیا جس کے حسن اخلاق نے جانی دشمنوں کو دوست بنایا اُسی کے اُمتی ہونے کے باوجود ہم کس راہ پر چل رہے ہیں۔ کوئٹہ میں مسلمان اسلام کے نام پر مارا جاتا ہے، طالبان مسلمان کا خون اسلام اور دین کے نام پر بہا رہے ہیں۔ تو پھر ہم کس عشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عشق کے تقاضے بہت مختلف ہوتے ہیں یہاں محبوب کا ایک ایک عمل، ایک قدم مشعل راہ ہوتا ہے۔ اور اس پر قدم رکھنے میں محب فخر محسوس کرتا ہے۔ تو آیئے اس میلاد پر اپنی راہوں کا تعین کر لیں اور بحیثیت مسلمان یہ طے کر لیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو غیروں کے لیے، کافروں کے لیے، مشرکوں کے لیے بھی رحمت تھا اُس کے عشق کا دعویٰ ہم تب کریں گے جب ہم خود آپس میں محبت اور رحمت بن جائیں گے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس نے غیر مسلم رعایا کے قاتل کو جنت کی خوشبو سے بھی محرومی کی وعید سنائی، جس نے جنگ میں بھی عورت بوڑھے اور بچے پر ہاتھ اٹھانے سے منع کیا، جس نے جانوروں تک پر رحم کا حکم دیا اور جس نے غلاموں کے حقوق کو مالکوں کے فرائض سے بڑھ کر اہمیت دی اُس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمتی ہونے کا اعزاز اگر خدا نے ہمیں دیا ہے تو پھر قتل و غارت چہ معنی دارد۔ اگر ہم خود کو بہت اچھا مسلمان کہتے ہیں اور اسی لیے دوسرے کے قتل کو روا سمجھتے ہیں تو یاد رکھیے سزا و جزا کا اختیار صرف اُس کو ہے جو عالمین کا رب ہے۔ اور جب تک کوئی

خدا کی حدود کو نہیں توڑتا اُسکی زمین پر کھلم کھلا فساد برپا نہیں کرتا تو کسی کو کوئی حق نہیں کہ وہ اُس کی جان کو قتل کرے کہ انسانی جان کو اللہ تعالٰی نے انتہائی مقدس قرار دیا ہے۔ لہذا بحیثیت مسلمان دعویٰ عشق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد میں اور دعویٰ پیروی نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہو۔اور ایسی پیروی کہ جس میں کوئی حیلہ اور کوئی حجت نہ ہو تو پھر فخر سے خود کو غلامِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہلا ئیے اور جسے یہ اعزاز نصیب ہو جائے تو گویا دو جہان اسکے قدموں میں ہیں۔

مماثلت۔۔۔کہاں

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں نے ایک عقیدے اور نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا۔ صرف ایک کلمے کی بنیاد پر اور سب نے اتفاق کیا کہ ایک خدا ایک نبی اور ایک قرآن لہذا ایک ہی پاکستان۔ لیکن ظاہر ہے کہ دشمن کو یہ نظریہ قابل قبول نہ تھا کیونکہ اِس نے اُس کے بہت سارے مفادات پر ضرب لگائی تھی ایک عظیم الشان سلطنت پر حکومت کرنے اور ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کا خواب چکنا چور ہوا تھا۔ اور صرف بھارت پر ہی کیا موقوف اسلامی ممالک کی لمبی زنجیر میں ایک اور مسلمان ملک کا اضافہ اوروں کو بھی ناگوار تھا۔ لہذا طاقت کے ساتھ ساتھ دوسرے بلکہ ہر قسم کے حربے آزمانے شروع کیے گئے کہ خدانخواستہ اس ملک کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔ ان میں سے اہم ترین ثقافتی حملہ تھا سونیا گاندھی نے تو بہت صاف طور پاکستان پر کسی جنگی حملے سے زیادہ ثقافتی حملے کو اہم قرار دیا تھا۔ اور یہ وار مسلسل کیا جارہا ہے، دوسری طرف ہمارے اپنے لوگ ہیں جو بڑی تندہی سے بھارت اور پاکستان کی ثقافتی مماثلتیں تلاش کرتے رہتے ہیں، کبھی سُر میں یہ مماثلت تلاش کر لی جاتی ہے اور کبھی پتنگ بازی میں تو عرض ہے کہ پتنگ بازی تو جنوبی امریکہ میں بھی ہوتی ہے اور سُر تو انٹارکٹکا میں بھی الاپے جاتے ہیں اور زبان تو امریکہ اور برطانیہ کی بھی ایک ہے۔

بھارت کے ساتھ دوستی میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن اس کے لیے شرائط برابری اور نیک نیتی ہے مماثلتیں نہیں اور یہ مماثلتیں تلاش کرکے دو قومی نظریے کی نفی کرنے کی بجائے پاکستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں میں انہیں کیوں تلاش نہیں کر لیا جاتا۔ بلکہ انہیں تو تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں مذہب نے اِن لوگوں کو ایسی ایک زنجیر میں باندھ رکھا ہے جہاں مماثلتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جو چار صوبوں کو مختلف ثقافتوں کا مالک سمجھتے ہیں اور علاقائی طور پر پائے جائے والے رسوم و رواج کو غیر ضروری اہمیت دیتے ہیں وہ اس پر بھی اتنی تحقیق کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ٹوپی چترال سے شروع ہو کر مکران تک پہنچتی ہے صرف انداز بدلتا ہے، چترال کی ٹھنڈ کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ بھیڑ کی اُون سے بنتی ہے تو سندھ اور بلوچستان میں یہ شیشوں سے مزین ہو جاتی ہیں، چادر ہی کو لیجیے یہ چارسدہ میں کھدر، گلگت میں اُون کی بنتی ہے تو پنجاب میں چارخانہ اور سندھ میں اجرک ہو جاتی ہے۔ پشاور اور خیبر پختونخواہ یں خواتین سفید برقعے میں تو عام طور پر ہی نظر آتی ہیں لیکن سندھ میں سفر کرتے ہوئے مجھے یہ برقعہ یہی احساس دلاتا رہا کہ فرق تو کہیں نہیں، دیہات کا وہی انداز، وہی بچے پانی کے کسی جوہڑ یا تالاب کے گرد کھڑے یا سڑک پر سائیکل کا پہیہ ڈنڈے کی مدد سے چلاتے ہوئے یہ احساس بالکل ختم کر دیتے ہیں کہ یہ کونسا علاقہ ہے، چارپائی کا وہی انداز، برتن وہی جو

صدیوں سے یہاں رائج ہیں۔ گھر ایک جیسے کھلے اور کشادہ چاہے کم رقبہ ہوں حتیٰ کہ زبانوں میں مماثلت اور کسی نامانوس زبان میں مانوس سا کوئی لفظ ایک خوشگوار تاثر دیتا ہے۔ تندور کا وہی انداز جو پشاور میں ہے وہی لاہور اور سکھر میں بھی ہے۔ صرف لگنے والی روٹی کا انداز بدل جاتا ہے۔ ساگ یہاں بھی پسندیدہ وہاں بھی مقبول، ہاتھ کا پنکھا خیبر پختونخواہ سے لے کر پنجاب، سندھ اور بلوچستان سب میں ایک جیسا سجا ہوا ہے، دلہن کا سرخ جوڑا سب کے لیے خوشی کا باعث، پگڑی کا صرف انداز بدلتا ہے باقی تو پگڑی پگڑی ہی رہتی ہے اور یہ سب کچھ صدیوں سے ایسا ہی ہے اور تاریخی طور پر ایسا ہے، اسے زبردستی ایسا نہیں کیا گیا۔ اگر ثقافت انہی چیزوں کا نام ہے تو ہمارے مختلف علاقوں اور صوبوں میں ان مماثلتوں کو تلاش کرکے کیوں اجاگر نہیں کیا جاتا۔ میں یہ ہرگز یہ نہیں کہتی کہ یہاں مختلف روایات اور رسوم و رواج نہیں ہیں اور ضرور ہیں اور چمن میں گلہائے رنگارنگ نہ ہوں تو وہ چمن نہیں جنگل بن جاتا ہے کہ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے۔ لیکن رسوم و رواج تو ایک گاؤں میں بھی مختلف ہوتے ہیں میں نے تو ایک ہی پشاور میں کئی رسمیں دیکھیں ہیں جو اگر ایک خاندان کی شادی میں انجام دی جا رہی ہیں تو دوسرے میں نہیں بلکہ وہاں کچھ اور ہی کیا جا رہا ہے۔

اس مضمون کو لکھنے کا سبب میرا وہ سفر بنا جو میں نے سندھ جاتے ہوئے کیا

اور راستے میں کچھ ایسا تلاش کرتی رہی جو مجھے احساس دلادے کہ اب میں ایک سے دوسرے صوبے میں داخل ہو رہی ہوں لیکن سوائے لباس کے رنگوں (انداز وہی) یا زبان اور لہجے میں تبدیلی کے کچھ ایسا خاص نظر نہیں آیا جس کی بنا پر میں انہیں یکسر مختلف قرار دوں۔

یہاں یہ اقرار کر لینا چاہیے کہ قومی یکجہتی پیدا کرنے سے ہم نے مجرمانہ غفلت برتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ہی کراچی میں رہتے ہوئے لسانی اور علاقائی خلیج خطرناک حد تک موجود ہے بلکہ اکثر قتل عام کا باعث بنتی ہے۔ پنجابی، پٹھان، بلوچی، سندھی، کشمیری ہر ایک دوسرے علاقے میں کمتر بن جاتا ہے اور اپنے علاقے میں برتر۔ ہمارا میڈیا جس باقاعدگی سے بھارتی فلم کی خبریں دیتا ہے حتّیٰ کہ ان کی کسی اداکارہ کو ڑکام بھی ہو جائے تو وہ ہمارے میڈیا کی زینت بن جاتی ہے کہیں، کسی دور دراز علاقے میں سانپ کھانے جیسا بیہودہ مقابلہ بھی ہو جائے تو اُسے گلیمرائزڈ کرکے دکھایا جاتا ہے۔ اُن کی علاقائی رسمیں چسکالے لے کر دکھائی جاتی ہیں تو آخر ہم خود سے اتنے بے خبر کیوں ہیں بلکہ ہم تو ان کے ڈرامے اور چینلز خود سے زیادہ تعداد میں دکھاتے ہیں اور ہمارے ہر نیوز چینل کے پاس پڑوسی سے محبت کے لیے وقت مخصوص ہے۔ دکھایئے یہ سب لیکن پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے اور یہ بھی پتہ لگایئے کہ بھارت میں ہمارے کتنے چینلز چل رہے ہیں، ان کے کیبل آپریٹرز ہمارے ڈرامے

سے کتنی امن کی پتنگیں اڑا رہے ہیں، ہماری روایات اور رسوم کی وہاں کتنی اہمیت ہے۔ ہمارے تو صحافیوں کو دہلی میں ہونے والے صحافیوں کے میلے سے بھی نکال دیا گیا اور ہمارے وہی اداکار ان کی خبر میں رہتے ہیں جو پاکستان کی بدنامی کا باعث ہوں، وینا ملک جیسے لوگ، ورنہ باقی تو وہاں سے نکال بھی دیئے جاتے ہیں۔پڑوسی سے امن کے لیے کام کریں لیکن پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے اس میں امن، بھائی چارہ اور محبت پیدا کریں یہ آپ کا فرض ہے اور فرض کو کاروبار پر ترجیح دیجئے تو کاروبار میں بھی برکت پڑھ جائے گی۔

یومِ یکجہتی کشمیر ہر سال کی طرح اس سال بھی

پانچ فروری یومِ یکجہتی کشمیر بڑی باقاعدگی سے ہر سال منایا جا رہا ہے۔ اس دن عام تعطیل ہوتی ہے کہیں ایک آدھ تقریب یا سیمنار ہو جاتا ہے اور یہ دن گزر جاتا ہے اور اگلے دن دفاتر اور تعلیمی ادارے دوبارہ کھل جاتے ہیں، یومِ یکجہتی گزر جاتا ہے اور بس نہ حکومت میں کوئی جنبش پیدا ہوتی ہے نہ سیاسی پارٹیوں میں نہ میڈیا میں۔ یا تو اعلان کر دیا جائے کہ ہم کشمیر سے دستبردار ہوتے ہیں تاکہ قصہ ہی ختم ہو یا اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی کوشش کی جانی چاہیئے لیکن ایسا بھی نہیں کیا جارہا کیونکہ جہاں سیاست چمکانے کا موقع ہو وہاں اس مسئلے سے مدد لے لی جاتی ہے۔ جبکہ معاملہ موقع پرستی سے زیادہ سنجیدگی کا طلب گار ہے کیونکہ یہی پاکستان اور بھارت کے درمیان تمام مسائل کی جڑ ہے۔پانی کے مسئلے کو لیجیے اسی سے جڑا ہوا ہے کہ پاکستانی دریاؤں کے منبع ادھر ہیں اور یہی پانی پاکستان کے زرعی میدانوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ نہ صرف زراعت بلکہ صنعت بھی کئی کئی حوالوں سے انہی دریاؤں کی مرہونِ منت ہے کہ بڑی آبادیاں اور صنعتیں یہی پر پھلتی پھولتی ہیں لیکن بھارت انہی دریائوں کا پانی روک کر ڈیم بنا رہا ہے۔

ہماری سرحدوں پر تناؤ پیدا ہوتا ہے تو اسی مسئلے کی وجہ سے۔اسلحے کی دوڑ ہے تو اسی کی بنا پر بلکہ اندرونی امن کا مسئلہ بھی اسی سے منسلک ہے کراچی میں تو یہ مسئلہ بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے اور کر سکتا ہے۔یہی حال قبائلی علاقوں کا ہے وہاں لوگوں یں شدت پسندانہ جذبات آخر خود رو جھاڑیوں کی طرح کیوں اُگ رہے ہیں کیا ہم سے کشمیر کے حالات کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔ اگر آج ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے اور اہلِ کشمیر کو ان کے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جائے جو کہ انسانی بنیادوں پر اور اقوام متحدہ کی قرادادوں کے مطابق ان کو حاصل ہے تو دنیا کا یہ حساس ترین خطہ بھی بدامنی سے محفوظ ہو سکے گا۔ لیکن اس مسئلے کے حل کے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور یہ سمجھنے سے کہ بین الاقوامی برادری خود اس مسئلے کو حل کرلے گی سب سے بڑی حماقت ہے کیونکہ غریب ممالک تو اپنے مسائل میں مبتلا ہیں اور بڑی طاقتیں اسلحے کی ایک بڑی منڈی کو کسی بھی طرح ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیں گی۔اور یہ بھی سمجھ لینا کہ صرف یومِ یکجہتی منا لینے سے اور چھٹی کر لینے اور دے دینے سے مسئلہ کشمیر حل ہو جائے گا بھی خوش فہمی ہو سکتی ہے حقیقت پسندی نہیں۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ اس مسئلے کو ہر بین الاقوامی فورم پر اُجاگر کیا جائے اور ایک زبردست سفارتی مہم چلائی جائے تاکہ دنیا کو اس مسئلے کی سنگینی کا احساس دلایا جاسکے کہ کس طرح ایک ایسے علاقے کو بھارت نے غلام بنا رکھا ہے جس کی اکثریت مسلمان ہے جو نہ تاریخی طور پر نہ ثقافتی

طور پر اور نہ ہی مذہبی طور بھارت سے کوئی مماثلت رکھتا ہے اور یہی وجوہات ہیں کہ کشمیری شہادتیں قبول کر رہے ہیں، سختی برداشت کر رہے ہیں، یتیمی کا دکھ سہنے کو تیار ہیں اور بیوگی کی بے بسی بھی لیکن بھارت کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں، اور اسی جرم میں روزانہ ریاستی تشدد کا سامنا کر رہے ہیں ہر روز شہادتیں ہو رہی ہیں صرف آزادی کی خواہش کے جرم میں۔ نہ ہی عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے اور نہ ہی بوڑھے کون کہاں مرا کسی کو معلوم نہیں۔ انٹرنیشنل پیپل ٹریبیونلز کے اعداد و شمار کے مطابق 2011 میں صرف کپواڑہ میں 1453 بے نام قبریں ملیں جبکہ ان قبروں کی کل تعداد 2730 بتائی گئی ہے۔ پچھلے بائیس سال میں کشمیر میں پچاس سے ستر ہزار شہادتیں ہو چکیں ہیں اور اسّی ہزار لوگوں کو غائب کیا گیا ہے جن میں سے ہزاروں کو ان بے نام قبروں میں چھپا دیا گیا ہے جن کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور ظاہر ہے ایسی اور بھی ہزاروں قبریں کشمیر میں موجود ہو گی۔ کشمیر میں موجود پانچ سے ساتھ لاکھ بھارتی فوج آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ سے جس طرح لطف اندوز ہو رہی ہے ہمیں اُسے بھی دنیا کے سامنے لانا چاہیئے تو تب ہی ہم یومِ یکجہتی کشمیر کا حق ادا کر سکیں گے۔

بھارت کشمیر میں بدامنی کے لیے پاکستان کو ذمہ دار ٹھہرا کر پوری دنیا میں واویلا کرتا ہے تو ہمارے پاس تو حقائق ہیں، پھر ہم کیوں ان حقائق کو دنیا

کے سامنے نہیں رکھ رہے، ہم دنیا کو کیوں نہیں بتا دیتے ہیں اور کیوں نہ انسانی حقوق کی تنظیموں کو جگا دیتے ہیں کہ وہ آکر ہزاروں نوجوان کشمیری بیوائوں اور معصوم یتیم بچوں کا دُکھ دیکھ لیں تاکہ اُن کے لیے آواز اٹھائی جا سکے۔ بھارت استصوابِ رائے سے مسلسل انکاری ہے اور اقوام متحدہ بھی اپنے اس سب سے قدیم مسئلے کے حل سے مسلسل غفلت برت رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ پاکستانی سیاستدان، دانشور اور صاحبانِ اختیار اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور بھارت کو سفارتی طور پر اتنا مجبور کریں کہ وہ کشمیریوں کا حقِ آزادی تسلیم کرلے۔ اگر آزادی دنیا کے تمام انسانوں کا حق ہے تو کشمیریوں کا کیوں نہیں اور اگر غلام بنانے والا اور پھر قتل کرنے والا ظالم ہے تو بھارت کیوں نہیں۔

مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ گلگت بلتستان۔۔۔ بننے نہ دیں

گلگت بلتستان ملک کے شمال میں واقع انتہائی خوبصورت علاقہ ہے۔ ایک عام پاکستانی کے لیے بھی گلگت اور سکردو یقینا اہم ہیں لیکن اپنے بچپن کے کچھ خوبصورت سال یہاں گزارنے کے بعد گلگت سے میں نے ہمیشہ جذباتی سی وابستگی محسوس کی ہے۔ میرے ذہن اور یادوں میں جس گلگت کا نقشہ ثبت ہے وہاں مجھے کبھی فائرنگ کی آواز سنائی نہیں دی، چوری کی خبر مجھے یاد نہیں اور سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھار محرم میں یا یومِ عاشور پر کشیدگی ہو جاتی تھی جو بخیریت ختم ہو جاتی تھی، دو ایک بار تو میرے والدِ محترم کو عین عاشورے کے دن انتظامی امور اور جلوس کی ذمہ داری سونپی گئی اور دن بخیریت گزر گیا۔ یہ سب کچھ ان علاقوں میں عرصہ تک ایسا ہی رہا لیکن کچھ سالوں سے ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی حالات خراب کیے جانے لگے ، شیعہ اور سنی تصادم عام ہوا بلکہ ایسا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی وہی ہاتھ سرگرم عمل ہے جو پورے پاکستان میں بدامنی پھیلانے میں مصروف ہے اور ان عناصر کا یہ واحد حربہ نہیں ہے بلکہ یہ ہر طرح سے پاکستان کی سالمیت پر ضرب لگانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ گلگت بلتستان جیسے محب وطن لوگوں میں سے بھی اس نے اپنے مطلب کے لوگ ڈھونڈ لیے ہیں اور انہیں حیلے بہانے سے ملک مخالف جذبات پیدا کرنے کے لیے

استعمال کر رہا ہے۔ گلگت بلتستان کے لوگوں کے دلوں میں پاکستان مخالف جذبات پیدا کرنے کے لیے مختلف حربے آزمائے جارہے ہیں اور ایسے نفسیاتی طریقے اپنائے جارہے ہیں کہ ان علاقوں کے لوگوں میں احساس کمتری پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے گلگت بلتستان نیشنل کانگریس بنوائی گئی جس کا صدر امتیاز حسین نامی ایک سیٹلائٹ انجینئر ہے جو ورجینیا امریکہ میں رہتا ہے جبکہ سینگی ایچ سارنگ نامی شخص ان کا دوسرا کارندہ ہے جس نے واشنگٹن میں انسٹیٹیوٹ آف گلگت بلتستان اسٹڈیز قائم کیا ہے اور اس کا صدر ہے یہ دونوں اشخاص پاکستان مخالف پروپیگنڈہ کرکے پاکستان مخالف جذبات پیدا کر رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہاں ہونے والے ترقیاتی کاموں میں نہ صرف رکاوٹ پیدا کی جا رہی ہے بلکہ ان کے خلاف مہم چلانے کی کوشش بھی کی جارہی ہے اور ایسا ماحولیات کے نام پر کیا جارہا ہے کہ یہ ترقیاتی اور تعمیراتی کام گلگت بلتستان کی جنگلی حیات کو نقصان پہنچانے کا باعث بنیں گے۔ دوسری طرف امتیاز حسین جیسے لوگ خود کو گلگت کے پسماندہ اقوام کا ہمدرد ظاہر کرتے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ ترقی کے بغیر پسماندگی کیسے دور کی جائے لیکن پاکستان مخالف قوتیں ایسے لوگوں کے ساتھ مسلسل تعاون کر رہی ہیں جس کا ثبوت سینگی ایچ سارنگ اور امتیاز حسین کے مضامین اور مختلف سیمینارز میں تقاریر ہیں۔

سارنگ تو انسٹیٹیوٹ آف ڈیفنس اسٹڈیز اینڈ انیلسیز دہلی کا ممبر ہے اور اس ادارے کا ایک بہت بڑا کام لگتا ہی گلگت بلتستان میں بد دلی پھیلانا ہے اور

اس کام کے لیے اسے "را" کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے جو انسٹیٹیوٹ آف ڈیفنس اسٹڈیز اینڈ انیلسیز دہلی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں اور نہ ہی اس کے ممبر سارنگ کے لیے جو بڑی تسلی سے اپنا کام کیے جا رہا ہے ہیں اور اس شخص کو اپنے انہی مددگاروں کی مدد سے یو این ایچ سی آر کے اجلاس میں شرکت کرنے کا موقع ملا جہاں اس نے گلگت اور ملحقہ علاقوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا رونا رویا اور یہاں کے لوگوں کے لیے ثقافتی، معاشی اور ماحولیاتی حقوق کا مطالبہ کیا جبکہ اس وقت پاکستان جن حالات سے گزر رہا ہے اس میں یہ سب کچھ کسی ایک شہر صوبے اور علاقے تک محدود نہیں اور ان حالات کا یہ پھیلاؤ بھی ان ہی بیرونی کارندوں کی وجہ سے ہے جو پاکستانیوں کی محبت میں نہیں بلکہ پاکستان کی مخالفت میں ان کی حمایت کر رہا ہوتا ہے تاکہ ان کو مزید برافروختہ اور پریشان کیا جا سکے اور ان کا مقصد بھی پورا ہوتا رہے اور کام بھی چلتا رہے۔ میں ہمیشہ یہ کہتی ہوں کہ دشمن کا کام دشمنی ہے جو وہ بڑی تندہی سے کر رہا ہے سوال تو یہ ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم اس طرح کے لوگوں کو پہلے کھل کر کام کرنے دیتے ہیں اور جب وہ اپنی جڑیں خوب مضبوط کر لیتے ہیں تو پھر بھی ان کی بیخ کنی کرنے کی بجائے شاخ تراشی میں مصروف ہو جاتے ہیں سارنگ اور امتیاز حسین جیسے لوگ شروع میں ہی کیوں نہ نظروں میں آئے اور انہیں پنپنے کا موقع کیوں دیا گیا اور دیا جا رہا ہے۔ کیا ہماری حکومت، ایجنسیاں اور ادارے کسی سدباب کی کوشش کر رہے ہیں ان عناصر اور ان

کے ارادوں کی راہ میں کیا کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان مسائل کا حل صرف تب ہی ممکن ہے جب حکومت نہ صرف ان ملک دشمن عناصر پر نظر رکھے بلکہ ان حالات کو پیدا ہی نہ ہونے دے جن کی وجہ سے انہیں سازش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر حکومت امن و امان کے مسئلے کو حل کر لے، عوام کو روزگار اور باعزت روزی مہیا کر سکے، انہیں سر چھپانے کو چھت اور پہننے کو کپڑا دے سکے تو عام لوگ رزق روزی کمانے کے لیے ان ملک دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ جا سکیں نہ ہی فرقہ واریت کے نام پر اور نہ ہی علاقیت کی آڑ میں۔

ویلنٹائن ڈے۔۔۔ تجھ کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا

چودہ فروری بس ایک عام سی تاریخ تھی ،چند سال پہلے تک آتی تھی اور گزر جاتی تھی نہ کسی کو انتظار ہوتا اور نہ یہ کوئی تہوار تھا۔پاکستان میں بے شماراخبارات بھی تھے اور رسالے اور میگزین بھی ، ریڈیواور ٹیلی ویژن بھی لیکن قوم کی مذہبی اقدار اور معاشرتی روایات کا جو بیڑا پچھلے دس سال میں غرق کیاگیا ہے اس کی مثال تاریخ میں ملنی مشکل ہے اور اس کے لیے جو ایک بھونڈی دلیل دی جاتی ہے وہ یہ کہ اس دور میں بین الاقوامی اثرات سے بچنا مشکل ہے اسی غیر معقول توجیہہ کو معقولہ بنا کر ہمارے میڈیا نے دنیا میں ہونے والی بے شار بیہودگیوں کو ہمارے معاشرے کا حصہ بنا دیا ہے ۔میرے خیال میں ہماری ثقافتی بلکہ مذہبی روایات پر اب تک سب سے بڑا حملہ ویلنٹائن ڈے ہے۔ میں یہاں سینٹ ویلنٹائن اور اس کے معشوقے کی کہانی نہیں دہراؤں گی اور نہ ہی لیلٰی مجنوں اور سوہنی مہیوال کی کہانی سے اس کا ربط ہونے یا نا ہونے پر بحث کروں گی کیونکہ یہ سب جان چکے ہیں لیکن مجھے وہ بیج نظر آ رہا ہے جو آج کے معاشرے میں بویا جا رہاہے اور بڑی تندہی سے اس کی آبیاری کی جا رہی ہے۔ نجی میڈیا نے جہاں سیاسی طور پر کچھ مثبت کردار ادا کیا ہے اور حکمرانوں کے اصلی چہرے عوام کو دکھائے ہیں وہی اس نے ایسی معاشرتی برائیوں کو کبھی جنم دیا ہے اور کبھی

انہیں رنگ و روغن لگا کر ملمع سازی کرکے مقبول بنایا ہے کہ اب معاشرہ ان سے جان نہیں چھڑا پا رہا۔ اسی میڈیا نے پاکستان کے باحیا قومی لباس کی بجائے مغرب کے اُس لباس کو جگہ دی جس نے عورت کو اس دائرے سے ہی نکال دیا ہے جس میں اسلام اس کو دیکھنا چاہتا ہے۔ قمیض شلوار اگر کہیں ہے تو اسے دوپٹے کے بند سے ہی آزاد کر دیا ہے اور لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا اور اس پر طرہ وہ روایات ہیں جو ہماری نہیں اور نہ ہو سکتی ہیں انہیں مرّوج کیا۔ اسلام حیا کو نصف ایمان کہتا ہے، عورت اور مرد کو اپنے اپنے دائرے میں رکھتا ہے،ان کی آپس کی محبت کو پاکیزہ اور باحیا دیکھنا چاہتا ہے اور نکاح کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل پا سکے۔ یہاں تک کہ ماں باپ کی اپنے بچوں سے اور بہن اور بھائی کے درمیان بلکہ بھائی کی بھائی اور بہن کی بہن سے بھی حیا ہے پھر وہ یوں غیر مرد اور عورت کے آپس میں برملا اظہارِ محبت کو کیسے پسند کر سکتا ہے جس کا درس ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو دیا جا رہا ہے صرف دوستی کے نام پر۔ اور یہ کہنا کہ یہ دن تمام رشتوں سے محبت جتانے کا دن ہے تو اسکے لئے ٹی وی کا سکرین استعمال کرنے کی کونسی تک ہے اور اس پر مجھے اپنے شوہر سے پیار ہے اور مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے جیسے جملے آخر کونسے مذہب اور تہذیب کی عکاسی ہے اور کیا محبت کے لیے ایک دن مخصوص کرنے کی بھی کوئی منطق ہے۔کیا اللہ تعالی نے والدین کے ساتھ محبت کے لیے ایک دن مخصوص کیا ہے یا بچوں سے محبت کے لیے چودہ فروری کی تاریخ کو

فرض قرار دیا ہے۔ جس طرح سارے بازاروں کو لال رنگ میں ڈبو دیا جاتا ہے کیا یہ طریقہ ہماری ثقافت، معاشرت اور مذہب کا عکاس ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں جس انداز کے موبائل میسجز ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں کیا ہمارا معاشرہ ان کی اجازت دیتا ہے اور کیا ہمارے تعلیمی اداروں میں اس دن جو ہوتا ہے اس پر ہمارے ہر دم باخبر الیکٹرانک میڈیا نے غور کرنے کی کوشش کی ہے جو اس دن سُرخ دلوں سے سٹیج سجا کر اس کی ترویج کرتا ہے اگر انہیں کبھی اسکی فرصت نہ ملی ہو تو میرے جیسے کچھ اساتذہ سے دریافت کرلے۔اے لیول کے ایک حساس طالبعلم نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کبھی میرے سکول آکر دیکھیئے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی لڑکیاں کیسا لباس پہنتی ہیں اور لڑکے اور لڑکیاں سبزہ زاروں اور بنچوں پر بیٹھ کر کیا گفتگو کرتے ہیں۔

غیروں کی روایات کو اپنے ملک میں یوں بغیر سوچے سمجھے رائج کرنے سے پہلے ان پر غور کرنا ضروری ہے اور یہ بھی کہ کیا ہمارا مذہب اس کی اجازت دے رہا ہے اور یہ بھی نکتہ قابل غور ہے کہ کیا ہمارے معاشرتی اور علاقائی تہواروں کو بھی مغرب نے کبھی اس طمطراق سے منایا ہے جو ہم کر رہے ہیں جیسا کہ ہمارے نجی میڈیا نے اپنے اپنے چینل کو زیادہ روشن خیال اور وسیع النظر ثابت کرنے کے لیے اس فضول روایت کو پروموٹ کیا اور کر رہا ہے اِسے ان کا ایک جُرم ہی تصور کیا جانا چاہئے۔ سوچیئے کیا اس دن کے پیغامات کے بعد اگلا

قدم یہ نہ ہوگا کہ خدانخواستہ وہ تمام مناظر جو یورپ کے پارکوں میں نظر آتے ہیں ہمارے ہاں نظر نہ آئیں گے۔ ایک سوال میرا یہ بھی ہے کہ آج سے چند سال پہلے جب پاکستان میں نجی میڈیا نہ تھا اور سینٹ ویلنٹائن کو بھی یہ عزت و توقیر نہیں بخشی گئی تھی تو کیا لوگ ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے تھے سچ تو یہ ہے کہ نفرت اور دہشت گردی اسی نام نہاد روشن خیالی کے بعد بڑھی ہے۔ میڈیا سے میری درخواست ہے کہ اپنی قوم پر رحم کیجئے اسلام میں اور اپنے معاشرے میں اتنی ملاوٹ مت کیجئے کہ آنے والی نسلیں آپ کو اپنے مجرم کے طور پر یاد کریں۔

اسلام امان، سلامتی اور کشادگی ہے

کوئٹہ میں مری آباد کی خوبصورت روشنیاں کوئٹہ کی رات کو انتہائی دلکش منظر عطا کرتی ہیں لیکن پاکستان کے دشمنوں کو نہ تو اس ملک کے امن سے کوئی غرض ہے نہ اس کے حُسن سے۔ مری آباد جو کوئٹہ میں آباد ہزارہ برادری کا مرکز ہے اور اس قبیلے کے زیادہ تر لوگ اسی جگہ آباد ہیں اور صدیوں سے آباد ہیں پھر اب ان کے خلاف نسل کشی کی مہم کیوں چلنی شروع ہوئی۔ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر دو بار ان پر کھلم کھلا دو بڑے حملے کیے گئے ہیں اور یہ صرف دو ہی حملے نہیں تھے بلکہ چار چھ لوگوں کا مر جانا تو ایک معمول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کیوں وہ کون ہے جو یہ سب کر رہا ہے وہ کس مذہب کے ماننے والے ہیں اور کون سے فرقے کے پیروکار ہیں جو کسی فرقے کو نہیں بخش رہے اور کوئی شہر ان سے محفوظ نہیں پورا پاکستان ان کی زد میں ہے لیکن ہزارہ برادری کو جس طرح نشانہ بنایا جا رہا ہے وہ بربریت کی بدترین مثال ہے کہ ایک برادری کو یوں قتل کیا جا رہا ہے جیسے وہ اس زمین کے بیٹے ہی نہ ہوں یا مسلمان نہ ہوں۔ اسلام تو کافر کو بھی کسی مسلمان مملکت میں مکمل حفاظت دیتا ہے تو پھر یہ کون سا اسلام ہے جس کے یہ حملے کرنے والے دعوے دار ہیں۔ دشمن تو اپنا کام کر رہا ہے کیوں کہ وہ دشمن ہے لیکن ہماری حکومت کہاں سو رہی ہے ،ہماری ایجنسیاں کیا کر رہی

ہیں اور ہمارے ادارے کس خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں کہ دہشت گرد ہر روپ میں ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں کیا یہ سب صدیوں پرانے وقتوں میں رہ رہے ہیں، ان کے زمانے میں کیا کوئی جدید مشنری ہے نہ جدید تکنیک جو ان دہشت گردوں کو ڈھونڈ سکے یا نیک نیتی کی کمی ہے جو وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہمارے سیاسی رہنما جو خود کو عوام کا نمائندہ کہتے ہیں اور اس بات کا علان کرتے نہیں تھکتے کہ ان کی جڑیں عوام میں ہیں وہ آخر کیوں اس فساد کی جڑ تک نہیں پہنچ پاتے کہ یہ کہاں سے پھوٹتا ہے، طالبان کہاں سے پیدا ہوئے جو پورے ملک اور قوم کو واجب القتل سمجھتے ہیں اس لیے نہیں کہ ان کے مذہب میں فرق ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے نکتۂ نظر میں تفاوت ہے اور لشکر جھنگوی کا کہاں سے ظہور ہوا جو ان ہزارہ مسلمان پاکستانیوں کو قابل گردن زدنی سمجھتے ہیں جن کا مذہب تو اسلام ہی ہے لیکن فرقہ جدا ہے کیا خدا نے ساری انسانیت کو ایک مذہب و مسلک پر پیدا کیا ہے اگر اُس نے ایسا نہیں کیا تو ہم ایسا کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ فرقہ واریت کے جنّ کی زنجیروں کو جس طرح کھولا جا رہا ہے وہ عام لوگوں اور ملک و قوم کے لئے تو خطرناک ہے ہی لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ خود اسلام کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس مذہب نے تو کافر کو بھی لکم دینکم ولی یدین کہہ کر جینے اور اپنے مذہب پر چلنے دیا ہے تو ہم سب تو مسلمان ہیں۔ میرے سنی ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ شیعہ کو کافر سمجھوں یا کسی کے شیعہ ہونے کا ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہ میرے مسلک کو غلط

قرار دے۔

فرقہ واریت کی فضائ پیدا کی جا رہی ہے اور بلیم گیم مسلسل جاری ہے چاہے اس میں حقیقت ہے یا نہیں لیکن ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی ۔ رانا ثنائ اللہ اور رحمٰن ملک زد میں بھی ہیں اور ایک دوسرے پر الزامات لگانے میں بھی پیش پیش ہیں وہ سچے ہیں یا جھوٹے یہ بات اتنی اہم نہیں ہے جتنی یہ کہ آخر یہ سب ہو کیوں رہا ہے کیا ہم دشمن کو خوش نہیں کر رہے۔ ہزارہ برادری بھی اس زمین پر اتنا ہی حق رکھتی ہے جتنا کوئی بھی دوسرا پاکستانی۔

اس وقت ملک دہشت گردی، بیرونی سازشوں اور اس کے نتیجے میں معاشی، صنعتی اور کاروباری بحرانوں کے جس بھنور میں پھنسا ہوا ہے اس لیے عوام کا اتحاد اور اتفاق کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ اہم ہونا چاہیے اور جب ہم خوش قسمتی سے ایک ایسے مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہوں جو ایک بے گناہ انسان کے خون کو پوری انسانیت کا خون قرار دیتا ہے اور اس میں کسی مذہب ، کسی مسلک ، کسی فرقے اور علاقے کی تخصیص بھی نہیں تو پھر آخر ایسا کون سا عنصر ہے جو ہمیں فرقہ واریت کی جنگ میں دھکیل رہا ہے اگر بقول وزیر داخلہ یہ اندرونی عناصر ہیں تو ابھی تک حکومت کی گرفت میں کیوں نہیں آئے اور اگر بیرونی ہیں تو ہم انہیں ایسا کرنے سے روک کیوں نہیں پا رہے اگر پیسہ باہر سے آ رہا ہے تو

کیسے، کیا ہماری حکومت سو رہی ہے یا اسے اپنی سیاسی ریشہ دوانیوں سے فرصت نہیں ہے۔ مسئلہ جو بھی ہے ملک اس وقت مشکل حالات سے گزر رہا ہے اور اگر فرقہ واریت کے اس دیو کو آزادی مل گئی تو پھر اس کو قابو کرنا مشکل ہو گا آخر یہی شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے رشتے تک کرتے کرتے ایک دوسرے کے دشمن اور خون کے پیاسے کیسے ہو جاتے ہیں۔ کیا دنیا میں مختلف مذاہب کے لوگ بھی ایک ہی محلے میں نہیں رہتے تو پھر ہم ایک ہی مذہب کے لوگ ایک ملک میں کیوں نہیں رہ سکتے۔ حکومت اور عوام کو احساس کرنا ہو گا کہ یہ سب کچھ کسی بڑی سازش کا حصہ ہے آخر کیسے آٹھ سو اور ہزار کلو بارود بن جاتا ہے کیسے خود کش بمباروں تک پہنچتا ہے اور کیسے کسی ٹینکر، گاڑی یا ٹرک میں لاد کر ایک حساس علاقے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ وقت ایک دوسرے پر الزامات لگانے کا نہیں بلکہ اصل مجرم تک پہنچنے کا اور اس پر ہاتھ ڈالنے کا ہے اگر یہ مجرم اتنے شقی القلب ہیں کہ کبھی یہ فرقے کے نام پر قتل کرتے ہیں، کبھی علاقے کے نام پر اور کبھی طالبان کی صورت میں صرف نکتۂ نظر کے نام پر تو پھر یہ بھی کسی رحم کے حق دار نہیں۔ یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے حساس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں اور ہماری ذمہ دار وزارتیں بھی، اگر انہیں حملے کی خبر ہو جاتی ہے چلیئے مانا کہ مقام اور وقت کا تعین مشکل ہے لیکن جب ایک شہر کے بارے میں اطلاع آجاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس شہر میں حساس مقامات کون کون سے ہیں تو کیا تب بھی حفاظت نا

ممکن ہوتی ہے ہاں ایسا اس لیے مشکل ہو جاتا ہو گا کہ ہماری پولیس جو وی آئی پیز کی حفاظت پر لگی ہوئی ہے اس کے پاس اتنی نفری بچتی ہی نہیں کہ عوام کی حفاظت کرے ۔یہاں حکومت کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہو گا اور اسے پورا بھی کرنا ہوگا۔ معاشرے میں قناعت اور شکر گزاری بھی پیدا کرنا ہو گی تا کہ لوگ پیسے کی خاطر انسانی جان کو یوں قتل نہ کرتے پھریں، علمائ کو مذہب کی صحیح روح بھی اُجاگر کرنا ہو گی اور لوگوں کو بتانا ہوگا کہ اسلام امان ہے ، سلامتی ہے اور یہ کشادہ دل بھی ہے ۔ہم اٹھارہ کروڑ کی طاقت کی بات تو کرتے ہیں اس اٹھارہ کروڑ کے ہجوم بیکراں کو قوم اور طاقت بنانا بھی ہوگا جس دن ہم نے اسلام کی کشادگی کو دل سے محسوس کر لیا اور اٹھارہ کروڑ کو طاقت بنا لیا تو ہم بڑی آسانی سے فرقہ واریت اور دہشت گردی پر قابو پالیں گے پھر نہ کوئی کسی راہگیر کی لاش کو روئے گا کہ وہ بم دھماکے کا نشانہ بنا نہ کوئی لاش شیعہ ہو گی نہ سنی وہ مسلمان یا انسان ہو گی اور بس۔

بنگلہ دیش میں عجیب وغریب نوعیت کے مقدمات

بنگلہ دیش کو پاکستان سے الگ ہوئے بیالیس سال ہو گئے ہیں اور اس دوران بنگلہ دیش میں پاکستان کے بارے میں کچھ بہت اعلیٰ قسم کے جذبات تو شاید کبھی نہ رہے لیکن پاکستان مخالفت بیں جھی اتنی شدت نہیں ہوئی جتنی حسینہ واجد کے دورِ حکومت میں ہوتی ہے۔ اس وقت بنگلہ دیش میں عجیب وغریب نوعیت کے مقدمات چلائے جارہے ہیں جن میں ملزمان پر الزام تو لگایا جارہا ہے کہ انہوں نے بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں انسانیت کے خلاف حرکات کیں یعنی قتل اور آبرو ریزی لیکن دراصل یہ سارے مقدمات اُن لوگوں پر چلائے جارہے ہیں جنہوں نے اس جنگ میں پاک فوج کا ساتھ دیا ورنہ اگر مظالم پر ہوتا تو مکتی باہنی کے ظالمان تو تمام کے تمام قابل گرفت تھے جنہوں نے مشرقی پاکستان میں موجود ہر مغربی پاکستانی کو یا پاکستان کی حمایت کرنے والے کسی بھی شخص کو قابل قتل جانا اور بُری طرح غیر انسانی طریقے سے یہ قتل عام کیا گیا۔ میں پاک آرمی کے ایک ایسے میجر کے بارے میں جانتی ہوں جسے خود تو اِس کے فوجی ہونے کی پاداش میں شہید کیا ہی گیا ،اُن کی اہلیہ جو ظاہر ہے ایک عورت تھی کو بھی شہید کیا گیا، ان کی دو بیٹیوں کو بری طرح سے زخمی کیا گیا اور اُن بچیوں کی موت کا یقین کرنے کے بعد مکتی باہنی والے انہیں چھوڑ کر چلے گئے یہ اور بات ہے کہ زندگی اور موت

اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دو اور چار سال کی یہ بچیاں اپنی خداترس بنگالی آیا کے ہاتھوں پاکستان پہنچ گیئں ۔ میں نوشہرہ کے میجر عطااللہ شہید کو بھی جانتی ہوں جن کے ورثائ نہیں جانتے کہ اُن کی لاش کہاں گئ انہیں کس طریقے سے شہید کیا گیا۔ کیا یہ سب ظلم نہیں تھا اور کیا مکتی باہنی کے ہر کارندے کے اوپر بھی مقدمہ نہیں چلنا چاہیے۔ مقدمات اگر واقعی جنگی جرائم کے بنا پر ہوتے تو خود بنگلہ دیش میں ان پر ہنگامے نہ چھوٹتے اور نہ اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیمیں اس پر معترض ہوتیں لیکن یہ سب سراسر تعصب کی بنیاد پر ہو رہا ہے اور اس گناہ کی پاداش میں ہو رہا ہے جو پاکستان کی حمایت میں کیا گیا تھا۔اس حمایت کو غداری قرار دینا بذات خود غلط ہے کہ اس وقت یہ سب پاکستانی شہری تھے اور پاکستانی شہری ہونے کے ناتے یہ ان لوگوں کا فرض تھا کہ پاکستان کی حمایت کرتے ۔اِس وقت بنگلہ دیشی حکومت جن مافوق الفطرت تعداد و شمار کے ساتھ پاکستانی فوج پر قتل عام اور عصمت دری کا الزام لگا رہی ہے خود کئ بنگالی بھائی اور غیر جانبدار مبصرین اس کو غیر حقیقی اور متعصبانہ قرار دیتے ہیں اور حکومت انہی بے بنیاد اعداد و شمار کو بنیاد بنا کر اپنے ہی ملک میں ایک تنازعے کو جنم دے رہے ہیں سوال یہ ہے کہ کیا ان بنگالیوں نے جنہیں آج سزا دی جا رہی ہے بنگلہ دیش بننے کے بعد کسی غداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ 73 سالہ دلاور حسین سیدی جو بنگلہ دیش جماعت اسلامی کے نائب امیر ہیں کی سزائے موت کے اعلان کے بعد بنگلہ دیش میں جس طرح ہنگامے پھوٹ

پڑے ہیں اور اب تک اس کی سڑکوں پر اسّی افراد کی جان لے چکے ہیں وہ کوئی اچھے آثار نہیں ہیں اس سے پہلے اسی جماعت کے ابوالکلام آزاد کو سزائے موت اور عبدالقادر ملا کو عمر قید تعصب کے سوا کچھ نہیں۔ 1971 میں جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم جو اس وقت نوے سال سے زائد عمر کے ہیں انہیں جیل میں جس حالت میں رکھا جا رہا وہ بذات خود انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے ان کے بیٹے بریگیڈیئر ریٹائرڈ عبداللہ اعظم اعظمی نے شکایت کی ہے کہ ان کے ضعیف العمر والد کی صحت انتہائی خراب ہے اور جیل کے ہسپتال میں نہ ان کے کھانے اور نہ ہی علاج کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ ان کے بھتیجے جو برطانیہ کے شہری ہیں اور ملائیشیا میں ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں چونتیس سال بعد اپنے چچا سے ملنے بنگلہ دیش آئے لیکن انہیں ملنے نہیں دیا گیا۔ اقوام متحدہ نے بھی ان مقدمات میں ملوث کیے گئے افراد کی قید کو غیر قانونی قرار دیا اور کہا کہ یہ مقدمات انٹر نیشنل کرائم ٹربیونل کے قانون کے مطابق درست نہیں۔ اخوان المسلمین مصر نے بھی بنگلہ دیش کی حکومت سے اس غیر قانونی سزا کو ختم کرنے کی اپیل کی ہے۔

مسئلہ جماعت اسلامی یا بنگلہ دیش نیشنل پارٹی کا نہیں، بلکہ کچھ اور ہے۔ یہ جماعتیں بنگلہ دیش کی سیاست میں فعال رہی ہیں اور اس کی پارلیمینٹ میں نشستیں بھی جیتتی رہی ہیں مسئلہ پاکستان کی مخالفت کا ہے۔

جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم پر وہاں کی حکومت یہ الزام لگا رہی ہے کہ اس کے

پاکستان کی آئی ایس آئی کے ساتھ تعلقات ہیں اور یہ کہ وہ القائد اور طالبان کے لیے نوجوانوں کو بھرتی کرکے پاکستان بھیجتی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تنظیم یہ دونوں کام بیک وقت کیسے کرتی ہے کیا القائد،طالبان اور پاکستان کا تعلق آپس میں جوڑا جا رہا ہے اور اس طلبہ تنظیم کے اوپر جس قتل عام کا الزام ہے اس میں پاکستان کو ملوث کیا جا رہا ہے۔کیا بھارتی صدر پرناب مکرجی کے دورہ بنگلہ دیش پر اُن کی آشیر باد حاصل کرنے کا یہی طریقہ تھا۔ معاملہ کچھ بھی ہو بنگلہ دیش کے لئے پاکستانیوں کے دل

میں برادرانہ جذبات اب بھی ہیں بھارت اور بنگلہ دیش یا بنگلہ دیش اور آسٹریلیا یا کسی بھی ملک کے ساتھ کرکٹ میچ میں ساری پاکستانی دعائیں بنگلہ دیش کے ساتھ ہوتی ہیں کیونکہ تعلق ٹوٹا ضرور ہے ختم نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ مذہب نے ہمیں جس لڑی میں پرویا ہوا ہے وہ اٹوٹ ہے۔ بنگالیوں کے دل میں پاکستان کے لیے اگر نفرت ہوتی تو پاکستان کا نام لے کر دی گئی سزاوں کو وہ بخوشی قبول کر لیتے اس کے ردعمل کے طور پر اپنی ہلاکتیں قبول نہ کرتے۔ عالم اسلام کو اس وقت نا اتفاقی اور باہمی تنازعوں میں جس طرح الجھایا گیا ہے کیا بنگلہ دیش میں بھی یہی کھیل رچایا جا رہا ہے اگر شیخ حسینہ واجد پاکستان سے اپنی آبائی نفرت اور غصہ نکالنے کی بجائے اس وقت اپنے ملک میں امن وامان قائم رکھتیں، مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتی اور پاکستان کے ساتھ تعصب برتنے کی بجائے حقائق سمجھنے کی کوشش کرتیں تو زیادہ بہتر ہوتا

اور حقیقت یہ ہے کہ پاکستان نے چاہے ٹوٹے اور دکھے ہوئے دل کے ساتھ سہی بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے اور اپنے سے ایک ہزار میل دور بنگالیوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے بغیر کسی حیل وحجت کے اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ انہی جذبات کی توقع وہ خود بھی کرتا ہے جس کا ثبوت وہاں کے عوام نے تو دیا ہے حکومت بھی دے تو خود اُس کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔

کوئی تو آئے نئی رُتوں کا پیام لے کر

آج سے تہتر سال پہلے کچھ بے نام ونشان لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوا اور ایک قافلہٴ شوق ترتیب دیا گیا کچھ اس قدر مرتب، متحد اور متفق کہ ایک ہی شوق اور مقصد ہر راہرو کے ماتھے پر تحریر تھا، ماتھے الگ تھے ۔ رنگ میں بھی فرق تھا، زبانیں بھی جدا تھیں، کوئی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتا تھا، کوئی ہاتھ چھوڑ کر ۔ کوئی رفع یدین کرتا تھا، کوئی سیدھا سجدے میں جاتا تھا۔ ہاں نماز کا سبق ، قرآن ، دین ،سب ایک تھا،پیشانی پر سجدے کا محراب ایک جیسا تھا، روشن اور چمک دار، اور وہ تحریر جو ان ماتھوں پر لکھی ہوئی تھی اُن میں نہ زیر کا فرق تھا نہ زبر کا، نہ کسی پیش اور تشدید کا اور یہ تحریر تھی لے کے رہیں گے پاکستان ، بن کے رہے گا پاکستان۔ وہ پاکستان جس کا کوئی وجود نہیں تھا اُس پر قربان ہونے کو سب تیار تھے، جذبہ تھا کہ دشمن کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گیا کیونکہ کندھے سے کندھا جڑا ہوا تھا اور دل سے دل ملا ہوا تھا۔ دنیا نے دیکھا کہ انہی بے نام ونشان لوگوں نے دنیا کی تاریخ بھی بدلی اور جغرافیہ بھی، آزادی ضرور حاصل کی لیکن ملک آزاد نہیں کیا بلکہ ملک بنایا اپنے گھروں کی قربانی دی لیکن یہ گھر محبوب رکھا اپنے پیاروں کو کھویا لیکن اس گھر کو کھونے کا تصور بھی نہیں کیا ہر مصیبت کا سامنا بھی کیا اور مقابلہ بھی، نہ بے

سروسامانی سے گھبرائے اور نہ قلتِ تعداد سے۔ لیکن۔۔۔
لیکن پھر کیا ہوا کہ یہی قافلہ جو بڑی شان سے چلا تھا آج ایک ایسے مقام پر رُک گیا ہے کہ نہ کوئی رہبر ہے نہ میرِ کارواں اگرچہ دعوے دار بہت ہیں اور دعوے بھی بہت ہیں لیکن ہر کوئی اپنا ہی دیا چاند بنانے کی کوشش میں مصروف ہے اور وہ جذبہ بھی مفقود ہے جس کے ساتھ یہ رہرو چلے تھے۔ آج پاکستان کا نہ صرف لیڈر بلکہ عام آدمی بھی جذبہ ایمانی سے عاری ہوتا جارہا ہے۔ 23 مارچ کو یومِ پاکستان منانے کا وہ جذبہ اور جوش و خروش بھی ماند دکھائی دیتا ہے جو چند سال پہلے تھا سرکاری پریڈ کا نہ ہونا تو امن عامہ کی خراب صورت حال ہو سکتی ہے لیکن عوام میں ایسے دنوں کا جوش و خروش سے منانا کم از کم وطن سے محبت کا جذبہ اُبھار دیتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر ایسے دن اپنا محاسبہ کرنے کے دن ہوتے ہیں کہ بحثیت قوم ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اگر آج اس 23 مارچ 2013 کے دن ہم اپنا محاسبہ کریں تو دکھ اور افسوس ہی ہوتا ہے کہ اُس وقت جب یہ قوم نوزائیدہ اور نو آموز تھی تو پاؤں پاؤں چلنا سیکھنے والے بچے کی طرح مسلسل چلنا چاہتی تھی دوڑنا چاہتی تھی لیکن آج اس نے کسی بوڑھے شخص کی طرح سہارے ڈھونڈنے شروع کر دیئے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں ساٹھ ستر سال کہنے کو تو کچھ لمبا وقت نہیں لیکن اگر ہم یہی کہتے رہے اور سوچتے رہے تو وقت ہمیں پیچھے چھوڑ جائے گا اور خود آگے بڑھ جائے گا جیسے یہ

میں آگے بڑھ گیا تھا۔ آج ملک کے حالات پر نظر ڈالیں تو نا اُمیدی اپنے پھن 1971
پھیلائے ہوئے ہے ایک طرف دہشت گردی ہے تو دوسری طرف شدت پسندی۔ کبھی
بلوچستان کا مسئلہ سلگتا ہے تو کبھی بھڑکنے لگتا ہے، کبھی طالبان زور آور دکھائی دیتے ہیں تو
کہیں فرقہ واریت پھیلانے والے گروہ برسرپیکار ہیں۔ کہیں رشوت کا بازار گرم ہے تو
کہیں اقربا پروری معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے اور کہیں گلوبل ولیج کی
فیشن زدہ اصطلاح ثقافت اور روایات کو ختم کرنے میں مصروف عمل۔ زیادہ افسوس
اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ہماری قیادت نیرو بنی بانسری بجا رہی ہے، ہا
ں جہاں ذاتی مفاد اور سیاسی مصلحت کو ضرورت پڑ جائے تو ملک کی فکر میں کوئی بیان
داغ دیا جاتا ہے جس ایک حصہ اپنی تعریف اور مسیحائی کے دعوے پر مشتمل ہوتا ہے اور
دوسرا اس خدشے پر کہ اگر بیان دینے والے نابغہ کا یا ان کی تنظیم اور پارٹی کا سہارا نہ لیا
گیا تو ملک ٹوٹ جائے گا خاکم بدہن۔ مسئلے کی نشاندہی اور اُس کا حل جس انداز میں بیان
کیا جاتا ہے وہ بذات خود قوم کو ذہنی پریشانی میں ڈالنے کو کافی ہوتا ہے۔
مسائل اور مصائب ہر ملک پر آتے ہیں لیکن ان سے مردوں کی طرح لڑنا اور ان پر
قابو پالینا ہی زندہ قوموں کی نشانی ہے اور اس کے لئے پہلی ضرورت ایک ایسی لیڈر
شپ اور رہنمائی ہے جو بکھرے ہوئوں کو، بچھڑے ہوئوں کو ایک مرکز پر لے

آئے انہیں قافلے کی شکل دے ایک فاتح فوج کی صورت دے دے، رہنما اتنا باکردار اور باوقار ہو کہ اپنی تعریف میں ایک لفظ نہ بولے، کوئی دھمکی نہ دے کسی کی دوسرے کی کردار کشی نہ کرے اور لوگ خود بخود اس کے پیچھے قطاریں بناتے چلے جائیں، صفیں باندھتے جائیں، کسی محمد علی جناح کی طرح جس کے کردار پر کوئی انگلی اٹھا سکا نہ خلوص پر، کسی اقبال کی طرح جو بانگ رحیل بلند کرتا رہا اور قافلے کو نئی قوت ملتی رہی وہ نہ بھی رہا تو اُس کی آواز نشان منزل کا پتہ دیتی رہی۔ 23 مارچ کو اگر ہم خود اپنی ذات سے یہ وعدہ کرلیں کہ پاکستان کو ترقی دینے کی، اِس کو 2013 پُر امن بنانے کی، اس کو محفوظ بنانے کی ذمہ داری صرف میری ہے اور میری غفلت اور میری بے ایمانی مجھے آنے والی نسلوں کا مجرم بنادے گی تو ہم اصلی پاکستان بنالیں گے وہ پاکستان جس کا خواب برصغیر کے ہر مسلمان کی آنکھ میں چمکا تھا اور جس نے ساری دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ پاکستان زندہ باد۔

ایم ایم عالم ـــــ کون تھا

جمہوریت کی مخالفت یا نیا فتنہ

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اس دین کے ماننے والے ہیں جس نے ہمیں زندگی گزارنے کا ہر ڈھنگ سکھایا ہے اور آنے والے زمانوں کے لیے بھی رہنمائی عطا کی ہے۔اِن اصولوں پر عمل نہ کرنا ہماری اپنی نا اہلی ہے جس کی وجہ سے ہم نے خود کو بہت سارے مسائل میں الجھا رکھا ہے اور یہی الجھاؤ اور نا اہلیاں اب ہمارے معاشرے میں شدت پسندی کی وجہ بن چکی ہیں۔ اسلام نے ہمیں اللہ کے کلام اور اس کی کتاب کو مشعل راہ بنا کر زندگی گزارنے کی تعلیم دی اور سارے بنیادی اصول سمجھا دیئے اور اس نے ہمیں جدت یا ترقی سے ہر گز منع نہیں فرمایا لیکن آج اگر ہم دیکھیں تو ایک طرف انتہا درجے کے ماڈرن ازم نے دوسری طرف ایک ایسی ذہنیت کو فروغ دیا ہے کہ جو پہلی ذہنیت کی مخالفت کو ہی اسلام کا درجہ دیتی ہے اور یہی ذہنیت طالبان بن کر آج پورے ملک کے لیے ہوا بنی ہوئی ہے۔ طالبان نے دیگر دہشت گردی کے ساتھ ساتھ جمہوریت کو خلاف شریعت قرار دے کر اس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر رکھا ہے۔آج کل وزیرستان اور دوسرے قبائلی علاقوں میں جمہوریت کے خلاف ایک پمفلٹ تقسیم کیا جا رہا ہے اور یوں ملک میں ایک اور مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جمہوریت کی مخالفت کرنے والے اپنی رائے کے لیے ایک عجیب توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ حاکمیت

کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے نہ کہ انسان کو جب کہ جمہوریت یہ حق انسان کو دیتی ہے لیکن عرض یہ ہے کہ خلافت ہو یا ملوکیت، بادشاہت ہو یا جمہوریت اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے لیکن اگر اُس نے ہی انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اور زمین اور انسان پر حکومت کے لیے فرشتوں کو مامور نہیں کیا تو پھر یہ حکمران کون ہوں اور کہاں سے آئیں ظاہر ہے کہ وہ انسان ہی ہونگے اور قرآن اور سنت نے ہمیں جو رہنما اصول دیئے ہیں تو اُن کی روشنی میں مرتب کیا گیا نظام حکومت یا آئین بھی قابل قبول ہونا چاہیے۔

اگر اللہ تعالیٰ باہم مشورے کا حکم دیتا ہے اور حکم بھی پیغمبر کو دیتا ہے کہ باہم مشورہ کیا کرو تو کیا اُس نبی کی غلامی کا دعویٰ کرنے والے نعوذباللہ اُن سے زیادہ عقل کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں مشورے کی ضرورت نہیں۔ چلئے اگر یہ دعویٰ نہیں کرتے تو آخر مشورہ کس سے کیا جائے ظاہر ہے کہ اس کے لیے ایک مجلس شوریٰ ہو لیکن آج کے زمانے میں جبکہ صرف ملک پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی سترہ اٹھارہ کروڑ ہے اِن میں سے متقی ترین لوگوں کا انتخاب کیسے ہو اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محل نظر ہو کہ میڈیا کے اس دور میں کسی پر الزام لگانا، تضحیک کرنا اور تذلیل کرکے اس کے کردار کو مشکوک بنانا بھی انتہائی آسان ہے ایک مدرسے کا پڑھا ہوا دوسرے کو کافر بھی آسانی سے قرار دیتا ہو تو تقویٰ کی پیمائش کیسے ہو۔ سوشل میڈیا پر جمہوریت کے

خلاف جن آیات کا حوالہ دیا جا رہا ہے کہ کم تعداد زیادہ تعداد پر غالب آ جائے گی تو وہ کفر اور اسلام کے مقابلے کا ذکر ہے قرآن پاک کی اپنی مرضی کے مطابق توضیح بھی عین خلاف اسلام ہے۔

ی وفات کے وقت مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیق (رض) کو ö اگر نبی پاک کثرت رائے سے اپنا خلیفہ منتخب کیا تھا تو اب کثرت رائے کی مخالفت کیوں۔ یہ بات کے سب سے قریبی ساتھی ö بھی تسلیم ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق (رض) نبی پاک تھے لیکن اس کے باوجود کثرت رائے کی ضرورت پڑی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ حکم ماننے کو تیار رہیں اور نظام مملکت چلانا ممکن رہے۔ ان کے بعد حکومت اُن کے بیٹوں کو منتقل ہوئی نہ حضرت عمر (رض) و عثمان (رض) و علی (رض) کے بعد ایسا ہوا بلکہ ان کا کونسل کے ذریعے یا کثرت رائے کے ذریعے لیکن انتخاب ہی ہوا جب کہ اِن میں سے کوئی بھی دوسرے سے تقویٰ میں کم نہ تھا۔

آج کی جمہوریت اور انتخاب کا اگر اُس زمانے سے موازنہ کیا جائے تو بلاشبہ اس میں فرق ہے یہ اتنی پاکیزہ ہرگز نہیں ہے لیکن اس کا مطلب نظام کی خرابی نہیں۔پاکستان بننے کے بعد آئین بنانے کے لیے جن نکات کو بنیاد بنایا گیا اور اُسے قرارداد مقاصد کی شکل میں آئین پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا اگر انہی نکات کو لیا جائے اور اسے مملکت وریاست کی بنیاد بنا دیا جائے تو

جمہوریت بذات خود ایک اسلامی طرزِ حکومت بن جاتی ہے۔
طالبان جس مکتبہ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں اسلام اس سختی کا روادار ہی نہیں ۔ اسلام انسانی جان کو مقدس ترین قرار دیتا ہے اور بے گناہ کو گناہ گار کے جرائم کا ذمہ دار نہیں مانتا اور گردانتا لیکن طالبان حکومت سے اختلاف کی بنا پر ملک میں رہنے والے ہر بڑے بچے ، مرد اور عورت کو قابل قتل سمجھتے ہیں چاہے وہ راہ چلتا یا سڑک کے کنارے روزی کمانے کے لیے پتھر کوٹنے والا ایک مزدور ہی کیوں نہ ہو یا ایک دودھ پیتا شیر خوار بچہ ہی کیوں نہ ہو یا ایک پردہ دار اور گھر دار خاتون خانہ ہی کیوں نہ ہو۔
اگر طالبان کسی ایسے ہی نظام حکومت کے لیے برسرپیکار ہیں تو حکومت کو اس چیز کا نوٹس لینا چاہیے اور ایک نئے فتنے کو پھیلنے سے پہلے روک لینا چاہیے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ووٹ کی اہمیت کو عوام کو سمجھانا ہوگا انہیں یہ بتانا ہوگا کہ ووٹ بکاؤ نہیں ہونا چاہیے اور اپنے نمائندے منتخب کرتے ہوئے یہ احتیاط لازم رکھنی ہے کہ وہ کون ہیں اور کیسے لوگ ہیں ۔ کروڑوں لوگوں میں سے اچھی منتخب قیادت لانے کے لیے ظاہر ہے ووٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن اس سے پہلے عوام میں شعور پیدا کرنا انتہائی ضروری ہے۔
آج کی دنیا میں رہنے کے لیے ہمیں دین کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے

ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کرنا ہے کہ ہم دنیا کا مقابلہ کر سکیں اور یہ سب ہم جمہوریت اور جمہوری طرز عمل میں کر سکتے ہیں۔ بادشاہت اور حاکمیت صرف اللہ کی ذات کو ہی سزاوار ہے لیکن زمین پر نظام مملکت و حکومت چلانے کے لئے ظاہر ہے انسان ہی کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ خود اللہ نے اس کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے لہذا اس سے انکار کرنا بھی مذہبی طور پر روا نہیں بلکہ ایک اور طرح کی انتہا پسندی ہے جس کا بروقت تدارک اور قلع قمع ضروری ہے۔

بنگلہ دیش۔۔۔ غیر ملکی دوستوں کے لیے ایوارڈز

بنگلہ دیش ہمارا برادر اسلامی ملک ہے پاکستان کے لوگ آج بھی بنگلہ دیش سے پیار کرتے ہیں ان کی کامیابی کا جشن مناتے ہیں اور ان کی ہار پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن بنگلہ دیش حکومت کا آجکل کا رویہ کچھ عجیب و غریب ہے کہ جیسے پاکستان کو نشانے پر لے لیا گیا ہو۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی کے دورِ اقتدار میں یہ سب کچھ بہت انوکھا بھی نہیں ہے لیکن افسوس ناک ضرور ہے۔ 1971 پاکستان کی تاریخ کا سب سے سیاہ ترین سال تھا کیا ہوا یہ سب جانتے ہیں کیوں ہوا بہت سی باتیں اب بھی ایک راز ہیں۔ فوجی آپریشن کیوں ہوا، کس نے کروایا، بھارتی فوج کی مداخلت، مغربی اور مشرقی پاکستان میں جغرافیائی دوری، سیاستدانوں کی خود غرضیاں اور ہوس اقتدار، فوجی قیادت کی نااہلی، مجیب، مکتی باہنی، بھٹو، یحیٰ ہر کردار اپنی جگہ قصوروار تھا۔ لیکن مجیب نے بھارت نوازی اور پاکستان دشمنی کا جو چہرہ تب دکھایا تھا آج اُس کی بیٹی شیخ حسینہ واجد کا رویہ بھی مختلف نہیں ہے پاکستان کے ساتھ اپنی موروثی نفرت کو وہ سنبھال کر رکھے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے بنگلہ دیش کے قیام میں مدد دینے والے غیر ملکی دوستوں کو ایوارڈز دیئے جن میں تیرہ پاکستانی ''دوست'' بھی شامل ہیں جنہوں نے اس ایوارڈ کی وصولی کے لیے یہ توجیہہ تراشی کہ ''ہم'' وہ لوگ ہیں جنہوں نے

فوجی آپریشن کی مخالفت کی تھی ان میں سے ایک وصول کنندہ نے اس ایوارڈ کے لیے ایک انتہائی ناقابل قبول وجہ یہ بھی تلاش کی کہ شیخ مجیب کی بیٹی شیخ حسینہ واجد پاکستانیوں کے ذہن سے یہ بات نکالنا چاہتی ہیں کہ بنگلہ دیشی پاکستانیوں کو اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اِس ایوارڈ کی قیمت صرف اتنی ہے کہ خواہشمند پاک فوج کا مخالف ہو اور ایک بڑے نیوز گروپ کا یہ اینکر اور کالم نویس یہ کام اپنا فریضہ سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ اُن کے والد کو اس لیے یہ ایوارڈ دیا گیا کہ بقول اُن کے وہ چار پانچ طلبائ کے ایک گروپ کو پنجاب یونیورسٹی سے ڈھاکہ لے کر گئے تھے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیوں کیا بنگلہ دیش بنانے کے لیے یا پاکستان بچانے کے لیے اب سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان بچانے والوں کو یہ ایوارڈ دیا جا سکتا تھا۔

اگر بقول اِن کالم نویس کے جو شیخ مجیب اور شیخ حسینہ واجد کو پاکستان کے بہترین خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے ایوارڈ وصولی کے فعل کے لیے جواز پیش کر سکیں لیکن وہ ذرا اُن پاکستانیوں کے سوالات کے جوابات تو دیں جن کے خاندان صرف اسی جرم میں وہاں قتل کر دیئے گئے کہ وہ خود کو پاکستانی کہتے تھے اور ملک سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اپنی جان بھی نذر کر دیتے تھے اور آج بھی خود کو پاکستانی کہتے ہیں۔ اپنے آپ کو انسانی حقوق کے چیمپئن کہنے والے اور نام کمانے کی خاطر اپنی فوج کو

مجرم گردانتے والوں کو وہ بے بس بہاری کیوں نظر نہیں آئے جو 1971 میں قتل کئے
گئے اوران میں سے بہت سے اب بھی مہاجر کیمپوں میں رہ رہے ہیں صرف پاکستانیت
کے جُرم میں لیکن ظاہر ہے ایسا کرنے پر انہیں ایک غیر ملکی ایوارڈ تو نہیں مل سکتا تھا۔
یہ لوگ تو اسی میں فخر محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں ایک غیر ملکی ایوارڈ ملا ہے تاریخ
مسخ کرنے پر ہی سہی۔ مشرقی پاکستان میں پاکستانیوں کے قتل عام کے ایک عینی شاہد اور
میرے ایک بہت محترم قاری ڈاکٹر جمیل رضوی رمنا ریس کورس گراونڈ میں شیخ مجیب
الرحمٰن کے ایک جلسے میں اس کے خونی لہجے کی اپنی یادشتیں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں
شیخ مجیب نے کہا ''کیوں پاکستانی، پنجابی، بہاری اور دوسرے غیر بنگالی اب تک زندہ ہیں
انہیں مار ڈالو انکے گھروں میں، اُنکی پناہ گاہوں میں، سیڑھیوں میں، انہیں انکی
خوابگاہوں میں، باورچی خانوں میں، گوداموں میں، غسلخانوں میں اور کسی بھی
دوسری پناہ گاہوں میں'' ڈاکٹر رضوی کا سوال ہے کہ اُن کے والد کے اغوااور خود اُس
وقت میڈیکل کے اس طالبعلم پر تین لوگوں کا حملہ کون سے قانون کے تحت تھا کیا اِن
سے کسی نے معافی مانگی یا کسی نے اس کا مطالبہ کیا۔ وقت نے یہ سب کچھ مجیب کے
ساتھ بھی کیا لیکن اُس سے پہلے وہ پاکستانیوں کا قتل عام کر چکا تھا۔ صرف اسلامی نظریے
کی پاسداری کے جُرم اور بھارت نوازی میں عالمی میڈیا نے جو جو الزامات پاک فوج
کے خلاف تراشے ان الزامات کو کچھ مخصوص بدنیت ذہنیت کے نام نہاد لیڈروں اور
میڈیا کے پیرانِ کامل نے تسلیم

کیا اور بنگلہ دیش کے معافی مانگنے کے مطالبے پر ان سے زیادہ اثر گئے لیکن مکتی باہنی، بھارتی فوج اور مجیب کے مظالم کا نشانہ بننے والے پوچھتے ہیں کہ ان کے پیاروں کے خون کا حساب کون دے گا سلیمہ ہاشمی، حامد میر یا عاصمہ جہانگیر یا پھر شیخ حسینہ واجد۔

اگر بقول ایوارڈ کے وصول کنندہ کالم نویس کے یہ سب کچھ پاکستان کی دوستی میں کیا گیا تھا کہ پاکستان کے بارے میں ایک اچھا تاثر پیدا کیا جا سکے تو بنگلہ دیش کی کرکٹ ٹیم کے دورے کو اعلان کے بعد کیوں بار بار منسوخ کیا گیا۔ پاکستان سے وفاداری کا ثبوت دینے والے نوے سالہ پروفیسر غلام اعظم جیل میں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ کالم نویس نے ہزاروں احتجاجیوں کا ذکر تو کیا کہ جو بنگلہ دیش جماعت اسلامی پر پابندی لگانے کے مطالبے کے تحت دھرنا دیئے ہوئے ہیں لیکن بیسیوں مقتولین کا نہیں جو اس پارٹی سے زیادتی پر احتجاج کرتے ہوئے ہلاک کئے گئے۔ مسئلہ اِس یا اُس جماعت کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ پاکستان کا ہے اور پاک فوج کی مدد کا ہے یہ سب کچھ ہمارے کچھ میڈیا گروپس سے شاید ''نظر انداز'' ہو گیا اور کچھ اینکرز نے اسے درخور اعتنائی نہیں سمجھا۔ دراصل وطن عزیز میں یہ عجیب رسم چلی ہے کہ فوج کے خلاف بولو اور بہت کچھ پالو، وال سٹریٹ جرنل میں ایک مضمون پاک فوج کے خلاف لکھو اور مالا مال ہو جاؤ۔ 1965 کی جنگ کو پاک فوج کی غلطی قرار دو اور انٹلکچوئل بن جاؤ، اُسے

کے تمام تر واقعات کا ذمہ دار قرار دو اور ایوارڈ وصول کر لو۔ کیا لکھنے والا اور 1971 کہنے والا یہ نہیں سوچتا کہ فوج آخر وہاں گئی کیوں، مکتی باہنی کس نے بنائی، الشمس اور البدر کے مجاہدوں کے ساتھ کیا ہوا۔ ڈھاکہ میں پاکستانیوں کی لاشیں بے گور و کفن کیوں پڑی رہی، چاہے وہ کوئی مزدور تھا یا کوئی سائیکل رکشا ڈرائیور اُسے پاکستانی ہونے یا چلئے غیر بنگالی ہونے کی سزا کیوں دی گئی کیا کوئی اُن سے معافی مانگے گا۔

یہ ایوارڈ لینے والے اگر اب پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان بہترین تعلقات کے لیے کوئی کردار ادا کرتے وہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں زبردستی ڈالی گئی نفرت ختم کرنے کی کوشش کرتے اور 1971 کے واقعات میں بھارت کا کردار عیاں کرنے کی سعی کرتے اور پھر کوئی ایوارڈ وصول کرتے تو ہم سب ان پر فخر کرتے لیکن کاش کہ ایسے مخلص لوگ سامنے آئیں اور ملک کی نیک نامی کے لیے کام کریں تو ایوارڈز کی وصولی کا جشن پوری قوم منائے اور خود انہیں بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا تردُد نہ کرنا پڑے۔

الیکشن۔۔۔ توقعات اور خدشات

الیکشن 2013 ،ہر طرف ایک غلغلہ ہے سیاسی پارٹیاں، انتخابی امیدوار، الیکشن کمشن ، ریٹرننگ افسر، کارکن، پارٹی رہنما سب ہی مصروف ہیں اور کچھ پریشان بھی۔ یہ اُن کے لیے مشکل وقت ہے اور قوم کے لیے مشکل مرحلہ ،اللہ کرے کہ یہ مرحلۂ شوق بخیریت طے ہو اور قوم مخلص اور ایماندار قیادت کے تحفے سے سرافراز ہو۔

الیکشن یوں تو دنیا میں کہیں بھی ہوں مشکل ہوتے ہیں لیکن پاکستان جیسے آمریت کے عادی ملک کے لیے مزید مشکل ہیں اس لیے بھی کہ کوئی اپنی ہار قبول کرنے اور دوسرے کی جیت سہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، انتخابی،برادری منشور سے زیادہ اہم ہو تی ہے اور دولت ان سب سے ،بڑھ کراہم کیونکہ انتخابی مہم چلانے سے لیکر لوگوں کو جلسے جلسوں میں لانے تک پیسہ ،بڑھ چڑھ کر بولتا ہے اور سیاستدانوں سے معذرت لیکن غریب عوام کا ووٹ خریدنے کے لیے بھی یہی پیسہ خرچ کیا جاتا ہے۔

ملک میں عام انتخابات میں اب بہت کم دن رہ گئے ہیں الیکشن کمشن اور سیاست دان ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں ۔ ریٹرننگ افسران کے سوالات اور سیاستدانوں

کے جوابات زبانِ زد عام بھی ہیں اور موضوع بحث بھی اگرچہ تنقید کے بعد سوالات کا معیار شاید بہتر ہو گیا تھا لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں بلکہ ایماندار اور اہل قیادت کا انتخاب ہے اور اس وقت قوم دیکھ رہی ہے اور حیران ہے کہ اُس کی رہنمائی کا دعویٰ کرنے والوں میں سے بے شمار کی ڈگریاں ہی جعلی ہیں، کسی پر قرضوں کی نادہندگی کا الزام ہے، کسی پر سزا یا فتگی کا یا مجرمانہ سرگرمیوں کا۔ اس وقت الیکشن کمشن کا عملہ اگرچہ پوری طرح متحرک ہے اور ایسے لوگوں سے انتخابی عمل کو صاف کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن چونکہ سانپ کا کاٹا رسی سے بھی ڈرتا ہے اس لیے قوم کا خوف بالکل بجا ہے کہ کیا الیکشن واقعی شفاف ہو سکتے ہیں اور کیا واقعی ہم ایک پاکیزہ قیادت کی شروعات کر سکیں گے جبکہ انہی بڑے لوگوں کو پھر ٹکٹ مل رہا ہے اور پھر وہی پارٹیاں برسرپیکار ہیں جنہیں بار بار آزمایا جا چکا ہے ہر پارٹی کے اصل نمائندہ وہی لوگ ہیں جو پچھلے، اس سے پچھلے اور اس سے پچھلے الیکشن میں بھی موجود تھے۔ اگرچہ الیکشن کمشن نے کئی بڑے لیڈروں کے کاغذات نامزدگی نامنظور بھی کیے ہیں لیکن ایک حلقے سے اور اگلے کسی حلقے سے یہ منظور کر لیے گئے ہیں کیوں کیا وہ وہاں باکردار اور آرٹیکل 62 اور 63 کے مطابق ہو گئے۔ الیکشن ایک انتہائی حساس معاملہ ہے جس میں ہم اپنی قیادت منتخب کرتے ہیں جنھوں نے اگلے پانچ سال نہ صرف اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے بلکہ انہوں نے ہی ان سالوں میں پوری دنیا میں پاکستان کی نمائندگی کرنی ہو گی لہذا اس چناؤ

میں ہر مکتبہ ئ فکر کی احتیاط ضروری ہے لیکن ہم اس میں اتنے ہی غیر محتاط ہیں۔اب اگر الیکشن کمشن نے کچھ کچھ اقدامات شروع کیے ہیں تو اسے اِن کا دائرہ وسیع کر دینا چاہیے جیسا کہ ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ کوئی امیدوار انتخابات میں فتح کے بعد بھی اگر کسی ایسے فعل کا سزاوار پایا گیا جو قانون کے مطابق قابل گرفت ہو تو تب بھی اُسے نا اہل قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں یہ سطور لکھ ہی رہی تھی کہ مجھے ایک اخباری خبر کے ساتھ ایک ای میل موصول ہوئی جو خیبر پختونخواہ سے طاہرہ نوید نامی ایک سوشل ویلفئیر آفیسر نے بھیجی تھی اور اُنھوں نے اپنا احوال لکھا تھا کہ کیسے ان کے سماجی بہبود کے محکمے کی صوبائی وزیر ستارہ ایاز نے انہی پیشہ ورانہ اختلافات کی بنا پر تین دن حبس بے جا میں رکھا اور اب بھی محترمہ طاہرہ نوید کا ان کے خلاف مقدمہ زیر سماعت ہے جبکہ اُن کے مطابق وزیر موصوفہ اقربا پروری اور اسی جیسے دوسرے افعال میں ملوث ہیں تو کیا وہ الیکشن لڑنے کی حقدار ہو سکتی ہے۔ طاہرہ نوید تو اس نا انصافی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہیں اور الیکشن کمشن اور اس سے پہلے عدالت بھی پہنچ چکی ہیں لیکن یہ ہمت پوری قوم کو کرنا ہوگی۔ یہ تو ایک مثال تھی جو مخصوص نشستوں پر منتخب ہونے والی وزیر کی ہے لیکن کیا اب بھی ایسے امیدوار ان مخصوص نشستوں پر منتخب نہ ہونگے بلکہ بہت سے شکست خوردہ تو بعد میں ممبر سینٹ بن جاتے ہیں اور یوں نمائندگی اور اختیار غیر نمائندوں کے درمیان ہی گردش کرتا رہتا ہے اور اقتدار ان کے لیے ہی مخصوص

رہتا ہے۔ اس وقت الیکشن کمشن کی باری ہے وہ اگر اس فرض سے بخوبی عہدہ براۂ ہو جائے جو قوم نے اُن پر ڈالی ہے، ایک چھانی میں سے امیدواروں کو چھان لیں، کھرا اور کھوٹا الگ کر دیں تو آگے عوام اپنی باری یعنی ووٹ میں شاید کچھ آسانی محسوس کریں اور اگر شعور کی کمی کی بنا پر وہ ووٹ کا غلط استعمال کر بھی لیں تو اتنا نقصان نہ ہو جتنا ماضی میں ہوتا رہا ہے۔

آج کل یہ بحث بھی خوب چل رہی ہے کہ آئین کے مطابق ایسے فرشتے کہاں سے آئیں گے تو عرض ہے کہ اب بھی اس ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے ہمیشہ ایمانداری اور خلوص نیت سے اپنا کام کیا ہے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے لیکن یہ ضرور معلوم کیا جائے کہ یہ خطا قصداً کی گئی یا غیر ارادی طور پر ایک غلط فعل سرزد ہوا، اور قتل عمد اور قتل خطا کی سزا جدا رکھی جائے لیکن اگر ہم آنکھوں دیکھی مکھی نگلیں گے تو قے کی شکایت کسی سے کیسے کریں گے ان سارے اقدامات کے ساتھ ساتھ اگر عوام کو بھی ووٹ کا درست استعمال سکھایا جائے تو کچھ عجب نہیں کہ ہم پاکیزہ قیادت کا ایک گروہ اوپر لا سکیں اگرچہ میڈیا چینلز چھوٹے پیمانے پر ہی سہی کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں کہ عوام کو ووٹ کا درست استعمال بتایا جا سکے لیکن ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ انتخابات کو شفاف اور غیر جانبدار بھی بنانا ہے اس میں ملکی اور غیر ملکی دونوں مداخلتیں روکنی ہیں۔ اگر بھارت سے الیکشن کمشن

کی ویب سائیٹ ہیک کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے تو کسی قسم کی بیرونی مداخلت یا اثر اندازی بھی خارج از امکان نہیں، خود ملک کے اندر سے بھی با اثر شخصیات کا دباؤ پڑ سکتا ہے۔ الیکشن کمشن کو یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں انتخابات کے نتائج بھی ظاہر ہے ہر ایک کی مرضی کے مطابق نہیں ہونگے لیکن اللہ کرے وہ سب کے لیے قابل قبول ہوں اور دل سے مان لئے جائیں۔

قوم امید کرتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ آنے والا الیکشن اُن کے لیے مخلص قیادت لائے ایک ایسی قیادت جو اپنی ذات سے زیادہ ملک کو اہم سمجھے جو اپنے نفع سے اور اپنا خزانہ بھرنے سے زیادہ ملکی خزانے کی فکر کرلے اور اور جو یہ نکتہ سمجھ لے کہ اگر وہ اپنی آنے والی نسلوں کی بجائے ملک کی آنے والی نسلوں کی فکر کرے تو یہ ملک، یہ قوم خود ان کی آنے والی نسلوں کو وہ عزت واحترام دے گی کہ وہ مالا مال ہو جائیں گی۔ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے اور ہمیں اس کی عزت اور وقار کا ذریعہ بنائے۔

نجانے کتنے گھروں کے عوض یہ گھر ٹھہرا

الیکشن 2013 اس وقت ملک میں سب سے اہم ترین معاملہ ہے اور پوری قوم کی نظریں آنے والے دنوں پر جمی ہوئی ہیں سیاسی پارٹیاں اس وقت عوام دوستی کی "بہترین مثال" پیش کر رہی ہیں اور سچ ہی ہے کہ

شہریاروں کا غریبوں کے دروں پر آنا

ہے تو ایک بات مگر بات بڑی ہوتی ہے

اور یہ بڑی بات آج کل ہو رہی ہے۔ بات یہاں تک بھی درست ہے کیونکہ گھر کے اندر ہے لیکن گھر کے اختلافات اگر حد سے بڑھ جائیں تو غیروں کو گھر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور یہ مداخلت پھر بڑھتی جاتی ہے اور چاروں طرف سے ہوتی ہے۔ یہی حال ہمارا ہے کہ ہمارے سیاستدان ایک دوسرے سے اختلافات کرتے ہوئے اتنا آگے چلے جاتے ہیں کہ نہ ملکی وقار کا خیال کیا جاتا ہے نہ قومی عزت کا۔ کراچی میں نئی حلقہ بندیوں کے مسئلے کو جس طرح اُچھالا گیا اور ایم کیو ایم جو اپنے آپ کو قومی جماعت کہلاتی ہے صرف کراچی کے مسئلے کو لے کر اقوام متحدہ پہنچ گئی اور حل کے لیے اُس سے درخواست کرنے لگ گئی کیا قومی جماعتیں ملک اور قوم سے نکل کر غیروں

سے اپنے معاملات کا تصفیہ طلب کرتی ہیں لیکن یہی ہمارا المیہ ہے کہ ہم مارشلائوں کو بھی خود دعوت دیتے ہیں اور پھر جمہوریت پسندی کا شور اٹھا دیا جاتا ہے۔ ایک طرف انتخابات جیتنے کے لیے اور لوگوں میں شہرت حاصل کرنے کے لیے غیر ملکی مداخلت کی مخالفت کی جاتی ہے اور دوسری طرف خود غیروں کو دعوت دی جاتی ہے ،ایک طرف دہشت گردی کی مذمت کی جاتی ہے اور دوسری طرف سیاسی مخالفین کو مار دیا جاتا ہے اور یہی ہمارا قومی رویہ بن چکا ہے ظاہر ہے اگر یہ درست ہے کہ جیسی قوم ویسے حکمران تو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ جیسے حکمران ویسی قوم کہ وہ قوم کی جیسی تربیت کرتے ہیں اس کے سامنے جیسا نمونہ پیش کرتے ہیں اور جس طرح ہر گناہ ہر جرم کرکے بھی بری ہو جاتے ہیں قوم رد عمل میں ارادی طور پر یا غیر ارادی ، لیکن وہی کچھ کرنا شروع کر دیتی ہے اور افراد خود کو قابل سزا بھی نہ سمجھتے ہیں اور نہ مانتے ہیں ہاں ہر ایک دوسرے کو بڑے شوق اور دھڑلے سے قابل گردن زدنی سمجھتا ہے اور الیکشن میں تو یہ سیاسی رویہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ ایم کیو ایم ہو یا کوئی بھی دوسری سیاسی جماعت اور خاص کر جو حکومتی حلیف بھی ہو نہ تو پارلیمنٹ میں کسی قومی معاملے پر مضبوط موقف اپناتی ہے نہ باہر کیونکہ ان پر حکومت سے نکل جانے کا خوف سوار رہتا ہے اور با اختیار ہونے کے بعد بے اختیار ہونے کا دکھ سہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ بار بار استعفوں کی دھمکی بس دھمکی ہی رہی یہ تو چلیں ملک کے اندر ہوتا رہا گھر کی بات تھی لیکن اپنے ہی

ملک کے خلاف اقوام متحدہ میں پہنچ جانا انتہائی افسوسناک ہے۔ الیکشن جیتنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی اور وہ بھی جب کہ ایک جماعت خود حکومت میں ہو اور یہ بھی سب جانتے ہوں کہ عالمی طاقتیں پاکستان کو نشانے پر لیے ہوئے ہیں کیونکہ حکومتیں لاکھ ان کی نمک خوار ہوں عوام کی اکثریت ان کا نمک کھانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور وہ ہر ہتھکنڈے سے ان کو زیر دام لانے کی کوشش کر رہی ہیں ۔الیکشن کے دنوں میں تو یہ عمل مزید زور پکڑ جاتا ہے تاکہ یہ طاقتیں اپنی مرضی کے لوگ منتخب کروا سکیں اب کی بار بھی ایسا ہی ہو رہا ہے اور غیر ملکی این جی اوز کی صورت میں اپنے سارے گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں اور ہماری سیاسی پارٹیاں آپس میں ہی برسرپیکار بھی ہیں اور بلیم گیم بھی جاری ہے اور ان عوامل اور سازشوں کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں ہے۔ وہی طاقتیں جو اسلام اور مکہ مدینہ کا نام دیکھ کر بدک جاتی ہیں اور مسلمانوں کو جنونی اور دہشت گرد قرار دے دیتی ہیں خود اپنے مذہبی مشنوں کو پاکستان بھیج کر اس کے الیکشن پر اثر انداز ہو رہی ہیں ایسی ہی ایک تنظیم چرچ ورلڈ سروسز پشاور اور کوئٹہ سمیت پورے پاکستان میں انسانی ہمدردی اور ترقیاتی منصوبوں کے نام پر معلوم نہیں کیا کچھ کر رہی تھی اب الیکشن پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش میں مصروف ہے۔ یو ایس ایڈ کے طول طویل اشتہارات ہمارے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی زینت ہیں۔ کراچی میں تجارتی سرگرمیوں کے لیے ان غیر ملکیوں سے وعدے ہو رہے ہیں لیکن الیکشن میں

مدد دینے کی شرط پر۔ یہ چالیں ہیں جنہیں ہم سب جانتے ہیں لیکن ہمیں الیکشن جیتنا ہے چاہے ملک کا نقصان ہو، فکر وطن کس کو ہے۔ امریکی حکومت نے تو یہ اعلان کیا کہ اُن کا کوئی اہلکار اِن دنوں پاکستان نہیں آئے گا میرے خیال میں اسکی ضرورت بھی نہیں ان کا مدعا ویسے بھی پورا ہو رہا ہے۔ ابھی 13 اپریل کو امریکی سفیر رچرڈ ولسن نے اعلان کیا کہ امریکی سفارتخانے نے ایک یوتھ کونسل ترتیب دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ کہ پاکستانی نوجوانوں سے براہ راست رابطہ کیا جائے گا یعنی براہ راست اور علی الاعلان مداخلت ''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات''۔ اِن نوجوانوں سے کیا کہا جائے گا، ان کے ذہنوں میں کیا ڈالا جائے گا، برین واشنگ کے کون کون سے گر آزمائے جائیں گے، کیا ابھی حال ہی ہونے والے ایک سروے میں جن اڑتیس فیصد نوجوانوں نے اسلام اور شریعت کو ملکی مسائل کا حل سمجھا ان کے خیالات اپنے دین کے بارے میں ویسے ہی رہیں گے یا ان پر مغربیت اور لادینیت کا غلبہ ہو جائے گا اور کیا وہ اپنے ملک کے بارے میں بھی اپنے نظریات بدلنے سے باز رہیں گے، نظریہ پاکستان جو آج کل نہ صرف میڈیا اینکرز بلکہ کچھ سیاستدانوں کی بھی زد میں ہے اس کی بقا کی ضمانت دی جا سکے گی ۔ دیکھنے اور سوچنے کے تو یہ معاملات ہیں منصوبہ بندی تو انہیں روکنے کی ہونی چاہیے لیکن افسوس کہ کوشش معاشرے قوم اور مذہب کو بچانے کی بجائے حکومت بچانے کی ہے۔ غیر ملکی مداخلت چاہے جارحانہ ہو اور ملک میں خون بہائے یا دیگر طریقوں سے پاکستانی ذہن کی موت

واقع ہو جائے دونوں ہی اس ملک کے لیے زہر قاتل ہیں۔ اگر سرحدوں کی حفاظت مسلح افواج کی ذمہ داری ہے تو نظریے کی حفاظت سیاستدانوں کے ذمے ہے۔ لیکن ہمارے سیاستدان اسکی حفاظت تو کیا کریں گے اسکی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں اور یوں ملک کی شکایت اقوام متحدہ میں کرنا تو ایک دو طاقتوں نہیں بلکہ پوری دنیا کو مداخلت کی دعوت اور اجازت دینا ہے جو انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے۔ دو چار سیٹوں کی کمی یا زیادتی اتنی بڑی بات نہیں لیکن اگر یہ ملک خدانخواستہ نہ ہو تو ایک شہر یا ایک صوبہ آپ کو وہ عزت نہیں دے سکتا ہے جو اب ہے اور نہ ہی وہ شہریت جس کی آپ کو تلاش رہتی ہے آپ کو مل سکتی ہے اللہ پاکستان کی حفاظت کرے اور اسے اندر اور باہر کے دشمن سے محفوظ رکھے کہ نجانے کتنے گھروں کے عوض یہ گھر ٹھہرا۔

امریکی ناکامی۔۔۔ عبرت انگیز داستان

امریکہ 2001 سے افغانستان میں براجمان ہے 11/9 کی آڑ لے کر اُس نے اس ملک میں قدم رکھا اور اپنے اس حملے کو دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا نام دیا جبکہ عالمی سطح پر خود اس جنگ کو سب سے بڑی دہشت گردی تصور کیا جارہا ہے کیونکہ اسی کے بعد دہشت گردی میں اضافہ ہوا، مغرب کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا اور پاکستان کو تو اتحادی بنا کر بھی دشمن سمجھا گیا۔ ہم اُس کے اتحادی کیسے بنے وہ ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ پاکستان کی معیشت، معاشرت اور ترقی پر اس جنگ نے جو بد ترین اثرات مرتب کئے اُن کا ازالہ کرنے کے لیے شاید ہمیں پھر 1947 سے سفر شروع کرنا ہوگا۔ اس جنگ نے ساری دنیا کی معاشی حالت کو بری طرح متاثر کیا ہے لیکن خود امریکہ بھی اس لاحاصل جنگ کے اثرات سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ اس کی فوج افغانستان سے اگلے سال نکل جائے گی کم از کم اس نے اعلان 2014 ہی کا کیا ہے لیکن یہ انخلائ اپنے پیچھے امریکی فوج کی ناکامی کی ایک عبرت انگیز داستان چھوڑ جائے گی۔ اس جنگ کے دوران خود امریکی فوج کو بھی کئی مسائل کا سامنا رہا اُس کا کہنا تو یہ ہے کہ اُس نے افغانستان کی تعمیر نو کی ہے یا کر رہا ہے لیکن یہ کام کرنے کی فرصت تو اُسے تب ملتی جب وہ اپنے مسائل پر قابو پاتا۔ امریکہ نے اس گیارہ سالہ جنگ

پر جتنا پیسہ خرچ کیا اگر وہ افغانستان کی ترقی پر خرچ کرتا تو آج افغانستان بھی کسی ترقی یافتہ یورپی ملک کا نقشہ پیش کرتا لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ آج بھی افغان مہاجرین پشاور اور پاکستان کے دوسرے شہر چھوڑنے کو تیار نہیں کیونکہ یہاں اب بھی ان کی معاشی حالت اپنے ملک سے بہتر ہے تباہ حال افغانستان میں زندگی گزارنا اب بھی مشکل ہے اور وہ اسی لیے ایک دوسرے ملک میں رہ کر خوش ہیں۔

امریکی فوج اگر چند کلومیٹر کی سڑک تعمیر کرکے یہ سوچ کہ اُس نے بڑا معرکہ سر کیا ہے تو وہ یہ بھی سوچ لے کہ اُسے درحقیقت کیا کچھ کرنا چاہیے تھا جبکہ وہ ایک ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بھی تھا۔ وال سٹریٹ جرنل میں شائع شدہ ایک مضمون کے مطابق کلومیٹر کی سڑک کی تعمیر پر لاکھوں ڈالر خرچ ہو چکے تو 100 کلومیٹر سڑک تعمیر 270 ہوئی جبکہ سیکیورٹی کے انتظامات کے لیے مقامی شخص اجمل حسن کو لاکھوں ڈالر دیئے گئے اس سے پہلے نیویارک ٹائمز میں شائع شدہ ایک مضمون میں بتایا گیا کہ سڑک کی تعمیر کرنے والوں کو دہشت گردوں سے بچانے کے لیے 43.5 ملین ڈالر ایک شخص کو دیئے گئے لیکن نہ سڑک تعمیر ہوئی نہ حملے رُکے۔ امریکہ افغانستان میں اُسامہ کی تلاش میں آیا یا کسی بھی اور وجہ سے لیکن وہ اپنے ہزاروں فوجیوں کی قربانی دے چکا ہے اور آرلینگٹن کے قبرستان میں ہزاروں قبروں کا اضافہ ہوا ہے صرف فوجی ہی نہیں

وہ سول ٹھیکیدار بھی مارے گئے جو افغانستان کی تعمیر نو کے نام پر یہاں لائے 1173 گئے یا افغانستان کے اندر ہی سے امریکہ اور اتحادی افواج کے ساتھ کام کرتے رہے اگر پانی کے ہینڈ پمپ لگانا یا کچھ سکول بنا لینا ترقیاتی کام شمار کیے جائیں تو پھر شاید کہا جا سکے کہ کچھ ترقیاتی کام ہوئے ہیں لیکن یہ کام تو کوئی این جی او بھی کر لیتی ہے۔ خود امریکی فوجی اہلکار اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کے ترقیاتی کام کرنے والے اہلکاروں پر ہونے والے حملے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں یعنی خود ہی اعتراف کیا جا رہا ہے کہ وہ ترقیاتی کام کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ایک ایسے ہی امریکی فوجی نے کہا سیلاب سے بچانے والے بند صرف دو موسموں تک تو پانی روک کر مطلوبہ دیہات کو بچا لیں گے مستقل نہیں تو کیا امریکہ خود اپنے ملک میں بھی ایسی عارضی منصوبہ بندی اور ٹیکنالوجی استعمال کرتا ہے یا واقعی اُس کے پاس ترقی یافتہ ٹیکنالوجی نہیں ہے جو وہ افغانستان میں استعمال کر سکے۔ مسئلہ جو بھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں وہ صرف ایک قابض فوج اور قوت ہے جو بگرام جیل جیسی دھمکیوں سے حکومت کر رہی ہے اور اسی ملک کے مذہب یعنی اسلام اور قرآن کی بے حرمتی کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 517 بلین ڈالر لگا کر بھی وہ افغانیوں کو فوجی شکست نہیں دے سکا ہے اور 57 بلین ڈالر کے ترقیاتی امداد کے عوض بھی وہ افغانیوں کے دل خرید نہیں سکا ہے۔ خود اُس کی فوج کے اندر یہ حالات ہیں کہ خودکشیوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

امریکی اگرچہ خاندانی زندگی کے بہت عادی نہ سہی لیکن اپنے پر سہولت ملک سے ہزاروں میل دور ہر وقت کسی خفیہ آنکھ اور گولی کی زد میں رہنے کا خوف انہیں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اب تک ڈھائی ہزار مارے جانے والے فوجیوں کے علاوہ ڈھائی ہزار سے زیادہ نے خودکشی کی اور لیون پینیٹا نے اِسے ایک وبا قرار دیا۔ صرف 2012 میں 349 خودکشیوں کا اعتراف کیا گیا کتنی کو چھپا لیا گیا یہ معلوم نہیں ہاں یہ ضرور مان لیا گیا کہ یہ اموات جنگی اموات سے زیادہ ہیں۔ اسی جنگ کے دوران امریکی جنرل ڈیوڈ پٹریاس کا ایک غیر خاتون کے ساتھ تعلقات کا سکینڈل بھی سامنے آیا تو ایک عام فوجی جو مہینوں اپنے ملک کی شکل نہیں دیکھتا اُس کا رویہ کیا ہوگا اور کس ذہنی خلفشار کا آئینہ دار ہوگا اس کا اندازہ کیا ہی جا سکتا ہے۔

امریکہ اگر صرف اس کو کامیابی سمجھتا ہے کہ چودہ سال تک افغانی اُسے اپنے ملک سے نہ نکال سکے تو اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ بقول امریکہ اسی جاہل اور غیر مہذب قوم نے اُسے سکون کا سانس بھی نہ لینے دیا۔ اُن کے لیے بیس کلو آٹے کا تھیلا یا پانچ کلو گھی کا ڈبہ اپنی زمین کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آزادی ان افغانوں کے خمیر میں گوندھی گئی ہے اگر امریکہ اپنی مرضی کے اعداد و شمار جاری کر کے یہ سمجھتا ہے کہ وہ اِن افغانوں کو یہ باور کرا دے گا کہ وہ ان کا محسن ہے تو ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ زمینی حقائق بہر

حال زمینی ہوتے ہیں اور سچ ہوتے ہیں۔ امریکہ اگر چاہتا تو افغانستان کو واقعی ترقی دینے میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا لیکن قابض بن کر نہیں بلکہ دوست بن کر۔ کیونکہ افغانی دوستوں کو تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں لیکن دشمن کو تب تک معاف نہیں کرتے جب تک وہ دشمنی چھوڑ نہیں دیتے یا معافی نہیں مانگ لیتے اور اُن کی آزادی سلب کرنے والا اُن کا سب سے بڑا مجرم اور دشمن ہوتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے۔

الیکشن۔۔۔ انجام گلستان کیا ہو گا

عام انتخابات کچھ دنوں کی بات ہے اور انتخابی مہم زوروں پر ہے لیکن ویسے نہیں جیسی ہونی چاہیے ، خوف کی ایک فضا ہے جو پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے پارٹیوں کے الیکشن دفاتر پر حملے ہو رہے ہیں ، کراچی تو باقاعدہ کسی میدان جنگ بلکہ قتل گاہ کا منظر پیش کر رہا ہے، پشاور اور کوئٹہ کی حالت بھی مختلف نہیں ۔لیکن یہ سب کون کر رہا ہے اور اس کا فائدہ کس کو پہنچ رہا ہے اور نقصان کس کا ہے۔ظاہر ہے فائدہ دشمن کا ہے ور نقصان پاکستان کو پہنچ رہا ہے۔

جمہوریت اپنی کئی ایک خرابیوں کے باوجود ایک بہتر نظام حکومت ہے جو عوام کو حکومت میں اور کار حکومت میں شامل کر دیتی ہے۔ عوام اپنے منتخب کردہ نمائندوں سے حساب کتاب لے سکتے ہیں ،پاکستان میں ایسا ہو رہا ہے یا نہیں وہ ایک الگ بحث ہے لیکن اس کا مطلب نظام کی خرابی نہیں ۔ عمر فاروق (رضؓ) سے ایک فالتو چادر رکھنے کی وجہ پوچھنا ہی تو جمہوریت ہے اور بہت.بری جمہوریت میں بھی پاکستانی عوام اپنے حکمرانوں پر تنقید کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں بلکہ خوب کرتے ہیں۔ تو پھر انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی سازش کہاں سے

ہورہی ہے اور کون ایسا کر رہا ہے اپنے یا پرائے ،ظاہر ہے اس میں دونوں قوتیں شامل ہیں۔ اگر ایک دن ایک سیاسی جماعت کے دفتر پر حملہ ہوتا ہے تو دوسرے دن دوسری جماعت کے دفاتر میں سے کوئی نشانہ بن جاتا ہے۔ طالبان کا نام بھی استعمال ہو رہا ہے لیکن طالبان کو استعمال کرنے والی بھی کچھ اور قوتیں ہیں ضروری نہیں کہ یہ غیر جمہوری ممالک ہوں یہ جمہوری بھی ہو سکتے ہیں۔ طالبان کو عرب ممالک کی طرف سے جو غیر ضروری سپورٹ حاصل ہے وہ سب جانتے ہیں لیکن بڑی طاقتیں جو اس کھیل کی اصل کھلاڑی ہیں ان کی مداخلت بھی ایک اہم عنصر ہے اور ان کو پاکستان سے کارندے ملنا بھی کوئی مشکل کام نہیں غربت ،بے روزگاری ،راشی حکمرانوں کے ستائے یہ لوگ زندگی سے نالاں، لوڈشیڈنگ کی وجہ سے پنکھے کی ہوا سے لے کر پانی کی بوند بوند کو، ترسے ہوئے مفلوج دماغوں کے یہ لوگ ظاہر ہے کسی بھی دام میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں، اوپر سے ہمارے بااختیار ادارے عوام کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں اور ان کے اوپر ایسے لوگوں کو حکمران بنانے کی کوشش کرتے ہیں جو خود غرضی کی اعلیٰ مثال ہوتے ہیں جن کا مقصد عوام کی خدمت نہیں بلکہ خود اپنی دولت اور جاہ و حشمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بظاہر آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 کے مطابق امیدواروں کی بڑی جانچ پڑتال کی گئی یا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ایک حلقے سے مسترد ہونے والا امیدوار دوسرے حلقے میں جاکر متقی وپرہیزگار ہوگیا اور منظور نظر بھی۔ 24 اپریل کے دی نیوز کے مطابق 55 ایسے امیدواروں کو

الیکشن لڑنے کی اجازت دی گئی جن کے اوپر دہشت گردی کے الزامات ہیں یہ کوئی نئی بات بھی نہیں پہلے بھی ہمارے بہت سے حکومتی عہدیدار ثابت شدہ مجرم ہیں بلکہ قتل اور اقدام قتل کے مجرم ، اب ایسے میں انجام گلستاں کیا ہوگا۔ ہماری عدالتیں بہت کچھ کر رہی ہونگی لیکن عوام کو ان حکمرانوں سے آزاد کرنے کے لیے کوئی ایسی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آرہی جو عوام کے مصائب میں کمی کا باعث ہو طالبان ، بیرونی عناصر اور خود اپنوں کی ستم ظریفیوں کے اس طوفان میں بار بار فوج کی مدد کا نعرہ بھی لگ جاتا ہے۔ جس پر ابھی تک تو فوج خاموش ہے لیکن تا بکے ۔ اللہ کرے کہ فوج اس خاموشی کو قائم رکھ سکے اور ملک میں سیاسی عمل چلتا رہے لیکن ایک ایسا سیاسی عمل جو ملک میں اہل قیادت کو سامنے لاسکے اور عوام کے مسائل حل کر سکے ۔ الیکشن کے عمل کو جاری رہنا چاہیے اور ان عناصر کی نشاندہی بھی ضروری ہے جو اس ساری دہشت گردی کے پیچھے ہیں۔ یہاں بجائے مصلحت سے کام لینے کے قومی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے نگران حکومت کے پاس اگرچہ مینڈیٹ نہیں ہے لیکن اس کے ہر نمائندے نے اپنی ذمہ داری کو اگر بر ضا و رغبت قبول کیا ہے تو اُسکی یہ ذمہ داری ضرور بنتی ہے کہ وہ حالات کو قابو میں لانے کی کوشش کرے۔ یہ سب کرنے یا کروانے والی کوئی سیاسی پارٹی ہو یا کوئی بیرونی دشمن یا کوئی اور عنصر اُس کا راستہ سختی سے روکنا ہوگا ملک کا اختیار اور حکومت کسی اور عنصر کو دینا خود کشی کے مترادف ہے جس کے راستے پر ہم پہلے ہی چل چکے ہیں اور بہت سارے معاملات میں

درحقیقت ہو وہی رہا ہے جو دہشت گرد اور اُن کے آقا چاہتے ہیں وہ جہاں چاہتے ہیں وہاں زندگی مفلوج کردیتے ہیں۔ یہ یا تو رزق روزی کا معاملہ ہے یا لوگوں کی ہمت کہ وہ پھر بھی کاروبارِ زندگی کو رواں دواں رکھتے ہیں ورنہ حکومت چاہے مستقل ہو یا نگران اس کی طرف سے اِن کو کوئی تحفظ نہیں دیا جا رہا۔ فوج، پولیس اور عوام مر رہے ہیں اور اب تو یہ دھماکے کوئی بہت بڑی بریکنگ نیوز بھی نہیں رہے بلکہ معمول بن چکے ہیں، لیکن انتخابات کے عمل کو روکنے کی جس طرح کوشش کی جا رہی ہے اُس کے پیچھے کوئی خاص مقصد ضرور ہے لہٰذا اسے معمول کی دہشت گردی نہیں سمجھنا چاہیے۔

افغانستان سے امریکی فوجوں کے انخلائی کے ٹائم ٹیبل کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا، پاکستان میں مسلسل اور بغیر وقفے کے تیسرے عام انتخابات کا انعقاد بھی مد نظر رہنا چاہیے، عرب ممالک میں جمہوری تحریکوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور سیاسی پارٹیوں کے سیاسی بلکہ ذاتی مفادات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے اور یہ بھی کہ کون ہمدردی کا ووٹ حاصل کرنا چاہتا ہے اور کون تعصب کے نام پر ووٹ لینا چاہتا ہے۔ اگر اِن میں سے کوئی بھی وجہ نظر انداز کی گئی اور اس کے اثرات کو قابل غور نہ سمجھا گیا بلکہ دیگر وجوہات کی تلاش بھی ضروری ہے تو ملک جس نقصان سے دوچار ہوگا اس کا ازالہ مشکل ہوگا۔ فوج ہر مسئلے کا حل نہیں اور اُس نے اگر سیاسی معاملات سے کنارہ کشی اختیار کی ہے تو اُسے ایک طرف رہنے دینا چاہیے۔ سیاسی قوتوں کو اپنا سارا زور، سارا وژن اور سارا زورِ بیان ایک

دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کی بجائے ملک کی فکر بھی کرنا ہوگی اور انہیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اگر یہ ملک ہے تو اُن کی سیاست بھی ہے، ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی بھی، ان کی شان و شوکت بھی اور اُن کی حکومت بھی ۔ لہٰذا پہلے انہیں اس کی بقا کی فکر کرنا چاہیے اور سیاست کو سیاست رکھنا چاہیے قتل عام نہیں بنا دینا چاہیے ، اور اس بات کو سمجھ لینا چاہیے بلکہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اگر انہوں نے اس ملک کی قدر نہیں کی تو خدا بھی ایسے لوگوں ، حکمرانوں اور قوموں کی قدر نہیں کرتا بلکہ انہیں مٹا دیتا ہے۔ اور تاریخ بھی ان کے ساتھ بہت بے رحمانہ سلوک کرتی ہے۔ منیر نیازی نے انہی لوگوں کو یاد دلایا ہے۔

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
اُن اُمتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں

سربجیت سنگھ ایک سفّاک دہشت گرد

بھارتی دہشت گرد سربجیت سنگھ جناح ہسپتال لاہور میں 2 مئی کو ہلاک ہو گیا۔ سربجیت سنگھ پر 26 اپریل کو اس کے دو ساتھی قیدیوں نے حملہ کرکے زخمی کر دیا تھا ۔مدثر اور عامر تانبے والا اُس کے ساتھ سزائے موت کے قیدی تھے اُن کے لیے ایک اور قتل کر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی اور انہوں نے یہ قتل کیا۔ سزائے موت ان کو تب بھی ملنی تھی اب بھی ملے گی لیکن سربجیت سنگھ نے بھی کئی پاکستانی گھر اجاڑے تھے یہ اور بات ہے کہ ہمارے انسانی حقوق کے نام نہاد علمبرداروں نے گاہے بگاہے اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی کیا اور اس کے گھر والوں کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی رہی۔ جیو ٹیلی وژن نے تو حسب معمول امن کی آشا کی پتنگ اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دہشت گرد کہنے سے بھی گریز کیا اور اُس کی موت کی خبر دیتے ہوئے نیوز کاسٹر منصور علی خان نے اُسے بھارتی جاسوس کہا۔ جاسوس اور دہشت گرد میں کچھ زیادہ فرق نہیں وہ بھی کسی عمارت کی بنیاد میں چوٹ لگاتا ہے اور عمارت کو نقصان پہنچاتا ہے لیکن دہشت گرد اس کام کے ساتھ بیانگ دہل خون بھی بہاتا ہے اور آج کے دور میں جس طرح دہشت گردی کو مسلمانوں سے منسوب کرنے کی مذموم سازش جاری ہے بلکہ اس لفظ کو اسلام کے مترادف ثابت کرنے کے لیے

امریکہ اور اس کے حواری ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ایسے میں ایک سقہ اور ثابت شدہ دہشت گرد کے ساتھ نرمی روا رکھنا ان خاندانوں کا دکھ بڑھانا ہے جن کے افراد اس دہشت گردی کا نشانہ بنے اور اس جرم میں شریک ہونے کے بھی مترادف ہے۔ دشمن سے ہاتھ ملانے میں مضائقہ نہیں لیکن یہ دھیان رہے کہ وہ آپ کی انگلیاں نہ کاٹ لے جائے یا گلے ملتے ملتے سینہ میں چھرا نہ گھونپ دے۔ سربجیت سنگھ نے 1990 میں لاہور اور فیصل آباد میں دھماکے کیے جن میں چودہ افراد شہید ہوئے یعنی چودہ خاندان اجڑے اور اس مکروہ فعل کے بعد وہ بھارت فرار ہوتے ہوئے 28 اگست 1990 کو گرفتار ہوا اور چونکہ اس وقت دہشت گردی اور دہشت گرد کی اصطلاح ابھی متعارف ہوئی تھی نہ عام یوں بھارت کا شمار اولین دہشت گردوں میں ہونا چاہیے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان نے سربجیت سنگھ کو طویل قانونی کاروائی کے بعد مجرم قرار دیا۔ وہ سزائے موت کا قیدی تھا اس کے باوجود جیل میں اُس کے ساتھ جو ہوا اس کو کسی نے اچھا نہ سمجھا نہ کہا کیونکہ سزا اسے قانون دیتا تو زیادہ بہتر تھا لیکن بھارت اور اُس کے میڈیا نے اس سارے معاملے کو یوں اچھالا جیسے اس فعل کا کوئی خاص مقصد ہو بلکہ اس کے ڈانڈے افضل گرو سے ملا دیئے۔ سربجیت سنگھ کے توزخمی ہوتے ہی اُس کی بیوی، بہن اور بیٹیوں کو پاکستان آنے دیا گیا اُنھوں نے اپنے مقدس مقامات پر جاکر اپنی دعائیں کیں اور انہیں یہاں پوری عزت دی گئی جبکہ افضل گرو کے ساتھ جو ہوا وہ دنیا جانتی ہے اس کی پھانسی اور تدفین جس

طرح ہوئی وہ جمہوری بھارت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

سربجیت سنگھ کی ہلاکت کے بعد بھارت کی شر پسندانہ ہندو ذہنیت سے پوری طرح یہ توقع کی جارہی تھی کہ وہ اپنی مجرمانہ خصلت کا ثبوت دے گا اسی لیے پاکستانی دفتر خارجہ نے سربجیت سنگھ کے زخمی ہونے اور ہلاکت کے ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ بھارت میں پاکستانی قیدیوں کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے لیکن سیالکوٹ کا ثنا اللہ رانجھے ہندو ظلم کا شکار ہو ہی گیا۔ اس کے ساتھ عمر قید کا قیدی ونود کمار جو ایک سابق بھارتی فوجی ہے نے اس پر حملہ کیا اور اسے شدید زخمی کر دیا جس کے جانبر ہونے کی توقع بہت کم ہے بلکہ درحقیقت نہیں ہے۔ ونود نے خود اپنے ایک فوجی ساتھی کو قتل کیا تھا اور اپنے خونی ہونے کا ثبوت دے چکا تھا تو کیا سچ یہ نہیں ہے کہ اُسے استعمال کیا گیا کہ سربجیت سنگھ کے قتل کا بدلہ لے۔ اشک شوئی کے لیے بھارت نے جموں کی کوٹ بہلوال جیل کے جیلر کو تو معطل کر دیا لیکن کیا وہ دنیا کو یقین دلادے گا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا اور سربجیت سنگھ کی ہلاکت کے ساتھ ہی جموں کی جیل یں ایک پاکستانی اور ایک بھارتی قیدی کے تعلقات خراب ہوگئے اور عین وہی واقعہ دہرایا گیا جو کوٹ لکھپت لاہور میں پیش آیا۔ ثنا اللہ رانجھے پر بھی بھارت نے دہشت گردی کا الزام لگایا تھا کہ اُس نے ایک الیکٹرک ٹاور اور سرکاری عمارتوں پر حملہ کیا تھا۔ 1999 میں ہونے والے اس جرم کی سزا اُسے

میں سنائی گئی یعنی نو سال تو سزا کے انتظار میں ہی کٹ گئے یہی حال دوسرے 2008 پاکستانی قیدیوں کا ہے اِس وقت بھارتی جیلوں میں 220 پاکستانی قید کاٹ رہے ہیں۔ غلطی سے سمندری حدود پار کرنے والے مچھیرے اس کے علاوہ ہیں اور کئی ایک تو اپنی قید کی مدت بھی پوری کر چکے ہیں ان میں ڈاکٹر خلیل چشتی کے ساتھ معمر بلکہ ضعیف ہونے کے باوجود جو سلوک کیا گیا وہ بھارت کے لیے خود باعث شرم ہے۔ پاکستانی جنگی قیدی مقبول حسین کو پنتالیس سال بعد رہا کیا گیا لیکن 1965 کے اِس جنگی قیدی کی زبان جیل میں کاٹ لی گئی تھی۔ آج یہ قیدی کسی کے ذہن میں بھی نہیں ہیں لیکن بھارت نے اپنے اس ثابت شدہ دہشت گرد کو جس طرح کا پروٹوکول دیا اُسکی چتا بندوقوں اور فوجی سلامی میں جلائی گئی بھارت کا یہ فعل بذات خود ہٹ دھرمی ہے کہ وہ دہشت گردی کرتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہے اور پھر دہشت گردوں کو اپنا ہیرو بنا کر انہیں عزت و توقیر بھی دیتا ہے اس کا میڈیا بھی اپنے دہشت گرد کے لیے چیخ اٹھتا ہے۔ خود ہمارے اپنے میڈیا نے بھی سربجیت سنگھ کی حالت سے لمحہ لمحہ پاکستانیوں کو باخبر رکھا لیکن پاکستانی قیدی کی خبر کو وہ اہمیت نہیں دی گئی۔ بھارت کے دہشت گرد کو جاسوس کہہ کر اُسکی دہشت گردی کا انکار کرنے والے میڈیا گروپ سے بھی اس بارے میں پوچھ گچھ ہونی چاہیے کہ آخر اس رویئے کی وجہ کیا ہے کیا عوام کا یہ خیال درست ہے کہ اس گروپ میں بھارت کے شیئرز ہیں اور انہی شیئرز پر یہ گروپ قومی مفاد کو پیچ ڈالتا ہے کیا یہ لوگ اس کی

وضاحت دینا پسند کریں گے اور ہمارے وزیر اطلاعات عارف نظامی اُن سے یہ سوال پوچھ سکیں گے کہ اگر ہم اپنے قومی مفاد کو اپنی ذات اور کروڑوں اربوں کے بینک بیلنس کی بڑھوتی پر ترجیح دینے لگیں گے تو دنیا ہمارے قومی وقار سے کیوں نہ کھیلے گی۔ اگرچہ پاکستان نے ثناللہ رانجھے کی پاکستان منتقلی اور پاکستانی قیدیوں کی حفاظت کا مطالبہ تو کرلیا ہے لیکن ضرورت ایک سخت لہجے کی ہے اگر ہمارا لہجہ سخت نہ ہوگا تو اسے ہماری کمزوری ہی سمجھا جائے گا اور کمزوروں کی اس دنیا میں نہ کوئی جگہ ہے نہ عزت اور جو قومیں اپنے قومی وقار کو مد نظر نہیں رکھتی دنیا اس کی عزت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ سربجیت سنگھ ایک دہشت گرد تھا یہ بات بھارت بھی جانتا ہے کیونکہ اُس نے اُسے پاکستان میں دہشت گردی کرنے بھیجا تھا اور پاکستان کا ہر ذمہ دار شخص بھی اس بات سے باخبر ہے کہ وہ ایک قاتل اور دہشت گرد تھا تو اُسے اور اس کے خاندان کو اس قدر اہمیت دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی حکومت کی تو کوئی مجبوری ہو سکتی ہے آزاد میڈیا کی کیا مجبوری ہے۔

بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو سربجیت سنگھ ایک دہشت گرد تھا اجمل قصاب اگر کسی ہمدردی کا حقدار نہیں تھا تو سربجیت سنگھ کیسے اس سلوک کا حقدار ٹھہرا اگر بھارت نے اس کی آخری رسومات فوجی سلامی میں ادا کیں تو کیوں نہ ہمارا میڈیا بھارت کا اصل چہرہ دنیا کو دکھا دیتا تاکہ دنیا کو معلوم ہوتا کہ پاکستان جو

کہ دہشت گردی سے سب سے زیادہ متاثرہ ملک ہے ایکے عوام کن لوگوں اور ملکوں کی دہشت گردی اور شدت پسندی کا نشانہ بن رہے ہیں اور اس کے قبائلی علاقوں کو دہشت گردی کے لیے کون استعمال کر رہا ہے، کون اسلحہ وہاں تک پہنچا دیتا ہے۔یقیناً یہ کام کرنے والے سربجیت سنگھ ہی ہیں تو پھر ان کو دہشت گرد کہنے میں آخر کونسا امر مانع ہے۔یاد رکھیے پاکستان ہی ہماری پہچان ہے اور اس کا حق ہم پر سب سے پہلا ہے لہٰذا اس کے مفادات ہر چیز پر مقدم ہونے چاہیے نہ کہ اپنی تجارت۔

جمہوریت بہترین انتقام ہے

الیکشن 2013 ہو گئے۔ قوم سرخرو ہوئی کہ تمام تر مشکل حالات کے باوجود اُس نے ووٹ ڈالا اور اُن قوتوں کو ناکام بنا دیا جو انتخابات کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے اور اِس دن "یہ اور وہ" کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اگر چہ الیکشن کمشن جس صاف شفاف اور آزادانہ الیکشن کی نوید سنا رہا تھا وہ وعدہ مکمل طور پر ایفائی نہ ہو سکا ، مخصوص گروہوں اور پارٹیوں نے اُس دن بھی ووٹرز کو ہراساں کیا اور اپنی پارٹی کے لیے "عظیم خدمت" سرانجام دیتے ہوئے پرچیوں پر دھڑا دھڑ ٹھپے بھی لگائے۔ یہ مناظر ہم سب نے ٹیلی وژن پر دیکھے اور شرمندہ ہوئے۔ اس سے پہلے صادق اور امین امیدوار کے امتحان میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود عوام نے بہت سے بڑے برج الٹ دیئے، کئی سارے تخت گرائے اور کچھ تاجداروں کے تاج بھی اچھال دیئے۔ جمہوریت بہترین انتقام ہے کا نعرہ لگا کر حکومت کرنے اور عوام کو انتقام کا نشانہ بنانے والوں سے عوام نے انتقام لے لیا اور یہ بتا دیا کہ جو وہ چاہیں گے وہ ہوگا تو وہ حکمرانوں کو خدمت کا موقع دیں گے نہیں تو حکومت کسی ایک جماعت کی میراث نہیں ہے اور نہ ہی پاکستان کسی خاندان کی جاگیر ہے۔ اگر چہ ابھی بھی عوام کو تربیت کی ضرورت ہے کہ وہ خاندانوں ، برادریوں اور شخصیات کو ووٹ دینے کی بجائے نظریئے اور

منشور کو ووٹ دیں تاکہ عوام خود ہی آرٹیکل 62 ، 63 کو مکمل طور پر لاگو کرنے کے اہل ہو جائیں۔ اور ایسی قیادت کو سامنے لائیں جو اگر صدق و امانت کے اعلیٰ مدارج پر فائز نہ بھی ہو تو کسی نہ کسی درجے پر تو ضرور پہنچتی ہو۔

قومی سطح پر عوام نے جسطرح پانچ سال تک حکمرانی کرنے والی جماعت پیپلز پارٹی کو رد کیا ہے وہ آنے والے حکمرانوں کے لیے بھی ایک وارننگ ہے کہ اگر اُنھوں نے قومی معاملات میں ایمانداری کو نہ برتا تو عوام ان کو بھی ''تیسرے درجے'' کی پارٹی بنا سکتے ہیں اسی طرح خیبر پختونخواہ کے عوام نے اپنی سابقہ حکمران جماعت کو قومی اسمبلی میں پہنچنے کے قابل تک نہ چھوڑا اور یہ ثابت کیا کہ پختون اُسی کو عزت دیتے ہیں جو خود کو اس کا اہل ثابت کرتا ہے۔ اے این پی جو خود کو پختونوں کی نمائندہ جماعت کہتی تھی اور پچھلے الیکشن میں صوبے کی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری بھی تھی لیکن جب وہ عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتری تو اُس کو کھلم کھلا اس کی سزا دی گئی۔ اس حکومت نے ترقیاتی کام تو کچھ نہ کچھ کئے ہی لیکن صوبے کے اصل مسئلے یعنی امن و امان کو بحال نہ کر سکی اگرچہ وہ اس دہشت کا خود بھی شکار ہوتی رہی لیکن عوام کے لیے ظاہر ہے پہلا مسئلہ جان اور پھر مال کی حفاظت ہے جس کی بحالی کے لیے سنجیدہ کوشش کی ضرورت ہے جبکہ پاکستان میں دہشت گردی میں غیر

ملکی ہاتھ ملوث ہونے کے کئی ثبوتوں کے باوجود اے این پی اس کا انکار کرتی رہی۔
انتخابات سے کچھ ہی دن پہلے اسفندیار ولی نے ریڈیو پاکستان کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اسلام آباد کو افغانستان میں بھارت کی موجودگی اور ترقیاتی کام کرنے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ بات بڑی معقول لگتی ہے کہ یہ دو اور ملکوں کا معاملہ ہے جس میں پاکستان کی مداخلت بے جا لگتی ہے لیکن کیا وہ یہ بات نہیں جانتے کہ بھارت افغانستان میں افغانوں کی محبت میں نہیں آیا ہے بلکہ اس راستے وہ مسلسل پاکستانی قبائلی علاقوں میں مداخلت کر رہا ہے اور دہشت گردوں کا ایک بڑا اسلحہ سپلائر ہے اور انہیں ہر قسم کی امداد مہیا کرتا ہے کہ پاکستان میں حالات خراب کیے جائیں اور خراب رکھے جائیں۔ یہی سوچ تھی جس نے اس جماعت کو دہشت گردوں کے خلاف کامیاب نہ ہونے دیا کہ مسئلے کی جڑ سے ارداتاً صرف نظر کیا گیا۔ اب صوبے میں جو بھی حکومت بنے گی اس کا سب سے بڑا امتحان دہشت گردی کا مقابلہ ہی ہوگا کہ وہ اس پر کس طرح قابو پاتی ہے یہی مسئلہ قومی حکومت کا بھی امتحان ہوگا کہ وہ ملک میں امن و امان کیسے بحال کرے۔
نواز شریف سے بھی گزارش ہے کہ انڈین ٹی وی کو دیئے گئے انٹرویوز میں بھارت سے دوستی کی پیشکش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن کشمیر میں بھارت کے مظالم، پاکستانی دریاؤں پر بھارتی ڈیموں کی تعمیر، ہندوستان میں اسلحہ کے انبار، بھارتی جیلوں میں پاکستانی قیدیوں کا قتل، سفارتی سطح پر پاکستان کو بین الاقوامی برادری میں آکیلا کرنے کی کوشش،

پاکستان میں براہ راست اور افغانستان کے راستے دہشتگردی کو ضرور ذہن میں رکھیں تاکہ وہ بھی مستقبل میں اسفندیار ولی کی طرح کے مسائل سے دوچار نہ ہوں۔ اللہ کرے کہ نہ صرف پاکستان کو اس مصیبت سے نجات دلانے میں نئی حکومتیں کامیاب ہوں بلکہ وہ اپنے وہ سارے وعدے پورے کریں جو انہوں نے انتخابی مہم کے دوران عوام سے کیے۔ دوسروں پر الزامات لگانے کا وقت گزر چکا ہے اور آنے والوں سے دست بستہ عرض ہے کہ خدارا اس چلن کو بدلیئے جس میں پچھلی حکومتوں کو ہر برائی کا ذمہ دار قرار دے کر خود اہلِ حکومت بری الذمہ ہو جاتے ہیں بلکہ لحہ لحہ اس بات کا اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ مسائل انہیں ورثے میں ملے ہیں، اس لیے لگتا یوں ہی ہے جیسے وہ سمجھتے ہوں کہ ان مسائل کو حل کرنا اب ان کی ذمہ داری ہی نہیں بنتی حالانکہ اب وہ اس ملک کے حکمران ہوتے ہیں اور تمام تر انتظام وانصرام ان کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن وہ اس سے بڑی صفائی سے بچ جانے کی کوشش کرتے ہیں اور کم از کم اپنے دور حکومت تک بزور بازو و بزور حکومت بچے رہتے ہیں اور اگلی حکومت کے آتے ہی احتساب کے عمل سے گزرنے لگتے ہیں اور اب یہ نئی حکومت وہی تاریخ رقم کرنے لگتی ہے جو پچھلی نے کی تھی۔ کرپشن کو ختم کرنے کے جو طریقے اپنائے جاتے ہیں وہ اس کو جان بوجھ کر موثر نہیں بناتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگلی بار وہ ان پر ہی لاگو نہ ہو جائیں۔

اگر عوام نے 11 مئی 2013 کو امن و امان کے مخدوش ترین حالات میں گھروں سے نکل کر سیاستدانوں کو ووٹ دیا ہے تو اس امید پر دیا ہے کہ شاید آنے والی حکومت ان کے مسائل میں کمی کر سکے، دہشت گردی کو روک سکے، معیشت کو بہتر بنا سکے، کرپشن کو ختم کر سکے، حقدار کو اُس کا حق دلا سکے، ظالم کو ظلم سے روک سکے اور مظلوم کی داد رسی کر سکے اور مفاہمت کے نام پر اپنے ذاتی فوائد کی سیاست اور قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ چھوڑ دیں۔ اب اگر آنے والے حکمران یہ سب نہ کریں اور پھر سے کرپشن کے دریا میں غوطہ زن ہو جائیں تو پھر انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ غوطہ آخری بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اپوزیشن کو بھی اپنے فرائض بحسن و خوبی ادا کرنا ہونگے فرینڈلی اپوزیشن کی اصطلاح جو پچھلی اپوزیشن نے متعارف کرائی ہے بھی اپنے فرائض سے فرار ہے اپوزیشن کا کام حکومت کے ہر اچھے برے فعل پر صاد کرنا نہیں اور نہ ہی خواہ مخواہ کی تنقید ہوتا ہے بلکہ اس کے اوپر ایک سخت چیک رکھنا ہوتا ہے، تاکہ اہل حکم اپنے فائدے کی بجائے ملک کے فائدے کے بارے میں سوچیں اور اگر کہیں وہ راستے سے بھٹکنے لگیں تو فوراً ان کا راستہ سیدھا کر دیا جائے۔ لہذا مفاہمت اپنی جگہ لیکن یہ مفاہمت صرف اور صرف ملک کی خاطر ہو اپنی ذات اور خاندانوں کے لیے نہ ہو۔

اس ملک اور قوم نے اپنی عمر کے تقریباً 67 سال کا اکثر حصہ سیاستدانوں اور

حکمرانوں کے ہاتھوں بڑی مشکل میں گزارا ہے ہم سے بعد میں آزادی حاصل کرنے والے ممالک ترقی کی دوڑ میں ہم سے کہیں آگے نکل چکے ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کی ہی جڑیں کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں، ایک دوسرے پر الزامات ہی لگائے رکھتے ہیں، نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں وہ تعاون نظر نہیں آتا جو گناہ اور برائی کے کاموں میں ہوتا ہے۔

عوام نے اس بار جس امید پر اپنا ووٹ دیا ہے نواز شریف اور عمران خان سے بالخصوص اور پیپلز پارٹی، جے یو آئی، ایم کیو ایم تمام مسلم لیگوں، جماعت اسلامی اور ہر چھوٹی بڑی پارٹی سے بالعموم یہ گزارش ہے کہ خدارا اس امید کومت توڑیئے اپنی اپنی جگہ پہچانئے اپنے اپنے فرض کا تعین کیجئے اور اس ملک کی ترقی میں حصہ بقدر جثہ ڈالیے۔ اور صرف ایک اصول اپنایئے۔ وَتَعَاوَنُوْ عَلَی الْبِرِ وَالتَّقْوٰی وَلَاتَعَاوَنُوْ عَلٰی الِاثْمِ وَالعُدْوَانْ۔ تو آپ دیکھئے گا آپ سب مل کر ایک نیا پاکستان بنالیں گے۔ اللہ آپ کو ہمت دے کہ آپ پاکستان کی حفاظت کر سکیں اور اسے ترقی و بلندی عطا کر سکیں بس اس کے لیے آپ کا خلوص اور نیک نیتی چاہیے۔

الطاف حسین کراچی سب کا ہے لہٰذا احتیاط!

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر، اس کا دل اور در حقیقت پورا پاکستان ہے جس نے اپنی گود میں پنجابی ،پٹھان ،سندھی ، بلوچی اور کشمیری ہر ایک کو سمایا ہوا ہے اور اسی نے اُن قابل فخر لوگوں کو بھی اپنی مادرانہ چادر کی چھاوٴں میں پناہ دی جنھوں نے قیام پاکستان کے وقت اپنے گھر بار چھوڑے اور ہجرت کی تو کراچی اور کراچی والوں نے ان آنے والوں کو بڑی فراخدلی سے اپنی زمین اور گھر بار پیش کر دیے ۔ان مہاجرین نے کراچی اور کراچی نے ان مہاجرین کو عزت اور پیار دیا کسی نے کسی پر احسان نہیں جتایا۔سالہا سال تک یہ شہر پیار اور محبت کا گڑھ بنا رہا لیکن بڑے دکھ اورافسوس کی بات ہے کہ آج ہر ایک کراچی کا احسان ماننے کی بجائے اس پر احسان جتا رہا ہے بلکہ پاکستان پر احسان جتا رہا ہے کہ ہم نے اس ملک کی خاطر ہجرت کی۔ اول تو بات یہ ہے کہ وہ جنھوں نے ہجرت کی تھی اُن میں چند ہی لوگ زندہ ہوں گے اوراب ابھی وہ پاکستان سے بے لوث محبت کرتے ہیں حکومت کے لیے نہیں ۔وہ نسل جو احسان جتا رہی ہے انہیں تو فخر سے کہنا چاہیے تھا کہ ہم ”سن آف دی سوائل“ ہیں لیکن تیسری نسل نے کہنا شروع کیا کہ ہم نے ہجرت کی ۔کاش آپ عظمت کے اُس درجے پر ہوتے کہ آپ نظریے کی خاطر اپنی دولت چھوڑ سکتے آپ تو حکومت کی خاطر اصولوں پر یوں سودے بازی کرتے ہیں جیسے آلو پیاز کی

خرید وفروخت کر رہے ہوں۔

الیکشن 2013 میں کراچی میں ہونے والی دھاندلی پر شہریوں کے احتجاج سے گھبرا کر متحدہ قومی مومنٹ کے برطانوی قائد الطاف حسین نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر کراچی کا مینڈیٹ تسلیم نہیں کیا جارہا تو کراچی کو پاکستان سے الگ کیا جائے یعنی حیرت ہے ایک غیر ملکی شخص کی خواہش پر پورا کراچی قربان کر دیا جائے یہاں برطانوی شہریت رکھنے والے الطاف حسین کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیۓ کہ کراچی جتنا اردو بولنے والوں کا ہے اُتنا ہر پاکستانی کا ہے بلکہ پاکستان کا ہر خطہ ہر صوبہ سب کا برابر کا ہے۔ کیا پشاور، پنڈی، لاہور، کوئٹہ حتیٰ کہ دور دراز کے شہروں میں بھی اردو بولے والے نہیں رہتے اور کیا کوئی انہیں وہاں سے نکالنے کی بات کرتا ہے، ہر گز نہیں نہ ہی وہ مقامی آبادی کے نشانے پر رہتے ہیں لیکن کراچی میں جو حالات ہیں وہ الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں نے پیدا کر رکھے ہیں خود ہی حالات بگاڑے جاتے ہیں اور پھر ان حالات کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور پاکستان کو توڑنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں یہ لوگ خود کو سب کچھ کرنے اور کہنے کے لیے آزاد سمجھتے ہیں نہ پاکستان ان کی دست برد سے محفوظ رہتا ہے نہ قومی نظریہ اور رہنما پچھلے دنوں اُس نے قائد اعظم کی ذات پر جس طرح حملے کیے وہ ایک مخصوص ذہنیت کی عکاسی ہے وہ ذہنیت جنہیں ہدایات کہیں اور سے ملتی ہیں اور کارندے وہ ہوتے

ہیں اور عام لوگ ان کے یرغمال، ورنہ میں جتنے اردو بولنے والوں سے بات کرتی ہوں چاہے وہ کراچی کے ہوں، پشاور کے یا پنجاب کے میں نے کسی کو ان خیالات کا حامی نہیں پایا بلکہ شدید مخالفت کرتے ہی سنا۔ پھر آخر وہ کون سے حربے ہیں جو مجبور لوگوں پر آزمائے جاتے ہیں اور لندن سے بیٹھ کر ان کی ڈور کھینچ لی جاتی ہے۔ الطاف حسین کے موجودہ بیان پر ملک بھر میں شدید رد عمل آیا اور لندن پولیس کو الطاف حسین کے خلاف ایک رپورٹ کے مطابق پانچ لاکھ سے زیادہ کالیں موصول ہوئیں کہ اس طرح کے بیانات کے تناظر میں اُس کے خلاف مقدمہ درج کیا جائے لیکن اگر حکومت پاکستان دلچسپی نہ لے تو کسی اور حکومت کو کیا فرق پڑتا ہے۔ بحر حال الطاف حسین برطانوی شہری ہے اس سے پوچھا جائے کہ وہ ہمارے ملک کے خلاف ہرزہ سرائی کیسے اور کیوں کرتا ہے اور کیوں اس کی حکومت اس سے نہیں پوچھتی کیا حکومت برطانیہ کسی پاکستانی کو اجازت دے گی یا برداشت کرے گی کہ وہ اس کے خلاف پاکستان سے سازش کرے۔

حیرت ہمارے میڈیا پر بھی ہے کہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ الطاف حسین کے خطاب، خطاب کم اور سازشیں زیادہ ہوتی ہیں پورا خطاب بڑے ذوق وشوق اور پابندی سے ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے کیا ان ٹیلیفونک خطابات کو بند نہیں کیا جاسکتا کہ فساد کم پھیلے اور آخر اس بات پر کوئی کاروائی کیوں نہیں کی جاتی کہ بار بار ایسے بیانات کیوں دیے جا رہے ہیں کہ کراچی کو اردو بولنے اور نہ بولنے والوں میں

کیوں تقسیم کیا جاتا ہے اردو تو پورے پاکستان کی زبان ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی پورے ہندوستان میں بولی جاتی تھی ورنہ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور سردار عبدالرب نشتر اردو نہ لکھتے۔ لیکن مصطفیٰ کمال علی لاعلان اور ببانگ دہل ٹی وی پر بیٹھ کر کراچی کو اسی بنیاد پر تقسیم کر رہا تھا جب کہ کراچی میں تو شاہی سید بھی اردو بولتا ہے اور نار بلوچ بھی چاہے ان کی مادری زبان کوئی بھی ہے۔ ایم کیو ایم اگر قومی جماعت بننا چاہتی ہے اور قومی سیاسی دھارے میں شامل ہونا چاہتی ہے تو اسے اپنی ان پالیسیوں میں تبدیلی کرنا ہو گی اور اپنی قیادت بھی تبدیل کرنا ہو گی ورنہ جب ایک پنجابی ،پٹھان ، سندھی ، بلوچی یا کشمیری دیکھے گا کہ نہ اُس کا ذکر ہے نہ فکر تو کیا وہ اُس جماعت کو ووٹ دے گا۔ سیاست مخصوص گروہوں کے حقوق کے تحفظات کے لیے نہیں بلکہ قومی معاملات کے لیے جاتی ہے مخصوص علاقوں، آبادیوں اور گروہوں کے ل لیے فلاحی تنظیمیں اور این جی اوز کام کرتی ہیں تو کیا ایم کیو ایم ہمیشہ ایک علاقائی تنظیم اور لسانی گروہ رہے گی یا آگے بڑھے گی اور اُس کی قیادت اُسے دہشت گردی کے لیبل سے آزاد بھی کرے گی یا نہیں ۔ اس بار تو الطاف حسین نے سر عام اُس میڈیا کو بھی للکارا جس نے ہمیشہ اُسے سنجیدہ قومی سیاست دانوں سے زیادہ اہمیت دی اُس نے میڈیا کو یاد دلایا کہ ’’ کتوں کے بھونکنے ‘‘ سے کارواں رُکتے نہیں میں ۔ بنگلہ دیش بننے کی یاد دہانی بھی وہ کراتے رہتے ہیں بلکہ اب کی بار تو انہوں نے جرنیلوں کو بھی اپنا مرہون منت کہا تو اُن سے ایک

سوال ہے کہ کیا مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان ہجرت میں لاکھوں خاندان تہہ و تیغ نہ ہوئے کیا وہ بھی لاہور کو امرتسر بنانے کی دھمکی دینے لگ جائیں تو پھر آخر ہمارے بزرگوں نے یہ ملک کیوں ہی بنایا تھا کیا وہ بے وقوف تھے یا ظالم تھے جنہوں نے خون بہایا۔

یہاں میرے کچھ سوالات حکومت، میڈیا اور عدلیہ سے ہیں کہ ہر حکومت پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت قائم کرنے اور رکھنے کے لیے ان ساری باتوں کو کیوں بھلا دیتی ہے،

میڈیا کے کچھ اینکرز ان کے گن گاتے کیوں نہیں تھکتے، کیوں ہر خطاب اور ہرزہ سرائی کو من وعن پیش کرتے ہیں اُس کے بارے میں سوچتے کیوں نہیں اور عدلیہ جو سوموٹو لینے کے لیے کسی واقعے کی تاک میں رہتی ہے کہ کہیں کوئی واقعہ ہو اور عدالت میدان میں آجائے یہاں کیوں چپ رہ جاتی ہے۔ کیا ان سب کے پاس اس کی کچھ وجوہات بیان کرنے کے لیے ہونگی تاکہ قوم بھی اُن سے آگاہ ہو اور سب سے بڑھ کر کراچی کے لوگ بھی بتائیں کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے یوں اُن کی زبانوں پر تالے لگائے ہوئے ہیں کہ وہ کچھ بولتے نہیں کیا اس زمین اور قوم کا ان سب پر کوئی حق نہیں۔

پاکستان ایک ذمہ دار ایٹمی قوت

آج سے پندرہ سال پہلے یعنی 28 مئی 1998 کو پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے اور بر صغیر میں طاقت کے بگڑتے ہوئے توازن کو متوازن کیا۔ طاقت کا جواب طاقت ہو تو معاملات بہت حد تک درست رہتے ہیں اور یہی ہوا۔ بھارت اپنے حالیہ ایٹمی دھماکوں کے بعد جو مغرور اور دھمکی آمیز زبان استعمال کر رہا تھا کم از کم اس میں کمی آئی۔

ایٹم بم کے استعمال کی نوبت نہ آنا ہی انسانیت کی دلیل ہے لیکن اس نوبت کے نہ آنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے طاقت کا توازن اور دونوں طرف اس کا موجود ہونا۔ لیکن بین الاقوامی طور پر آج بھی پاکستان کے ایٹم بم کو ہی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے خود ہمارے کچھ دانشوروں کو بھی جب امن کا نوبل انعام لینے کا خیال آتا ہے تو اپنے ہی ایٹم بم کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور ان تمام حالات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں یہ بنایا گیا اور یہ بھی نہیں سوچا جاتا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو کیا آج ہم اتنے محفوظ ہوتے۔

پاکستان کے خلاف بہت ساری بین الاقوامی سازشیں بھی اسی لیے کی جاتی ہیں کہ وہ ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے پاس ایٹم بم ہے۔ مغرب اور اس کے مشرقی

دوستوں نے طاقت کو اپنا حق سمجھ رکھا ہے اور مسلمانوں کے لیے شجر ممنوعہ اور سونے پر سہاگہ کہ مسلمان بھی ہمہ وقت باہم دست و گریباں رہتے ہیں بلکہ غیروں کے آلہ کار بن کر اپنوں کا ہی گلا کاٹتے نظر آتے ہیں اور اہل کفر کے لیے آسانی مہیا کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے منصوبے بھی پورے کریں اور بڑی سہولت سے انہیں دہشت گرد بھی قرار دے سکیں۔ پاکستانی ایٹم بم کے سلسلے میں بھی مسلسل یہی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ خدانخواستہ یہ دہشت گردوں کے ہاتھ لگ جانے کا خطرہ ہے اور کبھی کبھار تو مضحکہ خیز قسم کے مطالبوں کی آواز بھی آجاتی ہے کہ بین الاقوامی اداروں کو ان اثاثوں تک رسائی دی جائے یعنی بالفاظ دیگر بلی کو گوشت کو چوکیدار بنا دیا جائے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایٹم بم کسی قوم کا حساس ترین معاملہ ہوتا ہے اور اس تک رسائی دینے کا مطلب اپنے آپ کو خود ہی دوسروں کی غلامی میں دینے کے مترادف ہے جو کوئی ذی ہوش قوم نہیں کر سکتی۔ لیکن پاکستان میں دہشت گردی کا جو تانا بانا بنا گیا ہے اس کا ہر طرف اور ہر طرح سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے بہرحال اکثر محسوس یہی ہوتا ہے کہ سزا پاکستان کو ایٹم بم بنانے کی ہی دی جارہی ہے اور یہ سب اس کے باوجود ہو رہا ہے کہ پاکستان کی حکومتوں نے چاہے کسی قومی معاملے میں ذمہ داری کا ثبوت دیا یا نہ دیا ہو ایٹم بم کے معاملے میں بھرپور ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور خدانخواستہ ابھی تک کوئی ایسا حادثہ یا سانحہ نہیں ہوا جسے ہماری غیر ذمہ داری سے تعبیر کیا جاسکے جبکہ

اس کے برعکس امریکہ میں کئی ایسے واقعات ہو چکے ہیں اور بھارت میں ایٹمی سائنسدان اغوا بھی ہوئے اور قتل بھی ہوئے ہیں ان تمام غیر ذمہ دارانہ واقعات پر میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں اس لیے میں تفصیل میں نہیں جاؤنگی تاہم بین الاقوامی برادری کا وقتاً فوقتاً اٹھتے واویلا پر افسوس ضرور ہے جبکہ یہی لوگ بھارت کے ایٹمی پروگرام پر درپردہ اُسے مبارکبادیں دیتے ہیں۔ ایٹمی دھماکوں کی پاداش میں پاکستان پر پابندی لگانے والوں نے بھارت پر وہ اعتراضات اور خدشات نہیں اٹھائے جو اٹھائے جانے چاہیے تھے اور نہ اب ایسا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ایٹمی اثاثوں کے بارے میں بولنے والے یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ پاکستانی بم ہی تھا اور ہے جس نے برصغیر میں ہونے والی ایٹمی جنگ کو روک رکھا ہے۔ بھارت جو کئی بار خمار میں اٹھتا ہے اور پاکستان کو دھمکیاں دینے لگتا ہے کبھی ممبئی حملوں کا سہارا لے کر اور کبھی بارڈر پر بھارتی فوجیوں کی سر بُریدہ لاشوں کو بہانہ بنا کر اور کبھی کسی اور خود ساختہ دہشت گردی کو پاکستان کے نام لگا کر لیکن پھر اسے یاد آتا ہے کہ پاکستان بھی ایک ایٹمی قوت ہے اور وہ رُک جاتا ہے تو یوں پاکستانی بم نے نہ صرف پاکستانیوں کو بلکہ دنیا کو بھی ایٹمی جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ ایٹمی جنگ کے اثرات صرف ایک ملک تک محدود نہیں رہتے بلکہ یہ اوروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور نسل ہا نسل تک چلتے رہتے ہیں، جیسے امریکہ کے 68 سالہ پرانے جرم یعنی ہیروشیما اور ناگا

ساکی پر ایٹمی حملے کا اثر آج بھی وہاں معذور بچوں کی پیدائش کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔پاکستان نے اپنا بم اسے استعمال کر کے انسانیت کا قتل عام کرنے لیے نہیں بنایا ہے بلکہ اپنے حفاظت کے لیے بنایا ہے تاکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کو محفوظ بنا سکے کیوں کہ اس کی سرحد پر موجود اس کا پڑوسی اپنی فطرت کے عین مطابق کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا نہ تو وہ سرحدوں کو محفوظ رہنے دیتا ہے نہ ملک کے اندر در اندازی سے باز آتا ہے۔اب اس سب کچھ کے باوجود کوئی قوم اگر اپنی حفاظت کا انتظام نہ کرے تو اسے امن پسندی نہیں بلکہ غفلت کہا جاتا ہے اور یہ غفلت نہ امریکہ کرتا ہے نہ.برطانیہ اور نہ بھارت تو پھر پاکستان سے اس کی توقع کیسے کی جاتی ہے بلکہ اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔گذشتہ 15 سال سے پاکستان نے جس ذمہ دارانہ رویے کا ثبوت دیا ہے اس کے بعد یہ مان لینا چاہیے کہ پاکستان نے ایٹمی قوت اپنی حفاظت کے لیے حاصل کی ہے کسی پر گرانے کے لیے نہیں لیکن اگر اس کو ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا تو نہ صرف وہ ا پنی حفاظت کر سکتا ہے بلکہ اپنے مجرم کو سبق سکھانے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔

یوٹیوب پر پابندی۔۔۔ پاکستان ثابت قدم رہے

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ بیسویں صدی کی وہ ایجادات ہیں جس نے صنعت و حرفت ، سائنس و ٹیکنالوجی ، جنگوں ، معیشت ، فیشن ، تعلیم غرض ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا۔ خلا سے زمین کا رابطہ ہو یا مشرق کا مغرب سے سب پر اسی کی اجارہ داری ہے لیکن ان سب سے اہم وہ اثر ہے جو انٹرنیٹ نے معاشرے پر ڈالا بلکہ یوں کہیے کہ معاشروں کی ہیت ہی بدل کر رکھ دی اور اس کے مثبت اور منفی دونوں اثرات بہت واضح ہیں یعنی اگر کوئی بھلائی کے لیے استعمال کر رہا ہے تو بھی نظر آ رہا ہے اور منفی مقاصد کے لیے تو بھی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کے لیے کوئی ضابطہ اخلاق مرتب کیا جاتا شاید کہنے کو تو ایسا ہے بھی لیکن عملاً ایسا نہیں ہے اور اظہار رائے کی آزادی کے نام پر یہاں وہ کچھ نظر آتا ہے جو کسی بھی مہذب معاشرے میں نا پسندیدہ سمجھا جاتا ہے چاہے وہ مشرق ہو یا مغرب ۔ ملکوں اور حکومتوں کے خلاف چلنے والی تحریکیں بھی اسے آزادی سے استعمال کرتی ہیں لیکن سب سے بڑھ کر مذہب کے خلاف اس کا استعمال گھناؤنا اور قابل مذمت ہے۔

پچھلے بارہ ، پندرہ سالوں سے مغرب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک نئی صلیب

اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اس جنگ میں انٹرنیٹ کو بے تحاشا استعمال کیا گیا ہے۔
مسلمانوں، اسلام اور اس سے بھی آگے بڑھ کر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو جس طرح نشانہ بنایا گیا ہے وہ مغرب کی شدت پسندی اور بنیاد پرستی کی دلیل ہے۔ وہ اہل مغرب جو کتے بلیوں کے حقوق کے لیے لڑ مرتے ہیں وہی لوگ اسلام کی تضحیک کو عین فرض سمجھتے ہیں اور دو تین سالوں سے وہ صرف مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے کبھی فیس بک پر نعوذ باللہ ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے خاکے بنانے کے لیے مقابلے منعقد کروا رہے ہیں کبھی اسلام کے خلاف فلمیں بنا بنا کر گوگل، یوٹیوب اور دیگر طریقوں سے پھیلا رہا ہے۔
ستمبر 2012 میں Inocence of Muslims کے نام سے ایک فلم یوٹیوب پر اَپ لوڈ کی گئی جس پر پورے عالم اسلام میں شدید احتجاج کیا گیا۔ پوری اسلامی دنیا میں فسادات اور ہنگامے ہوئے لیبیا میں امریکی سفیر کا قتل بھی انہی ہنگاموں میں کیا گیا۔ اکثر اسلامی ممالک میں یوٹیوب کو بند کیا گیا جن کی اکثریت نے بعد میں اس کو کھول دیا۔ پاکستان نے بھی ان لنکس کو بند کیا لیکن ان شرپسندوں نے اور ایسی ہی وڈیوز اپ لوڈ کیں اور یہ حرکت خود اس بات کا ثبوت تھی کہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے تاکہ مسلمانون کو تکلیف پہنچائی جائے اور مظاہرے اور احتجاج ہوتا رہے اور چونکہ یہ مظاہرین ان ذمہ داروں

کو اپنے ملک میں بیٹھ کر نقصان تو پہنچا نہیں سکتے اس لیے اپنے ہی املاک کو نقصان پہنچاتے رہیں گے اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہوتے رہیں گے۔

پاکستان میں سپریم کورٹ اور وزیر اعظم کے حکم کے مطابق پی ٹی اے نے یو ٹیوب کو بند تو کر لیا جو ابھی تک بند ہے لیکن گاہے بگاہے خبر آتی ہے کہ اسے کھول دیا جائے گا۔ مسئلہ یو ٹیوب کا نہیں بلکہ اس گستاخانہ مواد کا ہے جو اس پر دیا گیا اور اظہار رائے کی آزادی کے نام پر اس پر رکھا جا رہا ہے جبکہ اسی یو ٹیوب سے مختلف اوقات میں مختلف ممالک کے احتجاج پر ان کے خلاف دیا گیا مواد ہٹایا گیا۔ بنگلہ دیش، چین اور ترکی کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ ترکی نے جب کمال اتاترک کے خلاف دیئے گئے مواد کے خلاف احتجاجاً یو ٹیوب بند کیا تو اس مواد کو ہٹا دیا گیا، 1989 میں چین میں ہونے والے احتجاج کو جب یو ٹیوب پر چلانے پر پابندی لگی تو بھی اس وڈیو کو ہٹا دیا گیا اسی طرح بنگلہ دیش کا احتجاج بھی منظور کیا گیا تو ایسا ہی اس فلم کے بارے میں کیوں نہیں کیا گیا۔ مسلمان حکومتوں نے اس بارے میں وہ زور اور شدت نہیں دکھائی جو دکھانا چاہیے تھی اگر پاکستان نے اس معاملے میں ثابت قدمی دکھائی ہے تو اسے برقرار رکھنا پڑے گا اور گوگل سے یہ مطالبہ کرنا پڑے گا کہ اس فلم کو ہٹا دیا جائے نہ صرف اس فلم بلکہ تمام قابل اعتراض مواد کو ہٹایا جائے اور 1.62 بلین مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھا جائے اور انہیں

خوامخواہ مشتعل نہ کیا جائے۔ بین الاقوامی قوتوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان اپنے مذہب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کے بارے میں کسی سمجھوتے کے قائل نہیں ہیں اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ ایسا کرنا ایمان گنوانے کے مترادف ہے اور مغرب کو اس بات کا احساس کرنا چاہیے کہ دنیا میں امن تب ہی قائم ہوگا جب وہ دہشت گردی پھیلانا چھوڑ دے گا اور مسلمانوں کے جذبات سے مغرب کا یہ کھیل بھی تب رُکے گا جب مسلمان اپنے اندر کچھ دم خم پیدا کریں گے۔

آج اگر یہ آوازیں آ رہی ہیں کہ یو ٹیوب اور فیس بک کے بغیر گزارہ نہیں یہ ہے بھی درست کہ ان سارے ذرائع پر ہماری تعلیم، معیشت، صنعت اور جنگوں ہر چیز کا انحصار ہے، خاص کر طلبائ ان سب کو اپنی تعلیم کے لیے اہم ترین قرار دیتے ہیں ان کا کہنا بھی بجا ہے لیکن بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود کو دوسروں کے اتنے تابع کیوں بنا دیا ہے۔ خود وہ اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جس پر بیٹھ کر دوسرے ہمارے جذبات سے کھیلتے ہیں ہماری قوم سے کھیلتے ہیں بلکہ ہمارے مذہب سے کھیلتے ہیں۔ آج بھی ملک میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے کہ پابندی کے باوجود یو ٹیوب دیکھ رہے ہیں، اس کے لیے مختلف پاس ورڈ لگائے جا رہے ہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ انہی وجوہات کی بنا پر یو ٹیوب ہمارے مطالبات کو اہمیت نہیں دے رہا۔ بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو مسلمان

ملکوں کو اپنے اس مطالبے کو منوانے کے لیے سخت اقدامات کرنا ہونگے اور مغرب کو بتانا ہوگا کہ اگر ہم ان کے مذہب کو نہیں چھیڑتے تو انہیں بھی اس امر سے گریز کرنا ہوگا اور اگر وہ گستاخانہ خاکے، فلمیں اور مضامین شائع کرکے مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کریں گے تو پھر انہیں مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا کیونکہ اگر وہ بظاہر خود مذہب کے بند سے آزاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو بھی ایسا ہے نہیں ورنہ وہ اسلام کے خلاف مذہب کے نام پر جنگ نہ کرتے وہ کسی ملک سے بحیثیت ملک نہیں بلکہ مسلمانوں سے بطور عالم اسلام برسرپیکار ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کسی ایک ملک کے خلاف ہوتے ،نہ ان کی فلمیں ہر دہشت گرد کو مسلمان کے روپ میں دکھاتیں اور نہ وہ فیس بک ، یو ٹیوب، گوگل یعنی پوری سائبر اور میڈیا وار مسلمانوں کے خلاف لڑتے۔ آج کی دنیا اگر گلوبل ویلج ہے تو اس میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال بھی رکھنا پڑے گا ورنہ امن خواب و خیال ہی رہے گا اور ہر طرف شدت پسندی کا دور دورہ رہے گا۔یو ٹیوب، گوگل اور فیس بک جیسے طاقتور ذرائع ابلاغ کو ایک ضابطہ اخلاق کے تحت لانے سے یہ دنیا کے امن اور سلامتی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں لہٰذا بجائے اسے تخریب کے لیے استعمال کرنے کے مثبت طور پر استعمال کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو اپنا یہ پیغام انتہائی موثر طریقے سے

ان اداروں تک پہنچانا ہوگا اور اپنا مطالبہ پورا کرنے کے لیے موثر سٹریٹجی بھی اپنانا ہوگی بجائے اس کے کہ ہر بار سمجھوتہ اور سودے بازی کی جائے اور بار بار دنیا میں فساد کی وجوہ پیدا کی جائیں۔

ولی الرّحمٰن کی ہلاکت اور طالبان میں پھوٹ

پاکستان میں نئی سیاسی حکومت آچکی ہے جمہوریت کا سفر جیسا بھی ہے آخر چل تو پڑا ہے۔ امریکہ اپنے آپ کو دنیا میں جمہوریت کا سب سے بڑا ٹھیکیدار سمجھتا ہے اور ملکوں ملکوں گھومتا ہے کہ کہاں بادشاہت یا آمریت ہے کہ اُسے ختم کرے اور جمہوریت بلکہ دراصل اپنی مرضی کی حکومت اُس ملک پر مسلط کرے لیکن پاکستان میں وہ جمہوری حکومتوں کے خلاف بھی مسلسل نبرد آزما رہتا ہے اور اپنے کارندے ہمیشہ متحرک رکھتا ہے۔ نئی حکومت آئی تو عوام کو ایک اُمید تھی کہ شاید دہشت گرد کاروائیوں میں کمی آئے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تحریک انصاف اور جماعت اسلامی جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ طالبان اِن کے لیے کچھ نرم گوشہ رکھتے ہیں ان کی حکومت خیبر پختونخواہ میں آئی تو سمجھا گیا کہ شاید اب حالات بہتر ہو جائیں، بالکل یہی تاثر مسلم لیگ (ن) کی حکومت اور طالبان کے بارے میں تھا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور دہشت گرد حملے اب بھی جاری ہیں۔ طالبان کی طرف سے مذاکرات کی پیش کش ہوئی تو امن کی اُمید میں بھی اضافہ ہوا اگرچہ کچھ حلقوں کی طرف سے یہ بھی کہا گیا کہ پچاس ہزار شہادتوں اور ہلاکتوں کے بعد مذاکرات کیوں، تو یہ کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ پچاس اور سو سالوں کی جنگوں کے بعد بھی صلح کے مذاکرات

ہوتے ہیں اور معاہدے طے پاتے ہیں لیکن ان معاہدوں میں طرفین کا خلوص درکار ہوتا ہے۔ طالبان کی طرف سے مذاکرات کا عندیہ دیا گیا تو اِس کے لیے طالبان لیڈر ولی الرّحمٰن کا نام سامنے آیا جو سالہا سال سے جاری اس جنگ کو ختم کرنے کے حامی تھے جب کہ حکیم اللہ محسود کا اپنے ہی گروپ کے اس رہنما سے اس بارے میں اختلاف رائے تھا۔ حکیم اللہ ظاہر ہے نہ تو اپنی لیڈری کو داؤ پر لگا سکتا تھا نہ اپنے آقاؤں کو ناراض کر سکتا تھا ولی الرحمٰن اور حکیم اللہ کے درمیان ایک تنازعہ شروع ہوا اور اسی کے نتیجے میں حکیم اللہ نے اپنے امریکی آقاؤں کو ولی الرّحمٰن کے ٹھکانے کا پتہ بتایا اور یوں ڈرون حملے میں اُسے مار دیا گیا تاکہ نہ مذاکرات ہوں نہ امن قائم ہو اور نہ ہی اُس کی کروڑوں کی امداد اور تنخواہ بند ہو۔ اس مخبری کی خبر خود امریکی حکومت کی طرف سے دی گئی کہ یہ اطلاع حکیم اللہ محسود گروپ کے ایک شخص نے دی تھی اور اس کارنامے پر اُسے حکومت امریکہ کی طرف سے پانچ ملین امریکی ڈالر دیئے گئے۔

مذاکرات کا عمل تو امریکہ اور اس کے امداد یافتہ طالبان نے سبوتاژ کر دیا لیکن اب طالبان کی صفوں میں بھی وہ اتحاد باقی نہیں رہ سکے گا بلکہ یقیناً اس میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ تحریک طالبان افغانستان کی طرف سے پاکستانی طالبان سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے

بلکہ اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ اب پھر ملا عمر کا یہ بیان سامنے آیا ہے کہ اُن کی جنگ امریکہ سے ہے پاکستان سے نہیں اور نہ ہی پاکستانی طالبان سے اُن کا کوئی تعلق ہے۔ یہ بات ماورائے عقل بھی ہے کہ آخر یہ لوگ افواج پاکستان اور حکومت پاکستان کے خلاف کس بنیاد پر برسرپیکار ہیں، کیا پاکستان ایک غیر مسلم ریاست ہے جس کے خلاف یہ جہاد کر رہے ہیں اور کیا حکومت یا نظام حکومت سے اختلاف کا مطلب اس ریاست کے ہر باشندے کا واجب القتل ہونا ہوتا ہے۔ جس میں بچے، بڑے، بوڑھے مرد اور عورت کسی کی تخصیص نہیں، اگر یہ جنگ اسلام کے نام پر لڑی جا رہی ہے تو، تاریخ نبوی میں سے کوئی واقعہ اٹھا کر دکھایئے جس میں راہ چلتے لوگوں کو مار دیا گیا ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس جنگ کی زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اِس ملک کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اس ملک کا وجود ہی اسلام کے خلاف اُن کے ارادوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور دکھ اس بات کا ہے کہ کچھ اسلامی ممالک بھی ان کے مددگار بن جاتے ہیں۔ لفظ طالب کا مطلب اب وظیفہ اکٹھا کرکے مسجد کے باقی طلبائ کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے والے بے ضرر ''چنڑے'' پشتو کے اس لفظ کا مطلب اکٹھا کرنے والا ہے) سے بدل کر دہشت اور وحشت کی (علامت بن چکا ہے اور اس معصوم بچے کی بجائے اب ایک قاتل اور وحشی کے معنی لے چکا ہے۔ خود کو طالبان کہلانے والے یہ لوگ دراصل وہ مجرم اور اجرتی قاتل ہیں جو بیرون ملک سے امداد لے کر اپنے ہی لوگوں کا خون بہاتے

ہیں اور اس کی مثال ان قبائیلوں کے روایات کے مطابق ایسی ہی ہے جیسے اپنے ہی قبیلے کا کوئی شخص مخبری کرکے مخالف قبیلے کو اس کے مطلوب شخص کا پتہ دے اور اس بار تو کھلم کھلا حکیم اللہ محسود نے یہ فعل سرانجام دیا ہے جس کے لیے اُسے اُجرت ادا کی گئی ہے۔ ولی الرحمن بھی کوئی بے گناہ شخص نہیں تھا وہ بھی ایک عرصے تک اِن کا آ لہ ئ کا رہنا رہا لیکن اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا تھا اور اس نے بارہ سال سے جاری اس قتل عام کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اُسے ہلاک کرنے کی آخر کیا وجہ تھی اور امریکہ نے حکیم اللہ کی مخبری پر عمل کیوں کیا،ظاہر ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ یہ جنگ ختم ہو بظاہر تو وہ 2014 تک افغانستان سے نکلنے کا اعلان کر چکا ہے لیکن وہ اپنا اثر و رسوخ اور اپنے مفادات اور اِن کی حفاظت کرنے والے چھوڑ کر جائے گا اور اپنی اہمیت جتانے کو یہاں امن قائم ہونے نہیں دے گا۔ طالبان گروپوں کو بھی یہ سب کچھ مد نظر رکھنا ہوگا اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا ہوگا کہ کیا ان کی آنے والی نسلیں بیرونی آقاؤں کے لیے غلام اور اجرتی ہونے کے فرائض ہی سرانجام دیتی رہے گی اور کبھی امریکہ اور کبھی بھارت اور کبھی کسی اور کے آگے اپنی خدمات کے لیے دست سوال دراز کرتی رہے گی اور خود اپنی زمین اور اختیار کے مالک ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی نمک خوار بنی رہے گی۔ قبائلی خون تو اپنے اختیار میں شراکت بھی برداشت نہیں کرتا کجا کہ اِسے دوسروں کو سونپ کر اِن کا غلام بن جائے وہ بھی صرف پچاس لاکھ

امریکی ڈالرز میں۔ کیا وہ مخبر جس نے ولی الرحمٰن کی مخبری کی وہ نہیں جانتا کہ ولی الرّحمٰن کے قبیلے کو اس کے نام کا علم ہوا تو وہ بدلہ لیے بغیر نہیں رہیں گے، کیا اس کا جانشین خان سعید یہ خون معاف کر دے گا اور اگر اُس نے ایسا کیا تو کیا وہ اپنے قبیلے کے سامنے جوابدہ نہیں ہوگا قبائلی روایات اس بات کی ہر گز اجازت نہیں دیتی۔

یہ جنگ جسے ہمارے کرتا دھرتا طبقے نے ہماری جنگ بنا ہی دیا ہے اسے اب ختم ہو جانا چاہیے ۔ حکومت اور افواج پاکستان کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ طالبان میں ایک ولی الرّحمٰن تھا اور اس کی موت کے ساتھ ہی صلح جوئی کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں ظاہر ہے ایک ولی الرّحمٰن تھا تو دس بیس اور بھی ہونگے جن کے آسرے اور سہارے پر اُس نے مذاکرات کی ہمت کی ہوگی بہت سے ایسے طالبان اب بھی زندہ ہیں جو ایک بار غلطی سے اس دام میں آ گئے ہیں اور اب اس سے نکلنا چاہیے ہیں لیکن کئی مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہیں کر پا رہے ضرورت ان کی تلاش کی ہے اور پھر ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ پچاس ہزار جانیں گنوانے کے بعد بھی اگر جنگ کا فیصلہ نہ ہو تو پھر سٹریٹجی کو بدل دینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اسے ہر صورت بدل دینا چاہیے ۔ ولی الرّحمٰن کی موت کا ایک اور بہت اہم نکتہ یہ ہے کہ امریکہ نے بہت بڑے پیمانے پر پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ہے یعنی صلح کے مذاکرات کو ختم کر کے۔ ڈرون

حملے تو اب اس کی عادت بن چکے ہیں لیکن نئی حکومت کو اس پر جراتمندانہ اقدام اٹھانا ہوگا ورنہ اُسے بھی آئندہ پانچ سال تک باہر سے حملے اور اندر سے مخالفت.برداشت کرنا ہوگی۔ خود کو شیر کہنے والی یہ حکومت یاد رکھے کہ ملکی سلامتی اور سرحدوں کی حفاظت حکومت کی پہلی ذمہ داری ہوتی ہے اور موجودہ حکمران اگر ملک کو ایٹمی قوت اور ناقابل تسخیر بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں تو آج اُس کے پاس ایک اچھا موقع ہے کہ وہ یہ کارنامہ بھی سرانجام دے دے اور اپنے عوام کو ڈرون حملوں سے بھی محفوظ کرلے، اور اگر دہشت گردی کی جنگ ختم نہیں کرسکتی تو کم از کم پاکستان اور اس کے عوام کو پر امن طریقے سے اس جہنم سے نکال لے اور پورے ملک میں راہ چلتی زندگیوں اور قبائلی علاقوں میں گھر میں بیٹھی ہوئی جانوں کو محفوظ بنادے۔ اللہ پاکستان کا حامی و ناصر ہو۔

سانحہ بلوچستان اصل مجرم کون!

15 جون 2013 بلوچستان کے لیے انتہائی بھاری دن تھا لیکن دل ہر پاکستانی کا رویا۔ چودہ جواں سال طالبات کو ان کی یونیورسٹی بس کے اندر جھلس دیا گیا۔ ان کی مائیں جو اُن کے گھر بسانے کے لیے اُن کی تعلیم ختم ہونے کے انتظار میں تھیں اُنھوں نے ان لائق فائق بیٹیوں کو مٹی کے سپرد کیا اور پاکستان کے مستقبل کے چودہ روشن ستارے صبح ہونے سے پہلے ہی بجھ گئے۔ سردار بہادر خان یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو مجھے یاد ہے کہ کوئٹہ کی طالبات نے کس خوشی کا اظہار کیا تھا چاہے وہ لڑکیاں بلوچ تھیں پٹھان تھیں ہزارہ تھیں یا پنجابی سب اس بات پر خوش تھیں کہ اب انہیں گھروں سے آسانی سے اعلیٰ تعلیم کی اجازت مل سکے گی اور کل اسی امیدوں کے مرکز میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا گیا۔ امید محبت اور عظمت کا ایک اور مرکز بلوچستان میں زیارت کے مقام پر بابائے قوم کی ریذیڈنسی تھی جسے قوم نے بھی سنبھال کر رکھا تھا اور زیارت کے لوگوں نے تو دل سے لگا کر رکھا تھا ان کی اس محبت کا احساس قوم کو تب ہوا جب چودہ اور پندرہ جون کی درمیانی شب دہشت گردوں نے اس پر بموں سے حملہ کرکے اسے تباہ کر دیا اور اگلے دن اہلیان زیارت سراپا احتجاج بن گئے۔ محبت کی اس یادگار کی حفاظت کرتے ہوئے اس کا ایک محافظ شہید ہو گیا۔ زیارت ریذیڈنسی پر حملہ دراصل

نظریہ پاکستان پر حملہ تھا حملہ آوروں نے عمارت کو تباہ کرکے پاکستان کے خلاف دشمنی کا کھلا ثبوت دیا دونوں واقعات اتنے افسوس ناک تھے کہ سارا دن ایک دکھ کی کیفیت میں گزرا۔ اگرچہ اب ہم بحیثیت قوم اس طرح کی خبروں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ہم ایک افسوس زدہ آہ کرنے کے بعد معمولات زندگی میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن اُس دن ایسا نہ تھا حتیٰ کہ ٹیلی ویژن کے پروگرام بھی اداس اور متاثر تھے ، ہاں پاک بھارت میچ سے پہلے ایک ٹی وی چینل پر ٹاکرا کے نام سے ایک پروگرام میں ہنسی مذاق اور مصنوعی نوک جھونک کا مقابلہ جاری رہا اور یہ غمگسارانِ وطن عین اُس وقت یہ سب کچھ کر رہے تھے جب کوئٹہ میں تئیس گھرانے آہ و بکا میں مشغول تھے۔ اگرچہ کراچی میں روز اور پشاور میں بھی دوسرے چوتھے روز یہی منظر ہوتا ہے لیکن یہ وہی کوئٹہ اور بلوچستان تھا جس کے گمشدہ لوگوں سے یکجہتی کے نام پر یہی اینکرز اپنا کاروبار چمکاتے ہیں ہاں شام کو انھوں نے پروگرام '' آپس کی بات ''میں اپنے روایتی لہجے میں اپنا روایتی تجزیہ کیا اور چند مفروضوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ان واقعات کی ذمہ داری سے بی ایل اے اور ملک دشمن عناصر کو بری الذمہ قرار دے کر قانون نافذ کرنے والے اداروں اور آئی ایس آئی کو ذمہ دار قرار دیا۔ یہ کہنا کہ ہماری فوج اور آئی ایس آئی میں ہر ایک فرشتہ ہے بھی غلط ہے، ایسا ممکن نہیں کیوں کہ یہ لوگ اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جس سے ایک عام شہری تعلق رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے ذاتی کردار میں تو قابلِ اعتراض ہو سکتے ہیں

اور یہی وجہ ہے کہ میں اِن چند لوگوں کا دفاع کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گی اور اگر اِن میں کوئی قصور وار ہے چاہے غفلت کا چاہے مخبری کا تو ان کو بھی ایک عام پاکستانی کی طرح سزا دی جائے لیکن بحیثیت ادارہ ایسا الزام لگانا بذات خود ملک دشمنی ہے اور اس الزام میں کوئی حقیقت کسی طرح نظر نہیں آتی کہ ملک دشمنوں کے خلاف لڑتی ہوئی یہ فوج اور یہ ادارے معصوم لڑکیوں اور پھر مریضوں اور معالجوں کو آخر کیوں قتل کریں ، بابائے قوم کی رہائش گاہ بھی کیا اِن کے مقاصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ تھی۔ ایک غیر معقول دلیل یہ دی گئی کہ بلوچستان کی نئی حکومت کو ناکام کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا کیونکہ ڈاکٹر عبدالمالک کے مطالبات اِن ایجنسیوں لیے نا پسندیدہ ہیں کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ :۔

نمبرا۔ لاپتہ افراد کو بازیاب کیا جائے اور گمشدگیوں کا سلسلہ بند ہو۔

نمبر۲۔ مسخ شدہ لاشیں ملنے کا سلسلہ بند ہو۔

نمبر۳۔ اکبر بگٹی کے قاتلوں کو سزا دی جائے۔

کیا اِن مطالبات میں سے کوئی ایک مطالبہ بھی ایسا ہے جس کی مخالفت کوئی بھی معقول شخص یا ادارہ کرے گا اور ایک جرنیل جسے اس ملک کے سیاستدانوں نے منتخب صدر کا درجہ دیا، اس کو عدالتوں نے آئین معطل کرنے کا اختیار دیا اس کو بچانے کے لیے یوں درجنوں لوگوں کو شہید کیا جائے گا، ان کے خاندانوں کو

رلایا جائے گا اور کیا بلوچستان میں پنجابیوں کا قتل عام جس کی ذمہ داری بی ایل اے قبول کرتی ہے اس کی اصل ذمہ دار بھی یہ ایجنسیاں ہیں۔ خدارا قوم کو گمراہ مت کیجئے۔
یہ لوگ اس پروگرام میں بار بار فرماتے رہے کہ وہ بی ایل اے کے بھی دشمن بن جاتے ہیں اور آئی ایس آئی اور فوج کے بھی کیونکہ وہ حق کی بات کرتے ہیں انھوں نے خدا جانے طنزیہ کہا یا نہیں لیکن محسوس طنزیہ ہی ہوا جب وہ بی ایل اے کو پاکستان دشمن کہہ رہے تھے۔ جب اس طرح کے تجزیے کئے جاتے ہیں تو ہم اصل مجرموں کو ایک سیف پیسج فراہم کر دیتے ہیں کہ لوگوں کا دھیان کہیں اور لگ جائے اور اصل مجرم بھاگ نکلے ۔ بلوچستان کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہاں تعلیم کا عام نہ ہونا سرداروں کے حق میں ہے حکومت اور فوج کے نہیں، کیونکہ جب یہ مجبور و مظلوم لوگ پڑھیں گے لکھیں گے تو ظاہر ہے کہ مقابلہ کرنا سیکھیں گے اور مقابلہ طاقتور اور حاکموں کے کبھی بھی حق میں نہیں ہوتا مبادا کہ مقابلہ کرتے کرتے کوئی مقہور خود ظلم کے آگے قہر نہ بن جائے ۔بی ایل اے ،براہمداغ، حربیار، اللہ نذر بلوچ یہ سب حاکم ہیں جو اپنے مفادات کے لیے لڑ رہے ہیں بلوچستان کے لوگ تو وہ ہیں جو زیارت ریزیڈنسی کی تباہی پر احتجاجی نعرے لگا رہے تھے جانتے بھی تھے کہ وہ بھی دشمن کے حملے کا نشانہ بن سکتے ہیں پھر بھی سڑکوں پر نکل آئے تھے۔
بگٹی کے قتل کو کسی بھی پاکستانی نے مبنی برانصاف نہیں کہا تھا نہ ہی مسخ

شدہ لاشوں کا ملنا قابل قبول ہے نہ ہی لاپتہ افراد کا معاملہ پسندیدہ۔ لیکن اس کو اپنی شہرت کے لیے استعمال کرکے اِن لوگوں کو اور زیادہ ریاست اور حکومت کے خلاف کرنا بھی ایک بڑا جرم ہے بلکہ قوم اور وطن سے غداری ہے جو قابل سزا ہے آزادی اظہار نہیں۔ آزادی اظہار کے تو جتنے یہ لوگ قائل ہیں وہ سب جانتے ہیں کہ اپنی مرضی اور ادارے اور ارادوں کے خلاف بولنے والوں کے تو یہ منہ بند کر دیتے ہیں ان کے پروگراموں میں صرف وہی لوگ ہوتے ہیں یا بولتے ہیں جو ان کی مرضی کے مطابق بولیں دوسری رائے یا دوسرا نظریہ بہت کم سننے کو ملتا ہے اور اب تو بات یہاں تک آ پہنچی ہے کہ یہ لوگ اپنے تجارتی پارٹنرز کی خوشنودی کے لیے کھلم کھلا نظریہ پاکستان کے خلاف بھی بولتے ہیں بلکہ دو قومی نظریے کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔ قوم کو اس وقت مثبت نظریے یکجہتی اور سالمیت کی ضرورت ہے نہ کہ شک کے بیج بونے کی اور نہ ہی اداروں کو ذلیل کرنے کی۔ اگر اِن تجزیہ نگاروں کو ایک مخصوص ذہنیت کے میڈیا نے "عظیم تجزیہ نگار" بنا دیا ہے تو گذارش ہے کہ حقائق سے پردہ پوشی مت کیجئے پاکستان اور اس کے لوگوں پر رحم کیجئے اس کی تاریخ اور قائد سے غداری مت کیجئے کم از کم اس کی یاد گار پر حملہ کرنے والوں کو فرار کا موقع مت دیں اگر آپ کی پہنچ اسامہ بن لادن، بیت اللہ محسود اور مولوی فضل اللہ تک ہو سکتی ہے تو پاکستان دشمنوں کو تلاش کیجئے اور جب یہ آپ کو ملیں تو انہیں قوم کے حوالے کیجئے۔ عدالت میں ثبوتوں کے بغیر سزا نہیں ہوتی اور یہ مجرم

ثبوت نہیں چھوڑتے کہ یہ تو خود کو ہی اڑا دیتے ہیں لہذا یہ ثبوت عدالت کو آ فراہم کیجئے تا کہ قوم اِن کے شر سے محفوظ ہو سکے۔ یہ خدمت سرانجام دیجئے اس معصوم خون کے بدلے جو پندرہ جون کو کوئٹہ میں بہا اور ہر روز پاکستان کے ہر شہر میں بہتا ہے۔ اللہ پاکستان کی ہر دشمن سے حفاظت کرے چاہے وہ اندرونی ہو یا بیرونی آمین۔

بھارت سے دوستی طاقت کی زبان میں

بھارت پاکستان کے ساتھ تو سینگ اڑائے ہی رکھتا ہے لیکن اس کے باقی پڑوسی بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں، سری لنکا میں بدامنی اور خانہ جنگی پیدا کرنے کے لیے وہ سمندر کے پانی عبور کرتا تھا، پاکستان کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کرنا، سال میں دو چار مرتبہ سرحدی خلاف ورزیاں کرنا اور دو تین دیہاتیوں کو شہید کردینا تو اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ابھی حال ہی میں اُس کے دو جنگی جہازوں نے پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی اب یا تو وہ مان لے کہ اُس کی نیت.بری تھی یا پھر اُسکے ہوا باز اس قدر غیر تجربہ کار ہیں کہ اپنی اور پرائی سرحدوں کا تعین نہیں کرپاتے۔ معاملہ جو بھی ہو لیکن جب پاکستانی ہوا باز اڑتے ہیں تو پھر بھارت کے جہاز مڑ کر نہیں دیکھتے اور بھاگ جاتے ہیں یعنی ان کی سمجھ میں صرف طاقت کی زبان آتی ہے۔ یہی کچھ بھارت کے ساتھ تب ہوا جب اُس نے چین کے ساتھ اپنی سرحد پر اپنی طاقت کا ناجائز مظاہرہ کرنے کے لیے پرانے مورچوں کو مضبوط کرنا شروع کیا اور اسی کی آڑ میں نئے مورچے بھی بنانے شروع کیے۔ لداخ کی بین الاقوامی سرحد چمار سیکٹر پر ہونے والی اس غیر معمولی سرگرمی کا چین نے سختی سے نوٹس لیا اور بھارت پر واضح کیا کہ اس متنازعہ سرحد پر وہ کوئی بھی مستقل مورچہ بندی نہیں کرسکتا۔ چین مک موہن لائن پر واقع اس

علاقے کو اپنا حصہ گردانتا ہے جبکہ بھارت اسے اپنا حصہ قرار دیتا ہے۔ مک موہن لائن برطانوی ہند کے برطانوی سیکرٹری خارجہ سر ہنری مک موہن نے ہندوستان اور چین کے درمیان 1914 میں کھینچی جسے چین نے تسلیم نہ کیا لیکن بھارت نے اپنے قیام کے بعد اپنی ہٹ دھرمی سے اس علاقے کو اپنا حصہ قرار دیا، چین نے اپنے آزادی کے بعد اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی اور 1950 میں چو این لائی نے بھارت کو پیش کش کی کہ اگر وہ اکسائی پر چین کا حق تسلیم کرلے تو چین مک موہن لائن کو تسلیم کرلے گا لیکن بھارت نے ایسا نہ کیا بلکہ 1960 میں پوری متنازعہ ہمالائی ریاست کا کنٹرول سنبھال لیا اور ماہرین کے نزدیک یہی 1962 کی چین بھارت جنگ کی وجہ بنی۔ وقتاً فوقتاً یہ 90,000 مربع کلومیٹر علاقہ چین اور بھارت کے درمیان تنازعے کا باعث بنتا رہتا ہے لیکن بھارت چونکہ طاقت کی زبان سمجھتا ہے اور چین اس پر دباؤ ڈالتا ہے تو وہ خود بخود اپنی پچھلی پوزیشن پر پہنچ جاتا ہے۔ 1980 کی دہائی میں بھی جب حالات خراب ہوئے تو بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی بیجنگ پہنچ گئے اور معاملات کو قابو کیا، اب جب کہ چین بزورِ بازو بھارت کو نئے مورچے بنانے اور پرانے زیادہ مضبوط بنانے سے روک چکا ہے تو اروناچل پردیش کے گورنر جنرل ریٹائرڈ جے جے سنگھ نے کچھ لو اور کچھ دو کو مسئلے کا حل قرار دیا ہے ظاہر ہے ایک گورنر خود سے کوئی ایسا حل نہیں دے سکتا یقینا مرکزی حکومت کی مرضی اس بیان میں شامل رہی ہے جس کا ثبوت وزیراعظم من موہن سنگھ کا رویہ

بھی ہے جنھوں نے کہا کہ اس مسئلے کو بخوبی حل کیا جائے گا اور آپس میں ہی طے کر لیا جائے گا۔ جبکہ انڈین میڈیا اپنے سیاستدانوں پر بھی چیخ اٹھا کہ وہ اس معاملے کو سنجیدہ نہیں لے رہے اور ان کے مطابق چینی افواج نے اپنے کچھ درجن سپاہی بھارتی سرحد کے اندر بھیجے اور خیمے لگائے مگر یہ نہیں بتایا کہ چین نے ایسا کیوں کیا، کیوں بھارت کو اپنی سرحد پر ہونے والی گشت کو روکنا پڑا اور اُسے چین کے مطالبات کیوں تسلیم کرنا پڑے۔ اُس نے چین کو پاکستان سمجھ کر یہ ساری کاروائی کی تھی جہاں وہ اپنے جہاز بھیجتا ہے کہ فضائی سرحد کی خلاف ورزی کرے، کبھی زمینی سرحدی خلاف ورزی کرتا ہے اور کبھی دہشت گرد کاروائیاں اور پھر دنیا کو یہ باور کرا دیتا ہے کہ سارا قصور پاکستان کا ہے بھارت تو صرف اپنا بچاؤ کر رہا ہے۔ اگر چہ یہی تاثر اُس نے چین کے ساتھ تنازعے پر بھی دیا اور یہی وجہ ہے کہ کچھ بین الاقوامی اخبارات اور رسالوں نے چین کے خیمے گاڑ ھنے کی خبر کو زیادہ اچھالا۔ چاہے جو بھی ہوا پہل جس نے بھی کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھارت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور وہ بھی چینی شرائط پر اور یہ دراصل چینی شرائط نہیں طاقت کی زبان تھی جس نے کوئی بڑا سانحہ، کوئی بڑی جنگ ہونے سے روک دی۔ اگر پاکستان بھی بھارت کو اسی لہجے میں جواب دے تو شاید ہر روز کی بھارتی شرارتوں سے بچا رہے اور علاقے میں زیادہ پائیدار امن قائم ہو لیکن یہاں تو بجٹ پاس ہو تو ہمارا ہر چغادری تجزیہ نگار اپنی تمام تر توانائیاں اور سمجھ بوجھ اس بات پر ضائع کر دیتا

ہے کہ دفاع کی مد میں زیادہ پیسے کیوں رکھے گئے اس کا دکھ ہر باشعور پاکستانی کو ہوتا ہے لیکن کاش اس کا پڑوسی بھارت نہ ہوتا اور یا وہ ایسا دشمن نہ ہوتا جو کھلم کھلا اور چھپ کر دونوں طرح سے وار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے امن کی بات اچھی ہے لیکن طاقتور اور کمزور کے مابین امن نہیں مجبوری ہوتی ہے۔ بھارت اپنی فوجی طاقت ہمہ وقت بڑھائے رکھتا ہے اگر وہ یہی توانائی اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن قائم رکھنے پر صرف کرتا اور انہیں اپنے اپنے ملک میں سکون اور آرام سے رہنے دیتا تو جنوبی ایشیا دنیا کا بہترین خطہ ہوتا اور نہ خود بھارت سے کوئی طاقت کے ذریعے فیصلے منواتا اور اس کی فوج کی عوام میں سبکی ہوتی اور نہ دوسرے ممالک اپنی عوامی خوشحالی کو چھوڑ کر اسلحہ بناتے اور خریدتے اس سب کچھ کے لیے اُسے علاقے کا چودھری نہیں صرف ایک ذمہ دار ملک بننا پڑے گا اور اپنے شر سے اپنے ہر پڑوسی کو محفوظ بنانا ہوگا۔

جمہوری حکومت کا ”عوام دوست“ بجٹ

2013 الیکشن کا سال تھا اور ہر پارٹی نے انتخابی دعویٰ کیا تھا کہ اگر وہ برسراقتدار آ گئی تو تبدیلی لے کر آئے گی لوڈشیڈنگ، مہنگائی ،بدامنی ، ڈرون ، صحت ، تعلیم اور معلوم نہیں کس کس چیز کو آناً فاناً بدلنے کے وعدے ہوتے رہے اور پچھلی حکومت بلکہ حکومتوں کے ستائے ہوئے عوام جانتے بھی تھے کہ جو باتیں ہو رہی ہیں وہ عملاً اتنی جلدی ممکن ہی نہیں اور نہ حکومت میں آنے کے بعد اپنے وعدے یاد رکھے جاتے ہیں اور وہی ہوا جو سب جانتے تھے ڈرون حملے بھی ہوئے ،لوڈشیڈنگ بھی پورے طمطراق سے جاری ہے، بدامنی نے تو سانس لینا بھی محال کیا ہوا ہے ہر روز ایک نیا سانحہ ، نیا دھماکہ ، نیا قتل عام ،نیا دکھ قوم و ملک کا نصیب بن رہے ہیں۔ اللہ نئی حکومت کو توفیق دے کہ وہ ملک و قوم کے لیے اپنے نیک ارادے پورے کر سکے ، لیکن تا حال اس نے جو ایک ہی کام کیا ہے وہ وفاقی بجٹ کا پیش کرنا تھا جس نے عوام کو مایوس ہی کیا۔ عوام کو معاشیات کے گورکھ دھندوں کی سمجھ نہ سہی لیکن اپنے گھریلو بجٹ کی ضرور ہے جو کسی طرح بھی ان کے قابو میں نہیں آ رہا۔ میں بھی کوئی ماہر معاشیات نہیں ہوں کہ بجٹ کے ان پہلوئوں پر تبصرہ کر سکوں لیکن مجھے ہر تنخواہ دار کی طرح اپنے بجٹ کی فکر ضرور ہے جہاں آمدن سے لے کر اخراجات تک کو ٹیکسوں کے بوجھ سے لاد دیا گیا ہے تنخواہ گھر

پہنچنے سے پہلے ٹیکس کی زد میں آچکی ہوتی ہے اور گھر آنے کے بعد اشیائے ضروریہ کی خرید وفروخت کے بعد دوبارہ ٹیکس کی چھری سے ذبح ہو جاتی ہے۔ پٹرول، سی این جی یا ڈیزل موٹر سائیکل سوار ڈلوائے یا رولز رائس سب کو ٹیکس تو دینا ہے چاہے وہ اپنی موٹر سائیکل ہفتے میں ایک بار نکالتا ہو تاکہ اُس کا انجن خراب نہ ہو۔

بازار میں قدم رکھتے ہی صارف مکمل طور پر ایک عظیم ٹیکس دہندہ بن جاتا ہے اور جی ایس ٹی کی مد میں اپنی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ وہیں چھوڑ آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ ٹیکس پہلے بھی تھا اور کہنے کو صرف ایک فیصد بڑھایا گیا لیکن وہ ملک جہاں خود حکومت کے بقول آدھی آبادی غربت کی لکیر پر یا اُس سے نیچے ہے وہ یہ ایک فیصد بھی کیسے برداشت کرسکے گی اور تنخواہ دار طبقہ دو، دوبار ٹیکس کیسے اور کیوں ادا کرے اور سونے پر سہاگہ کہ جی ایس ٹی لگا کر اسے اگلے ہی دن لاگو کیا گیا اور کچھ دن بعد سپریم کورٹ کے حکم پر پہلے اسے کم کیا گیا اور پھر یہ اضافہ واپس لے لیا گیا اب بیچ کے ہفتہ، آٹھ دن میں عوام جو یہ ٹیکس ادا کر چکے ہیں حکومت کے پاس اس کے لیے کیا جواز ہے اور کیا وہ انہیں واپس کیا جا سکتا ہے اور کیا غریب کی جیب نے جو قربانی دی اس کا کہیں ریکارڈ بھی ہوگا یا نہیں۔

اس بجٹ میں نہ صرف تنخواہوں پر ٹیکس لگا بلکہ اس میں معمولی سا اضافہ بھی نہیں کیا گیا اور بعد یں عوامی دباؤ پر اونٹ کے منہ میں زیرہ رکھ دیا گیا تا کہ اُسے بند کیا جا سکے اور صرف دس فیصد تنخواہیں بڑھائی گئیں عذر یہ دیا گیا کہ خزانہ خالی ہے اور مزید بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ ملک کی معاشی حالت اچھی نہیں ہے اور خزانہ خالی ہے لیکن کیا اِسے بھرنے کے لیے صرف عوام رہ گئے ہیں کہ انہی کی جیبوں سے اسے بھرا جائے میری ناچیز رائے میں تو اسے بھرنے کے لیے وہی پیسہ کافی ہے جو بڑی بڑی شخصیات نے قرضے کے نام پر بینکوں سے لیا ہوا ہے اور پھر معاف کروالیا ہے اور قوم کے پیسے سے عظیم الشان صنعتوں، زمینوں، جائیدادوں، پلازوں، تجارت، کمپنیوں اور کاروباروں کے مالک بن چکے ہیں اور اس سارے مال و متاع کا بڑا حصہ چونکہ ملک سے باہر ہے لہٰذا ملک کے کسی فائدے کا بھی نہیں۔ یہ کاروبار دوسرے ممالک کی آمدن میں تو اضافے کا باعث ہوتے ہونگے پاکستان اور اس کے عوام کے نہیں کیونکہ اس سے کمایا گیا روپیہ بھی غیر ممالک میں پڑا ہوا ہے۔ حکومت کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ان بڑی مچھلیوں کو پکڑ لے اور ان ہی سے یہ پیسہ واپس لے لے تو اسی سے خزانہ بھر جائے گا۔ ان کی تلاش کے لیے کسی بڑی دوڑ دھوپ کی ضرورت بھی نہیں توقیر صادق، گستاخی معاف لیکن جناب صدر، راجہ پرویز اشرف، گیلانی صاحبان ایفیڈرین کیس والے حضرات، حج کرپشن کیس کے ملزمان جیسے اس میدان کے بڑے، کھلاڑی تو سب کی ہی نظر میں ہیں

اگر حکومت یہ ابتدائی اپنے لیڈروں اور ایم این اے اور ایم پی اے خواتین وحضرات سے کرلیں تو کسی دوسرے کو بھی شکایت نہیں ہوگی اور یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا کہ اسی کی بدولت یہ سارے محسنین پاکستان شمار ہونگے کیونکہ قوم کا المیہ ہی یہی ہے کہ اسکی دولت چند لوگوں تک مرتکز ہے بلکہ وہ لوگ اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اور عوام کو ملنے والے چند پیسے احسان شمار کئے جاتے ہیں۔ اگر ہمارے حکمران خود کو اور ایک عام آدمی کو ایک ہی گوشت پوست کا انسان سمجھیں تو بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ جن سہولیات کا عوام سوچ بھی نہیں سکتے اگر حکمران طبقہ اپنے لیے ان کی مقدار اور معیار میں کمی ہی برداشت کرلے تو نہ تو معاشرتی مسائل بڑھیں، نہ نفرتیں اور نہ غربت۔ ایک عام آدمی تو اپنی سائیکل پر بھی ٹیکس دیتا ہے لیکن اِن بڑے لوگوں کو سرکار کی طرف سے مفت ایسی ایسی گاڑیاں فراہم کردی جاتیں ہیں جو عام آدمی نے کبھی تصویر میں نہیں دیکھی ہوتیں، سرکاری محلات اُن اُن سہولیات سے مزین ہوتے ہیں جس کو ایک عام پڑھا لکھا ذہین شخص سو دو سو سال بعد کی ایجاد سمجھتا ہے اور بہت سے تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہ تمام سہولیات ختم کی جائیں لیکن اِن میں کٹوتی انتہائی ضروری ہے کیونکہ قومی آمدنی کا ایک اچھا خاصا حصہ اسی عیش و عشرت کی نذر ہو جاتا ہے اگر درآمد شدہ کروڑوں کی مالیت کی گاڑیوں اور دیگر سامان تعیش پر پابندی لگادی جائے، سرکاری خرچے پر معمولی بیماریوں کے بیرونی علاج کو اپنے خرچے پر کیا

جائے ، بجلی کے بلوں پر قابو پایا جائے، مکمل طور پر ائیر کنڈیشنڈ ان بڑی بڑی عمارتوں میں اگر اے سی بند ہونگے تو لوڈ شیڈنگ کے مارے عوام کی تکلیف کا احساس ہو سکے گا۔ قصرِ صدارت اور وزیرِاعظم ہائوس کے اخراجات میں اگر چہ تیس فیصد کمی کا اعلان کیا گیا ہے لیکن اگر خزانہ اس حد تک خالی ہے کہ تنخواہیں بھی ادا نہ کی جا سکیں تو کیا یہ اخراجات مزید کم نہیں کیے جا سکتے اگر تیس فیصد تک حکومت خود راضی ہوئی ہے تو یقیناً اور زیادہ کمی کی گنجائش موجود ہے۔ حکومت کو دلیرانہ اقدامات کرنا ہوں گے لیکن یہ دلیری عوام پر آزمانے کی بجائے اگر حکمرانوں اور بڑے لوگوں سے شروع کی جائے تو یقیناً قابل ستائش ہوگی، اگر پہل بڑوں سے کی جائے تو آسان بھی ہوگا کہ اس ملک میں ''بڑے'' صرف سینکڑوں ہزاروں میں ہیں جبکہ عوام کروڑوں میں۔ احتساب عوام کا بھی ہونا چاہیے کیونکہ چوری ،اگر لاکھ کی چوری ہے تو دھیلے ٹکے کی بھی چوری ہے اور اس چوری اور رشوت کو سرکاری سطح پر روکنا ہے تو مہنگائی کم کرنا ہوگی اور تنخواہ اتنی رکھنی ہوگی کہ بغیر رشوت کے تنخواہ دار ملازمین عزت دار زندگی گزار سکیں۔ ٹیکس ضرور لگائیں کیونکہ اس کے بغیر حکومتیں نہیں چلتی لیکن عوام کی جیب بھی دیکھ کر اور خواص کی بھی تاکہ ملک میں واقعی ایک ایسا معاشی نظام نافذ ہو جو لوگوں کو معاشیات کے گورکھ دھندوں میں نہ الجھائے بلکہ ان کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہو۔

دیامیر میں قتلِ عام دہشت گردی یا پڑوسیوں کی سازش

پچھلے بارہ تیرہ سال سے پاکستان جن مشکل حالات سے گزر رہا ہے اس نے پوری قوم کو ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ ہر آنے والا دن مزید مشکلات لے کر آرہا ہے اور ہر نیا واقعہ پچھلے سے زیادہ اعصاب شکن ہوتا ہے۔ صرف پچھلے چند دن کے واقعات پر ہی نظر ڈالیے کوئٹہ میں یونیورسٹی طالبات پر حملہ اور شہادتیں، زیارت میں قائداعظم ریزیڈنسی پر حملہ، مردان میں نمازِ جنازہ پر حملہ اور شہادتیں، پشاور میں مسجد میں نمازِ جمعہ پر حملہ اور شہادتیں اور کراچی میں تو بربریت اور ظلم کا کوئی شمار نہیں قوم ابھی ایک حادثے سے سنبھلتی نہیں کہ دوسرا سانحہ ہو جاتا ہے۔ اب کی بار تو ظالموں نے اُن پہاڑوں کو بھی نہ چھوڑا جہاں موسم کے علاوہ دوسرا دشمن نہیں ہوتا۔ نانگا پربت پر گیارہ سیاحوں کا قتل ایک ایسا لرزہ خیز واقعہ تھا جس نے پوری قوم کو ایک بار پھر ہلا دیا اور حسب معمول طالبان نے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ طالبان جو کہتے ہیں کہ وہ دین اور خلافت کے لیے لڑ رہے ہیں نے اُس دین کے پُرامن ہونے کے نظریے کی دھجیاں بکھیر دیں جو اپنے شہریوں سے زیادہ غیر ملکی اور غیر مسلم شہری کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے، جس دین نے زمین میں سیر کرنے اور عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے تو کیا واقعی

طالبان کی جنگ کا مقصد وہی ہے جو وہ کہتے ہیں اور انہیں کہیں اور سے ہدایات نہیں ملتیں اور آخر وہ تیرہ ہزار فٹ کی انتہائی مشکل اور برفانی چوٹیوں تک پہنچ کیسے گئے، گلگت سکاوٹس کے یونیفارم کیسے حاصل کیے، وہاں رہے کیسے اور ان نہتے لوگوں کو مار کر کونسا کارنامہ سرانجام دیا۔ اللہ کرے حکومت اِن سب سوالات کے جوابات ڈھونڈ سکے کہ یہ علاقے اس قدر پُرامن علاقے ہیں کہ یہاں جرائم کی شرح انتہائی کم ہے۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے کہ گلگت شہر میں غلطی سے پستول چلا اور فائر ہوا تو بے شار لوگ اکٹھے ہو گئے اور اگلے دن بھی پوچھا جاتا رہا کہ فائر کس سلسلے میں ہوا اور یہ سوال ثبوت تھا یہاں کے لوگوں کی پُرامن فطرت کا اور آج جس مقام پر یہ اندوہناک واقعہ ہوا ہے وہاں تو ایسا ہونا اور بھی ناقابل یقین ہے۔ ذمہ داری تو قبول کر لی گئی لیکن قابل غور کچھ اور باتیں بھی ہیں کہ آخر اِن غیر ملکیوں کو کیوں نشانہ بنایا گیا کیا اس لیے کہ دوست ممالک سے تعلقات خراب ہوں، چین کے پاکستان میں ترقیاتی کاموں کو بند کروایا جاسکے ۔ کہیں گوادر کا دکھ تو نہیں نکالا گیا، یا اروناچل پردیش میں چلتی ہوئی بھارت چین ناچاقی کو ہمالیہ سے قراقرم منتقل کرنے کی کوشش تو نہیں کی گئی ۔ گوادر پر تو بھارت پہلے بھی کافی ناراضگی کا اظہار کر چکا ہے حالانکہ تب بات صرف بندرگاہ کی تعمیر میں چینی تعاون کی تھی جبکہ اب تو یہ ناراضگی زیادہ شدید ہے کہ گوادر کے انتظام کو تو چین کے حوالے کر دیا گیا ہے اور یوں بھارت جو خود کو

کہہ کر سپرپاورز کی صف میں شامل کرنا Riasing India اور Shining India چاہتا ہے اس کو اپنا خواب مشکل میں پڑتا ہوا محسوس ہو رہا ہے اور وہ ہر قیمت پر پاکستان اور چین کے تعلقات کو خراب کرنا چاہتا ہے اور فیری میڈوز جیسے ظالمانہ واقعات کرنے سے بھی نہیں چونکتا۔

اس واقعے کا ایک اور پہلو بھی ممکن ہے جس کی طرف شاید کسی نے دھیان نہ دیا ہو اور شاید میری اس بات کو اب بھی بہت سارے لوگ درخوراعتنائ نہ سمجھیں لیکن ماضی کو مدنظر رکھ کر اسے بعید از قیاس نہیں سمجھنا چاہیے۔ پچھلے کچھ مہینوں میں بھارت میں سیاح خواتین کے ساتھ بد سلوکی کے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ کچھ ملکوں کو اپنی خواتین کو ہدایات جاری کرنا پڑیں کہ وہ بھارت جانے سے گریز کریں۔ صرف 2013 میں ایسے کئی واقعات ہوئے جن میں یورپ سے آنے والی سیاح خواتین کی آبروریزی کی گئی اور اس میں درندہ صفت بھارتیوں نے کسی ملک اور عمر کی تخصیص نہیں رکھی۔ جہاں ایک اڑتیس سالہ سوئس خاتون کو درندگی کا نشانہ بنایا گیا وہیں ایک نوجوان کورین طالبہ کو بھی اسی سلوک کے قابل سمجھا گیا اور ایک نوجوان آئرش لڑکی بھی انسانیت کے ان دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی۔ تین جون کو ایک امریکی سیاح کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی۔ آگرہ میں چھٹیاں گزارنے کی نیت سے آئی ہوئی ایک برطانوی خاتون سیاح نے اپنی عزت بچانے کے لیے ہوٹل کے کمرے سے چھلانگ لگائی اور اپنی ٹانگ زخمی کر

بیٹھی ۔ یہ واقعات بھارت میں ایک معمول ہیں اور پانچ سال پہلے ایسی ہی ایک پندرہ سالہ معصوم برطانوی لڑکی جو سکول کی طالبہ تھی کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی اور اسے گوا کے ساحل پر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اسی طرح کا سلوک گروگاؤں میں چینی کارکن کے ساتھ کیا گیا۔ اگر چہ یہ واقعات بھارت میں ہوتے رہتے ہیں تاہم 2013 میں اب تک ایسے کم از کم آٹھ دس واقعات ریکارڈ پر آ چکے ہیں اور بھارت سیاح عورتوں کے لیے ایک خطرناک ملک قرار دیا جانے لگا ہے اسی لیے سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے اپنی سیاح عورتوں کو بھارت جانے کے خطرناک نتائج سے متنبہ کیا ہے جبکہ بھارت کی شان بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ اس کا کہنا ہے کہ اِن واقعات پر واویلا کرنے کی کوئی ضروت نہیں سیاحوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان میں اپنے کارندوں کو استعمال کیا گیا کہ سیاحوں کے لیے بھارت جیسے بلکہ اس سے بھی بدتر حالات پیدا کیے جائیں کیونکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس بلندی تک دہشت گرد اسلحے سمیت کیسے پہنچ گئے ، میں یہ نہیں کہتی کہ بھارتی فوجی بنفس نفیس آئے لیکن ان کی مدد کے اشارے بڑے واضح ہے جو فراہم کی گئی۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات قدرت کے حُسن سے مالا مال ہیں اور دنیا بھر کے سیاح یہاں بڑے شوق سے کھنچے چلے آتے ہیں اور ان کے رنگ برنگ خیمے اس علاقے میں پریوں کے اترنے کی روایت کا منظر پیش کرتے ہیں اور کوہ پیما تو اسے اپنے شوق اور پیشے کی معراج سمجھتے ہیں جب تک وہ ہمالیہ اور قراقرم کی بلندیوں کو نہ

چھولیں ان کے شوق کی تکمیل نہیں ہوتی اور وہ سب ان علاقوں کے لوگوں کی امن پسندی، مہمان نوازی اور محبت کے معترف ہیں میں نے گلگت کے کوہ ودمن میں اور درختوں پر اپنے خیموں میں بے فکری سے اپنی سیاحت کا لطف اٹھاتے سیاحوں کو مقامی لوگوں سے عزت پاتے ہی دیکھا ہے پھر آخر اب ایسا کیوں ہوا۔ تحریک طالبان اس واقعے کی ذمہ داری قبول کرچکی ہے اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں لیکن ضرورت واقعے کی تہہ تک پہنچنے کی ہے کہ تہہ میں کہیں گوادر یا بھارت میں سیاحوں کے ساتھ بدسلوکی تو نہیں کیونکہ مقتول سیاحوں میں بہرحال چینی باشندے بھی شامل تھے۔دیگر سیاح بھی دوست ممالک اور پاکستان کے لیے اتنے ہی قیمتی تھے جتنے چینی اور اسی لیے پاکستان کا ہر شخص اس واقعے پر دکھی اور غمگین ہے حکومت بھی پریشان ہے اور سیکیورٹی ادارے بھی، وہ بھارت کی طرح اسے معمول کی کاروائی قرار نہیں دیتے بلکہ اسے اپنے ملک کی بدنامی اور اپنی روایات کے عین خلاف سمجھتے ہیں اور یہی ہمارا اپنے دوست ملکوں کے لیے پیغام ہے کہ ہم بحیثیت قوم ان کی جانوں اور عزت وآبرو کو اپنی ذمہ داری اور اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتے ہیں۔ حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ اِن دہشت گردوں کو تلاش کرنے اور کیفر کردار تک پہنچانے اور اِن سے حقائق معلوم کرنے میں کسی نرمی اور سستی کا مظاہرہ نہ کرے کیونکہ یہ ہماری قومی عزت کا سوال ہے اور جس طرح اس واقعے کی ہر سیاسی، مذہبی اور عوامی حلقے نے مذمت کی ہے اسے عملی طور پر نظر بھی آنا چاہیے اور قومی ساکھ کو بحال کرنے میں کوئی دقیقہ فرد

گزاشت نہیں ہونا چاہیے۔

اردو ہے جس کا نام۔۔۔

زبان کسی بھی انسان کے دوسرے انسان سے رابطے اور تعلق کا ایک ذریعہ ہے اور ہم زباں ہونا اس کام کو سہل اور آسان بنا دیتا ہے۔زبان نہ صرف رابطے کا ذریعہ بلکہ قوموں کی پہچان بھی ہوتی ہے۔۔برصغیر پاک و ہند ایک وسیع و عریض خطئ ارض ہے اور یہاں مختلف اوقات میں مختلف اقوام مختلف زبانوں کے ساتھ وارد ہوتے رہے۔ شاید زبانیں بھی آپس میں خلط ملط ہوتی رہیں لیکن کسی نئ بڑی زبان کے جنم لینے کے شواہد اردو سے پہلے نہیں ملتے ہیں یعنی ہر زبان اپنی انفرادی حیثیت میں ہی چلتی رہی۔ جب پہلے پہل مسلمان یہاں آئے تو اپنے ساتھ عربی زبان اور بول چال لے کر آئے جس نے مقامی زبانوں پر اپنے اثرات مرتب کئے پھر افغان، ترک فارسی اور جو جو فاتح یہاں آتے گئے اور اپنی اپنی زبانیں لائے گئے تھیں تو بذات خود بھی یہ بڑی زبانیں اپنا وجود برقرار رکھتی رہیں لیکن اِن کو سمجھنے والے خود انہی اقوام تک محدود رہے اور دوسری اقوام اور مقامی باشندوں تک اپنی بات پہنچانا ایک عام آدمی کے لیے ممکن نہ تھا اور یوں اپنی اپنی زبان میں ایک دوسرے سے بات کرتے کرتے ایک ایسی زبان وجود میں آ گئی جس نے اردو کا نام پایا جو سب کے لیے قابل فہم تھی۔ یہ تو ایک الگ موضوع ہے کہ یہ زبان ارتقائی مراحل سے کیسے گزری لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان

رابطے کا ایک موثر اور مقبول ترین ذریعہ رہی۔ پاکستان بنا تو اسے پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا اور ایک بار پھر یہ پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، کشمیری اور مختلف علاقائی زبانیں بولنے والوں کے درمیان رابطے کا فریضہ سرانجام دیتی رہی۔ اس کے اندر مختلف زبانیں جذب کرنے کی صلاحیت نے اس کے دامن کو مالامال کیے رکھا اور بہت کم الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں بولے جائیں تو مس فٹ محسوس ہوتے ہیں ورنہ تو ہر لفظ اس میں یوں مدغم ہو جاتا ہے جیسے یہ اردو کا ہی ایک لفظ ہو، یوں اردو ایک زیادہ وسیع زبان بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اگرچہ عوامی سطح پر اس سے محبت کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ باوجود قومی زبان کا درجہ دینے کے ہم نے سرکاری سطح پر اس سے وہ سلوک نہیں کیا جس کی یہ حقدار ہے۔ منہ زبانی تو ہم اسے قومی اور سرکاری زبان کہتے ہیں لیکن عملاً ہم اسے وہ درجہ نہیں دیتے اور جہاں فوقیت اور اہمیت اس کا حق بنتا ہے وہاں بھی اس کو درجہ دوم کی زبان سمجھ کر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے مثلاً صدر، وزیراعظم یا کسی بھی دوسری اہم شخصیت کے حلف کو ہی لیجیے اس تقریب اور دستاویز کو ہر پاکستانی کے لیے قابل فہم ہونا چاہیے کیونکہ ایک پی ایچ ڈی پروفیسر، ڈاکٹر، انجینیئر جنرل، جج یا گھریلو خاتون سے لے کر ایک ریڑھی والے سبزی فروش، دیہاڑی کرنے والے مزدور اور ڈرائیور غرض ہر ایک کو یہ جاننے کا حق ہے کہ جسے اُس نے اپنا حکمران منتخب کیا ہے وہ قسم اٹھا کر قوم سے کیا وعدہ کر رہا ہے

لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ وعدہ ایک ایسی زبان میں کیا جاتا ہے جسے پاکستان کی ایک معمولی سی اقلیت ہی سمجھ سکتی ہے یعنی زبان من ترکی و من ترکی نہ می دانم۔ جس ملک میں خواندگی کی شرح ہی پچاس فیصد سے کم ہے وہاں انگریزی سمجھنے کی حد تک پڑھے لکھے لوگوں کی کیا تعداد ہوگی اور ویسے بھی ایک قومی فریضے کی ادائیگی کے لیے قومی زبان زیادہ موزوں اور حقدار ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہاں قومی دنوں پر انگریزی لباس پہن کر انگریزی زبان بولنے پر نہ صرف فخر محسوس کیا جاتا ہے بلکہ ایک طبقہ ایسا نہ کرنے والوں کو جاہل سمجھتا ہے جس کا اکثر اوقات اظہار بھی کر دیا جاتا ہے۔ الیکشن کے دوران پاکستانیت کے بے شمار دعوئوں کے باوجود بھی وزیراعظم کی تقریب حلف برداری کو اردو میں منعقد کرنے کی نہ ضرورت محسوس کی گئی نہ جرات کی گئی ۔صرف یہی نہیں بلکہ اکثر اوقات سرکاری تقریبات میں حکومتی شخصیات کو تضحیک کا سامنا بھی کرنا پڑجاتا ہے لیکن پھر بھی اردو کی بجائے انگریزی کو فوقیت دی جاتی ہے۔

سرکاری اور تعلیمی دونوں سطح پر اردو کو نظرانداز کر دینا قابلِ افسوس ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ انگریزی کو اہمیت نہ دی جائے،اسے بولا نہ جائے یا اسے نصاب تعلیم میں سے خارج کر دیا جائے یا جدید مضامین کو انگریزی میں نہ پڑھایا جائے یا انگریزی سکولوں پر پابندی عائد کر دی جائے ۔اس موضوع پر

مختلف مکتبہٴ ہائے فکر کے مختلف خیالات ہیں وزن دونوں طرف برابر رہی ہے اگر ایک طرف قومی زبان کی آسانی ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی زبان میں تحقیق کی آسان فہمی ہے اور بین الاقوامی طور پر موثر اور مستند رابطوں کی صحت بھی ہے لیکن آج کسی بھی اچھے یا عام نجی تعلیمی ادارے میں اردو کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے یہ زبان کم از کم اُس ہتک کی بھی سزاوار نہیں میں خود پاکستان کے بہترین نجی تعلیمی سسٹمز کے اداروں میں پڑھا چکی ہوں اور پڑھا رہی ہوں جہاں انگریزی کو اردو سے کہیں زیادہ پیریڈ دے دیئے جاتے ہیں اور اہمیت بھی اور پھر ہم سوال بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ آج کے بچوں کو اردو کیوں مشکل لگ رہی ہے جبکہ اگر اردو کو بطور مضمون بھی درست طریقے سے پڑھا دیا جائے تو ہمیں اپنے سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ اگر قومی زبان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا جائے تو اسے بین الاقوامی سطح پر بھی وہ اہمیت اور احترام ملنا شروع ہو جائے گا جو دوسری زبانوں کا ہے۔ دراصل عزت کی پہلی منزل گھر سے شروع ہوتی ہے لیکن ہم نے اپنی قومی زبان کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ خالص اردو بولنے والے کو اکثر تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے مثلاً ایک بار ایک محفل میں کرسی کہنے پر میری تصحیح یا تنقید کی گئی کہ میں ہمیشہ chair کو کرسی ہی کہتی ہوں جبکہ بولی اُس محفل میں اردو ہی جا رہی تھی اور ناقد خود سب سے کم پڑھی لکھی تھی۔ یہ کہنا بھی کہ انگریزی کو ملک سے ختم کر دیا جائے ایک عمل معکوس ہوگا کیونکہ ہمیں بین الاقوامی طور

پر بھی بہت سارے چیلنجز کا سامنا ہے جس کی براہ راست سمجھ جتنے زیادہ پاکستانیوں کو ہو گی اتنا بہتر ہو گا لیکن اردو کی اہمیت کو برقرار رکھنا بھی ایک چیلنج ہے کیونکہ زبان قومی وجود کی ضامن ہوتی ہے اور اس کا وجود تب ہی برقرار رکھا جا سکتا ہے جب ہم اسے خود اہمیت دیں گے اور صرف کتابوں اور کالموں میں نہیں بلکہ قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے مواقع پر بھی۔ پھر اس زبان میں اتنی شیرینی اور فصاحت و بلاغت ضرور ہے کہ سننے والے کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔اِن مواقع پر اردو کا استعمال ایک عام پاکستانی کو یہ احساس بھی دلا دیتا ہے کہ اُس کی حکومت اُس کو اپنے قومی معاملات سمجھنے کا حقدار سمجھتی ہے اور اس کی سمجھ اور فہم کے مطابق اُس کو بات بتائی اور سمجھائی جا رہی ہے۔پاکستان کے معاملات جاننے کا پہلا حق ایک عام پاکستانی کا ہے پھر امریکہ، برطانیہ اور کسی دوسرے انگریزی بولنے والے ملک کا۔ لہٰذا حکومت اس نکتے کو سمجھنے کی کوشش کرے اور کم از کم قومی معاملات میں اس اہمیت کو برتے بھی۔ یہ رویہ نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ہمیں اور ہماری زبان کو ایک مثبت اہمیت کا حامل بنا دے گا۔

جنوبی ایشیاء کا سنگین ترین مسئلہ

اقوام متحدہ میں بہت سارے مسائل پیش ہوئے اور حل بھی ہوگئے کئی اقوام کو اس کی مداخلت سے آزادی بھی مل گئی لیکن نہ ہوا تو کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ مذہبی بنیادوں پر ریاستوں کو آزادی ملی جس کی مثال ایسٹ تیمور ہے سوڈان کی 1.5 فی صد عیسائی آبادی کی فکر بھی کی گئی لیکن سالہا سال سے قربانیاں دینے کشمیری کبھی وہ اہمیت نہیں پاسکے جو اُن کا حق ہے حالانکہ ان کا مطالبہ بہت سادہ ہے اور وہ ہے آزادی۔ وہ جس ملک کے ناجائز قبضے میں ہیں وہ اُس سے آزادی چاہتے ہیں جس کے ساتھ نہ ہی تو ان کا ثقافتی رشتہ ہے نہ سماجی اور نہ ہی مذہبی اور ظاہر ہے مذہب نے ان تاریخ بھی ایک دوسرے سے جدا کردی ہے۔ اور یوں کوئی ایک بھی وجہ نہیں ہے جس کی بنا پر ایک بڑا علاقہ اور ایک بڑی آبادی اس کی مرضی کے خلاف غلام بنا کر رکھی جائے، نہ ان کا احتجاج نظر آئے، نہ قربانیاں درخور اعتنائ سمجھی جائیں اور نہ ہی ان کا بنیادی انسانی حق یعنی حقِ آزادی تسلیم کیا جائے۔ کیا اس لیے کہ وہ مسلمان ہیں یا اس لیے کہ بھارت کو ناراض کرنا مشکل ہے وہ بھی پاکستان کے لیے یا، اس لیے کہ اگر یہ مسئلہ حل ہوگیا تو بڑی طاقتوں کی اسلحے کی بہت بڑی منڈی ختم ہو جائے گی اور ان ملکوں میں ان کے مفادات بھی نہ رہیں گے۔

بہر حال جو وجہ بھی ہو مسئلہ کشمیر سرد خانے کی نظر ہو رہا ہے لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ کشمیری بھی اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ وہ تو اب بھی جانیں دے رہے ہیں، مائیں، بیویاں اور بیٹیاں اب بھی بین کر رہی ہیں اپنے شہیدوں کی لاشیں بھی اُٹھا رہے ہیں اور اپنے پیاروں کو گم بھی کر رہے ہیں جنہیں بھارتی افواج اٹھا لے جاتی ہیں اور جو خوش قسمت ہوتے ہیں اُن کی لاش مل جاتی ہے ورنہ وہ بھی نہیں ملتی۔

جب جب کشمیر میں حالات بھارت سرکار کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں وہ پاکستان پر دراندازی کا الزام لگا کر دنیا کی توجہ موڑ دیتا ہے حالانکہ کشمیریوں کی یہ جدوجہد پاکستان کے وجود سے بہت پرانی ہے۔ اس جنت نما خطے کے باسیوں کی بدقسمتی رہی ہے کہ اسے ظالم حکمرانوں نے اپنا نشانہ بنائے رکھا لیکن ان کی ہمت کہ وہ ان مظالم کے سامنے جھکے نہیں اور کشمیریوں نے کبھی اپنے شہیدوں کو بھلایا بھی نہیں بلکہ ہر نئی نسل نے اپنے سے پرانی نسل سے بہادری کا سبق سیکھا۔ ہر 13 جولائی کو کشمیری ایک ایسا ہی یوم شہدا مناتے ہیں جب آج سے بیاسی سال پہلے یعنی 1931 میں ڈوگرہ ڈی آئی جی چودھری رام چند نے جموں میونسپل پارک میں خطیب منشی محمد اسحاق کو عید کا خطبہ دینے سے روکا تو پورے کشمیر میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی اور پوری وادی میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے ہی ایک احتجاج میں عبدالقدیر نامی ایک نوجوان نے راجہ کے محل کی

اینٹ سے اینٹ بجانے کا نعرہ لگایا اور اس جرم کی پاداش میں اُسے گرفتار کر لیا گیا اور سری نگر کی سنٹرل جیل کو عدالت قرار دے کر اُس پر مقدمہ چلایا گیا۔کاروائی سننے کے لیے آنے والے لوگوں میں سے ایک نوجوان نے اٹھ کر بوقت ظہر، ظہر کی اذان دینی شروع کی ہی تھی کہ ڈوگرہ سپاہیوں نے اُسے شہید کر دیا،دوسرا نوجوان اذان دینے اٹھا تو اُسے بھی گولی مار دی گئی اور یوں اکیس نوجوانوں نے جام شہادت نوش کرتے ہوئے اذان مکمل کی اور تاریخ کا ایک ایسا باب بھی رقم کیا کہ جس پر آج بھی نہ صرف کشمیری بلکہ ہر مسلمان کو فخر ہونا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ کشمیری آج بھی اس دن کو فخر کے ساتھ مناتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ آج بھی نہ وہ آزادی حاصل کر سکے ہیں اور نہ ان کی زندگیاں محفوظ ہیں۔اگرچہ وہ اپنی جدوجہد میں ثابت قدم ہیں لیکن اور کتنی نسلیں خون کی اِن ندیوں سے پار ہوتی رہیں گی۔ دکھ اس بات کا ہے کہ پاکستان کی حکومتوں نے بھی رفتہ رفتہ کشمیر کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیا ہے۔اسی کشمیر کے مسئلے پر 1948 ، 1965 اور پھر 1999 میں جنگیں ہو چکی ہیں۔ اس مسئلے کو کچھ وقت کے لیے تو دبا دیا جاتا ہے لیکن اس کا مستقل حل نہ ہونے تک برصغیر میں پائیدار امن کا قیام ناممکن ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ مسئلہ جنگ کے ذریعے حل ہو لیکن جنگ کا خطرہ ہر وقت اسی مسئلے کی وجہ سے موجود رہتا ہے۔ کبھی کبھار اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کا کوئی نمائندہ یا کوئی مندوب پالیسی میٹرز کے طور پر اس مسئلے کا ذکر کر دیتا ہے ورنہ عملی طور پر کوئی قابل

ذکر کوشش اس مسئلے کے حل کے لیے دکھائی نہیں دیتی جبکہ کشمیری آج بھی اُسی طرح تہہ تیغ ہو رہے ہیں۔ 1989 میں جب تحریک آزادی کشمیر میں تیزی آئی تو اُس وقت سے لے کر 2012 تک 93,831 ہلاکتیں ہو چکی ہیں تقریباً ایک لاکھ کی اِن قربانیوں کے بعد تو آزادی کشمیریوں کا استحقاق بنتا ہے ایک لاکھ سے زیادہ بچے یتیم ہو چکے ہیں تقریباً تیس ہزار عورتیں بیوہ ہو چکی ہیں اور تقریباً دس ہزار عورتوں کی بے حرمتی کی جا چکی ہے، 2013 میں بھی اب تک 34 افراد شہید ہو چکے ہیں۔ اِن اموات میں ہزاروں پولیس کے زیر حراست ہوئیں ہیں اور گرفتاریوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ ان میں سے ایک ایک شہید اپنے پیچھے کتنے لواحقین چھوڑ رہا ہے کتنے بوڑھے والدین، معصوم بچے اور بیوہ عورتیں کشمیر کی وادی میں بھارتی مظالم کا کھلا ثبوت ہیں۔

مربع کلومیٹر کی اس مقبوضہ وادی میں کسی بڑے ملک کی فوج جتنی قابض 101,338 فوج موجود ہے اور سات لاکھ کی یہ فوج مختلف ریاستی قوانین کی ایسی ڈھال کے پیچھے چھپی ہوئی ہے جس میں ان کو ہر زیادتی کرنے کے باوجود مکمل قانونی تحفظ حاصل ہے اور افسوس اس بات کا ہے کہ یہ مظالم عالمی برادری کو نظر بھی نہیں آتے۔ کبھی کبھار ایمنسٹی انٹر نیشنل یا انسانی حقوق کی کسی دوسری تنظیم کی بھولے بھٹکے یہاں نظر پڑتی ہے ایک بے ضرر سی رپورٹ شائع ہوتی ہے اور بس، جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی قوتوں کو اس مسئلے کو حل کرنے کے

لیے بھارت پر دباؤ ڈالنا ہوگا۔ ایٹمی جنگ کی فکر تو کی جاتی ہے لیکن اُس کے سب سے بڑے ممکنہ محرک کو ختم کرنیکی کوشش نہیں کی جاتی۔ یہ تو غیروں کی بات ہے مگر سچ یہ ہے کہ اب تو خود ہماری حکومتیں بھی اس مسئلے کو وہ اہمیت نہیں دے رہیں جو اس کا حق ہے بھارت سے دوستی کی بات کرتے ہوئے اگر کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کی بھی بات کی جائے تو شاید ہم چھیاسٹھ سالوں کی قربانیوں کا حق ادا کر سکیں۔ بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے اور تجارتی روابط استوار کرنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہے کیونکہ امن سے رہنا ہر ایک کی خواہش کہ امن ہوگا تو ترقی اور سکون ہوگا لیکن اس سب کچھ کے لیے بدامنی کی سب سے بڑی وجہ دور کرنا ہوگی۔ امن کی تمام یک طرفہ تمام کوششوں کے باوجود بھی کیا بھارت کشمیر میں ریاستی دہشت گردی بند کرنے پر آمادہ ہے یا اُس نے ہماری سرحدی خلاف ورزیاں بند کردی ہیں اگر نہیں تو پھر مان لینا چاہیے کہ پہلے کشمیر کا مسئلہ حل ہوگا تو سارے مسائل خود بخود حل ہوتے جائیں گے۔ ہمیں صرف یوم شہدا منانے میں ہی کشمیریوں کا ساتھ نہیں دینا ہوگا بلکہ عالمی سطح پر کشمیر کی آزادی کے لیے آواز اٹھانا ہوگی اور اس مسئلے کو اقوام متحدہ کے سرد خانے سے بھی نکالنا ہوگا اور سفارتی سطح پر ایک ایسی مہم چلانا ہوگی کہ عالمی طاقتیں اور خود اقوام متحدہ بھارت کے پروپیگنڈا کے اثر سے نکل کر مسئلے کی حقیقت اور کشمیریوں کے حق کو تسلیم کرلیں کہ آزادی ان کا بھی اُتنا ہی حق ہے جتنا دوسری قوموں کا۔

ممبئی ہوٹل حملے بھارت نے خود کرائے

نومبر 2008 کو ممبئی میں تاج محل ہوٹل پر مسلح گروہ نے حملہ کر دیا اور بھارت نے حسب معمول الزام پاکستان کے سر پر تھوپ دیا۔ اجمل قصاب اور اس کے ساتھیوں کے سمندری راستے کا نقشہ تک بھارتی میڈیا نے چیخ چیخ کر بتا دیا۔ بھارت میں تو کسی کو سوئی چبھے تو الزام پاکستان اور آئی ایس آئی کے سر دھرنا کوئی انہونی بات نہیں لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ اپنے میڈیا نے تو ضلع اوکاڑہ میں اجمل قصاب کا گھر، خاندان اور پتہ بھی ڈھونڈ لیا، ٹیلی وژن پر اس کے گھر اور گاؤں کے مناظر بھی دکھا دیئے ۔ میں اور میرے جیسے کچھ گمنام کالم نگار بولتے اور لکھتے رہے کہ ڈرامے میں کئی جگہ جھول موجود ہے لیکن میڈیا تو میڈیا ہمارے کئی نامی گرامی سیاستدان بھی یہ الزام پاکستان کے سر ڈال کر ''ملک دوستی'' کا ثبوت دیتے رہے۔ خود ہمارے داستان گو وزیر داخلہ محترم رحمٰن ملک نے تو واقعے سے پہلے اجمل قصاب اور اس کے ساتھیوں کی منصوبہ بندی اور سفر کی یوں منظر کشی کی کہ ہر ایک نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا محسوس کیا۔ ہماری حب الوطنی اور قومی دردمندی کی اس کی بڑی مثال کوئی ہو ہی نہیں سکتی لیکن اس وقت دوستی اور امن کی آشا کا جو بخار چڑھا اور پڑوسی کو خوش کرنے کی جو کوشش کی گئی اس میں نہ تو قومی

مفاد نظر آیا نہ ملک کی نیک نامی اور بد نامی کی پرواہ کی گئی ۔ سراغ رساں ایجنسیوں اور انٹیلیجنس اداروں کی رپورٹس، تحقیقات اور صفائیوں کو پس پشت ڈال کر میڈیا اینکرز اپنی اپنی رپورٹس مرتب کر رہے تھے اور کچھ ایسے تجزیے کر رہے تھے جیسے ہر صورت پاکستان کو مجرم ثابت کرنا ہے تاکہ عظیم صحافت کا بول بالا ہو۔ اب جب بھارت کے ایک سیکریٹری ستیش ورمانے عدالت میں یہ بیان دیا کہ ممبئی حملے بھارت نے خود کرائے کیونکہ اُس نے دہشت گردی کے خلاف قوانین کو مضبوط کرنا تھا اور اس سے پہلے پارلیمنٹ پر حملہ بھی بھارت کی اپنی کارستانی تھی لیکن پھانسی افضل گرو کو دی گئی جس کو سزا دیتے ہوئے عظیم جمہوریت بھارت کی انصاف پسند سپریم کورٹ نے اعتراف کیا کہ وہ اس پر امن شخص پر کوئی الزام ثابت نہیں کر سکا لیکن عوامی دباؤ کے تحت اسے پھانسی دی جاتی ہے۔ یعنی انصاف کی اس سے اعلیٰ مثال بھی کوئی ہو گی کہ بے گناہی کا اعتراف بھی اور موت کی سزا بھی اور حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ انسانی حقوق کی کوئی عالمی تنظیم تو نہیں بولی خود ہماری کوئی تنظیم بھی نہ بولی، نہ ہی کوئی شخصیت گویا ہوئی کہ ایک بے گناہ انسان کیوں مارا گیا کیونکہ اسے لشکر طیبہ، پاکستان اور آئی ایس آئی کے نام پر مارا گیا تھا اور یہ سارے نام اِن شخصیات اور اداروں کے لیے پسندیدہ نہیں ہیں ۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہیں جس میں بھارت نے اپنے ہی شہریوں کو استعمال کیا اور پھر پاکستان کے نام پر انہیں ہلاک کیا اگرچہ اکثر ایسا اس نے اپنے مسلمان شہریوں کے ساتھ کیا

لیکن جہاں اُسے ضرورت پڑی ہندو بھی استعمال کیے گئے اور سکھ بھی اور الزام بڑی سہولت سے پاکستان پر لگا دیا۔ 8 ستمبر 2001 کو مہاراشٹر کے ضلع ناشک کے ما لیگائوں میں کئی دھماکے کئے گئے جس میں مختلف رپورٹس کے مطابق تیس سے چالیس افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً125 زخمی۔اِن دھماکوں کا الزام بھی آئی ایس آئی پر لگا کر نو مسلمان نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا جو سالہا سال سے جیل میں ہیں۔ابھی حال ہی میں چار ہندو نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا ہے جو کہ اصل مجرم بتائے جارہے ہیں پھر بارہ تیرہ سال کی سزائے قید کس جرم کی پاداش میں، کیا اقلیتوں کے حقوق کی کوئی تنظیم یا شخصیت یا لہنکر اس پر بولنا پسند کریں گے ۔کچھ واقعات یہاں یاد دہانی کے لیے بیان کرنا ضروری ہیں اور ایسے ہی ایک اور واقعے میں 15 جون 2004 کو احمد آباد پولیس نے ایک انیس سالہ نوجوان لڑکی عشرت جہاں کو مزید تین اشخاص کے ہمراہ سرراہ گولی ماردی تھی اور الزام لگایا گیا کہ وہ لشکر طیبہ کے لیے کام کرتی ہے اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہیں تھی اگرچہ اب اُس کی زندگی تو واپس نہیں آسکتی لیکن اُس کو مارنے والے پولیس اہلکار کو کیا سزائے موت نہیں دی جانی چاہیے اور کیا اس الزام کا کوئی ہرجانہ بھی ہوگا جو پاکستان پر لگایا گیا لیکن بھارت کو الزام لگانے اور ہمیں سہنے کی عادت ہو چکی ہے اگر خود ہم اتنے مضبوط اور مستحکم ہوتے تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اپنا ہر جرم ہمارے کھاتے میں ڈالتا، ہمیں دہشت گرد ریاست ثابت کرتا۔

ہماری معیشت اور تجارت کا بیڑا غرق کرتا۔ بین الاقوامی طور پر ہمیں تنہا کرنے کی کوشش کرتا اور ہماری سرحدوں کے اندر اپنے دہشت گرد داخل کرتا لیکن وہ دھڑلے سے ایسا کرتا ہے اس نے اپنے ثابت شدہ اور اقبالی دہشت گرد سربجیت سنگھ کو جس اعزاز کے ساتھ دفن کیا وہ فسادی ہندو ذہنیت کی درست ترین عکاسی ہے۔ لیکن بین الاقوامی سطح وہ واویلا یہ کرتا ہے کہ پاکستان دراندازی کرکے بھارت میں دہشت گردی کرتا ہے اس کے آندھر پردیش کے وزیر داخلہ جانا بڈی نے مئی 2007 میں مکہ مسجد حیدر آباد دکن میں ہونے والے دھماکوں کے بارے میں بھی یہی کہا تھا کہ یہ سب کچھ جماعتہ الدعوۃ اور لشکر طیبہ نے آئی ایس آئی کے کہنے پر کیا اس موقع پر نماز جمعہ کے چودہ نمازی شہید ہوئے تھے جن میں سے پانچ پولیس کی فائرنگ سے شہید ہوئے۔ یہ تو صرف چند ایک واقعات تھے جن کا تانا بانا بھارت سرکار نے بُنا اور الزام آئی ایس آئی اور پاکستان پر لگایا گیا لیکن ممبئی حملہ اور پارلیمنٹ پر حملہ کرواکے اس نے اپنی فوجیں لاکر سرحدوں پر کھڑی کر دیں تھیں اور دنیا تو دنیا خود ہمارے سیاستدانوں تک کو باور کرادیا تھا کہ مجرم پاکستان اور اسکی ایجنسیاں ہی ہیں۔ آج جب کہ خود گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھائی ہے تو بھارت کا میڈیا چپ سادھے بیٹھا ہے اور بقول معروف بھارتی صحافی کلدیپ نئیر کے بھارت میں تو کوئی شور نہیں مچا۔ ظاہر ہے وہ پاکستانی میڈیا جتنا" اوور سمارٹ" نہیں ہوگا اور دنیا میں نام اور پیسہ کمانے سے زیادہ اپنا قومی مفاد عزیز رکھتا ہوگا لیکن ہمارے کچھ

بڑے چینلز کے بھی زبان کو تالے لگ چکے ہیں اور آج جب دنیا کے سامنے اصل دہشت گرد کو بے نقاب کرنے کا موقع ہے تو وہ شاید اس کہانی کو کوئی نیا موڑ دینے کے لیے کسی نئی ''تحقیقاتی رپورٹ'' کی تیاری میں مصروف ہیں تاکہ ورما اور مانی کو کسی نہ کسی طرح پاکستانی نہیں تو پاکستانی ایجنٹ ہی ثابت کر سکیں جنہوں نے آئی ایس آئی اور پاکستان کے کہنے پر عدالت میں بیان دیا ہو۔

میڈیا گروپ سے بھی زیادہ معنی خیز خاموشی حکومت پاکستان کی ہے جس نے اس بیان کا کوئی نوٹس نہیں لیا کیونکہ خود وزیراعظم کو اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی بھارت سے دوستی کی فکر لاحق تھی ،اعتراض دوستی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ بھارت خود اپنے ملک میں دہشت گردی کرے اور الزام ہمیں دے اور ہماری معیشت ، صنعت اور ترقی کا جنازہ نکالے اور ہمارے ملک میں بھی دراندازی کرے اور دنیا کے سامنے ہمیں درانداز ثابت کرے۔ بقول کلدیپ نئیر کے ہمیں پیچھے کی بجائے آگے دیکھنا چاہیے تو کیا بھارت جو چاہے کرے اور ہم پیچھے نہ دیکھیں۔ اُس کی دراندازی نے ہی پاکستان توڑا تھا تو کیا ہماری ''امن کی آشا'' مہم کے پیچھے ہم خدانخواستہ پھر کوئی سانحہ برداشت کریں لیکن پڑوسی سے دوستی کریں۔ دوستی اور امن بہت ضروری ہے لیکن پہلے دشمنی کی وجوہات تو ختم کی جائیں پڑوسی کو یہی سکھا دیا جائے کہ ''جیو اور جینے'' دو

کا اصول ہر دو طرف سے بروئے کار لانا چاہیے ۔ بھارت سے زیادہ ہمیں اپنے پالیسی سازوں ، میڈیا اینکرز اور سیاستدانوں کو یہ بات بتانی اور سکھانی ہوگی کہ دوستی اور امن کی آشا اپنی جگہ لیکن ہماری پہلی ترجیح ہمارا ملک ہونا چاہیے اور ان کی یاد داشت کے لیے عرض ہے کہ ہمارے ملک کا نام پاکستان ہے الہذا جب بھی بھارت پاکستان کا نام لے ، اس کو نقصان پہنچانا چاہے اور اسے بدنام کرے تو سمجھ لیں کہ آپ کی اپنی یعنی ذاتی بدنامی ہے اور اگر آپ نے یہ سمجھ لیا تو پاکستان پر الزام لگانا تو درکار کوئی ایسا سوچنے کی غلطی بھی نہیں کرے گا۔

ڈی ایچ اے اور ای او بی آئی۔۔۔ کرپشن کی ایک اور کہانی

ہم بحیثیت قوم اس وقت کئی طرح کے مسائل کا شکار ہے جن میں سے کچھ تو یقینا غیروں کی مسلط کردہ ہیں جن سے پوری قوم متاثر ہے لیکن ہمارے اپنے پیدا کردہ مسائل بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ جن میں سب سے بڑا مسئلہ اکثریت کے خیال میں کرپشن ہے بلکہ میں تو اسے ''ام المسائل'' خیال کرتی ہوں کیونکہ اس نے پورے معاشرے کو جس طرح جکڑا ہوا ہے اس نے خرابیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چلا رکھا ہے جس میں اوپر سے نیچے تک ہر ایک بقدر ہمت اوست کے مطابق مصروف عمل ہے اور شخصی زندگی سے لے کر ریاستی عوامل تک اس کے زیر اثر ہیں۔ حق بات یہ ہے ہم بحیثیت قوم راشی ترین قوم کا خطاب بڑی خوشی سے قبول کر چکے ہیں اور ہر طرح سے اس عالمی ٹائٹل کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ہماری اکثریت ایک دوسرے کی کرپشن کے متاثرین ہیں اور شاید کچھ ایسے بھی ہیں ہم میں سے، جو اس عفریت سے نجات حاصل کرنے کے لیے دل سے کوشاں ہیں لیکن ان کوششوں کو کامیابی تب مل سکے گی جب اسے کرنے والا اپنی راہ درست رکھے۔ آج کل میڈیا میں جن بڑے بڑے کرپشن کیسز کا ذکر خیر چل رہا ہے اُن میں ایک ای او بی آئی اور ڈی ایچ اے کا کیس ہے۔ ڈی ایچ اے ایک ادارہ ہے جو ملک میں معیاری رہائشی سکیمیں بنانے کے لیے خاصی اچھی شہرت رکھتا ہے اور ای او بی

آئی ریٹائرڈ پرائیوٹ ملازمین کے لیے کام کرنے والا ادارہ ہے اس ادارے نے ڈی ایچ اے سے بائیس ارب روپے کے کمرشل پلاٹس خریدے، یہ سودا ستمبر 2011 میں کیا گیا اور بقول ڈی ایچ اے کے یہ پلاٹ سستے داموں دیے گئے جبکہ ای او بی آئی کے مطابق یہ زمین زیادہ قیمت پر دی گئی یعنی ترقیاتی کام ہونے کے بعد کی قیمت پر جبکہ یہ ساری زمین بنجر اور بیابان پڑی ہوئی ہے اور کوئی ترقیاتی کام نہیں ہوا۔ بات عدالت تک پہنچی اور عدالت نے فیصلہ دیتے ہوئے ڈی ایچ اے کو دو دن کی مہلت دیتے ہوئے کہا کہ وہ یہ رقم ای او بی آئی کو واپس کرلے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کے اثاثے ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ عدالت کے فیصلے کے بعد بھی ڈی ایچ اے اپنے موقف پر قائم ہے کہ یہ کمرشل پلاٹس مکمل طور پر قابل استعمال ہیں یہاں ترقیاتی کام ہو چکے ہیں اور اسے کم قیمت پر فروخت کیا گیا ہے۔ معاملہ جو بھی ہے لیکن عدالت کو فیصلہ دیتے وقت کچھ باتوں کا خیال ضرور رکھنا چاہیے تھا کہ ڈی ایچ اے سے ہزاروں افراد کا رزق وابستہ ہے اور رمضان اور عید کے مہینوں میں انہیں اپنے اور اہل خانہ کے لیے رقم درکار ہوگی جس کا انکی تنخواہ کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور اگر ادارے نے کوئی غلط کام کیا بھی ہو تو اُس میں ان تنخواہ دار ملازمین کا نہ تو مشورہ شامل ہوگا نہ معاونت یہ عام آدمی تو ویسے ہی مہنگائی کا مارا ہوا ہے جس کی تنخواہ بمشکل اُس کی ایک ماہ کی ضروریات پوری کر سکتی ہے اور چھوٹے ملازمین تو یقینا مہینے کے آخر میں

کھاتوں پر چلتے ہیں اور اگلے مہینے کی تنخواہ میں سے ایک بڑا حصہ پرچون والے کا پچھلے ماہ کا بل ادا کرتے ہیں لہذا اُن کا لحاظ اور خیال انتہائی ضروری ہے کیونکہ انصاف سب کے لیے برابر ہونا چاہیے ۔ اور یہ مسئلہ اتنا کنجلگ بھی نہیں ہے کیونکہ زمین اکی پلاننگ اور وہاں ہوئے ترقیاتی کاموں کا جائزہ لے کر عوام کو اس سے آگاہ کیا جا سکتا ہے اور یوں مدعی اور مدعا علیہ میں سے درست اور غلط کا بالکل صحیح اور مبنی بر انصاف تعین کیا جا سکے گا۔

ڈی ایچ اے سے بہت سے لوگوں کو بہت سی شکایتیں ہونگی لیکن اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ ترقیاتی کاموں کے لیے لی گئی رقم سے اپنی ہاوسنگ سوسائیٹیوں کی بہتری پر خرچ کرتے ہیں اور اپنے کسٹمرز کو صاف ستھرا ماحول اور ضروریات مہیا کر کے انہیں مطمئن رکھتے ہیں لیکن اگر اس کے اثاثے منجمد ہونگے اور اُس کے لیے تنخواہیں دینا ممکن نہ رہیں گی تو وہ اپنے معیار کو کیسے قائم رکھ سکے گا اور کچھ ہی عرصے میں ان سوسائیٹیوں کے حالات بھی کسی بھی عام ہاوسنگ سکیم جیسے ہو جائیں گے اور ایک تجارتی عمل بھی رک جائے گا۔

اس معاملے کی تحقیقات کو اگر کسی تعصب کے بغیر از سر نو کیا جائے تو شاید

معاملے کو کسی بہتر انداز میں سلجھایا جا سکے اور نہ ڈی ایچ اے سکیموں کے رہائشی متاثر ہوں اور نہ ہی ایک تنخواہ دار جو صرف اور صرف اپنی رزق روزی کے لیے اس ادارے سے وابستہ ہیں اور نہ اس کے فیصلوں میں شامل ہیں نہ بزنس میں۔ ہاں طرفین میں جو بھی مجرم ہو اُس کو ضرور سزا دی جانی چاہیے کیونکہ کرپشن پیسے کی صورت میں ہو یا کسی اور فعل اور عمل کی صورت میں اس کو معاشرے سے نکالنا ہوگا اور ذمہ داروں کو سزا بھی دینا ہوگی لیکن اس کام کو اس قدر شفاف طریقے سے ہونا چاہیے کہ سزا صرف ذمہ دار کو ملے اور چاہے وہ کوئی بھی ہو جس ادارے میں ہو اور جس عہدے پر متمکن ہو تا کہ ملک کو کرپشن کی عفریت سے نجات دلائی جا سکے اور ایک پاکیزہ معاشرے کی تشکیل کو ممکن بنایا جا سکے۔

اپنی ثقافت پر مغرب زدہ میڈیا کا یلغار

ٹیکنالوجی کی دوڑ نے دنیا کی شکل کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ جنگ ، نیزہ ، تلوار ، بم ، دھما کے ، ہتھیار یہ سب ٹیکنالوجی کی خوفناک ترین شکلیں ہیں جواب بھی دنیا میں موجود ہیں اور دنیا کو تہہ و بالا کر رہی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ طاقتور قوموں کی طرف سے ایک اور ایسی جنگ بھی چھیڑ دی گئی ہے جو بندوق تو نہیں اٹھاتی لیکن پھر بھی بڑی کامیاب سے لڑی جا رہی ہے اور یہ جنگ یقیناً زیادہ خطرناک ہے کہ یہ قوموں کے نظریات تبدیل کر رہی ہے اور یوں مغلوب اور کمزور قوموں کی جڑیں کاٹ رہی ہے۔ اس جنگ نے قوموں کے نظریات ، انکی اقدار حتیٰ کہ ان کے اعمال تک بدل دیئے ہیں وہی فعل جو قابل اعتراض تھا قابل فخر بنتا جا رہا ہے بلکہ میں تو کہوں گی کہ اس نے مذہب تک کو نہیں چھوڑا کہ جو افعال مذہب میں قابل اعتراض تھے ان کو یوں عام کر دیا جیسے وہ کبھی قابل اعتراض رہے ہی نہ ہوں اور میڈیا کی دوڑ نے تو اگر جغرافیائی سرحدیں نہیں مٹائیں تو نظریاتی سرحدوں کو ایک ایسا دھچکا ضرور لگا دیا ہے کہ اب تو خوف آتا ہے اور لگتا ہے کہ یہ بھی کوئی دم کی بات ہے اور مٹ جائیں گی ۔ آج کل ٹیلی وژن پر جو طوفان بد تمیزی مچا ہوا ہے اُس نے تو معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بناسپتی کے ایک اشتہار کو لیجئے جو رمضان

کے مبارک مہینے کے پس منظر میں بنایا گیا ہے اور ماڈلز یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ چلو اُس میراث کی تلاش میں نکلتے ہیں جو مسلمانوں کی اصل پہچان تھی اور یہ میراث مختلف اسلامی ممالک میں انتہائی مغرب زدہ لباس میں ملبوس خواتین اور نوجوان لڑکیوں کو دکھا کر پانے کی نوید سنائی جا رہی ہے۔ لباس کسی بھی معاشرے کی اولین پہچان ہے کیونکہ کسی بھی غیر کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑتی ہے اور اسلام میں لباس کا مقصد زیب وزینت اور ستر پوشی دونوں ہے اور یوں ایک باحیا اور پاکیزہ معاشرے کی تشکیل کا مقصد پورا کرنا ہے لیکن ہمارے آج کے ''مغرب زدہ میڈیا'' نے جہاں اور کئی قومی معاملات میں قومی وقار کی دھجیاں بکھیر دی ہیں وہی اپنے لباس کو بھی مذاق بنا کر تار تار کر دیا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ترنگ'' دودھ والوں'' کے تعاون سے جب ایک نجی چینل نے کچھ پرانی فلموں کی ری میک کی تو پہلے اس کام کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے گئے اور پھر ان کے حوالے سے ایوارڈز کی ایک تقریب منعقد کی گئی اس پروگرام کو یقیناً کچھ شریف خاندانوں نے بند کر دیا ہوگا کیونکہ جو ناچ گانا اس میں پیش کیا گیا اور جن لباسوں کے ساتھ پیش کیا گیا وہ شرافت کی کسی تعریف پر پورا اترتے ہیں نہ اسلام کی اور نہ پاکستانیت کے بلکہ مشرقیت کے بھی نہیں۔ پھر تماشائی عورتوں نے جو نیم عریاں لباس پہنے تھے معلوم نہیں کہ وہ کس معاشرے کے عکاس تھے۔ ساڑھی ایک معقول لباس ہے لیکن اس کی تراش خراش کا فائدہ اٹھا کر اس کو خاصے نا معقول طریقے سے پہلے بھی

پہنا جاتا تھا اور اب تو انڈین فلموں اور ڈراموں کے زیر اثر اس کو بیہودگی کا سمبل بنایا جا رہا ہے اس پروگرام میں خواتین نے جس طرح سے اس لباس کو پہنا اس کی کوئی توجیہہ پیش کرنا شاید ان پہننے والوں کے لیے بھی ممکن نہیں۔اِن خواتین کے ملبوسات کے بارے میں مزید کھل کر بات کرنے سے مجھے خود اپنی بات ناشائستہ ہو جانے کا خوف ہے اس لیے آیئے لباس سے ہٹ کر ذرا شرکائ کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے لیں تو یہاں سر ایک دفعہ پھر شرم سے جھک جاتا ہے کہ شرکائ خواتین اور مردوں کا ایک دوسرے سے گلے ملنا بلکہ بوسہ بھی لے لینا کیا ایک اسلامی نہ سہی مسلمان معاشرہ اس کی اجازت دیتا ہے اور اگر اس سے بھی آپ نیچے آئیں تو اس کی اجازت تو کوئی مشرقی معاشرہ بھی نہیں دیتا تو پھر آخر ہم کس معاشرے میں رہتے ہیں اور کس احساس کمتری میں بتہلائ ہیں اور آخر ہم دنیا کو اپنے بارے میں کونسا تاثر دینا چاہتے ہیں۔ ''روشن خیال پاکستان'' اور'' بے رہرو پاکستان'' میں فرق ہونا اور رکھنا بہت ضروری ہے۔ میڈیا معاشرے پر بہت زوردار طریقے سے اثرانداز ہوتا ہے جس کا ثبوت آج کی نوجوان نسل کا لباس اور طور طریقہ ہے۔ جس پر وہ رنگ غالب آرہا ہے جو میڈیا پر دکھایا جارہا ہے نہ کہ وہ جو ان کے بزرگوں کا تھا۔ تبدیلی نہ تو بری چیز ہے نہ اس سے بچائو ممکن ہے کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں لیکن اس دوڑ میں اپنے معاشرے اور روایات حتیٰ کہ مذہب کا بھی قتل عام کسی بھی طرح روانہیں اور اگر میڈیا صرف اپنے اثاثے بڑھانے کی خاطر اپنی ریٹنگ میں اضافہ

کرنے کے لیے اور ہر چینل دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے اخلاقیات کی تمام حدود پار کر رہا ہے اور بڑی آزادی سے کر رہا ہے تو آخر ہماری حکومت کہاں سوئی ہوئی ہے اور پیمرا کے ذمہ دار کس چیز کی تنخواہ لے رہے ہیں۔ عدالتیں کیوں اس پر خاموش ہے کیا یہ عام آدمی کی دلچسپی کی بات نہیں ہے یا قومی اہمیت کی نوعیت کا معاملہ نہیں یا پھر ان حرکات سے ہمارے بڑوں کے مفادات پر زد نہیں پڑتی یا ہم نے اپنی کمتر حیثیت کو بھی تسلیم کر لیا ہے اور ثقافتی جنگ میں اپنی شکست بھی تہہ دل سے مان لی ہے۔ ہم تو اپنے بچوں کو بھی کارٹون کے نام پر وہ کچھ دکھا رہے ہیں جس کا نہ تو ہمارے معاشرے سے کوئی تعلق ہے نہ اقدار سے اور نہ اخلاق سے۔ فیشن شوز سٹیج پر ہوں تو ایک مخصوص طبقہ ہی دیکھتا ہے لیکن ہمارا میڈیا ان بیہودہ ملبوسات کو پورے ملک کے سامنے کر دیتا ہے اور ان کی شان میں جو تعریفی کلمات بولے جاتے ہیں ان کا تو کوئی جواب نہیں اور ہر لباس کو مشرق و مغرب کا حسین امتزاج کہہ کر معلوم نہیں کیا ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بہر حال میڈیا تو یہ سب کر ہی رہا ہے لیکن سب سے بڑی ذمہ داری تو حکومت کی ہے کہ اگر وہ اس معاملے کو سنجیدگی سے لے تو معاشرے کو دو انتہاؤں میں بٹنے سے روک دے ورنہ نہ صرف ہم شدت پسندی کی جس آگ میں جل رہے ہیں اُس میں مزید اضافہ ہوگا بلکہ ہم اپنی قومی شناخت بھی مکمل طور پر کھودیں گے اور عدالتیں

بھی جہاں کئی اداروں کو کئی باتوں کے لیے پابند کرتی ہیں وہیں اگر وہ میڈیا کو بھی ایک ضابطۂ اخلاق کا پابند کر دے تو شاید ہم طمع، حرص، لالچ، بناوٹ، کرپشن اور بے راہروی کے مسائل پر قابو پالیں گے جو اور ذرائع کے ساتھ ساتھ اس ذریعے سے بھی بڑی تیزی سے معاشرے میں سرایت کرکے اس کا حلیہ بگاڑتے جا رہے ہیں۔

بلوچستان نصف پاکستان

بلوچستان پاکستان کے 43% سے زیادہ رقبے یعنی تقریبا نصف پر پھیلا صوبہ ہے، معدنیات سے مالا مال ہے، گوادر کی بندرگاہ اسی صوبے کا حصہ ہے، پھلوں کے باغات بھی ہیں اور محنت کش لوگ بھی ہیں لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی یہ صوبہ غیر ترقی یافتہ ہے اور غیر مطمئن بھی۔ غیر مطمئن ہونے کی اصل وجہ پسماندگی ہے جس سے یہ صوبہ دو چار ہے اور اس صورتحال کو سیاسی مفادات کے لیے مسلسل استعمال کیا جارہا ہے۔ ہمارا میڈیا اور ہمارے دانشور اس صوبے میں ہونے والے کسی بھی واقعے کو یوں پیش کرتے ہیں جیسے باقی کے پورے ملک میں تو امن اور چین ہے نہ ہی دھماکے ہیں نہ ٹارگٹ کلنگ ہے نہ بھتہ خوری ہے نہ ہی تعلیمی پسماندگی ہے نہ ہی صحت کے مسائل ہیں نہ روٹی کے۔ اگر یہ مسائل ہیں تو صرف بلوچستان میں ہیں اور یوں وہاں احساس کمتری کو مزید ہوا دے دی جاتی ہے۔ مسائل کی نشاندہی ضروری ہے تاکہ اُن کو حل کیا جاسکے نہ کہ ان کو یوں اُچھالا جائے کہ ملک دشمن عناصر اُن سے فائدہ اٹھائیں اور ملک دشمن سرگرمیاں سرانجام دے سکیں۔ اس وقت پورا ملک دہشت گردی کا شکار ہے خاص کر خیبر پختون خواہ اور کراچی لیکن ہمارے تجزیہ کار کوئٹہ کے معاملات کو مزید پیچیدہ بنا کر وہاں کے احساس محرومی کو مزید بڑھا دیتے ہیں اور دکھ اس بات کا ہے کہ مسائل کے حل

کے لیے یہ بڑے دماغ اور تھنک ٹینک اُس طرح سے نہ سوچتے ہیں اور نہ کام کرتے ہیں جیسا کہ کرنا چاہیے بلکہ انہیں اکثر اوقات صرف اچھال دیا جاتا ہے اور بس۔

نئی جمہوری حکومت کے آنے کے بعد عوام بجا طور پر یہ امید کر رہے ہیں کہ ملکی معاملات میں بہتری آسکے گی اور بلوچستان کے مخصوص حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسی حکمتِ عملی اپنائی جائے گی کہ وہاں نا امیدی اور مایوسی کا خاتمہ کیا جاسکے۔ بلوچ فطرتاً اپنی زمین اور روایات سے محبت کرنے والے لوگ ہیں اور وسیع علاقے کے مالک ہونے کی وجہ سے وسیع النظر بھی ہیں۔ ہم سب کو اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ قدرتی خزانوں سے معمور ہونے کے باوجود بلوچستان کی ترقی کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جو دی جانی چاہیے تھی اگرچہ اس میں وہاں کے مخصوص قبائلی پس منظر کا بھی ہاتھ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ذمہ داری مرکزی حکومت ہی کی بنتی ہے کہ وہ ملک کے ہر حصے کے عوام کو قومی امنگوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے وفاق اور ملکی سالمیت کا ایک پر اثر حصہ بنائے۔ اُن کے اپنے علاقے کے فیصلے تو ظاہر ہے کہ اُن کی خواہشات کے مطابق ایسے کیے جائیں کہ وہ پورے ملک کی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کر سکیں لیکن ساتھ ہی ہر صوبہ ملکی فیصلوں میں اس طرح شامل ہو کہ کمتری کا کوئی احساس پیدا ہی نہ ہو لیکن دکھ اور افسوس اسی بات کا ہے کہ ہمارے ملک میں مارشل

لائی ہو یا جمہوریت ملکی فیصلے ذاتی خواہشات یا پھر پارٹی مفادات کے مطابق ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مصیبت، آفات ناگہانی اور بیرونی جارحیت کے مقابلے پر ڈٹ کر اور یکجان ہو کر کھڑی ہونے والی یہ قوم اپنے معاملات پر اتفاق نہیں کرتی۔

حالیہ انتخابات کے بعد بلوچستان میں اگر پارٹی اکثریت اور ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر ایک ایسی حکومت کو موقع دیا گیا ہے جو پورے بلوچستان کے لیے قابل قبول ہے تو اس جذبے کو قائم رکھنا چاہیئے۔ وزیراعلیٰ ڈاکٹر مالک ایک سلجھے ہوئے انسان اور اچھی شہرت اور شخصیت کے مالک ہیں۔ مکران سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر مالک کسی قبیلے کے سردار نہیں لیکن ایک قابل احترام خاندان کے فرد ہیں اور اب تک بلوچستان کی صوبائی حکومتوں اور سینٹ کی سٹینڈنگ کمیٹیوں کے ممبر کی حیثیت سے خاصے مثبت کردار کے حامل رہے ہیں۔ بطور صوبائی وزیر تعلیم انہوں نے بلوچستان میں بالعموم اور مکران میں بالخصوص قابل قدر کام کیا اور اب بھی اپنے بجٹ میں تعلیم کی مد میں اضافہ کیا۔ مجھے بلوچستان میں جتنا گھومنے کا موقع ملا مجھے وہاں اچھے سکولوں اور اچھی تعلیم کی شدید کمی نظر آئی جس کو دور کرکے وہاں کے نوجوانوں کو قومی دھارے میں مؤثر طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ بلوچستان کی صوبائی حکومت نے اپنے لیڈر کی سرکردگی میں ایک مثبت سوچ

کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور اس جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے تمام قومی اداروں کو اُس کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا اور نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے ملک میں اس رویے کو فروغ دینا ہوگا۔ بلوچستان میں خاص کر مسخ شدہ لاشوں، لاپتہ افراد اور فرقہ وارانہ تشدد پر توجہ دینی ہوگی اور اِن جرائم کے اصل مجرموں کو تلاش کرنا ہوگا اور اس کی وجوہات بھی ڈھونڈنی ہوں گی تاکہ اِن مسائل کا تدارک کیا جاسکے۔ ہماری حکومت اور خفیہ ادارے بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ بلوچستان میں بیرونی ہاتھ حالات خراب کرتا ہے تو اُس ہاتھ کے کارندوں کو بھی عوام کے سامنے بمعہ ثبوتوں کے لانا ہوگا تاکہ بلوچ عوام دوست دشمن کی پہچان کر سکیں۔ بلوچستان کوئی الگ خطہٗ زمین نہیں ہے بلکہ یہ زمین کے اُسی ٹکڑے کا حصہ ہے جس کا نام پاکستان ہے ان کی بقائی ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اگر یہاں کوئی مسخ شدہ لاش ملتی ہے تو وہ پشاور یا وزیرستان میں بم دھماکے میں ناقابل شناخت لاش سے کم تکلیف دہ نہیں ہوتی اور اگر یہاں کا کوئی نوجوان کسی عالمی مقابلے میں فاتح قرار پاتا ہے تو اُس کی خوشی کراچی میں کوئٹہ سے کم نہیں منائی جاتی اور نہ کوئی بلوچ سپاہی سرحد پر کسی پنجابی جوان سے کم ڈٹا رہتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا کہ بلوچستان میں مسائل ہیں اور گھمبیر ہیں لیکن لاینحل نہیں، انہیں حل کرنے کے لیے صرف خلوص کی ضرورت ہے۔ نئی صوبائی

اور قومی حکومت کو بلوچستان کی ترقی اور احساس یکجہتی پر کام کرنا ہوگا اور خلوص دل سے کرنا ہوگا۔اسے احساس تحفظ دینا ہوگا اور اس احساس کے لیے پولیس، لیویز، ایف سی اور فوج کو صوبائی حکومت کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔ تعلیم کے شعبے کی طرف خصوصی توجہ دینا ہوگی تاکہ عدم برداشت کو بھی ختم کیا جاسکے اور نوجوانوں کو اپنے پاؤں پر بھی کھڑا کیا جاسکے۔ صوبائی حکومت کی تو جو ذمہ داری ہے وہ ہے ہی لیکن بہت ساری ذمہ داریاں وفاقی حکومت اور میڈیا کو بھی پوری کرنی ہونگی۔ وفاقی حکومت کو معمول میں ٹھوس اقدامات کرنا ہونگے عارضی پیکجز کا اعلان نہیں اور میڈیا کو کچھ خوش کن پہلو تلاش کرکے انہیں قوم کے سامنے لانا ہوگا تاکہ دوسرے بھی ان اچھی باتوں سے متاثر ہوکر بھلائی کے مددگار بن جائیں آخر اپنا لائحہ عمل تبدیل کرنے میں حرج کیا ہے۔ ہم آخر بلوچستان کو مشرقی پاکستان سے کیوں جوڑتے ہیں ،کیا زمینی حقائق اور جغرافیائی فاصلے ہی ایسے نہیں جو اِن معاملات کو مختلف بنا دیتے ہیں۔ اللہ ہمیں معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے کی توفیق عطا کرے اور پاکستان کی سالمیت کی حفاظت کرے۔

اگر ہم حالتِ جنگ میں ہیں تو اعلانِ جنگ کیوں نہیں

آج کل اگر ملک کے حالات پر نظر ڈالیں تو دل کانپ جاتا ہے کہ آخر یہ سلسلہ کہیں جا کر رکے گا بھی یا نہیں اور آخر کب تک ہم لوگ قتل کیے جایئں گے ۔ ہر دھماکے کے بعد ہمارے حکمران ایک بیان جاری کر دیتے ہیں کہ ''اِن بزدلانہ کاروائیوں سے ہمارے حوصلے پست نہیں کیے جا سکتے'' یا ''عوام دہشت گردی کا مقابلہ بہادری سے کر رہے ہیں'' ۔ یہ سب کچھ بجا ہے لیکن بلند حوصلگی، فخر یا بہادری سے زیادہ بڑھ کر یہ سب کچھ مجبوری کے تحت ہے۔ حکمران اپنے دورِ حکمرانی اور ممبری میں تو سیکیورٹی کے عظیم الشان انتظامات کے جلو میں نکلتے ہیں اور یہ سب کچھ نہ ہو تو ملک کو اس کی حالت پر چھوڑ کر دبئی، انگلینڈ یا یورپ نکل جاتے ہیں اور محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ وہی سے سیاست اور حکومت چلاتے ہیں لیکن بچارے عوام کہاں جائیں انہیں تو اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے اور اِن کے حکمران تو بہت ہیں، فکر کرنے والے نہیں ہاں اپنی کمزوری اور نا اہلی دوسروں کے سر ڈالنے کا رواج بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پہلے یہ الزام تراشیاں مختلف اخبارات کے ذریعے ہوتی تھیں اور اب تو میڈیا چینلز پر کچھ ایسی بحث ہوتی ہے کہ فریقین ایک دوسرے کی بات سنتے ہی نہیں تو سمجھیں گے کیا، بات شخصیات سے آگے نکل کر اداروں تک پہنچ چکی ہے

اور آج کل تو یہ الزام زور پکڑ چکا ہے کہ ملک میں ہونے والا ہر واقعہ خفیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نا اہلی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ لاپتہ افراد انہی کے پاس ہیں، ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں جیل انہی کی نا اہلی کی وجہ سے توڑے گئے۔ کوئٹہ میں فرقہ وارانہ دہشت گردی انہی کی غفلت کا نتیجہ ہے غرض کچھ بھی ہو جائے اس الزام کا رخ ان اِداروں اور ایجنسیوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور طرہ یہ کہ اِن کے حق میں بات کرنے والوں کو آئی ایس آئی اور فوج کا ایجنٹ قرار دے کر قابل نفرت قرار دیا جاتا ہے جبکہ سی آئی اے اور را کے ایجنڈے پر کام کرنے والے بڑے سکون سے مصروف عمل رہتے ہیں،اور دوسری طرف دہشت گرد اپنی کاروائیوں اور قوم کے قتل عام میں مصروف ہیں۔ چھوٹے شہروں میں تو دہشت گردی کسی کھاتے میں نہیں لائی جاتی نہ وہاں جانوں کے ضیاع کی اہمیت ہے ہاں جب ملک کے کسی بڑے شہر میں کوئی بڑا واقعہ ہوتا ہے تو حکومت کی واحد ذمہ داری یہ جملہ کہہ کر ادا کر دی جاتی ہے کہ سیکیورٹی سخت کر دی گئی ہے"۔ ڈی آئی خان جیل توڑے جانے کے بعد حکومت کو" جیلوں کا خیال آیا اور دوسری جگہوں سے سیکیورٹی ہٹا کر جیلوں کی سیکیورٹی سخت کر دی گئی ہے اور دیگر اہم تنصیبات دہشت گردی کے لیے خالی چھوڑ دی گئی ہے اس منصوبہ بندی کے ساتھ پھر الزام خفیہ اداروں، فوج اور پولیس پر لگا دیا جاتا ہے۔ اگر امن و امان سے لے کر قدرتی آفات زدگان کی مدد تک اور دہشت گردوں سے جنگ سے لے کر اپنے اصل کام یعنی سرحدوں کی حفاظت تک اور اِن سب کی

منصوبہ بندی تک ہر کام ان اداروں کی ذمہ داری ہے تو پھر کیوں نہ حکومت خفیہ اداروں، فوج اور پولیس کے حوالے کر دی جائے۔ بیشک کہ مندرجہ بالا کام اِن اداروں کے ہی ہیں لیکن اِن کی وسیع تر منصوبہ بندی حکومت اور ریاست کا کام ہے، ان حکمرانوں کا کام ہے جو ہر روز قتل ہوتے ان عوام کے ووٹوں سے حکومت کے مزے لوٹ رہے ہیں اور ہر دھماکے اور دہشت گردی کے بعد عوام کی لاشوں پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ ہم ہر قسم کی دہشت گردی کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ کیا اِن حالات کا مقابلہ مزید کیا جا سکے گا۔ اب تو عوام کہنے لگے ہیں کہ اگر ہم اپنی یا پرائی، مسلط کردہ یا اپنی مرضی سے جنگ لڑ ہی رہے ہیں تو پھر ''اعلان جنگ'' کر ہی دیا جائے اگرچہ حکومت منہ زبانی تو یہ کہتی ہے لیکن پولیس یا فوج کو ''اعلان جنگ'' کے اختیارات دینے سے گریزاں رہی ہے۔ چند علاقوں میں محدود پیمانے پر فوج کو اختیارات دیئے گئے ہیں لیکن دہشت گرد تو پورے ملک میں سرگرم عمل ہیں اور عملی طور پر'' اعلان جنگ ''کے بغیر ان کا مقابلہ ممکن نہیں، نہ ہی اِن اداروں کو وہ ہتھیار یا ٹیکنالوجی دی جاتی ہے جو دہشت گردوں کے پاس موجود ہے۔ کوئٹہ پولیس لائنز کے افسوس ناک ترین واقعے کے بعد بلوچستان پولیس کو جدید رائفلز دی گئیں کیا اس چیز کا احساس پہلے نہیں کیا جانا چاہیئے تھا۔ بالکل یہی رویہ دفاعی بجٹ کے اوپر تنقید کرتے ہوئے روا رکھا جاتا ہے اور اس طرح بحث کی جاتی ہے جیسے کسی دشمن ملک کا بجٹ ہو۔ اور پھر توقعات یوں رکھی جاتی ہیں کہ ملک کا نظم و نسق جہاں بھی بگڑے،

تو بگڑے ہوئے حالات سنوارنے کے لیے فوج کے حوالے کر دیئے جائیں۔

حکومتوں کو اپنی ذمہ داریوں کو خود پورا کرنا ہوگا تبھی ملک کے حالات سدھریں گے اور وزیر داخلہ سے لے کر میڈیا اینکرز نے ہر غلط کام کا الزام جو قانون نافذ کرنے والے اداروں کو دینا شروع کیا ہوا ہے اُسے ختم کرنا ہوگا بلکہ درحقیقت اِن اداروں کو خصوصی اختیارات دینا ہوں گے کیونکہ سچ یہ ہے کہ ہم حالت جنگ میں ہیں اور یہاں دشمن کسی بھی روپ میں موجود ہو سکتا ہے اور یا حکومت کو اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا ہوگی ورنہ قوم نے دیکھ لیا ہے کہ بھارت سے دوستی کی غیر معمولی اور غیر ضروری خواہش بلکہ درخواستوں کے باوجود وہاں سے جو جواب آیا ہے وہ سرحدی جھڑپوں میں نہ صرف اضافہ ہے بلکہ دہلی میں پاکستانی ہائی کمشن اور دوستی بس پر حملوں کی صورت میں ہے۔ اگر اتنا ہی زور ملکی حالات کی بہتری پر دیا جاتا تو حکومت کے چھیاسٹھ دنوں میں دہشت گردی کے ساٹھ چھوٹے بڑے واقعات نہ ہو چکے ہوتے، جن میں تین سو جانوں کا ضیاع ہو چکا ہے اور ان میں سے اکثر کی ذمہ داری ایجنسیوں پر ڈال دی گئی ہے اور حکومت کو بَری کر دیا گیا ہے۔ اسی غیر ذمہ دارانہ رویے کا ہی شاخسانہ ہے کہ اِن واقعات میں ہر روز اضافہ ہی ہوا اور قوم کو ایک طرح سے دہشت گردوں کے حوالے کر دیا گیا۔ حکومت کو یا تو ان اداروں کو خصوصی اختیارات دینا ہونگے اور یا خود ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔ عوام کی لاشوں پر کھڑے

ہو کر دہشت گردی سے نمٹنے کے عزم کے اظہار سے ہم دشمن کو مات کر سکتے ہیں نہ خود
کو محفوظ بنا سکتے ہیں۔

اسلام آباد واقعہ اور میڈیا کی چابکدستی

ملک درحقیقت بھی دہشت گردی کی زد میں ہے اور پھر اس میں کچھ ایسے واقعات بھی ہو جائیں کہ جس پر ڈرامے کا گمان ہو یا اُسے ڈرامہ بنا کر پیش کیا جائے بلکہ اُسے گلیمرائز کیا جائے تو قوم اپنی قومی بے بسی پر مزید نوحہ کناں ہو جاتی ہے۔ایسا ہی واقعہ 15 اگست کو پیش آیا جب بظاہر ایک عام سے حلیے اور خدوخال والا شخص سکندر اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر اسلام آباد کے اہم ترین علاقے جناح ایونیو پر پہنچ گیا اور پولیس کے روکنے پر فائرنگ شروع کر دی، اگرچہ سوال تو اٹھتا ہے کہ اتنے ناکے، اتنی پولیس پھر یہ سب کیسے ہو جاتا ہے لیکن یہاں ہماری روایات بھی آڑے آ جاتی ہیں کہ بیوی اور بچوں کے ہمراہ شخص کو احتراماً بھی گزرنے دے دیا جاتا ہے اور شاید یہی کچھ یہاں ہوا ہوگا۔بہر حال پولیس نے اس موقعے پر کافی ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا اور پانچ گھنٹے ایک مسلح شخص کو اس طرح قابو کیے رکھا کہ کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن چونکہ بد قسمتی سے ہماری پولیس نہ صرف یہ کہ نیک نام نہیں بلکہ کچھ لوگوں کی وجہ سے ہی سہی خاصی بدنام ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی اچھی یا معقول کارکردگی کو بھی دشمنانہ رویے کی نظر کر دیا جائے جیسا کہ اس فلم نما واقعہ کے وقت کیا گیا۔میڈیا گروپس نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی بھرپور کوشش کی اور ایک ایک کیمرہ

استعمال کرنے کی بجائے تین تین کیمرے استعمال کیے گئے تاکہ کوئی زاویہ، نگاہ سے اوجھل نہ رہے۔ براہ راست نشریات کے فوائد تو ہیں لیکن نہ تو یہ کسی کھیل کا کوئی مقابلہ تھا نہ کوئی سیاسی جلسہ بلکہ اس براہ راست نشریے نے اس واقعے کو سنجیدگی سے حل ہونے کی بجائے ایک غیر سنجیدہ واقعہ بنا کر رکھ دیا۔ عوام بھی لائیو کوریج کے شوق میں جائے وقوعہ سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور پولیس کے لیے مسلسل مشکلات پیدا کی جارہی تھی جس کا احساس اس وقت تو بالکل نہیں کیا گیا البتہ بعد میں مختلف اینکرز خود میڈیا کی اس غیر ضروری چابکدستی کو ہدف تنقید بنا رہے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ پولیس بھی اُن کی دست برد سے محفوظ نہیں تھی۔ دراصل پچھلے کچھ سالوں سے یہ ایک فیشن بن چکا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں پر تنقید کی جائے اور پچھلے دو چار ماہ سے تو یہ ادارے حکومتی اور میڈیا تنقید کی زد میں ہیں باوجود اس کے کہ یہ ادارے مسلسل اپنے اہلکاروں کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ الزامات دشمن ملک اور طاقتوں کی طرف سے لگائے جاتے تھے مثلاً وہاں ہونے والے ہر واقعہ کا ذمہ دار آئی ایس آئی تھا لیکن اب یہ سب کچھ کرنے کے لیے کسی دشمن کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ خود اپنے ہی یہ کام کر لیتے ہیں اور اگر باہر سے الزام لگے تو اُس کو ثابت کرنے کے لیے اپنے ہی ملک کا میڈیا اور دانشور دور دراز کا سفر کرنے نکل پڑتے ہیں اور حقیقت اور خیال، مستند اور غیر مستند ساری خبریں ملا کر ایک ایسی رپورٹ مرتب کر لیتے ہیں کہ دشمن

کو زحمت نہیں کرنا پڑتی اور بین الاقوامی سطح پر اُنکے موقف کی تائید بھی ہو جاتی ہے اور پذیرائی بھی اور اپنے ملک کی بدنامی بھی لیکن رپوٹر، اینکر اور چینل کی ریٹنگ آسمان کو چھو جاتی ہے منافع بھی مل جاتا ہے اور شہرت بھی۔

اسلام آباد واقعے کو کچھ دیر کے لیے براہ راست نشر کرنا یا وقتاً فوقتاً جھلکی دکھا دینا یا خبر دے دینا تو قابل فہم تھا لیکن پانچ گھنٹے کے لیے لحہ لحہ کی خبر دینا، پوری قوم کو مفلوج کرکے ٹی وی کے سامنے بٹھا دینا کوئی دانشمندی نہیں تھی اور وہ بھی جب قوم سالہا سال سے ایسے حالات سے گزر رہی ہو کہ کوئی ان کا پرسان حال نہ ہو کوئی حالات کی ذمہ داری نہ لے بلکہ ہر ایک اسے دوسرے پر ڈالتا رہے، حکومت کا بدلنا صرف چہروں کا بدلنا ہو باقی بے فکری کا وہی عالم ہو جو پچھلی حکومتوں کا ہو اور اگلی حکومت پچھلی حکومت کو اور پچھلی، اگلی کو دوش دیتی رہے۔ ساری ذمہ داری قانون نافذ کرنے والے اداروں کو دی جاتی رہے اور حکمران بری الذمہ ہوتے رہیں تو حالات بدلنے کی صورت کہاں سے بنے گی اور اس بات کا احساس ہی نہ کیا جائے کہ اگر ایجنسیاں کام نہیں کر رہیں یا پولیس ناکارہ ہے تو کمزوری کہاں ہے حکومت اُن کے سامنے بے بس کیوں ہے کہ اُن کی اتنی سخت شنوائی نہ کرسکے کہ اُنہیں مجبوراً ہی سہی کام کرنا پڑے۔ کہیں اس سب کچھ سے حکمرانوں کے مفادات تو وابستہ نہیں

اور عوام کا یہ گمان درست تو نہیں کہ کرسی اور دولت ان کی واحد ضرورت ہے جسے وہ بڑی سہولت سے پورا کر رہے ہیں۔

یہ وقت سنجیدگی دکھانے کا ہے سکندر کے نام کا فائدہ اٹھا کر اُسے مقدر کا سکندر اور سکندر اعظم جیسے طنزیہ ہی سہی خطابات دینے کا نہیں۔ بہت سارے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اس واقعے کو اتنی کوریج نہ دی جاتی تو اِسے بہت جلد ختم کیا جا سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میڈیا نے آج کے معاشروں کا رخ بدل دیا ہے اور یوں ریاستی ادارے بلکہ ریاستی ستون کی حیثیت حاصل کر لی ہے تو اُسے اس ذمہ داری کا احساس بھی کرنا ہوگا۔ سانپ نکلنے کے بعد لکیر پیٹنے والے اینکرز جب واقعے کے بعد لائیو کوریج کو میڈیا کی غلطی قرار دے رہے تھے تو اُنھوں نے یہ مشورہ پہلے ہی اپنے مالکان کو کیوں نہیں دیا تاکہ معاملہ اتنا طول ہی نہ پکڑتا اور پوری دنیا میں ملک کی سبکی نہ ہوتی۔ یہ منصوبہ بندی اگر پہلے ہی کر دی جائے کہ کس معاملے کو کتنی اہمیت دی جائے اور آیا اُسے براہ راست دکھایا جائے یا بعد میں رپورٹ دکھائی جائی اور ایک ضابطۂ اخلاق بھی مرتب کیا جائے جس میں میڈیا کو پابند کیا جائے کہ ریاستی اداروں پر تنقید کو قومی سلامتی پر حملے کی حد تک نہ لے جایا جائے۔ میرا یہ کہنے کا ہر گز یہ مقصد نہیں کہ انہیں تنقید سے مبرائ قرار دیا جائے، تنقید ہو اور ضرور ہو تاکہ یہ ادارے بھی شتر بے مہار نہ بنیں لیکن ان کی اچھی کار

کردگی پر انہیں سراہنا بھی ضروری ہے تاکہ اِن کا بھی حوصلہ بڑھے اور اپنی کارکردگی اور مہارت کو بہتر بنا سکیں اور دنیا بھر میں ملک کی جو پہلے ہی بدنامی ہو رہی ہے اس میں خود ہماری ہی وجہ سے اضافہ نہ ہو۔ اظہار رائے کی آزادی کے نام پر ملک کی ساکھ کو داؤ پر لگانا کسی بھی طرح ملک دوستی اور دانشمندی نہیں۔

شکیل آفریدی کی حوالگی قومی جرم ہوگا

مشرف دور میں امریکہ کو مطلوب کچھ لوگوں کو امریکہ کے حوالے کیا گیا بلکہ در حقیقت بیچا گیااور اپنے اس جرم کا اعتراف جنرل مشرف نے خود اپنی کتاب اِن دی لائن آف فائر میں بھی کیا۔ ان لوگوں کے جرائم جو بھی تھے ان کی فروخت کسی بھی طرح درست نہیں تھی کیونکہ ان کے جرائم پاکستان کے خلاف نہیں امریکہ کے خلاف تھے اور انہی فروخت شدہ لوگوں میں سے ایک ڈاکٹر عافیہ صدیقی تھی۔ عافیہ کا کس سے تعلق تھا یا خود وہ کون تھی، اُس کے ابتدائی جرائم کیا تھے یا نہیں تھے یہ سب سوالات اپنی جگہ لیکن اُسے جو چھیاسی سال قید کی سزا سنائی گئی، اُس کے ساتھ مقدمے کے دوران جو غیر انسانی سلوک کیا گیا اور اس سے پہلے اُس کو جس طرح نہ صرف حبس بے جا میں رکھا گیا اور بگرام جیل میں اُس کے ساتھ جو وحشیانہ رویہ رکھا گیا وہ سب اُس کو انتہائی قابل رحم بناتا ہے اور زیادہ افسوسناک عمل یہ ہے کہ اس تمام سزا کے لیے اُس کے جس جرم کو بنیاد بنایا گیا وہ یہ تھا کہ اُس نے ایک امریکی فوجی پر صرف بندوق اٹھائی تھی مارا نہیں تھا۔ عافیہ کے ساتھ پاکستان میں عمومی طور پر ہمدردی کا ایک جذبہ پایا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف ایک مجرم ہے، جو پاکستان کا مجرم ہے، جس نے پاکستان کی عزت اور خود مختاری کا سودا کیا تھا۔ امریکہ نے 2 مئی 2011 کو ڈاکٹر شکیل آفریدی کی

مخبری پر ایبٹ آباد کے بلال ٹاؤن میں ایک گھر پر ہیلی کاپٹروں کی مدد سے حملہ کرکے اُسامہ بن لادن کی ہلاکت کا دعویٰ کیا یہ حملہ پاکستان کے کئی کلومیٹر اندر آکر پاکستان ملٹری اکیڈمی سے دو چار کلومیٹر کے فاصلے پر کیا گیا اور اس کا باعث خود پاکستان کا ایک شہری ڈاکٹر شکیل آفریدی بنا جس نے امریکیوں کی ہر طرح سے رہنمائی کی۔ خوش قسمتی سے یہ غدارِ وطن پکڑا گیا اور تب سے اب تک امریکہ مسلسل اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ کسی طرح اپنے اس مخبر اور ہمارے اس غدار کو رہا کرواکر اپنے ملک لے جائے اور ظاہر ہے کہ وہاں اسے جس طرح نوازا جائے گا اُس کی تفصیل بیان کئے بغیر بھی سب کو معلوم ہے۔ ابھی تک حکومتِ پاکستان نے عوامی دباؤ کے تحت اس غیر ملکی دباؤ کو برداشت کیا لیکن اب جو خبریں گردش کر رہی ہیں وہ یہی ہیں کہ ممکن ہے کہ حکومت شکیل آفریدی کو امریکہ کے حوالے کر دے اور شاید عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس سے عافیہ صدیقی کو پاکستان کو دے دینے کا مطالبہ کیا جائے تاکہ یوں پاکستانیوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ بات اگر دو عام قیدیوں کی ہوتی تو قابلِ قبول تھی لیکن یہاں بات ایک ایسے غدار کی ہے جس کی غداری نے پوری قوم کا سر جھکا دیا اور پاکستان کو ایک ایسا ملک ثابت کرنے کی پوری کوشش کی جو اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا اور جہاں دشمن جب چاہے سرحدوں کے بہت اندر آکر ہم پر وار کر سکتا ہے۔ اگر وہ جانتا تھا کہ ایبٹ آباد کے ایک عام سے گھر کے اندر دنیا کا انتہائی مطلوب شخص اُسامہ رہتا ہے تو اُسے یہ راز اپنی حکومت

کو دینا چاہیئے تھا نہ کہ ایک غیر طاقت کو اور وہ بھی ایک ایسی طاقت کو جو اسلامی ملکوں پر حملہ کرنا اپنا فرض اور اپنے سُپر پاور ہونے کی تسکین سمجھتا ہے۔ شکیل آفریدی کوئی عام مجرم نہیں جسے قیدیوں کے تبادلے میں دوسرے ملک کے حوالے کیا جائے۔ امریکہ اپنے مجرموں کو تو دُنیا کے لیے عبرت بنا دیتا ہے جیسا کہ اُس نے عافیہ کے معاملے میں کیا جب کہ اپنے لیے کام کرنے والوں کو وہ دُنیا کے سامنے ہیرو بنا کر پیش کرتا ہے نہ صرف اپنے لیے بلکہ دنیا والوں پر بھی وہ ان کا ہیرو ہونا مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا بھی قائل ہے اور اس پر مُصر بھی کہ اُس کے شہریوں کو دنیا میں کچھ بھی کرنے کا اختیار حاصل ہے اور وہ کسی بھی جرم کے بعد انہیں بزور بازو چھڑا لے جاتا ہے۔ دُنیا میں تو یقیناً اس کی کئی مثالیں ہونگی جب اُس نے اپنے شہریوں کو دوسرے ممالک میں جرائم کے بعد چھڑا کر ہیرو بنا دیا ہوگا لیکن پاکستانیوں کے ذہنوں میں ابھی تک ریمنڈ ڈیوس کا رعونت زدہ چہرہ محفوظ ہے جو لاہور کی سڑکوں پر دو پاکستانیوں کے قتل کے بعد محفوظ و ماموں امریکہ پہنچ گیا تھا۔ اب اگرچہ معاملہ اُن کے شہری کا نہیں لیکن یہ شخص یعنی شکیل آفریدی امریکہ کے لیے اُس سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور پاکستان کے لیے انتہائی خطرناک۔ حکومت پاکستان کو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ ڈاکٹر آفریدی کی حوالگی کے اثرات کیا ہونگے، ایک ایسی قوم جس کے کچھ افراد اپنی غربت کے مارے بڑی آسانی سے غیر ملکی طاقتوں کے ہتھے چڑھ

جاتے ہیں اور کچھ اپنی اخلاقی پسماندگی اور طمع و لالچ اور حرص و ہوس سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو بیچ ڈالتے ہیں کیا شکیل آفریدی کی حوالگی کے بعد اُن میں بہت سارے شکیل آفریدی بننے پر آمادہ نہیں ہو جائیں گے اور یہ نئے غدار پرانے سے بڑھ کر ہونگے کیونکہ پرانوں کے ذہن میں کہیں نہ کہیں تو سزا کا خوف ہوگا لیکن نئے تو ہر قسم کے اندیشے سے آزاد ہو کر جرمِ غداری کے مرتکب ہونگے اور بڑی تسلی سے بڑے بڑے قومی جرائم کریں گے۔ الہذا حکومت اس قومی موقف پر جم جائے کہ ڈاکٹر آفریدی قومی مجرم ہے اور اگر پاکستان میں غداری کی سزا موت ہے تو یہی اُس کی سزا ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ یقیناً پوری قوم کی ہمدردیاں ہیں اور پاکستان کا ہر فرد ان کی آزادی کا خواہاں ہے اور ان کی بے حرمتی پر ہر پاکستانی تڑپا بھی ہے لیکن اُن کی رہائی کے لیے کوئی دوسری سبیل کی جائے جو پوری قوم کو قابلِ قبول ہو ڈاکٹر آفریدی کی رہائی کے بدلے عافیہ کی رہائی بھی متنازعہ ہو جائے گی اور ایک کمزور عورت جو عرصہ دراز سے امریکیوں کے مظالم سہہ رہی ہے اپنے لیے قومی ہمدردی بھی کھو دے گی۔ یہاں جذبات نہیں بلکہ ہوش اور فکر کی ضرورت ہے اور قوم یہ توقع کرنے میں حق بجانب بھی ہے کہ عافیہ اور اس کے اہل خانہ ایک غدار کے ساتھ پلڑے میں تُلنے کو راضی نہیں ہونگے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہر گز نہیں کہ عافیہ کی رہائی کی کوششیں ترک کر دی جائیں بلکہ اس رہائی

کو باوقار طریقے سے ممکن بنایا جائے اور عافیہ کو پورے عزت واحترام کے ساتھ واپس اپنے ملک لایا جائے نہ کہ ایک غدار کے بدلے میں۔

ڈاکٹر آفریدی کی امریکہ کو حوالگی ایک انتہائی حساس نوعیت کا معاملہ ہے اور اسے کسی صورت عمل میں نہیں آنا چاہیے ورنہ اُسکے فعل سے تو ملک کی جو سُبکی بین الاقوامی سطح پر ہوئی تھی سو ہوئی تھی اب کا معاملہ اس سے زیادہ سنجیدہ نوعیت کا ہوگا اگر ایسا کیا گیا تو دشمن اور شیر ہوگا اور ہر ایک اپنے کارندے نہ صرف بڑی تسلی سے پاکستان بھیجے گا بلکہ یہاں سے بھی اپنے مہرے ڈھونڈ نکالے گا۔ پاکستانی حکومت ماضی میں بڑی آسانی سے امریکی دباؤ میں آتی رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قوم اس خوف میں مبتلائی ہے کہ ایک بار پھر قومی وقار اور عزت کا سودا کر لیا جائے گا لیکن حکومت کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یوں آسانی سے ہتھیار ڈالنے کی روش نے ہمیں ایک مضبوط قوم نہیں بننے دیا اور تاریخ اور وقت شاید دو چار بار تو معافی دے بھی دیتی ہے ہر بار نہیں، اور وقت کی پکڑنے بڑے۔بڑوں کو دنیا سے بے ننگ و نام رخصت کیا ہے لہٰذا موجودہ حکومت اپنی حب الوطنی اور قائدِاعظم کی جانشینی کے بلند و بانگ دعوئوں کے باوجود اگر کوئی عامیانہ بلکہ غدارانہ قدم اٹھائے گی اور سستی شہرت خریدے گی تو یہ سودا اُسے بہت مہنگا پڑ سکتا ہے اور پھر اُسکی داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

کراچی میں امن فوج کا نہیں حکومت کا کام ہے

کسی معاملے میں سیاسی پارٹیوں کا یکساں موقف بہت کم دیکھنے میں آتا ہے بلکہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا ہی سیاست کی بنیاد سمجھی جاتی ہے اور اگر کہیں خوش قسمتی سے ایسا ہو جائے تو اتفاق رائے صرف زبانی کلامی رہتا ہے عمل تک بات کم ہی پہنچتی ہے۔ لیکن کراچی کے معاملے میں ایسا ہونا ایک خوش آئند بات ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ کراچی پر جس آسیب اور دہشت کا سایا ہے اُس سے اُسے آزاد کرایا جائے چاہے اس کے لیے فوج طلب کرنا پڑے بلکہ فوج طلب کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ کراچی کے حالات کے بارے میں فکر مندی پائی جا رہی ہے اور اس گھمبیر مسئلے کے حل کے بارے میں سنجیدگی بھی دکھائی جا رہی ہے لیکن اس سنجیدگی کو قوم کے مطلوبہ نتائج کے حصول تک جاری رہنا چاہیے۔ اگرچہ اب آپریشن حکومت سندھ کی نگرانی میں رینجرز اور پولیس کی مدد سے شروع ہو چکا ہے لیکن فوج کی مداخلت کی آواز اب بھی اُٹھ رہی ہے اور یہ فوج پر اعتماد کی مثال ہے تاہم ہر معاملے میں فوج کو شامل کرنا نہ تو خود اس کے حق میں بہتر ہے اور نہ ہی دیگر اداروں کے لیے سود مند۔ قانون نافذ کرنے والے

دیگر اداروں کو اگر اختیارات دے دیئے جائیں اور مخلص افسران کی قیادت میں پورے خلوص کے ساتھ کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ حاصل ہو سکے۔ کراچی کا مسئلہ امن و امان کا مسئلہ ہے جس میں سیاسی جماعتوں کا کردار بھی انتہائی اہم ہے اور مذہبی جماعتوں کا بھی، خبروں کے مطابق ان جماعتوں کے عسکری گروپ بھی ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اِن کی آڑ لے کر بہت سے جرائم پیشہ افراد نے بھی اپنے گروپ بنائے ہوئے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود ساختہ گینگ بھی سیاسی جماعتوں کا نام استعمال کر رہے ہوں بہر حال اس جرم سے بری الذمہ کوئی بھی نہیں ہے اور حکومت کو اگر ملکی مفاد عزیز ہے تو اسے پوری ایمانداری سے ہر ذمہ دار کی پکڑ کرنی ہوگی جس کے لیے رینجرز کا یہ مطالبہ بھی اہم ہے کہ اُسے مزید اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ اس معاملے اور مسئلے کو سلجھا سکے۔ پولیس اور رینجرز جن لوگوں کو پکڑ لیتی ہے انہیں تیز اور شفاف تحقیقات کے بعد سزا بھی دی جائے ورنہ خواہ مخواہ کی پکڑ دھکڑ آپریشن کو بار آور اور کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ اس میں کسی سیاسی یا مذہبی جماعت یا لسانی اور علاقائی گروہ کو رعایت نہیں ملنی چاہیے۔

یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ کراچی کے حالات ملکی معیشت، تجارت، صنعت اور کئی شعبوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کراچی کا بے تحاشا پھیلاؤ بھی اس کے مسائل کی ایک وجہ ہے اور یہاں علاقوں کی لسانی گروہوں یا مذہبی فرقوں

کے درمیان تقسیم نے بھی اسے مصیبت میں مبتلا کیا ہوا ہے اور یہ سب منصوبہ سازی فوج کا نہیں حکومت کا کام ہے لہٰذا تمام مسائل کے حل فوج کو سونپ دینا اصل حل نہیں۔ اس وقت رینجرز اور پولیس کے آپریشن کو سیاسی اور اخلاقی سپورٹ کی ضرورت ہے نہ کہ فوج کو اس نئے محاذ پر مصروف کرنے کی ہاں اگر خدانخواستہ یہ ٹارگٹڈ آپریشن بھی کامیاب نہ ہو تو پھر آخری آپشن استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن ابھی نہیں، کہ نہ تو سرحدوں کے حالات اس کی اجازت دیتے ہیں نہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اور نہ ہی بین الاقوامی منظر نامہ۔ رینجرز اور پولیس ابھی تک تندہی سے یہ کام سرانجام دے رہی ہے، کچھ ٹارگٹ حاصل بھی ہو رہے ہیں اسی لیے اس وقت ان کی ہمت بندھانی چاہیے اور ان تمام قوتوں کا تعاون ان کے لیے بہت ضروری ہے جو خوش قسمتی ہے اس بات پر متفق ہیں کہ کراچی کا امن بہر حال بحال ہونا چاہیے۔ کراچی پاکستان کے اندر ایک چھوٹا پاکستان ہے جس میں پاکستان کے ہر صوبے ہر شہر بلکہ ممکن ہے ہر گاؤں کا کوئی نہ کوئی شخص یا خاندان موجود ہے لہٰذا اس کے امن کے لیے سب کا تعاون حاصل ہو جانا کوئی بہت مشکل کام نہ ہو گا بس کوشش مخلصانہ ہو اور اگر مثبت نتائج حاصل ہوں تو اسے دل سے قبول کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے حکومت، قانون نافذ کرنے والے ادارے، عدلیہ، سیاست دان اور عوام اگر کوشاں ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں کہ رینجرز اور پولیس کا یہ آپریشن کامیاب نہ ہو بلکہ ممکن ہے ہفتوں کے لیے پلان شدہ یہ آپریشن دنوں میں ختم ہو اور کراچی کا سورج پھر سے پورا دن اور

اس کی روشنیاں پوری رات امن اور سکون سے جگمگائیں۔

امن کی خاطر مذاکرات ہو جانے چاہئیں!

نو ستمبر 2013 کو پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اور عسکری قیادت مل بیٹھے کہ ملک کو درپیش مسائل کا حل تلاش کریں کراچی اور بلوچستان کے مسائل سمیت دہشت گردی کے خلاف جنگ کے مسئلے پر بھی مشترکہ قرارداد منظور کی گئی اور حکومت اور وزیراعظم کو مسئلے کے حل کا اختیار بھی دیا گیا اور تعاون کی یقین دہانی بھی کرائی گئی۔ ڈرون حملوں کے خلاف بھی قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی اور نیٹو کی کاروائیوں کو پاکستان میں دہشت گردی اور اموات کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا گیا۔ مسائل کے حل کے لیے تمام سٹیک ہولڈر سے مذاکرات کی تجویز بھی منظور ہوئی اور یہ سب کچھ ظاہر ہے کہ ملکی مفاد میں کیا گیا۔ طالبان کی طرف سے بھی مذاکرات کی پیش کش پر مذاکرات کا عندیہ دیا گیا۔ اگرچہ اس سارے عمل کے چند ہی روز بعد اپر دیر میں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا اور پاک فوج کے ایک میجر جنرل، ایک لیفٹینینٹ کرنل اور ایک لانس نائیک ایک بارودی سرنگ کی زد میں آ کر شہید ہو گئے اور حسب معمول اس واقعے کی ذمہ داری تحریک طالبان کے ترجمان شاہداللہ شاہد نے قبول کر لی۔ طالبان کا کوئی ایک گروپ نہیں ہے یہ سب ہی جانتے ہیں تو پھر شاہد اللہ شاہد کس کا ترجمان ہے یہ کون بتائے گا۔ اور کیا کوئی یہ بتائے گا کہ

آخر مذاکرات پر آمادگی کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کا اعلان کیا معنی رکھتا ہے یہ اعلان کون سا گروپ کر رہا ہے اور کس کے کہنے پر کر رہا ہے۔ کیا کچھ ایسے عناصر سرگرم عمل ہیں جو یہ مذاکرات کسی صورت نہیں ہونے دینا چاہتے۔ ان مذاکرات کے اعلان کے ساتھ ہی اہل مغرب نے بھی پاکستان کے خلاف واویلا کرنا شروع کردیا ایسا ہی ایک مضمون ڈیلی ٹیلی گراف میں شائع ہوا اور مضمون نگار نے ڈرون حملوں، نیٹو کے کردار اور طالبان سے مذاکرات کرنے پر تنقید کی ہے۔

لیکن بات دراصل یہ ہے کہ پاکستان اور اس کے عوام بہتر جانتے ہیں کہ انہیں امن ہر صورت بحال کرنا ہے۔ اب تک ایک محتاط اندازے کے مطابق بھی چالیس ہزار پاکستانی اس جنگ میں جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں جن میں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سبھی شامل ہیں نہ نمازی چھوڑے گئے نہ مریض، وہ کچھ کیا گیا جس کا کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا، جنازہ سامنے پڑا ہو اور مزید لوگ قتل کر دیئے جائیں اس سے ہولناک صورت حال کیا ہو سکتی ہے لیکن یہ سب کچھ سالہا سال سے ہمارے ملک میں چل رہا ہے، فوجی آپریشن بھی ہوئے اور مذاکرات کے چھوٹے موٹے دور بھی چلتے رہے جس پر ایک سیاسی پارٹی ہاں اور دوسری ناں کرتی رہی اور نتیجتاً مذاکرات ناکام بھی ہوتے رہے لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ مذاکرات کے دروازے بند کر دیئے جائیں بلکہ انہیں ایسے خطوط پر

منعقد کیا جائے کہ یہ ملک میں امن قائم ہونے کا باعث بنیں۔ دنیا میں صد سالہ جنگوں کے بعد بھی فیصلے مذاکرات کی میزوں پر ہی ہوئے ہیں اور تقریباً پچاس فیصد جنگیں مذاکرات پر ہی اختتام پذیر ہوئیں ہیں۔ یہاں تو مسئلہ بھی مختلف ہے کہ دونوں طرف اپنے ہی لوگ ہیں جنہیں لڑایا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ اعتراض کہ انہیں سٹیک ہولڈر کہا جائے یا کوئی اور نام دیا جائے، مقصد مسئلے کا حل ہے۔ یہ لوگ اگرچہ حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں لیکن شہری تو پاکستان کے ہی ہیں شاید اِن میں سے بہت سے کارندے یہ جانتے ہی نہ ہوں کہ انہیں کون سی غیر ملکی قوتیں استعمال کر رہی ہیں اور علاقے میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص دہشت گردی سے ان کا کون کون سا مفاد وابستہ ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ طالبان تو اب صرف ایک ''علامت'' یا ''برینڈ نیم'' بن گیا ہے جس کو جرائم پیشہ گروہ بھی بڑے آرام سے استعمال کر رہے ہیں بلکہ انہیں دشمن قوتیں ایسا کرنے میں مدد فراہم کر رہی ہیں۔ امریکہ اپنے دوستوں یعنی بھارت اور اسرائیل کی مددِ خاص سے ایسا کرکے پاکستان کو کمزور کرنا چاہتا ہے تاکہ اُس کی ہوس ملک گیری کی راہ میں ایٹمی پاکستان حائل نہ ہوسکے اور اس کے عوض وہ بھارت کو علاقے کا چوہدری بنا کر پیش کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُسے افغانستان میں اہم بنا دیا گیا ہے جہاں سے وہ بڑی آسانی سے دہشت گردوں کی مدد کر سکتا ہے۔

طالبان سے معاملات پیچیدہ بھی ہیں اور مشکل بھی اور یہ اعتراض بھی درست ہے کہ طالبان کی شرائط پر مذاکرات حکومت اور ریاست کے حق میں نہیں ہیں لیکن ظاہر ہے ایک درمیانی راستہ ہمیشہ موجود رہتا ہے جسے پہلے دریافت کرنا ہے اور پھر اُسے اختیار کر کے طالبان کو مذاکرات کی میز تک لانا ہے اور یہ مذاکرات تمام گروپوں کے نمائندہ گروپ سے ہوں۔ چالیس ہزار جانوں کے بعد خدانخواستہ چالیس ہزار اور جانوں کا ضیاع کسی بھی طرح عقلمندی اور حب الوطنی نہیں ہے۔ ہاں اگر طالبان حکومت کے مذاکرات کی پُر خلوص کوشش کے باوجود بھی اپنی شرائط پر اڑے رہیں تو پھر حکومت اپنی پوری قوت بلا خوف و امتیاز استعمال کرے لیکن اب اس مسئلے کو حل ہو جانا چاہیے۔ میرا آج بھی یقین ہے کہ قبائلی انتہائی محب وطن پاکستانی ہیں صرف اُن کو احساس دلانا ہے کہ وہ کسی اور قوت کے کارندوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں یہ کام مشکل ضرور ہے نا ممکن نہیں۔ اگر دشمن ملک مذاکرات کے ذریعے اپنے معاملات حل کر سکتے ہیں، اگر مختلف مذاہب کے لوگ گفت و شنید سے دنیاوی مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں تو ہمارے تو دونوں طرف ایک ہی ملک ایک ہی مذہب کے لوگ ہیں تو آخر ہم ایسا کیوں نہ کر سکیں گے اور اعتراض کرنے والے اعتراض کس چیز پر کرتے ہیں یہ تو آپ اُن لوگوں سے پوچھیں جو اس مسلط شدہ پرائی جنگ میں خون دے چکے ہیں۔ ہمارے حوصلے یقیناپست نہیں ہیں اور ہم اللہ کے حکم کے مطابق اپنے شہیدوں پر فخر کرتے ہیں لیکن پُر امن زندگی بھی اللہ کی ایک نعمت ہے اور ہر

انسان کا حق بھی اور ملک کی ترقی کے لیے زندہ دست و بازو بھی درکار ہیں۔ لہذا اس جنگ کو اب ختم ہو جانا چاہیے تاکہ پاکستان ایک مضبوط معیشت، ایک ترقی یافتہ ملک اور ایک بڑی اسلامی قوت بن کر ابھرے اور ہر پاکستانی ایک پُرامن زندگی گزار سکے۔ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے آمین۔

دردِ مشترک

ایک اور بڑا دھماکا ہوا اور پشاور لرز اٹھا۔ چیختی ہوئی عورتیں، بلکتے ہوئے بچے، شوہروں اور بچوں کو ڈھونڈتی ہوئی عورتیں، ایک عورت اپنے سر کو مارتی ہوئی کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے جیسے کہ وہ بُری خبر کو نہیں سنے گی تو سب خیریت رہے گی، ایک اپنے بچے کے پیچھے چھپتی ہے کہ دیکھے گی نہیں تو لاشیں گریں گی نہیں۔ یہ منظر اب کوئی نیا نہیں لیکن دیکھ کر پھر بھی دل دہلتا ہے۔ نیا تو یہ اُس دن بھی نہیں تھا جب میں اسی طرح چیختی پھر رہی تھی کسی کو منہ کھولتا دیکھتی تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی تھی کہ مبادا مجھے یہ نہ بتا دیا جائے کہ خدانخواستہ میرا بیٹا بھی ۔۔۔۔۔۔ مسجد میں دھماکا ہوا ہو تھا اور میرا بیٹا نماز پڑھنے اسی مسجد میں گیا تھا اور میرے شوہر بھائی، بہن ہم سب اُسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ پھر میرے خدا کا شکر ہے کہ وہ مجھے مل گیا اُس کے دونوں پیروں کی ہڈیاں فریکچر تھیں اور اُس کا منہ سوجھا ہوا تھا اگر عام حالات میں میں اسے اس حالت میں دیکھتی تو رو رو کر بے حال ہو جاتی لیکن اُس دن میں اُسے چوم چوم کر خدا کا شکر ادا کرتی رہی۔ آج اِن ماؤں کو دیکھ کر مجھے اپنا آپ اور وہ سب مائیں اور بیویاں یاد آرہیں تھیں جو اسی طرح چیختی چلاتی پھر رہی تھیں فرق تھا تو یہ کہ وہ دھماکا مسجد میں

ہوا تھا اور یہ چرچ تھا، میں مسلمان ہوں اور یہ عورتیں عیسائی تھیں لیکن ماں تو ماں ہے، بیوی تو بیوی ہے، بیٹا تو بیٹا ہے اور باپ تو باپ ہے اور اسی لیے سب کا دُکھ ایک جیسا ہے۔ آج کوئی پاکستانی محفوظ نہیں، امام بارگاہ میں حسین اور علی مرے، مسجد میں عمر اور ابوبکر یا گرجے میں جوزف اور برکت مسیح یا کسی مندر میں مہیش اور رمیش، پورا پاکستان زخمی ہے ہم ایک حادثے کو چار دن یاد کرتے ہیں، روتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں بھول جانے کی وجہ ایک نیا حادثہ نیا دُکھ ہوتا ہے جو پچھلے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اور ہر پاکستانی اُسے دیکھ کر رو دیتا ہے پھر آخر کون ہے یہ جو یہ ظلم ڈھاتا ہے اگر وہ مسلمان ہے تو مسلمان کسی مسلمان کو تو کیسے مارے گا اُسے تو حکم ہے کہ وہ اپنے ملک میں رہنے والے غیر مسلم کی جان اور مال کی حفاظت کا بھی ذمہ دار ہے جب تک کہ کوئی اُس کے دین ملک اور ریاست کو نقصان نہ پہنچائے اور اِن حالات میں بھی یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدالت و سزا کا عمل سرانجام دے نہ کہ کسی فرد یا تنظیم کی پھر ایسا کرنے والے آخر کونسی ذمہ داری سرانجام دے رہے ہیں۔

22 ستمبر کو ہونے والا یہ دھماکا جو اب تک 81 افراد کی جان لے چکا ہے اور یہ سمجھنا کہ صرف مسیحی برادری سوگوار ہے بالکل غلط ہوگا آج ہر بات کرنے والا اسی دکھ کا اظہار کر رہا تھا کہ بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہر پاکستانی اُسی

طرح دکھی ہے جیسے کسی مسجد اور امام بارگاہ میں ہونے والے دھماکے پر ہوتا ہے یا کسی بازار اور مارکیٹ میں ہونے والی اموات پر ہوتا ہے۔ اس سانحے کے بعد ہمارے میڈیا کے کچھ چینلز نے اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں قرآن و حدیث سے حوالے دینا شروع کر دیئے جس سے یہ تاثر ملنے لگا کہ جیسے اقلیتوں کے حقوق پر حملہ کیا گیا ہو جبکہ آج تو پاکستان کا کوئی شہری محفوظ نہیں نہ مسلمان نہ غیر مسلم۔ لہٰذا میڈیا کو نہ صرف انتہائی احتیاط سے کام لینا ہوگا بلکہ ایسے کسی بھی تاثر کو زائل بھی کرنا ہوگا اور اگر غیر ملکی میڈیا اور تنظیمیں ایسا کرنا چاہیں تو اُس کا بھی تدارک کرنا ہوگا۔ اقلیتوں کے حقوق یاد کروانا اپنی جگہ ضروری ہے لیکن ایسے موقعے پر جب اس کی ضرورت ہو۔ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کا منہ بولتا ثبوت تو خود وہ عظیم الشان گرجا تھا جس میں یہ دھماکا ہوا اور وہ تعداد بھی جو اتوار کو بغیر کسی روک ٹوک کے اس عبادت خانے میں موجود تھی لہٰذا اس واقعے کو اقلیتوں کے حقوق کا معاملہ قرار دے کر حد سے آگے نکل جانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ ہاں اُس ہاتھ کو روکنا از حد ضروری ہے جو یہ سب کر رہا ہے۔ اگر چہ بظاہر یہ سب کرنے کی ذمہ داری جند اللہ نے قبول کر لی ہے لیکن خود یہ تنظیم کس کے زیر سایہ چل رہی ہے اصل مجرم کون ہے اور جب تک اصل مجرم نہ پکڑے جائیں تب تک معاملہ حل نہیں ہوگا۔ طالبان، لشکر اسلام، جند اللہ کیا مسلمان صرف یہ لوگ ہیں یا انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ذمہ داری تفویض ہوئی ہے اگر نہیں بلکہ

یقیناً نہیں تو پھر کس نے انہیں انسانوں کی جانیں لینے پر معمور کیا ہے اور کہیں سرزمین پاکستان کا انتخاب اس خاص وجہ سے تو نہیں کیا گیا ہے کہ یہ مملکت اُن کے ارادوں کی راہ میں ایک مضبوط رکاوٹ ہے یا یہ کہ اس کی ایٹمی قوت نا قابل برداشت ہے۔ یہ ملک جس میں ایک عام آدمی صرف اپنے مسلک سے سروکار رکھتا ہے یہاں کون فرقے کے نام پر تفریق پیدا کرتا ہے، علاقے کے نام پر نفرت پیدا کرتا ہے یا صوبائیت کا تعصب پھیلاتا ہے، ظاہر ہے کوئی تو ہے اور ہمارے حکمران اور ذمہ داران تو جانتے ہی ہیں تو کیا پھر مشیر خارجہ سرتاج عزیز کا صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ دہشت گردی میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے یا اُس ہاتھ کے نام کا اعلان کرکے اُسے کاٹ دینا ضروری ہے۔

قوم بہت سہہ چکی ہے بہت خون ناحق بہہ چکا اب سیاست نہیں سنجیدگی کا وقت ہے کارندے چاہے اندرونی ہیں لیکن آقا بیرونی اور حکومت کو اب ہر صورت، ہر راستہ اپنا، کر عوام کی جانیں محفوظ بنانی ہونگی خون ناحق بہہ جانے کا یہ سلسلہ روکنا ہوگا یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ دشمن ہمارے حوصلے پست نہیں کر سکتا۔ سر رہیں گے تو حوصلے رہیں گے جب سر ہی ختم ہو جائیں گے تو حوصلے کس کام کے اب آخری حد تلاش کر لینی چاہیے۔

میاں صاحب! ملاقات نہیں مذاکرات کریں

امن کی خواہش ہر انسان کی انسانیت کی دلیل ہوتی ہے لیکن اس خواہش کی کامیابی کا تمام تر دارومدار طرفین کی باہمی رضامندی، عزت، احترام اور برابری پر ہے۔ جہاں ایک کمزور اور دوسرا طاقتور ہو وہاں جبر سے لڑائی اور جنگ روکی جاتی ہے امن کی خواہش اور خوشحالی کی توقع کے لیے نہیں۔ کچھ یہی حال پاکستان اور بھارت کے درمیان امن کی خواہش کا ہے اگر تو یہ برابری کی بنیاد پر ہو تو اس پر ظاہر ہے کسی کو اعتراض نہیں بلکہ ہر باشعور شخص اس پر خوشی محسوس کرے گا کہ جنگی تیاریوں کی بجائے عوام کی خوشحالی، قومی ترقی اور معاشی سرگرمیوں پر توجہ دی جائے گی لیکن اگر اپنی زمینی وسعت اور زیادہ آبادی کی بنا پر بھارت خود کو ہمارا مالک و مختار سمجھنے کی کوشش کرے تو اس میں امن کی کسی خواہش کا عمل دخل نہیں بلکہ صرف دھونس اور دھاندلی ہے اور ہماری طرف سے ایک سمجھ میں نہ آنے والی گرمجوشی بلکہ بسا اوقات خوشامدانہ حد تک گرمجوشی دکھا کر اپنی کمزوری ظاہر کی جاتی ہے۔

موجودہ حکومت جب اقتدار میں آئی، بلکہ ابھی تو الیکشن ہی جیتا تھا کہ جناب نواز شریف نے اپنی بھرپور خواہش کا اظہار کیا کہ بھارتی وزیراعظم منموہن

سنگھ اُن کی تقریب حلف برداری میں شریک ہوں لیکن منموہن سنگھ نے اس تقریب اور جناب نواز شریف کو اس قابل ہی نہیں سمجھا۔ اب اقوام متحدہ کے اجلاس کے دوران جس طرح مذاکرات کے لیے بھارتی وزیر اعظم کو درخواست دی گئی اور پھر جس طرح کا اس طرف سے رویہ دکھایا گیا اور یہ درخواست مسترد کی گئی وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کو کافی ہے۔ دونوں وزراء اعظم ملیں گے ضرور لیکن یہ صرف ملاقات ہو گی ۔ منموہن سنگھ نے بتا دیا ہے کہ کشمیر پر کوئی بات نہیں ہو گی ۔ اگر پاک بھارت مذاکرات میں کشمیر پر بات نہ ہو تو مذاکرات منعقد کرنے کی ضرورت کیا ہے جبکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ اصل وجہ نزاع ہے ہی کشمیر اور جب تک یہ تنازعہ حل نہ ہو پاک بھارت تعلقات معمول پر آ ہی نہیں سکتے۔ اقوام متحدہ اسے متنازعہ علاقہ تسلیم کر چکی ہے لیکن بھارت اسے اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے جبکہ وہ اقوام متحدہ کا رکن ہے اور اس کے چارٹر پر دستخط کر چکا ہے لیکن لگتا یہ ہے اقوام متحدہ کا کام بھی امریکہ کو فوج کشیوں کی اجازت دینا اور اس کے دوستوں کے جائز اور نا جائز اقدامات کو تحفظ دینے کے علاوہ کوئی نہیں۔ جبکہ جب تک کشمیری خود اپنے حق آزادی و خود ارادیت سے دست بردار نہیں ہوتے تب تک بھارت ایسا کہنے کا حق بھی نہیں رکھتا اور میرے خیال میں کشمیری جس طرح ہر روز اپنی جانیں دے رہے ہیں آخری کشمیری بھی زندہ رہا تو کشمیر کی آزادی کی بات کرے گا وہ اپنے لاکھوں ہم وطنوں کے خون سے غداری کر ہی نہیں سکے گا۔

منموہن سنگھ جو کشمیریوں کو تو خودارادیت دینے کو تیار نہیں لیکن پھر بھی سمجھتا ہے کہ بھارت میں دہشت گردی نہ ہو یعنی کشمیری ظلم چُپ چاپ سہتے جائیں۔ پاکستان میں تو بھارتی دہشت گردی کے ثبوت موجود ہیں جس کے بارے میں ایک پوری فائل تو سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے شرم الشیخ میں بھارتی وزیراعظم کو پیش کی تھی اور اس کا دوسرا اور کھلا ثبوت افغانستان میں اسکی بلاوجہ موجودگی ہے۔ وہ کرزئی کے تمام فیصلوں پر بھی اثرانداز ہے اور اپنا قومی فرض نبھاتے ہوئے فاٹا میں دہشت گرد بھیجتا بھی ہے اور بناتا بھی ہے اور بلوچستان کا تو سب سے بڑا مجرم ہی بھارت ہے۔ اگر بھارت پاکستان میں دہشت گردی بند کردے اور دہشت گرد بنانا چھوڑ دے تو تب ہی اس فساد کو روکا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے ایک مضبوط معیشت رکھنے والا خوشحال پاکستان بھارت کے حق میں بالکل بھی نہیں۔ بھارت سسکتے بلکتے بے گھر و بے سائبان لاکھوں کروڑوں آبادی رکھنے کے باوجود ایک مضبوط معیشت گردانا جارہا ہے اگرچہ ایسا ہے بھی لیکن اس کا چرچا ہمارا میڈیا ضرورت سے کچھ زیادہ کرکے دنیا میں اُس کے لیے مزید منڈیاں تلاش کردیتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف بھارت پاکستان کو دہشت گردی کا گڑھ کہہ کر کچھ ہونے والی معاشی سرگرمیوں کو بھی روک دیتا ہے۔ دہشت گردی ساری دنیا سے بڑھ کر پاکستان کا مسئلہ ہے، دھماکوں سے ہمارے شہر گونجتے ہیں بھارت میں تو اکادکا ہی واقعات ہوتے ہیں

جس کی ذمہ داری وہاں کی تنظیمیں قبول کرلیتی ہیں یہ اور بات ہے کہ اس قبولیت کے باوجود وہ ان کا سلسلہ پاکستان سے جوڑ دیتا ہے اور وہ اپنا پروپیگنڈا اس زور و شور اور کامیابی سے کرتا ہے کہ پاکستان پوری دنیا میں قابل نفرت ٹھہرتا ہے۔ مذاکرات کے ایجنڈے سے کشمیر کو نکال دینا اگر بھارتی وزیر اعظم کی ضد ہے تو ہماری طرف سے بھی مطالبات ہونے چاہیءں نہ کہ ہم اُن کی شرائط پر بات کریں، جو مذاکرات بھیک کی طرح مانگے جائیں ان کی کامیابی کی تو یا امید نہیں رکھنی چاہیے اور اگر کوئی کامیابی ہوگی تو ظاہر ہے قومی مفادات اور قومی وقار کی دھجیاں اڑا کر ہونگی۔ میاں صاحب کو منموہن سنگھ کی بوڑھی دیہاتی عورت کی طرح اوبامہ کو شکایت لگانا اگر نظر آگیا ہے تو بھارت کو پسندید تجارتی ملک قرار دینے سے پہلے ان کا 407 بلین ڈالر کا فائدہ بھی نظر آجانا چاہیے جس کے بدلے میں پاکستان کو صرف 89 بلین ڈالر کا فائدہ ملے گا۔ جبکہ دہشت گردی میں اُس کے ہاتھ ہونے کے ثبوت جو بقول حکومت کے اُس کے پاس موجود ہیں دنیا کو دکھا دینے اور رکوا دینے میں فائدہ پاکستان اور پاکستان کے نکتہ نظر کا ہو۔

میاں صاحب! قوم نے آپ کو ووٹ دیا تھا کہ آپ دہشت گردی ختم کریں گے، آپ معاشی سرگرمیاں بحال کریں گے، آپ ایک خوشحال پاکستان قائم کریں گے لیکن چار پانچ ماہ گزرنے کے باوجود ایک بھی کام ہوتا نظر نہیں آرہا۔ اگر آپ کشمیر کے

مسئلے پر بھی پیچھے ہٹ جائیں گے، آپ مذاکرات نہیں خوشامد کریں گے، آپ بھارت کی بالادستی قبول کرلیں گے، آپ امن کی آشاوالوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے قومی مفادات کا سودا کریں گے تاکہ آپ کو میڈیا سپورٹ حاصل رہے تو آپ قومی سپورٹ کھودیں گے۔ امن ہر پاکستانی کی خواہش ہے لیکن ان دھماکے کرنے والوں کا تو ہاتھ روکیں۔ ملک کے چند علاقوں میں تو خدا کا شکر ہے کافی حد تک امن ہے لیکن آپ اور چوہدری نثار پورے پاکستان کے ذمہ دار ہیں اور پشاور اب بھی دھماکوں سے گونج رہا ہے اور تمام تر الزام عمران اینڈ کمپنی پر ڈال کر ذمہ داری سے سبکدوشی دکھائی جارہی ہے۔اب جبکہ کچھ دھماکوں سے تو طالبان نے بھی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے تو منموہن سنگھ کو بتا دیجئے گا کہ مذاکرات کی پیشکش کے باوجود دھماکوں میں ملوث ہاتھ آپ کو تھمادے اور اپنا ہاتھ روک لے تاکہ پاکستان سے دہشت گردی اور دہشت گردوں کا خاتمہ ہو۔ دہشت گردی ان کا نہیں ہمارا مسئلہ ہے اس سے نمٹنے میں ہمیں ان کا تعاون درکار ہے کہ وہ اپنے یہ کارندے پاکستان بھیجنا چھوڑ دے اگرچہ ان کو یہ قبول نہ ہوگا کیونکہ ہم اس ’’ایشیئن اکنامک ٹائیگر‘‘ کے مقابلے پر آجائیں گے لیکن ہمیں اپنی بقاء کی جنگ لڑنی ہے بھارت کے مفادات اور ترقی کی نہیں۔

سونیا گاندھی کی نیو یارک آمد اور سکھوں کا بھولا ہوا دکھ

طالبان سے مذاکرات کی پیشکش اور کوشش کے بعد پشاور تین بار دل دہلا دینے والے خونی دھماکوں سے لرز کر رہ گیا آہ و بکا اور چیخ و پکار سے ہر پاکستانی کا دل دہل کر رہ گیا لیکن اس بار ہوا یہ کہ ہر دہشت گرد واقعے کی ذمہ داری قبول کرنے والے طالبان نے بھی ان واقعات پر غم وغصے کا اظہار کیا اور ان دھماکوں سے لاتعلّقی کا اظہار بھی کیا تو پھر کون یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ میاں نواز شریف نے بھی اس خفیہ ہاتھ کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا اب یہ خفیہ ہاتھ بظاہر تو بیرونی ہے تو یہ بیرونی دشمن کون ہے ہمیں دہشت گردی کا گڑھ قرار دینے والے کیا اس ہاتھ کی نشاندہی کر سکیں گے ۔

بھارت خود دہشت گردی کا سب سے بڑا سپوٹر ہے اور پاکستانیوں کے لیے تو بھارت کا یہ کردار اور چہرہ کوئی نیا نہیں مشرقی پاکستان میں اس کا کردار تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ دوسرے ملکوں میں دراندازی تو خیر ایک عام بات ہے وہ اپنے ملک میں رہنے والی اقلیتوں کو جس عذاب میں مبتلاء رکھتا ہے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ مسلمان تو اکثر اوقات ان کے نشانے پر رہتے ہیں کبھی انفرادی طور اور کبھی اجتماعی قتلِ عام کا نشانہ بنتے ہیں اور قاتل کھلے عام پھرتے ہیں بلکہ قومی لیڈر بن جاتے ہیں۔ بال ٹھاکرے اور نریندر مودی جس

طرح دندناتے پھرتے ہیں وہی بھارت کا چہرہ بے نقاب کرنے کو کافی ہے۔ ایک سلمان خورشید تمام ہندی مسلمانوں کا چہرہ نہیں اور مسلمان ہی کیا سکھ تو اپنا وہ غم آج تک نہیں بھولے جب اُن کے مقدس گولڈن ٹیمپل کو بھارتی فوج نے بوٹوں تلے روندا تھا اور ان کی نسل کشی کی تھی نہ ان کے مرد بچے تھے نہ عورتیں، نہ بوڑھے نہ جوان اور نہ ہی بچے ان کو چن چن کر مارا گیا۔ سکھ دوست تو معلوم نہیں کیسا ہوگا لیکن بقول ایک پاکستانی فوجی افسر دلیر اور ظالم دشمن ضرور ہے اور یہی وجہ تھی کہ علاج کے لیے امریکہ پہنچی ہوئی سونیا گاندھی کو انہوں نے معاف نہیں کیا اور اُسے یاد دلایا کہ راجیو کی ماں نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور خود سونیا اندرا کی محبت میں تو ہرگز نہیں لیکن سیاست بازی میں ضرور سکھوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کے مجرموں کو تحفظ فراہم کرتی ہیں اور بات صرف منہ زبانی نہیں کی بلکہ 3 ستمبر 2013 کو امریکہ کی فیڈرل کورٹ سے اُسے سمن جاری کروایا گیا جو اس واقعے کے انتیس سال بعد ہوا لیکن بھارت کا اصل چہرہ دنیا کو یاد کروا دیا گیا وہی چہرہ جو کشمیر میں کشمیریوں کے قتل کے وقت ہوتا ہے یہ وہ سکھ تھے جو اس قتل عام کے وقت بچ نکلے تھے۔ یہی حال کشمیریوں کا بھی ہے اور نکسلائٹس کا بھی ان کی نسلوں کی نسلیں حالت جنگ میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی اور نئی نسل کا دکھ پرانی نسل سے بڑھ کر ہوتا ہے کہ پرانی نسل نے کچھ تو اچھے دن دیکھے ہونگے اپنے وطن اپنی زمین کی شیرینی محسوس کی ہوگی نئی نسل کے حصے میں تو پرائی

ہوا اور پرایا پانی ہوتا ہے لیکن اپنے آزاد وطن کی خواہش سب کی ہوتی ہے اور وہ بھی جب ان کی نہ عزت محفوظ ہو نہ گھر اور سب سے بڑھ کر دین اور مذہب کا غیر محفوظ ہونا انسان کو کچھ بھی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کبھی احتجاج، کبھی دہشت گردی، کبھی بغاوت اور کبھی آزادی کا مطالبہ۔ بھارت سمجھتا رہا کہ سکھ شاید 1984 کو بھول چکے ہیں لیکن یہ چنگاری ایک دفعہ پھر ایک ہلکی سی لو دکھا گئی اور سونیا گاندھی کی نیویارک آمد پر سکھوں کو اپنا بھولا ہوا دکھ یاد آ گیا۔ بھارت اگر یہ سمجھتا ہے کہ کسی اقلیتی مذہب اور برادری سے کسی ایک شخص کو صدر، وزیراعظم یا وزیر خارجہ یا کوئی اور وزیر بنا کر اُس نے اُس اقلیت کا حق ادا کر دیا یا اُسے مطمئن کر دیا تو ایسا ہوتا نہیں ہے ورنہ تو کشمیری آج اپنی آزادی کی تحریک ختم کر چکے ہوتے یا یہ چند ایک سکھ سہی منموہن سنگھ کو وزیراعظم دیکھ کر سونیا گاندھی سے اپنی تاریخ کا حساب نہ مانگتے۔ دوسروں کے گھر میں اور معاملات میں مداخلت کرتے کرتے ''عظیم جمہوریت'' یہ بھول جاتی ہے کہ اُسے اپنے لوگوں اور اپنی اقلیتوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں۔ دوسروں پر دہشت گردی اور مداخلت کا الزام لگاتے ہوئے اگر اپنے گریبان میں جھانک لے تو اُسے خون کے کئی دھبے نظر آئیں گے جس میں کوئی مسلمان، کوئی سکھ کوئی بنگالی کوئی نکسل باڑی کوئی پاکستانی اور کوئی سری لنکن ہوگا جہاں اُس نے اپنے خون کی پیاس بجھائی ہے۔

بھارت اگر خطے میں سکون چاہتا ہے جس کا وہ پوری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتا ہے تو اُسے اپنے رویے اور کردار میں تبدیلی پیدا کرنا ہوگی نا کہ دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے سے امن پیدا ہوگا اور اگر وہ اپنے گھر پر توجہ دے تو پڑوسی بھی سکون میں رہیں گے اور بھارتی عوام بھی لیکن شاید بھارت سرکار کے لیے ایسا کرنا خاصا مشکل ہوگا۔

بھارتی آرمی چیف کی سپیشل یونٹ

پاکستان میں بار بار کے مارشلاؤں نے ایک تاثر پیدا کر دیا ہے کہ یہاں حکومت ہر فیصلہ فوج سے پوچھ کر کرتی ہے اور خاص کر ہماری خارجہ پالیسی پر فوج کا اثر بہت زیادہ ہے بلکہ آسان الفاظ میں یوں کہا جائے کہ فوج اپنی مرضی کی مالک ہے اور حکومت کی بھی۔یہ تذکرہ کرتے ہوئے ہمارے اپنے تجزیہ کار بھی جو مثال دیتے ہیں وہ ''عظیم جمہوریت ''بھارت کی ہے اور یہ مثال دیتے ہوئے یہ ذکر بھی کیا جاتا ہے کہ وہاں فوج کا سربراہ کس کس طرح اور کب کب اپنے وزیر اعظم کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے اور اپنی رائے سے مکمل طور پر دستبردار ہو جاتا ہے چاہے معاملہ خالصتاً فوجی ہی کیوں نہ ہو اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہاں فوج صرف اور صرف پیشہ ورانہ فرائض سے غرض رکھتی ہے لیکن ان تمام دعووں کا پول اس وقت کھل گیا اور تجزیہ کاروں کے تمام خیالات اس وقت باطل ثابت ہوئے جب یہ خبر خود بھارتی میڈیا پر آئی کہ بھارت کے سابق آرمی چیف جنرل ریٹائرڈ وی کے سنگھ کے حکم سے کچھ ایسی یونٹس بنائی گئیں جن کی کوئی فوجی ڈیوٹی نہیں تھی نہ ہی حکومت کو اِن کے قیام کی خبر تھی یا اگر تھی بھی تو اسے صیغہ راز میں رکھا گیا تا کہ یونٹیں اپنا کام تسلی سے کر سکیں اور حکومتی مقاصد حاصل ہوتے رہیں۔اِن یونٹس کو جو ذمہ داری سونپی گئی وہ یہ تھی کہ کشمیر میں

وزرائ اور سیاستدانوں کو حکومتی حمایت پر مجبور کریں ۔اِس کام کے لیے وزرائ کو خطیر رقوم رشوت میں دی گئیں جنرل وی کے سنگھ نے خود اعتراف کیا کہ وزیر زراعت غلام حسن میر کو رشوت دی گئی تاکہ وہ مقبوضہ کشمیر کی حکومت میں تبدیلی لانے کے لیے کام کریں اور ظاہر ہے کہ تبدیلی وادی کے عوام کے خلاف اور بھارتی حکومت کے حق میں تھی۔ سابق آرمی چیف نے یہ بھی اعتراف کیا کہ فوج سیاستدانوں کو رشوت دیتی رہی تا کہ وہ کشمیر میں مرکزی حکومت کی وفادار حکومت قائم رکھ سکے۔ یہ ٹیکنکل سروسز ڈویژن کسی قسم کی ٹیکنکل خدمات سرانجام نہیں دے رہا تھا بلکہ سیاسی مقاصد کے لیے بنایا گیا اور اس نے رشوت اور بدعنوانی سے اپنے اِن فرائض کو سرانجام دیا یہی ٹی ڈی ایس پاکستان میں بھی غیر قانونی کاروائیاں سرانجام دے رہا تھا اس بات کا اعتراف بھی اس فورس کے ایک کارکن نے کیا کہ یہ ڈویژن دہشت گردی اور بدامنی اور سبوتاژ کی کاروائیوں میں ملوث تھا۔

خود سابق آرمی چیف کا یہ اعتراف کہ ایسی فورس بنائی گئی جو فوج کا حصہ تھی لیکن اُسے غیر فوجی بلکہ دہشت گرد کاروائیوں کے لیے استعمال کیا گیا اور اُسے حکومت بنانے اور گرانے کے لیے بنایا گیا اور وہ رشوت کے ذریعے یہ فرض سرانجام دیتا رہا۔ یہ اعترافات بھارت کی جمہوریت کی عظمت کی قلعی کھول دینے کے لیے کافی ہے اور ان ''عظیم تجزیہ نگاروں کے منہ بند کرنے کو بھی کہ جو''

اپنے ملک کی تذلیل کرتے وقت دشمن کا حوالہ دیتے نہیں تھکتے۔بھارت عرصہ دراز سے بلکہ اپنے قیام کے وقت ہی سے پاکستان مخالف کاروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے لیکن ساتھ ہی وہ پاکستان پر دراندازی اور دہشت گردی کے الزامات لگاتا ہے بلکہ اپنے ہاں ہونے والے کئی واقعات کی تحقیقات وہ پاکستان میں ہی کرنا چاہتا ہے اور جو تحقیقات اور تفتیش وہ اپنے ملک میں کرے اُس کے ڈانڈے بھی پاکستان سے جوڑ دیتا ہے اور پھر اس پر پاکستان سے مسلسل باز پرس بھی کرتا ہے اور تعلقات خراب کرنے کے بہانے کے طور پر استعمال بھی کرتا ہے۔اکثر اوقات یہ بھی ہو جاتا ہے کہ خود اُس کی کوئی عدالت یا کوئی اہلکار اس بات کا اقرار بھی کر لیتا ہے کہ واقعے کی تمام تر ذمہ داری خود بھارتی افراد پر تھی۔کبھی یہ ہوتا ہے کہ اپنے مسلمان شہریوں کا تعلق پاکستان سے جوڑ کر اُنہیں کسی واقعے میں ملوث کر دیتا ہے لیکن یہ تعلق بھی کسی طرح ثابت نہیں ہو پاتا اس کی چند مثالیں مذکورہ واقعات ہیں۔ایک اٹھارہ سالہ لڑکی عشرت جہاں کا تعلق دہشت گردی اور پاکستان سے جوڑ کر اسے بر سرِ سڑک قتل کر دیا گیا اور بعد میں عدالت نے کسی ایسے تعلق کی تردید کی۔افضل گرو کی پھانسی کی سزا کا حکم سُناتے ہوئے عدالت نے اعتراف کیا کہ ایسا کوئی ثبوت نہ مل سکا کہ اُس نے بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ کیا تھا لیکن عوامی دباؤ کے تحت اُسے پھانسی کی سزا دی جا رہی ہے۔کیا دُنیا کے کسی دوسرے ملک میں اس قسم کے انصاف کی مثال ملتی ہے کہ بے گناہی کے اعلان کے ساتھ سزائے موت سُنا دی جائے۔پھر سمجھوتہ ایکسپریس کے

بارے ہیں کرنل پروہت سری کانت نے جو حاضر سروس کرنل تھا، نے اعترافِ جرم کیا لیکن 68 افراد کے اِس قاتل کو تا حال کوئی سزا نہیں دی گئی۔ پھر سب سے بڑھ کر ممبئی حملوں کا وہ واقعہ جس پھر بھارت جنگ جو ایٹمی بھی ہو سکتی تھی پر تیار ہو گیا تھا اور جب اس کے کچھ اہلکاروں نے عدالت میں یہ بیان ریکاڈ کرایا کہ یہ بھارت نے کرایا تھا اس پھر بھی بھارت سرکار نے خاموشی اختیار کر لی۔ گزشتہ ہی سالوں کے واقعات بھارت کا اصل چہرہ بے نقاب کر دینے کو کافی ہیں۔ اَب اس کے سابق آرمی چیف کا ایک اور اعتراف جرم سامنے آیا تو دُنیا کو یہ جان لینا چاہیے کہ دہشت گرد کون ہے پاکستان یا بھارت۔ بھارت کے تمام دعوے تو خود اسی کی طرف سے کسی نہ کسی طرح باطل ٹھہر جاتے ہیں۔ اگرچہ ہونا تو یہ چاہیے کہ پاکستان بھارت کو اُس کے اِن جرائم پر پاکستان سے معافی مانگنے کو کہے کہ اُس کے بیانات کی وجہ سے پاکستان کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی کی جائے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ بھارت مسلسل دھونس جماتے ہوئے پاکستان کو دہشت گرد قرار دینے پر مُصر ہے۔ اس وقت کسی چھوٹی سے چھوٹی خبر کو اُچھال کر اور بریکنگ نیوز بنا کر پیش کرنے والا اور بلا جواز تبصرے اور تجزیے کرنے والا ہمارا میڈیا اگر بھارت کے پروپیگنڈے کا موثر جواب دے تو شاید ہم دُنیا میں اپنا مقدمہ بہتر انداز میں لڑ سکیں گے اور ساتھ ہی ہمیں بھارت کو یہ بھی بتانا ہو گا کہ وہ پاکستان میں دہشت گردی کرنا چھوڑ دے "را" کو کچھ اور ذمہ داریاں دی جائیں، ٹی ڈی ایس جیسی

یونٹوں کو اُس کے اصل کام تک محدود رکھا جائے، دراندازی کے الزامات کی بجائے خود دراندازی روکے تاکہ برصغیر پاک و ہند میں امن قائم ہوسکے ورنہ حالات کی ذمہ داری بھارت پر ہی ہوگی کیوں کہ ہر ملک کی طرح پاکستان کو بھی اپنے دفاع کا مکمل حق حاصل ہے۔

بھارت اپنے مجرم اپنے اندر تلاش کرے

پاکستان اور بھارت۔بر صغیر کے دو بڑے ممالک ، دو ایٹمی قوتیں اور دو پڑوسی ممالک ہیں لیکن اس سب کچھ کے باوجود دونوں ممالک کے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے دراصل پاکستان کا وجود میں آنا ہی بھارت نے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ۔بر صغیر کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے تابع رکھ کر پورے ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا تھا اور اسکی یہ خواہش اب بھی مری نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دہشت گردی اور سازش کے ذریعے اب بھی پاکستان کے وجود کے درپے ہے بلکہ کچھ عرصے بعد لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی اور چند ایک نہتے پاکستانی دیہاتوں کو شہید کر دینا بھی اس کے معمولات میں شامل ہے، پاکستانی فوج کے ساتھ جھڑپوں کا ماحول پیدا کرنا اور گولہ باری بھی اسکی نیت کی غماز ہے یہ اور بات ہے کہ پاکستان کی جوابی کاروائی پر ان کی توپیں اور بندوقیں خاموش ہو جاتی ہیں ۔ پچھلے چند ماہ سے وہ۔بڑی باقاعدگی سے اپنا یہ مجرمانہ کردار جاری رکھے ہوئے ہے وہ مسلسل ایل او سی کی خلاف ورزی بھی کر رہا ہے اور پاکستان پر الزامات بھی لگا رہا ہے۔ اس کا میڈیا خبر بناتا ہے اور اچھا لتا ہے اور اس کی فوج ، حکومت، حزب اختلاف ، عوام اور سرکاری حکام کبھی سب کے سب پاکستان کے خلاف بیک زبان ہرزہ سرائی شروع کر دیتے اور

کبھی باری باری یہ کام کیا جاتا ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے اقوام متحدہ کے اجلاس کے دوران بھارتی وزیراعظم نے پاکستان کو دہشت گردی کا گڑھ قرار دیا لیکن جب پھر بھی کسی نہ کسی طرح دونوں وزرائے اعظم مل لیے تو بھارتی میڈیا نے مقبوضہ کشمیر میں سمباکے ہیرا نگر تھانے اور ملٹری کیمپ پر ہونے والے حملے کو پاکستان سے منسوب کر دیا اگرچہ اس حملے کی ذمہ داری شہدا بریگیڈ نے قبول کر لی جو خود بھارت کے اندر کی تنظیم ہے۔ پاکستان نے اس دہشت گردی کی شدید الفاظ میں مذمت کی۔ یہ دہشت گرد بھارتی فوج کی وردی میں ملبوس تھے اس حملے میں ایک لیفٹیننٹ کرنل، آرمی اور پولیس افسران سمیت چودہ افراد ہلاک ہوئے۔ یہ سب کچھ نسبتاً پر امن علاقے میں ہوا اور الزام حسبِ معمول پاکستان پر لگا دیا گیا۔

بھارت کی طرف سے پاکستان مخالف واقعات و بیانات میں یہ تیزی کچھ اتنی خلاف معمول بھی نہیں بلکہ بھارت میں جب بھی انتخابات کا زمانہ قریب آتا ہے تو ایسی ہی پاکستان مخالف کاروائیاں زور پکڑ لیتی ہیں تاکہ پاکستان مخالفت کا ووٹ حاصل کیا جا سکے۔ بی جے پی کی پاکستان دشمنی کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے اور اگلے سال ہونے والے انتخابات کی تیاری کے طور پر وہ پھر سرگرم عمل ہے۔ خوش فہمی کانگریس کی طرف سے بھی کوئی نہیں کیونکہ اسی کے دورِ حکومت میں سرحدی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں اور بھارتی آرمی چیف، پاک فوج

اور آئی ایس آئی کے خلاف بیانات جاری کر رہا ہے لیکن بی جے پی کا طریقہ واردات تو سیاسی حد سے آگے نکل کر مجرمانہ انداز اپنا لیتا ہے مذکورہ حملہ بھی غالب گمان یہی ہے کہ اُس نے ہی کرایا ہے۔ بات یہ ہے کہ چاہے یہ حملہ شہداء برگیڈ نے کیا یا بی جے پی نے کرایا یہ بھارت کا اندرونی معاملہ اور اندرونی جرم ہے اگر وہ اپنے مجرم خود اپنے بیچ میں تلاش کرلیا کرے تو بر صغیر کے حالات میں بہت بہتر تبدیلی آسکتی ہے اور ساتھ ہی اگر ہمارا میڈیا بھارتی میڈیا کا موثر جواب دے سکے اور یک طرفہ امن کی بجائے دو طرفہ امن کے لیے کوشش کرے تو شاید امن کے قائم ہونے کی کوئی اُمید بھی پیدا ہو۔ اور یہ امن قائم رکھنے کی ذمہ داری دونوں ممالک پر ڈالی جائے اگر بھارت اپنے رویے کی تبدیلی پر آمادہ ہو جائے اور اپنے میڈیا کو بھی پروپیگنڈا مہم کے لیے وقف نہ کرے بلکہ اسے خبروں کی صحت کے بارے میں پابند کرے تو بھی حالات بہتر ہو سکیں گے ساتھ ہی اپنی انتہا پسند تنظیموں کو لگام دے اور ہر واقعے کی ذمہ داری پاکستان پر نہ ڈالے تو وہ اپنے ہاں ہونے والے جرائم اور دہشت گردی کے مجرم تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکے گا اور بدلے کے طور پر پاکستان میں بھی ایسی کاروائیوں سے احتراز کرے، یہاں اپنے دہشت گرد نہ بھیجے اور دہشت گردی کے خلاف پاکستانی کوششوں میں تعاون کرے تو بر صغیر کو دہشت گردی اور بدامنی سے پاک علاقہ بنایا جاسکے گا۔

حقیقتِ کشمیر

کیا پاکستان اور پاکستانیوں نے کشمیر اور کشمیریوں کو بھلا دیا ہے یا اُن پر اتنی مشکلیں آن پڑی یا ڈال دی گئیں کہ اُن کو اُنہی سے فرصت نہیں۔ وہ دہشت گردی، فرقہ پرستی، غیروں کی مسلط کردہ اور حکمرانوں کی اپنائی ہوئی جنگ لڑنے میں ہی مصروف ہیں ، کبھی ڈرون پر احتجاج، کبھی دھماکوں پر آنسو، کبھی لوڈشیڈنگ کے خلاف جلتے ٹائر اور کبھی مہنگائی کے خلاف ہنگامے، غرض ہر کوئی کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہے اور یہ سب قومی مسائل ہیں جن سے ہر پاکستانی لڑ رہا ہے۔ لیکن کشمیر آج بھی پاکستان کی بقاء کا سوال ہے اور تاریخ آج بھی اس کو پاکستان کے بہت سارے مسائل کی وجہ قرار دیتا ہے۔ اگر مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ ستائیس اکتوبر 1947ء کو اس مسلم اکثریتی ریاست کے بھارت سے الحاق کا اعلان نہ کرتا بلکہ پاکستان سے ہر رشتے میں جڑے ہوئے کشمیر کو پاکستان کا حصہ قرار دے دیتا تو برصغیر کے دو بڑے ممالک یعنی پاکستان اور بھارت کے درمیان یہ بہت بڑی وجہ نزاع جنم ہی نہ لیتی جو تین کھلی جنگوں کا باعث بنی۔ کشمیر کا ہی مسئلہ اسلحے کی ایسی دوڑ کی وجہ ہے جس نے خطے کے غریب عوام کو انتہائی زرخیز خطہ ہونے کے باوجود بھوک و افلاس میں مبتلاء رکھا ہوا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم بالکل واضح طور پر

مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی، پاکستان کا مطالبہ ایک الگ مملکت کا نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ تھا جہاں بقول قائداعظم کے وہ اسلامی اصولوں کو آزما سکیں اور اس مطالبے کو ہندوستان کے ہر مسلمان کی حمایت حاصل تھی اور اسی مطالبے کو انگریز اور ہندو دونوں نے چاہے بے دلی سے لیکن تسلیم کیا یا انہیں مسلمانوں کے جوش و جذبے کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے تو پاکستان وجود میں آیا۔ اب اگر پاکستان مذہب کی بنیاد پر بنا تو ایک مسلمان ریاست کو کس طرح وہاں کے عوام کی مرضی کے خلاف ایک غیر مسلم ملک کا حصہ بنا دیا گیا ظاہر ہے یہ اس نوزائیدہ مملکت کے خلاف سازش تھی۔ بھارت نے اگرچہ پاکستان کو تسلیم کر لیا تھا لیکن درپردہ وہ ہر صورت اکھنڈ بھارت کے خواب کو پورا کرنا چاہتا تھا لہٰذا پہلے انگریز کے ساتھ ساز باز کر کے پنجاب کی تقسیم اپنی مرضی کے مطابق کروائی اور اپنے لیے راستہ بنا کر کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کیں۔ کشمیر نہ صرف مذہبی لحاظ سے پاکستان کا حصہ تھا بلکہ جغرافیائی لحاظ سے بھی یہ پاکستان کا ہی حصہ بنتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ کشمیریوں نے کبھی بھی اس الحاق کو قبول نہیں کیا جو ان کی مرضی کے خلاف اُن پر مسلط کیا گیا۔ یوں تو کشمیری مسلمان دو صدیوں سے کبھی انگریزوں اور کبھی سکھوں کا محکوم رہا ہے لیکن اپنی آزادی کی جدوجہد سے کبھی دستبردار نہیں ہوا اور تقسیم ہند کے وقت اس کے ساتھ جو ظلم کیا گیا اور اس کی آزادی کو جس طرح سلب کیا گیا اس کے خلاف وہ روز اول سے ہی برسرپیکار

ہے اور ستائیس اکتوبر کو وہ آج بھی یوم سیاہ کے طور پر مناتا ہے جب ان کی آزادی پر ایک بار پھر شب خون مارا گیا تھا اور اس بار انہیں ایک ایسے غاصب کے حوالے کیا گیا تھا جس کی مکاری اور عیاری ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج بھی کشمیر میں سات لاکھ بھارتی فوجی موجود ہیں یعنی صرف ایک ریاست کو قابو میں رکھنے کے لئے ایک بڑے ملک کی فوج جتنی فوج استعمال ہو رہی ہے اور اس کے باوجود بھارت یہ کہتا ہے کہ کشمیری اس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور دنیا کو یہ تاثر دیتا ہے کہ جیسے کشمیر کا تمام تر مسئلہ پاکستان کا پیدا کردہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مختلف حیلوں بہانوں اور طور طریقوں سے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش نہ کرتا کہ کشمیر میں امن ہے مگر، اگر ایسا ہے تو پھر سات لاکھ فوج اس ایک وادی میں رکھنے کی ضرورت کیا ہے ابھی حال ہی میں سات ستمبر کو کشمیر میں ایک ایسی ہی بھونڈی کوشش کی گئی جب جرمن سفارتخانے کے تعاون سے ایک محفل موسیقی منعقد کی گئی جس میں زوبین مہتا اور اس کے گروپ نے پرفارم کیا۔ بھارتی نژاد جرمن زوبین مہتا کے مطابق یہ اس کا خواب تھا کہ وہ کشمیر میں یہ محفل موسیقی منعقد کرے اور جھیل ڈل کے کنارے شالیمار باغ سرینگر میں وہ یہ محفل برپا کر کے انتہائی خوش تھا جس میں پندرہ سو مدعو شدہ مہمانوں نے شرکت کی اور اس تقریب کو "احساسِ کشمیر" کا نام دیا اس بارے میں پاکستان نے جرمن سفارت خانے کو اپنے تحفظات سے بھی آگاہ کیا کیونکہ ظاہر ہے ایسی کوششوں کا مقصد صرف سیاسی ہے نہ کہ کشمیریوں کی

خوشی۔ لیکن کشمیری ظاہر ہے کہ دھنوں میں کھو کر اپنا اصل دکھ بھول نہیں سکتا لہذا اس پر خوشی کی بجائے کشمیر کے اصل حالات کے حوالے سے ''حقیقتِ کشمیر'' کے عنوان سے نہ صرف ایک تقریب ہوئی بلکہ آل پارٹیز حریت کانفرنس کی کال پر احتجاجی جلوس نکالے گئے، بھارت چاہے تو ایسی اور تقریبات بھی منعقد کر لے لیکن کشمیری اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بھارت سرکاری طور پر ستائیس اکتوبر کو بڑے جوش و خروش سے مناتا ہے لیکن حقیقتِ کشمیر وہ ہوتی ہے جب کشمیری نہ صرف کشمیر بلکہ پوری دنیا میں سڑکوں پر احتجاج کرکے اور اس دن کو یوم سیاہ کے طور پر مناتے ہیں لیکن اب یوم سیاہ منانے سے آگے بڑھ کر مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کی خواہش کے مطابق حل کرنا ہو گا ورنہ دنیا کی دو ایٹمی قوتوں کے بیچ یہ دھکتا ہوا انگارہ جو اگلی جنگ کی وجہ بنے گا اور یہ جنگ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دے گیاور اسے روکنے کے لیے بھارت کو اقوام متحدہ کی قرار داروں کے مطابق کشمیریوں کو حق ارادیت دینا ہو گا ورنہ اب تک شہید کیے گئے ہزاروں لاکھوں کشمیریوں کی آنے والی نسلیں بھی بھارت کے خلاف برسرپیکار رہیں گی اور اس خون خرابے کا واحد ذمہ دار بھارت ہو گا۔

حسین حقانی۔۔۔آج بھی امریکہ کا خدمت گار

پاکستان مسائل و مصائب کے نہ ختم ہونے والے سلسلے میں عرصہ دراز سے گھرا ہوا ہے اور اس کی بد قسمتی کہ بیرونی دشمنوں کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایسے ایسے کردار موجود ہیں جو اس کے مسائل کو ختم نہیں ہونے دیتے کبھی ایک اور کبھی دوسری طرح سے اس کی اساس اور اس کی نیک نامی کے خلاف سرگرم رہتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات تبدیل نہیں کرتے بلکہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور ہم انہیں بھول کر سمجھتے ہیں کہ وہ یہ بھول چکے ہیں کہ اُنہیں پاکستان کے خلاف کچھ بولنا ہے یا اس کی سُبکی کرنی ہے حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے اور وہ موقع ملتے ہی اپنا چہرہ پھر دکھا دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی کردار حسین حقانی کا ہے جو نہ تو اپنی ذاتی زندگی میں قابل اعتبار ہیں نہ ہی سیاسی زندگی میں اور نہ ہی اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ان کا صرف ایک ہی دین و ایمان ہے اور وہ ہے شہرت اور دولت۔ حسین حقانی نواز شریف کے دورہء امریکہ کو غنیمت جانتے ہوئے مختلف جگہوں پر بولتے نظر آئے، کہیں انٹرویو دیئے، کہیں لیکچر دیئے، کہیں مضامین لکھے جس میں وہ امریکہ کو پارسا اور پاکستان کا خیر خواہ ثابت کرتے رہے اس کی اہمیت جتاتے رہے اور تعلقات کی خرابی کی ذمہ داری پاکستان پر ڈالتے رہے۔ بلکہ مضمون نگار جیفر گولڈ برگ

نے تو حسین حقانی کے بیان کہ ان کا ملک یعنی پاکستان دہشت گردی کی حمایت کرتا ہے کو اوبامہ کے لیے بچاؤ کا ذریعہ بتایا۔ جیفر گولڈ برگ نے اوبامہ نواز ملاقات سے پہلے اپنے مضمون میں لکھا کہ ایمنسٹی انٹر نیشنل کی رپورٹ کے بعد اوبامہ نواز کے سامنے دفاعی پوزیشن پر ہونگے تاہم وہ حسین حقانی کے مذکورہ بیان کا سہارا لے سکتے ہیں۔ اور یوں حسین حقانی کی دونوں خواہشات پوری کر دیں یعنی شہرت اور دولت۔

حسین حقانی اور ان جیسے دوسرے کردار اگر اپنی ذات کی بجائے اپنے ملک کے لیے کام کرتے اور اپنی صلاحیتیں وقف کرتے تو یقیناً اُن کی عزت میں اضافہ ہوتا اور قومی مسائل میں کمی بھی ہوتی ہاں ان کی ذاتی دولت کی فراوانی اثر انداز ہو سکتی تھی۔ حسین حقانی جنھوں نے کراچی یونیورسٹی سے بین الاقوامی تعلقات عامہ میں ایم اے کیا، ایک اچھا طالب علم تھا اور اُس نے بطور طالب علم لیڈر اسلامی جمعیت طلبہ کے پلیٹ فارم سے شہرت پائی اور اسی زمانے میں اس کا امریکی قونصلیٹ کی لائبریری میں بہت آنا جانا رہا اور جب ایک بار طلبہ نے اس قونصلیٹ کے سامنے احتجاج کرنے کا پروگرام بنایا تو اُس نے اپنی تنظیم کا بھی ساتھ نہیں دیا شاید یہی وہ وقت تھا جب سی آئی اے نے اُس کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور اسکے بعد وہ ہمیشہ امریکی مفادات کا تحفظ ہی کرتے ہوئے پائے گئے اور آج بھی وہ یہی فریضہ سر انجام دے رہے ہیں بلکہ امریکہ میں وہ

پاکستانی سفیر کم اور امریکی سفارت زیادہ سرانجام دیتے رہے اور اب بھی امریکہ کی ہی تعریف میں رطب للسان رہتے ہیں۔ صرف یہی وفاداری ہے جو اُس نے نہیں بدلی ورنہ وہ ذاتی ، سیاسی اور قومی وفاداری بدلنے کے معاملے میں ایسی شہرت کما چکے ہیں جو کہ کم ہی کسی کے حصے میں آئی ہو گی۔ اپنے ہر نئے آقا کو وہ بڑی مہارت سے اپنا قائل کر کے اہم عہدہ حاصل کر لیتا ہے لیکن بہت جلد دوسری بڑی آفر پر اپنی وفاداری تبدیل بھی کر لیتا ہے۔ جماعت اسلامی کے ساتھ کام کر کے اور شہرت حاصل کر کے حقانی نے اپنے مزید سیاسی فائدے کے لیے مسلم لیگ نون سے عہد وفا باندھا اور اس زمانے میں اُس نے اخلاق سے گرے ہوئے انداز میں پیپلز پارٹی کے خلاف میڈیا پر بھرپور مہم چلائی جس کو پارٹی لیڈر نواز شریف نے بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور اُس سے جان چھڑانے کی کوشش کی اور اُسے سری لنکا میں پاکستان کا ہائی کمشنر بنا کر بھیج دیا۔ نواز حکومت کے بعد اُس نے اپنی خدمات جنرل مشرف کو بھی پیش کیں لیکن یہاں اُسے کامیابی نہ ملی اور جب پی پی پی کی حکومت آئی تو بی بی اور نصرت بھٹو کے اخلاق تک پر وار کرنے والا یہ شخص پھر اپنی چرب زبانی کے باعث اس حکومت کا منظور نظر بن گیا اور امریکہ جیسی اہم سفارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں وہ امریکی مفادات کا مکمل تحفظ کرتا رہا اور فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف ہرزہ سرائی کی بناء پر مغربی دنیا میں مقبولیت بھی حاصل کرتا رہا لیکن اس بار اُس کا ٹکراؤ اُس سے بڑے ایجنٹ یعنی منصور اعجاز سے ہو

گیا، اگرچہ اُس کی وفاداری بھی قابل بھروسہ نہیں اور اس پاکستانی نژاد امریکی نے پاکستان کے مفاد میں تو ہرگز نہیں لیکن معلوم نہیں اپنے کس فائدے کے لیے اُس میمو کا بھانڈا پھوڑ دیا جو حسین حقانی نے اُسے امریکی حکام تک پہنچانے کے لیے دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ امریکی فوج پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف کاروائی کرے اور سول حکومت کو بچائے بلکہ ایٹمی اثاثوں کی نگرانی بھی اپنے ہاتھ میں لے لے یعنی بہ الفاظ دیگر پاکستان کو امریکی نوآبادی بنا دیا جائے۔ اس معاملے کے بعد حسین حقانی کی اصلیت سب کے سامنے آ گئی اور اُسے سفارت سے استعفیٰ کے بعد پاکستان لایا گیا لیکن پھر بحفاظت نکال کر واپس امریکہ پہنچا دیا گیا۔ ایک شخص ملکی مفاد کے خلاف مکمل طور پر ظاہر ہو چکا ہے تو حکومت پاکستان اور پاکستانی میڈیا کو اُس کے خلاف نہ صرف عوام کو آگاہ رکھنا چاہیے بلکہ ملک، فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف اس کے پروپیگنڈے کا توڑ بھی کرنا چاہیے اگر وہ یہ کہہ رہا ہے کہ پاکستان دہشت گردی کی حمایت کرتا ہے تو اُس سے پوچھا جانا چاہیے۔ بقول حقانی کے اس سے کسی امریکی نے کہا کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم نہ ہو تو اُسکی اہمیت امریکہ کے لیے اُتنی ہے جتنی پاکستان کے لیے مالدیپ کی اور جناب حقانی اس کی مکمل تائید کرتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ امریکہ ہمیشہ خلوص سے پاکستان کے لیے کوشش کرتا لیکن پاکستان میں ہمیشہ امریکہ مخالف جذبات اُبھارے جاتے ہیں۔ کیا وہ ڈرون حملوں، 2 مئی کے واقعے یا سلالہ پر بمباری کی کوئی توجیہہ پیش کر

سکتے ہیں اور کیا امریکہ کو افغانستان میں اپنی جنگ لڑنے کے لیے کسی اور راستے اور سڑک کی پیش کش کر سکتے ہیں۔اُنہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ امریکہ اپنی افغان جنگ کے لیے پاکستان کا دست نگر ہے لیکن پاکستان مالدیپ سے اپنی ایسی کوئی ضرورت پوری نہیں کروا رہا ہاں یہ اور بات ہے کوئی پاکستانی اس امریکی خدمت پر خوش نہیں ہے اور نہ فخر کرتا ہے۔

مسٹر حقانی تو اپنے خاندان ، اپنے سیاسی دوستوں اور نظریات بلکہ اپنے مذہب تک سے وفادار نہیں جس کا اظہار وہ مختلف حیلوں بہانوں سے کرتے ہیں تو وہ بغیر کسی وجہ و اُجرت کے کیسے امریکہ کے لیے وفاداری نبھا رہا ہے۔مغرب میں آخر انہی لوگوں جو پاکستانی ہو کر پاکستان کی کسی بھی طرح سُبکی کا باعث بنتے ہیں کو کیوں اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے اوپر ہماری حکومت اور میڈیا کا رویہ کیوں سرد ہو جاتا ہے۔کیوں نہیں مغربی میڈیا اور اس شخصیت سے پوچھ گچھ ہوتی ہے اگر ہم ایسا کریں گے اور ان کا بھرپور جواب دیں گے تو شاید ہم اس قسم کے منفی پروپیگنڈہ کو کم کر سکیں، پاکستان کا تاثر جو بین الاقوامی طور پر بگاڑا جا رہا ہے اس کو بہتر کیا جا سکے گا اور ہم بین الاقوامی سطح پر اپنا اور اپنے اداروں کا مقدمہ کامیابی سے لڑ سکیں گے ۔یقیناپاکستان میں حسین حقانی سے زیادہ ذہین اور باصلاحیت لوگ موجود ہیں جو اس کا جواب زیادہ مدلل انداز میں دے سکتے ہیں اور اُنہیں یہ جواب قومی خدمت سمجھ کر دینا

چاہیے۔

ملالہ کی مغرب میں پذیرائی پر پہلے شکایت اب تشویش

ملالہ یوسفزئی سوات کی وہ خوش قسمت لڑکی تھی جس نے بہت کم عمر میں پورے پاکستان سے ستائش بھی حاصل کی اور پیار بھی۔ طالبان نے اُس پر حملہ کیا جس میں وہ شدید زخمی ہوئی تو دعائیں بھی بے شمار اُس کے نام ہوئیں ۔ میں نے خود بھی ملالہ کے حق میں اور طالبان کے اس عمل کے خلاف ایک مضمون لکھا اور مجھے آج بھی طالبان کے اُس حملے اور نکتہٗ نظر سے اختلاف ہے جس کو بنیاد بنا کر ملالہ کو نشانہ بنایا گیا اور اُس توجیہہ کے لیے بھی جو اِس بچی پر حملے کے لیے دی گئی یعنی) واقعہ موسیٰ وخضرؑ)زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے کسی انسان کے نہیں قاتل موت کا ذریعہ تو بنتا ہے لیکن مالک نہیں ملالہ بھی طالبان کے حملے میں بچ گئی اور اپنی پچھلی شہرت سے کہیں زیادہ شہرت حاصل، کی اس کے حق میں بھی آ وازیں اُٹھیں اور مخالفت بھی ہوئی لیکن اس حملے کی مذمت سب نے کی۔ وہ وقت گزر گیا ملالہ کے علاج پر انتہائی توجہ دی گئی، اللہ نے اُس کو شفا دی اور وہ صحت یاب ہو گئی۔ ملالہ کے طالبان کے بارے میں خیالات اور خوف کی وجہ سے مغرب نے اُس بچی کو ہاتھوں ہاتھ لیا پہلے ڈائری کے ذریعے اور پھر انعامات کے ذریعے ۔ ڈائری لکھنے کی بات مانی جا سکتی ہے بہت سے بچے بہت خوبصورت تحریریں لکھتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان میں ہر لکھنے والا مشہور

بھی ہو جائے، یہ نا ممکنات میں سے نہیں لہذا اس کا ڈائری لکھنا تو ممکن ہے اور تعلیم سے اُس کی محبت بھی قابل تحسین ہے لیکن قابل اعتراض یہ بات ہے کہ پاکستان میں یا خیبر پختون خواہ یا سوات میں کیا ایک ہی لڑکی پڑھ رہی تھی۔ سوات میں تو آپ مینگورہ سے چل کر کالام تک پہنچیں تو ہر جگہ پر آپ کو سکول نظر آئیں گے سیدو شریف اور مینگورہ تو سکولوں کے معاملے میں اس قدر خود کفیل ہیں کہ لگتا ہے کہ سکول زیادہ اور طلبہ کم ہیں اور یہ سب آج سے نہیں بلکہ والئی سوات کے زمانے سے ہے پھر یہ سہرا ملالہ کے سر باندھنے میں اتنا جوش کیوں دکھایا جا رہا ہے کیا دُنیا کو یہ بتانے کے لیے کہ اس بچی سے پہلے سوات میں کوئی پڑھی لکھی عورت نہیں تھی۔ یقیناً ملالہ کی والدہ بھی کچھ نہ کچھ پڑھی لکھی تو ہوں گی اور اگر ملالہ واقعی پاکستان یا سوات میں تعلیم کے لیے کچھ کرنا ہی چاہتی ہیں تو بے شمار انعامات میں ملنے والی رقم سے وہ واقعتاً بہت کچھ کر سکتی ہیں ورنہ کیا اُن خواتین اساتذہ کی خدمات زیادہ قابل قدر نہیں جو جنگ زدہ علاقے کے سکولوں میں پڑھا رہی ہیں۔ میں ایک ایسے سکول کے بارے میں جانتی ہوں جسے اُڑا دیا گیا تو اُس کی پرنسپل اور اساتذہ نے خیمے لگا کر بچیوں کی تعلیم جاری رکھی اور میٹرک کا امتحان دلوا کر اُن کا سال ضائع ہونے سے بچایا لیکن شاید کسی ٹی وی چینل یا کسی اینکر کی تعلیم کے لیے عملی طور پر کام کرنے والی خواتین پر نظر نہیں پڑی۔ میں یہ سب ملالہ کی مخالفت میں نہیں لکھ رہی، مجھے اُس بچی سے آج بھی ہمدردی ہے اور اُس

وقت تک رہے گی جب تک وہ اُس عمر کو نہ پہنچ جائے جب وہ اپنی عقل سے بات کرنا سیکھے گی اور اگر پھر بھی وہی کچھ کہے گی جو وہ آج کہتی ہے تو میری ہمدردی بھی ختم ہو جائے گی۔ آج تو مغرب نے اُس کے منہ میں اپنی زبان اور اُس کے ذہن میں اپنے خیالات رکھے ہوئے ہیں داڑھی سے خوف پر مجھے اعتراض اس لیے نہیں تھا کہ دہشت گرد جو بھی ہیں اُن کو داڑھیاں رکھوا کر مسلمان نما بنا دیا گیا ہے جس نے اس بچی کو خوفزدہ کیا ہو گا لیکن داڑھی کا مذاق بزبانِ ملالہ اور بقلم کرسٹینا لیمب ہر گز قابل قبول نہیں۔ اُس کی کتاب پڑھنے کا ابھی مجھے موقع تو نہیں ملا لیکن اُس کے اقتباسات پڑھ کر اہل مغرب کی ذہنیت کھل کر سامنے آرہی ہے کیوں کہ جن جن موضوعات و معاملات پر اُس لڑکی سے بات کروائی گئی وہ اُس کی عمر سے بہت بڑے ہیں اور بظاہر اُس کی سمجھ سے بھی ورنہ جس لڑکی نے ابھی تک دوپٹہ اور اپنا لباس نہیں چھوڑا، اگرچہ کل کی کچھ خبر نہیں وہ کیسے اپنے مذہب اور اپنی معاشرتی روایات کی تضحیک کرنے پر اُتر آئی ہے اور داڑھی کو لالٹین اور برقعے کو کیتلی سے تشبیہ دے رہی ہے۔

دراصل ضیاء الدین یوسف زئی مغرب کا آلہ کار بن کر یا تو پیسے کی محبت میں یا شہرت کی خواہش میں بیٹی کو استعمال کر رہا ہے اور مغرب کے لیے تو یہ ایک پسندیدہ مشغلہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دے بلکہ

ہر ایسے موقع کو پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کرے اور ملالہ پر حملے کو بڑھ چڑھ کر اسی مقصد کے لیے استعمال کیا گیا دراصل اُسے پاکستانی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ طالبان اور بالواسطہ پاکستان کی مخالفت میں ہر انعام کا حقدار قرار دیا گیا اور پندرہ سولہ سال کی لڑکی کے اوپر کتاب بھی لکھ دی گئی ابھی اُسے کچھ کام تو کرنے دیتے لیکن لگتا یہ ہے کہ ملالہ نے یا تو اِس کتاب کو پڑھا نہیں اور یا یہ باتیں اُس کی عمر کی طرح اُسکی سمجھ سے بھی بالاتر ہیں اور یا وہ طالبان کی مخالفت میں اسلام کے بنیادی اُصولوں کو بھی بھول چکی ہے ورنہ وہ نبی پاک ﷺ کے نام کے ساتھ ﷺ لکھنا نہ بولتی بلکہ اگر کرسٹینا لیمب بھول بھی گئی تھی تو وہ اُس کتاب کو اپنانے سے انکار ہی کر دیتی۔

ملالہ یوسف زئی کی مغرب میں پذیرائی پر پاکستانیوں کو پہلے تو عام سی شکایات تھیں لیکن اب اُنہیں تشویش ہے کہ آخر اس کی یہ غیر معمولی پذیرائی کیا معنی رکھتی ہے اور اُس سے اپنی مرضی کی بات کیوں کہلوائی جا رہی ہے اور مستقبل میں یہ سلسلہ کہاں تک لے جایا جائے گا۔اس کے والد آخر اپنی بیٹی کی خدمات کیوں مغرب کے حوالے کر رہے ہیں اگر وہ حقیقتاً با صلاحیت ہے اور اُس کی ذہانت پاکستان کے لیے وقف ہوتی تو عزت بھی حاصل کرتی اور بے شمار دعائیں بھی لیکن اِس خاندان نے وہ تمام محبتیں بھلا دیں جو اُس کو ملی

تھیں اور اپنے ذاتی فائدے اور شہرت کے لیے ایک بار بھی یہ وضاحت نہیں دی کہ پاکستان میں خواتین کی تعلیم کے لیے اکیلی ملالہ ہی کوشاں نہیں رہی بلکہ سوات میں کئی ایسے سکول ہیں جو ہر صورت کھلے رہے۔ ملالہ نے اپنی کتاب پر اعتراضات کا بھی ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی مسلم دُنیا میں ہونے والے امریکی یا اسرائیلی مظالم پر آواز اُٹھائی اوبامہ سے ملاقات میں صرف ایک بار ڈرون حملوں کے بارے میں بات کی اور بس۔ اِن دونوں باپ بیٹی سے دست بستہ عرض ہے کہ بہت انعامات جیتے جا چکے، بینک بیلنس بھی کافی ہو چکا اور شہرت کا تو کوئی حساب ہی نہیں، اب دُنیا کو پاکستان کی اصل صورتِ حال بتایئے کہ پورا پاکستان دہشت گرد نہیں یہ اُس اسلام کا پیروکار ہے جو سراسر امن وسلامتی ہے۔ یہاں بُرائیاں تو ہوں گی لیکن تعلیم بھی ہے، نرمی بھی، محبت بھی ہے، اچھائی اور نیکی بھی اور پاکستان دہشت گردی کا ذمہ دار نہیں بلکہ اس کا شکار ہے۔

امن کی بحالی ۔۔۔ آپریشن یا مذاکرات

حکیم اللہ محسود یکم نومبر 2013 کو ایک ڈرون حملے میں مارا گیا یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا جب حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات کی بات ہو رہی تھی بلکہ حکومت کے مطابق یہ مذاکرات شروع ہو چکے تھے۔ پھر ایسے موقعے پر حکیم اللہ کو مارنے کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ امن قائم ہی نہ ہو ،جنگ چلتی رہے، امریکہ اور بھارت پاکستان کی جڑیں کاٹتے رہیں، دو مسلمان ملکوں پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات خراب رہیں اور بجائے ایک دوسرے کی مضبوطی کا باعث بننے کے ایک دوسرے کے مخالف رہیں اور ایک دوسرے کو کمزور کرتے رہیں ۔ اس جنگ میں یہی ہو رہا ہے ،افغانستان کی سرزمین پاکستان مخالفوں کا اڈا بنا ہوا ہے، امریکہ یہی سے پاکستان میں امن نہیں ہونے دے رہا، بھارت یہی سے طالبان کو مدد فراہم کر رہا ہے اور پاکستان کے خلاف انہیں استعمال کر رہا ہے اور اسرائیل اسی راستے دہشت گردی میں امریکہ اور بھارت کا معاون بنا ہوا ہے ۔ وہ لوگ جو کہتے تھے کہ خطرات ہمیں اندرونی عناصر سے ہیں ان کی بھی آنکھیں کھل جانی چاہیئں کہ اِن اندرونی لوگوں کے پاس بیرونی ساختہ اسلحہ ، گاڑیاں اور ٹیکنالوجی کہاں سے آرہی ہے، مدرسوں سے پڑھے ہوئے یا بالکل اَن پڑھ لوگ کیسے جنگی سازوسامان سے لے کر کمپیوٹرائیزڈ مواصلات کا نظام بنا اور چلا

رہے ہیں اور کیوں اگر اِن میں سے کوئی مذاکرات پر آمادہ ہوتا ہے تو اسے مار دیا جاتا ہے۔ حکیم اللہ کو مارنے کے تو کئی مواقع پہلے بھی ملے ہونگے تب اُسے ڈرون کیوں نہیں مارا گیا اس وقت جب وہ مذاکرات کے خلاف تھا اور ولی الرحمٰن حق میں تو وہ کیسے زندہ بچا اور ولی الرحمٰن کیوں نشانہ بنا۔ مذاکرات کی مخالفت کرنے والوں کا اپنا نکتہ نظر ہے وہ اس کی کامیابی اور ناکامی پر تبصرہ کرتے ہیں جبکہ میں کہتی ہوں کہ اسے ہو تو جانے دیں جتنے اس کی ناکامی کے امکانات ہیں اتنے کامیابی کے نہ بھی ہوں تو دو چار فیصد امکان کو ہی آزمالیں۔ اصل مسئلہ امن کی بحالی ہے، عوام کے مسائل کا خاتمہ ہے، معیشت کی بحالی ہے، چاہے آپریشن اور جنگ سے ہو یا مذاکرات سے۔ آپریشن اور جنگ کو تو آزمایا جا چکا ہے اب دوسرا طریقہ بھی دیکھ لینا چاہیے۔ اب تو امریکہ نے جو کرنا تھا کر لیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے۔ حکیم اللہ سے بھی کسی خیر کی توقع نہیں تھی اس کے ریکارڈ پر بھی نرمی اور رحم کا کوئی واقعہ نہیں تھا وہ جس نے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں طالبان کے ساتھ مل کر ظلم اور دہشت گردی کی پہلی پہلی، کاروائی کی تھی اور دہشت اسکی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو بد نیتی کے تحت مارا گیا یا کیا اس کو مار کر انتہا پسندی ختم کر دی گئی یا کی جا سکتی تھی اور یا اُسے طالبان کا زور توڑنے کے لیے مارا گیا تو نتائج جو سامنے آئے ہیں وہ تو بہت ہی ہولناک ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ خیر کی توقع حکیم اللہ سے بھی نہیں تھی لیکن

طالبان نے جس شخص کو اپنا نیا امیر منتخب کیا ہے اُس کی ظلم و بربریت کی داستان حکیم اللہ سے بھی کئی گناہ زیادہ ہولناک ہے اور نہ ہی اُس میں لچک نام کی کوئی چیز ہے وہ پہلے بھی امن معاہدوں کی دھجیاں بکھیر چکا ہے اس لیے اب فوری طور پر مذاکرات کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا اور نہ ہی امن کی کوئی امید۔
مولوی فضل اللہ جس کا اصل نام فضل حیات ہے ایف اے پاس ہے اور کسی زمانے میں مُلا پولیو اور ملا ریڈیو کے نام سے بھی مشہور رہا ہے۔ سوات جیسی پرامن وادی کو اُس نے اپنی وحشت و بربریت سے خوف کی علامت بنا دیا تھا اور فوجی آپریشن میں شکست کھانے کے بعد افغانستان فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ "کیسے" یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینے کو کوئی تیار نہیں۔ وہ افغانستان کے صوبے کنڑ اور نورستان میں بیٹھ کر پاک فوج کے خلاف بالخصوص اور عام لوگوں کے خلاف بالعموم کاروائیاں کرتا رہا ہے۔ تو آخر امریکہ نے پاکستان کے لیے کون سی آسانی پیدا کی یا کون سی دوستی کا ثبوت دیا۔ فضل اللہ کے بارے میں سب یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بھارت سے کھلم کھلا امداد لیتا رہا ہے اور افغان حکومت بھی نہ صرف اُس کی دوست ہے بلکہ اُس کی حفاظت پر مامور ہے ورنہ وہ سالہا سال سے افغانستان میں علی الاعلان محفوظ و مامون نہ بیٹھا ہوتا اور وہاں سے کاروائیاں نہ کرتا۔ فضل اللہ کے طالبان کے امیر بن جانے کے بعد اب یہ بات مزید واضح ہو گئی ہے کہ پاکستان میں دہشت

گردی کے ذمہ دار امریکہ، بھارت اور کرزئی ہے۔ میں عام افغانیوں کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتی کیونکہ وہ خود چار رہائیوں سے حالت جنگ میں ہیں۔ لیکن بھارت کا تعلیم یافتہ حامد کرزئی اس الزام سے مبراء نہیں ہے اور مختلف اوقات میں اس کے بیانات میرے اس یقین کی تصدیق کرتے ہیں۔ فضل اللہ کے امیر بن جانے سے پہلے بھی پاکستان دہشت گردوں کی زد پر تھا اور اس کی امارت کے بعد بھی ہوگا لیکن اب امریکہ اور بھارت اپنے مقاصد پر زیادہ کھل کر کام کر سکیں گے۔ امریکہ افغانستان میں گزشتہ بارہ تیرہ سال سے مقیم ہے اور اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی، کیمروں اور ریڈاروں کی مدد سے اس کے چپے چپے کی خبر رکھتا ہے تو فضل اللہ اس کی نظروں سے کیسے اوجھل رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ آنکھیں بند نہ کرلے۔ اگر وہ پاکستان کی سرحد کے اندر آکر ڈرون حملے کرتا ہے تو افغانستان جو عملاً اس کے زیر تسلط ہے میں ایک شخص کو کیوں ہلاک نہیں کر سکتا لیکن ظاہر ہے جو جب تک اُس کے ایجنڈے پر کام کرتا ہے تب تک وہ اُس سے بچا رہتا ہے اور جو نہی کسی انحراف کا امکان تک پیدا ہوتا ہے مار دیا جاتا ہے لہذا فضل اللہ ابھی تک بچا ہوا ہے۔

ملا ریڈیو غیر محسود ہے بلکہ اُس کا تعلق قبائلی علاقے سے بھی نہیں ہے لہذا یہ سمجھنا کہ وہ کسی جمہوری طریقے سے امیر بنا ہے بھی حماقت ہے کیونکہ طالبان جمہوریت کے سخت مخالف ہیں تو یقیناً یہ چناؤ کسی خاص ایجنڈے کا حصہ ہے

ورنہ زیادہ مضبوط امیدوار خان سید کو سمجھا جارہا تھالیکن وہ مذاکرات کا حامی تھا لہذا امریکہ اور بھارت کے لیے قابل قبول نہ تھا اس لیے ان تجزیوں میں بھی کچھ زیادہ وزن نہیں ہے کہ یہ تحریک اب پہاڑوں سے اتر آئی ہے اور میدانوں میں مقبولیت حاصل کرلے گی اور فضل اللہ کو سوات اور خالد حقانی کو صوابی سے کارندے میسر آئیں گے یاد رہے کہ یہ اپنے علاقے کے بدنام زمانہ لوگ ہیں کوئی مقبول لیڈر نہیں اس لیے عوام کے ذہنوں میں یہ خوف ڈالنے کی ضرورت نہیں ،یہ بھی یاد رہے کہ فضل اللہ افغانستان سے اپنی کمان بھی کچھ زیادہ آسانی سے نہیں کرسکے گا اور اِن حالات کا فائدہ ہماری حکومت، خفیہ ایجنسیوں اور فوج کو بھی اٹھانا چاہیے اور اِن لوگوں کا کردار اور ان کی وجہ سے انکے علاقوں کے مصائب میں اضافے کے امکانات سے بھی لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیے ۔ میڈیا بھی ان میں بڑے بڑے ناموں والے عہدے تقسیم کرنا چھوڑدے فوج اور حکومت سے اختلافات بھلادے اور خفیہ ایجنسیوں پر تنقید کرنا چھوڑ کراِن کی مدد کرے تاکہ ہر پہلو سے مخالفین پر کاری وار کیا جاسکے اور ایسی ضرب لگائی جا سکے کہ ملک اس مصیبت سے نجات حاصل کرسکے۔ حکیم اللہ کی موت کے بعد ہمارے سیاست دان اور میڈیا جن نان ایشوز کو ایشوز بنا رہے ہیں ان کو چھوڑ کر اپنی توانائیاں ایک ایسی منصوبہ بندی میں لگائیں جو دہشت گردی سے قوم کو نجات دینے میں معاون ثابت ہوسکے اور اسی چیز کی اس وقت قوم کو ضرورت ہے نہ کہ بیان بازی اور تنقید برائے تنقید اور بیان برائے بیان کی۔

عمران خان، فضل الرحمٰن، منور حسن، چوہدری نثار اور دیگر کے بیانات سے زیادہ ضروری اس وقت یہ امر ہے کہ دشمن کا تعین کرکے اس کا مقابلہ زیادہ موثر انداز میں اور بھرپور طور پر کیا جائے۔

افواج پاکستان ۔۔۔ ایمان تقویٰ جہاد فی سبیل اللہ

طالبان پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے ایک ایسا امتحان بنے ہوئے ہیں، ایک ایسی آزمائش ہیں کہ نہ گولی سے ٹل رہے ہیں نہ دُعا ان پر کارگر ہو رہی ہے اور نہ ہی اِن پر کوئی دلیل اثر کر رہی ہے۔ قرآن و حدیث اور دین اسلام کا نام لے کر یہ فساد فی الا رض بھی برپا رکھتے ہیں اور انسان کا خون بھی یوں بہاتے ہیں جیسے پانی، ان کے نزدیک اِن کے علاوہ ہر انسان کا قتل جائز ہے اس میں نہ مرد اور عورت کی تخصیص ہے اور نہ بچے اور بوڑھے کی بلکہ مسلمان اور غیر مسلمان ہونا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک مسلمان کے اوپر تو بے گناہ غیر مسلم کا خون بھی حرام ہے کجا کہ وہ تکبیر کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہوئے نمازیوں کو شہید کر دے، جنازے کا فرض کفایہ ادا کرتے ہوئے مسلمانوں کو شہید کر دے، وہ اولیاء اللہ کے مزرات کو بموں سے اس لیے اڑا دے کہ اُس کا مسلک اُن سے جدا ہے۔ خود کو مسلمان کہنے والے اور بات بات میں قرآن و حدیث کا حوالہ دینے والے خدا کے گھروں کو گولیوں اور بموں سے چھلنی کر دیتے ہیں یہاں تک کہ لوگ مسجد میں نماز کے لیے جانے سے پہلے سوچنے لگے ہیں اور ستائس گنا ثواب کی خوشی جان بچانے کی فکر کے آگے ماند پڑ جاتی ہے۔ پھر کیسے اِن قاتلوں کے مرنے پر اِن کو شہادت جیسے عظیم مرتبے پر فائز کر دیا جائے اگرچہ یہ تو اللہ کا

فیصلہ ہے کسی انسان کا نہیں کہ کون شہید ہے اور کون ہلاک لیکن وطن کی حفاظت کی خاطر جان دینے والوں کو یوں بے تکریم کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ سید منور حسن امیر جماعت اسلامی نے افواج پاکستان اور عوام پاکستان کے جذبات کو جس طرح ٹھیس پہنچائی ہے قوم کو اس کی توقع ہر گز نہ تھی۔ دہشت گردی اور طالبان سے متعلق خیالات پر یوں بھی جماعت اسلامی اکثر و بیشتر تنقید کا نشانہ بنی رہتی ہے کہ وہ دھماکوں اور دہشت گردی کی کھل کر مذمت نہیں کرتی یہ پارٹی نکتہ نظر ہے یا رہنماؤں کے خیالات لیکن بہر حال قوم کی دل آزاری کی گئی اور شدید کی گئی اور جب آئی ایس پی آر کی طرف سے اس پر احتجاج کیا گیا تو بجائے اس کے کہ جماعت اسلامی کے امیر اپنا بیان واپس لیتے یا اس پر کسی پشیمانی کا اظہار کرتے جماعت نے اس پریس ریلیز پر تنقید کرتے ہوئے بیان جاری کیا کہ فوج کو ایسا بیان دینے کا کوئی حق نہیں کہ کسی سیاسی پارٹی کے رہنما سے وضاحت طلب کرے انہوں نے اس پریس ریلیز کو سیاسی معاملات میں فوج کی مداخلت قرار دیا۔ تو اس طرح سے کسی سیاسی پارٹی لیڈر کو فتویٰ دینے کا حق کیسے حاصل ہوا کیا وہ اس سلسلے میں اپنی کوالیفیکیشن سے عوام کو آگاہ کر سکتے ہیں اور کیا فوج کی بے عزتی کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے لیکن فوج کو جواب دینے کا نہیں۔

جماعت اسلامی کے تعلقات فوج سے کبھی کشیدہ نہیں رہے بلکہ عزت و احترام کا

ایک رشتہ قائم رہا لیکن منور حسن صاحب نے فوج کی قربانیوں اور وفاداریوں کو امریکہ کے نام کرکے ایک بُری روایت کی بنیاد رکھی ہے حالانکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ ہر پاکستانی فوجی ایمان اور تقویٰ کے ہتھیار لے کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلتا ہے اور آج اگر ہم اور ہمارے وی آئی پیز اپنے گھروں میں زندہ سلامت بیٹھے ہیں تو یہ انہی شہیدوں کے طفیل ہے چاہے وہ فوجی وردی میں ہوں یا پولیس کی وہ ہی اِن طالبان کے بھیجے ہوئے خودکش بمباروں سے ٹکراتے ہیں اور ملک اور عوام کو بڑی بڑی تباہیوں سے بچاتے ہیں۔ جماعت اسلامی اگرچہ اب شہداء کی قربانیوں کا ذکر بھی کر رہی ہے اور ان کے ساتھ اپنی یکجہتی کا اظہار بھی تاہم اس بیان کو واپس نہیں لیا جا رہا جس نے عوام اور فوج دونوں میں بے چینی پیدا کی ہے جو صرف ایک صورت میں ختم ہو سکتی ہے کہ اس بیان پر معافی مانگی جائے۔ فوج کو اگر اپنے دفاع کا حق بھی نہ دیا جائے اور حکومت و پارلیمنٹ بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کرے تو فوج کو تو اپنے جوانوں کا مورال بلند رکھنا ہی ہے اگر ان کی شہادت کو مشکوک بنا دیا جائے تو آخر یہ فوجی جوان کس لیے سروں سے کفن باندھیں کیونکہ یہی یقین ہی تو ہے کہ یہ فوجی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں اپنی جانیں دے رہے ہیں اور اللہ کے فرمان کے مطابق جو اُس کی راہ میں مارا جائے وہ مردہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے ہاں سے اپنا رزق پا رہا ہے۔

منور حسن نے تو جو کہا وہ قابل مذمت ہے ہی اور فوج کے مورال پر ایک حملہ بھی لیکن آخر یہ سب ہوا کیسے، کیوں بار بار اس بحث کو اُچھالا گیا، کیوں اس موضوع پر انٹرویو کیے گئے اور ایسے سوالات کیوں بار بار پوچھے گئے کہ ایک تنازعے نے جنم لیا اگرچہ یہ درست ہے کہ منور حسن نے حکیم اللہ کو شہید کہہ کر ہی ایک تنازعے کو جنم دے دیا تھا کہ وہ شخص جو ایک مسلمان ریاست میں فساد پیدا کرتا تھا، بے گناہ راگیروں کو قتل کرتا تھا اور اس کے پیروکار اب بھی ایسا کر رہے ہیں اور ایسا کرنے کی تیاری بھی کر رہے ہیں ریاست کو چیلنج کر رہے ہیں پھر کیسے ایک قاتل ایک فسادی جب مارا گیا تو شہید ہو گیا امریکہ کی مخالفت اپنی جگہ اور مجھ سے بڑھ کر شاید کوئی امریکہ کی پالیسیوں کے خلاف نہ ہو گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے، امریکہ کی مخالفت اور چیز ہے اور اپنے لوگوں کو بے وقار کرنا اور بات اور وہ بھی ایک اہم سیاسی جماعت کے سربراہ کی طرف سے، کیا ہمارے سیاستدان اپنے الفاظ کو بولنے سے پہلے تولنے کی روش اپنائیں گے تاکہ ملک میں ایسی صورت حال جنم ہی نہ لے جو مصائب میں مبتلاء پاکستان کو مزید مسائل میں الجھائے۔ میں نے تو اس مضمون کو لکھنے سے پہلے بھی کئی بار سوچا اور ارادہ ملتوی کر دیا کہ نان ایشوز کو ایشوز کیوں بنایا جائے، سب ہی جانتے ہیں کہ شہید کون ہے اور ہلاک کون لیکن مجھے اپنے معزز قارئین کی ای میلز اور پیغامات کی وجہ سے اس موضوع پر قلم اٹھانا ہی پڑا اور میرا اس موضوع پر

دوبارہ لکھنے کا ارادہ بھی نہیں جب تک کہ خدانخواستہ اس مسئلے کو اور نہ الجھایا جائے اور میری تمام لکھنے والوں اور ''بولنے والوں'' سے بھی یہی درخواست ہے کہ ملک میں حقیقی مسائل حل کرنے کی کوشش کریں نہ کہ دوسرے مسائل اٹھا کر ان پر وقت ضائع کیا جائے۔ قومی سلامتی کے اداروں کے اہلکار طالبان کو پاکستان کا دشمن، فسادی اور اسلام کی بدنامی کا باعث سمجھ کر ہی ان سے نبرد آزما ہیں۔ حکومت کا نظریہ وہ بدل نہیں سکتے اور وہ بھی یہ جانتے ہیں اور پوری قوم، سیاسی جماعتیں اور خود جماعت اسلامی بھی جانتی ہے کہ ان طالبان اور دہشت گردوں کو امداد کہاں سے ملتی ہے ان کو اسلحہ اور تربیت کون فراہم کرتا ہے لہٰذا افواج پاکستان کی شہادت کو مشکوک بنانا کہاں کا انصاف ہے اگر طالبان غیر مسلموں کے مقاصد بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی بھی طرح پورے کر رہے ہیں تو کیا ان سے جنگ جہاد نہیں اور کیا ان سے لڑنے والوں کی شہادت میں کوئی شک ہے۔ اللہ افواج پاکستان کے شہداء کی قربانی قبول فرمائے، ان کے درجات مزید بلند کرے اور اس مقدس خون کے صدقے اس مقدس سرزمین کی حفاظت کرے، آمین۔

فرقہ واریت۔۔۔ کوئی ہے جو سوچے اور سمجھے

سازشوں کا سلسلہ ہے کہ پاکستان کے خلاف جاری ہے شاید خدا کی کوئی خاص رحمت ہے یا ابھی کچھ مخلص لوگ اس ملک میں موجود ہیں کہ جن کے خلوص کے صدقے یہ صفحہ ہستی پر موجود بھی ہے اور ان سازشوں کے سامنے ڈٹا بھی ہوا ہے، ایک نہیں کئی دشمنوں کا مقابلہ بھی کر رہا ہے اور اپنی بقا کی جنگ میں کامیاب بھی ہے۔ کبھی پڑوسی ملک بھارت کی دشمنی اور سازشوں سے نبرد آزما ہوتا ہے، کبھی عالمی طاقتوں کی جنگوں سے بچ کر نکل جاتا ہے، کبھی غیر ملکی مداخلت کا شکار ہوتا ہے اور خود کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن سازشوں کا مقابلہ کرتے کرتے یہ قوم تھک چکی ہے اگرچہ خدا کا شکر ہے کہ اس کی ہمت ابھی ٹوٹی نہیں لیکن تا کجے۔ اب جو نیا حربہ آزمایا گیا ہے وہ فرقہ وارانہ فسادات کرانے کی کوشش ہے۔ اگرچہ یہ کوشش ہو تو عرصہ دراز سے رہی ہے لیکن دائرہ کار کو کچھ علاقوں تک محدود رکھا گیا تھا اُن علاقوں میں جہاں شیعہ اور سنی مسلمانوں کی تعداد میں فرق نسبتاً کم ہے کبھی کوئٹہ ، کبھی پاڑا چنار اور کبھی گلگت سکردو میں یہ فساد کروایا جاتا ہے لیکن اس بار راولپنڈی جیسے مرکزی شہر میں یہ فساد کروانے کی کوشش کی گئی بلکہ کروایا گیا اور کئی قیمتی جانیں بھی ضائع ہوئیں اور املاک کو بھی نقصان

پہنچایا گیا مدرسہ تعلیم القرآن کو مسمار کیا گیا اور تین مارکیٹیں نذرِ آتش کی گئیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ فرقہ واریت پہلی دفعہ کی گئی لیکن سوچنے کی بات یہ ہے آخر ایسا ہو کیسے جاتا ہے وہ کون لوگ ہیں جو یہ سب کچھ کر لیتے ہیں کیا اِن تمام فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ عام دنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتے سہتے یہ ایک دوسرے کے خون کے کیا ایسے ہی پیاسے رہتے ہیں حالانکہ یہ ایک دوسرے کے نظریات اور عقائد جانتے ہیں اور پھر بھی ہر روز ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور پُرامن رہتے ہیں پھر کیسے مخصوص دنوں میں یہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور کیوں ایک دوسرے کے عقائد پر حملے شروع کر دیتے ہیں دعویٰ ہر طرف سے ایک خدا کے ماننے اور ایک رسول ﷺ کی غلامی کا کیا جاتا ہے لیکن اُسی خدا اور اُسی رسول ﷺ کے دین کو دنیا میں مذاق بنا دیتے ہیں اور ایسے وقت میں ہمارے علماء جن کی ایک آواز پر ہزاروں لوگ لبیک کہتے ہوئے جمع ہو جاتے ہیں اپنا کردار کیوں ادا نہیں کر پاتے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ایسے واقعات میں متعدد بار غیر ملکی ہاتھ ملوث ہوتا ہے اور اس کا ثبوت بھی مل جاتا ہے لیکن صرف غیر ملکی ہاتھ کا اعلان کرکے اسے بے نقاب نہیں کیا جاتا ہے اور نہ ہی سزا دی جاتی ہے تو اب عوام اِن ہاتھوں سے خود کو کیسے محفوظ رکھ سکیں۔ یہاں ہمارے ایمان کی کمزوری بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں بک کیوں جاتے ہیں اور بکتا کون ہے لیڈر یا عوام اور یا یہ زنجیر غیر ملکی آقاؤں سے شروع ہو کر پاکستان کے

غریب اور بے خبر عوام تک پہنچتی ہے جو عالم اسلام کی یکجہتی اور اسلامی اخوت پر جان دینے پر آمادہ رہتے ہیں اور یقیناً اس پر ان کا فخر بجا ہے لیکن کیا ہمارے برادر اسلامی ممالک بھی اس بات کا احساس کر رہے ہیں کہ وہ پاکستان جو ان کے ہر دُکھ درد میں شریک رہتا ہے، ظلم اُن پر ہو تو احتجاج پاکستانی کرتا ہے لیکن مصیبت کے وقت میں وہ ہمارے مسائل میں اضافہ ہی کرتے ہیں اور غیر مسلم دنیا کے آلہء کار بن جاتے ہیں۔ سعودی عرب کے ساتھ اپنی عقیدت کی وجہ سے مکہ مدینہ کے صدقے میں ہم ان کی بہت ساری غلط پالیسیوں کو بھی برداشت کر لیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی جانتا نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں جاری بدامنی میں مذہب اور فرقے کے نام پر اُس کا بھی ایک کردار ہے اور یہ کردار انتہائی افسوس ناک ہے۔ وہ ایک خاص مکتبہء فکر جو پاکستان میں اکثریت میں نہیں ہے کو اکثریت کی رائے پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے جبکہ دوسری طرف ایران اپنے مسلک کے علماء، امام بارگاہوں اور سیاسی جماعتوں کی مدد کر رہا ہے اور یوں دو ملکوں کے درمیان پس ہم پاکستانی رہے ہیں اور ہمارے علماء اپنے لوگوں اور اپنے ملک کے مفادات کی بجائے دوسروں کے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت نے نہ تو پہلے اس طرح کے واقعات کو سنجیدگی سے لیا ہے اور نہ اب اُس کا رویہ سنجیدہ ہے بلکہ نہ ہی کبھی کسی بھی حکومت نے ایسا سوچا ہے۔ دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ وہ دن جب اتحاد واتفاق کی ضرورت ہوتی ہے انہی دنوں پر ہم ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتے ہیں

بلکہ پوری قوت لگا کر ایسی حرکات کرتے ہیں کہ دوسرا فریق ردعمل کا اظہار کرلے اور بسا اوقات تو معمولی بات کو ہی اچھال کر قتل عام تک نوبت پہنچا دیتے ہیں خون ہمارا بہتا ہے اور مفادات کسی اور کے پورے ہوتے ہیں۔ طالبان کو امریکہ کی محبت میں یا اپنے نظریے اور مسلک کی ترویج کی کوشش میں پیسہ عرب دنیا سے ملتا ہے تو ایران بھی پاکستان میں اپنی مرضی کے لوگوں کو بھی روپیہ فراہم کرتا ہے اور افغانستان میں بھارتی منصوبوں میں مددگار بن کر بھی پاکستان کا نقصان کرتا ہے اور پھر بھی ہمارے علماء ان کے حکم کو مقدس جان کر ان پر عمل کرتے ہیں۔

یہ وقت دوسروں کے مفادات کے تحفظ کا نہیں ہے ہمیں اپنے پچھلے ساٹھ ستر سالوں پر نظر ڈال لینی چاہیے کہ ہمارے مفادات کا کس کس نے تحفظ کیا اگر نہیں تو پھر خود ہی کمر باندھ لیجئے اور اپنی مدد کرنے کے لیے خود نکل کھڑے ہوں۔ علماء اگر اس بات پر خوش ہیں کہ لوگ ان کے کہے پر سر کٹا اور کاٹ دیتے ہیں تو پھر اپنی اس صلاحیت اور قبول عام کو اپنے دین کی سربلندی اور اسلامی اخوت کے لیے استعمال کریں اپنے دنیوی آقاؤں سے احکامات لینے کے بجائے اپنے اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات پر عمل کریں انہیں کے احکامات کو پھیلائیں، مدرسے کی گئی گزری عزت بحال کریں، اسے معاشرے میں جو مقام حاصل تھا وہی مقام لوٹا دیں، وہاں پڑھنے والے بچوں کو بتائیں کہ فرقہ تو فرقہ اِسلام تو دوسرے کے مذہب میں بھی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ جیسے میرے لیے میرا فرقہ

پسندیدہ ہے ایسا دوسرے کے لیے دوسرے کا ہے۔ میں شیعہ اور سنی کی تفصیلات میں جانا چاہتی ہوں نہ بریلوی، دیوبندی ،اہلحدیث، وہابی، جعفری، زیدی کی تفریقات میں کیونکہ جو جہاں ہے وہ وہاں صدیوں سے ہے اور وہاں رہے گا۔ ہم اپنے عقیدے میں پختہ رہیں اور دوسرے کو عزت دیں تو کسی کو متاثر کرنے کا اس سے بہتر طریقہ نہ ہوگا۔ امن قائم رکھنے کے لیے ہم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور حکومت تو اس کے لیے پابند ہے کہ وہ امن قائم رکھے گی۔ محرم ،ربیع الاول یا دوسرے ایام سے پہلے اگر وہ علماء کو ہی یہ ذمہ داری دے کہ وہ عوام کے جذبات کو قابو میں رکھیں گے اور ناکامی کی صورت میں وہ ذمہ دار ہوں گے تو شاید خرابی کچھ کم ہو۔ مذہبی رواداری کا درس جتنا اسلام نے دیا ہے اتنا کسی اور مذہب نے نہیں لیکن ہمارے اعمال نے ہمیں جگ ہنسائی کے لیے ایک رول ماڈل بنا کر رکھ دیا ہے اگر ہم اب بھی فیصلہ کر لیں کہ ہم نے نظریات کے اختلاف کے باوجود ایک رہنا ہے تو ہم اپنی عزت بحال کر سکتے ہیں اور ہماری خوش قسمتی کہ بحیثیت مسلمان ہم یہ بہت آسانی سے کر سکتے ہیں کہ لاکھ اختلافات کے باوجود ہماری بنیاد ایک کلمہ ہے۔ یہ ایک کلمہ ہمیں ایک بنا کر باقی دنیا سے ممتاز کر دیتا ہے اور ہمیں ایک قوم بنا دیتا ہے پس ہے کوئی جو سوچے اور سمجھے۔

کشمیر میں دیوارِ برلن

کشمیر دنیا کا خوبصورت ترین خطہء ارض بھی اور خطرناک ترین سرزمین بھی ہے ۔خوبصورتی تو اسے مصورِ کائنات نے عطا کی لیکن خطرناک اسے ریڈ کلف ایوارڈ کی جانبداری اور بھارت کی ہٹ دھرمی اور ہوس ملک گیری نے بنایا۔ 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے وقت جو جرم کیا گیا اور گورداسپور اور فیروز پور کے اضلاع بھارت کے حوالے کرکے اُسے کشمیر میں داخلے کا راستہ دے دیا گیا پھر 1948 میں مہاراجہ ہری سنگھ سے مسلم اکثریتی ریاست کا بھارت سے الحاق کروا کر ایک ایسے تنازعے کو جنم دیا گیا جس نے دو پڑوسی ممالک میں کسی بھی قسم کے اچھے تعلقات کی ہر امید ختم کر دی جس کا ثبوت وہ جنگیں اور جھڑپیں ہیں جو اِن دونوں ممالک کے درمیان جاری رہتی ہیں اور ہزاروں انسانوں کو نگل چکی ہیں۔ اسی مسئلہ کشمیر کی بدولت بھارت اور پاکستان اپنے دفاع پر زیادہ اور ترقی پر کم خرچ کرتے ہیں سرحدوں پر رہنے والے ہر وقت خطرے کے عالم میں رہتے ہیں کیونکہ بھارت کسی بھی وقت اپنی ''قوت'' کا مظاہرہ کرنے کے لیے فائر کھول دیتا ہے اور خود وادی کے اندر کے لوگوں کی زندگی تو ہر وقت بھارت کی فوج اور کالے قوانین کی زد پر رہتی ہے ۔ بھارت اپنے تمام حربے آزما چکا ہے کہ کشمیریوں کے دل سے آزادی کی تڑپ ختم کر دے

اُس نے ظالمانہ اور جابرانہ قوانین بھی لاگو کیے اور قتل عام بھی کیا، جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور حتیٰ کہ بچوں کا خون بہایا ہر ایک کو مارا، نہ مار سکا تو آزادی کی خواہش کو۔ اُس نے ایک وادی میں سات لاکھ فوج متعین بھی کر لی، اس کو تمام ترجدید اسلحے سے بھی لیس کیا اور اختیارات سے بھی ،آزادی کی تحریک کو دہشت گردی کا نام دے کر بدنام بھی کیا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری اور زیادہ زور و شور سے اپنا حق آزادی مانگنے لگے ہیں۔ بھارت نے کشمیر میں ہر قسم کی بھارت مخالفت کو پاکستان کے کھاتے میں ڈالنے کی روش اپنائی ہوئی ہے اور مسلسل یہ الزام تراشی کرتا ہے کہ پاکستان کشمیر میں مداخلت کرتا ہے اور دراندازداخل کرتا ہے جو وہاں ”بدامنی“ پھیلاتے ہیں اگرچہ یہ بدامنی جسے کشمیری تحریک آزادی کشمیر کہتے ہیں خود کشمیریوں کی ظلم کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے۔ اب بھارت نے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنا دینے کے لیے ایک اور تجویز اور تدبیر کرنے کا ارادہ کیا ہے اور وہ ہے پاک بھارت سرحد پر 198 کلومیٹر لمبی، ایک سو پینتیس فٹ چوڑی اور دس میٹر اونچی دیوار کی تعمیر۔ اخبار دی ہندو کی رپورٹ کے مطابق انسپکٹر جنرل بارڈر سیکیورٹی فورسز جموں فرنٹیر ایس ایس تومار نے اس دیوار کی تعمیر کا اعلان کیا اور ساتھ ہی اس کے لیے ایک غیر معقول توجیہہ بھی پیش کی کہ اس طرح سرحد پر ہونے والی کشیدگی اور فائرنگ میں شہریوں کی ہلاکت کو کم کیا جاسکے گا وہ اس بات کی گارنٹی نہیں دے رہے کہ فائرنگ نہیں ہوگی اگر فائرنگ ہوگی تو

یقیناًوہ اس دیوار کے اوپر سے ہوگی اور اوپر سے نیچے کا نشانہ لینا.برابر کے نشانے سے کہیں آسان ہوتا ہے یعنی.بڑی آسانی سے پاکستانی فوجیوں اور شہریوں کا نشانہ لیا جاسکے گا ۔یہ دیوار 122 دیہات سے گزرے گی اور اکنور سے کٹھوا کے اضلاع کے درمیان ہوگی دیہاتیوں سے زمین خریدنے کا کام جلد شروع ہو جائے گا۔

بھارت کشمیر میں ''دیوار.برلن'' تعمیر کرکے اگر یہ سمجھے گا کہ وہ کشمیر میں امن قائم کرلے گا تو یہ اُس کی خام خیالی ہے جب سرحد کے دونوں طرف رہنے والے خاندانوں کے درمیان ایک ایسی دیوار کھینچ دی جائے گی کہ ان کے آپس میں کبھی بھی ملنے کی امید ختم ہو جائے تو کیا وہ اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کرلیں گے بھارت کو تاریخ پڑھ لینی چاہیے کہ ایسا ہوتا نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو 1961 میں تعمیر ہونے والی دیوار.برلن صرف اٹھائیس سال بعد نہ توڑی جاتی اور اس کو توڑتے ہوئے جرمنوں کا جوش و خروش بھی مانند ہوتا۔ کشمیر کو مستقل تقسیم کرنے کی کوشش میں بھارت کی یہ کوشش بھی یقیناًدونوں طرف کے کشمیریوں کو نہ صرف یہ کہ قابل قبول نہیں ہوگی بلکہ وہ یقیناًاس کی شدید مخالفت بلکہ مزاحمت کریں گے۔

یہ دیوار کشمیر کی مستقل تقسیم کی کوشش تو ہے ہی لیکن یہ بھارت کی اُس نیت

کی غماز بھی ہے جو وہ پاکستان کے لیے رکھتا ہے اور ہمارے خواب دیکھنے اور دکھانے والوں کے لیے بھی ایک چیلنج ہے جو" امن کی آشا"کی بات کرتے ہوئے بھارت کی شدت پسندی کو بھلا دیتے ہیں اور ان حکمرانوں اور لیڈروں کی آنکھیں کھولنے کے لیے بھی کافی ہیں جو ویزا کی پابندیاں بھی ختم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے وزیراعظم نے بین الاقوامی ادبی و ثقافتی کانفرنس میں بھارت کے ساتھ تمام تصفیہ طلب مسائل کے حل کی بات کی اور یہی پر ویزا کی پابندی نہ ہونے کی بھی بات کی لیکن اس "خیر سگالی" کا جواب بھارت نے "دیوار کشمیر" بنانے کا اعلان کرکے دیا۔ اس اعلان پر اب تک ہماری اپنی تنظیموں سمیت انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں نے بھی کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ کیا یہ خاندانوں کو تقسیم کرنے کی غیر انسانی کوشش نہیں ہے۔ اس معاملے کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے ورنہ یہ 198 کلومیٹر لمبائی پورے کشمیر کو بھی گھیر سکتی ہے اور 770 کلومیٹر کنٹرول لائن پر بھی محیط ہو سکتی ہے۔ بھارت کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور اس لیے کسی ایسی کاروائی کا وہ مجاز نہیں ہے بلکہ جغرافیائی، مذہبی اور تاریخی طور پر پاکستان کا حصہ ہے اور بھارت کو یہی خوف ہے کہ پاکستان کے ساتھ یہ وابستگی ایک دن کشمیریوں کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کردے گی لہذا وہ ایسے حربے آزمارہا ہے۔ یہ دیوار ایک بڑے قید خانے کی مانند ہوگی جو کشمیریوں کے مصائب اور غلامی میں اور اضافہ کرے گی۔بڑی طاقتوں، اقوام متحدہ اور

انسانی حقوق کی تنظیموں کو بھارت کے ایسے اقدامات پر اسے روکنا چاہیے اور اسے مجبور کرنا چاہیے کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں اور کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق حل کرے۔ اسی سے برصغیر کا امن وابستہ ہے۔

انتخابات بنگلہ دیش میں اور الزامات پاکستان پر

بنگلہ دیش میں عوامی لیگ کی حکومت بھارتی احسانات کا بدلہ مسلسل پاکستان مخالف پروپیگنڈے کی صورت میں دے رہی ہے۔ 2014 بنگلہ دیش میں انتخابات کا سال ہے جو کہ پانچ جنوری کو ہونے قرار پائے ہیں یعنی ایک بالکل اندرونی معاملہ ۔ لیکن بھارت کو اس میں شدید دلچسپی ہے کیونکہ عوامی لیگ کے دور حکومت میں بھارت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور دور میں نہیں۔ عوامی لیگ بھارت کے لیے یوں بھی معاون ہوتی ہے کہ دونوں مل کر پاکستان کے خلاف الزام تراشی کرتے رہتے ہیں۔ آئی ایس آئی اور پاک فوج کے خلاف بولنا بھارت کا پسندیدہ موضوع ہے اور جو ایسا کرے وہ اس کی پسندیدہ شخصیت یا حکومت ۔ عوامی لیگ اور بھارت نے بنگلہ دیش بنا کر جس پاکستان دشمنی کا ثبوت دیا تھا وہ تاریخ کا حصہ ہے اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی یہ دونوں اپنے مشن سے باز نہیں آئے۔ ابھی بھی یہ اسی کام پر مامور ہیں اور مصروف عمل بھی اور اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر بنگلہ دیش کے ہونے والے الیکشن میں پاکستان کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی اپوزیشن جماعت بنگلہ دیش نیشنل پارٹی یعنی بی این پی کو حکومت کے خلاف مدد فراہم کر رہی ہے۔ دراصل عوامی لیگ نے اپنے دورِ حکومت میں اس

کے علاوہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دیا کہ کچھ بنگالی سیاسی رہنماؤں کو پاک فوج کا ساتھ دینے کے جرم میں موت کی سزائیں سنائیں، پاکستان دشمنی کو ہوا دی اور اس کی مخالفت پیدا کی جبکہ پاکستان نے جب بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تو بس کرلیا،اور آج بھی پاکستانیوں کے پاس بنگلہ دیش کے لیے دعائیں ہی ہیں کہ اللہ اس کا آزاد اسلامی تشخص برقرار رکھے۔ اس وقت بھی بنگلہ دیش مشکل حالات کا سامنا کر رہا ہے اور جنوری کے الیکشن سے پہلے ہی کئی درجن افراد ہلاک ہو چکے ہیں دراصل بنگلہ دیش نیشنل پارٹی اور اٹھارہ دوسری سیاسی جماعتیں یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ عوامی لیگی حکومت مستعفی ہو اور غیر جانبدار غیر جماعتی اور عبوری حکومت کے زیر نگرانی انتخابات ہوں کیونکہ عوامی لیگی حکومت سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ انتخابات شفاف طریقے سے کروائے اور یا بھارت کے اثر سے آزاد رہ سکے۔

بہر حال یہ اُن کا اپنا معاملہ اور مسئلہ ہے کہ وہ اسے عبوری حکومت کے زیر نگرانی کرائیں یا عوامی لیگ حکومت خود یہ فریضہ سرانجام دے، عوام سڑکوں پر آئیں یا گھروں میں رہیں، جس پارٹی کو بھی وہ ووٹ دیں یہ اُن کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے اور اُن کا قومی مسئلہ ہے لیکن خود بنگلہ دیشی میڈیا ایک غیر ضروری مسئلے کو ہوا دے رہا ہے اور ایسا وہ بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ بھارت جس نے کہنے کو تو کہہ دیا ہے کہ وہ بنگلہ

دیش الیکشن میں مداخلت نہیں کرے گا لیکن اِن انتخابات سے پہلے ہی وہ مصروف عمل ہوگیا ہے اور ساتھ ہی اپنا فرضِ اولین یعنی پاکستان مخالف پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا ہے۔ بنگلہ دیش ایک اسلامی ملک ہے ہماری تاریخ کا ایک تلخ باب اُن سے وابستہ ضرور ہے لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا مذہبی رشتہ ختم ہوگیا ہے جو ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے سب سے مضبوط رشتہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان توڑنے کے بعد بھی بھارت کی تشویش ختم نہیں ہوئی۔ یورپ میں پڑھتے ہوئے ایک بنگالی طالب علم کا ایک پاکستانی طالب علم کو یہ کہنا ہی اُن برادرانہ جذبات کا اظہار ہے جو ان دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان ہے کہ تم پاکستانی ہو لہذا تم عمر میں چھوٹے ہو یا بڑے میرے لیے بڑے بھائی کا درجہ رکھتے ہو۔ بھارت نے اپنے سارے گھوڑے دوڑا دیئے اور پاک فوج پر مظالم کے ایسے ایسے الزامات لگائے جن کا نہ سر ہے نہ پیر۔ جو آبرو ریزی بنگالی عورتوں کی انھوں نے کی وہ پاکستانی فوج کے کھاتے میں ڈال دی اُن کے مکتی باہنی کے مظالم تو چھپا دیئے گئے لیکن ان بنگالیوں کو جنھوں نے غداری نہیں کی اور حکومت کا ساتھ دیا اُنہیں نوے سال کی عمر میں بھی پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ تاریخ کچھ عرصے کے لیے تو پوشیدہ رکھی جا سکتی ہے بدلی نہیں جا سکتی وقت آئے گا کہ بنگالی بھائی بھی دوست دشمن کی پہچان کر لیں گے اور بھارت کی پیروی میں جو غلط الزامات پاکستان پر لگائے جا رہے ہیں کہ خالدہ ضیاء کے بیٹے طارق الرحمٰن آئی ایس آئی کی مدد سے عوامی لیگ حکومت کے خلاف

تحریک چلا رہے ہیں اور آئی ایس آئی اُسے مالی مدد فراہم کر رہی ہے بھی ظاہر ہو جائیں گے اور خود بھارت کی نیت سامنے آجائے گی۔ دراصل طارق الرحمن کے دیگر خیالات تو جو بھی ہونگے لیکن وہ بھارت کو اپنا دشمن نمبر ایک ضرور قرار دیتے ہیں اگر میجر ضیاالرحمن کے بیٹے نے اس بات کا ادراک کر لیا ہے تو پورا بنگلہ دیش بھی اس حقیقت کو جلد ہی تسلیم کر لے گا۔ اسی طارق الرحمن کا رشتہ ممبئی کے انڈر ورلڈ کے داؤد ابراہیم سے بھی جوڑا گیا تھا بنگلہ دیشی میڈیا جو چاہے کرتا رہے لیکن پاکستان کے معاملے میں اُسے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

ان الزامات کے لگائے جانے میں ہماری اپنی کمزوری بھی ہے اگر ہم خود کو مضبوط کر لیں ،آپس کے اختلافات ختم کر دیں اور اپنے قومی مسائل پر قابو پالیں تو کسی چھوٹی بڑی طاقت کو یہ ہمت ہی نہ ہو کہ وہ ہمارے بارے میں ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت دے۔ ہمارے میڈیا کو بھی ہر کسی سے ایوارڈ وصول کرنے کی بجائے اپنے ملک اور اس کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہیے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں کو ہر وقت چوکس رہنا چاہیے میڈیا کے خلاف جنگ تلواروں سے نہیں لڑی جا سکتی بلکہ اسے میڈیا کو ہی لڑنا ہے اور اس وقت تک لڑنا ہے جب تک دشمن کو خاموش نہ کر دیا جائے۔

نیٹو سپلائی اور ہم

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات اور پاکستان مسلسل یہ سزا کاٹ رہا ہے اور سالہا سال سے کاٹ رہا ہے کبھی یہ سزا طالبان دیتے ہیں کبھی امریکہ ، کبھی خود کش دھماکے، کبھی ڈرون حملے اور کبھی تو سلالہ اور ایبٹ آباد تک کے اندر آکر حملے ۔ بہر حال ہر طرف سے اور ہر طرح سے متاثرہ پاکستان ہی ہے۔ امن پاکستان کا تباہ، معیشت اس کی ڈوبی ہوئی، سڑکیں اس کی خستہ حال، عوام اس کے مفلوک الحال، تعلیم اسکی نا گفتہ بہ، ہسپتال اس کے پرائی خیرات سے چلتے ہوئے پھر بھی ہم چپ ہیں کیونکہ امریکہ ہمیں امداد دیتا ہے وہ امداد کہاں جاتی ہے عوام نہیں جانتے لیکن اس کے بدلے وہ ڈرون کا نشانہ بھی بنتے ہیں اور انہی ڈرون مارنے والوں کو اسلحہ ، خوراک اور ضروریات بھی پہنچاتے ہیں، ضروریات ان کی پوری ہوتی ہیں اور سڑکیں ہماری ٹوٹتی پھوٹتی ہیں اور جب عمران خان نے اس نیٹو سپلائی کو روکنے کے لیے دھرنا دیا تو ہمارے سیاستدان اس کے خلاف بولنے لگے وہی لوگ جو جب اپوزیشن میں تھے تو ڈرون بھی ملکی سلامتی اور خود مختاری پر حملہ تھے اور نیٹو سپلائی بھی قابل نفرین تھی کیونکہ یہ غاصب فوجوں کی رسد تھی جو پہنچائی جا رہی تھی اور اس کام کے لیے ہمارا ملک اور ہمارے راستے استعمال ہو رہے تھے

لیکن اب ان کی رائے یکسر بدل چکی ہے اور یہ نیٹو ممالک کی دوستی کو مد نظر رکھ رہے ہیں۔ ڈرون حملوں کے خلاف پورے ملک میں جو غم و غصہ پایا جاتا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے لیکن حکومت اپنی کونسی مخصوص مجبوریوں کے تحت امریکہ سے خوفزدہ ہے یہ عوام کو اگر بتا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

پاکستان تحریک انصاف نے کچھ ہمت دکھائی ہے تو اس پر میڈیا اور سیاستدان دونوں اعتراض کر رہے ہیں۔ ہنگو میں ہونے والے ڈرون حملے کے بعد خیبر پختون خواہ میں پی ٹی آئی کی حکومت نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی جو شروع میں نامعلوم افراد کے خلاف لکھوائی گئی تھی تاہم بعد میں اس میں پاکستان میں سی آئی اے چیف جان بریفن کو ملزم نامزد کیا گیا۔ معاملہ ایک سیاسی جماعت کی مخالفت تک رہتا تو اور بات تھی لیکن پنجاب کے وزیر قانون رانا ثناء اللہ نے اس معاملے میں بھی آئی ایس آئی اور فوج کی جان بخشی مناسب نہ سمجھی اور فرمایا کہ یہ نام آئی ایس آئی نے عمران خان یا پی ٹی آئی کو دیا یعنی رانا صاحب اسے سی آئی اے کے خلاف آئی ایس آئی کی سازش سمجھتے ہیں اور چونکہ ہر معاملے میں اپنی سیاست چمکانا ہمارے سیاستدانوں کا فرض اولین ہے چاہے اس کے لیے اپنے قومی اداروں کی ساکھ داؤ پر لگا دی جائے یا قومی مفاد کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اس لیے یہاں بھی ایسا کیا گیا۔ یہی حال ہمارے میڈیا کا ہے کہ اُس نے بھی پینترا بدلا اور امریکہ اور نیٹو کا ہمدرد بن

گیا اور عوام کو بین الاقوامی طور پر اکیلے ہونے سے ڈرانے لگا اور یہ تاثر دینے لگا ہے کہ جیسے ہماری زمین گندم بھی نیٹو کے حکم سے اگاتی ہے لہٰذا اس سے بگاڑ کر ہم بھوکوں مر جائیں گے۔ یہی میڈیا جو جنرل مشرف کی ایک کال پر ڈھیر ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتا تھا اب خود قوم کو مرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ دنیا میں اکیلے رہنا ممکن نہیں نہ شخصی طور پر نہ قومی اور بین الاقوامی طور پر لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قومی خود مختاری کو امداد کے عوض گروی رکھ دیا جائے اور قوم کو بھی بے غیرتی کی موت مرنے کا مشورہ دیا جائے۔ ظاہر ہے جب ملک کے اندر یہ سب ہوگا تو چک ہیگل امریکی وزیر دفاع تو اور دھڑلے سے دھمکیاں دے گا چک ہیگل آیا اور امداد بند کرنے اور پابندیاں لگانے کی دھمکیاں دے کر چلا گیا لیکن اس سے پہلے ہمارے اپنے بھی یہ کام کر چکے تھے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ڈرون اگر صرف مجرموں اور دہشت گردوں کو مارا جاتا ہے تو بھی ایسا کیوں نہ ہو کہ یہی ٹیکنالوجی پاکستان کو دے دی جائے اور پاکستان خود اپنے مجرموں کو نشانہ بنائے نہ کہ اسکی سرزمین غیروں کی جنگ کی آماجگاہ بنی رہے۔ مجھے اِن عرب، ازبک، تاجک اور افغان جنگجوں سے بھی کوئی ہمدردی نہیں جو ہمارے ہی قبائلی علاقوں میں بیٹھ کر ہمارے ہی لوگوں کا قتل عام کر رہے ہیں لیکن اُن کے لیے بھی ہرگز کوئی نرم گوشہ نہیں جو ہزاروں میل دور سے آکر اپنی جنگ ہمارے ملک میں لڑتے ہیں کیونکہ اسی امریکہ اور اسکے دوستوں نے غیر

ملکیوں کو یہاں مستحکم کیا اور جب چاہا اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر لیا۔ نیٹو سپلائی کی بندش کے خلاف بات کرنے والے کہتے ہیں کہ اب تو امریکہ واپس جا رہا ہے تو کیا ہم اُن کی واپسی کا راستہ روک رہے ہیں تو سوال ہی ہے کہ کیا وہ سامانِ جنگ جو اس نے ہمارے قتل عام کے لیے براہ راست (ڈرون) یا بلواسطہ استعمال کیا (یعنی وہ اسلحہ جو اُس نے ہمارے قبائلی علاقوں تک پہنچایا) کا واپس لے جانا اتنا ضروری ہے جس کے غم میں ہم دُبلے ہوں یا ہم اس لیے فکر مند ہیں کہ جب امریکہ کسی اور مسلمان ملک پر حملہ آور ہو تو اُسے نیا اسلحہ نہ بنانا پڑے۔ یہ سوچنا کہ امریکہ افغانستان سے مکمل طور پر نکل جائے گا بھی حماقت ہے خود اُس کے اعلان کے مطابق بھی وہ مزید دس سال تک افغانستان میں کسی حد تک ضرور رہے گا یہ اس کا مسئلہ ہے چاہے تو اِس اسلحے کو رکھے، چاہے تو خود ہی تباہ کر دے اور چاہے تو کسی لمبے راستے سے اس کو انتہائی زیادہ اُجرت پر نکال کر لے جائے، ہم اپنے ملک کے بارے میں سوچ لیں تو ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ لیکن مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک صرف اپنی ذات کے لیے سوچتا ہے ہمارا میڈیا تو خیر سب جانتے ہیں کہ امریکہ سے کروڑوں روپے لینے کا حق ادا کر رہا ہے اور ہماری حکومت شاید امریکی محبت کے حصول کے لیے کوشاں ہے، مر رہا ہے تو سڑکوں اور بازاروں میں عام پاکستانی یا پولیس چوکیوں پر موجود بے چارہ سپاہی یا فوج کے اہلکار جن کی شہادت پر بھی ہم شک کرتے ہیں یا میرانشاہ، ہنگو، ٹل، کوہاٹ، بنوں، وزیرستان میں ڈرون

سے مرنے والے عام لوگ اُن دو بہنوں کی طرح جن میں سے ایک نے بی ایس سی اور ایک نے ایف ایس سی تک پہنچنے کے لیے اس لیے محنت کی کہ ڈرون آئے اور انہیں مار دے دہشت گرد ہونا ضروری تونہیں۔

نیٹو سپلائی رُک جانے سے جس مالی نقصان کا واویلا کیا جا رہا ہے کیا وہ اُس نقصان سے زیادہ ہے جو ہمارے ملک کو اس جنگ نے پہنچایا۔ خدارا ہمارے سیاستدان اور میڈیا عقل کے ناخن لیں اور ملک کا مفاد پہچانیں، اسے عزیز رکھیں اور یاد رکھیں کہ عوام پابندیاں اور امداد کی بندش کو زیادہ آسانی سے برداشت کرلیں گے بہ نسبت موت کے جو اُن کے سروں پر امریکہ، نیٹو اور طالبان کی صورت میں ناچتی ہے۔

عبدالقادر ملا بمقابلہ غدارانِ وطن

عبدالقادر ملا کو بنگلہ دیش میں پھانسی دے دی گئی۔ جرم ان کا یہ تھا کہ وہ ہر دور میں اپنے ملک کے وفادار رہے انہوں نے ہمیشہ اپنے ملک کے آئین کی پابندی کی۔ جنگی جرائم کا جو الزام ان پر لگا اس کے لیے بالغ گواہ بھی دستیاب نہیں تھا بلکہ اُس وقت کی گیارہ سال کی ایک لڑکی کی گواہی کو قبول کیا گیا۔ دراصل یہ مقدمہ خالصتاً بدنیتی پر مبنی اور سیاسی بنیادوں پر چلایا گیا اور پاکستان کے پہلے یوم آزادی یعنی 14 اگست 1948 کو پیدا ہونے والا ایک وفادار پاکستانی اور ایک وفادار بنگلہ دیشی عبدالقادر ملا بنگلہ دیش کے یوم آزادی یعنی 16 دسمبر سے صرف چار دن پہلے پھانسی چڑھا دیا گیا۔

1971 کے بعد بیالیس سال تک یہ بنگلہ دیشی، بنگلہ دیش کے خلاف کسی قسم کی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ جب تک پاکستانی تھا تو پاکستان کا پورے دل و جان سے وفادار رہا اور بنگلہ دیش بننے کے بعد بنگلہ دیش ہی کے ہر فیصلے اور قانون کو تسلیم کیا، دو بار الیکشن لڑا ایک بار 1986 میں دوسری بار 1996 میں اگرچہ دونوں بار ہار گئے لیکن اس شکست کو بھی تسلیم کیا۔ وہ ایک صحافی تھے اور اخبار سنگرام کے ایڈیٹر رہے، پریس کلب کے عہدے دار منتخب

ہوئے پھر آخر کونسی وجوہات تھیں جن کی بنا پر انہیں پھانسی دی گئی۔ وہ وجہ یقیناً حسینہ واجد کی حکومت تھی جو آج بھی پاکستان دشمنی میں اپنے مرّبی بھارت سے بھی آگے نکلنے کے لیے کوشاں ہے کیونکہ اُسے اپنے والد پر بھارت کے احسانات کا بدلہ چکانا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے جس طرح بھارت کے منصوبے پر مشرقی پاکستان میں عمل درآمد کرایا وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ غداری کا بیج تو بہت پہلے بو دیا گیا تھا لیکن مجیب جیسا غدار تیار کرتے کرتے وقت لگا اور 1971 میں یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ سارا بنگلہ دیش اس منصوبے کا حامی نہ تھا اور انہی بنگالیوں میں الشمس اور البدر کے رضاکار بھی شامل تھے جن میں سے ایک عبدالقادر ملا بھی تھے جنہیں 12 دسمبر کو جنگی جرائم کی پاداش میں پھانسی دے دی گئی اور انہیں غدار قرار دیا گیا جبکہ وہ اُس وقت کی اپنی حکومت اور ملک کے حامی تھے۔ انہیں جیسے کچھ اور لوگ بھی اِن جیسے مقدمات کا سامنا کر رہے ہیں جبکہ غدار مسند حکومت پر براجمان ہیں۔ عبدالقادر ملا کی پھانسی پر آج نہ حکومت پاکستان، نہ سیاستدانوں اور نہ میڈیا نے وہ ردعمل ظاہر کیا جو ہونا چاہیے تھا۔ سیاستدانوں نے تو شاید جماعت اسلامی کی مخالفت میں اور حکومت نے بھی ایک اور جماعت سے تعلق رکھنے پر انہیں اس کا حقدار ہی نہیں سمجھا اور میڈیا کو تو جیسے حقیقی معاملات سے صرف نظر کرنے کی عادت ہی پڑ چکی ہے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں اپنے ملک میں ہونے والے کسی بھی واقعے پر احتجاج کو تو اپنا فرض سمجھتی ہیں لیکن اس

واقعے پر مجرمانہ طور پر خاموش رہیں۔ اسی میڈیا اور انسانی حقوق کے علمبرداروں نے اس سال مارچ میں بنگلہ دیش میں پاکستان کی مخالفت پر ایوارڈ حاصل کئے بلکہ حامد میر نے تو ان محب وطن پاکستانیوں پر مقدمہ چلانے اور سزا دینے کا مطالبہ بھی کیا تھا جنھوں نے قیام بنگلہ دیش کی مخالفت کی تھی لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ یہی خاص لوگ پاکستان میں باعزت بنے بیٹھے ہیں اور قوم کو بلوچستان کے حالات کی دھمکیاں دے رہے ہیں اور اس بات سے قطع نظر دے رہے ہیں کہ بلوچستان اور مشرقی پاکستان کے جغرافیائی حالات بہت مختلف ہیں ایک پورے پاکستان سے جڑا ہوا ہے جبکہ دوسرا ایک ہزار میل کی دوری پر تھا وہاں کے لوگ مغربی پاکستان کے زمینی حالات نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن بلوچستان کے لوگ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت پورا پاکستان ایک جیسے حالات سے گزر رہا ہے تاہم کچھ لوگ صرف وہاں ہی کے حالات کو دیکھ رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ ہم کسی معاملے کو کیا رنگ دیتے ہیں لیکن سازشوں کا توڑ کرنے کی بجائے ہم اُسے ہوا دیئے جارہے ہیں اور عبدالقادر ملا کی پھانسی تو نہ صرف پاکستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی علیحدگی کی تحریکوں کو ہوا دینے کے لیے مہمیز کا کام دے گی اور شرپسندوں کے آگے کوئی کھڑا ہونے کی ہمت بھی نہیں کرے گا کہ کل کلاں کو اگر مجیب کی طرح ان کے غدار بھی کامیاب ہوگئے تو ان کے محب وطن لوگ بھی پھانسی چڑھا دیئے جائیں گے اور باوجود معاہدوں کے پھانسی چڑھا دیئے جائیں گے کیونکہ بنگلہ دیش بھارت اور پاکستان کے درمیان

معاہدہ ہو چکا تھا کہ جنگ کے کسی کردار پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا لیکن بنگلہ دیش اس خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے لہٰذا پاکستان کو اس پر اصولاً احتجاج کرنا چاہیے تھا جو کہ انتہائی بے حسی کا ثبوت دیتے ہوئے نہیں کیا گیا۔ عبدالقادر ملا کی پھانسی جماعت اسلامی کے رکن نہیں بلکہ پاکستان کے ایک حامی کی پھانسی تھی اور انسانی حقوق کی سراسر خلاف ورزی اور عدالتی اور حکومتی ایما پر قتل ۔ جہاں دنیا کے کچھ ممالک پھانسی کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں وہاں ایک ایسی پھانسی تو یقیناً قابل مذمت ہونی چاہیے اور اسی لیے برطانیہ، ترکی، آسٹریلیا اور یورپی یونین نے اس کی مذمت کی اور اقوام متحدہ کے ہومن رائٹس کمشنر نیوی پیلے نے بھی اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا اور اس فیصلے پر عمل درآمد روکنے کو بھی کہا تھا کیونکہ عمر قید کی اس سزا کو بنگلہ دیش کے قانون میں تبدیلی کرکے اسے سزائے موت میں تبدیل کیا گیا لہٰذا یہ کسی بھی طرح مبنی بر انصاف فیصلہ نہیں تھا۔ عبدالقادر ملا کی پھانسی حسینہ واجد اور اس کی حکومت کا بھارت سے محبت اور پاکستان سے نفرت کا ایک اظہار تھا جس پر دنیا میں ادھر اُدھر سے کچھ آوازیں تو اٹھیں لیکن ہماری طرف سے وہ رد عمل ظاہر نہیں کیا گیا جو ہونا چاہیے تھا یعنی مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔ بہر حال ایک عام پاکستانی اپنے دل میں ان کی پاکستان کے لیے اس قربانی پر احترام اور عقیدت محسوس کر رہا ہے اور شخصیات حکومت کی کتابوں میں زندہ نہ بھی رہیں تو قوموں کی عقیدت

انہیں زندہ رکھتی ہے اور عبدالقادر ملا پاکستانیوں اور اُن بنگلا دیشیوں کے لیے ایسی ہی ایک شخصیت رہیں گے جو ان کی پھانسی پر سراپا احتجاج ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا میں ریٹنگ کی دوڑ

الیکٹرانک میڈیا حکمرانوں کی باگ اپنے ہاتھ میں پکڑے، عوام کو قابو میں کئے ہوئے ،عدالتوں پر اثر اندازی کا اصول اپنائے ہوئے، معاشرتی اور ثقافتی اقدار کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے ایک بے قابو جن بنتا جا رہا ہے۔ ہر چینل دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں ہر بند سے آزاد ہوتا جا رہا ہے نہ اخلاقیات ،نہ مذہب ،کچھ بھی اہم نہیں رہا ہے۔ سیاست پہ بات کم لڑائی اور توہین زیادہ کروائی جاتی ہے جس پروگرام میں ایک دوسرے کی زیادہ سبکی اور بے عزتی کی جائے وہ بار بار دکھا کر اپنی ریٹنگ بڑھائی جاتی ہے اور عوام کو جس چسکے کا عادی بنا دیا گیا ہے وہ انہیں اکثر اوقات فراہم کیا جاتا ہے۔ نجی چینلز کے ابتدائی زمانے کی بات ہے شاید قارئین کو بھی یاد ہو گا کہ ایک لڑکی دکھائی گئی اور کہا گیا کہ لباس سے آزاد یہ لڑکی اٹھارہ سال تک جنگل میں رہی یعنی ہمارے ایک چینل نے اسے دریافت کیا اور شیر خوارگی میں گم ہونے والی اس بچی کو اس کے ماں باپ نے شناخت بھی کر لیا، کیسے یہ ایک معمہ ہی ہے۔ ایسی دریافتیں اب بھی اس چینل کی طرف سے بھی جاری ہیں اور دیگر بھی اس دوڑ میں پیچھے ہی سہی دوڑے جا رہے ہیں ۔میڈیا کے تعاون سے بچے برائے فروخت کا ایک دور چلا، خود کشی کرنے والوں کو ہیرو ہیروئن بنا کر پیش کرنے کا فیشن بھی میڈیا میں ’’اِن‘‘ رہا،اُن غریبوں کی

غربت کا رونا رویا گیا جن کے گھر واشنگ مشین، ٹی وی، فریج اور موبائل موجود تھے ایسا ہی ایک کیس لاہور کی صائمہ کا تھا اور پھر سلسلہ چلتا گیا۔ اخلاقی طور پر جو حملہ خود ہمارا اپنا میڈیا کر رہا ہے اُس کا رونا روتے روتے تو شریف خاندانوں کی آوازیں بیٹھ گئیں ہیں لیکن اس حملے کی شدت میں کمی کی بجائے روز بہ روز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

پڑوسی ملک سے محبت کا ثبوت دیتے اور امن کی آشا کی پتنگ اُڑاتے اُڑاتے اپنی اقدار کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ کم لباسی بھی کوئی عیب نہ رہا اور مرد و عورت کا آزادانہ میل جول بھی بلکہ اب تو پروگرام میں بلائے گئے مہمان گلے مل کر ملتے ہیں اور اس میں صنف کوئی تمیز نہیں چاہے مرد ہے یا عورت مارننگ شوز ہماری اسی نئی ثقافت اور معاشرت کی مثالیں ہیں۔ مذہب کو تو ہم کب کا بھول چکے ہیں کیونکہ مذہب کو سوچا تو ریٹنگ کیسے بڑھے گی، مذہب میں تو رکھ رکھاؤ ہے، انسانیت کی اعلیٰ اقدار ہیں اور معاشرے کی تباہی کے لیے پہلے ان کی تباہی ضروری ہے۔

اب ذرا سیاسی، معاملات کی طرف آیئے جو نیوز چینلز کے لیے خوراک کا درجہ رکھتے ہیں اور ہر روز رات کو بڑی باقاعدگی سے حالات حاضرہ کے نام پر یہ سیاسی لڑائیاں دکھائی جاتی ہیں جن میں اینکرز خواتین و حضرات مکمل کوشش کرکے شرکاء کو لڑوا دیتے ہیں۔ فردوس عاشق اعوان اور کشمالہ طارق کی لڑائی ایسی ہی ایک ابتدائی مثال تھی جس کے بعد کئی مثالیں قائم ہوئیں اور ہو رہی

ہیں یعنی جتنا زیادہ گڑ ڈالا جاتا ہے اتنی ہی مٹھاس آتی ہے اور ریٹنگ اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ ایسے پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں جیسے پانی سے چلنے والی گاڑی، ایک عام پاکستانی بھی کچھ دن خوش ہو جاتا ہے کہ اب لانگ ڈرائیو پر نکلنا اس کے لیے بھی ممکن ہو گا اور چینل کی ریٹنگ خود بہ خود آسمان کو چھو جاتی ہے۔ ریٹنگ کی اس دوڑ نے ہمارے میڈیا کو صحافت کے مروجہ اصولوں اور اخلاقیات سے آزاد کر دیا ہے، معیار کی جگہ رنگینی اور چسکے نے لے لی ہے اور ایسا ریٹنگ کی دوڑ کی وجہ سے ہے جس کے لیے ہر اخلاقی و غیر اخلاقی طریقہ آزمایا جا رہا ہے۔ ریٹنگ کے لیے جو طریقہ کار استعمال کیا جا رہا ہے وہ ہرگز کسی چینل کی مقبولیت کا معیار نہیں سمجھا جا سکتا اس طریقے کے تحت صرف چند شہروں میں چند گھروں پر کچھ میٹر لگائے گئے ہیں جن سے دیکھے جانے والے چینلز کو مانیٹر کیا جاتا ہے اور رپورٹس کے مطابق ریٹنگ بڑھانے کے لیے ان میٹرز کو خود بھی آگے پیچھے کر دیا جاتا ہے اور یوں اپنی ریٹنگ بڑھا کر مزید اشتہارات حاصل کر لیے جاتے ہیں یعنی مالکان کی تجوریاں بھرتی جاتی ہیں اور ان اینکرز کے بینک بھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ چند ایک بڑے شہر مثلاً اسلام آباد، راولپنڈی، لاہور، کراچی وغیرہ اور اُن میں بھی چند گھر پورے پاکستان یا پوری دنیا کی نمائندگی کے حق دار کیسے ہو گئے۔ پیمرا کو بھی کچھ سوچ لینا چاہیے اور کسی چینل یا پروگرام کو نمبر ایک قرار دینے سے پہلے اس کے بارے میں عوام کی رائے بھی جان لینا چاہیے اور

قومی سلامتی کے تقاضوں سے ہم آہنگی اور قومی سلامتی، قومی نظریے ، قومی اداروں اور بین الاقوامی طور پر قومی عزت کے تحفظ کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے کیونکہ قومی سلامتی کو باقی تمام چیزوں پر مقدم ہونا چاہیے ۔ ریٹنگ کی اہمیت نے ہمارے میڈیا کو تمام تر اخلاقی و قومی تقاضوں سے آزاد کر دیا ہے اور ہر چینل اسی کے پیچھے دوڑ رہا ہے چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے حکومت اور اداروں کی کرپشن اور خرابیاں اُجاگر کرتا ہوا میڈیا اگر اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے تو وہاں بھی بہت سے جرائم نظر آئیں گے لیکن ان کو دکھانے کے لیے کوئی '' شیڈو میڈیا'' نہیں ہے کہ عوام اس کے بارے میں جان سکیں۔

میڈیا کو معاشرے میں اچھی روایات کی بنیاد ڈالنے کے لیے کردار ادا کرنا چاہیے قومی اتحاد کا پیامبر ہونا چاہیے ، خرابیوں کی نشاندہی کرنا چاہیے ناکہ اسے اُچھال اُچھال کر سیاسی جنگوں اور بین الاقوامی سبکی کا باعث بنایا جائے۔ اسی میں ہماری بقا اور عزت ہے اور میڈیا کے لیے بھی عوام الناس میں احترام کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہوگا جو خود بہ خود اس کی ریٹنگ بڑھادے گا بغیر کسی نا جائز ذریعہ کے استعمال کے ۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان

پچیس دسمبر آیا اور گزر گیا، ہم نے ہر سال کی طرح یوم قائداعظم منایا، سکولوں میں بھی پروگرام منعقد کیے گئے اور تنظیموں نے بھی مختلف تقریبات کے ذریعے اپنے قائد کو یاد کیا اگرچہ اس قوم نے اپنے بانی کے حق کو کبھی اُس طرح ادا نہیں کیا جیسا کہ کیا جانا چاہیے تھا۔ کچھ عرصے سے ہمارے کچھ بزعم خود دانشور اور الیکٹرانک میڈیا کے اینکرز دو قومی نظریے کو چیلنج کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے نظریے کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور یوں مغربی آقاؤں کے منظور نظر بن کر اپنی دنیا سنوارنے کی کوشش میں مبتلا ہیں اور ان کا یہی رویہ اس بار یوم قائد پر بھی رہا۔ حیرت انگیز طور پر تقریبا تمام بڑے چینلز قائداعظم کے نظریہء حکومت پر پروگرام پیش کرتے رہے اور موضوع بحث تھا قائداعظم سیکولر پاکستان بنانا چاہتے تھے یا اسلامی جمہوریہ یعنی پاکستان کے بنیادی نظریے کو ہی مشکوک بنانے کی کوشش۔

مغلوں کی نا اہل حکومت کے ختم ہونے کے بعد انگریز کی حکومت، مسلمانوں کی زبوں حالی، پسماندگی اور بحیثیت مسلمان قوم کے ان کے خلاف ہندو اور انگریز

کا تعصب اور اس تعصب کے نتیجے مسلمانوں کے اندر بیداری سب کچھ تاریخ کا حصہ ہے۔ خود مسلم لیگ کا قیام کانگریس میں ہندوؤں کی بالادستی کے مقابلے پر عمل میں لایا گیا۔ اس جماعت کے تمام بانی مسلمان تھے اور تمام مسلمانوں نے اس جماعت کو بحیثیت مسلمان جماعت کے قبول کیا اور اس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ایک اسلامی ریاست کے حصول کی کوشش کی۔آج ہمارے ہاں کچھ لوگ اس لفظ اسلامی کو مسلم ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کچھ لفظ مسلم کو بھی ہٹا کر سیکولر کا سابقہ لگا رہے ہیں۔ لیکن تاریخ کہتی ہے کہ برصغیر کا مسلمان قائداعظم اور مسلم لیگ کے پیچھے اس لیے چلا تھا کہ انھوں نے نعرہ لگایا تھا پاکستان کا مطلب کیا لَا اِلٰہ الااللہ اور نہ تو کبھی قائداعظم اور نہ ہی کسی اور مسلمان رہنما نے اس نعرے کی مخالفت کی اور نہ ہی انھوں نے کسی کو یہ نعرہ لگانے سے روکا جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ کون سا جذبہ، ارادہ اور نظریہ تھا جس کو بنیاد بنا کر ایک نئے ملک کا مطالبہ کیا گیا تھا پھر آج نظریات کیسے تبدیل ہو گئے کون ہے جس کے کہنے پر ملک کا بنیادی نظریہ ہلایا جا رہا ہے قائداعظم کو زبردستی کیوں سیکولر بنایا جا رہا ہے اور ایسا کرنے والے کچھ روشن خیالوں نے تو ٹیلی وژن پر بیٹھ کر یہ بھی فرمایا کہ ہمارا آئین اسلامی کیسے ہو سکتا ہے کیوں کہ اسلام اور ریاست کا آپس میں کوئی تعلق نہیں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن آئین کی کتاب نہیں لہذا یہ حکومت میں معاون نہیں ہے معاذاللہ بالفاظ دیگر وہ قرآن جس کو

دنیا چودہ پندرہ سو سال سے مکمل ضابطہ حیات سمجھ رہی ہے وہ معاشرے کو نہیں چلا سکتا حالانکہ حکومت دراصل معاشرے کو چلانے کا ہی دوسرا نام ہے۔ یعنی اس قدر بے علم لوگ بھی نظام حکومت اور اسلام کے بارے میں بات کرتے ہیں خدا کی قدرت ہے، بلکہ ان صاحب نے تو کچھ معاملات کی خاص کر نشاندہی بھی کی یعنی اپنی مرضی منوانے کے لیے یوں اپنے دین پر خود انگلی اٹھائی جائے انتہائی افسوس کی بات ہے، لیکن ''دانشوروں کے اس گروپ کو اپنا مقصد پورا کرنا ہے چاہے جس قیمت پر بھی ہو۔ ان کے نزدیک'' مسئلہ یہ نہیں کہ قائداعظم کا نظریہ کیا تھا یا وہ کیسا پاکستان چاہتے تھے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اور ان کے آقا کیسا پاکستان چاہتے ہیں، یک اپاہج پاکستان ایک ایسا پاکستان جو دجالی منصوبوں کے آگے جھک جائے اور اس کے عوام جو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے وہ فخر ختم کر دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ ہم قومی مسائل پر توجہ دینے کی بجائے نئی نئی بحثیں کیوں چھیڑ رہے ہیں اور اِن چند معاملات کو جن پر قوم کا ایک ہی نکتہ نظر ہے ان پر بھی نااتفاقی پیدا کیوں کی جاری ہے۔ پاکستان ستانوے فیصد مسلمانوں کا ملک ہے جنھوں نے بقائمی ہوش و ہواس دین اسلام کو قبول کیا ہے اور اسے اپنا رکھا ہے اور اِن میں سے سوائے چند لوگوں کے کسی کو اسلام اور اسلامی نظریہء حکومت سے اختلاف بھی نہیں تو پھر بحث کس چیز کی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ چند لوگ جب اسلامی نظریہ یا اسلامی جمہوریہ پاکستان پر بحث کرتے ہیں تو اس میں اقلیتوں کے

حقوق کو شامل کر دیتے ہیں بھلا اقلیتوں کے حقوق سے کس کو احتراز یا اعتراض ہے وہ پاکستان کے شہری ہیں اور اپنے بل بوتے پر جو چاہے کر سکتے ہیں وہ ایک عام پاکستانی کی طرح اِس ملک میں انجینئر بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں، قانون دان اور سیاست دان بھی ہیں اور حتیٰ کہ استاد بھی ہیں ،وہ اپنی عبادت کرنے میں اُسی طرح آزاد ہیں جیسے کوئی مسلمان مسجد جانے کے لیے، میں نے سندھ میں مندر بھی بھرے ہوئے دیکھے ہیں پنجاب میں گوردوارے بھی اور پورے پاکستان میں چرچ بھی۔ کبھی کبھار اگر کوئی نا خوشگوار واقعہ ہو جاتا ہے تو اس کے لیے ملک کے آئین اور قانون کو الزام دینا سراسر زیادتی ہے اور اسے روکنے کے لیے سیکولر ہونے کی ضرورت ہے اور نہ قائدِاعظم کو سیکولر ثابت کرنے کی ۔ان ''دانشوروں'' کے پاس اپنی بات منوانے کے لیے قائد کی 11 اگست 1947 کی تقریر کا واحد حوالہ ہے لیکن وہ یہ نہیں کہتے کہ قائد نے مسلمان اور ہندو کی بات کی تھی اسلام اور ہندومت کی نہیں ۔ایسا بھی ہرگز نہیں کہ اسلام کسی مذہب کے ماننے والوں سے اُس کے حقوق چھینتا ہے بلکہ جتنا اسلام بحثیت مذہب یہ حقوق دیتا ہے اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں اس کی سب سے بڑی مثال تو دنیا کا پہلا لکھا ہوا معاہدہ ،میثاق مدینہ ہے جس میں خود پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ کی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو مذہبی آزادی عطا کی اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء نے اسے اپنا فرض سمجھا۔ حضرت عمرؓ نے جب ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا اور پوچھنے پر انہیں بتایا گیا کہ وہ جزیہ ادا کرنے کے لیے

بھیک مانگ رہا ہے تو فرمایا اس نے اپنی جوانی اگر حکومت کو ٹیکس دینے میں لگادی تو کیا اب اس بڑھاپے میں اُسے بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، اور آپ نے اس کو نہ صرف ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا بلکہ بیت المال سے اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا، لیکن ہمارے یہ ''روشن خیال لاعلم'' جس طرح قائداعظم کی صرف ایک تقریر کو بطور حوالہ استعمال کرتے ہوئے باقی تمام تقاریر کو بھول جاتے ہیں بلکہ دراصل پڑھتے ہی نہیں ہیں اس سے بھی بڑھ کر یہ اسلام اور تاریخ اسلام سے ناواقف ہیں، اور یوں ایک قومی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ وہ بھارت کی مثال تو دیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ عملی طور پر آج بھی وہاں مسلم کش فسادات میں مسلمانوں کا خون بہتا ہے عیسائی اب بھی ہندوؤں کا نشانہ بنتے ہیں اور خود ہندو آج بھی برہمن، شودر اور دِلت، ہے۔

میں جانتی ہوں کہ میرے قاری مجھے اکثر اپنے میڈیا سے شاکی پا کر شاید مجھے قنوطی خیال کرتے ہوں لیکن آج کے دور میں میڈیا اور اس کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میڈیا ایک غیر اہم مسئلے کو اہم اور اہم کو غیر اہم بنا سکتا ہے اور جب تمام چینلز ایک دوسرے سے باری لے جانے کے لیے ایک ہی مسئلے کو لے کر بیٹھ جائیں اور ایک جیسے خیالات نشر کریں تو اس ملک کے عوام جنھیں غم روزگار سے ہی فرصت نہیں وہ کہاں قائد کے نظریات پڑھیں، کہاں ان کی تقریریں ڈھونڈیں، وہ تو وہی سچ سمجھنے لگتے ہیں جو انہیں دکھایا اور

بتایا جاتا ہے۔ میڈیا سے دست بستہ درخواست ہے کہ خدارا اپنی تاریخ کا چہرہ مت مسخ کریں اور نہ ہی اپنے کابرین کو متنازعہ بنایئے ان کے بارے میں تو تاریخ وہی لکھے گی جو تھا آپ کے بگاڑنے سے یہ بگڑے گی نہیں لیکن ملک میں جن تنازعات کو جنم دیا جا رہا ہے اس کا ازالہ بھی مشکل ہوگا اور علاج بھی اور قوم اس دہشت گردی کو برداشت بھی نہیں کرپائے گی کیونکہ یہ سچ ہے کہ انتہا پسندی کے ایک سرے پر طالبان ہیں اور اسلام کی اپنی تشریح کر رہے ہیں تو دوسرے پر خود کو روشن خیال ثابت کرنے والے یہ چند لوگ ہیں اور درمیان میں عوامِ پاکستان ہیں جو اسلام کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے بزرگوں نے پاکستان کی بنیاد لَاإِلٰہ اَلا اللہ پر رکھی تھی اور بالکل درست رکھی تھی۔ قائدا عظم نے اسے اسلامی قوانین کی تجربہ گاہ سمجھا اور کہا اور ایک نہیں کئی بار کہا۔ یہاں اسلام کو آزمایا ہی کب گیا ہے جو پرویز ہود بھائی اور اسی طبقہ کے لوگ اسلامی قوانین کی شکایت کر رہے۔ پاکستان اسلامی ملک ہی رہے گا آپ اسے لاکھ مسلم ریاست کہیں، یاد رکھیے مسلمان کا مذہب اسلام ہوتا ہے اور ان کی حکومت اسلامی اور اگر ملک میں جمہوریت ہو تو ملک اسلامی جمہوریہ ہی کہلائے گا اور اسی لیے پاکستان اسلامی جمہوریہ پاکستان ہی رہے گا۔ اللہ پاکستان کا حامی و ناصر ہو اور اسے اندرونی و بیرونی ہر قسم کے دشمنوں سے محفوظ رکھے، آمین۔

بلوچستان میں امریکی مداخلت

بلوچستان معدنی ذخائر سے بھرپور ہے اور اسی لیے دنیا کی نظروں میں کھٹکتا ہوا کانٹا ہے۔ پاکستان اس وقت بری طرح عالمی سازشوں کا نشانہ ہے، دہشت گردی نے جتنا نقصان پاکستان کو پہنچایا ہے اتنا کسی اور ملک کو نہیں اور یہ دہشت گردی صرف طالبان تک محدود نہیں جنہیں عالمی اور علاقائی طاقتیں مدد فراہم کرتی ہیں بلکہ اس میں وہ دوسری تنظیمیں اور افراد بھی شامل ہیں جو اپنے ذاتی مفاد، اپنی دولت اور حکومت کی خاطر اس ملک کی جڑوں میں پانی دے رہے ہیں اور یہاں بھی اُن کی مددگار یہی بیرونی طاقتیں ہیں۔ بلوچستان میں بھارت کی مداخلت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں جو مسلسل بلوچستان لبریشن آرمی یعنی بی ایل اے کو مدد فراہم کر رہا ہے یہاں سے بھارت ساختہ اسلحہ مل چکا ہے اور کئی اور ثبوت بھی بقول حکومت کے اس کے پاس موجود ہیں جو بھارتی وزیراعظم کو شرم الشیخ میں پیش بھی کیے گئے۔ اور اس بار پھر بی ایل اے اور خان آف قلات نے اپنے پرانے آقا سے مالی مدد کی درخواست کی لیکن اس بار ان سے معذرت کی گئی، وجہ پاکستان سے محبت یا بلوچستان میں اپنے کردار پر شرمندگی نہیں تھی بلکہ اس کی کچھ اور وجوہات تھیں، تاہم جب یہ انوکھا کام ہوا تو بی ایل اے اور خان آف قلات کو اپنے دوسرے آقا کی طرف

رجوع کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور وہ امریکہ کے در پر پہنچ گئے جہاں ان کی پوری طرح شنوائی ہوئی اور ریپبلکن پارٹی سے تعلق رکھنے والے تین ممبروں نے کانگریس میں بلوچستان کے بارے میں ایک بل پیش کر دیا جس میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا رونا رویا گیا۔ بل پیش کرنے والوں میں ڈانا روہبیشر، لوئی گومرٹ اور سٹیو کنگ شامل تھے۔ بل میں کہا گیا کہ ’’ بلوچستان پاکستان، ایران اور افغانستان میں منقسم ہے، پاکستانی بلوچستان میں لوگوں کی ٹارگٹ کلنگ ہو رہی ہے اور یہ صوبہ بدامنی کا شکار رہے اور یہ بل، بلوچیوں کے حقوق اور حق خود اختیاری کی حمایت کرتا ہے کہ اِن کی آزاد ریاست ہو اور انہیں اپنا مقام خود متعین کرنے کا حق حاصل ہو‘‘یعنی دوسروں کے معاملات میں کھلی مداخلت ،جس کا حق امریکہ صرف اور صرف اپنے لیے محفوظ سمجھتا ہے اس بل سے پہلے بھی امریکہ کے خارجہ امور کی ایک ذیلی کمیٹی نے بلوچستان میں انسانی حقوق کا رونا رویا جس کی صدارت کانگریس مین روہبشرانے کی اور اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس اجلاس میں لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) رالف پیٹر نے بھی شرکت کی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے 2006 میں اسلامی دنیا اور مشرق وسطی کا نیا نقشہ بنایا تھا اور پاکستان کے نقشے کے حصے بخرے کر دیئے تھے۔ ظاہر ہے بی ایل اے اور خان آف قلات کو اس سے زیادہ پاکستان دشمنی میں موزوں شخص کہاں سے ملتا جو اسامہ بن لادن کی تمام کاروائیوں کا بدلہ بھی پاکستان سے لینا چاہتا ہے حالانکہ وہ پاکستانی شہری نہیں تھا اور نہ ہی اُسے پاکستان نے بنایا تھا

بلکہ وہ امریکہ ساختہ تھا لیکن امریکہ اپنے ہر کیے کی سزا دوسرے کو دینے کی روش اپنائے ہوئے ہے۔ اگرچہ امریکی حکومت نے اس معاملے سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے لیکن ساری دنیا کو قابو کرنے کے لیے کوشاں امریکہ اپنے عہدے داروں یا سیاست دانوں کو قابو کیوں نہیں کرسکتا جو فاٹا اور بلوچستان میں بالخصوص اور پورے پاکستان میں بالعموم منفی کردار ادا کررہے ہیں۔اس بل سے امریکہ نے حکومتی سطح پر لاتعلقی کا اظہار کیا ہے تاہم امریکی حکومت کا کہنا کوئی حیثیت اس لیے نہیں رکھتا کہ اُس کی این جی اوز اور تھنک ٹینک مسلسل پاکستان مخالف کاروائیوں میں مصروف ہیں اور ہر منفی سروے میں پاکستان کو سب سے اوپر رکھ کر پوری دنیا میں اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ یہی سلوک بلوچستان کے معاملے میں کیا جارہا ہے اس کے مخصوص جغرافیائی ، معاشی اور معاشرتی حالات کا فائدہ بہت سی غیر ملکی طاقتیں اٹھارہی ہیں اور ایسا کرنے میں ہمارے اپنے ہی کچھ لوگ انہیں امداد فراہم کرتے ہیں۔ہمارے اس صوبے کے حالات کو کچھ اس طرح اچھالا جاتا ہے جیسے یہاں پاکستان کا نام بھی کوئی سننا گوارا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے آئین کو تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ ابھی سال بھی نہیں گزرا کہ یہاں کے عوام نے پاکستان کے آئین کے تحت عام انتخابات میں بھرپور حصہ لیا، اپنے نمائندے چنے اور ڈاکٹر عبدالمالک کے زیر قیادت قومی دھارے میں شامل ہو کر آئین پاکستان کے ہی تحت قومی معاملات میں حصہ لے رہے ہیں ۔ جہاں تک بلوچستان میں حالات کا تعلق ہے اس کے بارے

میں ہر پاکستانی کو تشویش ہے کیونکہ قدرتی وسائل سے بھرپور اس صوبے پر عالمی اور علاقائی طاقتوں کی نظریں مسلسل جمی ہوئی ہیں جس کے بارے میں، میں اور میرے جیسے قومی درد رکھنے والے مسلسل چیخ رہے ہیں کہ اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جائے نہ کہ اسے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا جائے۔ امن وامان کے حالات ملک کی کسی کونے میں اچھے نہیں ہیں اغوا، دھماکے، قتل، ڈکیتی پورے ملک میں ہے افراد گم بھی ہر صوبے سے ہوتے ہیں لیکن بلوچستان کے معاملے کو ایک اور انداز میں اچھالا جاتا ہے اور ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ لاپتہ یا گمشدہ افراد کا مسئلہ صرف بلوچستان میں ہے اور یوں بی ایل اے اور دوسرے شرپسندوں کے نکتہء نظر کو مزید تقویت دے دی جاتی ہے۔

چاہے جو بھی کہہ دیا جائے بلوچستان پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے اور جس طرح کوئی بھی ملک اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتا ویسا ہی پاکستان کا نکتہء نظر ہے اور دوسروں کو پاکستان کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے ہاں یہاں مسئلہ یہ ہے کہ عوام تو بولتے ہیں لیکن حکومت معذرت خواہانہ رویہ اپنا لیتی ہے اور ظاہر ہے عالمی سطح پر اہمیت حکومتی نکتہء نظر کی ہوتی ہے عوامی رائے کو تو چیخ و پکار سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں ملا عبدالقادر کو پاکستانی فوج کی مدد کرنے کی جرم میں سزا دیئے جانے پر پاکستان نے احتجاج کیا تو بنگلہ دیش نے اس پر غیر ضروری طور پر

شدید ردِ عمل ظاہر کیا اور اسے اپنے معاملات میں مداخلت کہا اور حسب معمول ہمارے کچھ اپنے لوگوں نے بھی ان کی حمایت کی حالانکہ معاملہ پاکستان سے ہی متعلق تھا اس لیے پاکستان کو احتجاج کا حق تھا۔ لیکن ہمارے ملک کے بارے معاملہ مختلف رکھا جاتا ہے ہر شخص اور ملک اس کے بارے میں رائے بھی دیتا ہے اور قرار دادیں اور بل بھی پاس کرتا ہے اور ہماری حکومت اور میڈیا دونوں خاموش رہتے ہیں بلکہ ہمارے جو دانشور ملک اور حکومت کی مخالفت میں فرق روا نہیں رکھتے یا سمجھتے نہیں ہیں وہ اِن بلوں اور قرار دادوں کو بطور حوالہ پیش کر دیتے ہیں اور یہ رویہ قومی معاملات میں ان کی غیر سنجیدگی کی غمازی کرتا ہے۔

بلوچستان کا مسئلہ سنجیدہ ہے اور اسے سنجیدگی سے لینا ضروری ہے حکومت، میڈیا، عدالتیں، فوج اور خفیہ اداروں کو اس کے بارے میں ہوشمندی سے کام لینا ہوگا۔ غیر ملکی مداخلت کے ثبوت نہ صرف دنیا کو بلکہ اپنے عوام کو بھی دینا ضروری ہیں خاص کر بلوچوں کو اور ان کے اپنے سرداروں کی خود غرضیاں بھی ان کے سامنے رکھنا ضروری ہیں تاکہ وہ جان سکیں کہ حربیار یا براہمداغ یا آغا میر سلیمان داود خان آف قلات یا کوئی اور ناراض سردار ان کے لیے نہیں بلکہ اپنی سرداری قائم رکھنے کے لیے مصروف عمل ہے اور اُن کا مقصد انہیں خوش رکھنا نہیں بلکہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کی خوشی ہے یہ آقا بھی وقت کے ساتھ

بدل جاتا ہے کبھی امریکہ، کبھی کرزئی اور اکثر اوقات بھارت ہوتا ہے۔ بلوچستان کے عوام کو یہ بات سمجھانا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ اُن کا دشمن کون ہے اور دوست کون، اور حکومت امریکہ سے بھی خوفزدہ ہونا چھوڑ کر اس سے احتجاج کرے کہ اس کے ملک سے ہمارے ملک کے خلاف سازش کیوں کی جاتی ہے اور اگر بالفرض ہم دنیا کی نظر میں اسامہ کو پناہ دینے کے مجرم ہیں تو ہمارا ہر غدار اور مجرم ان بڑی طاقتوں کا مہمان کیوں بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ دوسروں کو سمجھانے کے لیے حکومتی کاروائی کی ضرورت ہے اور اب ہم پاکستانی عوام صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ ہماری حکومتوں کو حوصلہ اور ہمت دے کہ وہ اپنے ملک اور ہم عوام کے لیے بول سکیں کیونکہ عوام تو اب حکومت کے لیے بول بول کر تھکنے لگے ہیں اور بہر حال حکومت کا کام حکومت کا ہے جو اسے کرتے رہنا چاہیے لہٰذا اُسے بلوچستان کے حالات پر خصوصی توجہ کے ساتھ بیرونی دشمنوں پر نظر بھی رکھنی چاہیے اور ان کا توڑ بھی کرنا چاہیے۔

چند ہزار طالبان اور اٹھارہ کروڑ پاکستانی

طالبان کون ہیں اور آخر چاہتے کیا ہیں کیا کچھ طاقتوں نے ایسے ظالم لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک ملک دشمن اور اسلام دشمن قوت بنا لی ہے جو نہ انسان کو انسان سمجھتے ہیں نہ مسلمان کو مسلمان۔ اس گروہ کو بناتے ہوئے خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اس کے ارکان میں انسانیت کی کوئی رمق نہ ہو، وطن اور اہل وطن کا خون ان کے نزدیک پانی سے بھی ارزاں ہو، یہ خود تو دین اور اسلام کے اصولوں کو توڑتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہوں لیکن دوسروں کا اسلام انہیں ناقص ہی نظر آتا ہو، خود ان کا جرم ثواب قرار پائے لیکن دوسرے کا ہر فعل ان کے نزدیک گناہ ہو۔ اسلام نے مثلہ بنانے کی شدید مذمت کی ہے نبی پاک ﷺ نے اس سے سختی سے منع فرمایا لیکن طالبان اس مکروہ فعل کو بڑی باقاعدگی سے سرانجام دیتے ہیں۔ اللہ نے انسانی جان کی تکریم بیان فرمائی لیکن طالبان انسانی جان کو کسی عزت کے قابل نہیں سمجھتے۔ پچھلے دنوں سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو چلتی رہی جو متنی جو کوہاٹ روڈ پشاور پر واقع ایک گاؤں ہے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص جنگریز کی ہے اس ویڈیو میں یہ شخص کچھ پولیس اہلکاروں کی سر کاٹنے کے بعد ان کے سروں سے فٹ بال کھیل رہا ہے۔ اس نے اِن سروں کو پکڑ کر تصویریں بنائیں ہیں یقین کریں ہاتھ کانپ رہا ہے یہ سب کچھ لکھتے ہوئے لیکن ایسا ہوا ہے اور یہ ویڈیو ایک

سابق طالب رسول جان نے اَپ لوڈ کی ہے۔ یہ کونسا اسلام ہے اسلام تو امن اور محبت کا مذہب ہے یہ تو دشمن کو بھی معاف کر دینے کا سبق دیتا ہے اس میں عمال حکومت کا قتل کہاں جائز قرار دیا گیا ہے، حکم تو تب تک اطاعت کا ہے جب تک حکومت اور حاکم صاف صاف کفر کا اعلان نہ کر دے۔ جنگجوں کی ویڈیو تو صرف ایک حوالہ ہے ورنہ بربریت کی جو داستانیں ان لوگوں سے منسوب ہیں وہ ایک نہیں کئی ہیں اور ہر ایک بربریت میں دوسرے سے بڑھ کر ہے اور دکھ اس بات کا ہے کہ پھر بھی ان کے حق میں کوئی آواز اٹھتی ہوئی سنائی دے دیتی ہے اور انہیں اپنی کاروائیاں تیز کرنے کے لیے موقع بھی مل جاتا ہے اور حوصلہ بھی ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کہنے کو کہا جاتا ہے کہ یہ طالبان چند ہزار ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ انہوں نے اٹھارہ کروڑ عوام کا جینا حرام کیا ہوا ہے یہ خفیہ دشمن اپنا وار ہر جگہ بڑی آسانی سے کر جاتا ہے تو کیا ان کا جاسوسی نظام ہماری خفیہ ایجنسیوں اور حکومتی اداروں سے زیادہ مضبوط اور مربوط ہے۔ بہر حال جو بھی ہے ان کی بربریت ہر روز پاکستانیوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے ہر روز کبھی عوام کبھی پولیس کبھی فوج اور کبھی تو سیاسی شخصیات بھی ان دھماکوں اور حملوں کی نظر ہو رہے ہیں ابھی حال ہی میں کراچی میں ایس پی سی آئی ڈی چوہدری اسلم کی شہادت اچانک ان کے روٹ تبدیل ہونے اور اچانک فون کالز بھی کچھ خطرناک اشارے دے رہے ہیں اور پھر حسب معمول تحریک طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد نے اس حملے اور قتل کی ذمہ داری قبول کر لی یعنی

طالبان ہر صورت اپنے سامنے آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے پر قادر ہیں اور بڑی دھوم دھام سے اپنے مظالم کا اعلان کرتے ہیں اور بسا اوقات تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اپنی دہشت بٹھانے کے لیے اور لوگوں کو خود سے مزید خوفزدہ کرنے کے لیے عام جرائم بلکہ ذاتی وجوہات کی بنا پر ہونے والے قتل بھی اپنے ذمہ لے لیتے ہیں ۔ یعنی وحشت و بربریت کی داستانوں میں یوں اضافہ کہ کوئی اُن کے سامنے دم بھی نہ مار سکے اور اگر کبھی کبھی یہ لوگ پکڑے جائیں تو اسی خوف اور وحشت کے مارے ثبوتوں کی عدم فراہمی کی توجیہہ کے ساتھ چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ جنگجو جیسے مجرموں کی اگرچہ ویڈیو تک منظر عام پر آچکی ہے اور اگر وہ زندہ ہے اور پکڑا جائے تو لگتا تو ایسا ہے کہ اُس کا جرم بھی ثابت کرنے کے لیے ثبوت ڈھونڈے جائیں گے۔ کیونکہ اس سے پہلے بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ بزبان خود اقرار کرنے والے مجرم چھوڑ دیئے گئے ہیں اور کسی سقہ طالب کو فوج یا پولیس نے از خود گولی ماردی ہو تو بھی انسانی حقوق کے نام پر تنظیموں ، این جی اوز اور میڈیا نے جو شور اٹھایا وہ بھی سب جانتے ہیں اور کہیں عدالت سزا سنا دے تو پھر حکومت عمل درآمد سے کتراتی ہے اور متاثر ہوتے ہیں عوام۔

پریشانی، دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت ، فوج خفیہ ادارے ، قانون نافذ کرنے والے ادارے ، پولیس ، ایف سی، رینجرز، سی آئی ڈی اور دیگر ادارے

اپنے تمام تر وسائل کے باوجود ان کا راستہ نہیں روک پا رہے۔ یہ بھی درست ہے کہ خود کش جان سے گزرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی راہ روکنا مشکل ہے لیکن آخر ان کے ماسٹر مائنڈز جب منصوبہ سازی کرتے ہیں اور شہروں کے بیچ میں کرتے ہیں تو ان کی خبر کسی کو بھی کیسے نہیں ہو پاتی مثال کے طور پر چوہدری اسلم کو مارنے والا خود کش اگر واقعی نعیم اللہ تھا اور کراچی کا رہائشی تھا تو کیسے وہ سب کی نظروں سے چھپا رہا اور ہنگو کا بہادر اور جری نوجوان اعتزاز اپنی کم عمری کے باوجود اگر خود کش حملہ آور کو پہچان کر اُس سے نبرد آزما ہوتا ہے تو آخر اس بچے سے پہلے اُسے کوئی کیوں پہچان نہیں پاتا۔ دراصل کوتاہیاں ہر سطح پر ہیں سزا و جزا کا عمل سخت ہو تو شاید بہتری کی صورت نکل آئے۔ پہنچنا جڑ تک ہے صرف شاخ تراشی سے بات نہیں بنے گی۔ جنگ ریز ہو، فضل اللہ ہو، شاہد اللہ شاہد ہو یا عقیل عرف ڈاکٹر عثمان یہ سب انسانیت سے گرے ہوئے لوگ ہیں اور کسی رعایت اور ہمدردی کے مستحق نہیں اور نہ ہی ان کے لیے کسی عدالتی کاروائی اور ثبوت کی ضرورت ہے ان کے جرائم اور مظالم اور ان کے بیانات خود ان کے خلاف ثبوت ہیں خدارا حکومت اور ذمہ دار ادارے ہر ممکن طریقے سے ان کو کیفر کردار تک پہنچا کر ملک کا امن بحال کریں تاکہ پاکستانی بھی امن کی فضا میں سانس لے سکیں اور ایک بار پھر ہم ایک پُر امن زندگی گزار سکیں کیونکہ یہ ہمارا بنیادی حق ہے۔

پاکستان کے ایٹمی اثاثے اور اہل مغرب کا تعصب

ایٹمی ملک تو پاکستان بھی ہے اور بھارت بھی لیکن اہل مغرب کو فکر اور پریشانی پاکستان کے ہی ایٹمی اثاثوں اور ہتھیاروں کی پڑی رہتی ہے اگرچہ کبھی کبھی وہ منہ کا ذائقہ بدلنے کو بھارت کی ایٹمی قوت کے بارے میں بھی ذکر کر دیتے ہیں لیکن پاکستان کو ہدف تنقید بنانا ان کی عادت ثانیہ بن چکی ہے جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کے خلاف اپنا تعصب نکالتے رہتے ہیں۔ ان ہدف تنقید ملکوں میں کوریا، ایران اور لیبیا وغیرہ بھی شامل ہیں اور کوریا کے علاوہ اس تنقید کا نشانہ مسلمان ممالک ہی بنتے ہیں بلکہ ان پر، معاشی، سفارتی، تجارتی، اور معلوم نہیں کون کون سی پابندیاں لگا دی جاتی ہیں۔ پابندیاں ہی کیا مسلمان ملکوں پر تو اسی بہانے حملہ کر دیا جاتا ہے اور اُن کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی ہے اور ہونے والے قتل عام میں فوج یا سول، چھوٹے بڑے یا بوڑھے اور یا عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ عراق اور افغانستان کے جنگی واقعات اس کے گواہ ہیں۔ پاکستان اگر اب تک تنقید کا نشانہ بن رہا ہے اور کھلی جنگ اور حملے سے بچا ہوا ہے تو صرف اور صرف اس ایٹم بم کی وجہ سے جسے یہ لوگ اسلامی بم کا نام دیتے ہیں۔

پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے بارے میں کچھ عرصے بعد کوئی نہ کوئی شوشا ضرور چھوڑا جاتا ہے اور اب کی بار یہ فریضہ مائیکل کلگمین نے سرانجام دیا ہے اور اس تنقید کو کوئی بنیاد فراہم کرنے کے لیے جو بہانہ تراشا گیا ہے وہ ہے جنرل خالد قدوائی کی سٹریٹیجک پلاننگ ڈویژن یعنی ایس پی ڈی کے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوشی اور لیفٹیننٹ جنرل زبیر محمود حیات کی اس ذمہ داری پر تعیناتی۔ جنرل قدوائی ایس پی ڈی کی ابتداء یعنی 1999 سے ہی اس اہم ذمہ داری کو نبھا رہے تھے اور اسے بحسن و خوبی نبھایا بھی لیکن ظاہر ہے ذمہ داریوں اور ذمہ داروں کی تبدیلی تو ایک قانون ہے جو کہ ہر جگہ لاگو ہوتا ہے اور ایسا بھی نہیں تھا کہ اب تک پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے بارے میں بے جا تنقید نہیں کی گئی۔ مائیکل کلگمین کو تشویش لاحق ہے کہ دہشت گرد اور طالبان کسی اہم ایئر بیس پر حملہ کرکے یہ ہتھیار اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں تو پاکستانیوں کا سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ نے اپنے ایٹمی ہتھیار فٹ حالت میں عام نمائش کے لیے واشنگٹن یا کیلیفورنیا یا نیو جرسی یا کسی اور ریاست میں کسی چوک پر یا کسی ایئر پورٹ میں کسی جہاز کے ہینگر میں رکھے ہوئے ہیں جو وہ پاکستان کے بارے میں ایسی تنقید کرتا ہے۔ وہ سب جانتے ہیں کہ پاکستان میں ایک بہت بڑا اور مضبوط ادارہ یعنی سٹریٹیجک پلاننگ ڈویژن اسی کام پر مامور ہے کہ ان اثاثوں کی حفاظت کرے۔ مسٹر مائیکل کو یہ بھی خوف ہے کہ پاکستان ٹیکٹیکل ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے جس سے وہ بھارت میں مخصوص

اہداف کو نشانہ بنا سکتا ہے اور ان ہتھیاروں کا دہشتگردوں کے ہاتھ لگنے کا آسان امکان موجود ہے۔ مسٹر کلگمین اگر یہ تجزیہ کرتے ہوئے سوچ لیتے کہ پاکستان نے اب تک ان ہتھیاروں کے بارے میں جس ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے وہ سب سے زیادہ ایٹمی قوت رکھنے والے امریکہ نے بھی نہیں دیا ہے، وہاں ہونے والے کچھ غیر ذمہ دارانہ واقعات کے بارے میں ، میں اپنے ایک اور کالم میں ذکر بھی کر چکی ہوں اور ان صاحب کو اگر بھارت کی اتنی ہی فکر ہے تو وہ اپنے ملک کو یہ مشورہ کیوں نہیں دے دیتے کہ جہاں وہ اقوام متحدہ کو ہر معاملے میں اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے وہاں وہ اُس پر کشمیر کا مسئلہ حل کرنے پر زور دے اور یا خود ثالثی کے لیے آگے بڑھے اور بھارت کو مجبور کرے کہ وہ کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق اس مسئلے کو حل کرے۔ اصل مسئلہ تو کشمیر ہے جس پر بھارت نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور اسی مسئلے نے دونوں ملکوں میں ہتھیاروں کی دوڑ لگائی ہوئی ہے اور دونوں ملکوں میں ملکی ترقی پر لگنے والے وسائل سے اسلحہ خریدا جا رہا ہے یعنی باالفاظ دیگر یہ سرمایہ بھارتی خواہشات کی نظر ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی تاریخ کا یہ سب سے پرانا غیر حل شدہ مسئلہ اگر حل کر لیا جائے تو پاکستان اور بھارت کے تمام تنازعات ہی ختم ہو جائیں اور جب لڑائی اور لڑائی کی وجہ نہ رہے تو پھر عام اور خاص، ایٹمی اور غیر ایٹمی کسی بھی قسم کے ہتھیاروں کا جھگڑا ہی نہ رہے گا۔ جہاں تک دہشت گردی کا تعلق ہے تو دنیا بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ بھارت بلوچستان اور

فاٹا دونوں راستوں بلکہ ہر ممکنہ راستے سے اپنے دہشت گرد پاکستان میں داخل کرتا ہے اور یہاں دہشت گردی کراتا ہے۔ اور دوسری طرف امریکہ ہے جس نے اپنے مقاصد کے لیے اِن لوگوں کو پہلے استعمال کیا اور پھر انہیں دہشت گرد اور شدت پسند قرار دے کراِن کے خلاف کاروائی شروع کی اور اسی کاروائی کی آڑ میں پاکستان کے خلاف اپنا بغض بھی نکال رہا ہے۔ دہشت گردوں کے پاس موجود اسلحہ خدانخواستہ پاک فوج کے اسلحہ ڈپوؤں سے نہیں نکالا گیا ہے بلکہ یہ غیر ملکی آقاؤں کی مہربانی ہے۔ ہمارے قبائلی علاقے میں پتھر کے پہاڑ ہیں بارود کے نہیں جسے طالبان استعمال کئے جا رہے ہیں لیکن ختم نہیں ہو رہا۔ اگر اللہ کے کرم سے ان لوگوں کی پہنچ اس اسلحے تک نہیں ہے تو ایٹمی اسلحے تک کیسے ہو سکتی ہے۔ جتنا زور امریکہ اور یورپ پاکستان مخالف پروپیگنڈے اور پاکستان میں دہشت گردی کی ترویج پر دے رہے ہیں اگر یہی زور اس کی بیخ کنی پر دیا جاتا اور اس معاملے میں پاکستان کی مدد کی جاتی تو اس مسئلے پر قابو پایا جا چکا ہوتا اور اسی طرح اگر وہ اتنی محنت کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لیے بھارت کو مجبور کرنے پر کرتے تو آج کم از کم پاکستان ایٹمی اسلحے پر اتنا خرچ نہ کرتا۔ ہاں بھارت کا مسئلہ اور ہے اُسے چین کے ساتھ بھی تنازعات حل کرنے ہیں اور سری لنکا میں بھی مداخلت کرنی ہے، بھوٹان جیسے چھوٹے ملکوں کو بھی اپنا مطیع رکھنا ہے اور بحر ہند میں بھی اپنی اجارہ داری قائم کرنی ہے جس کے لیے اُسے اسلحہ چاہیے لیکن حیرت ہے اتنے کھلے عام منصوبے بھی مغرب کی

نظر سے اوجھل ہیں ورنہ مائیکل کلگمین جیسے لوگ شاید ان کے بارے میں بھی کچھ کہتے اور پاکستان ہر وقت زیر عتاب نہ ہوتا۔ بہر حال جو بھی ہے امریکہ و یورپ کو پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کی فکر چھوڑ کر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ہتھیار ہم نے اپنے دفاع کے لیے بنائے ہیں اور اِن کا دفاع کرنا ہم جانتے ہیں اور ایسا کر رہے ہیں اور بہت اعلیٰ طریقے سے کر رہے ہیں۔ جس طرح ایٹمی قوت حاصل کرنے کے معاملے میں پورا ملک اور ہر حکومت ایک رائے رکھتی رہی ہے اسی طرح ان اثاثوں کی حفاظت کے لیے ہر جرنیل اور سپاہی بلکہ قوم کا ہر فرد مستعد ہے اور اس کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔

یوم یکجہتی کشمیر۔۔۔ صرف قرار دادیں پیش اور منظور نہ کی جائیں

1990 سے لے کر آج 2014 تک ،یعنی گذشتہ چوبیس سال سے ہم ہر پانچ فروری کو یوم یکجہتی کشمیر منا رہے ہیں اور پھر سال کے تین سو چونسٹھ دنوں میں اس مسئلے کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ہاں کشمیر سے منسوب چند ایک مخصوص دنوں میں اخبارات میں چند مضمون لکھ اور پڑھ لیتے ہیں اور بس اس کے بعد چاہے کشمیر میں قتل عام کیا جائے یا عورتوں اور بچوں سے بد سلوکی کی جائے ،پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی کی جائے، پاکستان پر الزامات لگائے جائیں ، اپنے ہاں ہونے والی تمام دہشت گردی پاکستان کے کھاتے میں ڈالی جائے یا ہمارا پانی روکا جائے ہماری حکومت سب کچھ بھلا کر کبھی بھارت کو پسندیدہ ترین قوم قرار دینے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے یا پھر تجارت کی خواہش کرنے لگتی ہے، چاہے پھر ہمارے ٹرکوں پر الزام لگا کر روک دیا جائے اور ایک بار پھر ہماری قومی سبکی کی جائے۔

مسئلہ یہ ہے کہ مسائل ان اقدامات سے حل ہوں گے بھی نہیں مسائل تو حل ہونگے بنیادی مسئلہ حل کرنے سے اور وہ ہے کشمیر جس کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرار دادیں بھی موجود ہیں اور کشمیری عوام کے ان جلسوں، جلوسوں اور

احتجاجوں کا ریکارڈ بھی جو وہ سری نگر، کالگام، کپواڑہ، حضرت بل اور کشمیر کے شہر شہر گاؤں گاؤں نکالتے ہیں اور پولیس اور فوج کی لاٹھیاں اور گولیاں کھاتے ہیں، خون سڑکوں پر بہتا ہے جذب ہو جاتا ہے اور پھر نئے خون کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ دنیا خاموش رہتی ہے کیوں کہ اس کا مفاد بھارت سے وابستہ ہے۔ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا یہ دوسرا بڑا ملک ہے اور ان کے لیے اہم ہے کیونکہ وہ اس منڈی کو کھونا نہیں چاہتے۔ نا حل شدہ مسئلہ کشمیر ان کے اسلحے کی کھپت کو بڑھاتا ہے لہٰذا ان کی عدم دلچسپی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ہم خود کیوں اس معاملے سے صرف نظر کر رہے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے دریا کشمیر سے نکلتے ہیں، کشمیر کا اور ہمارا مذہبی رشتہ ہے، ثقافتی رشتہ ہے، پاکستان بنانے میں کشمیریوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے پھر کیوں ہم لاتعلق ہو کر بیٹھے رہتے ہیں۔ پڑوسیوں سے دوستی بھی اپنی جگہ اور تجارت بھی خوش آئندہ لیکن یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اگر تمام مسائل کی جڑ یعنی کشمیر کے مسئلے کو حل نہ کیا جائے تو کیا باقی کے مسائل کا حل ممکن ہے۔

یوم یکجہتی کشمیر کو اگر صرف بطور چھٹی نہ منایا جائے اور صرف قرار دادیں پیش اور منظور نہ کی جائیں بلکہ عملی اقدامات کیے جائیں اور سال بھر کئے جائیں تو زیادہ موثر ہوں گے۔ مسئلہ کشمیر کو نہ صرف حکومتی سطح پر بلکہ آج کے جدید دور کے طاقتور میڈیا کو بھی آگے بڑھ کر اجاگر کرنا چاہیے اور

بھارت سے دوستی کا راگ الاپتے وقت کشمیریوں کی چیخ و پکار کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے آگے بڑھنا ہوگا کہ وہ اس مسئلے کے حل میں سنجیدگی دکھائے اور اس کی اہمیت کو سمجھے بلکہ دنیا کے امن کو اس سے لاحق خطرات کا احساس کرے کہ بھارت صرف اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کشمیر کا معاملہ حل نہیں کر رہا اور ایک مسلمان ریاست پر غاصبانہ قابض ہے۔ اس کی سات لاکھ فوج کو یہاں ہر قسم کے اختیارات حاصل ہیں کہ کسی بھی کشمیری کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے اور انہی اختیارت کو استعمال کرتے ہوئے ہزاروں کشمیریوں کو شہید کر چکا ہے جس میں بچے، بوڑھے اور جوان سب شامل ہیں۔ اکثر اوقات دریافت ہونے والی اجتماعی قبریں اس بات کا ثبوت ہے کہ اجتماعی قتل عام کیا جاتا ہے اور اپنے جرم پر منوں مٹی ڈال کر اُسے چھپا لیا جاتا ہے اور حیرت ہے کہ دنیا میں عام طور پر اور پاکستان میں خاص کر زمین کی تہوں سے جرم کو نکال کر باہر کرکے اور دنیا کو دکھا دینے والی این جی اوز اور میڈیا ایسے انسانیت سوز مظالم اور جرائم اگر نظر آ ہی جائیں تو ان پر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں ورنہ اکثر اوقات تو آنکھیں ہی بند رکھتے ہیں دنیا کا یہ رویہ تو سمجھ میں آتا ہے اور وجوہات کا ذکر میں شروع میں کر چکی ہوں لیکن ہمارا اپنا بھی یہی حال ہے۔ دن منانا بھی اچھا ہے کہ یوں ہم اپنی نئی نسل کو بھی یاد لاتے ہیں اور

انہیں کسی بھی معاملے کی نوعیت اور اہمیت سے آگاہی دیتے ہیں لیکن زیادہ ضروری اس کے حل کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنا اور پھر اپنے مطالبے کو منوانے کے لیے سفارتی سطح پر بھی کام کرنا ہے۔ اگر اس مسئلے کو حل کر لیں تو پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور دونوں ملکوں کے عوام سکھ کا سانس لے لیں گے اور ان کے وسائل جنگی سامان کی خریداری کے بجائے ان کی ترقی پر خرچ ہونگے ہر وقت جنگ کی تلوار سر پر نہیں لٹکی رہے گا بجٹ میں دفاع کا کم اور عوام کا حصہ زیادہ ہوگا اور یوں خوشحالی ان کا مقدر بنے گی۔ بھارت کو یہ باتیں سوچ لینی چاہیں اور ان پر عمل کر کے خطے کی تقدیر بدلنے کی کوشش کر لینی چاہیے۔

چین ایک عظیم دوست

پاکستان کے مشرق میں اگر بھارت واقع ہے جو اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تو دوسری طرف خوش قسمتی سے شمال میں چین جیسا دوست ملک بھی موجود ہے جو ہر مشکل وقت میں پاکستان کے ساتھ رہتا ہے۔ پاکستان میں ترقیاتی کاموں میں چین کا ہمیشہ ایک بہت.بڑا اور مثبت رویہ رہا ہے۔ چین نا صرف پاکستان میں ترقیاتی اور تکنیکی منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچاتا رہا ہے بلکہ تکنیکی تعاون بھی فراہم کرتا رہتا ہے۔ ہیوی میکینیکل کمپلیکس سے لے کر شاہراہ ریشم تک ہر جگہ چین کی دوستی کے ثبوت موجود ہیں اور یہی رویہ ہمیشہ پاکستان کی طرف سے رہا ہے اگرچہ وہ اس قسم کے منصوبے چین میں نہیں چلا سکا ہے لیکن سفارتی سطح پر چین کے قیام سے لے کر آج تک ہر موقع پر اس کا زبردست حامی رہا ہے۔ دونوں ممالک کی دوستی ہر فورم پر مثالی رہی ہے اور ایک دوسرے کے لیے حوصلے کا باعث بھی۔ لیکن بین الاقوامی اور علاقائی طاقتیں اس دوستی سے زیادہ خوش نہیں رہتی کیونکہ یہ اُن کے مفاد میں نہیں اگرچہ اس سے اُن کا نقصان بھی نہیں لیکن ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دونوں ملکوں میں غلط فہمیاں یا خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اب کی بار یونائیٹڈ سٹریٹیجی انسٹیٹیوٹ کی نیوز.بریف میں بیفیلو پیٹوسی نے ایک مضمون لکھ

کراِن طاقتوں کی ترجمانی کی۔ جس میں اُس نے نان ایشوز کو ایشوز بنا کر پیش کیا اور یہ یقیناً صرف اس کا نکتہ نظر نہیں ہے بلکہ ایک سوچ کو ہوا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کے لیے بین الاقوامی کے ساتھ ساتھ قومی میڈیا کو بھی استعمال کیا گیا۔ ایک بڑے اردو روزنامے میں جس کے خیالات اکثر قومی مفادات و خیالات سے متصادم ورنہ تو مختلف ضرور ہوتے ہیں کے ایک بڑے کالم نگار نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا جیسے چین اور پاکستان کے درمیان دوستی کی بنیادیں ہل رہی ہوں۔ دراصل گوادر کی بندرگاہ چین کو دینے پر اُن ملکوں کو اعتراض ہے جو بحر ہند کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں گوادر سے سینکیانگ تک بننے والی شاہراہ اور اس کے ذریعے چینی تجارت کو ملنے والی ترقی ان لوگوں کی معیشت کے لیے ایک ایسا خطرہ ہے جسے شاید مغربی دنیا برداشت نہ کر سکے۔ چین اس وقت اپنی صنعتی ترقی اور معاشی استحکام کی وجہ سے دنیا میں جس مقام تک پہنچا ہوا ہے وہ مغرب کی اجارہ داری کو چیلنج کر چکا ہے۔ آر یو ایس آئی کی نیوز بریف کے مطابق چینی سفیر کا یہ کہنا ہے کہ پاکستان میں چینی ماہرین کے لیے سیکیورٹی کے خدشات ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں گے اور جن کمپنیوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان چھوڑ کر چلی گئی ہیں تو بین الاقوامی تجارت اور صنعت میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ پاکستان میں سیکیورٹی کے مسائل سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ مسائل بھی انہی طاقتوں کے پیدا کردہ ہیں اور اگر

آج یہ دہشت گردوں کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں تو ہمارے پہاڑ بارود کی بجائے سونا اُگل سکتے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ چین پاکستان میں اپنے منصوبے بند کر رہا ہے یا کردے گا تو صرف ایک ماہ پہلے میں نے کراچی جاتے ہوئے چینی انجنیئرز کو ان مشینوں پر کھڑے دیکھا جو نیشنل ہائی وے کی تعمیر میں مصروف تھیں اور ہمیشہ ہی ان چینی کارکنوں کو پاکستان میں عزت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ چین اگرچہ پوری دنیا میں کئی منصوبوں پر کام کر رہا ہے لیکن پاکستان میں وہ صرف کام نہیں کر رہا بلکہ یہ کام وہ دوستی میں کر رہا ہے اور عرصۂ دراز سے کر رہا ہے اُس وقت سے ،جب وہ امریکہ اور یورپ کی ٹکر پر نہیں آیا تھا۔ اس لیے ان دونوں ملکوں کی دوستی جیسے ضرب المثل بن چکی ہے ویسے کسی اور ملک سے نہیں ۔ ایک غلط فہمی یہ بھی پیدا کرنے اور پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ سنکیانگ کی ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ کو پاکستان کی تحریک طالبان کے ساتھ جوڑا جارہا ہے جبکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ حکومت پاکستان کا اس سے کوئی تعلق ہے کیونکہ وہ کبھی نہیں چاہے گی کہ ایک عظیم دوست اور پڑوسی سے تعلقات خراب کئے جائیں۔

پاکستان اور چین دونوں جو اپنی دوستی کو ہمالیہ سے زیادہ بلند قرار دیتے ہیں کو ایسے بد نیت صحافیوں سے ضرور پوچھ گچھ کرنی چاہیے اور ہمارے اپنے ملک کے ان عظیم ''کالم نگاروں'' کو بھی یہ سوچنا چاہیے جو چین کی ٹوکری میں

انڈے نہ رکھنے کے مشورے دے رہے ہیں جبکہ یہی لوگ جو امریکہ اور بھارت کے بارے میں احتیاط کا مشورہ دیتے ہیں وہ ایک دوست کے بارے میں محتاط رہنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کیا آج تک ہمارے ہاں کی کسی تخریبی کاروائی میں چین کے ملوث ہونے کا ثبوت ملا ہے اگر نہیں تو ہم کیوں اُس کی دوستی کو ماننے کی بجائے اس سے پریشان ہو رہے ہیں ہاں اگر ایسا کوئی ثبوت موجود ہو تو ان کا کہنا بجا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چین اور پاکستان ہمیشہ ایک ساتھ اور ایک دوسرے کی پشت پر رہے ہیں کہیں اور کبھی دوسرے کو اکیلا نہیں چھوڑا لہٰذا اس دوستی کو قائم رکھنے کی ہر موقعہ اور ہر نہج پر نہ صرف کوشش کرنی چاہیے بلکہ اس پر فخر کرنا چاہیے۔

طالبان سے مذاکرات اور میڈیا

مسائل کا حل تلاش کرنا مشکل بھی ہوتا ہے، صبر آزما بھی اور احتیاط کا متقاضی بھی اور جب مسائل برسوں پر مُحیط ہوں تو یہ سب کچھ مزید ضروری ہو جاتا ہے۔ پاکستان اس وقت ایسے ہی ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ دہشت گردی نے پورے ملک کو تہہ و بالا کر کے رکھا ہوا ہے، آگ اور خون کا ایک کھیل ہے جو برسوں سے کھیلا جا رہا ہے، ہزاروں جانیں جا چکی ہیں اور اب بھی ہر روز جا رہی ہیں، آپریشن بھی ہوئے اور مذاکرات بھی لیکن خون بہنا بند نہیں ہو رہا۔ اب ایک بار پھر اس مسئلے کو مذاکرات کی میز تک لایا گیا ہے اگرچہ یہ سب کچھ خرابی بسیار کے بعد ہے اور اسی خرابی کو بنیاد بنا کر ایک خاص نکتہء نظر رکھنے والے ان مذاکرات کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ کیا ہم مزید اتنی ہی خرابی کے لیے تیار ہو جائیں اور آپریشن کو ہی آخری حل قرار دے دیں یقیناً اس کو آخری حل ہی سمجھنا چاہیے لیکن اس سے پہلے پُر امن حل کی ایک آخری کوشش ضروری ہے جس کے سلسلے میں ہی مذاکرات چل رہے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دہشت گردی اور دھماکے بھی ساتھ ساتھ جاری ہیں جن میں اکثر سے تو طالبان برأت کا اظہار کر رہے ہیں تاہم کراچی میں پولیس وین پر ہونے والے حملے کی ذمہ داری قبول بھی کر لی گئی ہے۔ اس طرح کے واقعات

مذاکرات کے عمل کو متاثر بھی کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف ہمارے میڈیا پر بھی ایک طرح سے کوشش کی جارہی ہے کہ کسی طرح بات پلٹ کر آپریشن پر چلی جائے حالانکہ اس وقت میڈیا پر انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے ہر موقع پر اور ہر بات پر تنقید منفی اثرات چھوڑ سکتی ہے۔ ایسا ضروری نہیں کہ یہ مذاکرات کامیاب ہی ہوں لیکن اس کی ناکامی کی پیش گوئیاں کرنا بھی کسی طرح مناسب نہیں۔ اور پھر مذاکراتی کمیٹی کے ارکان کو بُلا بُلا کر ان سے متجسس سوالات کرنا اور بہر صورت اُن سے جواب لینا یا لینے کی کوشش کرنا تو اور بھی خطرناک ہے۔ ظاہر ہے کہ دو فریقین کے درمیان ہونے والی بات چیت میں شروع میں خوشگوار باتیں کم اور نا خوشگوار باتیں زیادہ ہوں گی، ہر بات حوصلہ افزاء بھی نہیں ہوگی اور اگر ان نا خوشگوار باتوں کو میڈیا پر نشر کیا جاتا رہے تو اچھے نتائج آنے کی اُمید کہاں باقی رہے گی۔ آج کل میڈیا جس طرح کی تفتیشی یعنی انوسٹیگیٹو رپورٹنگ کر رہا ہے اور جس میں نہ ریاست کے اہم امور کو اور نہ ہی رازوں کو راز رہنے دیا جا رہا ہے۔ میڈیا کا یہ کردار اگر بد عنوانی، چور بازاری یا معاشرے کی خامیاں اُجاگر کرنے کی حد تک ہو تو قابلِ تحسین ہے، یہ رپورٹنگ اگر سیاستدان، جرنیل یا بیوروکریٹ کی ذات میں موجود کرپشن تک محدود ہوتی تو قوم کی خدمت ہوتی لیکن ایسا کرنے کے بجائے اداروں کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے اور ملکی رازوں کو یوں طشت از بام کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ کسی دشمن ملک کے راز ہوں اجمل قصاب کی مثال سب کے

سامنے ہے۔ لیکن اس وقت میڈیا کو اپنے کردار پر غور کرنا ہو گا۔ اول تو مذاکراتی کمیٹیوں کے ارکان کو ٹی وی ٹاک شوز میں بُلانا ہی نہیں چاہیے اور اگر بُلایا بھی جائے تو اُن سے صرف ایسے سوال کرنے چاہیں جو اس تمام عمل کے لیے خطرناک نہ ہوں لیکن ہو ایسا نہیں رہا ہے طالبان کی طرف سے کمیٹی کے ایک ممبر نے ایک اینکر سے درخواست کی کہ ان کو میڈیا پر نہ بُلایا جائے تو بہتر ہو گا اور میرے خیال میں یہ واقعی بہتر ہو گا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ قوم کو باخبر رکھنا ضروری ہے تو صرف اس حد تک جس حد تک یہ عمل متاثر ہونے کا خدشہ وخطرہ نہ ہو۔میڈیا پر مذکرات کی مخالفت کرنے والوں کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ اب جب ایک سلسلہ چل ہی پڑا ہے تو اس کے نتائج کا کچھ انتظار کر لینا چاہیے ۔ اگر چہ مذاکرات کے بارے میں ہمارا پچھلا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے اور ملا فضل اللہ کے بارے میں کوئی حسن ظن بھی نہیں رکھ سکتا کیوں کہ سوات میں اس کا کردار سب کو یاد ہے لیکن اس وقت قوم کو کسی بھی صورت امن چاہیے۔ ہاں اگر یہ مذاکرات خدانخواستہ کامیاب نہ ہو سکیں تو ظاہر ہے کہ حکومت کے پاس آخری حربہ آپریشن کا ہی ہو گا جس کے لیے فوج اور حکومت یقیناً تیار ہوں گے لیکن اس وقت یہ ضروری ہے کہ اگر کسی بھی طرح اس مشکل کو امن کے ذریعے حل کیا جاسکے تو ملک اور قوم کو ایک بار پھر آپریشن کی آزمائش سے نہ گزرنا پڑے گا۔ آپریشن میں ظاہر ہے صرف مجرم نہیں مارے جاتے بلکہ عام آبادی بھی کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتی ہے۔

لہذا اس وقت اگر

قوم پر یہ مہربانی کی جائے کہ مذاکرات کے عمل کو چلنے دیا جائے اور اسے کچھ وقت دیا جائے اور یہ سوچ اور سمجھ لیا جائے کہ مسئلہ شدید اور گھمبیر ہے اور اس لیے وقت لے گا تو بہتر ہوگا۔ وقت سے مراد سال دو سال ہرگز نہیں لیکن دو چار دن بھی نہیں۔ ہاں دونوں کمیٹیوں کو چاہیے کہ اس سارے عمل کو تیز کیا جائے اور طالبان کو مجبور کیا جائے کہ وہ دہشت گرد کاروائیوں سے باز رہیں۔ قوم کی اکثریت کو شدت پسندوں اور شدت پسندی سے اختلاف ہے لیکن اگر وہ اس وقت □ آئین پاکستان کے اندر رہنے کا کوئی معمولی سا عندیہ بھی دیتے ہیں تو اس کا فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اُنہیں مزید اس طرف لانے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ ان کے پُرانے بیانات کو غیر ضروری طور پر اُچھال اُچھال کر ماحول کو ناسازگار بنایا جائے۔ الیکٹرانک میڈیا کو اس جنگ میں سٹیک ہولڈر کا کردار ادا کرنے کی بجائے حالات کو ملکی مفاد کے مطابق ڈھالنا چاہیے اور یہ سوچ لینا چاہیے کہ کہیں اس کی تھوڑی سی بے احتیاطی قوم کو مصیبت سے نکالنے کے بجائے اُسکی تکلیف کو لمبا نہ کردے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اب عوام کے اعصاب اتنے تھک چکے ہیں کہ وہ ہر صورت اس مصیبت سے نجات چاہتے ہیں لٰہذا اُنہیں مدد کی ضرورت ہے اور میڈیا مددگار کا یہ کردار بہتر طور پر ادا کرنے کے لیے اپنے کردار کا خود تعین کر لے اور تجسس اور سب سے پہلے بریکنگ نیوز کے شوق کو ایک طرف رکھ کر اپنا مثبت کردار ادا کرے۔

پاکستانی نوجوان پر دہشت گردی کے اثرات

9/11 کو گزرے تیرہ سال سے زیادہ ہو چکے اور تقریباً اتنا ہی عرصہ اس دہشت گردی کو ہو گیا ہے جس نے پاکستان کے در و دیوار ہلا دیے ہیں۔ ہر روز دھماکے، قتل، ظلم، دہشت و وحشت کی نئی کہانی رقم ہوتی رہی۔ سوات، وزیرستان، خیبر، مہمند، ہنگو، پشاور، راولپنڈی، کراچی، کوئٹہ غرض ہر صوبہ اس سے متاثر ہوتا رہا، اپنے مکینوں کی اپنے جوانوں، بوڑھوں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی لاشیں اٹھاتا رہا، پاکستان روتا رہا اور دہشت گرد اپنا مقصد پورا کرتے رہے اور ان کے آقا پاکستان کو کمزور کرنے کا جشن مناتے رہے۔ ہماری ایک نسل اس جنگ کے دوران پیدا ہوئی اور ایک اسی دوران جوان ہوئی انھوں نے ہر روز جو دیکھا جو سنا اُس نے ان کو ذہنی طور پر جس خلفشار میں مبتلاء کیا وہ ایک اور محاذ ہے جس پر ہمیں لڑنا ہے اور ہر صورت اس سے نبرد آزما ہونا ہے اور اس کو شکست دینی ہے ورنہ ہم اگلی نسل تک بھی اس جنگ کے نتائج بھگتتے رہیں گے۔ ہم یہ تو کہتے ہیں کہ آج کا بچہ شدت پسند ہے لیکن کیوں، اس لیے کہ وہ اپنے معاشرے میں تشدد دیکھتا ہے اور شدت پسند کو آزاد بھی دیکھتا ہے یا اگر وہ گرفتار کر لیا جاتا ہے تو عدالتیں انہیں سزا نہیں سناتیں اور سزا سنا دی جائے تو اُن پر عمل نہیں کیا جاتا اور یوں ایک ایسا

معاشرہ تشکیل پا رہا ہے جس میں مجرم خوف محسوس نہیں کرتا یعنی ایک ایسا وار جس سے سنبھلنا بہت مشکل ہوگا۔ سزا و جزا کا عمل دراصل معاشرے کی تعلیم و تربیت اور اس کے سدھار کا ایک عمل ہوتا ہے جس پر عمل نہ کرکے حالات کو اُس نہج پر لایا گیا ہے کہ آج کبھی ہم آپریشن اور کبھی مذاکرات کے مسائل میں پڑے ہیں۔ دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس جنگ میں نوجوانوں کو ہی اس کا ایندھن بنا کر استعمال کیا گیا۔ خود کش حملوں کے لیے ان ہی معصوم نوجوانوں کی برین واشنگ کرکے ان کو جنت کے خواب دکھا کر ان کے جسموں کے پرخچے اڑائے گئے۔ تعلیمی اداروں میں اس فساد کا بیج بونے کی کوشش کی گئی اور یونیورسٹیوں، کالجوں اور حتیٰ کہ سکولوں میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو معاشرے میں شدت پسندی کو ترویج دے اور ایسا اسلام کا نام لے کر کیا گیا۔ بجائے اسلام کا اصل چہرہ لوگوں کو دکھانے کے کبھی اسے شدت پسند اور کبھی روشن خیال بنا کر پیش کیا گیا اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام روشن خیال ہے لیکن اس کی روشن خیالی میں بے راہروی کا شائبہ تک نہیں، نہ ہی یہ شدت پسند ہے بلکہ یہ تو میانہ روہے اور یہ امت، امت وسط ہے یعنی درمیانی امت اور جب ایسا ہے تو ہم اس رویے کو معاشرے میں پروان چڑھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ ہمیں تو رواداری اور برداشت کو معاشرے میں فروغ دینے کے لیے کام کرنا چاہیے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ کبھی ایک انتہا اور کبھی دوسری انتہا اس نسل کے سامنے رکھ رکھ کر ہم دو قسم کی انتہا پسندی کو جنم دے رہے ہیں اور

ہمارا میڈیا انہیں کچھ اس طرح گلیمرائز کرکے دکھاتا ہے کہ جیسے کوئی بہت عظیم کارنامہ سرانجام دیا گیا ہو۔ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ کو لڑتے لڑتے قوم کے اعصاب شل ہوتے جارہے ہیں۔ ایک بار پھر مسئلے کو مذاکرات سے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، دعا ہے کہ اللہ کرے ملک میں امن قائم ہو اور یہ نسل کسی اچھی یاد کو بھی اپنے سے اگلی نسل کو منتقل کرے۔ لیکن ایک طالبعلم نے مجھ سے پوچھا کیا ہم اُن مجرموں کو بھی رہا کر دیں گے جنہوں نے لوگوں کے سر کاٹے اُن سے فٹ بال کھیلا، ان کی جسم کے اعضاء کاٹے اور میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ کاش کہ جزا و سزا کا عمل پہلے ہی اتنا سخت ہوتا کہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہی نہ اور پاکستان کو امن کی خاطر ایسی تجویز پر غور ہی نہ کرنا پڑتا۔ لیکن وہ وقت جب ہم مسائل پر قابو پا سکتے تھے اس وقت انہیں بریکنگ نیوز کے شوق میں اچھالا گیا اور عدالتوں کے پاس ثبوتوں کی عدم فراہمی کی ایک خوبصورت توجیہہ بھی تھی۔ میڈیا طالبان یا دہشت گردوں میں عہدے تقسیم کر رہا تھا، ان کے ترجمان کے بیانات نشر کرتا تھا، اینکر حضرات بڑے فخر سے اِن سے اپنے رابطوں کا ذکر کرتے تھے لیکن یہ سوچ کسی کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی کہ دہشت گردی کی تباہی کے ساتھ ساتھ ہم ایک غیر اسلامی رویے اور شدت پسندی کو بھی فروغ دے رہے ہیں۔ ہمارے میڈیا نے ان متشدد نظریات کے مقابلے پر ایک ایسے طبقے کو پیش کیا جو سوشل ورک کو اپنی نمود و نمائش کا ذریعہ سمجھتا ہے یا ایسے ماڈرن علماء کو لایا گیا جو اسلام کی اپنی ہی

تشریح کرتے ہیں ایسے لوگوں کو نہیں ڈھونڈا گیا جو واقعی اسلام کو سمجھتے ہیں۔

اس وقت تو صرف ایک دعا ہے کہ اللہ کرے ملک میں امن قائم ہو اور مذاکرات کا نتیجہ پاکستان کی سلامتی کی صورت میں نکلے لیکن معاشرے کی تعمیر اور نسل نو کی تربیت ایک حساس اور مسلسل عمل ہے جس کے بارے میں ہر ''بڑے'' کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ تعلیمی ادارے، عدالتیں، قانون نافذ کرنے والے ادارے، قانون ساز ادارے یعنی اسمبلیاں، میڈیا اور سول سوسائٹی ہر ایک اس کو اپنی ذمہ داری سمجھے گا اور اپنے اپنے دائرہ کار میں سب کو اس پر کام کرنا ہوگا۔ ان کے لیے تعلیم ،تربیت اور روزگار کا بندوبست کرنا ہوگا تاکہ وہ دہشت گردی، شدت پسندی اور بھتہ خوری میں اپنی جائے امان نہ ڈھونڈے اور ملک کے کار آمد شہری بن سکیں اور اسلام کو امت وسط اور پاکستان کو اسلام کا ایسا قلعہ بنا دیں جہاں ہر مسلمان بلکہ غیر مسلم کے بھی جان و مال محفوظ ہوں اور خود یہ نوجوان صحیح معنوں میں ایک با عمل مسلمان کی بہترین مثال ہوں۔

مظفر نگر فسادات ۔۔۔ بھارت کا ایک اور الزام

دنیا میں سب سے بڑی اقلیت بھارتی مسلمان، اکثر اوقات بھارتی اکثریت یعنی ہندوؤں کے نشانے اور زد پر رہتے ہیں ۔ وہ ایک بڑی آبادی ہیں اور بظاہر ہندوستان یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ ایک سیکولر ملک ہونے کی وجہ سے اپنی اقلیتوں کو تمام حقوق دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انہیں ہندو شدت پسندوں سے تحفظ تک فراہم نہیں کر سکتا اور مسلم کش فسادات بھارت میں کوئی خاص واقعہ ہی نہیں ہوتا۔ اترپردیش میں واقع ضلع مظفر نگر کے مسلمان بھی اگست اور ستمبر 2013 میں ایک ایسے ہی واقعے کا شکار ہوئے جب مقامی ہندو آبادی نے اُن کے اوپر دھاوا بولا، درجنوں مسلمان شہید کر دیئے گئے اور درجنوں دیہات اور آبادیوں میں مسلمانوں کے گھروں اور املاک کو جلا دیا گیا۔جب یہ مسلمان وہاں سے بھاگے تو بھی ان کے ساتھ ہر ظلم کیا گیا، لڑکیوں اور عورتوں کی اجتماعی بے حرمتی کی گئی بچوں تک نشانہ بنایا گیا۔حکومت کو حالات کنٹرول کرنے کے لیے دس ہزار فوجی بھیجنا پڑے لیکن تب، جب مسلمان اپنی جانوں، مالوں اور گھروں سے محروم ہو چکے تھے ہاں یہ ضرور کیا گیا کہ انہیں کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا لیکن یہاں ایک بار پھر اُنہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا اور شاملی اور مظفر نگر کے یہ باسی مختلف کیمپوں میں موسم

اور حالات کی سختی کا شکار ہو کر حالات کی ستم ظریفی پر نوحہ کناں رہے اور جب سرد موسم سے شکست کھا کر بارہ بچے اپنی جانوں کی بازی ہار گئے تو ایک سرکاری اہلکار نے دنیا والوں کی معلومات میں بڑا سنگدلانہ اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ سردی سے بھی کبھی کوئی مرا ہے یہ مرنے والے نمونیا سے مرے ہیں سردی سے نہیں کیونکہ یہ سائبریا نہیں ہے یعنی ایک اور ہندو دہشت گرد ان متاثرین پر حملہ آور ہوا۔ لیکن ساتھ ہی بھارت نے اپنا فرض اولین بھی نہیں چھوڑا یعنی کسی نہ کسی طرح پاکستان کو اس معاملے میں بھی شامل کر لیا۔ ابتدائی واقعات چونکہ کچھ ایسے واضح تھے کہ وہ یہ کام نہیں کر سکا تاہم وہ اپنے فرض سے غافل بھی نہیں تھا اور آخر اس نے آئی ایس آئی کو اس معاملے میں کسی نہ کسی طرح گھسیٹ ہی لیا۔ ان فسادات کے متاثرین کے حالات سے بے خبر دہلی پولیس نے دو آئمہ مساجد کو گرفتار کیا اور الزام لگایا کہ اُن کے لشکرِ طیبہ سے رابطے ہیں۔ دہلی سپیشل پولیس سیل کے کمشنر ایس این سری وستوا نے کہا کہ لشکرِ طیبہ مظفر نگر کے متاثرین کو بہلا پھسلا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے اور انہیں فسادات کا بدلہ لینے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے اور لشکرِ طیبہ کے شاہد اور راشدی اور ان کے ساتھیوں نے لیاقت اور ضمیر نامی اشخاص سے ملاقات کی ہے۔ شری صاحب نے ایک اور بودا انکشاف یہ بھی کیا کہ ضمیر سے کہا گیا کہ وہ اغوا برائے تاوان کی کچھ وارداتیں کرے تاکہ یہ پیسہ مسجد کی تعمیر کے لیے استعمال ہو۔ یہاں کہانی میں کافی جھول ہے

کیونکہ مسجدوں کی تعمیر مسلمان اللہ پر توکل کرکے شروع کرتا ہے اور پھر ہر مسلمان اس تعمیر کی تکمیل کو اپنا فرض سمجھنے لگتا ہے اور کوئی مسلمان یہ جملہ کہنا تو درکنار سننا بھی نہیں چاہتا کہ اغوا برائے تاوان کے پیسوں سے مسجد بنائے، اس کے لیے اغوا برائے تاوان کی بجائے کوئی بھی دوسرا بہانہ شاید زیادہ مناسب ہوتا۔

بھارت میں مسلمان بالخصوص اور دوسری اقلیتیں بالعموم جن حالات میں رہ رہے ہیں اُن میں انہیں بھکانے کے لیے کسی اور کی ضرورت ہی نہیں ہے خود شدت پسند ہندوؤں کا رویہ ہی یہ کام آسانی سے سرانجام دے دیتا ہے۔ 23 فروری کو بھارت کے ایک اردو اخبار میں ہرش مندر نے اپنے مضمون "فرقہ وارانہ فسادات بل۔۔۔۔ حکومت بھی سنجیدہ نہیں" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ بھارت کے ہر مسلمان کی کہانی کے کسی نہ کسی سرے پر کہیں نہ کہیں فسادات ضرور ہیں، وہ جب اپنی عمر بھر کی پونجی لٹا کر اُسے دوبارہ بناتا ہے تو پھر وہ لوٹ لی جاتی ہے۔

ایک اور اخبار کی ایک خبر کے مطابق ضلع شاملی کے گاؤں بھاوڑی میں کرنل ناہر سنگھ نے کہا "سبھی مسلمان ملک کے غدار ہیں انہیں ملک سے باہر نکال دیا جائے"۔ نریندر سنگھ مودی کی مسلمان دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی تو نہیں لیکن

جب وہ کھلم کھلا کہے گا کہ ہم صرف ہندوؤں کے ذمہ دار ہیں تو بھارت کا مسلمان خود ہی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اسے یہ سوچ دینے کے لیے نہ کسی آئی ایس آئی کی ضرورت ہوگی نہ کسی لشکرِ طیبہ کی۔ لہٰذا بھارت دوسروں پر الزامات عائد کرنے کے بجائے اپنے مجرم خود اپنے اندر تلاش کرے۔ مظفر نگر کے باسیوں نے اپنے گھروں کو جیسے برباد ہوتے اور اپنوں کا خون بہتے دیکھا ہے اور پھر کیمپوں میں جس کسمپرسی کے عالم میں وہ رہ رہے ہیں کیا یہ کہانی کوئی اور جا کر انہیں سنائے گا اور کیا کوئی اور انہیں بتائے گا کہ وہ مظلوم ہیں۔ بھارت حکومت کے لیے اپنے فرائض سے سبکدوشی اور صرف نظری کا سب سے آسان طریقہ ہر واقعے میں پاکستان کو ملوث کرنا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پسماندگی، اُن کی غربت اور ان کی زبوں حالی پر اگر غور کرتی تو شاید اس کے اور مسلمانوں کے حق میں بھی بہتر ہوتا۔ کشمیر کی نگینہ اختر اور لالی زمان جب دہلی کو دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی کہ اُن کے کشمیر جنت نظیر اور دہلی کے گنجان آباد شہر میں ترقی کا کتنا فرق ہے تو وہ اپنے ملک اور حکومت کے بارے اپنے جو خیالات بنائیں گی وہ کسی لشکرِ طیبہ کے محتاج نہیں اور نہ ہی پاکستان کی آئی ایس آئی کو اُن پر کام کرنا پڑتا ہے۔ بھارت جس دراندازی کا رونا ساری دنیا میں روتا ہے اُس کی جڑیں خود اُس کے اپنے ملک میں پھوٹتی اور پنپتی ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف تعصب جب مسلمانوں کو نظر آئے گا تو ظاہر ہے وہ اس کے خلاف احتجاج ضرور کریں گے اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف

متعصب ہندوؤں بلکہ متعصب حکومت کے بھی زیر عتاب رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بھارت کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ترقی کا ایک بہت بڑا فرق موجود نہ ہوتا نہ ہی وہ تعلیم میں پیچھے رہتے اور نہ ہی نوکریوں میں۔ دراصل بھارت دنیا دکھاوے کو تو قوانین بھی بنالیتا ہے اور دوچار مسلمانوں کو کسی عہدے پر فائز بھی کر دیتا ہے لیکن مسلمان حقیقت میں حکومتی مراعات سے بہت کم فیض یاب ہوتے ہیں۔ بھارت کے لیے بہتر یہی ہے اور مظفر نگر کے مسئلے سمیت دوسرے مسائل کا حل بھی یہی ہے کہ وہ اپنی اقلیتوں کو وہ حقوق ضرور دے جو بحیثیت انسان اور بحیثیت بھارت کے شہری ان کا حق ہے۔ جو تخصیص اب وہ برت رہا ہے اور جس طرح سے مسائل سے انکار کرکے انہیں پاکستان کے کھاتے میں ڈال رہا ہے اگر وہ اپنا یہی رویہ اسی طرح برقرار رکھے گا تو وہ کسی بھی طرح اِن نسلی و مذہبی مسائل پر قابو نہ پاسکے گا جو دنیا میں اُس کی پہچان ہیں۔

یو این پی او۔۔۔حکومت خبر دار رہے

آج کی دنیا میں اپنی جغرافیائی اور نظریاتی حدود کو محفوظ رکھنے کے لیے حکومتوں اور قوموں کو ہر وقت اپنی آنکھیں اور دماغ کھلے رکھنے پڑتے ہیں اور ایسا خاص کر اسلامی ملکوں اور عام طور پر غریب اور ترقی پذیر ملکوں میں اور بھی ضروری ہو جاتا ہے جہاں ان کی غربت دور کرنے کے لیے کوشش نہیں کی جاتی بلکہ ان کو غلام بنانے کے لیے امداد کے نام پر قرضوں میں یوں جکڑا جاتا ہے کہ وہ عملاًان کے غلام بن جاتے ہیں اور انہیں ان کے رحم وکرم پر رہنا پڑتا ہے اور یوں یہ بالا دست اقوام اپنے اپنے مقاصد کے لیے ان ملکوں میں بڑی آسانی سے کام کرتے ہیں ۔ اسلامی ممالک میں کبھی علیحدگی کی تحریکوں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور کبھی جمہوریت کے نام پر خون خرابہ کیا جاتا ہے ۔ اس کام کے لیے ترقی یافتہ حکومتیں اور ان کی امداد یافتہ تنظیمیں دونوں ہر وقت برسرپیکار رہتی ہیں اور کبھی انصاف ، کبھی انسانی حقوق اور کبھی جمہوریت کے نام پر یہاں حکومتوں اور عوام میں ٹکراؤ کروایا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کی دیگر اقوام بھی ان کے شر سے محفوظ نہیں رہتی اور کبھی یہ بڑے ممالک براہ راست فوج کشی کر دیتے ہیں اور کبھی این جی اوز کی صورت میں ان پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں ۔ بظاہر تو یہ این جی اوز عوام کی فلاح میں مصروف نظر آتی ہیں لیکن دراصل یہ اپنے لیے

فنڈز بناتی ہیں اور اپنے مالکوں اور اپنے ملکوں کے لیے بے تحاشہ پیسہ اور غیر محسوس طریقے سے ان ملکوں کے عوام میں اپنی ہی حکومتوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ایسے ابھارتیں ہیں جس کا احساس تب ہوتا ہے جب یہ چنگاریاں ہر طرف پھیل چکی ہوتی ہیں اور یہ سب کچھ عالمی اداروں کے تعاون سے اسے قانونی شکل دے کر سر عام اور دھونس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان اداروں کے منشور کچھ ایسے خوشنما اور دلفریب بنائے جاتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والا ان لوگوں کو ہی دنیا کا سب سے بڑا غم خوار تصور کرتا ہے یہاں تک اس کے اپنے اہلکار بھی ان کے اصل مشن کو محسوس نہیں کر پاتے۔

Unrepresented Nations and Peoples Organization بھی ایک ایسی ہی تنظیم ہے جسے 1980 کی دہائی میں کچھ لوگوں نے مل کر بنایا کہ یہ دُنیا بھر میں بے نشان لوگوں کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دے گی اور ان کو انصاف فراہم کرنے میں مدد کرے گی۔ یو این پی او کو بنانے والوں میں یوں تو تبت ،ایسوٹنیا اور مشرقی ترکستان کے کچھ لوگوں کے نام بھی شامل ہیں لیکن دراصل مائیکل وین والٹ وین پراگ کے تعاون سے یہ تنظیم بنائی گئی یعنی باقی لوگوں کو استعمال ہی کیا گیا ورنہ تعاون تو اسے مغرب سے ہی حاصل ہے اس کا ہیڈ کوارٹر ہالینڈ میں ہے لیکن کاروائیاں دنیا میں ہر اُس جگہ ہیں جہاں اپنے ملک سے باغی لوگ موجود ہیں اور اپنی حکومتوں کے خلاف برسر پیکار ہیں ۔ ان لوگوں کو اپنے ملک توڑنے کے لیے علی الاعلان امداد فراہم کی جاتی ہے، ان کے نکتہ نظر کو پوری دنیا میں پھیلایا جاتا ہے،ان کے لیے

تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کا نشانہ زیادہ تر مسلمان ممالک ہی ہوتے ہیں۔
پاکستان میں بلوچستان کے مسئلہ کو ہوا بھی انہی لوگوں نے دی ہے اور دنیا میں اگر کہیں ایک دو بھی ناراض بلوچ ہیں تو ان کو مکمل طور پر حمایت فراہم کی جاتی ہے۔ یو این پی او ان کے نکتہ نظر کو نہ صرف پھیلاتا ہے بلکہ انہیں پلیٹ فارم بھی فراہم کرتا ہے اور اپنی کانفرسوں میں بھی انکو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر میڈیا کے ذریعے ان کو سپورٹ کیا جاتا ہے۔ بلوچستان کو یہ تنظیم مقبوضہ علاقہ ظاہر کر رہا ہے بلکہ یہاں تو سندھ کو بھی مقبوضہ اور گلگت بلتستان کو بے شناخت ظاہر کیا گیا ہے۔ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے جس میں مختلف قومیتیں بستی ہیں جو مختلف زبانیں بولتی ہیں لیکن ان کے درمیان ایک مظبوط رشتہ موجود ہے اور وہ ہے " اسلام" جس میں کوئی دوسرے سے پیچھے نہیں پھر یہ تمام صوبے اور علاقے ایک دوسرے سے زمینی طور پر بھی جُڑے ہوئے ہیں۔ بے شک کہ بلوچستان ترقی میں دوسرے صوبوں سے پیچھے ہے لیکن یہ یاد رکھا جائے کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے اور یہاں کہیں بھی کسی بھی صوبے میں پسماندہ علاقوں کی کمی نہیں لیکن بلوچستان کی بد قسمتی یہ ہے کہ اس میں حکومت اکثر بلوچ سرداروں اور بلوچستان کے بڑے خاندانوں کی ہی رہی ہے جنھوں نے صوبے کی بجائے اپنے خاندان کی خدمت کی ہے۔ یہاں اگر تعلیم کو ہی لیا جائے تو اس کی گھمبیر صورت حال کے لیے بھی یہی لوگ ذمہ دار ہیں کہ خود یہ سردار ایچی سن ،
آکسفورڈ اور کیمبرج

سے پڑھتے ہیں لیکن حکومت میں رہنے کے باوجود بلوچستان میں کوئی بڑا اور اچھا سکول کھولنے کی کوشش تک نہیں کرتے کیونکہ اسطرح رعایا کے پڑھنے لکھنے سے ان کی سرداری خطرے میں پڑتی ہے۔ بلوچستان کے حالات کے لئے حکومتیں اگر ذمہ دار ہیں تو خود سر کردہ بلوچ بھی کچھ کم ذمہ دار نہیں اور سچ یہ ہے کہ کسی بھی سطح پر بلوچستان کے مسائل کے لئے سنجیدہ کوشش کرنے کے بجائے اپنی سیاست ہی چمکائی جارہی ہے اور یہ بالکل نہیں سوچا جارہا کہ ہم خود کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں ۔ حیرت تو اس بات پر بھی ہے کہ ہماری حکومت بھی اس قسم کی تنظیموں پر نہ تو اس طرح نظر رکھ رہی ہیں جیسے کہ ضرورت ہے اور نہ ہی اُن کو کاونٹر کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں اور یوں یہ دُشمن قوتیں بلاخوف وخطر اپنی گھناؤنی کوششوں میں مصروف ہیں اور مزید یہ کہ ان اداروں اور ان کی رپورٹوں کو ہمارا ''آزاد میڈیا'' کوریج دے کر مزید شہہ دیتا ہے۔ یو این پی اواور اس جیسی کسی دوسری تنظیم کو کسی بھی بین الاقوامی قانون کے تحت یہ حق حاصل نہیں کہ ہمارے قومی معاملات میں مداخلت کرے۔ یو این پی او کی اپنی کوئی قانونی یا مسلمہ حیثیت نہیں لیکن جو لوگ اس تنظیم کو استعمال کر رہے ہیں ان تک پہنچ اور ان سے شدید اور موثر احتجاج کرنا ضروری ہے۔ ان تنظیموں کی فلاحی کاموں کی آڑ میں جاسوسی اور ملک دشمن سرگرمیوں پر نظر رکھنا بھی انتہائی اہم ہے ۔ دشمن صرف را، موساد، سی آئی اے اور دوسری خفیہ ایجنسیاں نہیں بلکہ یہ غیر سرکاری

تنظیمیں بھی ہیں کہ یہ اُن ہی کے ایجنڈے پر کام کرتی ہیں اور اُن کی طرح خفیہ نہیں بلکہ ببانگ دہل کرتی ہیں۔ ان کا توڑ بھی ضروری ہے ورنہ قوم کی رگوں میں ان کا اُتارا ہوا زہر اگر سرائیت کر گیا تو کسی بھی دوسرے زہر سے زیادہ خطرناک ہو گا۔ ہیگ میں بیٹھی ہوئی یہ تنظیم نہ تو بلوچوں کے غم میں مبتلا ہے نہ سندھیوں کے اور نہ بلتیوں اور گلگت کے لوگوں کے بلکہ ان کا مکروہ ایجنڈا پاکستان اور تیسری دنیا کے غریب ملکوں کو مغرب کی جاگیر بنانا ہے۔ الہذا ان کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے کے لئے عوام، حکومت، عدالتوں، فوج، میڈیا اور خفیہ اداروں غرض ہر ایک کو اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا ہوں گی تاکہ ہم ان کے شر سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔

فضہ ملک۔۔۔ روشن چراغ بجھا دیا گیا

فضہ ملک ایک اور جوان سال ٹیلنٹ مستقبل کا ایک اور ستارا خاک وخون میں نہلا دیا گیا۔ ہر دیکھنے والا رو رو کر اپنی بہن کا بین کرتے ہوئے فضہ کے بھائی کو دیکھ کر آبدیدہ تھا۔ وہ بھائی تو بس یہی کہ رہا تھا کہ اُس کی بہن بہت اچھی تھی، بہت پیاری تھی لیکن اب یہ کہانی ایک اسی بہن کی نہیں رہی۔ اسلام آباد کچہری پر حملہ میں گیارہ بے گناہ پاکستانی خون میں نہلا دیے گئے۔ کچھ بے نام ونشان لوگ آتے ہیں کبھی جسموں سے بم باندھے ہوئے اور کبھی فائرنگ کرتے ہوئے اور انسانی جان جو اللہ کی سب سے قیمتی تخلیق ہے اس کی تذلیل کرتے ہوئے خود کو بھی اُڑا دیتے ہیں اور دوسری جانوں کو بھی ہلاک کرکے خدا کی زمین پر فساد پیدا کرتے ہیں اور حیرت ہے کہ پھر بھی کچھ لوگ انہیں حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دہشت گردی نے جس بری طرح پاکستان کو نقصان پہنچایا ہے اُس کے اثرات معاشرے، معیشت، صنعت، تجارت ہر جگہ محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ معاشرہ ایک خوف میں بتہلا ہے اور اس خوف میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے کچھ ماہ سے طالبان نے اپنی سرگرمیوں میں جب بے تحاشہ اضافہ کیا اور مذاکرات کے ساتھ

ساتھ پاکستان کے معصوم شہریوں کے قتل عام کو بھی کار ثواب ہی سمجھتے رہے، ایف سی کے 23 جوانوں کو ذبح کرکے شہید کیا گیا اور فخر سے اس کا اعلان بھی کیا گیا اور ان تمام واقعات کے بعد فوج نے جب ٹارگٹڈ آپریشن شروع کیا تو بھی کہا گیا کہ حکومت مذاکرات میں سنجیدہ نہیں ہے اس لیے یہ کاروائی کر رہی ہے یعنی ادھر تو ہر ظلم کی اجازت ہو اور اس ظلم کا جواب تک نہ دیا جائے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے، امیر، غریب، فقہ، شریعت، مسلک کسی کو نہیں چھوڑا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ جنگ میں بھی عورتوں، بچوں اور بُوڑھوں کو کچھ نہ کہا جائے لیکن بقول خود ''عظیم اور پرہیز گار'' طالبان نے اسلام کی ان تعلیمات کو بالائے طاق رکھ کر عورتوں کو نشانہ بنا بنا کر مارا۔ پولیو مہم میں کام کرتی ہوئی خواتین کو سروں میں گولیاں ماری گئیں، پشاور میں محفل میلاد یا ختم قرآن میں مصروف خواتین کو شہید کیا گیا اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے ایک بار بھی انہیں قرآن و سنت یاد نہ آئے۔ سکولوں میں بچوں کو بموں کا نشانہ بنایا گیا اور دل میں خوف خدا نہ آیا کہ اسلام ان بچوں کے ساتھ شفقت کا حکم دیتا ہے۔ اعتزاز حسن جیسے بہادر بچوں کو پنپنے نہیں دیا گیا۔ اور اب فضہ ملک جو صرف دو ماہ پہلے لندن سے قانون کی اعلی ڈگری لے کر آئی اس دہشت گردی کی نظر ہو گئی یعنی ایک اور روشن چراغ بجھا دیا گیا۔ کہنے کو تو فضہ صرف ایک لڑکی تھی لیکن اُس کے ٹیلنٹ، اس کے مستقبل سے وابستہ پاکستان کے مستقبل سے روشنی کی ایک کرن

چھین لی گئی۔ اسی طرح کی دہشت گردیوں کے بعد بڑے دھڑلے سے ان واقعات کی ذمہ داری بھی قبول کر لی جاتی ہے اور پھر یہ طالبان خلافت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ کیا خلفائے راشدین میں سے کسی بھی خلیفہ نے یوں عوام الناس کے قتل کا حکم دیا تھا۔

خرابی ہمارے نظام اور بااختیار لوگوں میں بھی ہے جنہوں نے اس مسئلے کو صرف ٹالا ہی ہے ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے عدالتی نظام کی کمزوری کہیے یا ہمارے عادلوں کی کہ خود ہی اقرار جرم کرنے والے اور کبھی تو رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے دہشت گردوں کو بھی سزا نہیں سنائی جاتی اور کبھی تو ناکافی ثبوتوں کا عذر منظور کر کے ان ثابت شدہ ''مجرموں'' کو معاف کر دیا جاتا ہے جو خود اقرار جرم کر چکے ہوتے ہیں اور وہ ایک اور حملے کی تیاری اور منصوبہ بندی شروع کر دیتے ہیں اور کئی معصوموں کی جانیں پھر خطرے میں پڑ جاتی ہیں، کبھی فضہ جیسی لائق فائق بیٹی گھر نہیں پہنچتی اور کبھی تلاش رزق میں نکلا ہوا باپ بچوں کی روزی روٹی لانے کے بجائے ان کے لیے اپنا مردہ جسم یا جسم کے ٹکڑے دوسرے کے کندھوں پر اٹھوا کر گھر بھجوا دیتا ہے لیکن جب کبھی یہی سلوک دہشت گرد کے ساتھ کر دیا جائے تو بہت سارے ''انسانیت دوست'' چیخ اُٹھتے ہیں۔

اس وقت بھی اگر طالبان دوبارہ مذاکرات کی میز تک آئے ہیں تو اس میں کسی سیاسی بصیرت کا کوئی کارنامہ نہیں بلکہ یہ طاقت کی وہ زبان تھی جو فوج نے

بولی۔ میں مذاکرات کے خلاف نہیں ہوں بلکہ میں اس کے حق میں لکھ بھی چکی ہوں کہ خون خرابہ رک جانا چاہیے جس بھی طریقے سے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کمزوری کا مظاہرہ کیا جائے حکومت کو بہر حال اپنی طاقت دکھانی چاہیے تا کہ عوام الناس کو تحفظ کا احساس رہے اور مجرم کو خوف ۔ فوج اور حکومت کو یہ سب ذہن میں رکھنا ہو گا بلکہ جوابی کاروائی کے طور پر ہی سہی اپنی قوت دکھانی ہو گی ورنہ پولیو ٹیم کی کوئی کارکن نہ کوئی فضہ ملک ، نہ کوئی رفاقت حسین نہ کسی سکول میں پڑھتا ہوا کوئی ذہین بچہ ، محفوظ ہو گااور نہ ہی پاکستان کا مستقبل، نہ اس کی تجارت ، نہ معیشت اور نہ ترقی۔ امن قائم رکھنے کے لیے نرمی کے بعد اگر سختی کی ضرورت پڑے تو اس میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کسی بھی طور پر قابل معافی جرم نہ ہو گااور نہ اب ہم اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

تھر میں۔۔۔ زندگی تو نے بہت دیر سے ڈھونڈا ہم کو

تھر میں بچے بھوک سے مر گئے، ایک دو نہیں اب تک ڈیڑھ سو سے زیادہ بچے ہلاک ہو چکے ہیں اور یہ سانحہ ایک اسلامی ملک میں ہوا جس اسلام کے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاس سے مر جائے تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے لیے جوابدہ ہوگا، لیکن آج کا حکمران سوتا رہا بچے بلکتے رہے، مرتے رہے، مائیں سر پیٹتی رہیں لیکن کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ ہمارے میڈیا نے بھی اس وقت تک اس مسئلے کو اہمیت نہیں دی جب تک کہ کئی بچے بھوک سے مر نہیں گئے اور جب ہو گئے خاک تو ہم تک تیری آواز آئی۔

تھر کا صحرا دنیا کا ساتواں بڑا صحرا ہے جو بھارت اور پاکستان دونوں میں منقسم ہے۔ اس کا پچاس ہزار مربع کلو میٹر رقبہ پاکستان میں ہے اور اس میں سندھ کے کئی زرخیز اضلاع بھی شامل ہیں جو نہروں کی بدولت لہلہاتی فصلوں اور شاداب کھیتوں پر مشتمل ہیں لیکن تھرپارکر کا ضلع زیادہ تر ریگستانی ہے اور یہاں سالہا سال بارش نہیں ہوتی۔ یہ علاقہ قدرتی طور پر مخصوص اور سخت حالات کا حامل ہے کہ ظاہر ہے جب بارش نہیں ہوگی تو فصلیں نہیں ہونگیں اور ایسے

میں یہ حکومت کا فرض بنتا ہے کہ ان علاقوں کے بارے میں نہ صرف خبر رکھے بلکہ نامساعد اور غیر معمولی حالات سے نمٹنے کے لیے منصوبہ بندی بھی ضروری ہے لیکن افسوس کہ ہمارے حکمران اس ساری فراست سے عاری ہیں وہ اپنے مفادات سے ہٹ کر کسی دوسری طرف نہیں دیکھتے۔ اگر ایسا ہوتا تو جب سندھ حکومت، چیئر مین پیپلز پارٹی کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہا رہی تھی، جب موئن جو داڑو پر روشنیوں کا سیلاب امڈا ہوا تھا اور ہزاروں سال پرانی تہذیب زندہ کی جا رہی تھی اُس وقت تھر کی زندہ بستی اور زندہ بچے موت کے اندھیروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔
صرف سندھ فیسٹیول پر ہی پیسہ نہیں بہایا گیا بلکہ پنجاب یوتھ فیسٹیول میں لایعنی اور فضول قسم کے ریکارڈ بنانے پر بھی قومی دولت کو لٹایا گیا۔ گنیز بک کو کتنے پیسے دیے گئے یہ تو کوئی باخبر ہی بتا سکتا ہے۔ عشائیوں، عصرانوں اور ظہرانوں پر کتنا خرچ کیا جاتا ہے یہ بھی عوام کو علم نہیں تو اندازہ ضرور ہے اور شرمناک المیہ تو وہ کھانا بھی تھا جو وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ نے مٹھی کے قحط زدوں سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھ کر کھایا۔
تھرپارکر ریگستان سہی لیکن اس میں زندہ انسان بستے ہیں اور انتہائی مشکل حالات میں زندگی گزارتے ہیں یہی حال چولستان اور تھل کا بھی ہے۔ صحراؤں، ریگستانوں اور پہاڑوں کی زندگی آسان نہیں ہوتی اسی لیے یہاں کے باشندے خانہ

بدوشی پر مجبور رہتے ہیں لیکن یہاں کے مستقل مکین کہاں جائیں رہنا تو انھوں نے انہیں مشکل حالات میں ہوتا ہے اور آج کے دور میں جب ذرائع آمدرفت انتہائی تیز ہو چکے ہیں رسل وسائل کے مسائل بھی وہ نہیں جو سو دو سو سال پہلے تھے، میں یہ نہیں کہتی کہ ان علاقوں تک پہنچ اتنی آسان ہے جتنی کسی شہر تک لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ وہاں بسنے والوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ ملک کے بڑوں شہروں میں اگر تزئیں وآرائش پر بے تحاشا خرچ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کو دیکھ کر سراہا جاتا ہے اور داد وصول کی جاتی ہے تو ان دور دراز علاقوں تک ضروریات زندگی کا پہنچادینا بھی حکومت کا فرض ہے۔ سہولیات صرف بڑے لوگوں اور بڑے شہروں کا حق نہیں ان چھوٹے علاقوں اور لوگوں کا بھی ان پر اتنا ہی حق ہے لہذا یہ عذر کسی طرح قابل قبول نہیں کہ ان علاقوں تک پہنچ مشکل ہے۔ اس وقت تھر کی جو صورتحال ہے وہ صرف اور صرف حکومتی غفلت کا ہی نتیجہ ہے اس میں بیوروکریسی سے لیکر سیاسی نمائندوں اور حکومتی ارکان تک سب مجرم ہیں اور جو ان اموات کو سردی اور ہیضے کا نتیجہ کہہ رہے ہیں وہ کم از کم اتنا ہی کرلیں کہ ان بچوں کی کمزور صحت اور لاغر جسموں کو ہی دیکھ لیں جو افریقہ کے کسی قحط زدہ ملک کے بچوں جیسا منظر پیش کرتے ہیں ان بچوں کو دیکھ کر تو کسی بھی حساس انسان کے جذبات قابو میں نہیں رہ سکے۔ کاش کہ اب جو سیاسی رہنما اور امدادی تنظیمیں وہاں ڈیرے ڈانڈے ڈال کر بیٹھے ہوئے ہیں کچھ پہلے وہاں پہنچ جاتے۔

اب وہ ہمدردی

کی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن عوام ان کا اصل روپ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب لوگ بھوکوں مر رہے تھے تو وہ اپنی اپنی عیاشیوں میں مصروف تھے۔ اگر سندھ کی ثقافت کو بچانے سے پہلے سندھ کے بچوں کو بچا لیا جاتا تو یہ ثقافت خود بخود زندہ رہتی، اجرک اور ٹوپی پہننے والے سر اور کندھے نہ رہیں تو کہاں کی اجرک، کہاں کی ٹوپی اور کہاں کا فخر۔ ثقافت پر فخر کرنا بہت اچھا ہے اور میں خود اپنی ثقافت کی بڑی مداح ہوں لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ ہم اس کو اربوں روپے لگا کر زندہ رکھ لیں گے تو یہ غلط فہمی ہے اسے بچانے کے لیے تو انسان کا اپنی مٹی اور لوگوں سے پیار ضروری ہے۔ اب تھر کے وہ بچے تو دوبارہ نہیں آ سکتے جو ہماری قومی بے حسی کی نذر ہو گئے لیکن ان بچوں کی بے بسی نے قوم کو رُلا ضرور دیا اور اگر اب بھی ہمارے صاحبان اختیار اور سیاہ و سفید کے مالکان اپنی ترجیحات متعین کر لیں تو شاید ہم دوبارہ اپنی تاریخ، اپنے جغرافیے، اپنی ثقافت اور اپنے قومی وقار کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔ آج تھر میں امدادی کاروائیوں کے لیے بیٹھے ہوئے لوگ اگر وہاں مستقل بنیادوں پر کچھ ایسے ترقیاتی منصوبے بنا لیں اور کچھ ایسے کام کر لیں کہ تھر کے یہ بے بس اور انسانی ترقی سے بے خبر لوگ بھی خود کو اس دنیا کے باشندے تصور کر لیں تو ہم اپنی شرمندگی اور جرم کا کچھ نہ کچھ ازالہ کر ہی لیں گے۔ لیکن اگر ہر قومی سانحہ گزرنے کے بعد اس کو بھلا

دینے کی روش برقرار رہی تو اکیسویں صدی میں تھر میں بھوک افلاس اور بے بسی سے مرنے والے یہ بچے اس کرب سے گزرنے والے آخری بچے نہیں ہونگے بلکہ خدانخواستہ ہم اس درد اور شرمندگی سے بار بار گزریں گے لہذا حکومت وقتی نہیں مستقل بنیادوں پر سوچ اور اقدامات کرے تاکہ پھر ہمیں ایسی صورتحال سے دو چار نہ ہونا پڑے۔

دہشت گردی، ناکافی ثبوت اور ریٹنگ

ملک جب مشکل حالات سے گزر رہے ہوں تو اُس وقت جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت در پیش رہتی ہے وہ ہے قومی اتفاق رائے۔ جب ایک مسئلے کی نشاندہی کر لی جائے اور اسے مسئلہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر اس کے حل کے لیے کوشش بھی نہ صرف مربوط ہونی چاہیے بلکہ اس کے بارے میں قومی نکتہء نظر کا ایک ہونا بھی بہت ضروری ہے ورنہ بصورت دیگر مسائل کا حل نکلنا ممکن نہیں رہتا۔ لیکن اسے ہماری بد قسمتی کہیے کہ ہم اہم ترین قومی معاملات پر بھی انتشار کا شکار رہتے ہیں اور بڑے دھڑلے سے اسے سیاست، اظہارِ رائے کی آزادی اور اختلاف رائے کا حق جیسے خوبصورت الفاظ و تشبیہات کا نام دیتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے کسی کو اختلاف نہیں لیکن قومی معاملات میں ان کا ہونا خطرناک ہی ہوتا ہے اور ان رویوں کی ہی وجہ سے یہ مسائل طول پکڑ لیتے ہیں۔

دہشت گردی کے بارے میں بھی ہم اسی بد قسمتی کا شکار ہوئے ہیں ۔اس مسلط کردہ مصیبت اور جنگ کے بارے میں بھی ہر طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں ۔اختلاف کا شوق ضرور پورا کیجیے لیکن اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش تو مربوط ہونی چاہیے۔پاکستان میں محتاط اندازے اور اعداد و شمار بھی لیے جائیں تو بھی اس

عفریت نے پچاس ہزار جانیں نگل لی لیں ہیں لیکن دکھ اور حیرت ہے کہ اب بھی ان کے لیے ہمدردی کے جذبات کئی دلوں اور جگہوں پر امڈ آتے ہیں، کچھ لوگ کھل کر ان کی حمایت کر لیتے ہیں اور کچھ پوشیدہ اور مصلحتوں میں لپٹی ہوئی اور کچھ منہ زبانی نہ سہی لیکن اخلاقی طور پر یہ حمایت فراہم کر رہے ہیں۔ سیاست دان اگر اپنی سیاست چمکا رہے ہیں تو میڈیا اپنی ریٹنگ بڑھا رہا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر انصاف کی فراہمی کا دعویٰ کرنے والی عدالتیں جو ملزموں بلکہ مجرموں تک کو ناکافی ثبوتوں کی اصطلاح کی آڑ لے کر بری کر دیتی ہیں اور کہیں کہیں تو رنگے ہاتھوں پکڑے گئے دہشت گرد بھی اسی اصطلاح کے مطابق معصوم گردانے گئے۔ جن کو ناگزیر وجوہات کی بنا پر سزا دی گئی ان پر عمل درآمد نہیں کرایا گیا اور طالبان کی طرف سے کئی بار یہ دھمکی موصول ہوتی رہی کہ اگر ان دہشت گردوں کو سزائیں دی گئیں تو مزید دھماکے کیے جائیں گے یعنی ان کو کیش کیا جاتا رہا بلکہ کیا جا رہا ہے۔ مذاکرات کی بات ہوئی تو بھی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ سامنے آتا رہا۔ ہمارے بقول خود اور بقول چند مخصوص میڈیا گروپوں کے انتہائی نڈر بے باک، حرف انکار کے مجاہد اور معلوم نہیں کن کن خطابات کے حقدار سابق چیف، جسٹس افتخار چوہدری جو از خود نوٹس کے کافی شوقین بھی تھے نے کبھی ان معاملات پر از خود نوٹس نہیں لیا ہاں اگر فوج نے کوئی کاروائی کی تاکہ ان دہشت گردوں کا صفایا ہو تو اِس کے خلاف نوٹس ضرور لیے گئے لیکن دہشت گرد اور میڈیا اس سے مبراء ہی رہے ۔ ہمارا

عدالتی نظام کیا کبھی پچاس ہزار پاکستانیوں کے خون کا حساب مانگے گا۔ دارالحکومت اسلام آباد کی کچہری کے اندر دھماکے پر تو یہ لوگ سراپا احتجاج بن گئے لیکن سڑک، بازار، مسجد اور اسکول میں مرنے والوں کا دکھ عدالت میں کوئی جنبش تک پیدا نہ کر سکا اور اگر کسی نے یہ احساس جگانے کی کوشش کی بھی تو توہین عدالت کی سزا کے خوف سے چپ رہا۔ دوسری طرف میڈیا نے بھی ان لوگوں کو کچھ اس طرح سے کوریج دی کہ انہیں خود زیادہ محنت نہ کرنا پڑی اور ان کی دہشت بیٹھتی گئی۔ ان کے خلاف بولنے والی زبانیں کم ہوتی گئیں اور ان کا نقطہ نظر بھی واضح اور نشر ہوتا رہا۔ یہ رویہ صرف طالبان کے بارے میں نہیں رکھا گیا بلکہ ہر پاکستان مخالف کو اظہار رائے کی آزادی کے نام پر یہ سہولت مہیا کی جاتی رہی اور کی جار رہی ہے۔ 24 مارچ کو ایک نجی چینل پر حربیار مری کا انٹرویو دکھایا گیا اگرچہ اینکر نے کچھ اچھے سوالات بھی کیے جن کا حربیار کے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ احساس ناراضگی میں مبتلا بلوچوں کے ذہنوں میں بھی اپنے خیالات ڈالتا رہا اور یوں چینل کی ریٹنگ تو بڑھ گئی ہو گی لیکن اس کے خیالات بھی کچھ ہی سہی دیگر ذہنوں میں منتقل ہوتے رہے اور ایک اچھے انٹرویو کے بعد اینکر کے اختتامی الفاظ کسی بھی طرح مناسب نہیں تھے کہ انہیں یعنی حربیار کو اپنی رائے اور خیالات کے اظہار کی آزادی حاصل ہے اور یہ بھی کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی یعنی ایک پاکستان دشمن سے ملکر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ میڈیا آج کے دور کا ایک موثر ہتھیار ہے اور کسی

بھی موثر اور قاتل ہتھیار کی طرح اس کے استعمال میں احتیاط انتہائی لازم ہے ورنہ نتائج انتہائی خطرناک ہوتے ہیں۔ اسے اگر سیاستدان، تاجر اور صنعتکار پیسے دے کر اور اس کا وقت خرید کر استعمال کرتے ہیں تو یہ ملک دشمنوں کو مفت کیوں فراہم کیا جاتا ہے اور جب اسے کسی وجہ سے خود ان دہشتگردوں کی طرف سے دھمکی موصول ہو جائے تو پھر بھی صرف اپنا ہی احساس کیا جاتا ہے ملک کا نہیں۔

بہر حال اب تک تو جو ہو چکا وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے اگر اب بھی معاشرے کا ہر طبقہ اور ریاست کا ہر ستون ملکی بقاء کے بارے میں ایک رائے رکھے اور صرف خلوص پر مبنی رکھے تو ہم مزید خرابی سے بچ سکتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہوگا ورنہ صرف فوج، پولیس، خفیہ ادارے یا قانون نافذ کرنے والا کوئی بھی ادارہ اس عفریت کو قابو نہیں کر سکتا کیونکہ جب دوسرے ادارے ان کی مدد کرنے کے بجائے ان پر تنقید کریں گے، عوام میں ان کے خلاف جذبات ابھاریں گے، ان کو ملکی مسائل کا ذمہ دار بنا کر پیش کریں گے، ان کے افراد کی غلطیوں کے لیے ان کے اداروں کو ذمہ دار سمجھا جائے گا بلکہ ان اداروں کو مجرم بنا کر پیش کیا جائے گا تو ہم اس مصیبت سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جبکہ ہمیں یہ ذہن میں رکھنا ہے کہ اب ہم مزید نقصانات کے متحمل نہیں ہو سکتے اور ملکی مفاد کی خاطر ہمیں صرف جرات مندانہ

اور مخلصانہ فیصلے اور کوشش کرنا ہو گی۔ ذاتی مفاد، شہرت اور ریٹنگ سے ملک اور عوام کو اہم سمجھنا ہو گا اور اس کی سالمیت اور بقاء کے لیے اپنی ذات کی نفی کرنا ہو گی تو تاریخ اور وقت خود بخود ہمارے وجود کا اقرار کر لے گی ورنہ اپنی ذات کے لیے انکار کو بھی رد کر دے گی۔

حکومت بھارت سے پانی اور کشمیر جیسے مسائل پر بات کرے

کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی مسئلہ ہے جس نے جہاں دوسرے کئی مسائل کو جنم دیا ہے وہاں ایک مسئلہ پانی کا ہے۔ پاکستان بنا تو جہاں پاکستان کے اثاثے روکے گئے، لاکھوں مہاجرین کو ایک نئے اور بے سرو سامان ملک کے سپرد کیا گیا، جنگی سامان میں گھپلے کیے گئے، کشمیر پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کیا گیا وہیں ایک سال سے بھی کم عرصے میں پاکستان کا پانی بھی روکا گیا۔ 1960 تک پانی کا مسئلہ عارضی بنیادوں پر حل کیا جاتا رہا۔ دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے منبے کشمیر میں تھے اور کشمیر پر بھارت جیسے دشمن پڑوسی کا قبضہ تھا بہر حال ورلڈ بینک کی مداخلت اور تعاون سے پاکستان اور بھارت کے درمیان سندھ طاس معاہدہ طے پایا اور 19 ستمبر 1960 کو پاکستان کے صدر ایوب اور بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کراچی میں سندھ طاس معاہدے پر دستخط کردیے جس کی رو سے تین مشرقی دریاوءں راوی، ستلج اور بیاس پر بھارت اور تین مغربی دریاوءں سندھ، چناب اور جہلم پر پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا۔ دریاوءں کے منبے چونکہ بھارت میں تھے اس لیے اسے اجازت دی گئی کہ وہ دریا کے بہاؤ پر بجلی وغیرہ کے منصوبے بنا سکتا ہے لیکن وہ کسی بھی ایسے منصوبے کے بارے میں چھ ماہ پہلے ہی پاکستان کو آگاہ کرے گا اور منصوبے کا ڈیزائن اور تفصیلات

پاکستان کو دے گا اور یہ بھی دیکھے گا کہ اس منصوبے کی تعمیر سے دریا کے بہاؤ میں کوئی خلل نہ پڑے۔ پاکستان ان تفصیلات کو دیکھنے کے بعد تین مہینے کے اندر اندر ان کا جواب دے گا۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ بھارت دھڑا دھڑ ان دریاوءں پر منصوبے بنا رہا ہے جن میں کچھ تو دریا کے بہاو پر ہیں بھی نہیں بلکہ دریاؤں کا رخ موڑا گیا ہے لیکن پاکستان کو ان کے بارے میں آگاہ نہیں کیا گیا اور ہمارا انڈس واٹر کمیشن بھی تب جاگتا ہے جب منصوبے کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے بلکہ کافی کام ہو چکتا ہے اس وقت بھی مضبوط موقف اپنانے کے بجائے درخواستیں دائر کی جاتی ہیں یا خط لکھے جاتے ہیں اور بھارت ان کا جواب دینے کا بھی تردد نہیں کرتا۔ سوال کوٹ ہائیڈرو الیکٹرک پاور پروجیکٹ کی تفصیلات کی طلبی کے لیے پاکستان 29 خطوط لکھ چکا ہے لیکن جواب کسی ایک کا بھی نہیں آیا یہی حال دوسرے منصوبوں کے بارے میں بھی ہے۔ بھارت پانی کی بندش کو بھی پاکستان کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کر رہا ہے لیکن کمزوری ہماری حکومتوں کی بھی ہے جو تب ہوش میں آتی ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ عالمی عدالت انصاف میں اپنے حق کا اس طرح دفاع کرتی ہیں جیسا کرنا چاہیے۔ موجودہ حکومت نے تو ان مسائل کو پس پشت ڈال کر بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے کی مہم پر زور دیا ہوا ہے اور وہ پانی اور کشمیر جیسے مسائل پر بات کرکے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ حکمرانوں کو تجارت کرنی ہے۔ تجارت پر کسی کو بھی اعتراض نہیں لیکن اعتراض اس رویے پر ہے

جو دوسری طرف سے اپنایا جا رہا ہے۔ پاکستان جغرافیائی طور پر زیادہ تر صحرائی اور نیم صحرائی زمین پر مشتمل ہے اور اگر ان دریاؤں اور نہروں کا پانی نہ ہو تو پنجاب اور سندھ کے لہلہاتے کھیت اور زرخیز زمین بنجر ہو جائے اور ایک زرعی ملک اگر اپنی زراعت سے محروم ہو جائے تو پیش آمدہ صورتحال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ لہٰذا ان دریاؤں کا پانی پاکستان کے میدانوں میں بھاگتی دوڑتی زندگی کے لیے انتہائی اہم ہے اور اس اہمیت کا اندازہ حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کو ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لینا ضروری ہے اور غیر سنجیدگی کا مظاہرہ جو عالمی ثالثی عدالتوں میں کیا گیا ہے اسے بھی ختم ہونا چاہیے۔ اس وقت انڈس واٹر کمیشن بغیر کسی مستقل سربراہ کے بغیر کام کر رہا ہے اور یہی غیر سنجیدگی ہے جس کا دوسری طرف فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ بگلیہار، کشن گنگا، وولر اور اڑتیس دوسرے منصوبے جو بھارت بنا چکا ہے یا بنا رہا ہے اس کا ہمارے ملک، ہماری زراعت اور معیشت پر کیا اثر پڑے گا اس پر سوچنا ضروری ہے۔ اگر ہمارے یہ دریا خدانخواستہ سوکھ گئے تو دوبارہ ان کا بہاؤ ممکن نہیں ہوگا اور نہ ان میدانوں اور کھیتوں کا دوبارہ لہلہانا ممکن رہے گا۔ لہٰذا حکومت بھارت کو پسندیدہ قرار دینے سے پہلے اس کے ساتھ بنیادی مسائل حل کرے تاکہ تعلقات بہتر ہوں اور جب تعلقات بہتر ہوں تو دو طرفہ تجارت خود بخود شروع ہو ہی ہو جائے گی اور پاکستان بھی بھارت کی بہت بڑی منڈی سے فائدہ اٹھا سکے گا لیکن

اس کے لیے پاکستان کے وجود اور یہاں موجود زندگی کی بقاء ضروری ہے۔

خواجگانِ حکومت کی بد فہمی

خواجہ آصف اسمبلی میں بول رہے تھے، مسلم لیگ (ن) کے عظیم ارکان ڈیسک بجا بجا کر داد دے رہے تھے اور ملک کے عوام حیرت سے کھلے منہ کے ساتھ سن رہے تھے کہ ان کے ملک کا وزیر دفاع اپنی فوج کے خلاف اس زور شور سے بول رہا ہے اور فوج کے بارے میں ایسے ایسے الفاظ استعمال کر رہا ہے کہ دشمن ملک کا وزیر دفاع بھی وہ الفاظ استعمال نہ کرے۔ خواجہ آصف اپنی فوج کی تمام قربانیوں کو بھلا کر اسے مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور 1948 کے کیپٹن سرور شہید اپنے سینے پر نشان حیدر سجائے اپنی عزت افزائی پر نوحہ کناں تھے تو 1965 کے میجر عزیز بھٹی، 1971 کے میجر محمد اکرم، 1987 کے کیپٹن محمد اقبال اور 1999 کے کیپٹن کرنل شیر خان اپنے خون کی اس تضحیک پر ششدر رہتے ۔ وہ سپاہی، افسر اور جرنیل جو طالبان سے سیاسی حکومت کے حکم پر لڑتے رہے، مرتے رہے، کٹتے رہے ، جواں سال میتیں گھروں میں جاتی رہیں مائیں بہنیں بین کرتی رہیں اور باپ اپنے بڑھاپے کے سہارے کو مٹی کے حوالے کرتے رہے اور یہ سلسلہ تا حال چل رہا ہے لیکن خواجگانِ نون لیگ کے اپنے بیٹے اللہ سلامت رکھے، سلامت ہیں۔ دوسرے کا دکھ تب محسوس ہوتا ہے جب خود دل دکھی ہو خود جوان اولاد کی موت کا تو سوچ کر بھی رونگٹے کھڑے ہوں تو یہ کہاں کا انصاف

ہیں کہ دوسروں کی شہادت کا مذاق اُڑایا جائے اور شہیدوں کی تذلیل کی جائے۔ فوج ریاست کا ایک معزز اور محترم ادارہ ہے اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کی ضامن ہے اور یہی قومی بقاء کی جنگ لڑتی ہے، کفر و اسلام کے معرکے میں جان دینے والے کو ہی شہادت کا سب سے اولیٰ درجہ عطا کیا گیا ہے اور اُسے جنت کی بشارت سنائی گئی ہے۔ پھر 1965، اور دوسری جنگوں پر وزیر دفاع کا سر شرم سے جھک کیسے جاتا ہے۔ وزیر1948 دفاع کا کہنا یہ ہے کہ یہ تقریر 2006 کی ہے تو سوال یہ ہے کہ ان خیالات کے حامل شخص کو وزارتِ دفاع سونپی کیسے گئی کیا میاں صاحب نے سوچا بھی یا صرف اپنے ایک سینئر ساتھی کو ایک اہم وزارت دے کر انہیں نوازا گیا جبکہ خواجہ صاحب کا کہنا یہ بھی ہے کہ تقریر تو پرانی ہے لیکن میں آج بھی اپنے ان کہے ہوئے الفاظ پر قائم ہوں یعنی فوج کے لیے ان کے دل میں آج بھی نفرت اور غصہ موجود ہے جس کا اظہار انھوں نے ایک فوجی آمر کی اسمبلی میں اسمبلی ممبر کی حیثیت سے کھڑے ہو کر کیا تھا۔ سیاست میں فوج کا کردار اگرچہ پسندیدہ نہیں لیکن فوج کے وقار پر سیاسی حملہ بھی کوئی مثبت رویہ نہیں بلکہ انتہائی منفی رویہ ہے کیونکہ یہ کسی بھی قسم کی ناخوشگوار صورت حال کو جنم دے سکتا ہے۔ ایسا نہیں کہ فوج تنقید سے بالاتر ہے لیکن جس طرح پارلیمینٹیرین اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے اُسی طرح سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے وطن کی خاطر جان قربان کرنے کو حاضر کیے ہوئے فوج کے لیے بھی اپنی بے عزتی برداشت کرنا مشکل ہے اور ظاہر ہے کہ اس حکومتی سطح پر ہونے

والی بے عزتی کا جواب اگر ادارے کا سربراہ نہیں دے گا تو پورا ادارہ اس سے جواب مانگے گا بالکل اُسی طرح جیسے عدالت کے خلاف ایک لفظ بولنے پر توہین عدالت کا ملزم چیف جسٹس کی زد میں آئے، پارلیمنٹ کی ریشہ دوانیوں ، اراکین کی عیاشیوں پر تنقید کے خلاف تو خواجے بیانگ دہل بولیں بلکہ کسی مزدور یونین ، ٹرانسپورٹرز کی تنظیمیں، خواجہ سعد رفیق کی ریلوے کے ملازمین کی تنظیم یا صحافیوں کا کوئی گروپ تو یہ حق رکھے کہ اپنے خلاف کسی کاروائی پر ہڑتال کرے لیکن ملک کا یہ محافظ جس نے اپنے بھائی کے نشان حیدر پر فخر کے ساتھ اس مشن کو اختیار کیا اپنے ادارے کی سبکی پر چپ رہے حیرت ہے۔ خواجہ آصف کہہ رہے تھے کہ دفاعی بجٹ کا مطالبہ بھی نہ کیا جائے تو کیا بھارت ہماری سرحدوں سے کہیں دور چلا گیا ہے یا خواجہ صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دے کر ہندو ذہنیت کو بدل دیں گے اور یا وہ پاکستان کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑنے کے بدلے وہاں کی منڈی استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ملک میں کچھ جنرل تو ہوں گے جو عیاشی کر رہے ہوں لیکن پارلیمنٹ لاجز کے بارے میں بھی عوام بے خبر نہیں اور نہ ہی ملک کی امیر ترین شخصیات میں کسی فوجی کا نام شامل ہے اس فہرست میں جو لوگ موجود ہیں وہ خواجہ آصف اور خواجہ سعد کے ہی ہم پیشہ ہیں۔ ایک مشہور فوج دشمن لشکر ''بلڈی سویلین'' کے لفظ کو بار بار بول کر بلکہ غیر ضروری حد تک بول کر فوج کے خلاف عوام کو بھڑنے کی کوشش میں مصروف تھے اور اپنے متکبرانہ مزاج کے مطابق یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں

کر رہے تھے کہ کسی بھی ادارے کی طرح یہ ادارہ بھی احترام کا مستحق ہے۔اگر یہ نکتہ سمجھ لیا جائے کہ ہر ادارہ اسی طرح محترم ہے جتنا پارلیمنٹ اور ہر جان اتنی ہی قیمتی ہے جتنی کسی صحافی کی تو اداروں کے درمیان خلیج پیدا ہی نہ ہو۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب جب، جس جس کا مفاد جہاں جہاں وابستہ ہو وہاں وہاں، تب تب، ویسے ویسے خیالات یا ان کا اظہار بدل جاتا ہے۔ خواجہ آصف کو یقیناوہ وقت یاد ہوگا جب ان کے والد محترم ایک فوجی آمر کی مجلس شوریٰ کے چیئرمین کی کرسی پر بیٹھتے تھے اور ان کے رہبر ورہنما جناب نواز شریف مارشل لاء کی چھتری سر پر تانے تخت لاہور پر جلوہ افروز تھے۔ سیاستدانوں کو وہ وقت بھی یاد ہوگا جب فوجی جرنیل کو وہ اعتماد کا ووٹ دیتے تھے اور وہ وقت بھی جب اُسے وردی میں دس بار منتخب کرنے کا وعدہ کیا جاتا تھا۔ اگر ایسا کوئی ثبوت موجود ہے کہ کسی فوجی جرنیل نے یا چلیے کسی سپاہی نے ہی کسی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کو پارلیمنٹ میں ووٹ دے کر کوئی اختیار سونپا ہو تو اسے پیش کر دیا جائے۔ ہمارے ملک کے سیاہ و سفید کے مالکان اگر یہ سوچ لیں تو بہتر ہوگا کہ کس وقت کیا کہنا ہے اور کوئی اپنی بے عزتی کس حد تک برداشت کرلے گا۔ ظفر علی شاہ صاحب ایک پروگرام میں ارشاد فرما رہے تھے کہ آرمی چیف نے جواب کیسے اور کیونکر دیا وہ یہ حق نہیں رکھتے کہ جواب دیں حالانکہ سچ یہ ہے کہ جانور کو بھی چھیڑا جائے تو وہ بھی اُٹھتا ہے یہاں تو خاصا نپا تلا اور معقول جواب دیا گیا ہے۔

قوم اس وقت بد امنی ، بے روزگاری، افراط زر اور بے شمار دیگر مسائل سے دوچار ہے لیکن خواجگانِ حکومت تیغ تفنگ لے کر اپنی فوج کے خلاف بر سر پیکار۔ فوج کے افسروں کو عدالت میں ذلیل کرکے تو فتح کے پرچم لہرائے جاتے ہیں لیکن کیا وزیر اعظم صاحب اپنے ان شیروں کو سمجھانے اور ماضی کی کچھ یاد دلانے کی کوشش کریں گے یا سیاستدان پھر اپنی کج فہمی سے ملک کو کسی نا خوشگوار صورت حال سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اللہ کرے جنرل راحیل ان کے اس دام میں آنے سے بچ جائیں اور بے وقوف فوجی """عقلمند سیاستدان" کو یہ سبق پڑھا سکیں کہ قومی سلامتی اور بقاء کے" لیے وہ اندرونی محاذ کو بھی پُرامن رکھ سکتے ہیں۔ ہاں ایک تجویز عوام دے رہے ہیں کہ خواجہ آصف کا تبادلہ اگر بھارت کے وزیر دفاع کے طور پر نئی دلی کر دیا جائے تو اُنکی کارکردگی خاصی بہتر رہے گی۔

پاکستان کے خلاف علاقائی اور بین الاقوامی گٹھ جوڑ

رُوس اور امریکہ کی سرد جنگ ختم ہوئی تو دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیاڈُنیا بھی تو متاثر ہوئی ہو گی لیکن جو نقصان پاکستان نے اٹھایا اور کسی نے نہیں اٹھایا اور باوجود اس کے کہ پاکستان کا 11/9 سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھااس کو دنیاکے ہر ہر فورم پر نشانہ بنایا گیا اور ہر صورت اس کو دہشت گردی کا گڑھ قرار دیا گیا۔ ہر عالمی طاقت نے یہاں کھل کر کھیلا اور دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ اس کھیل میں کچھ اسلامی ممالک نے بھی صرف اپنے فائدے کی خاطر ایک افسوسناک کردار ادا کیا۔ پاکستان اور افغانستان جہاں یہ بساط بچھائی گئی اور ساری بازی کھیلی گئی بلکہ کھیلی جارہی ہے میں اختلافات پیدا کیے گئے اور افغانستان میں امریکہ کی مدد سے چلنے والی بھارت نواز کرزئی حکومت مسلسل پاکستان کے خلاف سازشوں کے جال بُنتی رہی اور عملی طور پر دہشت گرد تیار کرکے پاکستان میں حملے کرتی رہی بلکہ اپنی سرزمین امریکہ کو مہیا کرتی رہی اور اب بھی ایسا کر رہی ہے کہ وہ وہاں سے ڈرون حملے بھی کرے اور سلالہ چیک پوسٹ اور اسامہ کمپاؤنڈ ایبٹ آباد جیسے حملے بھی کرے۔ افغانستان کو نہ صرف امریکہ استعمال کر رہا ہے بلکہ اسے بھارت کی بھی ہر طرح کی مدد حاصل ہے۔ پاکستان کے خلاف بھارت کی

خدمات ویسے بھی ہر وقت برائے فروخت رہتی ہیں چاہے وہ کسی پڑوسی کو درکار ہوں یا دوسرے براعظموں کو اور یہی وجہ ہے کہ بھارت نے گوادر کی بندرگاہ کو بنتے دیکھا اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا تو فوراً ایران کو ایک نئی بندرگاہ چاہ بہار میں بنانے میں مدد دینے کی پیشکش کر دی جسے ظاہر ہے ایران نے قبول کر لیا تاکہ وہ تیل کی رسد پر بھی اپنا قبضہ رکھ سکے اور لینڈ لاکڈ وسطی ایشیا کی تجارت کو بھی قابو میں رکھ سکے جس کو گوادر کی بندرگاہ کے راستے بحری تجارت نزدیک ترین راستے سے سستی ترین پڑتی ہے اور یوں گوادر ایک بڑی بندرگاہ کے طور پر ابھرے گا کیوں کہ اس کا محل وقوع اور اس کا کٹا پھٹا ساحل اسے ایک قدرتی بندرگاہ بناتا ہے اور اسی خوف کے تحت ایران نے بھارت جیسے شاطر کی چال قبول کر لی جس نے نہ صرف چاہ بہار بندرگاہ میں معاونت کی پیشکش کی اور مدد بھی کی بلکہ دل آرام سورنج روڈ کی تعمیر میں بھی مدد کی جو ایران کی اس بندرگاہ کو افغانستان کے سرحدی شہر دل آرام سے ملاتی ہے اور یہاں سے مزید آگے صوبہ نیمروز کے شہر سرنج تک جاتی ہے اور یہ حصہ مکمل طور پر بھارت نے بنوایا ہے۔ اس شاہراہ کے بنانے کا مقصد افغانستان کی بحری تجارت کو پاکستانی بندرگاہوں سے دوسری طرف منتقل کرنا ہے۔ ایران کا یہ سمجھنا کہ بھارت اس کا دوست ہے اور وہ دوستی میں یہ سب کر رہا ہے اُس کی غلط فہمی ہے، بھارت جیسے مسلمان پاکستان کا دشمن ہے ویسے ہی مسلمان ایران کا بھی دوست نہیں ہے وہ یہ سب کچھ صرف اور صرف پاکستان

دشمنی میں کر رہا ہے اور انتہائی افسوس اس بات کا ہے کہ حکومت پاکستان اپنے ہی جھگڑوں میں پڑی ہوئی اور امریکہ، بھارت اور اسرائیل اپنا حلقۂ اثر وسیع تر کرتے جار ہے ہیں اور مسلمان ممالک کو بھی اس میں شامل کر رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اطلاعات آئی ہیں کہ نئی دلی میں بھارت، اسرائیل، ایران اور افغانستان کی خفیہ ایجنسیاں مل بیٹھیں کہ پاکستان کو کسی نہ کسی طرح دہشت گردی کا مرکز قرار دے کر عالمی سطح پر بدنام کیا جائے۔ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے بھی اس سازش میں مکمل طور شریک ہے، ان ایجنسیوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں بھی تبادلہ خیال کیا اور یہ فیصلہ بھی ہوا کہ علاقے میں ہونے والی تمام دہشت گرد کاروائیوں کی ذمہ داری پاکستان پر ڈالی جائے گی اور یوں پاکستان کو مزید بدنام کیا جائے گا جبکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ خود پاکستان کے اندر یہ تمام ممالک اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم ہیں بھارت اور اسرائیل کے ساتھ تو نظریاتی اور مذہبی اختلاف ہے لیکن ایران اور سعودی عرب بھی ہمارے ہاں ہونے والے فرقہ ورانہ فسادات کے اہم کردار ہیں جبکہ ایران اور افغانستان بلوچستان کے حالات میں بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں تاکہ گوادر کی اہمیت کو کم کرکے تیل کی تجارت پر اپنا قبضہ قائم رکھ سکیں۔ امریکہ، بھارت، اسرائیل اور افغانستان جو اس منصوبے کے اہم ترین کردار ہیں ان کی ہمارے ہاں ہونے والی دہشت گردی میں کردار میں تو اب کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن ہمیں دوسرے ممالک کی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھنا

ہو گی۔ ہماری خفیہ ایجنسیوں کو ان کے سدباب کا منصوبہ بھی بنانا ہو گا اور ہماری حکومتوں کو اپنی خارجہ پالیسی بناتے وقت جذباتیت نہیں بلکہ حقیقت پسندی کا ثبوت دینا ہو گا، نہ صرف اپنی زمینی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہو گی بلکہ نظریاتی طور پر ملک اتنا مظبوط کرنا ہو گا اور مذہبی اور صوبائی ہم آہنگی کو فروغ دینا ہو گا اور اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا ہو گی کہ بلوچستان جیسے حالات کو بھی قابو کیا جاسکے اور مزید ایسے حالات پیدا ہونے سے روکے جاسکیں اور ساتھ ہی سفارتی سطح پر کوشش کرنا ہو گی کہ دُنیا کے دیگر ممالک کے سامنے پاکستان کا مثبت چہرہ اس طرح سے اُجاگر ہو کہ پاکستان کے خلاف کوئی شیطانی منصوبہ کامیاب نہ ہوسکے چاہے وہ ”برادر اسلامی ممالک“ کا ہو، بھارت اور اسرائیل جیسے کھلے دشمنوں کا یا امریکہ جیسے اتحادی کا۔ بین الاقوامی تعلقات میں ممالک اپنے مفادات کا تحفظ سب سے پہلے کرتے ہیں، اس کے بعد دوسرے کا فائدہ دیکھا جاتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جنگ کھلم کھلا لڑی جائے تو اس میں ہار اور جیت ہو یہ کسی بھی طریقے سے ہو اپنے ملک کے مفادات سب سے پہلے دیکھے جاتے ہیں اور اپنا دفاع ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے۔ لہٰذا پاکستان کا یہ حق بنتا ہے کہ اس کی فوج، حکومت اور خفیہ ایجنسیاں دشمن کی چالوں کا توڑ کریں اس سے مراد ہر گز یہ نہیں کہ دوسروں کے معاملات میں مداخلت کی جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ دوسروں کو اپنے معاملات میں مداخلت کرنے سے روکا جائے۔

حامد میر پر حملہ اور قومی اداروں پر الزام تراشی

حامد میر پر کراچی میں حملہ ہوا، انہیں چھ گولیاں لگیں اور وہ شدید زخمی ہوئے تاہم اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے یہ حملہ 19 اپریل کو تقریباً شام 5 بجے کے قریب ہوا اور فوری طور پر جیو نیوز نے اس کا الزام آئی ایس آئی اور اس کے سربراہ جنرل ظہیر الاسلام پر لگا دیا اور ایسا ادارے اور اس کے سربراہ کا نام لے کر کیا گیا۔ جیو کے خیالات اب تک بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے اور نہ اس نیوز چینل نے اپنے قومی اداروں کو بے عزت کرنے میں کبھی کوئی کسر چھوڑی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر حملہ ہوتے ہی انہوں نے مجرموں کا تعین بھی کر دیا۔ اور بین الاقوامی سطح پر جیو کا ساتھ بھارت کے چینلز نے بھرپور طور پر دیا، خاص کر امن کی آشا کے دعوے دار ٹائمز آف انڈیا نے پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کو حملے کا ذمہ دار قرار دے کر اپنا حق شراکت داری ادا کیا اور جیو کے ساتھ امن کی آشا کی پتنگ کو خوب بلندی پر اُڑایا۔ حامد میر کی صحافت کے لیے خدمات ہوں نہ ہوں بلوچستان کے مُٹھی بھر علٰحدگی پسندوں، وزیرستان کے دہشت گردوں، پاک فوج کے خلاف بولنے والوں اور آئی ایس آئی پر کیچڑ اُچھالنے والوں کے لیے اُن کی خدمات واقعتاً قابل قدر ہیں۔ اگرچہ اس وقت وہ جس حادثے سے گزرے ہیں اُس پر وہ ہمدردی کے مستحق

ہیں لیکن ان کے زخمی ہونے پر اُن کے چینل کے رویے نے اگر کسی کے دل میں تھوڑی بہت ہمدردی تھی وہ بھی غصے میں بدل دی بلکہ یوں آئی ایس آئی اور اس کے چیف کو بغیر کسی ثبوت کے مجرم قرار دینے سے لاپتہ افراد کے لواحقین نے بھی سوچنا شروع کر دیا ہو گا کہ اُن کو بھی آئی ایس آئی کے خلاف اُکسا کر کہیں اصل مجرموں کو تو چھپایا اور بچایا نہیں جا رہا۔ ضروری نہیں کہ اس بچاؤ کا مقصد ان مجرموں سے ہمدردی ہو بلکہ ایسا صرف افواج پاکستان اور آئی ایس آئی دشمنی ہی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ موصوف کی بنگلہ دیش جا کر افواج پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی بھی ریکارڈ پر ہے اور وہ موقع بے موقع، موزوں یا ناموزوں ہر طریقہ سے اپنے دل کا بغض نکالتے رہتے ہیں۔

پاکستانیوں کے لیے حامد میر کا یہ رویہ بالخصوص اور جیو نیوز کا بالعموم کوئی نیا نہیں، ممبئ حملوں کے بعد اس چینل کا کردار بھی سب کو یاد ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آئی ایس آئی یا افواج پاکستان کے خلاف بات کرنے کو گناہ کہا جائے لیکن ایسا کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچا جائے کہ یہ ادارے ملکی سلامتی کے ضامن ہیں اور اگر انہی کو نقصان پہنچایا جائے تو ہم دشمن کے سامنے ننگے سر اور ننگے پاؤں کھڑے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایسے میں بچاؤ کی کوئی صورت نہیں بنے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک مخصوص گروہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہر وقت ایسا کرنے پر تلا رہتا ہے اور اس خدمت کے لیے اس کو خوب نوازا جاتا ہے اور اس طرح صرف چند سال میں اس گروہ کے لوگ کروڑوں کی جائیداد، بینک بیلنس اور

گاڑیوں کے مالک بن گئے ہیں۔ ظاہر ہے ایسا اپنے الفاظ اور خیالات مہنگے داموں بیچ کر ہی کیا گیا اور ان کی قیمت بڑھاتے وقت اور وصول کرتے وقت ملکی وقار اور سالمیت کو داؤ پر لگایا گیا اور خود کو انسانیت اور صحافت کا عظیم علمبردار ثابت کرنے کو کوشش کی گئی۔ یہ رویہ اس پورے نیوز گروپ کا رہا ہے، ہاں حامد میر کے واقعے سے اس گروپ کا اپنے اہلکاروں کے لیے رویہ بھی آشکار ہو گیا۔ حادثہ ہوتے ہی جو خبر بریکنگ نیوز کے طور پر چلائی گئی اس میں حامد میر کے زخمی ہونے سے زیادہ جس چیز کی اہمیت نظر آ رہی تھی وہ نامزد ملزموں نہیں بلکہ ایک یقین کے ساتھ مجرموں کا اعلان تھا اور جنرل ظہیر الاسلام بمع تصویر کے بطور اقدام قتل کے مجرم کے طور پر پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ گروپ جو پچھلے کئی سالوں سے ہمارے عدالتی فیصلوں میں پُوری طرح شامل ہے اور پچھلے ایک سال سے حکومتی فیصلوں پر بھی کافی مؤثر طور پر اثر انداز ہے کیونکہ فوج کے بارے میں حکومتی اہلکاروں اور اس کے اینکروں کے خیالات میں کافی ہم آہنگی ہے۔ اس خبر کے چلانے کے بعد اس کا خیال تھا کہ اسے عدالتی اور حکومتی کے ساتھ عوامی تائید بھی حاصل ہو جائے گی اور وہ اپنے غیر ملکی دوستوں اور آقاؤں کو مزید خوش کر سکے گا لیکن اس کے بالکل اُلٹ رد عمل سامنے آنے پر خود اس کے لیے صورت حال مشکل ہو گئی اور اس وقت اس نے اپنے عظیم اینکر کے بھائی کے اوپر سارا الزام دھر دیا کہ یہ بیان حامد میر کے بھائی عامر میر کا تھا جیو کا نہیں۔ لیکن جیسا کہ کچھ پروگراموں کے

ساتھ مختلف چینل یہ وضاحت ضرور پیش کرتے ہیں کہ ادارہ ان خیالات کا ذمہ دار نہ ہوگا ایسی کوئی وضاحت نہیں دی گئی تھی اور مسلسل ایک مخصوص لہجے میں اس چینلز کے نیوز کاسٹرز اس خبر کو پڑھتے اور سناتے رہے اور حامد میر کو عظیم اینکر بلکہ صحافیوں کا لیڈر اور مصیبت زدہ پاکستانیوں کا محسن بنا کر پیش کرتے رہے جبکہ دوسری طرف مد مقابل وہ لوگ تھے جو اپنی جانوں کی پرواہ کیے بغیر، یہ سوچے بغیر کہ ان کے بعد ان کے اہل خانہ زندگی کیسے گزاریں گے، جو دشمن کے ہر وار کو بس ناکارہ بنانے کی دھن میں بتلا رہتے ہیں، کہ ملک قائم رہے، سالم رہے کوئی اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکے۔ لیکن چونکہ یہ فوجی نہ تو پریس کانفرنس کر سکتے ہیں، نہ نیوز چینلز پر بیٹھ کر اپنی صفائیاں پیش کر سکتے ہیں، اس لیے وہ دشمن کے لیے تو لوہے کے چنے سہی جیو جیسے میڈیا گروپ کے لیے یا عاصمہ شیرازی جیسے ناپختہ اینکرز کے لیے یا امتیاز عالم اور اسی قبیلے کے دوسرے صحافیوں کے لیے ایک آسان ہدف بن جاتے ہیں۔ لیکن اس بار عوام نے اور بہت سارے میڈیا گروپس، چینلز اور صحافیوں نے اپنے محافظوں کی حفاظت کا جو فریضہ سرانجام دیا ہے وہ اُمید کی وہ کرن ہے جو دشمن کے چھکے چھڑا دیتی ہے اور انہیں آنکھیں چُندھیا کر بند کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگرچہ تازہ ترین خبر کے مطابق نون لیگی عظمیٰ بخاری کا کہنا ہے کہ حکومت کے لیے آئی ایس آئی اور جیو میں کوئی فرق نہیں اور وزیر اطلاعات پرویز رشید کے مطابق ”وزیر اعظم کا حامد میر کے پاس جانا اس بات

کو عیاں کرتا ہے کہ حکومت کس کے ساتھ ہے''لیکن عوام کا حامد میر پر قاتلانہ حملہ بھول کر آئی ایس آئی پر بلا ثبوت الزام لگانے پر ناراضگی بلکہ غصہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستانی قوم اپنے برے بھلے کی تمیز کر سکتی ہے اور وہ میڈیا کے تبصرے سُنتی ضرور ہے لیکن فیصلے اپنے کرتی ہے اور دوست اور دشمن کی پہچان بھی ضرور کرتی ہے جس کا ثبوت اس نے حالیہ واقعے میں دیا۔

آئی ایس آئی سے خوفزدہ لوگ

پاکستان میں نجی الیکڑانک میڈیا کا آغاز ہوا تو چینلز کی ایک فصل اُگ آئی بلکہ اب بھی روز نئے نئے چینلز کھل رہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جیو، ان میں ٹرینڈ سیٹر تھا اس نے انڈین اشتہار چلائے تو دوسروں نے بھی ایسا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ، بھارتی فلموں کے قابل اعتراض آئٹمز سانگ اور مناظر دکھائے تو دوسرے بھی پیچھے نہ رہے ، وقتاً فوقتاً قومی اداروں کے بارے میں بولا جاتا رہا تو کچھ دوسرے بھی ایسا کرنے لگے اور مقابلے کی ایک مصنوعی فضا قائم ہوتی گئی جس میں ہر چیز جائز سمجھی جانے لگی ۔ تاہم کچھ سنجیدہ مزاج اینکرز کچھ ایسے پروگرام بھی کرتے رہے جس میں میڈیا کو ان کی ذمہ داریوں اور حدود کا احساس دلانے کی کوشش کی جاتی رہی ، کامیابی کتنی ہوئی یہ ایک الگ بحث اور موضوع ہے لیکن جیو کے اینکر حامد میر پر قاتلانہ حملے نے میڈیا کے اندر الگ الگ ذہنیتوں کو واضح کر دیا۔ جس طرح حملہ ہوتے ہی جیو نے مجرم نامزد کر دیے اُس نے پوری قوم کو پریشانی بلکہ غصے میں مبتلاء کر دیا اور ساتھ ہی نجی چینلز کو بھی جھنجھوڑ دیا ۔ اگر چہ جیو کی پالیسیوں اور دوسرے چینلز کی طرف اس کے رویے پر دوسرے میڈیا گروپس کسی نہ کسی طرح اپنی ناراضگی کا اظہار تو شروع کر ہی چکے تھے لیکن اس واقعے

نے ان پر مزید واضح کر دیا کہ جیو اور ان کے راستے جدا ہونا ضروری ہیں اور تب انہوں نے اپنی قومی ذمہ داریوں کو بطریق احسن نبھایا اور فوج اور آئی ایس آئی کو کسی دوسری وجہ سے نہیں بلکہ قومی سلامتی کے ادارے اور قومی سلامتی کے ذمہ دار سمجھ کر ان کی بھرپور حمایت کی اور اس طرح اس میڈیا گروپ کی مخصوص ذہنیت اور مخصوص مفادات بھی کھل کر سامنے آگئے۔ یہاں جیو کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ اُس کی ایک غیر ذمہ دارانہ حرکت نے پورے ملک کے محب وطن لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا جنہوں نے شہر شہر مظاہرے کرکے پاک فوج اور آئی ایس آئی کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا اور جیو میڈیا گروپ کے پروپیگنڈے کو یکسر مسترد کر دیا۔ اس غصے کی وجہ یہ نہ تھی کہ الزام جنرل ظہیر الاسلام پر لگایا گیا تھا بلکہ اس کی وجہ اس الزام کا ڈی جی آئی ایس آئی پر لگنا تھا۔ آئی ایس آئی کے بارے میں ہمارے میڈیا کے چند ایک لوگ اور چینلز کچھ بھی کہیں پاکستانی عوام جانتے ہیں کہ ہماری یہ خفیہ ایجنسی پاکستان کی بقاء اور سلامتی کے لیے کئی دشمنوں سے بیک وقت برسرپیکار ہے۔ یہ دشمن اندرونی بھی ہیں اور بیرونی بھی را، سی آئی اے، موساد اور افغانستان یہ تو نظر آنے والے دشمن ہیں لہٰذا اُس سے تو نبٹ لیا جاتا ہے لیکن ملک کے اندر بیٹھے ہوئے دشمنوں پر اگر نظر رکھی جاتی ہے تو اُس کی اتنی منفی تشہیر کر دی جاتی ہے جیسے ملک کے اندر سانس لینا بھی اس ادارے کی اجازت سے ہو جبکہ ایسا کچھ بھی نہیں۔ ایک عام آدمی ان تمام وسوسوں سے بے

نیاز اپنے رزق کی تلاش میں مصروف ہے ہاں اُسے یہ خوف ضرور دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں کوئی دھماکہ نہ ہو جائے ، کہیں وہ طالبان کے ہتھے نہ چڑھ جائے یا کہیں بی ایل اے کی زد میں نہ آجائے لیکن دوسری طرف آئی ایس آئی سے صرف وہی لوگ خوف زدہ ہیں جن سے عوام خوف زدہ ہیں یعنی ملک دشمن عناصر۔ پھر ہمارے میڈیا کے کچھ لوگ یہ کیوں کہتے پھرتے ہیں کہ انہیں آئی ایس آئی سے خطرہ ہے اور کچھ ہوا ،یا ہو جائے تو الزام فوراًالزام آئی ایس آئی پر لگا دیتے ہیں، پہلے ہم یہ گلہ دشمنوں سے کرتے تھے اب تو خود ملک کے اندر یہ ہو رہا ہے بلکہ حامد میر کے کیس میں تو بھارت کی پاکستان دشمن بی جے پی کے یشونت سنہا نے بھی اس معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے اور نواز شریف کو یاد دلایا ہے کہ ان کے دور میں یہ حملہ افسوس ناک ہے اگر چہ جیو اور حکومت کے خصوصی تعلقات سب کے علم میں ہیں اور اب تو سیاستدانوں نے برملا اس کا اظہار بھی شروع کر دیا ہے لیکن بھارت کی طرف سے اس یاد دہانی کی تشریح و توضیح حکومت یا جیو ہی کر سکتے ہیں ۔ان تحقیقات کو بھی جیو اپنی جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لے کر کہیں کا کہیں لے جا سکتا ہے اُس کے انوسٹیگیٹو رپورٹرز اگر اجمل قصاب کی کہانی گھڑ سکتے ہیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں اب بھی جبکہ میڈیا کی اکثریت اور عوام کے احتجاج کے سامنے اس کی پوزیشن خاصی مشکل ہو چکی ہے معاملے کے ٹھنڈا ہوتے ہی وہ اپنی تحقیقاتی رپورٹس نشر کرے گا اور اپنی طرف سے لگائے گئے الزامات ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کا زور لگائے گا اور اگر قومی

نہیں تو بین الاقوامی حمایت ضرور حاصل کرلے گا جو کہ پاکستان کے خلاف آج کل کے حالات میں ہرگز کوئی مشکل کام نہیں۔ قومی سطح پر بھی مخصوص عناصر اور ذہینیت اس طرح کی کوششوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور جیو آج کل یہی کر رہا ہے کہ وہ اپنے اینکر پر حملے کو صحافت اور صحافیوں پر حملے کے طور پر پیش کر رہا ہے اور اسے آزادی صحافت کے خلاف سازش قرار دے رہا ہے تاکہ میڈیا اور صحافیوں کی حمایت حاصل کر سکے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا، حامد میر ہو رضا رومی ہو یا کسی اور نیوز چینل یا اخبار کا کوئی گمنام کیمرہ مین سب کی جان قیمتی ہے اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا حق بھی ہے لیکن ملک اور قومی اداروں کے بارے میں یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ پیمرا کا ادارہ اگر بنایا گیا ہے اور اس کے قوانین بھی موجود ہیں تو اسے اپنے فرائض بھی ادا کرنا چاہیے۔ میڈیا پر یہ نظر بھی رکھنا ضروری ہے کہ کون سی حد پر پہنچ کر وہ ملکی مفاد کے نقصان کا باعث بن رہا ہے۔ ریٹنگ کی دوڑ میں ملک کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے اسے بھی یاد رکھنا ضروری ہے اور جو لوگ آئی ایس آئی اور ملکی سلامتی کے کسی بھی ادارے سے خوف محسوس کرنے کا اعلان کرتے پھرتے ہیں ان پر نظر رکھنا اور بھی ضروری ہے کہ آخر وہ اپنے کون سے افعال کی وجہ سے اس خوف میں مبتلاء ہیں۔ یہاں یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ پیمرا اور سیکیورٹی کلئیرنس دینے والے ادارے جن میں خود آئی ایس آئی بھی شامل ہے کوئی بھی کلئیرنس دینے سے پہلے ان افراد کی چھان

بین کرتے ہوئے بھی احتیاط کرے۔ اب بھی پیمرا کو ان گروپس کو اپنی حدود کا احساس دلانا ہوگا اور انہیں پابند بھی کرنا ہوگا کہ مستقبل میں اپنی ایسی کسی بھی حرکت کے لیے وہ خود ذمہ دار ہوں گے اور یہ بھی بتانا ہوگا کہ قومی سلامتی پر بار بار سمجھوتہ کسی بھی صورت نہیں کیا جا سکتا۔

اظہار رائے میں احتیاط

کوئی بھی ملک، ملک تب بنتا ہے جب اس کا ہر کارکن ہر ادارہ اپنی اپنی جگہ پر اپنے فرائض ادا کرے اور اُسے ادا کرنے دیے جائیں اور ہر ایک اپنے دائرہ کار میں رہے تو معاملات درست بھی رہتے ہیں اور متوازن بھی۔ لیکن پاکستان میں ہر شخص اپنے آپ کو ہر معاملے میں ماہر سمجھ کر بہت سے معاملات بگاڑ دیتا ہے۔ اداروں کے بارے میں آزادانہ رائے دیتا ہے، آزادنہ رائے میں بھی کوئی حرج نہیں بلکہ قابل تعریف ہے لیکن اسے منفی اور دشمنانہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جو آج کل ایک میڈیا گروپ اور آئی ایس آئی اور فوج کے درمیان ہے۔ اگر صحافی اپنے آپ کو صرف صحافی اور اینکر سمجھتے خفیہ اداروں کے جاسوس نہیں تو شاید یہ تناؤ پیدا نہ ہوتا۔ آزادی صحافت اور اظہار رائے کی آزادی کے نام پر حدود پار نہیں ہونی چاہیے، جیسا کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا اور اس کی دیکھا دیکھی اب تو پرنٹ میڈیا بھی آزاد ہوتا جارہا ہے۔ میڈیا پر جس طرح خبروں کو مصالحہ لگا کر اور چٹخارہ لے کر دکھایا جارہا ہے، اچھے بھلے قومی لیڈروں پر تنقید کے نام پر گانے چلائے جارہے ہیں اور اداروں کی تضحیک کی جارہی ہے وہ انتہائی قابل مذمت ہے۔

پی ٹی وی کے لگے بندھے سرکارے خبرنامے کے عادی عوام نے ابتدا میں تو اس آزادی کا خوب لطف اٹھایا لیکن کوئی بھی چیز جب حد سے آگے بڑھ جائے تو اپنا تاثر کھو دیتی ہے اور مؤثر نہیں رہتی، یہی حال ہمارے میڈیا کا ہوا جہاں کبھی سیاسی پارٹیوں کو لڑایا گیا، کبھی اداروں کو اور کبھی شخصیات کو۔اس بے جا قسم کی تنقید کی زد میں فوج اور آئی ایس آئی تو عرصہ دراز سے تھے لیکن جب اقدام قتل کے الزام میں براہ راست ڈی جی آئی ایس آئی کو نامزد کیا گیا تو آخر کار باقی میڈیا اور عوام چیخ اٹھے اور اس رویے کو یکسر مسترد کر دیا۔

یہاں مسئلہ تنقید کا نہیں، تنقید اگر صحتمندانہ ہو تو معاشرے کی بہتری اور بھلائی کا باعث بنتی ہے لیکن اگر صرف برائے تنقید ہو تو الجھاؤ ہی کی وجہ بنتی ہے اور قومی سلامتی کے اداروں کے بارے میں تو خاص کر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اظہار رائے کی آزادی کا سب سے بڑا علمبردار اس وقت امریکہ خود کو سمجھتا ہے، بلکہ وہ باقی کی دنیا کو ہدف تنقید بنائے رکھتا ہے اور اگر کوئی حکومت اپنے مخالفین کے خلاف بھی کوئی اقدام کرے تو اُس پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام لگا دیتا ہے اور پوری دنیا میں اس اقدام کو اس کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتا ہے لیکن خود اپنی سلامتی سے متعلق معلومات کو عام نہیں کرتا اور قوانین بناتے ہوئے ایسی شقوں کو نکال بھی دیتا

ہے اور اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ہر ملک کو اپنے دفاع اور سلامتی کا حق حاصل ہے یہ اور بات ہے کہ امریکہ کسی اور کو یہ حق نہیں دیتا اور ایسا کرنے والوں پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام لگا دیتا ہے لیکن امریکہ ایسا کرے تو اس انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں بھی خاموش رہتی ہیں۔ تُرکی کے وزیر اعظم عبداللہ گل نے اپنی خفیہ ایجنسی ایم آئی ٹی کو قانوناً یہ اجازت دی کہ وہ دہشت گردی کی روک تھام کے لیے عوام کے ٹیلی فون ٹیپ کر سکتی ہے اگرچہ دہشت گردی کی روک تھام کے دیگر طریقے بھی ہو سکتے ہیں لیکن ہنگامی صورت حال میں کوئی بھی اقدام اٹھایا جا سکتا ہے اور اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔

ہمارے ملک میں آج کل جو صورت حال ہے اس میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اور اداروں کو اگر کچھ اضافی اختیارات نہ بھی دیئے جائیں تو انہیں کم از کم اپنا کام کر لینے دینا چاہیے تاکہ انہیں ہدف تنقید بنا کر تذلیل کی حد تک نہ پہنچا جائے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ادارے تنقید سے مبراء رہیں یا خود کو اس سے بالاتر سمجھیں لیکن یہ تنقید حملے کی صورت میں ہو تو ظاہر ہے قابل برداشت نہیں رہتی اور قومی معاملات میں تناؤ کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمارا میڈیا آزادی اظہار کا حق ضرور رکھے لیکن قومی حدود کو پار کرنے سے پہلے سوچ لیا کرے جبکہ ہو یہ رہا ہے کہ بقول مجید نظامی صاحب ”ہمارے کچھ میڈیا

چینلز پاکستانی سے زیادہ بھارتی نظر آتے ہیں" ان کا کہنا اس لیے بجا ہے کہ نہ تو لباس و اطوار میں یہ چینلز پاکستانی ہیں نہ خیالات و نظریات میں۔

اب تک تو میڈیا ایک بے لگام آزادی کے مزے لوٹتا رہا ہے کبھی فوج اس کے نرغے میں آتی رہی کبھی ایجنسیاں، کبھی پارلیمنٹ میں کسی بھی مخالف گروپ کے ارکان، کبھی شخصیات کی کردار کشی کی جاتی رہی لیکن قوم نے ایک میڈیا گروپ کے رویے پر جس رد عمل کا اظہار کیا ہے امید ہے کہ اب وہ اپنی حدود پہچان لے گی اور قومی سلامتی کو ذاتی ریٹنگ اور مالکوں کے خزانوں میں اضافے سے زیادہ اہم سمجھے گی کیونکہ چاہے کچھ بھی ہو جائے جیسے بھی حالات اور ماحول بنا دیا جائے امن کی جتنی بھی یک طرفہ خواہش کی جائے ملکی سلامتی سب سے مقدم ہے۔

مزید خرابی کی گنجائش نہیں

ذرائع ابلاغیات و نشریات ہر زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہے ہیں، کبھی ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا، کبھی نقارہ بجتا تھا پھر اعلان ہونے لگے ، بادشاہوں کے فرمان جاری ہوتے تھے اور پھیلائے جاتے تھے پھر اخبارات شائع ہونے لگے، ریڈیو آیا، ٹی وی عام ہوا اور آگے بڑھ کر سیٹلائیٹ کا دور آیا اور الیکٹرانک میدیا نے دوریاں سمیٹ کر رابطے آسان کر دیئے۔ پاکستان میں ایک عرصے تک لوگ پی ٹی وی کے خبرنامے اور ڈراموں پر اکتفا کرتے رہے اور اپنی مرضی کا کہنے سننے کے لیے وہ اخبارات پڑھتے تھے۔ جب نجی شعبے کو الیکٹرانک میڈیا میں چینلز کھولنے کی اجازت ملی تو یہ سمجھا گیا کہ اب صرف حکومتی نکتہ نظر نہیں بلکہ حقیقت سننے کو ملے گی۔ ایسا ہوا تو، لیکن بہت دفعہ ملکی مفاد پس پشت ڈالا جاتا رہا، مختلف اینکرز اور مالک اپنے نظریات و خیالات کی ترویج کرتے رہے کئی بار ذاتی مخالفت کی بنا پر دوسروں کی پگڑی اچھالی گئی۔ قومی و مذہبی اقدار کو کوئی اہمیت نہ دی گئی بلکہ اس کی مخالف سمت میں چلا گیا۔ نہ تو ہمارے ڈرامے ہمارے مذہب و ثقافت کے عکاس رہے نہ سیاست میں موجود تھوڑی بہت شائستگی باقی بچی۔ بات شخصیات سے آگے نکل کر اداروں ، قومی نظریات اور قومی سلامتی تک پہنچ گئی اور جیو نیوز نے امن کی آشا کے نام پر پاکستان اور بھارت کی

سرحدوں کو ہی غیر اہم اور لا معنی قرار دینا شروع کردیا، دوسری طرف ٹائمز آف انڈیا گروپ تھا جو بھارت کا قومی نکتۂ نظر ہی پھیلاتا رہا۔ بھارت نے نہ 14 اگست 1947 کو پاکستان کو دل سے تسلیم کیا تھا اور نہ ہی وہ 2014 میں پاکستان کے وجود کو مانتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسی زور و شور سے پاکستان اور اس کے نظریے کے خلاف برسرپیکا رہا لیکن پچھلے کچھ سالوں میں اکھنڈ بھارت کے نظریے کو جیو اور اس کے لینکرز نے خوب پھیلانے کی کوشش کی ۔دو قومی نظریے پر حملے کیے گئے ایسے ایسے دانشوروں کو اکٹھا کیا گیا جو کھلم کھلا پاکستان کی مخالفت اپنا فرض سمجھتے ہیں ماروی سرمد جیسے لوگ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لیے اور اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے اس پلیٹ فارم کو استعمال کرتے رہے ۔حکومتیں ، عدالتیں ، عوام، صحافی برادری حتیٰ کہ ہماری خفیہ ایجنسیاں بھی خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتی رہیں اور اب جیو بڑے دھڑلے سے کہہ رہا ہے کہ امن کی آشا میں حکومت ،فوج اور آئی ایس آئی کی رضامندی بھی شامل تھی تو آئی ایس آئی اس الزام کو رد کر رہی ہے لیکن اس سے پہلے اعتراض سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام نہیں اٹھایا گیا۔ کیا صرف اس لیے کہ اظہار رائے کی آزادی کا اعزاز حاصل کیا جائے بلاشبہ کہ اظہار رائے کی آزادی ضروری ہے لیکن اس سے بڑھ کر مذہب، قومی نظریہ ، قومی سلامتی اور اخلاقی اقدار ضروری ہیں جن کو پس پشت ڈالا گیا ۔

جیو ٹی وی پاکستان کا سب سے طاقتور میڈیا گروپ ہے جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے ملک کے کونے کونے میں پہنچتا ہے اور یوں دیکھا بھی جاتا ہے، اسے اپنی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا کہ اپنی اقدار اور روایات کو عام کرتا ،اپنے قومی نظریے کی ترویج کرتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ کشمیر کا مسئلہ اس کے پروگراموں میں نظر نہ آیا ہاں کبھی کبھی لوگوں کا منہ بند رکھنے کو سرسری تذکرہ ہو جاتا تھا۔

پاک بھارت پانی کے مسئلے سے زیادہ اہم ، واشنگ مشین سے لیکر ایک اچھے موبائل تک کی مالکن کی ''غربت'' کے مارے خود کشی کو سمجھا گیا۔ اگرچہ اس جرم میں دوسرے بھی اس کے شریک رہے تاہم وہ قومی مفادات پر یوں کھلم کھلا ضرب نہیں لگا رہے تھے جو امن کی آشا کے نام پر یہاں لگایا جا رہا ہے اور دوسری طرف ٹائمز آف انڈیا پاک بھارت سرحدیں مٹانے کی مذموم کوشش اپنا قومی مفاد حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔

بلوچستان کے حالات کا ادارک سب کو ہے ، یہاں کی محرومیاں بھی سب جانتے ہیں اور یہاں بھارت کا گھناؤنا کردار بھی کچھ ڈھکا چھپا نہیں لیکن یہ گروپ اس کی تمام تر ذمہ داری بھی فوج اور آئی ایس آئی کے سر ڈالتا رہا اور پڑوسی ملک کی خدمت کے عوض معلوم نہیں کیا کچھ وصول کرتا رہا۔ پڑوسی ملک کو خوش

کرنے کے لیے سیفما جیسے اداروں اور یہاں تک کہ کچھ سیاستدانوں کا تعاون اسے حاصل رہا، شریف برادران بھی امن کی پتنگ اڑانے کی کوشش کرتے رہے جس کی ڈور ہر بار بھارت کی طرف سے کاٹی جاتی رہی۔

یہ میڈیا گروپ بے نقاب ہوا ہے تو جو ثبوت اس کے خلاف اب لائے جارہے ہیں اگر جرم پھلنے پھولنے سے پہلے ہی جڑ کاٹی جاتی تو خرابی بسیار کی نوبت ہی نہ آتی۔ قومی سلامتی، قومی ثقافت، اقدار، روایات، لباس سب کچھ کو اپنی مرضی اور پڑوسی کی منشاء کے مطابق تبدیل کردیا گیا ہے اور یہ تبدیلی نہ صرف اندھی چال چلنے والے پورے میڈیا پر نظر آرہی ہے بلکہ پورے معاشرے میں دکھائی دے رہی ہے۔ اُس وقت حکومت، عدالتیں، میڈیا، عوام، خفیہ ادارے سب سوتے رہے اور اب جب ایک بڑے جھٹکے کے نتیجے میں جاگے ہیں تو سب کا ایک مطالبہ ہے کہ اس ذہنیت کے لوگوں کو لگام دیا جائے اگرچہ حکومت اب بھی تذبذب کا شکار ہے اور یہ گروپ بھی اپنی پالیسیوں پر قائم ہے۔ حال ہی میں اوور سمارٹ اینکر شائستہ واحدی نے اپنے مارننگ شو میں جو حرکات کیں عوام اس پر بھی مشتعل ہے اور علماء بھی اس اینکر اور چینل کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عملی طور پر ایسی گستاخیاں پہلے نہیں کی گئیں جب اپنے مذہب اور روایات کے عین خلاف ڈرامے اور شوز چلائے جاتے رہے تاہم اب بھی اگر قوم جاگ ہی گئی ہے اور میڈیا ہوش میں

آگیا ہے تو حکومت کو میڈیا کے لیے کچھ عملی قوانین بنا لینے چاہیے اور جو ہیں ان پر عمل درآمد یقینی بنانا چاہیے۔

اظہار رائے کی آزادی کے نام پر قوم اور ملک کو جتنا نقصان پہنچایا گیا اور جتنی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے اب ہنگامی بنیادوں پر اس کی مرمت ضروری ہے اور جیو کو تو قانون کے مطابق سزا دی ہی جائے لیکن باقی کے میڈیا کو بھی اپنی اقدار و روایات کی یاد دلا دینی چاہیے اور جس طرح سے قوم اور میڈیا اظہار رائے کی بیہودہ آزادی کے خلاف اکٹھے ہوئے ہیں اسے برقرار رہنا چاہیے اور ایسی حدود متعین کر لینی چاہیے جو مذہب اور قومی مفادات کے عین مطابق ہوں اور کسی ایک نہیں بلکہ سب کے لیے ہوں کیونکہ اب مزید خرابی کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ آگے تباہی کا اندھا گڑھا ہے جس سے واپسی کسی طور بھی ممکن نہیں۔

پاک افغان تعلقات اور عالمی امن

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات حکومتی سطح پر تو کبھی شاید مثالی خوشگوار نہ رہے ہوں لیکن بہرحال یہاں کے عوام کچھ ایسے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں جنھیں کوئی ختم نہیں کر سکتا جن میں سب سے بڑا رشتہ مذہب کا ہے۔ افغانستان کے مسلمانوں پر جب بھی مشکل وقت آیا پاکستانیوں نے آگے بڑھ کر ان کی مدد کی اور اس کے بدلے میں خود مشکل ترین حالات کا سامنا کیا۔ افغانستان میں چاہے روسی مداخلت تھی یا امریکی اس کا خمیازہ پاکستانیوں کو بھگتنا پڑا۔ پاکستان میں موجودہ دہشت گردی کی تاریخ اور حال دونوں افغانستان سے جا کر ملتے ہیں۔ پاکستان کے شمال مغربی علاقے میں موجود دہشت گردی کے اڈے طاقت افغانستان سے ہی پاتے ہیں۔ طالبان لیڈر جب پناہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہ افغانستان میں پناہ لے لیتے ہیں جس کی سب سے بڑی مثال ملا فضل اللہ ہے جو افغانستان میں محفوظ بیٹھ کر اپنے کارندوں کے ذریعے پاکستان کے شہروں بازاروں اور گلی کوچوں میں حملے کرواتا ہے اور اس کا ترجمان بڑے فخر سے ان ظالمانہ کاروائیوں اور قتل عام کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔ اس دہشت گردی نے پاکستان کی ترقی، صنعت، حرفت، تجارت، دفاع اور یہاں تک کہ تعلیم کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔

روز روز کے دھماکوں نے عوام کو ذہنی پریشانیوں اور مسائل سے دو چار کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی عالمی طاقتیں، بھارت اور افغانستان، پاکستان کو دہشت گردی کا گڑھ کہتے ہیں جبکہ اسی ملک نے خواستہ یا نخواستہ عالمی امن کے لیے سب سے زیادہ قربانیاں دیں ہیں، سب سے زیادہ زندگیاں گنوائی ہیں اور سب سے زیادہ منفی پروپیگنڈہ بھی برداشت کیا ہے۔ خود پاکستان کے معاملات میں ہر موقع پر ہر ایک نے مداخلت کو اپنا فرض سمجھا ہے حتیٰ کہ افغانستان جن کی مدد کی پاداش میں پاکستان کو سزا بھگتنا پڑتی ہے وہ بھی بڑے دھڑلے سے یہ الزام لگا دیتا ہے حالانکہ پاکستان جانتا ہے کہ افغانستان میں امن خود اس کے امن کے لیے ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کی پاکستان چاہتا ہے کہ افغانستان میں امن قائم ہو کیوں کہ اس کی مثبت اثرات پاکستان کے لیے دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ اہم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حکومت نہ صرف امن معاہدوں کے بارے میں سنجیدہ ہے بلکہ افغانستان میں ترقیاتی منصوبوں میں ہاتھ بٹانا چاہتی ہے، کیوں کہ اس بات کا احساس ہر پاکستانی کو ہے کہ اگر افغانستان میں روزگار کے ذرائع فراہم ہونگے اور وہاں کے لوگ باقی کی ترقی یافتہ دنیا سے آگاہ ہونگے تو وہاں خانہ جنگیاں خود بخود فرو ہوں گی اور پاکستان کی سرحد پر اور سرحدوں کے اندر دہشت گرد کاروائیوں کے لیے افرادی قوت میسر نہ آسکے گی لہذا دنیا کا یہ سوچنا کہ پاکستان افغانستان کے امن کے بارے میں سنجیدہ

نہیں حقائق سے صرف نظر ہے۔

یہ بات بھی درست ہے اور حکومت کے لیے قابل غور بھی کہ پاکستان کے تعاون سے تعمیر ہونے والے منصوبے اس وقت فنڈز نہ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں جنھیں ہر حال میں مکمل ہونا چاہیے تاکہ پاکستان کے بارے میں غیر ذمہ داری کا جو تاثر فروغ پا رہا ہے وہ ختم ہو اور عالمی سطح پر ساکھ بھی بہتر ہو۔ یہ تمام منصوبے نصف سے زیادہ مکمل ہو چکے ہیں بلکہ رحمان بابا ہوسٹل کا کام تو 97% مکمل ہو چکا ہے لیکن اگست 2013 سے یہ تمام کام بند پڑے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ پاکستان ان منصوبوں کے بارے میں دلچسپی نہیں لے رہا بلکہ وہ اس تعطل آگاہ ہے اور اسی لیے اپریل 2014 میں وزیر خزانہ اسحاق ڈار ان کی جلد تکمیل کے لیے کہہ چکے ہیں اور فنڈز کی فراہمی کا بھی وعدہ کیا ہے۔

افغانستان نہ صرف ہمارا پڑوسی ہے بلکہ برادر اسلامی ملک بھی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کا امن افغانستان کی صورتحال سے متاثر ہوتا ہے۔ ہمارے قبائلی علاقوں اور افغانستان کے درمیان صدیوں پرانے روابط موجود ہیں کہ جس میں خاندانوں میں باہم رشتے ہیں، پہاڑوں کے اس طرف اور اُس طرف کے لوگ مختلف دروں سے ہوتے ہوئے سینکڑوں سالوں سے تجارتی روابط میں بھی وابستہ ہیں اس لیے یہ کہنا کہ پاکستان افغانستان میں خون خرابہ کراتا ہے یا اس کے بارے میں سوچتا ہے کسی بھی طرح درست نہیں اور یہ صرف افغانستان پر ہی موقو

ف نہیں بلکہ کسی بھی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت پاکستان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہے اگرچہ خود ہم دوسروں کی سازشوں کا مسلسل شکار ہیں جن میں بھارت سرفہرست ہے اور افغانستان بھی اگر ایسا کرتا ہے تو اس میں بھارت نواز طبقہ ملوث ہے ورنہ ایک عام افغانی کے لیے پاکستان بھارت سے زیادہ اہم ہے کیونکہ نہ بھارت اس کا ہم مذہب ہے اور نہ ان کی سرحدیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں نہ ہی کبھی اس نے افغانیوں کا درد محسوس کیا ہے لیکن افغانستان میں اس کی مداخلت ضرور موجود ہے اور حالات اور تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ یہ موجودگی بھی پاکستان کے اندر پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ افغان حکومت کو بھی پاکستان کو اپنے حالات کا مورد الزام ٹھرانے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ جس ملک کے خلاف وہ پروپیگنڈا کر رہا ہے اور اس کے خلاف اپنی سرزمین کے استعمال کی اجازت دے رہا ہے وہ وہی ملک اور لوگ ہیں جنہوں نے بارہا اپنی سرزمین افغانوں کو بیرونی حملوں اور بموں سے بچانے کے لیے فراہم کی۔

پاکستان اور افغانستان دو برادر اسلامی ممالک ہیں، پڑوسی ہیں، ثقافتی، روایتی حتیٰ کہ ذاتی رشتوں اور ناتوں میں بندھے ہوئے ہیں لہٰذا انہیں ایک دوسرے کی خودمختاری، سلامتی، امن، ترقی اور خوشحالی کا نہ صرف خیال رکھنا چاہیے بلکہ اس سب کچھ کا ضامن بھی ہونا چاہیے۔

کیا دنیا اب بھی بھارت کو سیکولر ملک سمجھے گی

بھارت میں الیکشن ہوئے اور بی جے پی کے نریندر مودی جیت گئے۔ یوں تو بھارت میں کسی کی بھی حکومت ہو وہاں اقلیتیں عام طور پر اور مسلمان خاص طور پر غیر محفوظ رہتے ہیں۔ خود کو دیکولر کہلانے والی کانگریس جو بھارت کی بانی جماعت بھی ہے اور اکثر اوقات برسراقتدار بھی رہتی ہے کے دور میں بھی مسلمان کبھی محفوظ نہیں رہے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی مظفر نگر میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ جانوروں کے ساتھ بھی کیا جائے تو تحفظ حیوانات کی تنظیمیں چیخ اٹھتی ہیں، لیکن وہ بھارت کے مسلمان تھے اس لیے زیادہ ہلچل نہیں ہوئی اس کے علاوہ بھی کئی واقعات ان کے نامہ اعمال میں شامل ہیں۔ پاکستان دشمنی بھی بھارت کی ہر حکومت کا طرۂ امتیاز ہے اور پاکستان کا توڑنا بھی کانگریس کا ہی کارنامہ ہے۔
کانگریس یہ سب کچھ کرتی ہے لیکن کہلاتی خود کو سیکیولر ہے جبکہ دوسری طرف بی جے پی جو آج نہیں بلکہ کئی بار حکومت میں آچکی ہے اور اسی مسلم دشمنی اور پاکستان دشمنی ہی کے نعرے کی بنیاد پر اب کی بار بھی اسی ذہنیت نے فتح حاصل کی ہے اور پاکستان اور اسلام کے خلاف کھلم کھلا بولنے والے نریندر مودی نے آخر کار وزارتِ عظمٰی حاصل کر ہی لی۔ یہ وہ ہی مودی ہے جس نے

گجرات میں انسٹھ ہندوؤں کے بدلے دو ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ 27 فروری 2002 کو ایک ٹرین پر جب حملہ ہوا اور اس میں انسٹھ ہندو مارے گئے تو اس کا الزام بغیر کسی ثبوت کے مسلمانوں پر دھر دیا گیا اور وزیر اعلیٰ گجرات نریندر مودی نے اپنی ریاستی پولیس کو استعمال کرتے ہوئے دو ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا اور اب بھی اس کا ذکر فخر سے کرتا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ ان دو ہزار مسلمانوں کا قاتل ہے، ان فسادات میں کم از کم ڈیڑھ لاکھ افراد بے گھر ہوئے، عورتوں کی بے عصمتی کی گئی، لوگوں کو ہراساں کیا گیا، ان کی جائیداد کی تفصیلات بذریعہ پولیس بلوائیوں کو دی گئیں اور انہیں چھینا گیا یا جلا دیا گیا۔ یہ سارے کارنامے مودی کے کریڈٹ پر ہیں جن کو وہ مانتا ہے اور اکثر بیان کرتا ہے۔

وہ بھارت کی سرزمین پر کسی غیر ہندو باشندے کا حق تسلیم نہیں کرتا بلکہ اسے بھارت چھوڑنے یا پھر مرنے ہی کی اجازت دیتا ہے۔ بابری مسجد کو مسمار کرنے میں اس کا شرمناک کردار تاریخ کا حصہ ہے لیکن اس کے باوجود بھی اسے بھارت میں پذیرائی ملتی ہے اور وہ ایک ایسی واضح اکثریت حاصل کرتا ہے کہ اسے حکومت بنانے کے لیے کسی پارٹی، کسی آزاد امیدوار کو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں اور ایسا 1984 کے بعد پہلی بار ہوا ہے کہ کسی جماعت کی لوک سبھا میں اتنی سیٹیں ہوں کہ وہ خود ہی حکومت بنا سکے۔ 543 میں سے 336 سیٹیں بی جے

پی نے حاصل کیں اور انتہا پسند ہندو جماعت کا انتہا پسند ترین لیڈر مودی بھارت کا پندرھواں وزیراعظم بن گیا۔ تو کیا اس پس منظر و پیش منظر کے بعد بھی دنیا بھارت کو سیکولر ملک سمجھے گی اور وہاں کے مسلمانوں کو محفوظ، اور کیا اب بھی بھارت میں ہر دہشت گردی کے واقعے کو پاکستان کے کھاتے میں ڈالا جائے گا۔ ابھی نو مئی کو بھی اخبار انڈین ایکسپریس نے الزام لگایا کہ تامل ناڈو پولیس نے آئی ایس آئی کے ایک ایجنٹ کو گرفتار کیا اور کولمبو سری لنکا میں پاکستان ہائی کمیشن کے ویزا اکاؤنسلر عامر زبیر صدیقی کو بھی اس کا ساتھی قرار دیا لیکن سری لنکا نے بروقت اس الزام کی تردید کردی اور یوں یہ معاملہ بڑھنے سے رُک گیا ورنہ اسے بھی ممبئی حملوں کی طرح ہر صورت پاکستان کے کھاتے میں ہی ڈالا جاتا۔ آئی ایس آئی اور پاکستان سے بھارت کا خوف کھانا کچھ بے جا نہیں کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی اس سے ٹکر لے سکتا ہے تو وہ پاکستان، اس کی فوج اور آئی ایس آئی ہے لیکن یوں انہیں ہر معاملے میں گھسیٹ لینا بھی کافی خطرناک ہے کیوں کہ ظاہر ہے بھارت اور خاص کر اس کے میڈیا کے اس رویے کے خلاف پاکستان میں بھی ردعمل آئے گا اور بات سلجھنے کی بجائے الجھتی جائے گی اور بھارت میں مسلمان بھی چونکہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں لہٰذا خود بھارت کے اندر بھی دونوں بڑے مذاہب کے درمیان حالات قابو سے باہر ہو سکتے ہیں جو نئی حکومت کے لیے مشکل ہونگے۔

وزیر اعظم پاکستان نے اگرچہ اکثریت کی رائے کے خلاف مودی کی حلف برداری کی تقریب میں شرکت کی لیکن اس موقع پر بھی کسی خیر سگالی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے انہیں پاکستان کے خلاف چارج شیٹ ہی پکڑائی گئی ۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے وزیر اعظم بھارتی اداکاروں، اداکاراؤں اور تاجروں سے ہی ملاقات کرکے اتنے خوش تھے کہ انہیں اپنے ملک کے نقطۂ نظر اور مسائل پر بات نہ کر سکنے کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ ہاں بھارت کی نئی حکومت نے اپنی نیت اور ذہنیت دونوں کا اظہار کر دیا، لیکن اگراب بھی سرحد کے اُس پار سے احتیاط برتی جائے تو بہتر ہوگا ورنہ ہر عمل کا ایک رد عمل ضرور آتا ہے جو بھارت کے مسلمانوں اور پاکستان دونوں طرف سے ہو سکتا ہے۔ نریندر مودی اگر اپنا ماضی بھول کر اور اس پر فخر کرنا چھوڑ دیں تو اگرچہ مسلمان اس ماضی کو اپنے ذہنوں سے نکال تو نہ سکیں گے تاہم وقت کسی نہ کسی طرح سمجھوتے کے ساتھ گزر جائے گا ورنہ بصورت دیگر حالات کو سنبھالنا مشکل رہے گا اور بھارت حسب معمول ہر مشکل کا الزام پاکستان کے سر دھرتا رہے گا اور یوں حالات کبھی بھی قابو میں نہ آسکیں گے۔ اس لیے بھارت کی نئی حکومت اگر پاکستان اور مسلمانوں پر نظر رکھنے پر زیادہ وقت ضائع نہ کرے اور خود کو قابو میں رکھے ،اپنی انتہا پسندی کو لگام دے تو یوں اس کے لیے بھی آسانی رہے گی اور اس کے پڑوسی بھی اس کی الزام تراشیوں اور ریشہ روانیوں سے محفوظ رہیں گے۔

حکومت بین الاقوامی دباؤ کو کیسے سہہ سکے گی

پیمرا نے جیو پر پندرہ دن کی پابندی عائد کر دی اور ایک کروڑ کی ''خطیر رقم'' کا جرمانہ بھی لگا دیا جس کے جواب میں جیو نے پچاس ارب روپے کے ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ میڈیا کی آزادی اپنی جگہ قابل قدر اور ضروری ہے لیکن اسے قومی نظریے، قومی اداروں، قومی سلامتی اور قومی اقدار پر حملہ آور ہونے کا کوئی حق نہیں جبکہ آج میڈیا کسی نہ کسی طرح اپنی آزادی کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہ رویہ ایک دم سے نہیں ہوا بلکہ آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا اور اس آزادی پر فخر کیا جاتا رہا بلکہ اسے بہادری کا نام دیا جاتا رہا۔ معاشرتی برائیوں، معاشرے کی کالی بھیڑوں، رشوت اور بدعنوانی کے خلاف بات کرنا تو واقعی بہادری ہے لیکن جب بات افراد کی کی جائے اور نقصان اداروں کو پہنچایا جائے اور انہیں اس طرح سے ہدف تنقید بنایا جائے کہ نہ صرف ملک میں بلکہ پوری دنیا میں ان کی بدنامی ہو تو تب یہ قابلِ اعتراض ہے۔ جیو نیوز پر آئی ایس آئی کے خلاف چلنے والی خبر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس نے خود میڈیا کے اندر بیٹھے ہوئے محب وطن لوگوں کو جگایا تو جیسے سب کو احساس ہوا کہ اب تک بہت کچھ غلط ہو رہا تھا، ساتھ ہی عوام نے بھی جیو کے اس رویے اور الزام تراشی پر احتجاج کیا۔ اس کے بعد شائستہ واحدی کے مارننگ شو

پر عوام اور مذہبی طبقے نے بھی صدائے احتجاج بلند کی۔ یہ مارننگ شوز بھی کوئی آج کی بات نہیں ہیں ان میں ہماری اقدار اور مذہب کے خلاف عرصہء دراز سے بہت کچھ ہو رہا تھا، ضروری تو نہیں کہ منہ سے بولا جائے، کیا ہمارے ٹی وی چینلز میں پہنے جانے والے لباس خود ہمارے مذہبی اقدار کی نفی نہیں ہیں۔ ہمارے مختلف شہروں میں ہونے والے ڈریس شوز ہمارا میڈیا بڑے فخر سے دکھاتا ہے اور بڑے فخر سے اعلان کرتا ہے کہ حسیناؤں نے ریمپ پر جلوے بکھیرے لیکن سچ یہ ہے کہ ان جلوؤں کو دیکھ کر شریفوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ ہر چینل پر نہ صرف بھارتی فلموں کے بیہودہ گانے اور مناظر دکھائے جاتے ہیں بلکہ ان کے اشتہارات بڑے فخر سے دکھائے جاتے ہیں۔ ان کی ماڈلز جن مصنوعات کے لیے ماڈلنگ کر لیں وہ اسے اپنی کامیابی کی ضمانت تصور کرنے لگتے ہیں۔ یوں ہمارا میڈیا صرف منہ زبانی ہی اپنے نظریے کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ عملاً نفی کرتا ہے جس میں اب ہمارے سیاست دان بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں اور جو نظریے کی بات کرتا ہے اسے تشدد پسند ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے یا انھیں جنگ کا حامی قرار دیا جاتا ہے جبکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بھارت سے جنگ کی جائے اپنا نظریہ اپنی شناخت ہوتا ہے۔۔برصغیر کے مسلمانوں نے اسی نظریے کی بنا پر اپنا الگ ملک حاصل کیا تھا اور چھ دہائیوں تک اس بات پر فخر کیا جاتا رہا لیکن پھر میڈیا پر اس بات پر بحث شروع کر دی گئی اور جیو نیوز نے بالخصوص اور کھلم کھلا اس نظریے کی مخالفت شروع کی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا

لیکن ان بولنے والوں کے خلاف خاموشی چھائی رہی بلکہ یہ اینکرز خود کو بہادر اور بے لاگ کہتے رہے اور خود ستائشی کا ایک باقاعدہ پروگرام چلتا رہا۔ ہر اینکر اور رپورٹر تفتیشی افسر بن کر نئی سے نئی اور خفیہ سے خفیہ ترین معلومات کو طشت از بام کر کے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتا رہا۔

حامد میر پر حملہ تو ایک بہانہ بنا ورنہ فوج اور خاص کر آئی ایس آئی پر الزامات لگانا تو ایک معمولی کی کاروائی بن چکی تھی۔ عمر چیمہ کے اغواء کا الزام بھی آئی ایس آئی پر ہی لگا یا گیا اور سلیم شہزاد کے قتل کا بھی اور اجمل قصاب کو بھی پاکستان سے ہی ڈھونڈھ نکالا گیا۔ بھارت کی ترقی اور عظمت کو بھارتی میڈیا سے زیادہ جاذب بنا کر یہاں پیش کیا گیا۔ جب آئی ایس آئی کے سربراہ کو براہِ راست اقدام قتل کا مجرم بنایا گیا تو صدائے احتجاج بلند ہوئی لیکن اب بھی حکومت اس نیوز چینل کو درست ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وزراء کے بیانات میں تضاد خود حکومت کے تذبذب کا پتہ دیتا ہے۔ پیمرا کے پانچ ارکان کو تین بنا کر پیش کیا گیا جنھوں نے اس چینل کے خلاف فیصلہ دیا۔ پیمرا میں الگ بے ضابطگی کی گئی کہ اس کا قائم مقام چیئرمین لگایا گیا اور اس سے صرف پندرہ دن کی معطلی اور ایک کروڑ جرمانے کی مضحکہ خیز سزا سنوائی گئی۔

یہاں کئی سوالات جنم لیتے ہیں کہ حکومت میر شکیل الرحمان کے دباؤ میں کیوں ہے۔ یہ
تو عوام جانتے ہیں
کہ بھارتی ثقافت سے آلو گوشت کی مماثلت جناب نواز شریف ڈھونڈ ھتے ہیں تو پتنگ
بازی کی جیو نیوز۔ لیکن حکومت کو یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ اس میڈیا گروپ نے پچھلی
حکومت کو مسلسل دباؤ میں رکھا، عدالتوں کو اور چیف جسٹس کو اپنے مرضی کے مطابق
فیصلے کرنے پر مجبور کیا تو وہ آپ کے ساتھ بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔اور پندرہ دن کی
معطلی کی سزا وہ بھی ایسی کہ جس پر حکومت عمل درآمد نہیں کرا سکی عوام کو دھوکہ دینے
والی بات ہے اگر حکومت ایک میڈیا گروپ یا اس کے مالک یا اس کے ایک اینکر کے
آگے مجبور ہے تو یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ بین الاقوامی دباؤ کو سہہ سکے گی۔
مسئلہ پندرہ یا بیس دن یا کسی ایک میڈیا گروپ کی بندش کا نہیں بلکہ ایک ضابطہء کار کا
ہے کہ کیسے ملکی سلامتی اور اداروں کی ساکھ کو برقرار رکھا جائے اور کیسے ان کی عزت
کروائی جائے، کونسی معلومات کو نشر کیا جائے اور کونسی روکی جائے، کس قسم کے
ڈرامے اور شوز دکھائے جائیں اور انہیں قومی اور مذہبی ضابطہء اخلاق کا پابند بنایا
جائے اور میڈیا کو ایک حد کے اندر رکھا جائے۔ اس پابندی کا مطلب نہ تو صحافت اور
اظہارِ رائے کی آزادی پر حملہ تصور کیا جائے اور نہ ہی حکومت اس سے اپنے سیاسی
مقاصد حاصل کرے بلکہ اسے

خالصتاً قومی مفاد میں ہونا چاہیے۔ حکومت اس معاملے کو سنجیدگی سے لے اور اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیمرا کو زیادہ فعال بنائے۔ اس میں قومی سلامتی کے اداروں کے نمائندوں کو ماہرانہ رائے کے لیے شامل کرے یا ایسے لوگوں کو نمائندگی دے جو مخلص ہوں اور کاروبار پر قومی مفاد کو ترجیح دیں تو یقیناً میڈیا دوبارہ ایسی صورتحال سے دوچار ہونے سے بچ جائے گا اور قومی مفاد بھی آئندہ خطرے میں نہیں پڑے گا، بین الاقوامی طور پر بھی ہماری جگ ہنسائی نہیں ہوگی کیونکہ جو قومیں اپنے قومی مفاد پر سمجھوتہ کرتی ہیں کبھی بھی بین الاقوامی طور پر کسی عزت کے قابل نہیں سمجھی جاتیں۔

لہذا اگر ہمیں عزت دار قوموں کی صف میں کھڑا ہونا ہے تو اپنے اوپر کچھ نہ کچھ سختیاں اور پابندیاں خود لگانی ہونگی۔ اس کے لئے اگر حکومتی ضابطے ہیں تو پورے کرنے ہونگے ورنہ ہمیں خود ہی قومی اقدار اور قومی سلامتی کو مدِ نظر رکھ کر خود کو پابند کرنا ہوگا۔

دہشگردی۔۔۔ ہر ایک کو چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت

دہشت گردوں نے ایک بار پھر ایک حساس اور اہم ترین جگہ بلکہ پاکستان کی معاشی شہ رگ پر ہاتھ رکھا اور کراچی ائیر پورٹ پر حملہ کر دیا۔ ساری دنیا سے رابطے کے اس سب سے بڑے مرکز تک ان کی پہنچ کیسے ہوئی، کن راستوں سے وہ اندر پہنچے اور کیسے اس کے چپے چپے کی خبر رکھتے تھے کیا وہ یا ان کے گائیڈ عرصے سے یہاں کام کر رہے تھے کیونکہ ایسا حملہ بغیر تیاری کے تو ممکن نہیں۔ یہ سوال ضرور ہے کہ ایسا کیسے ہو گیا جبکہ وزارتِ داخلہ اور خفیہ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ اس بارے میں وارننگ دی جا چکی تھی بلکہ ایک سے زائد مرتبہ دی گئی تھی۔ بہر حال حملہ تو ہو گیا اور اس وقت موقع پر موجود اے ایس ایف کے جوانوں، پھر رینجر پولیس اور فوج نے آگے بڑھ کر خود کو موت کے سامنے کھڑا کر کے اور اسے گلے لگا کر جس طرح ائیر پورٹ کو بچانے کی کوشش کی یہ سب قابل ذکر بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ لیکن یہ قربانیاں کب تک دی جاتی رہیں گی کیا کبھی اس سلسلے کا اختتام بھی ہو گا کہ قوم سکون کا سانس لے اور ہر وقت کسی دہشتگردی کے خوف میں مبتلا نہ رہے جو گھر سے جائے واپس بھی آئے۔ سوال یہ بھی ہے کہ ان دہشتگردوں کے ہاتھ آخر ان حساس ترین مقامات کے بارے میں مکمل معلومات کیونکر آ جاتی ہیں۔ جی ایچ کیو جہاں داخلے

کے لئے آپ کو کئی پھاٹک اورچیک پوسٹیں عبور کرنی پڑتی ہیں یہ وہاں اندر پہنچ گئے۔ کامرہ، مہران بیس، مناواں پولیس ٹریننگ سکول، پشاور ائیر پورٹ اور اب کراچی ائیر پورٹ اورکیا خدا نخواستہ اب کوئی اور ایسا نشانہ باندھا جائے گا۔ ائیر پورٹوں کی سکیورٹی تو بڑھا دی گئی لیکن کیا ہماری بندر گاہیں محفوظ رہیں گی اس طرف بھی دھیان رکھنا پڑے گا اور خفیہ ایجنسیوں کی وارننگوں اور خبروں کو بھی سنجیدگی سے لینا پڑے گا۔ ہر ادارے اور اہم اور حساس مقام میں ملازمتیں دیتے وقت بھی انتہائی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور بعد میں نظر رکھنے کی بھی، کیونکہ یہ بات بھی بعید از امکان نہیں کہ کچھ ساتھی پہلے سے اندر موجود ہوں، گوگل ارتھ آپ کو وہ نہیں بتا سکتا جو ایک مخبر بتاتا ہے اور ہمارے حالات ہمیں ذرا سی بھی بے احتیاطی کی اجازت نہیں دیتے۔ جبکہ ہم مسلسل اپنی بے احتیاطیوں کی نظر ہو رہے ہیں، افغانستان اور ازبکستان ہم سے نہ تو زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور نہ ہی ان کی ایجنسیاں اور ٹریننگ ہم سے بہتر ہے پھر ان کے دہشتگرد ہمیں مات کیسے کر رہے ہیں۔ حکومت اور تمام ذمہ داران کو سوچنا چاہیے۔ اس حملے کے شواہد سے یہ بات مزید ثابت ہو چکی ہے کہ انہیں امداد وہی بھارت دے رہا ہے جس کے وزیراعظم کو ہمارے وزیراعظم خیر سگالی کے جذبات سے بھرپور خط بھیجتے ہیں اور پیشکشیں کرتے ہیں اور یہ جذبات اس وقت دکھائے جا رہے تھے جب کراچی کے ہوائی اڈے سے بھارتی ساختہ اسلحہ اور انجیکشن مل رہے تھے۔ اس سے دشمن کو کیا پیغام دینا

مقصود تھا کہ کیا تم کرتے جاؤ اور ہم برداشت کرتے رہیں گے۔ ہمارے حکمران، سیاستدان اور کرتا دھرتا ہر ایسے واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ ضرور فرماتے ہیں کہ ہمیں قربانیوں پر فخر ہے قوم کو بھی کراچی واقعے میں جانیں دے کر بڑے نقصان کو روکنے والوں پر فخر ہے لیکن ان کے لواحقین سے پوچھیے جن کے پیارے اس دہشتگردی کی نظر ہو جاتے ہیں اور سارے عمر یہ خاندان ان اندھیرے راستوں میں مرنے والے اپنے پیاروں کا سوگ مناتے ہیں حکومت کی بھارتی ہاتھ ملوث ہونے پر خاموشی بھی کافی معنی خیز ہے۔ ازبکٹ باشندوں کی شناخت ہونے کے باوجود شاہد اللہ شاہد کا ذمہ داری قبول کرنے کا بیان بھی یہ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے کہ تحریکِ طالبان نے کس کو بچانے کے لئے یہ بیان دیا اور یا وہ کس کس کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں یا کس کے اشارے پر پاکستان میں دہشتگردی کر رہے ہیں۔ حکومت اور سیاستدان بھارت اور طالبان کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے وقت ان شہیدوں اور ان غم زدہ خاندانوں کو ضرور اپنے ذہن میں رکھیں تاکہ وہ آئندہ ان کی بد دعا اور نفرت سے بچے رہیں۔

اس طرح کے واقعات پر قوم کی تشویش ایک قدرتی عمل ہے اور جہاں حکمران، سیاستدان، عدالتیں، ایجنسیاں، قانون نافذ کرنے والے ادارے کسی نہ کسی طرح ذمہ دار ہیں، ہمارا میڈیا بھی اس ذمہ داری سے مبرا نہیں ہے۔ براہِ راست نشریات اور سب سے پہلے خبر پہنچانے کے شوق میں مبتلا ہمارا میڈیا حفاظت اور

کامیابی کے عنصر کو ذہن سے ہی نکال دیتا ہے یہاں تک کہ سکیورٹی فورسز کہاں سے داخل ہو رہی ہیں اور کہاں تک پہنچ چکی ہیں تک بتا دیا جاتا ہے۔ایک آپریشن جسے انتہائی رازداری اور خفیہ طریقے سے ہونا چاہیے یوں طشت از بام کر دیا جاتا ہے کہ دہشتگردوں کے ماسٹر مائینڈ انہیں کسی بھی صورتحال سے مطلع رکھ سکیں اور وہ پہلے سے متعین کردہ دوسرے راستوں سے آگے بڑھ کر ہدف تک پہنچ سکیں اور اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔ظاہر ہے کہ یہ دہشتگرد اپنے ماسٹر مائینڈ سے مسلسل رابطے میں رہ کر ہدایات حاصل کرتے ہیں جبکہ ایسی براہِ راست کوریج کو صرف اپنی پولیس ، فوج رینجرز یا کسی بھی قانون نافذ کرنے والی قوت کے فائدے اور رہنمائی کے لئے ہونا چاہیے اور اس میں صرف دہشتگردوں کی پوزیشن اور موقع پر موجودگی کو ہی ظاہر کرنا چاہیے۔ ہاں عوام کی تسلی کے لیے اتنا بتانا ضروری ہے کہ فوج یا رینجرز نے آپریشن شروع کر دیا ہے اور کامیابی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔تفصیلات کو آپریشن کی کامیابی تک موخر کر دینا چاہیے اور ابتدائی یا حتمی تفصیلات اگر حکومت کا کوئی نمائندہ دے اور پوری ایمانداری سے دے تو عوام کا اعتماد قائم رہے گا لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہمارا میڈیا ان واقعات کو کسی جاسوسی ناول کے اتار چڑھاو کی طرح تجسس کے لیے پیش کرتا ہے اور حساس تنصیبات میں داخلے کے تمام ممکنہ راستوں کی پشین گوئیاں بھی کرتا رہتا ہے جو غیر ذمہ داری کی انتہا ہے۔کیونکہ یوں حملہ آوروں کی مطلوبہ کمک کی مسلسل رہنمائی جاری رہتی ہے

کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ دہشتگردوں کا پورا گروہ بیک وقت کسی جگہ میں داخل ہو جائے، کچھ لوگ ضرورت کے لئے باہر بھی موجود رہ سکتے ہیں۔ ان کے طریقہ واردات کی وضاحت بھی انتہائی خطرناک ہے جو دوسرے بدنیت لوگوں کو سہولت پہنچا سکتی ہے۔

ملک اس وقت انتہائی خطرناک حالات سے دوچار ہے۔ دہشتگردی، سیاسی ہلچل، حرص، لالچ، طمع، بے روزگاری یہ تمام عناصر ہیں جو ملک کے خلاف کام کرنے والے اندرونی اور بیرونی عناصر کے لئے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے ہر فرد اور گروہ کو چاہے سرکاری ہو یا ذاتی، انفرادی ہو یا اجتماعی، ہر سطح پر چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کہیں حکومتی سطح پر بے احتیاطی، کہیں بریکنگ نیوز کا شوق، کہیں خود ستائی کی خواہش اور کہیں مال وزر کی ہوس عوام کی زندگی اور ملک کی سالمیت اور سلامتی کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت ایک دوسرے پر طعنہ زنی اور تنقید کا بھی نہیں بلکہ اپنی غلطیاں تلاش کرکے درست کرنے کا ہے۔ ابھی کالم لکھتے لکھتے یہ خبر آئی ہے کہ اڈیالہ جیل پر تین کمانڈو تعینات کر دیے گئے ہیں، فوج کی تعیناتی کی خبر دینے تک تو درست ہے لیکن تین کی تعداد بتا کر کیا چالیس یا ساٹھ دہشتگردوں کو تیاری کا موقع دیا جا رہا ہے۔ حکومت سے لیکر میڈیا اور میڈیا سے لے کر ایک عام آدمی تک ہر ایک دیکھے اور سوچے کہ

وہ ملک کو کیا نقصان پہنچا رہا ہے اور اس ملک کے زخمی وجود میں برداشت کی اور کتنی ہمت باقی ہے۔ حکومت ، عدالت ، میڈیا ، قانون ساز اور قانون نافذ کرنے والے ادارے ، سیاستدان اور غرض ہر طبقہ اپنے جرائم خود تلاش کرے اور ان کو روک کر ان کا مداوا کرنے کی کوشش کرے اور اندرونی و بیرونی دوست دشمن کی پہچان کرلے تو یقیناً ہم اپنے مسائل پر قابو پانے میں کامیاب ہوجائیں گے انشاء اللہ۔

اے اللہ تو پاکستان کی حفاظت کر، اس کے مسائل حل فرما اور اسے ہمارے لئے جائے امن بنا دے ،آمین۔

یہ سب کچھ بلاشبہ اسلام کے لیے عظیم جذبے اور خدمت کی نیت سے کیے جاتے ہیں

دین کی تبلیغ و اشاعت کی اللہ تعالیٰ نے بڑی فضیلیت رکھی ہے اور ایسا کرنے والوں کے لیے بڑے اجر کی نوید بھی ہے اور اسی لیے ہمیشہ مسلمانوں نے اسے اپنا اولین فرض سمجھا ہے اور بصد احترام ادا کیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں نہ کبھی سستی کی گئی نہ کمی۔ آج بھی دنیا جتنی بھی ماڈرن ہو چکی ہے لیکن دین اسلام کے لیے وقت وقف کرنے والوں کی کمی نہیں۔ مخیّر حضرات اور ادارے بڑے احترام سے خوبصورت اسلامی کیلینڈر، سحر و افطار کے اوقات اور اوراد وظائف شائع اور تقسیم کرتے رہتے ہیں جو کئی گھروں میں خیر و برکت کا باعث بنتے ہیں۔ یہ سب کچھ بلاشبہ اسلام کے لیے عظیم جذبے اور خدمت کی نیت سے کیے جاتے ہیں لیکن بسا اوقات یہ سب کچھ کرتے ہوئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اکثر راستے میں چلتے ہوئے کسی اخبار کے ٹکڑے پر نظر پڑتی ہے جس میں کوئی قرآنی آیت، حدیث، مقامات مقدسہ کی کوئی تصویر یا کسی خوبصورت مسجد کا عکس صاف نظر آ رہا ہوتا ہے، کبھی تو میں اسے اٹھا کر کسی اونچی جگہ پر رکھ دیتی ہوں لیکن کبھی ایسا کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا اور ایک نا کردہ گناہ کا احساس لیکر اور تاسف کے ساتھ آگے بڑھنا پڑ جاتا ہے۔

اگر چہ کوشش پوری ہوتی ہے کہ ایسا نہ کروں اور ایسے میں ایک (غلط یا درست) سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ کیا ان آیات کو یوں چھاپ کر بے فکر ہونے والے لوگ درست ہیں۔ جس کثرت سے یہ آیات ، احادیث اور ادیا تصاویر شائع کی جاتی ہیں ان کو سنبھال کر رکھنا یا ان کو زمین پر گرنے سے بچانا نا ممکن ہے۔ ان آیات و احادیث کو چھاپنے والے اگر اس بات کو سوچیں کہ بجائے احترام کے خدانخواستہ کوئی بے حرمتی تو نہیں ہو رہی تو کتنا ہی اچھا ہو۔ اخبار والا اخبار کو یا تو گھر کے اندر پھینک دیتا ہے یا گیٹ کے نیچے سے سرکا دیتا ہے یعنی گھر کے اندر پہنچتے ہی وہ زمین پر پڑا ہوتا ہے جبکہ اُس میں پہلے ہی صفحے پر آیت کا ترجمہ موجود ہوتا ہے جو اگر ویسے زمین پر پڑا نظر آئے تو ہم اُسے اٹھا کر ''چوم کر'' آنکھوں سے لگا کر اونچی جگہ پر رکھ دیتے ہیں لیکن اس صورت میں ہم اس بارے میں سوچتے بھی نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ صرف پرنٹ میڈیا کے ساتھ نہیں ہے بلکہ موبائل میسجز بھی اس کی ایک مثال ہے جو بغیر تصدیق کے آگے بھیج دیئے جاتے ہیں جب کہ حدیث کی صحت اور درستگی انتہائی ضروری ہے یہاں تک کہ محدثین جھوٹے شخص کی بیان کردہ حدیث کو نہ تو تسلیم کرتے تھے نہ اپنی کتابوں میں شامل کرتے تھے۔ کچھ ایسے ایس ایم ایس بھی آگے بھیج دیئے جاتے ہیں جن میں دور نبوی کا کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا جاتا ہے لیکن جب تاریخ کھولی جاتی ہے تو اس واقعہ کا ذکر کسی کتاب میں موجود نہیں ہوتا۔

موبائل میسجز کو تو ڈیلیٹ کر دیا جاتا ہے لیکن اخبارات میں یہ بھی ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسا کوئی رواج اور بندوبست ہے اور نہ ہی یہ عملاً ممکن ہے کہ تمام کے تمام اخبارات ری سائیکل کیے جائیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اخبارات و رسائل سے کاغذ کے لفافے بنا دیئے جاتے ہیں جو چھوٹے دکاندار اپنا سودا سلف بیچنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور صارف چیز استعمال کرنے کے بعد اس لفافے کو پھینک دیتا ہے اور پھر یہی لفافے یا تو جوہڑوں اور گندے نالوں میں چلے جاتے ہیں یا کمیٹی والے انہیں ہر قسم کے گند کے ساتھ اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ یا تو جلا دیا جاتا ہے یا زمین میں دبا دیا جاتا ہے اور یوں ایک بار پھر بے حرمتی کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف انہی آیات و آحادیث کے اوپر، نیچے یا ساتھ ہی میں قابل اعتراض قسم کی تصاویر بھی لگا دی جاتی ہیں جبکہ ویسے ہم نماز اور قرآن پاک پڑھتے ہوتے تصاویر کی موجودگی کو درست نہیں سمجھتے لیکن یہاں ہمارے معیار بدل جاتے ہیں اور ہم بغیر سوچے سمجھے نہ صرف اسے قبول کر لیتے ہیں بلکہ قابل تعریف بھی گردانتے ہیں چاہے انہیں پڑھیں یا نہ پڑھیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اکثریت انہیں پڑھتی ہی نہیں۔ صرف خبریں، تجزیے، تبصرے، کالم اور مضامین پڑھ کر اخبار رکھ دیا جاتا ہے۔ ان تمام تحفظات کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ انہیں شائع نہ کیا جائے ضرور کیا جائے لیکن اخبار کے ہر صفحہ پر کچھ نہ کچھ شائع کرنے سے کیا یہ بہتر نہ

ہوگا کہ ایک مخصوص جگہ ان کو دی جائے تاکہ اخبار کے اس صفحہ کو الگ کیا جا سکے۔ ایک تجویز دینے والے نے یہ بھی تجویز دی کہ ہمارے یہ تمام ادارے جو ان آیات و احادیث کی اشاعت میں حصہ لیتے ہیں شہروں اور سڑکوں پر اونچے بل بورڈ پر انہیں لگا دیا کردیں یوں یہ ہر آنے جانے والے کی نظروں سے گزریں گے اور وہ ان تعلیمات سے فائدہ بھی اٹھا سکیں گے کئی شہروں میں ایسا ہے بھی لیکن اسے مزید بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔ جی ٹی روڈ اور موٹر ویز پر انہیں فاصلوں کے اونچے بورڈوں پر لکھا جا سکتا ہے یہاں ضروری نہیں کہ صرف سفر کی دعا لکھی جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات یا عقائد سے متعلق آیات اور حدیث اور اقوال بھی لکھے جا سکتے ہیں۔

دکانوں پر اگرچہ ابھی بھی آیات اور احادیث کے طغرے آویزاں ہوتے ہیں لیکن اگر خرید فروخت میں ایمانداری اور ناپ تول میں درستگی کے متعلق آیات و احادیث کو بجائے اخباروں کے بازاروں اور مارکیٹوں میں لگا دیا جائے تو وہ زیادہ موثر ثابت ہو سکتے ہیں کیوں کہ وہ موقع پر نظر آئیں گے اور نیچے گر کر خدانخواستہ بے حرمتی کا خطرہ بھی نہ رہے گا۔ ایک مسلمان کتنا ہی بے عمل کیوں نہ ہو مشکل اور تکلیف کے وقت اس کا آخری آسرا اور سہارا اللہ کا نام اور اس کی کتاب ہی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہسپتالوں میں آیات شفا جگہ جگہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس تکلیف کے وقت میں دلوں کی تسلی کا باعث

بنتے ہیں اس طرح نوٹ پر حصول رزق حلال عین عبادت ہے کا جملہ شاید کسی راشی کے دل پر اثر کرتا ہے۔ قرآن شریف یقیناًایک مکمل ضابطہ حیات ہے اسلام نے ہر مسئلے اور معاملے کے بارے میں ہدایت مہیا کی ہوئی ہے اگر ہم اسے ہر موقع پر استعمال کریں تو ہم ایک صالح معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں ہم اپنے شہروں، پارکوں اور سڑکوں کی گندگی کا گلہ بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھی صاف کرنے کی کوشش بھی۔ شاید اخبار میں دی ہوئی حدیث ہمیں ہر وقت یاد نہ رہے لیکن اگر صفائی سے متعلق آیات و احادیث کو پارکوں اڈوں، سڑکوں اور شہروں میں مناسب جگہوں پر خوبصورت بورڈز پر لگادیں تو زیادہ، موثر ثابت ہوں اور ان کو اتنا خوبصورت بنایا جائے کہ ہر بچے بڑے کی اس پر نظر پڑے یوں لوگوں میں صفائی کا شعور بھی اُجاگر ہوگا، دین میں اس کی اہمیت بھی، اور احترام بھی برقرار رہے گا۔ ان تجاویز سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ پرنٹ میڈیا اس ذمہ داری سے بری الذمہ ہوجائے بلکہ اسے ضرور اس کار خیر میں شامل رہنا چاہیے لیکن ذمہ داری کے ساتھ اور احترام کے جذبے اور اہتمام کے ساتھ تاکہ اگر یہ اخبارات و رسائل، لفافے والوں، ردی والوں یا بڑھی والوں کے پاس پہنچیں تو بے حرمتی کا خوف نہ ہو اور اگر کمیٹی والے کچرے کے ساتھ انہیں بھی ٹھکانے لگائیں تو ان میں یہ مقدس کلام شامل نہ ہوں۔ اور اگرچہ مشکل ضرور ہو گی لیکن تھوڑی محنت ثواب کی نیت سے کی جائے کہ صرف اِن مخصوص صفحات کو پڑھنے والا الگ کرتا رہے اور مہینے کے آخر میں ہاکر بل دیتے ہوئے اِن صفحات کو جمع کر لیا

کرے اور اس کاغذ کو ری سائیکل کرکے استعمال کر لیا جائے تو ہم ان آیات و احادیث کو زمین پر گرنے اور گندگی میں پہنچنے سے بچا سکتے ہیں۔

اللہ ہمیں اپنے دین کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری عملی زندگیوں میں شامل کرکے ایک مثالی اسلامی اور صالح معاشرے کی تشکیل میں ہماری مدد فرمائے آمین۔

آپریشن ضرب عضب۔۔۔آئی ڈی پیز ہمارے مہمان

آپریشن ضرب عضب شروع ہوااور ایک بار پھر لاکھوں پاکستانی اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ دہشت گردی نے جس طرح پوری قومی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا ہے اس سے مقابلہ کرنا کچھ آسان نہیں لیکن قوم جیسے تیسے اس مصیبت سے نبرد آزما ہے۔ یہ دہشت گرد ہر محاذ پر پاکستان کے خلاف مصروف کار ہیں اور ان کے مددگار مسلسل ان کی مدد پر کمربستہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ ایک حکومت اور ایک فوج کے خلاف دس پندرہ سال سے مسلسل لڑ رہے ہیں۔ لیکن اگر اب ان کے خلاف آپریشن شروع ہو چکا ہے تو قوم بجا طور قوی اُمید رکھتی ہے کہ یہ دہشت گردوں کے خلاف آخری معرکہ ہوگا اور اس کے بعد کبھی پھر یوں لاکھوں پاکستانی اپنا گھر بار چھوڑ کر شدید ترین موسم میں ننگے سر اور بھوکے پیٹ رہنے پر مجبور نہ ہونگے اور نہ ہی رمضان کا مقدس مہینہ یوں در بدر گزرے گا۔ شمالی وزیرستان سے بنوں اور پاکستان کے دیگر شہروں میں ہجرت کرکے آنے والے یہ آئی ڈی پیز دراصل پورے پاکستان کی خاطر بے گھر ہوئے ہیں اوراِن کی مدد کرنا ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہمارے مخیّر حضرات فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور ایک عام آدمی بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر ضرورت مند کی مدد کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم بڑے حادثات اور مشکلات سے اپنی مدد آپ کے تحت ہی

گزر جاتے ہیں۔ اب بھی آئی ڈی پیز کے لیے امدادی سامان کے ڈھیر اس بات کا ثبوت ہیں، لیکن یہ لوگ لاکھوں میں ہیں اور اب تک تقریباً پانچ لاکھ اپنا گھر بار چھوڑ چکے ہیں جن میں سے بہت سے تو کرایے کے گھروں میں رہ رہے ہیں لیکن ایک بڑی اکثریت کیمپوں میں بھی موجود ہے جو اس شدید گرمی کے موسم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ فوج مسلسل ان کے راشن اور دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے کوشاں ہے جس میں دوسرے ادارے اور افراد بھی شامل ہیں، ان میں ایک نمایاں نام بحریہ ٹاؤن کے مالک ملک ریاض کا ہے جنھوں نے ایک خطیر رقم کے عطیے کے ساتھ ماڈل آئی ڈی پی کیمپ بنانے کی بھی پیشکش کی ہے اور ان کے کھانے کے لیے مفت دستر خوان پروگرام بھی چلا رہے ہیں اسی طرح ہر ایک اپنی اپنی بساط کے مطابق لگا ہوا ہے تاہم اصل ذمہ داری وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی ہے کہ وہ اِن لوگوں کی اس طرح سے دیکھ بھال کرلے کہ ان میں سے اگر کسی کے دل میں حکومت کے خلاف اور طالبان کے حق میں کوئی معمولی جذبات بھی ہوں تو ان کو ختم کیا جاسکے اور انہیں یہ احساس تحفظ حاصل ہو کہ ان کی حکومت ان کی حفاظت کر سکتی ہے اور اُن کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہے۔ یہ وقت سیاسی پوائینٹ سکورنگ کا نہیں ہے بلکہ عملی کام کرنے کا ہے لیکن حیرت ہے کہ ایک انتہائی اہم آپریشن جاری ہے لاکھوں لوگ بے گھر ہیں پھر بھی ہمارے سیاست دان آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور کہیں کہیں سے تو یہ آواز بھی آتی ہے کہ آپریشن ضرب عضب کے لیے ہمیں پہلے مطلع نہیں کیا گیا اگرچہ ابھی تک کسی نے اس

آپریشن کے ہونے پر اعتراض نہیں کیا ہے تاہم اس طرح کی باتوں سے غلط فہمیاں ضرور پھیلتی ہیں اور حیرت ہے کہ ملک میں ملکی سلامتی سے متعلق ایک بہت اہم معاملہ چل رہا ہے لیکن ہمارا میڈیا بھی سیاست دانوں کی آپس کی چپقلشوں کو زیادہ وقت دے رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپریشن میں پاک فوج کی کامیابیوں کو زیادہ وقت دیا جائے تاکہ قوم کا مورال بلند ہو۔ مجھے اس بات سے بھی اختلاف ہے کہ آپریشن کی ہر تفصیل بیان کی جائے لیکن ایسے وقت میں ترجیحات کا تعین ضروری ہے اور خاص کر ہمارے سیاستدانوں کے لیے کہ وہ یہ سوچ لیں کہ زیادہ اہم حکومت کا حصول ہے یا ملک کی سلامتی اور دہشت گردی کی عفریت سے نجات اور ساتھ ہی آئی ڈی پیز کی دیکھ بھال ۔ اس وقت جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ ان کی مدد ہے اور حکومت کو اپنی زیادہ تر توانائی ادھر لگانے کی ضرورت ہے جس کے لیے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی مدد لی جائے اور فنڈز اکھٹے کیے جائیں ۔حکومت نے جو بارہ ہزار روپے فی خاندان دینے کا اعلان کیا ہے ان کی درست تقسیم کو یقینی بنایا جائے اور یہ بھی سوچا جائے کہ کیا اس موسم میں کیمپوں میں رہنا ممکن ہے ،اگر نہیں تو پھر کیا اِن پیسوں میں کرایہ کا گھر لینا ممکن ہے اور اس کیساتھ ہی کاروبار زندگی بھی چلایا جائے اور یہ بھی یاد رہے کہ اس علاقے میں، خاندان ماں باپ سمیت پچیس تیس لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے تو کیا بارہ ہزار روپے اس کے لیے کافی ہیں ۔ ہماری حکومت اگر اپنے اخراجات میں کٹوتی کرے تو وہ اپنے اِن مہمانوں کی زیادہ بہتر خاطر

تو اضح کر سکتی ہے لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ حکومت نہ تو حکومتی حیثیت میں اور نہ ہی حکومتی عہدے دار اپنی ذاتی حیثیت میں کسی فکر میں مبتلا نظر آ رہے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے وزیراعظم جو پاکستان کے امیر ترین لوگوں میں سے ہیں نے اپنے پورے خاندان کی طرف سے ایک کروڑ کی رقم دی ایک عام پاکستانی کے لیے تو یہ واقعتاً ایک بہت بڑی رقم ہے اکثریت نے تو کبھی اتنی بڑی رقم دیکھی بھی نہیں لیکن جناب وزیراعظم صاحب آپ تو۔۔۔۔۔۔۔ اور ہمارے کوئی اور عظیم صنعت کار حکومتی رکن تو کہیں نظر ہی نہیں آ رہے۔ چلئے یہ تو ذاتی حیثیت میں بات ہوئی حکومتی حیثیت میں بھی فوٹو سیشن ہو تو ہو لیکن انتظام اور بندوبست بھی ہونا چاہیے کوئی ماڈل قسم کے کیمپ بنائے جائیں جن میں اِن لوگوں کو کم از کم گرمی کی شدت سے ہی بچایا جائے۔ ان پانچ لاکھوں لوگوں میں ایک دو لاکھ بلکہ اس سے زیادہ ہی بچے ہوں گے کیا وہ موسم کی شدت کا مقابلہ کر سکیں گے کیا اِن دنوں گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند سکول اس مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے جہاں کم از کم بجلی کے پنکھے تو میسر ہوں۔ حکومت اس وقت اگر آپریشن اور آئی ڈی پیز کو اپنی پہلی ترجیح قرار دے دے تو زیادہ بہتر ہوگا اور خدارا ان کے لیے وصول ہونے والے عطیات کو شفاف طریقے سے انہی تک پہنچایا جائے اسے کہیں اور نہیں جانا چاہیے اور یہاں ایک اور ضروری عرض یہ بھی ہے کہ غیر ملکی این جی اوز پر بھی نظر رکھیے یا تو ان کی امداد حکومت یا فوج کے حوالے کی جائے اور یا فوج کی نگرانی میں یہ لوگ امداد تقسیم کریں

تاکہ کوئی اور مسئلہ سر نہ اٹھا سکے اور امداد کی آڑ میں یہ این جی اوز کسی اور یجنڈے کی تکمیل نہ کر سکیں۔ حکومت اور سیاست دان اپنے اُن مسائل کو جو اگر تاخیر سے بھی حل ہوں تو ملکی سلامتی پر کوئی اثر نہیں پڑتا کو پیچھے ڈال کر اس فوری مسئلے کو اہمیت دیں تو عوام ان کے مشکور ہوں گے کیونکہ یہ آپریشن ملکی سلامتی کے لیے ہو رہا ہے اور یہ آئی ڈی پیز ملکی بقاء کے لیے اپنے گھر چھوڑ کر نکلے ہیں اس لیے انہیں یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے کہ وہ تنہا نہیں ہیں اس ملک کا ہر فرد ان کی تکلیف محسوس کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہے اور یہ دعا کر رہا ہے کہ یہ لوگ واپس اپنے گھروں میں جلد از جلد آباد ہوں۔ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے اور ہمیں اس کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے، آمین

۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ یعنی نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔ اور اس زکوۃ کو خیر اور فلاح کے لیے استعمال کرکے معاشرے کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنایا غریب کو امیر کے مال میں حصہ دار قرار دیا اور یہ حصہ اتنا رکھا کہ امیر اسے بوجھ محسوس نہ کرے اور غریب اس سے اپنی کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتا رہے۔ زکوۃ ہر صاحب نصاب مسلمان پر فرض ہے۔ سونا، چاندی، غلہ ، مال مویشی، نقد رقم سب کے لیے اس کا نصاب اسلام نے مقرر کر دیا ہے اور یوں کسی بھی شعبے میں خوشحال فرد معاشرے کی فلاح میں اپنا حصہ ڈالنے کا ذمہ دار بن جاتا ہے اور غریب کی طرف سے بجائے حسد اور دشمنی کے ،برادرانہ جذبات اُبھرتے ہیں لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ رقم اصل مستحقین تک پہنچے۔ لیکن ہم یہ سوچے بغیر جب اپنی زکوۃ کسی کے بھی حوالے کر دیتے ہیں تو گویا ہم نے دین کے اس اہم رکن کو سمجھا ہی نہیں اور اس کو اس کی اصل روح کے ساتھ عبادت سمجھ کر ادا ہی نہیں کیا۔ میں نے اپنے پچھلے کالم میں رمضان شروع ہوتے ہی گداگروں کی یلغار کے بارے لکھا تھا جو مذہبی جذبات کو ابھار کر رمضان کا واسطہ دے کر خیرات صدقات اور زکوۃ مانگتے نہیں بلکہ چھیننے پر اتر آتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا وہ کون ہیں صرف یہی نہیں رمضان میں تو

مختلف تنظیموں اور اداروں کے کارکن بھی زکوٰۃ اکٹھی کرنا شروع کر دیتے ہیں جن میں کچھ تو جانے پہچانے ہیں لیکن ہر روز نئی نئی تنظیمیں اپنی رسید بک کے ساتھ آپ کے دروازے پر موجود ہوتی ہیں جو اس سے پہلے آپ نے نہیں سنی ہوتی تو آخر وہ کون ہیں۔ ایک اطلاع یہ ہے کہ اِن میں کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو دہشت گرد تنظیموں کی مدد کے لیے یہ چندے اور زکوٰۃ اکٹھی کرتے ہیں اور فلاحی تنظیموں کے نام سے خود کو رجسٹرڈ کرتے ہیں کراچی میں ایک ایسی ہی تنظیم کا انکشاف ہوا اور اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ صرف ایک تنظیم تک محدود ہیں یا رہیں گے تو حماقت ہو گی زکوٰۃ کی یہ رقم کچھ تنظیمیں جہاد کے نام پر بھی اکٹھی کرتی ہیں اور کچھ مدارس بھی یہ کام کر رہے ہیں۔ مدارس کو زکوٰۃ دینے میں کچھ حرج نہیں لیکن یہ زکوٰۃ صرف اُن مدارس کو دی جائے جن کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ کسی منفی سرگرمی میں ملوث نہیں بلکہ صرف اور صرف بچوں کو دینی تعلیم دے رہے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی مدرسے کے نام پر زکوٰۃ مانگ لی جاتی ہے جو نہ صرف فرقہ واریت پھیلاتے ہیں بلکہ صرف اپنے نکتۂ نظر کو ہی عین اسلام سمجھ کر دوسرے کو کافر قرار دے دیتے ہیں۔ مدرسہ ہمارے مذہب اور معاشرے کا اہم حصہ رہا ہے جو نہ صرف مذہبی تعلیم دیتے رہے ہیں بلکہ غریب بچوں کو خوراک اور رہائش کی سہولت بھی فراہم کرتے رہے ہیں اور اسی لیے انہیں دل کھول کر زکوٰۃ اور صدقات ملتے رہے اور اب بھی ایسا ہو رہا ہے، لیکن ملکی حالات، دہشت گردی اور شدت پسندی نے ان اداروں کو بھی نہیں چھوڑا اور

اِن چند ایسے مدرسوں کی وجہ سے ہر مدرسہ مشکوک معلوم ہوتا ہے اس لیے پہلے پورا یقین کر لینا چاہیے کہ جس مدرسے کو زکوۃ دی جا رہی ہے وہ کسی ایسی سرگرمی میں تو ملوث نہیں کہیں وہ رقم جو اللہ رب العالمین نے خیر اور فلاح کے لیے دولتمند مسلمان کے اوپر فرض کی وہ خود کش جیکٹ بنانے میں تو استعمال نہیں ہو رہی جو انسانوں کی بھلائی کی بجائے ان کی ہلاکت کا باعث بن جائیں۔ زکوۃ دینے کے لیے مستحسن یہی ہے کہ اسے اپنے آس پاس رہنے والے بلکہ پہلے تو اپنے غریب رشتہ داروں کو دیا جائے جو اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی بمشکل رکھتے ہیں جو مانگ نہیں سکتے لیکن آپ اُن کی ضرورت محسوس کر سکتے ہیں اگر سچ پوچھا جائے تو یہ اس سے بھی بہتر ہے کہ آپ یہ زکواۃ کسی ایسے ادارے کو دیں جن کے بارے میں آپ یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ رقم کہاں جائے گی۔ ہماری کچھ سیاسی جماعتیں بھی زکوۃ اور چندے اکٹھے کرتی ہیں لیکن زیادہ تر یہ رقم اپنے چند کارکنوں میں ہی تقسیم کر دی جاتی ہے جب کہ مستحقین اس سیاسی جماعت سے باہر بھی ہوتے ہیں اور زیادہ مستحق ہوتے ہیں زیادہ تکلیف میں ہوتے ہیں زیادہ ضرورتمند ہوتے ہیں لیکن چونکہ اُن کا اُس سیاسی جماعت سے تعلق نہیں ہوتا لہذا وہ کسی مدد کے حقدار نہیں ٹھہرتے جبکہ اللہ نے یہ رقم کسی بھی مستحق کا حق قرار دیا ہے کسی سیاسی فائدے کے لیے نہیں اور نہ ہی دنیاوی نمود و نمائش کے لیے بلکہ اس کا اصل مقصد معاشرے میں بھلائی اور توازن ہے لیکن آج کے دور میں اسے لیڈری چمکانے کے لیے بھی استعمال کیا

جارہا ہے۔ زکوۃ، چندے، خیرات لوگوں سے لے لیے جاتے ہیں اور انہیں سیاسی فائدے کے لیے اور اپنے ذاتی نام و نمود کے لیے استعمال کر لیا جاتا ہے جبکہ اِن کے بارے میں عوام کو کسی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا جاتا کہ کتنی رقم جمع ہوئی اور کتنی کہاں خرچ کی گئی یہاں تک کہ بینکوں میں کٹنے والی زکوۃ کہاں گئی زکوۃ دینے والا نہیں جانتا اور نہ پُریقین ہے کہ یہ زکوۃ کسی ایسے ہی کام میں صرف ہوئی جس میں ہونی چاہیے تھی۔ ایک سکول ٹیچر کی ایک ماہ کی تنخواہ جو تقریبا سولہ ہزار تھی میں سے زکوۃ کاٹ لی گئی اب اس مسئلے پر علماء کو سوچنا چاہیے کہ ماہانہ سولہ ہزار تنخواہ لینے والا کیا خود مستحق زکوۃ نہیں اور اس سے کٹنے والی زکوۃ کہاں گئی حکومت اسے کن کاموں میں استعمال کر رہی ہے۔ حکومت کے بارے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ رقم ملک دشمن سرگرمیوں میں استعمال نہیں ہو رہی تاہم بیت المال کو بھی جوابدہ ہونا چاہیے اور عوام کو سال میں ایک بار ہی سہی اِن کاموں کی تفصیل جاننے کا حق ہے جو اِس رقم سے کیے گئے۔

عوام کو ان تنظیموں اور اداروں کو زکوۃ دینے سے پہلے ہزار بار سوچنا چاہیے جن کا کسی دہشت گرد تنظیم سے تعلق یا صرف ہمدردی بھی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں تو تعاون کا حکم دیتا ہے لیکن حکم ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الِاثْمِ وَالعُدْوَانِ یعنی گناہ اور

.برائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مددمت کرو اور جو لوگ جہاد کے نام پر یہ زکوۃ اکٹھی کر رہے ہیں انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ نے جہاد کا حکم کن حالات میں اور کب دیا ہے اور اس کا اعلان کون کرتا ہے ہاں جب یہ غیر مسلموں کے خلاف ہو تو اس کا کرنا عین فرض ہے اور پھر مسلمان صرف زکوۃ نہیں بلکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقلید میں اپنا پورا گھر اور کل اثاثہ حاضر کر دیتے ہیں اور اسے نماز کی طرح اپنا فرض سمجھتے ہیں اس کی مثال 1965 کی جنگ ہے جب پاکستانیوں نے اپنے فوجیوں کی مدد کے لیے اپنے جان و مال حاضر کر دیئے تھے کیونکہ وہ کفر و اسلام کی کھلی جنگ تھی ۔لیکن یہ تنظیمیں جس جہاد کا نام لے کر پیسے بٹورتی ہیں وہ سڑک پر چلتے ہوئے بے گناہ راہگیر، مزدور، بچے، عورت اور بوڑھے کے خلاف ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے جنگ میں بھی ہاتھ اٹھانے سے منع فرمایا ہے اور جن جانوں کو اللہ تعالیٰ نے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے انہیں قتل کرنا کیسے جہاد ہو سکتا ہے۔ وہ یہ پیسہ ریاست کے خلاف بغاوت پر استعمال کرتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ریاست کے خلاف بغاوت سے تب تک منع فرمایا ہے جب تک وہ صریح کفر نہ کرے۔ ''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بلایا اور ہم نے آپ ﷺ سے بیعت (عہد) کی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ جن باتوں کا حضور ﷺ نے ہم سے عہد لیا اُن میں یہ بھی تھا کہ ہم خوشی و ناگواری تنگی اور کشادگی اور اپنے اوپر ترجیح دیے جانے میں اطاعت و

فرمانبرداری کریں اور یہ کہ حکمرانوں کے ساتھ حکومت کے بارے میں اُس وقت تک جھگڑا نہ کریں جب تک صاف کفر نہ دیکھ لیں جس کے لیے ہمارے پاس دلیل و برہان ہو'' تو پھر اِن تنظیموں کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون خود بھی گناہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ زکوۃ نیکی فلاح اور خیر ہے اور اسے حکومتی تنظیمی یا ذاتی سطح پر صرف بھلائی اور خیر کے لیے استعمال ہونا چاہیے کسی بغاوت، کسی شر یا کسی برائی کے لیے نہیں حتیٰ کہ حکومتی اخراجات کے لیے بھی نہیں اور اسے دیتے ہوئے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اسے اس کی روح یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق ہی استعمال کیا جائے گا اس کی اصل مستحقین تک پہنچ کا یقین ہونا چاہیے کسی دوسرے مقصد یعنی بغاوت سیاست یا ذاتی نمود و نمائش کے لیے اسے کسی طور بھی استعمال نہیں ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ کا حکم اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ادا ہو تو فرض تب ہی پورا ہوتا ہے۔

سوال ہے بابا!

جہاں ہمارے معاشرے میں کئی دوسرے ناسور پھیلے ہوئے ہیں وہیں ایک گداگروں کی یلغار ہے جو بازاروں، مارکیٹوں، چوراہوں ہر جگہ پر آپ کو نظر آتے ہیں اور رمضان شروع ہوتے ہی تو یہ تعداد ایک دم سے دگنی ہو جاتی ہے۔ آپ پھل والے سے بھاؤ تاؤ کر رہے ہوں، سبزی والے کے پاس کھڑے ہوں، کپڑے کی دکان پر ہوں یا کسی ٹریفک سگنل کے کھلنے کا انتظار کر رہے ہوں آپ کو کہیں بھی کوئی کام سکون سے کرنے کا موقع میسر نہیں ہوتا بلکہ یہاں تک کہ جلدی جلدی افطاری بناتے ہوئے گھنٹی بجی اور میں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گیٹ پر دیکھا تو ایک عورت کھڑی اپنی بیٹی کی شادی کی خبر دیتے ہوئے کچھ مدد مانگ رہی تھی۔ اور یہ حال ہے ایک اسلامی ملک کا جس کے نبی ﷺ کے پاس جب ایک مانگنے والا آیا تو آپ ﷺ نے اُسے بھیک دینے کی بجائے اُس کا کمبل اور پیالہ بیچ کر اُس کو دو درہم دیئے کہ ایک سے کھانے پینے کا بندوبست کرے اور دوسرے کی کلہاڑی خرید کر لکڑیاں کاٹ کر بیچے اور یوں اس کو ایک کاروبار میں لگا دیا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج ہمارے ملک میں نہ تو حکومتی سطح پر اور نہ عوامی سطح پر کوئی ایسی کوشش نظر آتی ہے کہ جس میں اِن گداگروں کو کسی کام پر لگایا جا سکے۔ دراصل گداگری کا اب ضرورت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ایک باقاعدہ پیشے کی صورت میں اختیار کر چکی ہے اور

پورے کے پورے خاندان اس پیشے سے وابستہ ہیں اور اس میدان میں آپ کو کافی ورائیٹی بھی نظر آتی ہے۔ راولپنڈی صدر میں ایک مانگنے والے نے انگریزی میں سیکھے ہوئے جملے بول کر بھیک مانگی تاکہ خود کو پڑھا لکھا بے روزگار مظلوم نوجوان ثابت کر سکے لیکن جب اُس سے مزید انگریزی بولی گئی تو اُس کے پاس جواب نہ تھا کیونکہ وہ پیشہ ور گداگر تھا پڑھا لکھا بے روزگار نہیں۔ پشاور کے ایک ہسپتال میں ایک گداگر سے ملاقات ہوئی جس کے بازو انتہائی بُری طرح مڑے ہوئے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کے حکم اور پھر پولیس کی دھمکی پر جب اُس نے بازو اور گردن سیدھی کی تو وہ ایک لمبا تڑنگا صحتمند نوجوان تھا۔ چوکوں چوراہوں اور ٹریفک اشاروں پر نوجوان عورتیں ننھے بچے گود میں لیے ہوئے یا لٹائے ہوئے تو انتہائی عام ہیں اور معلوم نہیں ان بچوں کو کیا دے کر سلایا جاتا ہے کہ یہ پورا پورا دن نہیں جاگتے اور نہ جنبش کرتے ہیں۔ یہ تو گداگروں کی چند اقسام ہیں ورنہ تو آپ کو ہر قسم، ہیت، طور طریقے کے گداگر نظر آئیں گے روتے دھوتے بھی، دہائیاں دیتے بھی اور دعائیں بد دعائیں دیتے بھی۔ اور شعبان شروع ہوتے ہی یہ ایک یلغار کی صورت میں آپ پر پل پڑتے ہیں اور اسے زکوۃ کا مہینہ قرار دے کر آپ کی جیب کی آخری پائی تک نکالنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ رمضان اور عید میں جیسے منافع خوروں کی چاندی ہو جاتی ہے اِن بھکاریوں کی بھی ٹولیوں کی ٹولیاں بھی نکل آتی ہیں اور جہاں دکاندار گاہکوں کو مہنگے داموں لوٹتے ہیں وہیں یہ گداگر ہر راگیر کو جذباتی طور

پر لوٹ کر ان کی جیبیں خالی کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں یوں یہ پیشہ ور بھکاری اِن مقدس مہینوں کے تقدس کو مجروح کرتے رہتے ہیں ۔اللہ کے رسول ﷺ نے دینے والے ہاتھ کو لینے والے ہاتھ سے بہت بہتر قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوالی کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ لوٹانا اللہ کو کسی طرح پسند نہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہر ہاتھ لینے کے لیے ہی آگے بڑھے اور یہ بھکاری اصل ضرور تمندوں اور حاجتمندوں کا حق مار لیتے ہیں۔ اسلام سفید پوش ضرور تمند کی ضرورت کو اس کی عزت نفس مجروح کیے بغیر پوری کرنے کی نہ صرف ہدایت دیتا ہے بلکہ اس کی تاکید کرتا ہے ۔ وہ صدقات خیرات اور زکوۃ کو پسند کرتا ہے بلکہ زکوۃ کو تو ہر صاحب نصاب مسلمان پر فرض کیا گیا تاکہ معاشرے کے غریب لوگوں کو بھی باعزت طور پر زندگی گزارنے کے قابل بنایا جائے۔ صدقات اور خیرات کے ذریعے بھی دولتمند کے دل میں ضرور تمند کی ضرورت کا احساس ڈالا گیا ہے لیکن اِن تمام کا مقصد خدانخواستہ ہر گز لوگوں کو سوالی بنانا نہیں بلکہ اِن سے معاشرے میں ایک توازن پیدا کرنا ہے،
دولت کو گردش میں رکھنا ہے اور غربت کا خاتمہ کرنا ہے نہ کہ وقتی ضرورت کو پورا کرنا۔ لیکن حیرت تو اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ اس مسئلے کو کبھی کسی حکومت نے اہمیت نہیں دی نہ انہوں نے کبھی اِن گداگروں کو کسی تعمیری سرگرمی میں یا کسی کام میں لگانے کی کوشش کی۔ کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اِن میں کہیں کوئی غیر ملکی، کوئی جاسوس، کوئی دہشت گرد یا کوئی ملک دشمن تو

نہیں جو یہ چولے پہنے ملنگ کا روپ دھارے بظاہر راگیروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں کیا اِن کے لیے یہ بہت آسان نہیں کہ وہ اپنے حلیے کا فائدہ اٹھالیں۔ اِن میں بہت سے اٹھائی گیر اور چور اچکے بھی ہوتے ہیں جو بھیک مانگنے کے بہانے گھنٹی بجاتے ہیں اور گھر والوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ گداگری ایک لعنت ہے جو محنت کی ضد ہے اور جب معاشرے میں سے محنت ختم ہو جائے تو معاشرے مردہ ہو جاتے ہیں وہ اپنا وقار اور عزت کھو دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہی رویہ قومی سطح پر منتقل ہوتا جاتا ہے اور عالمی سطح پر بھی بے وقعتی ملک و قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔ حکومت کو اس مسئلے کی طرف توجہ دینا چاہیے اور اسے سیکیورٹی کے نکتہِ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے اور معاشرتی.برائی کے پس منظر و پیش منظر میں بھی۔ اس لعنت سے چھٹکارے کے لیے کوئی قانون سازی بھی ہونی چاہیے ان کے گروہ اور بھکاری خاندان قانون کی زد میں ضرور آنے چاہیں۔ یہ لعنت غربت سے متعلق نہیں بلکہ یہ ایک پیشہ ہے جسے پورے کا پورا خاندان اپناتا ہے خاندان کے کچھ افراد اگر ٹریفک سگنل کے ایک طرف کھڑے ہوتے ہیں تو کچھ دوسری طرف۔ ایک ایسی ہی بچی سے جب پوچھا کہ دوسری طرف کھڑی ہوئی عورت تمہاری کیا لگتی ہے تو اس کا بچپن بول گیا اور اس نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ اُس کی ماں ہے یعنی ایک ہی چوک پر ایک ہی خاندان کے ثابت شدہ دو افراد ''بر سر روزگار'' تھے اور وہ بھی بغیر کوئی محنت کیے پانچ سو ہزار ایک ہی دن میں کما رہے تھے ظاہر ہے کہ مزید مزدور ''بھی ادھر ہی'' مزدوری

کر رہے ہوں گے اور وہ اصل مزدور جو سارا دن چونا گارا اٹھاتا ہے وہ توترس ترس کر کھائے اور یہ لوگ رات کو بھرے کشکول لے کر جائیں۔ یہ پیشہ ور بھکاری حکومت کے لیے ایک چیلنج ہیں جو اللہ کے نام پر مانگ مانگ کر جذباتی طور پر لوگوں کو مشتعلکرکے لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں یہ سب باتیں ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے حکومت بھی، حکومتی اہلکار بھی، پولیس بھی، عدالت بھی، قانون بنانے والے بھی اور نافذ کرنے والے بھی پھر بھی یہ یوں سر عام دندناتے ہوئے کیسے پھرتے ہیں کیسے مذہبی جذبات سے کھیلتے ہیں انسانی ترحم کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مقدس مہینوں کا تقدس خاص طور پر، پامال کرتے ہیں محنت کے بغیر کھاتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں۔ یہ سب تقریبا جرم کے زمرے میں بھی آتا ہے سوال تو بہت ہیں لیکن سوال یہ بھی ہے بابا کہ آخران کو کوئی پوچھنے والا کیوں نہیں کیا حکومتیں صرف حکومت آنے اور جانے کی فکر میں مبتلاء رہتی ہیں اور انہیں معاشرے سے کوئی سروکار نہیں کہ یہاں تو بہت ساری.برائیاں ہیں آخر کس کس کو ختم کیا جائے اس لیے رہنے ہی دو لوگ جانیں معاشرہ جانے اور اس میں پھیلی ہوئی.برائیاں جانیں۔

یواین مبصر گروپ کو بھارت چھوڑنے کا حکم

کشمیر وادی جنت نظیر لیکن اس کی بد قسمتی کہ اس کی سرحدیں بھارت جیسے مکار ذہنیت ملک سے ملتی ہیں جس کی آٹھ لاکھ فوج اس خطے اور اس کے باسیوں کی قسمت کی مالک بنی ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ اور عالمی طاقتیں ہر سال یہاں مسلمانوں کا قتل عام دیکھتی ہیں اور خاموش رہتی ہیں جبکہ یہی لوگ ایسٹ تیمور اور ساوتھ سوڈان کی چند لاکھ آبادی کو مذہب کے نام پر آزادی دینے کے لیے حامی و مددگار بن جاتے ہیں اور انہیں آزادی دے کر دم لیتے ہیں۔ لیکن اقوام متحدہ چھ دہائیوں سے کشمیر کا مسئلہ حل نہیں کر سکا ہے کیونکہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا ورنہ نہ تو یہ مسئلہ مذہبی طور پر پیچیدہ ہے کہ یہاں کی 77% آبادی مسلمان ہے اور نہ علاقائی طور پر یہ خطہ پاکستان سے الگ ہے۔ تقسیم ہند کے فارمولے کے مطابق ہر ریاست کی طرح اسے بھی حق حاصل تھا کہ پاکستان یا بھارت جس میں شامل ہونا چاہے، ہو جائے اور کشمیر کی مسلمان سیاسی قیادت نے تو یہ فیصلہ 19 جولائی 1947 کو ہی کر لیا تھا کہ پاکستان سے ہی الحاق کیا جائے گا لیکن ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کی جانبداری اور خواہش پر لاکھوں کشمیریوں کی خواہش کو قربان کر دیا گیا اور اُس نے بھارت سے الحاق کا اعلان کر لیا، اگر پوچھا جائے کس بنیاد پر تو جواب صرف ایک ہوگا کہ ریاست کی اکثریت نہیں بلکہ راجہ کی خواہش اور

ایک راجہ کے مذہب کو لاکھوں لوگوں پر ترجیح دی گئی اور اس طرح پاکستان کے وجود میں آتے ہی اس کے لیے مشکلات کھڑی کر دی گئیں۔ بھارت نے کشمیر کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا جس میں سے آزاد کشمیر کا علاقہ پاکستان نے ایک کھلی جنگ کے بعد آزاد کرالیا۔ صورت حال دیکھ کر بھارت نے اقوام متحدہ سے مدد کی درخواست کی اور اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل نے اپنی قرار داد نمبر 39 کے ذریعے ایک کمشن بنایا تاکہ معاملے کی چھان بین کرے جبکہ بعد میں 1948 میں بھارت ہی اقوام متحدہ میں گیا اور نتیجتاً ایک اور قرار داد منظور کی گئی کہ دونوں ممالک کشمیر سے اپنی فوجیں نکال لیں اور آزادانہ استصواب رائے کرایا جائے اور یوں کشمیری اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرلیں۔ لیکن وہ دن اور آج کا دن کئی کمشن بھی بنے کئی قرار دادیں بھی پیش اور منظور ہوئیں تین جنگیں بھی لڑی گئی لیکن کشمیری کی قسمت آج بھی وہی ہے کہ وہ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ بھارت وقتاً فوقتاً لائن آف کنٹرول کے اِس پار فائرنگ کرکے بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی کرتا رہتا ہے اور نہ صرف پاک فوج کے جوان اس فائرنگ کی زد میں آکر شہید ہو جاتے ہیں بلکہ سول آبادی بھی ان کا نشانہ بن جاتی ہے۔ لائن آف کنٹرول کی کل لمبائی 470 کلومیٹر ہے بھارت نے اس پر اپنی سرحد کے پچاس میٹر اندر خار دار تار کی باڑ لگا دی ہے جو بین الاقوامی قوانین کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اِن تمام خلاف ورزیوں کو پاکستان اقوام متحدہ کے فوجی مبصر گروپ کے نوٹس میں لاتا رہتا ہے۔

یونائیٹڈ نیشنز ملٹری

آبزرور گروپ برائے انڈیا و پاکستان اقوام متحدہ نے 1951 میں قائم کیا اور تب سے یہ مبصر گروپ اپنا کام کر رہا ہے اگرچہ 1972 میں شملہ معاہدے کے بعد سے ہی بھارت اس گروپ کے وجود کے درپے ہے اور حیلے بہانے سے اسے غیر ضروری قرار دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ بھارت نے اس گروپ کی موجودگی میں بھی بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں اڑائی ہیں اور کشمیر کے ہر سیکٹر میں جب چاہا ہے اور جیسے چاہا ہے خلاف ورزی کی ہے اور پاکستان کی فوجی چوکیوں اور سول آبادی پر بے دریغ فائرنگ کی ہے تاہم اس گروپ کے ذریعے یہ خلاف ورزیاں کم از کم بین الاقوامی برادری کے نوٹس میں آجاتی ہیں۔ اور اب ہمارے موجودہ وزیراعظم کے خیر سگالی کے غیر ضروری جذبات اور شال کا تحفہ حاصل کرنے کے باوجود بھارت کے انسانی حقوق کے مجرم وزیراعظم مودی کی حکومت نے دہلی میں اس گروپ کو اپنا دفتر بند کرنے کا حکم دیا ہے یعنی اقوام متحدہ کو کشمیر کے معاملے میں مزید بے بس ثابت کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ اگر کشمیر کے معاملے پر قراردادیں پاس کرنے کے بعد بھارت کی مرضی کے مطابق خاموش تماشائی بن کر نہ بیٹھا ہوتا تو آج بھارت یوں اپنے حکم سے دفتر کو بند نہ کر سکتا۔ ہاں پاکستانی حکومتیں بھی بھارت کے اس دیدہ دلیر رویے کی ذمہ دار ہیں جو بھارت سے خوشگوار تعلقات کی کوشش میں قومی نکتہ نظر سے بھی صرف نظر کر لیتی ہیں۔ کسی حکومت یا ملک کو خیر سگالی کا پیغام بھیجنا بہت اچھا ہے لیکن یہ جذبات دو طرفہ ہوں تو قومی وقار مجروح نہیں ہوتا۔ اس مشن کے ہونے

سے کشمیر آزاد ہوگا نہ اب تک اُس کے مصائب میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے لیکن کم از کم دنیا کے سامنے ایک غیر جانبدار ریکارڈ تو مرتب ہو رہا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہے اور یہ ملک بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے سال میں کتنی بار ہمسایہ ملک کی سرحد پر بلا اشتعال حملہ آور ہوتا ہے اور پھر دخل اندازی کا الزام بھی اسی ہمسایہ پر دھر دیتا ہے اور اپنے تمام مسائل کا ذمہ دار بھی اسی کو قرار دیتا ہے۔ اقوام متحدہ بھی اگر بھارت کے اقدامات کا نوٹس لیتا رہتا تو وہ آج اُس کے عملے سے عمارت خالی نہ کرواتا۔ اب بھی اقوام متحدہ کو اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ یہ مبصر پاکستان اور بھارت دونوں کی رضامندی سے مقرر ہوئے تھے اور اب بھی ان کے کام کرنے اور نہ کرنے میں دونوں ممالک کی رضامندی شامل ہونی چاہیے۔ ہماری حکومت بھی اگر خواب و خیال کی دنیا سے نکل آئے اور بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے، امن کی آشا کی پتنگ اُڑانے کے ساتھ ساتھ اسے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی طرف لے کر آئے تو اس کے بعد باقی کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ ہماری حکومت کو اس وقت بھی جاگ جانا چاہیے اور بھارت کے اس رویے پر احتجاج کرنا چاہیے اور اقوام متحدہ کو احساس دلانا چاہیے کہ فوجی مبصر گروپ ہی وہ ذریعہ ہے جس کے واسطے سے پاکستان کے خلاف ہونے والی بھارتی اشتعال انگیزی اور سرحدی خلاف ورزیوں سے اقوام متحدہ کو براہ راست باخبر رکھا جاتا ہے لہٰذا اس کی بندش سے یہ

سلسلہ رک جائے گا اور بھارت اپنی دہشت گردانہ کاروائیوں میں مزید اضافہ کر دے گا اور بلا روک ٹوک سرحدی بدمعاشی کرے گا۔ استصواب رائے کرانے پر تو وہ اب تک راضی نہیں ہوا اور مستقبل میں بھی اس کا کوئی امکان نہیں جب تک عالمی برداری انفرادی اور اقوام متحدہ اجتماعی طور پر بھارت کو مسئلے کے حل پر مجبور نہ کرے۔ حکومت پاکستان کو بھی بھارت کی اس ہٹ دھرمی پر اقوام متحدہ میں احتجاج ریکارڈ کرانا چاہیے اور سفارتی سطح پر بھی نہ صرف مبصر کے مسئلے کو اٹھانا چاہیے بلکہ کشمیر کے مسئلے کے مستقل حل کے لیے اپنی کوششیں تیز تر کر دینی چاہیے اور دنیا کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا تب تک جنوبی ایشیا میں امن بحال نہیں ہو سکتا اور دو ایٹمی قوتیں سرحدوں پر ایک دوسرے کے مد مقابل رہیں گی۔

نگاہ جان ! افغانستان کی فکر کرو

جب کسی ملک میں خود آپس کی نا اتفاقیاں ، نا چاقیاں ہوں اور ملک سے بڑھ کر حکومت اہمیت اختیار کر جائے تو بیرونی دشمن بھی اپنی سازشوں میں اضافہ کر دیتے ہیں بلکہ وہ جو خود دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں جو خود اپنے ملک کو سنبھال نہیں سکتے وہ بھی آپ کو اپنا مجرم قرار دینے لگتے ہیں اور یہی حال ہمارا ہے کہ افغانستان جیسا ملک بھی ہمارے بارے میں بات کرتا ہے ہمیں دھمکیاں دیتا ہے اور ہمارے خلاف سازشیں بھی کرتا ہے۔ حکومت تو حکومت اس کے بہت سے عام لوگ جنہیں پاکستان نے کئی دہائیوں سے پناہ دی ہوئی ہے وہ بھی اور جن کی نسلیں پاکستان میں پیدا ہوئیں وہ بھی پاکستان کے بارے میں منفی ذہنیت رکھتے ہیں ۔ ایسی ہی ایک افغان خاتون نگاہ جان نے انٹرنیٹ پر پاکستان کے خلاف اور بلوچ علٰحدگی پسندوں کے حق میں ایک پٹیشن دائر کی ہوئی ہے اور اب تک اپنے مطلب کے ایک ہزار لوگوں سے دستخط حاصل کر چکی ہے اور اس تعداد کو پندرہ سو تک پہنچا کر اس پٹیشن کو بان کی مون کو بھجوانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس افغان عورت کو بلوچوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے سوائے پاکستان دشمنی کے جبکہ وہ خود نہ اپنے ملک میں رہتی ہے نہ وہاں سے پڑھی ہوئی ہے۔ کینڈا میں رہنے والی نگاہ جان مک گل یونیورسٹی کینیڈا سے تعلیم یافتہ ہے اسے بلوچوں کا درد کیسے

محسوس ہوا ظاہر ہے کہ اُسے اس کام کے لیے معاوضہ دیا جا رہا ہوگا ورنہ وہ پہلے اپنے ملک کی فکر کرتی جو 1979 کے بعد سے امن کے لیے ترس گیا ہے۔ نگاہ جان کوئی واحد شخصیت نہیں جو مغرب میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف مصروف عمل ہے بلکہ وہ تو ایک بہت ہی چھوٹا سا مہرہ ہے وہاں تو کئی شہ اور وزیر بیٹھے ہوئے ہیں اور بڑی تسلی سے اپنے کام میں مصروف ہیں اور خاص کر بلوچوں کی اس طرح کی تنظیموں اور شخصیات کو تو سر آنکھوں پر بیٹھایا جاتا ہے اور کینیڈا جیسا ملک، جہاں امیگریشن اور اظہار رائے دونوں کی آزادی کے نام پر جو چاہے جائے اور جو جو چاہے کرے تو خاص کر ان عناصر کا گڑھ بنتا جا رہا ہے۔ بلوچستان کے معاملے میں تو کئی ممالک سرگرم ہیں امریکہ میں احمر مستی خان بھی ایسی ہی ایک تنظیم کا سربراہ بن کر بیٹھا ہوا ہے جبکہ خود اسکا کردار تک مشکوک ہے۔ نریندر مودی کی انتخابات میں کامیابی پر احمر مستی خان نے اسے ایک خط لکھ کر نہ صرف مبارکباد دی، خوشی کا اظہار کیا بلکہ اس سے بلوچستان میں کھلی مداخلت کی درخواست بھی کی اگر احمر مستی خان جیسے کرداروں کو بلوچوں سے بہت محبت اور ان کی بہت فکر ہے تو وہ کیوں نہ پاکستان آجاتے ہیں اور جن بلوچوں کو لڑا لڑا کر وہ مار رہے ہیں ان کے ساتھ خود کیوں شامل نہیں ہوتے اور نگاہ جان کا تو بلوچوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں لیکن وہ بھی اُس عالمی سازش کا ایک مہرہ ہے جو پاکستان اور بلوچستان کے خلاف برپا کی گئی ہے اور ایسے مہروں اور کارندوں کو مغرب میں اظہار رائے کی آزادی کے

نام پر کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے اور عالمی طاقتیں یوں بڑی آسانی سے اپنا کھیل کھیل رہی ہیں ۔ نگاہ جان نے حکومت پاکستان اور آئی ایس آئی پر جو الزامات لگا کر لوگوں سے اپنی پٹیشن پر دستخط حاصل کیے ہیں وہ انتہائی بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ پاکستان اور آئی ایس آئی دہشت گردوں کو بناتے ہیں اور پناہ دیتے ہیں اور انہیں افغانستان اور نگاہ جان کے مربی بھارت کے خلاف استعمال کرتے ہیں جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی افغان جنگوں کے ساتھ داخل ہوئی ہے آج بھی جو دہشت گرد قبائلی علاقوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اُن کا افغانستان سے کوئی نہ کوئی رشتہ ہے بلکہ اکثر کے والدین میں سے کوئی ایک افغانستان سے تعلق رکھتا ہے جو افغان مہاجروں کے روپ میں پاکستان آئے اور پناہ حاصل کرنے کے بعد اپنی اسی پناہ گاہ یعنی پاکستان کو نشانہ بنایا۔ نگاہ جان ، حامد کرزئی اور ان جیسے دوسرے افغانوں کو تو شاید یاد نہیں یا وہ یاد کرنا نہیں چاہتے لیکن تاریخ بہر حال گواہ ہے کہ افغانوں پر جب بھی برا وقت آیا ہے اور خانہ جنگی کا شکار ہوئے یا بیرونی قوتوں کے حملوں کی زد میں آئے انہیں اسی پاکستان کی سرزمین اور اس کے باسیوں نے پناہ دی اور اِن کی ہی وجہ سے ہم دنیا کی نظروں میں کھٹکے بھی اور اس کی دشمنیوں کا نشانہ بھی بنے لیکن افغانوں کی مدد کو اپنا دینی فریضہ سمجھا اور آج بھی لاکھوں افغان مہاجروں کے روپ میں پاکستان میں موجود ہیں لیکن ہر پناہ کے بعد افغان حکومتوں نے پاکستان کے احسان کا بدلہ دینے کی

بجائے اس کے مصائب میں اضافہ ہی کیا۔ آج بھی شہر شہر پھیلے ہوئے افغان مہاجرین میں سے اکثریت کی پیدائش پاکستان میں ہوئی یہ ادھر ہی پل کر جوان ہوئے بلکہ اُن کی دوسری نسل بھی اِدھر ہی پیدا ہوئی اور اب بھی وہ اپنے ملک جانے سے انکاری ہیں لیکن اس پناہ کے بدلے مہاجروں میں چھپے ہوئے دہشت گردوں کے ہاتھوں پاکستان مصائب میں گھرا ہوا ہے اکثر کسی دہشت گرد کا ملنے والا سر بتاتا ہے کہ وہ غیر ملکی ہے کبھی وہ افغان، کبھی قازق اور کبھی ازبک ہوتا ہے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے دہشت گردوں کو بھی یہی افغانستان پناہ فراہم کرتا ہے حکیم اللہ محسود ہو یا مولوی فضل اللہ اور یا کوئی اور جس تک بھی پاکستانی فوج کے پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو جائے وہ افغانستان ہی جا چھپتا ہے اور براہمداغ جیسے دہشت گرد تو افغان حکومت کے خاص اور معزز مہمان بن کر رہتے ہیں اور جو افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں رہنا پسند نہیں کرتے اور سوئٹزر لینڈ یا کسی اور یورپی ملک میں جا رہتے ہیں تو افغانستان اور بھارت وہاں ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان تمام باتوں کا نگاہ جان اور اِس جیسے دوسرے مغربی آلہ کار افغانوں کو علم بھی ہے لیکن وہ پھر بھی مجرم پاکستان کو ٹھہراتے ہیں کیونکہ انہیں اسی خدمت کے بدلے نوازا جاتا ہے۔ نگاہ جان کوئی اہم اور قابل توجہ شخصیت نہیں لیکن افغان بدنیتی اور بھارتی اور مغربی ارادوں کی علامت ضرور ہے لہٰذا اُس کے ارادوں کے آگے بند باندھنا ضروری ہے بلکہ ہمارے نوجوانوں کو اِن کے خلاف سوشل

میڈیا پر ہی موثر مہم چلانی چاہیے تاکہ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کا توڑ کیا جا سکے اور ایسا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی ضرور ہونی چاہیے جیسے کہ ڈاکٹر واحد بلوچ نے بلوچ کونسل نارتھ امریکا کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہوئی ہے جو بلوچ نوجوانوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ بلوچ سرداروں سے بچ کر رہیں کیونکہ وہ آزادی کی نہیں اپنی حکومت کی جنگ لڑ رہے ہیں مزید ایسے لوگوں کو سامنے لانا چاہیے تاکہ دشمن کا مقابلہ انہی کے انداز میں کیا جائے۔ دشمن اپنا کام کر رہا ہے لیکن ہمیں بھی اپنا کام کرنا ہے تبھی ہم اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں گے اور عالمی سطح پر اپنی عزت اور ساکھ بحال کر سکیں گے۔

عام مسلمان مجبور، خاص خوابیدہ اور فلسطین زخمی

فلسطین ایک دفعہ پھر لہو لہو ہے لیکن دنیا اپنے اپنے مشاغل و مسائل میں مگن ہے ۔ فلسطین کے بچے روتے رہے اور رمضان اور پھر عید بھی گزر گئی لیکن نہ تو اِن کے آنسو پونچھے گئے نہ ہی انہیں امن دیا گیا۔ مغرب اپنی غلطی کی تلافی کرنے کے لیے بھی تیار نہیں جس نے دنیا کے کونوں کھدروں میں بکھرے ہوئے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کیا اور وہاں کے اپنے باشندوں کو ملک بدر کر کے کیمپوں میں بھجوایا اور پھر انہیں یہاں بھی جینے نہیں دیا گیا۔ اس بات کا جواب کسی کے پاس نہیں کہ صدیوں سے اِن بھٹکے ہوئے راندہ یہودیوں کی ہمدردی میں برطانیہ کا کوئی حصہ یا امریکہ کی کوئی ریاست کیوں خالی نہ کی گئی کہ انہیں وہاں آباد کیا جاتا۔ ہٹلر واقعی عظیم تھا جس نے ان یہودیوں کو قتل کرنے پر فخر کیا لیکن اُس کے قتل عام کی سزا بے چارے فلسطینیوں کو کیوں دی گئی۔ اسرائیل پچھلے تقریباً ایک ماہ سے بلا روک ٹوک فلسطینیوں پر بمباری کر رہا ہے اور اس کے بچوں بوڑھوں عورتوں مردوں ہر ایک کو نشانہ بنا رہا ہے، نہ سکول چھوڑے گئے نہ ہسپتال لیکن اب تک نہ تو اقوام متحدہ کچھ کر سکا ہے نہ امریکہ ۔ امریکہ تو خیر اپنے اس ناجائز بچے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے نہ تو اُسے بنیادی انسانی حقوق یاد ہیں نہ کچھ اور ۔بلی کے بچے کے لیے تڑپ جانے والے امریکی

انسانی بچوں کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور تڑپ کر روتے ہوئے بھی لیکن پھر بھی وہ ان بچوں اور ان کے والدین کو مجرم قرار دیتے ہیں انہیں دہشت گرد کہتے ہیں جبکہ اُسے اور دنیا کو یہ مان لینا کہ اسرائیل ایک دہشت گرد ملک ہے اس پر وہ پابندیاں لگنی چاہیے اور وہ سزا دی جانی چاہیے جو کسی دہشت گرد کے لیے دنیا کے قانون میں رائج ہے۔

امریکہ اور یورپ تو اپنی اقتصادیات کی وجہ سے اسرائیل کے آگے مجبور ہیں لیکن مسلمان دنیا آخر کہاں ہے صرف یوم القدس کے جلوس نکال کر کیوں اپنے فرض سے سبکدوشی محسوس کر رہی ہے۔ حکومتیں تو جیسے خوابیدہ ہیں اور اپنی اپنی سیاسی جنگوں اور مفادات کی دوڑ میں مگن ہیں کبھی کبھی کوئی مری ہوئی سی آواز اٹھتی ہے اور وہ بھی بادل نخواستہ ۔عجم تو پھر بھی بول رہا ہے لیکن عرب تو اپنی تیل سے بھرپور زمینوں پر اپنی شاہانہ زندگیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ پندرہ سو سے زیادہ فلسطینی اب تک شہید ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں بچوں کی معصوم لاشیں دیکھ کر انسان تو انسان جانور کو بھی رحم آجائے اسکے ہاتھ سے بھی نوالہ گر پڑے لیکن مسلمان حکمران یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں ۔ اسرائیل کو مجبور کرنے کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن ابھی بھی دنیا کی ساری توجہ مسلمان ممالک کو ہی دہشت گرد قرار دینے پر مرکوز ہے اور مسلمان بھی ان کے آلہء کار بنے ہوئے آپس میں بر سر پیکار اور گتھم گتھا ہیں۔ شیعہ سنی کو، سنی شیعہ کو، حماس الفتح کو، الفتح حماس کو، مصر ایک کو شام دوسرے کو یعنی ہر ایک دوسرے

کو گناہ گار اور خطا کار قرار دے رہا ہے ایسے میں جب کہیں سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ او آئی سی کا اجلاس بلایا جائے تو بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ اس تنظیم کے ریکارڈ پر کوئی بھی ایسا کارنامہ نہیں ہے جس سے مسلم امہ کے مصائب میں کوئی کمی واقع ہوئی ہو۔ نہ تو یہ مسلمانوں کو آپس میں لڑنے سے روک سکی ہے نہ آپس میں جوڑ سکی ہے اور نہ اُس کی طرف سے اس کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ اگر ایسی کوئی کوشش کی جاتی تو یقیناً کوئی بہتری آسکتی تھی جب دنیا کے ستاون ممالک اکٹھے ہو جائیں تو چند چند ملکوں کی تنظیموں سے زیادہ موثر کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ پندرہ سو سے زیادہ فلسطینی شہید ہو چکے ہیں اور ہر روز سو سے زیادہ مزید شہید ہو رہے ہیں لیکن سب کے زبانوں کو تالے لگے ہوئے ہیں کیونکہ انہیں امریکہ اور مغرب کو خوش کرنا اور رکھنا ہے کہیں کسی مفاد کے لیے کہیں کسی اور مفاد کے لیے اور حد تو یہ ہے کہ امریکہ ،،برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ مصر، اردن اور کچھ اور اسلامی ممالک بھی اس تنظیم کو کلی اور جزوی طور پر دہشت گرد قرار دے چکے ہیں جب کہ اب تو سعودی عرب بھی اپنی سوچ بدل رہا ہے۔ انتہائی دکھ تو اُس وقت ہوتا ہے کہ کسی اسلامی ملک نے کوئی عملی قدم تو کیا زبانی جمع خرچ بھی نہیں کیا۔ پاکستان جسے ہم ہمیشہ بڑے فخر سے اسلام کا قلعہ کہتے اور سمجھتے رہے ہم نے بھی صرف اپنا پرچم سرنگوں کرکے سمجھا کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر لیا ہے بلاشبہ کہ ہم اس وقت خود بھی ایک

آزمائشی دور سے گزر رہے ہیں لیکن کیا ہم سفارتی سطح پر بھی بے بس ہیں کیا مسلمان ممالک کو ہم اس بات پر بھی اکٹھا نہیں کر سکتے کہ اسرائیل کے خلاف عالمی سطح پر کچھ کر سکیں جنرل اسمبلی کا اجلاس ہی بلا سکیں اسرائیل پر پابندیوں کی ہی کوشش کر لیں دنیا کو یہی یاد کرا سکیں کہ اسرائیل کی بنیاد ہی ظلم پر رکھی گئی تھی۔ 1896 میں یہودیوں کے لیے ایک ملک کا مطالبہ کیا گیا لیکن جلد ہی اسے ایک یہودی ریاست کے مطالبے میں بدل دیا گیا یہودیوں کو اس ملک سے فلسطینیوں نے نہیں نکالا تھا بلکہ وہ اپنے اعمال اور نافرمانیوں کے باعث ملک بدر کیے گئے تھے اور اللہ کی طرف سے کیے گئے تھے اور بعد میں بھی یہ مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں عیسائیوں اور دوسرے مذاہب و اقوام کی طرف سے اپنی زمین سے نکالے گئے جبکہ تیرہ سو سال سے یہاں رہنے والے فلسطینی مسلمان صرف چند لاکھ یہودیوں کی خواہش پر اپنے ملک سے یا تو نکالے گئے یا مہاجر کیمپوں میں رہنے پر مجبور کیے گئے یا چند چھوٹے چھوٹے ایک دوسرے سے جدا جدا علاقوں میں کسی قید خانے کی طرح بند کر دیے گئے اور اب دہشت گرد بھی انہیں ہی کہا جا رہا ہے یعنی گھر کے مالک کو گھر سے نکال کر اسے ہی ظالم کہا جائے۔ موجودہ اسرائیلی حملوں اور بربریت پر جس طرح سے پوری دنیا سوائے چند ممالک کے خاموش ہے وہ بجائے خود جرم ہے اور مسلمان ممالک کے لیے تو جرم عظیم ۔قرآن نے تو بتا دیا تھا کہ یہودی اور نصرانی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے یوں تو تاریخی طور پر یہ ایک دوسرے کے بھی دشمن ہیں لیکن مسلمانوں

کے خلاف ان کے گٹھ جوڑ کی بھی اللہ نے خبر دے دی تھی اور مسلمانوں کو نبی پاک ﷺ نے ایک جسم قرار دیا تھا لیکن ہم اس کے الٹ چل رہے ہیں۔ سعودی شہزادہ بندر جب موساد کے چیف پارڈو سے ملاقات کر رہے تھے اور بقول اُن کے انہوں نے مشرق وسطیٰ کے امن کے بارے میں تبادلہ خیال کیا تو کیا امن کے لیے فلسطینیوں کے قتل عام کا منصوبہ زیر غور آیا تھا اگر نہیں تو اسرائیل کو وحشت و بربریت روکنے پر مجبور کیوں نہیں کیا جا رہا۔ تیل سے مالا مال عرب ممالک اپنے تیل کو ہی مغرب کے لیے بند کر دیں تو کیا ان پر دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا، اگر اسلامی ممالک اسرائیل کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں تو کیا اِن کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے پہلے اتحاد بین المسلمین ضروری ہے۔ جس طرح مغرب ہٹلر کی یہودی نسل کشی کے خلاف متحد ہوا اور اُسے مجرم قرار دیا اسی طرح کیا مسلمان اسرائیل کی فلسطینی نسل کشی کے خلاف اکٹھے نہیں ہو سکتے جن کے بچوں کو چن چن کر شہید کیا جا رہا ہے نہ سکول محفوظ ہیں نہ ہسپتال نہ گھر، نہ مہاجر کیمپ حتیٰ کہ مساجد بھی نہیں یعنی مذہبی اور انسانی دونوں طرح کی دہشت گردی ہے جو ایک ماہ سے جاری ہے لیکن کیا کوئی ہے جو اقوام متحدہ میں اور دوسرے عالمی فورموں پر اسرائیل کے خلاف جم کر کھڑا ہو جائے اُسے مجرم ثابت کر سکے کوئی مسلمان لیڈر، کوئی مسلمان ملک، کوئی نواز شریف کوئی شاہ عبداللہ کوئی مذہبی رہنما۔ نہیں اور یہی عالم اسلام کا المیہ ہے اور یہی المیہ نہ صرف

فلسطین بلکہ دوسرے المیوں کو بھی جنم دے رہا ہے کیونکہ عام مسلمان بے بس ہے اور
خاص مسلمان سو رہا ہے کاش کہ انہیں کوئی جگا دے۔

آؤ کہ ایک دیوارِ گریہ بنائیں یہیں

عید آئی اور گزر گئی ۔ عید مسلمانوں کے لیے رمضان کے روزے رکھنے کا انعام ہے ،رب اللعالمین کا تحفہ ہے کہ اُس کے بندے نے صرف اُس کے حکم پر اپنا کھانا پینا اور نفسانی خواہشات ترک کیں، صرف اس کی طرف سے مقرر کردہ اوقات میں کھانے کی اجازت پر قانع رہا اور شکر اور صبر کرتا رہا۔ بلاشبہ کہ اس سخت عبادت کے بعد مسلمان انعام کا حقدار ہے اور اسی لیے اُسے خوشی کا یہ دن عطا کیا گیا لیکن اس عید رونے کو دل کرتا رہا فلسطین کے زخموں پر بھی ، اپنے ملک کے حالات پر بھی لیکن اپنے مذہبی اقدار کی بے حرمتی پر بھی اپنی ثقافت کی موت پر بھی اور اپنی معاشرتی روایات کے قتل پر بھی ۔ ابن انشاء نے تو کہیں پر بھی دیوار گریہ بنانے کی دہائی دی تھی لیکن میرا دل کرتا رہا کہ ایک دیوار گریہ بنائیں یہیں اپنے ملک میں اپنے ہی کسی شہر میں اسلام آباد ، کراچی ، لاہور ، پشاور ، کوئٹہ کہیں بھی ۔ تاکہ اُس سے لپٹ کر اپنی اقدار، روایات، رسوم و رواج سب کو یک بار روؤں شاید کوئی اور بھی آکر میرے ساتھ شامل ہو جائے اور ہم اپنے اشکوں سے قوم کے گناہوں کو دھولیں اور پھر ہمارے اوپر سے عذاب الٰہی بھی اٹھ جائے۔ میں قاہرہ کی شبینہ کلبوں میں رقص کرتی حسیناؤں اور کوئے بیروت و بصرہ کی بے آستینوں کا ماتم کیا کروں میں تو اپنے دیس کی حسیناؤں اور شہ

زور مردوں کو بانہوں میں بانہیں ڈال کر سرعام ٹیلی وژن پر رقص کرتے بھی دیکھتی رہی اور ضبط کرتی رہی اور اسلامیات کی کسی درسی کتاب میں لکھے اُس جملے کا ماتم کرتی رہی جس میں لکھا تھا کہ اسلام نے اپنے خوشی کے مواقع یعنی عیدین پر بھی مسلمان کو یادِ الٰہی سے غافل ہونے کی اجازت نہیں دی جہاں اور مذاہب کے لوگ اپنے مذہبی تہواروں پر غل غپاڑہ کرتے ہیں وہاں مسلمان عید کی نماز پڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کیا ہم اپنے بچوں سے جھوٹ بولتے ہیں یا سچ مچ ایسا ہے۔ اگر ہم دل سے سمجھتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں کہ حیا نصف ایمان ہے اور بے حیائی اور عریانیت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں تو پھر کیوں وہ کچھ ہمارے اُس میڈیا پر ہوتا ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ معاشرے کا رخ بدلتا ہے اور اس کے خدوخال مرتب کرتا ہے۔ میرا سوال تو یہ ہے کہ عید کے پروگراموں کو کس جدیدیت کی نظر کیا جا رہا ہے، ہمارا مذہب ہماری روایت تو چاند دیکھ کر چوڑی مہندی لگانا ہے عید والے دن خوبصورت نیا لباس پہن کر عید کی نماز پڑھنا ہے، ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دینا ہے مسجدوں میں بھی اور ایک دوسرے کے گھر جا کر بھی ، چھوٹے بڑوں کو مبارکباد دیں اور بڑے چھوٹوں کو عیدی، رقص کی محفلوں کا تو کہیں ذکر ہے نہ گنجائش لیکن عید کے تین دن ہمارا ہر چینل بہانے بہانے ناچتا رہا۔ بے تکے سوالات پوچھے جاتے رہے اور جیتنے پر ہو جائے بھنگڑا کہہ کر ناچ کے سیشن چلتے رہے۔ بے شک کہ آج کی تجارتی دنیا میں تجارت کے اصول ہوتے ہونگے لیکن یوں مذہب کو بیچ کر

کونسی دنیا آباد کی جارہی ہے اور پھر کون سی برکت کی اُمید رکھی جارہی ہے۔ جو قومیں اپنے رب کی بتائی ہوئی حدوں کو توڑتی ہیں ظاہر ہے اللہ بھی اُنہیں اپنی بدترین آزمائشوں سے آزماتا ہے، تو کہیں ہم انہی آزمائشوں میں سے تو نہیں گزر رہے جن سے نافرمان قومیں اور اُمتیں گزرتی ہیں کیا ہم بھی اس تسلی میں ہیں کہ ہم دیوار گریہ پر رو کر یا گنگا میں نہا کر گناہوں سے پاک ہو جائیں گے اور اسی لیے ہم غمی خوشی میں مذہب سے آزاد اور تہذیب سے عاری ہو جاتے ہیں۔ لباس پر تو ہم کب کا سمجھوتہ کر چکے، اس کے بعد گفتگو کی باری آئی اب ڈراموں میں ایسے ایسے جملے بولے جاتے ہیں جنہیں سن کر کوئی بھی غیرت مند انسان اپنی اولاد تو کیا کسی دوسرے کے سامنے بھی نظر نہیں اٹھا سکتا اور جملوں کے بعد حرکات بھی کھول دی گئیں اور اس عید تو لگا کہ قوم کی قوم معاذاللہ اُس بازار سے تعلق رکھتی ہے جو معاشرے کے وجود پر ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر ایک دوسرے پر الزام دھرتا ہے لیکن اپنے گریبان میں کوئی جھانک کر دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا۔ اس وقت ہر چینل بے باکی میں دوسرے سے باری لے جانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ روشن خیالی کا اعزاز حاصل کر سکے۔ مختلف اینکرز اس بے باکی پر پروگرام بھی کر رہے ہیں لیکن اپنے چینل کو کوئی روکنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ مبشر لقمان کب اے آر وائی کے پروگراموں پر تنقید کرتے ہیں جن میں ناچتے ناچتے عید منائی گئی انتظار رہے گا۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ عید پر مصلیٰ بچھا کر صرف عبادت کی

جائے لیکن کم از کم اپنی مذہبی روایات کو پامال تو نہ کیا جائے۔ ٹیلی وژن کی عید دیکھ کر بس ایک کمی محسوس ہوئی کہ ایک دوسرے پر رنگ پھینکے جاتے یا شراب کی بوتلیں توڑی جاتیں۔ ایک کولڈ ڈرنک کے اشتہار میں نوجوان بوتلیں ٹکراتے ہوئے معلوم نہیں کس تہذیب کی عکاسی کر رہے ہیں۔ موبائل فون سم اور سیٹوں کے اشتہار تو جیسے قوم کے نوجوانوں کی گمراہی کا ٹھیکہ لے کر اُسے پورا کر رہے ہیں، اپنا منافع بھی حاصل کر رہے ہیں اور صارفین کو مختلف پیکجز کے نام پر لوٹ بھی رہے ہیں میری حکومت سے درخواست ہے اور خاص کر وزارت اطلاعات سے کہ حکومت کی کامیابیوں کے مضحکہ خیز بیانات جاری کرنے کی بجائے اپنے کام پر توجہ دیں۔ پرویز رشید صاحب آپ عید شاپنگ کی قیمت بڑھنے کی نوید سنا رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ قیمتیں بڑھ گئی ہوں یا جو قوم بھوک کا علاج نہیں کر پا رہی وہ عیاشی پر تو نہیں اتر آئی اور اُس میں آپ کی وزارت کی عظیم کارکردگی کا عمل دخل تو نہیں کہیں ہر لڑکی خود کو مارننگ شو کی میزبان اور ہر لڑکا خود کو ڈرامے کا ہیرو تو نہیں سمجھ رہا۔ بہر حال جو بھی ہے وزارت اطلاعات اپنے اختیارات کو استعمال کرے اور میڈیا کو کسی ضابطہء اخلاق کا پابند کرے یہ نہ ہو کہ اظہار رائے کی آزادی کے نام پر قوم اپنی رہی سہی شناخت بھی کھودے اور جو نام ہم نے لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا تھا پھر ہم بے نامی اور گمنامی میں چلے جائیں اور پھر اگر گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے قیامت تک رو بھی لیا جائے تو تلافی اور معافی

نہ ہو۔

سری لنکا کے خلاف تحقیقات میں ایک پاکستانی کیوں

ملک مشکلات میں گھرا ہوا ہے لیکن اِن مشکل حالات میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو ملک سے زیادہ اپنی ذات اور اس سے وابستہ مفادات یا تشہیر کی فکر رہتی ہے اور ہماری بد قسمتی کہ ہمارے پاس ایسے چہرے کئی ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنی نام نہاد انصاف پسندی کی آڑ لے کر ملک کے لیے مسائل میں اضافے کا باعث بن جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت عاصمہ جہانگیر بھی ہیں جو اکثر اوقات ایسی سرگرمیوں میں شامل رہتی ہیں جس کا ملک کو فائدے سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ بظاہر وہ انسانی حقوق کی علمبردار ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ وہ صرف اُن لوگوں اور معاملات کے لیے آواز اٹھاتی ہیں جس میں شہرت پانے کے امکانات زیادہ ہوں اور بین الاقوامی تعریف و توصیف پانے کے بھی، چاہے ملک کا نقصان ہو۔ یہی کچھ ان محترمہ نے بنگلہ دیش میں کیا جب وہاں ٹیلی وژن چینل پر بیٹھ کر انہوں نے پاک فوج کے احتساب کا مطالبہ کیا کہ اس نے بنگالیوں کے خلاف انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی مگر یہ کہتے ہوئے وہ مکتی باہنی اور بھارت کے مغربی پاکستانیوں پر مظالم کا ذکر کرنا بھول گئیں۔ ان کی اسی طرح کی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے اقوام متحدہ نے انہیں نئی ذمہ داری سونپی ہے جسے انہوں نے ملک کے مفاد کو بالائے طاق رکھ کر قبول کر لیا اور وہ ہے سری لنکا میں تامل تحریک کے خلاف حکومت کی

طرف سے کی جانے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف تحقیقات ۔ اس وقت جب پاکستان کو مختلف حیلوں بہانوں سے بین الاقوامی طور پر ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے ایسے میں چند دوست ممالک کے حساس معاملات میں مداخلت کرکے انہیں ناراض کرنا کسی بھی طرح درست نہیں لیکن عاصمہ جہانگیر نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ان کے ساتھ اس کمیٹی میں فن لینڈ سے سابق صدر مارتھی اور نیوزی لینڈ سے سلویا کارٹی رائٹ بھی شامل ہیں یہ تین رکنی کمیٹی سری لنکا میں چلنے والی علٰحدگی پسند تحریک لبریشن ٹائیگر آف تامل ایلام اور حکومت کے درمیان آخری معرکوں کے دوران ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق تحقیقات کرے گی۔ سری لنکا کی حکومت اِن تحقیقات کی مخالفت کر رہی ہے ظاہر ہے کہ یہ مخالفت ہو گی کہ اگر عراق اور افغانستان میں امریکی جنگی جرائم پر بازپرس بھی نہ ہو کہ کتنے سویلین مارے گئے کتنے بچے قتل کیے گئے کتنی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی لیکن اقوام متحدہ کی نظر اس طرف نہیں گئی اور نہ امریکہ پر کوئی پابندی لگی نہ جرمانہ کیا گیا۔ کشمیر میں بھارت کے جرائم پر تو عاصمہ جہانگیر نے کبھی کسی تکلیف کا اظہار کیا نہیں بلکہ بال ٹھاکرے کے ساتھ بڑے فخر سے گفتگو اور فوٹو سیشن کرتی رہی ہیں بھارتی مسلمانوں کے خلاف کبھی اُس کے جرائم پر تحقیقات کا مطالبہ تک نہیں کیا۔ اول تو یہ بات حیران کن ہے کہ اقوام متحدہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ پاکستان اور سری لنکا دوست ممالک ہیں پاکستان سے ایک شخصیت کو ان تحقیقات کے لیے چنا

اور اگر کسی پاکستانی شخصیت کو ایسی کوئی پیشکش کی بھی گئی تو کیا انہیں نہیں چاہیے تھا کہ وہ سوچتی کہ پاکستان اگر چند دوست رکھتا ہے تو ان میں سے بھی ایک کو ناراض کیسے کر دیا جائے۔ سری لنکا تیس سال تک دہشت گردی اور خانہ جنگی کے جس عذاب سے گزرا ہے اس تکلیف سے سری لنکا کے عوام اور حکومت ہی آگاہ ہو گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف حکومت چاہے کسی بھی ملک کی ہو سختی سے نپٹتی ہے۔ آج اگر پاکستان میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ہو رہا ہے تو اس کی وجہ وہ تشدد ہے جو اِن لوگوں نے ملک میں پھیلا رکھا ہے کہ عوام کا جینا حرام ہے ان کو نہ تو گھروں میں تحفظ حاصل ہے نہ باہر تو کیا انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جتنے لوگوں کو چاہے مار دیں یہی صورت حال سری لنکا میں رہی ہے۔ اگر اقوام متحدہ ان تمام معاملات کی تحقیقات کر ہی رہا ہے کیونکہ سری لنکا ایک چھوٹا ملک ہے تو اس میں پاکستان کو ملوث کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ عاصمہ جہانگیر جیسی شخصیات تو ہمیشہ ملک سے زیادہ اپنی شہرت کی متمنی رہتی ہیں ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس ذمہ داری کو لینے سے انکار کر سکتی تھیں اور یوں پاکستان کی طرف سے سری لنکا کے معاملات میں انفرادی سطح پر ہی سہی مداخلت نہ ہوتی جبکہ اِن تحقیقات پر وہاں کی حکومت راضی بھی نہیں ہے اور اگر عاصمہ جہانگیر نے اس ذمہ داری کو قبول بھی کیا، تو کیا ضروری ہے کہ اس قدر جارحانہ انداز اپنایا جائے جیسا کہ انہوں نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اگر سری لنکن حکومت نے تعاون نہ کیا تو

انہیں اس کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔ عاصمہ جہانگیر نے تو اس ذمہ داری کو نہ صرف قبول کیا بلکہ زور و شور سے مصروف عمل بھی ہو گئیں حسب معمول ملک و قوم کی پرواہ کیے بغیر لیکن حکومت پاکستان کو تو جاگ جانا چاہیے اور اب جبکہ اس تحقیقاتی ٹیم نے ستمبر میں اپنی پہلی رپورٹ اقوام متحدہ کو پیش کرنی ہے تو ان محترمہ کو مجبور کرنا چاہیے کہ اپنا نام اس ٹیم سے نکال لیں یا پھر حکومت کو ہی کسی بین الاقوامی فورم پر اس تمام کاروائی سے لاتعلقی کا اعلان کر دینا چاہیے اور سری لنکا کو یہ یقین دلانا چاہیے کہ حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام عاصمہ جہانگیر کے کسی فعل کے ذمہ دار نہیں اور نہ ہی وہ سری لنکا کے خلاف کسی بین الاقوامی یا علاقائی سازش کا حصہ ہیں بلکہ وہ ہمیشہ اسے اپنا ایک اچھا دوست سمجھتے ہیں جو مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے

پاکستان کو آزاد ہوئے ستاسٹھ سال ہو چکے ہیں اور ایک دفعہ پھر سیاستدان آپس میں گتھم گتھا ہیں وہ مسائل جو آسانی سے حل ہو سکتے تھے اُن کو گھمبیر بنا دیا گیا ہے اور اس نہج پر لے آئے گئے ہیں کہ اِن کے پُر امن حل کے لیے دعا ہی کی جا سکتی ہے کیونکہ ہمارے سیاستدان اور حکمران اپنی فہم و فراست کے استعمال کی ضرورت محسوس ہی نہیں کر رہے بلکہ سب سے برا تو یہ ہے کہ کوئی فوج کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہا ہے اور کوئی اپنی توپوں کا رخ فوج کی طرف لگائے رکھتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی غلطیوں کے لیے بھی فوج کو ذمہ دار ٹھہرا کر مظلومیت کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے بلکہ سیاسی شہادت کی۔

پاکستان میں بھی سیاست کا عجب قصہ ہے کہ کرتے یہ سیاست دان جمہوریت کی باتیں ہیں لیکن نہ تو اختلاف رائے کا حق دیتے ہیں نہ اختیارات کی تقسیم کرتے ہیں اور یہ تقسیم اگر کی جاتی ہے تو اپنے اپنے خاندان کے اندر اور اگر اس پر اعتراض کیا جائے تو ایک بودی دلیل یہ پیش کر دی جاتی ہے کہ ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر اور کسان کا بیٹا کسان ہو سکتا ہے تو سیاستدان کا بیٹا سیاستدان کیوں نہیں ، سیاستدانی پر تو کسی کو اعتراض نہیں اعتراض تو اس بات پر ہے کہ

کسی پارٹی میں ذہانت و فطانت صرف ایک ہی خاندان کو کیوں ودیعت کر دی جاتی ہے ۔کیا یہ کوئی خدائی قانون ہے اور یا یہ ملک کوئی ذاتی جاگیر ہے جس کی ملکیت کسی ایک ہی خاندان میں رہتی ہے اور دوسروں کو صرف رعیت یا غلامی کا ہی حق ہو، یا زیادہ سے زیادہ ان بادشاہوں کے وزیر، مشیر بدل جایا کریں اور اِن خدمات کے لیے بھی خاندان مخصوص رہیں اور وزراتیں بھی زیادہ تر شاہی خاندان میں تقسیم کی جائیں۔ اب ان حالات کے خلاف اگر کوئی اُٹھ کھڑا ہو تو اسے عوام کی برداشت کی آخری حد گر داننے کی بجائے سازش قرار دے دیا جاتا ہے اور اس وقت عام رواج یہ ہے کہ اسے فوج کی سازش قرار دے دیا جاتا ہے ۔ تجزیہ کار، خبر کار، نیوز چینلز حتیٰ کہ سیاستدان تک اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیتا ہے اور بجائے اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنے اپنی غلطی تسلیم کرنے اور اپنی خرابیوں کو درست کرنے کے فوج کو بڑی آسانی سے ان معاملات میں گھسیٹ لیتا ہے اور باقاعدہ داد بھی وصول کر لیتا ہے ۔ جاوید ہاشمی ایک باوقار اور با اصول سیاستدان گردانے جاتے ہیں۔ کم از کم میں دل سے ان کی عزت کرتی ہوں اور انہیں ملک اور عوام کے ساتھ مخلص سمجھتی ہوں لیکن اس بار ہاشمی صاحب نے جو کردار ادا کیا ہے لگتا یہ ہے کہ فوج سے کوئی پرانا حساب چکایا ہے ۔ ہاشمی صاحب نے خود بطور احتجاج نواز لیگ سے علیحدگی اختیار کی تھی انہیں ان کی خدمات اور قربانیوں کا جو صِلہ دیا گیا تھا وہ انہیں بُرا لگا تھا لیکن جب حکمرانوں نے ملک کے لیے وہی رویہ اپنایا اور عوام نے احتجاج کیا تو

انہیں اس کے پیچھے کوئی قوت نظر آئی اور اس قوت کو انہوں نے بطور دشمن قوت کے لیا۔ جس شخصیت سے آپ کسی ایسی حرکت کی توقع نہ رکھیں اُس کے ایسے رویے کو عوام سنجیدگی اور افسوس سے لیتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک شخصیت کا رویہ نہیں ہے بلکہ بہت سارے لوگ اس رویے کی بنا پر داد وصول کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ہمارے سیاستدان حالات کو کھینچ کھینچ کر خرابی کی طرف لے جاتے ہیں اور بعد میں ہر الزام سے بری الزمہ ہونے کے لیے الزام دوسروں کے سر پر تھوپ دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں لگنے والے تمام مارشلاؤں سے پہلے سیاستدان اس کی خواہش اور کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن اب جبکہ فوج نے سیاسی معاملات کو سیاستدانوں کے حوالے کرنے کا اعلان کر ہی لیا ہے تو برائے خدا معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کریں انہیں بگاڑیں نہیں اور ملک کو اپنی ذات سے آگے رکھیں، اپنی ذات کے لیے مہم جوئی نہ کریں تو کسی اور مہم جُو کو بھی موقع نہیں ملے گا۔ ہر معاملے میں خرابی کی ذمہ داری فوج پر ڈالنے سے پہلے سوچ لیا کریں کہ فوج ایک قومی ادارہ ہے اور اس کو بھی قومی معاملات میں فکر مندی کا حق حاصل ہے ہاں اس کا کام حکومت نہیں حفاظت ہے اور اسی لیے محترم ہے کہ حفاظت ہوگی تو حکومت چلے گی۔ باقی رہا موجودہ حالات تک پہنچنے کا قصہ تو ہمارے حکمران سیاستدان اگر یہ سوچ لیتے کہ پاکستان میں ان کے خاندانوں کے علاوہ بھی بہت ٹیلنٹ ہے کوئی اور مریم، مریم نواز سے زیادہ بہتر سوجھ بوجھ کی مالک ہو سکتی ہے اور کوئی اور حمزہ، حمزہ شہباز سے زیادہ سیاسی فہم

وفراست رکھ سکتا ہے تو وہ بہت سارے الزامات سے بچ سکتے تھے۔پاکستان میں الیکشن میں دھاندلی ہونا یا اس کا الزام لگنا کوئی نئی بات نہیں تھی، اگر حکومت اِن الزامات کو تسلیم نہ بھی کرتی لیکن اِن کی تحقیقات کے مطالبات کو ہی تسلیم کرلیتی اور ایک نئی روایت کی بنیاد ڈال دیتی، آزادانہ تحقیقات کے نتائج کو تسلیم کرلیتی تو زیادہ نیک نام ہو سکتی تھی۔ہٹ دھرمی سے حالات کو کبھی بہتر نہیں بنایا جاسکتا صرف جمہور، جمہوریت اور جمہوری رویے جیسے الفاظ سے جمہوریت نہیں بنتی جمہوری حکومتیں احتجاج کے حق کو بھی تسلیم کرتی ہیں۔ سیاستدان چاہے کسی بھی طرف کے ہوں باہمی افہام و تفہیم سے معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرتے تو ملک اس ڈیڈ لاک سے نہ گزرتا اِن مطالبات سے نہ تو حکمران پارٹی متاثر ہو رہی تھی نہ حکومت۔ لیکن اب اگر مسائل کو الجھا ہی دیا گیا ہے تو اس غلطی کو تسلیم کرکے آئندہ کے لیے احتیاط کا راستہ اپنایا جائے۔پاکستان میں سیاست کا جو مطلب لیا جاتا ہے یعنی حکومت اس کو اگر خدمت سے بدل دیا جائے تو عوام خود، بخود اپنا اختیار ان سیاستدانوں کے ہاتھ میں دے کر مطمئن ہو جائیں گے پھر انہیں کسی ڈی چوک پر آنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور ملک کی معیشت بھی یوں نہ ڈبوئی جائے گی، نہ سکول بند ہو کر تعلیمی حرج ہوگا اور نہ سڑکیں بند ہو کر رسل و رسائل کے مسائل پیدا ہونگے۔جمہورت میں جہاں اور خوبیاں ہوں گی وہاں اپنی غلطی اور دوسرے کا حق تسلیم کرنا بھی اس کا حسن ہے جس کا یا تو شاید ہمارے سیاستدانوں کو علم نہیں اور یا وہ اس

کے قائل نہیں۔ لیکن انہیں آخر کار اس کو ماننا پڑے گا کیونکہ ایک دن انہیں جمہوریت سیکھنی تو ہے اگرچہ وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا رویہ اس کے برعکس ہے۔ اگر وہ اس احتجاج اور اِن حالات کو اپنے لیے چیلنج سمجھ لیں اور اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اور اسے حل کرکے اپنے آپ کو ثابت کرلیں کہ وہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے تو وہ عوام میں نہ صرف اپنا اعتماد بحال کرلیں گے بلکہ مستقبل کے لیے اپنا ایک مثبت تاثر بھی قائم کرلیں گے۔ جاوید ہاشمی اور ان جیسے سیاستدان اگر افواج پاکستان کو مجرم سمجھ کر موردِ الزام ٹھہرانا چھوڑ دیں اور اپنی توانائیاں فوج کے خلاف نہیں بلکہ سیاسی معاملات سیاسی طور پر طے کرنے پر خرچ کریں تو ملک بہت سارے مزید مسائل میں الجھنے سے بچ جائے گا، اسی میں ملک کی بقاء ہے اور ملک کی بقا سے سیاستدانوں کی اپنی بقاء بھی وابستہ ہے۔ سیاستدانوں کے لیے ایک مشورہ دردمندی کے ساتھ کہ حکومت کو خاندانوں کا حق مت سمجھیں بلکہ خاندانوں کو اور خود کو ملک کا خدمت گار گردانتے ہوئے اپنا فرض ادا کیجئے تو عزت خود بخود آپ کا مقدر ہو جائے گی۔

چہرے بدل بدل کر ہمیں مل رہے ہیں لوگ

سیاست اگر دیکھا جائے تو ملک کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور سیاست دان وہ لوگ کہ اگر چاہیں اور واقعی ملک کے مفاد کو ترجیح دیں تو قوم کو قوم بنا دیں اور ملک کو طاقت ۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے سیاست کو ذاتی طاقت اور دولت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اور طاقت بھی ایسی جو علاقے میں آپ کی دھاک بٹھا دے ملک، قوم، سلطنت، ترقی، کمال قومی عزت اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سیاست کرنے اور ایک دفعہ نام کما لینے کے بعد اسے بے دریغ دولت اور شہرت کمانے کے لیے استعمال کرنا ہر سیاستدان اپنا حق سمجھتا ہے، اور بے چارے عوام یہی سوچتے رہ جاتے ہیں کہ چہرہ بدل بدل کر ہمیں مل رہے ہیں لوگ۔ پاکستان تحریک انصاف بنی تو بغیر کسی بڑے سیاسی نام کے لیکن جب سیاسی قوت کے طور پر ابھری تو کئی بڑے نام اس کی طرف لپکے کچھ تو پہلے ہی سے اپنی پارٹیوں سے ناراض تھے لہذا عوام نے بھی اس تبدیلی کو قبول کیا لیکن کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو ہر صورت اسمبلی اور طاقت میں رہنا اپنا حق سمجھتے ہیں لہذا انہوں نے بھی موقع غنیمت سمجھا۔ اعتراض تحریک انصاف پر بھی ہے کہ آخر یہ کس تبدیلی کی بات کرتے ہیں جبکہ خود ان کی پارٹی کے اندر نیا پن کم اور پرانے خیالات زیادہ ہیں بہر حال یہ معاملہ صرف پی ٹی آئی کے

ساتھ نہیں ہوا بلکہ ہر پارٹی میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ہمارے سیاستدان چہرے نہیں نظام بدلنے کی بات کرتے ہیں اور یہ بات کرتے ہوئے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑا معرکہ مار رہے ہیں یا کوئی بہت بڑا فلسفہ پیش کر رہے ہیں وہ خود صرف پارٹی بدل کر سمجھتے ہیں وہ کوئی بہت بڑی تبدیلی لائے ہیں اور اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں کہ ہم نے اختلاف کے باعث پارٹی کو چھوڑا اگرچہ یہ اختلافات اکثر ذاتی ہوتے ہیں اس میں قومی مفاد کا کوئی ذکر نہیں ہوتا اور یا صرف خواہشات کی خاطر ایسا کر لیا جاتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جب جاوید ہاشمی نے مسلم لیگ (ن) کو چھوڑا تھا اور ان کے منانے پر بھی واپس نہیں گئے تھے اور تحریک انصاف کا حصہ بنے تھے تو لگتا یہی تھا کہ یہ اس بار اپنے فیصلے پر قائم رہ لیں گے اور اسلامی جمیعت طلبہ کی چھتری بدلنے کے بعد جنرل ضیاء کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ کرکے مسلم لیگ (ن) کی بھٹی میں تپ کر یہ اتنے مضبوط ہو چکے ہونگے کہ اب میدان نہ چھوڑیں گے لیکن ایک بار پھر انہوں نے فرار کو بغاوت کا نام دے کر اپنی تاریخ دہرالی اور اس بار انہوں نے فوج کو بھی معاملے میں گھسیٹ لیا جو کہ ہماری سیاست میں ایک عام رواج بن چکا ہے۔ فوجی آمروں کی سیاسی نرسری میں لگنے اور پنپنے والے یہ پودے جب کچھ قد کاٹھ نکال کر لیتے ہیں تو سب سے پہلے فوج کو ہدف تنقید بنا کر خود کو سیاسی مدبر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاشمی صاحب اس دوڑ میں اکیلے نہیں ہماری سیاست میں یہ رواج اتنا عام ہو چکا ہے کہ اب تو کوئی اس پر شرمندگی

بھی محسوس نہیں کرتا، کل کے دوست بلکہ مربی آج کے مخالف بن جاتے ہیں اور مخالفین جن کی مخالفت میں آخری حد تک جایا جا چکا ہوتا ہے دوست بن جاتے ہیں اور خوبصورت توجیہہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ سیاست میں کچھ بھی حرف آخر نہیں۔ ماروی میمن اس نظریے کی ایک اور زندہ مثال ہیں جنھوں نے آئی ایس پی آر میں بیٹھ کر سیاست اور میڈیا میں چلنا سیکھا، جنرل مشرف کی اہم ترین ساتھی رہیں اور اسی ناطے نواز شریف کی اہم ترین مخالف لیکن آج وہ ق لیگ کی بجائے ن لیگ کی مدح سرائی اور طاقت و اختیارات کے حصول کی دوڑ میں مصروف ہیں۔ ایک زمانے میں تو کچھ ایسی ہی اطلاعات خواجہ سعد رفیق جیسے اہم ن لیگی کے بارے میں بھی پھیلیں لیکن بہر حال ابھی تک وہ اپنی پارٹی میں قائم ہیں اور بڑی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے اپنے لیڈروں اور جماعت کے ساتھ وفاداری دکھا رہے ہیں۔ نبیل گبول کی پی پی پی سے ایم کیو ایم کی طرف ہجرت، ارباب خضر حیات کی تبدیلی جماعت کی عادت اور امیر مقام کی ق لیگ چھوڑ کر ن لیگ میں شمولیت یہ اس فہرست سے صرف چند مثالیں ہیں ورنہ قیام پاکستان سے اگر یہ گنتی کی جائے تو فہرست انتہائی طویل ہو جائے گی۔ اگر پاکستان میں سیاست میں مستقل مزاجی رواج پا یا جائے اور کرپشن اور بد عنوانی کی بنا پر پارٹی خود ہی اپنے ارکان کو فارغ کر دیا کرے اور یہ پابندی لگا دی جائے کہ ثابت شدہ الزامات کے بعد کوئی دوسری پارٹی ایسے سیاستدانوں کو ٹکٹ ہی نہ دے تو شاید یہ لوگ ملک کی خاطر نہ سہی اپنی عزت اور ممبری بچانے کے لیے ہی محتاط رہیں

سیاسی اکھاڑ پچھاڑ بھی کم ہو اور توجہ ملکی ترقی پر رہے ورنہ ایک جماعت کی حکومت جانے، پر دوسری جماعت میں ہجرت کا تناسب بڑھتا ہی جائے گا اور سیاست دان عوامی مسائل اور قومی ترقی کی بجائے اپنے مسائل کے حل اور اپنا اثر ورسوخ بڑھانے میں ہی لگے رہیں گے جبکہ اب ملک اس قسم کی حرکات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ دنیا ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکی ہے اور سرپٹ دوڑ رہی ہے، میں یہ نہیں کہتی کہ دوسرے ممالک میں سیاسی مسائل نہیں ہوتے ہیں لیکن سیاسی اور ذاتی مفادات میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ ہمارے سیاستدان اگر بیرون ملک جائیدادیں بنانے سے فرصت پالیں اور وہاں کی سیاست کے اچھے پہلوؤں کا مطالعہ کریں اور انہیں اپنے ملک کے تقاضوں کے مطابق قابل عمل بنا کر ان پر عمل درآمد کریں تو یقیناً ہم بھی ان ملکوں کے ساتھ ترقی اور خوشحالی کی دوڑ میں شامل ہو سکیں گے۔ اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہمارا حامی و ناصر ہو۔

چینی صدر کا دورہ بھارت۔۔۔ اصل کہانی

چین اس وقت نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کی بہت بڑی سیاسی، عسکری اور تجارتی طاقت ہے۔ خاص کر دنیا بھر میں تجارت پر چین چھایا ہوا ہے اور ایک اندازے کے مطابق شاید ہی دنیا میں کوئی گھر نہ سہی علاقہ ایسا ہو جس میں چینی ساختہ کوئی چیز نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ چینی حکام کے بیرونی دوروں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ حال ہی میں چینی صدر ژی جن پنگ نے بھارت کا دورہ کیا۔ یہ دورہ ایک بہت بڑا تجارتی دورہ سمجھا جا رہا تھا بلکہ خود ایک چینی ڈپلومیٹ نے دورے سے پہلے ممبئی میں صحافیوں کو بتایا کہ چین بھارت میں سو ارب ڈالر کی سرمایا کاری کرے گا لیکن دورے کے اختتام پر اس سرمایہ کاری کا حجم بیس ارب ڈالر رہا۔ اس دورے کے دوران بھارت اپنی مکارانہ ذہنیت کا کئی جگہوں پر، بلکہ مسلسل مظاہرہ کرتا رہا۔ جس سے وہ چین کو ایک قابض اور غاصب ملک ثابت کرنے اور چین پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ کہ وہ بھات کی مرضی کے مطابق اپنے فیصلے کرے۔ وہ سرحدی تنازعات کو بھی اپنے مفادات اور ترجیحات کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرتا رہا نہ کہ بین الاقوامی اصولوں کو مد نظر رکھ کر اور انہی وجوہات کی بنا پر چینی صدر کا دورہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں گردانا جاسکتا اور اس صورت حال کی ذمہ داری خود بھارت کے اوپر عائد ہوتی ہے جو بہر صورت خود کو

علاقے کا چوہدری سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو وہ چاہے وہ کیا جائے۔ بھارت کا غیر ذمہ دار اور غیر ضروری مستعد میڈیا بھی اپنی حکومت کی طرح کچھ بھی کرنا اپنا حق سمجھتا ہے اور اسی لیے چینی صدر زی جن پنگ کو مسٹر ایلون کہہ کر پکارتا رہا جو کسی بھی مہمان کے لیے قابل احترام طریقہ نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ خیر یہ تو ایک پہلو یا طریقہ تھا خود کو برتر ثابت کرنے کا ورنہ ایسی کئی کوششیں مسلسل نظر آتی رہیں۔ حیدر آباد ہاوس دہلی میں بھارتی وزیراعظم مودی اور چینی صدر کی ملاقات کے وقت تبتی طلبہ چین کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔اس سے پہلے ان احتجاجی طلبہ نے تاج ہوٹل جہاں چینی صدر ٹھہرے ہوئے تھے کے باہر مظاہرہ کیا اور یہ چین کے خلاف پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے ایک قوی رائے یہ ہے کہ یہ طلبہ خود سے اکٹھے نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں بھارتی حکومت کی ایماء پر اکٹھا کیا گیااور چینی صدر کو یاد دلایا گیا کہ انہوں نے تبت پر قبضہ کیا ہوا ہے جو انہیں چھوڑ دینا چاہیے یہ بات یقینی یوں بھی ہو جاتی ہے کہ جب چینی صدر نے بھارت سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ دلائی لاما کی جلاوطن حکومت کی تائید کرنا چھوڑ دے اور اپنی سرزمین پر ان کی نقل و حمل کو محدود کر دے اور ان پر پابندی لگادے تو مودی نے اس سے انکار کر دیا۔ اسی طرح بھارت نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ چین جموں وکشمیر اور اروناچل پردیش کے باشندوں کو سٹیپل ویزا کیوں دیتا ہے بھارت کا مطالبہ تھا کہ یہ سہولت ختم کر دی جائے لیکن چینی صدر نے اس پر کسی

سمجھوتے سے انکار کر دیا اور یوں ان دونوں ریاستوں کی مقبوضہ حیثیت چینی نکتہء نظر کے مطابق برقرار رکھی گئی۔ گجرات حکومت نے اسی سلسلے میں چین کو خوش کرنے کے لیے 22 ستمبر کو جو نقشہ شائع کیا اُس میں جموں و کشمیر اور اروناچل پردیش کو متنازعہ جبکہ ہمالائی صوبے اکسائی کو چین کا حصہ دکھایا گیا جس پر کانگریس نے شدید احتجاج بھی کیا اور بی جے پی نے اُسے انفرادی غلطی قرار دیا کہ اس نقشے سے حکومت کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ تاہم چین نے بھارت کے ویزا موقف کو ماننے سے انکار ہی کیا۔ بھارت نے لداخ کا مسئلہ بھی اسی دورے کے دوران اٹھایا اور اعتراض کیا کہ چین کے ایک ہزار فوجی چار پانچ کلو میٹر تک بھارتی سرحد کے اندر آ گئے ہیں اگرچہ بھارت اس کے جواب میں اپنے پندرہ سو فوجی ادھر بٹھا چکا ہے تاہم بھارت کے اس اعتراض کو بھی رد کر دیا گیا۔

بھارت نے اس دورے کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی کہ وہ چین سے اپنی بات منوائے گا وہ اُس میں کامیاب نہ ہو سکا اور مسائل اپنی جگہ ویسے کے ویسے ہی رہ گئے۔ اُس نے چینی حکومت کو حیثیت بھی نہ دی جس کا وہ مطالبہ کرتا ہے یعنی ون چائنا، جس کے مطابق تائیوان کو چین کا حصہ مانا جانا چاہیے، اُس نے نہ تو دلائی لاما کی جلاوطن حکومت کی مدد سے دستبرداری کا عندیہ دیا اور نہ ہی ون چائنا اور تائیوان کے مسئلے پر چین کے موقف کو اہمیت دی، دوسری طرف چین

کی طرف سے سو ارب ڈالر کی متوقع سرمایہ کاری کا حجم بھی سکڑ کر بیس ارب ڈالر تک رہ گیا اور ظاہر ہے کہ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ اگر صرف تبتی طلبہ کے مظاہرے اور چین کے خلاف احتجاج کو ہی لیا جائے تو بھی چین اور چینی حکومت کو دنیا کے سامنے غاصب اور قابض بنا کر پیش کیا گیا اگر بھارتی حکومت اس واقعے سے لا تعلّقی کا بھی اظہار کرے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے ملک کی اتنی بڑی پولیس ان طلبہ کو نہ روک سکی یہ بھارتی حکومت کی ایک اور ناکامی کہی جا سکتی ہے۔ بہر حال بھارت میں اس دورے کا جو انتظار کیا گیا معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ انتظار چین پر اپنی برتری جتانے کے لیے تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت چین نہ صرف بھارت سے ایک بہت بڑا ملک ہے بلکہ ایک بہت بڑی عسکری، اقتصادی اور تجارتی طاقت بھی ہے لہذا بھارت کی کسی ایسی منصوبہ بندی کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے اور اسی لیے کوئی کامیابی اُس کے حصے میں آئی بھی نہیں۔

اگر ان تمام حقائق کو مد نظر رکھا جائے اور اسے بڑی آسانی سے اگر ناکام دورہ نہ کہا جائے تو کامیاب بھی نہیں کہا جا سکتا اور یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت اپنے پڑوسیوں سے کبھی خوشگوار تعلقات کا نہ خواہاں ہے اور نہ اس کے لیے کوشش کرتا ہے اس کا ایک ہی اصول ہے کہ ہر صورت اپنی برتری قائم کی جائے چاہے اس کے لیے وہ اپنی خفیہ ایجنسیوں اور جاسوسوں کو استعمال کرے،

اپنے غیر منطقی قسم کے میڈیا کو اور یا مودی جیسے لوگوں کو وزیر اعظم بنا کر۔ لیکن بھارت کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھے تعلقات اس کے لیے امریکہ اور یورپ کے ساتھ تعلقات سے زیادہ اہم ہیں۔ بھارت کے ننگے بھوکے عوام کے تن اور پیٹ اسلحے سے نہیں بھرے جا سکتے لہذا اُسے آس پاس جنگی ماحول بنانے کی بجائے امن اور بہتر باہمی روابط پر توجہ دینا ہو گی تاکہ ایک پُر امن جنوبی ایشیا اور پُر امن علاقے کی تخلیق کی جا سکے۔

چالیس صحافی خواتین کو بعوض پانچ لاکھ ڈالر

ثقافت ، رسوم اور رواج کسی بھی معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں اور صدیوں سے چلے آتے ہیں بلاشبہ کہ اِن میں سے بہت سے ناپسندیدہ بھی ہوتے ہیں اور تنقید کا نشانہ بھی بنتے ہیں لیکن اکثر ان کا تعلق کسی مخصوص معاشرے کی ضروریات سے جڑا ہوتا ہے اِن پر اس معاشرے کے مذہب کی ایک گہری چھاپ بھی ہوتی ہے۔ اِن کو تبدیل کرنا کچھ آسان نہیں ہوتا اور ایسا کرنے سے معاشرے میں جوار بھاٹا ضرور اٹھتا ہے۔ لیکن اگر آج کل کے دور میں دیکھا جائے تو صرف چند سال کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک نئے خدوخال والا معاشرہ تشکیل پا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں میری نظر میں پہلا قدم لباس کی تبدیلی ہے کیونکہ اسے فیشن کے نام پر بہت جلدی بدل لیا جاتا ہے اور معاشرتی بے رہروی کو گھر کے اندر تک رسائی مل جاتی ہے۔ فیشن کی تبدیلی میں کوئی حرج بھی نہیں لیکن اگر اس میں سے اپنی اقدار کو خارج کر دیا جائے تو خرابی ناسور کی طرح وجود کے اندر تک سرایت کر جاتی ہے پھر اپنے دفاع کے لیے خیالات بھی بدل لیے جاتے ہیں اور خیالات بدلتے ہیں تو اعمال بدلنا بھی آسان ہو جاتے ہیں اپنے اقدار کو فرسودہ خیال کر کے ان سے جان چھڑا لی جاتی ہے اور پھر بات کا مذہبی اقدار تک پہنچ جانا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ فرائض تو ادا کر ہی لیے

جاتے ہیں لیکن اِن کے بھی اپنے اصول و ضوابط مرتب کر لیے جاتے ہیں۔
آج کے دور میں میڈیا نے صدیوں کے اس عمل کو سالوں تک محدود کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنے معاشرے میں بہت بڑی تبدیلی دیکھتے ہیں ۔ ہمارا میڈیا اس مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے اور بے دریغ ہو رہا ہے ۔ میڈیا لاکھ چیخے کہ وہ کسی سے فنڈز نہیں لیتا اینکرز لاکھ پارسا بنیں اور چیلنجز دیتے رہیں کہ آئے اور کوئی ثابت کرے کہ انہوں نے کوئی غیر ملکی فنڈ وصول کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہو رہا ہے۔ اور مغرب بہت مستقل مزاجی اور چالاکی سے میڈیا کے ذریعے تیسری دنیا کے خلاف بالعموم اور اسلامی ممالک کے خلاف بالخصوص جنگ لڑ رہا ہے ۔ امدادی منصوبوں کے ذریعے وہ اب بھی اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مشنری جذبے کے تحت کام کر رہا ہے۔ براہ راست کسی کانونٹ میں یا کسی گرجے میں چند لوگوں کو بٹھا کر تبدیلی مذہب نہیں کروا رہا بلکہ اب وہ معاشرے اور مذہب کی جڑوں اور بنیادوں میں پانی دے رہا ہے تاکہ پوری عمارت کو منہدم کر دیا جائے اور یہ کام این جی اوز کے ذریعے لوگوں کی مدد کے نام پر باآسانی کیا جا رہا ہے۔ ایسا ہی ایک منصوبہ کیئر انٹرنیشنل پاکستان کو سونپا گیا ہے کہ وہ خواتین کے معاشی استحکام کے لیے کام کرے۔ اگر حقیقت میں یہ منصوبہ صرف اسی حد تک محدود رہتا تو یقیناً قابل ستائش تھا لیکن بظاہر اس خوبصورت نام اور جذبے کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں وہ انتہائی

بھیانک ہیں جس کے لیے چالیس صحافی خواتین کو بعوض پانچ لاکھ ڈالر خریدا جائے گا اور انہیں ایشیائی مسلم ممالک میں بھیجا جائے گا جہاں وہ خواتین اور مردوں میں مساوات کے لیے کیے گئے کام کا مطالعہ کریں گی بات یہاں تک بھی درست لیکن جب اِن خوشنما اقدامات کی آڑ میں اسلام کے اصولوں کو توڑ کر مرد اور عورت کو ایک ہی ماحول، انداز اور لباس میں ملبوس کرکے معاشرے میں لایا جائے گا تو وہ جوار بھاٹا اٹھے گا جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا اور جس کے مظاہر معاشرے میں مذہبی بے راہروی اور مذہبی انتہا پسند دونوں صورتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک طبقہ مذہب سے دور ہوتا جاتا ہے تو دوسرا شدت پسندی سے اس طبقے کی مخالفت کرے گا اور دونوں صورتوں میں دشمن کا ایجنڈا پورا ہوتا رہے گا۔ اور یہ سب کرنے کے لیے ہی کیئر انٹر نیشنل پاکستان کو ذمہ داری سونپی گئی ہے اور میڈیا کو ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر چنا گیا ہے۔ ویسے اگر یہ سب نہ بھی ہو تو ہمارا میڈیا خود بھی ماڈرن ازم اور جدت پسندی کے شوق اور زعم میں سرپٹ دوڑتے ہوئے اپنے سُموں نیچے سب کچھ روند رہا ہے۔ نہ تو اس کے ڈرامے دیکھنے کے قابل ہیں نہ اشتہارات نہ مارننگ شوز اور یہاں تک کہ حالات حاضرہ کی اینکرز خواتین بھی اکثر ایسے لباس اور انداز میں نظر آتی ہیں جو معاف کیجئے گا کسی شریف خاندان میں ہرگز پسند نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں امریکہ جیسے ممالک سے پیسے لینے کے بعد تو یہ لوگ اپنے اُن داتاؤں کو خوش کرنے کے لیے نئی حدود دریافت کرکے ان آخری حدود

تک بھی پہنچ جاتے ہیں اور اس سب کچھ کے عوض مزید فنڈز اور پیسہ ان کے بینکوں تک پہنچ جاتا ہے اور ان کی آنے والی نسلیں مالی طور پر مزید خوشحال ہو جاتی ہیں اور ہمارے غریب عوام یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب اور امریکہ کو ان کی غربت، بھوک اور افلاس کے غم میں نیند نہیں آتی۔ انہیں صرف اپنی روٹی اپنے کپڑے اور خوشحالی سے غرض ہے کہاں سے اور کیسے سب کچھ آئے وہ اس کے بارے میں تردد کرنے کی سوچ ہی نہیں رکھتے۔ وہ تو این جی اوز کے مشکور ہو جاتے ہیں کہ انہیں بیس مرغیاں، پانچ کدالیں دو بیلچے اور کچھ بیج دے گئیں جن سے ان کی معاشی حالت میں ایک اچھی تبدیلی آتی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان تھوڑی سی چیزوں کے عوض ان کے ملک کے نام کو بیچا گیا اُسے بدنام گیا۔ پاکستان میں خواتین کے ساتھ زیادتی اور تشدد ہوتا ہے لیکن پردہ نہ زیادتی ہے نہ تشدد یہ ہمارے مذہب کا حکم ہے اور بہت سی معاشرتی برائیوں سے بچنے کا ایک محفوظ اور آسان ذریعہ لیکن کم لباس مغرب اسے جس منفی طور پر پیش کرتا ہے وہ بذات خود ایک سازش ہے۔ ایک معصوم دیہاتی عورت نے ایک ایسی ہی این جی اوز دہ خاتون کے بارے میں بتایا کہ کیسے اُس نے گاؤں کی چندان پڑھ خواتین کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے انگریزی زبان میں تقریر فرمائی اور انہیں خطاب سے پہلے ہدایات دیں کہ وہ اپنے چہرے مکمل طور پر ڈھانپ لیں سوائے آنکھوں کے کچھ نظر نہ آئے ایک خاتون کے چہرہ کھولنے پر اُسے سرزنش کی گئی۔ یہ خواتین اَن پڑھ ضرور تھیں مظلوم نہیں لیکن کیا معلوم انگریزی میں انہیں

کتنا مصیبت زدہ بیان کیا گیا اور ان کے نام پر کتنا کچھ وصول کیا گیا وہ خاتون یا این جی او دوبارہ اُس گاؤں میں نظر نہیں آئی لیکن پاکستانی عورت کی مظلومیت بھری داستان اور دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کر دیا گیا۔ سوات میں عورت اور کوڑے والی کہانی بھی پاکستان کی بدنامی کے لیے کافی تھی۔ مغرب تو کھلم کھلا ہماری روایات کو بدلنے کی مہم پر نکلا ہوا ہے بیانگ دہل اسلام کی مخالفت کرتا ہے ہماری کچھ کا نام دے کر ہمارے نا خواندہ معاشرےsocial abuses بہت اچھی روایات کو بھی کو بہکاتا ہے، عورت کے لیے پاکستان کو خطرناک ترین ملک قرار دیتا ہے، ملالہ اور شرمین عبید کو اس کے لیے ایوارڈ دیتا ہے، مختاراں مائی کو ہیروئن بنا کر پیش کرتا ہے یہ سب کچھ اُس کے حق میں اچھا ہے اور وہ اسے کر رہا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کیوں اس کے ہاتھ بِک جاتے ہیں چند لاکھ ڈالر اور یورو کیوں ہمیں یہ بھلا دیتے ہیں کہ ہم ان کے عوض اپنی شناخت کھو دیں گے ہماری حکومتیں اپنے سیاسی داؤ پیچ سے فارغ ہو جائیں، رشوت اور کرپشن سے اپنے محلات تعمیر نہ کریں، اپنا وقت اور اپنا نہ سہی عوام کا پیسہ ہی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے لگا دیں تو ہم یو ایس ایڈ اور کیئر انٹرنیشنل جیسی تنظیموں کے محتاج نہ رہیں۔ عوام کی فلاح و بہبود اور ان کے معاشی حالات میں بہتری لانا اپنی حکومت کا کام ہے کسی غیر ملکی این جی او کا نہیں مگر حکومت اگر اپنی نیند میں خلل برداشت کر سکے اور اسے اپنے ذاتی بزنس سے فرصت ملے تو وہ عوام کی.

طرف توجہ دے لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ اِن منصوبوں میں حکومت کا کتنا حصہ ہے میرے جیسے لوگ نہیں جانتے باخبر لوگ اگر بتا سکیں تو عوام مشکور ہوں گے۔

بھارتی اشتعال انگیزی پر حکومتی خاموشی

27 ستمبر کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 69 ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیرِ اعظم پاکستان جناب نواز شریف نے عالمی برادری کو یاد دلایا کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور اقوام متحدہ کے ریکارڈ پر سب سے پرانا غیر حل شدہ مسئلہ ہے جسے اقوام متحدہ نے استصواب رائے کے ذریعے حل کرنے کی قرارداد منظور کی تھی اور پاکستان آج بھی اس کے لیے تیار ہے۔ جناب وزیر اعظم نے کشمیر کی بات اقوام متحدہ میں کی اور بڑے زور و شور سے کی جو یقیناً بھارت کو کسی طرح نہیں بھائی۔ بھارت نے ہفتہ پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کسی بھی بین الاقوامی فورم پر کشمیر کی بات کرنا پاک بھارت مذکرات کو نقصان پہنچا سکتا ہے تاہم وزیر اعظم پاکستان نے قوم کی خواہشات کے عین مطابق بات کی اور ساتھ ہی بھارت کے مذاکرات ختم کرنے کی بھی مذمت کی انہوں نے نئی دہلی کے اس مطالبے کو بھی ماننے سے انکار کیا کہ کشمیر کو بنیادی مسئلہ نہ کہا جائے۔ نواز شریف کی تقریر کے بعد بھارتی میڈیا نے بھی طوفان اٹھایا اور مذاکرات کی معطلی سمیت کئی الزامات پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیے اور حسب معمول یوں شور مچایا جیسے پاک بھارت تعلقات کی ناکامی اور مشکلات کے لیے پاکستان ہی ذمہ دار ہے اور اسی کی وجہ سے پاک بھارت تعلقات بحال نہیں ہو پا رہے یا کشمیر کا مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکا ہے

۔جبکہ سچ یہ ہے کہ بھارت نے کبھی اس مسئلے کو حل کرنے کی نہ کوئی کوشش کی اور نہ ہی ایسی کوئی کوشش کامیاب ہونے دی ہے۔کچھ ہماری طرف سے بھی اس مسئلے پر سنجیدگی نظر نہیں آرہی اور اگر کبھی سنجیدگی سے بات کی جائے تو بھارت بھی پوری سنجیدگی سے اس کا جواب کچھ ایسے دیتا ہے جیسے وہ پاکستان کو بات کی سزا دے رہا ہے چنانچہ اب بھی ایسا ہی کیا گیا اور وزیراعظم پاکستان کی تقریر کے بعد عید الاضحٰی کے پہلے ہی دن جب دونوں طرف کے کشمیری مسلمان عید منا رہے تھے بھارتی فوج نے اپنی خباثت دکھاتے ہوئے ان پر گولہ باری شروع کر دی اور اب تک وہ تسلسل سے اپنی کاروائی جاری رکھے ہوئے ہے جس کے نتیجے میں اب تک تیرہ شہادتیں ہو چکی ہیں ایسا کچھ پہلی بار نہیں ہوا ہر قومی یا مذہبی تہوار کے دن بھارت ان نہتے کشمیری اور پاکستانی شہریوں کے اوپر گولہ باری کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور ساتھ ہی الزام بھی پاکستان کے اوپر دھر دیتا ہے اس بار بھی اُس نے پاکستان کو ہی پہل کا موردِالزام ٹھرایااور بقولِ بھارتی وزیراعظم مودی کے بھارت اس کا موثر جواب دے رہا ہے یعنی ہمیشہ کی طرح چوری بھی اور سینہ زوری بھی ۔ظاہر ہے کہ پاکستانی فوج اپنی عید کی مصروفیات چھوڑ کر، عید کے دن وقت نکال کر بھارت پر حملہ آور کیوں کر ہو وہ بھی جبکہ دوسری طرف بھی مسلمان ہی رہتے ہوں اور ہوں بھی وہ بے بس اور ہندو جیسی مکار قوم کے غلام اور اکثر اوقات ان کے زیر عتاب بھی رہتے ہوں۔بھارت نہ تو اپنے رویے پر کبھی شرمندگی محسوس کرتا ہے اور نہ اپنی

غلطی تسلیم کرتا ہے اور نہ کشمیر کے بارے میں کوئی بات کرنا اور سننا گوارا کرتا ہے لیکن دوسری طرف ہماری حکومتیں اور خاص کر موجودہ حکومت بھارت کی ناراضگی مول لینے کے لیے کسی بھی طور تیار نہیں۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں تو وزیر اعظم نے کھل کر بات کی لیکن اپنے شہریوں کی بے گناہ شہادتوں پر انہوں نے اور حکومت نے چپ سادھ لی جب آرمی چیف نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی بات کی تب بھی ہماری معزز حکومت نے ایسا کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور تقریبا ہفتہ دس دن بعد انتہائی محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا گیا کہ پاکستان امن کا خواہاں ہے لیکن اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم اپنا دفاع کرنا جانتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ امن کی خواہش بہت اچھی ہے اور ہم اپنا دفاع کرنا بھی جانتے ہیں اور اسی لیے ہماری فوج بھارتی گولہ باری کا بر وقت اور موثر جواب بھی دے رہی ہے لیکن حکومت کے موقف میں کوئی مضبوطی نظر نہیں آرہی نہ ہی ہماری وزارتِ خارجہ اور نہ ہی سفارت کار عالمی سطح پر کشمیر کا مقدمہ اس طرح لڑ رہے ہیں جیسا کہ لڑنا چاہیے۔ ادھر جب مودی اپنی فوج اور اس کی کاروائی کے حق میں بیان دے رہا ہے ہمارے وزیر اعظم چپ سادھ کر بیٹھے ہوئے ہیں لگتا ہے کہ یا تو وہ اپنے عام شہریوں کی پڑوسی لیکن دشمن ملک کی فوج کے ہاتھوں ہلاکت کے بارے میں بات کرنا اپنے عہدے کے شایان شان نہیں سمجھتے اور یا وہ بھارت سے اپنے ذاتی تجارتی تعلقات اور مفادات کو خراب نہیں کرنا چاہتے۔ اور یہی ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے حکمران اپنے ذاتی

مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ قومی مفادات کو کچھ ایسے پس پشت ڈال دیتے ہیں جیسے وہ ان کی ذمہ داری میں آتے ہی نہ ہوں۔ امن کی خواہش اپنی جگہ لیکن کیا دشمن کو یہ اجازت دینا بھی امن کی خدمت ہے کہ وہ جب چاہے ہماری سرحدوں پر بارود برسائے اور جب چاہے ہمارے شہریوں کو ہلاک کرے۔ حکومت کو سوچنا چاہیے کہ شوگر ملوں، سیمنٹ فیکٹریوں اور دیگر سرمایہ کاری کے لیے انہیں اور زمینیں اور منڈیاں بھی میسر آجائیں گی لیکن انہیں وزارت اعظمیٰ یہی بد قسمت پاکستان دے سکتا ہے جس کی بد قسمتی یہ ہے کہ اسے اپنے بانی کے بعد کوئی مخلص قیادت میسر نہیں آئی اور ہر حکمران کے برسر اقتدار آنے سے پہلے کے تمام دعوے عوامی مینڈیٹ حاصل ہونے کے زعم میں نخوت اور تکبر کی نظر ہوتے گئے یہاں تک کہ اپنے شہریوں کی دشمن کے ہاتھوں ہلاکت کی مذمت کرنا بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ ہمارے جنابِ وزیرِ اعظم اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ جنرل اسمبلی میں کشمیر کی بات کرکے انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ حکمرانی کا فرض حکمرانی کے آخری لمحے تک جاری رہتا ہے بلکہ اس کے بعد بھی چلتا رہتا ہے کیونکہ تاریخ ایک عام آدمی کی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کو تو معاف کر دیتی ہے لیکن حاکم کی ہر لغزش اس کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتی ہے اور آنے والی نسلیں بھی اُس کا حساب کرتی رہتی ہیں۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور برصغیر کی بد امنی کی واحد وجہ، پہلے اس کے حل کے لیے کوشش کیجیے پھر تجارت بھی کیجیے اور دوستی بھی لیکن قومی حدود

اور تقاضوں کے اندر رہتے ہوئے ان کا سودا کرکے نہیں۔

بھارت سے تجارت اور ہماری خودداری

آج کی دنیا میں اگر کوئی ملک کسی مد میں اپنی تمام تر ضروریات پوری کر بھی سکتا ہے تو بھی ورائٹی اور کوالٹی کی بھرمار ہونے کی وجہ سے دوسرے ممالک سے تجارت کیے بنا نہیں رہ سکتااور تجارت ہمیشہ دو طرفہ ہی ہوتی ہے چاہے اس کا تناسب کچھ بھی ہو۔ یہ تجارت اگرپڑوسی ممالک سے ہو تو اس کے اخراجات بھی کم ہوتے ہیں اور کم وقت میں زیادہ تجارت بھی ممکن رہتی ہے یوں اسے نعمت سمجھنا چاہیے اگر نزدیک ترین منڈی میسر آجائے۔

پاکستان اگرچہ بہت.بڑا سرمایہ کار اور تاجر ملک نہیں ہے لیکن انتہائی زیادہ آبادی والے خطے میں واقع ہونے کی وجہ سے.بڑی منڈیاں اس کو بہت نزدیک پڑتی ہیں جن میں سے ایک پڑوسی ملک بھارت بھی ہے جس سے.برابری کی بنیاد پر دو طرفہ تجارت ہماری خوش قسمتی ہوتی لیکن پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ بھارت جیسا ملک اس کا پڑوسی ہے جو ہر صورت میں پاکستان کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔پاکستان کے حکمران اپنی تمام تر کوشش کے باوجود بھارت کو.برابری کی بنیاد پر تجارت پر راضی نہیں کرسکے ہیں اور بھارت اپنی.بری نیت کا ہر موقع پر اظہار کرچکا ہے۔پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدے کی رو

سے تجارتی ویزہ کے لیے پولیس رپورٹ ضروری نہیں ہوگی لیکن بھارت نے نئی دہلی میں ہونے والی عالیشان پاکستان نامی تجارتی نمائش کے لیے جانے والوں کو اس سہولت سے فائدہ اٹھانے پر اور پولیس رپورٹ نہ دینے پر چالیس ڈالر کے حساب سے جرمانہ کیا۔ یعنی ایک نمائش میں شرکت کرنے پر بھی پاکستانیوں کی توہین کی اور ان کو قابل اعتبار نہیں سمجھااور خود ہی اپنے بھی اصول و ضوابط بالائے طاق رکھ دیئے اور ایسا صرف اس لیے کیا گیاتاکہ یہ تاجر سبکی محسوس کریں اور آئندہ بھارت میں اپنی کوئی چیز متعارف نہ کرا سکیں۔ہاں ہمارے ملک کے حکمران خود بھارت سے تجارت کے سب سے بڑے مدعی بن جاتے ہیں کیونکہ یہاں ان کا ذاتی فائدہ ہے جو ان کے لیے ملکی مفاد سے بڑھ کر ہے کیونکہ انہیں اپنی تجارت ہر صورت بڑھانی ہے۔ کہیں انہیں امن کا پیامبر بننے کا شوق ہے تاکہ دنیا کی نظروں میں عظیم بن سکیں اور کہیں بہت روشن خیال۔ دوستی میں اعتراض کسی پاکستانی کو نہیں ،مجھے بھی نہیں لیکن ملک اور اس کے وقار کی قیمت پر نہیں۔ پہلے ہم بنیادی مسئلہ یعنی کشمیر حل کرلیں ،اس کے ساتھ پانی کا مسئلہ تو خود بخود حل ہو جائے گا اور اسی طرح اگر دیگر سرحدی تنازعوں کو حل کرلیں تو پھر امن قائم کرنے کے لیے کسی ثالث کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی امن کی آشا جیسے میڈیا پروگراموں کی۔ ویسے یہ کوشش کسی ایک پروگرام یا چینل تک محدود نہیں ہمارا ہر ٹی وی چینل سرحد پر فائرنگ اور شہادتوں کی خبر دے کر اپنے نیوز چینلز پر بالی ووڈ کے ستاروں کی خبریں، ان کی فلموں کے واہیات

مناظر دکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے اور یہاں سے کوئی خبر نہ بھی ملے تو بھی کوئی فکر نہیں کیونکہ ہمارے میڈیا کے پاس لاتعداد ایسے اشتہارات موجود ہیں جن میں کترینہ کیف کرینہ کپور اور کئی موجود ہیں۔ عوام کی تسلی کے لیے اگر کوئی اینکر بیٹھ کر بھارت کی سرحدی خلاف ورزیوں کے خلاف بات بھی کرتا ہے تو اسی گروپ کا انٹرٹینمنٹ چینل اس کا کوئی نہ کوئی ڈراما چلا رہا ہوتا ہے۔ گلوبلائزیشن کے نام پر ہم اپنی اقدار کا بیڑہ ویسے ہی غرق کر چکے ہیں لیکن بھارت کے معاملے پر تو مسئلہ ہی کچھ اور ہے یہاں تو ہم اپنے ملک کی بہتری پر توجہ دینے کی بجائے اُن کی ترقی کو فخر سے پیش کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی صنعتی ترقی پر اتنے نازاں نہیں ہوں گے جتنا ہم اُس پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایک بڑا اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک موجود ہے۔ جواباً وہاں سے عوام پاکستان مخالف نعروں والی جماعت کو منتخب کرتے ہیں اور مودی کو پاکستان دشمنی کے ہی بدلے ووٹ دیا جاتا ہے بلکہ وزیراعظم بنا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کانگریس نے بھی اپنے دور اقتدار میں کبھی پاکستان کے ساتھ نہ خلوص دکھایا نہ دوستی اور نہ امن کی کوشش کی بلکہ ہر طرح کے الزامات پاکستان پر ہی ڈالتا رہا ممبئی حملے بھی سب کے ذہن میں ہیں، سمجھوتہ ٹرین، مالے گاؤں، پارلیمنٹ حملہ اور ان جیسے بے شمار واقعات جب بھارت نے واقعہ ہوتے ہی بغیر کسی تحقیق و تصدیق کے واقعے کی فوری خبر کے ساتھ پاکستان کے ملوث ہونے کا اعلان کر دیا چاہے پھر یہ بات ثابت ہو جاتی

کہ واقعے میں پاکستان کا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ مجرم پکڑے بھی جاتے تھے جو خالصتاً بھارتی شہری ہوتے تھے اور ان میں کرنل پروہت جیسے لوگ بھی تھے جو بھارت سرکار کا ملازم اور فوج کا حاضر سروس کرنل تھا۔ لیکن بی جے پی اور خاص کر مودی کا معاملہ تو اور بھی خاص ہے کہ یہ اپنی پاکستان دشمنی کا ہی ووٹ حاصل کرتے ہیں اور اپنے اس وصف کے لیے ہی شہرت رکھتے ہیں لہذا ان کی حکومت میں تو کسی خیر کی توقع رکھنا بھی عبث ہے۔ بھارت کی طرف سے مسلسل عدم تعاون کی پالیسی پر حکومت پاکستان کو نہ صرف احتجاج کرنا چاہیے بلکہ اس کا مؤثر جواب بھی دینا چاہیے اور قومی خودداری کا مظاہرہ بھی کرنا چاہیے اور تجارتی حجم پر بلکہ تجارتی روابط پر بھی سوچنا چاہیے کہ کس طرح یا کن شرائط پر اور کتنا رابطہ استوار کرنا چاہیے اور ثقافتی اور میڈیا کے میدان میں تو اس سے بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ماضی حال اور مستقبل تینوں کا مسئلہ ہے اور ان تینوں کو محفوظ رکھنا حکومت بلکہ عوام کی بھی برابر کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ سوچ لینا چاہیے کہ کہیں ہم اپنی شناخت اور پہچان نہ کھودیں اور ہمارے مسائل میں مزید اضافہ نہ ہو۔

ہماری پالیسیاں ہمارے فائدے کے لیے بننا چاہیے نہ کہ دوسروں کے لیے اور نہ ہی نام ونمود اور اپنے مفاد کے لیے۔

کشمیر۔۔۔ طوق غلامی کب تک

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم عمل میں آئی تو یہاں موجود ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت جس کے ساتھ شامل ہونا چاہیں ہو جائیں اور اسی اجازت کی آڑ لے کر مسلم اکثریتی ریاست کشمیر کے ہندو ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کی ملی بھگت سے ہی بھارت نے 27 اکتوبر 1947 کو باقاعدہ طور پر کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔اس دن کو کشمیری آج بھی یوم سیاہ کے طور پر مناتے ہیں۔چونکہ کشمیر ایک مسلمان ریاست تھی اور مہاراجہ ہندو تھا لہذا اس کے اس فیصلے کو کشمیریوں نے انتہائی سختی سے رد کیا۔اس مسئلے پر پہلی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں تقریبا83807 مربع کلومیٹر کا رقبہ آزاد کرا لیا گیا جب کہ اب بھی 139000 کلومیٹر کا علاقہ بھارت کے زیر تسلط ہے۔ بھارت کی درخواست پر اقوام متحدہ کی طرف سے جنگ بندی تو کرا دی گئی اور کشمیریوں کو استصواب رائے کا حق دیا گیا کہ پاکستان اور بھارت میں سے کسی ایک ملک کا انتخاب کر کے اس کے ساتھ شامل ہو جائیں اس قرار داد کو دونوں ملکوں نے تسلیم کیا اور بھارت 1957 تک اس بات پر قائم بھی رہا لیکن اس نے ایسا کیا نہیں، نہ ہی اس نے کشمیریوں کے حق آزادی کو تب قبول کیا اور نہ اب ۔خود کو دنیا کی سب سے جمہوریت کہنے والا بھارت یہاں اکثریت کا فیصلہ

ماننے سے انکاری ہے اور 27 اکتوبر 1947 سے لے کر آج تک اپنی فوج کو کشمیر میں ظلم وستم کے لامتناہی اختیارات دے کر متعین کیا ہوا ہے جو کشمیریوں کو انسانی حقوق کا روادار بھی نہیں سمجھتے۔ اقوام متحدہ کی منظور شدہ قرار دادوں میں سے کسی پر بھی بھارت عملدر آمد کے لیے تیار نہیں۔ حالانکہ وہ اقوام متحدہ میں استصواب رائے کی قرارداد پر دستخط کر چکا ہے لیکن آج بھی وہ کشمیریوں کو یہ حق دینے سے گریزاں ہے اور کشمیر کے مسئلے کو یکسر مسترد کرتا ہے۔ کشمیر طبعی اور مذہبی ہر لحاظ سے پاکستان کا حصہ بنتا ہے جس پر بھارت قابض ہے اور اگر پاکستان کشمیر کے بارے میں کسی بین الاقوامی فورم پر بات کرے تو اس کی سزا پاکستانی کشمیریوں کو بھی دی جاتی ہے اور مقبوضہ کشمیر کے مظلوم و محکوم عوام تو ہر وقت اس بے رحمانہ سلوک کے حقدار قرار دیے جاتے ہیں وہ آزادی کا مطالبہ کریں تو دہشت گرد قرار دے دیئے جاتے ہیں جبکہ بھارت پاکستان میں ایسی تحاریک کو بناتا ہے اور سپورٹ بھی کرتا ہے۔ بلوچستان میں مالی، فنی اور بین الاقوامی ہر قسم کی مدد فراہم کرکے وہ ایسی تحریکوں کا بانی ہے اور ان حالات کی ذمہ داری باوجود ثبوتوں کے قبول نہیں کرتا۔ لیکن دوسری طرف جب کشمیر کے مسلمان ایک غیر مسلم قابض حکومت سے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ پاکستان پر مداخلت کا الزام لگا دیتا ہیں۔ حالانکہ ہر انسان کی طرح کشمیری بھی آزاد ہونے کا پورا حق رکھتے ہیں اور بھارت یہ جانتا بھی ہے کہ وہ ریاستی دہشت گردی سے ان کی اس خواہش کو

دبا نہیں سکتا اور نہ ہی یہ تحریک ختم کر سکتا ہے جب تک کہ وہ آزادی حاصل نہ کرلیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ دنیا بھی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے اور خاموش ہے۔بڑی طاقتوں میں سے کوئی اس مسئلے کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا حالانکہ یہ دوایٹمی ممالک کا تنازعہ ہے اور وجہ یہ ہے کہ یہ طاقتیں اپنے اسلحے کی بہت بڑی منڈی کھونا نہیں چاہتی۔ ابھی حال ہی میں بھارت کی طرف سے ہونے والی پاکستان کی سرحدی خلاف ورزیاں بھارت کی نیت کی غماز بھی ہیں اور مسئلے کی سنگینی کی عکاس بھی۔لیکن بھارت بھی جانتا ہے کہ اسے بھارت کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف دنیا سے مددو تعاون حاصل ہے ورنہ نہتی سول آبادی پر بمباری کی اجازت تو کھلی جنگ میں بھی نہیں دی جاتی کجا کہ ، کھیتوں میں بھیڑ بکریاں چراتے لڑکے، سکولوں میں پڑھتے بچے یا گھروں میں کام کرتی عورتوں پر گولہ باری کی جائے۔بھارت سرکار نے ہمیشہ اپنی فوج کو کشمیریوں کے خلاف ہر قسم کے اختیارات دیئے رکھے ہیں اور اس کی فوج آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ کے تحت لا محدود اختیارات استعمال کرکے 1989 سے لیکر اب تک تقریبا 93935 کشمیریوں کو شہید کر چکی ہے اور یہ وہ تعداد ہے جو کہ ریکارڈ پر آئی جو شہادتیں ریکارڈ پر نہ آسکیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔یہ تعداد صرف یہاں تک اس لیے محدود نہیں رہتی کہ ان شہادتوں کے نتیجے میں پورے کے پورے خاندان متاثر ہوتے ہیں ہزاروں عورتیں بیوہ اور ایک لاکھ سے زیادہ بچے یتیم ہو چکے ہیں کیا بھارت ان یتیم بچوں کے ذہن سے یہ سوال کھرچ سکے گا کہ ان کے باپ کو کس

گناہ کی پاداش میں مارا گیا اور کیا وہ عورتیں اور دس ہزار لڑکیاں جو بھارتی فوجوں کی درندگی کا نشانہ بنیں وہ اپنی بے حرمتی کرنے والی سرکاری فوج کی حکومت کے تابع رہنا پسند کریں گی۔ بھارت کشمیر میں مسلمان اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کی جو ناپاک سازش کر رہا ہے اور پورے بھارت سے ہندوؤں کو لا لا کر کشمیر میں بسا رہا ہے اور ایسا صرف اور صرف اسی خاص مقصد سے کیا جا رہا ہے تو کیا آنے والی کشمیری نسلیں اس ظلم کو بھول جائیں گی۔ سچ یہ ہے کہ کشمیر ایک سلگتا ہوا انگارہ ہے جو کسی بھی وقت شعلہ بن سکتا ہے اور عالمی برادری کو اس بات کا احساس کرنا چاہیے۔ بھارتی میڈیا کے مطابق اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل آفس نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کشمیر کے معاملے پر مزید خاموش نہیں رہ سکتے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان بار بار ثالثی کا مطالبہ کرتا رہا ہے لیکن بھارت ایسا کرنے پر آمادہ نہیں اگر ایسا ہے تو کیا ایسا کہہ دینا کافی ہے یا اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی سنجیدگی بھی دکھائی جائے گی لیکن مسئلہ تو یہی ہے کہ اس مسئلے کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا اور اسے مزید سے مزید پیچیدہ بنایا گیا، اسی نے پانی کے مسئلے کو جنم دیا کہ بھارت جب چاہے ہمارا پانی بند کر دے اور ہماری ہری بھری فصلوں کو جلا دے اور کبھی اپنے فالتو پانی کو ہمارے دریاؤں میں چھوڑ کر ہمارے کھیتوں کھلیانوں اور ہماری آبادیوں کو سیلاب کی نظر کر دے۔ بات یہ ہے کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہ کر دیا جائے پاک بھارت کشیدگی میں

کوئی کمی نہیں آ سکتی نہ ہی تجارتی نہ ہی سفارتی رابطے کارگر ہو سکتے ہیں اس لیے بین الاقوامی برادری کو انفرادی طور پر اور اقوام متحدہ کو اجتماعی حیثیت میں اس مسئلے کے حل پر سنجیدگی دکھانا ہوگی ورنہ 27 اکتوبر کو یوم سیاہ منانے سے بات آگے بڑھ کر برصغیر میں کسی بڑی تباہی پر منتج ہو سکتی ہے اور اس تباہی کی ذمہ داری صرف اور صرف بھارت پر ہوگی۔

کشمیر۔۔۔ ملین مارچ

پچھلے ستاسٹھ سال سے کشمیری اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور عالمی برادری اپنے ضمیر کو سلا کر سو رہی ہے۔ بھارت کشمیر پر قابض ہے اور جیسا چاہتا ہے سلوک کشمیریوں کے ساتھ کر رہا ہے۔پاکستان کشمیر کی بات کرتا ہے تو بھارت اعلیٰ سطحی مذاکرات سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ کشمیر پر صرف ایک ہی معاملہ کرتا ہے اور وہ ہے جنگ کا اور کشمیریوں کے قتل کا۔ لیکن بے شمار شہادتوں کے باوجود کشمیر آج بھی محکوم اور غلام ہے اور ایسا صرف اور صرف بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے اگر وہ آج بھی غیر جانبدارانہ استصواب رائے کرالے اور کشمیریوں کو اپنی رائے استعمال کرکے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے دے تو مسئلہ حل ہو جائے لیکن وہ ایسا کر نہیں رہا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا ہوا تو فیصلہ اُس کے خلاف ہی آئے گا۔ 27 اکتوبر 1947 کشمیر کی تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے جب بھارت نے کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کر دیں تھیں اور کشمیری آج بھی ہر سال یہ دن بطور یوم سیاہ مناتے ہیں۔ لیکن اس سال اس دن سے ایک دن پہلے برطانیہ اور یورپ میں بسنے والے کشمیریوں نے لندن میں ملین مارچ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ دنیا والوں کو کم از کم یاد تو دلا سکیں کہ دنیا میں اب بھی قابض اور محکوم اقوام موجود ہیں اور ان کے درمیان جنگ بھی جاری ہے۔ کشمیری

اسی آزادی کی خاطر روز کٹتے مرتے ہیں چاہے وہ اپنی جدوجہد کو پرامن ہی کیوں نہ بنا دیں قابض بھارت کبھی سرحد کے اس پار کبھی اُس پار انہیں تشدد اور گولیوں کا نشانہ بنا دیتا ہے اور اسی سب کچھ کے خلاف .برطانیہ میں بسنے والے کشمیریوں نے جب اپنی آواز بلند کی تو ایک بار پھر بھارت نے اسے دبانے کی کوشش کی اور اُس کی وزیر خارجہ سشما سوراج نے لندن پہنچ کر .برطانیہ کے نائب وزیراعظم نک کلیگ سے ملاقات کی اور اس مارچ کو رکوانے کا مطالبہ کیا جس کو .برطانوی حکومت نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ .برطانیہ میں ہر ایک کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے لہذا اس مارچ کو روکا نہیں جا سکتا اور کشمیریوں کو بھی اپنی بات دنیا تک پہنچانے کا پورا حق حاصل ہے۔ ملین مارچ کے شرکاء میں خود .برطانوی پارلیمنٹ کے پچیس ارکان نے بھی شرکت کی اور کشمیریوں اور پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ سکھ .برادری بھی اس مارچ میں شریک ہوئی جب کہ خود .برطانیہ کے باشندوں نے بھی اس مارچ میں کثیر تعداد میں شرکت کی جس نے اس مارچ کی کامیابی ظاہر کردی کہ کسی حد تک سہی کشمیریوں نے اپنی آواز کو دنیا والوں تک پہنچایا اور انہیں یہ احساس دلایا کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے جس کے لیے اگر بھارت دوطرفہ حل سے انکار کرتا ہے تو اسے عالمی .برادری کی مدد سے حل کیا جانا چاہیے کیونکہ بھارت دوطرفہ مذاکرات کو حیلے بہانے سے ملتوی کردیتا ہے، اقوام متحدہ کی قرار دادوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ کشمیری اگر مسلح جدوجہد کریں تو وہ انہیں دہشت گرد قرار دے

دیتا ہے اور اگر وہ پر امن جدوجہد کریں تو وہ دنیا کو یہ تاثر دیتا ہے کہ کشمیر میں سب کچھ پر امن ہے اور یہاں کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں ۔ لہذا ملین مارچ جیسے اقدام سے کشمیر اور پاکستان دوسری اقوام کی توجہ اس مسئلے کی طرف کرا سکیں تو یہ ایک مثبت اقدام اور اچھا ذریعہ ہوگا اور بھارت کا یہ کہنا بھی اپنی حیثیت کھودے گا کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے اور یہ کہ کشمیر میں پاکستان، بھارت مخالف لیڈر شپ کو سپورٹ کرتا ہے یا اس ریاست میں دخل اندازی کرتا ہے ۔ کشمیر مذہبی ثقافتی اور جغرافیائی ہر لحاظ سے پاکستان سے جڑا ہوا ہے یہاں کے لوگوں کے رشتے ناطے سب پاکستان سے جڑے ہوئے ہیں، یہ لوگ مذہبی رشتہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان کشمیریوں کی اخلاقی مدد ضرور کرتا ہے لیکن اس ملین مارچ کا بیرسٹر سلطان محمود نے انتظام کیا جن کا تعلق کشمیر سے ہے اور وہ آزاد کشمیر کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ پاکستانیوں نے اس میں شرکت ضرور کی لیکن اس میں حکومت پاکستان کی کوئی مدد شامل نہیں تھی تاہم اس میں برطانوی اراکین پارلیمنٹ نے خوب شرکت کی۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مسئلہ کشمیر کو ہر عالمی فورم پر اٹھایا جائے اور عالمی رائے عامہ کو مسئلہ کی سنگینی کا احساس دلایا جائے اگرچہ بنیادی حقوق کی تنظیمیں وقتاً فوقتاً کشمیر میں بھارتی مظالم کے بارے میں آواز اٹھا لیتی ہیں تاہم یہ یا تو اتنی معمولی ہوتی ہیں کہ کسی کو سنائی ہی نہیں دیتیں یا بھارت انہیں گردانتا ہی نہیں لہذا اس کو مزید

بڑھانا چاہیے اور پاکستان کو مزید آگے بڑھ کر سفارتی اور بین الاقوامی سطح پر کشمیر پر
بھارت کے ناجائز قبضے، وہاں کے لوگوں پر اس کے مظالم اور پاکستان کی سرحدوں پر بلا
جواز فائرنگ جیسے مسائل کو اٹھانا ہوگا۔ اگرچہ وزیراعظم پاکستان اقوام متحدہ میں بڑے
کھلے الفاظ میں کشمیر کے بارے میں پاکستانی موقف ظاہر کرچکے ہیں لیکن اب اس سلسلے
کو رکنا نہیں چاہیے جب تک کہ عالمی برادری بھارت کو مجبور نہ کردے کہ وہ کشمیر سے
اپنی فوجیں واپس بلاکر کشمیریوں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرلے۔

واہگہ بارڈر دھماکہ اور امن کی خواہش

آپریشن ضرب عضب جاری ہے اور یہ بھی کہا جارہا ہے اور قوم کو مسلسل تسلی دی جا رہی ہے کہ دہشت گردوں کی کمر توڑ دی گئی ہے۔ فوجی جوان اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنے اور اپنی زندگیاں قربان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے وہ اُسی بہادری سے لڑ رہے ہیں جو ایک مجاہد کی شان ہے اور بظاہر دہشت گردی کی کاروائیوں میں کمی بھی نظر آرہی ہے اگرچہ یہ کمی بہت معمولی سی ہے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود سچ یہ ہے کہ دہشت گرد ابھی بھی سرگرم عمل ہیں، اب بھی وہ قوت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ پشاور کے شہری باڑہ سے دھماکوں کی آوازیں مسلسل سن رہے ہیں، وزیرستان کے پہاڑ دہل رہے ہیں، پاک فوج مسلسل مصروف عمل ہے، فضائی کمک بھی ہر وقت میسر ہے تو آخر یہ دہشت گرد ان خشک پہاڑوں میں کیسے زندہ ہیں، ان کے اسلحہ اور بارود کے ذخائر ختم کیوں نہیں ہو رہے، یہ دنیا کی سخت ترین افواج میں شمار ہونے والی پاکستانی فوج سے کیسے ٹکرلے رہے ہیں، واہگہ بارڈر تک ان کی رسائی کیسے ممکن ہوئی، ہماری سیکیورٹی اداروں کی کمزوری کیسے اور کہاں ہے۔ بقول وزیر داخلہ اس حملے کی وارننگ جاری کر دی گئی تھی، ایک اور اطلاع کے مطابق صبح بھی بتا دیا گیا تھا اور دو نئی چیک پوسٹیں بھی قائم کر دی گئیں تھیں پھر

بھی دھماکہ ہو گیا تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ اطلاعات وصول کرنے والے انہیں سنجیدگی سے نہیں لیتے یا جو انتظامات کیے جاتے ہیں وہ صرف خانہ پُری ہوتی ہے یا ہم نے یہ سوچ لیا ہے کہ ہم خود کش دھماکوں کو نہیں روک سکتے لہٰذا ہونے دو اور ہماری شکست خوردہ ذہنیت پچپن یا سینکڑوں یا ہزاروں افراد کی جان لے لیتی ہے۔ پنجاب پولیس کا ایک بیان یہ بھی سامنے آیا کہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ دہشت گرد عام لوگوں پر حملہ کریں گے تو کیا اب تک کوئی عام آدمی دہشت گردوں کے نشانے پر نہیں آیا تھا۔ مسجدیں عام آدمی سے ہی بھری ہوتی ہیں جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے، بازار میں بھی عام آدمی ہوتا ہے اور چوکوں پر بھی، مون مارکیٹ لاہور میں بھی عام آدمی مرا تھا اور قصہ خوانی پشاور میں بھی۔ دہشت گرد اپنی منصوبہ بندی اچانک بدل کر ہمارے اداروں اور حکومت کو حیران وپریشان بلکہ بے بس کر دیتے ہیں لیکن ہماری ایک ہی سٹریٹیجی ہے کہ ہم خود کش دھماکوں کو کسی طرح نہیں روک سکتے۔ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ آخر ان دہشت گرد تنظیموں میں کونسی ایسے اعلیٰ دماغ بیٹھے ہوئے ہیں اور انہوں نے زیر زمین بیٹھ کر کن عظیم درسگاہوں سے تعلیم اور تربیت حاصل کی ہے کہ اُن کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا۔ واہگہ بارڈر حملے کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ خود کش بمبار پریڈ تک نہ پہنچ سکا اور بڑا نقصان ہونے سے بچ گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دھماکہ پریڈ کے بعد ہوا اور خالی پریڈ گراونڈ میں دھماکہ ہونے سے کیا اتنا بڑا جانی نقصان ممکن تھا

جتنا اب ہوا اور اُس صورت میں سرحد کے دوسری طرف بھی تو نقصان ممکن تھا۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ کرنے والوں نے خود کو بچا لیا اور تباہی پاکستان کی طرف بھیج دی۔ چاہے ہم امن کو خواہش میں کتنے ہی دیوانے ہو جائیں لیکن دوسری طرف کسی نیک نیتی کا شائبہ تک نہیں اور اب تو اُنھوں نے ایک دہشت گرد کو اپنا وزیراعظم بھی چُن لیا ہے لہٰذا دہشت گردی کی منصوبہ بندی میں بھی مسئلہ درپیش نہیں ہے بلکہ اب تو یہ اعلیٰ ترین سطح پر ہو رہی ہے۔ دراصل یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر دہشت گردی بیرونی امداد کے بغیر ممکن ہو۔ آخر ان دہشت گردوں کے پاس کتنا اسلحہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آرہا ان کی سپلائی لائن میں کوئی رکاوٹ کیوں نہیں آئی کیا سرحدوں کے اُس پار سے مسلسل یہ ترسیل جاری نہیں ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو وہ بھارت ساختہ دوائیں تھیں جو کراچی ائرپورٹ حملے کے دوران ملیں اور بھارت ساختہ اسلحہ ملنا تو ایک عام سی بات ہے۔ اس بات میں اب کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ امریکہ، بھارت، اسرائیل بصورت سی آئی اے، را اور موساد پاکستان میں دہشت گردوں کے ماسٹر مائنڈ بھی ہیں اور مالکان بھی جو انہیں بھاری تنخواہوں پر رکھے ہوئے ہیں ورنہ چھوٹی موٹی مزدوریاں کرنے والے، تھڑے لگانے والے، چھولے اور پکوڑے بیچ کر رزق کمانے والے فکر معاش سے اتنے آزاد کیسے ہو گئے بلکہ اپنی تنخواہ دار فوجیں رکھنے کے قابل کیسے ہو گئے کہ فوج اور حکومت سے ٹکر لے سکیں۔ واہگہ دھماکے کے بعد تو یہ بات اور بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ دھماکہ کہیں اور سے

کیا گیا اور ذمہ داری کئی اور جگہوں سے قبول کی گئی، پہلے جند اللہ، پھر احرار الہند اور آخر میں احسان اللہ احسان کا بیان سامنے آیا اور ہر ایک نے اس ظلم اور ناحق قتلِ عام کا اعزاز قبول کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس بار ایسا کرنے کے لیے انہیں استعمال ہی نہیں کیا گیا اور یہ خدمت کسی اور سے یا خود ہی سرانجام دی گئی ہو لیکن ہر نمک خوار نے آقا کو خوش کرنے کے لیے اس ظلم کی ذمہ داری قبول کر لی ہو۔ ہماری حکومت انٹرپرائزز مودی اینڈ کو کے ساتھ اگر اپنے ذاتی تجارتی مفادات کو کچھ دیر کو بھلا کر قومی درد میں شریک ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ قوم اس دہشت گردی کا کوئی ایسا سرا تلاش کر لے جس کو اگر کاٹا جائے تو مزید خونِ معصوم نہ بہے اور لہو لہو پاکستان کے زخم کچھ مندمل ہو سکیں لیکن ایسا ہونے کے لیے ہمارے حکمرانوں اور ذمہ داران کو امریکہ، بھارت اور دیگر دہشت گرد ملکوں سے وابستہ اپنے مفادات کی قربانی دینا ہو گی۔ اس کے لیے صرف دہشت گردوں کو ہلاک کرنا کافی نہیں ہو گا بلکہ ان کی سپلائی لائن کاٹنی ہو گی جب ان کے پاس اسلحہ اور گولہ بارود نہ رہے گا، جب یہ خوراک کو ترسیں گے، جب ان کو اپنے اور بیوی بچوں کے علاج کی فکر ستائے گی، جب ان کے پاس بھارتی، امریکی اور اسرائیلی ساختہ دوائیں نہ ہو نگی، جب یہ غم روزگار میں اور فکر معاش میں الجھیں گے تو دوسرے انسانوں کا درد بھی محسوس کر لیں گے لیکن شرط ان کے آقاوءں سے ان کے رابطے منقطع کرنے کی ہے۔

اشتہار کی ضرورت نہیں رہے گی

ہماری موجودہ اور گزری ہوئی حکومتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے سوائے پارٹی نام کی تبدیلی کے۔ انداز حکمرانی ایک ہی جیسا ہے۔ یہ ترقیاتی یا فلاحی پروگراموں کے نام بدلتے ہیں ان کے چیئرمین بدلتے ہیں نیت اور پروگرام وہی رہتے ہیں ۔اِن میں زیادہ مالی فائدہ چلانے والوں کا ہی رہتا ہے۔ نوازا اپنے ہی لوگوں کو جاتا ہے اور ٹرخایا بھی عوام کو ہی جاتا ہے۔ ترقیاتی سکیموں کو صرف اور صرف روزگار کی فراہمی تک ہی رکھا جاتا ہے ایسا روزگار جس سے صرف پیٹ بھر سکے ، اور اگر پیٹ بھرے تو علاج ممکن نہ رہے اور تن کا کپڑا آئے تو پیٹ بھوکا رہ جائے ۔ بلاشبہ روزگار کی فراہمی ضروری ہے لیکن اس کی آمدنی کو اتنا محدود نہ کیا جائے کہ دن بھر رکشہ ٹیکسی چلا کر بس اتنا کمایا جائے کہ پیٹ بھرا جائے اور اگر بیماری آجائے تو اُس کا علاج کرنے کیلئے چار پیسے نہ بچیں اور نہ ہی ان سکیموں سے ملک کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ تو کیا بہتر نہ ہو کہ کارخانے لگائے جائیں صنعتیں قائم کی جائیں اور وہاں روزگار فراہم کیا جائے تاکہ روزگار کے ساتھ ساتھ ملک بھی ترقی کرے لیکن افسوس کہ ہماری حکومتیں صرف جزوقتی اقدامات کرکے عوام کو بیوقوف بنالیتی ہیں ۔ نوجوانوں کے ہاتھوں میں لیپ ٹاپ پکڑا دیئے گئے اور اس بات کی

نہ فکر کی گئی اور نہ مداوا کہ یہ لیپ ٹاپ کیسے اور کس مقصد کے لیے استعمال ہوں گے ۔ یہ تو چند ایک انتہائی مشتہر کردہ سکیمیں ہیں ورنہ اور بھی کوئی ایسا پروگرام نظر نہیں آتا جو واقعی فرد اور ملک کی ترقی کا باعث بن سکے ۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام سے خاندانوں کو ہزار روپے ماہوار دیئے گئے جبکہ ہر ایک یہ جانتا ہے کہ ہزار روپے میں صرف چائے اور دودھ کا خرچہ بھی پورا نہیں ہوتا تو کیا بہتر نہ ہوتا کہ ان لوگوں کو ملوں اور کارخانوں کی صورت میں روزگار فراہم کیا جاتا ۔ ہماری موجودہ حکومت نے عالمی منڈی میں پیٹرولیم کی قیمتوں میں کمی کے بعد اس سے کم کمی کی جسے حکومت پاکستان نے اپنا کارنامہ بنا کر پیش کیا اور اس کے ثمرات کی ایک لمبی فہرست بھی شائع کی اور عوام کو چند ایسی خوشخبریاں سنائیں جس کا عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق اول تو بنتا ہی نہیں اور اگر بنایا بھی گیا ہے تو دوسری طرف انہیں پیسا بھی گیا ہے۔ میں ماہر معاشیات نہیں ہوں کہ اعداد، میزانیوں اور جدولوں میں قاری کو الجھا سکوں لیکن اِن اقدامات کا جو اثر ایک عام آدمی پر پڑتا ہے اُس کا اندازہ جتنا میرے جیسا ایک عام شہری لگا سکتا ہے اتنا ماہر معاشیات نہیں مثلاً گندم کی امدادی قیمت سو روپے بڑھا کر کسان کو خوش ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ صنعت کار حکمران یہ اندازہ کیوں نہیں لگا رہے کہ ایک عام کسان اگر انتہائی محنت کرکے اپنی زمین سے پچاس من یا چلیے سو من گندم کی پیداوار لے لے تو اُس کی چھ ماہ کی آمدنی

میں پانچ سے دس ہزار کا اضافہ ہوگا جو ہمارے حکمرانوں کی ایک ٹائی کی قیمت بھی نہیں ہے جبکہ دوسری طرف گندم خرید کر کھانے والے کروڑوں عوام کے ماہانہ آٹے کے خرچے میں مستقل اضافہ ہوگا تو کیا کسان کی بہبود کے لیے بہتر نہیں تھا کہ کھاد کی قیمت کم کی جاتی۔ پیٹرول کی قیمت کم ہونے سے مہنگائی میں کمی کا مژدہ بھی سنایا گیا ہے کیونکہ کرایوں میں کمی ہو جائے گی جبکہ چائے، چینی، تیل، گھی، صابن یعنی استعمال کی کسی چیز پر نہ تو سیلز ٹیکس کم کیا گیا ہے نہ اُن کی قیمتوں میں حکومتی سطح پر کسی کمی کا اعلان کیا گیا ہے۔ بجلی کے نرخ بڑھانے سے قیمت بڑھنے کا اس داستاں میں ذکر کیا ہی نہیں گیا۔

یہاں میں نے چند اقدامات کا ذکر کیا ہے جنہیں حکومت عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے استعمال کر رہی ہے ورنہ ہر دور میں عوام کے ساتھ کوئی نہ کوئی مذاق چلتا ہی رہتا ہے اور تمام سیاسی جماعتیں اس کھیل میں شامل رہتی ہیں جو ایک یا دوسری طرح حکومت کا ساتھ دیتی رہتی ہیں۔ قانون سازی اور آئینی ترامیم کے نام پر اسمبلی اجلاسوں پر لاکھوں کروڑوں اُڑا دیئے جاتے ہیں اور عوام کی سمجھ سے بالاتر اصطلاحات بول بول کر اُنہیں متاثر کیا جاتا ہے لیکن اس عام آدمی کی عام زندگی کیسے گزرتی ہے اس کی خبر نہیں لی جاتی ہاں جب میڈیا پر کسی مجبور کی مجبوری، بیماری اور بیچارگی کی خبر آجاتی ہے تو ہمارے بڑے ہوش میں آتے ہیں اور نام کمانے کا موقع پا کر فوراً

آگے آتے ہیں اور عوام سے اپنی عوام دوستی کی داد پا لیتے ہیں۔ بات تو تب ہے کہ دریا کے کنارے کتے کے بھوکے پیاسے مرنے کے لیے حکمران خود کو خدا کے حضور جوابدہ سمجھیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ صدر، وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ ہر روز گلی گلی گھومے لیکن وہ اپنے کارندوں اور عمال حکومت کو آنکھیں کھلی رکھنے کا حکم دیں اور خود بھی جاگتے رہیں کبھی کبھی سہی باہر نکلیں اور خود دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے ورنہ سب اچھا کی رپورٹ دینے والے اپنی نوکری پکی کرتے رہیں گے اور بدنامی اور بد انتظامی حکومت کے نام لگتی رہے گی اور بجا لگتی رہے گی کیونکہ اصل کوتاہی ادھر ہی سے ہے۔ کرپشن کرنے والے کو اپنے بالائی حکام کا کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ادھر سے کوئی بے گناہ نہیں جو پتھر مار سکے۔ وہ حکومت جس کا کام عوام کی خدمت ہے صرف نام و نمود کا اشتہار دینے میں مصروف ہے جبکہ اشتہار دینے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ حکومت کو اپنے وسائل اس طرح استعمال کرنے چاہیے کہ اس کے ثمرات عام آدمی کے گھر تک پہنچ جائیں اور اس کا معیار زندگی بہتر ہو، تعلیم اچھی دی جائے گی اور طالب علم میں اس کا عکس نظر آئے گا، علاج اچھا ہوگا اور مریض جلد شفایاب ہوگا، آٹا سستا ہوگا اور غریب کا پیٹ بھرے گا، تو اشتہارات دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی اور اس کے بغیر ہی عوام آپ کے ساتھ ہوں گے اور ان کی دعائیں آپ کو مطمئن اور پر سکون رکھیں گی بغیر کسی مصنوعی سہارے کے۔

ہندو خاندانوں کی بھارت منتقلی

سندھ اپنی ثقافت اور اپنی روایات کے لیے جتنی شہرت رکھتا ہے اتنے ہی اس سرزمین پر رہنے والے رواداربھی ہیں۔ صوفیاء سے محبت اور عقیدت ان کا خاصا ہے اور اِن کی تعلیمات میں رواداری کا عنصر ہی تھا کہ اِس نے یہاں کے باسیوں کو اسلام کے دامن میں پناہ لینے پر آمادہ کیا اور وہ ہندو جنھوں نے اسلام قبول نہ کیا وہ بھی امن اور سکون سے اپنے اپنے گھروں میں رہتے بستے رہے۔ میں جتنے بھی سندھیوں سے جب بھی ملی میں نے انہیں پُرامن اور شکر گزار ہی دیکھا وہ اپنے ہندو ہمسایوں کے بارے میں کوئی مشتعل جذبات نہیں رکھتے ابھی پچھلے دنوں میڈیا پر ایک رپورٹ چلی جس میں عمر کوٹ کے ہندو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ محرم کے جلوس نکال رہے تھے۔ پھر آخر وہ کون سے ایسے عناصر ہیں جو چند ہندو خاندانوں کی بھارت منتقلی کو ایک متعصبانہ رنگ دے رہے ہیں۔ پاکستان میں ایک اندازے کے مطابق پچیس سے تیس لاکھ ہندو رہ رہے ہیں اور اتنے لوگوں میں کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ ہونا کچھ ایسا غیر قدرتی بھی نہیں وہ بھی ان حالات میں جب ملک میں عمومی طور پر امن وامان کی صورت حال دگرگوں ہے لیکن ہمارے ہاں عام رواج کے مطابق ہمارے نام نہاد علمبرداران انسانی حقوق کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر ہونے والے ایسے واقعے کو بھی ایک ایسا رنگ دے دیتے ہیں جیسے کہ

اقلیتوں کے خلاف کوئی محاذ آرائی کی گئی ہو یا انہیں مذہبی تعصب کی بنا پر نشانہ بنایا گیا ہو
یہ چند نمائشی لوگ تو ایسا کرکے نام کما لیتے ہیں لیکن ملک جو پہلے ہی عالمی طور پر
سازشوں کی زد میں ہے مزید بدنام ہو جاتا ہے ہاں ایسا کرنے والوں کو بیرونی شاباشی
اور امداد کے نام پر اپنے خزانے بھرنے کے لیے کچھ اور رقم میسر آ جاتی ہے۔ یہ حقیقت
ہے کہ سندھ سے کچھ ہندو خاندان بھارت جاکر آباد ہو گئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ
ہجرت کسی بہت بڑے پیمانے پر ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ کچھ اکا دکا ناخوشگوار واقعات
بھی ہو جاتے ہیں جس میں سندھ کے عام لوگوں کی بجائے شر پسندوں کا زیادہ ہاتھ ہوتا
ہے اور سندھی ہندوؤں کی طرف سے بھی ہمیشہ دوستانہ رویہ ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے ان
میں بھی ناپسندیدہ عناصر موجود رہتے ہیں اور یہ ان کا ذاتی فعل ہوتا ہے ورنہ اندرون
سندھ کے شہروں میں اکثر آپ کو ان کے کاروبار، دکانیں، گھر اور مندر نظر آتے ہیں
جن پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا میں نے انہیں گھنٹوں لاؤڈ سپیکر استعمال کرتے سنا
ہے۔ صرف یہی نہیں ان میں بڑے نامِ گرامی ڈاکٹر اور وکیل بھی نظر آئیں گے یہ لوگ
شہروں کے مہنگے سکولوں، کالجوں اور پیشہ ورانہ اداروں میں ایک بڑی تعداد میں موجود
ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ سندھی خاندانوں کا
اکثر اوقات کاروبار کے سلسلے میں بھارت آنا جانا لگا رہتا ہے یہ ایک معمول ہے اور
اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں یہاں بہت سے خاندان ایسے بھی ہیں جس کے کچھ
افراد سرحد کی

دوسری جانب بھی رہتے ہیں جن سے ملنے کے لیے آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے یہ سفر اکثر اوقات تجارتی بھی ہوتے ہیں اور اسی لیے سندھ کے اکثر بازاروں میں بھارت کی روایتی مصنوعات نظر آتی رہتی ہیں۔ پاکستان میں ہندوؤں آبادی 1.6 فیصد ہے جو تقریباً پچیس، تیس لاکھ کے قریب ہیں اب اگر یہ کہا جائے کہ اس تعداد میں کوئی واقعہ رونما نہ ہو تو ایسا ممکن نہیں ہاں جہاں ٹارگٹ کلنگ کی بات ہے چاہے اکثریت کی ہو یا اقلیت کی ہر دو صورتوں میں انتہائی ظالمانہ ہے اور اسے ہر صورت رکنا چاہیے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ظلم کے لیے مذہب اور نسل کی توجیہہ تلاش کرنا سراسر زیادتی ہے اور شاید اسی لیے اب تک اسے روکا نہیں جا سکا ہے کیونکہ جب اسے کسی مذہب، مسلک یا نسل کے خلاف بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو انہیں ایک فریق بنا دیا جاتا ہے اور ان کے دل میں نفرت کا بیج بو دیا جاتا ہے۔ مذہبی تعصب تو وہ ہے جو بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ برتا جاتا ہے اور نسل کشی وہ ہے جو مقبوضہ کشمیر میں کی جاتی ہے۔ پاکستانی ہندوؤں اگر مسائل کا سامنا کر رہے ہیں تو انہیں ہر صورت حل ہونا چاہیے پاکستان کے ہر شہری کی طرح انہیں بھی تحفظ فراہم کرنا حکومت کا فرض ہے اور یہ بھی افسوسناک امر ہے کہ حکومت ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی۔ لیکن دو چار ہزار ہندوؤں کا سندھ سے بھارت کی طرف چلے جانے کو جتنا اچھالا جا رہا ہے وہ کسی طور بھی مناسب نہیں جبکہ پاکستان میں ہندوؤں اپنے تمام تہوار آزادی سے مناتے ہیں اپنی عبادات میں آزاد ہیں اپنی ثقافت اور

روایات کو مکمل طور پر سنبھالے ہوئے ہیں لیکن ظاہر ہے اس طرح کے معاملات میں بھارت اپنا کردار ادا کرتا ہے اور پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے ایسے میں ہمارے میڈیا اور حکومت کو اس تاثر کو ختم کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے تاکہ پاکستان کے خراب حالات کا سہارا لے کر اسے اور بدنام نہ کیا جائے اور نہ ہی بین الاقوامی طور پر اسے مزید تنہا کیا جائے۔

"را" کا ایک اور منصوبہ"

ہمارے ملک کے دشمن تو کئی ہیں لیکن ہماری سرحد سے جڑا ہوا بھارت ہمارے خلاف جو کردار ادا کرتا ہے وہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا کرنا بہت آسان بھی ہو جاتا ہے کیونکہ اُس کو نہ تو لمبا سفر کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی اُس کے لوگوں کی پہچان آسان ہوتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایک جیسی شکل و صورت اور زبان کی وجہ سے بسا اوقات ایسا ممکن ہی نہیں رہتا اور اس چیز کا وہ دہرا فائدہ بھی اٹھاتا ہے اور بھارت میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔ دہشت گرد خود بناتا ہے خود اُن سے دہشت گردی کرواتا ہے خود ہی گرفتار کرتا ہے اور انہیں پاکستانی بنا کر پیش کر دیتا ہے ایسے کئی واقعات ثابت ہو چکے ہیں جن کے ملزمان کو پہلے پاکستانی بنا کر پیش کیا گیا لیکن بعد میں وہ بھارتی ہی ثابت ہوئے۔ اور ایسے واقعات تو بے شمار ہیں جو بعد میں ہر انداز سے بھارت اور اس کے اداروں کی سازش ثابت ہوئے۔ جن میں ممبئی حملوں کے بارے میں بھارت کے ہی کچھ لوگوں نے انکشاف کیا کہ ان حملوں کی منصوبہ بندی بھارت کے اندر ہی ہوئی۔ بھارت جیسے ملک کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ اپنے چند لوگوں کو مروا کر دنیا کی ہمدردی سمیٹے اور پاکستان کو بدنام کرکے اسے دہشت گرد قرار دینے کی کوشش کرے اور ایسی ہی ایک

کوشش کی ایک بار پھر بھارت میں منصوبہ بندی کی گئی ہے جس کے لیے آئی ایس آئی کو پہلے ہی نامزد کر لیا گیا ہے۔ اخبار دکن کرونیکل میں نام راتھا بی جی اہوجا کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاکستان نے اپنے دہشت گرد راجھستان کے راستے بھارت میں داخل کر دیئے ہیں جو پُونے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ان کا مقصد ہندو شخصیات اور اہم مقامات پر پہنچ کر اِن پر حملے کرنا ہیں ان میں خاص کر معاشی اور تجارتی اہمیت کے مقامات پر حملے کرنا شامل ہیں۔ اِن میں ریزرو بینک، ممبئی سٹاک ایکسچینج، تہار جیل دہلی، بی ایس ایف ہیڈ کوارٹرز جالندھر، پٹیالہ جیل پنجاب اور اوانتی پورا جموں کشمیر شامل ہیں۔ مضمون میں کہا گیا ہے آئی بی نے منصوبہ بندی کی تمام معلومات قانون نافذ کرنے والے اداروں کو دے دی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ منصوبہ بندی آئی ایس آئی نے کی ہے تو اس کی ہر قسم کی اور مکمل معلومات آئی بی یا را کو کیسے فراہم ہو گئیں۔ کیا آئی ایس آئی اتنی ہی ناپختہ کار ہے کہ اُس کا منصوبہ نہ صرف یہ کہ طشت از بام ہوا بلکہ تمام تر تفصیلات کے ساتھ ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایسے منصوبے را، بناتی ہے اِن پر عمل درآمد کرتی ہے اور پھر آئی ایس آئی کو ذمہ دار قرار دے دیا جاتا ہے۔ بھارت میں اس وقت بھی شدت پسند دہشت گردوں کی حکومت ہے اور کم از کم نریندر مودی کی دہشت گردی تو اتنی سقہ ہے کہ اِس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے اگرچہ بھارتی ذہنیت ہمیشہ سے ایک جیسی ہی رہی ہے لیکن اب تو اس میں جو شدت آئی ہے

اُس کو حکومت کی کامیابی سمجھا جارہا ہے کیونکہ ان کا سربراہ خود ایک دہشت گرد ہے۔ پاکستان بھارت کے ساتھ امن قائم کرنے کے لیے جتنی بھی کوشش کرے یہ یک طرفہ کوشش کامیاب ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ دوسری طرف بھی خیر سگالی کے جذبات نہ ہوں۔ جبکہ دوسری طرف سے نہ صرف الزامات لگانے کا سلسلہ جاری ہے بلکہ پاکستان کے خلاف عملی اقدامات بھی زیادہ زور پکڑ رہے ہیں، سرحدی خلاف ورزیاں اس کا کھلا ثبوت ہیں۔ بھارت پاکستان کے اندر بھی امن و امان کی خراب صورتحال کا بہت بڑا ذمہ دار ہے۔ افغانستان کے راستے وہ فاٹا اور بلوچستان میں جس طرح حالات کو خراب کر رہا ہے اُس نے پورے ملک کا امن و امان خراب کر رکھا ہے اور اس مداخلت کے ثبوت بھی موجود ہیں جو بھارت کو فراہم بھی کیے گئے۔ سربجیت سنگھ اور رُسُر جیت جیسے جاسوس بھی پکڑے گئے جنھوں نے اعتراف جرم بھی کیا اور ابھی حال ہی میں وزیرستان سے پکڑا جانے والا بھارت ساختہ اسلحہ اس مداخلت کا ایک اور کھلا ثبوت ہے لیکن پہلا نہیں، دنیا جانتی ہے کہ اس سے پہلے بھی یہ اسلحہ پکڑا جاتا رہا ہے اور دنیا کو دکھایا بھی گیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف بھارت میں ہونے والے کئی واقعات جن کا الزام اُس نے پاکستان پر لگایا تھا اُس کے بارے میں خود بھارت کے اندر ہی ثابت ہو گیا کہ وہ خود اس کا ذمہ دار تھا اور یہ منصوبے بھارت ہی کی ایجنسیوں نے بنائے تھے اور انہیں

عملی جامہ پہنانے والے مجرم بھی بھارتی شہری تھے جن میں کرنل سری کانت کی ''سمجھوتہ ٹرین بربریت'' سرفہرست ہے۔ بھارت مستقل بنیادوں پر پاکستان کے خلاف مصروف عمل ہے اور اسے دہشت قرار دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔ جس میں دکن کرونیکل میں لگائے گئے حالیہ الزامات ایک تازہ اضافہ ہے لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے اُسے سوچ لینا چاہیے کہ کب تک وہ اپنے لوگوں کو مروا کر الزام پاکستان کے سرڈالتا رہے گا اور اپنے عوام کو دھوکہ دیتا رہے گا آخرکار وہ بھی جان جائیں گے کہ اُن کا اصل قاتل اُن کا اپنا ملک ہے۔ پاکستان کی طرف سے امن کی جتنی بھی کوشش کی جائے وہ بارآور نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسری طرف سے بھی ایسی کوشش اور خواہش موجود نہ ہو۔ برصغیر کے امن کے لیے بھارت کو ایسے الزامات اور اقدامات سے باز رہنا ہوگا اور دنیا کو بھی اس کا نوٹس لینا چاہیے اور بھارت کو مجبور کرنا چاہیے کہ مثبت رویہ اپنائے تاکہ علاقے میں امن قائم ہوسکے اور یہ خطہ اور دنیا کسی بہت بڑے ناخوشگوار واقعے سے بچی رہے۔

سیاست ۔۔۔ پاکستان کے نام پر نہیں بلکہ پاکستان کے لیے

پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی ایک فصل ہے جو اُگی ہوئی ہے اور کوئی نہ کوئی نئی پارٹی اُگ کر اس فصل کی اٹھان میں نیا اضافہ کر دیتی ہے لیکن ہوتا کچھ نہیں ہے نہ عوام اور خواص کے درمیان خلیج پاٹی جاتی ہے نہ مسائل حل کیے جاتے ہیں، نہ ملکی ترقی کے لیے کام کیا جاتا ہے، نہ قومی یکجہتی ضروری سمجھی جاتی ہے اور نہ مذہبی رواداری پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یعنی جن مسائل اور بنیادوں پر سیاست ہونی چاہیے وہ کہیں نظر نہیں آتے بلکہ کوئی مذہب، کوئی مسلک، کوئی لسانیت، کوئی صوبائیت اور کوئی قومیت کے نام پر اپنی اپنی سیاست چمکانے میں مصروف ہے۔ اکثر پارٹیاں اور سیاست دان تو فوج مخالفت کا سہارا بھی لیتے ہیں اور اسے جمہوریت کا سب سے بڑا دشمن قرار دے دیتے ہیں اور یوں خود کو زیرک سیاستدان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ہر ایک اپنا راگ الاپتا ہے اور پاکستان اور ایک عام پاکستانی اپنی قسمت پر ماتم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں مختلف قسم کی ان سیاستوں میں کوئی صرف پاکستان کی بات کرتا تو شاید ہماری تقدیر بدل چکی ہوتی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ دین کو سیاست میں سے نکال دیا جائے دین ہماری زندگی کا حصہ ہے لیکن جس طرح مذہبی جماعتیں نام مذہب کا لیتی ہیں اور جنگ

اپنی اقتدار کی لڑتی ہیں وہ کسی طور پر بھی جائز نہیں یہ عوام سے اپنی ذات اور اپنی پارٹی کے لیے ووٹ مانگنے جاتے ہیں لیکن جذبات ان کے مذہبی ابھارے جاتے ہیں۔ ہر ایسی جماعت نے اپنے مسلک کے مدارس کھولے ہوئے ہیں جن کے طلباء جب فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں تو دوسرے تمام مسالک سے بدظن ہو کر اُن کے لیے معاندانہ رویہ اپنا چکے ہوئے ہیں۔ یہ جماعتیں اپنے مدرسوں کے ان طالبعلموں کو اپنے جلسوں کا حجم بڑھانے کے لیے اور اپنے ووٹوں کی گنتی میں اضافے کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہی حال نیم مذہبی جماعتوں کا ہے جنھوں نے مدارس کے ساتھ ساتھ سکول بھی کھول رکھے ہیں اور ان کے اساتذہ اور طلباء سے بھی وہی کام لیا جاتا ہے جو مدارس کے طلبا اور اساتذہ کرتے ہیں۔ اگر یہ جماعتیں اِن مدارس اور سکولوں کو غیر سیاسی رکھ کر ان سے صرف دین اور علم کی خدمت کا کام لیتے تو ملکی ترقی میں اضافے کا باعث بن کر قابل تحسین بن جاتے اور لوگ خود بخود اِن کی طرف مائل ہوتے لیکن کسی بھی قسم کی مذہبی خدمات کے بغیر ہی یہ رہنما خود کو بھی اور ہمارا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا بھی ان کو مذہبی رہنما قرار دے دیتا ہے جبکہ معذرت کے ساتھ لیکن لگتا یہی ہے کہ مذہب کو یہ لوگ صرف اور صرف سیاست کے لیے استعمال کرتے ہیں اپنی ذات پر اسے لاگو نہیں کرتے۔

یہی حال لسانی جماعتوں کا ہے جنھوں نے زبان کو سیاست کی بنیاد بنایا ہے۔ زبان یقیناً کسی فرد کی پہچان ہوتی ہے، یہ برادری کی شناخت بھی ہو سکتی ہے لیکن اسے سیاسی طور پر قوم کی پہچان بنانے کا

رجحان کسی طور پر بھی جائز نہیں بلکہ قابل مذمت ہے کیونکہ اگر اسے ہی بنیاد بنایا جائے تو پاکستان کے ہر صوبے میں مختلف زبانیں بولنے والے رہتے ہیں۔ ایک بلوچستان کو لیجئے جہاں بلوچی، پشتو، براہوی، دری، سرائیکی اور معلوم نہیں کتنی اور چھوٹی چھوٹی زبانیں بولی جاتی ہیں یہی حال پنجاب کا ہے کہ پنجابی، پوٹھوہاری، سرائیکی ہر زبان بولی جاتی ہے۔ سندھ اور خیبر پختون خواہ کا حال بھی مختلف نہیں لیکن لسانی بنیادوں پر ہی کراچی خون خرابے میں ڈوبا رہتا ہے اور مختلف جماعتیں مختلف زبانیں بولنے والوں کی نمائندہ بنی بیٹھی ہیں اور انہیں پلیٹ فارموں سے پاکستان کی سالمیت کو دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں سیاست کی ایک اور قسم بھی پائی جاتی ہے جن کے رہنما خود کو قوم پرست کہتے ہیں۔ جبکہ یہ کسی ایک زبان، قبیلے، گروہ یا ایک محدود علاقے کے نمائندہ ہوتے ہیں اور شاید نمائندہ بھی نہیں بلکہ خود ہی خود کو ایسا سمجھتے ہیں اور قومیت کے نام پر خون خرابہ پھیلاتے ہیں اور بجائے ان کی مذمت کرنے کے اظہار آزادی کے نام پر ہمارے میڈیا اینکرز اور صحافی انہیں قوم پرست رہنما قرار دے دیتے ہیں اور عام لوگ بھی انہیں ایسا ہی سمجھنے لگتے ہیں جبکہ یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ اس قوم کا نام پاکستان ہے اور یہ لوگ پاکستان کے خلاف اپنے قبیلے کی سیاست کرتے ہیں۔ جب انہیں حکومت پاکستان کوئی عہدہ دے دے تو یہ قومی دھارے میں شامل ہو جاتے ہیں اور جب یہ عہدہ لے لیا جائے تو پھر یہ پاکستانی قوم کو بھول کر اپنے قبیلے کو قوم قرار دے

دیتے ہیں۔

انہی سارے عوامل کی وجہ سے پاکستان میں مخلص سیاسی قیادت ابھر کر سامنے نہیں آسکی ۔ہماری سیاست تو اسی سے محدود دائرے میں قید ہو جاتی ہے جب امید وار کی شخصیت ، اس کی قابلیت، اسکے کردار سے بڑھ کر اس کی برادری اہم ہو جاتی ہے، اسے صرف برادری کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں ٹکٹ دیتی ہیں کہ جس کی جتنی بڑی برادری ہو گی اتنے زیادہ ووٹ ملیں گے اور اسمبلی میں سیٹوں کی تعداد بڑھ جائے گی یعنی بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر تولا گیا تو بہت سارے پلڑے ہوا میں اچھل جائیں گے لیکن سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آخر یہ ملک کب تک اس غیر معیاری سیاست کا حامل ہو سکے گا اور کب تک انتظار کر سکے گا کہ کوئی پاکستان کے نام پر سیاست کرے۔پاکستان بفضل خدا ایک اسلامی ملک ہے جہاں ستانوے فیصد مسلمان رہتے ہیں جن میں سے ایک چھوٹی سی اقلیت کو نکال کر اکثریت صوم و صلوۃ کی پابند ہے، مذہب کے بنیادی اصولوں سے بھی واقف ہے بات تو صرف اسلام پر عمل کرنے کی ہے جو یہ مذہبی اور مسلکی سیاسی لیڈر کروانے میں کامیاب نہیں ہو رہے کیونکہ ایسا کروانے کے لیے خود بھی صاحب عمل ہونا ضروری ہے۔اردو ، پنجابی، بلوچی، سندھی اور پشتو سبھی یہی زبانیں بولتے رہیں گے چاہے ان کے لیڈر ہر وقت ان پر لسانی سیاست مسلط کریں یا نہ کریں اور یہ بھی بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگر شاہ یا گیلانی

یا کسی اور برادری کا نمائندہ منتخب ہوا تو ساری برادری نہیں بلکہ صرف ممبر صاحب کا گھرانا ہی مالا مال ہوگا۔

میری سیاسی رہنماؤں سے درخواست ہے اور دست بستہ درخواست ہے کہ برائے خدا ایک بار پاکستان کے لیے بھی سیاست کیجئے پاکستان کے نام پر نہیں بلکہ پاکستان کے لیے تاکہ کچھ حق اس ملک کا بھی ادا ہو جس نے آپ کو نام دیا ہے اور جب آپ پاکستان کے لیے سیاست کریں گے تو اللہ آپ کو ضرور کامیابی دے گا پھر آپ کو مذہبی رہنمائی کا لبادہ اوڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ یہ ملک اللہ کے نام پر بنا ہے۔ نہ آپ کو زبان کا سہارا لینے کی ضرورت رہے گی کیونکہ خلوص اور محبت کی زبان ہر ایک سمجھتا ہے، نہ علاقائیت اور قومیت کی لاٹھی ٹیکنا پڑے گی کیونکہ پاکستان کا ہر کونا اپنی زمین آپ کے لیے کشادہ کر دے گا، نہ فوج کی مخالفت کرنا پڑے گی نہ موافقت کیونکہ آپ اپنے محاذ پر سرگرم ہوں گے اور فوج اپنے محاذ پر بغیر آپس کی کسی چپقلش کے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ چاہے سارے ادارے اپنا ہر قسم کا زور لگالیں لیکن ہمارے سیاست دان اپنے اندر سے سیاسی، ذاتی اور جذباتی کرپشن نہ ختم کر دیں تو ہم ایک مضبوط پاکستان نہیں بنا سکتے جہاں ہم امن اور سکون سے رہ سکیں اور دنیا میں اپنا مقام بنا سکیں۔

شرط صرف ایک ہے

حکومت یا کوئی نجی ادارہ بھی کسی آسامی کا اعلان کر دے تو امیدواروں کی قطاروں کی قطاریں لگ جاتی ہیں مطلوبہ تعلیم میٹرک ہوتی ہے لیکن قطاروں میں بیشتر افراد کے ہاتھوں میں بی اے کی ڈگریاں ہوتی ہیں، پانچ سو امیدواروں میں سے چار سو نوے پچانوے نوجوان ناکام و نامراد کسی اور دروازے پر جا کھڑے ہو جاتے ہیں اور یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کچھ خوش قسمت تو پانچ دس ٹھوکروں کے بعد کسی ٹھکانے لگ جاتے ہیں کچھ نا امید ہو کر ریڑھا چھابڑی لگا لیتے ہیں، کچھ کسی سمگلر کے جرائم میں شامل ہو جاتے ہیں اور کچھ نوکری کی تلاش میں کسی دہشت گرد تنظیم سے منسلک ہو جاتے ہیں اور یہ پانچ سو امیدوار نوکری لگ جاتے ہیں اور ہماری حکومتیں بے روز گاری کم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کون کس نوکری پر لگا اس کی پرواہ انہیں نہیں۔ انہیں تو وہ پاکستان نظر آتا ہے جو صدر، وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ، وزیروں اور اراکین قومی و صوبائی اسمبلیوں کے محلوں کے اندر ہوتا ہے یا قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی شاندار عمارتوں میں۔ جبکہ پاکستان وہ ہے جو اِن ساری عمارتوں کے باہر ہے جن کے رہنے والے لاکھوں کی گھڑیاں اور لباس زیب تن کرتے ہیں اور پرس کے اندر تو خیر کتنی رقم ہوگی خود پرس کی کی قیمت بھی صرف دس بیس لاکھ ہوتی ہے۔ جہاں احساس کا یہ عالم ہو وہاں عوام کا دکھ

کتنا ہوگا اور پھر بھی حکمران عوام کے خادم ہونے کا دعویٰ ببانگ دہل کرتے ہیں اور جب کوئی زندگی کے مصائب سے ہارا ہوا انسان خود کشی کر لیتا ہے تو اُس کے گھر والوں کو اس کی زندگی کی قیمت دو تین لاکھ روپے ادا کرکے عوامی حکمران بن جاتا ہے اور ایم ایس اور ایم اے کیئے ہوئے نوجوان جو کسی دہشت گرد تنظیم سے وابستہ ہونے کی سوچ رہے ہیں اور کچھ ایسا کر چکے ہیں وہ کسی توجہ کے مستحق نہیں کیونکہ ابھی وہ زندہ ہیں اور دہشت گردوں کے ماسٹر مائنڈ بن کر ان کے منصوبہ ساز یا آلہء کار بن سکتے ہیں یعنی بے روزگار تو نہیں رہیں گے۔ تعلیم کو عام کیا جانا یقیناً ضروری ہے لیکن تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ہم ملک میں دہشت گردی کا رونا تو روتے ہیں اور اس نے معیشت کو جو نقصان پہنچایا ہے اُس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں لیکن اس کے عوامل میں سے بہت سے عوامل سے صرف نظر کر جاتے ہیں جن میں ایک بے روزگاری بھی ہے۔ یہ دہشت گردی صرف طالبان کی صورت میں نہیں ہو رہی بلکہ بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان، گاڑی چوری، ڈکیتیوں اور مختلف صورتوں میں معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ حکومت چاہے مرکزی ہو یا صوبائی سب اپنی اپنی کامیابیوں کے گن گا رہی ہیں جب کہ عوام بنیادی ضروریات کے لیے ترس رہے ہیں۔ ایک گھر جس میں بھوک کا پیٹ بھرنے کے لیے صبح سے شام تک محنت ہو لیکن بھوک نہ مٹائی جا سکے اس گھر کے دو چار بچے اگر دہشت گردی کے بارے میں سوچنے لگیں تو کچھ انہونا بھی نہیں ہوتا اور اگر والدین ایک دو کو نان

نفقے کے لالچ میں ایسے مدرسوں کے حوالے کر دیں جو دینی تعلیم سے زیادہ اپنے دوسرے مقاصد کے حصول میں مصروف ہوں تو پھر کچھ بعید نہیں کہ یہ بچے خود کش دھماکوں میں استعمال ہوں اور ہماری حکومتیں اسی دہشت گردی سے نجات حاصل کرنے کے لیے۔بڑی طاقتوں کے آگے امداد کے لیے ہاتھ پھیلائیں اور یہ طاقتیں امداد ہی کے نام پر ملک میں داخل ہوں لیکن کریں وہ جو وہ چاہیں ۔اپنے این جی اوز کو اتنا پھیلادیں کہ وہ ہماری نبض پر اپنی گرفت مضبوط کرلیں یہی این جی اوز امداد کے نام پر ہمارے دیہات اور شہروں میں اس قدر پھیل چکے ہیں کہ ان کی حکومتوں کو اپنا ایجنڈا پورا کرنے کے لیے کسی اور ذریعے کی ضرورت بہت کم رہتی ہے۔ سی آئی اے ، رااور دوسری ایجنسیوں اور حکومتوں کے کارندے سب اپنا کام۔بڑے سکون اور اطمینان سے کر رہے ہیں اور ہماری حکومتیں خوش ہیں کہ ان کے حصے کا کام ہو رہا ہے یعنی امداد اور روز گار دونوں لوگوں کو فراہم کیے جارہے ہیں۔ حکومتیں بیرونی امداد سے ملک چلانے کے لیے جواز بھی پا رہی ہیں اور اپنی شاہ خرچیاں بھی اس امداد سے پوری کر رہی ہیں اور اپنے مال جائیداد اور کارخانوں کی تعداد میں اضافہ بھی کر رہی ہیں ۔ اگر ہمارے سیاستدان اپنے جلسوں اور تقریبات پر کروڑوں لگا کر ایک وقت کا کھانا شرکاء کو کھلا کر جو خرچہ کر رہے ہیں اُسی سے اِن بے روزگاروں کے لیے روزگار کے زیادہ نہیں کچھ کچھ مواقع فراہم کرتے رہیں تو تھوڑا تھوڑا بہت ہو کر کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور ہم بیرونی امداد بالفاظ دیگر ”بھیک “کی لعنت سے

نجات پا سکیں گے۔ ہمارے نوجوان اگر تعمیری سر گرمیوں میں مصروف ہو جائیں تو ہمیں خود کش دھماکوں کے بعد جائے وقوعہ سے نوجوان سر ملنا بھی بند ہو جائیں۔ دہشت گردی اور دوسرے مسائل کا مقابلہ ہم اب بھی کر رہے ہیں لیکن صرف اپنے فوجی جوانوں کے خون سے جواں دہشت گردوں کے مقابلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے چاہے اپنی جان دے دیں یا ان کی لے لیں لیکن جب تک جڑیں نہ کاٹیں جائیں یہ جھاڑیاں یونہی اگتی رہیں گی اور ملک کو تباہ کرتی رہیں گی لہذا ضرورت جڑیں کاٹنے کی ہے۔

مسائل کے حل اور ان سے نجات کے راستے بہت ہیں لیکن اگر ہمارے حکمران اور اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے دماغ اور منصوبہ ساز اپنی عیاشیوں اور بد عنوانیوں سے باز آ کر اِن کے حل کے لیے کوئی منصوبہ بندی کریں اور اپنے ذاتی مفادات کو بھول کر قومی مفاد کے لیے کام کریں، کارخانے اپنے لیے لگائیں لیکن اپنے ملک میں اور دوسروں کو بھی یہی ترغیب دیں تو ہم بھی اقوام عالم میں کسی باعزت مقام کے مستحق ہو سکتے ہیں شرط صرف ایک ہے خلوص نیت اور خلوص عمل۔

مسلمان خاندانوں کے 200 افراد کو زبردستی ہندو بنایا گیا 57

پاکستان کے صوبہ سندھ میں کچھ ہندو لڑکیوں نے اسلام قبول کر کے مسلمان مردوں سے شادیاں کیں تو بھارت نے تو طوفان اٹھایا ہی عالمی سطح پر بھی اس پر اعتراضات کیے گیے اور خود پاکستان کے اندر ہمارے انسانی حقوق کی علمبرداری کے مرض میں مبتلا کچھ افراد اور کچھ تنظیمیں بھی عالمی شہرت اور بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میدان میں کود پڑے۔ اگرچہ ان لڑکیوں نے خود بھی اِس بات کا اقرار کیا کہ ان پر کوئی زبردستی نہیں کی گئی لیکن اس مسئلے کو جتنا اچھالا جا سکتا تھا اچھالا گیا جب کہ دوسری طرف بھارت میں خاص کر مودی حکومت کے آنے کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں کو زبردستی ہندو بنانے کا عمل جاری ہے اور حال ہی میں 57 مسلمان خاندانوں کے 200 افراد کو ہندو بنانے کی کوشش کی گئی یا ہندو بنایا گیا۔ ان غریب لوگوں کو راشن کارڈ فراہم کرنے کے بہانے جمع کیا گیا اس سارے عمل کو کرنے کے لیے پُرکھوں کی واپسی کے نام سے تقریب کا اہتمام کیا گیا یعنی یہ سب کچھ دیدہ دلیری سے کیا گیا۔ بھارت میں ایسے واقعات عام ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو زبردستی ہندو بنایا جائے اور اس سال دسمبر ہی کے مہینے میں آگرہ کی ایک انتہائی غریب کچی آبادی کے 57 مسلمان خاندانوں کے 200 افراد کو

جس طرح جھانسا دے کر اور زبردستی ہندو بنایا گیا یا بنانے کی کوشش کی گئی اور کہا یہ گیا کہ ان کے آباواجداد چونکہ ہندو تھے اس لیے یہ انکی گھر واپسی ہے اور اس تبدیلی مذہب کے بدلے ان کو راشن کارڈ اور کچھ اور سہولتیں دی گئیں۔بقول بی جے پی، دھرما جگرن سمانویا وبھاگ اور بجرنگ دل جیسی شدت پسند اور دہشت گرد تنظیموں کے اب انہیں بھارت میں رہنے کا حق حاصل ہو گیا ہے کیوں کہ ان تنظیموں کا ایک ہی مشن ہے کہ بھارت کو یک مذہبی ملک بنایا جائے یعنی ہندو ملک۔ بھارت اب بھی ہندو ملک ہے دوسرے مذاہب کی اکثریت وہاں کچی آبادیوں میں "سلم ڈاگز" جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔بڑے شہروں میں پوش علاقوں میں رہتے ہوئے بھی ان کے گھر اور جانیں محفوظ نہیں ہیں جب ہندو ذہنیت کو جوش آتا ہے وہ ان کے گھر اور مسجدیں ڈھا دیتے ہیں ۔ بابری مسجد کی شہادت کو اب بھی یہ اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں اور ایسا سمجھنے والوں میں نریندر مودی سر فہرست ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کی برسی کی خوشی میں بجرنگ دل نے اس بار بھی مشعل بردار جلوس نکالا لیکن یہ تنظیم "کالعدم" قرار نہیں پائی۔ آگرہ میں حال ہی میں نشانہ بننے والے یہ غریب خاندان بنگالی ہیں جو بنگلہ دیش سے ہجرت کر کے یہاں آئے اور گذشتہ سترہ سال سے انتہائی غربت کی زندگی گزار رہے ہیں اگرچہ ان میں سے نور محمد اور اسماعیل صدیق نامی شخص نے کہا ہے کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں اور رہیں گے نور محمد نے کہا کہ انہیں اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ انہیں اس تقریب میں اس مقصد سے لایا گیا ہے۔

ایک مسلمان عالم نے نام ظاہر کیے بغیر کہا کہ ہندو ہونے والے خاندان مسلمان ہی نہیں تھے اور بنگلہ دیش سے آنے والے ہندو خاندان ہی تھے ۔ کیونکہ ایک مسلمان اتنی آسانی سے اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتا بہر حال جو بھی تھا یا ہے بھارت کے سیکولر ہونے کا پول ایک بار پھر کھل گیا ہے لیکن عاصمہ جہانگیر، ماروی سرمد، امتیاز عالم اور اس قبیلے کے دیگر پاکستانی ''علمبردارانِ انسانی حقوق'' جو پاکستان میں کسی ہندو کے مسلمان ہونے پر چیخ اٹھتے ہیں آج چپ ہیں ۔ کیونکہ یہ سب بھارت میں ہوا اور بھارت سے ان کے مفادات اور ان کی شہرت وابستہ ہے۔ بھارت میں یہ سلوک صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ دوسرے مذاہب بھی اس کا شکار ہیں اور عیسائی برادری بھی اکثر نشانے پر رہتی ہے۔ صرف تین ماہ قبل اس سال ستمبر میں علی گڑھ میں عیسائی خاندانوں کو ہندو بنایا گیا اور توجیہہ دی گئی کہ عیسائی پادری بھی گھر گھر جا کر بائبل اور مسیحی مواد تقسیم کرتے ہیں اور ایسا غیر ملکی امداد سے کیا جاتا ہے، اس سے مجھے بھی انکار نہیں کیوں کہ ایسے مشن پاکستان سمیت دنیا بھر میں کام کرتے ہیں لیکن یوں خاندانوں کو جمع کرکے زبردستی تبدیلی مذہب کروانا کسی بھی طرح جائز نہیں، لیکن بھارت میں ایسا ہو رہا ہے اور ببانگ دہل ہو رہا ہے اور باوجود اس کے کسی بین الاقوامی تنظیم نے بھارت کو اقلیتوں کے لیے خطرناک ترین ملک قرار نہیں دیا جبکہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے راجیشوار سنگھ نے کھل کر کہا ہے کہ اس بار کرسمس پر پانچ ہزار سے زیادہ مسلمانوں اور عیسائیوں

کو ''واپس'' ہندو بنایا جائے گا اور اس سلسلے میں مہا شیواری کالج علی گڑھ میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا جائے گا تقریب کی صدارت کا بھی اعلان کیا گیا ہے جو یوگی اڈیا ناتھ کرے گا اس نے یہ بھی بتایا کہ آر ایس ایس ہر ماہ اس مقصد پر پچاس لاکھ روپے خرچ کر رہی ہے اور 2003 سے اب تک آگرہ، فتح پور سکری، ایتاھ، میرٹھ اور چند دوسرے شہروں میں دو لاکھ تہتر ہزار مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنایا جا چکا ہے۔ یہ صرف چند واقعات اور منصوبہ بندیاں ہیں جو میں نے بیان کیے ہیں ورنہ ایسے کئی منصوبے بھارتی تنظیمیں بھارت سرکار کی مدد سے بنا اور چلا رہی ہیں اور ڈھنڈورا اپنے سیکولر ہونے کا پیٹا جاتا ہے۔ یہاں بڑے پیمانے پر مذہبی دہشت گردی ہو رہی ہے لیکن عالمی طاقتیں اور تنظیمیں خاموش ہیں۔ پاکستان میں اقلیتوں سے ذاتی دشمنی کی بنا پر ہونے والے کسی واقعے کو بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دے کر اسے اقلیتوں کے لیے خطرناک ترین ملک قرار دے دیا جاتا ہے حالانکہ یہاں ہونے والے کسی ایسے واقعے کو حکومتی اور سیاسی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی جبکہ دوسری طرف بھارت میں ایسا حکومتی سرپرستی میں کیا جاتا ہے لیکن مغرب جو سوڈان میں دس فیصد عیسائی آبادی کے لیے الگ ملک بناتا ہے کیونکہ سوڈان ایک غریب مسلمان ملک ہے بھارت میں اپنے مذہب سے ہونے والے سلوک پر چپ ہے کیونکہ یہاں مسلمان بھی ان کے ساتھ شامل ہیں اور وہ بھارت کو ناراض کر کے نہ تو پاکستان کے خلاف ایک مضبوط حریف کھونا چاہتا ہے اور نہ ہی ایک ارب سے زیادہ آبادی کی ایک بڑی

منڈی۔ یہاں ایک شکایت مسلمان ملکوں سے بھی ہے خاص کر عرب ممالک اور ایران سے جو اکثر اوقات بھارت کو پاکستان پر فوقیت دے دیتے ہیں کہ وہ اس تمام صورتحال کا نوٹس نہیں لے رہے، اگر یہ ممالک صرف مسلک اور فقہ کی بنیاد پر مسلم دنیا بشمول پاکستان میں مسائل کھڑے کر سکتے ہیں تو بھارت میں مذہب کے نام پر بھی خاموش کیوں ہیں۔ ہم مغرب کے رویے پر شکایت یا گلہ ضرور کر سکتے ہیں انہیں اسلام کی حمایت پر مجبور نہیں کر سکتے لیکن ہماری حمیت ملی اور غیرت دینی کہاں گئی کیا مسلمان حکمران ایک عام مسلمان کی مدد کر سکیں گے جو اس تلاش گمشدہ میں نکلا ہوا ہے کہ کہیں سے وہ اُس اسلام کو ڈھونڈھ لائیں جو محمد ﷺ عربی کا اسلام تھا اور جب کسی مسلمان کی تکلیف پر پورا عالم اسلام بلبلا اٹھتا تھا۔ بھارت کا مسلمان اگر تکلیف میں ہے بلکہ اس کا ایمان خطرے میں ہے تو پورے عرب و عجم کی ذمہ داری ہے کہ اس کی مدد کرے لیکن پہلے اپنے ذاتی اختلافات تو مٹا دیں اگر مٹا نہیں سکتے تو بھلا ہی دیں تاکہ اپنے رب اور رسول ﷺ کے آگے شرمساری میں کچھ تو کمی ہو۔

تم کو رقم کریں گے یہ بچے کتاب میں

پشاور کے ہسپتالوں میں مردہ خانوں کے آگے کسی چہرے پر کوئی امید کوئی آس نہیں تھی آج پورا شہر سوگوار ہے شہر کیا پورا ملک رو رہا ہے ہر آنکھ اشکبار ہے آج دہشتگردوں نے سفاکیت اور درندگی کی انتہا کردی ۔ دہشتگردی کے واقعات سالہاسال سے ہورہے ہیں اور ہر واقعہ قابل افسوس اور قابل مذمت ہے لیکن آج تو سارا پاکستان رو پڑا چیخ اٹھا یہ حملہ یوں تو آرمی پبلک سکول پر ہوا لیکن یہ پاکستان کے ہر بچے پر حملہ ہے اس کے مستقبل پر حملہ ہے۔ معلوم نہیں وہ انسان کیسے ہوتے ہیں جو انسان کو مار کر فتح کا جشن مناتے ہیں اور وہ کیسے لوگ تھے جن کی بندوقیں بچوں کی طرف اٹھیں اور گولیاں اُگل گئیں انہیں اپنی ماں کا بھی خیال نہیں آیا کہ اس نے ان کو ان کے بچپن میں کیسے تکلیف سے بچانے کی کوشش کی ہوگی ایسی ہی مائیں ان بچوں کی بھی ہیں لیکن ایسا تو انسان سوچتے ہیں اور یہ دہشت گرد جو خود کو مسلمان کہتے ہیں یہ تو انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں۔ اگر وہ انسان ہوتے تو وہ یوں پھول جیسے بچوں کو نہ مارتے بلکہ نہ کچلتے۔ آٹھویں جماعت کو وہ چھوٹا سا بچہ کامران ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا جو سینے پر دو گولیاں کھا کر کہہ رہا تھا اب میں ٹھیک ہوں اب درد کم ہے۔ دسویں جماعت کے عمر خان سے جب ہسپتال میں بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے سکول کا

پراکٹر تھا اور گیٹ پر اس کی ڈیوٹی تھی ان دہشتگردوں نے اندر داخل ہوتے ہی اس پر گولی چلائی اور پھر اس کے دو دوستوں کو شہید کیا اور جب یہ ان کی مدد کرنے کے لیے ان کی طرف بڑھا تو اس پر دوسری گولی چلائی گئ اور اس کے بعد جب وہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے کے قابل بھی نہ رہا تو تب اس نے اپنی جان بچائی اب کس نے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا اس بچے نے یا طالبان نے۔ مسلمان وہ بچہ تھا جو چار پانچ چھوٹے بچوں کو لے کر بھاگ رہا تھا یا خلافت اور امارت کے دعویدار یہ درندے۔ میری جلال اور علیم سے بھی بات ہوئی بے شک کہ ان کے حوصلے بلند تھے ان میں سے کسی نے بھی آئندہ سکول نہ جانے کی بات نہ کی لیکن جو یہ کہتے ہیں کہ قربانیاں زندہ قومیں دیتی ہیں اور آخری سانس تک لڑینگے وغیرہ وغیرہ تو بلاشبہ کہ ایسا ہی ہے لیکن کیا پاکستان میں قربانیوں کا یہ سلسلہ تھمے گا بھی تاکہ ہم ان قربانیوں کا پھل کھا سکیں یا کیا ہمارے حکمران ہمیشہ قوم سے قربانیاں مانگتے رہیں گے اور صبر کے میٹھے پھل کے لیے ہماری نسلوں کی نسلیں قربان ہوتی رہیں گی اور نامراد گزرتی رہیں گے۔

دہشت گردی ہمارے ملک کا سب سے گھمبیر مسئلہ ہے لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ ہمارے حکمرانوں کی غلطیوں کا خمیارہ ہے جو قوم بھگت رہی ہے ہمارے سیاستدان آپس میں دست وگریباں ہیں انہیں حکومت چاہیے اور جن کے پاس حکومت ہے وہ اس کے دائمی تسلسل کے خواہاں ہیں۔ قوم کا خیال انہیں تب آتا ہے ملک کی فکر

انہیں تب ہوتی ہے جب ان کے چہرے لہو لہان ہو جاتے ہیں۔ آج پشاور کے آرمی پبلک سکول کے باغ سے جب پھول نوچے گئے، پاکستان کے مستقبل کے کئی روشن ستارے تاریک کر دیئے گئے تو ایک دفعہ پھر سیاسی قیادت مل بیٹھی۔ سیاست سے اختلاف کو خارج نہیں کیا جا سکتا لیکن کم از کم قومی معاملات پر تو اتفاق رائے ہو۔ قوم چیختی رہی کہ ہمارے قاتلوں یعنی دہشت گردوں کو سزائیں دی جائیں لیکن کہیں ہماری عدالتیں یہ بیان اور فیصلے سناتی رہیں کہ ثبوت ناکافی ہیں اور یوں درندوں کو بری کیا جاتا رہا اور کہیں اگر کسی عدالت نے غلطی سے کھلے ثبوت تسلیم کر لیے اور مجرموں کو سزا سنائی تو ہماری حکومتیں مصلحتوں کا شکار ہو کر ان سزاؤں پر عمل درآمد سے گریز کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ دہشت گردوں کی پھانسیوں کو بھی روکا گیا بلکہ بہت سوں کو تو رہا کر دیا گیا اور توجیہہ صرف وہی ایک کہ ثبوت ناکافی ہیں۔ کیا پشاور آرمی پبلک سکول کے ان بچوں نے کوئی جرم کیا تھا اور کیا طالبان نے کسی لمبے مقدمے کے بعد انہیں مجرم پا کر انہیں مارا اگر ایسا نہیں ہے تو ہم کیوں لمبے مقدموں اور ثبوتوں اور عدالتی فیصلوں کے چکر میں رہتے ہیں جبکہ انہیں جائے وقوعہ سے گرفتار کیا جاتا ہے تو اور کون سے ثبوت ہیں جو نہیں مل رہے۔ ایسے حادثوں کے بعد تو ہم سب یک زبان ہو جاتے ہیں ایک قوم بن جاتے ہیں اور اس کے چند دن بعد ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اب بھی حکومت نے تین روزہ سوگ کا اعلان کیا ہے لیکن کیا صرف سوگ منا لینے سے ہم آئندہ اس قسم کے حادثات سے محفوظ ہو

جائیں گے قوم کا فیصلہ اس سوچ کے خلاف ہے اور سوال یہ ہے کہ ہم آخر ان دہشت گردوں کو فوری سزائیں کیوں نہیں دیتے اور کیوں انہیں مزید اور مزید مواقع فراہم کر دیتے ہیں۔ حکومت نے جس سوگ کا اعلان کیا ہے وہ اُس ماں کے دکھ کا علاج نہیں جس کا بچہ بیدردی سے شہید کر دیا گیا اگر حکومت واقعی سنجیدہ ہے جیسا کہ آج وزیر اعظم نواز شریف نے دہشت گردوں کی سزاوں پر سے پابندی ختم کرنے کا اعلان ہے تو کیوں نہ ان تین دنوں میں ہی ان دہشت گردوں کو پھانسی پر اٹکایا جائے حق تو یہ ہے کہ ہر اُس بیٹے کو جس کا باپ، ہر اُس ماں کو جس کا بیٹا اور ہر اُس بہن کو جس کا بھائی اس دہشت گردی کی نظر ہوا ان کو حق حاصل ہے کہ ان کو اسی طرح چوکوں چوراہوں سڑکوں اور مارکیٹوں میں سرعام سزا دیں جیسا کہ اُنھوں نے معصوم لوگوں کو ہر جگہ مارا لیکن شاید ایسا ممکن نہ ہو لہذا حکومت اپنا فرض ادا کرے اور خون کا بدلہ خون لے۔ ڈی جی آئی ایس پی آر نے کہا ہے کہ یہ پتہ چلا لیا گیا ہے کہ اے پی ایس پر حملہ کرنے والے دہشت گرد کون تھے اور کہاں سے ہدایات لے رہے تھے اگر ایسا ہے تو اگر ابھی ممکن نہ ہو تو جلد از جلد قوم کو حقائق بتائے جائیں اور ان مجرموں تک رسائی حاصل کرکے انہیں اعلانیہ اور جلد از جلد سرعام سزائے موت دی جائے اگر ہم نے ایک دفعہ سخت سزاؤں پر عمل درآمد شروع کر دیا تو دہشت گردی سے نجات پانے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ قوم اپنے معصوم بچوں کے خون کے بدلے کا انتظار کرے گی اور ان کو جلد از جلد سزا شاید ان کے زخموں پر مرہم رکھ دے کیونکہ

اب مزید صبر بزدلی کے زمرے میں آئے گا اور بزدل قومیں فنا ہو جاتی ہیں تاریخ انہیں اپنے صفحات سے مٹا دیتی ہیں۔ بس اب مزید کسی حادثے کا انتظار مت کیجیے آخری فرد تک مقابلہ ضرور اچھا ہے لیکن جب آخری فرد، آخری سانس بھی ختم ہو جائے تو جیت کس کام کی۔ اگلی نسل تک بات مت جانے دیں ان کی حفاظت ہمارا فرض بھی ہے اور ضرورت بھی ورنہ ہمیں کتاب میں کون رقم کرے گا۔

ہم نکتہء انجام ہیں اس تیرہ شبی کا

پشاور میں سکول پر حملہ ہوا معصوم بچوں کا خون بہایا گیا اور بے رحم و بے دریغ بہایا گیا محاورتاً نہیں حقیقتاً کلیوں کو روندا گیا جو بچے شہید ہوئے ان کے والدین ، بہن بھائیوں اور عزیز رشتہ داروں کا تو جو حال ہے وہ تو وہی جان سکتے ہیں ہم تو صرف ان کے صبر کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ ان کی مدد کرے کہ ان کی مدد انسان کے بس کی بات نہیں۔ اُس دن مائیں اپنے بچوں کو ڈھونڈتی ہوئی اپنے آپ سے بے خبر دوڑی پھر رہی تھیں بے شک کہ اولاد کی تکلیف سے بڑھ کر والدین کے لئے اور کوئی تکلیف نہیں۔ ہسپتالوں میں اپنے زخمی بچوں کے ساتھ بیٹھی ماؤں کا کرب بھی کلیجہ چھلنی کر دیتا ہے۔ وینٹیلیٹر پر پڑے ابرار کے والدہ کی بے چینی اور دعا کے لیے التجا کوئی جانور بھی دیکھے تو رو پڑے۔ عبداللہ ہو ،ارسلان ہو، سعد ہو، طلحہ ہو یا وحید ہو کون سا بچہ کم پیارا ہے ہم سب کے ہاتھ ان کی صحت یابی کی دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہیں۔ ماؤں نے انہیں اس لیے تو نہیں پالا تھا کہ وہ دہشتگردی کی خوراک بن جائیں وہ مبین وہ زین، ان کا قصور کیا تھا، سہیل اسلم جیسا پر امن بچہ جس کو تو شرارت کرنا بھی کم کم ہی آتی ہوگی اس کی امن پسندی بھی شر پسندوں کی نظر ہو گئی لیکن کیا ہم ان بچوں کو بھول جائیں گے اور تین دن سوگ منا کر پھر سے اپنی اپنی مصروفیات میں مشغول

ہو جائیں گے۔ ہماری حکومت جو ابھی تو بلند بانگ دعوے کر رہی ہے اور یقیناً کچھ اقدامات بھی کر رہی ہے، کہیں پھر تو نہیں سو جائے گی جس کے امکانات ہر وقت موجود رہتے ہیں لیکن یاد رہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے اور یا یہی وقت ہے اگر اس وقت بھی ہم نے کچھ نہ کیا تو قوم اسی طرح ان شدت پسندوں اور دہشت گردوں کی یرغمال رہے گی اور ہم کمیٹیاں اور کمیشن بناتے رہیں گے۔ حیرت کا مقام ہے کہ دہشت گرد ہمارے معاشرے کا ناسور بن کر پھیل چکے ہیں کون جانے کہ ساتھ والے گھر میں یہی لوگ ہوں یا ان کے ہمدرد اور مددگار ہوں اگر دارالحکومت کے قلب میں لال مسجد کے اندر سے مولانا عبدالعزیز کی آواز دہشت گردوں کی حمایت میں اٹھتی ہے تو کیا اور ایسے لوگ نہیں ہونگے اور کیا ایسا نہیں ہوگا کہ ام حسان جامعہ حفصہ میں لڑکیوں کو یہی تعلیم دے رہی ہوگی ۔ یہ سب کچھ پچھلے بارہ تیرہ سال سے ہو رہا ہے لیکن ایکشن پلان آج بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اور معلوم نہیں یہ سیاستدان جنگی حکمت عملی کیسے وضع کریں گے لگتا یوں ہے کہ قوم کا منہ بند کرنے کے لیے جلدی جلدی ایک کمیٹی بنادی گئی اور کمیٹی نے ہفتہ اتوار کی چھٹی کو بھی ضروری سمجھا یہ دو دن کیسے گذریں گے ذرا کسی شہید بچے کی ماں سے پوچھیں ماں جس کی کل کائنات اس کی اولاد ہوتی ہے ورنہ پھول کھلے ،بہار آئے، ہفتہ ہو یا اتوار اس کو اس سے کوئی غرض نہیں ۔ہم تو چھٹی کر رہے ہیں لیکن کہیں ایسا نہ ہو دہشت گرد کام پر نکل آئیں ۔ کیا واقعی سیاست کا دل نہیں ہوتا ہاں شاید اسی لیے تو ن لیگ اور تحریک

انصاف کے نمائندوں نے قوم کا مزید خون جلایا یہ کہہ کر کہ ایک ہفتے تک قوم کو خوشخبری مل سکتی ہے۔بریک تھرو ہو سکتا ہے کون سی خوشخبری، اس وقت تو قوم کو ایک ہی خبر کا انتظار ہے کہ بتایا جائے کہ ملک سے دہشت گردی کو ختم کر دیا گیا ہے اس کی جڑیں کاٹ دی گئی ہیں، دہشت گردوں کے رہنما اور ماسٹر مائنڈ گرفتار کرکے پھانسی چڑھا دیئے گئے ہیں اور کوئی خبر اس خبر سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ڈیڑھ سو بچوں اور اساتذہ کا خون بہانے کے بعد تو یہ پھانسی کے حقدار ٹھہر گئے۔ دو دو اور چار چار دہشت گردوں کو پھانسی چڑھانے سے اس عمل میں بہت دن لگیں گے کیا ان ظالموں کو وقت مہیا نہیں کیا جارہا کہ وہ بھی منصوبہ بندی کرلیں یا حکومت کو پھر پھانسی کی سزا زیادتی تو نہیں نظر آجائے گی اور دہشت گرد پھر اطمینان سے اپنی کاروائیاں کرنے لگ جائیں گے اور یہ بارہا ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ہمارے منصوبہ سازوں سے زیادہ اچھے منصوبہ ساز ہیں کہ ہر بار ہمارے فوجی اور سول پلان ناکام ہو جاتے ہیں اور دہشت گرد اپنا کام کر جاتے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر بھی ہے کہ آخر پھانسی کی سزا معطل کیوں کی گئی تھی کیا یہ جرم کو سہارا دینے کے مترادف نہیں۔ قمر زمان کائرہ نے کہا ایسا اس لیے کیا گیا کہ دنیا بھر میں موت کی سزا ختم ہو چکی ہے تو عرض ہے کہ وہاں ہمارے جیسے مسائل نہیں ہیں اور ہم ان کے قانون کو اللہ رسول ﷺ کے حکم پر ترجیح دیں گے تو ہم ایسے ہی سانحات سے گزرتے رہیں گے لیکن ہمارے حکمرانوں کو تو اس کا بھی خوف نہیں کہ جب یہ چلتے ہیں تو سو دو سو افراد ان

کی حفاظت پر مامور ہوتے ہیں۔جب وزیر اعظم زخمی بچوں کو دیکھنے پچاس ستر گاڑیوں کے جلوس میں ہسپتال تشریف لائے تو اتفاق سے میں بھی بچوں کی عیادت کے لیے اُدھر ہی تھی اور میں نے والدین کو کہتے سنا ''ساری سیکورٹی تو انھوں نے لے لی مر ہمارے بچے گئے'' اب اگر یہ حال ہو تو قوم کیا سوچے کیا کہے اور یہ سوچنا کہنا کل کو ایک اور قسم کی دہشت گردی کو بھی جنم دے سکتا ہے۔کیا بہتر نہ ہوتا کہ ملک کی پولیس کو وسائل دیے جائیں ،اس کی تربیت جدید خطوط پر کی جائے اور انہیں بہتر تنخواہ دی جائیں تاکہ وہ رشوت کی بجائے خدمت پر توجہ دیں۔ حکومت اگر ہنگامی بنیادوں پر اُٹھ کھڑی ہو جائے تو قوم اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو جائے گی بالکل خون کی ان بے تحاشا بوتلوں کی طرح جو ہسپتال میں پڑے بچوں کی ضرورت سے بھی بڑھ گیا تھا۔ اس وقت ہماری حکومت اور اداروں کے پاس سُستی کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی قانونی اور آئینی موشگافیوں کے لیے۔ یہ نہ کہا جائے کہ سزائے موت پر عملدرآمد کرنے کے لیے آئین میں ترامیم کی ضرورت ہوگی یہ بھی اعلان کرنے کی ضرورت نہیں کہ آج اتنی پھانسیاں دی جائیں گی بلکہ عمل کرکے بتایا جائے کہ اتنے افراد کو پھانسی چڑھا دیا گیا اور اس کا بھی کوئی جواز نہیں کہ سات دن بعد عمل شروع ہوگا سات دن میں تو عمل مکمل ہوجانا چاہیے۔ بہت اچھا کیا گیاکہ تمام شرعی اور انسانی تقاضے پورے کرکے ڈاکٹر عثمان اور ارشد کو پھانسی دی گئی اور ان لوگوں کے منہ بند کردیئے گیے جو پاک فوج پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے

الزامات لگاتے تھے انہیں بتا دیا گیا کہ کون کیا کرتا ہے لیکن ان سارے کاموں میں تیزی کی ضرورت ہے ورنہ چوکوں، چوراہوں اور راہوں، شاہراہوں پر اسی طرح ہماری لاشیں گرتی رہیں گی۔اب اس ظلم کا نکتہء انجام پہنچ جانا چاہیے اور اگر آرمی پبلک سکول میں پڑھنے والے ان فوجی اور سول بچوں (یاد رہے کہ بچے صرف بچے ہوتے ہیں) کا معصوم اور پاک خون یہ کہہ سکے کہ ہم نکتہء انجام ہیں اس تیرہ شبی کا تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اس خون کو رائیگاں نہیں جانے دیا ہم نے بدلہ لے لیا ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ قومی سانحات کا بدلہ لینا ہی قومی زندگی کی ضمانت ہے ورنہ کمزور قومیں مٹ جاتی ہیں اور جب قوم نہ ہو تو حکمران حکومت کرکے اپنی تسکین کیسے کریں گے سوچیے اور کچھ کیجیے کیوں کہ کرنے کو بہت کچھ ہے ورنہ دشمن تو اپنا کام کرتا رہے گا اور ہم صرف سوگ مناتے رہیں گے کیا اس قوم کو جشن منانے کا حق بھی ہے یا نہیں۔

سزائے موت۔۔۔کیا حکومت اور عدلیہ دباؤ میں

قوم اس وقت شدید صدمے اور دکھ سے دوچار ہے مائیں اپنے بچوں کو خود سے دور نہیں ہونے دے رہی ہیں بچے خود بھی خوفزدہ ہیں اُن دھمکیوں سے جو دہشت گردوں کی طرف سے آرہی ہیں اور وہ مائیں جن کے لخت جگر آرمی پبلک سکول پشاور میں دہشت گردی میں شہید ہوئے ہیں اُن کے دکھ کا تو اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ وہی جانتی ہیں لیکن آسان بھی ہے کہ ہر صاحب اولاد اس کا اندازہ کر سکتا ہے اور وہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ گویا اُس سے اُس کا بچہ چھینا گیا ہے۔ میں نے ہر ماں کو ڈھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا یہاں تک کہ مرد بھی سسکیاں لے لے کر روتے رہے۔ ریسکیو اہلکاروں نے بہت سے دھماکوں میں بہت سے جنازے اٹھائے ہوں گے لیکن اُس ایک تصویر کو دیکھ کر اندازہ لگایئے جس میں ایک اہلکار یوں رو رہا تھا جیسے اُس نے اپنے بچے، اپنی اُمیدوں کا جنازہ اٹھایا ہو۔ قوم اس وقت ایسی حالت میں ہے کہ اگر اُس کے دکھ کا مداوا نہ کیا گیا تو اس کا سنبھلنا مشکل ہے۔ ایسے میں اس بار حکومت اور سیاسی پارٹیوں نے بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا اور اپنی اکثر دیگر مصروفیات ختم کرکے اس مسئلے پر غور و خوص کیا۔ اگرچہ اس دوران بھی کچھ سیاسی مفادات کا تحفظ کیا جاتا رہا مثلاً پی ٹی آئی اور مسلم لیگ (ن) کے مذاکرات اور تصفیے ،کچھ نے ان حالات میں ذاتی بغض بھی نکالنے کی کوشش کی ۔ادھر

عمران خان ایک ہفتے بعد سکول تشریف لائے تاہم بحیثیت مجموعی توجہ دہشت گردی کے مسئلے اور اس کے خاتمے پر مرکوز رہی شاید اس لیے بھی کہ قوم اور کچھ سننا بھی نہیں چاہتی۔ ایسے میں پھانسی کی معطل سزا بھی بحال کی گئی اور میڈیا مسلسل بلیک وارنٹ موصول ہونے کی خبر دیتا رہا رحم کی اپیلیں مسترد ہونے کی اطلاعات بھی آتی رہیں لیکن حیرت انگیز طور پر پھر ہمارا عدالتی نظام آڑے آتا رہا اور صرف چھ پھانسیاں دی گئیں جبکہ قوم بہت بڑی تعداد کا انتظار کر رہی ہے۔ ایسے میں یورپی یونین کی آواز نے قوم کو چونکا دیا بلکہ برافروختہ کر دیا کہ یورپی یونین نے پھانسی کی سزا بحال ہونے پر شدید تحفظات کا اظہار کیا سوال یہ ہے کہ یہ ہمارا معاملہ ہے اور اس پر بولنے کا کسی کو حق نہیں ہونا چاہیے اگرچہ اُمید ہے کہ ہماری حکومت اسے مانے گی لیکن پھانسی کی سزا پر رکا ہوا عمل درآمد بھی عوام میں اضطراب کا باعث بن رہا ہے اور یہی تصور کیا جا رہا ہے کہ ہماری حکومت اور عدالتیں پھر دباؤ میں آ گئی ہیں اور اسی لیے آئین اور قانون میں نکتے اور شقیں نکال کر توجیہات تلاش کی جا رہی ہیں۔ ایک ٹی وی چینل نے جب ججوں سے رائے لی کہ موت کی سزا ہونی چاہیے یا نہیں تو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ انتہائی غیر متعلقہ دلائل پیش کر رہے تھے، اگرچہ وہ سزا کی مخالفت بھی نہیں کر رہے تھے لیکن اسے پُر اثر بھی نہیں گردان رہے تھے مجھے نہیں معلوم ایسا کہنے والے لوگ یورپی نظریے سے متاثر ہیں یا یورپی خوشنودی کے خواہاں اور یا پھر نامعقول

روشن خیالی کے شوقین۔ یورپی یونین بھی کہتی ہے کہ پھانسی مسئلے کا حل نہیں اور اس سے معاشرے میں جرائم کم نہیں ہوتے اور ہمارے چغادری قانون دان اور منصفین بھی اس خیال کا اظہار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ خود کش تو مرنے آتا ہے اُسے سزا کا خوف کیوں کر ہوگا تو کیا اُن کے خیال میں مرنے والے خودکشوں کو پھانسی دی جائے گی خود کش تو مر گیا ہم تو ان کی پیٹھ پر بیٹھے دہشت گرد ذہنوں کی بات کر رہے ہیں جو انہیں بھیجتے ہیں دہشت گرد تو اپنی سزا پالیتا ہے اور آخرت میں حدیث نبوی ﷺ کے مطابق خود کش اسی طریقے سے مسلسل خود کشی کرتا رہے گا۔ لہذا مسئلہ اس خود کش کا نہیں جو مر گیا مسئلہ اُن دہشت گردوں کا ہے جو زندہ گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور بات یہ بھی ہے کہ اگر انہیں موت کا خوف نہیں ہوتا تو وہ اپنی سزا کے خلاف رحم کی اپیل کیوں کرتے ہیں۔ خبروں کے مطابق عقیل عرف ڈاکٹر عثمان جیسا شقی القلب بھی پھانسی کی رات رحم مانگتا رہا۔ سزا کا خوف اگر کوئی چیز نہیں تو ہماری عدالتیں کیوں بیٹھی ہیں اور انصاف کس چیز کا نام ہے اگر پھانسی کی سزا غیر انسانی ہے تو یہ تو صرف اُسی مجرم کو دی جاتی ہے جس نے کسی انسان کی جان لی ہو تو کیا اس مجرم کا جرم انسانی فعل تھا جس نے کسی کی جان لی اور یاد رہے کسی ایک انسان کو قتل کرنا پوری انسانیت کے قتل کے برابر ہے پھر کیا اس گھناؤنے مجرم کو سزا دینا زیادتی ہے ایسا سوچنے والوں کی سوچ پر دکھ بھی ہے افسوس بھی اور ان کی نیت پر شک بھی اور جو اسے معاشرے کی اصلاح میں کارآمد نہیں سمجھتے

اگر اُن کے اس نظریے کو مان لیا جائے کہ سزا جرائم کم نہیں کرتی تو مجرم کو گرفتار کیوں کیا جاتا ہے کیا مہمان بنانے کے لیے اور مقتول کے ورثاء سے بچانے کے لیے یعنی تحفظ فراہم کرنے کے لیے۔ اس طرح تو یہ بے خوف ہو کر یہ جرم کریں گے اور برائی بڑھتی جائے گی۔ ہمارے ہاں سزائے موت پر اعتراض کرنے والے امریکہ میں اس سزا پر کیوں اعتراض نہیں کرتے۔ یہ سزا سوائے یورپ کے پوری دنیا میں دی جا رہی ہے صرف 2013 میں 778 سزائے موت پر عمل درآمد کیا گیا یہ چین میں دی جانے والی ہزاروں سزاؤں کے علاوہ ہیں ان میں 39 امریکہ، آٹھ جاپان، ستر جنوبی کوریا، سات ویت نام میں دی گئی جبکہ بھارت میں بھی ایک سزا دی گئی، ایران، سعودی عرب، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی یہ سزا دی جاتی ہے بلکہ ایران میں تو سر عام بھی یہ سزا دی گئی پھر ہم کیوں ایسا نہیں کر رہے جب کہ ہم تو دہشت گردی سے سب سے زیادہ متاثر ملک ہیں۔ عدلیہ کے اسی کردار نے آخر کار معاملہ فوجی عدالتوں تک پہنچا دیا اس پر بھی اعتراضات اٹھائے گئے میں مانتی ہوں یہ کوئی خوشگوار کام نہیں ہے فوج کا کام دفاع ہے لیکن ہماری حکومت جہاں مشکل میں پڑتی ہے وہاں فوج کو بلا لیتی ہے، مردم شماری، الیکشن، شہروں کا امن و امان، تھر میں خوراک پہنچانا، سیلاب، زلزلہ، طوفان ہر مشکل کام اس کے سپرد کر دیا جاتا ہے حالانکہ آئین میں اگر فوجی عدالتیں نہیں لکھی گئی تو یہ سب کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ فوجی عدالتوں پر اعتراض اٹھانے والے اس نکتے پر ضرور غور کریں اور یہ بھی سوچیں

کہ ایسا کیوں ہوا کیا ایسا نہیں ہے کہ عوام عدلیہ سے نا اُمید ہو چکے ہیں اگر عدلیہ خوف کی وجہ سے فیصلے نہیں کر رہی یا حکومت اُس پر عملدرآمد نہیں کرا پا رہی اور اگر فوج نے ایک بار پھر اس کڑوی گولی کو نگلنے کے لیے رضامندی دے دی ہے تو اُسے یہ کام کرنے دیں لیکن کیا بہتر نہ ہوتا کہ ہماری عدالتیں دباو قبول نہ کرتی۔ ہمارے میڈیا کے چند لوگ جواب بھی موت کی سزا کو متنازعہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ قوم کی خاطر، اس کے مستقبل کی خاطر اپنے مفادات کو پس پشت ڈال دیں اور قوم کے زخموں پر مرہم رکھیں۔ اگر ہم خود درست فیصلے کریں گے اپنے مسائل کو خود اپنے ماحول اور اپنی ضرورت کے مطابق حل کریں گے تو نہ تو یورپی یونین نہ کسی اور کو ہمارے فیصلوں پر اعتراض کرنے کی ہمت ہوگی۔ بس ہمیں خود ہمت کرنا ہوگی۔

اظہار رائے کی آزادی سے اختلاف کسی کو نہیں لیکن۔۔۔

میڈیا نے بہت کچھ عوام کی آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ عوام اگر اب بھی اندھا دھند اعتقاد کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر کسی لیڈر کے پیچھے چلیں تو میرے خیال میں قصور ان کا اپنا ہے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے والا کسی اور کو موردِ الزام نہیں ٹھرا سکتا یہ اور بات ہے کہ سارے حقائق جان کر بھی ہم ووٹ دیتے وقت بہت سے دوسرے عوامل کو مد نظر رکھتے ہیں خاندان ، زبان، دولت ، مسلک ، فرقہ اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ، نہیں دیکھتے تو اہلیت ، قابلیت اور خلوص نیت آہ! اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر اور یہی وہ جنس ہے جس کے لیے پاکستانی ترس گئے ہیں۔ بہر حال میڈیا جس نیت سے بھی سہی یہ سب کچھ کر رہا ہے لیکن دوسری طرف اس انتہائی آزاد میڈیا نے ہی قوم کو کچھ مسائل سے بھی دوچار کیا ہوا ہے۔ اظہار رائے کی آزادی سے اختلاف کسی کو نہیں اور ظاہر ہے مجھے بھی ہر گز نہیں کہ میں خود آزادی سے لکھنا اور کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن کیا اگر میں اپنے لیے خود ہی کچھ حدود و قیود کا تعین کرلوں تو بہتر نہ ہوگا کچھ ایسی حدود جو میرے قومی مفادات سے متصادم نہ ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کچھ تو ہم مسائل کے انبار تلے دبے ہوئے ہیں ہماری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ خونخوار قسم کی دہشت گردی نے ہمیں گھیرا ہوا ہے اور کچھ ہمارے بے مہار قسم کے آزاد میڈیا نے اس

دہشت گردی کو ہر ہر زاویے سے کوریج دی اور اتنی دی کہ بین الاقوامی میڈیا نے بھی یہی سمجھا کہ یہ ملک مالِ مفت ہے اس کے اوپر جو الزام لگاؤ وہ جائز ہے۔ پاکستان واقعی اس وقت خطرناک ترین صورت حال سے دوچار ہے ہم ہر روز ایسے واقعات سے دوچار ہو رہے ہیں جن سے ہم کسی بھی طرح صرف نظر نہیں کر سکتے لیکن اِن واقعات کو جس طرح پاکستان کی بدنامی کے لیے بین الاقوامی سطح پر استعمال کیا جا رہا ہے وہ انتہائی قابل اعتراض ہے جب کہ ایسے ہی واقعات بہت نہ سہی کچھ تو دنیا کے باقی ممالک میں بھی ہو رہے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں بھارت خود کو ترقی کی دوڑ میں اگر دوڑتا ہوا دکھا رہا ہے تو دنیا اُسے اڑتا ہوا دکھا رہی ہے حالانکہ وہاں بھی جرائم ہوتے ہیں اور یہ چونکہ بہت بڑا اور بڑی آبادی والا ملک ہے لہذا بہت زیادہ جرائم ہوتے ہیں، یہاں دہشت گردی کے واقعات بھی ہوتے ہیں اور بڑے تسلسل سے ہوتے ہیں یہ دہشت گردی زیادہ تر فرقہ وارانہ ہوتی ہے اور ہندو اکثریت مسلم اقلیت کو بدترین تشدد کا نشانہ بناتی ہے اس کے لیے مختلف بہانے تراش لیے جاتے ہیں اور پھر مسلمان آبادیاں بربریت کا نشانہ بن جاتی ہیں ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے غریب مسلمان خاندانوں کو جس طرح زبردستی ہندو بنانے کی کوشش کی گئی وہ بذات خود ایک بہت بڑی دہشت گردی ہے، اس واقعے کو خبر تو ضرور بنایا گیا لیکن بھارت کی بدنامی اور تنقید کے لیے استعمال نہیں گیا ورنہ اگر ایسا ہی کوئی واقعہ پاکستان میں ہو جائے تو اُسے بے تحاشہ دہرایا جاتا ہے اور متاثرہ لوگوں کو ہیرو بنا کر پیش

کیا جاتا ہے ماضی میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں متاثرین سے ہمدردی سے زیادہ پاکستان کو بدنام کرنے کی نیت موجود تھی جبکہ بھارت میں آر ایس ایس، بجرنگ دل، خود برسراقتدار بی جے پی سب کے سب ایسی سرگرمیوں میں ملوث رہتے ہیں لیکن نہ تو خود ان کا اپنا میڈیا اور نہ ہی بین الاقوامی میڈیا ان واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا تو درکنار بہت جلد انہیں بھول جاتا ہے اور یوں بھارت ایک دفعہ پھر پُرامن صنعتی ترقی یافتہ ملک بن کر بیرونی سرمایہ داری کے لیے انتہائی سازگار ملک بن جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی دن جاتا ہوگا جب بھارت کے اخبارات میں دہشت گردی اور شدت پسندی کی خبریں نہ ہوں گی۔ خود کو سیکولر کہہ کر ہر مذہب کے حقوق کی پاسداری کا اعلان کرنے والا بھارت اور اس کے ہندو، مسلمان گھروں میں گائے کے گوشت کی موجودگی کی خبر پر مسلمان آبادیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں حال ہی میں بھوپال میں ایسا ہی واقعہ پیش آیا جب اس جرم پر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگادی گئی۔ اور تو چھوڑیے عامر خان کی نئی فلم Pk کی نمائش کے دوران کئی سینما گھروں میں ہنگامے ہوئے اور توڑ پھوڑ اور دہشت گردی کی گئی اور الزام لگایا گیا کہ اس فلم کو بنانے میں اُسے آئی ایس آئی کا تعاون حاصل ہے معلوم نہیں آئی ایس آئی نے ایسی ریکارڈ توڑ فلم پاکستان کے لیے کیوں نہیں بنائی لیکن اوروں کو تو چھوڑیے ہمارا اپنا میڈیا اس حوالے سے خاموش رہا اور صرف اس فلم کی کامیابی کی خبریں دی گئیں۔ دوسری طرف اگر اپنے ملک میں معمولی واقعہ بھی ہو جائے تو

اُسے بریکنگ نیوز بنا کر بار بار پیش کیا جاتا ہے اگر ایسے واقعات جن سے کوئی نقصان نہ ہوا ہو کو خبر نہ بھی بنایا جائے تو اس سے ملک کو کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ اس کا نقصان دہشت گردوں کو ہی ہوگا کہ وہ کوئی شہرت حاصل نہ کر سکے مثلاََ ابھی چند دن پہلے کوئٹہ اور سبی کے درمیان ریلوے ٹریک کے دو میٹر ٹکڑے کو اڑا دیا گیا اس خبر کو مسلسل ایک دو منٹ تک بریکنگ نیوز بنا کر دہرایا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ اس سے گاڑیوں کی روانگی میں فرق نہیں پڑا لیکن بہر حال دہشت گردوں کو جس شہرت کی ضرورت تھی وہ انہیں دے دی گئی۔ اگر ہمارا اپنا میڈیا یہ کردار ادا کرے گا تو بیرونی میڈیا تو ہمارے ہاں ہونے والے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا رہے گا۔

ایک تحقیق کے مطابق دہشت گرد کوئی بھی کاروائی کرنے سے دہشت گردی اور نقصان پہنچانے کے علاوہ جو دو مقاصد حاصل کرتے ہیں وہ ہیں خوف اور شہرت جو میڈیا کے ذریعے انہیں بڑی آسانی سے حاصل ہو جاتے ہیں اور قومی اور بین الاقوامی میڈیا نے جو شہرت پاکستانی دہشت گردوں کو دی اس سے انہوں نے کئی مقاصد حاصل کیے اسلام کو بھی بدنام کیا اور پاکستان کو بھی کئی طرح سے نقصان پہنچایا۔ جبکہ حیرت انگیز طور پر بھارت میں ہونے والے ایسے واقعات جن میں مسلمان ملوث ہوں انہیں تو اچھالا جاتا ہے لیکن ہندو شدت پسندوں کی کاروائیوں کو دبا دیا جاتا ہے یہاں میری اپنے میڈیا سے یہ درخواست ہے کہ کم از کم وہ

واقعات جن میں خوش قسمتی سے نقصان نہ ہوا ہو اُسے تو اتنی اہمیت نہ دیں کہ ہمارے ہاں اگر پٹاخہ بھی چلے تو اُسے بھی اچھال دیا جائے ملک کی کچھ بہتر چیزیں بھی دکھائیں تاکہ دنیا ہمارا ایک بہتر چہرہ بھی دیکھ سکے۔

بنگلہ دیش میں پاک فوج پر تنقید

1971 میں پاکستان دولخت ہوا وہ ملک جس کے لیے ہندوستان کے گوشے گوشے کونے کونے میں رہنے والے مسلمانوں نے بغیر یہ سوچے سمجھے کہ وہ پاکستان کا حصہ بن سکیں گے یا نہیں پاکستان کے حصول کا نعرہ لگایا اور پاکستان حاصل بھی کرلیا لیکن اپنوں کی خود غرضیاں اور غیروں کی سازشیں کام کر گئیں اور بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگلہ دیش تو بن گیا لیکن سازشیں نہ رکیں تاریخ سے سبق حاصل نہیں کیا گیا اور اب بھی ہمارے درمیان ایسے کردار موجود ہیں جو نفرت انگیز بیانات دیتے ہیں اور پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بنگلہ دیش میں عوامی لیگی حکومت آئی اور شیخ مجیب کی بیٹی حسینہ واجد تخت افروز ہوئی تو اس نے اپنی پاکستان دشمنی کا ایک بار پھر ایک اور انداز سے آغاز کیا۔ اور حسب معمول ہمارے شہرت کے خواہشمندوں نے ہمارے ملک کے خلاف بولنے والوں کی مدد کا فیصلہ کرلیا،اُدھر پاک فوج کی مدد کے الزام میں پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے اور اِدھر یہ غیروں کے غمخوار حکومت پاکستان سے مطالبہ شروع کردیتے ہیں کہ بنگلہ حکومت سے 1971 کے واقعات پر معافی مانگی جائے۔ ایسا ہی عبدالقادر ملا کی پھانسی کے وقت ہوا اور اب ایسا ہی مطیع الرحمان نظامی کی سزائے موت کے فیصلے کے وقت بھی ہوا اور حامد میر صاحب نے ایک بار پھر فاصلے

مٹانے کے نام پر معافی کا مطالبہ کیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ خود بنگلہ دیش تشریف لے گئے اور بھارت نواز اخبار ''پروتھوالیو'' کے مہمان بنے اور مہمان نوازی کا یہ لطف اس لیے اٹھوایا گیا تاکہ کسی پاکستانی کی زبان سے پاکستان کے خلاف زہر اُگلوایا جائے اور پھر دنیا کو بتایا جائے کہ خود پاکستانی بھی ان مظالم کا اعتراف کر رہے ہیں جو بنگلہ دیش میں پاک فوج نے کیے۔ مشرقی پاکستان میں ضرور زیادتیاں بھی ہوئیں جن 1971 میں اکثر سیاسی تھیں اور حسب معمول معاملہ سیاست کے ہاتھوں سے نکلا تو فوج کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور فوجیں جنگیں ہی لڑتی ہیں اور لڑائی میں کسی بھی طرح کے نقصانات ہوتے ہیں لیکن بنگلہ دیش میں ہونے والے مکتی باہنی جو باقاعدہ فوج نہیں تھی کے مظالم کے بہت سارے گواہ آج بھی زندہ ہیں جن پر کبھی محترم میر صاحب نے بنگلہ دیش کی حکومت سے مطالبہ نہیں کیا کہ وہ بھی ان غریب اور بے بس مزدوروں کے بچے کھچے لواحقین سے معافی مانگ لے جن کو ملوں اور کارخانوں میں اس لیے قتل کیا گیا کہ وہ مغربی پاکستانی یا بہاری تھے اور مغربی پاکستانی فوجی یا دوسرے سرکاری اہلکاروں کو جس طریقے سے نشان عبرت بنایا گیا کیا ان مظالم کی معافی دی جائے کیوں کہ وہ میر صاحب کے دوستوں یعنی بھارتیوں کی ایما پر کیے گئے۔ 1971 کے واقعات کسی بھی طرح خوشگوار نہیں تھے لیکن حالات کو نفرت کی اس نہج تک کیونکر لایا گیا بھارت کو بنگالی مسلمانوں کی محبت نے اتنا دیوانہ کیونکر کیا کہ وہ دوسرے ملک میں مداخلت کرنے پہ

آمادہ ہوا۔ اگر 1971 کے واقعات کے لیے پاکستانی فوج کو ذمہ دار گرداننے والے اس حقیقت کا احاطہ بھی کرلیں تو شاید معاملات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ بات یہ نہیں ہے کہ یہ خواتین و حضرات بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے ہمدرد ہیں بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ پاک فوج کی مخالفت میں قومی وقار اور عزت کا سودا کرنے میں حرج محسوس نہیں کرتے یہ جانتے ہیں کہ پاکستان کی مخالفت کرکے وہ غیروں کی آنکھ کا تارا بن جاتے ہیں اور" بہت کچھ" پالیتے ہیں ایوارڈ یونہی انہیں نہیں دیئے گئے ان کی وفاداریاں بھی خریدی گئیں اور معلوم نہیں کتنے عرصے کے لیے خریدی گئی ہیں کہ باربار انہیں یہی خیال ستارہا ہے اور باربار وہ پاکستان اور پاک فوج کو مجبور کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ وہ معافی مانگیں ۔ یہ وہاں جاکرپاکستان کے مخالفین سے مل رہے ہیں انہیں تحفے تحائف دے رہے ہیں اور بدلے میں ان کے انٹرویو ہورہے ہیں اور مسلسل نوازے جارہے ہیں۔

اگر ہمارے یہ دانشور اور عظیم صحافی واقعی چاہتے ہیں کہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں فاصلے کم ہوں اوردلوں میں پڑی کدورتیں مٹ جائیں تو انہیں اپنا طریقہء کار تبدیل کرنا ہوگا جیسے یہ پاک فوج کومسلسل قصوروار قرار دے رہے ہیں اور ساتھ ہی عوامی لیگ کے شیخ مجیب کی بیٹی شیخ حسینہ اور اس کی حکومت کا ایجنڈا پورا کررہے ہیں اس سے بنگلہ دیش کی نئی نسل اصل حالات و واقعات

سے کبھی آگاہ نہیں ہوسکے گی انہیں کبھی معلوم نہیں ہوسکے گا کہ مشرقی پاکستان میں ہر غیر بنگالی پاکستانی واجب القتل تھا چاہے وہ بے چارہ دو وقت کی روٹی بھی بمشکل کھاتا تھا کُجا کہ سیاست کا حصہ بنتا مکتی باہنی کے کارکنوں کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کا تعلق پاکستان کے مغربی حصے سے ہے اور اس کا قتل روا ہو جاتا تھا۔ یاد رہے انسان غیر بنگالی بھی تھے اور قتل ان کا بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی بھی تھا اور جنگی جرم بھی کیونکہ ہتھیار انہوں نے بھی نہیں اٹھائے تھے بلکہ نہتے مارے گئے تھے۔ ہمارے صحافی اگر اس بارے میں بھی تحقیقات کریں اور ان بے نام و گمنام مرنے والوں کے نام بھی تلاش کریں جو ہزاروں میل دور رزق کمانے گئے تھے یا اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے مسلمان ہونے کے ناطے برصغیر میں بننے والی اسلامی ریاست میں پناہ لینے آئے تھے اور اس ریاست کے وفادار تھے تو شاید وہ یہ حقیقت بھی جان لیں کہ ان کے ورثاء بھی معافی مانگے جانے کے اتنے ہی حقدار ہیں جتنا دوسری طرف کے، ہاں یہ فرق ضرور رہے گا کہ ایک ریاست کے وفادار تھے اور دوسری طرف ریاست سے غداری کی گئی تھی اور دنیا میں کونسی ایسی ریاست ہوگی کہ وہ اپنے مخالفین بلکہ باغیوں کو کھلا چھوڑے اور ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کرے بنگلہ دیش کے کسی چینل پر بیٹھ کر اپنے کسی آئندہ کے انٹرویو میں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھیئے اور یہ سوال ضرور اٹھایئے شاید کوئی جواب مل ہی جائے۔

فرانس میں صرف بارہ ہلاکتیں اور عالمی واویلا

مسلمان سو رہا ہے اور ایک بار پھر اُس کی عزت سے کھیل لیا گیا اور توہین آمیز خاکے شائع کیے گئے اور ایسا اب کی بار فرانس کے اخبار چارلی ہیبڈو نے کیا ایسا پہلی بار نہیں ہوا کہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلا گیا ہو ایسے ہی خاکے پہلے ناروے میں بھی شائع ہو چکے ہیں اور نہ یہ ایک واحد انداز ہے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری کی گئی ہو۔ نعوذ باللہ ''برن دی قرآن'' جیسے باقاعدہ قسم کے پروگرام بھی بنائے اور چلائے گئے ظاہر ہے ایسے واقعات پر مسلمان کا اشتعال میں آ جانا ایک نہایت ہی قدرتی امر ہے۔ ایک مسلمان اپنی جان سے بڑھ کر، اپنی عزت سے کہیں زیادہ اپنے مال سے بہت آگے بڑھ کر حتیٰ کہ اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ کہ جس سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں لیکن اپنے نبی ﷺ کو اس سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں۔ یہ عشق یہ محبت ان کے ایمان کا حصہ ہے اور یہی وجہ ہوئی کہ مسلمانوں نے اس اخبار پر حملہ کیا ظاہر ہے دہشت گردی کا جواب تو دینا ہی پڑتا ہے جس چیز کو مسلمانوں نے دہشت گردی سمجھا اس پر ان کا رد عمل آیا اور جس کو فرانسیسی حکومت نے دہشت گردی سمجھا اس پر ان کا رد عمل آیا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ دہشت گردی کی ابتداء کس نے کی ظاہر ہے اس اخبار نے جس نے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی اور انہیں اُکسایا کہ وہ اپنا

شدید رد عمل دکھائیں لہذا ایسا ہی ہوا اور کچھ حملہ آوروں نے اخبار کے دفتر پر حملہ کرکے کسی بے گناہ کو نقصان پہنچائے بغیر قصورواروں کو نشانہ بنایا۔ صرف بارہ افراد مرے لیکن یوں لگا جیسے پورے یورپ میں زلزلہ آگیا ہو بلکہ دنیا ہل گئی ہو۔ چالیس ممالک کے سربراہان ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اس واقعے کے خلاف اکٹھے ہو گئے کندھے سے کندھا ملا کر اس کی مذمت کرتے رہے اسے دہشت گردی قرار دیتے رہے لیکن اس کی وجوہات پر کوئی غور نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس پر بات کی گئی۔ مادر پدر آزاد اس معاشرے نے اسے آزادی صحافت پر حملہ قرار دیا اسے اظہار رائے کی آزادی کے خلاف کہا اور انتہائی افسوس کا مقام یہ ہے کہ مسلمان حکمران سوتے رہے بلکہ کچھ نے تو جا کر یورپی حکمرانوں کے ساتھ مل کر مظاہرہ کیا۔ رپورٹس کے مطابق جامعہ الازہر نے بھی اس حملے کی مذمت کی لیکن یورپ کے اپنے نبی ﷺ کے بارے میں رویے کی مذمت کرنا بھول گیا۔ یورپ اور مغرب جس دیدہ دلیری سے مسلمانوں، اسلام اور حتیٰ کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا ہے وہ بذات خود اعلان جنگ کے برابر ہے اور یہ رویہ نہ تو نیا ہے اور نہ ہی محض اظہار رائے کی آزادی، بلکہ یہ مسلمانوں کے خلاف ایک مکمل منصوبہ بندی ہے وہ خود کو تو اظہار رائے کی آزادی کا حق دیتا ہے لیکن مسلمانوں کے لیے اس کے معیار بدل جاتے ہیں ورنہ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ آزادی عمل کا حق بھی دے۔ لیکن یہاں کمزوری مسلمانوں کی اپنی بھی ہے یورپی صلیبی جنگوں سے لیکر آج تک مسلمانوں کے خلاف ہر منصوبے میں ایک دوسرے

کے شریک کار بن جاتے ہیں، صلیب کے نام پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کا عمل اپنے اوپر جائز کر لیتے ہیں۔ یہی کچھ اس نے صلیبی جنگوں میں کیا اور یہی کچھ نیٹو کے نام پر بھی کیا عراق پر حملہ کیا تو آپس کے اختلافات بھلا دیئے افغانستان پر بم برسائے تو پورا مغرب اس جرم میں شریک ہوا اور اب فرانس میں اپنے جرم کا دفاع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو پھر یکجان۔ لیکن دوسری طرف ہم مسلمان آپس میں ہی دست و گریبان رہتے ہیں ہم مسلک و فرقہ کی تفریق سے فرصت پالیں تو اکٹھے ہوں اور مغرب کی گستاخی اور ڈھٹائی کا جواب دیں۔ اخبار چارلی ہیبڈو نے یہ منحوس اور توہین آمیز خاکے چھاپے اور اس پر حملہ ہوا تو خیر سگالی کے طور پر کئی دوسرے یورپی اخباروں نے انہیں دوبارہ شائع کیا اور خود اسی ملعون اخبار نے جس نے پہلے تیس ہزار پرچے نکالے ایک بار پھر انہی خاکوں کو لاکھوں کی تعداد میں شائع کیا تب یورپ کو کوئی قانون کوئی ضابطہ اخلاق یاد نہیں آیا۔ فرانس یورپ میں سب سے زیادہ مسلمان آبادی والا ملک ہے مسلمان ممالک کو بات بات پر انسانی حقوق کی یاد دلانے والا یورپ اس وقت ایک ارب مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہا ہے اور پھر وہ یہ توقع کرتا ہے کہ مسلمان احتجاج بھی نہ کریں وہ مسلمانوں کو کس طرح پابند کر سکتے ہیں کہ ان کے احتجاج کا انداز کیسا ہو یہ احتجاج اخبار پر حملہ یا دوبارہ حملہ یا بار بار حملہ بھی ہو سکتا ہے اگر مغرب اپنی چند ہلاکتوں کا انتقام لینے کے لیے مسلمان ملکوں پر بموں کی بارش کر سکتا ہے تو

مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل ہے اور جبکہ مغرب جانتا بھی ہے کہ مسلمان اپنی جان اپنے مال اپنی اولاد کی جان کی معافی دے سکتا ہے لیکن اپنے نبی ﷺ کے بارے میں وہ کسی قسم کا نازیبا لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ اس کی معافی دیتا ہے تو اس کو نتائج کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ اور ان کی حکومتوں کو اس بارے میں اپنے میڈیا اور عوام کو پابند کرنا چاہیے ورنہ جسے وہ دشت گردی کہتا ہے اس دہشت گردی میں اضافہ ہی ہوگا کیوں کہ مسلمان واقعی اپنے رسول ﷺ اور دین ومذہب کے بارے میں ہر غلط بات کرنے والے کے لیے شدت پسند ہیں۔ اگر اس نے اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا تو اسے ایسے واقعات کے لیے مستقبل میں بھی تیار رہنا چاہیے۔ فرانسیسی صدر نے مذہبوں کے احترام کی بات تو کی لیکن نہ تو اخبار کو سزا دینے کی بات کی نہ کسی جرمانے کی۔ پوپ فرانسس نے بھی کچھ ایسا ہی بیان دیا لیکن کسی پابندی یا سزا کا مشورہ نہیں دیا ضرورت بیانات کی نہیں عملی اقدامات کی ہے جس کے لیے تمام مسلمان ملکوں کو متحد ہونا ہوگا لیکن افسوس تو یہی ہے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ مسلمان سو رہا ہے اور او آئی سی تو کسی بہت ہی گہری نیند میں ہے نام کو مسلمانوں کی یہ نمائندہ تنظیم اس قدر غیر فعال ہے کہ ساری مسلمان آبادی بھی سڑکوں پر نکل آئے یہاں ہل جل نہیں ہوتی ۔پاکستانیوں سے بھی درخواست ہے کہ اپنی سڑکیں بند کرنے ، اپنے عوام کو مصیبت میں ڈالنے اور اپنی املاک کو نقصان پہنچانے کی بجائے ٹھوس قسم کا احتجاج کریں ہم جس فخر سے ان ممالک کی

روایات اپنا رہے ہیں انہیں چھوڑ دیں، ان کی مصنوعات استعمال نہ کریں فرانس کی خوشبو لگانے میں فخر محسوس نہ کریں اپنی مٹی کے پیالے کو ان کے سونے کے جاموں سے بہتر سمجھیں تاکہ انہیں احساس ہو کہ مسلمان اپنے نبی ﷺ اور دین کی خاطر اپنا آرام قربان کر سکتے ہیں کاش کہ ہم ایسا کر سکیں اور حکومتی اور عوامی دونوں سطحوں پر انہیں مجبور کر سکیں کہ آئندہ وہ کوئی ایسی حرکت کرتے ہوئے ہزار بار سوچیں اور پھر رُک جائیں۔ اگر یورپ صحافتی دہشت گردی کو اظہار رائے کی آزادی کا نام دیتا ہے تو مسلمان حکومتوں کو انہیں یہ پیغام پہنچا دینا چاہیے کہ پھر وہ مسلمان عوام کو آزادی عمل سے نہیں روک سکیں گے۔

سانحہ پشاور۔۔۔ بھارت کا ہاتھ اور امریکی ثبوت

پشاور میں سانحہ ہوا طالبان نے ذمہ داری قبول کی، وزیر داخلہ نے بھی اعلان کیا کہ تمام خود کش پاکستانی تھے ماسٹر مائنڈ بھی پاکستانی تھا یہ بھی کہا گیا کہ کسی بیرونی ہاتھ کے شواہد نہیں ملے وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں اپنی جگہ بالکل درست ہوں گی لیکن بیرونی ہاتھ کو معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت خارج کیا گیا اگر ملا فضل اللہ افغانستان میں بیٹھا ہے تو اُسے یقیناً کسی کی حمایت اور مدد حاصل ہے اور اسی مدد کے بل بوتے پر وہ محفوظ ٹھکانے پر بیٹھ کر اپنا کام پورا کر رہا ہے۔ بے شک کہ وہ پاکستانی ہے لیکن استعمال وہ بطور غیر ملکی مہرے کے ہی ہو رہا ہے اور اب کی بار تو اس حقیقت کا اظہار امریکہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق امریکی سیکریٹری آف سٹیٹ جان کیری نے بھارت کے حالیہ دورے کے دوران بھارت سرکار کو آڑے ہاتھوں لیا اور ملا فضل اللہ سے اس کے روابط کے ثبوت پیش کیے۔ امریکہ نے خود بھی اس حقیقت کا ادراک کرنے میں برسوں لگا دیے اور ان برسوں میں ہزاروں پاکستانی اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ پاکستان کہتا رہا کہ پاکستان میں دہشت گردی میں بھارت کا ہاتھ ہے اور وہ یہ کام مختلف اطراف سے کر رہا ہے نہ صرف پاکستان سے جڑی سرحدوں سے دہشت گرد داخل کر رہا ہے بلکہ افغانستان میں بھی اُسے خاصے سازگار حالات میسر آئے۔ اُس نے

یہاں غیر معمولی اور غیر ضروری تعداد میں اپنے قونصل خانے کھولے جس پر پاکستان اعتراض کرتا رہا لیکن عالمی طاقتوں نے کبھی اس بات کو اہمیت نہ دی یا تو وہ بھارت کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں یا پاکستان کے خلاف ایک بہت اچھا سا تھی کھونا نہیں چاہتی تھیں جو پاکستان کے خلاف کوئی بھی کام کرنے کو نہ صرف ہر وقت تیار رہتا ہے بلکہ یہ اُس کی قومی پالیسی کا حصہ ہے کہ پاکستان کو ہر صورت نقصان پہنچایا جائے اور مودی سرکار کا تو یہ انتخابی نعرہ اور منشور بھی تھا اور اپنی نیت کا ثبوت وہ مسلسل دے رہا ہے۔
دسمبر میں پشاور سکول میں بچوں کے قتل عام پر اُس نے افسوس بھی کیا، اسمبلیوں میں بھی دکھ کا اظہار کیا گیا، خاموشی بھی اختیار کی گئی اور سکول کے بچوں کے سیشن بھی کرائے گئے۔ سب کچھ ہوا لیکن جب پاکستان اس انتہائی دکھ اور افسوس سے گزر رہا تھا بلکہ پوری دنیا میں اس کی گونج سنائی دے رہی تھی اس وقت اس واقعے کے صرف پندرہ دن بعد اُس نے ہماری سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی کیا افسوس اور دکھ کے اظہار کا یہ بھی کوئی طریقہ تھا جو بھارت نے اپنایا۔ بھارت اس سے پہلے بھی اور مسلسل پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث رہا ہے اور اس کے ثبوت مسلسل ملتے بھی رہے اور دنیا کو بتائے بھی گئے لیکن ان کو اہمیت نہ دی گئی۔ فوج کئی بار بھارت ساختہ اسلحہ پکڑتی بھی رہی ہے اور دکھاتی بھی رہی ہے جسے بین الاقوامی قوتوں نے ہمیشہ نظر انداز ہی کیا لیکن اس بار اوبامہ کے دورہ بھارت سے پہلے جان کیری نے بھارت کو جو آئینہ

دکھایا ہے بھارت اسے جنرل راحیل شریف کے دورہ امریکہ کا نتیجہ قرار دے رہا ہے اگر ایسا ہے تو بھی یہ پاکستان کی کامیابی ہے۔ امریکہ نے اجیت کمار دیوول کے پشاور سکول حملے کے لیے ملا فضل اللہ کو رقم فراہم کرنے پر بھی بھارت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اجیت کمار اس وقت بھارتی وزیراعظم مودی کے مشیر برائے قومی سلامتی ہیں۔ یاد رہے کہ اجیت کمار وہ شخص ہے جو پاکستان، چین اور سری لنکا میں تخریبی سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے اور جو کسی غیر ہندو کو جینے کا حق نہیں دیتا یہی سے بھارت حکومت کی امن کے لیے سنجیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ امریکہ، بھارت اور طالبان کے تعلقات کے بارے میں جانتا تھا اور ان کے درمیان رابطہ کار یعنی اجیت دیوول سے بھی اچھی طرح باخبر تھا تو پھر کیوں نہ بروقت بھارت کو اس کام سے روکا گیا اور اس کی کیوں نہ شنوائی کی گئی کیا بھارت اور امریکہ دونوں ایک دوسرے کے سہولت کار تھے۔ امریکہ نے ملا فضل اللہ سے کسی بھی امریکی کے تعلق رکھنے پر پابندی بھی عائد کی اس کے اثاثے منجمد کرنے کا بھی اعلان کیا اور اُسے عالمی دہشت گرد بھی قرار دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اب تک ملا فضل اللہ سے امریکیوں کے تعلقات تھے اور اس کے اکاونٹس آخر کس نوعیت کے اور امریکہ میں کہاں کہاں تھے جو منجمد کیے گئے کیا یہ کوئی امدادی اکاونٹ تھے اور کیا یہ امداد امریکہ کی طرف سے تھی یا بھارت کی طرف سے لیکن استعمال اگر امریکی بینک ہو رہے تھے تو کیا پہلے امریکہ بے خبر

تھا یا افغانستان سے جاتے جاتے اُسے یہ خیال آیا۔ بہر حال جو بھی ہے امریکہ کو بھارت پر اپنا دباؤ برقرار رکھنا ہوگا اور پاکستان کو امریکہ سے اپنا یہ مطالبہ پر زور طریقے سے نہ صرف کرنا ہوگا بلکہ دہراتے رہنا ہوگا کیونکہ اب ہم نہ مزید دہشت گردی برداشت کر سکتے ہیں اور نہ مزید جانیں قربان کر سکتے ہیں۔ حکومت کو نمبر سکورنگ کے لیے بھارت دوستی کا راگ الاپنے کی بجائے سنجیدگی سے اپنے مسائل حل کرنا ہونگے اور بھارت کا افغانستان میں کردار محدود کرنے پر زور دینا ہوگا۔ بھارت افغانستان میں ترقیاتی کاموں کی آڑ میں جو تربیتی کیمپ چلا رہا ہے اُسے ختم کروانے کے لیے بھی عالمی برادری کو آگے آنا ہوگا اور خاص کر امریکہ کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ ''را'' کا ایک نکاتی ایجنڈا یعنی ''پاکستان کے لیے مسائل پیدا کرو'' کا بھی توڑ کرنا ہوگا۔ ذرائع کے مطابق امریکہ نے بھارت کے ساتھ دو ٹوک انداز اور سخت لہجے میں بات کی ہے لیکن اس موقف کو سیکریٹری آف سٹیٹ تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ صدر اوباما کو بھی بھارتی دورے کے دوران اس موضوع پر نہ صرف بات کرنی چاہیے بلکہ بھارت سرکار کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ اِن کاروائیوں کو روکے اور پاکستان کو بھی بھارتی مداخلت کے جو شواہد اور ٹھوس ثبوت ملے ہیں انہیں بھرپور طریقے سے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیے تاکہ بھارت کا اصل چہرہ سب کے سامنے آسکے۔

بھارت کا ایک اور ناٹک

سمندروں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے نفع کا باعث بنایا ہے، یہ انسان کے لیے خوراک کا عظیم ذریعہ ہے ۔اسے انسان نے زمانہء قدیم سے اپنے لیے راستے کے طور پر استعمال کیا اور طویل راستے مختصر کیے۔ جو ممالک سمندر کے کنارے واقع ہیں ان کی بندرگاہیں ان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں پاکستان بھی ان خوش قسمت ممالک میں شامل ہے جسے اللہ نے اس نعمت سے نوازا ہوا ہے جو تجارتی مال کی ترسیل کے ساتھ ساتھ اپنے سمندر سے دوسرے فوائد بھی حاصل کر رہا ہے۔ سندھ کے ساحلوں پر رہنے والی ایک بڑی آبادی مچھیروں پر مشتمل ہے ۔بڑے تاجروں کے علاوہ چھوٹے مچھیرے بھی ہیں جو صرف اتنی مقدار میں مچھلی پکڑ لیتے ہیں جس میں سے کچھ تو خود کھا لیتے ہیں اور کچھ بیچ کر اپنی دیگر ضروریات زندگی پوری کر لیتے ہیں۔ یہ مچھیرے سمندر میں ایک مقررہ حد یعنی پاکستانی سرحدوں کے اندر اندر سے اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہیں لیکن چونکہ سمندر کے اندر کوئی ایسی ٹھوس نشانی نہیں ہوتی جس سے بین الاقوامی سرحد کی یقینی پابندی ہو سکے اور اسی لیے یہ مچھیرے بسا اوقات بھارت کی سمندری حدود میں داخل ہو جاتے ہیں یہی حال بھارتی مچھیروں کا ہے کہ وہ پاکستانی حدود میں آ جاتے ہیں دونوں طرف کے مچھیرے گرفتار تو ہو جاتے ہیں لیکن پھر حکومتیں ان کا تبادلہ کر لیتی ہیں اور یہ اپنے گھروں

کو واپس چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار انہیں کشتیوں میں کچھ سمگلر کشتیاں بھی شامل ہو جاتی ہیں جن کے ساتھ قانون کے مطابق معاملہ کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بھارت کسی بھی ایسے موقعے کی تلاش میں رہتا ہے کہ پاکستان کو کسی نہ کسی بہانے بدنام کیا جائے خشکی کی سرحدوں پر تو وہ اکثر حملہ آور ہوتا رہتا ہے اور بے گناہ پاکستانی شہریوں کو بھی نہیں بخشتا اور پھر پاکستان پر پہل کا الزام لگا دیتا ہے۔ ہمارے قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں اس کی مداخلت اور موجودگی بھی دہشت گردی میں اس کے ہاتھ کا پتہ دیتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کا ذمہ دار وہ پاکستان اور آئی ایس آئی کو ٹھہرا دیتا ہے اور اکثر ایسے پروگرام اپنے ہاں بھی سٹیج کرتا رہتا ہے۔ ممبئی حملے اور سمجھوتہ ٹرین جیسے واقعات کے بعد اس نے بحیرہء عرب میں ایک کشتی کو دھماکے سے اڑا دیا اور نئی کہانی پیش کی کہ یہ کشتی لشکر طیبہ کی تھی یاد رہے کہ بھارت کے مطابق لشکر طیبہ کو بھارت میں تخریب کاری کے لیے پاکستان کی حمایت حاصل ہے لہٰذا ایک طرح سے بھارت نے اسے پاکستان کی طرف سے ریاستی دہشت گردی قرار دیا ۔پاکستان کی وزارت خارجہ نے اسے سختی سے مسترد کیا اور اسے بھارت کی طرف سے ایک لغو پروپیگنڈا قرار دیا۔ پاکستان کی طرف سے رد عمل کو تو ظاہر ہے کہ آنا ہی تھا لیکن خوش قسمتی سے پاکستان کے موقف کی تائید خود بھارت کے اندر سے ہو گئی اور کانگریس نے اس واقعے پر شک کا اظہار کیا کہ بی جے پی حکومت کی کہانی میں صداقت نظر نہیں آ رہی۔ بھارت نے اس کشتی کو

گجرات کی پوربندر سے 356 کلومیٹر دور تباہ کیا۔ واقعے کے اڑتالیس گھنٹے بعد بھارتی موقف میں تبدیلی آئی اور اس نے اس کشتی کی ملکیت لشکر طیبہ سے لے کرچھ چھوٹے سمگلرز کو دے دی اور کہا کہ ہو سکتا ہے کشتی پر کچھ چھوٹے سمگلرز سوار ہوں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ایسی کوئی کشتی تھی بھی یا نہیں کیونکہ بھارتی میڈیا نے اس واقعے کی جو فلم چلائی اس میں کشتی کو آگ لگی ہوئی دکھائی گئی اور کہا کہ کشتی چونکہ چھوٹی تھی اس لیے اس کے ٹکڑے ایسے بکھر گئے کہ نظر ہی نہ آسکے اور خراب موسم کی وجہ سے بھی ان ٹکڑوں اور ملاحوں کے جسموں کو نہیں دیکھا جا سکا۔ جبکہ موسمیاتی پیشن گوئی کہتی ہے کہ اس دن بحیرہ عرب میں موسم صاف تھا اور ہوا بھی معمول کے مطابق تھی یہ پیش گوئی انٹرنیٹ پر اب بھی دیکھی جا سکتی ہے جو بھارت کے جھوٹ کا پول کھول دیتی ہے۔ بھارت ہر حساس موقعے پر کوئی نہ کوئی ایسا ناٹک ضرور رچاتا ہے اور اس نے اس بار بھی ایسا ہی کیا کہ امریکی صدر اوبامہ جو نہ صرف اس کے لیے بلکہ پورے خطے کے لیے ایک حساس معاملہ تھا سے پہلے اس نے ایک ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان کو دہشت گرد بنا کر پیش کرے اور خود بھارت امن پسند کہلائے حالانکہ اس کے وزیراعظم کو امریکہ نے دہشت گردوں کی فہرست میں شامل رکھا تھا اور اس کے نظریات بھارت کے اندر ہر غیر ہندو کے بارے میں اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے اور پاکستان کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار وہ وزارت عظمیٰ سے پہلے کرتا تھا اس میں ابھی بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے

اور اس کا یہ کردار پوری دنیا کے سامنے ہے۔ اس بار اوبامہ کے دورے سے پہلے ہماری مشرقی سرحدوں پر جس اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا گیا وہ تو کیا ہی گیا لیکن سمندر میں کھیلے گئے کھیل کے بارے میں اسے خود اپنے ملک میں بھی شرمندگی اٹھانا پڑی کیونکہ وہ اس واقعے کی کوئی تفصیلات نہ تو اپنے میڈیا کو نہ ہی بین الاقوامی میڈیا کو فراہم کر سکا اس کا مقصد صرف پاکستان کو بدنام کرنا تھا۔ وزارت خارجہ نے اس واقعے کی پرزور تردید کی لیکن اس پر حکومت پاکستان کو سفارتی سطح پر مزید بھی کام کرنا ہوگا تاکہ بھارت بار بار اس قسم کے واقعات کا اعادہ کر کے پاکستان کے لیے مشکلات پیدا نہ کرے۔ اور دنیا کو یہ بھی بتایا جائے کہ اس طرح کے الزامات اور واقعات سے خطے میں امن وامان کی صورت حال مزید بگڑتی جائے گی جو کسی بھی طرح نہ تو خطے کے لیے بہتر ہے نہ عالمی امن کے لیے۔ بھارت سے تو پہلے بھی خیر سگالی کی کوئی امید نہیں تھی لیکن اب تو ایسا ہونا تقریباً ناممکن نظر آ رہا ہے اور اسی لیے دنیا کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ دو ایٹمی ممالک کے درمیان ناخوشگوار تعلقات نہ ہی خطے کے اور نہ ہی عالمی امن کے لیے کسی بھی صورت بہتر ہو سکتے ہیں۔

بھارت اور ایٹمی ٹیکنالوجی

اسلحے کی دوڑ نے دنیا کو اس کی اصل ترقی سے دور رکھا ہوا ہے اسی دوڑ نے حکومتوں کو بنیادی سہولیات سے زیادہ دفاعی اخراجات کی فکر میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ صحت، تعلیم، خوراک، کپڑا سب کچھ پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور جب معاملہ بھارت جیسے ملک سے درپیش ہو تو پھر تو اس میں کسی کمی کے امکانات ہی نہیں رہتے۔ بھارت سرکار کی ترجیحات میں اسلحہ سرفہرست ہے چاہے خود اس کا باہر کا دورہ ہو یا باہر ملک سے کوئی بھارت آئے ان کی ملاقات کا مقصد تقریباً ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے دفاعی معاہدے یا ایسی ٹیکنالوجی کا حصول جس سے وہ اسلحہ بنا سکے اور اپنے پڑوسی کو مصیبت میں مبتلا رکھ سکے۔ اس بار بھی جب صدر اوبامہ بھارت کے دورے پر آئے تو دونوں ملک علاقے اور دنیا کے مفادات کو بھلا کر اور بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے معاہدوں اور تجارت کی فکر میں رہے۔ تجارت دو ملکوں کا حق ہے لیکن یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ اس کا اثر عالمی امن پر کیا پڑے گا۔ بھارت اس وقت تقریباً چالیس بلین ڈالر اپنے دفاع اور اسلحے پر خرچ کر رہا ہے اور ہر قسم کا بے تحاشا اسلحہ خرید رہا ہے جس میں ایٹمی اسلحے کی تیاری بھی شامل ہے۔ اگرچہ پاکستان اور بھارت دونوں نے این پی ٹی پر دستخط نہیں کیے لیکن بھارت اس وقت نیوکلیئر سپلائیر گروپ کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے بھی کوشاں ہے اور

وہ بھی اپنی شرائط پر جبکہ بھارت نے اس سے پہلے بھی اپنے ایٹمی تنصیبات اور اثاثوں کے بارے میں کسی اچھی ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ بھوپال میں یونین کاربائیڈ میں ہونے والے حادثے کے متاثرین آج بھی اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں بلکہ ان کی دوسری نسل بھی بھارت کی ایٹمی غیر ذمہ داری کو جھیل رہی ہے ایسا کوئی ایک واقعہ ہو تو یہ حادثہ ہوتا ہے لیکن بھارت میں ایسے دیگر واقعات بھی ہو چکے ہیں جن میں ایٹمی سائنسدانوں کا قتل بھی شامل ہے اب ایسے میں اگر اسے نیوکلیئر سپلائیر گروپ کی رکنیت بھی دی جائے تو کیا یہ بہت خطرناک نہیں ہوگا اور وہ بھی اگر اس کی اپنی شرائط پر ہو تو معاملہ کافی گھمبیر ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے لیے تو یہ انتہائی خطرناک ہوگا کیونکہ یہ بات نہ صرف پاکستان اور خود بھارت جانتے ہیں کہ بھارت کی جنگی تیاری حقیقتاً پاکستان کے خلاف ہوتی ہے اگرچہ چین بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں لیکن بہت بڑا ملک ہونے کی وجہ سے بھارت اس کے بارے میں کوئی بات یا فیصلہ کچھ سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ لیکن پاکستان کے بارے میں وہ چاہنے کے باوجود بھی نہیں سوچتا کیونکہ یہاں وہ دشمنی اور مخاصمت کی اس حد پر ہے جہاں انسان صرف دوسرے کی جان ومال کے در پے رہتا ہے نہ اسے انسانیت سے تعلق ہوتا ہے نہ رحم سے نہ کسی ضابطہء اخلاق سے بلکہ اسے صرف دشمنی کرنی اور نبھانی ہوتی ہے اور اس دشمنی کا ثبوت وہ کھلی جنگوں کے علاوہ سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ سے دیتا رہتا ہے جس میں وہ کسی فوجی اور سول کی تمیز نہیں کرتا بلکہ بچہ یا بڑا، جوان یا

بوڑھا مرد یا عورت جو بھی اس کی زد میں آگیا وہ معصوم شہری اپنی جان سے جاتا ہے۔ اس کے پاس اسلحے کی کمی تو ہے نہیں جسے وہ سوچ سمجھ کر استعمال کرے لہذا وہ اس کا کھلا استعمال کرتا رہتا ہے۔ چین کی سرحد پر بھی وہ اپنی شرپسند موجودگی کا احساس سال دو سال میں ایک دو بار دلاتا رہتا ہے۔ بنگلہ دیش کی موجودہ حکومت سے دوستانہ تعلق سے قطع نظر وہ بھی مسلمان ہونے کے ناطے اس کے شر سے محفوظ نہیں رہتا ہے۔ سری لنکا نے تیس سال اس کے ہاتھ جس مصیبت میں گزارے ہیں وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے اور پاکستان میں مشرقی پاکستان کے بعد بھی اور ابھی بھی بلوچستان اور فاٹا میں دہشت گردوں اور ملک دشمنوں کے اس سے رابطے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ وہی عالمی طاقتیں بھارت کے بارے سوچتے اور فیصلے کرتے ہوئے کیسے نرم پڑ جاتی ہیں جو پاکستان کے اوپر وہ الزامات بھی عائد کرتی ہیں جن کا پاکستان سے دور دور تک تعلق بھی نہیں ہوتا۔ بھارت ایک بڑی آبادی والا ملک ضرور ہے لیکن علاقے میں اس کے بارے میں کوئی اچھا تاثر نہیں ہے بلکہ وہ امن کے لیے مسلسل ایک خطرہ بنا رہتا ہے۔ اب ایک ایسے ملک کے بارے میں یہ سوچنا کہ اسے سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت دی جائے اسے شہ اور کھلی چھٹی دینے کے مترادف ہے کہ جو چاہو کرو اور اپنے بارے میں کسی بھی شکایت کو ویٹو کر دو۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ بھارت کے ساتھ امریکہ کا یہ وعدہ پہلی بار نہیں ہے بلکہ ہر دورے میں یہ وعدہ کیا جاتا ہے جو اب تک تو صرف وعدہ ہی رہتا ہے لیکن کیا اسے علاقے کے

دوسرے ملکوں کے لیے دھمکی کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا کہ وہ بھارت کی مرضی کے مطابق چلیں ورنہ۔۔۔۔۔۔ظاہر ہے کہ بھارت اپنی بے محابا آبادی اور بے تحاشا فوج کی وجہ سے ویسے ہی خطے کے امن کے لیے خطرہ ہے اس کے پاس پہلے ہی اسلحے کے ڈھیر ہیں ،اس کی فوج پر بے دریغ خرچ کیا جارہا ہے اور پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلے ہی اسلحے اور آلات جنگ کا تناسب انتہائی غیر مناسب ہے اگر اسے مزید سہولیات دی گئیں اور خاص کر ایٹمی ٹیکنالوجی چاہے سول استعمال کے نام پر دی جائے استعمال اسے زیادہ تر فوجی مقاصد کے لیے ہی کیا جائے گا اور یہ زیادہ پاکستان کے ہی خلاف ہوگا لیکن علاقے کے دوسرے ممالک بھی زیادہ محفوظ نہیں ہونگے یوں دنیا کسی بہت بڑی تباہی اور عذاب میں مبتلا ہو سکتی ہے اور وہ بھی جب یہ رعٓیت اور سہولت صرف ایک ملک کو دی جائے اگرچہ چین اس معاملے پر پاکستان کے موقف کی تائید کر چکا ہے تاہم سفارتی سطح پر مکمل زور لگانا ہوگا اور دنیا کو ممکنہ اور آمدہ خطرات سے آگاہ کرنا ہوگا اور یہ بھی بتانا ہوگا کہ کسی ملک کو دہشت گردی اور وہ بھی ایٹمی دہشت گردی کے لیے
ساز وسامان مہیا کرنا کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کی ضرورت ہے جس کے لیے ہمیں دنیا کو جگانا اور مجبور کرنا ہوگا تاکہ اپنے علاقے بلکہ دنیا کے امن کو محفوظ بنایا جاسکے۔

قومی ایکشن پلان۔۔۔ سب کچھ تیزی سے کرنا ہوگا

اسلام تو جنگ میں بھی بچے، بوڑھے اور عورت پر ہاتھ اٹھانے سے منع کرتا ہے۔ جب اسلام نے یہ حکم دیا تو اس وقت کی تمام جنگیں کافروں سے تھیں لیکن کفر و اسلام کی ان جنگوں میں بھی یہ حکم نافذالعمل رہا اور عورتوں بچوں اور بوڑھوں بلکہ جنگ میں حصہ نہ لینے والے جوانوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ لیکن خود کو مسلمان کہنے، شریعت کا مطالبہ کرنے والوں، پاک فوج کو کافروں کی فوج کہنے والوں اور آئین پاکستان کو غیر شرعی کہنے والوں نے اسلام کے اس اصول کی دھجیاں اڑا دیں ہیں ان کی زد پر بازاروں میں کام کرتے ہوئے خوانچہ فروش، سڑکوں پر کام کرتے مزدور، پولیو کے قطرے پلاتی عورتیں حتیٰ کہ سکولوں میں پڑھتے ہوئے معصوم بچے بھی ہیں اور جب کسی قوم کے بچے بھی مار دیئے جائیں تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ سانحہ پشاور نے قوم کا دل ہلا کر رکھ دیا آج بھی اس سانحے کا ذکر ہو تو دل رو پڑتا ہے اور لوگ آنسو آنسو روتے ہیں۔ ان بچوں نے قوم کو واقعی رُلایا بھی لیکن حقیقت میں انہیں متحد بھی کیا ہمارے آپس میں لڑتے بھڑتے سیاستدان بھی مل بیٹھے اور اس قومی سانحے کے ردعمل کے طور پر قومی ایکشن پلان تیار کیا تاکہ دہشت گردی کو ختم کیا جا سکے۔ اس سانحے کو دو ماہ گزر چکے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ نہ تو آنسو خشک ہوئے ہیں نہ دہشت گردی رُکی ہے۔

اس ایکشن پلان کے تحت فوجی عدالتیں قائم کی گئیں اور اس کے لیے آئین میں ترمیم کی گئی۔ پھانسی کی سزا پر عائد پابندی ختم کی گئی لیکن ابھی تک صرف بائیس پھانسیاں دیں گئی ہیں جبکہ پھر نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ سلسلہ رُکا ہوا ہے اور شاید یہی وجہ ہے دہشت گردوں کا خوف دور ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے اسی لیے تو شکارپور میں پھر خون کی ہولی کھیلی گئی اور پھر ایک بار پھر پشاور بھی نشانہ بنا اور حیات آباد میں بھی وہی کچھ ہوا جو شکارپور میں ہوا تھا۔ کئی جانیں ضائع ہوئیں اسے دہشت گردوں کے خلاف کاروائی کا ردعمل قرار دے دیا گیا بلاشبہ کہ ایسا ہے لیکن اس عذر کو کب تک پیش اور قبول کیا جائے گا۔ قومی ایکشن پلان بنا تو لیا گیا اب اس پر سختی سے عمل درآمد کی بھی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حکومت اس معاملے میں غیر سنجیدہ ہے یا غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہی ہے وہ معاملات کو سنبھالنے کی کوشش ضرور کر رہی ہے لیکن دو ماہ کے اندر اندر دو مزید بڑے بڑے دھماکے کس بات کا ثبوت ہے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ دوسری طرف فوجی عدالتوں کو اب بھی تنقید کا نشانہ بنا لیا جاتا ہے ہمارا میڈیا جس نے معذرت کے ساتھ لیکن طالبان کے مقاصد کو بڑی تقویت دی تھی چاہے یہ براہ راست نہیں تھی اور ہو سکتا ہے کہ بدنیتی پر بھی مبنی نہ ہو لیکن طالبان کمانڈرز اور دیگر عہدے داران کو جس طرح کوریج دی گئی اور جس طرح ان کے مقصد کو واحد مقصد یعنی شریعت کو مسلسل خبر بنایا گیا اس نے کم فہم لوگوں کو باور کرادیا کہ وہ واقعی شریعت کے لیے جدوجہد

کر رہے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ شریعت اور دین کے نام پر ہمارے لوگ کسی بھی مقصد کے لیے بے دریغ استعمال ہو سکتے ہیں۔ اب تک تو جو نقصان ہونا تھا ہو چکا اور اس نقصان کا مداوا ممکن نہیں لیکن مزید کسی نقصان کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے لہٰذا اب میڈیا کو اپنا کردار بہت سوچ سمجھ کر بہت ذمہ داری سے ادا کرنا ہے۔ دونوں طرف کے موقف کو پیش کرنے کی کوشش میں اور آزاد میڈیا کہلانے کے شوق میں اب فوجی عدالتوں کو موضوع بحث نہ بنایا جائے حکومت کو ہدف تنقید بنانا اور بات ہے اور دہشت گردی کے خلاف اقدامات کو زیر بحث لانا اور بات۔ ظاہر ہے کہ فوجی عدالتیں کوئی خوشگوار فیصلہ نہیں ہے لیکن ملکی حالات کے پیش نظر کچھ ناخوشگوار اقدامات بھی اٹھانا پڑتے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف نہ تو ہماری عدالتوں نے قابل فخر کردار ادا کیا اور نہ ہی حکومت نے۔ اول تو عدالتوں نے ناکافی ثبوتوں کے نام پر ہاتھ ہلکا رکھا اور اگر عدالتوں نے کسی سزا کا فیصلہ سنایا بھی تو اس پر عمل درآمد کے بارے میں کسی قسم کی ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا گیا۔ اب ایسے میں عوام کو فوجی عدالتوں کے قیام کے بارے میں کسی شک و شبہ میں مبتلا کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں لہٰذا میڈیا دونوں طرف کے موقف کو پیش کرنے کے شوق میں کسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہ کرے تاکہ پھر سے کسی ملک دشمن موقف کو فائدہ نہ پہنچ سکے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے ہمیں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ صرف محتاط رہنا ہوگا بلکہ سب کچھ تیزی سے کرنا ہوگا

تاکہ جتنی جلدی ہو سکے اس ناسور کو کاٹ کر پھینکا جا سکے اور ایسا تب ہی ممکن ہے جب قوم کی رائے اس مسئلے کے بارے میں کسی قسم کی تقسیم کا شکار نہ ہو اور قوم کو ایک صفحہ پر لانے میں میڈیا بہترین کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس جنگ کے بارے میں اس کا رویہ کافی حد تک بدل چکا ہے اور اب طالبان کمانڈر کے کارنامے بیان کرنے میں کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا اور اس سٹریٹیجی کا اثر نظر بھی آ رہا ہے لیکن دہشت گردی کے خلاف اقدامات کو مزید پذیرائی دینے کی ضرورت ہے تاکہ عوام میں اگر ان کے بارے میں ایک فیصد بھی ہمدردی یا تائید پائی جاتی ہے تو اسے ختم کیا جا سکے کیونکہ اب ہمارے پاس کسی غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔

وہ نمرود کون تھا جس نے اولادِ ابراہیم کو کو بھڑکتی آگ میں جلایا

اسے پاکستان کی بدقسمتی کہیے کہ یہاں ہر کوئی ملک سے زیادہ اپنی فکر میں مبتلا ہے حکمران ہے تو حکومت کے جانے کی فکر سے پریشان سیاستدان ہے تو اپنی لیڈری کی دکان بڑھانے کی کوشش۔ لاوارث ہے تو یہ ملک اور اس کے عوام۔ بے قصور عوام بھی نہیں ہیں کہ بار بار ٹھوکر کھاتے ہیں اور پھر اسی بادشاہ کے دربار میں حاضری کو اپنا فخر سمجھتے ہیں اسی کو ووٹ دیتے ہیں اور یہ سیاستدان ان کی ڈوریوں اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں کہ جس وقت چاہے ڈھیلی کردو اور جب دل کرے کھینچ دو اور تماشے کا شور دل میں اٹھے تو شہر کو آگ لگادو۔ اور ایسا ہی بلدیہ ٹاؤن کراچی میں ہوا جے آئی ٹی کے مطابق بھتہ نہ دینے پر اس فیکٹری کو زندہ انسانوں سمیت آگ لگادی گئی فیکٹری تو جلی سو جلی مالی نقصان جو ہوا سو ہوا مال تو آجائے گا فیکٹری تو بن جائے گی لیکن وہ انسان جو زندہ جلادیئے گئے وہ اب کبھی نہیں آسکیں گے ان کے لواحقین انہیں ہمیشہ روتے رہیں گے لیکن پھر مجبوراً ہی سہی ووٹ دیں گے اور انہیں نامعلوم افراد کو دیں گے جن کو پورا کراچی جانتا ہے لیکن چپ ہے کیونکہ یہ اتنے طاقتور ہیں کہ انسانوں کو زندہ بھی جلا سکتے ہیں حالانکہ جلانے کی سزا اللہ جل شانہ نے صرف اپنے لیے مخصوص رکھی۔ کسی سخت ترین جرم پر بھی اس سزا کا اختیار انسان کو نہیں دیا کجاکہ بے قصور کو دی

جائے۔ کراچی پاکستان کا معاشی دل ہے جب یہاں خون رُکتا ہے تو پورا پاکستان ڈول جاتا ہے اور اسی کو بطور دھمکی استعمال کیا جارہا ہے اور مسلسل کیا جارہا ہے۔ ایم کیوایم اگر اس دھمکی کو کھلم کھلا استعمال کررہی ہے تو دوسری جماعتیں بھی کسی نہ کسی طریقے سے اس میں شامل ہیں، بھتہ بھی کسی ایک جماعت کا حربہ نہیں ہے۔ لیکن سانحہ بلدیہ ٹاؤن کے بارے میں اقرار جرم کرنے والے نے جے آئی ٹی کے سامنے اقرار جرم کیا اور ہوتے ہوتے یہ الزام ایم کیوایم کے سر ڈال دیا اور ایم کیوایم کے احتجاج پر اب جناب وزیراعظم نے اس جے آئی ٹی کو مسترد کرتے ہوئے ایک اور جے آئی ٹی رپورٹ مرتب کرنے کا حکم صادر کیا ہے اسی طرح رپورٹیں مرتب اور مسترد کرتے دو چار سال اور لگ جائیں گے اور لوگ اس حادثے کو بھول جائیں گے اور ہمارے سیاستدان پھر ہیرو بن جائیں گے اور یہ حادثہ لوگوں کے ذہن سے محو ہوجائے گا، مجرم کسی اور فیکٹری کو آگ لگانے کی منصوبہ بندی شروع کردیں گے اور ان تحقیقات کو سیاست کی آڑ دے کر سیاست کی نظر کردیا جائے گا۔ سیاسی مصلحتیں، مفاہمتیں اور مخالفتیں اس بساط پر اپنی اپنی چالیں چلتی رہیں گی اور عوام اپنی قسمت کو روتے رہیں گے ہمارے سیاسی لیڈر پینترے بدلتے رہیں گے اور اپنے ہی کیے مطالبے واپس بھی لیتے رہیں گے۔ جے آئی ٹی رپورٹ کے بعد ایم کیوایم کے قائد الطاف حسین نے جس طرح فوج اور رینجرز کو تنقید کا نشانہ بنایا ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ کسی دشمن ملک کی فوج پر حملہ آور ہیں اور تمام تر خرابیاں اسی کی وجہ سے کراچی کے گلی

کوچوں میں پل رہی ہیں انہوں نے حسب روایت احتجاجاً استعفیٰ دینے اور پھر واپس لینے کا اعلان بھی کیا اگرچہ اب ان اعلانات کی نہ کوئی اہمیت رہی ہے اور نہ ہی میڈیا پر بلکہ کراچی میں بھی اس سے کوئی سنسنی پھیلتی ہے کیونکہ ڈراپ سین سبھی جانتے ہیں کہ کیا ہوگا اور کل رات انہی الطاف بھائی نے جنرل راحیل شریف سے پھر مطالبہ کیا کہ جے آئی ٹی فوج کی سربراہی میں بنائی جائے یعنی شفاف تحقیقات کے لیے پھر فوج کا سہارا، چلئے حکومت اور فوج اس مطالبے کو مان بھی لے کیونکہ اگر گناہ گار اور بے گناہ کی پہچان ایسے ممکن ہے تو ہو جائے لیکن کیا اگر رپورٹ پھر بھی یہی ہوئی تو اسے تسلیم کر لیا جائے گا یا ایک اور دھمکی دے دی جائے گی اور اگر ڈانڈے کسی اور پارٹی سے جا ملے تو پھر اس کے مطالبے پر ایک اور ٹیم ایک اور رپورٹ مرتب کرے گی پھر مسترد ہوگی سلسلہ آگے ہی چلتا جائے گا اور کئی سالوں بعد بلدیہ ٹاؤن لواحقین تھک ہار کر چپ ہو جائیں گے چپ تو وہ اب بھی تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی آواز سیاست کے شور میں دب جائے گی اور بس۔ بلدیہ ٹاؤن ایک بہت بڑا حادثہ اور سانحہ تھا اور اگر آگ جان بوجھ کر ہی لگائی گئی تھی تو بہت ہی بڑا ظلم اور گناہ بھی۔ حکومت کو سیاسی مصلحتیں چھوڑ کر معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے گناہ گاروں کا تعین جلد از جلد ہونا چاہیے اور مکمل تحقیقات اور اس کے یقینی نتائج کی بنیاد پر سزا کو اتنی ہی تیزی سے لاگو ہونا چاہیے تاکہ اعتراضات در اعتراضات کا سلسلہ چل ہی نہ سکے اور ایک روایت قائم تو ہو۔

حکومت کو کوئی دباؤ قبول نہیں کرنا چاہیے وہ ایم کیوایم کا ہو، جماعت اسلامی کا ہو، اے این پی یا کسی اور جماعت کا۔ حکومت حکومت ہوتی ہے پورے ملک کے لیے، عوام کے لیے، سیاسی جوڑ توڑ کے لیے نہیں جوڑ توڑ حکومت سے باہر رہ کر کرنے کے کام ہیں۔ حکومت کے پاس کام کرنے کا موقع ہے وہ کام کرکے دکھائے بغیر جوڑ توڑ کے عوام کے ووٹ اور اس کی حمایت اس کے ساتھ رہے گی۔ بلدیہ ٹاؤن میں ہونے والا ظلم کوئی عام سی بات نہیں تھی ظلم تو ایک شخص پر ہو تو بھی اس کی سزا ہے اور زندہ جلانے جیسا جرم اور ظلم دکھانے سے تو تاریخ کی کتابیں بھی معذوری ظاہر کرتی ہیں پھر وہ نمرود کون تھا جس نے اولاد ابراہیم کو کو یوں بھڑکتی آگ میں جلایا۔ اس کا تعین بھی ہونا ضروری ہے اور جب تعین ہو جائے تو رحم کا سوال بھی پیدا نہیں ہونا چاہیے، چاہے یہ کسی کا ذاتی فعل ہو یا جماعتی اور اجتمائی اور اس کی سزا میں سستی کرتے ہوئے ان زندہ جلتے ہوئے انسانوں کی چیخیں ذہن میں رہنی چاہیے جنہیں بے گناہ جلایا گیا جبکہ خدا کی دوزخ میں بھی صرف گناہ گار ہوں گے۔

روس افغانستان سے چلا گیا لیکن افغان مہاجرین واپس نہیں گئے

مکہ میں کفار نے بہت ستایا تو پیارے نبی ﷺ نے مدینہ ہجرت کی اور یوں اور انبیاء کی طرح ہجرت سنت محمدی ﷺ بھی ٹھہری۔ آج کی دنیا میں بھی قوموں کی ہجرت کوئی غیر معمولی سرگرمی نہیں ہے۔ انسان نے جتنی بھی ترقی کر لی ہے لیکن اس نے نئی زمینوں کو فتح کرنے کی ہوس نہیں چھوڑی اور یوں کبھی حملہ آور اقوام کے مظالم سے بچنے کے لیے مفتوح اقوام کی بہت بڑی تعداد مجبوراً دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت کرتی ہے اور کبھی اپنے ہی ملک میں نامساعد حالات کے ہاتھوں بھی ہجرت کر لی جاتی ہے۔ روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو افغان عوام کی ایک بہت بڑی تعداد نے اپنے ملک سے ہجرت کی۔ کچھ تو دنیا کے دوسرے ممالک میں گئے، کچھ ایران گئے لیکن سب سے بڑی تعداد پاکستان پہنچی جو تقریباً تیس لاکھ تھی۔ اسے تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت گردانا گیا۔ پاکستان اور پاکستانی عوام نے مصیبت کے مارے اپنے ان مسلمان بھائیوں کو دل و جان سے خوش آمدید کہا اور اپنے محدود وسائل میں انہیں شامل کیا۔ نوشہرہ میں اضاخیل اور پشاور میں کچہ گڑھی ناصر باغ مہاجر کیمپ دنیا کے سب سے بڑے مہاجر کیمپ بن گئے۔ یہ مہاجرین صرف کیمپوں تک محدود نہیں تھے بلکہ شہروں کے اندر بھی ہر جگہ نظر آتے رہے دکانوں بازاروں حتیٰ کہ ٹرانسپورٹ میں بھی ہر جگہ یہ

افغان نظر آنے لگے اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی امداد کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہر قسم کی محنت مزدوری اور مشقت بھی کی لیکن ان مہاجرین کے ساتھ کچھ ایسی خرابیاں میں معاشرے میں در آئیں جن سے ہم آج تک چھٹکارا حاصل نہیں کرپائے مثلاً منشیات اور کلاشنکوف کلچر لیکن ان مہاجروں کو پھر بھی خندہ پیشانی سے پاکستان میں رہنے دیا گیا۔ روس تو افغانستان سے چلا گیا لیکن یہ مہاجرین افغانستان واپس نہیں گئے اور ان کی اولادیں بھی یہاں پیدا ہوئیں پلی بڑھیں لیکن انہوں نے اپنے ملک سے بھی رابطہ نہیں توڑا اور بڑی آزادی سے جب چاہا افغانستان گئے اور جب چاہا پاکستان آئے۔ امریکہ نے 11/9 کے بعد افغانستان پر بموں کی بارش کی تو اگر کچھ افغان واپس اپنے ملک جا بھی چکے تھے وہ پھر واپس پاکستان چلے آئے لیکن اس بار وہی مجاہدین جو طالبان میں تبدیل ہو چکے تھے نے پاکستان کو بھی اپنا نشانہ بنایا اور خودکش حملوں سے پورا پاکستان لرز اٹھا اور ان حملوں میں بہت مرتبہ شواہد افغان مہاجرین کی طرف جاتے رہے اور تانے بانے انہی سے ملتے رہے انہی مہاجرین میں ازبک اور دوسری قومیتوں کے لوگ بھی شامل ہوتے رہے اور دوسرے ملکوں کی مداخلت بھی جاری رہی۔

پاکستان دھماکوں سے گونجتا رہا کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ افغانستان پاکستان سے زیادہ محفوظ اور بہتر ہے لیکن پھر بھی یہ مہاجرین پاکستان میں رہنے کو ترجیح دیتے رہے کیونکہ بہتر تعلیم بہتر علاج، بہتر رسل و رسائل اور بہتر تجارت کے موقع انہیں میسر رہے اور ساتھ ہی مہاجرین کے لیے

آنے والی امداد بھی حاصل رہی۔ دوسری طرف افغان حکومت بھارت کے ساتھ دوستی بڑھاتی رہی بھارت کے غیر ضروری حد تک تعداد میں قونصل خانے، تعمیراتی کمپنیوں کے نام پر افغانستان میں موجودگی اور تجارت کے نام پر بڑھتے تعلقات یہ سب کچھ پاکستان کے لیے تشویش کا باعث بھی رہا ہے اور تکلیف کا بھی۔ پاکستان سے بھاگ کر جانے والے طالبان لیڈروں کو افغانستان میں پناہ ملتی رہی اور وہ وہاں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف منصوبہ بندی کرتے رہے جسے جیسے تیسے برداشت کیا جاتا رہا لیکن پشاور سکول سانحے سے ملک کا منظر نامہ تقریباً تبدیل ہو گیا اور قومی ایکشن پلان بنا اور دہشت گردی کے خلاف سخت اقدامات اٹھائے گئے تو ظاہر ہے کہ پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ افغان مہاجرین کے خلاف بھی ایکشن شروع ہوا اور جو مہاجرین غیر قانونی طور پر ملک کے اندر رہتے تھے ان کو بھی قانون کے شکنجے میں لایا گیا۔ بہت سے مہاجرین نے پاکستان کا قومی شناختی کارڈ غیر قانونی طور پر بنوایا تھا اور کچھ بغیر کسی کارڈ کے ہی رہ رہے تھے نہ تو ان کے پاس پاکستانی شناختی کارڈ ہے نہ ہی پی او آر یعنی پروف فار رجسٹریشن کہ وہ پاکستان میں بطور مہاجر رہ رہے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے سرکاری کاغذات میں کسی شخص کے وجود کا اگر کوئی ثبوت ہی نہ ہو تو کسی جرم میں ملوث ہونے کی صورت میں اُسے کیسے پکڑا جائے۔ سانحہ پشاور کے بعد حکومت پاکستان نے ان مہاجرین کو 31 دسمبر 2015 تک پی او آر کارڈز جاری کئے ہیں اور اب تک بارہ لاکھ کارڈ دیے جاچکے ہیں

جبکہ 107571 کارڈز مزید دیئے جائیں گے یہ کارڈ 2010 میں آخری بار جاری ہوئے تھے۔ عالمی برادری اور یو این ایچ سی آر نے ہمیشہ ان مہاجرین کی دیکھ بھال کرنے پر پاکستان کو سراہا ہے۔ اگرچہ پاکستانی قوم نے اس لمبی مہمان نوازی کا کوئی صلہ افغان حکومت سے نہیں پایا بلکہ ہمیشہ نقصان ہی اٹھایا ہے اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد بھی بجائے مشکور ہونے کے پاکستان کے خلاف بولتے ہوئے اور بھارت کی مدح سرائی کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ ابھی حال ہی میں پژواک افغان نیوز کے ایک مضمون کے مطابق افغانستان میں نوجوانوں کی ایک تنظیم نے جو کہتی ہے کہ وہ اصلاحات اور تبدیلی کے لیے کام کر رہی ہے کے صدر نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے مذکورہ بالا تمام اقدامات کرنے پر حکومت پاکستان پر شدید تنقید کی اور الزام لگایا کہ افغان مہاجرین کو ڈرایا جا رہا ہے تنظیم کے صدر سید میثم احسان نے اقوام متحدہ سے پاکستان کے اوپر دباؤ ڈالنے کا مطالبہ کیا اور یہ سنگین الزام بھی لگایا کہ حکومت پاکستان افغان مہاجرین کو افغانستان میں شدت پسندانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور کر رہی ہے۔ میثم احسان کوئی مشہور و معروف لیڈر نہیں ہے لیکن لہجہ اس کا جانا پہچانا ہے ایسا لہجہ بھارت سمیت دوسرے پاکستان دشمن استعمال کرتے ہیں۔ تقریباً چالیس سال تک ان مہاجرین کی دیکھ بھال کرنے کے بعد جب وہ ایسا الزام لگائے گا تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کس کی زبان بول رہا ہے اس نے یہ بھی کہا کہ تین ہزار افغان مہاجرین کو پاکستان سے نکالا

گیا ہے یہ اقرار بھی کیا گیا ہے کہ یہ مہاجرین جو وقتاً فوقتاً واپس بھیجے گئے ہیں بغیر کسی دستاویزات کے تھے تو کیا دنیا کا کوئی ملک بغیر دستاویزات کے کسی دوسرے ملک کے شہریوں کو اپنے ہاں رہنے کی اجازت دیتا ہے اور کیا یوں ہر روز سرحد کے آر پار آمدو رفت جاری رہتی ہے کہ ہفتہ وار تعطیل افغانستان اور باقی ہفتہ پاکستان میں گزارا جائے۔ نام کو یہ خوشحال لوگ مہاجر ہیں لیکن وہ پشاور یا اسلام آباد میں بیٹھ کر بیرون ملک اپنی تجارت کرتے ہیں تجارت پر بھی اعتراض نہیں لیکن اتنے بڑے بزنس کا مالک تارک وطن تو ہو سکتا ہے لیکن مہاجر کو ملنے والی مراعات وہ کیسے لیتا ہے۔ جہاں تک مہاجرین کو ہراساں کرنے کی بات ہے تو ان لوگوں کے بچے اس وقت بھی اچھے پاکستانی سکولوں میں پڑھ رہے ہیں اب بھی بڑی بڑی دکانوں کے مالک ہیں، اور اب بھی یہ ریڑھی چھابڑی پر موجود ہیں۔ اب تو میثم احسان جیسے نوجوانوں کو خود اپنی حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے شہریوں کو واپس لا کر اپنے ملک میں بسائیں اور اپنے شہر آباد کریں۔ پاکستان اس وقت خود حالت جنگ میں ہے اور اس جنگ میں سب ہی جانتے ہیں کہ ایک بہت بڑا حصہ افغان مہاجرین کا ہے بلکہ جتنے یہ اس میں ملوث ہیں تو یہ اس جنگ کے فریق محسوس ہوتے ہیں کون جانے مرنے والے پاکستانی دہشت گردوں نے بھی شربت گُلہ کی طرح پاکستانی شناختی کارڈ بنا رکھے ہوں۔ بہرحال معاملہ جو بھی ہے اب خود افغان حکومت اور اقوام متحدہ کو اس معاملے پر سوچنا چاہیے اور میثم احسان جیسے افغانوں کو پاکستان کے

خلاف ہرزہ سرائی سے ہر صورت روکنا چاہیے جو پاکستان اور افغانستان کے بہتر ہوتے تعلقات میں خود یا کسی کے کہنے پر دوبارہ خرابی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ خطے کا امن ان دونوں برادر ملکوں کے بہتر تعلقات پر منحصر ہے۔

کشمیر۔۔۔چہ ارزاں فروختند

کشمیر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے سے اپنی تمام تر خوبصورتی اور حسن کے باوجود غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے کبھی انگریز، کبھی ڈوگرہ اور کبھی بھارت کے زیر تسلط رہا ہے اور یہاں کے مسلمان مسلسل عذاب جھیل رہے ہیں۔ آج اکیسویں صدی میں بھی انسانوں کو غلام بنانے کا رواج موجود ہے اور پوری پوری قوموں کو غلام بنانے کی ہوس بھی، اور کشمیر انہی بدنصیب قوموں میں سے ایک ہے جو غلام بھی ہے اور اس کی فکر سے دنیا آزاد بھی ہے۔ انسانی حقوق کے علمبردار بھی ان مظالم پر چپ ہیں جو وہاں مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سب جھیل رہے ہیں۔ کشمیر کی ایک اور بدنصیبی جو شاید تاریخ میں واحد مثال ہو کہ پورے ملک کو بمعہ اس کی قوم کے بیچا گیا اور وہ بھی انتہائی سستے داموں۔ 16 مارچ 1846 کو انگریزوں نے کشمیر کو ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ صرف پچھتّر لاکھ روپے میں بیچا اور دکھ کی بات یہ ہے کہ بیچنے والا خود بھی کشمیر کا مالک نہیں تھا وہ تو خود دوسری زمین سے آیا ہوا ایک ناجائز قابض تھا۔ اس نے گلاب سنگھ کو پابند کیا کہ وہ کشمیر کی سرحدیں تبدیل نہیں کرے گا اور ساتھ ہی اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اس کے خلاف جب بھی مسلح جدوجہد یا بغاوت ہوئی تو حکومت برطانیہ ا س کی مدد کرے گی۔ گلاب سنگھ نے برطانوی حکومت کی بالادستی قبول کرتے ہوئے معاہدے کی ایک شق

کے مطابق تاج برطانیہ کو ہر سال کچھ علامتی تحائف بھیجنے کا بھی وعدہ کیا ان تحائف میں ایک گھوڑا، بارہ شالوں والی خاص نسل کی بھیڑیں (چھ نر چھ مادہ) اور کشمیری شالوں کے تین جوڑے شامل تھے اور یوں ایک پوری ریاست اور پوری قوم بہت ہی سستے داموں بیچ دی گئی۔ انگریز افسروں اور رنجیت سنگھ کے جاگیردار گلاب سنگھ نے معاہدے پر دستخط کر دیئے اور کشمیر کی قسمت بلکہ اس کی غلامی کا فیصلہ ہو گیا۔ گلاب سنگھ اور اس کے بعد آنے والے تمام ڈوگرہ راجوں نے کشمیر کو ہی نہیں کشمیریوں کو بھی اپنی جاگیر سمجھا اور جب چاہا جہاں چاہا جو سلوک چاہا کشمیریوں سے کیا۔ 1837 میں گلاب سنگھ جب وہ جموں کا گورنر تھا نے پختون قبیلے یوسفزئی کے ہر فرد کے سر کی قیمت صرف ایک نانک شاہی روپیہ مقرر کی اور یوں ہزاروں مسلمان مار دیئے گئے۔ عورتوں کو گلاب سنگھ کے حرم میں لے جایا گیا یا اس کے سپاہیوں کو دے دیا گیا اور یا لاہور کی منڈی میں بیچ دیا گیا۔ مہاراجہ بننے کے بعد تو اس کو یہ ایک روپیہ ایک سر کا تناسب بھی شاید زیادہ لگا ہو۔ 1863 میں اس کے جانشین رنبیر سنگھ نے ہنزہ اور یاسین کے علاقے میں اپنے خلاف اٹھنے والی مخالفت کو جس طرح دبایا وہ بھی ظلم کی بے مثال داستان ہے جب مندوری پہاڑی میں چھپی ہوئی زخمی عورتوں کو ان کے بچوں سمیت زندہ جلا دیا گیا، کل دو ہزار دیہاتی مارے گئے اور پانچ ہزار کو جبری مشقت کے لیے لے جایا گیا۔ کشمیریوں کے مسائل یہاں ختم نہیں ہوئے بلکہ انگریز ہندوستان سے گیا تو کشمیر کا مسئلہ یہیں چھوڑ

گیا۔ کشمیر کے راجہ ہری سنگھ نے انگریز سے خریدا ہوا کشمیر بھارت کے ہاتھ بیچ دیا اور یوں کشمیر ایک دفعہ پھر بک گیا اور اس بار تو مفت میں بیچ دیا گیا اور ایک ایسے خریدار کے ہاتھ بیچا گیا جو کشمیری کو گلاب سنگھ سے بھی زیادہ بے قیمت سمجھتا ہے اپنی آزادی کی بات کرنے والے کو یوں قتل کرتا ہے اور نامعلوم اجتماعی قبروں میں یوں دفناتا ہے کہ اس کا کہیں نام ونشان بھی باقی نہ رہے کہ مبادا آنے والی کشمیری نسلیں اس کی بہادری اور قربانی سے متاثر ہی نہ ہو جائیں۔ کشمیر آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی جب اپنی آزادی کی بات کرتا ہے تو اسے دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔جب کہ اس کی 77% مسلمان آبادی ہندو خواہش پر بھارت کی غلام ہے اور نہ صرف اس پر آٹھ لاکھ ایسی فوج متعین ہے جس کو ہر کشمیری جان پر ہر قسم کے اختیارات حاصل ہیں بلکہ بھارت بھر سے ہندو لاکر یہاں بسائے جارہے ہیں ، مندر بنائے جارہے ہیں اور انہیں خصوصی مراعات دی جارہی ہیں تاکہ کشمیری مسلمانوں کے اکثریت کی بنا پر آزادی کے حق کی توجیہہ کو ختم کیا جاسکے۔ایک طرف مسلمانوں کی نسل کشی اور دوسری طرف ہندو آبادکاری لیکن دنیا خاموش ہے.بڑی طاقتیں بھارت کو خوش کرنے کے لیے اسے سلامتی کونسل کا مستقل رکن بنانے کی کوشش کے وعدے کررہی ہیں لیکن اگر وہ تاریخ پڑھ لیں تو جان جائیں کہ کشمیر اور کشمیری کو پہلی بار جس طرح اور جس دام بیچا گیا تھا اور جس طرح اسے دوبارہ بیچا گیا تو پہلے تو وہ ان جرائم کا مقدمہ چلائیں اور پھر تاریخ کی جوابدہی کے بعد

وہ کوئی ایسا وعدہ کر سکیں تو کرلیں ۔ان طاقتوں کو تو چاہیے کہ وہ بھارت سے کشمیر کے بارے میں نہ صرف باز پرس کریں بلکہ اسے مجبور کریں کہ وہ اقوام متحدہ میں کیے گئے اپنے وعدوں کے مطابق کشمیر کے حق خوداریت کو تسلیم کرے اور اگر وہ واقعی خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت سمجھتا ہے تو جمہوریت کا تو پہلا اصول ہی کثرت رائے کو فوقیت دینا ہے تو پھر کشمیر میں مسلمان اکثریت کو کیوں دبا کر غلام بن کر رہنے پر مجبور کیا جارہا ہے کیوں ان کو آزادی کا حق دار نہیں سمجھا جارہا۔کیا پچھتّر لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض کشمیریوں کی غلامی کے ایک سو ستر سال کافی نہیں کیا چار پانچ نسلوں کی غلامی کے بعد بھی آزادی کشمیریوں کا حق نہیں ۔دنیا کو یہ سوچ لینا چاہیے اور یہ بھی کہ اگر آٹھ لاکھ ہندو فوجی آزادی کی خواہش کو نہیں کچل سکے ہیں تو اور کتنی فوج متعین کی جائے گی۔ آزادی اگر ہر انسان کا حق ہے تو کشمیریوں کا بھی ہے اور انہیں ان کا یہ حق مل جانا چاہیے۔

پاکستان میں پانی کے ذخائر بڑھانے ہونگے

پاکستان دنیا کے ان ملکوں میں تو شامل ہو چکا ہے جن میں پانی کی کمی ہے لیکن اگر موجودہ حالات برقرار رہے تو کمی اس شدت تک پہنچ سکتی ہے جب صورت حال خطرناک اور تشویش ناک ہو جائے۔ ایک رپورٹ کے مطابق کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پاکستان کے پاس تیس دن سے زیادہ کا ذخیرہ شدہ پانی نہیں ہے اور ایسے میں اگر اس کی طرف آتے ہوئے دریاؤں کا پانی بھی روک دیا جائے تو کیا یہ نہ سمجھا جائے کہ پانی کو اسکے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہی پانی کبھی ایسے بند کر دیا جاتا ہے کہ دریا سوکھ جاتے ہیں اور کبھی ایسے کھول دیا جاتا ہے کہ یہ اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے کیونکہ ہمارے زیادہ تر دریا ہمارے پڑوسی ملک سے ہو کر ہم تک پہنچتے ہیں، حالانکہ دنیا میں پاکستان واحد ملک نہیں جس کے دریا دوسرے ملک سے نکلتے ہوں لیکن شاید بھارت واحد ملک ہے یا کم از کم ان چند ملکوں میں سے ہے جو مشترکہ دریاؤں کے پانی کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے اور حصہ دار ملک کو صحرا میں بدلنا اپنا فرض۔ پاکستان بھارت کے ہاتھوں آبی دہشت گردی کا شکار واحد ملک نہیں اگر ایسا ہوتا تو شاید یہ کہا جاتا کہ پاکستان کی شکایت کسی روایتی دشمنی یا مبالغے پر مبنی ہے لیکن یہی شکایت بھارت کے دوسرے پڑوسیوں کو بھی ہے۔ یہاں صرف ایک دو مثالیں ہی بیان کروں گی۔ بھارت

اور نیپال کے درمیان کوسی دریا کے پانی پر تنازعہ موجود ہے اس دریا پر بننے والے ڈیموں اور بیراجوں کے بارے میں نیپالی عوام اور ماہرین کا خیال ہے کہ بھارت اس سے زیادہ فائدہ اٹھا رہا ہے جبکہ نیپال کو انتہائی محدود پانی مہیا کیا جارہا ہے یہ منصوبے سرحد کے نزدیک بنائے گئے ہیں۔ کوسی، سارداا ور گندھک کے منصوبوں کے تمام اخراجات بھارت نے برداشت کیے اوراس کے بدلے میں بقول نیپالیوں کے اس پانی کو خرید لیا۔ بھارت کا رویہ یہی ہے کہ بڑا ملک ہونے کے ناطے وہ وسائل وذرائع کو اپنا حق سمجھتا ہے کبھی اسے قیمتاً خریدتا ہے اور کبھی زبردستی ہتھیا لیتا ہے۔ مہا کھلی دریا پر بھارت اور نیپال کے درمیان پنچشوارہ منصوبے کا معاہدہ 1996 میں ہوا اس منصوبے سے 6000 میگا واٹ بجلی تیار کی جا سکتی ہے یہ آب پاشی کا منصوبہ بھی ہے لیکن اس سے صرف چار فیصد پانی نیپال کو دینا قرار پایا۔ بھارت کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی اور اب وہ 96% پانی لے رہا ہے۔ یہی صورت حال بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان بھی ہے اور بنگلہ دیشی عوام بھارت کا اصلی چہرہ دیکھ رہے ہیں جہاں وہ صرف اور صرف اپنا مفاد دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ملک پہلے اپنا مفاد دیکھے گا یہ اس کا حق ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دوسرے ملکوں کے عوام کو بھوک اور پیاس سے مار دیا جائے معاہدے باہمی مفادات کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں اور پھر اسی طرح نبھائے جاتے ہیں لیکن بھارت نہ صرف بغیر معاہدوں کے دوسرے ممالک کے ساتھ مشترکہ وسائل کو صرف اپنا حق سمجھ کر

استعمال کرتا ہے بلکہ معاہدوں کی دھجیاں بھی اڑاتا ہے جیسا کہ اس نے سندھ طاس معاہدے کی موجودگی میں کیا لیکن سندھ طاس کی طرف بعد میں آتے ہیں پہلے بنگلہ دیش کے ساتھ اس کے پانی کے تنازعے پر نظر ڈالتے ہیں کہ کیسے اس نے دریائے گنگا کا رخ موڑا اور سرحد کے قریب فراکا ڈیم بنایا جس سے بنگلہ دیش تک پہنچنے والے پانی کا حجم اتنا کم ہوا کہ یہاں مچھلی کی پیداوار بری طرح متاثر ہوئی بقول بنگالی ماہرین کے ماحولیات پر منفی اثرات کی وجہ سے نہ صرف یہاں کی زرعی زمین میں نمکیات کا تناسب بڑھا جس سے زرعی پیداوار کم ہوئی بلکہ دنیا کے سب سے بڑے ساحلی جنگلات یعنی سندر بن میں درخت اور پودے بڑی تعداد میں سوکھ چکے ہیں۔ اوپر دی گئی مثالوں سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ بھارت خطے میں نہ صرف روایتی ہتھیاروں کی دوڑ اور استعمال کا ذمہ دار ہے بلکہ وہ غیر روایتی طریقوں سے بھی اپنے پڑوسیوں کے بہت سارے مصائب کا ذمہ دار ہے جن میں بہت بڑا ہتھیار پانی ہے۔ ماہرین کے مطابق مستقبل کی اکثر جنگیں پانی پر لڑی جائیں گی لیکن بھارت تو ابھی سے ایسا کر رہا ہے اور پانی کو بطور ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ پاکستان بنا تو اگلے ہی سال بھارت نے پاکستان کا پانی روک دیا جو بین الاقوامی اور اقوام متحدہ کی مداخلت پر تو کھول دیا گیا لیکن پھر بھی اکثر وہ یہ حربہ استعمال کرتا رہا ہے۔ 1960 میں سندھ طاس معاہدہ ہوا تو دریائے سندھ، جہلم اور چناب کا پانی پاکستان کے حصے میں آیا بھارت کو دریائی بہاؤ میں خلل ڈالے بغیر ان کے پانی

کے محدود استعمال کی اجازت ملی لیکن بھارت نے نہ صرف ان دریاؤں کا پانی روک کر ڈیم بنائے اور اب تک تیس سے زائد ڈیم بنا چکا ہے بلکہ ان دریاؤں کا رخ موڑنے کے لیے سرنگ بھی بنائی اور پانی کی چوری کا بھی مرتکب ہو اور پانی کی اس چوری کا مقصد اگر ایک طرف اپنی ضرورت پوری کرنی ہے تو دوسری طرف پاکستان کو بنجر بنانا بھی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو بھارت افغانستان کو دریائے کابل پر ڈیم بنانے کا مشورہ نہ دیتا اس نے نہ صرف یہ مشورہ دیا بلکہ یہ ڈیم بنانے کے لیے ہر قسم کے تعاون کا یقین بھی دلایا اور پاکستان جو ویسے ہی پانی کی کمی کا شکار ہے اور موسمیاتی لحاظ سے صحرائی اور نیم صحرائی خطہ ہونے کی وجہ سے یہاں بہت کم بارش ہوتی ہے اس پر اگر دونوں طرف سے پانی بند یا کم کر دیا جائے تو صورت انتہائی خطرناک ہو سکتی ہے۔ تحقیق کہتی ہے کہ دریائے سندھ میں ہر سال خریف میں 30%اور دریائے جہلم میں 10% کم پانی آتا ہے اور ظاہر ہے جس ملک کی زراعت کا انحصار ہی دریاؤں اور ان سے نکلنے والی نہروں کے پانی پر ہو پانی روکنے کی صورت میں وہاں صورت حال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی ستر فیصد آبادی زراعت سے کسی نہ کسی طریقے سے وابستہ ہے اور زرعی پیداوار اس کی جی ڈی پی کا تقریباً 24% حصہ بنتا ہے اس سے پانی کی اہمیت کا اندازا بخوبی لگایا جاسکتا ہے اور اس امکان کو ہر گز رد نہیں کیا جاسکتا کہ خدانخواستہ پاکستان شدید ترین آبی قلت کا شکار ہو جائے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کا لیے حکومت کو اس معاملے کو سنجیدگی

سے لینا ہوگا اور ایک طرف بھارت کے خلاف اپنا مقدمہ انتہائی شدت سے لڑنا ہوگا بلکہ بین الاقوامی برادری کو بھی صورت حال کا احساس دلانا ہوگا۔ بنگلہ دیش اور نیپال جیسے متاثرہ ملکوں کے ساتھ مل کر بھی کام کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف خود اپنے ملک میں بھی پانی کے ذخائر بڑھانے ہونگے اور مزید ڈیم بنانے ہونگے تاکہ ناہموار موسمی بارش کا پانی موثر طور پر ذخیرہ کیا جاسکے اور پورے ملک کو تھر جیسی صورت حال سے بچایا جاسکے۔

23 مارچ 2015 کو ایک اور قرارداد پاکستان

مسلمان برصغیر میں دو سو سال سے غلامی کی زندگی گزار رہے تھے وقتاً فوقتاً مسلمان رہنما اٹھتے رہے اور قوم کو جگاتے رہے آزادی کی چنگاری بجھی نہیں تھی لیکن شعلہ بھی نہیں بن رہی تھی آزادی کی خواہش بھی موجود تھی اور اسے حاصل کرنے کی لگن بھی لیکن نہ تو منزل کا تعین کیا گیا اور نہ ہی راستہ واضح تھا۔ ایسے میں مسلمان رہنما 22 مارچ 1940 کو منٹو پارک میں جمع ہوئے اور قوم کے لیے ایک منزل کا تعین کیا۔ اجلاس تین دن جاری رہا اور جب چوبیس مارچ کو یہ اجلاس ختم ہوا تو مسلمان اپنے راستے اور منزل کا تعین کر چکے تھے۔ قائداعظم نے اپنے صدارتی خطاب میں جس طرح مسلمانان ہند کے لیے آزادی کے حق کو بیان کیا اُس نے منزل اور راستے دونوں کو واضح کر دیا۔ قائداعظم نے انگریز حکومت اور مکار ہندو ذہنیت دونوں کو باور کرایا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جو ہندوستان میں اب تک تو اکٹھی رہ رہی ہیں لیکن انگریز اور ہندو کے اب تک کے رویے کو سامنے رکھتے ہوئے اب مسلمان مزید کسی بہتری کی توقع نہیں رکھتے اور نہ ہی انہیں اپنے لیے ایک الگ ریاست کے علاوہ کوئی حل قبول ہے۔ قائداعظم نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب، فلسفہ، معاشرتی رسوم اور ادب سب کچھ مختلف ہے نہ یہ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور نہ مل کر کھاتے

ہیں حقیقت میں یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جو نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ اکثر اوقات ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ان کا نظریہء زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہے، ان کے ہیرو مختلف ہیں اور اکثر اوقات ایک قوم کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہوتا ہے۔ایسی دو قوموں کو ایک ملک میں اکٹھے کرنا جہاں ایک قوم عددی اکثریت اور دوسری اقلیت میں ہو تباہی کا باعث ہو گا۔ قائداعظم نے مزید فرمایا مسلمان قوم کی کسی بھی تعریف کے مطابق ایک قوم ہیں لہذا ہماری خواہش ہے کہ مسلمانوں کو ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے۔ قائداعظم نے ہندوستان میں دو قومی نظریے کی اتنی واضح انداز میں وضاحت کی کہ اس کے بعد مسلمانوں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور اپنی منزل کی طرف سفر شروع کر دیا۔لاہور میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ایک الگ ریاست حاصل کرنے کا جو عزم کیا گیا اسے مسلم لیگ نے قرار داد لاہور کا نام دیا لیکن ہندو اخبارات ملاپ، پرتاب، بندے ماترم اور ٹریبون وغیرہ نے اسے قرار داد پاکستان کا نام دیا اور یوں مسلمانوں کی منزل مزید واضح کر دی اور آخر کار انھوں نے سات سال کی انتھک جدوجہد اور قربانیوں کے بعد پاکستان حاصل کر لیا۔ پاکستان کا بن جانا یقیناً شب قدر کا معجزہ تھا ورنہ دشمن نہ صرف کئی تھے بلکہ بااختیار بھی تھے اور مکار بھی لیکن عزم اور حوصلے نے انہیں شکست دی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ ملک خاکم بدہن جلد اپنا وجود کھو دے گا لیکن ایسا نہ ہوا اور پاکستان باوجود دشمنوں کی کوشش کے

بفضل تعالیٰ قائم ہے اور رہے گا۔ لیکن آج ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں ملک میں جو بدامنی شدت پسندی اور دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے وہ قوم کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے جس سے نمٹنا یقیناً بہت مشکل کام ہے لیکن ہمیں اپنی بقاء کی یہ جنگ جیتنی ہو گی اگر اُس وقت پاکستان کا حصول نا گزیر تھا تو آج اس کی بقاء نا گزیر ہے اگر کل اس کو حاصل کرنے کے لیے جنگ لڑنا پڑی تھی تو آج پھر سے اس کے لیے جنگی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی بقاء کی یہ جنگ ہر محاذ پر لڑنا ہو گی ۔ ہمارے ملک کی رگوں میں جو برائیاں سرایت کر گئی ہیں انہیں ختم کرنا ہوگا۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں رشوت ، بدعنوانی، سفارش، کام چوری ، بے حیائی اور بہت سی برائیاں اور کمزوریاں ہیں ہم کسی اور میدان میں سر فہرست ہوں نہ ہوں بد قسمتی سے ہر آنے والی رپورٹ ہماری شرمندگی کا باعث بنتی ہے کبھی ہم سب سے زیادہ راشی ملکوں کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں تو کبھی سب سے زیادہ بدعنوان ممالک میں جبکہ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہم سب سے زیادہ شرح خواندگی والے ممالک میں شامل ہوتے، ہماری یونیورسٹیاں دنیا کے بہترین اداروں میں شامل ہوتی ، ہم خلاء میں قدم رکھتے، ہم خوراک میں خود کفالت حاصل کرتے، ہم صنعتوں میں انقلاب برپا کرتے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ ہم نے ایسا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ بلکہ ہم نے اپنے دشمنوں کو ہمیشہ موقع فراہم کیا کہ وہ ہماری صفوں میں گھس کر ہم پر وار کریں اور اس میں زیادہ قصور ہمارا اپنا ہے اگر ہم نے خود اپنی صفوں میں اتفاق برقرار

رکھا ہوتا تو ایسا کبھی ممکن نہ تھا لیکن ہم صوبائیت سے لے کر فرقہ واریت تک ہر چیز میں بٹے ہوئے ہیں جس کا فائدہ ظاہر ہے کہ دشمن اٹھاتا ہے لیکن اگر ہم نے اپنی کمزوریوں اور برائیوں کو خود شکست دے دی اور سب سے پہلے اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کیا اور 23 مارچ 1940 کی طرح 23 مارچ 2015 کو بھی ایک اور قرارداد پاکستان پاس کی جو حصول پاکستان سے آگے بڑھ کر تعمیر و تکمیلِ پاکستان کی قرارداد ہو اور قوم اسی جذبے سے چلے تو اس منزل کا حصول بھی ناممکن نہ رہے ہاں یہ مشکل ضرور ہے لیکن قیامِ پاکستان سے زیادہ مشکل نہیں بس ضرورت عزم کی ہے ایک ایسے عزم کی جس کا مقصد صرف اور صرف منزل ہو اور اس سے کم کسی چیز پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو۔

پاکستانی جوہری معاملات کی مانٹرنگ

1947 میں نظریے کی بنیاد پر پاکستان بنا اور اگلے سال یعنی مئی 1948 میں مغرب کے مکمل تعاون بلکہ منصوبہ بندی کے نتیجے میں اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا گیا اور ایک سال بعد اسے تسلیم بھی کر لیا گیا۔ اس کا قیام بھی نظریے کی بنیاد پر عمل میں لایا گیا قیام تو دونوں ریاستوں کا اپنے اپنے نظریے کی بنیاد پر کیا گیا لیکن اِن کے نظریات میں اس قدر تفاوت تھا کہ نہ تو کبھی اِن کے تعلقات قائم ہو سکے اور نہ ہی ایک دوسرے کے لیے کبھی خیر سگالی کے جذبات ہی محسوس کیے گئے۔ اس کی وجہ وہ بنیاد تھی جس پر اسرائیل کی عمارت اٹھائی گئی اور جس طرح فلسطینیوں کو مظالم کا نشانہ بنایا گیا اُس نے اسرائیل کے وجود کو شروع سے متنازعہ بنائے رکھا۔ اسرائیل کا کردار نہ صرف فلسطین کے حوالے سے مجرمانہ رہا ہے بلکہ پورے عالم اسلام کے خلاف اس کی سازشیں ہمیشہ جاری رہی ہیں اور بحیثیت اہم ترین اسلامی ملک پاکستان کے خلاف اس کا رویہ شروع سے ہی صرف معاندانہ رہا ہے بلکہ اُس نے ہر موقع پر پاکستان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف سازش کی خاص کر اس کا ایٹمی پروگرام مسلسل اسرائیل کے نشانے پر رہتا ہے اور بھارت اور اسرائیل ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اور امریکہ کی مدد سے پاکستان کی جوہری تنصیبات کے بارے میں سازشوں کا جال

بنتے رہتے ہیں ابھی حال ہی کی ایک خبر کے مطابق بھارت اور اسرائیل نے راجھستان میں ایک مرکز قائم کیا ہے جہاں سے وہ پاکستانی جوہری معاملات کی مانٹرنگ کر سکیں یہ کوئی پہلا موقع یا پہلی سازش نہیں ہے جو بھارت اور اسرائیل نے پاکستان کے خلاف مشترکہ طور پر کی ہو اور ان مشترکہ سازشوں کے ثبوت اکثر ملتے رہتے ہیں۔ اس نے 1979 میں بھارت کی ہی اطلاع پر کہ پاکستان ایٹمی دھماکہ کر سکتا ہے پاکستان کے ایٹمی تنصیبات پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اُس نے جرمنی میں ڈاکٹر اے کیو خان کے سپلائرز کو نہ صرف دھمکی دی بلکہ اُس پر حملہ بھی کیا جس میں ایک سپلائیر ہینز کا کتا بھی مارا گیا اور اِن کاروائیوں کے لیے اسے بھارت کی انٹیلیجنس سپورٹ حاصل رہی بلکہ یہ تمام کاروائیاں یہ دونوں ممالک مل کر کرتے ہیں اور را، موساد، سی آئی اے تمام کی تمام ایجنسیاں پاکستان کے ایٹمی تنصیبات پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہیں اور کسی موقع کی تلاش میں ہیں کہ خدانخواستہ جو نہی موقع ملے وہ ان پر حملہ آور ہو۔ یہ طاقتیں ہمارے ایٹمی پروگرام کے خلاف جو زہر اُگلتی ہیں اس میں وقفہ تو آتا ہے یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ وہ کبھی طالبان کی طرف سے خطرے کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی دہشت گردوں کی طرف سے کہ ان کے ہاتھ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں تک پہنچ سکتے ہیں اور یہ بات ایسے کہی جاتی ہے کہ جسے یہ ہتھیار سرراہ پڑے ہوئے ہوں ان ایٹمی ہتھیاروں کی حفاظت کا ایک مربوط نظام موجود ہے لیکن دراصل انہیں خطرہ ان ممالک کی طرف سے ہے جو اس کے خلاف پروپیگنڈا

کرتے رہتے ہیں اور پاکستان میں امن و امان کی خراب صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے میں کچھ آوازیں ملک کے اندر سے بھی اِن کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں اور اس پروپیگنڈے کو اور مضبوط کر دیا جاتا ہے جیسے پچھلے دنوں ایک اخبار میں پرویز ہود بھائی کا مضمون شائع ہوا جو بظاہر ایٹمی توانائی کے مقابلے میں شمسی توانائی کی زیادہ اہمیت وافادیت پر تھا لیکن ساتھ ہی پاکستان کے ایٹمی پلانٹس تک دہشت گردوں کی پہنچ کے امکانات بھی ظاہر کیے گئے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم گھر کے اندر کے ساتھ ساتھ اِن جانے پہچانے اور معلوم دشمنوں پر بھی نظر رکھیں اور بین الاقوامی اور سفارتی سطح پر ان کا توڑ کریں اور ہمارے یہ جینئس اگر اپنی کچھ توانائیاں بین الا قوامی سطح کے اِن مجرموں کو بے نقاب کرنے میں لگا دیں تو شاید ہمارے یہ اثاثے زیادہ محفوظ بن سکیں اور نہ تو کوئی دہشت گردوں اور نہ ہی طالبان کی آڑ لے سکے۔ یہ ممالک نہ صرف ہمارے ایٹمی اثاثوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں بلکہ یہ ہر سطح پر پاکستان کے خلاف اکٹھ کیے ہوئے ہیں اور دہشت گردوں اور دہشت گردی کے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ بھارت تو اب مشرقی سرحدوں سے اٹھ کر مغربی اور شمالی سرحدوں تک پہنچ چکا ہے اور یہاں سے بھی اندر آرہا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے وہ اپنے نظریاتی دوستوں کے ساتھ مل کر سازش کرتا ہے اور اپنا کام نکالتا ہے اُسے یہ دوست، ملک کے باہر اور اندر دونوں سے مل جاتے ہیں لیکن صرف اس بات کا واویلا کرنے اور شور مچانے سے ہم دشمنوں سے اپنا بچاؤ نہیں

کر سکتے اور جب یہ وار کرلیں تو اُس کے بعد ان کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں۔ ہمیں دنیا کو اِن سازشوں سے پہلے ہی آگاہ کرنا ہوگا اور یہ کام سفارتی سطح پر کرنا ہوگا۔ سفارتی کوششوں سے بین الاقوامی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا ہوگا اور ساتھ ہی اپنی طاقت، قوت اور مہارت نہ صرف برقرار رکھنی ہوگی بلکہ اسے مزید بڑھانا ہوگا کیونکہ صرف شکایت کرنے سے معاملات حل نہیں ہوتے بلکہ بہت دفعہ ان کا جواب اِن سے بڑھ کر دینا پڑتا ہے تاکہ نہ صرف اب کے دشمن کی سرکوبی کی جائے بلکہ آئندہ کے لیے بھی اس کی قوت کو ختم کیا جائے اور دوسروں پر بھی اپنے خلاف کچھ سوچنے کچھ کرنے سے پہلے ہی اپنی طاقت کا اظہار کر دیا جائے کیونکہ قوموں کی بقاء ان کی قوت میں ہے اور کمزور قومیں نہ تو بقاء حاصل کرتی ہیں نہ باعزت مقام۔

پُرامن کراچی خوشحال پاکستان کی ضمانت

کراچی جس کو کسی زمانے میں روشنیوں کا شہر کہا جاتا تھا لیکن پھر ہوا یہ کہ یہاں دن کی روشنی میں بھی کوئی جان محفوظ نہیں رہی اور وہ جرائم جو رات کے اندھیرے میں بھی ڈر کر کیے جاتے تھے دن کے روشنی میں بھی بے خوف وخطر کیے جانے لگے۔ نا معلوم افراد کے نام پر معلوم افراد خون کی ہولی کھیلتے رہے اور اس صورت حال کے خلاف بات کرنے والے بھی انہی نامعلوم افراد کا نشانہ بنتے رہے۔ ایسے میں یہ حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ اِن حالات کا نوٹس لیتی بلکہ اس کے خلاف سخت ایکشن لیا جاتا اور ہر صورت عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جاتی لیکن سیاسی مصلحتوں کے تحت حکومتیں اس سب کچھ کو.برداشت کرتی رہیں اور اس کے بدلے عوام کا خون بہتا رہا اور سیاسی پارٹیاں سیاسی اور حکومتی جوڑ توڑ میں مصروف رہیں لیکن چونکہ کراچی کے حالات میں سیاسی جماعتوں کے ملوث ہونے کے مکمل اور صاف شواہد موجود تھے اس لیے سیاسی طور پر لاکھ مخالفت سہی یہاں مصلحتوں کا کھیل کھیلا جاتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی جماعتیں فوجی آپریشن کا مطالبہ بھی کرتی رہیں اور ہر جماعت ان حالات سے .برآت کا اظہار بھی کرتی رہی اور سارا الزام دوسروں پر ڈالا جاتا رہا ایک دوسرے کو حالات کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا۔ پھر موجودہ حکومت نے آپریشن کا فیصلہ کیا اور اسے شروع بھی کیا۔ یہ

آپریشن جرائم پیشہ افراد کے خلاف کیا گیا اور کیا جا رہا ہے، اب تک کے نتائج کے مطابق کافی کامیابی بھی ہو رہی ہے اور اللہ کرے کہ یہ آپریشن اُس ناسور کو نکال پھینکنے میں کامیاب ہو جائے جس نے پورے کراچی کو بیمار کر رکھا ہے۔ مجرم کوئی بھی ہو کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو وہ مجرم ہی ہوتا ہے چاہے کسی سیاسی پارٹی کا رکن ہو یا کسی ڈان کا آلہء کار۔ کراچی آپریشن دراصل اِن تمام مجرموں کے خلاف ہے لیکن حیرت ہے کہ ایک سیاسی پارٹی نے اسے اپنے خلاف قرار دے دیا ہے اور اس کی آڑ میں ملک، فوج اور حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئی ہے۔ ایم کیو ایم خود کو ایک سیاسی جماعت کہتی ہے اور ایسا ہے بھی، اس کی ملک کے دوسرے صوبوں میں اپنی تنظیم کی کوشش بھی خوش آئند ہے اور کچھ دوسری زبانیں بولنے والوں کو اپنی جماعت میں شامل کرنا بھی لیکن اس کے باوجود وقتاً فوقتاً وہ خود کو اردو بولنے والوں کی نمائندہ جماعت ظاہر کرتی ہے اور فوج اور رینجرز کے خلاف بیانات دیتے ہوئے متعصب بھی ہو جاتی ہے اور دھمکی آمیز بھی۔ اُس نے خود سے یہ طے کر لیا ہے کہ موجودہ آپریشن اُس کے خلاف ہے جبکہ حکومت بار بار اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ آپریشن صرف اور صرف جرائم پیشہ افراد کے خلاف ہے لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ایم کیو ایم کی صفوں میں ایسے لوگ موجود ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ پکڑے بھی جا چکے ہیں جن میں سے کچھ اقرارِ جرم بھی کر چکے ہیں مثلاً صولت مرزا کے اقرار جرم سے اگر کچھ ایسے نام سامنے آئے ہیں جن کا تعلق ایم کیو ایم سے ہے تو ان کی

تحقیقات ضرور ہونی چاہیے اور اگر ان پر جرم ثابت نہیں ہوتا تو پھر صولت مرزا یا اُس کی بیوی جس نے ایک ٹی وی پروگرام میں ان الزامات کی تصدیق کی دونوں کو سخت ترین سزا دی جائے ورنہ بصورت دیگر ان لوگوں کو جن کے نام لیے گئے ہیں کسی قسم کی رعایت نہ دی جائے۔ ایم کیو ایم جواِن الزامات کی تردید کر رہی ہے اُسے بھی اپنی صفوں میں سے ایسے افراد ڈھونڈھ کر خود حکومت اور قانون کے حوالے کر دینا چاہیے تاکہ انہیں آئندہ کسی ایسی صورتِ حال کا سامنا ہی نہ کرنا پڑے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ وہ مجرموں کے پکڑے جانے کو اپنے خلاف کاروائی قرار دے دیتے ہیں۔ رینجرز کو بھی کسی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے تمام ثبوت حاصل کر لینے اور پیش کر دینے چاہیے تاکہ اُسے جانبداری کے شک کا سامنا نہ کرنا پڑے اور نہ کسی کو اس کے خلاف بولنے کا موقع ملے اُسے کراچی میں چھوٹے یا بڑے کسی جرم میں ملوث کسی سیاسی پارٹی کے کارکن کو کسی دباؤ میں آئے بغیر پکڑنا چاہیے۔ چونکہ یہ بات طے ہے کہ پاکستان کے اس سب سے بڑے شہر میں کوئی ایک جماعت مجرمانہ کاروائیوں میں ملوث نہیں بلکہ یہ کھیل مختلف پیمانے پر سہی کئی ایک کھیل رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ بھی پکڑے جا رہے ہونگے لیکن وہ سیاسی جماعتیں چپ رہ جاتی ہیں اور میڈیا پر بھی خبر آجاتی ہے کہ پکڑے جانے والے ملزم یا مجرم کا تعلق ایک سیاسی جماعت سے تھا اگر سیاسی جماعت کا نام ظاہر کرنے سے ملک کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے تو کیا بہتر نہ ہو کہ سیاست کے نام پر خون اور جرم کا کھیل کھیلنے

والوں کو بے نقاب کیا جائے تاکہ عوام بھی یہ پہچان کرسکیں کہ کون ان کی خدمت کے لیے کوشاں ہے اور کون حصول حکومت اور طاقت کے لیے برسرپیکار، کیونکہ الزام تراشی کا یہ کھیل عوام کو سچ اور جھوٹ کی پہچان نہیں ہونے دے رہا۔ ہمارے لوگ جو خاندان، خوف اور پیسے کی سیاست کے عادی ہو چکے ہیں یا ایسا کرنے پر مجبور ہیں اُن میں اگر سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو ہم کسی حد تک سہی اپنے درست نمائندے منتخب کرسکیں گے۔ حکومت نے بھی اگر آپریشن شروع کیا ہی ہے تو اُسے اِسے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہیے تاکہ کراچی کا امن بحال کیا جاسکے اور پاکستان کے اس معاشی شہ رگ میں زندگی بے خوف وخطر چلتی رہے نہ یہاں سے بوری بند لاشیں ملیں، نہ اس کے بازار بند ہوں، نہ یہاں نو گو ایریاز ہوں، نہ بیریئرز ہوں اور نہ ہی بھتہ خور گینگ ہوں۔ اس سلسلے میں ہر قسم کے دباؤ کو مکمل طور پر رد کرکے صرف اور صرف ایک نکاتی ایجنڈا رکھا جائے اور وہ ہے کراچی میں مکمل امن۔ کیونکہ اس شہر کے امن کا مطلب پاکستان کی معاشی ترقی اور خوشحالی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی قسم کے اقدامات انتہائی بہادری سے اٹھانا ہوں گے تاکہ کامیابی میں کوئی شک نہ رہے۔

سانحہ تربت۔۔۔ ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ گرفتار ہوا لیکن رہا کر دیا گیا

بلوچستان میں ایک بار پھر نہتے غریب مزدوروں کو قتل کر دیا گیا۔ ان مزدوروں میں سے سولہ کا تعلق صادق آباد اور رحیم یار خان پنجاب، اور چار کا تعلق حیدرآباد سندھ سے تھا۔ یہ انتہائی غریب خاندانوں کے لوگ تھے جو تربت میں گڈان کے علاقے میں سہراب ڈیم کے منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ بلوچستان پاکستان کا سب سے زیادہ غیر ترقی یافتہ صوبہ ہے یہ قدرتی دولت سے مالامال ہے لیکن کچھ شدید قسم کے جغرافیائی حالات اور کچھ یہاں موجود خود غرض قسم کے سردار اور خود کو لیڈر رکھنے والے لوگ ہیں جو اپنے اقتدار اور اختیار کے دوام کے لیے اس صوبے کی ترقی کو ہر طرف سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ صرف چند لوگ ہیں لیکن انہیں مسلسل بیرونی امداد میسر ہے اور اصل میں یہی وجہ ہے بلوچستان کے حالات بہتر نہ ہونے کی۔ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ ایک مخلص شخص ہیں جو واقعی بلوچستان کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں اور پچھلے کچھ عرصے سے بلوچستان میں سکون اور امن ہونے سے دل کو تسلی مل رہی تھی کہ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا کہ اچانک ایک بار پھر اس واقعے نے سب کے دل ہلا کر رکھ دیئے اور بیس انتہائی بے ضرر اور غریب مزدوروں کو قتل کر دیا گیا۔ جن لوگوں نے ان علاقوں میں غربت دیکھی ہے وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ مزدور غربت کی لکیر سے بھی

کتنا نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔ عینی شاہدین کے مطابق مزدور کیمپ میں مزدوروں کو قطار میں کھڑا کیا گیا ان سے شناخت پوچھی گئی اور پھر انہیں گولیاں مار دی گئیں۔ اس وا قعے سے دو طرح کے مقاصد حاصل کیے گئے ایک غیر بلوچوں کو پیغام دیا گیا کہ وہ بلوچستان کا رخ نہ کریں اور دوسرا حکومت کے ترقیاتی کاموں کو سبوتاژ کیا گیا۔ اس کے بعد یہ اندازہ لگانا ایک عام آدمی کے لیے بھی مشکل نہیں کہ واقعے کے پیچھے وہی غیر ملکی عناصر کارفرما ہیں جو اس صوبے میں امن نہیں ہونے دیتے لیکن اس اندازے کی تصدیق وزیراعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک نے بھی کردی اور کہا کہ اس واقعے میں بھارت ملوث ہے۔ ایک انتہائی ذمہ دار سیاستدان اور وزیراعلیٰ کی طرف سے کوئی ایسی بات بغیر تصدیق کے نہیں کی جا سکتی۔ بھارتی مداخلت کا یہ پہلا واقعہ بھی نہیں ہے بلوچستان بھارت کا پسندیدہ محاذ ہے جہاں وہ پاکستان کے مخالفین کو منظم کرتا ہے امداد کرتا ہے اور کاروائی کرواتا ہے۔ تربت واقعے کی ایف آئی آر ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ کے خلاف درج کر لی گئی ہے جو کہ بلوچستان لبریشن فرنٹ سے تعلق رکھنے والا وہ شر پسند ہے جو بلوچستان میں قتل وغارت گری میں ملوث ہے۔ خود کو بلوچوں کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز رہنما کہتا ہے اور وہ یہ اعزاز غیر بلوچوں کے خون ناحق کے بدلے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قتل کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ یہ خون اس نے بہایا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ شخص ایک بار پہلے بھی گرفتار ہوا لیکن چوہدری افتخار کی مہربانی سے رہا کردیا گیا۔ مئی 2004 میں

اس نے تین چینی انجنیئرز کو جو گوادر میں کام کر رہے تھے قتل کر دیا۔ کیا اس کے ان اقدامات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ بلوچستان اور اس کی ترقی کا دشمن ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس صوبے کی ترقی کے لیے کام کرنے والوں کی قدر کرتا۔ تربت واقعے میں جو بھی گروپ ملک یا شخص ملوث ہے اس کے خلاف حکومت کو سخت کاروائی کرنا ہوگی ورنہ بلوچستان میں یہ سرگرمیاں دوبارہ زور پکڑ سکتی ہیں جن کا ملک کسی بھی طرح متحمل نہیں ہو سکتا۔ پاکستان مختلف قسم کی دہشتگردیوں کے خلاف ایک طویل عرصے سے جنگ لڑ رہا ہے اور سچ یہ ہے کہ ان میں اکثر معاملات وہ ہیں جن میں غیر ملکی ہاتھ بڑا واضح دکھائی دیتا ہے اور ہماری افواج اور قانون نافذ کرنے والے ادارے مسلسل ان سے نبرد آزما بھی ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ چند لوگ حکومت اور ایک بہت بڑی فوج سے ٹکر لیے ہوئے ہیں ان تک اسلحے کی ترسیل بلا روک ٹوک جاری ہے اور ان کا انٹیلیجنس نظام بھی اتنا مربوط اور مضبوط ہے کہ یہ اپنی کاروائی بڑی آسانی سے کر جاتے ہیں تو کیا یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ انہیں کسی تربیت فوج کا تعاون اور پشت پناہی حاصل ہے اور یہی وہ قوتیں ہیں جو پاکستان کے خلاف ہر وقت جغرافیائی اور نظریاتی لحاظ سے برسرپیکار رہتی ہیں۔ عرصہ دراز سے پاکستانی عوام دہشت گردی کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں کہیں طالبان تو کہیں بی ایل اے اور بی ایل ایف جیسی مٹھی بھر علحدگی پسندوں کی تنظیمیں اور کہیں کراچی مارکہ دہشت گردی۔ حکومت اور فوج کی ان کے خلاف کاروائی جاری ہے لیکن کہیں کہیں اب بھی ان کے

ہمدرد موجود ہیں۔ چاہے یہ ہمدرد ملکی ہوں یا غیر ملکی ان کا خاتمہ ضروری ہے اور ان کی مدد کرنے کی سخت سزا بھی دی جانی چاہیے۔ غیر ملکی دہشت گردی کے ثبوت کھل کر دنیا اور پاکستانی عوام کے سامنے رکھ دیے جانے چاہیے۔ صرف غیر ملکی ہاتھ کی موجودگی کا اعلان کافی نہیں ۔ اگر بھارت ممبئی حملوں کو بنیاد بنا کر پاکستان کے خلاف انتہا پسندانہ پروپیگنڈا کر سکتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کرتے اور ہمارے سفارتی ذرائع کیوں خاموش اور ناکام رہتے ہیں۔ ان بیس مزدوروں کے خاندانوں کے سامنے کون جوابدہ ہے ظاہر ہے کہ اپنی حکومت، اور اگر حکومت ایف آئی آر میں ملزم نامزد بھی کرتی ہے تو جرم ثابت ہونے پر سزا بھی ہونی چاہیے۔ انسانی حقوق کا واویلا مچا کر ان لوگوں کے حق میں میڈیا میں طوفان اٹھانے والوں سے بھی پوچھنا چاہیے کہ ان انتہائی غریب مزدوروں کا قصور کیا اتنا ہی نہ تھا کہ وہ دوسرے صوبوں سے مجبوراً اٹھ کر اپنے گھروں سے دور صحرا میں بیٹھ کر اور کام کرکے بارہ ہزار روپے کمانے گئے تھے۔ بارہ ہزار سے زیادہ میں تو ان انسانی حقوق کے ٹھیکیداروں کے کتے بلیوں کی خوراک آتی ہے۔ امید ہے کہ اس بار گرفتاری کے بعد یہ مجرم کسی ایسی عدالت میں پیش ہو کر بری نہیں ہونگے جن کو انصاف سے زیادہ اپنی ذاتی شہرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان بیس مزدوروں کو اگر انصاف دلا دیا جائے تو امید ہے پھر کوئی لیڈر اپنی لیڈری چمکانے کے لیے کسی انسان کو خون میں نہیں نہلائے گا۔ بلوچستان آدھا پاکستان ہے اور حقوق کے نام پر اس کی علٰحدگی کی بات کرنے

والے خود کیوں اس کی ترقی کے راستے مسدود کر رہے ہیں ایک مقدمہ اس امر کا بھی دائر ہونا چاہیے۔

افغان جنرل کا دورہ پاکستان ۔۔۔ جلال آباد دھماکے ۔۔۔ تعاون بھارت کا

پاکستان ملٹری اکیڈمی کی 132 ویں پاسنگ آؤٹ پریڈ کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے مہمان خصوصی افغان چیف آف جنرل سٹاف شیر محمد کریمی تھے۔ پاکستان اور افغانستان دو ایسے ہمسایہ ممالک ہیں جو مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں دونوں ملکوں کی تاریخ ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور یہ تاریخی سلسلے آپس میں ایسے باہم پیوست ہیں کہ ان کو جدا کرنا ممکن ہی نہیں ۔ محمد غوری، محمود غزنوی، بابر اور بے شمار ایسے نام جو پاکستان اور افغانستان کا مشترکہ اثاثہ ہیں۔ لہذا افغان آرمی چیف کا پی ایم اے پاسنگ آؤٹ میں مہمان خصوصی ہونا یوں کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن وقت ، حالات اور دشمنوں کی سازشوں نے ان دونوں قوموں میں جو خلیج پیدا کی تھی اس کو پاٹنے کی طرف پہلا قدم ضرور تھا جو دونوں قوموں کے بہترین مفاد میں ہے لیکن دشمن کے مفاد کے بالکل خلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ عین اسی دن افغانستان کے شہر جلال آباد میں ایک بینک کے باہر خودکش دھماکہ کیا گیا جہاں سرکاری اہلکار اپنی تنخواہ وصول کرتے تھے جہاں 33 افراد ہلاک جبکہ سو سے زیادہ زخمی ہوگئے۔ دشمن جو بھی ہے یقیناً مشترکہ ہے جو نہیں چاہتا کہ یہ دونوں ممالک نزدیک آسکیں اور افغانستان کے لیے اس کی اہمیت کم ہو اور محسوس یہی ہوتا ہے کہ اسی ضرورت کے

پیشِ نظر بھارت اور ''را'' ایک دفعہ پھر مصروفِ عمل ہو گئے ہیں کیونکہ کچھ عرصے سے یقیناً اسے اپنی اہمیت کی کمی کا احساس ہو رہا ہے کیونکہ طویل عرصے تک بھارت نواز کرزئی حکومت کے بعد جب صدر اشرف غنی کی حکومت آئی تو افغانستان نے پاکستان کے بارے میں مثبت طور پر سوچنا شروع کر دیا پھر سانحہ پشاور آرمی پبلک سکول نے پاکستان کے ساتھ افغان مسلمانوں کے دل بھی ہلا کر رکھ دیے اور دہشت گردوں اور شدت پسندوں کے خلاف تعاون کا فیصلہ کیا گیا۔اس سال فروری میں چھ افغان کیڈٹ پاکستان کی ملٹری اکیڈمی میں تربیت حاصل کرنے پہنچے جو دونوں ملکوں کے درمیان اعتماد کی بحالی کی ایک بڑی نشانی تھی جسے خود سابق افغان وزیر دفاع شاہنواز تنئی نے ایک خوش آئند فیصلہ کہا۔ اس سے پہلے 2003 سے بھارت افغان فوجیوں کو تربیت فراہم کر رہا تھا اور اب تک 1400 افغان کیڈٹس کی تربیت کر چکا ہے جب کہ تین سو اب بھی وہاں زیرِ تربیت ہیں اور یہ معاہدے بھارت کے تعلیم یافتہ اور بھارت نواز کرزئی کے دورِ حکومت میں ہوئے تھے۔ افغانستان اور بھارت کو اپنے معاملات میں یقیناً آزادی حاصل ہے لیکن ان کا مقصد صرف تربیت نہیں بلکہ ان زیرِ تربیت فوجی افسران کی پاکستان کے خلاف برین واشنگ بھی ہے ان کے ذہنوں میں پاکستان کے خلاف وہ نفرت بھر دی جاتی ہے جسے وہ اپنی پیشہ ورانہ تکمیل کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ بھارت پاکستان کے خلاف صرف سرحد پر برسرِ پیکار نہیں بلکہ وہ اپنے داؤ ہر طرف سے چل رہا ہے اور افغانستان میں اسے حامد کرزئی کی صورت میں ایک ایسا مہرہ مل

گیا تھا جسے وہ بساط پر جس طرف چاہتا تھا چلا دیتا تھا۔ 2014 میں کرزئی نے اپنا طے شدہ دورہ پاکستان منسوخ کردیا تھا اور اس کے لیے بہانہ بنایا گیا کہ پاکستان افغانستان کے شہر کنڑ میں افغان فوجی چوکی پر حملے میں ملوث ہے اس حملے میں اکیس افغان فوجی مارے گئے تھے اس حملے کی ذمہ داری طالبان نے قبول کر لی تھی لیکن کرزئی نے اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے دورہ پاکستان منسوخ کر دیا۔ چال اب بھی وہی چلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں ملک اگر صلح صفائی اور برادرانہ تعلقات کی بحالی کے لیے کسی کوشش کا آغاز کر رہے ہیں تو اسے ابتداء میں ہی سبوتاژ کردیا جائے اور افغانستان کو بھارت کا دست نگر ہی رکھا جائے۔ امریکہ کے افغانستان سے واپسی کے بعد افغان فوج کو خود ہی ہر قسم کے حالات اور دشمنوں کا سامنا کرنا ہے اور اس کے لیے اسے اپنی فوج کو پیشہ ورانہ طور پر تیار کرنا ہے اور شاید اسی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ افغان کیڈٹس کو پاکستان بھیجا گیا ہے اور خیر سگالی کے جذبات کے تحت ہی افغان چیف آف جنرل سٹاف کو پی ایم اے کی پاسنگ آوٹ پریڈ میں بطور مہمان خصوصی بلایا گیا۔ امید اب بھی یہی کی جارہی ہے کہ یہ تعلقات آگے بڑھیں گے اور افغانستان اس ضرورت کو محسوس کرے گا کہ وہاں بھارت کی موجودگی کو کم سے کم سطح پر لایا جائے اور یہ کہ دوست دشمن کی پہچان کی جائے اور دونوں ملک اپنے مشترکہ دشمنوں کے خلاف باہمی اتفاق رائے اور اتفاق عمل سے کاروائی کریں گے۔ جلال آباد کے یکے بعد دیگرے دو دھماکوں سے طالبان نے جس طرح براہ

ت کا اظہار کیا ہے بلکہ اسے ظالمانہ قرار دیا ہے وہ کسی اور دشمن کی موجودگی کا پتہ دے رہا ہے ورنہ طالبان تو ان جرائم کو بھی قبول کر لیتے ہیں جن کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ جرم کیا ہے اگرچہ بظاہر ان دھماکوں کی ذمہ داری آئی ایس آئی ایس نے قبول کر لی ہے لیکن درپردہ انہیں جو تعاون حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں کیونکہ ان دھماکوں کی آڑ میں پاک افغان تعلقات کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور اسی لیے پاکستان کے ہر سفارتی مشن کو ہر سطح پر ان مسائل کو دنیا کے سامنے رکھنا ہوگا اور افغانستان کو بھی سارے مسائل کا حل پاکستان کے ساتھ مل کر نکالنا ہوگا نہ صرف خود کو دشمن سے بچانا ہوگا بلکہ دوست اور دشمن کی پہچان کرکے اسے کیفر کردار تک پہنچانا ہوگا تاکہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی محفوظ بنایا جا سکے۔

سبین محمود کا قتل فائدہ ماما قدیر کا الزام آئی ایس ائی پر

سبین محمود کراچی میں ایک این جی او چلا رہی تھیں ان کو شاید چند ایک لوگ ہی جانتے تھے جن کا ان سے واسطہ پڑا ہو۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ غلط ہاتھوں میں پڑ گئی یا شہرت کے شوق نے اسے اس راستے پر چلا دیا جس نے آخرکار اس کی جان لے لی وہ جان سے گئی اور شہرت دوسروں کو مل گئی۔ اس کی موت نے ماما قدیر اور اس کے چند ایک ساتھیوں کو جو فائدہ پہنچایا اس کی خاطر اس ایک جان کو مار دینا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی اور پھر بڑی ہوشیاری سے ایک بار پھر پاکستان دشمنوں نے ان بلوچ علحدگی پسندوں کو بچالیا اور اس قتل کا الزام آئی ایس آئی پر لگادیا۔ ایک بار پھر ہمارے بنیادی انسانی حقوق کے کچھ نام نہاد علمبردار چیخ اٹھے وہی جو کراچی میں روزانہ کے قتل عام پر نہیں بولتے جو بلوچستان میں غریب مزدوروں کے قتل کو نہایت سرسری انداز میں لیتے ہیں اور چپ رہتے ہیں کیونکہ ان کے لیے بولنے سے انہیں کسی بین الاقوامی شہرت کی توقع نہیں ہوتی نہ ہی کسی بڑے ہوٹل میں تقریب منعقد ہوتی ہے۔ سبین محمود جیسے لوگ بھی قابل رحم ہیں جو نہ صرف ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں بلکہ ان کے مقاصد کی نظر بھی ہو جاتے ہیں۔ کہانی صرف سبین محمود تک محدود نہیں بلکہ

اگر اس کا سرا تلاش کیا جائے تو کڑیاں کہیں اور جا ملتی ہیں جس میں بین الاقوامی سازشوں کے تانے بانے بھی الجھے ہوئے ملتے ہیں۔ پاکستان اور چین دو ہمسایہ اور قابل بھروسہ دوست ممالک ہیں اور ان کے آپس میں معاہدے اور تعاون کچھ غیر قدرتی نہیں لیکن دونوں ممالک کی اہمیت کے پیش نظر کچھ عالمی اور علاقائی طاقتوں کے ارادوں کے آگے کچھ بند ضرور باندھتے ہیں۔ چین ایک بڑی اقتصادی اور معاشی قوت ہے اور اگرچہ پاکستان خود اپنے بہت سارے مسائل میں الجھنے کی وجہ سے معاشی طور پر تو کسی بڑے مقام پر نہیں لیکن اس کی علاقائی اور تزویراتی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں اس کے ساتھ ہی اللہ نے اس کو کچھ ایسے ذرائع سے نوازا ہے کہ دنیا جانتی ہے کہ جس دن بھی ان سے مکمل طور پر فائدہ اٹھانا شروع کیا گیا یہ معاشی برتری میں کئی بڑے ملکوں سے آگے نکل سکتا ہے اور کم از کم ان بڑی طاقتوں کا انحصار تو اس پر ہو سکتا ہے بلکہ یہ ان انحصار کی مجبوری بن سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ان حصوں میں شورش برپا کی جاتی ہیں جن کے بارے میں انہیں ذرا بھی شک ہو کہ وہاں سے ان کی برتری پر زد پڑ سکتی ہے۔ عرصے تک سندھ میں مختلف قسم کی آٹھ دس یا سو دو سو لوگوں کی تنظیمیں بنائی جاتی رہیں جو خود کو ایک الگ قوم کہلاتی تھیں لیکن محب وطن سندھیوں کے آگے جب وہ بے بس ہوئے اور کراچی کی بندرگاہ کی اہمیت کو کم نہ کیا جا سکا تو ان کا رخ بلوچستان کی طرف مڑ گیا اور وہاں موجود چھوٹی موٹی مخالفتوں کو ہوا دے دے کر بڑھایا جانے لگا ۔ گوادر کی بندرگاہ کو جب

حکومت پاکستان نے اہمیت دینا شروع کی اور اس پر ترقیاتی کام شروع کیے گئے تو بہت ساری قوتیں بلوچستان میں گڑبڑ پھیلانے پر کمربستہ ہوگئیں اس میں دوست دشمن کی بھی تخصیص نہیں رہی بلکہ ہر ایک نے اپنا مفاد دیکھا۔ایران کو اپنی بندرگاہوں کی اہمیت کم ہونے کی فکر پڑ گئی تو صحرا سے نخلستان بننے والے دبئی کو اپنی ترقی معکوس نظر آنے لگی۔پاکستان کے ایک سرے پر اگر گوادر ہے تو دوسرے پر خشکی میں گھری ہوئی وسط ایشیائی ریاستیں اور معاشی قوت چین ہے۔ اول الذکر کو اپنی بحری تجارت کے لیے گوادر نزدیک ترین راستہ ہے اور آخرالذکر کو اپنی ہر روز بڑھتی ہوئی تجارت کے بوجھ کو بانٹنے کے لیے گوادر سب سے مناسب سہولت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ایک اپنے مفاد کی خاطر بلوچستان کو استعمال کر رہا ہے اور یہاں پاکستانی ایجنسیوں کو مسلسل بدنام کرکے دو طرح کے مقاصد حاصل کیے جارہے ہیں ایک عوام میں ان کے خلاف بدظنی پیدا کی جارہی ہے اور دوسرے اسے معاشی لحاظ سے پیچھے رکھا جارہا ہے۔ یہاں مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کو استعمال کیا گیا اور کیا جارہا ہے جن میں ایک نام ماما قدیر کا بھی ہے اور حیرت ہے کہ ہمارے میڈیا اینکرز اور انسانی حقوق کے دعویدار ملک کے لیے ان کے عزائم کو جانتے ہوئے بھی انہیں نہ صرف وقت بلکہ پروجیکشن دیتے ہیں۔ بلوچستان میں گمشدہ افراد کا مسئلہ جس طرح کھڑا کیا گیا اور اس کے لیے آئی ایس آئی اور دیگر ایجنسیوں کو ذمہ دار ٹھہرا کر ہمارے کچھ عاقبت نااندیش لوگوں نے دشمن عناصر کو جس طرح تعاون فراہم کیا وہ بجائے خود

ایک المیہ ہے۔ بات صرف یہاں تک محدود نہیں رہی بلکہ ان لوگوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا انہی میں سے ماما قدیر بھی ہے جس سے بلوچستان سے اسلام آباد تک مارچ کروایا گیا اور ہر ہر موقع پر ہمارے کچھ چینلز اسے کوریج دیتے رہے۔ بہتر سالہ قدیر ریگی اس دعوے کے ساتھ 2013 میں کوئٹہ سے چلا کہ اس کے ساتھ ہزاروں لوگ ہونگے لیکن اس کے اس سفر میں صرف چند لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کے سفر کی ابتداء سے لے کر منزل تک اس کے ساتھ مکمل تعاون کیا گیا اور اسے ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا رہا۔ 2015 میں چینی صدر کے دورہ پاکستان سے پہلے اسے دوبارہ بہت فعال کر دیا گیا اور مارچ میں اسے براستہ امریکہ یورپ اپنے دوسرے ہم خیالوں یعنی براہمداغ، حربیار وغیرہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی تاہم اسے آخری وقت میں ائیرپورٹ سے واپس کر دیا گیا لیکن خبر میڈیا میں زیادہ توجہ حاصل نہ کر سکی پھر اسے لمز میں مدعو کیا گیا تاکہ اپنے مذموم عزائم پورے کیے جا سکیں لیکن یونیورسٹی انتظامیہ کی طرف سے اُسے روک دیا گیا خبر بنی لیکن اہمیت حاصل نہ کر سکی اگرچہ بین الاقوامی برادری کی ہمدردی بھی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور چینی حکومت کو بھی حالات خراب ہونے کا عندیہ دیا گیا۔ اس سے پہلے بلوچستان میں مزدوروں کے قتل سے بھی کوشش کی گئی تھی کہ بہت سارے معاہدے نہ ہو سکیں لیکن جب زیادہ کامیابی نہ ہو سکی تو سبین محمود کو قتل کروا دیا گیا اور ایسا عین اس وقت کیا گیا جب وہ اپنی تنظیم کے تحت ماما قدیر اور اس کے گروپ کے لوگوں سے ملاقات کر کے

اپنی والدہ کے ہمراہ گھر جا رہی تھی خود اس تنظیم کے ایک رکن نے کہا کہ ملاقات کی تاریخ 21 سے 24 اپریل کی گئی جبکہ جگہ بھی تبدیل کی گئی کیونکہ انہیں دھمکیاں موصول ہوئیں تھیں اگر ایسا کیا گیا تھا تو ظاہر ہے اس تبدیلی کا علم صرف شرکاء کو ہی رہا ہوگا پھر وہ کون لوگ تھے جنھوں نے سبین کو قتل کیا اور الزام ایک بار پھر بڑی آسانی سے پاکستانی ایجنسیوں پر لگا دیا۔ یہ الزام بھارت کی طرف سے بھی آیا آخر اسے اس چھوٹی سی تنظیم اور اس کی بانی ڈائریکٹر سے کیا دلچسپی تھی اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اس قتل سے زیادہ شہرت کس کو ملی۔ کیا آئی ایس آئی کے لیے ماما قدیر کو مارنا مشکل تھا کہ ایک عورت کو مار دیا گیا اگر ایسا کیا جاتا تو عمر رسیدہ ماما قدیر کو لانگ مارچ کے دوران ختم کیا جاتا اور اسے طبعی موت قرار دے دیا جاتا۔ ماما قدیر اپنے قاتل بیٹے جلیل ریگی کا مقدمہ لے کر نکلا تھا تو وہیں تک محدود کیوں نہیں رہا کیوں اسے ایک بین الاقوامی شخصیت اور ایکٹیوسٹ بنا دیا گیا اور ان سارے واقعات کے لیے وہی وقت کیوں منتخب کیا گیا جو چینی صدر کے دورہء پاکستان کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ سوچنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن ہمارے طاہرہ عبداللہ، عاصمہ جہانگیر، فرزانہ باری، نجم سیٹھی، حامد میر یا اسی قبیلے کے اعلیٰ دماغ اگر سوچنا چاہیں۔ لیکن اس کے لیے پہلے انہیں اپنی ذاتی شہرت کی قربانی بھی دینا پڑے گی اور اپنے ہی ملک کے اداروں کے خلاف بغض اور تعصب بھی دل سے نکالنا ہوگا اس طرح شاید وہ سبین محمود اور اسی جیسے دوسرے

لوگوں کے قاتلوں تک پہنچا جا سکے۔

ایک بار پھر مشورہ ہے الطاف بھائی احتیاط کیجئے

کراچی میں ایس ایس پی ملیر راؤ انوار نے ایک پریس کانفرنس کی، غلط کی یا درست کی، اپنے اختیارات سے تجاوز کیا یا نہیں کیا، کانفرنس خود کی اور ملک کی محبت میں کی یا کسی کے کہنے پر سیاسی بونچھال لانے کی خاطر کی یا کسی کے سیاسی مفادات کی خاطر کی یہ ایک الگ بحث ہے جس پر سیاست دانوں ، قانون دانوں اور تجزیہ نگاروں نے اپنی رائے کا کافی اظہار کر لیا ہے لیکن اس پریس کانفرنس کا جواب جس بھونڈے، انتہائی قابل اعتراض بلکہ ملک دشمن انداز میں الطاف حسین نے دیا وہ بذات خود مجرمانہ فعل ہے یعنی کھلم کھلا ملک دشمن ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ایسا پہلی بار نہیں کیا گیا بلکہ اپنی کئی دوسری تقاریر میں نجانے کس حالت میں وہ ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارا پورا الیکٹرانک میڈیا یرغمال بنا پوری قوم کو سمجھ سے بالاتر آواز اور انداز کی تقریر سنوا رہا ہوتا ہے کیوں کہ کوئی بھی چینل کسی ناخوشگوار واقعے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس بار بھی پورا میڈیا یرغمال بنا ہوا تھا الطاف حسین بول رہا تھا اور پوری قوم سن رہی تھی کہ کیسے ایک پولیس آفیسر کی باتوں کا جواب دیتے دیتے بات ملک کی مخالفت اور حسب سابق فوج کے خلاف تعصب پر پہنچ گئی۔ ایم کیو ایم جو خود کو ایک بڑی قومی جماعت کہلاتی ہے اور ایسا بھی وہ صرف

اپنے سیاسی مفادات کی خاطر کرتی ہے ورنہ جب اُس کے خلاف سیاسی طور پر بھی بات کی جائے وہ اسے اردو بولنے والوں کے خلاف قرار دے کر متحدہ سے مہاجر قومی موومنٹ بن جاتی ہے اور فساد اور نقص امن پر نہ صرف آمادہ ہو جاتی ہے بلکہ اپنے ووٹرز اور تمام اردو بولنے والوں کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پارٹی کے سربراہ اکثر مغلظات بولتے ہوئے نظر آتے ہیں اس بار بھی ایس ایس پی راؤ انوار کے بارے میں ایسا کیا گیا اور جو باتیں مہذب لوگ تنہائی میں بھی نہیں کرتے وہ جلسۂ عام میں کی گئی لیکن اس بات سے بھی آگے بڑھ کر فوج کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا گیا اس کی کوئی توجیہہ ایم کیو ایم پیش نہیں کر سکتی اور پھر مزید آگے بڑھ کر ہماری سب سے بڑی دشمن انٹیلیجنس ایجنسی یعنی ''را'' کو درخواست پیش کی گئی کہ وہ اُن کی مدد کرے تاکہ وہ لوگوں کو بتا سکیں کہ '' را'' کی مدد حاصل ہو تو وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ الطاف بھائی نے تو جو کچھ ان کے دل میں تھا وہ فرما دیا سونے پر سہاگہ یہ ہو جاتا ہے کہ ان کی رابطہ کمیٹی ان کے بیانات کی توجیہات پیش کرنا شروع کر دیتی ہے باالفاظ دیگر اُن کے بیانات کو درست قرار دینے لگتی ہے۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ایم کیو ایم میں ملک دشمن عناصر کثیر تعداد میں موجود ہیں ۔ کراچی کے حالات کی بہت زیادہ ذمہ داری ایم کیو ایم پر عاید ہوتی ہے جب یہ جماعت چاہتی ہے تو کراچی بند ہو جاتا ہے اور اربوں کا نقصان کروا دیا جاتا ہے کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کی مرضی کے بغیر کاروبار کر سکے، کوئی میڈیا

گروپ اُس کے خلاف کھل کر نہیں بول سکتا اگر چہ اس خوف میں کچھ کمی ضرور آئی ہے لیکن اب بھی کچھ ہی لوگ یہ ہمت کرتے ہیں ۔اردو بولنے والوں کی اکثریت اِن سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ وہ اُن کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنے پر مجبور ہے اور ایسے میں جب الطاف حسین انہیں عسکری اور جسمانی تربیت حاصل کرنے کے لیے اُکسا رہے ہیں، دریائے سندھ کو خون سے سرخ کرنے کی بات کر رہے ہیں تو کیا اس کا کوئی اثر نہ ہوگا ۔حسب معمول اس بیہودہ گفتگو پر الطاف حسین نے معذرت کر لی اور ان کی رابطہ کمیٹی نے کہا کہ تقریر کو سیاق و سباق کے بغیر لیا جا رہا ہے حالانکہ تقریر کو براہ راست نشر کیا گیا لہٰذا سیاق و سباق کے غلط ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں مشورہ یہ ہے کہ ایم کیو ایم اپنے اصل منشور میں تبدیلی پیدا کر لے اور ساتھ ہی اپنے لیڈر بھی بدل دے اور یا کراچی کے عوام کو آزاد کر دے تاکہ یہ مخلص اور سچے پاکستانی اپنے ملک ، اپنی فوج یا دیگر اداروں کے بارے میں یہ متعصبانہ کلمات آئندہ نہ سنیں۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے آباو اجداد نے اس ملک کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑے اور دو قومی نظریے کو اپنے عمل سے سچا کر دکھایا پھر ان میں ملک دشمن عناصر کہاں سے داخل ہوئے جو آج ''را'' سے مدد مانگ رہے ہیں کیا وہ لوگ اپنے بزرگوں کے خون سے غداری نہیں کر رہے۔ جہاں تک مہاجر کے نام پر سیاست کا تعلق ہے تو آخر کب تک اس لفظ کو بنیاد بنا کر لوگوں کے جذبات سے کھیلا جائے گا اس اعزاز پر فخر کرنا اور بات ہے اور اس کے نام پر لوگوں میں احساس

محرومی پیدا کرنا اور بات ۔جب ’’ الطاف حسین اینڈ کو‘‘ مہاجروں کی محرومی کی بات کرتے ہیں توکیاپاکستان کے باقی لوگوں، صوبوں اور شہروں میں تمام محرمیاں ختم ہو گئی ہیں ،کیا یہاں ہر ایک کو نوکری، بجلی، پانی، گیس، چھت ، تعلیم سب کچھ میسر ہو گیا ہے۔ کراچی توپاکستان کاسب سے زیادہ سہولتوں والا شہر ہے جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ نہ صرف خواندگی بلکہ تعلیم کی سب سے زیادہ شرح انہی میں ہے۔ کئی مہاجر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں اور اب بھی ہیں چاہے وہ اردو بولنے والے مہاجر ہیں یا پنجابی بولنے والے ۔ اور اب تواِن کے لیے یہ لفظ زیادہ موزوں بھی نہیں کہ تیسری چوتھی نسل جب ایک زمین پر پیدا ہو جائے تواُسے زمین کا بیٹا کہلانے پر فخر کرنا چاہیے، اُسے لوگوں کوحُب الوطنی کا درس دینا چاہیے نہ کہ دشمن سے مدد مانگنے کی ترغیب ۔ اب اگر رابطہ کمیٹی ’’را‘‘ کو دشمن اور پاکستان اور خاص کر بلوچستان میں گڑبڑ کی ذمہ دار قرار دے رہی ہے جو دراصل بلوچستان اسمبلی کی اُس قرارداد کارد عمل ہے جس میں ایم کیو ایم پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا لیکن چلیے یوں ہی سہی کہ اُنھوں نے اُسے دشمن مان ہی لیا ہے تو بھی وہ پہلے اپنے لیڈر کی تقریر کا متن کیوں نہیں دیکھ لیتی، کیوں ان کی ذہنی صحت کا یقین نہیں کیا جاتا، کیوں انہیں یہ بات نہیں سمجھائی جاتی کہ معافی آخر کتنی بار۔ ہمارے حکمران اور سیاستدان اگر فوری معافی، معذرت کو احسن اقدام قرار دے کر قبول کر لیا کریں گے تو پھر تو یہ روش عام ہو

جائے گی اور کسی دن معافی مانگنے سے پہلے ہی مدد آ پہنچے گی پھر اُس صورت حال کا تدارک کون کرے گا اور کیا یہ ممکن بھی ہوگا یا نہیں کہ دریا سندھ کو سرخ ہونے سے روک دیا جائے۔ کراچی میں بہت خون بہایا جاچکا اب مزید کی گنجائش نہیں ہے لہذا معافی تلافی سے پہلے ہی اگر معاملات کو سنبھال لیا جائے تو ایم کیو ایم، کراچی اور پاکستان سب کے حق میں بہتر ہوگا۔ لہذا ایک بار پھر مشورہ ہے کہ الطاف حسین اینڈ کمپنی احتیاط کیجئے۔

نلتر ہیلی کاپٹر ایک حادثہ

9 مئی کو پاک فوج کا ایک خصوصی ہیلی کاپٹر گلگت بلتستان کی خوبصورت اور پر فضا وادی نلتر میں گر کر تباہ ہو گیا اس افسوس ناک واقعے میں مزید افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس ہیلی کاپٹر میں غیر ملکی سفیر اور ان کے اہل خانہ سوار تھے جنھیں پاکستان کے جنت نظیر شمالی علاقوں کا حسن دکھانے کے لیے لے جایا گیا تھا اور بہت اہتمام اور عزت واحترام اور حفاظت سے لے جایا گیا تھا لیکن قدرت اور قسمت کے آگے تمام انسانی اقدامات بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس واقعہ کی حادثاتی نوعیت کا سب نے اعتراف کیا لیکن طالبان سے منسوب ایک بیان جو آیا کہ اس ہیلی کاپٹر کو انہوں نے نشانہ بنایا ہے ایک انتہائی بیہودہ اور غیر منطقی اقدام ہے۔ طالبان نے بلاشبہ پاکستان کے امن کو تہہ وبالا کر کے رکھا ہوا ہے بہت سے علاقے اور شہر ایسے ہیں جہاں انہوں نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے ہیں لیکن شمالی علاقوں میں ایسے کوئی شواہد موجود نہیں کہ طالبان وہاں اتنی تعداد اور طاقت کے ساتھ موجود ہیں کہ وہ اتنی سیکیورٹی کو عبور کر سکیں۔ یہ ایک انتہائی اعلیٰ سطحی دورہ تھا جس میں مسلح افواج کے سربراہوں اور وزیراعظم کو بھی پہنچنا تھا اور اسی نوعیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے طالبان نے موقع غنیمت جانا کہ ایک بار پھر اپنی دھاک

بٹھادیں اور دعویٰ کردیا کہ ہیلی کاپٹر انہوں نے مار گرایا ہے بقول خالد خراسانی کے طالبان نے ایک خاص گروپ تشکیل دیا جس نے زمین سے فضامیں مار کرنے والے راکٹ لانچر سے ہیلی کاپٹر پر حملہ کیا اور وہ کچھ دنوں میں ہتھیار دکھا بھی دیں گے۔ جی ہاں کچھ دنوں تک اس ہتھیار کی شکل کا کچھ بناہی لیا جاے گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ تیسرا ہیلی کاپٹر تھا جو یہاں اتر رہا تھا اور اترنے سے پہلے کچھ ہی بلندی پر تھا کہ گر گیا۔ اتنی بلندی کے لیے تو زمین سے زمین پر مار کرنے والا ہتھیار بھی کافی تھا۔ پھر بقول اس نام نہاد ترجمان کے ان کا اصل نشانہ وزیراعظم نواز شریف تھے لیکن وہ بچ گئے۔ تحریک طالبان نے پاکستان میں ظلم و بربریت کی بے شمار وارداتیں کی ہیں کئی مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگاہے، کئی لوگوں کو مسجد میں باجماعت نماز سے خوفزدہ کر دیا گیا، جنازہ جیسے فرض کفایہ پر جانے سے پہلے مسلمان سوچتے ہیں، تعلیمی ادارے مسجدیں بازار کوئی جگہ محفوظ نہیں اور واقعہ ہوتے ہی طالبان اس کی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں ایک نامعلوم مقام سے بیان جاری ہو جاتا ہے اور مجرم کا تعین کردیا جاتا ہے جبکہ کئی واقعات میں غیر ملکی ہاتھ کا ثبوت بھی مل جاتا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ طالبان کو غیر ملکی تعاون حاصل رہتا ہے اورکچھ واقعات کی ذمہ داری طالبان اپنی دہشت بٹھانے کے لیے بھی قبول کر لیتے ہیں اور اس بار بھی ایسا ہی کیا گیا اور ایک ہائی پروفائل کیس کا دعویٰ کر دیا گیا لیکن اس دعوے کو انتہائی بروقت اور انتہائی سختی سے

آئی ایس پی آر، مشیر خارجہ اور ترجمان دفتر خارجہ نے مسترد کر دیا۔ ہیلی کاپٹر میں سوار ستره افراد میں سے بچ جانے والے دوسرے افراد اور عینی شاہدوں کے بیانات نے بھی ثابت کیا کہ طیارہ تکنیکی خرابی کے باعث گرا،اس کی دُم پر لگا پنکھا بند ہو گیا اور یہ آرمی پبلک سکول ملتر کی چھت سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا اسے اسی سکول کے گراؤنڈ میں اترنا تھا یعنی اس کی زمین سے بلندی بیس، تیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ طالبان کے بیان کو اگرچہ کسی معقول شخص نے قبول نہیں کیا لیکن ان کا یہ دعویٰ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ضرور ہے کہ اگر اس سے پہلے ان کے ترجمانوں، بیان بازوں اور خود ساختہ کمانڈروں کے بیانات کو اظہار رائے کی آزادی کے نام پر خواہ مخواہ اور بلا ضرورت اہمیت نہ دی گئی ہوتی تو آج کا دعویٰ بھی سامنے نہ آتا جس سے دو طرح کے مکروہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے ایک ان محفوظ مقامات تک پہنچ کا اعلان کرکے اپنی دہشت کو مزید بڑھانا اور دوسرے دنیا کو یہ پیغام دینا کہ ان کے سفارت کار بھی پاکستان میں محفوظ نہیں ہیں یوں سفارتی تعلقات کو متاثر کرنا۔ جس طرح اس بار اس دعوے کو رد کر دیا گیا اور میڈیا نے بھی اسے زیادہ درخود اعتناء نہ سمجھا ایسا شروع سے کیا جاتا تو شاید آج طالبان کمانڈروں اور عہدہ داروں کی اتنی دھاک نہ بیٹھی ہوتی کہ تمام متاثر علاقوں کے جرائم پیشہ افراد اپنے جرائم چھپانے کے لیے اس کا سہارا لیتے۔

اس حادثے میں جو نقصان ہوا اس کا پورا کرنا تو ناممکن ہے ان خاندانوں کی سطح پر بھی اور قومی سطح پر بھی لیکن اس نے اس بات کا ثبوت بھی فراہم کر دیا ہے کہ کچھ حادثات اتفاقاً بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ طالبان کے ساتھ کچھ اور سازشی دماغ بھی چلتے ہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں اور پاکستان کے لیے بین الاقوامی طور پر مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وقت اس دعوے کے پیچھے دماغوں اور سازشوں کو بھی ثابت کر دے گا اگر اس کی درست اور شفاف تحقیقات کی گئی اور حادثے کے ساتھ ساتھ دعوے اور الزامات کی وجہ ڈھونڈنے کو بھی اہمیت دی گئی۔

کراچی میں وحشت و بربریت کا مظاہرہ

کراچی میں ایک دفعہ پھر خون کی ہولی کھیلی گئی اس بار اسماعیلی برادری پر حملہ کیا گیا اور چند لمحوں میں پنتالیس انسان خون میں نہلا دیئے گئے۔ بس عائشہ منزل جارہی تھی کہ راستے میں صفورا گوٹھ پر چھ حملہ آوروں نے اس پر حملہ کردیا اوراپنی وحشت وبربیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خون کی پیاس بجھائی۔ کراچی بیک وقت وہ خوش قسمت اور بدقسمت شہر ہے جس نے اپنے اندر پاکستان کے ہر علاقے، ہر مذہب، ہر فرقے کے لوگوں کو جگہ دی ہوئی ہے اوران کی چھت اور رزق کا ذریعہ بنا ہوا ہے لیکن دوسری طرف اس کی بدقسمتی کہ یہاں انسان اپنی قدر کھوچکا ہے، کون کون ہے اور کون کس کا دشمن ہے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا بس روز لاشیں گرتی ہیں اور اٹھالی جاتی ہیں۔ نامعلوم افراد اور نامعلوم دشمن مسلسل برسرپیکار ہے اور پاکستان کی اس معاشی شہ رگ پر حملہ آور ہے۔ کبھی یہاں دکانیں بند کردی جاتی ہیں، کبھی فیکٹریاں جلادی جاتی ہیں زندہ انسانوں سمیت اور کبھی تعلیمی ادارے بند کرکے مستقبل سے کھیل لیا جاتا ہے۔ اکثر واقعات کی ذمہ داری کالعدم تنظیموں کی طرف سے قبول کرلی جاتی ہے۔ ایسا ہی اس واقعے کے بارے میں بھی کیا گیا اور جنداللہ اور آئی ایس آئی ایس نے اس کی ذمہ داری قبول کرلی لیکن کیا یہ ذمہ داری واقعی ان پر ڈالی جانی چاہیے یا سانحہ نشتر کی طرح

دشمن اپنی دہشت بٹھا رہا ہے۔ وہاں تو حادثہ تھا یہاں واقعی حملہ تھا اور اگر سمجھ لیا جائے کہ داعش یا جنداللہ نے کیا ہے تو آخر یہ لوگ کس کے اشارے پر ایسا کر رہے ہیں کچھ ماہ سے سکیورٹی کی صورت حال میں انتہائی کم لیکن ہونے والی بہتری ایک دم سے مزید خراب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کراچی میں سبین محمود کا قتل بلوچ قوم پرستوں اور علحدگی پسندوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش تو تھی ہی ساتھ ہی بین الاقوامی طور پر یہ کوشش بھی کی گئی کہ پاک چین معاہدوں پر بھی اثر انداز ہوا جائے کیونکہ یہ واردات چین کے صدر کے دورہ پاکستان کے فوراً بعد کی گئی اور انہیں یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ بلوچستان میں واقع بندرگاہ یعنی گوادر اُن کے لیے ہرگز محفوظ نہیں۔ اس وقت پاکستان اور چین کے درمیان ہونے والے معاہدوں سے جو لوگ خوفزدہ اور فکر مند ہیں اور جو اسے اپنے لیے معاشی خطرہ محسوس کر رہے ہیں ان میں اگر صنعتی ممالک شامل ہیں کہ جنہیں اپنی مصنوعات کی منڈی میں چینی بالادستی بڑھتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور ساتھ ہی وہ پاکستان کی تزویراتی کے ساتھ ساتھ معاشی اہمیت بڑھ جانے کے خوف میں بھی مبتلا ہو رہے ہیں یہ سب کچھ ہے ہی لیکن ان معاہدوں سے بھارت براہ راست متاثر ہو سکتا ہے جو خود کو خطے میں سپر پاور کی حیثیت دے رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان معاہدوں سے اور گوادر کے راستے پاک چائنہ معاشی راہداری سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی اور یہی وجہ ہے کہ اس کی خفیہ ایجنسی راء مزید سرگرم ہو گئی ہے۔ اگر یہ کہا جا رہا ہے کہ اس

واقعے میں راء ملوث ہے تو کچھ غلط نہیں ہے اور حسب معمول ان کالعدم اور ملک دشمن تنظیموں سے یہ کام کروایا گیا ہے کہ اس واقعے کی ذمہ داری قبول کرلیں۔ ان ذمہ داری قبول کرلینے والے بیانات کی حقیقت تو نلتر میں ہیلی کاپٹر کے حادثے نے ہی ظاہر کردی ہے کہ ایک حادثے کی ذمہ داری بھی قبول کرلی گئی جو کہ مکمل طور پر ایک فنی اور تکنیکی خرابی کے باعث پیش آیا۔ لہٰذا اس بار بھی ایسا ہی ایک ذمہ داری قبول کرلینے والا بیان منظر عام پر لایا گیا۔ اس واقعے کو بھی کئی طرح سے استعمال کیا جائے گا پاک چین معاشی راہداری کو نقصان پہنچانے کے ساتھ اسے فرقہ واریت کا رنگ بھی دیا جائے گا بلکہ دیا جارہا ہے۔ اسماعیلی برادری کے لوگ پاکستان کے پرامن شہری ہیں جنھوں نے تعلیم اور صحت کے شعبے میں بالخصوص بہت کام کیا اور ان کو یوں نشانہ بنانا یقیناً پاکستان کے بہتر ہوتے امیج کو خراب کرنا ہے۔ اس حملے کے بعد پاکستان میں اقوام متحدہ کے نمائندے جیکی بیڈ کاک نے کہا کہ ہم اس واقعے سے خوفزدہ ہوگئے ہیں یعنی پہلا اثر آچکا اور دشمن کو پہلی کامیابی مل چکی۔ وزیراعظم کی برہمی بھی بجا ہے کہ اگر دشمن کو ہمارے اندر سے اتنے مخلص کارندے میسر آجاتے ہیں کہ وہ ان کی خاطر اپنے ہموطنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے ہیں تو ہم کیوں اس کا توڑ نہیں کرپا رہے۔ جب تک ہم اپنی کوتاہی کا اعتراف نہیں کریں گے تب تک ہم اپنی خرابیوں اور غیروں کی سازشوں کا تدارک نہیں کرسکیں گے دشمن کی باربار کی کامیابی دراصل ہماری اپنی ناکامی ہے۔ اگر

ہم اپنا دشمن جانتے بھی ہیں تو اس کے اوپر ہماری نظر کیوں نہیں پڑ رہی۔ مانتی ہوں کہ اپنے ہی اندر اپنے ہی بہروپ میں دشمن کی شناخت مشکل ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے تمام وسائل بروئے کار لا کر ہمیں ایسا کرنا ہوگا۔ دوسری طرف یہ ہماری پولیس کی کارکردگی پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہے کچھ دن پہلے سندھ پولیس کے لیے ایک خوبصورت گیت میڈیا پر چلایا جاتا رہا لیکن وقت آنے پر اس کارکردگی کا گراف سب کو پتہ چل گیا۔ بات کارکردگی دکھانے کی ہے بتانے کی نہیں یہ خود نظر آجاتی ہے۔ حادثہ ایک دوبار ہوتا ہے اگر بار بار ہو تو یہ اپنی ناکامی اور کوتاہی ہوتی ہے اور بار بار ان کے لیے توجیہات تلاش کرنا بھی اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمیں بیک وقت کئی دشمنوں کا سامنا ہے اور مقابلہ مشکل بھی ہے اور اس دشمن کے لوگ میڈیا سے لے کر گلی کوچوں میں ہر جگہ موجود بھی ہیں اور ہماری ترقی اور کوئی بھی کامیابی اس کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ہم ہر بار یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ ایسی کاروائیاں مزید برداشت نہیں کی جائیں گی لیکن قوم مجبور ہے اور بار بار انہیں یہ سب برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ حادثوں کے بعد ہماری سیاسی اور عسکری قیادت مل بیٹھتی ہے فیصلے بھی ہوتے ہیں لیکن ان پر عمل کی ضرورت ہے۔ فوج یہ جنگ لڑ رہی ہے اور ہمت اور حوصلے سے لڑ رہی ہے لیکن ہر ادارے کو ان دشمنوں کے خلاف ہر محاذ پر متحد ہو کر لڑنا ہوگا قوم کو بحیثیت قوم اپنے فرائض ادا کرنے ہوں گے اپنے ارد گرد کسی بھی مشکوک شخص اور منصوبہ بندی پر

نظر رکھیں اور اس کی اطلاع متعلقہ اداروں کو ضرور دیں۔ قوم کے ہر فرد کو ایک سپاہی کی طرح ان لوگوں سے لڑنا ہوگا اور ان کے منصوبوں اور ارادوں کی خبر اپنے خفیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو دینا ہوگی تو شاید ہم اپنے ملک کو اس ناسور سے پاک کر سکیں گے۔ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے۔

28 مئی۔۔۔ عالم اسلام کی پہلی ایٹمی قوت۔۔۔شاباش پاکستان

انسان ازل سے اپنی بقاء کی خاطر جدوجہد میں مصروف ہے اور نہ صرف انسان بلکہ وہی جاندار اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے جو دوسرے کے اوپر حاوی ہوسکے اور جب بات قوموں کی آتی ہے توجب تک کوئی قوم اپنے مدمقابل کے مقابلے میں قوت اور طاقت حاصل نہیں کرلیتی اس کی بقاء کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ ہتھیار کی اہمیت یوں تو ہر زمانے میں رہی ہے لیکن آج کی جدید دنیا میں ہر روز نئے، زیادہ طاقتور اور تباہ کن ہتھیاروں نے دنیا کو زیادہ خطرات سے دوچار کررکھا ہے اور جس ملک نے جتنے زیادہ اور مہلک ہتھیار بنالیے ہیں اتنا ہی وہ دوسروں کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ پاکستان کے ہمسایے میں بھارت بھی ایسا ہی ملک ہے جواسلحے کے زور پر علاقے میں برتری قائم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اسی کوشش میں اس نے روایتی اور غیر روایتی ہتھیاروں کے انبار جمع کررکھے ہیں جن کو استعمال کرنے کے وہ بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے ایسے میں اپنی بقاء کی خاطر یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ طاقت میں توازن پیدا کیا جائے۔ بھارت نے ایٹمی تجربات توکامیابی کے ساتھ 1974 میں ہی کرلیے تھے لیکن جب مئی 1998 میں اس نے ایٹمی دھماکے کرکے خود کو ایٹمی ممالک میں شامل کرلیا تو اس کے لہجے میں ایک ایسا تحکم آگیا کہ جیسے خطے کے دوسرے ممالک اس کے زیر نگین آچکے ہوں خاص کر

پاکستان کے بارے میں اس کے خیالات اور لہجہ بدل گیا تھا ایسے میں پاکستان کے لیے فیصلہ کرنا ضروری ہوگیا تھا کہ وہ بھی اپنی ایٹمی قوت کو ظاہر کردے۔ظاہر ہے کہ پاکستان بھارت کے ارادوں سے باخبر تھا اور اس کے ایٹمی پروگرام سے بھی اور یہ بھی جانتا تھا کہ اسے اپنی بقاء کی جنگ ہر صورت لڑنی ہے جس کے لیے اسے پوری دنیا سے تو بالعموم لیکن اپنے پڑوسی سے بالخصوص مقابلہ کرنا ہے لہٰذا اس نے اسی حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے بھارت کے 22 مئی کے ایٹمی دھماکوں کے جواب میں 28 مئی 1998 کو ایٹمی دھماکے کردیے اور یوں دنیا کی ساتویں جبکہ عالم اسلام کی پہلی ایٹمی قوت بن گیا اور ساتھ ہی بھارت کو یہ احساس بھی دلادیا کہ وہ خطے کا سپرپاور نہیں ہے بلکہ پاکستان اس کا مقابلہ کرنے کی سکت اور صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے لیے تیار بھی ہے۔ یہی ایٹمی قوت کا حصول ہی ہے جس نے بھارت کو اپنے ارادوں سے باز رکھا ہوا ہے ورنہ پاکستان اس کے لیے نہ ہی پہلے نہ اب قابل قبول ہے وہ اس کے خلاف مسلسل سازشوں میں مصروف ہے بلکہ اسلحے کے ڈھیر جو وہ لگا رہا ہے وہ اگر دیگر ہمسایوں کے لیے بالعموم ہیں تو پاکستان کے لیے بالخصوص ہیں۔ اگرچہ بھارت کے تعلقات نہ تو سری لنکا سے بہتر ہیں نہ نیپال سے قابل رشک اور چین کے ساتھ تو اس کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے بلکہ سرحدی تنازعات پر سرحدی چھڑپیں بھی معمول ہیں یہاں تک کہ بنگلہ دیش کے ساتھ بھی اس کے تنازعات چلتے رہتے ہیں چاہے پانی پر ہی ہوں حالانکہ یہ وہی ملک ہے جو بھارت کی سازشوں کے نتیجے میں بنا

اور ''را'' نے اپنی اس کامیابی کے بعد بھی سکون کا سانس نہیں لیا اور آج بھی وہ اپنی کاروائیوں میں مصروف ہے اور پاکستان میں طالبان. برانڈ دہشت گردی سے لے کر بلوچستان میں علحدگی پسندی کے نام پر ہونے والی ملک دشمنی اور کراچی میں ہونے والے قتل عام غرض ہر جگہ پر را کی موجودگی ثابت ہو چکی ہے۔ بھارت پاکستان کے خلاف یہ تمام سازشیں پاکستان کے اندر اور باہر ہر جگہ پر کر رہا ہے بلکہ اپنے ملک میں بھی کچھ کاروائیاں کرتا ہے اور الزام پاکستان پر لگا دیتا ہے اور سرحدی خلاف ورزیاں بھی کرتا رہتا ہے لیکن اگر وہ کھل کر پاکستان کے خلاف نہیں آ سکتا تو اس کی واحد وجہ پاکستان کی ایٹمی قوت ہے اور یہی صلاحیت پاکستان کے دفاع کی وہ دیوار ہے جسے عبور کرنے کی خواہش ہر دشمن کے دل میں موجود تو ضرور ہے لیکن وہ اسے عملی شکل دینے سے قاصر ہے کیونکہ اسی قوت سے وہ خوفزدہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گاہے بگاہے وہ ہمارے ایٹمی اثاثوں کے خلاف لایعنی اور بے معنی پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں اور اس کی حفاظت کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار بھی کرتے ہیں جو کہ بالکل بے بنیاد اور صرف ایک سازش ہے۔ لیکن اس سازش اور پروپیگنڈے کے باوجود اللہ کے فضل سے پاکستان کا ایٹمی پروگرام نہ صرف محفوظ بلکہ مکمل طور محفوظ ہے اور پاکستان کے دفاع کی ایسی دیوار ہے جسے انشاء اللہ کوئی دشمن عبور نہیں کر سکتا اور یہ ہماری حفاظت کی ضمانت ہے جس کی خلاف ورزی کرنے کی کسی میں ہمت نہیں۔ اللہ ہمارے ملک کی حفاظت کرے۔

داؤد ابراہیم کا گڑھا مردہ

داؤد ابراہیم کہاں ہے بھارت نہیں جانتا لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ پاکستان میں ہے جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھارت میں ہی ہو لیکن چونکہ پاکستان کے خلاف کوئی نہ کوئی پروپیگنڈا تو کرنا ہے اور شاید موضوعات کی کمی ہو گئی یا پاک چین معاہدوں نے بھارت کو بوکھلا دیا تو داؤد ابراہیم کا گاڑھا مردہ اکھاڑ دیا گیا اور یا اسے شاید اس لیے اکھاڑا گیا کہ کراچی میں ہونے والی دہشت گردی میں بھارت اور را کی مداخلت اور موجودگی کھل کر سامنے آ گئی اور اب تو بھارتی وزیر دفاع منوہر پاریکر نے کہہ ہی دیا کہ بھارت پاکستان میں دہشت گردی کرا رہا ہے یعنی دیدہ دلیری سے اعتراف بھی کر لیا گیا لیکن الزام پھر بھی پاکستان پر لگایا جاتا ہے اور اپنے ہاں خود ہی کروائی جانے والی د ہشت گردی کا ذمہ دار بھی پاکستان کو قرار دیا جاتا ہے اور ایک تاثر داؤد ابراہیم کے بارے میں بھی یہی پایا جاتا ہے۔ ایک بھارتی وزیر ہری بھائی چوہدری نے کہا کہ جب داؤد ابراہیم کا پتہ چل جائے کہ وہ کہاں ہے تو اس کے خلاف ایکشن ہوگا اور جب اس کے اس بیان پر تنازعہ اٹھا کہ اب تک معلوم کیوں نہیں تو امور داخلہ کے وزیر مملکت کرن رجیو نے کہا کہ حکومت کا موقف یہی ہے کہ وہ پاکستان میں ہے اور یہ کہ ہری بھائی چوہدری کے بیان کا غلط مطلب نہ لیا جائے کیونکہ اُس کا یہ

بیان ایک خاص سوال کے جواب میں تھا اس سے پہلے بھارت کے مطابق پچاس مطلوب ترین اشخاص کی فہرست جو اس نے پاکستان کو دی تھی اس میں اس کے بقول داؤد ابراہیم کراچی میں کلفٹن کی ایک گلی میں رہتا ہے اور بھارت اس کے گھر کا نمبر بھی جانتا ہے اگر بھارت یہاں تک پہنچ چکا تھا تو داؤد ابراہیم اس کے ہاتھ سے محفوظ کیسے رہ گیا جبکہ کراچی میں وہ کھلم کھلا دہشت گردی کر رہا ہے اور اس کا وزیر دفاع اس کا اعتراف بھی کر رہا ہے تو اس ایک شخص کو بھی کسی دہشت گرد حملے میں مار دیا جاتا۔ بھارت کو داؤد ابراہیم کی سرگرمیوں پر شک اس لیے بھی ہے کہ اس کی دو بیٹیاں پاکستانیوں سے بیاہی ہوئی ہیں تو کیا ایسی دوسری مثالیں نہیں ہیں لیکن اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کا سہارا لے کر اسے پاکستان کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ داؤد ابراہیم بھارت کا شہری ہے اور اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کا وہ خود ذمہ دار ہے اس کا کاروبار اگر پھیلا ہے جو پیسوں کا حوالہ یا ہنڈی ہے تو اس میں بھارتی ایجنسیوں کا قصور ہے لیکن خود اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کی بجائے وہ الزام پاکستان پر ڈال رہا ہے حالانکہ اسے تو اپنی پولیس اور اپنی ایجنسیوں اور اداروں سے پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ بالفرض اگر وہ پاکستان میں ہی ہے تو عظیم بھارت ''کی عظیم پولیس کے شکنجے میں آیا کیوں نہیں بلکہ اس سے نکلنے میں'' کامیاب کیونکر ہوگیا۔ ممبئی پولیس کے سابق چیف ستیاپال نے کہا کہ داؤد کی حتمی لوکیشن کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اگر 1993 کے ممبئی دھماکوں میں ملزم ٹھہرائے جانے کے بعد اکیس

بائیس سال تک وہ نہیں پکڑا جا سکا تو کیا ایسا تو نہیں کہ بھارت خود ہی اسے پکڑنا نہیں چاہتا تاکہ وقتاً فوقتاً اس کا ایشو اٹھاتا رہے۔ اس نے کچھ الزامات پاکستان پر مستقل لگائے رکھنے کا تہیہ کیا ہوا ہے مثلاً ممبئی حملے اور جب چاہتا ہے انہیں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر بھارت اپنے تمام مجرموں بشمول داؤد ابراہیم کے پکڑنے پر اتنی محنت اور منصوبہ بندی کرتا جتنا وہ پاکستان میں دہشت گردی کروانے پر کرتا ہے تو اب تک وہ پکڑے جا چکے ہوتے لیکن وہ یہ ذمہ داری پاکستان پر ڈال رہا ہے اور وزیر داخلہ راج ناتھ کا کہنا ہے کہ چونکہ انٹرپول داؤد ابراہیم کے ریڈ وارنٹ جاری کرچکا ہے اس لیے پاکستان پر لازم ہے کہ وہ اس کو ڈھونڈے تو کیا اس کو کہیں بھی ڈھونڈنا چاہے وہ بھارت میں ہو پاکستان کا کام ہے اس قسم کی باتیں اور وہ بھی ایک وزیر کے منہ سے اپنی ناکامی کا خود اعتراف ہے۔ پاکستان بھارت کے احکامات کا پابند نہیں ہے اور جب وہ بار بار ان الزامات کو رد کر رہا ہے تو پھر اس کی کونسی ذمہ داری بنتی ہے۔ حال ہی میں نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر عبدالباسط نے یوپی پریس کلب کے زیر اہتمام ایک تقریب میں بھی ان الزامات سے سختی سے انکار کیا۔ جب کہ دوسری طرف بھارت کا وزیر دفاع اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ وہ پاکستان میں دہشت گردی کرا رہا ہے اگرچہ ان کے اس بیان سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ یہ بات پہلے بھی ثابت شدہ تھی لیکن اگر ملزم اقرار جرم کرلے تو وہ مجرم کہلاتا ہے اور جرم کی سزا بھی

ہوتی ہے اور اگر یہ سزا نہ دی جائے تو آج ایک کے خلاف جرم کرنے والا کل سب کے خلاف جرم کرے گا اور پھر اس کی انتہا نہیں آتی وزیر داخلہ چوہدری نثار نے تو کہہ دیا ہے کہ پاکستان اپنی سالمیت اور دفاع کے لیے ہر قدم اٹھائے گا لیکن بین الاقوامی برادری کو بھی بھارت کو لگام ڈالنا ہوگا ورنہ مجرم پڑوس سے نکل کر اگلے محلے تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ بھارت اپنی مکار ذہنیت سے کبھی نہیں نکلا ہے اور اس لیے اس کی یہ باتیں نئی نہیں ہیں لیکن پاک چین معاہدوں نے اسے کبھی کے بھولے ہوئے غم بھی یاد دلا دیئے ہیں جن کے الزامات اس نے پاکستان پر لگانا شروع کر دیے ہیں تاکہ پاکستان کے امن کو جہاں اس نے دہشت گردی سے تباہ کیا ہوا ہے اب اس کی ساکھ کو مزید نقصان اس قسم کے الزامات سے پہنچائے۔ حالانکہ خود وہ یہ کام پاکستان کے خلاف کر رہا ہے اور برہمداغ، حربیار، فضل اللہ اور انہی جیسے دوسرے شرپسند اور انسانوں کے قاتلوں کو مسلسل مدد اور تعاون فراہم کر رہا ہے اور بیانگ دہل کر رہا ہے۔ داؤد ابراہیم بھارت کا اپنا درد سر ہے وہ اس کو جہاں ڈھونڈتا ہے ڈھونڈے ممبئ، کلکتہ، دہلی، مدراس کئی سارے بڑے شہروں میں اس کے انڈر ورلڈ کے کئی سارے ڈان رہتے ہیں وہ بھی انہی کے ساتھ کسی زیر زمین محل میں رہتا ہوگا۔ لہذا اگر بھارت اپنی توانائیاں درست سمت میں لگائے تو شاید کامیاب بھی ہو جائے لیکن اگر بھارتی حکومتیں اپنے عوام کے منہ بند کرنے کے لیے یہی آسان حربہ آزماتی رہیں کہ ان کا ہر مجرم پاکستان میں ہے تو پھر اس کے لوگ

کسی کامیابی کی اُمید نہ رکھیں اور ان ملزموں اور مجرموں کے رحم و کرم پر رہنا اپنا مقدر سمجھ کر صبر کرلیں اور اپنی حکومتوں کو اپنے حیلوں بہانوں سے حکومت کرنے دیں۔

ثقافتی حملہ اور ہماری شناخت

ثقافت اور رسوم و رواج کا مذہب سے بہت گہرا تعلق ہے جو جس مذہب سے تعلق رکھتا ہے وہ خود ہی اپنے رسوم و رواج ایسے وضع کر لیتا ہے جو نہ صرف اس مذہب سے مطابقت رکھتے ہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ ہر ملک اپنی روایات کا امین ہوتا ہے اور پاکستان تو وہ خوش قسمت ملک ہے جس کی انتہائی مضبوط اور خوبصورت روایات موجود ہیں لیکن دوسری طرف ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنے رسوم و رواج کو بہت جلد اور آسانی سے بالائے طاق رکھ کر دوسروں کی فرسودہ، غیر معیاری اور غیر اخلاقی روایات کو اپنا لیتے ہیں اور پھر انہیں جدید دنیا کے ساتھ ہم آہنگی، دنیا سے قدم ملا کر چلنے، جدید و قدیم کا حسین امتزاج، مشرق و مغرب کا ملاپ جیسے پُرفریب نام دے کر قبول کر لیا جاتا ہے اور ہماری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ہمارا دشمن اس محاذ سے بھی ہمارے اوپر حملہ آور ہے۔ جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تو ہم اس پر فوج لگا دیتے ہیں لیکن نظریاتی سرحدوں پر دشمن کو حملہ آور ہوتے دیکھ کر ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اگر آنکھیں کھلی بھی ہوں تو بھی اس کی پرواہ نہیں کی جاتی بلکہ گلوبلائیسزیشن کا ایک ثمرہ اور نشانی قرار دے کر مطمئن ہو لیا جاتا ہے اور آج کل تو ہمارے میڈیا نے اسے اپنا ایک

ضروری سگمنٹ بنا لیا ہے۔ انگریزی فلمیں اور سیریز تو ایک زمانے سے ہمارے ٹی وی پر چلتی تھیں لیکن اِن کے چناؤ اور پھر ریلیز کرنے میں بھی کافی احتیاط کی جاتی تھی لیکن اب ایسے کسی تردد کی زحمت ہی نہیں کی جاتی اور خاص کر بھارت کے ڈرامے اور فلمیں تو یوں دکھائی جاتی ہیں کہ جیسے اُن کے بغیر ہمارے چینلز چل ہی نہ پائیں گے یہ سلسلہ اُن کے اداکاروں اور اداکاراؤں کی خبروں سے لے کر ان کے ڈراموں میں بیہودہ لباسوں اور فلموں میں واہیات مناظر تک جا پہنچتا ہے اور اس دوڑ میں سب کچھ جائز سمجھ لیا گیا ہے حد تو یہ ہے کہ اداکاروں کی سالگرہ کا دن بھی بتایا جاتا ہے بلکہ ایک طرح سے منایا جاتا ہے۔ پہلے ان کے رسوم و رواج ہماری شادیوں بیاہوں میں داخل ہوئے اور اب ان کی زبان ہماری زبان پر اس طرح اثر انداز ہو رہی ہے کہ اس کی شکل جو انگریزی کے بے تحاشا الفاظ نے پہلے ہی بگاڑ دی تھی مزید ہندی کے الفاظ سے بگڑ رہی ہے اب تو ہماری خبروں میں بھی یہ الفاظ استعمال ہو رہے ہیں مثلاً دو ٹیموں کے درمیان مقابلے کو دو ٹیموں کے بیچ ٹاکرا بنا دیا گیا ہے اگرچہ یہ الفاظ اردو میں مستعمل ضرور ہیں لیکن دوسرے انداز سے دوسرے مواقع پر۔ ڈراموں اور فلموں کے تماش بینوں کے خاندان اب پریوار میں بدل چکے ہیں، ہمارے بچے اب زبان، ہندی کارٹون پروگراموں سے سیکھتے ہیں اور وہ یقین کی بجائے وشواس پر زیادہ یقین رکھنے لگے ہیں۔ اگر کوئی اِن ڈراموں اور فلموں سے اجتناب کر بھی لے تو اشتہارات تو ان پر بہر صورت مسلط ہیں اور

کترینہ کیف، کرینہ کپور، ارجن کپور اور معلوم نہیں کون کون سے اداکار اور اداکارائیں ہر وقت کسی بھی بیہودہ لباس اور حرکات کے ساتھ ہمارے گھروں میں موجود رہتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے اپنے ماڈلز کسی زیادہ بہتر صورت میں ہوں وہ بھی پڑوسیوں کو مات دینے کے لیے انہیں جیسے لباس اور حرکات کے ساتھ ٹیلی ویژن کی زینت بنے ہوئے ہوتے ہیں کیوں کہ انہیں اس دوڑ میں آگے جو نکلنا ہے اور یہ حال اب صرف میڈیا تک محدود نہیں رہا بلکہ میڈیا سے باہر کے لوگ بھی اس کلچر میں رنگے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے لیڈر صاحبان بھی ان کی مدح سرائی میں بھول جاتے ہیں کہ ہم نے جب آزادی حاصل کی تھی تو ہم نے اُن کے مذہب کے ساتھ ساتھ اُن کی ثقافت کو بھی رد کیا تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ امن کی آشا جیسے ڈھکوسلہ ناموں کا سہارا لے کر عوام کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کی اچھی باتوں کو اپنا لینے میں کوئی حرج بھی نہیں لیکن اپنی تہذیب و روایات کی قیمت پر ہرگز نہیں کجا کہ اُس سے متصادم اور اس کے الٹ ہوں۔ جہاں اسلام توہمات کو ماننے سے انکار کرتا ہے وہاں ہندو معاشرہ ترتیب ہی انہی توہمات سے پاتا ہے، جہاں اسلام انسانی معاشرے میں برابری کا داعی ہے وہاں اُس معاشرے میں ذات پات کا غیر انسانی اصول رائج ہے اور کم یا زیادہ یہ سب کچھ کسی نہ کسی صورت میں اُن ڈراموں کا حصہ رہتا ہے جو ہمارے چینلز بڑی باقاعدگی سے دکھاتے ہیں اور یوں یہ چیزیں ہماری معاشرتی اقدار پر اثر انداز ہوتی ہیں

لیکن باقی سارے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک ہی اصول ہمارے میڈیا نے اپنایا ہوا ہے اور وہ ہے سرمائے کا حصول جس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتا ہے لیکن یہاں ساری ذمہ داری میڈیا پر ڈال کر معاشرے کے دوسرے طبقوں یا افراد کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔مثلاً ہماری قومی صنعت کو ہی لیجیے جو اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لیے بھارتی اداکاراؤں کا سہارا لیتی ہے۔پاکستان میں بننے والی لان کو بیچنے کے لیے بھارتی اداکارہ کا سہارا لینا کہاں کا انصاف ہے اور پھر عوام کا جوق در جوق اس لان کا خریدنا اور وہ بھی اس اشتہاری گر کی وجہ سے ہمارے افسوسناک قومی رویے کا غماز ہے یوں عوام کو بھی اس جرم سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا جس نے ہماری معاشرتی روایات میں دراڑیں ڈالنے کا عمل شروع کر رکھا ہے۔اس خرابی کی ذمہ داری میں ہماری حکومتیں بھی شریک ہیں جنھوں نے جانے کون سی وجوہات کی بنا پر لیکن اس بات کی کھلی اجازت دے رکھی ہے۔ ہمارے اپنے سنیماؤں میں ان کی فلمیں، ہمارے ٹی وی پر اُن کے ڈرامے اور ہمارے ٹاک شوز میں اُن کے نظریات کی مدح سرائی بلکہ دو قومی نظریئے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش مسلسل جاری ہے۔اس رویے کو روکنے کے لیے ہمیں ہر سطح پر کام کرنا ہے،حکومت اگر یہ اجازت واپس لے لے،ہمارے سنیما اور کیبل کو ان پروگراموں سے روکے، ہمارا میڈیا قومی نظریات کے تقاضوں کو اپنے ذاتی مفادات پر ترجیح دے،ہمارا عام معاشرہ اور اس کے افراد ان کو مسترد کر دے اور ہمارے والدین اپنے قیمتی وقت

میں سے کچھ وقت نکال کر اپنے بچوں کو ان قومی تقاضوں سے متصادم پروگراموں کو دیکھنے سے روکے تو ہم اپنے معاشرے پر اس نظریاتی حملے کو روک سکیں گے اور پھر شاید تاریخ کی جوابدہی میں ہمارے لیے آسانی ہو ورنہ ہم اپنے جرائم پر حال میں تو پردہ ڈال سکیں گے لیکن مستقبل جب یہ پردہ اٹھائے گا تو ہم خدانخواستہ اپنی قومی شناخت سے ہی ہاتھ دھو چکے ہونگے اور بے شناخت قومیں بے وجود بھی ہوتی ہیں اب ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمیں اپنی پہچان چاہیے یا عارضی نفع اور دولت۔

اٹھارہ کروڑلوگوں کا ملک جدید اسلحے سے لیس ایک ایٹمی قوت

بھارت کی پاکستان سے دشمنی پہلے بھی نہ کچھ کم تھی نہ ڈھکی چھپی تھی لیکن جب سفّہ بین الاقوامی دہشت گرد مودی بھارت کا وزیراعظم بنا تو اس میں کچھ اور اضافہ ہوا اور اب جب پاکستان اور چین کے درمیان موجودہ اقتصادی راہداری کا معاہدہ ہوا تو جیسے بھارت کے وزیراعظم سے لے کر اس کے ہر وزیر اور مشیر کا منہ پاکستان کے خلاف کھل گیا بلکہ یوں کہیے کہ اس کے ایوانوں میں جیسے آگ بھڑک اٹھی اور ایک طرف.براہ راست اس معاہدے کے خلاف زہر اُگلنا شروع کردیا تو دوسری طرف جہاں اور جس بیرونی ملک کے دورے پر اس کے وزیراعظم سے لے کر ایک عام وزیر تک گیا نے پاکستان کے بارے میں ہرزہ سرائی کو اپنا معمول بنالیا ہے۔ طاقت کے زعم میں مبتلاء بھارت نے اپنے دہشت گرد ہونے کا اعتراف تک کرلیا اور مان لیا کہ وہ پاکستان میں دہشت گردی کرارہا ہے مودی جو شدت پسند اور جنونی تو پہلے بھی تھا لیکن وزیراعظم بننے کے بعد اس میں تیزی یوں آئی کہ چونکہ اس کے ملک میں اب اس کا حکم چلتا ہے تو اس کے خیال میں یہ حکم پڑوسی ممالک کو بھی ماننا چاہیے اور اسی زعم میں اس نے پاکستان کو دھمکیاں دینی شروع کیں اور اعتراف جرم بھی کرلیا۔ بنگلہ دیش میں مجیب کی بیٹی حسینہ واجد نے جب سابق بھارتی وزیراعظم واجپائی کو ایک ملک یعنی پاکستان کو توڑنے پر تمغے سے نوازا تو اس

موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مودی نے اُگل ہی دیا کہ یہ جرم اُس کے ملک نے کیا ہے اور یہ بھی کہ مکتی باہنی انہی کے لیے کام کرتی رہی۔ کاش عام بنگالی ہی اس سازش کا راز کھلنے پر جاگ جاتا اور کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کو کیا حق تھا کہ وہ دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا شاید ایسا کسی نے سوچا بھی ہو لیکن وہ دیکھ رہے ہیں کہ چوالیس سال پہلے باغیوں کے مقابلے میں حکومت وقت کا ساتھ دینے کے جرم میں محب وطن لوگوں کو آج تختہء دار پر لٹکایا جارہا ہے لہذا وہ خاموش رہے ہوں لیکن آخر کار جب اس جرم کا اعتراف تو کرہی لیا گیا ہے تو یہ بات بھی مان لی جائے کہ بنگالیوں کے قتل عام اور عورتوں کی آبروریزی کے جو الزامات پاکستان پر لگائے جارہے تھے وہ بھی دراصل بھارت کا ہی کارنامہ رہا ہوگا جس میں شیخ حسینہ کا باپ شیخ مجیب بھی ملوث رہا ہوگا اقتدار کے لیے تو سب ہی چلتا ہے لہذا مجیب اور بھارت نے عورتوں کی آبروریزی اور بنگالی اور غیر بنگالی مسلمانوں کے خون سے اگر ہاتھ رنگ لیے تو اقتدار تو مل گیا۔ بات یہاں جاکر رُکی نہیں بلکہ کئی بنگلہ دیشی حکومتوں کے ساتھ مل کر کئی دہائیوں سے پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا رہا۔ اب جب برما کی حکومت نے انسانوں کے ساتھ جانوروں سے بھی برا سلوک کیا کیونکہ وہ مسلمان تھے اور بے شک کہ دنیا میں ایسے مظالم کی مثال نہیں ملتی دنیا اور اقوام متحدہ ان مظالم پر خاموش ہے تو موقع کا فائدہ اٹھا کر بھارت پھر بول پڑا کہ اس نے میانمار کے اندر جاکر حملہ کیا ہے کیوں کہ اس کی فوج

نے بھارت کے کچھ فوجیوں کو بھارتی سرحد کے اندر آکر مارا تھا اور ساتھ ہی اس نے پاکستان کو بھی دھمکی دے ڈالی کہ پڑوسی ممالک اور پاکستان یاد رکھے کہ بھارت سرکار ان کے خلاف بھی ایسی کاروائی کر سکتا ہے۔ پاکستان اور ساری دنیا نے تو جان لیا کہ بھارت دہشت گرد کاروائیاں کرتا ہے اور بیانگ دہل کرتا ہے لیکن بھارت یہ بھول گیا کہ پاکستان میانمار نہیں پاکستان ہے ،اٹھارہ کروڑ لوگوں کا ملک جدید اسلحے سے لیس ایک ایٹمی قوت اگر پاکستان اتنا تر نوالہ ہوتا تو اب تک بھارت اسے چبا چکا ہوتا۔ اسے بنگلہ دیش میں اپنی کامیابی پر ناز ہے تو وہ یاد رکھے مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے ایک ہزار کلومیٹر سے زیادہ دور تھا اور بھارت سے تین طرف سے گھرا ہوا بھی جہاں اس نے نفرت کا بیج بہت پہلے بو لیا تھا لہذا وہ کامیاب ہوگیا لیکن اب کے اعتراف کے بعد تو اس کا مکروہ چہرہ اور بھی واضح ہو گیا ہے پاکستان پہلے بھی یہ بات کہتا رہا اور بار بار کہتا رہا کہ پاکستان میں دہشت گردی میں بھارت ملوث ہے لیکن دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر مختلف اسلامی ممالک پر یلغار کرنے والے امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک بھارت کے اعتراف جرم پر بھی خاموش ہیں کیونکہ یہ جنگ دراصل دہشت گردی نہیں بلکہ اسلامی دنیا کے خلاف ہے۔ یہاں گلہ اسلامی ممالک سے بھی ہے جو باہم دست وگریباں ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور افغانستان، بنگلہ دیش اور حتیٰ کہ ایران بھی اکثر اوقات بھارت کی ہی ایما پر پاکستان کے خلاف صف بستہ ہو جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں تو جب

تک غدار مجیب کی بیٹی مسند اقتدار پر براجمان ہے کسی بہتری کی اُمید نہیں لیکن باقی اسلامی دنیا کو بھارت کی چالوں کو ضرور سمجھنا چاہیے لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ بھارت کو اب تک اسی کی زبان میں پاکستان سے جواب نہیں ملا، چوہدری نثار نے اسے یاد ضرور دلایا کہ پاکستان اور میانمار میں فرق ہے لیکن اگر کوئی سخت جواب وزیراعظم بھی دیتے تو شاید مودی کو بھی پتہ چلتا کہ پاکستان کا وزیراعظم بھی اپنے ملک کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے والے کو سبق سکھا سکتا ہے ہاں آرمی چیف اور کور کمانڈروں نے بھارت کو بھارت کے لہجے میں جواب ضرور دیا ہے لیکن ایسی باتوں کے جواب میں اعلیٰ سطحی فوجی اور سیاسی قیادت یک زبان، یک انداز اور ایک ہی لہجے میں بولے تو قومی یکجہتی کا جو اظہار ہوتا ہے وہ خود بخود دشمن کو پہلے تولنے اور پھر بولنے پر مجبور کرتا ہے۔ اب جبکہ بھارت اعتراف جرم کر چکا ہے پاکستان کو سفارتی سطح پر بھی متحرک ہونے کی ضرورت ہے اور قومی سطح پر بھی قومی یکجہتی پر ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے شواہد اس کے پاس موجود ہیں تو اسے قوم کے سامنے رکھے تاکہ ان دشمنوں سے ہر سطح پر بچاؤ کیا جاسکے اور بھارت سے بھارت کے لہجے میں بات کرنے کی ہمت پیدا کی جائے۔ امن کی خواہش ضرور ہو لیکن یہ بھی یاد رکھا جائے کہ امن طاقت میں توازن سے ہی قائم رہ سکتا ہے اس لیے بھارت کو یاد کروایا جائے کہ جیسے حملے یعنی پاکستان کے اندر گھس آنے کی دھمکی وہ دے رہا ہے ویسا ہی پاکستان بھی کر

سکتا ہے بات ایسے ہی دو چار بار کے حملوں کے بعد کھلی جنگ تک بھی پہنچ سکتی ہے لہذا بین الاقوامی برادری بھی یہ بات یاد رکھے کہ پاکستان اور بھارت دونوں ایٹمی ممالک ہیں لہذا وہ بھی مودی اور اس کے درباریوں کو یہ بات یاد دلادے کہ پاکستان اس سے رقبے میں چھوٹا ضرور ہے لیکن اپنا دفاع کرنا جانتا بھی ہے اور اس کا حق محفوظ بھی رکھتا ہے۔

رویت ہلال۔۔۔ جغرافیائی مسئلہ یا انا

پاکستان میں پھر رمضان ایک ساتھ شروع نہ ہو سکا۔ خیبر پختونخواہ میں بھی کچھ لوگوں نے 18 جون بروز جمعرات اس ماہ مبارک کی ابتدء کی اور کچھ نے 19 جون جمعہ کے روز سے۔ یہ مسئلہ نیا نہیں لیکن آخر ایسا ہے کیوں کچھ تو غلط ہے اور دونوں طرف سے ہے ایک فریق کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہم دینی فرائض میں بھی میں اور تو کا شکار ہیں، عقائد کو تو ہم نے جنگ وجدل اور فرقہ پرستی کی نظر کر ہی دیا ہے ہر ایک اپنے عقیدے کو درست اور دوسرے کو غلط قرار دے رہا ہے جبکہ بنیادی طور یہ عقائد بھی ایک ہی ہیں یعنی ایک خدا ایک رسول ﷺ ایک قرآن ایک کلمہ لیکن پھر بھی اختلافات کو ہوا دے کر ہر فرقے کو الگ مذہب بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو دوسرے کو برداشت کرنے کو تو کیا تیار ہوں ہاں ہر وقت کفر کا ایک فتویٰ تیار رہتا ہے جو دوسرے فرقے پر لاگو کر دیا جاتا ہے۔ یہی حال رویت ہلال کے وقت بھی ہوتا ہے ملک میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی موجود ہے لیکن متوازی رویت ہلال کمیٹی بھی سالہا سال سے اپنا کام کر رہی ہے اور فیصلہ ہمیشہ دونوں کمیٹیوں کا مختلف ہوتا ہے یہ اختلاف دونوں طرف سے موجود رہتا ہے۔ یہاں سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اور سرکاری رویت ہلال کمیٹی اپنی ساکھ اتنی مضبوط بنا لے اور

اپنے فیصلے بے داغ رکھے کہ لوگ اس پر یقین کر سکیں تو انہیں دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہے لیکن معذرت کے ساتھ اگر ان کے فیصلوں میں، جانبداری یا پسند نا پسند اور ایک صوبے کی گواہی کو اہمیت نہ دینے کا رویہ موجود رہے تو ہم خود ہی نفاق کا بیج بو دیتے ہیں دوسری جانب مسجد قاسم علی خان میں بیٹھی ہوئی رویت ہلال کمیٹی جو کہ غیر سرکاری ہے نے اپنا فرض سمجھا ہوا ہے کہ اس نے باقی ملک سے ایک دن پہلے رمضان اور ایک دن پہلے عید کرنی ہے، اسے نہ اس کے لیے حکومت کی طرف دیکھنا ہے نہ عوام کی طرف اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ اگرچہ پشاور کے باسیوں نے اگلے دن چاند کافی دیر تک آسمان پر دیکھنے کا دعویٰ کیا۔ اس بار زیادہ تر گواہیاں دتہ خیل، بنوں اور آس پاس کے علاقوں سے آئیں اور تقریباً ہر سال ایسا ہوتا ہے شہادتیں موصول ہوتی ہیں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ شہادتیں شرعی لحاظ سے درست قرار پائیں اور چاند نظر آنے کا اعلان کر دیا گیا دوسری طرف سے یعنی حکومتی رویت ہلال کمیٹی بھی اعلان کرتی ہے کہ یا تو شہادت موصول ہی نہیں ہوئیں یا اگر ہوئیں بھی تو شرعی لحاظ سے درست ہی نہیں پائیں گئیں اور پشاور سمیت خیبر پختونخواہ کے کچھ لوگ تو روزہ رکھ لیتے ہیں اور کچھ نہیں لیکن سوچتے ضرور رہ جاتے ہیں کہ کون درست تھا اور کون غلط۔

چاند ایک مادی شے ہے اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات بھی مقرر ہیں، صرف اتنا

ہے کہ کبھی یہ انتیس اور کبھی تیس دن کے بعد دوبارہ طلوع ہو جاتا ہے لیکن ہم اس ایک دن پر متفق نہیں ہو پاتے اور مسلمان جو پہلے ہی تفرقے کا شکار ہیں یوں بھی بٹ جاتے ہیں۔ اگر اس معاملے کا جغرافیائی محل وقوع سے تعلق ہے یعنی کہ کچھ علاقوں میں اگر چاند واقعی پہلے نظر آتا ہے تو کیوں ان علاقوں کی گواہیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور چاند دیکھنے کا اعلان نہیں کیا جاتا اور کبھی کبھی تو اعلان میں فرمادیا جاتا ہے کہ کن کن علاقوں سے شہادتیں آئیں اور کن کن کو تسلیم کیا گیا جس سے ظاہر ہے کہ دلوں میں شک اور ناراضگی کا بیج بو دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف مسجد قاسم علی خان میں بیٹھی کمیٹی بھی قومی کمیٹی کے ساتھ کسی قسم کے رابطے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ خود ہی اعلان کر دیا جاتا ہے۔

یہاں حکومت سے بھی یہ سوال ہے کہ کیوں نہ قومی کمیٹی کے ممبران اور قیادت میں کچھ تبدیلی کی جائے اور یہی کچھ مسجد قاسم علی خان میں بھی ہو تو شاید نہیں یقیناً بہتری کے کچھ آثار پیدا ہونگے۔ اگرچہ شرعی لحاظ سے دو روزوں اور دو عیدوں میں کوئی حرج یا قباحت تو نہیں کیوں کہ اس کا تعلق چاند کے نظر آنے یا نہ آنے سے ہے اور پورے عالم اسلام کے وسیع و عریض علاقے میں تو ایسا ہرگز ممکن نہیں لیکن ایک ملک میں تو ایسا ہر صورت ممکن بھی ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر حکومت ایک ہے تو اس حکومت کے تحت ایسے اہم معاملات تو کم

اد کم اتفاق رائے سے طے ہوں تاکہ تہواروں کو قومی یکجہتی کے لیے استعمال کیا جا سکے نہ کہ نا اتفاقی اور جگ ہنسائی کے لیے۔ اس کے لیے پہلے مفتی منیب الرحمان اور شہاب الدین پوپلزئی کو اپنے رویے تبدیل کرنا ہوں گے ورنہ قوم کو بانٹنے میں ان کا کردار ہمیشہ منفی انداز میں یاد کیا جائے گا۔ رمضان محبت، امن اور بھائی چارے کا مہینہ ہے اور اس کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے نہ کہ تقسیم اور نا اتفاقی کے لیے۔ اسے انا کی جنگ نہیں مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیے اور جو اسے اپنے ذاتی مقاصد یا خواہشات کے لیے استعمال کرنا چاہیں انہیں ایسا کرنے سے بہر صورت روکنا ہوگا۔

سیاسی جماعتیں اور گینگ وار فنڈنگ

کراچی میں ٹارگٹ کلرز نے عرصہ دراز سے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے، بھتہ خور دوسروں کی محنت کی کمائی پر اپنا حق سمجھتے ہیں، وار گینگ یوں فعال ہیں جیسے انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں، فرقہ پرستی نے الگ عام آدمی کے تحفظ کو مکمل طور پر غیر یقینی بنادیا ہے۔ یہاں قربانی کی کھالیں، فطرانہ، زکوۃ اور صدقہ بھی بھتہ کی طرح وصول کیا جاتا ہے۔ مذہبی اور غیر مذہبی، سیاسی اور غیر سیاسی ہر طرح کی تنظیمیں اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہی ہیں اور شہر میں اپنا اپنا ہولڈ قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ شہر میں امن وامان کی صورت حال کو قابو کرنے کے لیے سیاسی جماعتیں فوجی آپریشن کا مطالبہ بھی کرتی رہیں اور انہی مسائل اور حالات کی وجہ سے اس آپریشن کی ذمہ داری رینجرز کو دی گئی اور اس کے مثبت اثرات واضح طور پر محسوس بھی کیے گئے اور دیکھے بھی گئے۔ ٹارگٹ کلنگ اگر ختم نہیں ہوئی تو اس میں کمی ضرور نظر آئی۔ جرائم اور بھتہ وصولی میں کمی نوٹ کی گئی لیکن جب انہی اقدامات کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کے مفادات پر زد پڑی تو یہ لوگ بلبلا اٹھے اور اسی آپریشن جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے کے خلاف ہو گئے۔ پہلے ایم کیو ایم نے دل کھول کر رینجرز اور فوج کے خلاف بیان باری کی۔ ڈی جی رینجرز جنرل بلال اکبر نے کھلے الفاظ میں کہا کہ سیاسی

جماعتیں گینگ وارز کو فنڈنگ کر رہی ہے اور کروڑوں روپے اس بدامنی کو پھیلائے رکھنے پر خرچ کر رہی ہیں، انہوں نے ایپکس کمیٹی کو بتایا کہ اس معاملے میں بڑے بڑے سیاسی نام شامل ہیں اور ساتھ ہی سرکاری محکموں کے بارے میں بھی انکشافات کئے جو ان سیاسی پارٹیوں کے مطالبے پر ان کے لیے پیسے کا بندوبست کرتے ہیں ان میں پولیس، تعمیراتی کمپنیاں اور انتظامیہ بھی شامل ہیں۔ ان کے جرائم میں منی لانڈرنگ کے کیسز بھی شامل ہیں جن میں ماڈل آیان علی جیسے واقعات کھل کر سامنے آ چکے ہیں اور شرجیل میمن کے گھر سے دو ارب روپے کا ملنا بھی کسی نہ کسی طرف اشارہ ضرور ہے۔ ساتھ ہی عزیر بلوچ کے بیانات یا الزامات بھی موجود ہیں کہ کیسے وہ پیپلزپارٹی کی اعلیٰ قیادت سے براہ راست احکامات وصول کرکے ٹارگٹ کلنگ کرتا رہا اس نے کھلے الفاظ میں پیپلزپارٹی کے شریک چیئرمین اور سابق صدر آصف علی زرداری کا نام بھی دیگر لوگوں کے ساتھ لیا۔ اب جب ڈی جی رینجرز نے سیاسی جماعتوں کے دہشت گردوں کے ساتھ رابطے کی بات کی تو جناب آصف علی زرداری نے یقیناً اشارہ سمجھ لیا اور اس بات کا جواب کچھ یوں دیا کہ مزید اعترافات کر گئے۔ جو دھمکیاں انہوں نے پاک فوج کو دیں شاید ایسی دھمکیاں دشمن ملک بھارت نے بھی نہ دی ہونگی نہ ہی یوں اینٹ سے اینٹ بجانے کی بات کی ہوگی جیسے اپنے ہی ملک کی ایک بڑی پارٹی کے مرکزی رہنما نے کی۔ اور حیرت اس بات پر ہے کہ ان کھلے الفاظ میں دھمکیوں پر اس وقت تالیاں بجا کر داد دینے والے پیپلزپارٹی کے رہنما بعد میں ان الفاظ

کو مختلف معانی پہنانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے رہے۔ یہ ہماری عجیب و غریب جمہوریت کا ایک اور رخ ہے کہ لیڈر چاہے کچھ کہہ دے بعد میں مصاحب اس سارے گند کو صاف کرنے کی ذمہ داری اٹھالیتے ہیں چلیے یہ توان صاحب، مصاحب کا معاملہ ہوا لیکن کیا ہماری سیاسی جماعتیں اپنے اس کردار کی کوئی توجیہہ پیش کر سکتی ہیں جو وہ قومی معاملات میں ادا کررہی ہیں۔ بظاہر دہشت گردی کی مخالفت کرنے والے اندر سے ایسے ہی لوگوں کی مدد کررہے ہیں۔ یہ جماعتیں اگر شہروں میں ہونے والی قتل وغارت گری میں ملوث ہوں تو قوم ان سے کس بہتری کی اُمید رکھے اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے ہی اداروں اور قومی سلامتی کے ذمہ داروں کو یوں سرعام بے عزت کرے۔ جناب زرداری لگتا ہے جوش خطابت میں بھول گئے کہ وہ اپنی ہی فوج کو للکار رہے ہیں بجائے اس کے کہ وہ اپنے اعمال پر غور کرتے وہ اپنے ہی سپہ سالار کو للکار رہے تھے کہ تم نے تین سال رہنا ہے ہمیشہ ہم نے ہی رہنا ہے تو وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہمیشہ اللہ کی ذات نے رہنا ہے باقی ہر شے کو فنا ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما اسی نظریے سے مال دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں کہ انہیں ہمیشہ دنیا میں رہنا ہے الہذا ساری دنیا کی دولت سمیٹ لینی چاہیے۔ فوج کو دھمکیاں دیتے ہوئے انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ اس فوج اور سپہ سالار کو دھمکیاں دے رہے ہیں جو اس وقت بھی جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں سرحدوں پر اور ملک کے اندر ہر جگہ دشمن سے برسرپیکار ہے۔ جرنیلوں کا محاسبہ کرنے پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن اس محاسبے کو ذاتی

حد تک رکھنا چاہیے فوج کو بے عزت کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ سیاستدانوں کو یہ بھی اعتراض ہے کہ رینجرز اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہی ہے اس کا مینڈیٹ سیاستدانوں پر ہاتھ ڈالنا نہیں تو بات یہ ہے کہ اس کو یہ مینڈیٹ حکومت نے دیا ہے کہ دہشت گردی کو روکے اور اس کے لیے ظاہر ہے اسے دہشت گردوں کے مدد گاروں اور سہولت کاروں کو ختم کرنا ہوگا چاہے وہ سیاستدان ہو، مذہبی رہنما ہو یا عام آدمی ہو۔ رینجرز نے سنی تحریک کے کچھ کارندوں کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہے اور اگر یہ کاروائیاں بلا تفریق جاری رہیں جو کہ رہنی چاہیے تو یہ قومی اُمید کی جا سکتی ہے کہ کراچی اپنی اصلی حالت پر بہت جلد واپس آ جائے گا لیکن اس میں عام آدمی سے بھی یہ توقع کی جانی چاہیے بلکہ اسے یہ اپنا فرض سمجھنا چاہیے کہ وہ ہر ایسی قوت کو رد کرے جو ملک کے خلاف ہو۔ ہمارے سیاستدان بھی اگر اپنی وفاداری ملک، قوم اور عوام کے ساتھ رکھے تو اگر انہیں عوام میں کل پذیرائی ملی تھی تو آج بھی وہ عزت مند ہونگے۔ چونکہ آج کے دور میں میڈیا نے اندھے اعتماد کو تقریباً نا ممکن بنا دیا ہے لہذا ہمارے لیڈر صاحبان یہ سوچنا چھوڑ دیں کہ ان کے ایسے کاموں پر پردہ پڑا رہے گا اور عوام ان کے ہاتھوں بیوقوف بنتے رہیں گے ایسا اب بھی کسی نہ کسی حد تک ہوگا لیکن کبھی صولت مرزا اور عزیر بلوچ بول بھی لیا کرتے ہیں۔ جناب زرداری کے لیے ایک مشورہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ آپ بہت ذہین ہیں بازی پلٹنے کا گر بھی جانتے ہیں لیکن اگر آپ یہی ذہانت ملک کی

بہتری اور یہاں امن وامان قائم کرنے کے لیے لگادیں تو قوم آپ کو یقیناً ایسی عزت
دے گی جو سوئس بینکوں میں پڑے آپ کے سرمایے سے زیادہ قیمتی ہوگا۔

زرداری صاحب۔۔۔آپ ذہین ہیں لیکن

کراچی میں ٹارگٹ کلرز نے عرصہ دراز سے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے، بھتہ خور دوسروں کی محنت کی کمائی پر اپنا حق سمجھتے ہیں، وار گینگ یوں فعال ہیں جیسے انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں، فرقہ پرستی نے الگ عام آدمی کے تحفظ کو مکمل طور پر غیر یقینی بنادیا ہے۔ یہاں قربانی کی کھالیں، فطرانہ، زکوۃ اور صدقہ بھی بھتہ کی طرح وصول کیا جاتا ہے۔ مذہبی اور غیر مذہبی، سیاسی اور غیر سیاسی ہر طرح کی تنظیمیں اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہی ہیں اور شہر میں اپنا اپنا ہولڈ قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ شہر میں امن وامان کی صورت حال کو قابو کرنے کے لیے سیاسی جماعتیں فوجی آپریشن کا مطالبہ بھی کرتی رہیں اور انہی مسائل اور حالات کی وجہ سے اس آپریشن کی ذمہ داری رینجرز کو دی گئی اور اس کے مثبت اثرات واضح طور پر محسوس بھی کیے گئے اور دیکھے بھی گئے۔ ٹارگٹ کلنگ اگر ختم نہیں ہوئی تو اس میں کمی ضرور نظر آئی۔ جرائم اور بھتہ وصولی میں کمی نوٹ کی گئی لیکن جب انہی اقدامات کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کے مفادات پر زد پڑی تو یہ لوگ بلبلا اٹھے اور اسی آپریشن جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے کے خلاف ہو گئے۔ پہلے ایم کیوایم نے دل کھول کر رینجرز اور فوج کے خلاف بیان بازی کی۔ ڈی جی رینجرز جنرل بلال اکبر نے کھلے الفاظ میں کہا کہ سیاسی

جماعتیں گینگ وارز کو فنڈنگ کر رہی ہے اور کروڑوں روپے اس بدامنی کو پھیلائے رکھنے پر خرچ کر رہی ہیں، انہوں نے ایپکس کمیٹی کو بتایا کہ اس معاملے میں بڑے بڑے سیاسی نام شامل ہیں اور ساتھ ہی سرکاری محکموں کے بارے میں بھی انکشافات کئے جو ان سیاسی پارٹیوں کے مطالبے پر ان کے لیے پیسے کا بندوبست کرتے ہیں ان میں پولیس، تعمیراتی کمپنیاں اور انتظامیہ بھی شامل ہیں۔ ان کے جرائم میں منی لانڈرنگ کے کیسز بھی شامل ہیں جن میں ماڈل آیان علی جیسے واقعات کھل کر سامنے آ چکے ہیں اور شرجیل میمن کے گھر سے دو ارب روپے کا ملنا بھی کسی نہ کسی طرف اشارہ ضرور ہے۔ ساتھ ہی عزیر بلوچ کے بیانات یا الزامات بھی موجود ہیں کہ کیسے وہ پیپلزپارٹی کی اعلیٰ قیادت سے براہ راست احکامات وصول کرکے ٹارگٹ کلنگ کرتا رہا اس نے کھلے الفاظ میں پیپلزپارٹی کے شریک چیئرمین اور سابق صدر آصف علی زرداری کا نام بھی دیگر لوگوں کے ساتھ لیا۔ اب جب ڈی جی رینجرز نے سیاسی جماعتوں کے دہشت گردوں کے ساتھ رابطے کی بات کی تو جناب آصف علی زرداری نے یقیناً اشارہ سمجھ لیا اور اس بات کا جواب کچھ یوں دیا کہ مزید اعترافات کر گئے۔ جو دھمکیاں انہوں نے پاک فوج کو دیں شاید ایسی دھمکیاں دشمن ملک بھارت نے بھی نہ دی ہونگی نہ ہی یوں اینٹ سے اینٹ بجانے کی بات کی ہوگی جیسے اپنے ہی ملک کی ایک بڑی پارٹی کے مرکزی رہنما نے کی۔ اور حیرت اس بات پر ہے کہ ان کھلے الفاظ میں دھمکیوں پر اس وقت تالیاں بجا کر داد دینے والے پیپلزپارٹی کے رہنما بعد میں ان الفاظ

کو مختلف معانی پہنانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے رہے۔ یہ ہماری عجیب وغریب جمہوریت کا ایک اور رخ ہے کہ لیڈر چاہے کچھ کہہ دے بعد میں مصاحب اس سارے گند کو صاف کرنے کی ذمہ داری اٹھالیتے ہیں چلیے یہ توان صاحب، مصاحب کا معاملہ ہوا لیکن کیا ہماری سیاسی جماعتیں اپنے اس کردار کی کوئی توجیہہ پیش کرسکتی ہیں جو وہ قومی معاملات میں ادا کررہی ہیں۔ بظاہر دہشت گردی کی مخالفت کرنے والے اندر سے ایسے ہی لوگوں کی مدد کررہے ہیں۔ یہ جماعتیں اگر شہروں میں ہونے والی قتل وغارت گری میں ملوث ہوں تو قوم ان سے کس بہتری کی اُمید رکھے اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے ہی اداروں اور قومی سلامتی کے ذمہ داروں کو یوں سرعام بے عزت کرے۔ جناب زرداری لگتا ہے جوش خطابت میں بھول گئے کہ وہ اپنی ہی فوج کو للکار رہے ہیں بجائے اس کے کہ وہ اپنے اعمال پر غور کرتے وہ اپنے ہی سپہ سالار کو للکار رہے تھے کہ تم نے تین سال رہنا ہے ہمیشہ ہم نے ہی رہنا ہے تو وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہمیشہ اللہ کی ذات نے رہنا ہے باقی ہر شے کو فنا ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما اسی نظریے سے مال دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں کہ انہیں ہمیشہ دنیا میں رہنا ہے لہذا ساری دنیا کی دولت سمیٹ لینی چاہیے۔ فوج کو دھمکیاں دیتے ہوئے انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ اس فوج اور سپہ سالار کو دھمکیاں دے رہے ہیں جو اس وقت بھی جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں سرحدوں پر اور ملک کے اندر ہر جگہ دشمن سے برسرپیکار ہے۔ جرنیلوں کا محاسبہ کرنے پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن اس محاسبے کو ذاتی

حد تک رکھنا چاہیے فوج کو بے عزت کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ سیاستدانوں کو یہ بھی اعتراض ہے کہ رینجرز اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہی ہے اس کا مینڈیٹ سیاستدانوں پر ہاتھ ڈالنا نہیں تو بات یہ ہے کہ اس کو یہ مینڈیٹ حکومت نے دیا ہے کہ دہشت گردی کو روکے اور اس کے لیے ظاہر ہے اسے دہشت گردوں کے مددگاروں اور سہولت کاروں کو ختم کرنا ہوگا چاہے وہ سیاستدان ہو، مذہبی رہنما ہو یا عام آدمی ہو۔ رینجرز نے سنی تحریک کے کچھ کارندوں کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہے اور اگر یہ کاروائیاں بلا تفریق جاری رہیں جو کہ رہنی چاہیے تو یہ قومی اُمید کی جا سکتی ہے کہ کراچی اپنی اصلی حالت پر بہت جلد واپس آجائے گا لیکن اس میں عام آدمی سے بھی یہ توقع کی جانی چاہیے بلکہ اسے یہ اپنا فرض سمجھنا چاہیے کہ وہ ہر ایسی قوت کو رد کرے جو ملک کے خلاف ہو۔ ہمارے سیاستدان بھی اگر اپنی وفاداری ملک، قوم اور عوام کے ساتھ رکھے تو اگر انہیں عوام میں کل پذیرائی ملی تھی تو آج بھی وہ عزت مند ہونگے۔ چونکہ آج کے دور میں میڈیا نے اندھے اعتماد کو تقریباً نا ممکن بنا دیا ہے لہٰذا ہمارے لیڈر صاحبان یہ سوچنا چھوڑ دیں کہ ان کے ایسے کاموں پر پردہ پڑا رہے گا اور عوام ان کے ہاتھوں بیوقوف بنتے رہیں گے ایسا اب بھی کسی نہ کسی حد تک ہوگا لیکن کبھی صولت مرزا اور عزیر بلوچ بول بھی لیا کرتے ہیں۔ جناب زرداری کے لیے ایک مشورہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ آپ بہت ذہین ہیں بازی پلٹنے کا گر بھی جانتے ہیں لیکن اگر آپ یہی ذہانت ملک کی

بہتری اور یہاں امن وامان قائم کرنے کے لیے لگادیں تو قوم آپ کو یقیناً ایسی عزت دے گی جو سوئس بینکوں میں پڑے آپ کے سرمایے سے زیادہ قیمتی ہوگا۔

بھارت۔۔۔پاکستان کے خلاف ہر سازش کا حصہ

پاکستان بھارت کے پاکستان میں مداخلت کے ثبوت اقوام متحدہ میں پیش کرے گا۔ یہ فیصلہ وزیراعظم اور آرمی چیف کی ملاقات میں کیا گیا ہے ویسے بھارت خود یہ ثبوت پچھلے کچھ عرصے سے پیش کر رہا ہے۔ اس کے وزیر مشیر سے لے کر وزیراعظم تک سب بیانگ دہل اپنی تخریبی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ پاکستان میں تخریبی کاروائیاں کر رہے ہیں کوئی اس کی توجیہہ بھی پیش کر رہا ہے کہ ایسا بدلہ لینے کے لیے کیا جارہا ہے۔ مودی خود جاکر بنگلہ دیش میں اعلان کر رہا ہے اور شیخ مجیب کی بیٹی کو خوش کرنے کے لیے کہہ رہا ہے کہ وہ خود بھی بنگلہ دیش بنانے کی تحریک میں شامل تھا یعنی اس کی دہشت گردانہ ذہنیت اس وقت سے مکمل طور پر سرگرم ہے۔ شیخ حسینہ جو بنگلہ دیش کی وزیراعظم کم اور شیخ مجیب کی بیٹی کا کردار زیادہ ادا کر رہی ہے کو اس واقعے کے بعد یقین آجانا چاہیے تھا کہ اس کے لوگوں کو کس نے مارا تھا پاک آرمی نے یا مکتی باہنی نے۔ پاکستان کے خلاف بنگلہ دیش میں قتل عام کا زیادہ چرچا بھی بھارت کا ہی کارنامہ تھا جو اس نے اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا تھا۔ اب بھی اپنے ہاں ہونے والے جرئم اور دہشت گردی کے واقعات کی ذمہ داری وہ پاکستان پر ڈال کر اپنے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے جبکہ کئی واقعات ''را'' اور بھارت سرکار خود کرتی

ہے اور الزام پاکستان کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ اگرچہ خود بھارت کے اندر سے بھی ایسی آوازیں اٹھ جاتی ہیں جو اس کے جھوٹ کا پول کھول دیتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں سرکاری وکیل روہنی سیلیان نے بیان دیا کہ نیشنل انوسٹیگیشن ایجنسی اور سُپریم کورٹ اس پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ وہ مالے گاؤں میں 2008 میں ہونے والے دھماکوں کے مجرموں کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرے یاد رہے کہ ان دھماکوں میں چھ افراد ہلاک اور ایک سو ایک زخمی ہوئے تھے۔ یہ دھماکے ایک مسجد کے باہر کیے گئے تھے اور اس میں ابھینو بھارتیہ نامی ہندو تنظیم کے لوگ شامل تھے۔ جہاں جس ملک میں خود حکومت اور عدالت دہشت گردوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کے لیے وکلا کو مجبور کرے وہاں انصاف کیا ہوگا اور کیسا ہوگا اور جو ملک اپنے ملک کے مسلمانوں کے خلاف یوں برسرپیکار ہے وہ پاکستان کے خلاف کیسے خاموش بیٹھ سکتا ہے اور اس کا یہ کردار کوئی دو چار سال کی بات نہیں بلکہ پاکستان بنتے ہی بھارت سرکار نے یہ اقدامات شروع کر دیے تھے۔ اس نے قائداعظم کی زندگی میں ہی کشمیر پر حملہ کیا اپریل 1948 میں پہلی بار پاکستان کا پانی روکا اور اب تک یہ طرز عمل جاری ہے یعنی جب بھارت چاہتا ہے پانی روک لیتا ہے اور کبھی سیلابی ریلا چھوڑ دیتا ہے جو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا لیتا ہے اور وہ یہ آبی دہشت گردی بڑی دیدہ دلیری سے کرتا ہے۔ فاٹا میں جاری بلکہ فاٹا کے راستے پورے ملک میں جاری دہشتگردی میں بھارت کا مکمل ہاتھ ہے یہاں سے وہ افغانستان کے راستے بھی کھلی مداخلت کرتا

ہے اور پاک افغان تعلقات بھی بحال نہیں ہونے دیتا۔ جناب اشرف غنی ایک بار اگر پاکستان سے محبت اور دوستی کا اظہار کرتے ہیں تو اگلی بار پھر اپنے ملک میں جاری بدامنی کے لیے پاکستان کو ذمہ دار قرار دینے لگتے ہیں یعنی جب بھارت کا داؤ چل گیا سو چل گیا۔ ایران کے ساتھ بھی دوستی صرف ایک مقصد سے کی جاتی ہے کہ پاکستان میں شمالاً جنوباً شرقاً غرباً ہر طرف سے مداخلت کے لیے راستہ مہیا رہے ورنہ جس مودی اور اس کے، پیش روؤں کو پاکستان صرف اس لیے قبول نہیں کہ وہ اسلامی ملک ہے اسے کیسے کسی اور اسلامی ملک سے محبت ہو سکتی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ افغانستان کے راستے فاٹا اور بلوچستان اور ایران کے راستے بلوچستان اتنا نزدیک پڑے کہ اسے تخریب کاری اور دہشت گردی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے جبکہ پنجاب اور سندھ کی تو ویسے ہی سرحدیں بھارت سے جڑی ہوئی ہیں لہذا مشکلات بہت کم ہیں۔ بجائے اس کے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھارت کے رویے میں تنگ نظری کی بجائے وسعت پیدا ہوتی وہاں تعصب اور دشمنی بڑھ رہی ہے اور جو خوش فہم پاکستانی خود کو یہ تسلی دیتے ہیں کہ بھارت میں حکومت پاکستان کے خلاف ہوگی عام لوگ نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ اس کے وزیراعظم کو عام لوگوں نے منتخب کیا ہے جو آج فخریہ اعلان کر رہا ہے کہ اس نے ہمارا ملک توڑنے میں کردار ادا کیا۔ اس ملک کی سوچ میں تبدیلی نہیں آئی وہ آج بھی پاکستان کے وجود کا دشمن ہے۔ پاکستان کے خلاف ہر سازش کا حصہ ہونا اس کی قومی پالیسی میں شامل ہے اسی کام کے لیے اس نے ''را'' بنائی جس

کی اولین اور سب سے بڑی ذمہ داری پاکستان کے خلاف کام کرنا ہے۔

بھارت کے رویے اور پاکستان کے خلاف اس کی خفیہ اور اعلانیہ کاروائیوں پر عالمی رائے عامہ کو مطلع کرنا بھی انتہائی ضروری ہے لیکن سفارتی سطح پر ان کا توڑ اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور اس کے لیے پاکستان کے سفارتی مشینوں کو زیادہ تندہی سے کام کرنا ہوگا اور بھارت کو یہ احساس بھی زیادہ موثر طریقہ سے کرانا ہوگا کہ پاکستان نہ تو تر نوالہ ہے اور نہ کمزور ملک، اس کا دفاع اتنا مضبوط ہے کہ یہ کسی بھی قسم کی مہم جوئی کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہے لہذا اس کو پاکستان کے خلاف بیانات سے لے کر اس کے خلاف کاروائی تک کو سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے ورنہ نتائج دونوں ملکوں ، خطے اور پوری دنیا کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں جس کی مکمل ذمہ داری بھارت پر ہو گی۔

نریندر مودی کا دورہ اسرائیل اس سال جولائی میں

اسرائیل اور بھارت دو ایسے ممالک جن کی داخلہ سے لے کر خارجہ اور دفاع تک ہر پالیسی کا صرف ایک ہی مرکزی نکتہ ہے اور وہ ہے اسلام اور مسلمان کی مخالفت بلکہ ان کی تباہی جس کے لیے وہ ہر قسم کی تیاری مکمل رکھتے ہیں اور درپردہ اور بظاہر ہر قسم کی سازشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندو ذہنیت جو بغل میں چھری منہ میں رام رام کی پالیسی پر رکھتی ہے نے اب تک تو فلسطین کے ساتھ یکجہتی کا ڈھنڈورا پیٹا لیکن آخر ان کے صبر نے جواب دے دیا اور وہ کھل کر اسرائیل کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ گذشتہ 23 سال سے ان دونوں ممالک میں سفارتی تعلقات استوار ہیں اور دفاعی امور میں ایک دوسرے کے دست راست ہیں۔ بھارت اسرائیلی اسلحے کا سب سے بڑا خریدار ہے۔
بھارت اور سرائیل کے تعلقات کچھ نئے نہیں بھارت نے اسرائیل کو اس کے قیام کے بعد جلد ہی یعنی 1950 میں تسلیم کر لیا تھا اور ان کے خفیہ تعلقات قائم تھے تاہم سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد بھارت نے ایک دم سے پینترا بدلا اور امریکہ بہادر کو خوش کرنے کے لیے اسرائیل سے اپنے تعلقات ظاہر بھی کر دیئے اور بڑھائے بھی اور نوے کی دہائی میں کئی مشترکہ منصوبے بھی بنائے گئے۔
1992 میں بھارت اور اسرائیل کے مابین دو سو ملین کی تجارت ہوئی اور 2013 میں بھارت اسرائیل کا

دسواں بڑا شریک تجارت ملک تھا اور یہ تعاون وتجارت دفاعی ساز وسامان سے لے بائیو ٹیکنالوجی تک میں تھا۔ اسی دوران دونوں مذاہب نے بھی تعاون بڑھانے پر اتفاق کیا اور اسرائیل کے چیف ربی نے بھارت کا دورہ کیا۔ اس وقت بھی یہ سب کچھ جاری ہے لیکن حالیہ سالوں میں اس میں کئی گنا اضافہ ہوا اور ایسا ہونا قدرتی امر تھا کیونکہ اب تو بھارت میں حکومت بھی ایک انتہا پسند ہندو جماعت کے مزید انتہا پسند وزیر اعظم مودی کی ہے لہذا حالات مزید خراب ہوتے جارہے ہیں دوسری طرف اسرائیل ہے جس نے کبھی انسانی حقوق کی پاسداری کا سوچا بھی نہیں سب سے پہلے تو اس نے ایک قوم کو اس کی زمین سے بے دخل کیا اور خود اس کا مالک بن بیٹھا فلسطینیوں کو کیمپوں میں رہنے پر مجبور کردیا اور اب وہاں بھی جب چاہتا ہے ان بے خانماں لوگوں پر زمین تنگ کردیتا ہے یہی حال بھارت کشمیر میں کشمیریوں کا کرتا ہے اور پھر ان کو اجتماعی قبروں میں دفنا دیتا ہے اور انہی تمام ظالمانہ منصوبوں کو مزید موثر بنانے کے لیے دونوں وزرائے اعظم نے 2014 میں ستمبر میں نیویارک کے ہوٹل میں ملاقات کی اور اسرائیل کے

وزیر اعظم نیتھن یاہو نے بھارت کے وزیر اعظم نریندرا مودی کو اپنے ملک کے دورے پر مدعو کرلیا اور اس دعوت کو انتہائی خوشی کے ساتھ قبول کرلیا گیا اس موقع پر یاہو نے دونوں قدیم تہذیبوں کا حوالہ دے کر کہا کہ ہم مل کر کام کریں گے اور جواباً مودی نے بھارت میں تاریخی یہودی کمیونٹی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بھارت وہ واحد ملک ہے جہاں کبھی یہودیوں کو تکلیف نہیں دی گئی۔ وہ بھارت

جہاں اس کے دوسرے بڑے مذہب کے لوگ یعنی مسلمان جو کروڑوں میں ہیں حتیٰ کہ مسلمان ممالک سے بھی بڑی آبادی ہیں کا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن ایک اندازے کے مطابق صرف پانچ ہزار یہودی اہم ہیں اور ان کو کبھی تکلیف نہیں ہونے دی گئی تو اس کا کچھ مقصد تو ہوگا اور اسی مقصد کو یہود و ہنود کا گٹھ جوڑ کہتے ہیں اور اسی کو مضبوط کرنے کے لیے مودی کا دورہ اسرائیل اس سال جولائی یعنی اسی ماہ طے پایا ہے اور وہ پہلا بھارتی وزیراعظم ہے جو اسرائیل کا دورہ کرے گا۔ بھارت کے فلسطین کے بارے میں رویے میں خلوص پہلے بھی نہیں تھا لیکن اب تو اس نے کھل کر اس کا اظہار کرنا شروع کردیا ہے بھارت کی سشما سوراج نے کہا کہ اس دورے سے پہلے ایک وفد اسرائیل جائے گا جو اہم امور طے کرے گا یہ وفد اپنا کام کر چکا اس لیے اب کسی بھی دن مودی یہ تاریخ رقم کرے گا کہ پہلا بھارتی وزیر اعظم ہے جو اسرائیل کا دورہ کرے گا۔ سوراج کے مطابق وہ خود بھی اسرائیل جائے گی اور فلسطینی دہشت گردوں سے بھی ملاقات کرے گی یعنی اب فلسطینیوں کا نام بھی دہشت گرد رکھ دیا گیا بھارت نے غزہ کے مسلمانوں پر مظالم کے خلاف اقوام متحدہ میں قرارداد پر خاموشی اختیار کی۔ مودی کے اس دورے سے نہ صرف بھارت کے مسلمان پریشان ہیں بلکہ وہ عرب جو بھارت کی دوستی کا دم بھرتے تھے وہ بھی بھارت کے اس رویے سے پریشان ہیں اور ان پر ہندو ذہنیت کی اصلیت کھل رہی ہے۔ حتیٰ کہ فلسطینی بھی یہ سمجھتے تھے کہ بھارت ان کا ایک بہت بڑا حامی ہے اسی حامی نے اب ان کے دشمن سے نہ صرف گٹھ

جوڑ شروع کرلیا ہے بلکہ یقیناان کے خلاف منصوبہ بندی میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوگا۔ عرب ممالک کو بھی اس بات کا ادراک ہو جانا چاہیے کہ بھارت جیسے ممالک اسلام کے دشمن ہیں اور اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں میں شریک ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس کے منصوبہ ساز بھی ہیں اور مالی معاون بھی۔ بھارت امریکہ اسرائیل تکون کی جب بات کی جاتی ہے تو ہمارے کچھ چغادری صحافی اور تجزیہ کار ایسی بات کرنے والوں کا تمسخرہ اڑاتے ہیں۔ کیا یہ کھلم کھلا اسلام دشمنی کا ثبوت نہیں کہ دو ایسے ممالک آپس میں مل جائیں جن کا بنیادی نظریہ اسلام کے خلاف یکجا ہو کر کام کرنا ہو۔ مودی اور یاہو جب مل کر بیٹھیں گے تو عام سی فہم والا شخص بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کی ملاقات اور گفتگو کا محور فلسطین اور کشمیر ہوں گے اور اس معاملے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، چاہے بند کمروں سے نکل کر وہ کچھ بھی بیان دیں۔ اس وقت میں مسلمان ممالک اور عام مسلمانوں کی بھی آنکھیں کھل جانی چاہیے کہ ان کا دشمن مزید متحد اور متحرک ہوگیا ہے لہٰذا انہیں بھی ان کا توڑ کرنے کے لیے متحرک ہو جانا چاہیے اور کیا اس دورے کے بعد ایران کو مودی کو اپنے ملک میں خوش آمدید کہنا چاہیے کیونکہ پروگرام کے مطابق اُسے ایران بھی جانا ہے ہو سکتا ہے وہاں پاکستان کے مقابلے میں مزید کچھ منصوبوں پر بھارت کے ساتھ تعاون کے معاہدوں پر دستخط ہوں۔

بھارت اسرائیل امریکہ گناہ گار ہوں گے لیکن کیا زیادہ گناہ گار مسلمان نہیں جو اپنے دشمنوں اور ان کے منصوبوں سے باخبر ہو کر بھی ان کے خلاف متحد نہیں ہو سکتے کیا یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ نہیں اور کیا یہ ہمارے کسی گناہ کی سزا نہیں۔

کشمیر کی آزادی پاکستان کا فرض

اکیسویں صدی میں بھی کچھ قومیں غلام ہیں غیر ان کے ملک، ان کی زمین، ان کی قسمت کے مالک بنے بیٹھے ہیں کشمیر انہی بد قسمت خطوں میں سے ہے جہاں کے لوگ سالہاسال سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اپنی جانیں دے رہے ہیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اُن کے آقا تو بدل رہے ہیں آزادی کی منزل ابھی نہیں آئی۔ گلاب سنگھ سے انگریز، انگریز سے ڈوگرہ، ڈوگرہ سے بھارت کی متعصب ہندو حکومت کی غلامی، جو بظاہر خود کو سیکولر قرار دیتی ہے لیکن دراصل وہ کسی غیر ہندو کو بھارت کی زمین پر رہنے کا حق بھی نہیں دیتی اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حکومت کس جماعت کی ہے، کانگریس ہو بی جے پی یا کوئی اور اس کا صرف ایک منشور ہوتا ہے اور وہ ہے مسلمانوں کے خلاف کام کرنا اور بھارت کی زمین اس پر تنگ کرنا اور کشمیر کے مسلمان اس کے مظالم کا سب سے زیادہ شکار رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، وہ آزادی جو ہر انسان کی طرح اس کا بنیادی حق ہے اور دنیا کا ہر قانون انسان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے اور ہر ملک اپنے آئین میں اسے لکھتا ہے۔ بھارت کے آئین میں بھی آزادی کے حق میں بات کی گئی ہو گی۔ وہ خود کو پوری دنیا کے سامنے سیکولر کہہ کر متعارف کراتا ہے اور خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ بھی کہتا ہے لیکن اس کی یہ جمہوریت پسندی کشمیر

تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتی ہے۔وہ ایک ہی مذہب کی پیروی کرنے والے پاکستان کے مختلف صوبوں کو تو علٰحدگی پسندی پر اکساتا ہے اور بلوچستان میں علاقائی تعصب کے نام پر شرپسندوں کو مالی بلکہ عسکری معاونت بھی دیتا ہے لیکن وہ کشمیر جس کی ثقافت اور طور طریقے تو ایک طرف، سب سے بڑھ کر اس کا مذہب بھارت کی اکثریت کے مذہب سے مختلف ہے اسے وہ آزادی کا حق نہیں دیتا ہے۔بھارت کی دوسری ریاستوں میں بھی مسلمان بستے ہیں اور بہت بڑی تعداد میں بستے ہیں لیکن وہ بکھرے ہوئے اور چاورں طرف سے ہندو آبادی میں گھرے ہوئے ہیں لیکن کشمیر کے ساتھ معاملہ مختلف ہے یہ پاکستان سے جڑا ہوا خالصتا مسلم اکثریتی خطہ ہے جو اگرچہ ہندو، سکھوں اور انگریزوں کی غلامی میں جکڑا رہا ہے، ان کی نسلیں تو بدل جاتی ہیں پرانی سے نئی ہو جاتی ہیں لیکن ان کا آزادی حاصل کرنے کا جذبہ ماند نہیں پڑتا اور اسی ذوق وشوق سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں ۔ پچھلے پچیس تیس سال میں تقریبا ایک لاکھ کشمیری اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں، عورتیں بیوہ، بچے یتیم ہو چکے ہیں۔ کشمیری ہر سال اپنے کئی دن مناتے ہیں اور اس جذبے کو زندہ کرتے ہیں جو ان کے آبا واجداد میں تھا۔

تیرہ جولائی 1931 کو عبد القدیر نامی نوجوان جس نے ڈوگر راج کے خلاف جدوجہد کی تھی پر چلنے والے مقدمے کے دوران جب ایک نوجوان نے ظہر کی اذان دینی

شروع کی تو اُسے گولی مار دی گئی اس اذان کو مکمل کرنے کے لئے نوجوان کوشش کرتے رہے ہر ایک گولی کھا کر شہید ہوتا رہا لیکن اذان دیتا رہا اور جب اذان مکمل ہوئی تو اکیس نوجوان جام شہادت نوش کر چکے تھے لیکن آفرین ہے کہ کوئی پیچھے نہ ہٹا ۔کشمیری آج بھی اس دن کو یوم شہدا کے طور پر مناتے ہیں اور شہادت سے پیچھے نہیں ہٹتے ۔ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہوا تو اُنیس جولائی کو پھر یہ کشمیری ڈٹ گئے اور پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا اور آج تک اس عہد پر قائم ہیں وہ ہر سال اس عہد کی تجدید کرتے ہیں اور بھارت سرکار ان کی ثابت قدمی کے آگے بے بس ہو جاتی ہے۔ پچھلے دو چار ماہ میں کئی بار کشمیریوں نے اپنے جلسے جلوسوں میں پاکستان کا پرچم لہرا کر اپنے اس عزم کا ثبوت دیا آسیہ اندرابی کے جلسے میں پاکستانی پرچم لہرانے کے بعد سے یہ عمل شبیر شاہ، سید علی گیلانی، مسرت عالم اور کئی دوسرے رہنماؤں کے جلسوں میں دہرایا جاچکا ہے۔ کشمیری 1947 کی طرح اب بھی پر عزم ہیں کہ وہ پاکستان کا حصہ ہیں اور اس میں شامل ہو کر رہیں گے۔ اقوام متحدہ اپنی قرار دادوں پر اگر عمل نہ بھی کرا سکے تو کشمیری ہمت ہارنے والے نہیں لیکن اس وقت ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ کشمیریوں کو ہر فورم پر سپورٹ کیا جائے۔ پاکستان بھارت کے ساتھ بات چیت اور تجارت ضرور کرے دوستی کی کوشش بھی کرے لیکن اس سب کچھ سے یہ پہلے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی بات کرے اور اپنے موقف پر ثابت قدم رہے۔ کشمیر صرف ایک خطہ نہیں ہماری شہ رگ ہے ہماری رگوں میں دریاؤں کی صورت

دوڑنے والا خون یہی سے ہو کر آتا ہے۔۔بر صغیر کے نقشے پر نظر ڈالیں تو کشمیر پاکستان کا قدرتی حصہ ہے اور اپنے جسم کے حصے کی حفاظت ہمارا فرض ہے، اسی لئے ہمیں ہر محاذ پر اپنی یہ جنگ لڑنی ہو گی اور کشمیریوں کی اخلاقی مدد جاری رکھنی ہو گی ہمیں سفارتی محاذ پر بھی سرگرمی دکھانی ہو گی اور کشمیریوں کو یہ احساس دنیا ہو گا کہ پاکستان انکے ساتھ ہے اور خود کو ان کے بغیر نامکمل سمجھتا ہے۔ کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا احساس بھی دنیا کو دلانا ہو گا اور کشمیر کی جدوجہد آزادی کو کسی منطقی انجام تک پہنچانا ہو گا۔آزادی کشمیریوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسری قوم کا لہذا بھارت اس پر اپنا قبضہ ختم کرے اور کشمیریوں کی خواہش کے مطابق انہیں پاکستان کے ساتھ شامل کر دیا جائے جس کے لئے وہ 1947 سے مصروف جدوجہد ہیں اپنی جانیں دے رہے ہیں لیکن اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔

ایم کیو ایم۔۔۔ کارکن توجہ دیں

پاکستان میں سیاسی لیڈر اکثر سیاسی گرما گرمی پیدا کر دیتے ہیں اگر یہ گرما گرمی مثبت ہو توتب تو درست ہے یعنی سیاسی جلسے جلوس، عوام تک اپنا سیاسی منشور پہنچانا یا اپنے ترقیاتی پروگراموں سے عوام کو باخبر رکھنا۔ایک دوسرے پر تنقید کرنا بھی سیاست کا حصہ ہے اور تنقید اگر تعمیری ہو تو یہ سیاست کا مقصد اور سیاست دانوں کا قبلہ درست رکھتا ہے حکومت کو کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ جو چاہے کرے بلکہ اپوزیشن کی تنقید اور مخالفت کے ڈر سے حکومت سوچ سمجھ کر چلتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی مخالفتوں میں اداروں کو بھی لپیٹ دیا جاتا ہے اور یہی رویہ اکثر اوقات ایم کیو ایم کی طرف سے دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ زیادہ تر اس کے قائد الطاف حسین ملک کی مخالفت میں سب سے آگے نظر آتے ہیں یعنی جب ان کی پارٹی یا ان کی ذات کے خلاف بات کی جائے اور چاہے وہ کسی کی طرف سے ہو وہ بات گھما پھرا کر فوج اور اُس سے آگے بڑھ کر پاکستان کے خلاف لے جاتے ہیں اور اخلاق سے گری ہوئی زبان استعمال کرتے ہوئے ایسی دھمکیاں دینے پر اُتر آتے ہیں جو عموماً دشمن ممالک ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور ان کے ان بیانات سے پیدا شدہ خراب صورت حال کو قابو کرنے کے لیے ان کی پارٹی کے لوگ مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں، صفائیاں پیش ہوتی ہیں، جملوں کے معنی و

مطالب تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے اور سیاق و سباق سے کاٹ کر جملے پیش کرنے کے الزامات لگائے جاتے ہیں غرض ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ شدید ردِ عمل دیکھ کر معافی تلافی کا دور بھی چلا دیا جاتا ہے لیکن چند دن گزرے نہیں ہوتے کہ مزید سخت بیان دے دیا جاتا ہے اور رابطہ کمیٹی اور دیگر پھر صفائیاں پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن آخر کب تک یہ لوگ اپنے قائدیا قائدین کے جرائم کی توجیہات پیش کریں گے۔ ایم کیو ایم کی اکثریت اردو بولنے والوں پر مشتمل ہے اور اسے بنانے والوں نے عرصہء دراز تک اسے قومی جماعت بننے سے ایک طرح روکے رکھا بلکہ اب بھی دوسری زبانیں بولنے والوں کی تعداد صرف چند ہی ہے جو عمومی خیال کے مطابق صرف اس لیے شامل کئے گئے ہیں کہ یہ کہا جائے کہ اس جماعت کو ایک خاص زبان تک محدود نہیں رکھا گیا ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہے بلکہ جب بھی یہ لوگ بات کرتے ہیں اردو بولنے والوں کی ہی کرتے ہیں۔اردو بولنے والے پاکستان کو سرمایہ ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر ہندوستان کے بڑے شہروں سے آئے ہوئے پڑھے لکھے اور ہنر مند لوگ تھے جنھوں نے نوزائیدہ مملکت خدادادِ پاکستان کی تعمیر میں اہم کردار ترین ادا کیااور یہ لوگ بھی یہ بات جانتے ہیں کہ انہیں بھی بے پناہ عزت دی گئی ۔سب کچھ ٹھیک تھا نہ تقسیم تھی نا تعصب تھا کہ اچانک ایک سیاسی جماعت بنا دی گئی اور اس کی آڑ میں کچھ مخصوص لوگوں نے تفریق پیدا کر دی گئی اور کراچی کے عوام خوف یا کسی اور وجہ

سے ان کے زیرِ دام آتے رہیں لیکن اب لگتا یہی ہے کہ اُنھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس خوف کی چادر کو اُتار پھینکیں کیونکہ ان کو اپنے جن سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا یا تو ان کی برداشت سے باہر ہے یا انہیں سمجھ آ گئی ہے کہ انہیں جس نسلی سحر میں گرفتار کیا گیا تھا اور یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا اس نے انہیں فائدہ نہیں نقصان ہی پہنچایا ہے اور انہیں باقی پوری قوم سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایم کیو ایم کے اندر بھی اب ہیجان نظر آ رہا ہے، اس کے کئی کارکنوں سے کئی خطرناک اور مجرمانہ کام کروائے گئے لیکن جب وہ پکڑے گئے تو ان سے اعلانِ لاتعلقی کر دیا گیا اور ایسا ان ملزموں اور مجرموں کے اقبالی بیانات کے بعد کیا گیا۔ جب کہ پہلے انہیں لوگوں کو فخر سے اپنا اثاثہ اور سرمایہ بنا کر پیش کیا جاتا تھا، ان کے ساتھ فخر سے تصویریں بنائی جاتی تھیں، ان پر لگنے والے الزامات کو رد کیا جاتا تھا اور ان کی تمام کاروائیوں کو چھپا لیا جاتا تھا ان سے رابطوں اور تعلق پر فخر کیا جاتا تھا لیکن بقول صولت مرزا استعمال کے بعد ایم کیو ایم نے انہیں ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا۔ اب جبکہ ایم کیوایم کے خوف میں کمی آئی ہے تو کارکن خود اس سے لاتعلقی ظاہر کرنے کی سوچ رہے ہیں اور ایسا اُس کی قیادت کی وجہ سے ہے۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ملک جس میں تمام سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ہو، ایک جماعت خود کو ملک کی تیسری بڑی جماعت کہتی ہو، صوبائی اور وفاقی سطح پر تقریباً ہر حکومت کا حصہ ہو اُس کا قائد ملک سے فرار ہو کر

دوسرے ملک میں بیٹھ جائے اور وہاں کی شہریت بھی اختیار کرلے۔ کارکن اس بات پر بھی سوچ رہے ہیں کہ ان کی ڈور ایک برطانوی شہری کے ہاتھ میں کیوں ہے جو جب چاہتا ہے ان کا شہر بند کرا دیتا ہے جب چاہتا ہے کھول دیتا ہے اور جب چاہتا ہے چلا دیتا ہے اور ان تمام حالات سے اُس کی ذات مکمل طور پر محفوظ رہتی ہے اور متاثر عوام ہی ہوتے ہیں اور پکڑ دھکڑ بھی اُن کی ہوتی ہے۔ وہ جنھوں نے اپنے لیڈر پر جان دینے کا وعدہ نبھاتے ہوئے کسی بھی جرم سے دریغ نہیں کیا ہوتا لیڈر علی الاعلان پوری دنیا کے سامنے ان کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اگرچہ خبریں تو یہ ہیں کہ الطاف حسین کی ایم کیو ایم ٹوٹ کر تین دھڑوں میں تقسیم ہو رہی ہے، ایک اپنی جگہ پر رہے گی، ایک حقیقی کے ساتھ مل جائے گی اور ایک پرویز مشرف کی طرف چلی جائے گی لیکن ایک تاثر یہ بھی ہے کہ بہت سارے لوگ ایم کیو ایم سے مکمل علحدگی اختیار کر رہے ہیں اور وہ کسی عام قومی سیاسی جماعت میں شامل ہو جائیں گے اور ایک عام پاکستانی کی طرح بغیر کسی ڈر اور خوف کے اپنا ووٹ استعمال کر سکیں گے۔ پاکستان ہم سب کی ایک ایسی پہچان ہے جس پر سب کا حق برابر ہیں۔ اردو ہم سب کی قومی زبان ہے، مادری زبانیں گھر اور علاقوں میں اور ہم زبانوں سے بولنے کے لیے ہیں جن کو ختم نہیں کیا جا سکتا لیکن قومی زبان ہمارے رابطے اور محبت بڑھانے کی زبان ہے۔ کیا خود کو مہاجر کہنے والوں کا یہ اعزاز کم ہے کہ اُن کی زبان کو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان تصور کرکے پاکستان کی قومی زبان بنایا گیا اور اس سے

خیبر سے کراچی تک ہر ایک نے پیار کیا اور اسے اپنی زبان تسلیم کیا۔ ہجرت اور مہاجر اسلام کی شان ہے لیکن اگر ان الفاظ کو تعصب اُبھارنے لیے استعمال کیا جائے تو ایسا کر نے والوں کو وہی سزا دی جائے جو معاشرے میں منافرت پھیلانے والے دوسرے افراد کی ہے۔ اب کراچی کے عوام کو اس بات کا احساس ہو رہا ہے اور اگر ایم کیو ایم بھی اپنا وجود برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اُسے اپنی پالیسیوں میں تبدیلی لانا ہو گی اور جیسے پاکستان کے کسی بھی شہر میں کوئی بھی رہ سکتا ہے اسی طرح کراچی میں کسی کو بھی آزادی سے رہنے کا حق ہے۔ سب سے بڑھ کر اُسے اپنی اُس قیادت کو تبدیل کرنا ہو گا جو اُس کے لیے مسائل کا باعث ہے۔ الطاف حسین جس طرح فوج اور ملک کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں اور جو زبان استعمال کرتے ہیں اور پھر جس طرح رابطہ کمیٹی اُن کے بیانات کا دفاع کرتی ہے عوام کو دونوں کا نوٹس لینا چاہیے اور ضروری نہیں کہ وہ حقیقی یا مشرف کے پاس جائے پورا پاکستان اور اس کی سیاست ان کے لیے ہر پاکستانی کی طرح کھلی پڑی ہے اور ہر ایک کو اپنی راہوں کے تعین کا مکمل اختیار حاصل ہے اور اس کے استعمال کا بھی۔ جیسے پشاور، کوئٹہ، لاہور، مسلم لیگ، پی پی پی یا پی ٹی آئی سب کے ہیں اگر اسی طرح ایم کیو ایم کو بھی سب کی جماعت بنانا ہے تو اس کے کارکنوں کو اس کے منشور اور خاص کر قیادت کی طرف توجہ دینا ہو گی۔

صفائی نصف ایمان ہے

صفائی نصف ایمان ہے اور ایمان مسلمان کی شان ہے ہم سب خود کو بہت باعمل مسلمان بلکہ مومن گردانتے ہیں دوسرے کے ایمان پر تنقید اور شک کرتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانکنے کی غلطی بھی نہیں کرتے۔ بلاشبہ اسلام اپنے پانچ ستونوں پر کھڑا ہے لیکن نبی پاک ﷺ نے کچھ دوسری چیزوں کو ایمان کا لازمی جز قرار دیا ہے جن میں سے صفائی ایک بہت بڑا جز ہے بلکہ اسے نصف ایمان قرار دیا۔ اب ذرا اسی تناظر میں اپنا جائزہ لیجئے کہ ہم صفائی کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے شہر ہمارے ایمان کے اس جز کی کمزوری کی بہت بڑی دلیل ہیں۔ ہماری حکومتیں انتخابات سے پہلے اس مسئلے کو بھی اپنی انتخابی مہم کا کسی نہ کسی حد تک حصہ بناتی ہیں،، برسر اقتدار آکر ایسے پروگراموں کا آغاز بھی کر دیتی ہیں اور بڑے جوش و خروش سے کرتی ہیں چاہے عوام کو دکھانے کے لیے ہی سہی لیکن کچھ عرصہ بعد نہ صرف جوش ختم ہو جاتا ہے بلکہ پروگرام بھی عملاً ختم ہو جاتا ہے اگرچہ کاغذوں میں زندہ رہتا ہے کیونکہ منسلک لوگوں کو تنخواہیں دی جارہی ہوتی ہیں۔ یہاں معاملہ کچھ ایسا ہے کہ حکومت اور عوام دونوں اس مسئلے کے ذمہ دار ہیں ہمارے عوام اگر گنڈیری چوس کر یا مالٹا، کینو کھا کر اس کا چھلکا سڑک پر نہ پھینک دیں تو لگتا ہے وہ پھل کے ذائقے سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتے

پشاور سے لے کر کراچی تک یہی رویہ ہر جگہ نظر آئے گا۔ ہماری سبزی منڈیاں غیر صحتمند ماحول کی زندہ ترین مثال ہیں ،گلے سڑے پھل سبزیاں یوں آسانی سے سر عام پھینک دی جاتی ہیں جیسے کوڑے کے ڈھیر پر پھینکی جا رہی ہوں۔ سکھر میں میڈیکل سٹور والے کو دواؤں کے خالی ڈبے ڈھڑا دھڑ سڑک پر پھینکتے ہوئے دیکھ کر جب ایسا نہ کرنے کی درخواست کی تو جواب ملا بی بی کیا ایک میرے نہ کرنے سے یہ گند جو پڑا ہوا ہے ختم ہو جائے گا۔ کچھ ایسے ہی جوابات راولپنڈی کے مصریال روڈ پر یا لاہور کی انار کلی یا پشاور کے قصہ خوانی بازار میں بھی ملے۔ کوئٹہ کے سریاب روڈ کا حال بھی مختلف نہیں ہوتا۔ یہ تو دکانداروں کا رویہ ہے عام آدمی اپنے گھر کے باہر کی نالی پختہ کرکے صاف کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا چاہے گھر کے اندر سنگ مرمر کا سیلاب آیا ہوا ہو۔ ہمارے رویے اوپر سے نیچے تک ایک ہی جیسے ہیں اگر عوام کا رویہ یہ ہے تو حکومت بھی کسی ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیتی اگر گند پھینکنے والوں کو جرمانہ کی سزا دی جائے اُن سے پوچھ گچھ کی جائے تو حالات میں بہتری آسکتی ہے۔ ہمارے بازار بجلی کی بے تحاشا تاروں سے مزین نظر آتے ہیں اور خطرناک حد تک نیچے یہ تاریں خدانخواستہ کسی بھی وقت کسی بھی حادثے کا باعث بن سکتی ہیں۔ یہ تاریں آپس میں کچھ ایسے الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ شارٹ سرکٹ کی صورت میں آپ ہرگز معلوم نہیں کر سکتے کہ مسئلہ کس لائن پر کہاں موجود ہے اور یوں معلوم کرتے کرتے اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ ایک بہت بڑا حادثہ رونما ہو جاتا ہے۔ جانیں چلی

جاتی ہیں دکانیں جل جاتی ہیں لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے اور بعد میں صرف انکوائریاں ہی ہوتی رہتی ہیں۔

صحت کے مسائل کا تعلق تو صفائی کے ساتھ یوں جڑا ہوا ہے جیسے جسم اور روح کا اور ہماری صفائی کی مخدوش صورت حال ہی کی وجہ سے ہمارے ملک میں آلودہ پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں انتہائی عام ہیں ۔یہی حال فضائی اور زمینی آلودگی کا ہے کارخانوں سے نکلنے والے دھوئیں نے تو ہوا میں سانس لینا دوبھر کر دیا ہے اور پھیپھڑوں اور سانس کی بیماریوں میں مسلسل اضافے کا باعث ہے۔ زمینی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے اس زمین کو جس کو کہنے کو ہم اپنی ماں کہتے ہیں لیکن عملاً ایسا ہے کہ ہم نے کبھی اس کی صفائی اپنا فرض نہیں سمجھا۔ لگانے کو تو میونسپل کمیٹیوں ، کارپوریشنوں اور حکومتوں نے جگہ جگہ کوڑے دان بھی لگا دیئے ہیں لیکن ہونے کو ہوتا یہ ہے کہ اِن کے آس پاس ہی کوڑا پھینک کر سمجھ لیا جاتا ہے کہ کوڑے کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہے یہ اور بات ہے کہ راہگیر اپنی سانس روک کر اس جگہ سے گزرتے ہیں۔ ہماری نالیاں رنگارنگ شاپنگ بیگوں کی وجہ سے بند پڑی رہتی ہیں اور گندا پانی ابل ابل کر آس پاس پھیل رہا ہوتا ہے ، ہمارے پارک جوس کے ڈبوں اور چپس کے ریپرز سے اٹے پڑے ہوتے ہیں اور ہماری بے حسی کی داستان سنا رہے ہوتے ہیں، ہمارے تالاب ، ڈیم اور دوسری آبی سیرگاہوں میں سطح آب پر تیرتے ہوئے کھانے پینے کی اشیاء کے

ڈبے اور ریپرز ہمارے کمزور ایمان کا ثبوت دے رہے ہوتے ہیں۔ ہم کسی ایک دن ٹی وی کیمروں کے لیے کسی سکول کے بچوں سے کسی پارک کی صفائی تو کروا دیتے ہیں لیکن اس کو معمول بنانے پر بالکل آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم خود کو عظیم مسلمان کہنے والے اگر اس نصف ایمان کو اپنا نصف ایمان نہ سہی کچھ نہ کچھ ترجیح بنا لیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے شہروں اور اپنی گزرگاہوں کو صاف ستھرا رکھیں تو نہ صرف اپنے ماحول کو بچا سکیں گے، بیماریوں سے بچ سکیں گے بلکہ اپنے ایمان کو بچا کر اپنے رب اور رسول ﷺ کو خوش کر سکیں گے۔ اسلام صرف نماز، روزہ کا نام نہیں یہ ایک مکمل ضابطہء حیات ہے یہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی اہتمام کرتا ہے لہذا اس پر مکمل طور پر عمل کرنا ضروری ہے تاکہ ہم جب خود کو مومن اور مسلمان کہیں تو ہمارے دل میں کہیں کوئی چور موجود نہ ہو۔

اللہ کرے کہ حالات میں آنے والی بہتری مزید بہتری کی طرف رواں رہے۔پاکستان عرصہ دراز سے جن سازشوں کی زد میں ہے اُس نے پورے معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ دہشت گردی اور شدت پسندی کی عفریت نے معاشرے کے امن کو نگل لیا ہے۔یہ دہشت گردی کئی اطراف سے ملک کے امن کو تہس نہس کیے ہوئے ہے کسی شہر میں یہ فرقہ واریت بن کر سامنے آتا ہے اور کسی میں بم دھماکہ، کہیں بھتہ کہیں ٹارگٹ کلنگ ، غرض کبھی ایک وجہ کبھی دوسری وجہ لیکن نتیجہ مشترک اور وہ ہے ملک ، قوم اور عوام کی مصیبت۔اب اگر اس ساری صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی جڑوں میں ایک ہی مائنڈ سیٹ بیٹھا ہوا ہے جو معاشرے کی تقسیم چاہتا ہے ہر بنیاد پر، اور بد قسمتی سے اس کے لیے سب سے زیادہ مذہب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ روس افغان جنگ کے بعد مختلف ممالک سے آنے والے مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے مجاہدین پاکستان کے قبائلی علاقوں میں رہ گئے اور ان کو اپنے اپنے ملک سے اپنا اپنا نظریہ پھیلانے کے لیے مدد بھی ملتی رہی اور یوں جب معمولی اختلافات کے ساتھ ہی سہی مختلف نظریات آپس میں ٹکرانے لگے اور ساتھ یہ بھی ہوا کہ اپنے مسلک کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے ہر حد تک جایا گیا۔خوارج کے نظریے نے عملاً دوبارہ جنم لیاان کے علاوہ ہر دوسرا گناہ گار

اور پھر واجب القتل ہو گیا اور یوں ملک ان مصائب و مسائل کا شکار ہو گیا جس نے ہمیں ترقی کے حوالے سے کئی صدیوں پیچھے دھکیل دیا اور انسانی جانوں کا جو ضیاع ہوا اس کا مداوا تو صدیوں میں بھی ممکن نہیں۔ اگرچہ دہشت گردی ختم کرنے کے لیے فوج نے جو آپریشن کیے اُن سے حالات میں تو کچھ بہتری آئی اور خاص کر ضرب عضب سے قوم کو یہ توقع ہے کہ دہشت گردی کی کمر توڑ دی جائے گی لیکن اس مسئلے کا مستقل حل وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اُس کے لیے ہمیں معاشرے میں اُن عناصر کی بیخ کنی کرنی ہو گی جنھوں نے نہ صرف معاشرے بلکہ اُس سے آگے بڑھ کر اسلام کو تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں کسی شک و شبے کی بات ہی نہیں کہ ان عناصر کو بیرونی امداد حاصل ہے اور ان چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل کو الگ الگ اسلام کی بنیاد بنا کر پیش کرنے کے لیے جن جن طاقتوں نے خزانوں کے منہ کھولے ہوئے ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن میں پھر یہی کہوں گی اُن کے آلہ کار ہمارے اپنے لوگ ہیں جو کبھی ایک مولوی کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور کبھی دوسرے کے جو ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے یوں جاری کرتے ہیں جیسے یہ گڑیا گڈے کا کھیل ہو۔ جبکہ در حقیقت اگر دیکھا جائے تو یہ لوگ اقتدار کی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ کبھی ملک میں رائج طرز حکومت کو غلط کہتے ہیں اور کبھی آئین کو۔ نعرہ خلافت کا لگاتے ہیں لیکن اگر ان لوگوں سے خلافت کے بارے میں پوچھا جائے تو خلافت تو دور کی بات یہ اسلام کے بنیادی احکامات بھی نہیں جانتے سوائے اپنی مرضی کے چند ایک کے اور ان کو

بھی یہ توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا بنا لیتے ہیں۔ یہ گروپس خود بھی ایک بنیادی نظریے پر متفق نہیں اور ہر ایک نے مختلف پہلوؤں کو اپنے ایجنڈے پر رکھا ہوا ہے اور اسی کو لے کر انسانوں بلکہ مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں اور یہی ایک نکتہ ان کے منشور میں متفقہ ہے کہ ان کے علاوہ ہر انسان گناہ گار ہے لہٰذا اس کا قتل جائز ہے جبکہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ایک انسان کے قاتل کو پوری انسانیت کا قاتل قرار دیتا ہے اور ایک زندگی بچانے کو پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف سمجھاہے۔ یہ لوگ جو اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کو جہاد کا نام دیتے ہیں ان سے اگر جہاد کے بارے میں پوچھا جائے تو یہ اُس کی تفصیلات سے بے خبر ہیں۔ حکومت کی ان کے خلاف کاروائیاں بھی اپنی جگہ اور فوج کے ان کے خلاف آپریشن بھی ان کی کمر توڑنے کے لیے بے حد ضروری ہیں لیکن ان شر پسندوں کے خلاف عام لوگوں کی کوشش بھی انتہائی اہم ہیں کیونکہ عوام بھی ان کے کہے میں آکر ایک دوسرے کے خلاف بڑی آسانی سے کفر کے فتوے جاری کرتے رہتے ہیں اور یوں محلے اور شہروں کی بنیاد پر حالات خراب کر دیے جاتے ہیں۔ اس پہلو پر بھی اگر کام کیا جائے اور ان شر پسندوں کو یکسر مسترد کر دیا جائے تو پھر کسی دشمن طاقت کو یہ ہمت ہی نہ ہو کہ ہمارے ملک میں اپنی کاروائیاں جاری رکھ سکے۔ دراصل کچھ ایسے حالات حکومت کی طرف سے بھی مہیا کر دیے جاتے ہیں کہ ان لوگوں کا کام آسان ہو جاتا ہے اس وقت بھی بے روزگار نوجوانوں کی ایک بہت بڑی کھیپ ان کو میسر ہے جو ذہنی تناؤ کے باعث ان کے لیے ایک

انتہائی آسان ہدف ہیں اور یہ بڑی آسانی سے ان کی خدمات خرید لیتے ہیں اور خودکش بمبار بنا کر استعمال کر لیتے ہیں۔ اس عفریت کے مقابلے میں حکومت اور فوج کے ساتھ ساتھ عام آدمی کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ ایسے لوگوں کے معاشرے میں موجود چند ہمدردوں کی سوچ کو بھی بدلنا ہوگا۔ اسلام امن کا مذہب ہے اور باہمی احترام کا سبق دیتا ہے اور ہر ایک کو اپنے عقیدے کے ساتھ زندہ رہنے کا حق بھی لیکن یہ گمراہ لوگ عملاً اسلام کے ان اصولوں کا انکار کرتے ہیں یہ کہتے تو خود کو مسلمان ہیں لیکن اسلام کو بدنام کرنے میں جتنا ان کا ہاتھ ہے اتنا غیر مسلموں کا بھی نہیں کیونکہ اُن کی دشمنی کے بارے میں تو سب جانتے ہیں اس لیے اُن کا توڑ کرنا آسان ہے لیکن یہ تو اسلام کا نام لے کر اسلام کو بدنام کرتے ہیں اور اپنے اسلام دشمن آقاؤں کا ایجنڈا پورا کرکے ان سے ہر قسم کا دنیاوی فائدہ حاصل کرتے ہیں ورنہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ساری زندگی روپوش رہ کر بغیر کسی روزگار کے یہ زندہ کیسے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں ان حالات کو ختم کرنے کے لیے کئی جہتوں پر کام کرنا ہوگا سب سے بڑھ کر مذہبی رواداری کو بڑھانا ہوگا اور طاقت اور حکمت دونوں کو کام میں لاکر دشمن کی چالوں اور دہشت گردی کے اس جن کو قابو کرنا ہوگا۔

ایک ڈرامہ گورداسپور کے سٹیج پر

.برصغیر کی تقسیم کا فارمولا بنا تو گورداسپور کو پاکستان میں شامل ہونا تھا لیکن ہوا یہ کہ اچانک ہندوانگریز سازش کامیاب ہو گئی اور یہ مسلم اکثریتی ضلع بھارت میں شامل کردیا گیا اور اب بھارت نے یہاں ایک اور سازش اور ڈرامہ سٹیج کرنے کی کوشش کی ہے۔ 27 جولائی کو گورداسپور میں ایک پیچیدہ منصوبے کے تحت تخریب کاری کا پروگرام بنایا گیا جب تین بندوق.بردار حملہ آوروں نے دینا نگر گورداسپور میں ایک بس پر حملہ کیا بس میں سوار مسافروں میں سے کئی زخمی ہوگئے لیکن بس ڈرائیور نے بس کو انہی حملہ آوروں کے اوپر دوڑادیا حملہ آور بھاگ گئے اور ڈرائیور بس کو ہسپتال لے کر پہنچ گیا جہاں زخمیوں کو طبّی امداد پہنچائی گئی یہی حملہ آور ایک اغواشدہ کار میں آگے گئے اور دینا نگر پولیس سٹیشن پر حملہ کردیا اس سے پہلے انہوں نے ساتھ ہی واقع ہیلتھ سنٹر پر حملہ کیا اور ایک عورت چار پولیس اہلکار اور تین شہری ہلاک ہوگئے جبکہ پندرہ افراد زخمی بھی ہوئے۔ اسی دوران حملے سے پانچ کلومیٹر دور پر مانند ریلوے سٹیشن کے قریب امرتسر پٹھانکوٹ لائن پر پانچ بم بھی ناکارہ بنادیے گئے اور یہ کارنامہ بھی عین اس وقت سرانجام دیا گیا جب گاڑی اس پُل پر سے گزرنے ہی والی تھی اسے صرف دوسومیٹر دور ہی

روک دیا گیا یعنی بھارت کی پولیس کی کارکردگی کو اعلیٰ اور مثالی بنا کر پیش کر دیا گیا۔ اس سارے آپریشن کو بارہ گھنٹے میں مکمل کیا گیا یعنی واقعات سارے ساتھ ساتھ چلے لیکن پھر بھی بارہ گھنٹے لگا دیئے گئے اور اس کے لیے بھی بھارتی میڈیا نے یہ توجیہہ پیش کی کہ پولیس کم از کم ایک حملہ آور کو زندہ پکڑنا چاہتی تھی ورنہ اتنا وقت نہ لگاتی لیکن ہوا یہ کہ تمام حملہ آور مار دیئے گئے یعنی تمام ثبوت ختم کر دیے گئے اور ساتھ ہی بھارتی میڈیا نے اعلان کر دیا کہ حملہ پاکستان نے کروایا بلکہ یہ اعلان حملے کے شروع ہوتے ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ رویہ کچھ نیا بھی نہیں تھا کیونکہ بھارت سرکار تمام کامیاب و ناکام حملے، تخریب کاریاں، دہشت گردی، شدت پسندی اور علحدگی پسند تحریکیں پاکستان کے نام لگا کر امن و امان کے متعلق اپنی تمام تر ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو جاتی ہے۔

گورداسپور کا واقعہ کوئی پہلا واقعہ نہیں اور حال ہی میں تو اوپر نیچے ایسے الزامات کی بوچھاڑ کر کے بھارت نے اپنی غیر سنجیدگی کا بھرپور ثبوت دیا پہلے ایک معصوم کبوتر پکڑ کر اسے پاکستان کا جاسوس قرار دیا اور دنیا بھر میں اپنا مضحکہ اڑایا پھر گورداسپور حملہ پھر کشمیر میں عثمان خان نامی ایک لڑکے کو پکڑ کر اسے پاکستانی شہری قرار دیا لیکن نادرا نے یہ بھی بھانڈا پھوڑ دیا کہ اس شخص کا نادرا میں کوئی ریکارڈ ہی نہیں۔ دراصل ہوا یہ کہ گورداسپور کے واقعے کے بعد بھارت کے سابق صدر عبدالکلام کے انتقال نے بھارت حکومت کو مصروف کر دیا اور وہ میڈیا کے ذریعے شروع کرنے

والی اس پاکستان مخالف مہم کو مزید اُچھالنے کے لیے فارغ نہ ہو سکی اور اس طرح یہ مہم کسی حد تک صرف میڈیا کی خبر تک محدود رہ گئ اگرچہ بھارت کی وزارت داخلہ کی طرف سے کچھ حصہ ضرور ڈالا گیا لیکن بہت ساری جزئیات کی طرف توجہ نہیں دی گئی جس نے اس ڈرامے کو فلاپ کر دیا۔ مثلاً کچھ بم پولیس سٹیشن میں اور پانچ پر مانند ریلوے سٹیشن پر ناکارہ بنائے گئے لیکن حیرت انگیز طور پر اس کو کنٹرول کرنے والا آلہ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے فاصلے پر پٹھان کوٹ میں نصب کیا گیا تھا۔ دہشت گردوں میں سے کسی کے بارے میں کوئی معلومات ابھی تک جاری نہیں کی گئ جبکہ مارے جانے والوں میں سے تین کی لاشیں سیکیورٹی فورسز والے لے گئے کیوں اور ان کی شناخت کے بارے میں کیوں کچھ نہیں کہا گیا۔ منصوبہ جس بھونڈے پن سے بنایا گیا اور جس انداز سے اس پر عمل کیا گیا اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس حملے پر قابو پانے کا منصوبہ حملے کے منصوبے کے ساتھ ہی بنایا گیا تھا اور ٹائمنگ کا مکمل خیال رکھ کر بنایا گیا یوں پنجاب پولیس کی سپشل ویپن اینڈ ٹیررسٹ ٹیم کو بھی عظیم اور ماہر بنا کر پیش کر دیا گیا اور اس پر بھی تعریف کے ڈونگرے برسائے گئے یہ تو حملہ اور اس پر قابو پانے کی تفصیلات تھیں لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں کیا جا رہا ہے کہ کبھی ایک کبھی دوسرے واقعے کو پاکستان سے منسوب کیا جا رہا ہے اور وہ بھی پے در پے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھارت کا عام وطیرہ ہے لیکن ان واقعات اور الزامات میں تیزی کی کچھ وجوہات اور بھی ہیں جو کہ ہمیشہ ہوتی

ہیں جن سے حالات پر نظر رکھنے والا ہر شخص اتفاق کرے گا۔ سب سے پہلی اور بڑی وجہ جس نے بھارت کو بوکھلایا ہوا ہے وہ پاکستان اور چین میں تعاون کے حالیہ منصوبے ہیں چین پاکستان اکنامک کاریڈور کے پاکستان اور عالمی معیشت پر اثرات اور اہمیت سے بھارت پریشان ہے اور اسی پریشانی میں وہ کبھی ایک کبھی دوسرا الزام پاکستا پر دھر رہا ہے جو ایک ایک کرکے غلط ثابت ہو رہے ہیں اور اسے شرمندگی اٹھانا پڑ رہی ہے۔ یہاں مسئلہ بھارت کی اس نیت کا بھی ہے کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان مسائل کو ختم کرنے کی بجائے بڑھانے پر تلا رہتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل مسئلہ کشمیر ہے جس سے توجہ ہٹانے کے لیے وہ مسلسل دوسرے مسائل اٹھاتا رہتا ہے اور اسی سلسلے میں اس نے دہشت گردی کو اس سے بڑا مسئلہ بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا ہے اور اگرچہ پاکستان میں تخریبی کاروائیاں تو اس کا قومی ایجنڈا ہے لیکن اسی نظریے کو تقویت دینے اور پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے وہ اپنے ہاں بھی ایسے ڈرامے سٹیج کرتا رہتا ہے وہ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ کشمیر ان دونوں ممالک کے درمیان تمام مسائل کی جڑ ہے۔ پاکستان جس فورم پر بھی اس مسئلے کو اٹھاتا ہے بھارت اس کا بائیکاٹ کر دیتا ہے اور یا ایسا ممکن نہ ہو تو اس سے گریز کی دوسری راہیں اپناتا ہے اب بھی اگست کے آخر میں دونوں ملکوں کے سلامتی کے مشیروں کے درمیان جو ملاقات ہونی ہے اس سے راہ فرار اختیار کرنے اور اسے سبوتاژ کرنے کے لیے بھارت ایسی حرکتیں کر رہا ہے ایک طرف وہ پاکستان

میں دہشت گردوں کو مدد فراہم کر رہا ہے، بلوچستان میں علحدگی پسندوں کا ماسٹر مائنڈ بنا ہوا ہے بلکہ اپنے ہاں بھی ایسے منصوبے بنا کر اسے پاکستان سے منسوب کر دیتا ہے دوسری طرف وہ کھلم کھلا سرحدی خلاف ورزی اور جارحیت کا مرتکب ہو رہا ہے اور اس کا الزام بھی پاکستان پر لگاتا ہے اگر ان سب حالات میں بھی پاکستان سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اپنے بیرونی اور اندرونی دفاع پر سمجھوتہ کرے تو یہ ایک قومی جرم ہوگا۔
پاکستان کو بھارت کو ٹھوس اور سخت جواب دینا ہوگا اور عالمی طاقتوں کو مجبور کرنا ہو گا کہ انہیں آگے بڑھ کر اور حالات کا گہرائی سے جائزہ لے کر اور بھارت کے منفی کردار کو سامنے رکھ کر پاک بھارت تنازعات کو حل کرنے میں مدد کرنا ہو گی اور بھارت کو اس بات پر تنبیہ کرنا ہو گی کہ وہ خود دہشت گردی کے منصوبے بنا کر پاکستان کے نام کرنے سے اجتناب کرے ورنہ خطے کا امن کبھی بھی بحال نہ ہو سکے گا اور اسلحے کی دوڑ لگے رہے گی اور دو ایٹمی ملکوں کے درمیان تناؤ بڑھتا رہے گا جو خطرناک نتائج پر منتج ہو گا اُس وقت بھارت ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار رہے۔

یہ لوگ پاکستان کو اپنا ایمان کہتے ہیں

امریکہ میں صرف 11/9 ہوا اور پھر سکون اور امن ہو گیا لیکن پاکستان جس کا اس واقعے میں نہ کوئی ہاتھ تھا نہ دوش اس کے بعد سے مسلسل حالت جنگ میں ہے۔ دھماکے، دہشت گردی، شدت پسندی اور ان سب سے منسلک بے شمار مسائل، آفرین ہے اس ملک کے عوام پر جو یہ سب برداشت کر رہے ہیں اور پھر بھی ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہماری بدقسمتی کہ ہمارے قبائلی علاقے ایسے لوگوں کی آماجگاہ بن گئے جو مختلف دشمنوں کے ایجنڈے پر کام کرتے ہیں ورنہ یہ قبائلی لوگ تو ہمیشہ سے پاکستان کے بغیر تنخواہ کے سپاہی اور محافظ تھے لیکن اپنے خلوص ہی کی وجہ سے شاید ان دشمنوں کو نہ پہچان سکے اور انہیں اپنے علاقوں میں جگہ دیتے رہے اور دشمن اپنی سازشوں کا جال پھیلاتا رہا۔ پاک فوج مسلسل ان کے خلاف برسرپیکار رہی آپریشن راہ نجات، المیزان، راہ راست اور ان کے خلاف مسلسل دیگر کاروائیاں کرتی رہی اور جب آپریشن ضرب عضب شروع ہوا تو اس عہد کے ساتھ ہوا کہ اسے آخری دشمن کا صفایا کرنے تک جاری رکھا جائے گا۔ پھر آرمی پبلک سکول پر ان وحشی دشمنوں کے حملے نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا اور فوج کے عزم کو مزید تقویت دی۔ ان دشمنوں کے خلاف مزید سختی سے کاروائیاں شروع کی گئی اور اس مشکل وقت میں بھی ان قبائلیوں نے پھر اپنا مثبت کردار ادا کیا اور اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنے ہی ملک میں ہجرت کی،

اپنے ہی ملک میں ہجرت اُس ہجرت سے بہت تکلیف دہ ہوتی ہے جو غیروں کے تسلط اور ظلم سے بچنے کے لیے دوسرے ملک میں کی جاتی ہے لیکن ان لوگوں نے یہ قربانی اس لیے دی کہ جب سول آبادی ان علاقوں میں نہ ہوگی تو فوج کے لیے دہشت گردوں کے خلاف کاروائی بہت آسان ہوگی۔ یہ وہ لوگ اور وہ علاقے ہیں جس کا جینا طالبان نے حرام کیے رکھا، یہاں سکولوں کو انتہائی بے دردی سے اڑادیا گیا اور خاص کر لڑکیوں کو تعلیم کا حقدار ہی نہیں سمجھا گیا، صحت مراکز اور ہسپتالوں کو نشانہ بنایا گیا سڑکیں ٹوٹ پھوٹ گئیں حتیٰ کہ ان لوگوں کے گھر تباہ و برباد ہوگئے دکانیں، کاروبار، سرکاری دفاتر سب کچھ ختم ہو کر رہ گئے، پھر فوجی کاروائیوں میں بھی ان املاک کو مزید نقصان پہنچا اور ان علاقوں کا منظر وہی ہوگیا جو جنگ زدہ علاقوں کا ہوتا ہے یہ تو وہ رخ ہے جو
انفراسٹرکچر سے متعلق ہے۔ انسانی طور پر بھی ظاہر ہے کہ ان لوگوں پر جو اثر پڑا اس کا احاطہ کرنا بھی آسان نہیں ہے چاہے کچا مکان ہو لیکن اپنا ہو تو اس میں تحفظ اور ملکیت کا جو احساس ہوتا ہے وہ پرائے محل میں بھی نہیں ہوتا اور یہ لوگ اپنے گھروں سے نکلے تو کہیں کیمپوں میں لگے خیموں میں آبسے اور کہیں کرائے کے مکانات لے کر رہنے لگے کتنے عرصے کے لیے یہ انہیں بھی نہیں معلوم تھا جنگ کب ختم ہوگی حالات پر کب قابو پایا جاسکے گا اس کا بھی اندازہ نہیں بچے سکولوں سے اٹھ کر کیمپوں میں آبیٹھے پورے گھر کی جگہ صرف چند انتہائی ضروری، ضروریات زندگی کے ساتھ چند فٹ کے خیمے نے لے لی اس

سے بچوں بلکہ بڑوں کے ذہنوں پر کیا اثر پڑا یہ تو کوئی ماہر نفسیات ہی بہتر بتا سکتا ہے۔
یہ سب کچھ تو ہوا کیونکہ حالات کو شروع سے جانچنے اور قابو کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی اور خرابیء بسیار کے بعد جب حالات کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو نفسیاتی، معاشرتی، معاشی اور طبیعاتی ہر قسم کے نقصانات کافی بڑھ چکے ہوتے ہیں ایسے میں پھر جنگی بنیادوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔ ضرب عضب واقعتاً دشمنوں کے لیے ایک کاری ضرب ثابت ہوئی ہے اور اللہ تعالٰی کے فضل وکرم سے حالات معمول کی طرف بڑھنا شروع ہو چکے ہیں لیکن اب بڑا مرحلہ ان علاقوں اور یہاں کے عوام کی بحالی کا ہے۔ ان پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کے طریقہء بودوباش میں فرق بہت سست رفتاری سے آتا ہے اور کچھ یہ بھی ہوتا ہے کہ حکومتیں بھی آسان میدانی علاقوں میں تو ترقیاتی کام کر لیتی ہے لیکن مشکل اہداف اور مشکل علاقوں کی طرف نہیں جاتی جو انتہائی قابل افسوس رویہ ہے اور یوں ہمارے یہ علاقے کہیں صدیوں اور کہیں دہائیوں کے حساب سے پیچھے رہ جاتے ہیں اب جبکہ ان علاقوں کی بحالی کا کام شروع کیا جارہا ہے تو ان تمام امور کو مد نظر بھی رکھنا ہوگا اور انہیں ترجیح بھی دینا ہوگی۔ تعلیم پر کام کرنا ہوگا کہ شعور آئے اور روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہونگے تاکہ پھر نوجوان غلط ہاتھوں میں نہ پڑ جائیں، اب موقع ہے کہ ان علاقوں کو جدید خطوط

پر استوار کیا جائے یہاں ہسپتال بنوائے جائیں تاکہ مریض پشاور پہنچتے پہنچتے راستے میں مر نہ جایا کریں انہیں چھت مہیا کرنی ہوگی ، صنعت لگانا ہوگی یہاں کی جو روایتی صنعتیں ہیں انہیں سائنسی بنیادوں پر وان چڑھانا ہوگا اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے پورے معاشرے کو اپنا فرض نبھانا ہوگا اور یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ان لوگوں نے ملک کے لیے کیا قربانی دی ہے چند دہشت گردوں کے جرم کی سزا ان سب نے کاٹی ہے لہٰذا اب ان سب کو بھرپور زندگی جینے کا حق ملنا چاہیے۔ فوج اگر ان کاموں کی نگرانی کا بیڑا اٹھا رہی ہے تو دوسروں کو آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنی ہوگی لیکن اس کے لیے مخلص لوگوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ این جی اوز خاص کر غیر ملکی اداروں پر نظر رکھنی ہوگی کہ کہیں پھر یہ فلاحی ادارے فلاح کے پردے میں شر نہ پھیلادیں جیسا کہ ماضی میں کئی بار ہوچکا ہے۔ یہ علاقے ہمیشہ سے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہے ہیں جس کا خمیازہ ہم نے کئی دہائیوں تک ادا کیا ہے لیکن اب شاید قوم میں مزید مشکل حالات سہنے کی ہمت نہیں ہے لہٰذا ان لوگوں کو ملک کے دوسرے لوگوں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا ہوگا انہیں ہر ادارے میں حصہ دار بنانا ہوگا ان کی نفسیاتی تربیت کرنا ہوگی ان کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ پورا پاکستان ان کا مشکور ہے کہ ان کی قربانیوں کی وجہ سے ملک دہشت گردی کی عفریت سے نکلنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ حکومت کو یہاں سڑکوں، سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں کا جال بچھانا ہوگا کارخانے لگانا ہونگے تاکہ پہاڑوں میں رہنے والے بھوکے نہ رہیں اور

دہشت گردوں سے تنخواہیں نہ وصول کریں۔ قلیل المدت منصوبے بھی بنانا ہوں گے لیکن طویل المدت منصوبہ بندی بھی کرنی ہوگی بلکہ اس پر زیادہ توجہ دینا ہوگی اور یہ یاد رہے کہ اس سارے عمل میں مقامی آبادی کو ہر ہر قدم پر شامل اور مد نظر رکھنا ہوگا۔ ہر شعبہء زندگی میں انہیں قومی دھارے میں شامل کرنا ہوگا۔ یہ قبائلی انتہائی محب وطن لوگ ہیں وزیرستان سے ایک فوجی دوست نے کہا یہ لوگ پاکستان کو اب بھی اپنا ایمان کہتے ہیں لہذا یہ سوچ لینا ہوگا کہ یہ آخری موقع ہے اور ہم نے اس کا پورا فائدہ اٹھانا ہے اور قبائلیوں کو یہ احساس دلانا ہے کہ اگر پاکستان تمہارا ایمان ہے تو تم لوگ پاکستان کی شان ہو۔

وطن سے محبت کا اظہار۔۔۔ جذبوں کو عمل میں ڈھالنا ہو گا

ایک بار پھر ہم نے چودہ اگست کو یوم آزادی منایا اور اپنے رب کا شکر ادا کیا جس نے ہمیں آزادی کی نعمت سے نوازا اپنی زمین پر اپنا اختیار دیا ہر طرف لہراتے سبز ہلالی پرچم اس بات کا ثبوت تھے کہ ہماری اپنی شناخت ہے بازاروں میں لگے سٹال اور اس پر خریداروں کا ہجوم بھی یہ یقین پیدا کرتا رہا کہ اس ملک کے رہنے والے اس سے بے پناہ پیار کرتے ہیں یہ محبت نہ کسی خاص طبقے سے مخصوص ہے نہ کسی خاص فرقے، صوبے، شہر یا علاقے سے۔ بازار میں کچرا چننے والے ایک چھوٹے بچے نے پرچم کا ہیٹ پہنا ہوا تھا اور خاموشی سے چلتے ہوئے اعلان کر رہا تھا کہ ''میں بھی پاکستان ہوں'' سوڈا واٹر کی بوتلیں بیچنے والے کے ریڑھے پر لگا پاکستان کا بڑا سا پرچم اس کے جذبات کا اظہار کر رہا تھا کہ ''یہ میرا پاکستان ہے'' دکانیں اور عمارتیں برقی قمقموں سے سجے دل میں امیدوں کے دیے روشن کر رہے تھے کہ اس وطن سے پیار کرنے ولے اسکے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیں گے۔ ہر طرف جذبہ ہر طرف امید ہر طرف عزم ہر سمت وعدے۔ ٹیلی ویژن پر خوبصورت قومی گیت، وطن کی محبت میں گُندھے ہوئے اشتہارات اور پروگرام یعنی محبت ہی محبت عقیدت ہی عقیدت ایسا ہر سال ہوتا ہے ہمیشہ ہوتا ہے ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بس اب پاکستان بدل گیا ہماری تقدیر بدل گئی ہے

لگتا ہے اب ہم نے اپنی برائیوں پر قابو پالیا ہے اب پرچموں سے سجے دفاتر میں کرپشن نہیں ہوگی سکولوں میں بچوں کو وطن کی محبت کا سبق سکھاتے استاد اور قومی نغمے گاتے بچے اب اصل تعلیم حاصل کریں گے ان سکولوں میں تعلیم کے نام پر کاروبار نہیں ہوگا۔ پرچم لگی ریڑھی سے اب مضر صحت چیز فروخت نہیں کی جائے گی لیکن کڑوا سچ یہ ہے کہ اگلے دن جس طرح ہمارے پرچم کی جھنڈیاں زمین پر پڑی ہوا کے ساتھ اڑ رہی ہوتی ہیں اسی طرح پچھلے دن کے دعوے اور وعدے بھی دفنائے جا چکے ہوتے ہیں بلکہ سچ پوچھیں تو اس دن بھی ہر ایک اپنے اپنے کھیل میں مصروف رہتا ہے۔ اس سال کا یوم آزادی جس جوش وخروش سے منایا گیا اس نے واقعی لہو گرما دیا لیکن کاش کہ ہم اس جذبے کو عمل میں ڈھالنے کی بھی کوشش کریں لیکن ہوگا وہی کہ ہم پھر بدعنوانی کرپشن، رشوت میں مصروف ہو جائیں گے اور پھر ہم نہ یہ احساس کریں گے کہ ہم نے اس ملک کے ساتھ جو وعدے کئے تھے اس کی حفاظت کی جو قسمیں کھائی تھیں اس کی ترقی کے جو بلند بانگ دعوے کیے تھے وہ ہم نے پورے بھی کرنے ہیں۔ اگر ہم چودہ اگست کو یوم آزادی منانے کے بعد سال میں کچھ بار یوم عمل بھی منا لیا کریں اور کچھ دن یوم احتساب کے طور پر بھی منا لیا کریں اور جائزہ لے لیا کریں کہ ہم نے پچھلے دنوں میں کیا کیا کیا ہم نے صرف باتوں کے تیر چلائے یا عمل بھی کیا۔ ہماری قوم کی بہت ساری خرابیوں کے ساتھ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھتے جبکہ ترقی اور بہتری عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے پاس اچھے

دماغ نہ ہوں، کاغذوں میں بننے والے منصوبے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم اچھے منصوبہ ساز ہیں لیکن کاش کہ ہم ان منصوبوں پر پوری ایمانداری سے عمل کریں ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ بے عملی یا کرپشن صرف اوپر کی سطح پر ہے جہاں بہترین منصوبے بنا کر قومی اور بین الاقوامی سطح پر خوب داد وصول کر لی جاتی ہے لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ منصوبے فائلوں میں بند پڑے پڑے پرانے ہو جاتے ہیں لیکن قوم کے کام نہیں آتے ہاں یہ منصوبہ ساز بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرکے اپنی آنے والی سات نسلوں کا مستقل سنوار لیتے ہیں اور اگر کوئی یہ محنت، ایمانداری سے کر لیتا ہے تو اسے لاگو کرنے والے اس کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں کہ کروڑوں کے خرچے سے بننے والا پل چند ماہ یا دو چار سال میں ہی گر کر اپنے بنانے والے انجینئر کی قابلیت اور ایمانداری پر نوحہ کناں ہو جاتا ہے۔ تعلیم کے شعبے کو ہی لیجئے جہاں اسی نوے فیصد نمبر لینے والے اپنے مضامین کے بنیادی خدوخال سے بے خبر ہوتے ہیں اور جب یہی طلباء اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جاکر عملی زندگی میں آتے ہیں تو بے شفا اور بے فیض ڈاکٹر اور انجینئر بن جاتے ہیں نہ تو لوگوں کے لیے نہ ملک کے ان کا وجود خیر کا باعث بنتا ہے۔ اب ذرا نیچے کی طرف آیئے آپ کو ہر دوسرا چوتھا بندہ بے روزگاری اور تنگدستی کا رونا روتا ہوا نظر آئے گا لیکن جب انہیں نوکری مل جاتی ہے تو یہ یا تو دو چار دن بعد چھوڑ جاتے ہیں یا اگر بیٹھے رہیں تو یہی توقع کرتے ہیں کہ انہیں کام کرنے کو نہ کہا جائے پاکستان کی

آبادی اس کے لیے رحمت بھی ہو سکتی ہے اگر ہر ایک اپنے اپنے محاذ پر ایک سپاہی کی طرح کام کرے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہم نوکری حاصل کرنے کے بعد تنخواہ کے اوپر اپنا حق سمجھتے ہیں اور کام کو زیادتی کہ اگر کام مانگا تو شاید یہ زیادتی کی جا رہی ہے اور اس طرح ہم مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر پاتے۔ نوکریوں سے آگے نکل کر دیکھیں تو تجارت میں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

مودی کا دورہ امارات ۔۔۔ پاکستان کے خلاف سازش

اچھے ہمسایے خدا کی رحمت ہوتے ہیں اگر یہ محاورہ عام زندگی میں لاگو ہوتا ہے تو یہی اصول بین الاقوامی ہمسائیگی اور تعلقات کے لیے بھی ہے کہ اگر ہمسایہ ممالک کے تعلقات اچھے ہوں تو سکون رہتا ہے لیکن اگر سرحد پر بھارت جیسا پڑوسی ہو جو روایتی طور پر عیار، مکار اور سازشی ہو تو خطے میں امن مشکل نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔

پاکستان کو بنے ہوئے اڑسٹھ سال ہو چکے اور بھارت کی آزادی کو بھی اتنا ہی عرصہ گزر گیا لیکن بدقسمتی سے بھارت نے آج تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ برصغیر کے مسلمان اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ایک الگ ملک کے حصول کا حق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلسل پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے اور کوئی ایسا محاذ نہیں چھوڑ رہا جہاں سے وہ سازش نہ کر رہا ہو اور یہی وجہ ہے کہ دونوں ممالک کے تعلقات معمول پر نہیں آرہے بلکہ ہر وقت اتنے کشیدہ ہوتے ہیں کہ کسی بھی وقت جنگ کا سماں محسوس ہوتا ہے۔ بھارت بارڈر پر جس رویے کا مظاہرہ کر رہا ہے اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ نہ تو اپنے تعلقات کی بہتری کے بارے میں سنجیدہ ہے اور نہ ہی اپنی سازشی ذہنیت بدلنے کو تیار ہے۔ بھارت نے پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے اب تک اپنے ہاں دہشت گردی کے بے شمار واقعات کرائے اور پھر الزام پاکستان کے

نام لگا دیا تا کہ حالات کو درست کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنایا جائے جبکہ اس نے انہی واقعات پر بس نہیں کیا اور دوسرے محاذ پر پانی کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور سندھ طاس معاہدے کی رو سے جن دریاؤں کا پانی پاکستان کا حصہ ہے ان پر بند باندھ کر ان کا پانی روکا اور یوں پنجاب کی ذرخیز زمین کو صحرا میں بدلنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ وہ کشن گنگا، رتل اور بگلیہار جیسے منصوبے تیزی سے مکمل کر رہا ہے اور کر چکا ہے جن کے ڈیزائنز پر پاکستان اپنا احتجاج ریکارڈ کرا چکا ہے اور غیر جانبدار ماہرین مقرر کرنے کی درخواست دے چکا ہے لیکن بھارت یہاں بھی ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آ رہا اور مختلف حیلوں بہانوں سے اسے تعطل کا شکار بناتا رہتا ہے۔

اس کے یہ سازشی منصوبے تو پرانے ہیں لیکن اب وہ ان سے آگے بڑھ دوسرے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے اور اس نے اسلامی ممالک کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ بھارتی سازشوں میں حالیہ اضافے کی بہت بڑی وجہ چین پاکستان معاشی راہداری ہے اور جب اپنی پرانی چالوں سے اب تک وہ چین کو بدظن نہیں کر سکا اور پاکستان کے ایک دوست کو توڑ نہیں سکا تو اس نے دوست اسلامی ممالک کو زیر دام لانے کی کوشش شروع کر دی اور متحدہ عرب امارات کے دورے کے دوران بھارتی وزیر اعظم مودی نے یہ پیشکش کی کہ اگر عرب ممالک پاکستان کے ساتھ اپنے موجودہ خوشگوار تعلقات میں تبدیلی لے آئیں تو بھارت ان کے ساتھ

ہر قسم کا تعاون کرے گا جس میں یمن کا معاملہ بھی شامل ہے۔ دراصل بھارت کے وزیراعظم نے موقع کیش کرنے کی کوشش کی ہے اور چونتیس سال بعد اچانک کسی بھارتی وزیراعظم کا دورہ امارات کیا ہی اس لیے گیا کہ پاک امارات تعلقات میں جو تناؤ عرب یمن تنازعے کے وقت آیا جب پاکستان نے پارلیمنٹ کی قرارداد کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس جنگ میں عملی حصہ نہیں لے گا اور اس پر متحدہ عرب امارات نے غیر ضروری رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ اب بھی بھارتی وزیراعظم کے دورے کو خوامخواہ اہم بنا دیا گیا اور اس میں دہشت گردی، شدت پسندی تجارت وغیرہ وغیرہ کو ایجنڈا پر رکھا گیا جبکہ اصل ایجنڈا صرف یہی ایک نکاتی تھا کہ کسی طرح عرب مسلمان ممالک کو پاکستان کے خلاف استعمال کیا جائے اس عمل میں سعودی عرب کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس نے پاکستان کے ساتھ اپنے برادرانہ اور انتہائی قریبی تعلقات کو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستان کو اس سازش سے آگاہ کردیا اور رپورٹس کے مطابق ایسا سرکاری سطح پر کیا گیا کہ بھارت پاکستان کے خلاف دفاعی معاہدے کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ نہ صرف سعودی عرب بلکہ کوئی بھی عرب ملک پاکستان کے خلاف کسی بھی سازش کا حصہ نہیں بنے گا یوں اگرچہ بھارت اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا جس کے لیے سعودی عرب کی کوشش کو سراہا جانا ضروری ہے لیکن یہ بات باعث تشویش ضرور ہے کہ روایتی اور مذہبی طور پر پاکستان کے دوست مسلمان عرب ممالک کے پاس جاکر بھارت سازش کرنے کی ہمت کیسے کر رہا ہے۔

بھارت یہ بھی جانتا ہے کہ پاکستان اور عرب ممالک ایک دوسرے کے لیے اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں جتنا بھارت عرب ممالک کے لیے لیکن چونکہ بھارت ہر موقعے کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور پاکستان کے خلاف کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا ایسے میں عالم اسلام اگر اسی فہم وفراست کا مظاہرہ کرے جس کا سعودی عرب نے کیا ہے تو کسی غیر قوت کی یہ ہمت نہ ہوگی کہ وہ کسی اسلامی ملک کے خلاف سازش کرے وہ بھی برادر مسلم ممالک کے ساتھ مل کر۔ مودی نے اپنے اس دورے کے دوران مذہبی شدت پسندی پر بھی بات کی جب کہ وہ خود ہندو شدت پسند ہے بلکہ اس نے ہمیشہ شدت پسندوں کی لیڈری کی ہے، یہ سب کچھ ریکارڈ پر موجود ہے اور بھارت بطور ملک بھی انہی رویوں کی ترویج کرتا ہے۔ بہر حال اس بار تو بھارت کامیاب نہیں ہو سکا لیکن ایک نئی سازش کا بیج اس نے ضرور بو دیا ہے جس پر پاکستان کو مسلسل نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ مستقبل میں بھی کسی ناخوشگوار صورت حال سے بچا جا سکے۔

بھارت ! یاد رکھو یہ ستمبر ہے

بھارت مسلسل پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے کبھی لائن آف کنٹرول کے اوپر فائرنگ کرتا ہے کبھی ورکنگ باؤنڈری کے اوپر۔ ریت تو یہ بہت پرانی ہے اور خاص کر ہمارے مذہبی تہواروں اور قومی دنوں پر وہ بزدلی اور بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہتی عام سول آبادی کے اوپر فائرنگ کرتا ہے اور خود کو بڑا سورما سمجھتا ہے۔ اب کی بار بھی اگست کے مہینے میں مسلسل وہ یہ کاروائی کر رہا ہے۔ اٹھائیس اگست کو جمعہ کے روز اس نے پھر اسی کمینگی کا مظاہرہ کیا اور سیالکوٹ میں ورکنگ باؤنڈری پر بلا اشتعال فائرنگ کی جس میں آٹھ افراد شہید اور تقریباً ساٹھ زخمی ہو گئے جن میں سے گیارہ شدید زخمی ہیں کئی مکانات کو نقصان پہنچا مال مویشی ہلاک ہو گئے اور بھارت نے بہادری کا تمغہ سجا لیا۔ اس نے صرف اگست کے مہینے میں پچیس بار یہ خلاف ورزی کی۔ اکثر اوقات وہ یہ کاروائی سول آبادی پر کرتا ہے اور پاکستانی فوج کا بھرپور جواب بھارتی بندوقیں اور توپیں خاموش کرا دیتا ہے اگرچہ پاکستانی سیاسی اور فوجی قیادت اس پر سنجیدگی اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاملات کو پرامن طور پر سلجھانے کی کوشش کرتی ہے لیکن لگتا ایسا ہے کہ بھارت نے امن کی خواہش کو کمزوری سمجھنا شروع کر دیا ہے اور اسی لیے وہ اپنی کاروائیوں

کی شدت میں اضافہ کردیتا ہے۔ بہر حال اس بار فوجی اور سول دونوں قیادتیں بولیں اور خوب بولیں وزیر دفاع خواجہ آصف نے کہا اگر بھارت نے مجبور کیا تو وہ اپنے تمام پرانے نقصانات بھول جائے گا۔ سپہ سالار راحیل شریف کا تو صرف اشارہ ابرو ہی کافی ہے فوج تو فوج پوری قوم ان کے ایک اشارے پر اٹھ کھڑی ہوگی۔ بھارت نے اپنی بزدلانہ حرکات کے لیے چنا تو اگست کا مہینہ ہے جس میں اس نے معصوم شہریوں کو نشانہ بنایا ہے لیکن ستمبر شروع ہو چکا ہے وہی ستمبر جس میں اس نے آج سے پچاس سال پہلے لاہور پر حملہ کیا تھا، چور چوری کے لیے رات کا وقت پسند کرتا ہے لہذا اس نے بھی ایسا ہی کیا اور چند قدم اندر آنے پر اسوچا کہ بس لاہور تو اس کے قبضے میں آگیا لیکن پاکستانی فوجی سونے سے بیدار ہوئے تو چند لمحے آنکھیں مسلنے میں لگائے اور پھر قہر خدا بن کر ٹوٹے تو نہ ہندو اس کے سامنے ٹھہر سکا نہ ہندوستان۔ لاہور کا محاذ تو خیر وہ کیا یاد کریں گے سیالکوٹ سیکٹر میں حملے کے وقت اگر وہ ادھر ہی آس پاس کہیں چونڈہ یاد کرلیتا تو اچھا ہوتا جہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی لڑی گئی اور بھارت نے اپنے کم از کم ایک سو بیس ٹینک دو دن کی لڑائی میں کھو دیئے۔ بھارت جنگ ستمبر میں بھی اسی زعم میں مبتلاء تھا کہ پاکستان اس کے لیے تر نوالہ ثابت ہوگا لیکن پاک فوج نے صرف بھارت ہی نہیں پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا کہ اپنے سے کئی گنا بڑے ملک اور بڑی فوج کا مقابلہ کیسے کیا جاتا ہے بلکہ کیسے اسے ہزیمت سے دوچار کیا جاتا ہے۔ 1965 میں

دوسرے محاذوں پر بشمول سیالکوٹ شدید چوٹ کھانے کے بعد بھارت اقوام متحدہ اور امریکا کے پاس پہنچ گیا کہ جنگ بندی کروائی جائے اب بھی اقوام متحدہ کے مبصر پاکستان آئے امریکہ کی قومی سلامتی کی مشیر سوسن رائس بھی پاکستان آئیں ان سب نے دیکھا کہ بھارت نے کس طرح جارحیت کرکے نہتے شہریوں کو نشانہ بنایا ہے۔ پاکستان نے مبصرین کو یہ تباہی دکھا کر دراصل بھارت کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ دنیا کو یہ سب کچھ دکھانے کے بعد اب پاکستان ہر قسم کی جوابی کاروائی کا اپنا حق کسی بھی وقت استعمال کر سکتا ہے۔ پاکستان نے تو مروجہ اصولوں کے مطابق بالکل درست طریقہ اختیار کیا اور بھارت کو بتا بھی دیا کہ اُس کی مزید مہم جوئی۔برداشت نہیں کی جائے گی اور یہ بھی کہ پاکستان جواب دینے کی مکمل صلاحیت اور وسائل رکھتا ہے لیکن کیا بھارت اپنے رویے میں کوئی تبدیلی لانے کو تیار ہو گا یا ستمبر 1965 کی غلطی پھر دہرائے گا۔کہنے کو تو دنیا بہت آگے نکل چکی ہے جہاں سرحدوں کا تبدیل کرنا مشکل نہیں نا ممکن ہے ہاں اگر کوئی خطہ کسی ملک کے ناجائز تسلط سے آزادی حاصل کر لے اور ایک نیا ملک بن جائے تو اور بات ہے یا کشمیر جیسی کوئی ریاست بھارت جیسے غاصب سے آزادی حاصل کر لے تو تب ہی دنیا اور ملکوں کے نقشے تبدیل ہوتے ہیں پھر بھارت آخر کیا سوچ کر پاکستان کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اسے اب اپنا رویہ تبدیل کرنا ہو گا اور اس بات کو تسلیم کرنا ہو گا کہ پاکستان ایک اٹل حقیقت ہے اور ایک مضبوط ایٹمی قوت بھی جو بھارت کی ہر جارحیت کا جواب دے سکتا ہے

اور اگر اس نے ایک بار پہلے بھی کم جنگی وسائل اور کم افرادی قوت کے ساتھ بھارت کو مجبور کردیا تھا کہ وہ صلح کروانے کے لیے امریکہ اور اقوام متحدہ کے پاس دوڑا گیا تھا تو اب وہ ایک مستحکم ایٹمی قوت ہے لہٰذا نہ صرف اپنے وجود کی حفاظت کرسکتا ہے بلکہ دوسرے کو زیادہ سخت سبق سکھانے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

ستمبر 1965 ۔۔۔ چند دانشوروں کے شکوک و شبہات

ستمبر 1965 پاکستان پر بھارت نے حملہ کیا میں اس تفصیل میں نہیں جاؤنگی کہ بھارت نے رات کے اندھیرے میں حملہ کیا، اچانک کیا، اس کا ناشتے کا پروگرام تھا۔ یہ سب ہماری تاریخ کا حصہ ہے اور یہ بھی کہ کیسے اس کے تمام ارادوں کو ناکام بنادیا گیا۔
لاہور جم خانہ میں کھانا کھانے کی حسرت بھی جنرل چودھری کے دل میں رہ گئی۔ اس کی زیر کمان فوج رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر واہگہ کی سرحد اور اس کے مضافات میں واقع علاقوں تک تو پہنچ گئی لیکن جونہی ان کی حرکت محسوس کرلی گئی اس کے بعد اس کے فوجیوں کو قدم جمانے تو کیا قدم رکھنے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ اس جنگ اور اس کے واقعات کے چشم دید گواہ ابھی اس دنیا میں موجود ہیں بھارت کا غیر اعلانیہ حملہ اور پاک فوج کا لاہور کا کامیاب دفاع ابھی انہیں یاد ہے وہ فوجی بھی زندہ ہیں جنھوں نے اس جنگ میں حصہ لیا لیکن اس کے باوجود تاریخ کو مسخ کرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے اور یہ کوشش زیادہ تر خود کو نمایاں اور مشہور کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم قومی مفاد کو کہیں ایک طرف رکھ کر اپنے ذاتی نام ونمود کی خاطر ایسے تمام اوچھے ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور ہمارا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا بھی ان خیالات کی نشر واشاعت شروع کردیتا ہے بغیر اس خیال کے کہ اس سے ملکی ساکھ کو کتنا

نقصان پہنچے گا اور یہ بھی کہ تاریخ کے ساتھ ہم جو کر رہے ہیں تاریخ بھی ہمارے ساتھ وہی کرے گی۔ حال ہی میں کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے ساتھ ایسا ہی کھیل کھیلا گیا جب ڈاکٹر سید اکبر زیدی نے پاکستان کی تاریخ پر سوال اٹھاتے ہوئے لیکچر دیا اور اس کی روداد کو ڈان نے اپنے پانچ ستمبر کی اشاعت میں جگہ دی، شائع کیا اور اسے فکر انگیز بھی قرار دیا۔ انہوں نے قدیم اور جدید دونوں تاریخوں پر اعتراضات کئے اور غیر منطقی کیے مثلاً انہوں نے درسی کتابوں میں لکھے اس جملے پر اعتراض کیا کہ پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب مسلمان 712ء میں سندھ اور ملتان میں داخل ہو گئے تھے ان کا کہنا تھا کہ مسلمان سب سے پہلے جنوبی ہندوستان میں کیرالہ میں تجارت کے سلسلے میں آئے۔ وہ یہ بات کرتے ہوئے دو باتیں بھول گئے نمبر ایک کہ ملک تاجروں سے نہیں حکمرانوں سے بنتے ہیں اور دوسرا یہ کہ کیرالہ پاکستان میں شامل نہیں ہے لہذا ان دونوں باتوں اور واقعات کو جوڑنے کی تک نہیں بنتی۔ انہوں نے قرار داد پاکستان کو بھی موضوع بحث بنایا لیکن پھر بھول گئے کہ قرار داد نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو الگ قومیں بتایا اور قوم کے لیے ملک ہونا ضروری ہوتا ہے لہذا پاکستان کا وجود میں آنا ناگزیر بن گیا۔ پھر پاکستان بننے کے بعد اور پاک بھارت جنگوں اور تعلقات کو بھی موضوع بنایا گیا۔ چھ ستمبر یوم دفاع سے عین ایک دن پہلے ڈان نے ان خیالات کو شائع کیا جس میں ڈاکٹر زیدی نے کہا کہ اس سے بڑا کوئی جھوٹ نہیں کہ پاکستان نے ستمبر 1965 کی جنگ جیت لی۔

خدا جانے وہ جنگ کو دو ملکوں کے درمیان ہاکی یا کرکٹ یا کسی اور کھیل کا میچ سمجھ رہے ہیں جس میں رنز یا گولوں کی گنتی پر فیصلہ ہو جائے گا چلیے اگر ایسا بھی ہے تو پھر بھی فوجوں کی افرادی قوت اور اسلحے کی تعداد و مقدار میں مقابلہ بھی ضروری ہے اور پھر دونوں فوجوں کی کامیابی وناکامی کا تناسب بھی اور اگر ایسا کیا جائے تو شاید ڈاکٹر زیدی اور ان جیسے دوسرے دانشوروں کے شکوک و شبہات دور ہو جائیں یہ تقابلی جائزہ تو عددی حساب سے ہوگا لیکن تاریخ کے پاس اس جنگ کے بارے میں بے شمار دوسرے واقعات موجود ہیں جو پاک فوج کی کامیابی کا ثبوت ہیں ان میں چند ایک یا داشت تازہ کرنے کے لیے لکھ رہی ہوں لوگوں کو اب بھی یاد ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان چونڈہ میں جو ٹینکوں کی لڑائی لڑی گئی اسے دنیا بھر میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹینکوں کی دوسری بڑی لڑائی کہا گیا جس میں شواہد اور رپورٹس کے مطابق بھارت نے اپنے چھ سو ٹینک جھونکے لیکن پاک فوج نے ان میں چار سو کو اسی میدان میں دفن کر دیا۔ پاک فضائی فوج نے اس جنگ میں کامیابی کے جو جھنڈے گاڑے کیا وہ فتح کا نشان نہیں ہے۔ ایم ایم عالم نے چشم زدن میں دشمن کے پانچ طیاروں کو جس طرح زمین بوس کیا دشمن تو کیا اس کا بدلہ لیتا آج تک کوئی دوسرا بھی ایسا کارنامہ سرانجام نہ دے سکا۔ اس وقت کی پاکستان کی واحد آبدوز غازی نے بھارت کی نیوی کو ساتھ جو سلوک کیا وہ اب بھی بھارت کے اعصاب کے کھچاؤ کے لیے کافی ہے دوارکا کی تباہی اس کے لیے اب بھی بھیانک خواب جیسی ہے۔

ڈاکٹر موصوف ان کامیابیوں کو اگر درخور اعتنا نہیں سمجھتے تو یہی دیکھ لیں کہ پاک فوج نے اپنے سے تین گنا بڑی فوج کے ارادوں کے آگے کس طرح بندھ باندھا، کشمیر تو کشمیر حاجی پیر بھی نہ دینے کا فیصلہ کیا اور دیا بھی نہیں۔ کھیم کرن، فاضلکا، چھمب جوڑیاں اور چونڈہ سب میں بھارت کو جو سبق دیا وہ اس کو تہس نہس کرنے کو کافی ہو گیا اور یہی وہ سب کچھ تھا جس نے بھارت کو مجبور کر دیا کہ وہ اقوام متحدہ اور عالمی طاقتوں کی مدد لے کر پاکستان کو جنگ بندی پر آمادہ کرے اور مزید ہزیمت سے بچ سکے۔ کیا یہ سب کچھ بھارت کی شکست کا ثبوت نہیں۔

ہماری نئی نسل کو اگر ڈاکٹر زیدی جیسے دانشوروں کے حوالے نہ کیا جائے اور یونیورسٹیز اور تعلیمی اداروں میں ان جیسے لوگوں کو مدعو ہی نہ کیا جائے اور یا انہیں تاریخ کا قتل نہ کرنے کا پابند بنایا جائے اور ہمارے ہر قسم کے میڈیا کو بھی ایک ضابطہء اخلاق دیا جائے کہ قومی مفاد کے خلاف اور حقائق کو مسخ کرنے والا مواد نہ نشر کیا جائے اور نہ اس کی اشاعت کی جائے تاکہ ہماری نئی نسل حقائق سے آگاہ ہو اور دشمنوں کے وار سے قوم اور ملک کو بچایا جا سکے۔

اصل مسئلہ کشمیر دہشت گردی اس کی شاخ ہے

کاش بھارت پاکستان کا ہمسایہ نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ مہذب انداز میں رہنے کا طریقہ جانتا اور کاش کہ برطانیہ جاتے ہوئے کشمیر کا مسئلہ اپنے پیچھے چھوڑ کر نہ جاتا۔ کشمیر جغرافیائی اور مذہبی لحاظ سے پاکستان کا قدرتی حصہ ہے لیکن بھارت اس پر زبردستی قبضہ کیے ہوئے ہے اور اپنی آزادی کی خاطر لڑنے والوں کو انتہائی سخت اور ظالمانہ طریقے سے کچلنے میں مصروف ہے اور انہیں دہشت گرد قرار دیتا ہے جبکہ بھارت کشمیر میں جو کچھ کر رہا ہے وہ بذات خود دہشت گردی کی انتہا ہے۔ وہ یہاں کے باشندوں کی زندگی اور موت کا خود کو مالک سمجھتا ہے جب چاہتا ہے ان کا قتلِ عام شروع کر دیتا ہے جب چاہتا ہے تشدد کا نشانہ بناتا ہے اور پھر عالمی سطح پر دراندازی کا رونا رونے لگتا ہے، بین الاقوامی فورموں پر مسئلہ اٹھاتا ہے اور اپنی مکارانہ چالیں چلنے لگتا ہے لیکن ابھی حال ہی میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کونسل کے اجلاس میں بھارتی مندوب اس وقت لاجواب ہوگیا اور اسے خاموشی کا سہارا لیناپڑا جب کشمیری رہنما سید فیض نقشبندی نے بھارت کے مظالم کا پردہ چاک کرتے ہوئے دلخراش حقائق اجلاس کے سامنے رکھے تقریباایک لاکھ کشمیری حریت پسندوں کا قتل، لاکھوں یتیم بچوں کی ایک پوری نسل، اجتماعی قبریں،زندہ درگور بیوائیں

اور بھارتی فوجیوں کی درندگی کا نشانہ بننے والی نوجوان لڑکیاں یہ سب مظالم کشمیر میں ہو رہے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنے حق آزادی سے دست بردار ہونے کو تو تیار نہیں ہو سکتے لہذا وہ یہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں۔ بھارتی جیلوں میں موجود پانچ ہزار کشمیری اُس وقت کا انتظار کر رہے ہیں کہ اُن پر کوئی مقدمہ شروع تو کیا جائے تو وہ جُرم انہیں بھی معلوم ہو جائے گا جو انہوں نے کیا ہے یا کیا ہی نہیں ہے۔ بھارت کا حملہ کسی ایک طرف سے نہیں جو وہ پاکستان پر کر رہا ہے۔ سرحدوں پر آئے روز اُس کی فائرنگ اور معصوم شہریوں کی شہادتیں بھارت کی ایک اور دہشت گردی ہے وہ بلا اشتعال فائرنگ کرتا ہے اور پھر الزام پاکستان پر دھر دیتا ہے لیکن عالمی طاقتیں اس کے خلاف آواز اُٹھانے سے کتراتی ہیں ہاں پاکستان کو ہر قسم کے مشوروں سے نوازا جاتا ہے۔ کشمیر پاکستان اور بھارت کے بیچ بنیادی مسئلہ ہے باقی تمام مسائل اسی جڑ سے نکلنے والی شاخیں ہیں جنہیں اگر کاٹ بھی دیا جائے تو زندہ جڑ دوبارہ پھل پھول کر ایک نیا درخت بنا دے گی لیکن اس بات کا احساس کیے بغیر بلکہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر کے بھارت دہشت گردی کو بنیادی مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس 2015 میں بھارتی وزیراعظم مودی کی بجائے وزیر خارجہ سشما سوراج خطاب کریں گی اور دہشت گردی کو پاک بھارت ایشو کے طور پر پیش کیا جائے گا یعنی جڑ کاٹنے سے پھر گریز کیا جائے گا۔ بھارت کو اپنا موقف پیش کرنے کا پورا حق ہے لیکن اگر عالمی

طاقتیں اسے یہ مشورہ دیتی کہ مسائل کی اصل وجہ پر توجہ دی جائے تو بہتر ہوتا لیکن ہوا یہ کہ امریکہ نے محاذ آرائی سے گریز کے نام پر پاکستان اور بھارت کو مشورہ دے کر اصل مسائل سے بھی گریز کا مشورہ دیا ہے۔ دہشت گردی پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک مسئلہ ضرور ہے اور بھارت مسلسل اس کا مرتکب ہو رہا ہے ایک طرف وہ سرحدی دہشت گردی کر رہا ہے اور دوسری طرف دراندازی، نہ صرف مشرقی سرحد سے بلکہ مغربی سرحد پر بھی اس کی موجودگی ثابت شدہ ہے۔ افغانستان کے راستے پاکستان میں نہ صرف دہشت گرد داخل کرتا ہے بلکہ انہیں مالی معاونت بھی فراہم کرتا ہے۔ آپریشن ضرب عضب اگرچہ کامیابی سے جاری ہے اور دہشت گردوں کی کمر کافی حد تک ٹوٹ بھی چکی ہے لیکن بھارت اور اس کے دیگر معاونین اب بھی اپنا زور لگا رہے ہیں اور پاکستان میں امن کی بہتر ہوتی صورت حال کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان کی یہ کاروائی بلاامتیاز ہر دہشت گرد کے خلاف ہے پھر بھارت امریکہ یا عالمی میڈیا کیسے پاکستان سے مزید اقدامات کا مطالبہ کر سکتا ہے یا مشورہ دے سکتا ہے لہٰذا پاکستان کو صلح جوئی کا مشورہ دینے کی بجائے اگر بھارت کو مجبور کیا جائے کہ وہ کشمیر کا مسئلہ کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل کرے تو دوسرے تیسرے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور خطے میں امن قائم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

اس بار قربانی کی کھالیں آئی ڈی پیز کے لیے

اللہ تعالٰی نے اپنے دوست ابراہیمؑ سے بیٹے کی قربانی مانگی باپ نے بیٹے سے اپنے خواب کا ذکر کیا اور سراپا فرماں بردار پسر اسماعیلؑ نے باپ کی ہمت بندھائی اور تاریخ انسانی کے اِس عظیم واقعے نے جنم لیا اور رب کریم نے اپنے دوست کی عظیم قربانی کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے اسے اپنے محبوب ﷺ کی اُمت پر فرض قرار دیا یعنی دوست کی قربانی کو محبوب پر بھی لاگو کر دیا۔قربانی مسلمانوں پر فرض بھی کر دی اور اسے ان کے لیے عید یعنی خوشی کا موقع بھی بنا دیا اور سب سے بڑھ کر حج جیسی عبادت کا رکن بھی اور ساتھ ہی اسے مسلمانوں کے لیے تجارت کا ذریعہ بھی بنا دیا۔ہر سال عید پر لاکھوں کروڑوں جانوروں کی خرید و فروخت ہوتی ہے اس موقع کے لیے بڑے شوق سے سارا سال جانور پالے جاتے ہیں انہیں خوب کھلایا پلایا جاتا ہے اور عید کے قریبی دنوں میں یہ ایک اور طرح کا منافع بخش کاروبار ہوتا ہے۔ لیکن قربانی ہو جانے کے بعد بھی سنت ابراہیمی کا فرض ختم نہیں ہوتا بلکہ قربانی کے جانوروں کی کھالیں ایک بار پھر انتہائی منافع بخش کاروبار کا ذریعہ بن جاتی ہیں اکثر لوگ اسے خیرات و صدقے میں دے دیتے ہیں اور کچھ اس کو فروخت کر دیتے ہیں اس کے علاوہ سیاسی جماعتیں اور فلاحی ادارے لاکھوں کی تعداد میں یہ کھالیں جمع کر لیتے ہیں۔

ان میں سے کچھ ضرور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال ہوتی ہوں گی لیکن کتنی، یہ عوام نہیں جانتے شاید یہ ادارے اور جماعتیں اندرونی طور پر اس کا کچھ حساب کتاب رکھتی ہوں لیکن عوام کو اس کا کتنا فائدہ پہنچتا ہے اس کا کوئی حساب کتاب نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کراچی میں تین ارب روپے کی کھالیں جمع ہوتی ہیں۔ کراچی میں تو اس سرگرمی سے جماعتوں اور اداروں کو اس سال روک دیا گیا ہے لیکن اگر پورے ملک میں جمع شدہ کھالوں کا حساب لگایا جائے تو اس کی قیمت اس سے کہیں بڑھ کر ہو گی۔ ان کھالوں کو چمڑے کی مصنوعات میں استعمال کر کے بہت بڑا زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ کھالوں کا یہ کاروبار عید قربان کی ایک ذیلی برکت ہے لیکن اس عید کا اصل مقصد صاحب نصاب شخص کا اپنی آمدن میں سے کچھ حصہ نکال کر اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنا ہے۔ اس وقت وطن عزیز جن مسائل سے دوچار ہے اس میں دہشت گردی سر فہرست ہے یوں تو اس مسئلے سے پورا ملک متاثر ہے اور بہت بری طرح متاثر ہے لیکن ہمارے قبائلی علاقوں اور یہاں کے عوام نے ان شرپسندوں کے ہاتھوں جن مصائب کا سامنا کیا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ ان شرپسندوں کی سرکوبی کے لیے تمام فوجی آپریشنوں اور اب ضرب عضب کی کامیابی کے لیے انہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے ہی ملک میں کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ ان علاقوں میں بحالی کا کام شروع ہو چکا ہے ایسے میں اگر ان کھالوں کو اس بار حکومتی اداروں کے تحت منظم کے طور پر جمع کیا جائے اور اس سے حاصل ہونے

والی رقم کو اگر ان آئی ڈی پیز کی بحالی کے لیے استعمال کیا جائے تو ہم اب تک کسی حساب کتاب کے بغیر غائب ہونے والی قیمتی کھالوں کو ایک ایسے مقصد کے لیے استعمال کر لیں تو نہ صرف بے خانماں لوگوں کو اپنی روز مرہ زندگی بحال کرنے میں مدد کریں گے بلکہ ان علاقوں میں ہونے والے ترقیاتی کاموں میں بھی ان کی آمدنی کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان بے گھر لوگوں کی دلجوئی حکومت پاکستان اور پاکستان کے ہر شہری کا فرض ہے اس لیے اگر وہ اس بار ان کھالوں کو ان کے نام کر دیں تو ہم اس کو قومی یکجہتی کا ذریعہ بھی بنا سکتے ہیں۔اس کے لیے حکومت اگر یہ ذمہ داری شہری انتظامیہ کو دے یا فوج سے بھی مدد لے جو با قائدہ اندراج کر کے اس رقم کو ہر آئی ڈی پی تک پہنچائے اور اس بات کو بھی یقینی بنائے کہ اس رقم سے صرف بحالی کا کام کیا جائے چاہے یہ ذاتی گھر کی بحالی ہو یا کاروبار اور یا سکولوں، ہسپتالوں، سڑکوں، پانی کی سپلائی جیسے منصوبوں پر ہی خرچ ہو تو ہم ان کھالوں کو زیادہ سے زیادہ قومی ترقی اور یکجہتی کے لیے استعمال کر کے قربانی کی اصل روح کو زندہ کر سکتے ہیں اور ملت مسلمہ کے اس نیکی کے فعل کو مزید نیکی کا باعث بنا سکتے ہیں۔ یہ یقیناً دنیاوی فائدے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث بھی ہو گا جو سنت ابراہیمی کی اصل روح ہے۔

افغان حکومت اپنے اداروں، عوام اور علماء کو لگام دے

پاکستان اور افغانستان دو ہمسایہ اور برادر اسلامی ممالک ہیں جغرافیائی طور پر جڑے ہوئے ان دونوں ملکوں کے آپس میں مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی رشتے بھی موجود ہیں۔ افغانستان پر جب مشکل وقت آیا تو پاکستان نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی اور اس کے لاکھوں باشندوں کو سالوں نہیں دہائیوں تک اپنی زمین پر جگہ دی لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود ان دونوں ممالک کے تعلقات میں اونچ نیچ کا تناسب بڑھتا جارہاہے اور بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دونوں ممالک کے عوام میں بھی خلیج بڑھتی جارہی ہے۔ معاملات بہتر ہونے لگتے ہیں، دونوں طرف سے مثبت بیانات آنے لگتے ہیں اور ایک دم سے اس میں گرماگرمی پیدا ہوجاتی ہے جس میں اکثر افغانستان کی طرف سے پاکستان پر الزامات لگادیے جاتے ہیں کہ پاکستان افغانستان میں دہشت گردی کرارہاہے جبکہ زمینی حقیقت اس کے الٹ ہوتی ہے۔ پاکستان خود اس دہشت گردی سے سب سے زیادہ متاثر ہے اور ان دہشت گردوں کی اکثریت افغانستان کی سرحد سے جڑے ہوئے پاکستان کے قبائلی علاقوں سے ہی تیار ہوکر آتی ہے اور وہاں یہ افغانستان سے درآمد ہوتے ہیں جو پاکستان کے طول وعرض میں دہشت گردی کی کاروائیاں کرتے ہیں۔ پاکستان اور افغانستان جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا کہ مذہبی ، ثقافتی اور معاشرتی رشتوں میں جڑے ہوئے ممالک

ہیں یہاں تک کہ دونوں ملکوں کے عوام میں خونی رشتے بھی موجود ہیں پاکستان نے افغان مہاجرین کی کئی دہائیوں تک میزبانی کی اور اب بھی کر رہا ہے پھر آخر وجہ کیا ہے کہ دوسری طرف سے ان جذبات اور احساسات کا اظہار نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہی ایسے اقدامات کیے جا رہے ہیں جو حالات کو بہتری کی طرف لے جائیں بلکہ پاکستان میں ہونے والے دہشت گردی کے اکثر بڑے واقعات افغانستان سے ہی کنٹرول ہوتے ہیں ضروری نہیں ہے کہ ایسا کابل حکومت کی مدد سے ہو لیکن وہاں سے اس کو ختم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ پشاور اے پی ایس حملے کے بعد آرمی چیف جنرل راحیل شریف کابل گئے اور ثبوت پیش کیے کہ اس حملے کی منصوبہ بندی میں ملوث لوگ افغانستان میں موجود تھے اور ان کے کارندے پاکستان میں درندگی کی انتہا کر رہے تھے اس حملے کے بعد آپریشن ضرب عضب کو جب انتہائی تیز کیا گیا تو حالات کافی بہتر ہوئے لیکن تحریک طالبان پاکستان کے نام نہاد عہدے دار اور مولوی فضل اللہ جیسے لیڈر افغانستان میں موجود رہے اور اب بھی ہیں جن کے خلاف افغان حکومت اور امریکہ نے اب تک موثر کاروائی نہیں کی۔ افغانستان میں بھارت کا عمل دخل ایک بہت ہی اہم عنصر ہے جو پاکستان میں دہشت گردی میں اہم ترین کردار ہے۔ بھارت کا اثرورسوخ حکومت سے آگے بڑھ کر افغان عوام اور علماء تک پہنچ چکا ہے تبھی ایک طرف پشاور میں ایک نوجوان افغان نے کہا'' دیکھا بڈھ بیر میں ہم نے حملہ کر دیا ناں''جب کہ دوسری طرف افغان علماء کونسل نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ پاکستان میں جہاد

جائز ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس فتوے کو ایک افغان حکومتی حکم نامے میں شامل کیا گیا ہے جو اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ افغان حکومت کی مدد پاکستانی طالبان کو حاصل ہے لیکن اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح وہ دہشت گردی کے خلاف ایک دہائی سے زیادہ عرصے پر محیط فوجی آپریشنز کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کو ضائع کردے گا اسے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ افغان قوم بنیادی طور پر ایک جنگجو قوم ہے جو کسی بھی وقت حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہو سکتی ہے اور اپنی مرضی کے خلاف حکومت کے خلاف تحریک کو خانہ جنگی کی صورت دے سکتی ہے قندوز پر حملہ اور قبضہ ایسے ہی نظریات کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اگر احسان اللہ احسان اس فتوے کو لاگو کرنے کی بات کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ افغان حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات ہیں دوسری طرف افغان حکومت کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان میں اس کو مداخلت کا کوئی حق نہیں اس کی اپنی بقاء بھی پاکستان کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے لیکن اس نے اپنے نیشنل سیکورٹی ڈائریکٹریٹ میں ایک حصہ اسی کام کے لیے مختص کیا ہوا ہے کہ پاکستان کے خلاف بات کرتا رہے۔ اگر اس کے علماء نے یہ بات کہی بھی ہے تو بجائے اس کے کہ ان کی حوصلہ شکنی کی جائے اس نے اسے اپنے حکومتی حکم نامے میں شامل کر دیا۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ حکومت پاکستان اور پاک فوج تو اپنی ذمہ داریاں پوری کرینگے ہی لیکن پاکستانی علماء کو بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں اس فتویٰ کا سختی سے جواب دینا چاہیے اور اگر اس

میں ہماری مذہبی سیاسی جماعتیں شامل ہو جائیں تو اور زیادہ بہتر ہوگا۔ اگر یہ جماعتیں جمہوریت پر یقین رکھتی ہیں بلکہ انتخابات اور حکومتوں میں شامل ہو کر اس کا حصہ بنتی ہیں تو انہیں صرف حصول حکومت کے لیے اس کا حصہ نہیں بننا چاہیے بلکہ ریاست کی بقاء اور امن کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے افسوس کا مقام یہی ہے کہ یہ جماعتیں جمہوری عمل کا حصہ بنتی ہیں لیکن طالبان، داعش اور دیگر خود ساختہ ولیوں کے خلاف زبان کھولتے ہوئے یا تو ان کے مفادات سامنے آتے ہیں یا خوف۔ اسلام امن، سلامتی اور میانہ روی کا مذہب ہے اسے خوارج کے حوالے کرنے والے خود اس کی تضحیک کا باعث بن رہے ہیں لہذا اگر ایک طرف افغان حکومت اور پاکستان میں دہائیوں تک اور دہائیوں سے پناہ گزین اور یو این ایچ سی آر سے مسلسل مہاجرین کی مراعات لینے والے افغان باشندوں کو اپنے رویے درست کرنے ہیں تو دوسری طرف پاکستانی علماء اور مذہبی جماعتوں کو حکومت اور پاک فوج کی مدد کے لیے آگے سے آگے بڑھ کر خود کوشش کرنا ہوگی تاکہ بھارتی دباؤ کے زیر اثر افغان حکومت نہ صرف اپنے بلکہ اپنے اداروں، عوام اور علماء کے ارادوں کو لگام دے اور یہ احساس کرے کہ اس کا اور پاکستان کا امن اور وجود ایک دوسرے سے وابستہ ہے بھارت سے نہیں۔

قندوز پر طالبان کا حملہ۔۔۔اصل کہانی

افغانستان کے شمالی شہر قندوز پر اچانک طالبان نے حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس سے پہلے طالبان نے جیل پر حملہ کیا اور رپورٹس کے مطابق پانچ سو قیدیوں کو چھڑا لیا یعنی اپنی طاقت میں براہ راست پانچ سو افراد کا اضافہ کیا اگر یہ کہا جائے کہ یہ حملہ اشرف غنی کی حکومت کے خلاف ایک سازش ہے تو شاید یہ غلط نہ ہو گا کیونکہ حالات و اقعات کے مطابق اس کے قوی امکانات موجود ہیں۔ اس حملے کو مبینہ طور پر ملا عبدالسلام اخوند اور ملا محمد حسن اخوند نے مرتب کیا ان دونوں طالبان لیڈروں کو پاکستان نے 2010 میں گرفتار کرکے قید میں رکھا لیکن سابق افغان صدر حامد کرزئی کی درخواست اور یقین دہانی پر ان دونوں کو رہا کر دیا گیا اب غالب گمان یہی ہے کہ ان دونوں کو اشرف غنی حکومت کے خلاف استعمال کر لیا گیا لیکن بھارت نواز حامد کرزئی کے ان قریبی ساتھیوں کے اس حملے اور قبضے کے بعد ایک اور بھارت نواز لیڈر افغانستان کے چیف ایگزیکیٹو ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے اس کا الزام پاکستان کے اوپر لگا دیا اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں اپنی منفی سوچ کا بھرپور مظاہرہ کیا دراصل بھارت نے آج کل اپنی تمام تر توانائیاں اس بات پر لگا رکھی ہیں کہ پاکستان کو کسی بھی

صورت، کسی بھی طور دہشت گرد ثابت کیا جائے جس کے لیے وہ کوئی فورم اور کوئی موقع ضائع نہیں کرتا اور اپنے ساتھ دوسرے ممالک کو شامل کرنے کے لیے مسلسل اور ہر سطح پر کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ افغانستان اپنی کمزور حکومت، ناقص منصوبہ بندی، دہشت گردی کے خلاف اپنے غیر سنجیدہ اقدامات کے باعث جن حالات و مسائل کا شکار ہے بھارت کے ساتھ اس کا اتحاد بہت آسان تھا اور بھارت نے اس چیز کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے افغانستان میں مختلف انداز میں اپنی موجودگی کو بڑھایا، یہ موجودگی تعمیر نو کے بہانے بہت آسانی سے ممکن تھی لہذا اس نے کئی منصوبے وہاں شروع کیے اور اپنے ہزاروں باشندے وہاں پہنچادیے، اپنے قونصل خانے بنائے، افغان فوج کی تربیت کے منصوبوں میں شامل ہو کر فوج میں بھی دخیل ہوا اور اس طرح حکومت میں بھی اس کا عمل دخل ممکن ہوا جس میں حامد کرزئی کا کردار بہت اہم ہے، اس کے بعد عبداللہ عبداللہ نے اس کی ڈیوٹی سنبھال لی۔ عبداللہ عبداللہ جو جب 1986 میں افغانستان سے نکلا تو پشاور کی زمین نے اسے پناہ دی وہ وہاں سے مجاہدین کی مدد اور علاج کرتا رہا لیکن اب جب انہی گروپوں کی دوسرے ناموں سے تشکیل ہوئی تو انہیں وہ پاکستان کے کارندے کہتے ہیں اور ان کی کاروائیوں کا الزام پاکستان پر لگاتے ہیں۔ افغانستان نے بھارت سے یہ تربیت بھی لے لی ہے کہ اپنا چور گھر میں ڈھونڈنے سے پہلے ہمسایوں کے گھر پر دھاوا بول لیتے ہیں اور یوں اپنا گھر بھی لٹ جاتا ہے۔ افغانستان اگر اپنی حالت ٹھیک کرنے کی کوشش کرے اور دہشت

گردی کے خلاف سنجیدہ اور ٹھوس اقدامات کرے تو نہ صرف وہ خود ایک محفوظ ملک بن جائے گا بلکہ پاکستان بھی ان تباہ کن حالات سے باہر آجائے گا جس نے پچھلے پندرہ سال سے بڑی شدت سے ہمارے ملک کے پورے ڈھانچے کو ہلا کر رکھا ہوا ہے۔ افغانستان اگر پاکستان کو موردالزام ٹھہرانے کی بجائے اصل مسئلے کا حل ڈھونڈے تو یقیناً یہ دونوں ممالک کے لیے بہتر ہوگا۔ قندوز حملے کو اگر پاکستان کے نام لگانے کی بجائے اصل مجرم تلاش کر لیے جاتے تو یہ زیادہ اچھا ہوتا اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان گروہوں میں مزید شدت پسند گروہوں کے مل جانے کا ڈر لگا رہے گا بلکہ داعش آئی ایس آئی ایس اور دیگر ایسی ہی تنظیموں نے نہ صرف افغانستان بلکہ اسی راستے پاکستان میں بھی اپنی موجودگی کا پتہ دینا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت اگر افغانستان میں عبداللہ عبداللہ جیسے لوگ بیان بازی اور بلیم گیم سے اجتناب کریں، بھارت اور را کے جھانسے میں نہ آئیں اور دونوں ممالک خلوص سے مل بیٹھ کر مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ دونوں ملک اور اس کے عوام دہشت گردی کے چنگل سے نہ نکل سکیں۔

افغانستان کے رہنما یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ پاکستان اور بھارت کا معاملہ نہیں جہاں مذہب، ثقافت، تہذیب، معاشرت سب ہی کچھ مختلف ہے جبکہ پاکستان اور افغانستان میں یہ سب کچھ مشترک ہے یہاں وجہ نزاع کچھ بھی نہیں۔ اگر آج بھارت، امریکہ اور دیگر طاقتوں کا اثر ورسوخ افغانستان سے ختم ہو جائے اور خاص کر بھارت کا پروپیگنڈا اور دہشت گردوں کے لیے اس کی مالی اور

تکنیکی امداد ختم ہو جائے تو ہم مل کر دہشت گردی کی جڑوں کو کاٹ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے افغان حکومتوں سے حامد کرزئی اور عبداللہ عبداللہ جیسے لوگوں کی بے دخلی ضروری ہے اور اشرف غنی کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ قندوز پر حملے کے دو کردار ملا عبدالسلام اخوند اور ملا محمد حسن اخوند ہی کیوں چنے گئے اور جب پاکستان انہیں گرفتار کر چکا تھا تو حامد کرزئی نے انہیں کیوں چھڑایا اور افغانستان نے انہیں اتنی آزادی کیسے دی کہ وہ اتنے بڑے حملے کی منصوبہ بندی کرکے اسے عملی جامہ پہنا سکے۔ افغانستان اگر پاکستان کے مطلوب دہشت گردوں کو پناہ دیئے ہوئے ہے تو ظاہر ہے ساتھ میں ایک ایسی کھیپ بھی تیار ہو رہی ہے جو افغانستان کے لیے مستقبل میں بھی وہی مسائل پیدا کرتی رہے گی جس کا وہ اب بھی سامنا کر رہا ہے کیونکہ دہشت گرد کی صرف ایک شناخت اور فطرت ہے شدت، ظلم اور دہشت۔ افغانستان کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ وہ اپنے فیصلے خود کرے بھارت جتنا پاکستان کا دشمن ہے اتنا ہی افغانستان کا بھی کیونکہ یہ دونوں مسلمان ممالک ہیں اور اگر وہ اپنے مسلمان شہریوں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا تو دوسرے مسلمان ممالک کا کیسے کرے گا لہذا اگر افغانستان اپنے اصل دشمن کی پہچان کر لے تو زیادہ مناسب ہوگا۔